نایاب تحفہ

اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویہدی الیہ من ینیب

دارالعلوم دیوبند نمبر

درج ذیل اکابرین کے انمول مضامین

- حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
- شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا
- مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب
- مولانا شمس الحق افغانی
- مولانا سرفراز احمد صفدر
- سید نفیس الحسینی
- ڈاکٹر علامہ خالد محمود
- مولانا تقی عثمانی

مولانا سمیع الحق
مدیر "الحق" اکوڑہ خٹک

افتتاحی تقریب

حضرت مہتمم دارالعلوم کا خراجِ تحسین — دعائیں — اور مبارکباد

۲۸ مارچ اتوار کا دن دیوبندی مکتبِ فکر کے لیے خصوصاً اور علمی و فکری حلقوں کے لیے عموماً علمی اور روحانی مسرتوں کا دن تھا کہ آج لاہور میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں ماہنامہ "الرشید" کے عظیم الشان دارالعلوم دیوبند نمبر کا افتتاح ہونا تھا۔ "الرشید" کے فاضل مدیر نے لاہور کے علمی، ادبی، صحافتی اور سماجی حلقوں کے ارباب علم و فضل کو اس تقریب میں بلایا تھا اور نہ صرف لاہور سے بلکہ شمع دیوبند کے پروانوں کو جہاں بھی خبر ملی وہ پروانہ وار صبح ہی جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن میں پہنچ گئے تھے جہاں قاری محمد طیب صاحب کی صورت میں انہیں متحرک اور مجسم دیوبند اور اس نمبر کی شکل میں کتابی اور علمی دیوبند کا قِران السعدین دیکھنا تھا اور بقول حضرت قاری صاحب مدظلہ "اس خواب کی تعبیر تھی جو وہ خود بھی برس ہا برس سے دیکھ رہے تھے"۔ آغازِ تقریب میں فاضل مرتب مولانا عبدالرشید ارشد نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اور حضرت محترم مولانا مفتی محمود صاحب نے وقیع انداز میں دارالعلوم دیوبند کے اہداف و مقاصد، علمی تاریخ، مجاہدانہ مزاج اور دیوبندی سکول کے منفرد خصائص پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد مہمانِ خصوصی حضرت اقدس قاری صاحب مدظلہ نے دارالعلوم کے علمی، روحانی، سیاسی، معاشرتی اور باطنی و ظاہری خدمات کو اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا۔ "الرشید" کے اس نمبر کی جامعیت سے ہر پڑھے لکھے انسان کی طرح خود حضرت قاری صاحب بھی نہایت متاثر تھے اور دوران تقریر بار بار اپنی مسرتوں کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا عبدالرشید ارشد اس قدر افزائی کے مستحق تھے کہ جنہوں نے طویل محنتوں سے مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی کی سرپرستی میں اس نمبر کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اپنی ایک ذات سے ایک — ایک پورے طبقہ، ادارہ اور اکیڈمی کا کارنامہ سرانجام دیا۔ —— حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے آغاز تقریر میں فرمایا کہ مولانا نے ایسا نمبر نکال کر پورے علماء، پوری امت مسلمہ اور پوری جماعت پر ایک عظیم احسان کیا جو دارالعلوم کے تاریخی، دینی، مذہبی، علمی، سیاسی اور روحانی گوشوں پر حاوی اور جامع ہے۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ہم لوگ برس ہا برس سے خواب دیکھتے رہے اور مولانا عبدالرشید نے اس کی تعبیر مجسم کرکے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے اس نمبر کو شائع کرکے ساری جماعت پر احسانِ عظیم کیا۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ عنقریب دارالعلوم کے صد سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے لیے ہم دارالعلوم کے ہمہ جہت کارناموں پر علمی اور کتابی کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ایک نقش قدم بنلایا جس پر آئندہ تعمیر ہوگی۔ بنیاد پاکستان نے رکھ دی۔ ہندوستان اس پر عمارت بنائے گا تو ایسی عمارت بڑی شاندار ہوگی۔ اسی بنیاد پر دارالعلوم کی لمبی چوڑی تاریخیں مرتب ہوں گی —— مخصوص حکیمانہ انداز میں فرمایا کہ پہلے میں دارالعلوم کی خبر بن کر آتا تھا اور اب یہ نمبر خبر واقعہ ہے تو دارالعلوم اسے لے کر جاؤں گا تو دارالعلوم میرے دامن میں ہوگا اور یہ خبر میرے اندر ہوگی۔ آخر میں انہوں نے مضمون نگاروں کو دل سے دعائیں دیں۔

ترجمان جامعہ رشیدیہ ساہیوال

ماہنامہ **الرشید** لاہور

قیمت دیوبند نمبر

مقام اشاعت ۲۲ اے شاہ عالم لاہور

جلد ۴ ○ شمارہ ۲ ○ ۳ صفر المظفر و ربیع الاول ۱۳۹۶ھ ◉ فروری و مارچ ۱۹۷۶ء

دارالعلوم دیوبند نمبر

انتساب
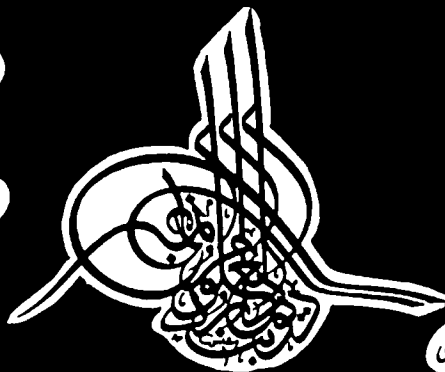
حضرات اکابرِ رشیدیہ و بزرگانِ رائے پور کے نام

- حضرت مولانا حافظ الحاج محمد صالح رائے پوری خلیفہ حضرت گنگوہی (مؤسس اوّل جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا فضل احمد رائے پوری خلیفہ حضرت رائے پوری (مہتمم اوّل جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا حافظ مفتی فقیر اللہ رائے پوری تلمیذ حضرت شیخ الہند (صدر المدرسین و مفتی جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا حافظ احمد الدین رائے پوری خلیفہ حضرت رائے پوری (واعظ و مفتی جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا منشی رحمت علی بہروی خلیفہ حضرت رائے پوری (رکن دار العلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیر المدارس (رکن دار العلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا رشید احمد سلفی رشیدی (بانی جامعہ سلفیہ مدینہ منورہ)
- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (فضلاء جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا محمد علی جالندھری (بانی مجلس تحفظ ختم نبوۃ) فضلاء جامعہ رشیدیہ
- حضرت مولانا محمد انوری جالندھری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب)
- حضرت مولانا عبد الجبار ابوہری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب) مبلغ دار العلوم دیوبند
- حضرت مولانا محمد ابراہیم سلیم پوری (میاں چنوں) سرپرست جامعہ رشیدیہ
- شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہ (مدرس و مبلغ اعظم جامعہ رشیدیہ)
- استاذ العلماء حضرت مولانا الحاج عبد العزیز رائے پوری جالندھری مدظلہ (خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ ہذا)
- حضرت پیر جی الحاج حافظ عبد اللطیف رائے پوری مدظلہ (چیچہ وطنی) خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ ہذا

شارعِ کون و مکاں کی راہ پر لاتا رہا — گمرہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا

پرچمِ اسلام ابرِ درخشاں کے رُوپ میں — تجددوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا

ہمرہانِ دل گرفتہ کو بہ اعلانِ جہاد — تیغ جوہردار کا آئینہ دکھلاتا رہا

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا — وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

شورش کاشمیری مرحوم)

خادمانِ جامعہ اشرفیہ لاہور،

کتاب و سنّت کے خادم ادارہ!

دارالعلوم دیوبند

کے متعلق ماہنامہ الرشید کے خصوصی شمارہ شائع کرنے پر

ادارہ الرشید اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو

پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالےٰ

اس محنت کو قبول فرمائیں!

اراکین، اساتذہ و طلباء

جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھم صلِ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما صلیت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آلِ ابراہیم

انّک حمیدٌ مّجیدٌ

اللّٰھم بارِک علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما بارکت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آلِ ابراہیم

انّک حمیدٌ مّجیدٌ

دار العلوم دیوبند

قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید
ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن
رسول اللہ وخاتم النبیین
الاحزاب
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکر و اعتذار

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں "دارالعلوم دیوبند نمبر" شائع کرنے کی توفیق بخشی۔ تاہم یہ حسرت ہی رہی کہ دارالعلوم کے شایان شان نمبر پیش نہیں کر سکے۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا پیش خدمت ہے دارالعلوم کی خدمات پر اس طرح کے کئی ضخیم نمبر نکل سکتے ہیں اور ہم انشاء اللہ آئندہ سال "شخصیات نمبر" شائع کریں گے۔ کہ ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں دارالعلوم دیوبند بحیثیت سلسلہ جو جشن منا رہا ہے۔

جہاں ہم اپنے اکابر اور احباب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے مضامین عطا فرمائے، وہاں اُن حضرات سے معذرت خواہ بھی ہیں کہ جن کے مضامین شامل اشاعت نہیں ہو سکے۔ خصوصاً حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی سے حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی، محب محترم مولانا قاری سے نورالحق ایڈووکیٹ اور برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی کی طرف سے شرمندہ ہیں کہ ان کے مضامین شامل نہیں ہو سکے حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب کا ایک مضمون رہ گیا۔ ان سے بھی بصد ادب معذرت ہے۔ نہ وقت تھا نہ گنجائش۔ پروفیسر احمد سعید تھانوی سے بھی شرمندہ ہیں کہ ان کا مضمون شامل نہ ہو سکا

حضرت مفتی محمود صاحب: مولانا قاری نورالحق: مولانا زاہد الراشدی تینوں حضرات کے مضامین ایک ہی انداز اور ایک ہی طرح کے تھے۔ لہٰذا قائد کے مضمون کو لے لیا گیا اور باقی دو چھوڑنا پڑے۔

یہاں قاضی محمد اسماعیل صاحب مالک کوکل آرٹ پریس لاہور کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے کہ جن کی ان دنوں تمام تر مساعی پرچہ کو مکمل کرنے پر مرکوز رہیں۔ پروگرام کے مطابق اتنے دنوں میں پانچ صد صفحات شائع ہونا بھی مشکل نظر آتے تھے، جب کہ ان کی توجہ سے آٹھ صد صفحات شائع ہو گئے۔ اپنے رفقائے کار مولانا سعید الرحمن علوی (ایڈیٹر خدام الدین) جناب اکرام القادری (ایڈیٹر ترجمان اسلام)، مولوی محمد دین شوق اور رانا عنایت اللہ نے جس خلوص اور محنت سے ہر ہر مرحلے پر ساتھ دیا؛ وہ بھی لائق صد تحسین ہے۔

حضرت سید نفیس رقم کی زیر سرپرستی شعبہ کتابت میں برادران۔ عبدالرشید: محمد جمیل حسن، معراج الدین: چوہدری محمد صادق، عزیزم عبدالشکور: محمود الحسن نے جس لگن سے کام کیا۔ قابل صد ستائش ہے۔ خصوصاً برادرم عبدالرشید نے جس توجہ سے کام کیا۔ اس پر وہ بہت تبریک کے مستحق ہیں۔

آخر میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی کے شکر گزار اور ممنون ہیں جنہوں نے ہماری استدعا کو قبول فرما کر ۲۸ مارچ کو افتتاح کے لیے وقت مرحمت فرمایا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ کا شکریہ ادا کرنا ان کے لطف و کرم اور شفقت بے پایاں کی توہین ہے:

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ نمبر میں حصہ لینے والوں کے لیے دعا کریں۔

فاضل حبیب اللہ رشیدی

عبدالرشید ارشد

عبدالرشید ارشد

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہتی خدمات کا انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی روزِ روشن میں یہ کہے کہ مجھے وجودِ آفتاب کی دلیل دو۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" لیکن اس کے باوجود اگر کوئی انکار کرتا چلا جائے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

دارالعلوم دیوبند نمبر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ دارالعلوم کا قیام کن حالات میں ہوا اور ایک سو دس سال میں اس نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔ اس کے قدرے تعارف کے لیے ماہنامہ "الرشید" نے اپنا خصوصی نمبر" دارالعلوم دیوبند" نمبر شائع کرنے کا اعلان و اہتمام کیا۔ ایک ایسا ادارہ جس کے ایک ایک فرد کے حالات و سوانح بیان کرنے کے لیے صدہا صفحات پر مشتمل کئی کئی جلدیں لکھی جا چکی ہوں اس کے حالات و تاریخ بیان کرنے کے لیے یقیناً یہ نمبر کافی نہیں تاہم یہ خیال کرتے ہوئے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا مفید ہے۔ اجمال و اختصار کے ساتھ تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ اس سلسلے میں مزید کام کرتے رہیں گے۔ اس کوشش کو اس کا پہلا قدم سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے قدم تدریجاً اٹھتے رہیں گے۔

سربراہ خاندان

جس طرح ایک خاندان کے سربراہ کو اپنے کنبہ و خاندان کی تمام ضروریات کے فراہم کرنے، اپنے آباؤاجداد کی خصوصیات وصفات کو قائم رکھنے اور ہر ہر فرد کی تعلیم و تربیت، لباس و خوراک، رہائش و آسائش کا خیال رکھنا پڑتا ہے اسی طرح علمائے ربانیین بھی اسلامی برادری کے علی حسب مراتب سربراہ ہوتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری ایک وقت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر تھی۔ پھر ایک وقت میں اس کے حامل الامام المحدث شاہ ولی اللہؒ تھے۔ ان کے بعد ان کے اخلاف و صاحبزادگان نے اس فرض کو سنبھالا۔ جس کے ایک دور کی قیادت وسیادت امیرالمومنین حضرت سید احمد شہید کے حصہ میں آئی اور اس کے بعد یہ کام اللہ تعالیٰ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر

ط ______

گئی اور ان کے جانشینان سے لیا اور یہ بوجھ ان کو ایسے ناخوشگوار حالات اور نامساعد وقت میں اٹھانا پڑا کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کلیۃً ختم ہو چکی تھی اور چھ ہزار میل دور سے آئے ہوئے فرنگی ملک پر قابض و متسلط ہو چکے تھے۔ اور ملک کی حالت ایسی ہوشربا اور روح فرسا ہو چکی تھی جس کا نقشہ میکم لوئین جج عدالت عالیہ بنگال سابق ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا:۔

ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم ورواج کی توہین کی عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کر لیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مالگزاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے[1]

لارڈ ڈلہوزی وائسرائے کی نسبت ایک قابل مصنف اور فوجی افسر نے لکھا:۔

"وہ ہندوستانیوں کے عقائد اور محسوسات، عادات اور روایات کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے"[2]

مورخ کئی تسلیم کرتا ہے کہ:۔

"ایک مقام میں چھ ہزار ہندوستانیوں کا قتل عام کیا گیا۔ تنہا الہ آباد کے علاقہ میں میں نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز مرد و عورت اور بچے بوڑھے ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء-۵۸ء کے سارے ہنگامے میں انقلابیوں کے ہاتھ سے انقلاب کی وجہ سے نہیں مرے"[3]

ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ:۔

"انبالہ سے دلی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو انگریزوں نے مار ڈالا، ان کے بدنوں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا تھا اور ہندوؤں کے منہ میں گائے کا گوشت ٹھونسا جاتا تھا"[4]

ٹامسن نے لکھا ہے:۔

"دہلی کے کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے اور زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا جاتا اور مسلمانوں کو سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا"[5]

خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ:۔

---

[1] منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل مؤلفہ سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) مطبع جیلی دہلی ۱۹۴۵ء ص ۸۶

[2] فوجی بغاوت از لیفٹیننٹ جنرل میک لوڈ انیس ص ۱۶ بحوالہ روشن مستقبل ص ۸۵

۳، ۴، ۵۔ بحوالہ مذکور روشن مستقبل

ی ——

"ہزاروں عورتیں فوج کے خوف سے کنوؤں میں گر پڑیں۔ یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہوگئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنوئیں سے نکالنا چاہا تو انہوں نے کہا۔ ہمیں گولی سے مار دو نکالو نہیں ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں ہماری عزت خراب نہ کرو۔ بعض لوگوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔"

(بہادر شاہ کا مقدمہ از خواجہ حسن نظامی دفتر اخبار منادی دہلی)

یہ تو تھے مظالم جو انگریز نے کئے تاکہ اس کی حکومت مستحکم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے اپنے مذہب عیسائیت کے فروغ اور ہندوستانیوں کو بپتسمہ دے کر عیسائی بنانے کے لیے جو مہم شروع کی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دارالحکومت دہلی میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر عیسائی پادری اسلام کی حقانیت کو چیلنج کرتے اور تین خداؤں کی دعوت دیتے نظر آتے (اس کی کچھ تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے) یہ تھے وہ حالات جن میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ پھر اس دارالعلوم کے خدام نے جو دراصل کتاب و سنت کے خادم تھے ہر ہر محاذ پر کس استقلال و استقامت، تدبر و حکمت، اور جہد و ہمت سے کام کیا۔ وہ تاریخ برصغیر کا جلی عنوان بن چکا ہے۔ جو نہ مٹائے مٹ سکتا ہے اور نہ ہی مغالطوں یا حاسدانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈے سے اس کو دھندلایا جا سکتا ہے۔ ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم ۔

یہ مرتبہ بلند ملا۔ جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

خادمانِ علوم و اعمالِ نبوت

ان حضرات کی اصل حیثیت کتاب و سنت کے خدام کی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے دین الٰہی (اسلام) کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ اس کے لیے اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مغربی پاکستان میں ۱۹۶۲ء میں کل مدارس دینیہ کی تعداد ۵۶۳ تھی (یہ وہ مدارس ہیں جن کے حالات انتہائی محدود وسائل رکھنے والے ایک شخص حافظ نذر احمد صاحب نے مہیا کئے۔ [1] سینکڑوں مدارس اس کے علاوہ اور ہوں گے جن میں ۲۹۱ مدارس دیوبندی اور ۲۷۲ مدارس بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ حضرات کے ہیں اور انہی ۲۷۲ میں ۸۶ مدارس ایسے ہیں جو بلا تخصیص مسلک کام کر رہے ہیں اور ان میں بھی یقیناً اکثریت ایسے مدارس کی ہوگی جو دارالعلوم دیوبند سے قریب اور دوسروں سے دور ہوں گے ——— اب ایک اور انداز سے دیکھئے کہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد کیا ہے۔ دیوبندی مشرب کے بڑے

---

[1] حافظ نذر احمد صاحب مسلم اکاڈمی لاہور نے ایک کتاب "جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان" کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

مدارس کو جائزہ مدارس عربیہ کو سامنے رکھ کر یا براہِ راست مدارس کو خط لکھ یا دہاں جاکر اندازہ لگائیے تو معلوم ہوگا کہ طلباً کی دیوبندی مدارس میں کل مدارس کے طلباً کا اسی فیصد ہوگی ـــــــ ان مدارس سے کتاب وسنت کی کس قدر اشاعت ہوئی۔ کس قدر مصنف ۔ مبلغ ۔ مدرس ۔ مناظر۔ خطباً اور صوفیا پیدا ہوئے اور انہوں نے ہر ہر شعبۂ زندگی میں کس قدر کام کیا۔ اس کی بھی قدرے تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی ۔ یہاں اس کی تفصیل تحصیل حاصل ہوگی۔ ہم یہاں بعض دوسری اہم باتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

چند مذہبی مغالطے

دارالعلوم کے قیام سے پہلے۔ قیام پر۔ بعد اور آج بعض حلقوں کی طرف سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کے بانیان۔ سرپرست اور اساتذہ کی بعض عبارات ایسی ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر مانتے ہیں۔ نور نہیں مانتے ؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ ان کو مختارِ کل نہیں مانتے اور ہروقت ہر جگہ حاضر ناظر وغیرہ وغیرہ ۔ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ واقعتہً ان بزرگوں کا یہی عقیدہ و یقین ہے کہ مختارِ کل عالم ماکان ومایکون (ماضی وحال واستقبال) از ازل تا ابد اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کی صفات و خصوصیات صرف خدائے عزوجل کو حاصل ہیں اور یہ صفات اسی کے لیے مختص ہیں ـــــــ یہ چیزیں یا صفات اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مان لی جائیں تو پھر خدا اور رسول میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ معبود حضور علیہ السلام عبد۔ اللہ تعالیٰ خالق۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں ۔ اگر ہم بھی ان صفات خداوندی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مان لیں تو پھر اسلام اور عیسائیت میں کیا فرق رہ جاتا ہے ۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام صفات تسلیم کر لی جائیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت۔ صبر و استقامت ۔ توکل علی اللہ اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین۔ اس کے سامنے گریہ وزاری وغیرہ کے تمام باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے خارج کرنا پڑیں گے اور پورے قرآن کا انکار کرنا پڑے گا اور پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان بے معنیٰ ہوکر رہ جاتا ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ　　بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں عمدہ نمونہ ہے

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ　　(اے پیغمبرؐ) کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے

اب فرمائیے کہ اگر الوہی صفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تسلیم کر لی جائیں تو پھر ان کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کیسے کیا جا سکتا ہے ، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام عالم الغیب تھے تو پھر ان سے بیٹے کی قربانی طلب کرنے کا کیا مقصد ؟ کہ جب انہیں صفت علم غیب سے یہ پتہ ہو کہ بیٹا قربان نہ ہوگا تو پھر ان سے قربانی طلب کرنا،

ل ـــــــ

ان کا قربانی کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ وہ ہر آزمائش میں پورے اترے، ان سب حقائق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ سوال ہوگا کہ بات تو حضور علیہ السلام کی ہو رہی ہے اور درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ آگیا، تو گذارش ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک برادری کے فرد ہیں یہ علیحدہ بات ہے تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض، مگر یہ گروہ جس کا ذکرِ خیر ہو رہا ہے وہ تو تمام اولیاء اللہ کو ان صفات کا حامل قرار دیتا ہے، بہشتی زیور سے کون واقف نہیں، مولانا احمد رضا خان کے ایک خلیفہ صاحب نے "اصلاح بہشتی زیور" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کے تعارف و اشتہار میں یہ عبارت درج ہے:

"اس میں انبیاء کرام و اولیائے عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نیاز و فاتحہ دینے، نذر و منت ماننے، ان سے مدد چاہنے، انہیں پکارنے یا رسول اللہ، یا علی، یا غوث کہنے، انہیں ہر حال کی خبر رہنے، ان کے نام کا جانور پالنے، چھوڑنے، ذبح کرنے، ان کے مزارات پر عرس کرنے، چراغ جلانے، چادر، مٹھائی، حلوا، گلگلے وغیرہ چڑھانے، ان کے نام کا وظیفہ کرنے، بازو پر پیسہ باندھنے، ان کی دہائی دینے، خدائی رات کرنے، کسی جگہ کا ادب و تعظیم طواف و سجدہ کرنے، کسی کے سامنے جھکنے، کھڑا رہنے، عبدالنبی، غلام رسول، نبی بخش، علی بخش، غلام محی الدین وغیرہ نام رکھنے، گلے میں کلاوا ڈالنے، بدھی پہننے، سہرا باندھنے اور ان کی مثل بہت سی باتوں کو جو بہشتی زیور میں مذکور اور وہابیہ کے نزدیک شرک و کفر و حرام و بدعت تھیں، تردید اور علاوہ ان کے بہت سے مسائل فقہ کی اصلاح و تصحیح کی گئی ہے"

(اشتہار مندرجہ بر ٹائٹل صفحہ آخر اصلاح بہشتی زیور ص۴۳۲)

(مطبوعہ مسلم پریس دہلی)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

جو دین بالکل سادہ اور ان معلومہ اعمال و افعال جو کتاب و سنت اور امت کے متواتر و متوارث عمل سے ثابت ہیں، سے عبارت تھا، اور جس سادگی، قناعت، کفایت شعاری اور توحید خالص کی تعلیم اسلام نے دی تھی کیا یہ سب کچھ اسی اسلام کا حصہ ہے؟

ایک نیا مغالطہ

اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کی بدولت امت کے افراد کو بعض ایسی کرامتیں یا فضیلتیں حاصل ہو جاتی ہیں جن کو کشف و کرامت کے اصطلاحی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے

حضرت فاروق اعظمؓ کا مسجدِ نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے "یا ساریۃ الجبل" کہنا، اور اس آواز کا سینکڑوں میل دور سنا جانا، اکابرِ دیوبند اس دور میں پورے عالمِ اسلام میں اتباعِ سنت میں ایسا ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ باید و شاید اسی اتباع و اطاعت کی بدولت ان سے کرامتیں اور خرقِ عادت قسم کے واقعات ظہور میں آئے جن کا ذکر کتب میں آیا اور اس شمارہ میں بھی بعض چیزوں کا ذکر ہے۔ اب حاسدین ان چیزوں کو لے کر عام کر رہے ہیں کہ دیکھو یہ اپنے بزرگوں میں تو ان کو مانتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں۔ یہ مغالطہ اس لئے دیا جا رہا ہے کہ پہلے حربے تو ناکام ہوگئے اب یہ نیا ہتھیار استعمال کیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بیشک ہمارے ان اکابر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ اتباع کے طفیل اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیں لیکن اس کے باوصف ہم ان کو خدا کے عاجز بندے ہی سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں۔

سیاسی مغالطے

ایک اور حربہ جس کا استعمال ملک کے مختلف لوگ موقع بموقع استعمال کرتے رہتے ہیں، ان میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ان کے رفقائے کار کا تحریکِ پاکستان کی (قیام پاکستان سے قبل) مخالفت کرنا اور علامہ اقبالؒ کا حضرت مدنیؒ کے متعلق فارسی میں ایک نظم کہنا ہے۔ ہم یہاں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتے، صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے قبل جب یہ تحریک مشاورتی مرحلہ میں تھی، سے اختلاف کفر تھا نہ جرم، ایک نظریہ کی حمایت و مخالفت تھی بالکل اسی طرح جس طرح سفر کرنے سے پہلے ایک ہی خاندان کے افراد میں اختلاف ہوتا ہے کہ سفر کیا جائے یا نہ اور اگر کیا جائے تو پھر ریل میں کیا جائے، ہوائی جہاز میں کیا جائے یا بس اور کار میں، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے ان لاکھوں متوسلین کو جو پاکستان میں تھے، ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ پاکستان کی ترقی و استحکام کے لئے سینہ سپر رہیں اور خود دعائیں کیا کرتے تھے بلکہ یہاں تک فرمایا کہ "پاکستان کا مسئلہ اب مسجد کی حیثیت رکھتا ہے" اور اس بات کے گواہ و راوی سینکڑوں لوگ ہیں[1]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور مشرقِ وسطیٰ کے دورے سے واپسی پر چند گھنٹوں کے لیے کراچی ایئرپورٹ پر اترے ان چند گھنٹوں سے وقت نکال کر قائدِ اعظم کے مقبرہ پر گئے اور دعائے مغفرت کی اخبارات میں اس کا ذکر آیا۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن [illegible] ایجوکیشن [illegible] اسلام آباد سے بتا رہے ہیں کہ [illegible]
[illegible] کی موجودگی میں [illegible] میں سنا۔

"نوائے وقت کے بانی و ایڈیٹر حمید نظامی مرحوم (جو مدیران میں سے مولانا کے سب سے بڑے سیاسی مخالف تھے) نے اداریہ نوٹ لکھا اور پاکستان کے ان حکام و مقتدر حضرات کی مذمت میں سخت الفاظ لکھے کہ جنہوں نے مولانا مرحوم کے مقام کے مطابق آداب اختیار نہیں کیے ———— باقی رہی علامہ اقبالؒ کی نظم کی بات تو معاف کیجیے ہم علامہ اقبال کے پورے احترام کے باوجود ان کو پیغمبر یا صحابی نہیں سمجھتے وہ مسلمانوں کے عظیم مفکر تھے۔ ان کو ایک غلط بات پہنچی اور انہوں نے اس سے متاثر ہوکر فوراً ایک نظم لکھ دی اور پھر حضرت مدنیؒ کی تقریر کے الفاظ ہیں "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے لفظ تھے اور علامہ اقبالؒ نے "ملت از وطن است" استعمال کیا ہے اور پھر اس نظم میں حضرت مدنیؒ کی توجہ کی گئی ہے مگر دیوبند کو خراج تحسین پیش کیا ہے ———— اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسی پاکستان میں ایوب خان کے زمانے میں تحریک جمہوریت کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان تھے اور ان کے تحت تمام مسلم لیگیں اور دیگر جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ مس فاطمہ جناح کے پشاور میں استقبال میں عبدالولی خان کے علاوہ کوئی آگے نہ آیا اور لاکھوں کے جلسہ کی صدارت خان صاحب موصوف نے کی اور مس فاطمہ جناح نے خطاب فرمایا۔ مغربی پاکستان (ون یونٹ) کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان بنے۔ مفتی محمودؒ صاحب سرحد کے وزیراعلیٰ رہے اور آجکل مرکزی آسمبلی میں قائد حزب اختلاف ہیں کیا ان سب باتوں کے بعد بھی اس بات میں کوئی وزن رہ جاتا ہے کہ فلاں کانگریسی تھا یا پاکستان کا مخالف تھا اور اب مولانا محمد ضیاءالقاسمی اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر اور مولانا غلام غوث ہزاروی حکومت کے حلیف ہیں لیکن شقاوتِ قلبی اور ذہنی تعیش کا کیا علاج کہ یہ بات ہمیشہ دہرائی جاتی ہے ، ان لوگوں کو یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ پاکستان بنانے میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ، حضرت مفتی محمد حسن امرتسری اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تقریباً سبھی خلفاء قائدانہ حیثیت رکھتے تھے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان کی حمایت نہ کرتے تو شاید پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوتا۔ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بانی پاکستان کی نماز جنازہ پڑھائی کراچی میں پرچم کشائی علامہ شبیر احمدؒ نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے کی۔

لہو پکارے گا آستین کا

گزشتہ سطور میں تو ہم نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مذہبی یا سیاسی مغالطے کے طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اب یہاں ہم ایک ایسے مختصر سے گروہ کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے آپ کو سواد اعظم سمجھتا ہے اور اس لیے

لے موصوف حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مرید تھے۔

میں مبتلا ہے کہ شاید پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہے ۔ حرمین شریفین کے اماموں کی پاکستان میں تشریف آوری نے کیا ان کی آنکھیں نہیں کھول دیں ۔ اس مختصر سے گروہ کے سرخیل اور اکابر کا (جن میں سے ایک کی عبارت "گنگلوں والی" اوپر پیش کی جا چکی ہے) فتویٰ یہ ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اگر یہ لوگ کافر ہیں تو پھر کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ لائلپور، حیدرآباد میں (سب ملاکر ایک کروڑ کی تعداد میں) جن مسلمانوں نے امام حرم کے پیچھے نماز ادا کی ہے ۔ وہ سوادِ اعظم تو یقیناً ہے لیکن ان عقائد کا حامل نہیں جن کو آپ اصل اسلام سمجھتے ہیں اب ہم یہاں ان حضرات کے چند فتوے نقل کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ کی کیا خدمات سرانجام دیتے رہے ہے ۔

امیرالمومنین حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا شیخ الہندؒ حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی رحمہم اللہ اجمعین کے متعلق ان کے فتویٰ کی عبارت تو ادب عالیہ کا ایسا مرقع ہے کہ جس کی داد نہیں دیجا سکتی ؛ ایک فتوٰے پڑھیئے

(۱) "خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ طائفے سب کے سب کافر و مرتد ہیں باجماع امت اسلام سے خارج ہیں۔ (حسام الحرمین) صـ۱۱۳) (۲) سید احمد خلیل احمد، رشید احمد، اشرف علی کے کفر میں جو شک کرے خود کافر (۳) اس میں (حسام الحرمین) نانوتوی و دیوبندیوں کی نسبت صاف تصریح ہے کہ من شک فی کفرہ فقد کفر جو ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے" (عرفان شریعت صـ۲۴، ج ۲) حمد و صلوٰۃ کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ طائفے جن کا تذکرہ سوال میں واقع ہے غلام احمد قادیانی ۔ اور رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد انبیٹھوی اور اور اشرف علی وغیرہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی نہ کسی حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اس کے کفر میں شک نہیں (حسام الحرمین صـ۴۳)

یہاں تک مولانا احمد رضا خان کے فتوے ہیں اب ایک مشہور و معروف کتاب تجانب اہل السنۃ[1] سے چند فتوے نقل کیے جاتے ہیں ۔

مولانا شبلی نعمانیؒ

اور ان صلح کل نیچری لیڈروں کا مقصد سیاست کے پردے میں بے دینی و دہریت پھیلانا ہے ان صلح کل لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی بہت نمایاں ہستی رکھتے ہیں ۔ صـ۲۸۹

صلح کلیہ نابکار جو اللہ اور رسول جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی توہینیں و صریح تکذیبیں کرنے والوں

---

[1] یہ کتاب ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوئی جس کے مؤلف مولوی محمد طیب صاحب داناپوری فاضل مرکزی مدرسہ حزب الاحناف لاہور ہیں اور اس پر منجملہ اور تقریظات کے مظہر اعلیحضرت مولوی حشمت علی کی تقریظ بھی ہے

ع

کے کفر و ارتداد کو چھپانے ان کی تکفیر شرعی کو غلط و باطل ٹھیرانے کے لیے اپنی صلح کلیت بکمارست اہل ہ سب بحکم شریعت مطہرہ کافرین ہیں۔ ص ۲۰۳
شبلی اعظم گڑھی کی نیچریت و وہابیت اس کی کتابوں سیرۃ النبی و الفاروق و سیرۃ النعمان میں اپنے زندیقی کرشموں کی بہار و الحادی بو ہزلی کی بہار دکھا رہی ہے ص ۲۸۹

مولانا حالی

حالی نے امام الوہابیہ کی شاگردی میں ان سب کفروں کا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علی آلہ وسلم پر افترار کردیا۔ ص ۲۹۹، تو اس بیدین قائل کو (حالی کو) کافر مرتد ماننا پڑے گا۔ ص ۳۰۲،
مسٹر حالی کے اس مسدس میں بیسیوں کفریات کے انبار ہیں اور ہزاروں ضلالات کے طومار،
مولانا الطاف حسین حالی پر یہ غیظ و غضب مسدس لکھنے پر ہے جیسا کہ اوپر ظاہر ہوا اور مسدس حالی موصوف کا وہ شاہکار ہے جس کے دو اشعار یہ ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ، اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

شاید مولوی حشمت علی وغیرہ کو مولانا حالی پر اس لیے غصہ آیا کہ اس نے اس مسدس میں یہ شعر بھی کہا تھا۔ مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں عبادت کریں شوق سے جس کی چاہیں
اور مولوی حشمت علی صاحب کا اس بارے میں کیا مذہب ہے وہ " اصلاح بہشتی زیور" کی عبارت میں گزر چکا

علامہ اقبال

مسلمانان اہل سنت خود ہی انصاف کرلیں کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے" ص ۳۲۲، ہم نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر صاحب ایسے عقائد رکھتے ہوئے کیسے مسلمان ہیں ڈاکٹر صاحب کے اسلام کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اگر ان اعتقادات کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی اور اسلام گھڑ لیا ہے اور وہ اپنے اس گھڑے ہوئے اسلام کی بنار پر مسلمان ہیں"۔ ص ۳۲۳
سائنس کے یہی وہ وہمیات کاذبہ اور خرافات باطلہ در حسب بشارت ڈاکٹر اقبال جیسا ایمان حقیقت جب حضرات علمائے اہل سنت کی درسگاہ میں بے ارشاد غیر لازم ہے، کتاب مذکور ص ۹ کر کے صفحہ ۱۷ پر ہے
مرتبہ ... ہند کرکے ایمان ہے"

آئے اور ان پر بھروسہ کرکے ارشادات الٰہیہ کو جھٹلائے" بحکم شریعت مطہرہ یقیناً بے ایمان و بے دین ہے" صہ۲۳
شاید ایسی باتوں کو دیکھ کر ڈاکٹر مرحوم نے کہا تھا۔ ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملاں ہیں کیوں ننگ مسلمانی

مولوی دیدار علی صاحب کا تکفیری فتویٰ جو انہوں نے علامہ اقبال کے متعلق دیا تھا وہ مشہور و معروف ہے جس پر علامہ اقبال نے مبارکباد دی۔ ؎

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے — کہ یک زبان ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

جو لوگ شیخ الاسلام حضرت مدنی کے متعلق علامہ اقبال کے اشعار سٹیج پر لہرا لہرا کر گا گا کر پڑھتے ہیں ان سے سوال ہے کہ تمہارے بزرگوں کا علامہ اقبال کے متعلق تو یہ فتویٰ تھا کہ وہ نعوذ باللہ کافر تھے۔ جناب آپ کے ہاں تو علامہ اقبال کا اسلام ہی معتبر نہیں، پہلے ان کا اسلام تو ثابت کیجئے۔ ہمارے اکابر کا علامہ سے کیا تعلق تھا وہ اسی پرچے میں پڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت مدنی یا اکابر دیوبند میں سے کسی نے ان کے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار نہیں فرمایا

سیرت کمیٹی

قاضی عبدالمجید قریشی (پٹی ضلع لاہور) نے سیرت کمیٹی کے نام سے ایک مرکزی کمیٹی بنائی تھی۔ آج جو سیرت و میلاد کے جلسے جلوس نکلتے ہیں اسکا بطور تحریک انہوں نے آغاز کیا اب ملاحظہ فرمائیے کہ مولوی حشمت علی صاحب ان کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔

"سیرت کمیٹی درحقیقت "خباثت کمیٹی" اور حسب زبان شریعت مطہرہ "ضلالت کمیٹی" اور بحکم قرآن عظیم "کمیٹی" اور بلحاظ نتیجۃً "ردت کمیٹی" اور عند التحقیق اپنے چہیتے ماں باپ "خلافت کمیٹی" و ندوۃ کی لاڈلی بیٹی ہے"۔ (راز سیرت کمیٹی مطبوعہ سلطانی پریس بمبئی صہ۱) "جس سیرت کمیٹی کا سنگ بنیاد یہ کفر و ارتداد، دہریت و الحاد کفار و مشرکین و منافقین و مرتدین کے ساتھ کھال میل اور اتحاد ہے اس کی تمامتر کارروائیاں مخالف شریعت منافی اسلام ہی ہوں گی سیرت کمیٹی کے اسی بنیاد کفر و ارتداد و زندقہ و الحاد کا نتیجہ ہے کہ اس کمیٹی کی طرف سے جو متعدد رسائل شائع ہوئے ان میں بکثرت کفریات و ضلالات واقع ہوئے" صہ۷ بحکم شریعت مطہرہ مسلمانوں کو سیرت کمیٹی میں [illegible]ل ہونا اور اس کا [illegible] حرام، حرام، حرام صہ۵۵

۱ے۔ مولوی [illegible] کات [illegible]

ص

سرسید کے نورتن

جس طرح بے دین بادشاہ اکبر نے اپنے نورتن بنائے تھے جو اس کے وزیران حکومت اور مشیران سلطنت تھے، اسی طرح پیر نیچر نے بھی اپنے نورتن بنا رکھے تھے جو پیر نیچر کے وزیران نیچریت اور مشیران دہریت اور مبلغین زندیقیت تھے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نواب محسن الملک مہدی علی خان ۲۔ نواب اعظم یار جنگ ۳۔ مولوی چراغ علی خان ۴۔ نواب انتصار جنگ ———— ۵۔ مولوی مشتاق حسین ۶۔ مولانا الطاف حسین حالی ۷۔ شمس العلماء مولوی ذکا اللہ ۸۔ مولوی مہدی حسن ۹۔ سید محمود خان ۱۰۔ شبلی نعمانی آف اعظم گڑھی ۱۱۔ ڈپٹی نذیر احمد خان دہلوی (تجانب اہل السنۃ ص۸۶۔۸۷)

خواجہ حسن نظامی

"خواجگی کے دعویدار، کفر کی تبلیغ کے ٹھیکیدار، اسلام کی مخالفت کے علمبردار، کرشن کنہیا کے اُمتی، مسٹر کوہی خواجہ حسن نظامی" (حوالہ مذکور ص۱۳۱)

شاہ ابن سعود مرحوم

کتاب مذکور میں ص۲۵۶، ص۱۵۹ پر شاہ ابن سعود مرحوم کو "ابن سعود خذلہ الملک المعبود اور ابن سعود قمہ الملک الودود کے "معزز القاب" سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے "کفار نجد کے اس مجموعہ خبیثہ میں تو بھی بجز کفریات قطعیہ و ارتدادات یقینیہ اسلے گجبے بھر رہے ہیں مگر آدمی کے کافر و مرتد ہو جانے کیلیے معاذ اللہ ایک ہی کفر و ارتداد بس ہے" (کتاب مذکور ص۱۶۳)

حج فرض نہیں

مولانا احمد رضا خاں نے ایک کتاب "تنویر الحجۃ بمن یجوز التواء الحجۃ" رقم فرمائی اس کی ایک عبارت "جب یہ معلوم ہو گیا تو ہم کہتے ہیں اور بجزم یقین کہتے ہیں کہ آج جب کہ حجاز مقدس میں ابن سعود منحوس و نامسعود و مخذول و مطرود و مردود اور اس کے ہمراہیان نامحمود کا تمس وزود ہے اور حسب بیان سائل فاضل و دیگر کثیر حضرات حجاج و افاضل امان مفقود ہے، فرضیت ساقط ہے یا ادا غیر لازم ہے" (کتاب مذکور ص۹)

قائد اعظم

"تجانب اہلسنت" سے آخری دو حوالے پیش کر کے ختم کرتے ہیں :

۱۔ "اور مسٹر جناح ان کا قائد اعظم ہے اگر صرف انھیں دو کفروں پر اکتفا کرتا تو قائد اعظم کی خصوصیت ہی کیا رہتی لہٰذا وہ اپنی اسپیچوں، اپنے لکچروں میں نئے نئے کفریات قطعیہ بکتا رہتا ہے" تجانب اہل سنّۃ ص۱۱۹

۲۔ "بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ خبیثہ کی بنار پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے۔ وہ بھی کافر و مرتد اور شرالقاتم اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام" (کتاب مذکور ص۱۲۲)

ان تمام فتوؤں کو جو مذکور ہوئے پڑھیے پھر سوچیے کہ اس کے بعد پوری دنیا میں اس مختصر گروہ کے علاوہ کوئی فرد مسلمان رہ سکتا ہے۔ شیخ العرب و العجم حضرت مدنیؒ کو تو مسلم لیگ اور قائد اعظم سے سیاسی نظریاتی اختلاف تھا بلکہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کا اشتراک بھی ہوا (جو اگرچہ بوجوہ ختم ہو گیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)

... ہمارا یہ خیال نہ تھا کہ اس قصے کو طول دیں اور اپنے اس نمبر میں ان فتاوٰی کو جگہ دیں لیکن صرف یہ بتانے کے لیے کہ جو لوگ آج آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں ان کی خدمات سے بھی قارئین واقف ہو سکیں کہ

تعرف الاشیاء باضدادھا — اشیاء اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں

یہ لوگ جن کے فتاوٰی کا ذکر ہوا ان حضرات کو برصغیر کی ان اسلام دشمن طاقتوں کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ تھا جو اسلام کے خلاف برسرپیکار تھیں۔ عیسائیوں کو ہر ہر محاذ پر شکست دی تو علماء حق اکابر دیوبند نے آریہ سماجیوں سے مناظرے کیے تو اکابر دیوبند نے (ہم مولانا ثناء اللہؒ کو بھی اسی قافلے کا راہی سمجھتے ہیں کہ وہ دیوبند میں پڑھتے رہے ہیں) انگریز سے لڑائی لڑی تو اسی گروہ نے قائدانہ حصہ لیا۔ اگر کسی نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ میدان میں آئے۔ لاہور کے ایک کالج کے پرنسپل نے حضورؐ کی شان میں بے ادبی کے الفاظ کہے تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہزاروں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانی سمندر کو رات کے بارہ بجے کالج لے گئے۔ قرآن و حدیث کی خدمت و اشاعت کا سہرا انہی کے سر رہا۔ یہاں ہم بطور شہادت مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ہمنوا و ہم مشرب لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر سید حبیب صاحب کی رائے بطور :

الفضل ما شہدت بہ الاعداء درج کرتے ہیں

"جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند کے متدینین و متقین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان ساعی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دین حنیف، علوم عربیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کے چرچے بحمدہٖ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں (سیاست لاہور ۲۷ جون ۱۹۲۷ء)

ایک دوسرا اخبار "عصر جدید" کلکتہ لکھتا ہے:

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض تو اعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی دلکشی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کر دیا تھا جب کہ دنیاوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی جبکہ لوگ مذہب سے بے پرواہ اور مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے اور قال اللہ و قال الرسولؐ کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے مغلوب ہو چکی تھی۔ اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا۔ ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا۔ فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کر سکی نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رَو میں اسے بہا لے جائے مگر کسمپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور زنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیان قرآن و حدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد جمع ہیں۔" (عصر جدید کلکتہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

تبلیغی جماعت

یوں تو بالاستقلال دارالعلوم ایک تبلیغی تحریک ہے تاہم اسی دارالعلوم کے ایک نامور فرزند حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی تبلیغی تحریک میں اپنے سوز دروں سے جو رُوح پھونکی مش

اور ان کے نامور فرزند حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ نے اس کو جس معراج پر پہنچایا وہ کسی تعارف و تبصرہ یا تائید کی محتاج نہیں۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تبلیغی جماعت اس دور کی سب سے بڑی بین الاقوامی تبلیغی تحریک ہے جس کے افراد آج پوری دنیا کے ہر ملک میں نہایت خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے دین کی اشاعت میں مصروف ہیں جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ کروڑ پتی تاجر، فوج کے جنرل، بڑے بڑے آفیسر، علماء وصلحا اپنا سامان اپنے کندھوں پر اٹھاتے پوری دنیا میں یہ کام کر رہے ہیں اور حیرت در حیرت کی بات یہ کہ اس جماعت کا کوئی اخبار نہیں۔ روداد نہیں، ممبر سازی نہیں، چندہ نہیں جھنڈا نہیں۔ جماعتوں کے معروف قواعد و ضوابط میں سے ان کے ہاں کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں۔

اللہ تعالےٰ کی نصرت

اکابر و مشائخ دیوبند ایمانی و احسانی کمال صبر و شکر اور خلوص و للّٰہیت کے پیکر تھے اور جس پیغمبر کی سنتوں اور سیرت کو عام کرنے کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا اس نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ورفعنا لك ذكرك — اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا

تو اس کے نام لیواؤں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور تائید سے نوازا اور ان کے کام میں اتنی برکت عنایت فرمائی کہ اسے تائید ایزدی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی نظر دنیاوی مفاد کے بجائے "ان اجری الا علی اللہ" پر رہی۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے پر اپنے آپ کو ڈال دیا تو اللہ تعالےٰ نے راستے ان پر کشادہ فرما دیئے۔

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا وان الله لمع المحسنين — اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو سیدھے راستوں پر چلاتے ہیں۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

شیخ الہندؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا اور ساتھ ساتھ عملی جہاد بھی کیا اس ترجمے کو کہ جس کے حواشی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھے۔ اتنی قبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے اب تک لاکھوں نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ صرف پاکستان میں سات آٹھ کمپنیوں نے اسے شائع کیا ہے۔ ہانگ کانگ اور جرمنی سے شائع ہوا۔ حکومت افغانستان نے اس کے ترجمے اور حواشی کو فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کرایا ـــ حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو کئی ناشر شائع کر چکے ہیں۔ بہشتی زیور کو پندرہ بیس ناشر شائع کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کے فضائل کے رسائل بنام "تبلیغی نصاب" پندرہ سولہ سال کے عرصے میں دس بارہ لاکھ شائع ہو

ت ـــــــ

چکے ہیں........... یہ سب کچھ کیا ہے. اور کیوں ہے ؟
اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ صد سال پیشتر دے چکے ہیں.
من کان للہ کان اللہ لہٗ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے.
اور اس پر برصغیر کا ذرہ ذرہ شاہد عدل ہے
اور علمائے دیوبند کی عنداللہ مقبولیت کو مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں یوں بھی خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے :

"نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمس کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔"

(تذکرہ صـ ٦٦)

اکرام القادری

شہرہ جہاں میں عام ہے دارالعلوم کا
الہام پر قیام ہے دارالعلوم کا

اس کا وجود عظمتِ اسلام کی دلیل
کتنا بلند مقام ہے دارالعلوم کا

محمودؒ ہو، حسینؒ ہو، قاسمؒ ہو یا رشیدؒ
روشن انہی سے نام ہے دارالعلوم کا

جس کو ہُوا نصیب وہاں درسِ آگہی
وہ تیغ بے نیام ہے دارالعلوم کا

شاخیں نگر نگر میں ہیں دارالعلوم کی
کیسا عظیم کام ہے دارالعلوم کا

بٹتا ہے اب بھی بادۂ عرفاں شبانہ روز
گردش میں اب بھی جام ہے دارالعلوم کا

دُشنامیوں کا طائفہ، افرنگ کے غلام
کیا جانیں کیا مقام ہے دارالعلوم کا

تبلیغ دینِ خواجۂ گیہاں شعارِ خاص
یہ کام صبح و شام ہے دارالعلوم کا

تاریکیوں میں اس نے جلائی ہیں مشعلیں
یہ شغل مدام ہے دارالعلوم کا

چرچا ہُوا ہے دینِ محمدؐ کا چار کھونٹ
یہ ہی تو فیضِ عام ہے دارالعلوم کا

روشن قلوب میں ہیں چراغِ علوم و فن
یہ حسنِ اہتمام ہے دارالعلوم کا

چڑھتا نہیں گناہ پہ یاں نیکیوں کا جھول
پیغامِ حق پیام ہے دارالعلوم کا

ہر آنکھ میں اسی سے ہے شرم و حیا کا رنگ
ہر دل میں احترام ہے دارالعلوم کا

ہے امن و آشتی کی بنا اس کے نام سے
دارالسلام نام ہے دارالعلوم کا

اکرامؔ مجھ سا ننگِ بزرگانِ دیوبندؒ
ادنیٰ سا اک غلام ہے دارالعلوم کا

تصانیف حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم و دیگر مطبوعات

1- احسن الکلام فی ترک قراۃ الفاتحہ خلف الامام مکمل مجلد . . .
2- المنہاج الواضح یعنی راہ سنت فی رد بدعات . . 21.00
3- ہدایت المرتاب الی طریق الصواب یعنی راہ ہدایت (فی تحقیق المعجزات و الکرامات) قسم اول 4.50
قسم دوم 3.60
4- تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر و الناظر یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک . . 6.75
5- مقام حضرت امام ابو حنیفہ مجلد 18.00
غیر مجلد 12.00
6- باب جنت بجواب راہ جنت ختم
7- گلدستہ توحید فی رد شرک 8.75
8- دل کا سرور، مسئلہ مختار کل . . 6.00
9- تبلیغ اسلام، حصہ اول . . 3.00
10- ضوء السراج فی تحقیق المعراج موسوم بہ چراغ کی روشنی . . 2.25
11- عیسائیت کا پس منظر . . 2.50
12- انکار حدیث کے نتائج . . 5.62
13- صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام، حصہ اول . . 5.62
14- عبارات اکابر حصہ اول . .
15- الطیب الکلام ملخص احسن الکلام 2.25
16- رسالہ تراویح . . 1.62
17- کھلی تحریری مناظرہ . . 3.37
18- عقیدۃ الطحاوی . . 2.25
19- مودودی کا غلط فتویٰ . . 1.12
20- ملا علی قاری اور مسئلہ علم غیب 1.12
21- حکم الذکر بالجہر . . 8.00
22- دلیل المشرکین مترجم . . 8.00
23- تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین . . 6.75
24- بانی دارالعلوم دیوبند . . 2.25
25- تحقیق الدعا اور نماز جنازہ . . 3.36
26- چالیس دعائیں . .
27- آئینہ محمدی . . 1.12
28- حلیۃ المسلمین معہ رسالہ اعفاء اللحیہ
29- درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ 1.94
30- چہل مسئلہ حضرات بریلویہ . . 1.50
31- مسئلہ قربانی مع رسالہ سیف یزدانی 2.25
32- نماز مسنون مترجم مع اذکار و ادعیہ . . 1.12
33- مسئلہ طلاق ثلاثہ . . 4.00
34- تسکین الصدور . . 9.00
35- فیوضات حسینی . . 9.00
36- بیان ازہر . . 1.12
37- الطاف القدس فارسی معہ ترجمہ اردو از شاہ ولی اللہ . . 5.25
38- تکمیل الاذہان (عربی) از شاہ رفیع الدین . . 5.75
39- اسرار محبت (عربی) . . 4.75
40- تفسیر آیت نور (عربی) . . 1.50
41- طائفہ منصورہ
42- الکلام الحاوی فی عبارۃ الطحاوی (ختم)
43- ازالۃ الریب عن مسئلہ علم غیب
44- تحدیہ صبائیت قسم اول 3.50
قسم ثانی 2.50
45- دمغ الباطل از شاہ رفیع الدین 50.00
46- مجموعہ رسائل . . . (ختم)

ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ (پاکستان)

لاہور میں ملنے کا پتہ، مکتبہ تنویر القرآن، اردو بازار لاہور

ہم
اہلِ میانچنوں کی جانب سے
ادارہ الرشید کو
عالم اسلام کی عظیم دانشگاہ
دارالعلوم دیوبند
سے متعلق عظیم تاریخی نمبر نکالنے پر بصمیمِ قلب
مبارکباد پیش کرتے ہیں!
مولانا رشید احمد ● میاں محمد ثنا اللہ بودلہ ● حاجی اللہ رکھا
حاجی عبد العزیز ● حافظ عبد الحق عابد ● چوہدری رحمت علی ورک
حاجی سجاد احمد خان ● ملک افتخار احمد ● چوہدری نذیر احمد جاوید
عبد اللہ سلام ● چوہدری غلام علی آزاد ● بشیر احمد خادم ایڈووکیٹ

تاریخ ساز تاریخی کُتب

تحریکِ شیخ الہند رحمۃ اللہ

قیمت مجلد ۲۵ روپے

انگریزی سرکار کی زبان میں

ریشمی خطوط سازش کیس اور کون کیا تھا؟

انڈیا آفس لندن میں محفوظ ریکارڈ کا اردو ترجمہ

مقدمات و بیاناتِ اکابر

قیمت مجلد ۲۵ روپے

مقدمہ کراچی و مقدمہ کلکتہ | مولانا محمد علی جوہر حضرت مدنی، مولانا آزاد
برصغیر کی آزادی کا سنگ میل ثابت ہوئے | کے بیانات حق و جرأت کے تاریخی شاہکار

مکاتیب سید احمد شہید

قیمت مجلد ۳۰ روپے

حضرت سید احمد شہید بحیثیت امیر المومنین جو فرامین جاری کیے

یا جو عرضداشتیں ان کے نام آئیں —— فارسی مخطوطہ کا پہلی دفعہ عکس۔

بیس (۲۰) بڑے مسلمان

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی	مولانا محمد قاسم نانوتوی
مولانا رشید احمد گنگوہی	شیخ الہند مولانا محمود حسن
مولانا اشرف علی تھانوی	علامہ محمد انور شاہ کشمیری
مولانا عبید اللہ سندھی	مفتی کفایت اللہ دہلوی
مولانا سید حسین احمد مدنی	علامہ شبیر احمد عثمانی
مولانا محمد الیاس دہلوی	مولانا شیخ عبد القادر رائپوری
مولانا احمد علی لاہوری	مفتی محمد حسن امرتسری
مولانا ابو الکلام آزاد	مولانا محمد علی جوہر
مولانا سید سلیمان ندوی	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	سردار احمد خان پتافی

اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا اثر ہے کہ اتنی بڑی کتاب کا تیسرا ایڈیشن طبع ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس میں مندرجہ بالا حضرات کی مستند سوانح کے علاوہ علم و عمل اور تزکیہ و تصوف سیاست و مذہب اور علم و ادب کی ایسی چاشنی شامل ہو گئی ہے کہ کتاب ایک شیخ اور مربی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نے سہارنپور پہنچی بعد از عصر کی مجلس میں بالاستیعاب تمام کتاب کئی روز میں ختم کر کے مرتب کو ایسا خط لکھا جو مرتب کے لیے فخر کی پونجی ہے قیمت ۶۰ روپے

تاریخِ حدیث

از

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

ڈاکٹر برق صاحب کا شمار منکرین حدیث میں ہوتا رہا۔ آپ کی پیدائش و پرورش سنی گھرانے میں ہوئی۔ بعد میں تحقیقات کی روشنی میں دور نکل گئے لیکن خدا کے فضل و کرم نے ان کی دستگیری کی کہ انہوں نے ادھر ادھر کا چکر لگا کر اپنی گمشدہ متاع حکمت کو دوبارہ پا لیا اور تلافیٔ مافات کے طور پر تاریخِ حدیث لکھی اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ ہمارے ناقص خیال میں طلباء حدیث کے لیے نادر اور انمول تحفہ ہے۔ عام قیمت ۱۵ روپے

ہر قسم پر پیشگی پوری آنا ضروری ہے۔ اسطرح محصول ڈاک کی —— رعایت بھی ہو گی

مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ ۳۲-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

دارالعلوم دیوبند کے طرز پر پاکستان کی ممتاز دینی درس گاہ
دارُالعلوم کراچی
بانی و صدر
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی اعظم پاکستان
شعبہ جات ایک نظر میں
درسِ نظامی جس میں ہر سال پاکستان، برما، ایران، افغانستان، افریقہ، اور دوسرے ممالک کے تقریباً دو سو طلبہ قیام و طعام کی مفت سہولتوں کے ساتھ اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں
درجۂ تخصص۔ جس میں صاحبِ استعداد علماء فتویٰ اور تصنیف و تالیف کی تربیت پاتے ہیں۔
دارالافتاء۔ جو ملک بھر میں فتویٰ کا سب سے بڑا مرکز ہے، اور اطرافِ عالم کے لئے ایک لاکھ فتاویٰ جاری کر چکا ہے۔
درجۂ تجوید و قرأت جس میں تجوید و قرأت کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے
درجۂ حفظ۔ جس میں قرآن کریم حفظ کرانے کا انتظام ہے۔
مدرسہ ابتدائیہ۔ جس میں سرکاری پرائمری کے ساتھ قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔
دارالتربیت۔ جس میں کمسن بچے ماہر اتالیقوں کی زیرِ نگرانی ٹھیٹھ اسلامی تربیت حاصل کرتے ہیں۔
نظامِ مکاتب۔ جس کے تحت کراچی اور حیدرآباد میں بیس مکاتب قائم ہیں جن میں ۲۸۰۰ بچے زیرِ تعلیم ہیں
البلاغ۔ علمی و تبلیغی ماہنامہ جو اپنے بلند معیارِ صحافت کے لئے معروف ہے۔
دارالتصنیف۔ جس میں اصلاحی اور تحقیقی کتابوں کی تالیف، ترجمے اور نشر و اشاعت کا انتظام ہے اور جس نے عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں گرانقدر کتابیں شائع کی ہیں۔
کتب خانہ۔ جس میں اب تک مختلف علوم و فنون کی اٹھارہ ہزار کتابیں مخطوطات جمع ہو چکے ہیں۔
کراچی کی ایک پر فضا بستی میں، ۱۵ ایکڑ رقبۂ زمین پر ایک عظیم دینی درس گاہ جو خاموشی سے خدمتِ دین میں مصروف ہے۔
دارالعلوم کے سالانہ مصارف تقریباً پانچ لاکھ روپیہ میں جو بفضلہ تعالیٰ مسلمانوں کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔ یہ عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔
پتہ
دارالعلوم کورنگی : کراچی ــــ ۱۴

هدیۂ تبریک
بآں گروہے کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند
ہم مسلمانان گلاسگو برطانیہ کی جانب سے ——
کارکنان ماہنامہ "الرّشید"
اور ارکان جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو
دار العلوم دیوبند نمبر
شائع کرنے پر خلوص قلب سے
مبارکباد پیش کرتے ہیں
خاکپائے اکابر دیوبند
حافظ شفیق احمد، رانا کفایت اللہ، حاجی ولی محمد، حاجی فضل محمود اکبر، حاجی محمد بخش
گلاسگو سکاٹ لینڈ

محافظِ ختمِ نبوّۃ — و — محافظِ ناموسِ صحابہؓ

—— اور ——

ملتِ اسلامیہ کی ایک صدی سے خدمت کرنے والے

ادارہ دارالعُلوم دیوبند

کی خدمات کو اجاگر کرنے کی خاطر خصوصی شمارہ شائع کرنے پر ماہنامہ "الرشید" اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو ہم دل کی گہرائیوں سے سلام کرتے ہیں
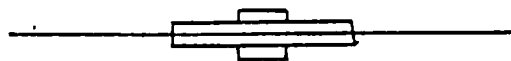
عبدالشکور دین پوری (صدر) عبدالمجید ندیم (ناظم اعلیٰ)

مجلس تحفظِ حقوقِ اہلِ سُنّت — پاکستان

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند !
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم !

دارالعلوم دیوبند اپنی عالمگیر شہرت و ناموری کی وجہ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ اس کا نام لے کر یا کام پیش کر کے اسے پہنچوایا جائے البتہ اس کی یہ غیر معمولی شہرت و عظمت ہی اس کی ضرور متقضی ہوتی ہے کہ اب تک جیسے اسے کانوں سے سنتے اور دلوں سے سمجھتے آئے ہیں کاش ایک نگاہ اس کو دیکھ بھی لیتے۔ چنانچہ اس کے لئے لوگ دور دراز سے سفر کر کے دیوبند آتے ہیں اور اسے دیکھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جس سے دلوں کو مزید طمانیت و تسکین حاصل ہوتی ہے۔ کوئی اس کے علم و تعلیم سے متاثر ہوتا ہے تو وہ درسگاہوں کا چکر لگاتا ہے کوئی اس کے نظم و نسق سے اثر لیتا ہے تو وہ انتظامی دفاتر میں گھوم گھوم کر اس کا انتظامی لائحہ عمل دیکھتا ہے۔ کوئی اس کے غیر معمولی ذخیرہ کتب قلمی و غیر قلمی سے شغف لیتا ہے تو وہ اس کے کتب خانہ کی شاندار عمارت کی طرف دوڑتا ہے۔ کوئی اس کے حسابات کی صفائی سے مسرور ہوتا ہے تو وہ دفتر حساب محاسبی اوقاف اور مطبخ وغیرہ کی عمارتوں میں گھومتا ہے اور کوئی اس کے مرکزی نظم و تنظیم پر نگاہ جماتا ہے تو وہ مرکز نظم دارہ اہتمام کی عمارت میں آکر بیٹھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے غرض کاموں کے رنگ رنگ ہونے سے کاموں سے متعلقہ مکانات اور عمارات میں پہنچ کر حسب التفات خاطر کاموں کے نقوش دیکھنے ہی سے ہر ایک کو تسلی ہوتی ہے۔ لیکن ملک کے کروڑوں انسانوں میں سے معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو دور دراز سفر کی سہولتیں بہم پہنچا کر دارالعلوم کے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کر پاتے ہیں ورنہ اکثریت ان ہی بندگان خدا کی ہے جو عمر بھر دارالعلوم کے شوق دیدار کے جذبات دل کے دل ہی میں لئے ہوئے ہیں مگر یہاں پہنچ کر دیدار کرنے کی مالی استعداد نہیں رکھتے ان کے ان ہی جذبات شوق کی تسکین کے لئے دارالعلوم نے اپنی ممتاز اور شاندار عمارات کے فوٹو تیار کرنے کا فیصلہ کیا اور زر کثیر صرف کر کے ان مخلصین کے شوق کا مداوا کرتے ہوئے دارالعلوم کی وسیع اور پرشکوہ درسگاہوں شاندار دفاتر انتظامی شعبہ جات کے مراکز اور خصوصی مقامات کے فوٹوؤں کا ایک مجموعہ (البم) تیار کیا جو **"آئینۂ دارالعلوم"** کے نام سے آپ کے سامنے ہے تاکہ جس طرح آئینہ کسی چیز کا عکس دکھلا کر اس کی اصل سے روشناس کرا دیتا ہے۔ اسی طرح دارالعلوم کی عمارات کا یہ کاغذی آئینہ اس کی تعمیرات کا عکس دکھلا کر شائقین کو اصل کے دیدار کا کسی حد تک لطف بہم پہنچا سکے گا اور اس کے نادیدہ مخلصین جس مرکزی درسگاہ کا نام اور کام اپنے کانوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک گھر بیٹھے آنکھوں سے بھی دیکھ لیں گے۔

یہ ضرور ہے کہ عکس دیکھ کر اصل کے دیکھنے کی بیتابیاں اور بڑھ جائیں گی لیکن جہاں یہ شوق دیدار کے جذبات بھڑکیں گے وہیں فی الجملہ

یہ تسلی بھی حاصل ہوگی کہ کم از کم اصل کے خط و خال کا فی الجملہ عکس تو نگاہوں کے سامنے ہے اور اگر کسی بڑی رقم سے وہاں کا سفر دشوار تر ہے تو کم سے کم اس کی بڑھتی ہوئی ترقیات کے ساتھ تعاون اور حسب استطاعت اس کی مالی اعانت تو دشوار نہیں جو دیدار سے زیادہ اہم ہے اس لئے اس آئینہ میں دارالعلوم کی ممتاز عمارات کے یہ ۳۰ عکس پیش کئے جا رہے ہیں اور دفتر جلسہ دستار بندی نے ان عمارات کے آغاز و اختتام کی جو مختصر تاریخ مرتب کی ہے اسے ہر عمارت کے نیچے درج کر دیا گیا ہے جس سے پورے دارالعلوم کی ایک اجمالی تاریخ بطور خلاصہ کے سامنے آجائے گی۔

پس اس آئینہ سے صورتاً تو دارالعلوم محسوس ہوگا اور اس کی اجمالی تاریخ سے دارالعلوم کا کام اور مقصد معلوم ہوگا اور اس طرح مخلصین دارالعلوم کے لئے فکر اور منظر اور حسن و علم دونوں کا سامان بہم پہنچ سکے گا جو اس آئینہ کے بے تعداد جوہروں میں سے چند جوہروں کی نقاب کشائی ہے ورنہ غیر معلوم جوہر معلوم جوہروں سے زیادہ ہیں جو اصل ہی کے دیکھنے سے سامنے آسکتے ہیں۔ بقول اقبال مرحوم:۔

کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں!
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں!

واللہ الموفق لما یحب و یرضی

محمد طیب مدیر دارالعلوم دیوبند
۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸۳ ہجری یوم العید
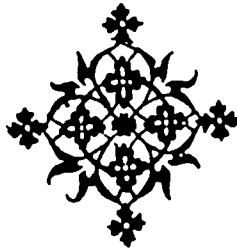
الإهداء

إن الذى سمك السماء بنى لنا
بيتا دعائمه أعز وأطول !!

لسنا بحاجة إلى أن نعرف بهذا المعهد الإسلامى الجليل، فإن منزلته أشهر وأرفع من أن ينوه به. فقد بلغ صيته إلى أرجاء العالم من أقصاها إلى اقصاها ما يغنينا عن سرد خدماته وأعماله الحيوية فقد عرفه كل من له قلب سليم أو ألقى السمع وهو شهيد.

نعم قد تجعل سمعته أفئدة من الناس تهوى إليه فيودون لو قدر الله لهم زيارة هذا المعهد السعيد. فيتهافت عليه الزوار ما استطاعوا إليه سبيلا ويسعدون بزيارته ويالها من شدة اعجابهم به عندما يرونه رأى العين ويالها من شغفهم بخدماته الجلى. فمنهم من يطوف بقاعات الدروس معجبا بدروسه ودراساته، ومنهم من يجول فى المكاتب وهو يتدبر فى نظمها وإدارتها ومنهم من يقضى اوقاته فى مكتبتها الذاخرة السنية مفيدا من كتبها القيمة. ولا يخلو عدد الزوار ممن يسره ما يشاهد فى مكتبى التموين والمحاسبة من دقة فى نظمهما كما لا يفوته زوار يستهويهم نظامه الرئيسى فيقصد مكتب المدير حيث يجلس متمتعا بما يراه من شتيت الأشغال وتوارد الموظفين بصددها. والحق أن لكل وجهة هو موليها يستمتع بما يلائم وسريرته. ومن الطبيعى ان يكون من يرتاد إليه إذا ما أطاق مشاق السفر وتحمل متاعبه مهما كثر عددهم، أضعف عددا ممن أقض عليهم مضاجعهم شوقا الى زيارته ولا يجدون إلى ذلك سبيلا. فقررت دارالعلوم أن تنشر مجموعة من الصور لمبانيها الشامخة حتى يتروى به غليل الراغبين فى زيارتها وصرفت فى هذا السبيل مبالغ طائلة وأتت بمجموعة رائعة تسر الناظرين تحتوى على صور جميع مبانيها من مكتب المدير والمكاتب الاخرى وقاعات الدروس ودور القرآن، والحديث والتفسير وما إلى ذلك نشرتها تحت عنوان " مرآة دارالعلوم " فإنه لمرآة تتجلى فيها دارالعلوم مبانيها ومناظرها لمن احب وتاق إلى زيارة هذا المعهد العظيم.

وقد لا يستبعد أن الصور لتزيد فى الهوى إلا أنها لا تخلوان كونها تاساء وسلوى

إلى حد ما وكيف لا فإنها ترى الناظرين نبذة من لمحات و معالم لما حال دونه تلل الجبال والبيد الصحارى و إذا لم يستطع الزوارات يرتادوا إليه من الأقطار النائية فمابالهم لا يسرعون إلى ما يسعهم من المساهمة والتعاون فى بنائها ورقيها ولعمرى إن ذلك أغلى وأثمن من رؤيتها .

فإليكم أيها الإخوان ، مبانى دارالعلوم الشامخة و مناظرها الخلابة ، ترونها فى هذه المرآة كرأى العين . ولم يفتنا أن نذكر عند كل صورة نبذة من تاريخ المبنى الذى تمثلها هذه الصورة. وقام بهذا العمل المشكور مكتب " دستار بندى " فإذا جمعنا هذه اللمح التاريخية تتمثل لنا دارالعلوم فى تاريخها الوافى، و يجد القراء فى هذا الالبوم ما تريهم مناظر هذا المعهد و تقرب معالمه إليهم مع ما تطلعهم على الأهداف السنية والمرمية إليها وراء تأسيسه . فكفى لنا بهذا روية لعمارات الدار و فكرة عن غاياتها . ولا مراء أن هذه المجموعة لن تكشف للقراء عن جميع ما تحتضنها الدار من الدرر و اللآلى . وأنى لها ذلك ، فهى محض مرآة ليس لها إلا أن تعكس معالم الحبيب فحسب. اللهم إلا أنها لا تقل من أن تعطى للقراء فكرة عما أتى و ياتى به هذا المعهد المبارك .

ربنا وسعت كل شئى رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك وآتنا من لدنك رحمة وهيئ لنا من أمرنا رشدا

محمد طيب
(مدير دارالعلوم ديوبند - الهند)

مشاہیرِ عالم کی نظر میں

علامہ سیّد رشید رضا (مصر)

اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے بہت غمگین واپس جاتا ——————— (تقریر)

"میں نے مدرسہ دیوبند میں جس کو از ہر ہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی رجحان ترقی کرتے دیکھا۔ ہندوستان بھر میں میری آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں حاصل ہوئی اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہوئی جتنی وہاں۔ اس کی وجہ صرف وہ غیرت و اخلاص ہے جو میں نے اس مدرسہ کے علماء میں دیکھا۔" ——————— (بحوالہ رسالہ المنار مصر)

مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم حکومت ہند)

آپ کی یہ درسگاہ دراصل ایک ایسا کارخانہ ہے جو مسلمان کی روحوں کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیئے اس درسگاہ کے اسلاف نے عمل کا جو نمونہ پیش کیا تھا اور جن مقاصد کو لے کر یہ درسگاہ قائم کی تھی اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ شاندار مستقبل اس کے لئے تیار ہے۔ ——————— (تقریر)

"ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ترین ادارے میں نہ صرف یہ کہ اس ملک کے تمام حصوں سے بلکہ بعید تر بن علاقوں مثلاً انڈونیشیا، ملایا، افغانستان، وسط ایشیا اور یمن سے طلبا کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے وسیع رقبہ کے طلبا اور علما میں اس کی مقبولیت اس کی عظمت و شہرت کی دلیل ہے۔ اس بنا پر یہ ادارہ صحیح معنٰی میں تعلیماتِ اسلامی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔" ——————— (معائنہ)

ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند)

"آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ممالک کے طلبا بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر جو کچھ یہاں انہوں نے سیکھا ہے اپنے ممالک میں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سب ہی باشندوں کے لئے قابلِ فخر ہے۔"

" دارالعلوم دیوبند کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم۔ ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں بلکہ پورے

ملک اور دُنیا کی خدمت ہے۔ آج دُنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے۔ اس کا صحیح علاج روحانیت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سکون و اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دُنیا کے لئے مہیا فرما رہے ہیں۔ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دُنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے۔ میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا۔ اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علما، دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انہیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علما اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے اور انہوں نے اپنے وطن عزیز واپس جاکر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔"

مسٹر عبد اللطیف (وزیر عدل وصحت ربا)

"یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے لائق انسان پیدا کئے۔"

محمد عبد الفتاح عودہ (مصر)

"میں نے دیوبند میں اسلام اور سنن و ایمان کا ایک قلعہ دیکھا اور محسوس کیا کہ دین کس طرح دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا ضامن ہوتا ہے اور کس طرح سلف صالح کی تقلید جس کی حفاظت یہاں کے بزرگان دین کر رہے ہیں اور جس سے یہاں کے طلبا فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ایک بیش بہا میراث شمار کی جاسکتی ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس طریقہ کو مضبوطی سے پکڑیں اور مستقبل کی عمارتوں کے لئے اسے بنیاد بنائیں۔"

رشید احمد اسماعیل تکولیا (جوہانسبرگ جنوبی افریقہ)

"انگریزی زبان بولنے والی دنیا میں اس کو (دارالعلوم دیوبند کو) ایٹن اور کیمبرج کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ درجہ اس کی شان کے لئے کمتر ہے۔ دارالعلوم کا مرتبہ دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔"

نیاز برکیز (ترکی)

"لائبریری اور اس کے بیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے

اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا میں اس عمدہ کام پر جو نیاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔"

ایس۔ای ملّان (جنوبی افریقہ)

" دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور ملاحظہ کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی سیاحت وسفر میں کسی جگہ ایسی عظیم الشان مذہبی درسگاہ نہیں دیکھی جو اپنی نوعیت میں ایک مرکزی درسگاہ کہلانے کے قابل ہو۔ موجودہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی ۔"

ڈی جولیس جرمینس (پروفیسر بوڈاپیسٹ یونیورسٹی ہنگری)

" میں نے خود اپنے ملک میں دیوبند کے مدرسہ کے بارے میں سنا۔ مجھے ہمیشہ سے شوق تھا کہ علوم اور اسلامی اسپرٹ (روح) کے اس قلعہ کو دیکھوں۔ ترکی اور مصر کے قدیم مدرسوں کے بعد جو مسجدوں میں قائم کئے جاتے ہیں مجھے عربی اور تعلیمات اسلامی کی اس گہرائی اور جدوجہد کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جو اس مدرسے کے درودیوار میں دائر و سایر ہے ۔"

جناب ابراھیم الجبالی (رئیس وفد جامعہ ازھر مصر)

" ہمیں جامعہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس وتدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب شیخ* شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی، ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پُر کردیا۔ اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔ ہم نے ایک ایسی جماعت دیکھی جس نے علوم دین یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی خدمت کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی ادب، منطق، فلسفہ اور الہیات وغیرہ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ان علوم سے امتِ اسلامیہ کو یہ حضرات نفع پہنچائیں ۔"

پروفیسر گرے ونٹ (آکسفورڈ یونیورسٹی ۔ لندن)

" یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر اب بھی یہاں پوری آب وتاب سے درخشاں ہے۔ ایک مورخ کے لئے اس سے زیادہ روشن مواقع کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

عثمان کیدو (نمائندہ چینی اسلامی نیشنل سالویشن فیڈریشن)

" میرے لئے یہ باعث سعادت ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خالص مذہبی ادارہ ہے جسے ازہرِ مشرق کا خطاب دیا جاسکتا ہے ۔"

(* ۔ اس وقت جب یہ معائنہ لکھا گیا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دارالعلوم کے مدیر تھے۔)

ایم حسن (وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

" یہ (دارالعلوم دیوبند) صحیح معنی میں ایک یونیورسٹی ہے۔ مجھے ہندوستان اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں کے بارے میں ذاتی تجربہ ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کی بہت سی یونیورسٹیاں اس قدیم طرز کی یونیورسٹی سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔"

جناب انوارالسادات (وزیر حکومت مصر و جنرل سکریٹری موتمر اسلامی) حال صدر جمہوریہ مصر

" اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کروں جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منار ثابت ہو۔"

رئیسِ روسی وفد (برائے ہندوستان)

" میں نے یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کو دلچسپی سے دیکھا۔ برّاعظم کے اس حصہ میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی دریا دلی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امن اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہندوستانی عوام اور سوویٹ یونین کے عوام کے درمیان ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔"

امریکی وفد برائے ہندوستان

" ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو نور بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) ضو فشاں ہے۔"

(مختار حسن، عمر حسن احمد، امیر رشید، سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد امریکہ)

جناب علی اصغر حکمت (سفیر ایران برائے ہندوستان)

" اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبد ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نعمت سے نوازا۔ اور یہاں کے اساتذۂ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طیبات سے اس عبد ضعیف کے دل و جان بہرہ ور ہوئے۔ ان کے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا جو کہ بقول " مداد العلماء افضل من دماء الشہداء " (علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے) اپنے دامن میں ربانی برکات اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں۔"

كما يراها قادة العالم!

العلامة السيّد رشيد رضا - رئيس تحريرات مجلة المنار (القاهرة. مصر)

ولو لم أرها (أى دار العلوم الديوبندية) لرجعت من الهند حزينًا (من خطابه)

" انى رأيت فى مدرسة (ديوبند) التى تلقب بأزهر الهند نهضة دينية وعلمية جديدة. ماقرت عينى بشئ فى الهند كما قرت برؤية مدرسة ديوبند ولا سررت بشئ هناك كسرورها بما لاح لى من الغيرة والإخلاص فى علماء هذه المدرسة."

(المنار)

صاحب المعالى فقيد الأمة مولانا أبو الكلام آزادؒ

" لا يأتى الطلبة إلى هذا المعهد الدينى العظيم من شتى نواحى الهند فحسب وإنما يقصدونه من أقصى العالم من إندونيسيا وملايا وأفغانستان وأواسط آسيا والصين، وإن صيته الذائع بين رجالات الدين والأدب إلى هذه الأقطار النائية يدل على عظمته وفخامته. فيمكننا أن نقول بأن المعهد لجامعة دينية دولية." (من خطابه)

إن معهدكم هذا معمل عظيم تصاغ فيه أرواح المسلمين. ومادام هذا المعمل قائمًا لا يجوز لنا أن نقلق أو نضطرب. وإن الأهداف السامية التى أسس المعهد لأجلها وإن الأسوة الحسنة التى اتخذها وخلفها مشائخ هذا المعهد لئن كانت هذه ترشدكم وتنور الطريق لكم فإن المعهد مستقبلا مستنيرا فى انتظار واستعداد.

الدكتور راجندرا براساد (رئيس الجمهورية الهندية)

إن معهدكم هذا لم تقتصر الإفادة منه عند مواطني هذه البلاد فحسب وإنما يعب في مناهله غيرهم أيضا، ويهرع إليه بفضل خدماتكم السنية رواد العلم والمعرفة من كل فج عميق فيعودون إلى أوطانهم حيث ينشرون ما حملوا معه من العلوم والمعرفة

وما زال من دأب شيوخ دار العلوم أن لم يبغوا وراء حصول العلوم ونشرها إلا خدمة لها ولم يتخذوها وسيلة لأي غرض مادي قط على أن قد خلت العلماء من قبل إلا أنهم قليلون. وقد كانوا أن نالوا من احترام الناس وتبجيلهم ما لم ينل منهم الملوك. وظل مشائخ هذا الدار محتفظين بهذه التقاليد. والحق أن أعمال هذه الدار ليست بخدمات تنتفع بها نفسها أو المسلمون فحسب بل هي خدمات للبلاد بأسرها بل للعالم أجمع. لقد عم العالم اليوم نوع من الهياج والفوضى عن انتشار المادية في أرجائها وفقدت القلوب هدوءها وطمانينتها. ولا شك أن ليس إلى حصوله من سبيل إلا الروحية وإني أرى أن هذه هي السبيل التي بنورها وبها يعود إلى قلوب الناس سكينتها وطمانينتها.

ولو شاء الله أن يبقى هذا العالم فسعيده إلى هذه الروحية. ولقد سررت أي سرور بزيارتي هذه الدار وإني عائد إلى بيتي مستفيد امنها مليئا بفضائلها جرابي.

جلالة الملك "ظاهر شاه" (ملك أفغانستان)

"يسرني أن رفقت اليوم بزيارة دار العلوم. لقد ذاع صيتها في أرجاء أفغانستان قاطبة وخاصة في دوائرها الدينية. ولم يزل علماءها ينظرون إلى شيوخ دار العلوم وعلمائها نظرة إجلال واحترام وظلوا معترفين بعلو كعبهم في الروحية وما أوتوا من أوفر حظ في العلوم الإسلامية

وكم من عالم أفغني استفاد من هذه الدار فنشر العلوم بين مواطنيه بعد عودته إلى بلاده وأسدى لها خدمات جمة.

عبد اللطيف . وزير العدل والصحة بورما

لم يتخرج من هذا المعهد رجال من الاسلام فحسب بل له كبير فضل في إنتاج كبار الرجال لوطنه أيضا .

الأستاذ محمد عبد الفتاح عوده (من مصر)

لقد وجدت فى ديوبند معقلا للاسلام وحصناً للسنن والإيمان ، وعرفت كيف يكون الدين صلاحًا للدنيا والآخرة وكيف أن تقاليد السلف الصالح التى يحافظ عليها الشيوخ الأجلاء ويقتبسها الطلبة النجباء . هى ميراث ثمين لا بد أن نتمسك به وأن نجعله عماداً لبنيان المستقبل .

السيد رشيد احمد اسمٰعيل نكوليا . جوهانسبرگ (جنوبى افريقيا)

إنى اعتقد أن مكانة هذا المعهد مكانة جامعتى ايلن وكمبرج فى عالم اللغة الإنكليزية لكن أنى لهما أن تبلغا قدره من شانه فإنه أرفع من المعاهد الاخرى أى رفعة . والحق أقول أن لا يوجد له نظير .

نيازبركيز (تركيا)

لقد تأثرت كثيرا بمكتبة دارالعلوم وذخائرها العلمية الثمينة وإنى وجدت فى هذه البيئة حباخالصاما يعجزنى عن إظهار امتنانى وتشكرى . وأسدى تهنئاتى على الاعمال المباركة التى يقوم بها مدرسوها وموظفوها ـ

ايس . اى مَلّان (من إفريقيا الجنوبية)

لقدا ستيقنت بعد استقصائى جميع مكاتب دارالعلوم وأقسامها بأنى لم أرفى

أى من البلاد الكثيرة التى زرتها وفى أى بقعة من بقاع الأرض التى جلت فيها معهدا دينيا أرفع منه مرتبة وعظمة وأجدر منه تعبيرا بمركز دينى. وعسير أن يوجد له مثيل أى عسر.

البروفيسر ڈی'جولیس جرمانوس (بجامعة بودابست المجر)

سمعت فى بلادى عن أخبار دارالعلوم وكنت اشتاق إلى ان ازورمعقل الروح الإسلامى هذا. وليس من شك فى أن الخدمات الدينية وروح العلوم الإسلاميه التى تجرى بين أبناء هذا المعهد، أدهشتني دهشة عميقة بعد المدارس الدينية التى أسست فى مساجد تركيا ومصر.

الأستاذ إبرهيم الجبالى (رئيس البعثة الأزهرية من مصر)

فقد سعدنا بزيارة جامعة دارالعلوم الديو بندية وطفنا على دروسها فى مختلف الطبقات واجتمعنا بمديرها فضيلة الأستاذ الشيخ شبيرأحمد العثمانی وحضرات أساتذة الأكرمين فشهدنا ماملأ قلوبنا سرورا ولمحنا للعلم فى وجوههم نوراً. رأينا قوما قد وقفوا حياتهم لخدمة علوم الدين من تفسير القرآن والحديث والفقه وأصوله، وأضافوا إلى ذلك من وسائل العلوم الأخرکعلوم اللغة العربية والمنطق والفلسفة والهيئة، ما نرجوأن يعمم به النفع للأمة الإسلامية

الأستاذ گرے ونٹ (آکسفورڈ)

وكان من حسن حظى أن اتيحت لى الفرصة للحضور إلى دارالعلوم، ورأيت أن الحضارة الإسلامية القديمة لاتزال متلألئة ومزدهرة فى هذاالمعهد ولست اظن أن يتأتى لمؤرخ فرصة أوسع واحسن من ذلك.

الأستاذ عثمان كيدو. ممثل الصين اسلامی نیشنل سالویشن فیڈریشن ـــ "

ان من سعادتى أن سنحت لى فرصة زيارة دارالعلوم وانامستيقن بان

هذا المعهد معهد إسلامى خالص" ويستحقُّ لأن نسميه " أزهر الشرق "

الأستاذ ايم حسن (نائب مدير جامعة داكه)

حقًّا إنّ دار العلوم ديوبند معهد كبير،، وإن لى تجارب خاصة فى معاهد أوربا والهند، وَ إنّى أقول أنّ المعاهد الجديدة تحتاج أن تاخذ أشياءً ثمينة فى هذا المعهد الذى اسس على الطراز القديم۔

الأُستاذ أنور السادات . وزير الدولة بمصر والسكرتير العام للموتمر الاسلامى

فى مناسبة زيارتى لهذا المعهد التاريخى العظيم يهمنى أن أتقدم بخالص التهنية لإخوتى القائمين على أمره وأسأل الله أن ينفع به دائما الإسلام والمسلمين وان يظلّ مناراً للعلم والمعرفة۔

رئيس الوفد.(الاتحاد السوفيتى للهند)

لقد قمت بزيارة الجامعة (دار العلوم ديوبند) زيارة شائق مهتم بها. إنه حد المراكز الإسلامية التى تحتضنها هذا البقعة من القارة. وإنى لجد ممتن لمضيفى الكرام وأدعو الله ان تتقوى بين الشعبين السوفيتى والهندى روابط الاخاء وعاطفة الأمن والنصح التى هى من أُس الإسلام۔

رئيس الوفد (من ولايات المتحدة الامريكية)

لقد قضينا يوما كاملا فى دار العلوم بديوبند حيث اجتمعنا بكبار العلماء وتلامذتهم. وإنه الحق أن الوعى الإسلامى هو الذى ينور الأرواح وأن دار العلوم ثرية بهذا النور المبين.

مختار عمر حسن احمد، امير رشيد، سعيد احمد، اميرحسن، محمد احمد
(من ولايات المتحده الامريكية)

علی أصغر حکمت ، سفیر ایران فی الهند سابقا

إنی أشکر الله وأحمده علی ما أنعم علی هذا العبد الضعیف بأن ونقه لزیارة دارالعلوم هذه وأسعده بالاجتماع مع أجلاء أساتذتها وکبار علمائها وامتلأ قلبی ومسامعي نورا وسعادة بکلماتهم الطیبات. واحتظیت بآثارهم الخالدة وتآلیفهم الثمینة بإنها کما قیل "مداد العلماء أفضل من دماء الشهداء" ینابیع البرکات الربانیة والسعادات الأبدیة.
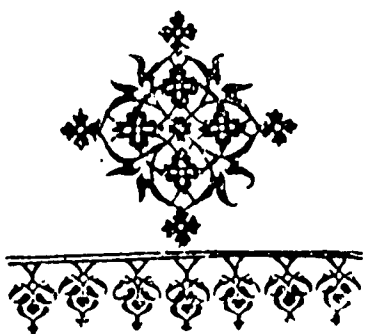
تصاویر
عمارات دارالعلوم
(دیوبند)

بابـ الامداد

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پیشین اور اولین صدر دروازہ جو شیخ الطائفہ حضرت مولینا حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے نام نامی سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ لب سڑک واقع ہے اور بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولینا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ تعمیر ہوا۔

باب الإمداد

البوابة القديمة المرتفعة لدارالعلوم، سميت باسم شيخ الطائفة حضرة الحاج مولانا إمداد الله المهاجرالمكيّ، وهى المدخل الرئيسى للدار من الشارع العام. و بنيت فى إدارة المدير الشاه رفيع الدين طاب الله ثراهٗ.

Babul Imdad

The Main gate of Darul Uloom which is called after Late Hazrat Moulana Haji Imdadullah sb. the party leader. It is just facing the road and was built during the ehtemam of Hazrat Moulana Rafiuddin sb.

बाबुल इमदाद

दारुल उलूम देवबन्द का सब से पेशीन और अव्वलीन सदर दरवाजा जो शैखुत्ताइफा हजरत मौलाना हाजी इमदादुल्ला साहब के नामे नामी से मौसूम किया गया है यह लबे सड़क वाकेअ है और बजमानये अहतमाम हजरत मौलाना रफीउद्दीन साहब कुद्दसा सिर्रहू तामीर हुआ।
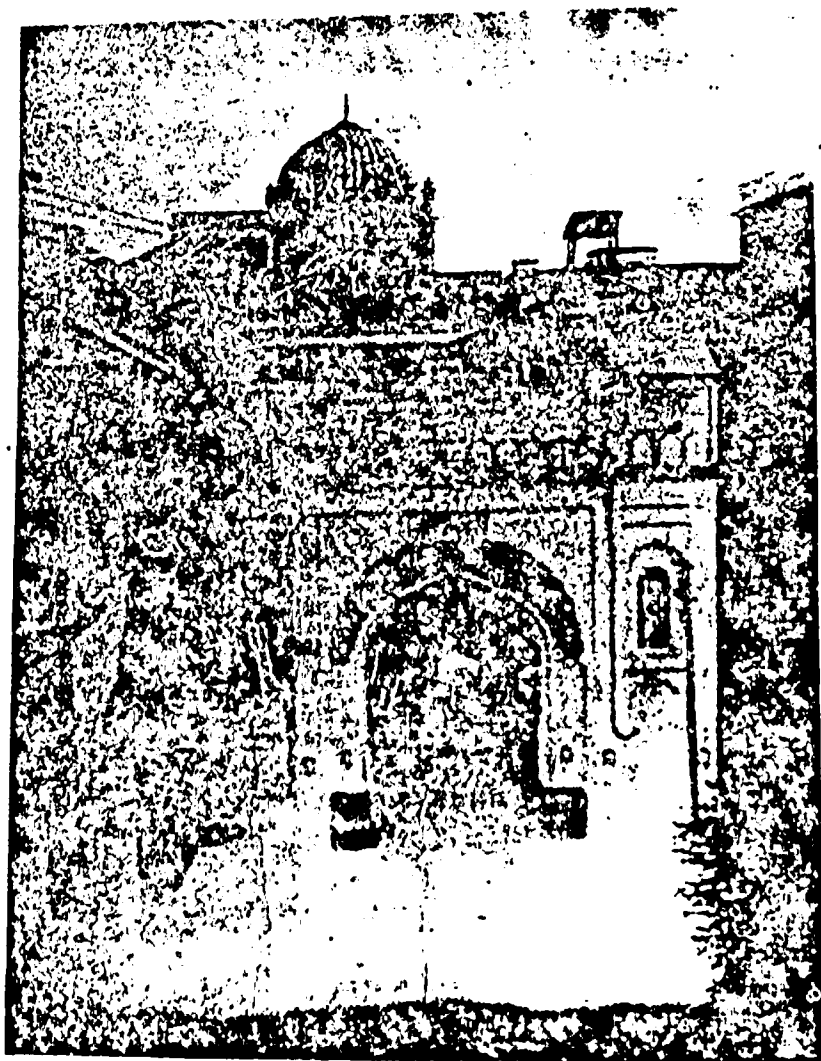
باب قاسم

احاطہ نودرہ کا صدر دروازہ جس کے اوپر دفتر اہتمام کی عظیم عمارت ہے جو حضرت بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی حیات میں تعمیر ہوا اور حضرت اقدس کے نام نامی کی طرف منسوب کیا گیا۔

باب القاسم

البوابة الشامخة التی بنیت فوقها عمارة دارالاهتمام وتم بناؤها فی حیاة حضرة حجة الاسلام مؤسس الدار الشیخ مولانا محمد قاسم النانوتوی رحمه الله وسمیت باسمه

Bab-e-Qasim

The main gate of ehata Naudara on which the building of Daftar-e-Ehtemam is situated. It was built during the life time of Late Hazrat Moulana Mohammed Qasim sb. the founder of Darul Uloom. So it is called after the said Moulana Mohammed Qrsim sb.

बाबे कासिम

अहाते नौदरे का सदर दरवाजा जिस के ऊपर दफ्तर अहतमाम की अजीम इमारत है जो हजरत बानिये दारुलउलूम हुज्जतुल इस्लाम मौलाना मुहम्मद कासिम साहब नानौत्वी की हयात मे तामीर हुआ और हजरते अकदस के नामे नामी की तरफ मनसूब किया गया।
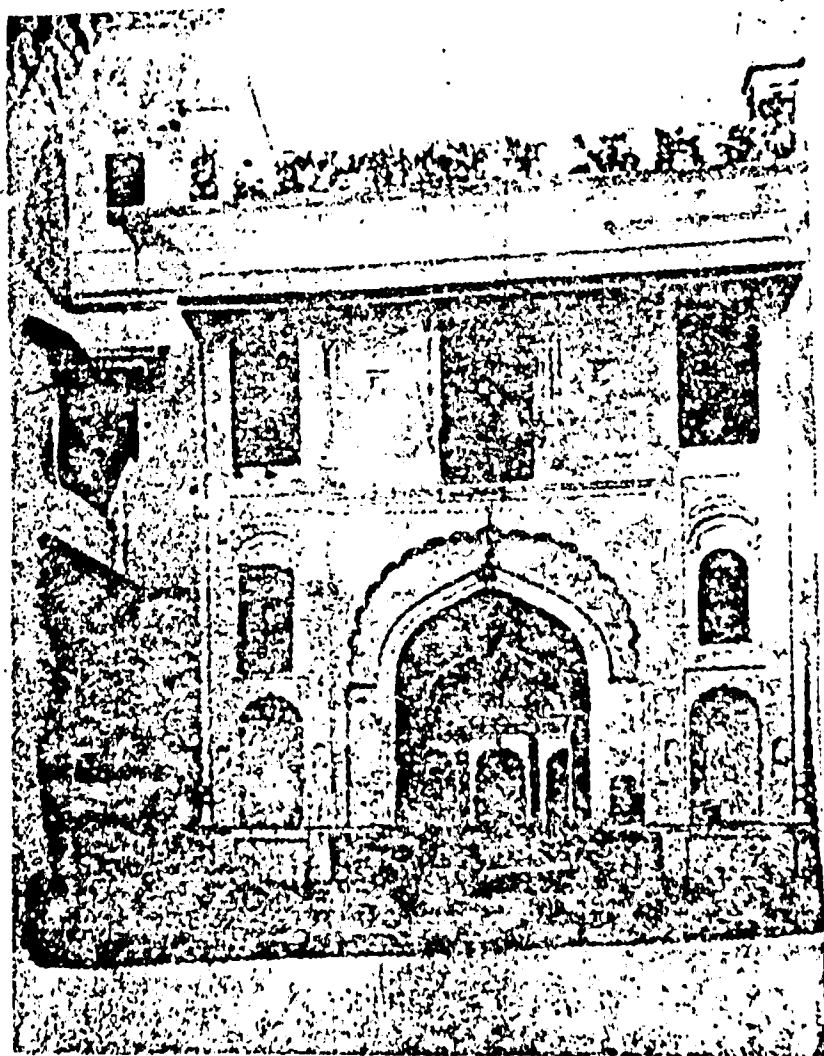
مسجد دار العلوم دیوبند

دار العلوم کی خوشنما مسجد جو سنگ تراشی کی بہترین صنعت کا شاہکار ہے جس میں ہر نماز کے وقت ایک ہزار سے زیادہ علماء، طلبا اور صلحاء بارگاہ حق میں سر بسجود ہوتے ہیں۔ پانچوں نمازوں میں نماز جمعہ کی طرح ہجوم رہتا ہے۔ یہ مسجد ۱۳۲۷ھ مطابق سنہ ۱۹۱۰ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن قاسم العلوم قدس سرہٗ تعمیر ہوئی۔ اندرون مسجد کا رقبہ ۴۲ × ۳۳ مربع فٹ بیرون مسجد کا رقبہ ۱۱۸ × ۵۰ مربع فٹ

مسجد دار العلوم

مسجد الدار الجميل وهو نموذج أنيق من نماذج النحت على الطابع الإسلامي ويصلي فيه خمس مرات يوميا حوالى ألف نسمة ما بين طالب عالم وصالح نراه مزدحمة عند كل صلوٰة كما تزدحم المساجد الأخرى أيام الجمعة. تم بناؤها في إدارة حضرة الحافظ مولانا محمد أحمد سنة ١٣٢٧هـ الموافقة لسنة ١٩١٠م — ومساحة المسجد من الداخل ٤٢×٣٣ قدما ومساحة المسجد من الخارج ١١٨×٥٠ قدما

Masjid-e-Darul Uloom

The spiendid mospue of Darul Uloom, Deoband which contains masterpiece of carving and in which at every prayer time more than a thousand Ulamas, saints and students bow down their heads before Allah. In all the five prayers of the day and night the gathering presents a scene of Jumma prayer.. It was built in 1327 Hijri (1910-A.D.) during the ehtemam of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb.

The Area of the internal portion :- 42ft x 33ft.

The Area of the external portion :- 118ft x 50ft.

मसजिद दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द की खुशनुमा मसजिद जो संगतराशी की बेहतरीन सनअत का शाहकार है जिसमें हर नमाज़ के वक्त एक हज़ार से ज़ायद ओलमा, तलबा और सोलहा बारगाहे हक़ में सर बसुजूद होते हैं। पांचों नमाज़ों में नमाज़े जुमा की तरह हुजूम रहता है यह मसजिद सन् १३२७ हि० मुताबिक सन् १९१० ई० में बज़माने एहतमाम हज़रत मौलाना हाफ़िज़ मुहम्मद अहमद सा० रहमतुल्ला अलैह पुत्र क़ासिमुल उलूम तामीर हुई। रकबा अन्दरून मसजिद ४२ × ३३ वर्ग फ़ीट बेरून मसजिद का रकबा ११८ × ५० वर्ग फ़ीट

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

جہاں سے ہندو بیرون ہند کے تقریباً بارہ ہزار استفتوں پر ہر سال فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں۔ یہ عمارت مسجد دارالعلوم کے مشرقی بالائی حصہ پر ہے اس کے نیچے مسجد دارالعلوم کا حوض نظر آرہا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء بزمانہ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی۔ اس میں تین بڑے بڑے کمرے ہیں جن کا رقبہ یہ ہے۔ (۱) ۱۴×۱۷ مربع فٹ (۲) ۱۴×۱۸ مربع فٹ (۳) ۱۴ × ۱۲ مربع فٹ۔

دارالإفتاء

أكبر المراكز الهندية للإفتاء يقصده المسلمون من كل ناحية باستفتاءاتهم واستفساراتهم في الأمور الدينية. وتصدر من هذا المركز فتاوى سنويا يبلغ عددها نحو اثنى عشر ألفا. ويقوم البناء على الجانب الشرقي من مسجد الدار في الطابق الأول ويحتوي على ثلث غرف فسيحة ويقع تحتها حوض المسجد الذي يرى في الصورة. وتم البناء سنة ١٣٦٧هـ الموافقة لسنة ١٩٤٨ الميلادية في إدارة المدير مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه. مساحة الغرفات الثلاث ١٧×١٤، ١٨×١٤ و١٤×١٢ قدما

Darul - Ifta

From here nearly twelve thousand questions (Istiftas) are answred with reference every year. This Building is situated on the upper story of the eastern portion of the mosque of Darul Uloom. Under this building the fountain (Hauz) of the mosque can be seen. It was built in 1367Hijri (1948-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. It has three spacious rooms with the following areas.

(1) 17ft x 14ft. (2) 18ft x 14ft. (3) 14ft 12ft.

दारुल इफ्ता दारुलउलूम देवबन्द

जहां से हिन्द व बैरून हिन्द के लग भग १२ हजार इस्तफतों पर हर साल फतवे सादिर किये जाते है यह इमारत मस्जिद दारुल उलूम के पूर्वी बालाई हिस्से पर है इसके निचे मस्जिद दारुलउलूम का होज नजर आरहा है। यह इमारत सन् १३६७ हि० १९४८ ई० में बजमाना महतमाम हजरत मोलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुई। इसमें तीन बड़े २ कमरे है जिनका रकबा निम्न लिखित है :—

१— १७×१४ २— १८×१४ ३— १४×१२ वर्ग फीट
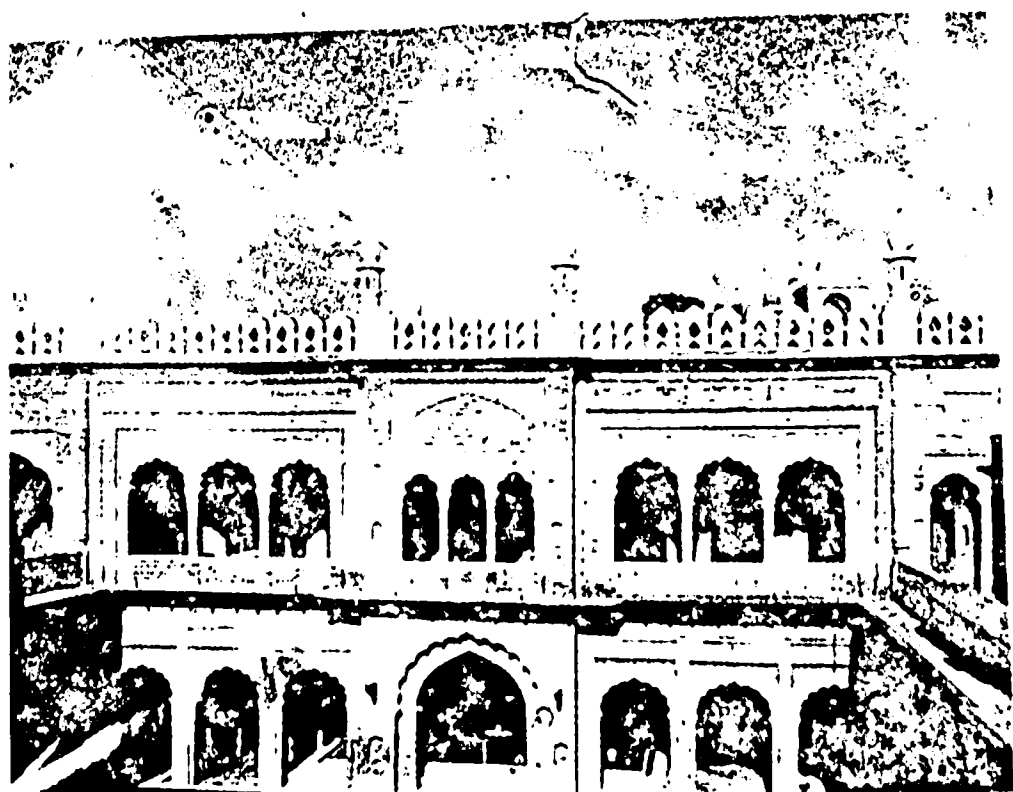
دفتر محاسبی

دارالعلوم کے مالیات کا مرکزی دفتر جہاں اہل خیر مسلمانوں کے تقریباً چھ لاکھ سالانہ کے آمد و صرف کا ریکارڈ مرتب رہتا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ ابن قاسم العلوم قدس سرہ ہوئی۔

رقبہ ۴۴ × ۱۱ مربع فٹ

إدارة الحساب

إدارة الدار الرئيسية للمحاسبة والمراقبة على الشؤون المالية فهي التي تستلم تبرعات المسلمين التي تقدر بستمائة ألف روبية سنويا. وترفع إليها الحسابات من كل إدارة تابعة. بنيت العمارة سنة ١٣١٧ﻫ الموافقة لسنة ١٨٩٩ الميلادية حين إدارة الشيخ الحافظ محمد أحمد بن قاسم العلوم مولانا محمد قاسم رحمهما الله ومساحة البناء ٤٤ × ١١ قدما

Daftar Mohasabi :-

The central accounts office of Darul Uloom, where the accounts of income and expenditure of nearly six Lacs Rupees received as donations from the well wishers of Darul Uloom is maintained. It was built in 1317 Hijri (1899-A D.) during the ehtemam of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. Area :- 44ft x 11ft.

'दफ्तर महासबी'

दारुल उलूम के मालियात का मर्कजी दफतर जहां अहले खैर मुसलमानों के लग भग ६ लाख सालाना के आमदो खर्च का रिकार्ड मुरत्तब रहता है इस इमारत की तामीर सन् १३१७ हि० मुताबिक सन् १८९९ ई० में बजमानये अहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्लाअलेह पुत्र कासिमुल उलूम तामीर हुई।

रकबा ४४×११ वर्गफीट

دارالاہتمام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مرکزی دفتر جس کے تحت بیس شعبوں کے دفاتر کام کرتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء
میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعمیر ہوئی۔

رقبہ ۲۳×۱۹ مربع فٹ

دار الاهتمام

الإدارة الرئيسية لدارالعلوم التى يجلس فيها المدير، وتشرف هذه الإدارة على عشرين شعبة تابعة، وتم بناؤها سنة ١٣١٥هـ الموافقة لسنة ١٨٩٧ الميلادية بعهد حضرة الحافظ محمد أحمد رحمه الله نجل مؤسس المعهد المغفورله مولانا محمد قاسم، ومساحتها ـــــ ٢٣ × ١٩ قدما.

Darul-Ehtemam

The central office of Darul Uloom which controls twenty sub-Offices of different departments. It was built in 1315 Hijri (1897 A.D.) during the ehtemam of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb.

Area:- 23ft x 19ft.

'दारुल अहतमाम दारुलउलूम देवबन्द'

दारुल उलूम देवबन्द का मरकजी दफ्तर जिसके तहत बीस शोबों के दफातिर काम करते हैं वह इमारत सन् १३१५ हि० मुताबिक सन् १८९७ ई० में बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मोहम्मद अहमद साहब तामीर हुई।

रकबा २३×१९ वर्ग फीट

دفترنشرواشاعت دارالعلوم دیوبند

اس دفتر سے دارالعلوم کے ماہانہ احوال وکوائف نشر کئے جاتے ہیں اور یہیں سے دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ آرگن رسالہ "دارالعلوم" ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا ہے ۔ رقبہ ۲۳ × ۱۳ مربع فٹ

دارالنشر والإشاعة

الإدارة المسئولة عن تسجيل نشاط الدار الأدبي والديني ونشره، فتنشر التقارير شهريا، كما تصدر مجلة شهرية تسمى "دارالعلوم" مليئة بالمقالات الدينية الممتعة . المساحة ۱۳×۲۳ قدما

Daftar Nashr-o-Ishaat :- (Publications)

From this office the montnly organ of Darul Uloom is published every month regularly in which the activities of Darul Uloom are also published
Area 23ft x 13ft.

दफ्तर नशरो इशाअत दारुल उलूम देवबन्द

इस दफ्तर से दारुल उलूम के माहाना अहवाल व कवाईफ नशर किये जाते हैं और यही से दारुल उलूम देवबन्द का माहाना आर्गन रिसाला "दारुल उलूम" हर माह पाबन्दी से शाये होता है।
रकबा २३×१३ वर्ग फीट
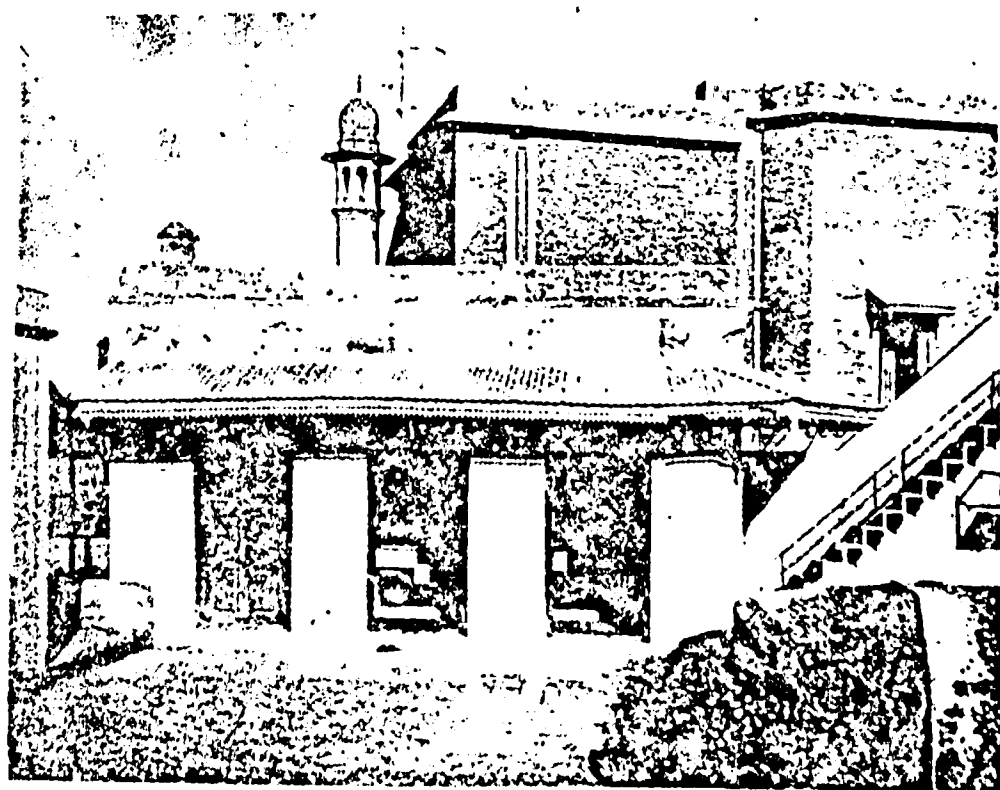
نودرہ دارالعلوم دیو بند

دارالعلوم دیوبند کی اولین درسگاہِ حدیث جو حجۃ الاسلام حضرت مولینا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانیٔ دارالعلوم کی حیات میں بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولینا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ تعمیر ہوئی جس میں دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت اقدس مولینا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ درس حدیث دیتے تھے۔ اس عظیم عمارت میں تین بڑی بڑی درسگاہیں ہیں جن میں اس وقت مختلف علوم و فنون کے اساتذہ درس دیتے ہیں۔ سن تعمیر ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۷ء۔ کل نودرہ کا رقبہ ۷۴×۵۰ مربع فٹ۔ تینوں درسگاہوں میں سے ہر ایک درسگاہ کا رقبہ ۳۶×۲۵ مربع فٹ ہے۔

"نودرہ" دارالعلوم

أول دار للأحاديث النبوية بنيت أثناء حياة الشيخ حجة الإسلام مولانا محمد قاسم النانوتوی تحت إدارة الشيخ الشاہ رفيع الدين طاب الله ثراهما سنة ۱۲۹۳ھ الموافقة لسنة ۱۸۷۷ الميلادية وكان يحدث فيها أول رئيس المدرسين لدار العلوم مولانا محمد يعقوب نور الله مرقده وهذ البناء الفخم يحتوى على ثلث قاعات كبيرة، والآن يدرّس فيها أساتذة المعهد علوما متنوعة وفنونا عديدة. ——— ومساحة البناء كلها ۷۴×۵۰ قدما، ومساحة كل قاعة ۳۶×۲۵ قدما

Naudara

The first lecture room of Hadis which was built in 1293 Hijri (1877-A.D.) during the lifetime of Hujjatul Islam Late Hazrat Moulana Mohammed Qasim sb. the founder of Darul Uloom, under the ehtemam of Late Hazrat Moulana Rafiuddin sb. The first principal of Darul Uloom Late Hazrat Moulana Mohmmed Yaqub sb., taught Hadis in this building. It consists of three spacious lecture rooms in which different subjects are tauhght by renowned professors.

The Area of Naudara as a whole:- 74ft x 50ft.
The Area of each lecture room:- 36ft x 25ft.

नौदरा दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द की अव्वलीन दरसगाहे हदीस जो हुज्जतुल इस्लाम हजरत मौलाना मोहम्मद कासिम सा० नानोतवी कुद्दसा सिर्रहू बानिये दारुल उलूम की हयात में बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना शाह रफीउद्दीन साहब कुद्दसा सिर्रहू तामीर हुई। जिसमें दारुल उलूम के सब से पहले सदर मदरिस हजरते अकदस मौलाना मुहम्मद याकूब साहब दरसे हदीस देते थे, इस अजीम इमारत में तीन बड़ी दरसगाहें है। जिनमें इस वक्त मुख्तलिफ उलूम व फनून के असातजा दरस देते है

सने तामीर सन् १२९३ हि० मुताबिक सन् १८७७ ई०।
कुल नौदरे का रकबा ७४ × ५० वर्ग फीट तीनों दर्सगाहों में से हर एक दर्सगाह का रकबा ३६ × २५ वर्ग फीट है।

دارالحدیث (بیرونی منظر)

دارالحدیث (منظر من الخارج)

Darul Hadis (External View)

दारुलहदीस (बैरूनी मंजर)
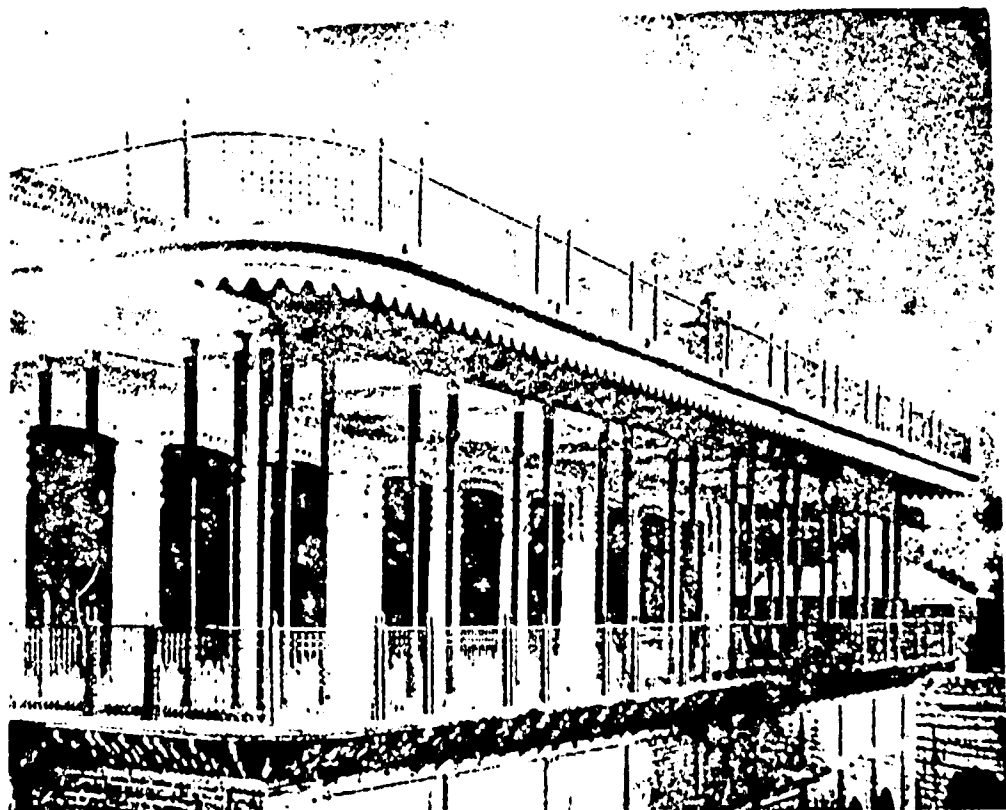
دارالحدیث دارالعلوم دیوبند کا روکار

دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی اور شاندار درسگاہ حدیث جو ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں بزمانہ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی ۔ جس میں دورۂ حدیث کی جماعت کے دوسو سے زائد طلباء درس حدیث میں شرکت کرتے ہیں برقی روشنی اور برقی پنکھوں کا معقول انتظام ہے۔ اس دارالحدیث میں درس کا آغاز حضرت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی ؒ نے فرمایا اور آخر دم تک اسی میں پڑھاتے رہے: رقبہ ۶۸ x ۳۵ مربع فٹ ۔

دارالحدیث

القاعة الكبيرة الخاصة لدراسة الحديث النبوى على صاحبه الصلاة والتسليم وهى أكبر مدرجات الدار تم بناؤها سنة ١٣٥٢هـ (١٩٣٤ الميلادية) فى عهد مدير الدار الحالى مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه وبدأ المغفور له الشيخ حسين أحمد المدنى التدريس فى هذه القاعة وواظب عليه إلى أن توفاه الله. والقاعة مزينة بالأنوار والمراوح الكهربائية ۔ (المساحة ٦٨ × ٣٥ قدما)

Front View of Darul Hadis

Darul Hadis, the most spacious and magnificient lecture room, of Darul Uloom, which was built in 1352 Hijri (1934 A. D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab Sb. with suitable arrangements of electric lights and fans. It accomodates more than two hundred students of Daura-e-Hadis. Late Sheikhul Islam Moulana Syed Husain Ahmad Madani inaugurated it by teaching lessons of Hadis and took his classes of Hadis in it till his last moments.

Area 68 ft.x35ft.

दारुल हदीस दारुलउलूम देवबन्द का रुकार

दारुल उलूम देवबन्द की सब से बड़ी और शानदार दरसगाहे हदीस जो सन् १३५२ हि० मुताबिक १९३४ ई० में ज़मानये एहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुई जिस में दौरये हदीस की जमाअत के २०० से अधिक विद्यार्थी दरसे हदीस में शिरकत करते हैं। बरक़ी रोशनी और बरक़ी पंखों का माकूल प्रबन्ध है। इस दारुलहदीस में दरस का प्रारम्भ हज़रत शैखुलइस्लाम मौलाना सैयद हुसैन अहमद साहब मदनी रहमतुल्ला अलैह ने फ़रमाया और आख़ीर दम तक इसी में पढ़ाते रहे।

रक़बा ६८×३५ वर्ग फीट

بابِ رشید

احاطۂ نودرہ کا شمالی دروازہ جو بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولینا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ احاطۂ باغ سے داخل ہونے والوں کے لئے تعمیر کیا گیا اور آج حضرت اقدس فقیہ الاسلام مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند کے نام نامی کی طرف منسوب ہے ۔

باب الرشيد

الباب الشمالی لنودرة المنسوب إلى فقيه الإسلام رئيس العلماء حضرة الحاج مولانا رشيد أحمد الكنكوهي برد الله مضجعه بني في إدارة حضرة الحاج مولانا رفيع الدين رحمه الله .

Bab-e-Rasheed

The Northern gate of Naudara, which was constructed during the ehtemam of Moulana Rafiuddin sb. for those who wanted to come from ehata Bagh to Naudara. It has been named after Faqihul Islam Late Hazrat Moulana Rashid Ahmed sb. of Gangoh who was the second patron of Darul Uloom. Late Moulana Mohammed Qasim sb. was the first patron (Sarparast)

बाबे रशीद

अहाता नौदरे का शुमाली दरवाजा जो बज़माना इहतमाम हज़रत मौलाना रफ़ीउद्दीन साहब रहमतुल्ला अलैह अहाता बाग से दाखिल होने वालों के लिये तामीर किया गया। और आज हज़रते अक़दस फ़क़ीहुल इस्लाम मौलाना रशीद अहमद साहब गंगोही मरहूम सरपरस्त सानी दारुलउलूम देवबन्द के नाम नामी की तरफ़ मन्सूब है।
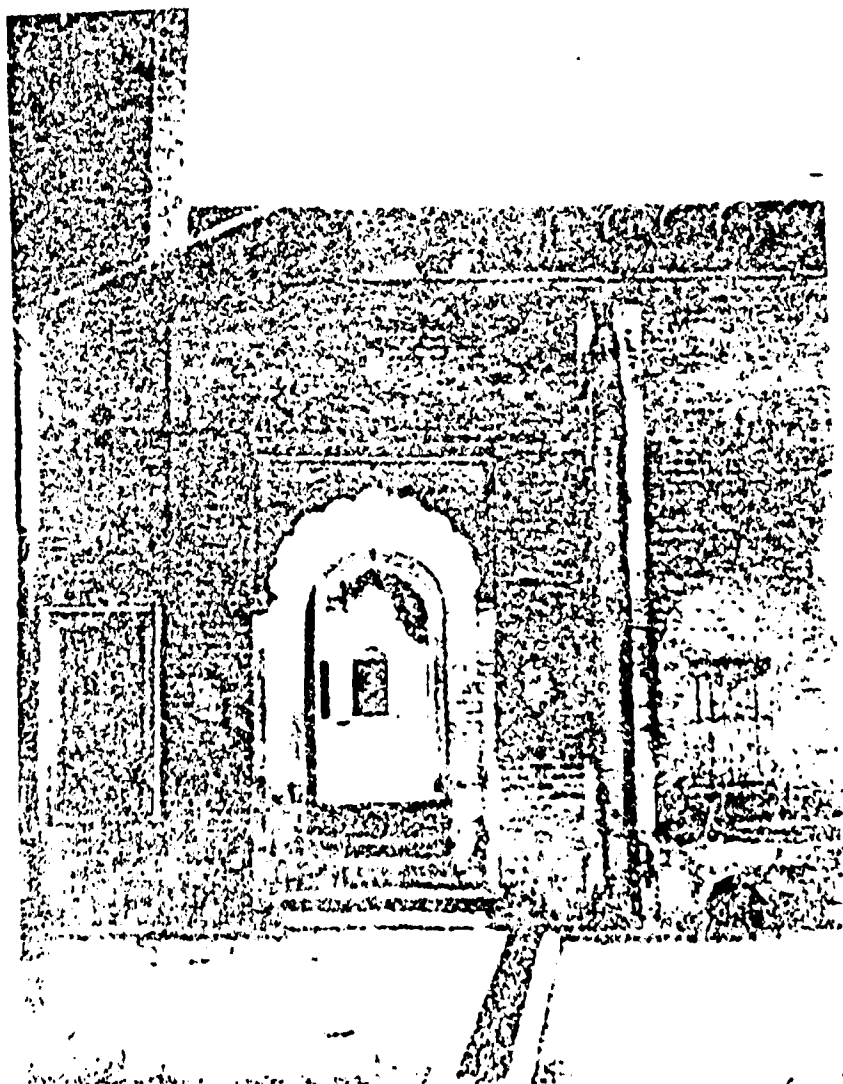
دارالطلبا قدیم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کا قدیم دارالاقامہ جو انیس ۱۹ کمروں پر مشتمل ہے۔ جس میں بیک وقت ۵۶ طلبہ کی گنجائش ہے۔ اس دارالاقامہ کی تعمیر بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوئی۔

ہر کمرے کا رقبہ ۱۱ x ۹ مربع فٹ ہے۔

دار الطلبة القديمة

دار الإقامة القديمة التي تحتوي على تسع عشرة غرفة، ويقيم فيها الآن ستة وخمسون طالبا، تم بناؤها في زمن حضرة الحافظ محمد أحمد المغفور له ومساحة كل غرفة منها ۹×۱۱ قدما،

The Old Hostel of Darul Uloom Deoband

The old hostel of Darul Uloom Deoband, which contains ninteen rooms and accomodates 56 students, was costructed during the time of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad, the then Mohtamim.

Area of each class room is 11ft x 9ft.

दारुल तलाबा क़दीम दारुल उलूम देवबन्द

दारुलउलूम का क़दीमी दारुल इक़ामा जो उन्नीस (१९) कमरों पर मुश्तमिल है। जिसमें बयकवक्त ५६ विद्यार्थियों की गुंजाइश है। इस दारुल इक़ामे की तामीर बज़माना मुहतमाम हज़रत मोलाना हाफ़िज़ मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्लाहअलैह हुई। हर कमरे का

रक़बा ११×९ वर्ग फीट है

باب محمود

احاطۂ نودرہ کا جنوبی دروازہ جس سے مطبخ کی سمت رہنے والے طلبہ اس احاطہ میں داخل ہوتے ہیں یہ دروازہ بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعمیر ہوا۔ اور آج حضرت اقدس شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحبؒ کے نام نامی کی طرف منسوب ہے۔

باب محمود

الباب الجنوبي لنودره وهو المدخل للطلبة المقيمين في الجنوب عند دار الطعام، بني في إدارة مدير الدار حضرة الشيخ مولانا رفيع الدينؒ وهو معنون باسم شيخ الهند مولانا محمود حسن نور الله ضريحه.

Bab-e-Mahmood

The Southern gate of Naudara through which the students residing in Ehata Matbakh enter Naudara. This gate was built during the ehtamam of Late Hazrat Moulana Rafiuddin sb. and is called after Late Sheikhulhind Hazrat Moulana Mahmood Ul Hasan sb.

बाबे महमूद

अहातये नौदरे का दक्षिणी दरवाज़ा जिस से मतबख़ की सिम्त रहने वाले तलबा इस अहाते में दाख़िल होते है यह दरवाज़ा बज़मानए अहतमाम हज़रत मौलाना रफ़ीउद्दीन साहब रहमतुल्ला अलैह तामीर हुआ। और आज हज़रते अक़दस शैख़ुलहिंद मौलाना महमूद हसन साहब रहमतुल्ला अलैह के नामे नामी की तरफ़ मन्सूब है।
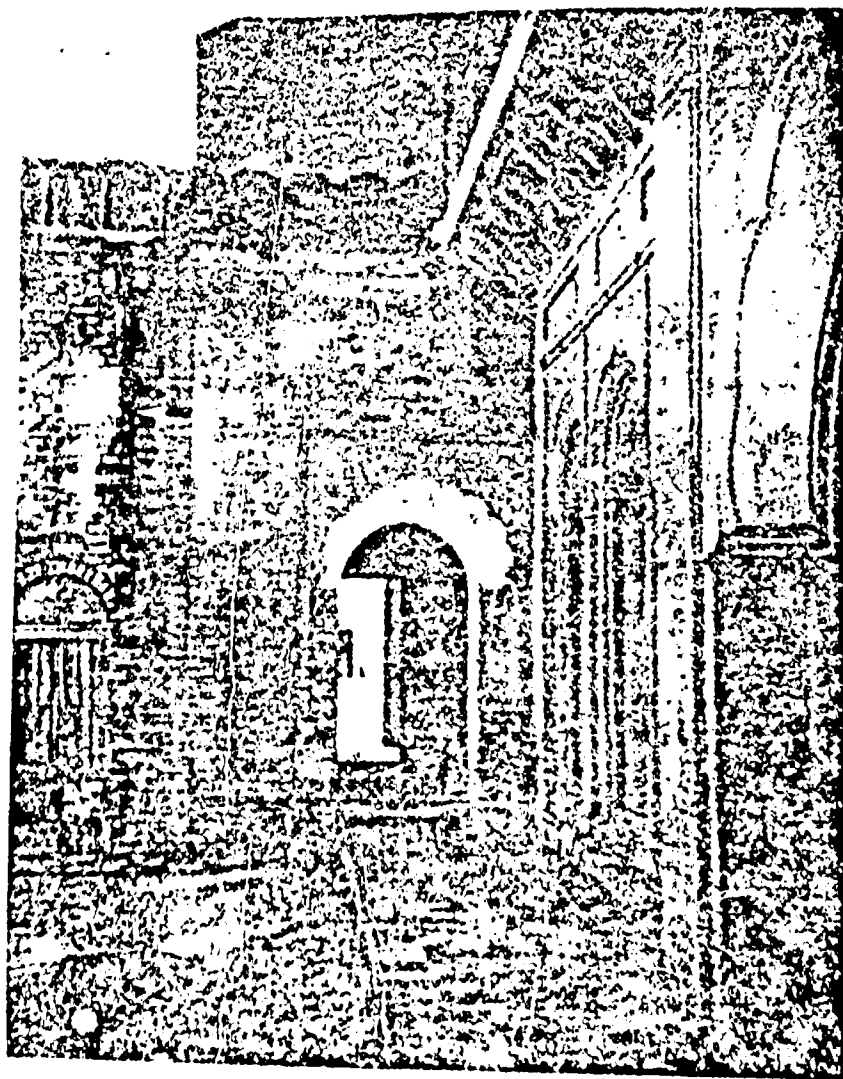
دارالحفلات ـ دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مرکزی ہال جو دارالحدیث کے نیچے واقع ہے۔ اس مرکزی ہال میں دارالعلوم کے بڑے بڑے جلسے ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہال ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ بن قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتویؒ تعمیر ہوا۔

رقبہ مشرقی حصہ کا ۷۳ × ۴۰ مربع فٹ۔ مغربی حصہ کا ۳۶ × ۳۵ مربع فٹ

دارالحفلات

قاعة الدار المركزية الواقعة تحت دار الحديث تنعقد فيها حفلات الدار الكبيرة كل سنة. تم بناؤها في إدارة حضرة الحافظ محمد أحمد بن قاسم العلوم مولانا محمد قاسم طاب الله ضريحهما سنة ١٣٣٠ﻫ الموافقة لسنة ١٩١١م

مساحة جانبها الشرقي ٧٣×٤٠ قدما وجانبها الغربي ٣٦×٣٥ قدما

Darul-Hafalat

The central hall of Darul Uloom, Deoband which is just under the Darul Hadis. All important functions and general meetings of the year take place in this central hall. It was built in 1330 Hijri (1911-A.D.) during the ehtemam of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. son of Late Moulana Mohammed Qasim sb. the founder of Darul Uloom.

Area of the eastern portion 73ft. x 40 ft.
Area of the western portion 36ft. x 35 ft.

दारुल हफलात दारुलउलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द का मरकज़ी हाल जो दारुलहदीस के नीचे वाक़ेअ है इस मरकज़ी हाल मे दारुल उलूम के बड़े २ जलसे हर वर्ष होते रहते है यह हाल सन् १३३० हि० मुताबिक सन् १९११ ई० मे बज़माना मुहतमिम हज़रत मौलाना हाफ़िज़ मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्ला अलैह पुत्र क़ासिमुल उलूम हज़रत मौलाना नानौतवी तामीर हुआ।

रक़बा पूर्वी भाग का ७३×४० वर्ग फीट पश्चिमी भाग का ३६×३५ वर्ग फीट

دارالحدیث (اندرونی ہال)

دارالحدیث (منظر من الداخل)

Inner view of Darul Hadis

दारुल हदीस का अन्दरूनी मंजर
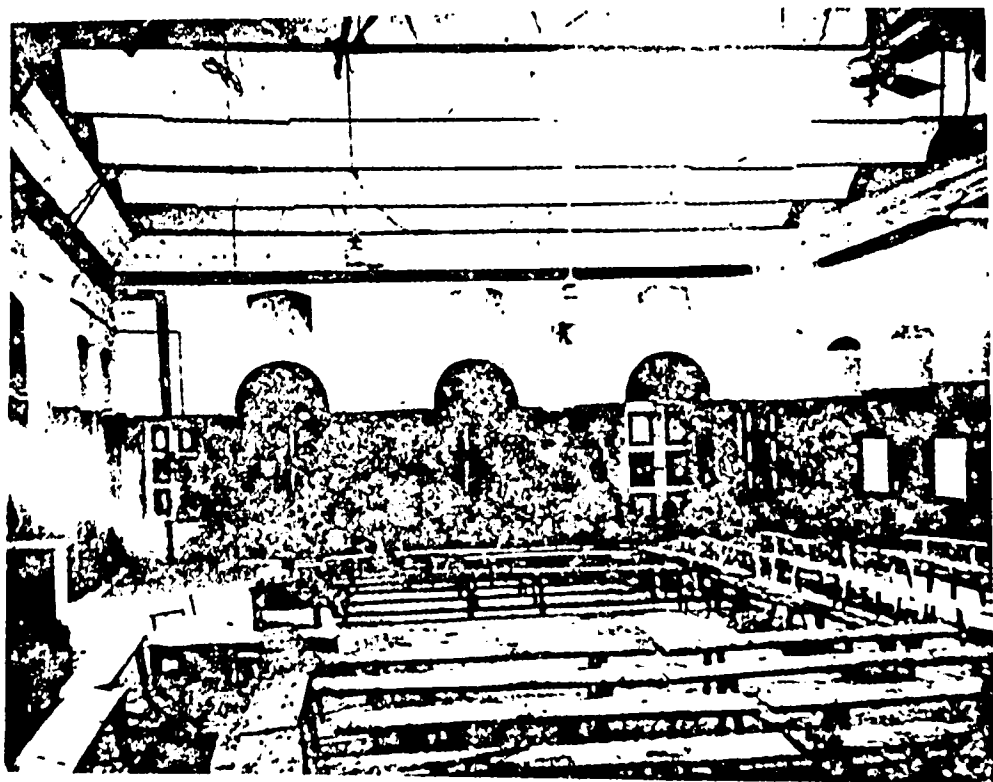
دارالتفسیر دارالعلوم دیوبند

علوم قرآن سے افادہ کی سب سے بڑی درسگاہ جو دارالحدیث کے اوپر واقع ہے۔ اس کا چمکدار گنبد سامنے نظر آرہا ہے
یہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی۔

رقبہ ۳۰ x ۳۰ مربع فٹ

دارالتفسیر

أكبر الينابيع الهندية التي تتفجر منها علوم القرآن، وتروى غليل رواد المعرفة والحكمة، الذين يؤمون الدار من كل صوب. وهي قاعة فخمة ذات قبة شامخة شيدت فوق دارالحديث، ترى في الصورة القبة الشامخة بنيت خلال إدارة المدير الحالي مولانا محمد طيب سنة ١٣٥٨ھ الموافقة لسنة ١٩٣٩ الميلادية. مساحتها ٣٠×٣٠ قدما.

Darul-Tafseer

The biggest department of imparting knowledge about the Holy Quran, which is situated just above Darul Hadis . The shining dome is just before you. It was built in 1358 Hijri (1939-A.D.)during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohmmed Tayyab sb.

Area 30 ft x 30 ft.

'दारुत्तफसीर दारुल उलूम देवबन्द'

उलूम कुरान से इस्तफादे की सबसे बड़ी दर्सगाह जो दारुल-हदीस के ऊपर वाक़ेय है। इसका चमकदार गुम्बद सामने नजर आरहा है यह सन् १३५८ हि० मु० सन १९३९ ई० में बजमाना एहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुई

रकबा ३०×३०, वर्ग फीट
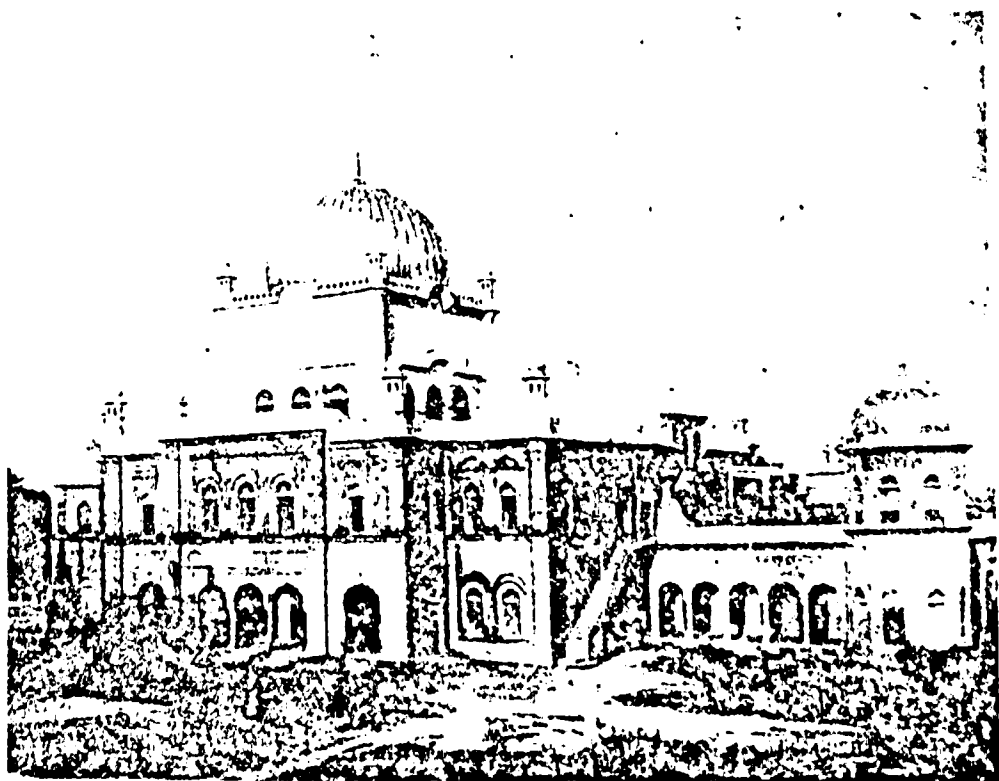
باب الظاهر

دارالعلوم کے جدید دارالاقامہ کا عظیم الشان دروازہ جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفر افغانستان کے موقعہ پر اعلیٰ حضرت امیر ظاہر شاہ بادشاہ افغانستان کے عطیہ سے ان کے نام پر بطور ان کی یادگار کے ۱۳۵۹ھ مطابق سنہ ۱۹۴۰ء میں بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔ رقبہ ۵۴ × ۴۲ مربع فٹ

باب الظاهر

البوابة الفخمة لدار الإقامة الجديدة بنيت من تبرعات صاحب الجلالة محمد ظاهر شاه ملك افغانستان وهو تفضل بمنحها عند ما قام المدير الحالي مولانا محمد طيب بزيارة أفغانستان ودعاهله. وتم بناؤها سنة ١٣٥٩هـ الموافقة لسنة ١٩٤٠ الميلادية ' وسميت باسم الملك.
المساحة ٥٤×٤٢ قدما

Babuzzahir (Zahir Gate)

The massive and splendid gate of the new hostel of **Darul Uloom** which was built in 1359 Hijri (1940-A.D.) with the royal donation presented by his Majesty Zahir Shah, the king of Afghanistan to Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. during his visit to Afghanistan So the gate was named after His majesty, the king of Afghanistan.

Area :- 54ft x 42ft.

बाबुज़्ज़ाहिर

दारुल उलूम के जदीद दारुल इकामे का अज़ीमुश्शान दरवाज़ा जो हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू मोहतमिम दारुल उलूम देवबन्द के सफ़रे अफ़गानिस्तान के अवसर पर आला हज़रत अमीर जाहिर शाह बादशाह अफ़गानिस्तान के अतीय्ये से उनके नाम पर बतौर उनकी यादगार के सन् १३५९ हि० मुताबिक सन् १९४० ई० में बज़मानये अहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुआ।

रक़बा ५४×४२ वर्ग फीट

دارالطلبہ جدید دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کا عظیم ترین شاندار دارالاقامہ جو ایک سو سات کمروں پر مشتمل ہے جس میں بیک وقت آٹھ سو طلباء قیام پذیر رہتے ہیں۔ اس دارالاقامہ کی تعمیر ابتداءً ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز شروع ہوئی تھی اور ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۹ء تک حافظ صاحبؒ کے زمانہ ہی میں اسکے تیرہ کمرے تیار ہو چکے تھے۔ بقیہ کمروں کی تکمیل ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں زمانۂ اہتمام حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ ہوئی۔

ہر کمرے کا رقبہ ۱۹ × ۱۸ مربع فٹ۔ پورے احاطہ کا رقبہ ۵۰۰ × ۳۶۱ مربع فٹ ہے۔

دار الطلبة الجديدة

دار الإقامة الحديثة العظيمة التي تشتمل على سبع ومائة غرفة ويقيم فيها حوالي ثمانمائة طالب. ابتدأ بناؤها بعهد حضرة الحافظ محمد أحمدؒ سنة ۱۳۳۸ھ الموافقة لسنة ۱۹۱۹ الميلادية وبنيت منها ثلاثة عشر غرفة في حياته (سنة ۱۳۴۴ھ الموافقة لسنة ۱۹۲۹ الميلادية) لكن تم بناؤها بعهد إدارة المدير الحالي مولانا محمد طيب سنة ۱۳۶۴ھ الموافقة لسنة ۱۹۴۵ الميلادية.

ومساحة كل غرفة منها ۱۹ × ۱۸ قدما ومساحة دار الإقامة ۵۰۰ × ۳۶۱ قدما.

Daruttalaba Jadid :- (New Hostel)

The biggest and most attractive hostel of Darul Uloom which contains 107 rooms and accomodates 800 students free of all charges. The construction of this hostel was started in 1338 Hijri (1919-A.D) during the principalship of Late Moulana Hafiz Mohammad Ahmad sb. By 1344 Hijri (1929-A D.) thirteen rooms were completed during his life time The rest of the rooms were built during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. and were completed in 1364 Hijri (1945-A.D.)

Area of the whole compound 500ft x 361ft
Area of each room:- 19ft x 18ft

दारुल तलबा जदीद दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम का सबसे बड़ा तरीन शानदार दारुल इकामा जो एक सौ सात (१०७) कमरों पर मुश्तमिल है। जिसमें बयक वक्त आठसौ विद्यार्थी क़याम पज़ीर रहते हैं। इस दारुल इकामे की तामीर प्रारम्भ में सन् १३३८ हि० मुताबिक सन् १९१९ ई० बज़माने: मुहतमाम हज़रत मौलाना हाफ़िज़ मुहम्मद अहमद साहब मरहूम शुरू हुई थी और सन् १३४४ हि० मुताबिक सन् १९२९ ई० तक हाफ़िज़ साहब रहमतुल्ला अलैह के ज़माने ही में इसके १३ कमरे तैयार हो चुके थे। बाक़ी कमरों की तकमील सन् १३६४ हि० मुताबिक सन् १९४५ ई० में बज़माना मुहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू हुई।

हर कमरे का रक्बा १९ × १८ वर्ग फीट पूरे अहाते का रक्बा ५०० × ३६१ वर्ग फीट है।

بابِ یعقوب

دارالاقامہ جدید کا شمالی دروازہ جو بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔ اور حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ سب سے پہلے صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کے نام نامی کی طرف منسوب کیا گیا۔ اس دروازہ سے شیخ الاسلام حضرت مولٰنا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث دینے کے لئے دارالعلوم میں داخل ہوا کرتے تھے۔

باب یعقوب

الباب الشمالی لدار الإقامة الحديثة المنسوب إلى حضرة الحاج مولانا محمد يعقوبؒ اول رئيس المدرسين للمعهد وبنيت فى إدارة المدير مولانا محمد طيب. ومن ميزاتها أن المغفور له شيخ الإسلام مولانا السيد حسين أحمد المدنى كان يدخل من هذا الباب عند دخوله المعهد لتدريس الحديث النبوى على صاحبه الصلوٰة والتسليم.

Bab-e-Yaqoob

The Northern gate of Daruttalaba Jadid, which was built during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. and is called after Hazrat. Moulana Mohammed Yaqoob sb, the first principal of Darul Uloom. Late Sheikhul Islam Hazrat Moulan Syed Husain Ahmad sb. used to enter through this gate while going to lecture room for teaching Hadis.

बाबे—याकूब

दारुल इकामा जदीद का उत्तरी दरवाजा जो बजमानये एहतमाम हजरत मौलाना मु० तैयब साहब मद्दाजिल्लहू तामीर हुआ और हजरत मौलाना मुहम्मद याकूब साहब सब से पहले सदर मुदर्रिस दारुलउलूम देवबन्द के नामे नामी की तरफ मनसूब किया गया। इस दरवाजे से शेखुल इस्लाम हजरत मौलाना हुसैन अहमद साहब रहमतुल्लाह अलैह दरसे हदीस देने के लिये दारुल उलूम में दाखिल हुआ करते थे।
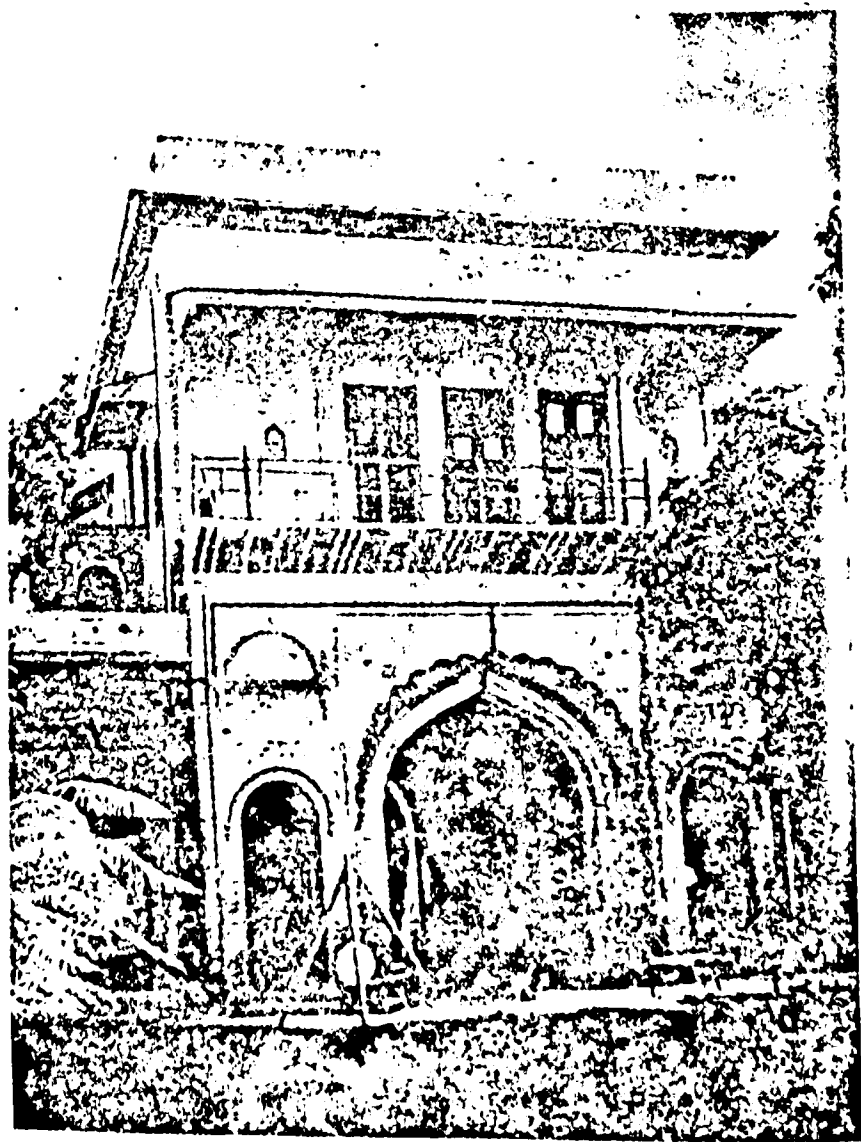
دارجدید دارالعلوم دیوبند کا غربی بالائی حصّہ

اوپر طلباء کے چار کمرے نظر آرہے ہیں۔ جن میں تقریباً ۳۲ طلباء کی رہائش کی گنجائش ہے۔ یہ کمرے ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوئے۔

ہر کمرے کا رقبہ ۱۹½ × ۱۸ مربع فٹ

الطابق الثانی لدار الإقامة الجديدة

تری فی الصورة أربع غرفات بنیت حدیثا علی الجانب الغربي، وتتسع لاثنین وثلاثین طالبا، وإنما یعود الفضل فی بناءها أیضا إلی حضرة الشیخ مولانا محمد طیب المدیر الحالی، ومساحة کل غرفة ۱۹½ × ۱۸ قدما.

The upper story of the western portion of Dar-e-jadid

On the Upper story four rooms are visible which can accomodate 32 students. They were built in 1377 Hijri (1958-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area of each room 19'5ft x 18 ft.

दारे जदीद दारुल उलूम देवबन्द का पश्चिमी ऊपरी हिस्सा

ऊपर विद्यार्थियों के चार कमरे नजर आरहे है। जिन में लगभग ३२विद्यार्थियों के रहने की गुन्जाइश है। यह कमरे सन १३७७ हि० मुताबिक १९५८ ई० में बजमानये महतमाम हजरत मौलाना मु० तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुए।

हर कमरे का रकबा १९½X१८ वर्ग फीट

باب رفیع

دارالاقامہ جدید کا جنوبی دروازہ جو بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔ یہ دروازہ مسجد چھتہ کی پشت پر جانب شہر واقع ہے۔ اس سمت کے وارد و صادر اکثر اسی دروازے سے دارالعلوم میں داخل ہوتے ہیں۔

باب الرفيع

البوابة الجنوبية لدار الإقامة الواقعة خلف مسجد "تشتة" مواجهة لمدينة ديوبند. بنيت تحت إشراف وفي إدارة المدير مولانا محمد طيب

Bab e Rafi

The southern gate of Daruttalaba Jadid, which was built during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. This gate is situated on the back of Chhatta Masjid facing towards the city. The visitors of this side mostly come in through this gate.

बाबे रफ़ी

दारुत्तलबा जदीद का जुनूबी दरवाजा जो बज़माने एहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुआ। यह दरवाजा मस्जिद छत्ता की पुश्त पर जानिबे शहर वाकय है। इस सिम्त के वारिद व सादिर अकसर इसी दरवाजे से दारुल उलूम में दाखिल होते है।

دارالعلوم دیوبند کی دو نئی درسگاہیں

جو احاطۂ مولسری کے جانب جنوب اسی سال (۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں) بہ زمانہ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوئیں۔ ہر درسگاہ کا رقبہ ۲۳½ × ۲۸½ مربع فٹ ہے۔

القاعتان الجديدتان

مدرجان بنيا حديثا في جنوب من احاطه مولسرى، في إدارة حضرة الحاج مولانا محمد طيب سنة ۱۳۷۸ﻫ الموافقة لسنة ۱۹۵۸، الميلادية. ومساحة كل منهما ۲۳½ × ۲۸½ قدما.

The two New Lecture Rooms

Both these new lecture rooms were built in 1378 Hijri(1958-A. D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tyyab sb.

Area of each rooms 28'5ft x 23'5ft.

दारुल उलूम देवबन्द की दो नई दर्सगाहें

जो महातये मोलसरी के जानिबे जुनूब सन १३७८ हि० मुताबिक १९५८ ई० में बज़माने महतमाम हज़रत मोलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुईं।

हर दर्सगाह का रकबा २३½×२८½ वर्ग फीट
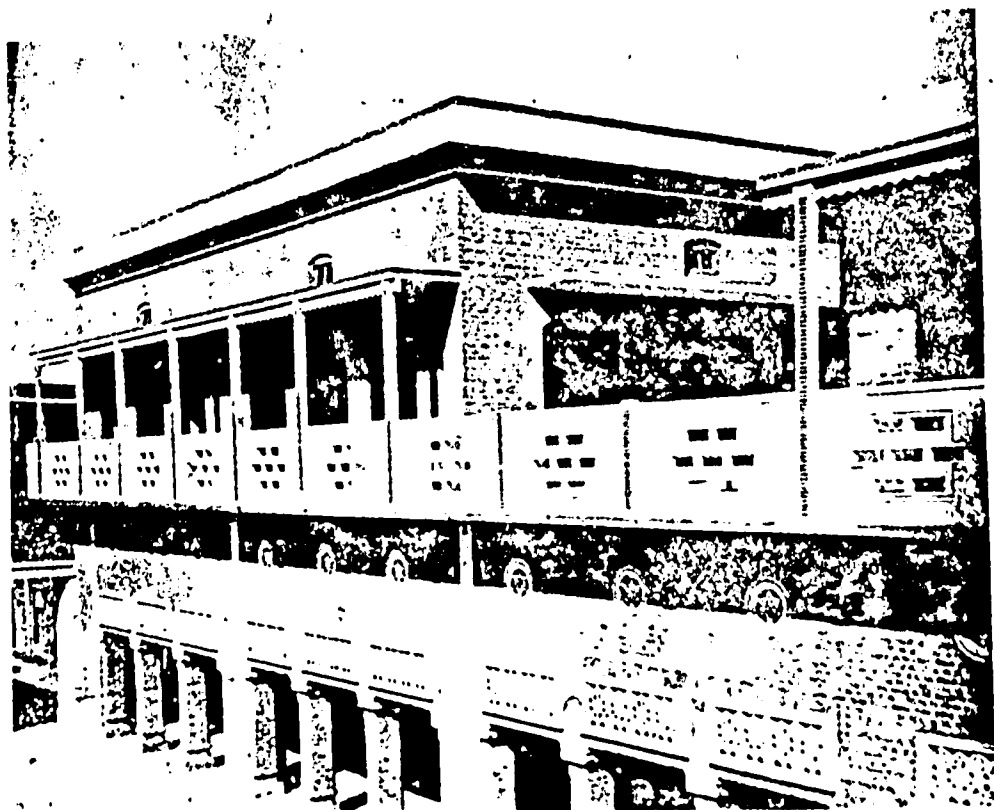
دارالطعام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مطبخ جس میں روزانہ تقریباً آٹھ سو طلبہ کا کھانا دونوں وقت تیار کیا جاتا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء
میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوئی ۔ رقبہ ۷۰×۵۵ مربع فٹ
لکڑیاں رکھنے اور کھانا تقسیم ہونے کی جگہ اس رقبہ کے علاوہ ہے ۔

دارالطعام

إحدى المباني الفخمة التي تشتمل على مطبخ الدار إلى جانب الأمكنة المختصة بالوقود
والأروقة لتوزيع الطعام، يعد الطعام في هذا المطبخ لنحو ثمان مائة طالب غدوة وعشيا،
تم بناء العمارة سنة ۱۳۶۲هـ الموافقة لسنة ۱۹۴۳م تحت إشراف المدير الحالي مولانا محمد طيب
أطال الله بقاءه . ومساحة المطبخ ۷۰×۵۵ قدما (غير الأمكنة والأروقة المخصصة للوقود و
توزيع الطعام)

Darul - Taam

The kitchen of Darul Uloom, Deoband where food is prepared twice a day for 800 students. It was built in 1362 Hijri (1943-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area-: Excluding the rooms for distributing the meals and for the storage of fuel 70ft x 55 ft.

दारुत्तआम दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द का मतबख जिसमें रोजाना लगभग ८०० तुल्बा का खाना दोनों वक्त तैयार किया जाता है यह इमारत सन् १३६२ हि० मुताबिक सन् १९४३ ई० में बजमाना मुहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्‌जिल्लहू तामीर हुई। रकबा ७० × ५५ वर्ग फीट

(नोट—लकड़ियां रखने और खाना तकसीम होने की जगह इस रकबे में अलग है।)

دارالقــرآن

قرآن شریف حفظ وناظرہ، اور اردو کے ابتدائی درجات کی تعلیم کے لئے پانچ درسگاہوں کا مجموعہ جو جناب شیخ فیروز الدین صاحب تاجر کلکتہ کے مخصوص عطیہ سے ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب ظلہ، تعمیر ہوا۔

پانچوں درسگاہوں میں سے ہر درسگاہ کا رقبہ ۲۵ × ۲۱ مربع فٹ

دارالقرآن

إحدى المباني الفخمة التي تحتوي على خمس مدرجات فسيحة بنيت مما تبرع الشيخ فيروز الدين أحد تجار كلكته خاصاً لهذا الغرض، وتم بناؤها تحت إشراف وفي إدارة المدير مولانا محمد طيب سنة ۱۳۶۸ھ الموافقة لسنة ۱۹۴۹ الميلادية، وتختص للقرآن الكريم قراءة وحفظاً كما يتعلم فيها الطلاب اللغة الأردوية .ومساحة كل غرفة ۲۵ × ۲۱ قدما

Darul Quran

A row of five class rooms with the primary classes of Urdu and the classes of the Holy Quran (Hifz and Nazira). A special donation was awarded by Sheikh Ferozuddin, a prominent businessman in Calcutta for the construction of this building. It was built in 1368 Hijri (1949 A. D.) During the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area of each class room. 25ft x21ft.

'दारुल कुरान दारुलउलूम देवबन्द'

कुरान शरीफ हिफ्ज व नाजरे और उर्दू के इब्तदाई दरजो की तालीम के लिए पांच दर्सगाहों का मजमूआ जनाब शेख फीरोजुद्दीन साहब ताजिर कलकत्ता के मखसूस अतीये से सन् १३६८ हि० मु० १६४६ई० बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना मु० तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुआ । पांचों दर्सगाहों में से हर एक का रकबा २५×२१ वर्ग फीट
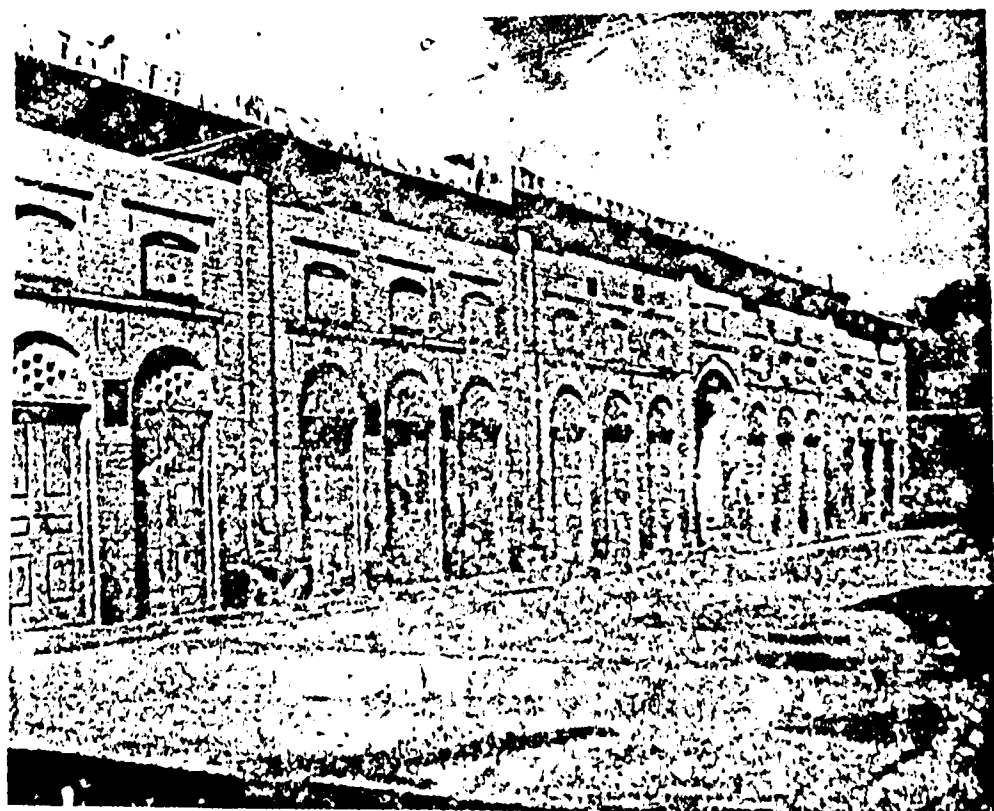
شعبۂ زبان فارسی دارالعلوم دیوبند

۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔ اس شعبہ میں دیگر عصری مضامین کے ساتھ ساتھ فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ جس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں نے استفادہ کیا ہے۔ رقبہ ۴۳×۴۶ مربع فٹ

معهد اللغة الفارسية

بناء جميل بنى فى إدارة مولانا محمد طيب سنة ١٣٥٦هـ الموافقة لسنة ١٩٣٧ الميلادية، ويدرس الطلاب فيه اللغة الفارسية، ويتخرجون فيها منه نهائيا إلى جانب العلوم الحاضرة اللازمة. ومما يذكر أنه لم تقتصر إفادة هذا المعهد عند المسلمين، وإنما يفيد منه غيرهم أيضا.

المساحة ٤٦×٤٣ قدما

The Department of Persian Studies

It was built in 1356 Hijri (1937-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. In this department the modern subjects are taught together with the persian language, the standard of which is very high. Muslims and non Muslims both derive benefits from this department.

Area :- 46 x 43ft.

शोबये जबान फारसी दारुल उलूम देवबन्द

सन १३५६ हि० मुताबिक सन १९३७ ई० में बजमानये महतमाम हजरत मोलाना मुहम्मद तैयब साहब महजिल्लहू तामीर हुआ। इस शोबे में दीगर असरी मजामीन के साथ साथ फारसी की आला तालीम दी जाती है। जिस में मुसलिम और गैर मुसलिम दोनों ने इस्तफादा किया है

रकबा ४६×४३ वर्ग फीट

دارالکتب دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کے عظیم الشان کتب خانہ کی طویل و عریض عمارت جس میں ایک عظیم ہال اور اس کے اردگرد چھ بڑے بڑے کمرے ہیں. تقریباً ایک لاکھ کتابوں کا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے. یہ عمارت ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ تعمیر ہوئی۔ ہر کمرے کا رقبہ یہ ہے (۱) ہال کا رقبہ ۴۹×۲۳ مربع فٹ (۲) ۲۰×۱۹ مربع فٹ (۳) ۲۵×۱۳ مربع فٹ (۴) ۲۴×۲۰ مربع فٹ (۵) ۳۷×۱۳ مربع فٹ (۶) ۲۲×۲۰ مربع فٹ (اس کے نیچے صنعتی درسگاہ ہے جس میں جلد سازی، چرم دوزی، خیاطی وغیرہ کی صنعتیں فضلاء دیوبند کو سکھائی جاتی ہیں)

دارالکتب

للمعهد مكتبة فخمة تحوى على مائة ألف كتاب تقريباً وتشغل بناية عظيمة فيها قاعة كبيرة تحوطها ست غرفات فسيحة من حولها تم بناؤها تحت إشراف فضيلة المدير مولانا محمد أحمد بن قاسم العلوم حجة الاسلام مولانا محمد قاسم النانوتوىؒ سنة ۱۳۲۴ھ الموافقة لسنة ۱۹۰۶ الميلادية. وتقع تحتها بناية دار الصناعة التى يتعلم فيها الخريجون وغيرهم تجليد الكتب والخياطة ونراها فى الصورة. مساحة القاعة الرئيسية (۱) ۴۹×۲۳ قدما، مساحة الغرفات (۱) ۲۰×۱۹ قدما (۲) ۲۵×۱۳ قدما (۳) ۲۴×۲۰ قدما (۴) ۳۷×۱۳ قدما (۵) ۲۲×۲۰ قدما.

Darul-Kutub

The spacious building of the grand library of Darul Uloom which consists of a great hall and five big rooms. The collection of books amounts to nearly one Lac. It was built in 1324 Hijri (1906 A. D.) during the "ehtemam" of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. Areas of various rooms

Hall :- 49ft x 23ft. 1st room :- 20ft x 19ft.
2nd room :- 25ft x 13ft. 3rd room :- 24ft x 20ft.
4th room :- 37ft x 13ft. 5th room :- 22ft x 20ft.

(The rooms below the library are occupied by the Industrial Department)

'दारुल कुतुब दारुल उलूम देवबन्द'

दारुल उलूम के अजिमुश्शान कुतुब खाने की तवील व अरीज इमारत जिस में एक अजीम हाल और उसके इर्द गिर्द ६ बड़े बड़े कमरे हैं। तकरीबन एक लाख किताबों का जखीरा हर वक्त मौजूद रहता है। यह इमारत सन् १३२४ हि० मुताबिक सन् १९०६ ई० में बजमाना मुहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मुहम्मद अहमद साहब पुत्र कासिमुल उलूम मौलाना नानौतवी तामीर हुई। हर कमरे का रकबा निम्न लिखित है :---

(१) हाल का रकबा ४९×२३ वर्ग फीट (२) २०×१९ वर्ग फीट (३) २५×१३ वर्ग फीट (४) २४×२० वर्ग फीट (५) ३७×१३ वर्ग फीट (६) २२×२० वर्ग फीट

इसके नीचे दारुल उलूम की सनअती दर्सगाह दारुस्सनाये है जिस में जिल्द साजी, चिर्मदोजी, खय्याती आदि की सनअतें फुजलाये देवबन्द को सिखाई जाती हैं।
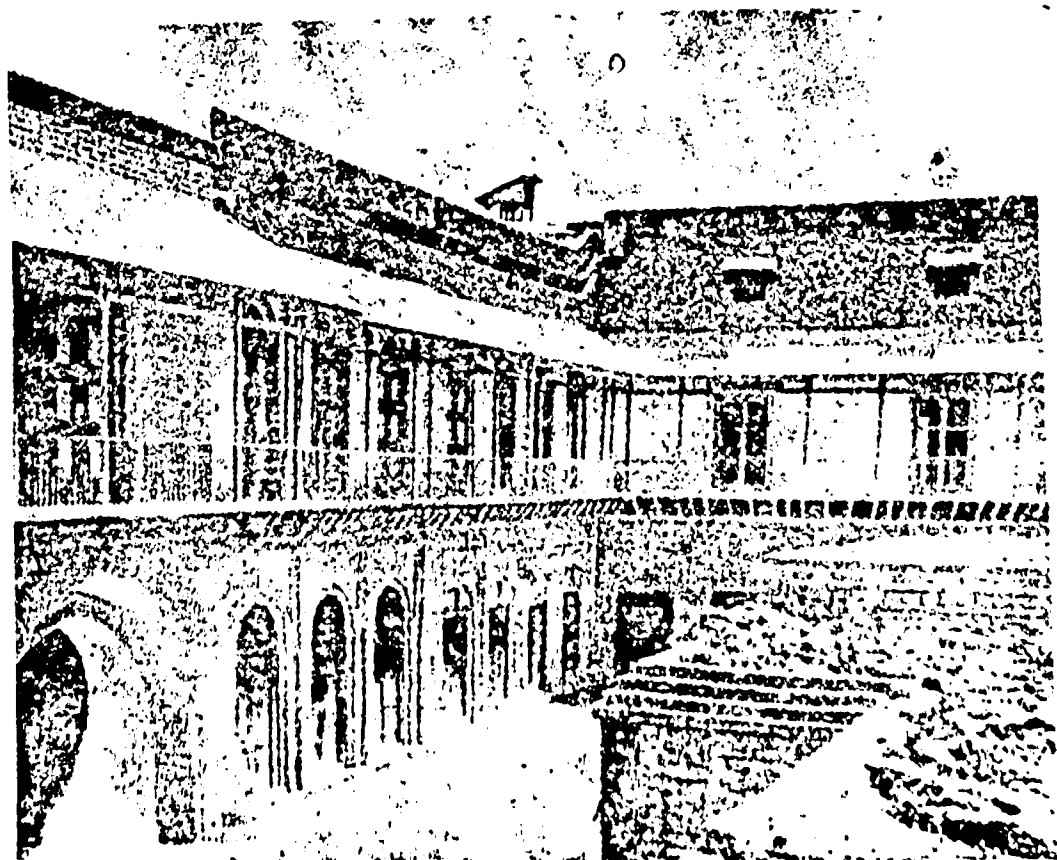
دارالکتب (اندرونی ہال)

دارالکتب (منظر من الداخل)

Darul Kutub (Inner view)

दारुल कुतुब (अन्दरूनी मंज़र)

دارالاضیاف

دارالعلوم دیوبند کا جدید شاندار مہمان خانہ جس میں بیک وقت تقریباً پچاس ساٹھ مہمانوں کے قیام و آسائش کا ہر وقت انتظام رہتا ہے۔ یہ مہمان خانہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوا۔

رقبہ ۱۱۵ × ۸۰ مربع فٹ

دار الأضياف

مبنى جديد يخص للأضياف، وهو بناء فخم مزود بكل ما يحتاج إليه الزوار، والعمارة تتسع لخمسين ضيفاً في وقت واحد، وتم بناؤها تحت إشراف المدير مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه سنة ١٣٧٧هـ الموافقة لسنة ١٩٥٨ الميلادية.

مساحتها ١١٥ × ٨٠ قدما

Darul - Azyaf

The new magnificient guest house, furnished with all the requirements to accomodate fifty to sixty guests at a time, free of all charges. It was built in 1377 Hijri (1958-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moolana Mohammed Tayyab sb.

It covers an area of 115ft x 80ft.

"दारुल–अजयाफ़"

दारुल उलूम देवबन्द का जदीद शानदार मेहमान खाना जिसमें एक ही वक्त में लग भग पचास साठ मेहमानों के क़याम व आराम का हर वक्त प्रबन्ध रहता है। यह मेहमान खाना सन् १३७७ हि० मुताबिक सन् १९५८ ई० में बज़माना महतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्‌ज़िल्लहू तामीर हुआ।

रकबा ११५×८० वर्ग फीट
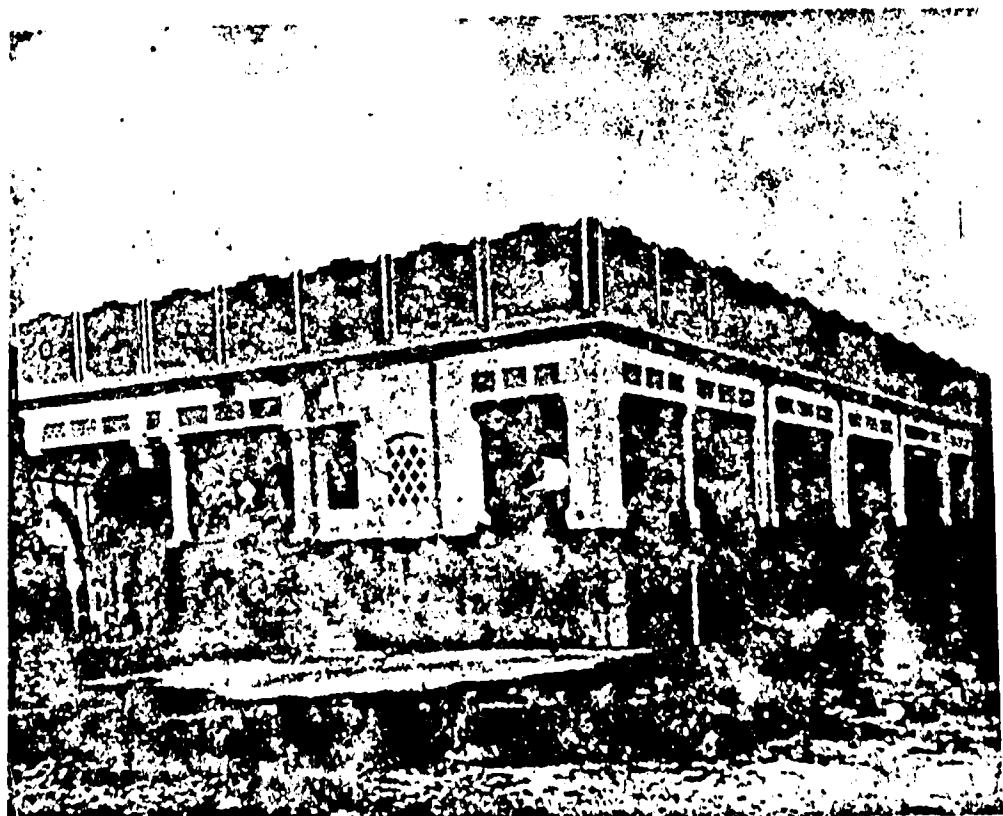
مسجد چھتّہ

دار العلوم دیوبند کا اوّلین نقطۂ فیض جس کے صحن میں انار کے درخت کے نیچے ایک شاگرد (شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ) اور ایک استاذ (ملّا محمود قدس سرہٗ) سے دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔ یہ مسجد کئی صدی پہلے کی قدیم ترین تعمیر ہے۔

رقبہ ۸۴ × ۴۰ مربع فٹ

مسجد تشتّه

إحدى المبانى الأثرية القديمة بنيت منذ قرون، ولهذا المسجد فى تاريخ الدار أهمية خالدة فهو الينبوع الأول الذى تفجرت منه عيون المعرفة والحكمة إذ جلس فيه تحت شجرة رمان مولانا محمود حسن (شيخ الهند) أول تلميذ أمام مولانا ملا محمود أول أستاذ لدار العلوم، وتلقى أول درس فى هذا المعهد الذى قدر له أن يصبح فيما بعد ما هو عليه اليوم

المساحة ٤٠×٨٤ قدما

Chhatta Masjid

The starting point of Darul Uloom's spiritual progress, the "Chatta mosque". In its courtyard Darul Uloom was started under a pomegranate tree with a teacher (Late Mulla Mahmood) and a student (Late Hazrat Moulana Mahmood Ul Hasan.) It is an ancient mosque centuries old.

Area :- 84ft x 40ft.

'मसजिद छत्ता'

दारुल उलूम देवबन्द का अव्वलीन नुक़्तए फ़ैज़, जिसके सहन में अनार के दरख़्त के नीचे एक शागिर्द (शैखुलहिन्द हज़रत मौलाना महमूद हसन साहब) और एक उस्ताद मुल्ला महमूद (कुद्दसा सिर्रहू) से दारुल उलूम देवबन्द का इफ़्तताह हुआ। यह मसजिद कई सदी पहले की क़दीम तरीन तामीर है

रक़बा ८४ · ४० वर्ग फीट

دارالعلوم دیوبند کی وسیع عمارت کا مجموعی اور عمومی منظر

جس میں دارالعلوم کی تمام عمارات کے ساتھ دارالتفسیر کا شاندار گنبد نمایاں نظر آرہا ہے۔

المنظر العام لدار العلوم مبانيها الشامخة

ويرى فيه قبة دار التفسير العالية الشامخة مع مباني دار العلوم الأخرى.

General view of the buildings of Darul Uloom Deoband

All the buildings of Darul Uloom together with the splendid dome of Darul-Tafseer are visible.

दारुल उलूम देवबन्द की वसी इमारत का मजमूई और अमूमी मंजर

जिस में दारुल उलूम की तमाम इमारात के साथ दारुत्तफसीर का शानदार गुम्बद नुमाया नजर आरहा है।
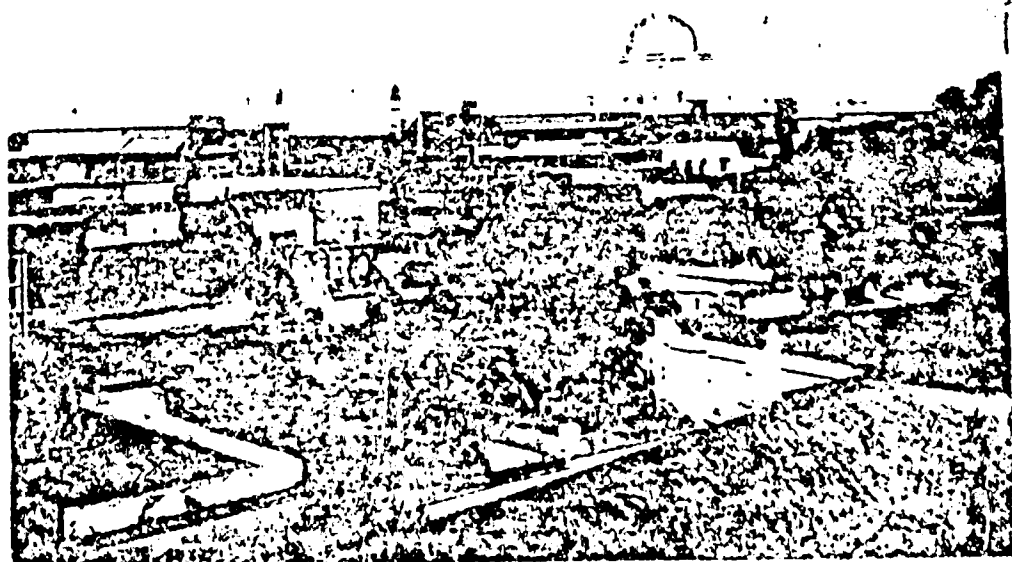
PHOTOS

of
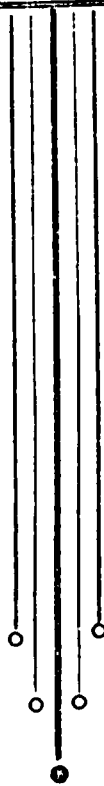
THE BUILDINGS OF DARULULOOM DEOBAND

एम हसन (वाइस चांसलर ढाका यूनिवरसिटी)

"यह दारुलउलूम देवबन्द सही मानों में यूनिवरसिटी है। मुझे हिन्दुस्तान और यूरोप की बहुत सी यूनिवरसिटियों के बारे में जाती तजरबा है मैं कह सकता हूँ कि जदीद तर्ज की बहुत सी यूनिवरसिटियां इस कदीम तरज की यूनिवरसिटी से बहुत कुछ सीख सकती है"।

श्री अनवारुस सादात (वजीर हुकूमत मिस्र व जनरल सेक्रेट्रीमोतमर इसलामी)

इस अजीम तारीखी यूनिवरसिटी की जियारत ने मुझे मजबूर किया कि मैं खुलूस दिल से अपने उन भाईयों को मुबारकबाद पेश करूँ जो इस के निजाम को चला रहे हैं। मैं अल्लाह ताला से दुआ करता हूँ कि इस से इसलाम और मुसलमानों को हमेशा नफा पहूँचे और यह इलम व मारफत का एक मीनार साबित हो।

रईस रुसी वफ्द (बराये हिन्दुस्तान)

मैं ने यूनिवरसिटी (दारुलउलूम देवबन्द) को दिलचस्पी से देखा। महाद्वीप के इस हिस्से में यह मजहब इसलाम का एक मरकज है। मैं अपने मेजबानों को दरया दिली का शुकरिया अदा करता हूँ और दुआ करता हूँ कि अमन और फैयाजी का जज्बा जो मजहब इसलाम की रीढ की हड्डी है हिन्दुस्तानी जनता और सोवियत यूनियन की जनता के दरमियान हमेशा तरक्की पजीर रहे"।

अमरीकी वफ्द बराये हिन्दुस्तान

"हमारी अमरीकी जमात को एक दिन यहां (दारुलउलूम देवबन्द) में कयाम करने का मौका नसीब हुआ। हमने प्रसिद्ध आलामा और उनके शागिरदों से मुलाकातें कीं। दर हकीकत इसलाम ही का जज्बा रूह को नूर बख्शता है और यह नूर यहां (दारुलउलूम देवबन्द में) जूफशां है"।

(मुख्तार हसन, उमर हसन अहमद, अमीर रशीद, सईद अहमद, अमीर हुसैन, मुहम्मद अहमद, अमेरीका)

जनाब अली असगर हिकमत (सफीर ईरान बराये हिन्दुस्तान)

अल्लाह तआला का शुक्र है कि उसने इस अब्द जईफ को इस अजीमुश्शान दारुलउलूम देवबन्द की जियारत से नवाजा और यहां के असातेजाकराम और आलमा कराम की मसाहबत की तौफीक अता फरमाई। उनके कलमात तैयबात से इस अब्द जईफ के दिल व जान बहरावर हुए। इनके बाकी रहने वाले आसार व तालीफ से मैं महसूस हुआ जो कि बकोल 'मदाद आलमा अफजल मन माउश्शोहदा" (आलमा की रोशनाई शोहदा के खून से अफजल है) अपने दामन में रूहानी बरकात और आसमानी फजीलतें लिये हुये है।

एस० ई० मुल्लां (दक्षिणी अफ्रीका)

"दारुलउलूम के जुमला शोबों का बग़ौर मुलाहज़ा करते हुये मैं इस नतीजे पर पहुंचा हूं कि मैं ने अपनी मशाहदात और सफ़र में किसी जगह ऐसी अज़ीमुश्शान मज़हबी दर्सगाह नहीं देखी जो अपनी नौईयत में एक मर्कज़ी दर्सगाह कहलाने के क़ाबिल हो। मौजूदा तारीख़ इसकी नज़ीर नहीं पेश कर सकती"।

डी० जूलियस जरमानस (प्रोफ़ेसर बुडा पेस्ट यूनिवर्सिटी हंगरी)

मैं ने ख़ुद अपने मुल्क में देवबन्द के मदरसे के बारे में सुना। मुझे हमेशा से शौक़ था कि उलूम और इस्लामी इस्प्रिट (रूह) के इस क़िले को देखूं। तुर्की और मिस्र के क़दीम मदरसों के बाद जो मस्जिदों में क़ायम किये जाते हैं मुझे अर्बी और तालीमाते इस्लामी की इस गहराई और जोशो जज़्बे को देखकर और भी ज़्यादा हैरत हुई जो इस मदरसे के दर व दीवार में दायर व सायर है।

जनाब इब्राहीम अलजिबाली (रईस वफ़्द जामेआ अज़हर मिस्र)

"हमें जामेआ दारुलउलूम देवबन्द की ज़ियारत नसीब हुई। हम ने मिल्ल कर दरजात में फिर कर दर्स व तदरीस का मुआइना किया और इस मदरसे के मुदीर जनाब शेख़ क़ारी मोहम्मद उसमानी और हज़रात असातज़ा केराम से मुलाक़ात की हम ने ऐसा मंज़र देखा जिसने हमारे दिलों को मुसर्रत से भर दिया। और उनके चेहरों पर इल्म का नूर देखा। हम ने एक ऐसी जमात देखी जिसने उलूमे दीन यानी तफ़सीरे क़ुरान, हदीस, फ़िक़ा और उसूले फ़िक़ा की ख़िदमत के लिए अपनी ज़िन्दगी वक़्फ़ कर रखी है। इसके अलावा दूसरे उलूम भी पढ़ाये जाते हैं मसलन अर्बी, अदब, मन्तिक़ फ़लसफ़ा और अलाहियात आदि। हम दुआ करते हैं कि इन उलूम से उम्मत इस्लामिया को यह हज़रात नफ़ा पहुंचायें।

प्रोफ़ेसर ग्रेविन्ट (आक्सफ़ोर्ड यूनिवर्सिटी - लन्दन)

यह मेरी बहुत बड़ी ख़ुशक़िस्मती है कि मुझे देवबन्द देखने का इत्तिफ़ाक़ हुआ। मैं ने देखा कि क़दीम इस्लामी कल्चर अब भी यहां पूरी आबो ताब से दरख़्शां है। एक मुसर्रिख़ के लिए इस से ज़्यादा रोशन मौक़े का मैं तसव्वुर भी नहीं कर सकता"।

उसमान कांदू (नुमाइन्दा चीनी इस्लामी नेशनल सालवेशन फ़ेडरेशन)

मेरे लिए यह बाइसे सआदत है कि मुझे दारुलउलूम देवबन्द को देखने का मौक़ा नसीब हुआ। मैं समझता हूं कि यह एक ख़ालिस मज़हबी इदारा है जिसे अज़हरे मशरिक़ का ख़िताब दिया जा सकता है"।

आला हजरत शाह अफ़गानिस्तान

मै बहुत मसरूर हूं कि आज मुझे दारुलउलूम को देखने का मौका हासिल हुआ। यह दारुलउलूम अफगानिस्तान में और खास तौर पर वहां के मजहबी हलकों में बहुत मशहूर व मारुफ है। अफगानिस्तान के ओलमा दारुलउलूम देवबन्द के बानियों और यहां के असातजा को हमेशा इज्जत की निगाह से देखते आये है और इल्म व रुहानियत के यकीन में जो फजीलत और मरतबत उनहे हासिल है उसके हमेशा कायल व मद्दाह रहे हैं। बहुत से अफगान ओलमा इस दारुलउलूम से फैजयाब हुए और उन्हों ने अपने वतन अजीज वापस जाकर वहां इल्म की रोशनी फैलाइ और मुल्क की खिदमात अंजाम दी।

मिस्टर अब्दुल लतीफ (वजीर पदल व सेहत बर्मा)

'यह ऐसा इदारा है जिसने अपने हम मजहबों ही के लिए नहीं बल्कि पूरे मुल्क के लिये लायेक इनसान पैदा किये

मु० अब्दुल फत्ताह औदा (मिस्र)

"मै ने देवबन्द मे इसलाम और सुनत व ईमान का एक किला देखा और महसूस किया कि दीन किस तरह दुनिया और आखिरत की भलाइयों का जामिन होता है और किस तरह सल्फ सालेह की तकलीद, जिसकी हिफाजत यहां के बजुरगान दीन कर रहे है और जिस से यहां के तलबा फैजयाब हो रहे है एक बेश बहा मीरास शुमार की जासकती है। हमारे लिये जरुरी है कि हम इस तरीके को मजबूती से पकड़े और भविष्य की इमारतों के लिए इसे बुनियाद बनायें"

रशीद अहमद इसमाईल टिकोलिया (जोहांसबर्ग जुनूबी अफ्रीका)

अंग्रेजी जबान बोलने वाली दुनिया मे इसको (दारुलउलूम देवबन्द को) एटिन और कैमरिज का दरजा दिया जाता है। लेकिन मै कहता हूं कि यह दरजा इस की शान के लिए कमतर है। दारुलउलूम का मरतबा दूसरे इदारों मे कहीं ज्यादा बुलन्द है। सच तो यह है कि इस का कोई हमसर नहीं।

नियाज बरकीज (टरकी)

"आदवरगी और उसके बेशकीमत कलमी कुतुब के जखीरे ने मुझे खास तौर पर मुतास्सिर किया। मै ने यहां इतना कुछ पाया कि अपनी ममनूनियत के इजहार के लिये पूरी तरह अलफाज नहीं पाता। मैं उस काम पर जो यहां का अमला और मदरसीन अंजाम दे रहे है मुबारकबाद पेश करता हूं"।

दारुल उलूम देवबन्द

मशाहीर आलम की नज़र में

अल्लामा सैयद रशीद रज़ा (मिस्र)

" अगर मैं इस मदरसे को न देखता तो हिन्दुस्तान से बहुत ग़मगीन वापस जाता (तक़रीर)
मैं ने मदरसा देवबन्द में जिस को अज़हरे हिन्द का ख़िताब दिया जाता है एक अजीब इल्मी इज़हान तरक़्क़ी करते देखा। हिन्दुस्तान भर में मेरी आँखों को एसी ठंडक कहीं हासिल नहीं हुई जैसी कि मदरसा देवबन्द में हासिल हुई और न इतनी ख़ुशी कहीं हासिल हुई जितनी यहाँ। इसकी वजह सिर्फ़ वह ग़ैरत व इस्लाम है जो मैं ने इस मदरसे के उलमा में देखा"।
(रहबाला रिसाला अलमिनार मिस्र)

मौलाना अबुल कलाम आज़ाद (वज़ीर तालीम हुकूमते हिन्द)

आपकी यह दर्सगाह दर असल एक ऐसा कारख़ाना है जो मुसलमानों की रूहों को ढालता है यह कारख़ाना क़ायम है तो हमें परेशान न होना चाहिये। इस दर्सगाह के असलाफ़ ने अमल का जो नमूना पेश किया था और जिन मक़ासिद को लेकर यह दर्सगाह क़ायम की थी अगर वह रोशनी आपकी रहनुमाई कर रही है तो मैं आपको यक़ीन दिलाऊँगा कि शानदार मुस्तक़बिल इसके लिए तैयार है (तक़रीर)
"हिन्दुस्तान में इस्लामी तालीमात के इस अज़ीम तरीन इदारे में न सिर्फ़ यह कि इस मुल्क के तमाम हिस्सों से बल्कि बईद तरीन इलाकों मसलन इन्डोनेशिया, मलाया अफ़ग़ानिस्तान, वस्त-एशिया और चीन से तलबा खिंचे चले आते हैं। इतने वसी रक़बे के तलबा और उलमा में इस की मक़बूलियत, इसकी अज़मत व शोहरत की दलील है। इस बिना पर यह इदारा सही मानों में तालीमाते इस्लामी की एक बैनुलअक़वामी यूनिवरसिटी है"। (मुआइना)

डाक्टर राजेन्द्र प्रशाद (सदर जमहूरिया हिन्द)

"आपके दारुलउलूम ने केवल इस मुल्क के बसने वालों की ही ख़िदमत नहीं की बल्कि आप ने अपनी ख़िदमात से इतनी प्रसिद्धता प्राप्त करली है कि ग़ैर मुमालिक के तलबा भी आपके यहाँ आते हैं और यहाँ से तालीम पाकर जो कुछ उनहोंने यहाँ सीखा है अपने मुल्कों में उसकी इशाअत करते हैं। यह बात इस देश के सब ही निवासियों के लिये क़ाबिल फ़ख़्र है।

दारुल उलूम देवबन्द के बुज़ुर्ग इल्म को इल्म के लिए पढ़ते और पढ़ाते रहे हैं। एसे लोग पहले भी हुए हैं, मगर कम। उन लोगों की इज़्ज़त बादशाहों से भी ज़्यादा होती थी। आज दारुलउलूम के बुज़ुर्ग उसी तर्ज़ पर चल रहे हैं और मैं समझता हूँ कि यह सिर्फ़ दारुलउलूम या मुसलमानों की ही ख़िदमत नहीं बल्कि पूरे मुल्क और दुनिया की ख़िदमत है। आज दुनिया में माद्दियत के फ़रोग़ से बेचैनी फैली हुई है। और दिलों का इतमिनान और चैन मफ़क़ूद है। इसका सही इलाज रूहानियत है। मैं देखता हूँ कि सुकून व इतमिनान का यह सामान यहाँ के बुज़ुर्ग दुनिया के लिये मुहैया फ़रमा रहे हैं। अगर ख़ुदा को इस दुनिया को रखना मन्ज़ूर है तो दुनिया को बिल आख़िर इसी लाईन पर आना है। मैं दारुलउलूम में आकर बहुत मसरूर हुआ। और यहाँ से कुछ लेकर जा रहा हूँ"

पस इस आइने से सूरतन तो दारुलउलूम महसूस होगा और इसकी अजमाली तारीख से दारुलउलूम का काम और मकसद ज्ञात होगा और इस प्रकार मुतवस्सलीन दारुलउलूम के लिए फ़िकर व नजर और हिम्मत इल्म दोनों का सामान बहम पहुँच सकेगा जो इस आइने के बेतादाद जौहरों में से चन्द जौहरों की नकाब कुशाई है वरना गैर मालूम जौहर मालूम जौहरों से अधिक हैं जो असल ही के देखने से सामने आते हैं।

बकौल इक़बाल मरहूम

"कितने बेताब हैं जौहर मेरे आईने में, किस कदर जलवे तड़पते हैं मेरे सीने में"।

मुहम्मद तैयब

मुदीर दारुलउलूम देवबन्द

१० जिलहिज सं० ११७८ हिजरी

जोहरे - आइना!

दरपसे आइना तूती सिफतम दाश्ता अन्द ।

उंचे उस्तादे अजल गुफ्त हुमा मी गोयम ॥

दारुलउलूम देवबन्द अपनी आलमगीर शोहरत व नामवरी की वजह से किसी परिचय का मोहताज नहीं कि उसका नाम लेकर या काम पेश कर के उसे पहचनवाया जाये, अलबत्ता उसकी यह गैर मामूली शोहरत व अज़मत ही इस की ज़रूर मुक्तज़ी होती है कि अब तक जैसे उसे कानों से सुनते और दिलों से समझते आये है काश एक निगाह उसको देख भी लेते। तथापि इस के लिए लोग दूर दराज से यात्रा कर-करके देवबन्द आते हैं और उसे देखने की सआदत हासिल करते है जिससे दिलों को मज़ीद तमानियत व तिसकीन हासिल होती है । कोई उसकी विध्या तथा शिक्षा से मुतासिर होता है तो दरसगाहों का चक्कर लगाता है। कोई उसके नज़म व नस्क़ से असर लेता है तो वह इन्तज़ामी कार्यालयों में घूम-घूम कर इसका इन्तज़ामी माएहये अमल देखता है। कोई इसके गैर मामूली ज़खीरए कुतुब कलमी व गैर कलमी से शग़फ लेता है तो वह इसके कुतुबखाने की शान्दार इमारत की तरफ दौड़ता है। कोई इस के हिसाबात की सफाई से खुश होता है तो वह कार्यालय हिसाब महास्बी, औकाफ और मतबख वगैरा की इमारतों में घूमता है और कोई इस के मरकज़ी नज़म व तंज़ीम पर निगाह जमाता है तो वह मरकज़ नज़म दाइरा अेहतमाम की इमारत में आकर बैठने में खुशी महसूस करता है। अत: कामों के रंग-रंग होने में कामों से सम्बन्धित मकानों और इमारतों में पहुंच कर हस्बे इमतफाते खातिर कामों के नक़्शा देखने ही से हर एक को तसल्ली होती है। लेकिन मुल्क के करोड़ों मनुष्यों में से मादूद चन्द ही होते हैं जो दूर दराज सफर की सहूलतें बहम पहुंचाकर दारुलउलूम के जमाले-जहाँआरा का मशाहिदा कर पाते हैं वरना अधिकता उन बन्दगाने खुदा की है जो उमर भर दारुलउलूम के शोके-दीदार के जज़बात दिल ही दिल में लिये हुए हैं। मगर यहाँ पहुँचकर दीदार करने की माली इस्तेदाद नहीं रखते। उनके इन ही जज़बाते शोक की तिसकीन के लिए दारुलउलूम ने अपनी मुमताज़ और शान्दार इमारत के फोटो तैयार करने का निर्णय किया और ज़रेकसीर खर्च करके उन मुखलसीन के शोक का मदावा करते हुए दारुलउलूम की बसी और पुरशिकोह दरसगाहों, शान्दार दफातिर, इन्तज़ामी शोबाजात के केन्द्र और विशेष स्थानों के फोटोओं का एक मजमुआ (एलबम) तैयार किया जो "आइनाए-दारुलउलूम" के नाम से आपके सामने है ताकि जिस प्रकार आइना किसी वस्तु की परछाई दिखलाकर उसकी वास्तविक शकल से रुशनास करवाते है इसी प्रकार दारुलउलूम की इमारात का यह कागज़ी दर्पण इस की तामीरात का अक्स दिखलाकर - शायकीन को असल के दीदार का किसी हद तक लुत्फ बहम पहुँचा सकेगा और उस के नादीदा मुखलसीन जिस मरकज़ी दरसगाह का नाम और काम अपने कानों से सुनते चले आये हैं उस की एक झलक घर बैठे आंखों से भी देखलेंगे।

यह ज़रूर है कि अक्स देख कर असल के देखने की बेताबियाँ और बढ़ जायेंगी किन्तु जहाँ यह शोक दीदार के जज़बात भड़केंगे वहां फिलजुमला यह तसल्ली भी हासिल होगी कि कम से कम असल के खदोखाल का फिलजुमला अक्स तो नेत्रों के सामने है और अगर किसी बड़ी रकम से वहाँ की यात्रा कठिन है तो कम से कम उसकी बढ़ती हुई उन्नतियों के साथ तआवुन और हिम्मत भर इसकी माली तौर पर इआनत तो कठिन नहीं जो दीदार से अधिक महत्वपूर्ण है इस लिए इस आइने में दारुलउलूम की मुमताज इमारतो के यह ३० फोटो पेश किये जा रहे हैं और "दफ्तर जलसा दस्तार बन्दी" ने इन इमारतों के आग़ाज़ व इख़्तताम की मुख़्तसर तारीख मुरत्तब की है उसे हर इमारत के सामने दर्ज करदिया गया है जिस में पूरे दारुलउलूम की एक इजमाली तारीख बतौर खुलासा सामने आजायेगी।

M. Hasan. Vice Chancellor Dacca University.

It is a University in the real sense of the term. I have personal experience of many Universities in India and Europe and I can say that many Universities of the "Modern Type" may well learn many things from this Muslim "University" of the old type.

Anwarussadat - Minister Govt. of Egypt And General Secretary Of The Islamic Congress. Egypt.

On the occasion of my visit to this grand historical University I am compelled to offer my heartiest congratulations to my brethren who are running it. I pray to God to benefit Islam and the Muslims by it for ever, and that it may prove a light-house of learnings and spirituality.

Leader Of The Russian Delegation.

I have examined the University with interest. It seems to be a centre of Muslim religion in this part of the continent. I thank the hosts for their hospitality and hope that the spiritual peace and hospitality which is the back bone of Muslim religion will always prevail between the people of India and the people of the Soviet Union.

Leader of the American Delegation

We, the Jamat from America had the opportunity to spend a day here, met the leading Ulmas and their students. The spirit of Islam is indeed the light for soul. This light presents its rays here. (Mukhtar Omar, Hasan Ahmad, Amir Rasheed, Syeed Ahmed, Amir Husain, Mahmood Ahmad.)

Ali Asghar Hekmat, Ambassador of Iran

I thank God that He bestowed upon this humble servant the blessings of a visit to this grand institution Darul Uloom, Deoband and gave me a chance to sit in company with the revered professors and Ulamas. The heart and soul of this humble servant were enlightened with their pious words. I was extremely glad to see the ever lasting work and publications which bear the heavenly blessings and the celestial honour according to the saying "The ink of Ulamas is superior to the blood of martyrs"

unable to express my gratitude adequately. I offer my congratulations for the fine work carried by the staff and teachers and wish them all the best for the coming years.

S. E. Mullan (Durban - South Africa.)

After visiting all the departments of Darul Uloom, Deoband, I am of opinion that I have not seen such a splendid and grand religious institution, during my journey abroad, which may be titled as a central religious institution. Modern history cannot present its rival.

D. Julius Jermanus, Professor Budapest University Hungry.

I heard of Madrassa of Deoband already in my native country and have always been eager to visit this fortress of learning and of true Islamic spirit. After the old mosque schools of Turkey and Egypt I still was surprised by the depth of Arabic and Islamic learning and the vigour which reign supreme among the walls of the Madrassa.

Ebrahim Al-Jibali, Leader of The Delegation of Alazhar University, Cairo (Egypt)

We had the opportunity of visiting Jamia Darul Uloom, Deoband. We were shown round the lecture rooms of different departments and had a discourse with its secretary the revered Moulana Shabbir Ahmad Usmani and the revered professors. We perceived that which filled our hearts with joy, and witnessed the light of learning glaring on their faces. In other words we met those who have devoted their lives for the service of Islamic Learnings such as Tafsir of Holy Quran , Hadis, Fiqah and Usule Fiqah and included with it other subjects also, such as Arabic literature, Logic, Phillosophy and Astrology. We hope that it will prove to be a means of success for the Muslim community.

Grey Wint Oxford.

It has been my very good fortune to visit Deoband and to find here the ancient Islamic Culture still flourishing vigorously. For a historian I can imagine few more illuminating experiences.

Usman Kedov, Representative of Chinese Islamic National Salvation. Federation.

It is a priviledge to me for having an opportunity to pay a visit to Darul Uloom, Deoband. I find it is a pure religious institution which may be titled as the Al-Azhar in the East.

ever increasing materialism. Peace and tranquility have disappeared. The proper remedy for this disease is spritnality. I see that the authorities of Darul Uloom, Deoband are engaged in supplying this means towards peace and tranquility to the whole world. If God really wants this world to last longer, the world is compelled to follow this line. I was extremely glad to visit Darul Uloom, and I have gained something from here.

His Majesty The King Of Afghanistan

I am extremely pleased to have a chance to visit Darul Uloom, Deoband to day. This Darul Uloom is very well known in Afghanistan, specially in relegious quarters. The Ulamas of Afghanistan have ever been paying tributes of honour to the founders of Darul Uloom, Deobond and its professors, and have ever been admitting and appreciating their high position in the faith of learnings and sprituality. A number of Afghan Ulamas graduated from this Darul Uloom and after going back to their motherland they spread the light of learnings and served their own country.

Abdul Lateef, Minister of Law And Health Burma

It is an institution which has preduced worthy hands of not only the community but the country.

Mohammed Abul Fattah Auda, Egypt

In Deoband I found a fortress of Islam and a strong hold of Sunnat and Iman and came to know how Al-deen (Religion) adorns the worldly life and here after, and how the following of the righteons proves to be a precious heritage, which the renowned Ulamas have been preserving so long, and the shining students have been clinging to. It is exceedingly necessary that we should stand fast and build our future constructions on these very pillars

Rashid Ahmad Ismail Takolia, Johannesburg, South Africa.

In the English speaking world it (Darul Uloom, Deoband) is ranked as the equal to Eton and Cambridge. May I state that it is an understatement. Deoband towers greatly above any other institutions. Truly it has no equal.

Niyaz Berkez Turkey

I have been particularly impressed by the library and the valuable manuscripts it contained. I have seen so much cordiality and friendliness that I am

DARUL ULOOM, DEOBAND
AS
World famous personalities saw it

Syed Rashid Raza. Editor Almanar. Cairo. Egypt.

If I had not visited it (Darul Uloom, Deoband) I would have returned from India, sadly disgusted (Speach). Throughout India my eyes were not so much refreshed anywhere as in madrassa Deoband, nor did anything fill me with as much joy as this (Institution). It is merely due to the sincerity and devotedness which I witnessed in the Ulamas of this institution. I witnessed in madrassa Deobanbd, which is known as "Alazhar" of India, the dawn of a new religious and educational era (Almanar).

(Late) Moulana Abul Kalam Azad, Minister of Education Govt. of India.

This premier institution of Islamic studies in India attracts stdudents not only from all parts of the country but also from distant regions like Indonesia, Malaya, Afghanistan, Central Asia, and China. Its popularity with students and scholors of such a wide area is proof of its eminence. It is thus in the true sense an International Univerisity of Islamic studies. This institution of yours is really a workshop which moulds the souls of muslims. We should not bother about our future if this workshop is in order. If the practical example, set by the elders of this institution and the aims and objects for which this institution was started, are still guiding you. I will assure you that brilliant future is ready to embrace it.

Dr. Rajandara Prashad, President of India.

Your Darul Uloom has served not only the inhabitants of this country but has already gained such a reputation that students from far off countries come to join it. After completing their education here they go back to their native lands and preach whatever they have learnt. It is a thing which all the inhabitants of this country should be proud. of.

The elders of Darul Uloom have been learning and imparting education for the sake of education only. Such personalities, although very rare, were present in bygone days. They were honoured even more than the kings. Today the authorities of Darul Uloom are treading the same path. I think this is not the service to Darul Uloom and Muslims only, but the service to the whole country; in fact to the whole world. Today discontentment and un-easiness prevail all over the world due to the

In this "**Reflection of Darul Uloom**" thirty photographs of important buildings of Darul Uloom have been included. A brief history of the buildings prepared by the office of **Jalsa-e-Dastar-bandi** has been given on the opposite page. So this album will present before you the picture of Darul Uloom and the brief history will give you a conception of the works performed by this institution so far.

Mohammad Tayyab,

Mudeer, Darul Uloom, Deoband- (U. P.

Jauhar-e-Aina

Dar Pase Aina Tuti Sifatam Dashtaand Unche Ustade Azal guft Human me goyam

(They have seated me behind the mirror. I repeat whatever the master of eternity has taught)

Darul-Uloom, Deoband does not need any introduction due to its world-wide fame and the services rendered by it. But the very uncommon fame and dignity creates a desire to visit this institution. To fulfil this desire people come to Deoband from far off countries which gives them much satisfaction.

Those interested in education go round the lecture rooms; those interested in management visit the offices and the mode of the office work; those interested in the huge stocks of rare manuscripts and printed books go towards the grand library; those interested in the accounts visit the offices of the accounts, the endowments and, the kitchen; and those interested in the general management visit the hub of the management "Daftar Ehtemam"

In brief every visitor satisfies himself by visiting different departments according to his own taste. But out of the millions of people there are a few only who can afford to manage for such a long journey to visit Darul Uloom. The majority does not find an occasion to fulfil their long-cherished desire of visiting it. To fulfil this desire of such persons Darul Uloom decided to spend a large sum and arranged for the photographs of some of its prominent and splendid buildings such as spacious and grand lecture rooms and offices of different departments. We had it printed in the shape of an album, which is before you as a **"Reflection of Darul Uloom, Deoband."** It serves the purpose of a mirror in which the virtual images of the buildings of Darul Uloom are reflected.

The well wishers of Darul Uloom can there-by satisfy there keen desire of having a glimpse of this institution at there respective homes. Just as these virtual images are sure to incite the desire of visiting the real buildings, in the same way they are sure to satisfy that desire to some extent. Though it will be difficult to travel to such a long distance for paying a visit to Darul Uloom, it can be much easier to co-operate with its ever increasing improvements by helping it financially. This is more important than a visit.

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

جس قوم کا تہذیبی ورثہ لُٹ جائے اور حال ماضی سے کٹ جائے۔ وہ قوم گو نام سے باقی رہے، مگر حقیقت میں اس کی نبضیں خاموش ہوتی ہیں۔ وہ کسی دوسری قوم کے قالب میں جلوہ گر ہو تو یہ زندگی کی علامت نہیں اپنی اصل کے لحاظ سے موت کی آغوش میں ہے۔

اسلام اگر ایک زندہ مذہب ہے، تو تاریخ اسلام کے ہر دور میں اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ زندگی تسلسل کے بغیر زندگی نہیں اور اس کے تمام دور آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط و منظم ہونے چاہئیں۔ اسلام تاریخ کے مختلف دوروں میں خواہ کسی پیمانے میں رہا اور ناسازگار حالات میں سے اسے کیسے ہی کیوں نہ گزرنا پڑا، اسلام کی شاہراہِ حیات ہر دور میں موجود رہی اور اس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا کہ اس کی اساسی حیثیت کلیۃً مٹ چکی ہو اور آئندہ پھر نئے سرے سے طلوعِ اسلام ہوا ہو۔

دین کی غایت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی تعمیل ہے، وہی ذات واجب الوجود اس شاہراہِ تسلسل کی آخری منزل ہے۔ سب پیغمبر اسی ایک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اسی کی تلاش ہر دینی کاوش کا منتہٰی رہی۔ جس نے اسے پالیا، اس نے سب کچھ پالیا۔ اس کی طرف لوٹنا نجات، اور اس سے ٹوٹنا انشقاق و اضطراب کی آگ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے من انصاری الی اللہ کہہ کر بتلایا کہ میں خدا کی طرف بلانے والا ہوں تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی منزل کی نشاندہی فرمائی اور اللہ کی طرف بلانا اپنا رستہ بتلایا: قل ھذہ سبیلی ادعوکم الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی

یہ شاہراہِ تسلسل اسی ذات واجب سے چلتی اور اسی کی طرف لوٹتی ہے، تمام پیغمبرانہ دعوت کا اجتماعی نقطہ وہی ایک ذات ہے۔ جہاں تمام دینی محنتیں منتہی اور سب مذہبی کاوشیں ختم ہو جاتی ہیں، وہی منزلِ حقیقی ہے، جو اسے پالے، پھر اس کا اتصال بھی وصال ہو جاتا ہے۔

پیغمبروں کے بعد پیغمبروں پر ایمان لانے والے اس شاہراہ کے داعی رہے اور ان کی پیروی اس شاہراہ سے ملانیوالی نیکی کی راہ تھی۔ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ (پ۲۸ الممتحنہ) (بے شک تم لوگوں کے لیے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان کے ساتھیوں میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔

جو لوگ ایمان لاکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوتے ہوگئے۔ سب نے اپنے اپنے وقت میں لوگوں کو اسی ایک منزل کی دعوت دی تھی۔ جس راہ وہ چلے تھے، وہ آئندہ لوگوں کے لیئے نشان راہ ہوگئی۔ فرعون کے سامنے ایک مومن نے یہی کہا تھا کہ اب میری پیروی میں نیکی کی راہ ہے۔ وقال الذی امن یقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد۔ (پ ۲۴ المؤمن ع ۵) اور کہا اس ایماندار نے کہ اے قوم! میری راہ پر چلو، میں تم کو پہنچاؤں گا نیکی کی راہ پر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس شاہراہ کے داعی صحابہ کرامؓ تھے، وہ اپنے اپنے دائرۂ عمل و رسوخ میں خدا کے بندوں کو اس شاہراہ کی دعوت دیتے رہے اور آئندہ آنے والے لوگ ان ہی سے اس شاہراہ کا نشان لیتے رہے۔ یہ نجوم ہدایت اس راہ میں چلنے والوں کی روشنی اور حضور رحمۃ للعالمینؐ کے مشن (MISSION) کی عالمی رحمت تھے۔ ان کا اختلاف بھی رحمت تھا۔ جس سے زندگی کے ہر خاکے میں رنگ آگیا تھا زندگی کا ہر گوشہ عمل کی راہ پاتا اور زندگی ہر تعبیر میں حضور خاتم النبیینؐ کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتی۔

جس طرح خدا کی طرف بلانا تمام پیغمبروں کا اجتماعی نقطہ تھا، سب امت کو حضورؐ کے نقش قدم پر لانا تمام اصحاب رسولؐ کا اجتماعی نقطہ رہا اور اصحاب رسولؐ کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ آئندہ آنے والے لوگ ان کے نقش قدم پر چل کر اس شاہراہ سے مسلسل ہوں، جو انبیاء کی میراث ہے، ان کی دعا رہی کہ اسلام کا ہر قافلہ اپنے بعد آنیوالوں (SUCCESSORS) کی پیروی سے اپنے پہلوں (PIONEERS) کے ساتھ مسلسل رہے، قرآن کریم میں اللہ کے بندوں کی یہ دعا مذکور ہے۔

واجعلنا للمتقین اماما۔ (پ۱۹ الفرقان ع ۶) (ترجمہ: اے اللہ ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنادے۔ یعنی ایسا بنادے کہ لوگ ہماری پیروی کرکے متقی بن جایا کریں۔ حضرت امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) نے اس دعا کا یہ معنی تحریر فرمایا ہے؛ ائمۃ نقتدی بمن قبلنا و یقتدی بنا من بعدنا (صحیح بخاری، جلد ۹/ص۱۱۳) ترجمہ: اے اللہ ہمیں ایسے پیشوا بناکہ ہم تو اپنے پہلے ائمہ کرام کی پیروی کریں اور ہمارے بعد آنیوالے ہماری پیروی کریں (اور ہمارے ساتھ مسلسل ہوں۔

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ (۳۶ھ) کو مخاطب کرکے بڑی بلیغ ہدایت فرمائی؛ انکم ایھا الرھط ائمۃ یقتدی بکم الناس۔ (موطا امام مالکؒ صفحہ ۳۲۲ کتاب الحج) (اے اصحاب رسولؐ) بیشک تم لوگوں کے امام ہو لوگ تمہاری پیروی کریں گے۔ پس تمہیں بڑا محتاط رہنا چاہیئے۔

اور ہر اس بات سے بچنا چاہیئے جو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی اس نصیحت میں پیروی کرنیوالوں کے پیروی کرنے پر کوئی تنقید نہیں کی، جنکی پیروی ان کی راہ ہوگی، انھیں ہی اپنے ماقبل طریقے کے التزام کی تاکید کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کو آسمانِ ہدایت کے ستارے جانتے تھے۔ کہ جو ان میں سے کسی کی پیروی کرے۔ ہدایت پاجاتے۔ وہ لوگوں کو اس شاہراہ پر لانا اور اسی پر چھوڑنا چاہتے تھے، جو اپنے مابعد اور ماقبل سے مسلسل ہو۔ اللہ کی رسی کا ہر جوڑ اپنے ماقبل اور مابعد سے تو متصل ہو، لیکن دائیں بائیں کسی طرف سے مربوط نہ ہو۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ (۹۲ھ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ (آخری حج میں) جب منٰی سے واپس ہوئے، تو رستے میں وادیٔ بطحا میں ٹھہرے، زمین پر چادر بچھائی، اس پر بیٹھے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکر کہا، اللھم کبرت سنی وضعفت قوتی وانتشرت رعیتی فاقبضنی الیک غیر مضیع و لا مفرط (اے اللہ میں بوڑھا ہوچکا ہوں، قویٰ کمزور ہوگئے اور میری رعیت بہت دور تک پھیل چکی ہے۔ اب تو مجھے اپنی طرف بلالے۔ کہ میں بغیر کسی زیادتی اور کمی کے تیرے ہاں حاضر ہوجاؤں۔ پھر آپ مدینہ تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا اور ایک ہاتھ دوسرے پر مارتے ہوئے کہا: ایھا الناس قد سنت لکم السنن و فرضت لکم الفرائض و ترکتم علی الواضحۃ الا ان تضلوا بالناس یمینا و شمالا - وضرب باحدی یدیہ علی الاخری (موطا امام مالک ص۳۴۹ کتاب الحدود، (اے لوگو! تماری راہیں متعین ہوچکی ہیں اور تماری ذمہ داریاں طے ہیں، تم ایک شاہراہ پر چھوڑے گئے ہو۔ دیکھنا دائیں بائیں طرف دیکھ کر (دوسری قوموں کے متوازی نظریات سے اثرات لے کر) گمراہ نہ ہوجانا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آقا حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے پیشرو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جو شاہراہ پائی تھی، جس پر آپ خود بھی چلتے رہے اور دوسروں کو بھی چلاتے رہے۔ اب آپ اسی شاہراہ میں سلامتی کی راہ بتلا رہے ہیں اور متنبہ فرما رہے ہیں کہ عصری تحریکات سے متاثر ہوکر اپنی شاہراہ کو چھوڑ دینا یا اس میں ترمیم کرنا گمراہی کی راہ ہے۔ سلامتی انہی کی ہے، جو اس شاہراہ مسلسل میں چلیں اور زندگی کے خاکے میں اسلاف کی اتباع کا رنگ بھریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۳۲ھ) نے شاہراہِ اسلام کے پہلے قافلے سے متصل رہنے کی یوں تلقین فرمائی۔

من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تومن علیہ الفتنۃ اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔ (مشکوٰۃ شریف)

(ترجمہ) جس کو کسی لائن پر چلنا ہو اسے چاہیئے کہ ان لوگوں کی لائن پر چلے جو اس دنیا سے جاچکے۔ کیونکہ زندوں پر

ابھی آزمائشیں ختم نہیں ہوئیں، وہ جاننے والے جن کی اتباع پر چلنا ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ یہ طبقہ امت اسلامی کا بہترین طبقہ تھا۔ ان کے دل بہت نیک تھے اور ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا، ان میں بناوٹ نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پیغمبر کی صحبت کے لیے اور دین کی اقامت کے لیے چنا ہوا تھا۔ ان کی فضیلت پہچانو، ان کی شاہراہ پر چلو، جہاں تک ہوسکے۔ ان کے اخلاق اور ان کے طریقوں کی پیروی کرو۔ بے شک وہ سیدھی راہ پر تھے۔ (تنقیح اللمعات جلد ۱ ص ۲۴۰)..... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد تابعین کو نصیحت کرتے ہوئے تھا کہ وہ صحابہؓ کی پیروی کرتے ہوئے ہدایت کی راہ پر چلیں۔ فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد محض ایک اتفاقی نصیحت نہ تھی، وہ امت کو آئندہ اٹھنے والے فتنوں میں حق کی راہ بتا رہے تھے۔ ؎ کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

بزرگانِ دین کا نورِ بصیرت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کی مسند تدریس پر درس دیتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) اپنے وقت میں اسی مسند علمی کے وارث بنے۔ اُن دنوں تین ہی اسلامی دنیا کے علمی مرکز تھے۔ حجاز جہاں امام مالکؒ (۱۷۹ھ) رونق افروز تھے۔ شام: جہاں امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) حدیث و فقہ کا مرجع تھے اور عراق، جہاں کی مسند علمی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے آباد تھی۔

علم الٰہی میں یہ بات موجود تھی کہ دین میں اٹھنے والے علمی فتنے زیادہ تر عراق سے اٹھیں گے۔ اعتزال اور انکار قدر کی تحریکیں یہیں سے سر اٹھائیں گی۔ شیعیت کا مرکز بھی یہی زمین ہوگی، ظاہر ہے کہ ان تمام فتنوں میں سلامتی کی راہ صحابہ کرام کے نقش قدم کی پیروی اور انھیں معیارِ حق تسلیم کرنا تھا اور وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیائے اسلام کے نجوم ہدایت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کوفہ کی مسند تدریس کے پہلے معلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر کے ساتھی اور خلفائے راشدین کے بعد افضل الاصحاب سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے دل میں ڈال دی اور آپ نے تابعین کو صحابہ کرامؓ کی پیروی کی راہ بتلائی، اسے ہی سلامتی کی راہ سمجھا اور آپ نے مذکورالصدر اصول بیان کرکے آئندہ اٹھنے والے تمام فتنوں کا اصولی سدباب کردیا۔ بزرگانِ دین کی فراست کی عجیب شان ہے وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں۔

حجاز یا شام کی علمی درسگاہوں کی ان اعتقادی اور علمی فتنوں سے براہ راست ٹکر نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ صحابہؓ کی بات کو حجت قرار دینے میں وہ شدت نہیں کرتے، جو درسگاہ کوفہ کے امام ابوحنیفہؒ نے اختیار کی اور دیگر کسی درسگاہ میں عقائد اسلامی کا وہ اصولی تجزیہ نہیں کیا گیا، جو امام ابوحنیفہؒ نے فقہ اکبر میں کیا ہے۔ حدیث و فقہ کے ساتھ کلامی مسائل میں یہ اہتمام اور ان میں اصول سنت کا پورا تحفظ حضرت امام کا وہ عظیم موقف ہے، جو رہتی دنیا تک ہر الحادی تحریک کے سامنے اسلام کا مضبوط قلعہ بنا رہے گا۔ حضرت امام سمجھ چکے تھے کہ علمی فتنوں کی ان تیز و تند آندھیوں میں سلامتی کی یہی ایک راہ ہے کہ صحابہ کرام کے نقش قدم کی پوری پابندی کی جائے اور اسلام کی شاہراہِ مسلسل کو لازم پکڑا جائے۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ ہندوستان میں اٹھنے والے خطرناک دینی فتنوں سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ نے یہاں کے

مسلمانوں میں امام ابوحنیفہؒ سے گہری دینی عقیدت پیدا کر دی تھی۔

ائمہ اربعہ میں دُوسرے امام جنہیں ان الحادی فتنوں سے واسطہ پڑا، حضرت امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) تھے۔ آپ فقہ میں زیادہ تر اہلِ حجاز کے ہم نوا تھے۔ مگر آپ نے جب مسئلہ خلق قرآن میں معتزلہ کے فتنوں کو قریب سے دیکھا، تو آپ بھی صحابہ سے تمسک کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کے ہمنوا ہو گئے۔

حافظ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں: جعل للصحابة فی ذالك مالم يجعل لغيرهم واظنه مال الیٰ ظاهر حديث اصحابی كالنجوم والله اعلم والیٰ نحو هذا كان احمد بن حنبل يذهب (جامع بيان العلم جلد ۲ صـ۱۰۱) ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ نے اتباعِ حق میں صحابہ کا وہ درجہ ٹھیرایا ہے۔ جو صحابہؓ کے علاوہ اور کسی طبقہ کے لیے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ حدیث اصحابی کالنجوم کے ظاہر پر مطمئن تھے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبلؒ کا تھا۔ محمد بن عبدالرحمٰن الصیرفیؒ کہتے ہیں کہ مَیں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ جب صحابہ کرام کسی مسئلے میں مختلف ہوں، تو اس میں غور و فکر کرنا کہ حق پر کون ہے تاکہ اس کی پیروی کی جاسکے، کیا جائز ہے؟ امام احمدؒ نے فرمایا: "نہیں"

يجوز النظر بين اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم (جلد ۲، صفحہ ۱۰۲) میں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ؟ تو آپ نے فرمایا، تقلد ايهم احببت تاکہ ان میں سے جس کی چاہو پیروی کرسکو۔

حنبلی مسلک کے مقتدر امام حدیث ابو داؤد سجستانی (۲۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ اگر کسی مسئلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف روایتیں نقل ہوں تو صحابہ کرام کا عمل فیصلہ کرے گا کہ ان روایات میں سنت باقیہ کیا ہے، نظر الیٰ ما عمل به اصحابه۔ سنن ابی داؤد ۱۰۱ باب المرور بين يدى المصلى۔

یہ اسلام کی علمی میراث اور اس کا تہذیبی ورثہ ہے، جو حضورؐ سے صحابہؓ کو اور صحابہؓ سے تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کو پہنچی اسلام کی شاہراہِ مسلسل جو خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم کی بشارت نبوی میں صحابہ و تابعین سے مسلسل چل آ رہی تھی، امام ابوحنیفہؒ نے اس پر پہرہ دیا، امام احمدؒ نے تائید کی۔ اس سے تمسک دین مسلسل سے وابستگی ہے اور یہی دین قیم اور ایک زندہ مذہب ہے........ اسلام کی چودہ صدیوں میں ہر صدی میں بھی کچھ ایسے لوگ اُبھرتے رہے، جنہوں نے اسلام کے اصول و عقائد اور اساسِ اعمال کو ہر قیمت پر زندہ رکھا اور اس کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں آیا، جب قرآن کی تعبیر اور اسلام کی تعبیر تمام تحریف کی نذر ہو چکی ہوں، ورنہ اسلام ایک زندہ مذہب نہ رہتا۔ پھر یہ ایک مجموعۂ دساتیر ہے زندگی کا تسلسل نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ایسے افراد پیدا کئے جن کی زندگی اظہارِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے وقف رہی۔ ناسازگار حالات اور الحاد کی لہریں انہیں ایک انچ بھی شاہراہِ عظیم سے نہ ہٹا سکیں۔ یہ پاک شخصیتیں گو علی الانفراد معصوم نہیں، مگر ان کا مجموعی مؤقف ضرور معصوم رہا ہے۔ یہی اسباب کی وہ دُنیا ہے، جس کے ذریعہ دین کی ابدی حفاظت ہوئی اور رب العزت کا یہ وعدہ پورا ہوتا آیا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (پ ۱۴/سورۃ الحجر) (بے شک ہم نے ہی قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں) قرآن کریم نظم و معنی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جہاں الفاظ کا یہ نظم نہیں، وہ قرآن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محض ترجمہ قرآن کو قرآن نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہاں الفاظ کی وہ نشست اور ترتیب نہیں رہتی اسی طرح اگر معانی کی تعبیر غلط ہو تو بھی قرآن محفوظ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات بتلانے والا طبقہ ہر دور میں موجود رہا۔ پس قرآن پاک کی وہی تعبیر صحیح ہوگی، جس کا حال اس کے ماضی سے منقطع نہ ہو اور ہم صرف اسی تعبیر کو اختیار کر سکتے ہیں، جو اسلام کے اسنادی پہلو سے کہیں نہ ٹکرائے اسلام کے تسلسل حیات اور حفاظ دین کی خصوصیت اس کا اسنادی پہلو ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا ایک معجزہ ہے، اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ طاقتے ربانی رہے ہیں، جو آج سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں ـــــــ یہ صحیح ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی طبقہ بحیثیت طبقہ کے مقدس نہیں کہ پورے طبقے کو پاک باطن اور بلا استثناء عدول کہا جائے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس امت کا کوئی قرن مصلحوں، ہادیوں مجددوں اور مقتدیین سے خالی نہیں رہا اور ائمہ علم، ائمہ ہدایت اور ائمہ کمالات ظاہرہ و باطن کی کسی دور میں نفی نہیں ہوئی۔ ان آثار نبوت میں کوئی طبقہ نسبت ایمان و احسان کا محافظ رہا، کوئی نسبت احسان و عرفان کا، کوئی الفاظ قرآن کا اور کوئی سنت صاحب قرآن کا۔ اور یہ سب طبقے اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ تا قیامت باقی رہیں گے، یہی اسلام کی زندگی ہے اور یہی اسلام کا تسلسل ہے۔

قرآن کریم کی ابدی حفاظت کا دائرہ الفاظ کتاب اور مطالب کتاب ہر دو کو محیط ہے، جس طرح اس کے نقوش کتابیہ ہر تحریف لفظی سے محفوظ ہیں، اس کے معانی و مطالب بھی ہر تحریف معنوی سے مصئون ہیں۔ الفاظ اور معانی و مطالب دونوں کی حفاظت ہوتی چلی آئی ہے۔

قرآن کریم کی اس ابدی حفاظت کا خود رب العزت نے تکفل فرمایا اور اس کے لیے ہر اسباب پیدا کئے۔ وہ اُمت کے اہل حق کے ذریعے اس کے طرق حفاظت ہیں، جب بھی اسلام کے خلاف کفر و الحاد کی آندھی چلی۔ رب العزت نے اس امت کے بہترین نفوس اس کے مقابلے میں کھڑے کر دیئے۔ ہر بزرگ نے اپنے مناسب حال کسی نہ کسی مورچے کو سنبھالا اور ایسے بڑے مسلمانوں کا ایک قافلہ ہر دور میں باطل سے نبرد آزما رہا، ان افراد کا کبھی جزئی مسئلے میں کوئی اختلاف ہو تو ہو، لیکن ان کی مجموعی کوششیں ہمیشہ معصوم رہی ہیں۔ یہ حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ کا دین تاریخ کے ہر دور میں زندہ ہے۔ دسویں صدی ہجری کے مشہور فاضل علامہ حسن شرنبلالی (صاحب نور الایضاح) اپنے رسالہ "النفحۃ القدسیہ" میں لکھتے ہیں: امرنا بحفظ النظم والمعنی جمیعا فانہ دلالۃ علی النبوۃ ص۲۱) ہم لوگ قرآن پاک کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت پر مامور ہیں اور یہی نبوت کا معجزہ ہے۔

ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عن تحریف الغالین وانتحال المبطلین

———— ۱۰۲

وتاویل الجاھلین. (کتاب المدخل) (ترجمہ: اس علم کو ہر صحیح جانشین سے آگے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے، وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویل کو ہمیشہ دُور کرتے رہیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:-

ان منکم من یقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیلہ۔ (بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو قرآنی مرادات کے لیے بھی اسی طرح جہاد کریں گے، جیسے تنزیلِ قرآن پر میں جہاد کرتا رہا ہوں (ابو کاقال، رواہ احمد و الطحاوی) اس روایت میں الفاظِ قرآن کی طرح مرادات قرآن کے تحفظ کی بھی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ امت کے فیصلے قرآن پاک کی بدلفظی اور معنوی تحریف سے پوری طرح حفاظت رہے گی۔ حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:-

لن یبرح ھذاالدین قائما یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعۃ۔ (دین برابر قائم رہے گا اور اس کے لیے مسلمانوں کا ایک طبقہ برابر لڑتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ حدیث روایت کی:-

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تزال طائفۃ من امتی قائمۃ بامراللہ لا یضرھم من خذلھم اوخالفھم حتی یاتی امراللہ وھم ظاھرون علی الناس (صحیح مسلم) ج۲ ص۱۴۳ (میری امت کا ایک طبقہ امرالٰہی پر برابر قائم رہے گا، جو انھیں ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے یا ان کی مخالفت کریں گے، وہ انھیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ طبقہ لوگوں پر ظاہر رہے گا۔)

فطرتِ سلیمہ کے خلاف چلنے اور حق سے ٹکرانے والے اگر قیامت تک رہیں گے تو ایسے مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ ضرور رہے گا، جو اپنے مالک کی وفاداری اور اطاعت میں اس کے رحم وکرم اور رضوان و غفران کا مظہر ہوں۔

ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذالك خلقھم (پ ۱۲، سورۂ ھود)

اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، مگر جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

درخانۂ عشق از کفر ناگزیر است — دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

قرآن پاک نے اس مقام پر ایک ایسے ہی طبقے کی نشاندہی کی ہے، جو رحم وکرم کا مظہر ہوکر قیامت تک دینِ فطرت کا ساتھ دے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بتلایا کہ آپ کی اُمت گمراہی کے کئی حصوں میں بٹ جائے گی، تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایک طبقہ جو میری سنت اور میری جماعت کے مطابق ہوگا، وہ حق پر ہوگا اور وہی راہِ نجات ہوگی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والا طبقہ قیامت تک باقی رہے گا، اور کوئی آندھی حق کے درخت کو اپنی جڑ سے نہ اکھاڑ سکے گی ؎ نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ائمہ ھدایت اور ائمہ ضلالت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق اور باطل کی معرکہ آرائی برابر جاری رہے، تو جس طرح ہدایت مسلسل رہے گی، گمراہی بھی برابر چلے گی. اب ان کا امتیاز کیسے ہو؟ جواباً گزارش ہے کہ خطِ مستقیم صرف ایک ہوتا ہے اور ٹیڑھے خط کئی. ہدایت کی راہ صرف ایک ہے۔ اور باطل کی راہیں کئی ہیں۔ قرآن کریم نے ظلمتوں کو جمع کی صورت میں اور نور کو واحد کی صورت میں ذکر فرمایا ہے۔ جعل الظلمات والنور (پ، سورۃ الانعام)

پس ہدایت کے باقی رہنے میں مسلسل رستے کی بقا ہے اور گمراہی کے باقی رہنے میں کسی ایک طریق کی بقا ضروری نہیں، ہو سکتا ہے کبھی کوئی گمراہی سر اٹھائے اور کبھی کوئی گمراہی دم مارے، گمراہی میں گو وہ سب برابر ہوں، مگر ہر گمراہی کی راہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے جیسے ٹیڑھے خط آپس میں سب مختلف ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ائمہ ضلالت اپنے طریق کو کبھی ایک دوسرے کی طرف اسناد نہیں کرتے۔ نمرود، شداد، فرعون، ہامان، سب اپنے اپنے وقت میں ائمۃ الکفر تھے، مگر ایک دوسرے سے انتساب کے ہرگز قائل نہ تھے. بخلاف ان کے انبیائے کرام جو ائمہ ہدایت تھے. سب ایک دوسرے کے مصدق اور ایک ہی راستے کے داعی تھے.

اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (پ۔۔، سورۃ انعام)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا کہ "سارا طبقہ میرے رستے پر تھا، آپ بھی اسی راہ پر چلیں". نبوت کے جھوٹے مدعی اور انکارِ حدیث کے مبلغین، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، مرزا غلام احمد، عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز یہ سب گمراہی کے امام ہیں، مگر آپس میں کوئی انتساب نہیں رکھتے اور نہ ان میں سے کسی نے اپنے طریقِ کفر کو اپنے ماقبل سے اسناد کیا ہے. یہ سب اپنے اپنے طریقے کے موجد ہوتے ہیں بخلاف ان کے وہ تمام اہلِ حق جو ان ائمہ ضلالت کے مقابلے میں ائمہ ہدایت بنے، آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو مسیلمہ کذاب کے خلاف اٹھے، ان کی غلامی پر وہ سب اہلِ حق فخر کرتے ہیں، جنھوں نے مرزا غلام احمد کی تحریک کا مقابلہ کیا، بلکہ علماً اور عملاً وہ اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہی پیروی سمجھتے ہیں. ختمِ نبوت کے عقیدے میں یہ امت کا اتصال ہے، مگر یہ مدعیانِ نبوت آپس میں متصل نہیں. مسٹر پرویز اپنی فکر کے خود موجد ہیں، لیکن ان کے خلاف اٹھنے والے اپنے مسلک کے موجد نہیں، وہ پہلے کے متوارث دین کے داعی ہیں اور اپنے متقدمین اہلِ حق کی پیروی کو ہی راہِ نجات سمجھتے ہیں. حق ایک مسلسل راہِ ہدایت ہے، جس کے کارکن آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں اور باطل کی راہیں گو ہر دور میں موجود رہیں، لیکن وہ آپس میں مسلسل اور مربوط نہیں، حق کا امتیاز اس کا اسنادی پہلو ہے. حق ایک راہ ہے، جو مسلسل چلی آ رہی ہے۔ یہی صراطِ مستقیم (سیدھی راہ) ہے اور اس کے سوا باقی سب سبل (کئی راہیں) ہیں

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ (پ، سورۃ الانعام)

"یہ میری ایک سیدھی راہ ہے، اسی پر چلو اور متعدد راہوں پر نہ چلو، یہ تمھیں میری راہ سے جدا کر دیں گی".

سیدھی راہ چلنے والے اہلِ حق جو انبیاء کرام کی پیروی میں اس راہ پر چلے وہ گو فرداً فرداً معصوم نہ ہوں، مگر ان کا مجموعی موقف ضرور معصوم رہا ہے اور اسی طریق سے ہدایت کی راہ آگے پھیلتی رہی، اس میں اسلام کی بقا تھی اور اسی میں اسلام کی زندگی تھی. یہ صحیح

ہے کہ انفرادًا معصوم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں بھی اختلافات اور نزاعات ہوئے، مگر ان کے اختلافات وہ فروعات کے اختلاف تھے۔ اصول و عقائد کے نہیں ہم ان کی توجیہ کرتے ہیں تردید نہیں اور فقہی اختلافات میں انہیں ناسخ اور مرجوح سے آگے نہیں جانے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب کے باوجود یہ ایک راہ ہے اور یہ راہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی جماعت کی راہ ہے۔ یہ سب اہل حق اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سند اپنے پہلوں سے لیتے رہے اور اسی طرح سے یہ متوارث دین ہم تک پہنچا ہے۔

یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ سے چلا اور بارہویں صدی کے بعد یہ اسناد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان میں جمع ہوگئے پاک و ہند بلکہ بیشتر بلاد عربیہ کی دینی فضا اسی گھرانے سے قائم ہوئی اور اپنے بعد والوں کے لیے یہی خاندان روشنی کا مینار رہا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بیٹوں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے قرآن پاک کے پہلے اردو ترجمے لکھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے حدیث و فقہ کی مسند سنبھالی۔ انگریزی عملداری میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور حضرت شاہ صاحب کے پوتے، شاہ اسماعیل شہیدؒ عملی جہاد کے لیے اٹھے۔ بعد میں آنیوالے سب اہل علم اسی گھرانے سے سند لیتے رہے اور یہی خاندان ان ممالک میں اہل حق کا سلسلہ اسناد اور مرکز اعتماد تھا۔

اسی عہد کے قریب قریب یورپ صدیوں کی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ انگریز ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط کر رہے تھے مسلم حکمرانوں کی باہمی مخالفت کا انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور DIVIDE AND . RULE کی راہ سے وہ پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ مسلم ممالک اور تہذیب اسلام کے تحفظ کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا، یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مسلم ممالک کو تہذیب جدید کی راہیں دکھائیں "وقت کے تقاضوں پر پورا اترنا چاہیئے" یہ ایک بڑا حسین عنوان تھا۔ جدت پسندی کے نام سے مغرب پسندی اپنا دامن پھیلا رہی تھی محدثین دہلی کے پیرو وقت کے تقاضوں سے غافل نہ تھے، مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ MODERNISATION کی راہ سے WESTERNISATION ہمارے گھروں میں گھس رہی ہے۔ سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے سائے میں پروان چڑھیں تو دینی اور روحانی قدروں کی زمین بھی بدل جاتی ہے

اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترک قوم مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی اور مغربی قدروں میں بہہ کر اپنے رسم الخط تک کو بدل ڈالا آئندہ ترک نسلیں ایک عظیم ذخیرۂ علم سے جو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں مشرقی رسم الخط میں پھیلا ہوا تھا، محروم ہوگئیں۔ ترک کلچر مغربیت میں فنا ہوگیا۔ اور ایک عظیم اسلامی سلطنت اپنے ماضی سے کٹ کر رہ گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں اور خاص کر محدثین دہلی کے علم و فکر کے وارثوں کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اس باب میں کہ اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ مسلم مفکرین کی آراء مختلف تھیں۔

۱۔ مسلم مفکر (بعض) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے دفتروں اور ملازمتوں میں کچھ رعایت لے کر مغربی نکتۂ نظر کو تسلیم کر لینا چاہیئے اور مسلمانوں کو دنیوی تعلیم میں اتنا آگے نکلنا چاہیئے کہ غلام ہندوستان میں وہ کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں۔

یہ حصّہ ابتداء میں بالکل بے ضرر تھا۔ لیکن مغربی فکرونظر سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انجام کار اپنے اصل سے کٹنا لازمی تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد افکار میں ڈھلنے لگے اور اعمال وسعت قلب BROADMINDEDNESS کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ اسی دور کے قریب سرسید نے علیگڑھ سکول کی بنیاد رکھی (جو بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ گیا) اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس نظریئے کے گرد جمع ہوگئے۔ یہ ایک اچھی تجویز تھی، مگر وقتی تدبیر تھی، جس کا سنّت اسلام سے کوئی اسنادی تعلق نہ تھا۔

۱۔ محدثین دہلی کے پیرو اس بات کے حامی تھے کہ گو جنگ آزادی میں ہم ناکام ہوچکے ہیں، مگر مغربی فکرونظر سے سمجھوتہ نہ ہونا چاہیئے انگریزی زبان بے شک سیکھ لی جائے۔ مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو نہ اپنایا جائے اور درس و تدریس اور تزکیہ و تعلیم کے ذریعے اسلام کی علمی اور عملی قوت کو محفوظ رکھا جائے، جس سے پھر کسی وقت ماحول کے چراغ روشن ہوسکیں۔ یہ حضرات اپنی فکرونظر کے موجد تھے علم نبوت کے ترجمان اور سنّت اسلام کے داعی تھے اور اسی راہ سے وہ ملتِ اسلامیہ کی راہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اسنادی پہلو صحابۂ کرامؓ، بزرگانِ اسلام اور محدثینِ دہلی سے مربوط تھا۔ اسی دور کے قریب اہلسنت والجماعت کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند قائم ہوئی

۲۔ مسلمانانِ ہند میں ایک خیال یہ بھی کام کر رہا تھا کہ نماز روزہ جیسے چند اعمالِ اسلام کو باقی رکھ کر انگریزی عملداری کو خلوصِ قلب سے اپنا لیا جائے اور انگریزوں کو اپنے اولی الامر داخل سمجھا جائے۔ یہ لوگ دین اور دنیا کی تقسیم کے حامی تھے اور دنیوی مراعات حاصل کرنے کے سوا ان کا کوئی مطمحِ نظر نہ تھا۔ انگریزوں سے کامل وفاداری کے اظہار کے لیے یہ لوگ محدثینِ دہلی کے خلاف بھی دم مارتے رہے اور ان کی مرکزی دینی رہنمائی انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ اس دور کے قریب کئی دنیادار مشائخ کو استحکام ملا اور ان کی گدیوں نے باقاعدہ شکل اختیار کی، مگر انگریزوں کو اولی الامر میں داخل کرنے کے لیے ان کی آواز پھر بھی کافی نہ تھی۔ کیونکہ ابھی تک سب علمی چراغ محدثینِ دہلی کے چراغوں سے روشن تھے۔ اس کام کے لیے نبوت کی ہدایت درکار تھی۔ انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ غلام ہندوستان میں ایک نبوت بھی قائم کی جائے، جو انہیں اپنے اولی الامر میں داخل کرے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے ایک کمیشن لندن سے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ انگریز کے متعلق مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے۔ اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کئے۔

۱۸۷۰ء وائٹ ہاؤس لندن میں کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کمیشن مذکور کے نمائندگان کے علاوہ ہندوستان میں متعین مشنری کے پادری بھی دعوتِ خاص پر شریک ہوئے۔ اس میں دونوں نے علیحدہ علیحدہ رپورٹ پیش کی جو کہ "دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" کے نام سے شائع کی گئی، جس کے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

رپورٹ سربراہ کمیشن سر ولیم ہنٹر

"مسلمانوں کا مذہبا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیرملکی حکومت کے زیرِسایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیرملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے، جہاد کے اس تصوّر سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے اور وہ جہاد کے لیے ہر لمحہ تیار ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں حکومت کے خلاف اُبھار سکتی ہے۔"

رپورٹ پادری صاحبان

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائیں، جو ظلّی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہوجائے تو اس کے حلقۂ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہوجائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعوے کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمتِ عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ لیکن اب جب کہ ہم برصغیر کے چپے چپے پر حکمران ہوچکے ہیں اور ہرطرف امن و امان بھی بحال ہوگیا ہے۔ تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیئے، جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔" اقتباس از مطبوعہ رپورٹ کانفرنس وائٹ ہاؤس لندن، منعقدہ ۱۸۷۰ء۔

(دی اارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا) (ماخوذ)

ان تینوں ذہنوں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ پہلا ذہن دنیوی تقاضوں کے ضمن میں دین کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ دین کے ضمن میں دنیوی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حامی تھا اور تیسرا ذہن دین اور دنیا کی پوری تقسیم کا ہموا تھا۔ ان تینوں طبقوں میں اسناد کا امتیاز صرف دوسرے طبقہ کو حاصل تھا۔ یہ حضرات درس و تدریس میں باقاعدہ اسناد اور تزکیہ و تعلیم میں باقاعدہ سلسلوں کے حامل تھے۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، محدثین دہلی کے نظر و فکر کی نشاۃ ثانیہ تھی اس کے بانی اور پہلے سرپرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں باقاعدہ شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پہلے اور دوسرے ذہن کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے صحتِ عقائد پر سرسید سے خط و کتابت کی۔ جو ابھی دنوں "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شائع ہوگئی۔ پھران حضرات کے ارشد تلامذہ اور دیوبند کے پرنسپل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ خود علیگڑھ تشریف لائے۔ حضرت مرحوم اور ان کے شاگردِ رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی تقریروں سے نہ صرف دونوں ذہن ایک دوسرے کے قریب ہوگئے بلکہ پہلے طبقے کی کافی حد تک دینی اصلاح بھی ہوگئی۔ علامہ شبلیؒ اور ندوۃ العلما کے ذریعہ جو جدید نظریات اسلام کے نام سے سامنے آرہے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے دارالعلوم دیوبند نے خاص سعی فرمائی۔ جو تاریخِ دیوبند کا بہترین مظہر ہے۔۔۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے بلکہ ان کے ارشد خلفاء میں شمار ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندوی اور عبدالماجد دریاآبادی جیسے مطرانِ علوم کے مشاہیر اکابرِ دیوبند پر اپنی فخر نچھاور کرنے لگے اور اس کا اثر پھیلتا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جو ندوۃ العلما کے ناظم، جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی کے رکن اور مجلس تاسیس رابطۂ اسلامی کے رکن رکین ہیں، اور آج دنیائے اسلام کے جانے پہچانے مفکر اور اپنی خاص صلاحیتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علیؒ سے خلیفہ مجاز ہوئے۔ علمائے دیوبند کی ان کوششوں

ملّتِ نبوت کی ان بے لوث وفاداریوں کے لیے گو مغربی طرز کا پروپیگنڈا ساتھ نہ تھا، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان حضرات نے علم و تقویٰ اور تزکیہ و طہارت کی روشنی میں اسلامیانِ ہند کی ہر شعبے میں راہنمائی کی ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا دردمند دل جب سوئی قوم کو جگا رہا تھا اور مرحوم کی آتشیں نوائیں مسلمانانِ ہند کو جھنجھوڑ رہی تھیں تو علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ مبادا ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فکرِ اسلام کی اسنادی علم سے ذرا مختلف ہوجائے۔ فلسفۂ اسلام کی بعض گہرائیوں پر مرحوم سے گفتگو ہونی چاہیے، چنانچہ امام العصر، حجۃ الاسلام علامہ انور شاہؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لاہور تشریف لائے، ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اہم ملی مسائل اور اسلام کی فکری گہرائیوں پر کئی دن تبادلۂ افکار رہا۔ انجمن حمایتِ اسلام میں ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے متعلق جو موقف اختیار کیا، وہ زیادہ تر انہی مذاکرات کی صدائے بازگشت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دائرۂ اثر میں اس حقیقت کو خوب اجاگر کیا کہ نبوت کے اختلاف سے قوم بدل جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر اسرائیل سے ایک نئی قوم نکلی اور نصاریٰ یہود سے علیحدہ ایک نئی ملت بن گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آگے ایک اور ملت کا موجب ہوئی اور یہود و نصاریٰ کے بعد امتِ مسلمہ کا قیام عمل میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کسی اور نبی کا پیدا ہونا مان لیا جائے، تو پھر ایک اور قوم عمل میں آئے گی، جو ملتِ اسلام سے علیحدہ ایک الگ قوم قرار پائے گی اور جس طرح اہلِ اسلام کی عقیدت کے مرکز مکہ اور مدینہ ہیں۔ اس نئی قوم کی وفاداریاں اپنے جدید مرکزِ نبوت سے وابستہ ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ان پاکیزہ کوششوں میں علمائے دیوبند کا بہت دخل ہے اور ان ہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے افکار سلف سے کہیں نہیں ٹکراتے اور نازک سے نازک مسائل میں وہ اسلام کی شاہراہِ عظیم سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر علامہ اقبال اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جداگانہ قومی نظریے پر متفق ہوئے، جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے سیاسی میدانوں میں برسوں بعد تک سنی جاتی رہی۔ البدر الساری کے مصنف لکھتے ہیں:

لم يستغن عن آرائه الدقيقة فى الفلسفة مثل الفيلسوف الدكتور السر محمد اقبال الهندى وسمعت سنة ١٣٤٧ھ فى ديوبند من المحترم عبد الله چغتائى من اخص اصحاب الدكتور المرحوم ان الدكتور اقبال يثنى كثيرا على دقة رايه فى غوامض الفلسفة منه ...طبع مصر[1]

علمائے دیوبند کا اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں، جو ماضی سے یکسر کٹا ہو، کیونکہ وہ مسلسل رشتہ نہیں۔ ایک نئی راہ ہے اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم و رواج اور تقلید آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تعامل خیرالقرون تک مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہوسکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح

---

[1] ترجمہ: حضرت شاہ صاحب کے دقیق فلسفیانہ نظریات سے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے فلسفی بھی بے نیاز نہ تھے ... اور میں نے دیوبند میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ۱۳۴۷ھ میں سنا کہ ڈاکٹر اقبال فلسفہ کی گہرائیوں میں حضرت شاہ صاحب کی دقتِ نظری کے بہت مداح تھے۔

قائل اور پابند ہیں، جو قرآن و حدیث کے سرچشمے سے فقہ اسلام کے نام پر چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بنا پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اہتداء کے نور سے خالی ہوں۔

اولوکان آباء ھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون (پ ۲) ترجمہ: بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں"

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اہتداء کے نور سے منور تھے۔ ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں۔ کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم (پ۱) ترجمہ: اے اللہ! چلا ہمیں سیدھی راہ پر.... راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا"

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رائی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے اژدہے بھی انھیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے۔ ان کے اعمال و افکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ و عمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا۔ یہ حضرات علم و عمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے، جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت مہد تک مسلسل ہے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا علامہ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

"اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے۔ اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انھیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے۔ کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنا لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح حضرت سید احمد کبیر رفاعی، حضرت شیخ علی ہجویری، حضرت شیخ معین الدین چشتی، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباع سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگان کرام ہیں ان حضرات کا فیض روحانی اعمال تسخیر سے نہیں اعمال سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری نسبتوں سے انتساب رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حکمت اور تزکیہ نفوس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے یہ حضرات علماً عملاً ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں۔ بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات اسی لیے پیش پیش رہے کہ ان کے

اعمال کا اساسی پہلو کہیں موجود نہ تھا اور یہ تردید بھی نئی نہیں، بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

"اجتناب از اسم و رسم بدعت تا از بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد و ایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہ ہائے بدعت اند و محو کنندہ ہائے سنت و بدعتہا پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آں فتوے مے دہند و مردم را ببدعت دلالت می نمایند۔" (مکتوب ۵۴ دفتر دوم ص۱۱۱)

ترجمہ: بدعت کے نام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے۔ جب تک بدعت حسنہ سے بھی اسی طرح پرہیز نہ کرے، جس طرح بدعت سیئہ سے پرہیز کی جاتی ہے۔ روحانیت کی بو طالب کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہوگئی ہے ایک جہان بدعت کے دریا میں ڈوب رہا ہے اور لوگ بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے اور احیائے سنت کے لیے زبان کھولے۔ اس وقت اکثر علماء بدعتوں کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں۔ رواج یافتہ بدعتوں کو مجبوری قرار دیکر ان کے جائز بلکہ بہتر ہونیکا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جن علمائے ربانی کی تمنا کی تھی کہ احیائے سنت کے لیے زبان کھولنے والے اور بدعتا کے خلاف دم مارنے والے کہاں ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اسی تحریک کی نشاۃ ثانیہ حضرات اکابر دیوبند سے پوری ہوئی۔ فللہ المنۃ

فقہ میں سنت کی راہیں

سرزمین پاک و ہند میں نوے فی صد مسلمان فقہ حنفی کے مقلد ہیں۔ فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد، ان کے تلامذہ کے استخراجات اور پھر اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھان بین اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصول شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا، مگر اس طریق عمل میں ایک اور پہلو بھی تھا، وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر فقہاء ہی کی تخریجات تک محدود رہتی اور گو وہ اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہؓ کے طریق سے متجاوز نہ ہوتے، مگر عمل کرنیوالے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہ کرسکتا تھا علمائے دیوبند نے اعمال و عبادات کو ان کے مصادر کی طرف لوٹایا، احادیث کے دفاتر کھلے، تحقیقات پھیلیں، رجال کی نئی سرے سے پڑتال ہوئی، مطالب و معانی چھان بین کی گئیں اور گو ان حضرات کو فقہ کا کوئی مفتی بہ فیصلہ اصول شریعت سے ٹکراتا ہوا نہ ملا تاہم اس راہ تحقیق نے ایسی فضا پیدا کردی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا، اب وہی مسائل نور سنت کی روشنی دینے لگے اور ان اعمال و عبادات میں اتباع سنت کی وہ لذت محسوس ہونے لگی، جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھی علمائے دیوبند نے نہ صرف پاک و

ہند کے احناف کو سنت کا شعور بخشا بلکہ ان کی حدیثی تحقیقات نے شام و مصر تک ان حضرات کے علوم پھیلا دیئے۔ یہ حضرات نہ صرف عملاً حنفی ہیں، بلکہ آج حنفیت کی مسند تدریس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ یہاں نہ ظاہریت کی تفریط ہے اور نہ اہل بدعت کی سی افراط بلکہ سلف صالحین کی سی کامل اتباع دیوبند کا مسلک مختار ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں علمائے احناف کے پاس اصحاب ترجیح کے کچھ متون رہ گئے تھے، جن سے فقہ کی تدریس باقی تھی۔ ان میں مرکزی کتاب ہدایہ تھی، جسے علامہ برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) نے اس پیرائے میں لکھا تھا کہ دین کی اصل حجیت ائمہ مجتہدین نہ سمجھے جائیں بلکہ طالب کا مرکز توجہ کتاب الہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہو، علامہ ابن ہمام اسکندری (۸۶۱ھ) اور صاحب بحر علامہ ابن نجیم (۹۶۹ھ) کے بعد فقہ حنفی کا مدار در مختار، عالمگیری طحطاوی اور شامی پر رہ گیا تھا اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں فقہ حنفی کے فتاوے نہایت منقح اور قابل اعتماد صورت میں ملتے ہیں۔ لیکن فقہ کے طالب علم ان کتابوں میں فقہ کے مجتہدانہ ذوق کا ادراک نہ کرسکتے تھے۔ فقہ حنفی کی اساس حضرت امام محمدؒ (۱۸۹ھ) کی کتابوں پر تھی۔ اور ان کی ظاہر الروایات فقہ حنفی کا اصل خزانہ تھیں۔

امام محمدؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد مدینہ تشریف لائے اور حضرت امام مالکؒ (۱۷۹ھ) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ آپ نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے ذوق اجتہاد کا تقابلی مطالعہ کیا تو امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کو اصول سنت کے زیادہ قریب پایا۔ آپ نے اپنے ان احساسات پر الحجۃ علی اہل المدینۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کا ایک نسخہ مدینہ منورہ بھجوا دیا۔ یہ کتاب مدینہ شریف کے مکتبہ محمودیہ میں موجود تھی۔ ایک نقل ترکی کے مکتبہ نور عثمانیہ میں تھی۔ علماً و فضلاً دور دراز سے اس کتاب کو دیکھنے آتے تھے۔

شیخ الہندؒ کے نامور شاگرد محدث جلیل حضرت مولانا مفتی مہدی حسنؒ (جو ۲۰ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں) نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا اور بیس سال میں اس کے مسودے کی تصحیح اور تعلیق مکمل کی حیدرآباد دکن کے مطبع المعارف الشرقیہ نے ۱۳۸۵ھ میں اس کی دو جلدیں شائع کردیں۔ دوسری جلد کتاب البیوع پر ختم ہوتی ہے۔ پوری کتاب چار جلدوں میں ہے۔ علماء دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمت میں یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ امام محمدؒ کی کتاب مبسوط جو ظاہر الروایہ میں کتاب الاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے اس نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ استانبول کے مکتبہ فیض اللہ میں چھ جلدوں میں موجود تھی۔ دیوبند کے مقتدر عالم مولانا ابوالوفا افغانی رئیس لجنۃ المعارف النعمانیہ نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا اور تعلیق لکھی ۱۴۰۹ھ میں اس کتاب کی پہلی دو جلدیں بڑی آب و تاب سے شائع ہوگئیں اور وہ کتاب جسے دیکھنے کے لیے علماً ایک ہزار سال سے تجسس کر رہے تھے، دیوبند کے فیض کا صدقہ منصۂ شہود پر آگئی۔ تیسری جلد کتاب التحری سے شروع ہوتی ہے کتاب الاصل کی اشاعت سے فقہ کے طالب علم تحقیقات میں قرن اول کے ذوق فقہ سے حصہ پا رہے ہیں۔

امام محمد کی کتاب السیر الکبیر بھی امام سرخسی کی شرح کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے ۔ اسلامی ریاست کی تعمیر میں یہ کتاب اساسی حیثیت رکھتی ہے ۔

فقہ میں سنت کی راہیں معلوم کرنے کے لیے آٹھویں صدی میں حافظ جمال الدین زیلعیؒ (۷۶۲ھ) نے علم حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ "نصب الرایۃ" کے نام سے جمع کیا تھا ۔ یہ عظیم علمی سرمایہ سالہا سال سے نایاب تھا ۔ علمائے دیوبند نے نہ صرف اسے دوبارہ طبع کرانے کا اہتمام فرمایا بلکہ اس پر بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی کے نام سے ایک جلیل القدر حاشیہ تحریر فرما کر علمائے حدیث پر ایک بڑا احسان فرمایا ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے ۔ علمائے دیوبند کی یہ کوشش فقہ حنفی اور علم و حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت ہے ۔ محدث کبیر ملا علی قاریؒ کی کتاب شرح نقایہ فقہ و حدیث کا عظیم سرمایہ تھی مگر زیور طباعت سے آراستہ نہ تھی ۔ دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے "محمود الرایہ" کے نام سے اس پر ایک مستقل حاشیہ لکھ کر اسے بڑے اہتمام سے شائع فرمایا ۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے شرح وقایہ کے ساتھ درس نظامی میں مستقل جگہ دیجائے ۔ اب یہ کتاب علیحدہ مکمل صورت میں شائع ہو رہی ہے ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے تمام فقہی ابواب کو احادیث و روایات کی روشنی میں مرتب کرنے کا اہتمام فرمایا اور خانقاہ تھانہ بھون میں اعلاء السنن کے نام سے ایک عظیم علمی ذخیرہ بیس جلدوں میں مرتب ہوا ۔ یہ عظیم علمی خدمت راس المحدثین حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سر انجام دی اسکا مقدمہ قواعد علوم الحدیث علمائے شام نے بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے ۔ یہ مقدمہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں ہے ۔ شیخ ابوغدہ نے اسکی بہت توصیف فرمائی ہے اور عرب کے نامور فضلاء نے اس کی غزارت علم کا اعتراف کیا ہے تقسیم ملک سے پہلے اعلاء السنن کی تیرہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں کتاب ایک متن اور ایک شرح پر مشتمل ہے ۔ متن اور شرح کی زبان عربی ہے بعض جلدوں کے آخر میں صرف متن کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جس سے اردو دان حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

جہاں تک فقہ کی عام خدمت کا تعلق ہے یہ کہنا کافی ہوگا کہ علمائے دیوبند نے کئی کتابوں پر مفید حاشیے لکھے علامہ ابن ہمامؒ (۸۶۱ھ) کی کتاب زاد الفقیر پر حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے المستنیر الحقیر نام سے مفید عربی حاشیہ تحریر فرمایا دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے مختصر القدوری پر نور الایضاح پر اور کنز الدقائق پر بہت اعلیٰ عربی حاشیے تحریر فرمائے آپکا نور الایضاح کا حاشیہ بہت مقبول ہوا اور کئی دفعہ چھپا ہے ۔ آپ نے آزاد قبائل اور افغانستان کے طلبہ کے لیے نور الایضاح کا ایک فارسی حاشیہ بھی تحریر فرمایا جسے مطبع قاسمیہ نے شائع کیا ہے ۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاویٰ رشیدیہ تین حصوں میں حضرت مولانا تھانویؒ کا فتاویٰ امدادیہ چھ ضخیم جلدوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب نقشبندیؒ کا عزیز الفتاویٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مفتی عبدالرحیم صاحب کا فتاویٰ رحیمیہ (جو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور اہل یورپ اس سے اسلامی قانون استنا

کرتے ہیں) اور مفتی رشید احمد صاحب کا احسن الفتاوے وہ فقہی مواد ہے جو علماءِ دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمات میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس دور میں ہزاروں تشنگان علوم دینی کو سیراب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان فضلاء کرام پر رحمتوں کے پھول برسائے جو انگریزوں کی پوری سازشوں اور اپنوں کی پوری مخالفتوں کے بیچ ایسی سلامت روی اور خلوص کی راہ چلے کہ امت کو سلف کا ذوق متوارث دے گئے اغیار کی سازش سے ان پر تکفیر کے گولے بھی برستے رہے مگر دیوبند سے انتساب رکھنے والا ہر فرد سلف کے روشن چراغوں سے امت کو شاہراہ مسلسل دعوت دیتا رہا

علم حدیث کی خدمات

اس مسلک کے اکابر نے علم حدیث کی وہ خدمات انجام دی ہیں جن کا تصور بھی اس قرن میں مشکل تھا۔ حدیث کی ہر اہم کتاب پر عربی شرحیں لکھیں حاشیے رقم فرمائے اور نئے تقاضوں کے مطابق حدیث کا گرانقدر ذخیرہ اردو میں بھی نئی ترتیب سے پیش فرمایا۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کے امالی "فیض الباری" علی صحیح البخاری مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح بخاری پر اپنی تقریرات کو اپنے تفسیر قرآن کے مخصوص انداز میں ایک نہایت نفیس شرح کی صورت میں مرتب فرمایا یہ شرح فضل الباری علی صحیح البخاری کے نام سے چھپ گئی ہے۔ عصر حاضر کے اس شاہ کار کا ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب نے اس کتاب کو دیکھ کر فرمایا کہ اس سے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی وہ تمنا پوری ہو گی جس کے تحت وہ یورپ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا پھیلاؤ دیکھنا چاہتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کی عربی تصنیف لامع الدراری علی صحیح البخاری حضرت گنگوہیؒ کی تقریر صحیح بخاری کے متن کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں مکمل چھپ چکی ہے اور صحیح بخاری پر تحقیقات کا نادر خزانہ ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تراجم بخاری کی مکمل عربی شرح کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے خدا کرے کہ یہ علمی خدمت جلد طباعت پذیر ہو۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین امروہیؒ کی صحیح بخاری پر اردو تقریرات نہایت نفیس انداز میں چھپ رہی ہیں۔ صحیح مسلم کی بہترین عربی شرح جسے علماء ازہر نے احناف و شوافع کی جملہ سابقہ شروح پر فائق تسلیم کیا ہے فتح الملہم کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ عظیم خدمت حدیث دیوبند کا مایہ ناز سرمایہ ہے راس المحدثین مولانا خلیل احمد نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود پانچ ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر فرمائی اب یہ شرح حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا کے مختصر حاشی کے ساتھ مصر میں دوبارہ بڑے آب و تاب سے چھپی ہے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے امالی علی سنن ابی داؤد انوار المحمود کے نام سے دو جلدوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ الطیب الشذی مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، الکوکب الدری شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور معارف السنن مولانا یوسف بنوری جامع ترمذی کی بہترین شرحیں ہیں۔ معارف السنن کی پہلی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں دعا ہے کہ باقی درمیانی جلدیں بھی جلد طباعت پذیر ہوں مولانا محمد یوسف بنوری کی یہ عظیم شرح اس دور میں خدمت حدیث کا شاہ کار ہے۔ عرب ممالک کے علماء حدیث

شرح ترمذی پر انگشت بدنداں ہیں۔ امام محمدؒ کی کتاب الآثار کی شرح حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب نے ضخیم جلدوں میں عربی میں لکھی جو پوری تاریخ میں پہلی مثال ہے جامع ترمذی کے امالی میں شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی تقریرات بہت معروف ہیں حضرت شاہ صاحب کی العرف الشذی سے حدیث کا کوئی مدرس مستغنی نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالے نے اسے عجیب مقبولیت بخشی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگرد عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (۲۱۱ھ) کی حدیث کی ضخیم کتاب المصنف علم حدیث کا بڑا ذخیرہ تھی۔ اس کے چند نسخے مختلف جگہ موجود تھے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس کے مسودات پر بڑی عرق ریزی فرمائی اور اس پر نہایت نفیس تعلیق لکھی۔ حدیث کی یہ عظیم کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں بیروت میں چھپی ہے اور اسے جوہانسبرگ (افریقہ) کی مجلس علمی نے شائع کیا ہے۔ علماء دیوبند کی حدیث کی یہ خدمت قرن حاضر کا بہت بڑا علمی کام ہے۔

ابوبکر بن ابی شیبۃ (۲۳۰ھ) کی حدیث کی کتاب المصنف کا ذکر بھی صرف شروح حدیث میں ملتا تھا اور علماء کی آنکھیں اسے دیکھنے کو ترستی تھیں۔ جمعیت علماء حیدرآباد (ہند) کے نائب صدر مولانا عبدالخالق افغانی نے اس پر تحقیقاتی کام کیا اور علم حدیث کا یہ نادر خزانہ منصۂ شہود پر آگیا ۱۳۸۰ھ تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی تھیں

حضرت مولینا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی ترمذی کی ایک نہایت جامع اور نفیس عربی شرح تحریر فرمائی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سنن نسائی پر حضرت مولانا اشفاق الرحمن صاحب نے بہترین حاشیہ تحریر فرمایا۔ مؤطا امام مالک کی مفصل عربی شرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ نے چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع فرمائی۔ اور طحاوی کی شرح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے "امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار" کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ مشکوٰۃ کی شرح "التعلیق الصبیح" حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے سات ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر کی۔ سنن ابن ماجہ پر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک نہایت عمدہ حاشیہ لکھا جو ابھی تک چھپ نہیں سکا۔ ایک اور حاشیہ جو مفصل شرح کا درجہ رکھتا ہے۔ مولینا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلویؒ نے بھی تحریر فرمایا جو المحمد ﷲ کراچی سے شائع ہوگیا ہے۔

اُردو میں حدیث کی خدمت

سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس طرف توجہ فرمائی اور اپنے مخصوص ادبی انداز میں صحیح بخاری پر تشریحی نوٹ لکھے ان کے بعد عمدۃ المحدثین حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مدنیؒ نے "ترجمان السنۃ" کے نام سے ایک گرانقدر علمی ذخیرہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنے روائتی انداز میں شائع کیا اور اسی طرح صاحب موصوف نے "جواہر الحکم" کے نام سے تین چھوٹے چھوٹے مجموعے موجودہ دور کے خصوصی

تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھتے : "ترجمان السنۃ" کے نام سے انہوں نے جو کام کیا وہ اگرچہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا کیونکہ ان کا
ارادہ اس طرح کی آٹھ دس جلدیں لکھنے کا تھا مگر زندگی نے مہلت ہی اتنی دی کہ چار جلدیں پوری کر سکے، تاہم یہ ایک ایسا عمدہ
علمی ذخیرہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے یہ اپنے دور کی حدیث کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ حضرت مولانا مرحوم
کا انداز تحریر ایسا ہے کہ متوسط درجہ اور اونچے طبقہ کے لوگ اس سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ حضرت مولینا
محمد منظور نعمانی مدظلہ نے نہایت عام فہم مفید اور سلیس انداز میں "معارف الحدیث" کے نام سے علم حدیث کی خدمت کی
اس کی ۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان گراں بہا تحریرات پر نظر کرنے سے یہ غلط پروپیگنڈا پادر ہوا جاتا ہے کہ راسخ
العلم علمائے کرام عصر حاضر کے تقاضوں سے غافل ہیں۔

قرآن کریم کی عصری خدمات

علمائے دیوبند نے عصر جدید کے پھیلتے ہوئے الحاد کے آگے ہر ممکن بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب
میں سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ قرآن کریم کو نئی نسلوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ روایات کے
کسی قسم کے الحاد کے بغیر نفس مراد نہایت آسان پیرایہ میں ادا ہو جائے اور جہاں جہاں دشمنان اسلام مورچہ بنائے ہوئے
ہوں وہاں ایسی تعبیر اختیار کی جائے کہ نفس اختلاف میں اترے بغیر تمام پیدا ہونے والے یا پیدا کیے گئے شبہات از خود دور
ہو جائیں۔ شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر ایک نہایت شگفتہ، پرمغز اور
دلکش تفسیری حاشیہ لکھ کر عصر حاضر کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ آپ کے حواشی اگر ایک طرف سلف صالحین
کے مسلک کے مطابق ہیں۔ تو دوسری طرف موجودہ ضروریات کے بھی عین مطابق ہیں پڑھتے جائیے۔ معاندین اسلام کے
پیدا کیے ہوئے شبہات کی جڑ از خود کٹتی چلی جائے گی۔ پھر کسی فریق کی دلآزاری نہیں کسی فرقے کا نام تک نہیں زبان
اور طرز بیان خشک اور پرانا نہیں بلکہ نہایت سلیس اور دل نشیں ہے۔ اللہ تعالے نے اس تفسیری حاشیے کو اتنی مقبولیت
عطا فرمائی ہے کہ پاکستان، ہندوستان، چین، ہانگ کانگ اور افغانستان وغیرہ میں (فارسی میں ترجمہ ہوکر) چھپ چکا
ہے۔ اور پاک و ہند میں چھ سات اداروں نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تاج کمپنی نے حسب روایت
دو سائزوں میں چار قسم کے کاغذ پر شائع کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو اسلام کو سلف کے آئینہ میں مطالعہ کرنا چاہتے
ہیں۔ وہ اس مختصر تفسیر میں نہایت اطمینان اور شرح صدر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ اور حاشیہ علمائے دیوبند کا جدید
نسل پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا کام بیان القرآن
کے نام سے کیا ہے۔ حکیم الامت کی یہ تفسیر اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اتنی جامع اور مختصر ہے کہ بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس تفسیر کو غور سے پڑھنے کے بعد کسی دوسری تفسیر کی مراجعت کی ضرورت نہیں رہتی۔
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پیرایہ بیان علمی ہے اور معمولی پڑھے لکھے لوگ اس سے کماحقہ فائدہ نہیں

اٹھا سکتے قرآن کریم کا مختصر — عام فہم اور ربط آیات سے مطالعہ کرنے والے حضرات شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے ترجمہ اور حواشی سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو ادبی پیرایہ بیان میں پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کا ترجمہ اور تفسیر بہت مفید ہے۔

مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے عام فہم اور سلیس انداز میں قرآنی مسائل اور معارف کا بیش بہا خزانہ ہے اس میں عصری فتنوں پر پوری گرفت ہے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور پڑھے لکھے لوگ اس تفسیر میں زبان کی فصاحت عصر حاضر کی بلاغت اور سلف کی سی ثقاہت محسوس کرتے ہیں۔ اس تفسیر میں مولانا تھانوی اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ کی تفسیرات کی روح بولتی ہے اور اس نے تفسیر کے تمام جدید ذخیروں کو اپنی سلاست، جامعیت اور افادیت میں پیچھے کر دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی معارف القرآن کے نام سے ایک نہایت جامع تفسیر لکھی ہے مولانا کا علمی انداز بیان حقائق و معارف کے موتی چن چن کر پیش کرتا ہے یہ تفسیر سورہ احزاب تک مکمل ہو چکی تھی کہ مولانا رحمت الٰہی سے جا ملے خدا کرے کہ یہ عظیم تفسیری خدمت جلد طباعت پذیر ہو۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے آخر عمر میں قرآن کریم کی آیات احکام پر کام کرنے کا ارادہ فرمایا وقت نے مہلت نہ دی اور آپ نے یہ خدمت اپنے اصحاب و خدام میں تقسیم فرما دی کل کتاب سات جلدوں میں ہے پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں تیسری اور چوتھی جلد ابھی باقی ہے یہ عربی تفسیر احکام القرآن تفسیر علم اصول حدیث اور فقہ کا بحر ناپیدا کنار ہے علماء عرب اس زمانے میں اس عظیم خدمت پر حیران ہیں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے سورہ نساء تک آٹھ سو صفحات میں اس کی دو جلدیں تحریر فرمائیں پانچویں اور چھٹی جلدیں مفتی محمد شفیع صاحب نے چھ سو صفحوں میں مکمل کیں اور ساتویں جلد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے قلم بلاغت رقم سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کی تفسیر مشکلات القرآن عربی نادر علمی تحقیقات کا عجیب خزانہ ہے آپ نے قرآن کریم کے مشکل مقامات پر بصیرت افروز کلام کیا ہے محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری نے اس کا ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو مقدمہ تفسیر القرآن پر ایک بڑی خدمت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد سالم استاذ دارالعلوم دیوبند ان دنوں تفسیر کے جدید عصر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک مبسوط مقدمہ تفسیر قرآن عربی میں لکھ رہے ہیں خدا کرے کہ قرآن کریم کی یہ عظیم خدمت بھی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو اپنے مسلک کے علمی حلقے اس کے شدت سے منتظر ہیں۔

اس وقت جو ترجمے برصغیر پاک و ہند میں سب سے زیادہ مقبول اور مؤثر ہیں وہ زیادہ تر علماء دیوبند کے ہی ہیں مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے گو بعض امور میں ہمیں شدید اختلاف ہے تاہم ان کی خدمات قرآن کریم انگریزی

حاشیہ قرآن اور اردو تفسیر قرآن زیادہ تر علماء دیوبند خصوصاً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ہی فیضان ہیں مولانا دریا بادی جابجا مرشد تھانوی کا اپنی بات کی سند لاتے ہیں۔

جدید عصری تقاضوں پر دینی لٹریچر

عقلیت پسند ذہن کو اسنادی اسلام کے قریب کرنے کے لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی "العقل و النقل"، "خوارق عادات" اور "مسئلہ تقدیر" جیسی تحریرات عصری تقاضوں کے پیش نظر نہایت مفید کتابیں ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی کی کتاب "سائنس اور اسلام" حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی "اشاعت اسلام" مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی "اسلامی معاشیات" مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی "اسلام کا اقتصادی نظام"، "اخلاق اور فلسفہ اخلاق"، "قصص القرآن" (چہار جلد) مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی "علم الکلام" حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی کی "آلاتِ جدیدہ اور احکام اسلام" مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی "اسلام اور مسئلہ غلامی" اور اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی کی مختلف کتابیں وہ صحیح دینی لٹریچر ہے جو اکابر دیوبند اور منتسبین دیوبند کے ذریعہ جدید نسلوں کو ملا ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی

عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو میں کتاب و سنت اور سیرو تاریخ اسلام کی وسیع تر اشاعت کے لیے فضلائے دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حال صدر شعبہ دینیات علیگڑھ (یونیورسٹی) نے ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی۔ یہ چاروں حضرت علامہ شاہ انور کشمیری کے ہونہار تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند ہیں۔ ان کی مساعی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے اردو میں جو مفید دینی لٹریچر شائع کیا اس لٹریچر اور مذکورہ بالا لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اکابر دیوبند اور منتسبین دیوبند نے عربی اور اردو میں کتاب و سنت اور فقہ کی اشاعت و تبلیغ میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کے مقابلہ میں کسی دوسری ایک جماعت یا سب جماعتوں کے دینی لٹریچر کو ملا کر بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات نے اس مفید دینی لٹریچر کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو ماضی سے وابستہ رکھتے ہوئے اور اسلاف پر تنقید سے بچتے ہوئے جدید نسلوں تک دین پہنچانے کی عزت انہی حضرات کو حاصل ہے۔ یہ بزرگ پرانے متن میں نیا مطالعہ کرنے کی بحمداللہ پوری استعداد رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مفید دینی لٹریچر کے پیچھے کسی منظم پارٹی کا پراپگنڈہ نہیں۔ اور نہ اسے کسی سیاسی گروہ کی تائید حاصل ہے مگر یہ کوئی کمزوری نہیں دین کا تقدس ہے کہ اسے اس قسم کی آلائشوں سے پاک رکھا جائے۔

سرزمین پاک و ہند میں کئی افراد اور جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں۔ جماعت دیوبند کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اپنے علم و فکر کو اسلاف سے جوڑ کر آگے چلتے ہیں ان کا حال ماضی سے مربوط اور انکا دین عہد صحابہؓ سے مسلسل ہے۔

دین کے نام پر جب یہ کہا جائے کہ پہلوں نے دین کو غلط سمجھا تھا۔ صرف ہم اس کے صحیح داعی ہیں یا اسلاف پر اس طور تنقید و جرح کی جائے کہ جس سے نقاد کی عظمت دلوں میں راسخ اور اسلاف کی عزت و وقعت اور عظمت و رفعت کم ہوتی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے داعی حق اس عظیم قافلے کے رکن نہیں ہو سکتے جو عہد رسالت کے بعد قیام حق کے لیے چلا تھا اور قیامت تک اس کے ارکان اس راہ پر کاربند رہیں گے یہی حق کا تسلسل ہے اور یہی اسلام کی زندگی ہے۔ دین کی ہر دعوت اسلاف سے مربوط نہیں وہ حق نہیں نفس کا فریب ہے۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے اس تسلسل کی یوں خبر دی ہے۔

لاتزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لایضرهم من خذلهم اوخالفهم حتی یاتی امر الله	میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ اس کی مخالفت کرنے والے اسے کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

زیر نظر دارالعلوم نمبر میں اکابر دیوبند کی جن خدمات کا ذکر ہے۔ یہ اہل حق عہد رسالت سے قائم بامراللہ چلے آ رہے ہیں اور اس وقت بھی ان کے جانشین اور خلفاء اس عظیم قافلہ کا نشان ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جب یہ کہتے ہیں کہ :- ع سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

تو گویا وہ بھی اس سلسلہ قطار کا ہی دم بھرتے ہیں اور اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کا اسناد قائم رہے۔ حضرت امام ابن سیرینؒ تو علم اسناد کو بھی دین ہی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس پر دین کا مدار ہے امام مسلم ان سے نقل کرتے ہیں :-

ان هذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم	بے شک یہ علم (علم اسناد) دین ہے پس دیکھو کہ تم کن لوگوں سے دین حاصل کرتے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مگر کہا جائے کہ جماعت دیوبند آئینی طور پر جماعت نہیں ان کی کسی ایک رجسٹر میں ممبر سازی نہیں۔ اس کے کارکنوں کے موضوع مختلف ہیں اگر مولانا سید حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ دہلی استخلاص وطن کے لیے دیوبند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ زیادہ تر حکمت اور تزکیہ نفوس میں مصروف رہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے فقہ و حدیث کی مسند نے زینت لی۔ حضرت مولنٰا محمد الیاس کاندھلوی امر بالمعروف کے لیے ہر بستی و صحرا میں گھومے تو نہی عن المنکر کے لیے مولانا مرتضٰے حسن چاند پوری، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید عطاءاللہ شاہ صاحب بخاری اہل باطل کے سامنے تلوار بن کر چمکتے رہے اور ان سب کے شیوخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے تزکیہ نفوس اور جہاد بالسیف، درس و تدریس اور مسند ارشاد و فتاوٰی میں ساری عمر گزار

دی۔ تو یہ افراد جو مختلف موضوعوں اور میدانوں میں کام کرتے رہے اور ہر ایک کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف رہا اب یہ مختلف حضرات اس عظیم قافلے کے رکن کیسے ہو سکتے ہیں جو عہد رسالت سے قائم بامراللہ چلا آرہا ہے۔ طائفہ وہی ہے جس کے ارکان ایک نظام میں منسلک ہوں جواب عرض ہے کہ طائفہ کے لیے موضوع عمل ایک ہونا ضروری نہیں جو لوگ اصولاً متحد ہوں اور موضوعاً تقسیم کار میں جدا جدا کام کررہے ہوں یہ ان کے ایک جماعت ہونے کے منافی نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ کبھی وہ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک رجسٹر میں مندرج ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقطار عالم میں پھیلے ہوئے ہوں اور بعض ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں مگر سامت سے مربوط رہنے میں سب ایک دوسرے کے قوت و بازو ہوں، حدیث مذکورہ بالا کا محدثین نے یہی مطلب بیان کیا ہے؛ ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث امام محی الدین نوویؒ اس طائفہ کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

قلت ويحتمل ان هذه الطائفة متفرقة بين انواع المومنين منهم شجعان مقاتلون ومنهم فقهاء ومنهم محدثون ومنهم زهاد وآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر ومنهم اهل انواع اخرى من الخير ولا يلزم ان يكونوا مجتمعين بل قد يكون متفرقين في اقطار الارض وفي هذا الحديث معجزة ظاهرة فان هذا الوصف ما زال بحمد الله تعالى من زمن النبي (صلى الله عليه وسلم) الى الآن ولا يزول حتى ياتي امر الله المذكور في الحديث وفيه دليل لكون الاجماع حجة وهو اصح ما يستدل به من الحديث

میرے خیال میں طائفہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ مسلمانوں کی متفرق اقسام پر مشتمل ہو (۱) لڑنے والے بہادر بھی ہوں (۲) فقہا بھی (۳) محدثین بھی (۴) زاہد و عابد بھی (۵) امر بالمعروف کا تبلیغی کام کرنے والا (۶) باطل کا مقابلہ کرنیوالے اور (۷) کئی دوسرے نیک کام کرنیوالے بھی۔ طائفہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ (ایک رجسٹر یا ایک جگہ) جمع ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اقطار ارض میں پھیلے ہوئے ہوں اس حدیث میں اسلام کا ایک ظاہر معجزہ مذکور ہے کیونکہ قیام بامراللہ کا یہ وصف اس امت میں عہد رسالت سے اب تک مسلسل چلا آرہا ہے اور یہ تسلسل اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ قیامت واقع نہ ہو جائے۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امت کا اجماع حجت ہے[1]۔ اور اجماع کے حجت ہونے پر احادیث سے جو استدلال کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح یہ استدلال ہے۔

---

[1] کیونکہ اجماع بھی ہوگا جب یہ طائفہ بھی ساتھ ہو اور اس طائفہ پر ہونا منصوص ہے۔ پس اجماع کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

اسنادِ سلف کے اثرات

جن حضرات نے علم و عمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کیے ہوں ان کے ذمے سلف کا دفاع لازمی ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں بے داغ اور آئندہ نسلوں کے لیے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے چلے آئیں۔ اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت نہیں رہتا۔ اور نہ اسے ایک زندہ مذہب کہا جا سکتا ہے۔

اسلام کے اس تسلسل کا آغاز صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پاک و ہند کی علمی و عملی فضا میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان تک پہنچتا ہے ہمارے بعض دوست اس زنجیر کی پہلی کڑی کو کمزور بتاتے ہیں اور جن چند نفوس کا اقرار کرتے ہیں انہیں بھی حکمت عملی (یا تقیہ) اور خاموشی کی چادر اوڑھا دیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان مثل شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ محدثین دہلی پر اعتراض کرتے ہیں اور گو ان کے ایک بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علامتہ متابعین شاہ اسمٰعیلؒ کو کافر نہ کہیں اسی میں سلامتی ہے مگر ان کی اس خاندان سے مخالفت پھر بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ محدثین دہلی کے پیرو تحریک خلافت میں ترکوں کے ساتھ تھے لیکن یہ بزرگ اور ان کے ساتھی ترکوں کی مخالفت میں کام کرتے رہے ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے حق اسناد دین کے دفاع میں صحابہؓ پر تنقید اور مخالفت بھی روکیں اور محدثین دہلی کی بھی عمومی صفائی پیش کریں کیونکہ اسناد کی یہی کڑیاں انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتی تھیں۔ اور اسلام کا تسلسل انہی حضرات سے قائم تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو صحیح اسلام کے اسناد سے یوں بے نیاز ہوگئے کہ انہوں نے اس لڑی کے اعلیٰ ترین افراد صحابہ کرامؓ سے بھی ایک بڑا منصب (نبوت) اپنے گھر میں تجویز کر لیا، اور مرزا صاحب نے اعلان کردیا کہ وہ ہر حدیث جو میری وحی کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ چودھری غلام احمد پرویز نے پرانے اسلام سے بغاوت کرکے نیا "طلوع اسلام" جاری کر لیا۔ دینی نظریات کی اس کش مکش میں علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار تھے اور سلف صالحین کی اتباع کی یہاں تک پابندی کی کہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی
اک اہل عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تسلسل اسلام اور اسناد دین کو کمزور کرنے والے ان مختلف طبقوں سے ان اکابر نے اگر کوئی اختلاف کیا تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے کوئی ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لیے کہ اسلام جس مبارک سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا بدعی نظریات کی تخریب و تردید اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی تعمیر اور بقا کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور اس کا انداز جدل احسن رہا جس کی تعلیم

خود قرآن پاک نے دی ہے۔

وجادلہم بالتی ھی احسن پ۱۴ اور ان سے مجادلہ احسن (طور پر) کرو۔

ناموس صحابہ کا دفاع

ناموس صحابہؓ کے دفاع میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدیۃ الشیعہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مطرقۃ الکرامۃ علی مرآۃ الامامۃ اور ہدایات الرشید الی افحام العنید تحریر کیں اور محدثین دہلی کے علمی اور فکری مؤقف کی پوری نمائندگی کی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ سے ظاہر ہے پھر امام اہل السنۃ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی دفاع صحابہ کی اس عظیم خدمت میں پوری عمر مصروف رہے اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا یہ کئی جلدوں میں پھیلی ہوئی کتاب تعارف صحابہ کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اس کتاب کا ترجمہ مولانا عبدالشکورؒ کا برصغیر پاک و ہند پر بڑا احسان ہے حضرت مولانا لکھنویؒ نے ازالۃ الخفا کا بھی تین جلدوں میں اردو ترجمہ کیا آیات امامت و خلافت اور مقام صحابہ سے دوسری آیات کی وہ بےنظیر تفسیر لکھی کہ اسکا تصور اس دور میں مشکل تھا

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مقام صحابہ پر کامیاب مضامین لکھے اور جب وقت کی سیاسی آندھیوں نے قافلہ اسلام کی صف اول پر یلغار کی تو حضرت مدنیؒ نے صحابہ کے معیار حق ہونے پر وہ مباحث تحریر فرمائے جو قرن حاضر کا سرمایہ فخر ہیں۔

پھر دفاع صحابہ کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے شاگرد آگے بڑھے مولانا ولایت حسین رئیس دلورہ نے صوبہ بہار میں اور سلطان المناظرین مولانا حافظ محمد شفیع سنکتروی نے پنجاب میں اس مورچے کو سنبھالا مولانا ولایت حسین نے کشف التلبیس تین حصوں میں تحریر فرمائی اور حافظ صاحب مرحوم نے مناظرے کے پلیٹ فارم کو سنبھالا حضرت مولانا عبدالشکور کے شاگرد خصوصی مولانا بشیر احمد پسروری (جو حدیث میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کے شاگرد اور سلوک میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے خلیفہ مجاز تھے) نے پوری زندگی دفاع صحابہ کے محاذ پر لگا دی اور ان موضوعات پر پچیس کے قریب لاجواب رسائل تحریر فرمائے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا لکھنوی رحمہما اللہ کے ارشاد پر مخدوم القوم سردار احمد خاں پتانی نے تنظیم اہل السنۃ کی بنا رکھی جو تقریباً نصف صدی سے دفاع صحابہ کی شمع فروزاں ہاتھ میں لیے ہے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے شاگرد علامہ دوست محمد قریشی نقشبندی اور حضرت مولانا لطف اللہ جالندھری (جو حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب رائپوری کے فرزند رشید تھے) اس پلیٹ فارم پر فتنہ رفض و الحاد کے خلاف تیغ براں بن کر چمکے اور اسی منت میں حضرت عثمانیؒ کے یہ دونوں شاگرد اپنے خالق سے جا ملے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر انجمن خدام اہل السنۃ جو اپنے والد ماجد مولانا کرم دین دبیر مصنف آفتاب ہدایت کی نسبت سے بھی دفاع صحابہ میں پورے مجاہد ہیں۔ اس میدان میں ربع صدی سے خدمات جلیلہ سر انجام دے رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو خاصی شہرت رکھتی ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے شاگرد مولانا سید نورالحسن شاہ بخاری اور مولانا عبدالستار تونسوی اس وقت پوری قوم کو اسلام کی شاہراہ مسلسل کی دعوت دے رہے ہیں اور اس شاہراہ کے پہلے قافلے کا پورا دفاع کر رہے ہیں مولانا نورالحسن شاہ بخاری تنظیم اہل السنۃ کے قیام میں سردار احمد خاں پتافی رئیس اعظم جام پور ضلع ڈیرہ غازیخان کے دائیں بازو تھے سالہا سال یک ہفت روزہ دعوت لاہور کے مدیر رہے اور دفاع صحابہ پر عظیم اور تاریخی خدمات سرانجام دیں مولانا تونسوی دفاع صحابہ پر صف اول کے مناظر ہیں اور رب العزت نے انہیں ہر میدان میں عجیب فتح و نصرت سے نوازا ہے حضرت مدنیؒ نے اپنے تلامذہ میں عظمت صحابہ اور دفاع صحابہ کی وہ روح پھونک رکھی ہے کہ جوبھی جہاں کہیں ہے شاہراہ اسلام کے اس ہراول دستے کی مدح میں مصروف ہے اور قوم کو اس کے نقش قدم پر آنے اور چلنے کی دعوت دے رہا ہے۔

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ

اس عظیم شاہراہ اسلام پر ایک اور یلغار ہوئی ایک بڑا فتنہ انکار ختم نبوت پیدا ہوگیا اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلاد افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے علماء حق نے مسلمانوں کو اس فتنے سے خبردار کیا سرخیل اکابر دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے خلفاء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کو اس طرف متوجہ فرمایا پیر صاحب حجاز ہجرت کے ارادہ سے آئے تھے۔ حضرت حاجی صاحب مرحوم کی نظر بھانپ رہی تھی کہ حضرت گولڑوی کو مرزا غلام احمد کے مقابلہ میں کام کرنا ہے۔ آپ نے پیر صاحب کو واپس ہندوستان جانے کا امر فرمایا شیخ الہند کے شاگرد امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مناظر اسلام مولانا مرتضےٰ حسن چاندپوری، مولانا محمد عالم آسی امرتسری اور مناظر اسلام مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ میدان میں نکلے اور ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں عربی اور فارسی میں کتابیں لکھ کر دوسرے ممالک کو بھی اس فتنے سے خبردار کیا اور مہر شاہ صاحب کے شاگرد حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری نے پوری قوت سے فتنہ انکار ختم نبوت کا مقابلہ کیا اور عقائد اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند اور دیگر مسلم ممالک کو وہ علمی اور تحقیقی مواد مہیا کیا کہ منکرین ختم نبوت دم بخود رہ گئے مولانا مناظر احسن گیلانی کے شاگرد رشید پروفیسر الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب اب بھی قادیانی نظریات کا انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے۔

شیخ الہند کے شاگردوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مسائل فقیہہ میں شیخ کے مسلک پر نہ تھے لیکن ختم نبوت کے لیے آپ کے ارشاد پر جان چھڑکتے تھے حضرت شیخ الہند نے مولانا امرتسری کے ذریعہ اہل حدیث کے پورے حلقے میں مرزائیت کے خلاف بیداری پیدا کر دی اور مولانا امرتسری نے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ اور مولانا محمد داؤد غزنویؒ کو بھی اس پلیٹ فارم پر لاکھڑا کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء

میدان تبلیغ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شعلہ نوائی سے نصف صدی کے قریب گرم رہا شاہ صاحب آخر دم تک مرزائیت کے خلاف نبرد آزما رہے اور ان کے سروں پر تیغ براں بن کر لٹکتے رہے آپ کے بعد مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا محمد علی جالندھری نے اس مورچے کو سنبھالا اور اپنی زندگی اس محاذ پر لگا دی

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں صدر مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خاں لاہور تھے مگر موصوف میں یہ ولولہ پیدا کرنے والے اور انہیں اس صدارت کے لیے تیار کرنے والے خود مولانا عطاءاللہ شاہ بخاریؒ تھے اور تحریک کی زمام کار حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھی جب وہ وقت قریب آیا کہ مرزائیت قانونی طور پر بھی غیر مسلم اقلیت قرار پائے تو اللہ رب العزت نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کے طور پر محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا انتخاب فرما لیا۔ پھر ۱۹۷۴ء میں تمام مسلم جماعتوں نے حضرت مولانا بنوری کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا ملک میں ہمہ گیر تحریک چلی۔ پاکستانی قومی اسمبلی نے مرزائیوں کو قانونی طور پر مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا ..... اور تحفظ ختم نبوت کا جو کام حاجی امداد اللہ اور علامہ انور شاہ کے الف سے شروع ہوا مولانا یوسف بنوری کی یا پر پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب خدام دیوبند مختلف ممالک میں ختم نبوت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

علمائے دیوبند نے اس محاذ پر نہ صرف عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ کیا بلکہ اسلام کے جملہ وہ مسائل جن پر قادیانی الحاد کا اژدہ چل رہا تھا ان کا پورا دفاع کیا حرمت جہاد، مسیح ہندوستان میں، وفات مسیح اور منبع خوارق عادات کے خلاف کام کیا مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ مسلسل سے جوڑا اور یہ ان کی قربانیوں اور محنتوں کا فیضان ہے کہ امت ان مسائل میں ابھی تک شاہراہ اسلام پر گامزن ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اہل باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ تیغ بے نیام رہے اور انہیں جہاں اور جب کہیں پتہ چلا کہ کوئی اسلام میں رخنہ اندازی کر رہا ہے اور ملت اسلامیہ کو سلف صالحین کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بجائے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا کرنے والے بزعم خود و مریداں امت کی ایسی رہبری کر رہے ہیں کہ پوری تاریخ میں ملت کو ایسا عالی دماغ قائد و رہنما میسر نہیں آیا تو حضرت مولانا اس کے سامنے بلا خوف و لومۃ لائم سینہ سپر ہوگئے، اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ فتنۂ انکار حدیث پر ضرب کلیمی کی ضرورت ہے تو انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں ایک جلسہ عام میں اعلان فرمایا کہ جو حدیث کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر

ہے اور قرآن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ گرچہ اس سے پہلے بھی علمائے ربانی خاموش نہیں تھے۔ حضرت لاہوری کے اس نعرہ رستاخیز کے بعد ملک اور بیرون ملک کے ہر فرقہ و خیال کے علماً کے دستخطوں سے ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں حضرت مولانا کے اس خیال کی مکمل تائید کی گئی اور اس پر اجماع امت ہوگیا کہ حدیث کے منکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور اب اس سلسلے میں مولانا سرفراز احمد خاں صاحب صفدر شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ردِ بدعت وشرک

اتباع سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ "مرکز ملت" کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کرکے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہؓ کے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کرکے جو چاہے فیصلہ کر دے ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو زبانی کلامی محبت وعشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقات امت کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر و مشرک سے بدتر سمجھتا ہے لیکن عملاً اسکا حال یہ ہے کہ شریعت کے پُرنور چہرے کو مسخ کرکے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور جب ٹوکا جاتا ہے تو "ثواب کا کام ہے، کیا حرج ہے"، ان جیسی باتیں کہہ کہ اپنی وضع کردہ رسوم و بدعات کو اسلام میں داخل کرتا اور من گھڑت افکار کو شریعت قرار دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں اپنے ان رسوم و رواج کو دین و شریعت کا جزو بنانے کے لیے بے معنی دلائل کا انبار لگا دیتا ہے ایسے رسوم و رواج کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت قرار دیا ہے اور بدعت ایسی برائی ہے کہ جس کا چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی کے لیے نیا دین اختیار کرنا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر خطبہ میں بدعت کی برائی بیان فرمایا کرتے تھے آپؐ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ ردِ بدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی تھی۔ جانشینان محدثین دہلی نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید بریلویؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بدعتیوں کی نظر میں سب سے زیادہ یہی دو افراد کھٹکتے ہیں۔ ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ ماضی قریب میں مولانا حسین علی (واں بھچراں) اور مولانا مرتضےٰ حسن چاندپوری نے اس فریضہ کو بطریق احسن ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی سالہا سال اس میدان میں کام کرتے رہے اور آج کل ان سب کی جانشینی کا حق تحریری طور پر سرفراز احمد خاں شیخ الحدیث مدرسہ عربی نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سرانجام دے رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر انھوں نے قابل قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے کتاب و سنت کی راہیں واضح اور کشادہ نظر آتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں اثر رکھا ہے چنانچہ تھوڑے عرصہ میں ان کی اکثر کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

قافلہ اسلام کے ان کارکنوں کی نظر مخالفین کی مخالفت کی بجائے اصل اسلام کی اشاعت پر مرکوز رہتی ہے مخالفت یہ صرف رستے کی چھیڑ ہے جسے خدام دیوبند پسند نہیں کرتے۔ ہاں گلے پڑ جائے تو پھر اس سے گریز بھی نہیں کرتے پھر یہ حضرات ایسے گمراہ انسانوں کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دیتے ہیں اور صدق کی تلوار حق کا جلال بن کر چمکتی ہے اس کا مقصد بھی مخالف کی تذلیل نہیں متوارث اسلام کی دفا ہے کیونکہ اسناد اسلام کی کڑیاں اپنا اپنی جگہ لائق تحفظ ہیں۔

رد بدعت میں داعیہ اہتمام

بدعت کا لفظ سنت کے مقابلے میں ہے جس طرح سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک مسلسل پہنچتی ہے بدعت اس سے پہچانی جاتی ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا اہل بدعت سے جب کسی عمل پر اس کے تسلسل کا حوالہ پوچھا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتے ہیں کہ اس میں حرج کیا ہے؟ اہل بدعت کا نظریہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی میں تسلسل ضروری نہیں اسلام میں نئے طریقے داخل کرنے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔

مولانا احمد رضا خان نے فتاوے افریقہ صـ۱۱۱ میں تصریح کی ہے کہ راہ احداث کشادہ ہے ظاہر ہے کہ وہ بزرگ جو مسلسل اسلام پر رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہ مسلسل اسلام کی تعلیم دینے کے حامی ہیں وہ مولانا احمد رضا خان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے انہیں سنت اسلام ہر مصلحت سے زیادہ پیاری تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ حضرات اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور تھے۔ اور وہ اپنے کسی عمل کو جو شاہراہ مسلسل سے نہ آئے وہ اسلام کا نام دینے کے لیے تیار نہ تھے پس رد بدعت میں ان حضرات کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے وفاداری تھی اہل السنۃ والجماعۃ وہ حضرات ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہؓ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور احداث کشادہ (بدعت کا دروازہ کھلا ہے) کہہ کر بدعت کو فروغ نہ دیں۔ بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریق بین المسلمین لازمی ہوگی کیونکہ بدعات ہر ایک گروہ کی اپنی اپنی ہوں گی یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے۔ پس بدعت کے رد میں مذکور الصدور حضرات کا اہتمام کوئی منفی داعیہ نہ تھا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے مخلصانہ عقیدت تھی۔

عصری تقاضوں میں احساس ذمہ داری

علم و تحقیق اور تزکیہ و تدریس تک ہی نہیں اکابر دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر قدم پر راہنمائی کی ہے۔ جس طرح فروعی مسائل میں ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہوا اسی طرح خالصۃً سیاسی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے برصغیر میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اکابر دیوبند کا ایک وسیع گروہ تھا کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک و ملت کیلئے مفید خیال کرتا تھا تو دوسرا وسیع گروہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدم اشتراک و اتحاد کا مؤید تھا پہلے گروہ کے قائد حضرت مولانا

سید حسین احمد مدنی اور دوسرے کے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف مبنی بر دیانت تھا اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل تھے یہ کہنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے موید تھے ۔ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لیے اور بہتر قرار دیا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائد اعظم کے بعد تصور پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا سب سے موثر عمل حضرت علامہ ہی کا تھا تو بیجا نہ ہوگا ۔ آپ نے قرار داد پاکستان میں بیان جاری فرمائے ۔ جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی ، مضامین لکھے ، پرزور تقاریر کیں ۔ پیرانہ سالی میں ہمت کو جوان کرکے قائد اعظم کا پورا پورا ساتھ دیا ۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر آفرین خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ الاسلام کی وجد آفرین زبان تھی ۔ اور یہ سابق صوبہ سرحد اور سلہٹ (مشرقی پاکستان) کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام نے جیتا تھا ۔ حضرت علامہ پاکستان کی حمایت میں نہ نکلتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے ۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کی پاکستان میں شمولیت محدث دیوبند کا پاکستان پر احسان عظیم ہے ۔ حلقہ دیوبند سے حضرت علامہ ہی پاکستان کی حمایت میں نہیں نکلے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی ، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی ، حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن اور حکیم الامت کے دوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے ۔ دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدیداروں (سرپرست ، صدر مہتمم ، صدر مدرس ، مہتمم) میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے ۔ سرپرست حکیم الامت حضرت تھانوی تھے ۔ صدر مہتمم شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی تھے اور مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب دامت برکاتہم تھے صدر مدرس شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس میں تھے ۔

ہمیں ان دوستوں پر بہت افسوس ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تو دیوبند کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں اکابر دیوبند کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ ان اکابر کی خدمات کے بغیر پاکستان کی تعمیر کسی طرح ممکن نہ تھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا اختلاف بھی مسلمانوں کے سودے پر نہیں دیانت پر مبنی تھا ۔ انکا خیال تھا کہ مسلمان وہ قوت ایمان اور ہمت عمل رکھتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان میں کبھی مغلوب نہ رہیں گے ایک تہائی کے قریب تعداد اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر یہ خدا کے ہوکر رہیں اور محمد بن قاسم ، سلطان محمود غزنوی وغیرہم حضرات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرلیں تو ہندو اکثریت انکا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور اگر ایمانی جذبہ مفقود رہا ، بے عملی و الحاد نے راہ پکڑ لی تو پھر ایک علیحدہ ملک لے کر بھی ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا ۔ حضرت مولانا مدنی مسلمانوں کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے مگر حضرت تھانوی انہیں حالات کے آئینہ میں اور ان کی عملی کوتاہیوں کو دیکھ رہے تھے بہرحال

اس سے انکار نہیں کہ حضرت مدنیؒ کا اختلاف کسی غرض پر نہیں دیانت و خلوص پر مبنی تھا چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم لیگ کے جلسوں میں فرمایا کہ مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پورا سیاسی اختلاف ہے مگر مجھے ان کی دیانت پر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ واقعی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ دیوبند کے ایک حلقے میں اگر کانگریس کی حمایت تھی تو دوسرا حلقہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں علی الاعلان مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تمام خلفا بھی پاکستان کے حامی تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی مخالفت میں حضرت مولانا مدنیؒ کے اسم گرامی کو اچھالتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ انہیں اصولاً اس وقت کے سیاسی اختلافات سے دلچسپی نہیں بلکہ علماً کے خلاف ایک اندرونی بغض ہے جس کو یہ لوگ وقتاً فوقتاً اگلتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے بے رحم اندازِ گفتگو سے محتاط رہنا چاہیے۔ علمائے دین کے خلاف اس قسم کے خیالات دین سے بیزاری کا ایک نیا عنوان ہے۔

قراردادِ مقاصد

پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلمانوں سے کئے گئے اس وعدے کو پورا کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن وسنت پر مبنی ہوگا اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد پاس کرائی جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہوگا اور اس کے قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی ہوں گے۔ شیخ الاسلامؒ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بڑی محنت سے قرارداد مقاصد پاس کرائی مگر افسوس کہ مولانا کی وفات کے بعد ملکی قیادت کے مدوجزر نے اس قرارداد کو بھی ایک یادگار ماضی بناکر رکھ دیا حالانکہ یہ قراردادِ پاکستان کی روح تھی اور اسی مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

تعلیماتِ اسلامی بورڈ اور شریعت کی قانونی دفعات

خان لیاقت علی خان مرحوم نے شیخ الاسلام کے ارشاد کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ قائم کیا جو شریعت کی روشنی میں پاکستان کی قانون سازی کرے اور پھر یہ سفارشات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوں۔ بعض اعیان حکومت کا خیال تھا کہ علمائے اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانونی جزئیات مرتب نہ کر سکیں گے اور روایات کے اختلاف میں الجھ کر رہ جائیں گے مگر علمائے دیوبند نے وقت کے اس چیلنج کو بھی قبول کرلیا اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت تھانویؒ جو اس بورڈ کے ممبران میں سے تھے۔ انہوں نے اس بیدارمغزی روشن خیالی اور وسعتِ نظر سے اسلام کی قانونی جزئیات مرتب کیں کہ حکمران طبقے کے لیے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ قانونی مسوّدات کو سرخ فیتے سے باندھ رکھیں اور دستور ساز اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں ہمیں اس وقت اس کی علت و غایت سے بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتلانا ہے کہ علمائے دیوبند نے وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہر موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکابر علمائے اسلام نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی بھی

پوری صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اجتہاد آزاد نہ ہو۔ پچھلے مجتہدین کرام کے بیان کردہ اصولوں کے ماتحت ہو اور اس کا مقصد بھی نئے مسائل کا حل ہو پہلے فیصلوں کی تردید و تنقیص نہ ہو۔ اس قسم کے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ نئے اجتہاد کا مطلب پچھلے مجتہدین کی تغلیط نہیں۔ پچھلے ذخیرۂ اجتہاد پر ایک ضروری اضافہ ہے۔ علمائے دیوبند نے اس قسم کے اجتہاد کو کبھی منع نہیں کیا، ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی اجازت انہی لوگوں کو ہو جو اس کے اہل ہوں اور پچھلے فقہاء و مجتہدین کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

اسلامی دستور مملکت کی مساعی

پاکستان ایک مسلم جمہوری مملکت ہے۔ یہاں ہر مکتب فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ہر ایک کی فکر اور فقہ جدا ہے۔ شیعہ لوگوں میں اکثریت اثناعشری فرقے کی ہے۔ اہل سنت کے بڑے بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ اہل حدیث کے ہم خیال بھی کافی موجود ہیں۔ مولانا مودودی کے ہم مسلک بھی کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں۔ ان تمام مکاتب فکر میں کوئی ایسا مکتب نہیں جس پر دوسرے سب مکاتب جمع ہو جائیں۔ ہر ایک کے اپنے اصول ہیں اور اپنے مسائل ہیں۔ ان میں سے جو جماعت بھی نفاذِ شریعت کے لیے آگے بڑھے گی دوسری جماعتیں اسے اپنے مسلک کے لیے خطرہ سمجھیں گی۔ گو وہ جماعت دوسرے مکاتب فکر کو کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ اسلامی قانون سازی کے وقت ہر مکتب فکر کی فقہ کا پورا احترام کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی اسی قسم کی ہوگی جیسے کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے پر ہر طبقے کو اس کے حقوق پورے ملیں گے۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اقتدار پر قبضہ ہونے کے بعد مسلمان انہی کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اسی طرح مسلمانوں کا ہر مکتب فکر نظام اسلامی کے قیام کی باگ کسی ایک مکتب فکر کے ہاتھ میں دینا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔ مبادہ وہ لوگ اقتدار پر آکر ان کی فکر و فقہ کو نظرانداز کر دیں۔ جماعت اسلامی اگرچہ اپنے آپ کو تمام فرقوں سے بالا سمجھتی ہے اور گروہی تعصبات سے دور رہنے کا اعلان کرتی ہے، لیکن عملاً وہ مولانا مودودی کی ساعی سے ایک ایسا فرقہ بن چکی ہے جس کو ہر فرقے سے تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ جماعت کی اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ارکان اور متفقین وغیرہ زیادہ تر مولانا مودودی کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس ایک مکتب فکر کے ساتھ وہ تمام مکاتب فکر کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب یہ بات سامنے آتی ہے تو مولانا مودودی کی یقین دہانی پھر وہی رنگ اختیار کرتی ہے جو کانگریس کے لیڈر اختیار کرتے تھے۔ ان حالات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور مملکت اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے یہاں کے رہنے والے تمام مکاتب فکر مشترکہ کمان سے نہ چلیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان علیٰحدہ علیحدہ ہر مکتب فکر کے افراد کو اپنے ساتھ کھینچتے ہیں، لیکن ان کے مکاتب فکر کو ان کی نمائندہ حیثیت میں کبھی انہوں نے دعوت نہیں دی اور نہ انہوں نے دوسرے تمام مکاتب فکر کی کبھی کوئی مشترکہ میٹنگ بلائی ہے۔ نظام اسلامی کے نفاذ کے لیے وہ کسی مشترکہ قیادت کے قائل نہیں۔[1]

---

[1] امیر جماعت اس دور میں داعی اسلام کہلاتے ہیں، بلکہ انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ داعی اسلام بے چارہ کیا کرے" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذہن
باقی صفحہ ۱۲۹ پر

علمائے دیوبند اس اصولی ضرورت سے پوری طرح باخبر تھے۔ نظامِ اسلامی سے گریزپائی کرنے والے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو نظامِ اسلام کے نفاذ کا ایک بہانہ بنا رہے تھے۔ علماءِ دیوبند نے اس مغرب زدہ طبقے کا چیلنج بھی قبول کیا اور کراچی میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی۔ جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتبِ فکر کے اکابر شامل ہوئے جنہوں نے اپنے مکتبِ فکر کی نمائندگی خود کی۔ اکتیس علماء کی یہ نمائندہ میٹنگ بلانے کا سہرا علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے سر بندھا۔ کافی بحث وتمحیص اور محنت وعرق ریزی کے بعد وہ مشترکہ دستوری خاکہ تیار ہوا، جس پر تمام مکاتبِ فکر متفق ہوئے۔ یہ اکتیس علماء کا تاریخی فیصلہ کہلاتا ہے اور بارہا چھپ چکا ہے اور ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جو فرقہ وارانہ اختلاف کی آڑ میں اسلامی نظامِ زندگی سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ علمائے دیوبند کا یہ تاریخی کارنامہ ہے جو رہتی دُنیا تک مثال رہے گا۔ ہمیں اس وقت اس کی تفصیلات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرزمین پاک وہند میں مسلک دیوبند ہی ایسا معتدل مسلک ہے جس کے علماء نے باہمی اختلاف کو کم کرنے اور مشترکہ ملی ضروریات کے موقع پر مختلف مکاتبِ فکر کو جوڑنے کی پوری مخلصانہ کوشش کی ہے۔

عائلی قوانین اورعلمائے حق

عائلی اختلافات و مسائل پر حکومت پاکستان نے ایک عائلی کمیشن مقرر کیا جو یہ رپورٹ پیش کرے کہ عائلی قوانین کو کس طرح کتاب وسنت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ اس کمیشن میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی ایک رکن تھے، لیکن اس کے باقی ارکان مغرب زدہ تھے۔ انہوں نے اپنی جو رپورٹ مرتب کی اس میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کے عنوان سے ایسی تجاویز پیش کی گئیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلاف کیا اور اپنا ایک مفصل اختلافی نوٹ لکھا جو کتاب وسنت کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔ خود اعیانِ حکومت میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اسلام کے نام سے غیر اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ عائلی سفارشات جو منظوری کے درجہ میں تھیں، لیکن ان کا نفاذ نہ ہوا تھا کہ مارشل لاء کا نفاذ ہوگیا۔ اور مارشل لاء کے سائے میں ان سفارشات کو ایک آرڈی ننس کے ذریعہ قانون کی شکل دے دی گئی اور اس کی دفعات قوم کے سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ بعض امور میں صریحاً قرآن وسنت

بقیہ صفحہ ۱۲۸

نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے تمام مسلم فرقوں کو یکجا کرنے کے سلسلے آج تک کیا کیا۔ تحریری طور پر فرقہ وارانہ سبق دیتے ہیں کہ میں امت مرکز کو کھڑا ہوا ہوں اور اسی نعرے کی بدولت شروع شروع میں ہندوستان کے بعض بڑے علماء نے اس آواز پر لبیک کہی اور کئی اکابر نے ان کی تحسین بھی کی جس کو آج بھی جماعتِ اسلامی اچھالتی ہے، لیکن علاوہ بعض اجتہادی مسائل اور بعض دوسرے امور میں پوری امت کے مجددوں پر تنقید کرکے اہلسنت والجماعت کے تمام فرقوں سے ایک علیحدہ فرقہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلامی نظام جو اصل مقصد ہے اس کے لیے فرقہ مشترکہ قیادت کے قائل نہیں لیکن سب کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی بھی قیادت قبول کرتے ہیں اور نوابزادہ نصراللہ خان کی بھی۔ ع این چہ بوالعجبی است (راشد)

کی مخالفت کی گئی ہے اور قرآن پاک میں تحریف کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ خلیفہ اکبر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تجویز و صدارت میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث تمام مکاتب فکر کا نمائندہ اجتماع جامعہ اشرفیہ نیلاگنبد میں ہوا، اور باتفاق عائلی قوانین کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا، لیکن اس فیصلہ کی اشاعت کی اجازت نہ ملی۔ اسی طرح مولانا احمد علیؒ کی صدارت میں اسی قسم کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں صدر محمد ایوب خان مرحوم نے ملک کو نیا آئین دیا اور اس کے تحت انتخابات ہوئے۔ ہزارہ سے مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے ممبر اور ڈیرہ اسماعیل خان سے مفتی محمود صاحب قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، صوبائی اسمبلی میں عائلی قوانین کے خلاف صدائے بازگشت سنی گئی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس سلسلے میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کی اور کہا کہ صوبائی اسمبلی ان قوانین کو مسترد کرنے کی سفارش کرے۔ ایک مرد مجاہد کی للکار جرأت و بیباکی اور کتاب و سنت کی ترجمانی کا یہ اثر ہوا کہ سوائے چار پانچ ممبروں کے تمام ہاؤس نے مولانا کی تائید کی ——— ——— اور عظیم اکثریت سے مولانا کی تجویز پاس ہوئی۔ اور یہ قرارداد.... مرکزی اسمبلی کو بھیج دی گئی، لیکن قومی اسمبلی میں اس کا جو حشر ہوا وہ ایک طویل دلگداز داستان ہے۔ جس کو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ختم نبوت اور علمائے حق

اسلام اللہ کا آخری دین ...... قرآن پاک خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں، لیکن مملکت پاکستان میں بوجوہ اس عقیدہ کے خلاف کام ہوتا رہا۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ تحفظ ختم نبوت کے بارے میں ایک مؤثر تحریک چلائی جائے اور حکومت تک اپنے مطالبات پہنچائے جائیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جالندھری نے تمام مکاتب فکر کے تقریباً پانچ صد نمائندہ علمائے کرام کو دعوت دی اور برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ایک عظیم تاریخی اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ اس سلسلے میں آئینی اور قانونی طور پر اپنے مطالبات حکومت تک پہنچائے جائیں۔ ایک مجلس عمل ترتیب دی گئی جس کے صدر مولانا ابوالحسنات قادری خطیب جامع مسجد وزیر خاں مقرر ہوئے۔ تحریک پُرامن طریق سے چل رہی تھی کہ مجلس عمل کے تمام ارکان کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہو چلی تھی کہ مغربی پاکستان کے نوے فیصد عوام و خواص اس کے ساتھ تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد ممتاز دولتانہ نے بھی ہمنوائی کی۔ امید تھی کہ اس عوامی اور اسلامی تحریک کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجلس عمل کی گرفتاری سے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور تحریک جذبات کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور لاہور میں مارشل لاء لگانا پڑا اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی غلط پالیسی اور مجلس عمل کے ارکان کی گرفتاری کا ردعمل تھی۔ عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ علمائے حق نے یہاں بھی ملت اسلامیہ کے ایک اہم بنیادی مسئلہ کی حفاظت کے لیے پوری امت کو ایک سٹیج پر لا کھڑا کیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ وہ حقائق سے چشم پوشی کرتے اور اپنے مخصوص مفادات و نظریات کے

پرچار کی خاطر ہمیشہ سے غلط پروپیگنڈہ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تحریک وقتی طور پر دب گئی تھی۔ لیکن اس کی بنیادیں خلوص اور لاتعداد قربانیوں کا خون تھا۔ شہیدوں کا خون ہمیشہ رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں یہ تحریک حضرت مولانا یوسف بنوری کی قیادت میں کامیابی سے ہمکنار ہوگئی اور مرزائی قانون کی نظر میں باقاعدہ غیرمسلم اقلیت قرار پائے۔

اس مختصر تحریر میں ان خدمات کی تفصیل کما حقہ پیش نہیں کی جا سکتی جو ان علمائے حق نے برصغیر پاک وہند میں ملت اسلامیہ کی رہنمائی کرتے ہوئے سرانجام دیں۔ اس کام کی قدرے تفصیل "بیس بڑے مسلمان" میں آپ کو ملے گی۔ یہ کتاب بیس علمائے حق اور متوسلین کی متاع حیات ہے۔ جس میں ذی علم اور فاضل حضرات کے قلم سے ان اکابر کے سیرتی خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان اہل حق کی پاکیزہ داستان ہے جو ایک صدی کے قریب اپنے اپنے دائرہ عمل میں حق کا نشان بنے رہے۔ اس پاکیزہ داستان کی تحریک تجویز اور ترتیب عزیز محترم مولانا حافظ عبدالرشید ارشد فاضل خیرالمدارس نے کی ہے۔ جو اس پاکیزہ کوشش پر ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔ رب العزت عزیز موصوف کی اس کوشش کو اسی طرح حیات دوام بخشیں جس طرح انہوں نے اپنے اسلاف کی خدمات کو زندہ رکھنے کی یہ گراں بہا کوشش کی ہے ؎

نام نیک رفتگان ضائع مکن ـــ تا بماند نام نیکت برقرار

راقم الحروف اپنی علمی بے بضاعتی اور ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ ان پاک بازو پاک نہاد اکابر کی سوانح پر کچھ سطور لکھے لیکن مولانا موصوف کے اصرار اور گذشتہ کئی سال کی مودت نے مجبور کرکے یہ چند سطور لکھوا دی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے ان بزرگوں کے تبحر، تقدس اور ان کی قربانیوں کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ لیکن اس انتساب سے یہ کچھ امید ہوگئی ہے کہ رب العزت ان کی محبت کا صدقہ ان کے ساتھ حشر فرمائے ؎

أُحِبُّ الصالحين ولستُ منهم ـــ لعل الله يرزقني صلاحا

یہ سطور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور انگلستان میں جہاں کوئی مطلوب کتاب پاس نہیں مسافرت کی حالت میں لکھی گئی ہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہو یا کوئی ضروری بات نہ آسکی ہو تو دوستوں سے معذرت اور چشم پوشی کا خواستگار ہوں۔

خالد محمود حال مقیم برمنگھم

مکتوب گرامی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ العالی

احقر نے حضرت کی خدمت میں مضمون کے لیے عرض کیا۔ حضرت نے اس کے جواب میں یہ مکتوب ارسال فرمایا :- ارشد

مکرم محترم مد فیوضکم ۔ بعد سلام مسنون ۔ آج کی ڈاک سے گرامی نامہ اور دارالعلوم
کے اشتہار پہنچے ۔ مختصر اشتہار تو الرشید کے ٹائٹل پر پہلے بھی سن چکا تھا مگر جو تفصیل آج
کے اشتہار سے معلوم ہوئی یہ پہلے نہیں سنی تھی ۔ بہت ہی طبیعت خوش ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ
بہت مبارک فرمائے ۔ یہ ناکارہ دعا کرتا ہے اللہ جل شانہ جلد از جلد اس کی تکمیل فرما کر لوگوں کو
زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے ۔ اس ناکارہ کو اپنے بزرگوں کے حالات پڑھنے کا بہت
بچپن سے شوق عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے ۔ اکابر کی جو بھی سوانح چھپی میں نے اس کو
ایک رات یا دو رات میں پوری پڑھی ۔ جب زندگی تھی اور صحت تھی ۔ اب جب سے معذور
ہو گیا ہوں اشتیاق تو بدستور ہے مگر سننے میں دیر لگتی ہے ۔ سب سے پہلے تو اپنا نام مجلد
کاغذ کے خریداروں میں درج کرتا ہوں ۔ یہاں سے پیسے بھیجنا تو مشکل ہے مگر عنقریب جناب
تک پہنچ جائیں گے ۔ تیاری کے بعد بذریعہ ڈاک تو ہرگز نہ بھیجیں کہ ڈاک میں بالخصوص رسائل
بہت ضائع ہوتے ہیں رسالہ پر میرا نام لکھ کر عزیزم مولوی احسان الحق رائیونڈ یا حضرت مولانا
محمد یوسف صاحب بنوری کے صاحبزادے عزیز محمد بنوری کو کراچی بھیج دیں ۔

اس کے بعد آپ نے گرامی نامہ میں کچھ لکھنے کو تحریر فرمایا ۔ اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین لکھنے کی
کبھی عادت نہیں ہوئی ۔ میرے حضرت اور حضرت تھانوی، حضرت مدنی، خود حضرات رائپوری
چچا جان عزیز یوسف کے انتقال پر بہت سے احباب کے تقاضے آئے کہ میں کچھ لکھ کر بھیجوں مگر میں یہی
معذرت کرتا رہا کہ مجھے اس قسم کے مضامین لکھنے کی عادت نہیں نہ مناسبت ہے ۔ لوگ اصرار
کرتے ہیں کہ تیرا تعلق ان سب حضرات سے بہت خصوصی رہا ۔ میں لکھ دیتا کہ یہ تو صحیح ہے
اور واقعات بھی بہت یاد ہیں مگر تذکرہ میں واقعات یاد آتے رہتے ہیں مستقل لکھنے کی عادت
نہیں ۔ آپ نے دو باتیں خاص طور سے معلوم کیں مدرسہ مظاہر علوم، دارالعلوم کے ارتباط کے واقعات
تو بہت ذہن میں آتے رہے اور رات نیند بھی ان ہی خیالات میں نہیں لگی جس سے آج بخار
بھی ہو گیا مگر پھر وہی بات کہ مرتب تو لکھوانے کی عادت نہیں بات میں بات یاد آتی رہتی ہے
یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دہلی کا علمی چمن اجڑ جانے کے بعد سب اکابر کے ذہنوں میں کثرت سے مدارس
قائم کرنے کا خیال بیک وقت موجزن ہوا اور یکے بعد دیگرے بہت سے مدارس قائم ہوئے ۔ محرم الحرام
۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند اور اسی سال رجب میں مظاہر علوم سہارنپور کی ابتدا ہوئی اس کی
تفصیلات تو اس ناکارہ کا رسالہ تاریخ مظاہر حصہ اول میں گزر چکی ہیں ۔ اس میں سے کوئی

چیز ایک بننے کی ہو تو دے دیں۔ ان حضرات کے آپس کے تعلقات اور محبت کے واقعات تو بہت
مشہور ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری جو مظاہر کے روح رواں ہیں اور حضرت
نانوتوی نور اللہ مرقدہ ابو داؤد میں ان کے شاگرد تھے۔ راستہ ان سے ملنے کے واسطے کثرت سے
تشریف لاتے رہتے تھے۔ مدرسہ میں بھی تشریف آوری ہوتی رہتی تھی ۱۲۹۳ھ میں جب مظاہر علوم
محلہ قاضی سے اپنی موجودہ جگہ پر منتقل ہوا تو حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہ نے تین گھنٹہ تک
وعظ فرمایا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب نور اللہ مرقدہ ابتدائی زمانہ میں کلکتہ میں ملازم تھے وہاں
سے سبکدوش ہوکر ۱۲۹۱ھ میں مستقل سہارنپور تشریف لے آئے اور مدرسہ میں تدریس کا سلسلہ
شروع فرمایا۔ اسی دوران میں ..... حضرت مولانا احمد علی صاحب مظاہر علوم کے چندہ کے لئے کلکتہ تشریف
لے گئے کہ وہاں طویل قیام کی وجہ سے وہاں والوں سے تعارف تھا اس سفر کا حساب بھی مدرسہ کے
رجسٹر میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک ایک پیسہ کا حساب تھا کہ فلاں تاریخ کو کرایہ فلاں جگہ کا تھا
اور اخیر میں یہ جملہ جو لکھا اس جگہ لکھا ہے یہ تھا کہ کلکتہ میں سے فلاں جگہ اپنے ایک دوست
سے ملنے کیلئے گیا وہاں اگرچہ چندہ تو کافی ہوا مگر میرا سفر چندہ کی نیت سے نہیں تھا بلکہ اپنے
ذاتی کام کیلئے تھا اسلئے اس آمد ورفت کا خرچ مدرسہ کے ذمہ نہیں لگایا۔ آپ بیتی میں ہیں۔
یہ قصہ آپ دیکھا۔ ان اکابر کی یہ احتیاط تھی اب ہم لوگ اپنے دور میں دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اپنی
ضرورتوں سے کہیں جاتے ہیں تو مدرسہ کی رسید بھی ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ سفر بیکار نہ ہو جائے
یہ بین تفاوت رہ از کجا است تا بکجا۔ فالی اللہ تعالیٰ المشتکی۔
۹۲ھ میں کتب حدیث سب حضرت مولانا ہی نے بنفس نفیس پڑھائیں اس سے پہلے چھٹی کے زمانے
میں جب تشریف لاتے تو کتب حدیث کثرت سے پڑھایا کرتے تھے جو روئیدادوں میں تفصیل
سے ہے۔ اس سال میں ۱۲۹۲ھ میں مسلم شریف تمام دو مرتبہ ابو داؤد شریف بخاری شریف ایک ایک مرتبہ
تمام دوسری مرتبہ گیارہ سیپارے مشکوٰۃ شریف نسائی شریف ابن ماجہ ترمذی موطا امام محمد
جامع الصغیر جلالین شریف ترجمہ کلام مجید احیاء العلوم درمختار شمائل ترمذی مقدمہ ترمذی
سراجی شرح جامی اور قدوری، اتنی کتابیں ہم جیسے ضعفاء کو سنکر ہی حیرت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ
نے ان اکابر کے اوقات میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی۔ ۹۵ھ میں لکھا ہے کہ اکتیس حضرات نے
صحاح ستہ حضرت مولانا احمد علی صاحب رح سے سند حدیث حاصل کی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے
دس سال تک تن تنہا صحاح ستہ کی تعلیم فرمائی۔ اس وقت کے اکابر سب ایک دوسرے کے ساتھ
محبت زیادہ نسبت یک جان دو قالب کے مصداق تھے۔ مظاہر علوم ابتداء ایسے مقامی افراد کے
زیر اثر رہا اور ۱۳۲۲ھ میں ممبران کے آپس کے اختلاف و انتشار کی وجہ سے حکام کی مداخلت
اور ان کی حکم بنا دے کا انہوں نے تین حضرات کو مدرسہ کا سرپرست بنایا۔ مولانا شاہ
عبد الرحیم صاحب رائپوری حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مولانا اور الحاج خلیل احمد والد ما جد

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ دیوبندی۔ مولانا ذو الفقار صاحب کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہند رح
سرپرست بنے اور تو خوب نک رہے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند بھی انتشار کا مرکز
بنا ہوا تھا جسکو میرے رسالہ کے صفحہ ۹ پر دارالعلوم اور مظاہر علوم کی ہم آہنگی کے عنوان سے
حضرت شیخ الاسلام کی تحریر درج ہے۔ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہ سے چونکہ مولانا احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
وغیرہ سے دور کی قرابت بھی تھی اسلئے تقریبات میں آمد ورفت بھی کثرت سے رہتی۔
حضرت مولانا احمد صاحب کے اہتمام میں حضرت سہارنپوری کو بھی دخل ہے جیسا بیان تذکرۃ الخلیل
میں ہے کہ مولانا احمد صاحب کے اہتمام کی تحریک سب سے پہلے حضرت گنگوہی کی خدمت میں میں
نے ہی پیش کی تھی اور بار بار یاد دہانی بھی کرتا رہا۔ اگر صحت اجازت دیتی تو خود ہی تفصیلات
لکھتا اب تو آپ کا جی چاہے تو ان حوالوں سے دیکھ لیجئے۔ ۱۳۳۰ھ کے بعد سے دونوں مدرسوں
کے طلبا میں کچھ تنافس پیدا ہوا اور ایک مدرسہ کو دوسرے پر ترجیحات میں گفتگوئیں ہوتی
رہتیں۔ مگر اس کا اثر اکابر تک نہیں پہنچا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ نے
عزیز مولوی طاہر مرحوم برادر خورد حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کو مظاہر علوم میں پڑھنے کیلئے
بھیجا اور اس ناکارہ کو خاص طور سے نگران بنایا۔ میرا وہ زمانہ حماقتوں اور الشباب شعبۃ
من الجنون کا تھا۔ میں طلبہ پر زبانی نکیر کے بجائے ہاتھ سے نکیر کیا کرتا تھا۔ خاص طور سے صاحبزادوں
پر جس میں میرے حضرت نور اللہ مرقدہ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ حضرت مولانا
عبد الرحمن صاحب صدر مدرس کے اعزہ واقارب زیادہ شکار رہتے تھے۔ عزیز مولوی طاہر مرحوم
میری دست درازی کا تحمل نہ کرسکے اور بیمار ہو گئے۔ آب وہوا کی عدم موافقت کی مجبوری
مولانا حبیب الرحمن صاحب کو لکھی اسلئے مولانا نے ان کو بلا لیا۔ میری دست درازی میں
حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب اور قاری سعید صاحب کو زیادہ دخل تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ
ان خوردوں اور بڑوں کے بچوں کی قدر ان کے مارنے سے ہی ہو سکتی ہے نہیں تو اسپر قادر ہے اور
تیرے ساتھ ہی سے تجھ سے باز پرس ہوگی۔ ان کی یہ تقریر مجھے اور تشدد پر برانگیختہ کرتی رہتی۔
بہرحال تنافس کا زمانہ چند سال تک چھوٹوں میں رہا۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام مدنی رح
کی صدر مدرسی کے بعد حضرت کی کثرت سے آمد ورفت نے اس چیز کو بالکل ہی زائل کر دیا۔
حضرت قدس سرہ کے بعد مولانا فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہ بھی اکثر تشریف لاتے رہتے تھے
اور رمضان کے دو چار دن بھی خاص طور سے سہارنپور گزارتے تھے۔ نیز مولانا اعزاز علی صاحب رح
بھی آخر زمانہ میں تقریبا ہر جمعہ کو تشریف لاتے رہتے تھے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب
زاد مجدہم بھی اپنی شفقتوں میں اپنے اکابر کے قدم بقدم ہیں۔ ان سب امور ہی نے وہ
تنافس کا سلسلہ جو دارالعلوم و مظاہر علوم میں چند سال تک رہا بالکل نسیا منسیا کر دیا۔ اب

تو ساتھیوں سے اس قسم کی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔

رات تو بہت سے واقعات یاد آ رہے تھے مگر اب تو ذہن میں نہیں رہے۔ حضرت دیوبند نور اللہ مرقدہم میں حضرت شاہ مولانا انور شاہ صاحب۔ مولانا اعزاز علی صاحب کی تقریریں بھی بذل المجہود پڑھیں وہ بھی انگریز کے تعلقات کی طرف اشارہ ہیں۔ باتیں تو بہت یاد آئی تھیں مگر اب تو یاد نہیں رہیں۔ البتہ ایک ضروری تنبیہ یہ ہے کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے اپنی اور حضرت سہارنپوری کی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کی تحریک میں شرکت اور واقفیت مدینہ منورہ کی تحریر فرمائی ہے اور حضرت مدنیؒ کی تحریر سے اور بھی متعدد لوگوں نے مختلف جگہ نقل کیا ہے جہاں تک حضرت مدنی کا تعلق ہے وہ تو صحیح ہے اس لئے کہ حضرت کئی سال پہلے سے مدینہ منورہ تشریف فرما تھے لیکن جہاں تک حضرت سہارنپوری کا تعلق ہے وہ صحیح نہیں بلکہ شوال ۳۳ھ میں جبکہ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند کی حجاز کی روانگی تجویز ہو رہی تھی اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کی حیثیت میں اس تحریک کی قیادت اصل حضرت رائپوری کے سپرد ہونی تھی وہ منشا ہی ہی میں طے ہوئی تھی اور اس سے ان حضرات کے انگریز کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے شوال ۳۳ھ کے پہلے ہفتہ میں حضرت شیخ الہند دیوبند سے اور اعلیٰ حضرت رائپوری رائپور سے اور مولانا احمد صاحب رامپوری رامپور سے سہارنپور تشریف لائے اور ۴-۵ روز تک مدرسہ کے کتب خانہ میں یہ سب تبادلہ ہوئی تھیں چاروں حضرات فجر کی نماز کے بعد چائے اور اشراق سے فارغ ہو کر مدرسہ کے کتب خانہ میں اوپر تشریف لے جاتے تھے اور سب طرف کے کواڑ اندر سے بند ہو جاتے تھے۔ پانچویں کا وہاں گزر نہ تھا۔ ۱۱½ بجے سے حاجی مقبول احمد صاحب مرحوم جو میرے حضرت کے خصوصی خادموں کا ~~کھانا~~ مکان سے کھانا لانا اور کھلانا کے ذمہ دار تھے وہ ۱۱½ سے تقاضہ شروع کرتے تھے۔ اوپر تو جا نہیں سکتے تھے۔ مدرسہ کے صحن میں کھڑے ہو کر چلاتے رہتے تھے کہ کھانا آ گیا، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اور مولانا احمد صاحب ۲-۳ تقاضوں پر اٹھ کر کواڑ میں سے کہتے کہ آ رہے ہیں۔ ظہر کی اذان سے ۱۵-۲۰ منٹ پہلے یہ حضرات اوپر سے اترتے اور کچھ گرم کچھ ٹھنڈا نوش فرما کر (اسی دوران میں اذان ہو جاتی) اور ظہر کی نماز پڑھ کر پھر کتب خانہ میں پہنچ جاتے تھے۔ اور عصر کی اذان پر اترتے تھے۔ عصر کے بعد سے صبح کی نماز تک مجلس نہیں ہوتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ کتب خانہ میں اس وقت بجلی نہیں تھی عصر کی نماز پڑھ کر حضرت رائپوری تو اپنی قیام گاہ پر جو دار الطلبہ کے قریب رائے پور والوں کا مکان کے نام سے مشہور ہے۔ تشریف لے جاتے۔ اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ اپنے احباب سے ملنے کے لئے شہر میں کبھی کہیں کبھی کہیں تشریف لے جاتے اور مولانا احمد صاحب بھی اپنے احباب سے ملاقات کے لئے۔ ۴-۵ دن تک مسلسل یہ روزانہ کا معمول صبح سے عصر تک رہا۔ اور اس دوران میں کوئی

عام یا خاص اور پرنہیں جا سکتا تھا۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کی بعض حاسدوں نے شکایات تحریری اور تقریری حضرت سہارنپوری اور حضرت رائے پوری تک پہنچا رکھی تھیں۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ یہ حضرات ان شکایات پر کچھ غور کر رہے ہیں؟ میرے والد صاحب نے خوب یاد ہے کہ زور سے ہنس پڑے کہ وہ ایسی تھوڑا ہی ہیں کہ جس کے واسطے اتنی بھی چوڑی طلب شوری ہوتی اور حضرت شیخ الہند اور مولانا احمد صاحب گودوں سے کیا تعلق۔ یہ حضرات تو جانے کہاں کہاں کی پرواز کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں حضرت شیخ الہند رح کی غیبت میں اعلیٰ حضرت رائے پوری تو ایک کا سرپرست قرار پا گئے تھے جو بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدھما کا مدینہ میں ایک ہی جگہ تھا۔ اور ملاقاتیں وغیرہ اکثر ہوتی رہیں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی حیات میں بہت چاہتا تھا کہ حضرت مدنی جو حضرت سہارنپوری والا قصہ نقل کریں اس کی اصلاح کر دوں مگر والد صاحب اور حضرت نور اللہ مرقدہ کی دونوں کی سخت مشغول اور اس کے بعد حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی طویل بیماری (جو وصال پر منتہی ہوئی) نے نوبت نہ آنے دی

سه نہ جانے تھے کہ اس جان جہان سے یوں جدا ہوں گے
یہ سنتے تو چلے آتے تھے اک دن جان ہے جانی

(۲) آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کا سوال کیا۔ یہ چیز تو بہت طویل ہے لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ جب امام مومنین کے لئے یہ ہے تو پھر شیخ سلوک کا کیا پوچھنا۔ حضرت نانوتوی رح کے قصائد تو قصائد قاسمی میں ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری کے دو ایک قصے لکھوا رہا ہوں ـــــ حضرت شیخ الہند کا معمول وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا تھا کسی نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر پڑھنے کا تو آدھا ثواب ہے تو حضرت نے فرمایا ہاں بھائی یہ تو معلوم ہے مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیٹھ کر پڑھنا حدیث میں آیا ہے۔

اور بذل المجہود لکھواتے وقت جب حدیث النفل شرکی جو مصنف عثمانی کی ترتیب کے خلاف ہے تو حضرت نور اللہ مرقدہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک پرچہ پر اس حدیث کو نقل کر دیجیو کہ میں رات کو تہجد اسی پر پڑھوں گا۔ پوری حدیث بذل جلد نمبر ۲ باب تحزیب القرآن میں ہے۔

آپ کی طرف سے روضہ اقدس پر صلوۃ و سلام میں نے خود ہی پیش کر دیا اور احباب سے بھی تاکید کر دی۔ اور پیش کرتا رہتا ہوں۔ آپ کے لئے آپ کے مدرسہ کے لئے دل سے دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ

مکروہات سے حفاظت فرما کر دارین کی ترقیات سے نوازے۔ فقط۔ حضرت شیخ زاد مجدہ۔ بقلم محمد شاہد مظفر۔ ۱۰ صفر ۱۳۹۷ھ ۔ ۱ فروری ۱۹۷۷ء

الرشید زیر ادارۃ مولانا حبیب اللہ (ابن حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فاضل دیوبند، چونکہ اپنے رسالہ الرشید کا دارالعلوم دیوبند نمبر نکال رہے ہیں اور اس ناکارہ سے فرمائش فرمائی کہ میں دارالعلوم کے سلسلے میں کوئی مضمون پیش کروں، اس لیے دارالعلوم کے بارے میں حسب ذیل چند سطور پیش ہیں:

دارالعلوم دیوبند کا اجراء عام موجودہ طریقے پر نہیں ہوا کہ چند افراد نے بیٹھ کر تجویز کیا ہو کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے اور مجموعی رائے سے مدرسہ دیوبند قائم کر دیا گیا، بلکہ یہ مدرسہ بالہام غیب قائم کیا گیا ہے۔ وقت کے اہل اللہ اور ارباب قلوب افراد کے قلوب پر یکدم وارد ہوا کہ اس وقت ہندوستان میں جب کہ انگریزی اقوام مسلط ہو چکی ہے اور اس کے تحت ان کا تمدن اور ان کے افکار و نظریات طبعاً اس ملک پر مسلط ہونے والے ہیں، جو یقیناً اسلام کے منافی اور لادینیت کے فروغ کا باعث ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کے نفسانی تمدن کے زیر اثر اسلامی معاشرت بلکہ نفس دین و مذہب ہی سے قلوب میں بیگانگی پیدا ہو جائے (جو کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کی فراست ایمانی کے مطابق یہ خطرہ واقعہ بن کر نمایاں ہونے لگا) ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، جو مسلمانوں کو اس سیلاب کے بہاؤ سے بچا سکے — چنانچہ ہر ایک نے اپنے واردات کو ایک مجلس میں بیٹھ کر ظاہر کیا! کسی نے کہا کہ مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ ان حالات میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، جو کم سے کم مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھ سکے۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر بھی یہی وارد ہوا ہے، کسی نے کہا کہ مجھے خواب میں یہی حقیقت دکھلائی گئی ہے۔ غرض قدرتی طور پر ایک باطنی الہام اس پر منتج ہو گیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا دین محفوظ ہو جائے، گو ان کی اسلامی شوکت پامال ہو چکی ہے، لیکن اگر دین و دینی جذبات محفوظ رہ جائیں گے، تو ایسا وقت آنا بھی ممکن ہے کہ وہ ان دینی جذبات و عادات سے ہی دنیا کو بھی سنوار

الہامیں، یہ تھے، وہ الہامات غیب جن کے تحت ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء میں اس ادارے کا آغاز کیا گیا، اس لیے یہ مدرسہ کسی رسمی مشورہ مفاہمت سے قائم نہیں ہوا، بلکہ باشارات غیب وقوع پذیر ہوا۔

حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اُن روشن ضمیر رفقاء کے ساتھ اجراء مدرسہ پر مستعد ہوئے اور مُلا محمود صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو میرٹھ میں مدرس تھے، میرٹھ ہی میں بُلا کر فرمایا کہ آپ کو یہاں دس روپے ماہوار تنخواہ مل رہی ہے، آپ اپنے وطن دیوبند تشریف لے چلیں، وہاں مدرسہ قائم ہو رہا ہے اور وہیں درس و تدریس شروع فرمائیں، آپ کی تنخواہ بھی پندرہ روپے ماہوار ہو گی، مُلا صاحب جب ہی تشریف لے آئے اور مسجد چھتہ میں جو دارالعلوم سے متصل اور اب دارالعلوم ہی کے زیر انتظام ہے؛ مُلا محمود صاحب نے صرف ایک شاگرد مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) کو سامنے بٹھلا کر مدرسہ دیوبند کا آغاز کر دیا۔ بعد میں اجراء مدرسہ کا اعلان ہوا اور بتدریج ایک سے دو اور دو سے دس پانچ تک طلباء کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی، پھر حضرت نانوتویؒ نے اس مدرسہ کو بلکہ اس جیسے تمام مدارس کے لیے آٹھ اصول وضع فرمائے اور ان پر عنوان یہ لکھا کہ "وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں" مولانا محمد علی جوہر مرحوم جب تحریک خلافت کے موقع پر دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم میں پہنچے اور یہ اصول ہشتگانہ حضرت ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ان کے سامنے پیش کئے گئے۔ (جو بجنسہٖ خزانہ دارالعلوم میں حضرت ہی کی قلمی تحریر کے ساتھ محفوظ ہیں) تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا: "ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو خزانۂ غیب اور مخزن معرفت سے نکلے ہوئے ہیں، حیرت ہے کہ جن نتائج تک ہم سو برس میں دھکے کھا کر پہنچے ہیں، یہ بزرگ سو برس پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے"۔ اس شہادت اور ہم خدام دارالعلوم کے یقین کی گواہی سے صاف ظاہر ہے کہ اس مدرسہ کے اصول بھی الہامی ہیں، کسی رسمی مشورہ مفاہمت کا نتیجہ نہیں، اجراء مدرسہ کے بعد یہ مدرسہ مختلف مسجدوں اور پھر کرایہ کے مکانات میں چلتا رہا۔ سات آٹھ برس کے بعد جب طلباء کی کثرت ہوئی اور رجوع عام ہوا تو ضرورت پیش آئی کہ مدرسے کا کوئی اپنا مستقل مکان ہونا چاہیے، تو یہ جگہ اور اس کے حصے جہاں آج دارالعلوم کی وسیع عمارات کھڑی ہوئی ہیں۔ تحریک و ترغیب کے بعد مدرسے کے لیے دینے شروع کئے، بعض نے بقیمت اور بعض نے حسبۃً للہ، جس سے ایک بڑا قطعہ مدرسے کے ہاتھ آگیا۔ یہ جگہ عموماً شہر کا میلا پھینکنے اور کوڑیوں کی جگہ تھی۔ دارالعلوم کے قیام سے تقریباً ایک صدی یا کم و بیش پہلے یہاں سے حضرت سید احمد شہید بریلوی مع اپنے رفقاء مجاہدین کے گزرے تو فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی بُو آتی ہے، جس کا ظہور ساٹھ سال بعد ہوا اور اسی گندی جگہ سے بالآخر ۱۳۰۸ھ کے بعد علوم نبوت کی اشاعت و ترویج شروع ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی جگہ انتخاب بھی الہامی ہے، جو باشارات غیب پہلے سے منتخب تھی اور آخر کار اسی جگہ پر ان اہل اللہ کا قرعۂ فال پڑا اور اس میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔

زمین مل جانے کے بعد جب حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند (جو نقشبندی خاندان کے اکابر میں سے تھے، صاحب کشف و واردات اور صاحب کرامات بزرگ تھے) کے زمانۂ اہتمام میں عمارت مدرسہ تجویز ہوئی اور اس کی پہلی بنیاد کھود کر تیار کی گئی اور وقت آگیا کہ اُسے بھرا جائے اور اس پر عمارت اٹھائی جائے، کہ مولانا علیہ الرحمۃ نے خواب دیکھا کہ اس زمین پر حضرت اقدس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، عصا ہاتھ میں ہے، حضورؐ نے مولانا سے فرمایا، شمال کی جانب جو بنیاد کھودی گئی ہے، اس سے صحن مدرسہ چھوٹا اور تنگ رہ گیا اور آپؐ نے عصائے مبارک سے دس بیس گز شمال کی جانب ہٹ کر نشان لگایا کہ بنیاد یہاں ہونی چاہیے۔ تاکہ مدرسے کا صحن وسیع رہے، (جہاں تک اب صحن کی لمبائی ہے) مولانا علیہ الرحمۃ خواب دیکھنے کے بعد علی الصباح بنیادوں کے معائنے کے لیے تشریف لے گئے تو حضور صلی اللہ کا نشان لگایا ہوا اسی طرح بدستور موجود تھا تو مولانا نے پھر نہ ممبروں سے پوچھا، نہ کسی سے مشورہ کیا، اسی

اسی نشان پر بنیاد کھدوادی اور مدرسے کی تعمیر شروع ہوگئی

اس سے واضح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی بنیادیں بھی الہامی اور اشاراتِ غیب کے تحت ہیں۔ اُس کا سنگِ بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو تمام اہل اللہ اور اکابرین جمع ہی نہیں تھے، بلکہ اُن کے قلوب میں ایک عجیب بشاشت و کیفیت کا نور موجزن تھا، سنگِ بنیاد میں جس سے بھی پہل کرنے کو کہا جاتا تو وہ کہتا، نہیں فلاں صاحب سے ابتدا کرائی جائے، وہ ہم سب کے بڑے اور اس کے اہل ہیں، گویا بے نفسی کا یہ خیال تھا کہ اپنے کو کم تر سمجھ کر کوئی بھی آگے نہیں بڑھتا تھا، بالآخر اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے رکھوائی گئی اور اس کے ساتھ ہی حضرت نانوتویؒ نے حضرت میاں جی منّے شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا اور فرمایا کہ یہ وہ شخص ہیں جنھیں خیرہ گناہ کا بھی کبھی تصور نہیں آیا، تو اُنھوں نے حضرت محدث سہارنپوری کے ساتھ اینٹ رکھی جس سے واضح ہے کہ سنگِ بنیاد رکھنے والے بھی وہ اہل اللہ تھے جو اتباعِ سنت اور روحانیات میں مستغرق تھے اور بے نفسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ممدوح دارالعلوم کے صحن (پیش نودرہ) میں کھڑے ہوئے تھے چند طلباء بھی حاضر تھے کہ دورۂ حدیث کا ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لے کر آپ کے سامنے آیا (جب کہ اُس وقت مطبخ میں صرف چودہ یا پندرہ طلباء کا کھانا پکتا تھا) اور اُس نے نہایت ہی گستاخانہ انداز میں شوربے کا پیالہ مولانا کے سامنے زمین پر دے مارا اور کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام انتظام کہ اس شوربے میں نہ مسالہ ہے، نہ گھی ہے۔ پانی جیسا شوربہ ہے، اور کچھ اور بھی سخت سست الفاظ کہے، اس گستاخی پر طلباء جوش میں آگئے، مگر چونکہ حضرت مولانا پوری متانت کے ساتھ خاموش تھے اور زبان سے کچھ نہیں فرما رہے تھے، اس لیے طلباء بھی خاموش کھڑے رہے، بجائے کچھ فرمانے کے مولانا نے اُس گستاخ طالب علم پر تین دفعہ اس کے سر سے پیر تک نگاہ ڈالی جب وہ طالب علم بک جھک کر چلا گیا تو مولانا نے حیرت سے طلباء سے فرمایا کہ کیا یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم ہے؟ طلباء نے عرض کیا کہ حضرت یہ مدرسے کا طالب علم ہے، فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے۔ طلباء نے کہا کہ مطبخ کے رجسٹر میں اس کے نام کا باقاعدہ اندراج ہے اور یہ برابر مدرسہ سے کھانا لے رہا ہے، فرمایا کچھ بھی ہو یہ مدرسے کا طالب علم نہیں ہے۔ چند دن کے بعد جب چھان بین ہوئی تو ثابت ہوا کہ وہ مدرسے کا طالب علم نہیں ہے، اس کا ایک ہمنام دوسرا طالب علم ہے، اس نے دھوکے سے محض نام کے اشتراک کی وجہ سے کھانا لینا شروع کر دیا، ورنہ اس کا اندراج سرے سے ہی رجسٹروں میں نہیں ہے، بات کھل جانے پر طلباء نے عرض کیا کہ حضرت! بات تو وہی نکلی جو آپ نے ارشاد فرمائی تھی، کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے، لیکن آپ نے اس قوت سے کس بنا پر اس کے طالب علم ہونے کی نفی فرمائی؟

فرمایا: ابتداءً میں اہتمام سے کنارہ اور بے زار تھا، لیکن جب بھی چھوڑنے کا ارادہ کرتا، تو حضرت نانوتویؒ رد کر دیتے تھے۔ مجبوراً پھر کام میں لگ جاتا تھا اور رد و انکار اور جبر و اصرار کے چند دن بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ احاطۂ مولسری دارالعلوم کا کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس کی من پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، لینے والے آ رہے ہیں اور دودھ لے جا رہے ہیں، کوئی گھڑا لے کر آ رہا ہے، کوئی لوٹا، کوئی پیالہ اور کسی کے پاس برتن نہیں ہے تو وہ چلّو ہی بھر کر دودھ لے رہا ہے۔ اور اس طرح ہزاروں آدمی دودھ لے کر جا رہے ہیں، فرمایا کہ وہ خواب دیکھنے کے بعد میں مراقب ہوا کہ اس واقعے کا کیا مطلب ہے؟ تو مجھ پر منکشف ہوا کہ کنواں صورتِ مثالی دارالعلوم کی ہے اور دودھ صورتِ مثالی علم کی ہے اور قاسم العلوم یعنی تقسیم کنندۂ علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ آ آ کر دودھ لے جانے والے طلباء ہیں، جو حسبِ استعداد علم لے لے کر جا رہے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ مدرسہ دیوبند کے ...

داخلہ ہوتا ہے اور طلبہ آتے ہیں تو میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اُس مجمع میں تھا اور یہ بھی، لیکن ایک گستاخ طالب علم پر میں نے سر سے پیر تک تین دفعہ نظر ڈالی، یہ اُس مجمع میں تھا ہی نہیں، اس لیے میں نے قوت سے کہہ دیا کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ اس مدرسے کے لیے طلبا کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں نہ اشتہار ہے، نہ پروپیگنڈہ اور نہ ترغیبی پمفلٹ کہیں جاتے ہیں کہ طلبا آکر داخل ہوں، بلکہ من اللہ جس کے قلب میں داخلے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، وُہ خود ہی کشاں کشاں چلا آتا ہے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم ثانی دارالعلوم کا مقولہ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ مدرسہ دیوبند کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتوی کرتے ہیں، جو جو ان کے قلب پر وارد ہوتا ہے وُہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتا ہے اور میں وُہی کام کر گزرتا ہوں چنانچہ جب بھی مولانا کوئی غیر معمولی کام کرتے تھے، تو اگلے دن حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، کچھ عرصے سے یہی کام جو آپ نے انجام دیا ہے، میرے دل میں آ رہا تھا کہ ایسا ہونا چاہیے جسے آپ نے عملاً انجام دے دیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس مدرسے کے امور مہمہ بھی اشارات غیب اور الہامات ہی سے انجام پاتے تھے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ جہاں قوی النسبت اکابرین میں سے تھے، وہیں اُمّی محض تھے، نہ لکھنا جانتے تھے، نہ پڑھنا، امور متعلقہ مولانا کے ارشاد، احکام اہتمام قلمبند ہوتے تو مولانا اس پر اپنی مُہر لگا دیتے تھے، گویا احکام اہتمام بھی کچھ مادی اسباب ہی قلمبند ہوتے تھے جس میں رسمی نوشت و خواند کی ہوتی تھی؟ حضرت کا اُمّی ہونا خود اس کی بھی دلیل ہے کہ ان کے قلبی مضمرات کسی سعی و عمل کے تابع نہ تھے، بلکہ قلبی واردات ہوتے تھے، جنہیں اشارات غیب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا مکاشفہ اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں آیا۔ فرمایا کہ میں دارالعلوم کی وسطی درس گاہ نودرہ سے عرش تک نور کا ایک مسلسل سلسلہ دیکھتا ہوں جس میں کہیں بھی بیچ میں فصل یا انقطاع نہیں اور اس لیے بزرگوں کا بلکہ خود اپنا بھی تجربہ ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ جو بہت سے مطالعے سے بھی حل نہیں ہوتا، اس درس گاہ میں بیٹھ کر پڑھنے اور سوچنے سے حل ہو جاتا ہے اور اس میں شرح صدر نصیب ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس مدرسے کا فیضان بھی کچھ رسمی اسباب کے تابع نہیں بلکہ من اللہ قلوب طلبا و اساتذہ پر وارد ہوتا ہے اور ان میں علمی شرح صدر پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہ بھی مکاشفہ ہے کہ درس گاہ نودرہ کے سامنے کے صحن میں درس گاہ کے ایک دو گز کے فاصلے پر اگر کسی جنازے کی نماز پڑھی جائے تو وُہ مغفور ہو جاتا ہے، اس لیے اس احقر نے اس جگہ کی تشخیص کے بعد اس پر سیمنٹ کا ایک چوکھٹا نشان بنوا دیا ہے اور اس پر جنازہ رکھ کر خواہ شہری ہوں یا متعلقین مدرسہ ان کے جنازے کی نماز پڑھی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کی مقبولیت صرف تعلیم تک اور صرف متعلقین مدرسہ تک محدود نہیں، بلکہ عوام بھی اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، خواہ وُہ اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں، ھم القوم لا یشقی جلیسہم پھر اس مدرسہ کے اساتذہ اور عہدیداروں میں بھی تکوینی طور پر ایسے ہی حضرات کا انتخاب ہوتا رہا ہے، جو صاحب نسبت اور صاحب دل ہی ہوتے رہے ہیں۔

بہر حال اس مدرسے کے ابتدائی تصور اس کی جگہ کا انتخاب، اس کا اجراء، اس کا سنگ بنیاد، اس کے ذمہ داروں کا انتخاب اس کے طلبا کی تشخیص، طریق کار اور طریق اجراء احکام سب ہی کچھ اس عالم اسباب سے زیادہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے میں نے اس مدرسے کا لقب عنوان میں "الہامی مدرسہ" رکھا ہے۔

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس کے فضلاء و علماء جو سو برس میں

دس ہزار سے کم تیار نہیں ہوئے، جنھوں نے اس ماحول میں تربیت پاکر علوم واعمال کا اکتساب کیا۔ ان کا علم عام حالات میں محض رسمی نہیں ہو سکتا، بلکہ ناگزیر طریق پر اس میں معرفت اور گہرائی شامل ہی ہے۔

اور جو بھی دارالعلوم کا فاضل جو حقیقتاً فاضل اور یہاں کے ذوق پر تربیت یافتہ ہے، وہ جہاں بھی ہے، خواہ شہر ہو یا قصبہ اور دیہات عوام کے ایمانوں کی حفاظت کئے ہوئے ہے۔

ہزاروں فضلاء وہ ہیں کہ جن کا نہ نام کسی کو معلوم ہے، نہ اشتہار اور تشہیر کا سلسلہ ہے، مگر ایمان کا تحفظ خاموش طریقے پر ہو رہا ہے اور کوئی بھی دینی فتنہ ایسا نہیں جس کی روک تھام میں وہ حسبِ استطاعت و قابلیت مصروف نہ ہوں، دارالعلوم کے فضلاء کا سلسلہ اور مرکز سے ان کی وابستگی کسی تنظیم یا ممبر سازی کے ساتھ نہیں ہے، مگر روحانی رشتہ ان ساری تنظیموں سے بالاتر اور مضبوط و مستحکم ہے اور الحمد للہ کامیاب و بامراد ہیں، تدریس، تصنیف، تربیت، باطن، تعلیم، مسائل افتاء، املاء کے تمام علمی سلسلے ان سے خاموش طریق پر انجام پا رہے ہیں اور عالم غیب کے دفاتر میں منضبط ہیں، جیسا کہ عالم غیب کے ہی اشاروں سے ان کی اور ان کے مرکز کی ابتداء ہوئی ہے۔

عادتاً کوئی بھی درسگاہ یا تربیت گاہ ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کے پروردہ سب کے سب ایک درجے کے ہوں، جب کہ قرآن حکیم نے عمومی طور پر یہ اشارہ بھی فرمایا ہے، (والذین اوتوا العلم درجٰت (جنھیں علم سے سرفراز کیا گیا ہے، ان کے درجات اور مراتب متفاوت) ہیں۔ اس لیے اس سلسلے کے افراد بھی مختلف المراتب ہیں اور ان کی طبعی خصوصیات اور ذوق الوان بھی الگ الگ ہیں، لیکن رشتہ مشترک سب کا ایک اور نصب العین واحد ہے، اس سو سال میں ان کی خدمات حق تعالیٰ کے یہاں منضبط ہیں۔ اس لیے بعض سادہ لوح اور بدخود غلط لوگوں کی زبانوں پر آجاتا ہے، کہ اس طبقے کی کچھ خدمات نہیں، خدمت اگر کچھ ہے تو شناہم نے اپنا ان طبقہ نے، لیکن ان کی خدمات کا انکار نہ کرتے ہوئے یہ ضرور عرض کیا جائیگا کہ فضلاء دارالعلوم کی خدمات میں شور اور نمائش نہیں ہے اور یہی انھیں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لیے اگر شور اور نمائش یا تشہیر ہی کسی خدمت کا معیار ہے تو یہ مقولے صحیح باور کئے جا سکتے ہیں کہ ان کی کچھ خدمات نہیں لیکن اگر کسی خدمت کی واقعیت کا معیار خدمت ہے، جس میں تشہیر اور شور کرنے کا دخل نہ ہو تو قلوب پہچانتے ہیں کہ اس سو سالہ جماعت کی کیا خدمات ہیں! اب اگر کوئی ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرے، تو انھوں نے یہ خدمات کسی کے امید اعتراف پر کی کب ہیں کہ وہ اس سے دلگیر ہوں جب کہ ان کا نصب العین ہی یہ رہا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال" کوئی نہیں مانتا تو وہ اپنی آخرت کے تصور اور رضائے خداوندی کو سامنے رکھ کر اس سے قطعاً بے پرواہ ہیں اور انھیں بے پرواہ ہی رہنا چاہیئے کہ کوئی ان کی خدمت کو نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس سے ان کی خدمت پر کوئی داغ دھبہ آسکتا ہے، نہ خدمت گزاروں کے دل میں کوئی ادنیٰ تمیل

زبادشاہ وگدا فارغم بحمد اللہ
گدائے خاک در دوست بادشاہ من است

اس قریبی فرصت میں یہی چند سطریں بغتۃً ذہن میں آئیں جو "الرشید" کے لیے بطور انگشت دم آلود شہیدوں میں شامل ہونے کے لیے سپرد قلم کر دی گئیں۔ خدا کرے کہ قابل قبول ہوں۔

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۳ ۵.. ۱۳۹۵ھ

> ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
> ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
>
> ——— خواجہ حافظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ماہنامہ الرشید لاہور کی طرف سے یہ روح افزا خوشخبری ملی۔ کہ یہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند نمبر شائع کر رہا ہے۔ اس کے مدیر محترم مولانا عبدالرشید ارشد نے اس ناکارہ سے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس فرمائش نے میرے قلب و دماغ میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ دارالعلوم کی مبارک فضاؤں میں بیتے ہوئے عمر کے ۵۲ سال کا پورا نقشہ گویا نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس میں کیا کیا دیکھا اور سنا۔ کیسے کیسے بزرگانِ دین اولیاء اللہ کی زیارت و صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک طویل داستان ہے جو در دفتر نمی گنجد کی مصداق ہے۔ اور اسّی سال کی عمر۔ قلب و دماغ کے سب قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ نگاہ میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ لکھنے کی قدرت، نہ لکھوانے کا سلیقہ۔ بس اپنا ہی ایک شعر یاد آیا۔ جو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں کہا تھا۔

دل نعت رسول عربی کہنے کو ہے بے چین　　　عالم ہے تحیر کا، زباں ہے، نہ قلم ہے

دارالعلوم دیوبند بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و سنن مقدسہ کی ایک مبارک یادگار ہے۔ اس سقوط قویٰ کے وقت میں اس کے متعلق بھی یہی عالم تحیر سامنے آگیا تو کیا بعید ہے۔ قلم اٹھایا کہ عذر لکھ دوں۔ مگر میرا اس محرومی پر دل راضی نہ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے نام سے کوئی نمبر شائع ہو، اور اس ناکارہ کا اس میں کچھ بھی حصہ نہ ہو۔ مسودات ٹٹولے، تو ایک پرانا لکھا ہوا مضمون دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہاتھ آگیا۔ اس پر نظر ثانی اور ترمیم کر کے ارسال کر رہا ہوں۔

بندہ محمد شفیع
۱۲ شعبان ۱۳۹۵ھ

دارالعلوم دیوبند اور
اُس کا مزاج و مذاق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ:

دارالعلوم دیوبند برصغیر کی وہ عظیم علمی درسگاہ ہے، جس نے گزشتہ صدی میں عالم اسلام کی مایۂ ناز شخصیتیں پیدا کیں اور ملت کی فکری اور علمی رہنمائی کر کے مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب کئے۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ وہ کیوں قائم ہوا؟ اور اس نے کیا خدمات انجام دیں؟ ان سوالات کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کے حالات پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے کیونکہ یہی حالات دارالعلوم دیوبند کے قیام کے سبب بنے، اور اس درسگاہ کو اسی وقت ٹھیک ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس کے قیام کا پورا پس منظر سامنے ہو۔

۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کو مغربی تسلط سے نکالنے کی آخری کوشش تھی اور اس تحریک نے انگریز حکمرانوں پر کم از کم یہ بات ضرور واضح کر دی تھی کہ مسلمان ایسی قوم ہے جو کسی بھی حالت میں غیروں کی غلامی پر قانع نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس مرحلے پر انگریز نے اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی اور وہی انگریز جس نے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا کر اور سینکڑوں کو تختۂ دار پر کھینچ کر ہندوستان میں اپنے پنجے جمائے تھے، اب ہندوستانی عوام کا خیرخواہ بن کر اُن کے سامنے آیا۔ مقصد یہ تھا کہ جو قوم زور اور زبردستی سے قابو میں نہیں آسکی، اس کے ذہن کو رفتہ رفتہ ایسا بدلا جائے کہ وہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھے، وہ اپنی دینی روایات، تہذیبی اقدار اور تابناک ماضی سے دھیرے دھیرے بے خبری ہوتی چلی جائے یہاں تک کہ ایک عرصے کے بعد اُسے یہ یاد ہی نہ رہے۔

وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ مؤثر حربہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نظامِ تعلیم میں کچھ ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ جن کے ذریعے ان کے ذہنوں پر مغرب کی ہر جہتی بالادستی کا سکہ بٹھایا جا سکے اور وہ اِس بالادستی سے مرعوب ہو کر اپنے ذہن سے سوچنے کے قابل ہی نہ رہ جائیں چنانچہ لارڈ میکالے نے ہندوستانی باشندوں کے لیے ایک نئے نظامِ تعلیم کی سفارش کی اور اسی غرض کے لیے ایک طویل یادداشت مرتب کی جس میں اسلامی اور مشرقی علوم کا پوری ڈھٹائی کے ساتھ مذاق اُڑایا، مسلمان علماء پر بے بنیاد الزامات لگاتے اور آخر میں صاف صاف لکھا کہ:

"ہمیں اِس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے، جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے، جن پر ہم اس وقت حکمران ہیں۔۔ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔۔"

مسلمانوں کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے انگریز کا غلام بنا دینے کی یہ سازش درحقیقت ہندوستان پر اپنے اس اقتدار کو سنبھالا دینے کے لیے تیار کی گئی تھی، جو آزادی کی مختلف تحریکوں کی بنا پر ہر وقت ڈانوا ڈول رہتا تھا۔ اور جس کی حفاظت کے لیے توپ و تفنگ کی طاقتیں ناکام ہو چکی تھیں، اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک چھوٹے سے شعر میں اس سنگین انگریز سازش کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

توپ کھسکی، پروفیسر آئے
جب بسولہ ہٹا تو رندا ہے

لیکن مسلمانوں میں سے اہلِ بصیرت علماء اس خطرناک سازش کے دور رس اثرات سے غافل نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر اس مرحلے پر مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا گیا، تو کچھ عرصے کے بعد یہ قوم ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اپنا وجود ہی کھو بیٹھے گی اور چند نسلوں کے بعد ان میں شاید یہ بات جاننے والا بھی کوئی نہ رہے کہ اسلام کس چیز کا نام ہے؟ اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟

اب تک اُس دور کے اہلِ بصیرت علماء اس کوشش میں مصروف تھے کہ ہندوستان سے انگریز کے سیاسی اقتدار کو ختم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے آزادی کی مختلف تحریکوں کے ذریعے وہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے، لیکن جب انگریز نے توپ و تفنگ کا راستہ چھوڑ کر خاموش مگر سنگین سازش شروع کی، تو یہی علماء جنھوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ انھوں نے بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کر کے انگریز کے براہِ راست مقابلے کو چھوڑ دیا، نئے تعلیمی نظام کی

ہلاکت آفرینیوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے خود ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جن میں وہ اسلام کو اپنی صحیح شکل و صورت کے ساتھ محفوظ رکھ سکیں۔

چنانچہ ان حضرات نے اپنی ساری توانائیاں اسی کام میں صرف کر دیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت حاجی سید عابد حسین صاحبؒ یہ وہ حضرات تھے، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں نمایاں حصہ لیا تھا اور یوپی کے ایک چھوٹے سے خطے میں باقاعدہ اسلامی حکومت بھی قائم کر لی تھی اور اسی کے صلے میں انہیں عرصہ دراز تک حکومت کا سخت معتوب بھی رہنا پڑا، لیکن جب تعلیمی نظام کا یہ منصوبہ سامنے آیا تو ان حضرات نے دیوبند کے مقام پر ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی اور اسی درسگاہ کا نام آج "دارالعلوم دیوبند" ہے۔

یہ وہ وقت تھا، جبکہ ہندوستان میں کسی دینی درسگاہ کو قائم کرنا نت نئے مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا، دہلی میں جہاں سلطان محمد تغلق کے دور میں ایک ہزار مدارس قائم تھے، انگریزی تسلط کے بعد ایک بھی مدرسہ باقی نہ رہا تھا، علماء بھی جہاد میں حصہ لینے کے جرم میں یا پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے۔ یا انہیں کالا پانی بھیج دیا گیا تھا، باقی ماندہ حضرات منتشر اور اپنے اپنے حالات میں گرفتار تھے۔ اسی لیے ان حضرات نے اس درسگاہ کے لیے کسی شہر کے بجائے قصبہ دیوبند کو پسند کیا اور کچھ طلباء کو جمع کر کے اس سلسلۂ خیر کا آغاز کر دیا۔

اس درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام اور اسلامی علوم کو مٹانے کی جو کوششیں لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے ذریعہ کی جا رہی ہیں، انہیں ناکام بنا کر اسلامی علوم کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کی جائے اور ایسے جاں نثار علماء کی ایک کھیپ تیار کر دی جائے، جو سخت سے سخت حالات میں دین کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں، بلکہ اسے دوسروں تک پھیلا اور پہنچا سکیں، اور اس طرح عام مسلمان الحاد اور بے دینی کے ان فتنوں سے باخبر ہو سکیں جو مغربی طرز فکر اپنے ساتھ لائے گا، تاکہ جب کبھی مسلمانوں کو مغرب کے سیاسی اقتدار سے آزادی نصیب ہو تو انہیں اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے لیے اسلام کی ہدایات جوں کی توں محفوظ مل جائیں اور وہ ان کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔

چنانچہ مورخہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو نہایت سادگی کے ساتھ اس عظیم دینی درسگاہ کا آغاز کیا گیا۔ اس درسگاہ کے بانیوں کا مقصد چونکہ دین کی پرخلوص خدمت تھی۔ اس لیے اس کے قیام کے لیے نہ اخبار و اشتہار کا اہتمام ہوا۔ نہ اس مقصد کے لیے کوئی باضابطہ بورڈ قائم کیا گیا اور نہ ہی شہرت اور نام و نمود کے دوسرے طریقے اختیار کیے گئے۔ بس اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے دیوبند کے چھوٹے سے قصبے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے تھے۔ ایک انار کے درخت کے نیچے آب حیات کا یہ چشمہ جاری کر دیا۔ اس عظیم الشان تعلیمی منصوبے کو عملاً شروع کرنے والے، صرف دو افراد تھے۔ ایک استاد، ایک شاگرد۔ دونوں کا نام محمود تھا، استاد حضرت ملا محمود دیوبندی تھے جنہیں مدرس کی حیثیت میں میرٹھ سے بلایا گیا تھا اور شاگرد دیوبند کے ایک نوجوان محمود الحسن تھے، جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے معروف ہوئے اور جنہوں نے اپنی ریشمی رومال کی تحریک کے ذریعے انگریزی حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا۔

دارالعلوم دیوبند کی
خدمات اور خصوصیات

دارالعلوم کی ابتداء ایک انار کے درخت کے سائے میں ہوئی تھی کسے معلوم تھا کہ یہ دو افراد جو اتنی مسکنت اور گمنامی کے ساتھ یہاں ایک چشمۂ فیض جاری کر رہے ہیں بالآخر برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیں

گے۔ لیکن دُنیا نے دیکھ لیا کہ اسی سادہ سی درس گاہ سے علم و فضل کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جنھوں نے ایک دنیا کو جگمگا کر رکھ دیا۔ درسگاہیں دنیا میں بہت سی قائم ہوتی ہیں۔ دینی درس گاہوں کا بھی کسی دور میں فقدان نہیں ہوا، لیکن اللہ نے دارالعلوم دیوبند کو جو فضیلت اور جو امتیاز بخشا، بہت کم علمی اداروں کے حصے میں آتا ہے۔ یہاں مجھے مختصراً اسی امتیاز کو واضح کرنا ہے۔

دارالعلوم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وُہ محض ایک درسگاہ کا نہیں، ایک خاص نظریے اور ایک خاص طرزِ عمل کا نام ہے، جو کتاب و سُنّت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس درسگاہ کی بنیاد ہی چونکہ اس لیے رکھی گئی تھی کہ اس کے ذریعے اسلام اور اسلامی علوم کو اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے۔ اس لیے اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ دین صرف کتابی حروف و نقوش کا نام نہیں ہے اور نہ دین محض کتابوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اللہ نے ہمیشہ کتاب کے ساتھ رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ وُہ اپنے عمل سے کتاب کی تفسیر کرے۔ چنانچہ ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ دُنیا میں رسول بھیجے گئے مگر کتاب نہیں آئی، لیکن ایسی مثال ایک بھی نہیں ہے کہ صرف کتاب بھیجی گئی ہو اور اس کے ساتھ رسول کوئی نہ آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت بتلاتی ہے کہ دین کو سمجھنے، سمجھانے اور پھیلانے پہنچانے کا راستہ صرف کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وُہ اشخاص بھی ہیں جو کتاب کا عملی پیکر بن کر اس کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں، لہٰذا دین کو سمجھنے کے لیے کتاب اللہ اور رجال اللہ، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک کو دُوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا چنانچہ قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و تشریح کی روشنی میں اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ، تابعین اور دُوسرے بزرگانِ دین کی روشنی میں ہی ٹھیک ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر دین کی تعبیر و تشریح کی ہر کوشش گمراہی کی طرف جا سکتی ہے۔

مراتب کا فرق ملحوظ رہے، جو مقام اللہ تعالیٰ کا ہے، وُہ کسی نبی کو حاصل نہیں ہو سکتا، جو مرتبہ ایک نبی کا ہے، وُہ کسی صحابی کا نہیں ہو سکتا اور جو درجہ ایک صحابی کو حاصل ہے، کوئی بڑے سے بڑا ولی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بس فرقِ مراتب کے ساتھ دین کے ان سرچشموں میں سے ہر ایک کے حقوق و حدود کی رعایت دارالعلوم دیوبند کا وُہ خصوصی مزاج ہے جس نے اسے دُوسرے اداروں سے امتیاز عطا کیا ہے اور جس کی بنا پر اس کا مسلک مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان ایک ایسی راہِ اعتدال کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی ہے اور افراط و تفریط سے بچتی ہوئی انسان کو رضائے الٰہی تک پہنچاتی ہے

اور جب دارالعلوم کا اساسی نظریہ یہ ٹھہرا کہ دین کتاب اللہ اور رجال اللہ کے مجموعے کا نام ہے، تو یہیں سے اس کا ایک دُوسرا اہم امتیاز ظاہر ہوتا ہے اور وُہ یہ کہ دارالعلوم اپنے عہدِ شباب میں محض ایک علمی درسگاہ نہیں تھی جس میں طلباء کو صرف کتابوں کے حرُوف و نقوش اور صرف علم کا ظاہری خول دیا جاتا ہو۔ بلکہ ساتھ ساتھ ایک عملی تربیت گاہ بھی تھی، جہاں علم کے ظاہری بدن میں عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ کی رُوح بھری جاتی تھی، یہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والے صرف ظاہری علوم ہی سے آراستہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ وُہ عملی اعتبار سے بھی سچے اور پکے مسلمان ہوتے تھے۔ جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا۔ جن کی ہر نقل و حرکت اسلام کی نمائندگی کرتی تھی

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دارالعلوم کے قرنِ اوّل کے طلباء میں سے تھے وُہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وُہ زمانہ دیکھا ہے، جب اس کے ایک چپراسی سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر ہر شخص صاحبِ نسبت ولی کامل تھا۔ دن کے وقت یہاں علوم و فنون کے چرچے ہوتے اور رات کے وقت اس کا گوشہ گوشہ اللہ کے ذکر اور تلاوتِ قرآن سے گونجتا تھا چنانچہ اس دور میں جو شخصیتیں دارالعلوم دیوبند سے تیار ہوئیں۔ انھوں نے عبادات، معاملات، ...اق معاشرت

سیاست اور اجتماعی امور میں ایسے ایسے تابناک کردار پیش کئے ہیں، کہ آج اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ان میں سے ہر شخص اسلام کی مجسم تبلیغ تھا۔ وُہ جہاں بیٹھ گیا، ایک جہان کو سچا مسلمان بنا کر اُٹھا، علم اگر رُوحِ عمل سے خالی ہو تو عمُوماً انسان میں خود پسندی اور پندار پیدا کر دیتا ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کا علم جو یکسر رُوکھا پھیکا علم نہ تھا، بلکہ اس میں اخلاق و عمل اور عشق و محبت کا سوز و ساز بھی شامل تھا۔ اس لیے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ رہی کہ اس کا پُورا ماحول، تواضع اور سادگی اور بے تکلفی کا ماحول تھا، وہاں ہر شخص علم و عمل کا آفتاب ہونے کے باوجود عبدیت اور تواضع کا پیکر تھا۔ اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء اور خودداری کے حامل تھے۔ اور دُوسری طرف فروتنی خاکساری اور ایثار و زہد کے جذبات سے معمور۔

دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہر علم و فن میں یکتائے رُوزگار تھے۔ ان کی تصانیف آج بھی ان کے علوم کی شاہد ہیں۔ لیکن ان کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس کبھی کپڑوں کے دُو سے زائد جوڑے جمع نہیں ہوتے۔ دیکھنے والا پتہ بھی نہ لگا سکتا تھا کہ یہ وُہی مولانا محمد قاسم ہیں جنھوں نے مسلمانوں ہی سے نہیں، غیر مسلموں اور منکروں سے بھی اپنے علم و عمل و فضل کا لوہا منوایا ہے۔ دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہیں، جو بانیانِ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہم سبق اور ہر کام میں رفیق، حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ، اور استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی رحمہ کے صاحبزادے تھے۔ مزاج شاہانہ، مگر سادگی کا عالم یہ تھا کہ بعض اوقات کمر بند نہ ہوا تو رسی ہی سے کام لے لیا۔ تمام علوم و فنون اور دُوسرے صنفوں میں بھی اللہ نے انکو کمال بخشا تھا، صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ دارالعلوم کے قرنِ اوّل کے اساتذہ میں سے تھے اور فلسفہ، ریاضی، ہئیت اور دیگر عقلی علوم میں اس وقت اُن کا ثانی نہیں تھا، انھوں نے ساری عمر دیوبند کے قصبے میں گزاری اور اس حالت میں دُنیا سے تشریف لے گئے کہ دیوبند میں ان کی ذاتی جائداد تو کُجا، رہنے کا ... مکان بھی اپنا نہیں تھا۔ حضرت ملا محمُود صاحب جن سے دارالعلوم کی ابتدا ہُوئی، دیوبند کے زمیندار بھی تھے، مگر کوئی وقت علمی خدمت سے خالی نہیں، میرے والد محترم نے ایک بڑی کتاب اُن سے صرف اُس وقت میں پڑھی ہے، جب کہ وُہ گھر سے گوشت ترکاری لینے کے لیے بازار جاتے تھے، تو شاگرد ساتھ ہوتے۔ یہ سبق اسی طرح پُورا ہوا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ جو مدرسے کے پہلے طالب علم تھے اور بعد میں علم و عمل اور سیاست دونوں میدانوں میں عالمگیر شہرت حاصل کی، جب وُہ دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے تو انھیں صرف "بڑے مولوی صاحب" کہا جاتا تھا تعظیمی القاب کے تکلفات بعد میں پیدا ہوئے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب دارالعلوم کے پہلے مفتی اعظم تھے، لیکن مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وُہ محلے کی بیواؤں، یتیموں اور بے کس افراد کا سودا سلف خُود اپنے ہاتھوں سے لا کر انھیں پہنچایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ (جو حضرت میاں صاحب کے نام سے معروف ہیں) حدیث کے اونچے درجے کے اساتذہ میں سے تھے لیکن آخر عمر تک ایک کچے مکان میں مقیم رہے اور صرف اس لیے پختہ مکان نہیں بنایا کہ محلہ غریبوں کا تھا۔ اور جب تک سب کے مکان پختہ نہ بن جائیں۔ اپنا مکان پختہ کرانے کو دل نہیں مانتا تھا۔

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جنھیں آج دُنیا اس صدی کے عظیم رہنما کی حیثیت سے جانتی ہے اور جنھوں نے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں، ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لیکن دارالعلوم میں طالب علمی کی زندگی اس طرح بسر کی کہ مدرسے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں رہتے اور طالب علمی ہی کے زمانے میں اوقات کے نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ ان کی مصرُوفیات کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جا سکتا تھا۔ نہ امتحان کا

ہو یا عام تعلیم کا، ہمیشہ عشاء کے بعد سو جاتے اور آخر شب میں تہجد کے لیے بیدار ہوتے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

اس علمی ادارے کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے مسلک اعتدال کی طرف دعوت اور دوسروں پر تنقید کے سلسلے میں پیغمبرانہ اسلوب تبلیغ اختیار کیا جس میں مخالف کو زیر کرنے کے بجائے اس کی دینی خیر خواہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے حق کے معاملے میں مداہنت کو کبھی گوارا نہ کیا اور جس بات کو حق سمجھا، اس کا برملا اظہار بھی کیا لیکن اس اظہار میں حکمت اور نرمی کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد چونکہ دین کی حفاظت تھا اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہو سکتا تھا، جب تک ایک جماعت دوسرے ہر کام کو چھوڑ کر صرف اسی کی نہ ہو رہے۔ اس لیے انھوں نے دنیوی مناصب اور عہدوں سے قطع نظر کر کے اور خود پیٹ پر پتھر باندھ کر، اس خدمت کو انجام دیا۔ لیکن عام مسلمانوں کی مادی ترقی کی فکر بھی انھیں ہمیشہ دامن گیر رہی۔ انھوں نے ہر اُس پُرخلوص تحریک کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جو دین کو محفوظ رکھتے ہوئے، مسلمانوں کی اجتماعی فلاح اور مادی ترقی کا مقصد لے کر آگے بڑھی۔ ہاں جس جگہ مادی ترقی کے شوق میں انھیں دین پامال ہوتا نظر آیا، وہاں وہ دین کی حفاظت کے لیے سد سکندری بن گئے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دو سو سال تک انگریز اور ہندو کی دوہری چکی میں پسنے کے باوجود اللہ کے فضل و کرم سے آج دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہے۔ برصغیر میں دین کو سمجھنے والے اس کی دعوت دینے والے اور اس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھنے والے موجود ہیں اور عام مسلمان بھی مغربی افکار کے بے پناہ سیلاب کے باوجود نظری طور پر آج بھی مسلمان ہیں اور اسلام پر فخر کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے جتنی عظیم شخصیتیں پیدا کیں، اتنی شخصیتیں کم ہی کسی علمی درسگاہ کے حصے میں آئی ہیں۔ شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ جنھوں نے تقریباً چالیس سال دارالعلوم میں درس حدیث وغیرہ کی خدمات انجام دیں اس کے ساتھ ہی اصلاح و تربیت کا بڑا سلسلہ قائم فرمایا، ہزاروں علماء، صلحاء اور مشائخ طریقت کی صورت میں ہندوستان و بیرون ہندوستان میں پھیلا۔

آخر عمر میں اہل یورپ کے متعدد محاذ کے ذریعے ترکی اسلامی خلافت کے زوال کے وقت جذبۂ جہاد غالب آیا تو ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کر کے اسلامی سلطنت بنانے کے لیے وہ بے مثال کارنامے انجام دیے کہ انگریز بھی حیرت میں رہ گئے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ جو دارالعلوم کے فضلاء میں ایک بے نظیر شخصیت ہیں، دین اور علم دین کی خدمات کے جتنے شعبے ہیں، سب میں آپ کے آثر بے شمار ہیں، ایک ہزار سے زائد آپ کی وہ مقبول تصانیف ہیں، جن سے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا، آپ کے سلسلۂ ارشاد سے بھی لاکھوں مسلمانوں کی زندگی بنی۔ اور سینکڑوں مشائخ طریقت پیدا ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جو حضرت شیخ الہندؒ کے اخص تلامذہ میں سے ہیں جو دارالعلوم میں تعلیم سے فراغت پا کر تزکیۂ نفس کے لیے چند سال حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہے۔ بالآخر ان کے خلیفۂ مجاز ہوئے اور اٹھارہ سال تک مدینہ منورہ مسجد نبویؐ میں علوم قرآن و حدیث کا درس دیا۔ پھر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ جہاد آزادی میں شرکت فرما کر چار سال مالٹا جیل میں آپ کے ساتھ رہے۔ پھر رہائی کے بعد بھی اسی مشن کی تکمیل میں جد و جہد کرتے رہے اور آخر میں ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۷۷ھ ۳۲ سال دارالعلوم کے صدر مدرس اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دیتے ہوئے دارالعلوم ہی میں وفات پائی۔

محدث عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام علوم و فنون میں ایک بے نظیر جامع عالم بنایا تھا خصوصاً حدیث میں تو اپنے زمانے کے زہری اور حافظ ابن حجر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا درس

حدیث ایک مثالی درس تھا۔ اپنے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی وفات کے بعد دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس گیارہ سال درس حدیث کی خدمات انجام دیں، جس میں ایک ہزار سے زائد طلبہ نے آپ سے درس حدیث لیا اور سینکڑوں علماء و محدثین پیدا ہوئے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح آپ بھی حضرت شیخ الہند کے اخص تلامذہ میں سے ہیں صحیح مسلم شریف کی شرح فتح الملہم اور قرآن مجید کی مختصر جامع تفسیر جو مقبول عالم ہوئی اور افغانستان میں اس کا فارسی ترجمہ کرکے شائع کیا گیا، آپ کی ذو شہرہ آفاق تصانیف ہیں جو آپ کے علمی کمال کی شاہد ہیں، عرصہ دراز تک دارالعلوم میں درس حدیث کی خدمات انجام دیں اور آخر میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر دارالعلوم سے مستعفی ہوکر تحریک بنائے پاکستان کے سلسلے میں مؤثر اور مفید خدمات انجام دیں۔ جن کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت "پاکستان" وجود میں آئی پھر تا بستر مرگ اسی مملکت میں اسلامی دستور و نظام لانے کی مساعی میں پوری کوشش کی

اس وقت بطور مثال کے چند اہم شخصیتوں کے نام سامنے آگئے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ؎ این خانہ تمام آفتاب است

دارالعلوم سے پیدا ہونے والی بے مثال شخصیتیں جن سے دنیا میں علم وعرفان کے چشمے جاری ہوئے۔ اس کثرت سے ہیں کہ شمار میں لانا مشکل ہے دارالعلوم دیوبند درحقیقت ان ہی شخصیتوں اور اسی طرز فکر کا نام ہے۔ جس کی مختصر تشریح اوپر پیش کی گئی ہے۔ احقر نے اپنی آنکھ دارالعلوم ہی کے پُر نور صحن میں کھولی ہے اور بچپن ہی سے ان بزرگوں کے نورانی چہروں کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور گویا ان ہی بزرگوں کی آغوش شفقت میں پل کر جوان ہوا اور طالب علمی سے لے کر مختلف درجات کی درس تدریس پھر خدمت فتوے میں عمر کے ۵۲ سال گزارے ہیں۔ ۵۲ سال کی عمر میں پاکستان کی طرف ہجرت نصیب ہوئی۔

دارالعلوم کی نورانی فضاؤں میں بیتے ہوئے ۵۲ سال کی کہانی کوئی مختصر بھی کرے تو کہاں تک کرے۔ خصوصاً اب جب کہ عمر کے اسی سال پورے ہونے والے ہیں، قویٰ کا خاتمہ ہو چکا ہے، لکھنے پڑھنے سے تقریباً معذور ہو چکا ہوں اب تو بس اس سلسلے میں اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ماہنامہ "الرشید" کے خاص نمبر "دارالعلوم دیوبند نمبر" کے لیے راقم الحروف بنوری سے عزیزم عبدالرشید ارشد نے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی، ضعیف اور عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے جدید مضمون لکھنے سے قاصر رہا .... آج سے تقریباً ۴۰ سال قبل قاہرہ میں ایک مضمون عربی میں ایک ہفت روزہ رسالہ "الاسلام" میں ایک مضمون وہاں کے فضلاء کے مطالعے کے لیے لکھا تھا کہ وہ دارالعلوم کی خدمات سے واقف ہوسکیں اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۴۰ سال پہلے دارالعلوم کا جو کارنامہ تھا، بعد میں دارالعلوم دیوبند نے بہت سے جدید کارنامے اور آثار مبارکہ اضافہ کیے ہیں، ان کا ذکر اس میں نہ ملے گا، یہ بات پیش نظر رہے ... محمد یوسف بنوری عفی عنہ

دارالعلوم دیوبند ○ ایک جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زمانے میں اللہ تعالیٰ کے کچھ نفحات ہیں، وہ ایک قوم کو خاص ترجیحی مآثر عطا کرتا ہے اور دوسری قوم کو دیگر خصائص سے مشرف کرتا ہے، کبھی ہر ایک کو یہ خصائص عطا کرتا ہے اور کبھی ان سے روک لیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "اور ان ایام کو ہم بدلتے رہتے ہیں لوگوں میں" نیز ارشاد ہے: "یہ اللہ کی سنت ہے جو گزر چکی ہے اس کے بندوں میں" قرون اولیٰ کی بات رہنے دیجیے، جن میں علوم قرآن و سنت اور حدیث کے چشمے ابل رہے تھے۔ قرون متوسطہ، چوتھی صدی سے آٹھویں صدی تک ہی کو لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں خطۂ عرب، حجاز، عراق، شام، اندلس، مصر اور خراسان و ماوراء النہر کے علاقے کتاب و سنت اور دیگر علوم دینیہ سے بکثرت بہرہ ور ہیں اور ان میں بلند پایہ حفاظ حدیث، ناقدین رجال، مایہ ناز ائمہ فقہ اور عالمین دین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آئے گا، جن کی کثرت سے عقل حیران ہے۔

حافظ خطابی الشافعی، ابو عمر قرطبی مالکی، حافظ عزالدین ابن عبدالسلام الشافعی، حافظ ابن دقیق العید، حافظ فضل اللہ تورپشتی حنفی، حافظ علاء الدین الماردینی الحنفی، حافظ علاء الدین مغلطائی، حافظ ابن حجر، اور اس پائے کے دیگر جہابذۂ امت، اس دور میں آسمان علم و فضل کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے اور ایک عالم کو اپنی روشنی سے منور کیا۔

لیکن اس دور میں سرزمین ہند بنجر نظر آتی ہے اور وہ مذکورہ بالا علاقوں کے عبقری افراد شانہ بشانہ چلنے سے قاصر ہے۔ بلاشبہ اس دور میں بھی کچھ سربرآوردہ افراد پیدا ہوئے، اور باہر سے یہاں آئے، لیکن ان کے آثار و نشانات انمٹ ثابت نہ ہوئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے خطۂ ہند پر احسان فرمایا، اور عبقری امام نابغۃ الایام، الامام الحجۃ الشاہ ولی اللہ فاروقی دہلوی کو پیدا کیا، جب کہ ہندوستان کے افق پر غالی شیعوں اور رافضیوں کے سیاہ بادل

مبتلا رہے تھے۔ قریباً سارے ہندوستان پر اُن کا تسلط تھا، بدعات رائج ہو چکی تھیں اور سنت کی رسی بوسیدہ ہو رہی تھی۔

نوامیس فطرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاری ہے کہ ایک جماعت تاقیامت حق پر قائم رہے گی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر آئندہ نسل میں ایسے رجال کار کھڑا کرتا رہے گا، جو دین سے غالیوں کی تحریف اور باطل پرستوں کے غلط ادعا کی اصلاح کرتے رہیں گے، چنانچہ اسی سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس امام کے ذریعے ملت حنیفیہ کے ستونوں کو مضبوط کیا۔ قرآن و سنت کے علم صحیح کی بنیاد ڈالی اور قوم کی بدحالی کا مداوا کیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد و احفاد کے ذریعے ولی اللّٰہی تحریک پروان چڑھی اور اس کے حسن و رونق کو چار چاند لگے۔

پس ہندوستان میں یہ پہلی دینی و علمی تحریک تھی، جس کی بنیادیں نہایت راسخ اور جس کی عمارت بلند و بالا تھی۔ امام ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جدید علمی تحریک اور شیعوں کی دستبرد سے اہل سنت والجماعت کے مسلک کی حمایت و حفاظت کا بار ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اٹھایا اور ان کی تحریک دینی، اور مروجہ بدعات کی اصلاح و تردید کو سنبھالنے کا فریضہ شاہ اسمٰعیل شہید بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ نے انجام دیا۔ یوں ان دو شخصوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کی علمی و اصلاحی تحریک کی تکمیل کرائی۔

بعد ازاں جب ویرانۂ ہند پر حکومت کے منحوس سائے پھیلنے لگے اور اس کے جبر و استبداد اور تسلط کو استحکام نصیب ہوا، تو ولی اللّٰہی تحریک کے انوار مٹنے لگے اور اس بادِ سموم سے اس کی تر و تازہ شاخیں پژمردہ ہونے لگیں۔ ادھر برٹش گورنمنٹ کے تکبر و خود سری میں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان ۱۸۵۷ء کا معرکہ ہوا، جس میں بدقسمتی سے حکومت کو غلبہ اور مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس سے حکومت برطانیہ کی تیزی و تندی میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کا تسلط اور بھی مستحکم ہو گیا۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی انتقامی سازشوں سے دین کی بنیادیں ہلنے لگیں اور شعائر اسلام ایک ایک کر کے مٹنے لگے۔ ان بھیانک تاریکیوں میں ایک گمنام سے خطے میں دارالسلطنت دہلی سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع ہے! روشنی کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ یہ مبارک خطہ قصبہ دیوبند ہے چنانچہ عارف باللہ الشیخ مولانا محمد قاسم نانوتوی دیوبندی نے ۱۲۱۲ھ میں ایک دینی و علمی مرکز کی بنیاد رکھی، جو آج دارالعلوم اور جامعہ قاسمیہ کے نام سے شہرۂ آفاق ہے۔ یہ روشنی بتدریج پھیلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس سے دور و ساز کے تاریک علاقے بھی منور ہو گئے اور خطۂ ہند سے جہل کے پردے ہٹ گئے اور پھر اس کا فیضان خطۂ ہند سے نکل کر جاوا، سماٹرا، چین، جنوبی افریقہ افغانستان اور ایران تک پہنچا اور ان شاء اللہ اس کے نور و ضیا اور حسن و بہار میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

جو حقائق میری آنکھوں کے سامنے ہیں وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں علی رؤس الاشہاد یہ دعوے کروں کہ اگر سرزمین دیوبند سے علم و معرفت کا یہ چشمہ صافیہ نہ بہہ نکلا ہوتا تو تیرھویں صدی کے اواخر میں ہندوستان سے قرآن و سنت کے علوم کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

میں یہاں اس عظیم الشان دانش کدہ کی ابتدائے تاسیس سے لے کر اسلامی صدی کے نصف تک کے، سالہ دور کے آثار و برکات کی جانب چند اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

دیوبند اور افراد سازی

جن حضرات نے اس دارالعلوم میں داخل ہو کر اس کے درجات عالیہ میں درس لیا، مگر اس کے پورے نصاب کی تعلیم نہیں پائی۔ ان کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے اور جو حضرات اس کے مقررہ نصاب کی تکمیل کے بعد دارالعلوم کی آخری سند سے مشرف ہوئے، ان کا شمار پانچ ہزار تک پہنچتا ہے اور ان میں سے وہ نابغہ شخصیتیں، جنھوں نے علم و حکمت کے دروازے کھولے

اور ہندوستان میں مختلف جہتوں سے فیض کے چشمے جاری کئے، ان کی تعداد ایک ہزار نفوس قدسیہ سے کم نہیں۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۵۷ھ تک دار العلوم سے فیضیاب ہونے والے طلبہ کا سالانہ داخلہ ڈیڑھ ہزار ہے اور ان میں ان بدن اضافہ ہو رہا ہے، یہ صرف وہ طلبہ ہیں، جو خاص دار العلوم میں اقامت پذیر ہیں۔ ان طلبہ کی تعداد اس کے علاوہ ہے، جو دار العلوم سے وابستہ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں اور مجموعی طور پر ان دینی مدارس سے فارغ ہونیوالے علمائے کرام کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے، جو میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

دیوبند اور تاسیسِ مدارس

جو حضرات اس شیریں اور فیاض چشمہ (دار العلوم دیوبند) سے سیراب ہو کر نکلے، انھوں نے اپنے اپنے علاقے میں بے شمار مدارسِ دینیہ کی بنا ہیں استوار کیں، اس وقت ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے۔ تاہم جو مدارس اس جامعہ (دار العلوم دیوبند) سے منسوب ہیں، ہندوستان میں ان کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہو گی۔

ان میں سے بعض مدارس وہ ہیں، جن کی بنیاد فضلائے دار العلوم نے غور رکھی، بعض ایسے ہیں جن کو فضلائے دار العلوم کے مبارک ہاتھ تدریس و اہتمام کی شکل میں چلا رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا دار العلوم سے امتحانی رابطہ ہے اور سالانہ امتحان کے پرچے دار العلوم سے ارسال کئے جاتے ہیں، مگر یہ مدارس کسی محکمۂ اوقاف کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔ نہ کوئی مخصوص جماعت ان کی کفیل ہے، تاکہ جامعہ ازہر سے متعلقہ مدارس کی طرح ان میں انتظامی وحدت ہوتی۔ بلکہ ہر مدرسہ اپنے امور و معاملات میں مستقل ہے بہرحال یہ جامعہ دار العلوم دیوبند ان تمام دینی مدارس کی اصل بنیاد دام الدائما ہے، جو سرزمین ہند کو منور کر رہے ہیں۔

دیوبند کی نابغہ اور سرآمدِ روزگار شخصیتیں

علماء دیوبند میں سب سے اوّل جن حضرات کو سیادت و قیادت کا شرف حاصل ہوا، وہ تین افراد تھے، جن کے سینوں میں پاک صاف دل اور ان کے دماغ میں بلند پایہ اسلامی افکار و علوم کا وسیع سمندر تھا۔

(۱) الشیخ الامام، عارف باللہ مولانا محمد قاسم (المتوفی ۱۲۹۷ھ)

(۲) الفقیہ المحدث العارف مولانا الشیخ رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ)

(۳) بحر بیکراں الشیخ مولانا محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ)

ان حضرات کے خصائص کی تفصیل کے لیے مستقل فرصت درکار ہے مختصر یہ کہ حضرات علوم کتاب وسنت اور علوم ظاہر و باطن کے جامع اور عارفین اور اصحاب قلوب کی وراثت کے امین تھے، انھوں نے پہاڑ سے زیادہ راسخ عزائم کے ساتھ، ورع و زہد، انکسار و تواضع، شہرت سے نفرت اور اتباع سنت ایسے بلند پایہ اخلاق و شمائل کو اس حد تک جمع کر لیا تھا کہ اخلاق عالیہ میں یہ حضرات اپنے دور میں ضرب المثل تھے، ان کی تعریف میں راقم الحروف کا یہ قصیدہ ہے۔

هممٌ لهم في الدهر درةُ تاجهم
ان کا عزم و ہمت زمانے میں ان کے تاج کا موتی ہے۔

كَلِمٌ لهم تشفي الصدى سلسال
ان کے کلمات سے خشک لب تشنہ سیراب ہوتا ہے

سمتٌ وصمتٌ والوقار وهيبة
خوش روئی، خاموشی، وقار، ہیبت

علمٌ غزيرٌ هامرٌ هطّال
بے پناہ برسنے اور بہنے والا علم

لهم التواضع والرزانة والتقى
ان کی تواضع، رزانت و متانت اور تقویٰ

فضلٌ لهم ضربت به الامثال
وطہارت کے فضائل ضرب المثل ہیں

وتلألأت انوارهم بوجوههم
ان کے انوار ان کے چہروں سے چمکتے ہیں

هدى النبي جمالهم وجلال
ان کا جلال و جمال طریقۂ نبوی کی تفسیر ہے

كرم وخلق عفة وديانة
کرم، اخلاق، عفت و دیانت میں ان کا قول و

هدى الصحابة حالهم ومقال
عمل صحابہ کے نقشِ قدم پر ہے۔

باهى جمالهم جمال شريعة
ان کے ذاتی جمال کا جمال شریعت سے آمیزہ ہوا

فبهى جمال وزاد كمال
تو ان کے جمال کو چار چاند لگ گئے اور کمال میں اضافہ ہوا

وبهى كمالهم كمال علومهم
اور بوقت مقابلہ کمالِ علوم کے ساتھ ان کا ذاتی کمال

عند التباهى فاستزاد جمال
غالب آیا اور ان کے حسن و جمال میں اضافہ کا موجب ہوا

دع وصف قوم انهرت آثارهم
اس قوم کی کیا تعریف کی جائے جن کے آثار تاباں و درخشاں ہیں

فالشمس البهر والمديح خيال
پس آفتاب خود ہی روشن ہے اور مدح و ثنا خیال محض ہے

والشمس طالعة زهت انوارها
اور آفتاب طلوع ہے۔ اس کے انوار خود چمکتے ہیں

والوصف يقصر والمجال مجال
وصف قاصر رہتا ہے اور گفتگو کی مجال وسیع ہے

ان حضرات کے بعد قیادت مندرجہ ذیل حضرات کے سپرد ہوئی:

(۱) مسند الوقت شیخ العصر الاستاذ الامام شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۳۳۹ھ۔

(۲) عارف باللہ الشیخ مولانا عبدالرحیم رائے پوری (۱۳۳۷ھ)

(۳) شیخ المحدث مولانا خلیل احمد سہارنپوری و المتوفی بالمدینۃ المنورۃ ۱۳۴۶ھ و دفن بالبقیع)

ان کے بعد شیخ محدث حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی طال بقائہٗ۔ اور الشیخ امام العصر شاہ محمد انور الکشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ) اور موجودہ دور میں اس کے ستون، جن پر اس کی عمارت قائم ہے۔ چار نفوس ہیں۔

(۱) الشیخ مولانا اشرف علی تھانوی

(۲) محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی، صاحب فتح الملہم شرح صحیح مسلم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔

(۳) شیخ العصر مولانا الشیخ حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

(۴) فاضل محقق مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی، صدر جمعیت علماء ہند۔

مسلمانوں کی رہنمائی اور بیداری میں ان چاروں حضرات کی مساعی جمیلہ قابل شکر ہیں، انھوں نے مسلمانوں کے لیے علم و عمل اور دین و سیاست کا بہت اونچا معیار قائم کیا ہے اور ان کے لیے علمی و سیاسی اور اجتماعی و انفرادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ یہ حضرات پختہ فکر، ذہن رسا، صدق عمل اور خلوص نیت کے جامع ہیں۔ ان کے چہروں سے علم و حکمت کا نور جھلکتا ہے اور عقل و کمال کی علامات نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ امت کے لیے ان کی نافع زندگی کو عافیت و سلامتی سے ہمکنار کرے اور عزت و کرامت کے ساتھ ان کی مساعی مبارکہ میں برکت فرمائے۔

علمائے دیوبند اور اُن کے علمی آثار

علمائے دیوبند نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، اصول فقہ، فقہ حنفی، فرائض، توحید و عقائد، سیرۃ و آداب اور دیگر علوم و فنون میں، نیز فرق باطلہ عیسائیت، ملاحدہ، دہریت، مرزائیت، قادیانیت اور غالی شیعوں کے ردّ میں، نیز دین متین کی حفاظت اور مبتدعین کے ردّ اور غیر مقلدین کی بعض سینہ زوریوں کی تردید میں جو کتابیں تالیف فرمائی ہیں، ان کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے، جن میں چھوٹے چھوٹے رسائل سے لے کر کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں شامل ہیں۔ یہ مقدار صرف اکابر اور نابغہ شخصیتوں کی تالیفات کی ہے، دارالعلوم کے دیگر فضلاء اور منتسبین کی تالیفات مزید برآں ہیں۔ ان تمام کتابوں کے نام کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ ان اکابر میں سے صرف ایک مصنف حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصنیفات ۵۰۰ سے زائد ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کی دو سے لے کر ۱۰ تک جلدیں ہیں، یہاں تک کہ موصوف کثرت تالیف میں قاہرہ کے نابغہ عالم شیخ جلال الدین سیوطی سے بھی فائق ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس نابغۂ ہند کی کتابیں اتقان و تحقیق میں نابغۂ مصر کی کتابوں سے فائق ہیں، ہاں سیوطی کی وسعت معلومات اور ان کا حیرت افزا تبحر کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ تھانوی کی ان کتب مذکورہ میں سے بیشتر ملکی زبان اردو میں ہیں، لیکن عربی میں بھی کم نہیں، پھر ان تالیفات کے علاوہ آپ کے وہ مواعظ و ملفوظات ہیں، جو آپ نے مختلف مجالس اور جلسوں میں بیان فرمائے اور جن میں بہت سے علوم اور بلند پایہ تحقیقات ہیں۔

علمائے دیوبند میں سے صرف ایک عالم مولانا الشیخ الفقیہ عزیز الرحمن دیوبندی نے مختلف سوالات کے جواب میں پچاس ہزار فتاوے صادر فرمائے۔ ان کے فتاوے دارالعلوم کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور شیخ تھانوی کے فتاوے کی ۵ ضخیم جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور شیخ محدث و فقیہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوے ۳ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح ان حضرات کے علم و نفع کثیر کا دنیا میں چرچا ہے۔ میں یہاں ان حضرات کی ان کتابوں کا اجمالی تذکرہ کرتا ہوں، جو تفسیر قرآن، شرح حدیث، شروح کتب حدیث اور علم و ادب سے متعلق ہیں۔

علمائے دیوبند اور تفسیر قرآن

(۱) ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی۔ بزبان اردو۔ اس ترجمے پر غریب فوائد تحریر فرمانے کا سلسلہ شروع کیا تھا، مگر ان کی تکمیل نہ فرما سکے۔

(۲) تکملہ فوائد شیخ الہند از محقق عصر مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ سے آخر قرآن تک۔

(۳) تفسیر بیان القرآن ۱۲ حصص۔ از مولانا اشرف علی تھانوی، جو نفائس جلیلہ پر مشتمل ہے۔

(۴) خلاصہ تفسیر بیان القرآن، از مصنف موصوف۔

(۵) فتح المنان فی تفسیر القرآن۔ از مولانا عبدالحق دہلوی، دیوبندی (تحصیلاً) آٹھ ضخیم جلدوں میں یہ تفسیر عربی اور اردو دونوں میں مشتمل ہے، اور اس میں بلند پایہ فوائد ہیں۔

(۶) البیان فی علوم القرآن، از مولانا عبدالحق موصوف، یہ بہت ہی عمدہ کتاب ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۷) ترجمہ قرآن، مولانا عاشق الٰہی، مع فوائد تفسیریہ (اردو)

(۸) مشکلات القرآن از امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری (عربی)

(۹) اعجاز القرآن از محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی۔

(۱۰) حاشیہ تفسیر بیضاوی۔ کامل از مولانا عبدالرحمن امروہی (عربی)

(۱۱) حاشیہ تفسیر جلالین از مولانا حبیب الرحمن دیوبندی، سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

(۱۲) سبق الغایات فی نسق الآیات (عربی) از حکیم الامۃ تھانوی

(۱۳) رسالہ اسرار قرآنی (اردو)، از مولانا محمد قاسم نانوتوی آپ کا ایک آیات قبلہ کے اسرار میں ہے۔

(۱۴) درس تفسیر قرآن (اردو) ازمولانا حسین علی پنجابی، تلمیذ حضرت شیخ گنگوہیؒ۔

(۱۵) تقریرات متعلقہ تفسیر قرآن : ازمولانا عبیداللہ سندھی، دیوبندی جو ان کے بعض تلامذہ نے قلمبند کیں۔

(۱۶) حاشیہ تفسیر مدارک تا البقرہ از بعض علمائے دیوبند

(۱۷) فوائد تفسیریہ ازمولانا احمد علی لاہوری۔ جو مولانا سندھی سے مستفاد ہیں۔

(۱۸) قرآن کریم کی چند سورتوں سے متعلقہ چند رسائل، ازمولانا احمد علی لاہوری یہ بھی مولانا سندھی سے مستفاد ہیں۔

نوٹ : (مولانا احمد علیؒ لاہوری کے نام کا محمد علی لاہوری قادیانی کے نام سے التباس نہ ہونا چاہیئے۔ مولانا احمد علیؒ اہل حق میں سے ہیں اور محمد علی لاہوری طائفہ قادیانیہ مرزائیہ کے بڑے طاغوتوں میں سے تھا۔ قادیانیت کے بانی اور اس کے موافقین کی تکفیر پر علمائے ہند کا اجماع ہے، ان بزخود غلط دعاوی کی بنا پر جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مسٹر محمد علی لاہوری نے بھی بیان القرآن کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے، جس میں ہذیانات اور اباطیل ہیں، پس متنبہ رہنا چاہیئے۔)

(۱۹) شیخ محقق تھانوی کے دو رسالے، جن میں سے ایک میں نذیر احمد دہلوی پر اور دوسرے میں مولانا احمد علی کے رسائل پر تنقید کی ہے۔

(۲۰) ہدیۃ المہدیین فی تفسیر آیت خاتم النبیین، ازمولانا محمد شفیع دیوبندی۔ خاصا بڑا اور عجیب رسالہ ہے۔

(۲۱) خاتم النبیین : امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا آیت خاتم النبیین میں ایک رسالہ ہے، جو بہت ہی عجیب و غریب علوم پر مشتمل ہے۔ لہ

(۲۲) عقیدۃ الاسلام : فی حیات عیسیٰ علیہ السلام ؛ از امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ آیات کی مبسوط شرح جو بہت سے علوم و لطائف پر حاوی ہے، قرآن کریم سے متعلقہ علمائے

لہ ۱۵ ——

دیوبند کی تالیفات کا احاطہ بہت ہی دشوار ہے۔ بلا تأمل جو فوری طور پر اس وقت ذہن میں آئیں، میں نے بطور نمونہ ان کا تذکرہ کردیا۔ تاکہ علمائے دیوبند کی خدمت دین اور خدمت قرآن کا قدرے اندازہ ہوسکے۔ ورنہ تفصیل کے لیے دوسرا موقعہ درکار ہے۔

حاصل یہ کہ یہ جلیل القدر تالیفات ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالےٰ نے اُمت کو بہت ہی نفع پہنچایا اور ان کو زمین میں حسن قبول عطا فرمایا جس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ عنداللہ بھی مقبول ہوں گی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے :

انا لنرجوا فوق ذالك مظهرا

فضلائے دارالعلوم دیوبند کے مآثر میں سے نماز فجر کے بعد قرآن کریم کا درس دینا بھی ہے، جو ہندوستان کی بہت سی مساجد میں رائج ہے۔ اس درس کے ذریعے جمہور امت اور عوام مسلمین کو جو ضروریات دین سے واقف نہیں، قرآن کے مقاصد کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے۔ اور یہ خدمت دین کی ایک جدید تحریک ہے اور اس کے آثار بہت ہی عمدہ ہیں، حق تعالیٰ اس میں برکت فرمائے۔

دیوبند اور علم حدیث

علم حدیث میں علمائے دیوبند کی بہت سی تالیفات ہیں، جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے، یہاں مختصر سی تعداد ذکر کرتا ہوں :

(۱) حاشیہ صحیح بخاری (عربی) ازمولانا الشیخ احمد علی سہارنپوری (المتوفی ۱۲۹۷ھ) موصوف کا شمار اکابر علمائے دیوبند میں ہوتا ہے اور ان کا یہ حاشیہ ایک ضخیم شرح کا حکم رکھتا ہے۔

(۲) بذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد (عربی) ازمولانا الشیخ خلیل احمد سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) ۵ ضخیم جلدوں میں (اور اب مصر سے ۲۰ جلدوں میں

لہ ماہنامہ بینات کراچی میں اس کا ترجمہ و تشریح قسط وار شائع ہوئی ہے۔ مترجم۔

شائع ہوتی ہے۔ مترجم)

(۳) فتح الملہم فی شرح صحیح مسلم (عربی) از محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پانچ ضخیم جلدوں میں، دو جلدیں چھپ چکی ہیں، تیسری زیر طبع ہے۔ افسوس! کہ باقی کی تکمیل نہ ہوسکی۔ مترجم۔

(۴) فیض الباری بشرح صحیح البخاری (عربی) یہ امام العصر مولانا الشیخ محمد انور شاہ کشمیری کی تقاریر کا مجموعہ ہے، انشاء اللہ متعدد جلدوں میں عنقریب مصر سے شائع ہوگی۔

(۵) العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی) یہ شیخ محدث گنگوہیؒ کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

(۶) الکوکب الدری علی جامع الترمذی (عربی) یہ شیخ محدث گنگوہیؒ کی تقاریر درس کا مجموعہ ہے۔

(۷) النفع الشذی شرح الترمذی (اردو) یہ بھی حضرت گنگوہی کی تقریر درس ہے۔

(۸) شرح سنن ابی داؤد (عربی) امام العصرؒ کی تقاریر کا مجموعہ۔ دو جلدوں میں

(۹) حاشیہ ابن ماجہ (عربی) از امام العصرؒ

(۱۰) اوجز المسالک فی شرح موطا امام مالک (عربی) از مولانا الشیخ محمد زکریا کاندھلوی متعدد ضخیم جلدوں میں۔ دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں (کامل چھ جلدیں ہیں اور اب بیروت وغیرہ سے متعدد جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ مترجم)

(۱۱) التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح (عربی) از مولانا محمد ادریس کاندھلوی اس کی چار ضخیم جلدیں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۱۲) اعلاء السنن، متعدد اجزاء میں (عربی) اس میں امام ابو حنیفہ رح کے مسلک کی احادیث جمع کی گئی ہیں اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے زیر اشراف تالیف کی گئی ہے

(۱۳) الآثار (عربی) از مولانا اشرف علیؒ اس میں امام ابو حنیفہ کے دلائل ایک جزء میں جمع کئے ہیں۔

(۱۴) شرح شمائل ترمذی (عربی، اردو) از مولانا الشیخ محمد زکریا کاندھلوی

(۱۵) النبراس الساری فی اطراف البخاری (عربی) از مولانا عبدالعزیز پنجابی دو جلدوں میں۔ مقیاس الواری کے نام سے اس پر مصنف کا حاشیہ بھی ہے۔

(۱۶) حاشیہ نصب الرایہ للزیلعی، (عربی) اس کا نام "بغیۃ الالمعی" رکھا جائے، مجلس علمی کے زیر اہتمام مصر میں نصب الرایہ کے ساتھ زیر طبع ہے۔

(۱۷) التعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد، مولانا فخر الحسن گنگوہی تلمیذ رشید شیخ محدث گنگوہی کا نفیس اور ضخیم حاشیہ ہے۔

(۱۸) حاشیہ ترمذی، جو شیخ محدث شیخ الہند دیوبندی کی جانب منسوب ہے۔

(۱۹) شرح تراجم بخاری، از شیخ الہندؒ

یہ ان کے مآثر علمی کا مختصر سا جائزہ ہے، جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی شروح سے متعلق ہے۔ جن کتابوں کا نام تذکرے سے رہ گیا ہے ان کی تعداد بھی معمولی نہیں ہوگی۔ اس پر ان علمی رسائل کا مزید اضافہ کرلیا جائے جو حدیث کے ابحاث سے مزین ہیں، مثلاً ایضاح الادلہ اوثق العریٰ احسن القریٰ، القطوف الدانیہ، اسرار النجیح، المصابیح، فصل الخطاب، خاتمۃ الخطاب، کشف الستر، نیل الفرقدین، ان کے علاوہ دیگر رسائل، جو احادیث و فقہ کے مختلف موضوعات پر ان اکابر نے تالیف فرمائے ہیں اور اس مقالے میں ان سب کے تذکرے کی گنجائش نہیں۔

دیوبند اور علم و ادب

علمائے دیوبند نے علم و ادب پر بھی بڑی عمدہ اور نافع کتابیں تالیف کی ہیں۔ چند نام حسب ذیل ہیں:

(۱) شرح حماسہ ازمولانا فیض الحسن سہارنپوری، تلمیذ حضرت گنگوہیؒ، یہ نفیس شرح فیضی کے نام سے معروف ہے۔

(۲) تسہیل الدراسہ شرح دیوان حماسہ (عربی۔ اُردو) ازمولانا ذوالفقار علی دیوبندی، والد ماجد شیخ العصر مولانا شیخ الہند مولانا محمود حسن

(۳) التبیان شرح دیوان متنبی۔ ازمولانا موصوف

(۴) التعلیقات علی سبع المعلقات، ازمولانا موصوف ایضاً

(۵) عطرالوردہ فی شرح البردہ، ایضاً نفیس شرح ہے

(۶) الارشاد الی بانت سعاد۔ ایضاً قصیدہ کعب بن زہیرؓ کی عجیب شرح۔

(۷) فتح المغلقات شرح المعلقات۔ ازمولانا نظام الدین کیرانوی

(۸) شرح حماسہ ازمولانا محمد اعزاز علی امروہی شیخ الادب دارالعلوم دیوبند

(۹) شرح دیوان متنبی، ایضاً۔

(۱۰) التعلیقات شرح المقامات، ازمولانا نورالحق، تلمیذ مولانا محمود حسن استاذ ادب کالج لاہور

(۱۱) درایۃ المتیقظ علی کفایۃ المتحفظ لابن الاجدابی۔ ازبعض فضلائے دیوبند

(۱۲) حاشیہ نفحۃ الیمن ازمولانا محمد شفیع دیوبندی۔

پس یہ قرآن وحدیث اور ادب سے متعلق آثار ہیں اور یہ جواہر علمائے دیوبند کے قلم کے رہین منت ہیں۔ ان کے علاوہ اصول فقہ، فقہ حنفی علم مناظرہ، فرائض، تصوف، سیرت نبویہ اور تاریخ اسلام وغیرہ سے متعلق اکابر دیوبند کی تصانیف بے شمار ہیں، جن کے تعارف کے لیے دوسرا موقعہ درکار ہے، ان تمام امور سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے ساری عمر درس وتقریر کے ذریعے قوم کو حیات ملی کی روح پھونکنے میں اپنی زندگی صرف کردی اور ان آثار جلیلہ کے مقابلے میں مذکورہ بالا آثار نسبتاً ہی معمولی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ علمائے دیوبند ہیں اور یہ ان کے آثار ہیں، جو ان کی علمی خدمت میں بلندی مرتبت پر شاہد ہیں۔ توقع ہے کہ ایک تجربہ کار صاحب بصیرت ان آثار کی قدرشناسی کرے گا۔ اگر ایسے قلب میں انصاف اور فکر میں بصیرت عطا کی گئی ہو۔ اور ان کے آثار کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ اُس وقت ہوسکتا ہے جب کہ ہندوستان کے جمہور مسلمانوں میں اس کی تاثیرات کو ملاحظہ فرمایا جاتے۔

تلك آثارنا تدل علينا
فانظروا بعدنا الى الآثار

اگر تم چاہتے ہو کہ ایسے مردان راہ کی زیارت کرو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجاہت رکھتے ہوں، مگر انسانوں میں گمنامی کو پسند کرتے ہوں تو ان علمائے دیوبند کو جاکر دیکھو۔ اگر صحف ومجلات اور اخبار وجرائد میں ان کا ذکر نہیں تو نہ ہو۔ ان کا ذکر خیر مخلوق کی زبانوں پر ہے، قلوب ان کی گواہی دیتے ہیں عالم کے بنیات اور کائنات کے صحیفے ان کے شاہد ناطق ہیں۔ اور اگر اس سے کچھ لوگ جاہل یا متجاہل ہیں، تو کچھ افسوس اور شکایت نہیں اور چونکہ جو چیز کہ اللہ کے پاس ہے، وہ زیادہ بہتر اور پائدار ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ دیوبندی تحریک یا صحیح معنوں میں ہندوستان کی دینی وعلمی تحریک در اصل اسی دہلوی تحریک کی تجدید ہے، جس کے لیے امام شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان گرامی قدر اُٹھے تھے اور دوسری جہت سے دیکھئے تو یہ اس تحریک کی تکمیل اور تشیید ہے۔ پس اکابر دیوبند اس جماعت کا نام ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے خدمت دین، خدمت علم دین، خدمت علوم قرآن وسنت کے لیے منتخب فرمایا اور اس بیان پر تعجب کیوں کیجئے۔ آفتاب اپنے مطلع سے طلوع ہوچکا ہے اور چیز اپنے معدن میں اجنبی نہیں رہی۔ اس کی بوئے عنبریں اقطار ہند میں مشام جاں کو معطر کررہی ہے اور اس کے چشمے اُبل اُبل کر زمین کے اطراف واکناف کو سیراب کررہے ہیں۔ اس کے انوار وبرکات آفاق وبلاد کو روشن کررہے ہیں اور یہ روشنی صفحات ایام پر مسلسل پھیلتی جائے گی۔

● پس یہ ہیں علمائے دیوبند اور ان کا علمی مرکز ●

"اِنّ فی ذالك لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وھو شهيد"

محمد یوسف بنوری، عفی عنہ، نزیل قاہرہ

مقالہ
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

تلخیص
صوفی محمد اقبال قریشی

مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ، خلفہ دیوبندی دامت برکاتہم وفیوضہم نے جمعرات ۳۰ نومبر ۱۹۴۰ء کی شب دارالحدیث دارالعلوم دیوبند کے وسیع ہال میں طلباء دارالعلوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

کہ : " آپ حضرات کو ابھی اس نعمتِ خداوندی کی قدر نہیں ہے کہ اس نے آپ کا تعلیمی رشتہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک کر دیا ، جب اس بسم اللہ کے گنبد سے آپ باہر نکلیں گے اور کتاب و سنت اور فقہی مسائل کی تعبیر میں آپ کو افراط و تفریط کا ایک بھیانک منظر نظر آئے گا ، اس وقت معلوم ہوگا کہ دیوبند اور اس کا معتدل مسلک کیسی عظیم نعمت ہے ، میں بھی طالب علمی کے زمانے میں آپ کی طرح محض اپنے والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم سے متعلق ہوا ، یہاں کے اساتذہ سے اپنے حوصلہ کے مطابق علم حاصل کیا اور مسلک دیوبند بھی تقلیداً اختیار کیا ، لیکن دنیا کے نشیب و فراز اور سرد و گرم دیکھنے ، فرقہ وارانہ مباحث سے گزرنے کے بعد اپنی تحقیق سے اس مسلکِ اعتدال کی خوبیاں مستحضر ہوئیں ، وطن کے اعتبار سے تو میں دیوبندی فطرتاً تھا اور مسلک کے اعتبار سے تقلیداً ، لیکن طویل غور و فکر ، بحث و تمحیص کے بعد مسلک دیوبند کے اتباع کا محض تقلید سے نہیں بلکہ بصیرت سے پابند ہوں " (نقوش و تاثرات درسفر تھانہ بھون و دیوبند " ص ۴۵)

نیز آپ نے ایک مرتبہ مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : " ایک صدی میں اس مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے دنیا کے ہر خطے میں علم نبوت پھیلے ، دہلی اور دیوبند کے مراکز علوم کی اہم خصوصیت اسلامی فرقوں اور جماعتوں کے اختلافی مسائل میں نظری اور فکری اعتدال ، علم کے ساتھ عمل اور ظاہر کے ساتھ

باطن کی اصلاح رہی ہے، یہی دیوبند کا طرۂ امتیاز ہے، جس نے اسے قبولیت عامّہ اور خاص برکات کا مظہر بنایا۔ نظریاتی اعتدال میں تو دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا رسالہ دیکھنے کے قابل ہے۔ (ماہنامہ بینات کراچی، ربیع الآخر ۸۶ھ)

"علماء دیوبند کا مسلک" از حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان نے فرمایا کہ:

"یہ مقالہ سراسر الہامی معلوم ہوتا ہے"۔ (ماہنامہ الصدیق اگست ۱۹۶۴ء)

اس لیے بندہ برادر محترم مولانا عبدالرشید ارشد صاحب مدظلہ کے ارشاد پر باوجود ضعف و علالت کے اس کی تلخیص شروع کرتا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔ بندہ محمد اقبال قریشی

خادم مجلس صیانۃ المسلمین، ہارون آباد۔ ۱۰ رجب ۱۳۹۵ھ

علماءِ دیوبند اپنے مسلک کے اعتبار سے حقیقتاً اہلِ سنّت والجماعت ہیں

علماء دیوبند اپنے مسلک اور دینی رُخ کے لحاظ سے کلیۃً اہلسنت والجماعت ہیں اور اہل سنت کا بھی اصل حصہ ہیں، جس سے وقتاً فوقتاً مختلف شاخیں کٹ کٹ کر الگ ہوتی رہی ہیں۔ علماء دیوبند نے نہ صرف اہلسنت والجماعت کے تمام اصول و قوانین ہی کو از اوّل تا آخر پابند رہے ہیں، بلکہ ان کے متوارث ذوق کو بھی انھوں نے تھاما۔ پھر وُہ خود زود قسم کے اہلسنت نہیں، بلکہ اُوپر سے ان کا استناد اور سند کا سلسلہ ملا ہوا ہے، اسلیے مسلک کے اعتبار سے نہ وُہ کوئی جدید فرقہ ہیں، نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وُہی قدیم اہلسنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے، جو اُوپر سے تسلسل و استمرار اور سند متصل کے ساتھ کابراً عن کابر چلا آرہا ہے۔

سو اہلسنت والجماعت کے اس اصل طبقہ یا علماء دیوبند کے اس جامع اور معتدل ترین مسلک کو سمجھنے کے لیے جس میں افراط ہے، نہ تفریط، نہ غلو ہے، نہ مبالغہ بلکہ کمال اعتدال و جامعیت کا جوہر پیوستہ ہے۔ اس کے لقب اور ماخذ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اجزاء سے مرکب ہے، ایک السنت جس سے اصول، قانون اور طریق نمایاں ہے اور الجماعت کے لفظ سے ذوات شخصیات اور رفقاء کے طریق نمایاں ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول و قوانین بغیر ذوات کے (مثلاً القرآن الحکیم اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی عمل کا نمونہ خود آپ نے کرکے دکھایا اور آپ کے متبعین حضرات صحابہ کرام رض، ائمہ مجتہدینؒ وغیرہم) اور ذوات بغیر قوانین کے معتبر نہیں، کیونکہ قوانین ان ذوات ہی کے راستے سے آتے ہیں، اس لیے ماخوذ کو لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہوسکتا، اس لیے حدیث ما انا علیہ و اصحابی میں بہتّر فرقوں میں سے فرقۂ حقّہ کی نشاندہی فرماتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معیار حق ان ہی دونوں چیزوں کو قرار فرمایا۔ ما سے اشارہ اسی السنۃ یعنی روش نبوی یا قانون دین کی طرف ہے جس سے ملت حقّہ پیدا ہوئی اور جس سے پھر مختلف دینی شعبے بنے اور انا و اصحابی[1] سے اشارہ الجماعۃ یعنی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف ہے، جو پیغمبرؐ سے شروع ہوئیں اور بعد میں دینی شعبوں میں کسی نہ کسی شعبہ حذاقت و مہارت سے بنتی رہیں، جس سے فرقۂ حقّہ پیدا ہوا۔

---

[1] بلکہ امام احمد و ابوداؤد میں اسی مضمون کی روایت میں "و اصحابی" کی جگہ الجماعۃ کا صریح لفظ موجود ہے۔

ان سب (صحابہؓ سے لے کر تابعینؒ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین فی العلم تک) کی عظمت و محبت اور متابعت اور ادب و احترام اسی مسلک کا جوہر ہے، کیونکہ جملہ دینی شخصیتیں ذات نبویؐ کے ظلال ہیں، ورنہ اسے دینی شخصیت کیوں کہا جاتا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ساری شخصیتوں کے جامع اور ان میں فرد اکمل ہیں۔

شریعت کے تمام علمی و عملی شعبے بلکہ دین کی ساری حجتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مختلف الانواع نسبتوں کے ثمرات و آثار ہیں، مثلاً آپؐ کی نسبت ایمانی سے عقائد کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا فنی اور اصطلاحی نام کلام ہے۔ آپؐ کی نسبت اسلامی سے عملی احکام کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فقہ ہے۔ آپؐ کی نسبت احسانی سے تزکیۂ نفس اور تکمیل اخلاق کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے۔ آپؐ کی نسبت اعلاء کلمۃ اللہ سے سیاست و جہاد کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا عنوانی لقب امارت و خلافت ہے۔ آپؐ کی نسبت استنادی سے سند کے ساتھ نقل دین کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی نام فن روایات و اسناد ہے، آپؐ کی نسبت استدلالی سے حجت طلبی اور حجت بیانی کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی نام درایت و حکمت ہے، آپؐ کی نسبت اتقائی سے علوم فراست و معرفت کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی نام فن حقائق و اسرار ہے، آپؐ کی نسبت استقرائی سے کلیات دین کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی نام فن اصول ہے، خواہ اصول فقہ ہوں یا تفسیر و حدیث وغیرہ، آپؐ کی نسبت اجتماعی سے تعاون باہمی اور حسن معاشرت کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا فنی اور اصطلاحی نام حضارۃ و مدنیت ہے، آپؐ کی نسبت تیسیری سے سہولت پسندی اور میانہ روی کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی لقب عدل و اقتصاد ہے۔ پھر شرعی حجتوں کا سلسلہ دیکھئے، جس سے اس جامع شریعت کا وجود ہوتا ہے آپؐ کی نسبت انبائی (نبوت) سے وحی متلو کا ظہور ہوا، جس کے مجموعہ کا نام القرآن ہے، آپؐ کی نسبت اتقائی اور وجدانی سے استنباط اور استخراج مسائل کا ظہور ہوا، جس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ آپؐ کی نسبت خاتمیت سے امت میں دوامی ہدایت اور عدم اجتماع برضلالت کا مقام پیدا ہوا، جس سے اس میں حجت کی شان ظاہر ہوئی، جس کا اصطلاحی نام اجماع ہے، غرض آپؐ ہی کی نسبتوں سے دین کی چار حجتیں قائم ہوئیں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع امت (۴) اجتہاد مجتہد۔ اگرچہ ان کے اصطلاحی نام بعد میں رکھے گئے مگر ان کی حقیقتیں قدیم اور پہلے ہی سے ذات نبوت سے وابستہ تھیں ان سب کو علماء دیوبند نے جوں کا توں لے کر اپنے مسلک کا رکن بنا لیا اور وہ اس کے مسلک کے عناصر ترکیبی قرار پائے، پھر ہر طبقے میں کمال حذاقت و مہارت اور خداداد فراست و بصیرت کے لحاظ سے اس فن کے ائمہ اور اولو الامر پیدا ہوتے اور وہ اس فن میں اس درجہ منہمک و فانی ہوتے کہ یہ فن ان کا اوڑھنا بچھونا اور جوہر نفس ہو گیا۔ ایسی شخصیتوں کو ان فنون کا امیر المؤمنین اور اولو الامر مانا اور پکارا گیا۔ اور وہ امام و مجتہد کے ناموں سے یاد کیے گئے۔ مثلاً ائمہ اجتہاد (امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ) ائمہ حدیث جیسے بخاریؒ و مسلمؒ، ابو داؤدؒ وغیرہ، ائمہ تصوف جنیدؒ و شبلیؒ اور معروفؒ و بایزیدؒ وغیرہ، ائمہ درایت و تفقہ، ابو یوسفؒ، محمد حسن مزنی اور ابن حبیب وغیرہ ائمہ حکمت و حقائق رازیؒ و غزالیؒ و ابن عربی، ائمہ کلام ابو الحسن اشعریؒ، ابو منصور ماتریدی وغیرہ ——— ائمہ اسلام فخر الاسلام بزدویؒ و علامہ دبوسیؒ وغیرہ اور اسی قسم کی دین کی برگزیدہ شخصیتیں، مسلک علماء دیوبندؒ کے اعضاء و اجزاء قرار پائے جن کی درجہ بدرجہ توقیر و عظمت مسلک کا دوسرا اہم ترین رکن ہے، پس جیسے علماء دیوبندؒ کا رجوع ان شعبوں کی طرف یکساں ہے اور کسی ایک شعبے پر غلو کے ساتھ زور دینا ان کا مسلک نہیں کہ وہ تصوف کو لے کر حدیث سے بے نیاز ہو جائیں یا حدیث کو لے کر تصوف و کلام سے بیزاری کا اظہار کریں

اس لیے علماء دیوبند کے محدث ہونے کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ وُہ متکلم کو کم رتبہ سمجھیں، اصولی ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ صوفی کو حقارت سے دیکھیں یا صوفی ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ وُہ متکلم کو کم رُتبہ سمجھیں فقیہ ہونے کے یہ معنی نہ ہونگے کہ وُہ حدیث سے بچتے ہوں جبکہ یہ تمام نوع شخصیتیں کسی نہ کسی جہت سے آثار نبوت سے ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں ہر رنگ اور ہر طبقے کے افراد جمع تھے اور ایک دُوسرے کی عظمت و محبت اور ادب و احترام میں بھی انتہائی مقام پر تھے، تمام شعبہ ہائے دین جن شخصیتوں میں جمع ہوئے، ان میں جامعیت کی شان پیدا ہوئی، یہ الگ بات ہے کہ کسی شخصیت پر غلبہ کسی خاص شعبے یا فن کا رہا ہو۔ الحمدللہ اکابر دیوبند میں ایسی شخصیتیں رہی ہیں اور موجوُد ہیں.

تمام دینی شعبوں کا خُلاصہ

پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصُول و قوانین کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں، عقیدہ اور عمل۔ عقیدے میں بنیادی عقیدہ اور تمام عقائد کی اساس توحید ہے اور عمل میں سارے اعمال کی بنیاد اتباع سنت و پیروئ اسوۂ حسنہ ہے.

توحید

اس مسلک میں اصل چیز توحید خُداوندی پر زور دینا ہے، جس کے ساتھ شرک یا موجبات شرک جمع نہ ہو سکیں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو، لیکن ساتھ ہی تعظیم اہل اللہ اور توقیر اہل فضل و کمال کو اس کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں اور ایسے ہی تعظیم شخصیات میں مبالغہ کرنا جس سے توحید میں خلل پڑتا ہو یا اس میں شرک کی آمیزش کر دینا جو تعلیم کا غلو ہے.

حضرات انبیاء علیہم السّلام

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے بارے میں علماء دیوبند کا نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ یہ مقدسین پیغام الٰہی کے معین ہیں، جنھوں نے کمال دیانت اور حزم و احتیاط کے ساتھ پیغام الٰہی مخلوق تک پہنچایا، وہ عالم کے معلّم و مربّی ہیں، جو ہر تعظیم و عظمت کے مستحق اور ہر ادب و احترام کے مستوجب ہیں، مگر ساتھ ہی اس مسلک کا اہم جزو یہ بھی ہے کہ وُہ بشر بھی ہیں، نوع بشر سے الگ اُن کی کوئی نوع نہیں، اس لیے جہاں ان کی بے ادبی کفر اور عظمت عین ایمان ہے، وہیں اس عظمت میں کفر کی آمیزش بھی کفر سے بڑھ کر کفر ہے.

خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

علماء دیوبند بصدقِ قلب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الکائنات افضل البشر اور افضل الانبیاء یقین کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی آپؐ کی بشریت کا بھی اقرار کرتے ہیں، غلوے عقیدت و محبت میں نفی بشریت یا ادعاء اوتاریت یا پردہ مجاز وغیرہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ وُہ آپؐ کی ذات بابرکات کو تمام انبیاء کرام کی تمام کمالاتی خصُوصیات خلت، اصطفائیت کلیمیت، نارُوحیت، صادقیت، خلیلیت اور صدیقیت وغیرہا کا جامع بلکہ مبدار نبوت انبیاء اور منشاء ولایت اولیاء سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی آپؐ کا سب سے بڑا کمال عبدیت سمجھتے ہیں، وُہ آپؐ کے عُلوِّ درجات ثابت کرنے کے لیے حدودِ عبدیت کو توڑ کر حدودِ معبوُدیت میں پہنچا دینے سے مدد نہیں لیتے وُہ آپؐ کی اطاعت کو فرضِ عین سمجھتے ہیں، لیکن آپؐ کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے، وُہ آپؐ کی خصُوصیات الوہیت تسلیم نہیں کرتے، اور اس میں ذاتی و عرضی کا فرق بھی تسلیم نہیں کرتے، وُہ آپ کے ذکر مبارک اور مدح و ثنا کو عین عبادت سمجھتے ہیں، لیکن اس میں عیسائیوں کے مبالغے جائز نہیں سمجھتے ہیں کہ حدُودِ بشریت کو حدُودِ الوہیت سے جا ملائیں، وُہ برزخ میں آپؐ کی جسمانی حیات کے قائل ہیں، مگر وہاں معاشرت دُنیوی کے قائل نہیں، وُہ اس کے اقراری ہیں کہ آج بھی اُمت کے ایمان کا تحفظ گنبدِ خضرا ہی کے منبع ایمانی سے ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی آپؐ کو حاضر

و ناظر نہیں جانتے، جو خصوصیات الوہیت میں سے ہے، وہ آپؐ کے علم عظیم کو ساری کائنات کے علم سے خواہ ملائکہ ہوں یا انبیاء و اولیاء بمراتب بے شمار زیادہ اور بڑھ کر جانتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے ذاتی اور محیط ہونے کے قائل ہیں، غرض تمام ظاہری و باطنی کمالات آپ کو ساری مخلوقات میں بلحاظ کمال و جمال یکتا، بے نظیر اور بے مثال یقین کرتے ہیں، لیکن خالق کے کمالات سے ان کے کمالات کی وہی نسبت مانتے ہیں جو مخلوق کو خالق سے ہو سکتی ہے کہ خالق کی ذات اور صفات اور کمالات سب لامحدود اور مخلوق کی ذات و صفات اور کمالات سب محدود۔ وہ ذاتی ہیں یہ عرضی اور عرضی ہو کر بھی محدود وہ خانہ زاد ہیں اور یہ عطا کا ثمرہ۔ پس یہ حدود کی رعایت وہی نقطۂ اعتدال ہے، جو اس مسلکِ اعتدال کی اساس ہے۔

صحابہ کرامؓ

علماء دیوبند صحابہ کی عظمت اور جلالت پر اس کے قائل نہیں کہ کسی کو لائق محبت سمجھیں اور کسی کو معاذ اللہ لائق عداوت۔ کسی کی مدح میں رطب اللسان ہوں اور عیاذاً باللہ کسی کی مذمت میں، وہ انھیں بلا استثناء نجوم ہدایت مانتے ہیں کہ بعد والوں کی نجات ان ہی کے علمی و عملی اتباع کے دائرے میں محدود ہے، لیکن انھیں شارع تسلیم نہیں کرتے کہ حق شرع ان کے لیے ماننے لگیں، علماء دیوبند کے نزدیک سب صحابہؓ شرفِ صحابیت اور صحابیت کی برگزیدگی میں یکساں ہیں اس لیے محبت و عظمت میں بھی یکساں ہیں، البتہ ان میں باہم فرقِ مراتب بھی ہے تو عظمت مراتب میں بھی فرق ہے، لیکن یہ ہے کہ نفس تبعیت کا فرق نہیں، اس لیے محبت و عقیدت میں فرق نہیں پڑ سکتا، پس اس مسلک میں الصحابۃ کلھم عدول، صحابہؓ سب کے سب عادل متقی کا اصول کارفرما ہے، جو اس مسلک کا سنگِ بنیاد ہے، صحابہؓ بحیثیت قرن خیر من حیث الطبقہ پوری امت کے لیے نبیؐ کے قائم مقام اور معیارِ حق ہیں، نبوت کے منکر کی طرح ان کے اجماع کا منکر بھی کافر ہے اور جو ان کے بارے میں بدگمانی یا بدزبانی کا شکار ہے، وہ حقانیت سے ہٹا ہوا ہے۔ علماء دیوبند انھیں غیر معصوم کہنے کے باوجود بوجوہ محفوظیتِ دین انھیں قابلِ تنقید و تبصرہ نہیں سمجھتے کہ بعد والے انھیں اپنی تنقیدات کا ہدف بنائیں، ان کے مشاجرات اور باہمی نزاعات میں خطا و صواب کا تقابل ہے، حق و باطل یا طاعت و معصیت کا نہیں اور سب جانتے ہیں کہ مجتہد خاطی کو بھی اجر ملتا ہے نہ کہ زجر۔ پس ان کے معاملات میں جو نیک نیتی اور پاک نفسی پر مبنی تھے حسبِ مسلک علماء دیوبند نہ بدگمانی جائز ہے نہ بدزبانی۔ یہ توجیہ کا مقام ہے۔ تلک دماء طہر اللہ عنھا ایدینا فلا نلوث بھا السنتنا

تصوف اور صوفیاء

علماء دیوبند جملہ اولیائے امت (خواہ وہ کسی مسلک کے ہوں) کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انھیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی تعظیم ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انھیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنا لیا جائے، وہ ان کی منور قبروں سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے کے قائل ہیں، لیکن انھیں مشکل کشا اور دافع البلاء والوباء نہیں سمجھتے کہ وہ صرف شانِ کبریائی ہے، وہ اہلِ قبور سے حصولِ فیض کے قائل ہیں، استمداد کے نہیں، وہ حاضریِ قبور کے قائل ہیں، مگر ان کے عیدگاہ بنانے کے قائل نہیں، وہ مجالسِ ابرار میں شروطِ فقہ کے ساتھ نفسِ سماع کے منکر نہیں مگر گانے بجانے کے کسی درجے میں بھی قائل نہیں، البتہ نسبت نبوت اور اتباعِ سنت کے غلبہ کی وجہ سے سماع سے الگ رہنا قابلِ مدحت

نہیں، قابلِ مدح ہے۔ مشائخ دیوبند کا عمومی معمول اس بارے میں یہی ہے کہ وہ رسوم شادی و غمی کو اسوۂ حسنہ اور سلف صالحینؒ کے سادہ اور بے تکلف طریق عمل میں محدود رکھنا چاہتے ہیں، وہ غمی کی رسوم مثلاً تیجہ، دسواں، چہلم، برسی وغیرہ کو بدعت سمجھتے ہیں اور سختی سے روکتے ہیں، کیونکہ وہ ثواب سمجھ کر کی جاتی ہیں اور شادی کی رسوم تمدن و شہرت کے جذبے سے انجام دی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ رسوم محض خلافِ سنت ہیں اور خلافِ سنت میں عقیدہ محفوظ نہیں رہتا۔ وہ ایصالِ ثواب کو مستحسن اور اموات کا حق سمجھتے ہیں، مگر اس کی محض نمائشی صورتیں بنانے کے قائل نہیں، جنہیں مخصوص اصطلاحات نیاز، فاتحہ وغیرہ کے وضع کردہ عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ تکمیل اخلاق اور تزکیۂ نفس کیلئے حسبِ سلاسل طریقت مشائخ کی بیعت و صحبت کو حق اور طریقت کے اصول و ہدایات کی پابندی تجربۃً مفید اور ضروری سمجھتے ہیں، لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے، بلکہ شریعت ہی کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں، جسے شریعت نے احسان کہا ہے۔

وہ مشاہد و آثارِ صلحا کی برکت اور ان سے تبرک و استفادہ کے قائل ہیں، مگر انہیں سجدہ گاہ بنا لینے کے قائل نہیں، اگر آثارِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جیسے موئے مبارک، پیرہن مبارک یا نعلین مبارک کا ایک تسمہ بھی مستند طریق پر مل جاتے تو اسے سلاطین کے تاج اور دُنیا و فیہا کی ہر دولت سے کہیں زیادہ بڑھ کر دولت سمجھتے ہیں، غیر مستند ہوں تو بے ادبی سے بچ کر بے سند چیزوں سے کنارہ کش ہو جانا ضروری سمجھتے ہیں۔

اولیاء اللہ کے شطحیات اور غلبۂ حال کے کلمات و افعال کے بارے میں علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ وہ نہ تو ان اقوال و افعال کی بنا پر جنکی سطح بظاہر سنت و شریعت سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے، ان حضرات کی شان میں ادنیٰ بے ادبی و گستاخی کو جائز نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان موہوم یا مبہم کلمات کو غلوئے محبت میں شریعت سمجھتے ہیں۔ نہ اُن کو حجتِ شرعی سمجھتے ہیں کہ ان کی طرف لوگوں کو بلائیں اور نہ ہی انہیں اسلام سے خارج کرنے کے درپے ہوتے ہیں، درحقیقت ایسے کلمات و افعال انکا ایک مخصوص حال ہے، جو بظاہر خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے، درحقیقت نہیں، عارف اور بعض علماء نے ان کی توجیہات میں مستقل رسائل تالیف کر دیئے ہیں۔ اس مسلک کا جزو جہاں یہ ہے کہ مغلوب الحال اہل اللہ کا عذر قابلِ قبول اور قابلِ تاویل ہے، وہاں یہ جزو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مغلوب الحال کوئی اونچا مقام نہیں بلکہ ایسے مقام میں علوِ مقام کی بات یہ ہے کہ دامن سنت و شریعت ہاتھ سے نہ چھوٹے، مشائخ دارالعلوم کی روش اس بارے میں یہی رہی ہے کہ وہ غلبۂ حال میں از خود رفتہ نہیں ہوتے اور اتباعِ سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

فقہ اور فقہا

علماء دیوبند کا مسلک فقہی اور اجتہادی مسائل میں فقہ حنفی پر عمل کرنا ہے، لیکن اسے آڑ بنا کر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھیرانا یا ائمہ مذاہب پر زبانِ طعن دراز کر کے عاقبت خراب کرنا نہیں کیونکہ یہ حق اور باطل کا مقابلہ نہیں، سب ائمہ حق پر ہیں، دین کے بارے میں آزادیٔ نفس سے بچنے اور خود رائی سے دور رہنے کے لیے کسی ایک امام کی تقلید ضروری ہے، تقلید میں بھی علماء دیوبند کا مسلک افراط و تفریط سے پاک ہے وہ کسی بھی امام، مجتہد یا اس کے فقہ کی کسی چھوٹی سے چھوٹی جزئی کے بارے میں تمسخر یا سوءِ ادب یا رنگِ ابطال و تردید سے پیش آنے کو خسرانِ دنیا و آخرت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اجتہادات شرائع فرعیہ ہیں شرائع اصلیہ نہیں کہ اپنے فقہ کو موضوع بنا کر دوسروں کی تردید کر دیں البتہ

اپنے اختیار کردہ فقہ کی حد تک ترجیح پر مطمئن ہیں۔

حدیث اور محدثین

علماء دیوبند کے مسلک میں قوتِ سند یا اصح ما فی الباب ہونا اصل نہیں، بلکہ بصورتِ جمع مناطِ حکم اور بصورتِ ترجیح تفقہ اصل ہے حنفیہ کے یہاں بلاشبہ جمع بین الروایات اور تحقیق و تنقیح مناط کی وجہ سے توجیہات کی کثرت ہے کہ اس کے بغیر روایات باہم جڑ کر حکم کا جامع نقشہ پیش نہیں کر سکتیں، مگر یہ توجیہات و تاویلات محض یا تخمینی بات نہیں، بلکہ اصول اور نصوص سے مؤید ہونے کی وجہ سے تقریباً تفسیراتِ حدیث ہم پلہ ہوتی ہیں اس لیے حدیث کے بارے میں علماء دیوبند کا غالب عنصر جامعیت و اعتدال ہے، جس میں نہ تشدد ہے، نہ تساہل بلکہ وہ روایات کے ساتھ تمام ائمہ کے اصول کو لے کر چلتا ہے

کلام اور متکلمین

علماء دیوبند کا مسلک تمام متکلمین کی عظمت کے ساتھ امام ابو منصور ماتریدی کا اتباع ہے، لیکن یہاں بھی کلامِ معین کی پابندی و اتباع کے ساتھ تحقیق کا سرا ہاتھ سے نہیں دیا گیا، کلامی مسائل کے ساتھ علماء دیوبند میں قاسمیت غالب ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ ہے، جس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدی کے اختلافات میں ردّ و قدح کی بجائے رفعِ اختلافات اور تطبیق و توفیق کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، جس سے بڑے سے بڑا اختلاف نزاعی محسوس ہونے لگتا ہے مذہب کے مخالف جنگ کرنیوالوں نے عقل کو بڑا استعمال کیا ہے، علماء دیوبند کا اس کے بارے میں نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں نہ تو عقل کو ذوارِ کار سمجھتے ہیں اور نہ ہی اسے مستقل رہبر مانتے ہیں، وہ عقل سے نقل کو نہیں پرکھتے، بلکہ نقلِ صحیح کو عقل کے صحت و سقم کے پرکھنے کی کسوٹی سمجھتے ہیں، وہ عقل کو محسوسات کے ناپ تول کا ترازو سمجھتے ہیں مغیبات کے ادراک کا آلہ اور حاسہ باور نہیں کرتے، اس سے انکے نزدیک دین و مذہب کی اصل وحی خداوندی ہے اور اس کے اثبات کے خدام میں ایک خادم عقل بھی ہے، گو شریف ترین خادم ہے، مگر حاکم نہیں، مگر بے فکر اور بے ذکر عقل خادمِ دین ہونے کے منصب کی اہل نہیں۔

سیاست اور خلفاء

سیاسی اور اجتماعی امور میں شریعت نے زیادہ تر توسعات کو سامنے رکھا ہے، کیونکہ سیاست ملکی تدابیر کے انصرام کا نام ہے اور تدبیر و وسائل تدبیر ہر دور کے مناسب حال الگ ہے، اس لیے شریعت نے اس کے اصول بیان کر دیے، مخصوص صورتوں پر زور نہیں دیا، اس بارے میں علماء دیوبند کا مسلک امارات شورائیت جیسی مہمات، تفصیلات کا عقلی اور نقلی نقشہ حکمتِ ولی اللہی میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے پیش فرما دیا ہے۔

ظاہر و باطن کے جامع

علماء دیوبند کا مسلک استدلال کے دائرے میں نصوص کے ساتھ ظاہر و باطن دونوں کو جمع رکھ کر دونوں ہی کا علمی حق ادا کرنا ہے کہ کوئی ایک پہلو نظر انداز نہ ہو، پھر اس جامع ظاہر و باطن مسلک سے ایسے جامع لوگ بنتے رہیں، جو عالم باللہ بھی اور عالم باسرار اللہ بھی ثابت ہوں، اس لیے

؎ علماء دیوبند کے ہاں استاد اور کتاب دونوں کی حاجت ہے، صرف کتاب کافی نہیں بدون صحبتِ مشائخ دین کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا، کورس تو صرف لفظ ہی سکھاتے ہیں، جب کہ آدمی آدمی بناتے ہیں۔

اس کا افادہ عمومی، ہمہ گیر اور نفع عام ہے۔

علمائے دیوبند کا نقطۂ آغاز

اگر دارالعلوم کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اسلاف اور مؤسسین صرف مدعیانِ مسلک ہی نہ تھے، بلکہ مسلک کا عملی نمونہ تھے، بالخصوص حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ مسلک کے ان نظری و عملی پہلوؤں کا مجسم پیکر تھے، اس کا کچھ نقشہ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ حضرت بانیٔ دارالعلومؒ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھ کر درس و تدریس اور تعلیم کا آغاز کرایا اور خود بھی چھتہ کی مسجد میں جو اس دارالعلوم کا نقطۂ آغاز ہے، درس شروع فرمایا۔

۲۔ یہ مسجد چھتہ جو دارالعلوم کا نقطۂ آغاز اور حضرت بانی قدس سرہٗ کی قیام گاہ تھی میں حضرتؒ نے حلقۂ ارشاد و تلقین قائم فرمایا، جس میں یہی اعضائے دارالعلوم شریک ہوتے اور حضرتؒ کے روحانی توجہ و تصرف سے ان کی باطنی تربیت کی جاتی تھی، اس لیے بانیؒ ہی کے عمل سے علمائے دیوبند کا دوسرا مقصد تربیتِ باطنی اور تزکیۂ نفس بھی مشخص ہوا۔

۳۔ اسی دارالعلوم میں حضرت بانیؒ نے محکمۂ قضا قائم فرما کر صدرالمدرسین دارالعلوم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کا قاضی مقرر فرمایا، جس سے ہزارہا اُلجھے ہوئے مقدمات شرعی انداز سے فیصل ہونے لگے اور اسلامی عدلیہ مسلمانوں کے قبضے میں آنے لگی جو حکومت کا ایک اساسی شعبہ ہے۔

۴۔ اسی دارالعلوم میں حضرت بانی قدس سرہٗ نے طلباء کو گتکا، بنوٹ اور لاٹھی چلانے کی مشقیں شروع کرائیں جس کا مقصد طلبہ میں فنِ سپہ گری اور مجاہدانہ اسپرٹ کو باقی رکھنا تھا، جو سیاست کا اساسی شعبہ ہے۔
مخالفین نے اس پر اعتراضات کیے کہ مدرسہ حربیہ ہو گیا، مگر حضرتؒ نے پرواہ نہ کی۔

۵۔ عیسائی مشنریوں، آریوں اور دوسرے فرقِ باطلہ کے اسلام کے بارے میں مشکوک انداز میں الزام تراشی اور متعصبانہ اعتراضات کے جواب میں جابجا مدافعانہ اور مناظرانہ تقریروں کا سلسلہ شروع فرمایا اور ساتھ ہی اصلاحی اور تبلیغی مواعظِ حسنہ کا بھی آغاز فرمایا۔

۶۔ حضرتؒ نے دیوبند کے شیوخ میں سنیت اور سنی مذاق رائج کرنے کی جد و جہد شروع فرمائی، کیونکہ یہاں شیوخ میں تفضیلیت کے اثرات رچے ہوئے تھے اگر وہ تقیہ نہ تھے۔

۷۔ حضرت بانیؒ نے آخری عمر میں خواہش ظاہر فرمائی کہ کاش! میں انگریزی پڑھتا اور مدعیانِ حکمتِ فرنگ کو یورپ جا کر بتلاتا کہ، حکمت وہ نہیں، جسے تم سمجھ رہے ہو، حکمت وہ ہے جو انبیاءؑ کے قلوب سے اُتر کر روشن سینوں میں اتری۔ والحمد للہ اس مقصد کے لیے دارالعلوم میں انگریزی و سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام کر دیا گیا ہے اور بانیؒ کی آرزو مستقل جامہ پہن رہی ہے۔

۸۔ حضرتؒ نے محققانہ اور مدافعانہ تحریرات کا خود بھی سلسلہ شروع فرمایا اور اپنے تلامذہ کو بھی تصنیف و تالیف کی طرف لگایا۔

۹۔ حضرت بانیؒ نے سلطان ترکی سے اپنی عقیدت و محبت کا رشتہ قائم رکھا اور ترکوں کی امداد کے لیے لاکھوں روپے چندہ جمع کیا اور ان کی مدح میں قصیدے لکھے۔

۱۰۔ دارالعلوم کے تمام تعلیمی و عملی کاموں کو مخالفتِ اغیار سے بچانے اور حکومتِ وقت کی امداد سے گریز کے لیے آٹھ اساسی اُصول وضع فرمائے جو الہامی معلوم ہوتے ہیں۔

تلك عشرة كاملة

پس مسلک علمائے دیوبند صرف نظری مسلک نہیں بلکہ عملی طور پر

ایک مستقل دعوت ہے جس کا رنگ تعلیمی ہے، پھیلاؤ تبلیغی ہے، جماؤ معاشرتی ہے، بچاؤ محکمۂ قضائی ہے، چڑھاؤ ریاضت سپہ گری ہے، ضبطِ نفس تربیتی ہے اور مدافعت مجاہدانہ ہے اور بین الاقوامیت حرمی ہے۔ اسی ہمہ گیر، جامع اور معتدل مزاج کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے دیوبندیت کے بارے میں ایک جامع اور بلیغ جملہ استعمال کیا تھا جو اس مسلک کی صحیح تصویر کھینچ دیتا ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ "یہ دیوبندی کیا کوئی فرقہ ہے"؟ کہا، نہیں

"ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے"۔

بہرحال اس جامعیت اصول و شخصیت سے پیدا شدہ امتزاج کا نام مسلکِ علماء دیوبند ہے۔ تمت بالخیر

مدحِ طیبؒ

از قلم جناب مولانا قاری عبدالعزیز صاحب شوق مرحوم و مغفور، صدر مدرس دارالعلوم الاسلامیہ پرانی انارکلی لاہور

طیب الصورت ہیں آپ اور طیب الاخلاق ہیں ‏ ‏ ‏ آپ اپنے نام کے ہر طور سے مصداق ہیں

آپ کی تحریر ہے رشکِ فنونِ سامری ‏ ‏ ‏ آپ کی تقریر میں اعجازِ نطق دلبری

آپ کا حسنِ عمل انموذج اسلاف ہے ‏ ‏ ‏ آپ کی ہستی یقیناً جامع الاوصاف ہے

ایشیا میں منفرد علم و عمل کی درسگاہ ‏ ‏ ‏ کہہ رہی ہے آپ ہیں اس دور میں ملت پناہ

آپ نے اس دور میں سمجھا ہے ملت کا مزاج ‏ ‏ ‏ آپ پر نازاں ہے روحِ قاسمؒ و محمودؒ آج

آپ ہیں بے شک وحید العصر اے والا جناب ‏ ‏ ‏ عالموں میں آپ کا ممکن نہیں کوئی جواب

آپ کا تقویٰ فرشتوںؑ سے فزوں پاتے ہیں ہم
آپ کے صدق و دیانت کی قسم کھاتے ہیں ہم

[illegible]

پروفیسر مولانا محمد اشرف، صدر شعبہ عربی، اسلامیہ کالج پشاور

اسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا آخری پیام تھا، جو پورے عالم کی ہدایت اور پوری انسانیت کی اصلاح وفلاح ونجات کے لیے آیا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی تھے اور رسول تھے، جن کے دائرۂ نبوت کو ہر زمان ومکان پر محیط اور ابدالاباد تک مستمر کر دیا گیا، نبی انور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کار رسالت کی ادائیگی اور اپنے دین کی دعوت وپیام کو تمام کرنے کے لیے جن فرائض نبوت سے نوازا، ان کا تذکرہ قرآن کریم نے کئی مقامات پر کیا ہے۔

سب سے پہلے اُمت مسلمہ کے مورث اول سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والتسلیم، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ربنا وابعث فیہم رسولا منہم یتلوا علیہم آیتک ویعلمہم الکتب والحکمۃ ویزکیہم، انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ۔ ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے، جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت، کامل الانتظام۔ (بیان القرآن از مولانا تھانویؒ)

دعائے خلیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی صورت میں قبول ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا احسان جتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولا من انفسہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتب والحکمۃ، وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (آل عمران)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور

اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب
اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ
قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

(بیان القرآن، از تھانویؒ)

دوسری جگہ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم
یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم
ویعلمھم الکتب والحکمۃ و ان
کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔

(الجمعۃ-۱)

وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور ان کو (عقائد باطلہ، اخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

(بیان القرآن، تھانویؒ)

یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا کام بحیثیت نبی کے یہ تھا کہ آپ لوگوں پر اللہ کی آیات پڑھ کر انھیں اللہ تعالیٰ کے دین اور احکام کی طرف بلائیں اور جو اس دعوت کو قبول کریں، انھیں قرآن کریم حکمت (یعنی ارشادات نبویؐ اور کتاب وسنت کی سمجھ فقہ و احکام و فرائض سے بہرہ مند فرمائیں اور اپنی صحبت اور تربیت سے ان کے نفوس و ارواح کو پاک فرمائیں، انھیں فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہد وجہاد و دعوت و ارشاد کے دیگر احکام مرحمت فرمائے گئے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

فلا تطع الکفرین وجاھدھم بہ
جھادا کبیرا (الفرقان-۵)

تو کافروں کا کہنا نہ مان اور بذریعہ قرآن کے تو اُن
سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

گویا جہاد بالقرآن وعلم کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر قرار دیا ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

یایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین
واغلظ علیھم (سورۂ توبہ۔ سورۂ تحریم)

اے نبی، کفار سے (بالسنان) اور منافقین سے
(باللسان) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

نبی انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا حق اُدا فرمایا اور عالم کو ہدایت سے بقعۂ نور بنادیا۔ اور امت کو نیابۃً یہ فرائض سونپ کر تشریف لے گئے اور ہر زمانہ میں نسلاً بعد نسل اُمت ان فرائض کو ادا کرتی رہی، کاشانۂ اسلام کی رونق انہیں فرائض سہ گانۂ نبوت کے لیے جد وجہد سے قائم تھی اور قرونِ اولیٰ سے لے کر اب تک دین کی سرسبزی و اشاعت انھیں فرائض کی بجا آوری کے لیے جہد وجہاد سے باقی و قائم رہی۔

غربت کدۂ ہند میں اسلام کے قدم صحابہ کے عہد سعادت میں پہنچ چکے تھے، غزنوی وغوری کے خانوادوں کی ترکتازیوں اور ایبک، والتمش کی معرکہ آرائیوں نے اقصائے ہند تک سلطنت اسلامیہ کا پرچم لہرا دیا تھا، دوسری طرف علماء وصوفیہ کرام کی کاوشوں نے ساکنان ہند کے لیے اسلام میں داخلے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسلام کے ظاہری و باطنی استیلاء کو خاندانِ مغلیہ کے بعض فرمانرواؤں کی غلط سیاست و اقدامات سے زک پہنچی اور اسلام کا بڑھتا ہوا سیلاب تھم گیا۔ لیکن رحمت حق کو جوش آیا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے سیاسی کوتاہیوں کے مداوا کے لیے گیارھویں صدی ہجری میں قطبیت تشریعیہ کا مرکز زمین ہند کو قرار دیا اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی احمد سرہندی

نور اللہ مرقدہٗ سے ہدایت اور نیابت نبوت کا وہ کام لیا، جس کی مثال قرونِ متاخرہ میں نہیں ملتی۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دورۂ تجدید سے دین کی بقاء و فروغ و نیابت و فرائض رسالت کی بجا آوری انہیں کے منتسبین کے سپرد رہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند بھی اسی سلسلے کی وہ سنہری کڑی ہے جسے من حیث الجماعت فرائض سرکارِ نبوت کی ادائیگی اور جہد و جہاد فی سبیل اللہ کی سعادت اور تصلب دینی اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، اشاعت اسلام اور رد بدعات کی دولت نصیب ہوئی، کفر و استعمار کے مقابلہ میں دیوبند ایک عظیم قلعہ ثابت ہوا اور گزشتہ ایک سو سال سے دیوبند میراث نبوت کا حامل و امین اور داعی ہے، جو نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہمہ جہتی، فرائض نبوت کا وارث، دعوت و ارشاد، جہد و جہاد، حفاظت علوم رسالت، تعلیم و دعوت کتاب و سنت، تدریس و اشاعت فقہ و کلام تزکیۂ قلوب و تربیت و تصفیۂ نفوس کا علمبردار ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو بزبانِ "قاسم العلوم والخیرات" "دوام الفرل والنزایغ" کہا جا سکتا ہے جس کے فیوض عامہ سے بحمد اللہ تعالیٰ نہ صرف پورا ہند و پاک سیراب ہے، بلکہ اس کا سایۂ برکت نور اور ظل سعادت و رحمت اقصائے عالم پر پھیلا ہے۔ ذالك من فضل الله علينا وعلى الناس ولكن اكثر الناس لا يشكرون۔

اور یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور بانیان دارالعلوم کا اخلاص و تقویٰ ہے جس نے اس شجرۂ طیبہ کو

اصلها ثابت وفرعها فی السماء
تؤتی اکلها کل حین باذن
ربها (ابراہیم ۲۴) ——— ترجمہ: جس کی
جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں
جا رہی ہوں، وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا
ہے۔۔ (بیان القرآن حضرت تھانوی) کا مصداق بنا

دیا ہے۔ ؎ کعبہ را ہر دم تجلی می فزود
زانکہ از اخلاصات ابراہیم بود

فقیر کے نزدیک دارالعلوم نرا ایک جامعہ، درسگاہ یا مرکز تعلیم و تربیت نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک و دعوت و مدرسۂ فکر ہے۔ آج دیوبندیت کا اطلاق نہ صرف دارالعلوم دیوبند پر ہوتا ہے، بلکہ وہ تمام مدارس و ادارے جو دیوبند کے رنگ میں رنگ چکے ہیں اور مسلک دیوبند کے ترجمان بن چکے ہیں انہیں دارالعلوم دیوبند کی شاخ قرار دیا جائے گا۔ اس اعتبار سے دیوبندی مدرسہ فکر کے دائرہ میں سہارنپور و ڈابھیل، دہلی و میرٹھ، کراچی و لاہور، ملتان و پشاور ساہیوال، اکوڑہ و ٹنڈو اللہ یار اور ہند و پاک کے دیگر بے شمار ادارے و مدارس آجاتے ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

جس طرح درخت کا اپنی جڑ کی مضبوطی و استواری پر انحصار ہوتا ہے اور وہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح کوئی دینی ادارہ اور جماعت اپنے بانیوں کے اخلاص و تقویٰ کے بقدر پھلتا پھولتا اور قائم رہتا ہے اور اس کے تربیت یافتہ افراد سے اس کی کارکردگی، کمال و خوبی کا اندازہ ہوتا ہے، اس معیار پر جب ہم دارالعلوم دیوبند کو جانچتے ہیں، تو اس کی بنیادوں کو اٹھانے والی وہ قدسی الصفات ہستیاں دکھائی دیتی ہیں، جن کی پیشانیاں علم، تقویٰ، زہد و قناعت، للٰہیت و تعلق مع اللہ، محبت الٰہی، خشیت الٰہی، حب للہ، بغض فی اللہ کے نور سے چمکتی تھیں، جو سنت کے کمالِ اتباع کے ساتھ متصف، حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے، دین کی محبت و حفاظت کے نشے سے سرشار اور کفر و ضلالت، الحاد و معصیت کے ہر ذرہ سے بیزار تھے، جو اسلام کی فلاح جان کی بازی لگاتے ہوئے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے عملی میدانوں میں سرگرم رہ چکے تھے، جو دنیاوی جاہ و منصب مال و دولت، عزت و شہرت، نام و نمود، ذاتی آرام و آسائش سے کنارہ کش اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ میں مگن ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین کا پیکر تھے۔ اگر ان کے ظاہری اعمال و کردار

احکامِ الٰہی اور سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین تھے، تو ان کے سینے علومِ نبوۃ سے معمور، اور ان کے دل معرفتِ الٰہیہ، حبِ الٰہی اور حبِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے منور تھے، گویا ان کے ظاہر و باطنی اعمال سیرتِ طیبہ محمدیہ علیٰ صاحبہا العلیٰ والتحیہ کے انوار کا آئینہ، ہدایتِ الٰہیہ کا گنجینہ اور فیوضِ نبویہ کا خزینہ تھے۔ فیضانِ نبوتِ محمدیہ کے ظاہری و باطنی سوتوں سے ان کی ذواتِ عالیہ سیراب اور منہاجِ نبوت پر استقامت ان کا امتیاز تھا، وہ ظاہر و باطن کے جامع علم و عمل کے سنگم، مدرسیت و خانقاہیت کی یکجائی کے مظہر، مرج البحرین یلتقیان، معقولات و منقولات کے بیک وقت بحرِ زخار، رات کو عابدِ شب زندہ دار، دن کو فارج حق میں تیغ آب دار، تدریسِ علوم کے وقت ان سے تعلیم الکتاب والحکمۃ کی جلوہ ریزیاں نمایاں اور تربیتِ نفوس کے وقت "یزکیہم" کی نور افزائیاں ہویدا تھیں، گویا ان میں سے ہر ایک بیک وقت کمالاتِ دینی کا مجمع البحار تھا، دورِ آخر میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین حق کی یہ جماعت اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان باطنی و ظاہری پاکر بقدرِ ظرف و استعداد ان قرآنی آیات کی مصداق تھی۔

محمد رسول اللہ ، والذین معہ اشداء
علی الکفار رحماء بینہم تراہم
رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ
و رضوانا ، سیماہم فی وجوہہم
من اثر السجود (الفتح۔۴)

• محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں اور کبھی سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں، ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ (ترجمہ از بیان القرآن)

دارالعلوم دیوبند کے مورثِ اعلیٰ حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور خانوادہ دہلی کے وکر شموس بازغہ کا تذکرہ سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اسی طرح دیوبند کے جدِ رُوحانی شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ پچھلے دور میں ہدایتِ ربانی، سلوکِ صمدانی کے لیے کھلی امدادِ الٰہی اور اللہ کی نشانی تھے، دگر سلاسل حقہ سے انکار نہیں لیکن پچھلی ایک صدی میں وراثتِ نبوت کی تقسیم اور تصرف و سلوک اور اصلاحِ باطنی کا کام ان کے سلسلے سے جو لیا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سلسلہ ملاءِ اعلیٰ کی توجہات کا خاص مرکز ہے اور ان کی نسبت کا شیوع اپنے سایۂ رحمت میں اقصائے عالم کو لیے ہوئے ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز بانیانِ دیوبند کے مُرشد اور اس باطنی رُوح کے منبع ہیں جو قالبِ دیوبند کی جان ہے۔

اعلیحضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور بانیانِ دارالعلوم کا ذکر باعثِ برکت ہوتا، لیکن یہ مجال تطویل کا متحمل نہیں ہوسکتا اور تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں صرف آسمانِ دیوبند کے مہر و ماہ قطب الارشاد حضرت علامہ رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ معدن کی اصالت کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

اولاً، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تحریر تبرکاً نقل کرتا ہوں۔ شیخ سے بڑھ کر اپنے مریدوں کے حالات کا جاننے والا کون ہوسکتا ہے۔

• فقیر کی طرف سے مشتہر کرا دو کہ مولوی رشید احمد صاحب عالمِ ربانی، فاضل حقانی ہیں، سلف صالحین کا نمونہ ہیں، جامع بین الشریعۃ والطریقۃ ہیں، شب و روز خدا اور اس کے رسول کی رضامندی میں مشغول رہتے ہیں۔ حدیث شریف پڑھانے کا شغل رکھتے ہیں، مولانا مولوی محمد اسحاق صاحب

کے بعد میں اس قسم کا فیض علم دین کا مولوی صاحب سے جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں مولوی صاحب ایک فرد واحد ہیں، مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی مولوی صاحب سے ہوتی ہے۔ ہر سال میں پچاس آدمی کے قریب علم حدیث پڑھ کر مولوی صاحب سے سند لیتے ہیں اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں محو ہیں، محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق خداوندی میں مستغرق ہیں، حق گو ہیں۔ لا یخافون لومة لائم کے مصداق ہیں خدا کے اوپر پورے طور سے توکل رکھتے ہیں، بدعات سے پورے طور سے مجتنب ہیں، اشاعت سنت ان کا پیشہ ہے، بدعقیدوں کو خوش عقیدہ بنانا ان کا حرفہ ہے ان کی صحبت اہل اسلام کے واسطے کیمیا اور اکسیر اعظم ہے ان کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آتا ہے، یہی اللہ والوں کی علامت ہے۔ متقی اور تارک الدنیا ہیں راغب الی الآخرة اور تصوف اور سلوک میں کامل ہیں امیر و غریب ان کے نزدیک یکساں ہیں، سب کی طرف توجہ برابر ہے لا طمع ہیں، فقیر نے جو کچھ ان کی شان میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے، وہ حق ہے اور وہ یہ ہے ـــــ

(نیز ہر کس کہ ازیں سیرت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند۔ اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من و من بمقام اوشاں شدم و صحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زماں نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند)

ترجمہ: (جو شخص اس فقیر سے محبت، عقیدت، ارادت رکھے، مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو کہ تمام کمالات ظاہری و باطنی ان میں موجود ہیں مجھ راقم کی جگہ سمجھے، بلکہ مجھ سے بھی فائق فی المدارج جانے، اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہو گیا کہ میں ان کی جگہ اور وہ میری جگہ ہو گئے اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھے کہ اس زمانے میں ایسے آدمی نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیضیاب ہوتا رہے۔)

اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر ان کو اپنے واسطے ذریعہ نجات کا سمجھتا ہے اور میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے، وہ میرا دل دکھاتا ہے، میرے دو بازو ہیں، ایک مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم اور دوسرا مولوی رشید احمد صاحب۔ ایک جو باقی ہے، اس کو بھی نظر لگاتے ہیں، میرا اور مولوی صاحب کا ایک عقیدہ ہے، میں بھی بدعات کو برا سمجھتا ہوں، جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے، وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسول کا مخالف ہے ـــــ

اسی اللامر کے آخر میں فرماتے ہیں: "اور میں چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب کی نسبت مجھے کوئی کلمہ بے ادبی کا نہ سنا دے اور نہ تحریر کرے، مجھ کو ان امور سے سخت ایذا ہوتی ہے، عجیب بات ہے کہ میرے لخت جگر کو ایذا پہنچائیں اور اپنے آپ کو میرا دوست سمجھیں، ہرگز نہیں، مولوی صاحب سچے حنفی اہل سنت

صوفی المشرب، باخدا ولی کامل ہیں، ان کی زیارت کو غنیمت
سمجھیں۔ دستخط: امداد اللہ کہ منظلہ

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ (سوانح علماء حق و
علماء سو، صفحہ نمبر ۴، تا ۶)

سرسید — (بانی تحریک مدرسہ علیگڑھ) نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رح کے وصال پر علیگڑھ انسٹیٹوٹ میں جو مضمون لکھا، حضرت کے علم و تقوے ایک ایسے معاصر کی شہادت ہے، جو کئی مسائل و عقائد میں ان سے اختلاف رکھتا تھا اس لیے اس سے قوی شہادت دوسری نہیں ہو سکتی۔

"افسوس ہے، کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے، اور آئندہ بھی بہتوں کو روتے گا، لیکن ایسے شخص کے لیے رونا، جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے، لوگوں کا خیال تھا کہ بعد مولوی محمد اسحٰق صاحب کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونیوالا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقوے اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا۔ کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ، بہت لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقوے اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے۔ ویسے ہی نیک بختی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، ان کو جناب مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ درجے کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند سنت و شریعت تھے اور لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا، انھیں کی کوششوں سے علوم دینیہ کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند قائم ہوا اور نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے، وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے، لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً شمال مغربی اضلاع میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ میں ہے ہم مولوی محمد قاسم صاحب کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو

خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح بتقاضائے نفسانی، بغض اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام جس قدر کرتے تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا، صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنی ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے، یا بری بات کرتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم صاحب اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحق صاحب سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہو جانا، ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے، افسوس کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کام کرے، زبانی عقیدت و ارادت بہت زیادہ کرتی ہے ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس سے کہہ کر خاموش ہو جائیں، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرے کو صاف کر لیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے۔ اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ قائم اور مستقل رہے۔ اور اس کے ذریعے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔"

• علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص ۴۶۷ - ۴۶۸

منقول از رسالہ دارالعلوم بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ (از مراسلہ علماء حق وعلماء سوء۔ صفحہ نمبر ۷۷ تا ۸۰)

صاحب نزہۃ الخواطر نے حضرت الشیخ گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے بارے میں جو لکھا ہے قابل دید ہے:۔

الشيخ الامام العلامة المحدث رشيد احمد ..... احد العلماء المحققين والفضلاء المدققين. لم يكن مثله في زمانه في الصدق والعفاف والتوكل والتفقه والشهامة، والاقدام في المخاطر والصلابة في الدين والتشدد في المذهب .... وكان اية باهرة ونعمة ظاهرة في التقوى، واتباع السنة النبوية والعمل بالعزيمة والاستقامة على الشريعة ورفض البدع ومحدثات الامور ومحاربتها بكل طريق والحرص على نشر السنة واعلاء شعائر الاسلام والصدع بالحق وبيان الحكم

الشرعی، ثم لا یبالی بما یتقاول فیہ الناس لا یقبل تحریفا، ولا یتحمل منکرا ولا یعرف المحاباۃ والمداھنۃ فی الدین مع ما طبعہ اللہ علیہ من التواضع والرفق واللین دائرا مع الحق حیث ما دار... یرجع عن قولہ اذا تبین لہ الصواب، انتھت الیہ الامامۃ فی العلم والعمل ورئاسۃ تربیۃ المریدین وتزکیۃ النفوس والدعاء الی اللہ واحیاء السنۃ واماتۃ البدع وقد رزقہ اللہ من التلامیذ والخلفاء ما یندر وجود امثالھم فی ھذا العصر فی الاستقامۃ علی الدین، واتباع الشریعۃ الغراء، ونشر العلم النافع واحیاء السنن واصلاح المسلمین ونفع بھم خلائق (لا) تحصی بعد وعد

(نزہۃ الخواطر ص ۱۴۹، ۱۵۱ ج ۸)

(ترجمہ) حضرت شیخ امام، علامہ محدث رشید احمد گنگوہی ... محققین علماء اور مدققین فضلاء میں سے ہیں، آپ صدق وعفت، توکل وتفقہ، تیز فہمی اور خطرات کا سامنا کرنے میں، دین میں مضبوطی اور مذہب میں سخت ہونے میں لاثانی تھے۔ آپ تقوائے اتباع سنت نبوی میں اور عزیمت پر عمل کرنے میں، شریعت پر استقامت میں اور ہر طریقے سے بدعات کو مٹانے میں، سنت کی اشاعت میں اور شعائر اسلام کے بلند کرنے کے لیے حریص ہونے میں اور حق کو واضح کرنے میں اور شرعی حکم کے بیان کرنے میں ایک روشن نشانی اور ایک ظاہر نعمت تھے۔ آپ لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے، نہ کسی تحریف کو قبول کرتے اور نہ کسی منکر کو برداشت کرتے، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طبیعت میں تواضع ونرمی کو ودیعت کیا تھا۔ آپ دین کے بارے میں کسی قسم کی جانبداری اور مداہنت کو نہیں جانتے تھے، جدھر کو حق ہوتا تھا آپ اس کے ساتھ ہوتے۔ آپ پر علم وعمل، مریدین کی تربیت، نفوس کا تزکیہ کرنے، اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے، سنت کو زندہ کرنے اور بدعات کو مٹانے کی ریاست وامامت ختم تھی (یعنی آپ جملہ امور میں امام وقت اور رئیس الملت تھے۔) آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے شاگرد اور خلفاء بخشے تھے کہ اس زمانے میں دین پر استقامت، روشن شریعت کی اتباع علم نافع کے پھیلانے، سنن کو زندہ کرنے اور مسلمانوں کی اصلاح کرنے میں ان جیسوں کا وجود نادر ہے، ان کے ذریعے خلائق کو اتنا نفع پہنچا کہ جس کا کوئی حساب وشمار نہیں۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، نمونہ اس کا کچھ درج کرتا ہوں:

"الشیخ الامام العالم الکبیر قاسم بن اسد علی الصدیقی النانوتوی احد العلماء الربانیین .... وکان ازھد الناس واعبدھم واکثرھم ذکرا ومراقبۃ وابعدھم عن زی العلماء ولبس المتفقھۃ من العمامۃ والطیلسان وغیرھما، وکان فی ذلک الزمان لا یفتی ولا یذکر بل یشتغل فی ذکر اللہ سبحانہ ومراقبتہ حتی فتحت علیہ ابواب الحقائق والمعارف فاستخلفہ الشیخ امداد اللہ المذکور ومدحہ بان مثل القاسم لا یوجد الا فی العصر السالف. (ص ۳۰۳/ ج ۷)

ترجمہ: حضرت شیخ، امام، عالم کبیر قاسم بن اسد علی صدیقی نانوتوی ربانی علماء میں سے ہیں، آپ لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد، عبادت گزار، بکثرت ذکر و مراقبہ کرنے والے اور علماء کی طرح لباس عمامہ چادر وغیرہ پہننے سے دور

بھاگنے والے تھے۔ اس زمانے میں آپ نہ فتوے دیتے تھے اور نہ وعظ کرتے تھے، بلکہ اللہ سبحانہٗ کے ذکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے، حتیٰ کہ آپ پر حقائق و معانی کے دروازے کھلے اور حضرت شیخ امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خلافت سپرد کی اور آپ کی مدح فرمائی کہ قاسم جیسا شخص سوائے زمانۂ سلف کے کہیں نہیں پایا جاتا۔

محدث کبیر حضرۃ الاستاذ علامہ سید محمد یوسف البنوری دظلہ نے لامع الدراری کے مقدمہ میں "بیان ما لاهل الهند من الخدمة" کے زیر عنوان ایک عجیب اور اچھوتی بحث میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ:

بل هو الذي جمع مع علوم العرفاء ارباب
القلوب علوم المحدثين وارباب الظواهر
واستبحار مدهش في علوم الرواية ورقة
مدهشة في فنون الدراية علوم ناضجة
وافكار ثاقبة وانوار من الغيب معه
ساطعة، وعلى بصيرة اقول: ان الله
سبحانه وتعالى خلق شخصا من
شخصين احدهما جمع بين اشتات
علوم الظاهر روايتها ودرايتها، منقولها
ومعقولها، وهو الحافظ ابن تيمية
الحراني وذلك البحر المندفق الذخار
والآخر جمع بين الحقائق الالهيه
وعلوم العارفين الربانية مع حظ وافر
من علوم الظاهر وعلوم غريبة من
العلوم الدقيقة، وهو الشيخ الاكبر
الاندلسي محي الدين ابن العربي جمع
من هذين الشخصين العظيمين
شخصية كبيرة بارزة وهو الشيخ
الحجة عبد العزيز الدهلوي لا يقوم
بمثله الا افراد من الأمة الافذاذ، فكان
الحجة الدهلوي نظير اولئك الافذاذ
والجهابذة۔

ترجمہ: آپ وہ شخص ہیں کہ جو اہلِ دل عارفین کے علوم کے ساتھ ساتھ محدثین اور اہل ظواہر کے علوم کے بھی جامع ہیں اور جو علوم روایت کے ساتھ حیران کن تبحر کے ساتھ ساتھ فنونِ درایت میں بھی حیرت زا مہارت کے جامع ہیں، راسخ علوم اور روشن افکار کے ساتھ ساتھ غیب کے روشن و ظاہر انوار کے بھی جامع ہیں اور میں بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے دو شخصوں سے ایک شخص کو بنایا ان میں سے ایک شخص گوناں گوں ظاہری علوم اور ان کی روایت و درایت اور منقول و معقول کے جامع ہیں اور وہ شخص حافظ ابن تیمیہ حرانی ہیں، جو کہ ایک بحر ناپیدا کنار ہیں اور دوسرے وہ جو ظاہری علوم کے ایک حصۂ وافر سے بہرہ مند اور دقیق علوم میں سے عجیب عجیب علوم سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق الٰہیہ اور عارفین کے ربانی علوم کے بھی جامع ہیں، وہ شیخ اکبر اندلسی محی الدین ابن عربی ہیں، ان دو بڑی ہستیوں سے ایک دوسری بڑی ہستی بنائی گئی اور وہ حضرۃ شیخ الحجۃ عبدالعزیز دہلوی کی ذات گرامی ہے ..... ایسا کام اُمت کے چند نادر افراد کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اور حضرت شیخ و حجۃ دہلوی ان ہی چند نادر ہستیوں کے نظیر تھے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

وورث علوم الشيخ عبد العزيز الدهلوي
عالمان جليلان: الامام الحجة محمد
قاسم النانوتوي والمحدث الفقيه
الحجة الشيخ احمد الگنگوهي. بيد

انہ غلب علی النانوتوی علوم المتکلمین وعلوم الحقائق وغلب علی الشیخ الکنکوہی علوم الفقہاء وعلوم السنۃ، مع حظ وافر بین الجانبین، ولکن اصبحت جہۃ الحقائق مغلوبۃ فی واحد، کما ان جہۃ علوم الفقہاء مغلوبۃ فی الآخر، شبہ ضئیل لانقسام علوم النبوۃ وکمالاتہا فی الخلفاء الراشدین

.... فکان المحدث فقیہ ہذہ العصر ... الشیخ رشید احمد الکنکوہی الانصاری رحمہ اللہ جمع مع العلوم الرائجۃ علوم ارباب القلوب ووہب نورانی القلب یلمع بہ ما اظلم علی الناس فکان یأتی بتوجیہات فی المشکلات الفقہ ومعضلات الحدیث ماخلت عنہا الاسفار الضخمۃ والمجلدات الکبیر وکان موفقا طیلۃ حیاتہ المبارکۃ لدرس الامہات الست طول النہار غیر فترۃ قلیلۃ فی البین وبقی نصف قرن یدرس الحدیث وکتب السنۃ لا یلحقہ ملل ولا ضجر ولا سامۃ ولا تعب مع اشتغالہ بتربیۃ النفوس وتربیۃ القلوب بالاذکار والتوجہ فکان نفسہ الزکیۃ تتجلی کل حین وہذا ماعدا افتاء فی النوازل والمسائل حیث کان مرجعا فی معضلات النوازل کما کان مرجعا للارشاد وتربیۃ النفوس وتدریس الصحاح الستۃ من الامہات.

(مقدمہ لامع الدراری ص ۵ تا ۸)

ترجمہ: اور حضرت شیخ عبدالعزیز دہلویؒ کے علوم کے وارث دو جلیل القدر عالم ہوئے۔ اور وہ حضرت امام وحجۃ محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت محدث و فقیہ وحجت، شیخ احمد گنگوہیؒ ہیں، ہاں دونوں اماموں کے بہر دونوں جانب سے بہرہ مند ہونے کے باوجود، حضرت نانوتوی پر متکلمین کے علوم اور حقائق کے علوم کا غلبہ ہے اور حضرت شیخ گنگوہیؒ پر فقہا کے علوم اور سنت کے علوم کا غلبہ ہے لیکن ایک میں حقائق کا پہلو مغلوب ہے، جب کہ دوسرے میں فقہا کے علوم کا پہلو مغلوب ہے اور یہ خلفائے راشدین کے ساتھ علوم نبوۃ اور اس کے کمالات کی تقسیم میں ادنیٰ سی مشابہت ہے۔

پس فقیہ زمانہ حاضرہ، حضرت محدث شیخ رشید احمد گنگوہیؒ انصاری رحمۃ اللہ علیہ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اہل دل کے علوم کے بھی جامع ہیں۔ اور انھوں نے دلوں کو ایسا نور بخشا جس سے لوگوں پر اندھیرا روشن ہوگیا۔ آپ فقہ اور حدیث کے مشکلات کی ایسی ایسی توجیہہ فرماتے کہ جن سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی خالی ہیں، آپ اپنی ساری مبارک عمر میں سارا سارا دن سوائے تھوڑے سے درمیانی وقفے کے صحاح ستہ کی درس و تدریس کی توفیق سے سرفراز رہے اور نصف صدی تک حدیث وکتب سنت کی اس طرح تدریس فرماتے رہے کہ جس سے نہ آپ کبھی شکستہ خاطر ہوئے اور نہ کبھی تھکے، باوجود اس کے کہ آپ کو ذکر کے ذریعے نفوس کی تربیت و قلوب کے تصفیہ اور توجہ کے ساتھ مشغولی ہوتی تھی پس آپ کا پاکیزہ نفس ہر وقت متجلی رہتا تھا اور یہ کام، حوادث مسائل میں افتاء کے علاوہ تھا۔ آپ جس طرح کہ ارشاد و تربیت نفوس اور صحاح ستہ کی درس و تدریس کے لیے مرجع خلائق تھے، اسی طرح آپ حوادث کے مشکل مسائل کے لیے بھی مرجع خلائق تھے۔

بانیان دیوبند میں سے صرف دو بزرگوں کے بارے میں چند آثار محض نمونہ کے لیے نقل کر دی گئیں، ورنہ این خانہ ہمہ آفتاب است۔ شاید اس بات میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ دیوبند جیسی مدرسہ نے پچھلے سو سال میں جس قدر عظیم دینی و روحانی شخصیتوں کو وجود بخشا، اس کی مثال ماضی قریب میں کسی دوسرے ادارے میں دکھائی نہیں دیتی، بقول حضرت علامہ مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ ہمیں دیوبند کا وہ دور یاد ہے کہ مہتمم سے لے کر ادنیٰ چپراسی تک صاحب نسبت بزرگ ہوتا تھا

از سر تا بقدم ہر کجا می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

دیوبند کی یہ بار آوری جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، ملاء اعلیٰ کے فیضان خاص اور بانیان مدرسہ کے اخلاص و تقویٰ کا نتیجہ تھی، وہاں نیابت نبوت کی اس جامعیت کا ثمرہ تھی، جو روز ازل سے ہی "دارالعلوم کے لیے مقدر تھی حقیقت یہ ہے کہ دین کا کوئی کام اس وقت تک استوار اور پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنا و نشو و نما منہاج نبوت کے مطابق نہ ہو اور وہ جامعیت نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کا پرتو و عکس اپنے میں لیے ہوئے نہ ہو اور عقائد و تعلیمات و اعمال نبویہ کا ظاہراً و باطناً آئینہ دار نہ ہو" اہل دیوبند پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ جامعیت کبریٰ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیۃ) کی نیابت کا شرف کامل انھیں میسر آیا، ان کے علوم ظاہر نے انھیں "باطنی روحانیت اور تزکیۂ نفس" کی نبوی صفت سے غافل نہیں ہونے دیا اور "باطن کا سوز و حقیقت" علوم ظاہرہ اسلامیہ میں رسوخ سے مانع نہیں ہوا، علوم عقلیہ کا حصول علوم نبویہ کی عظمت و فوقیت کو ماند نہ کر سکا۔ نہ یونانی علوم و دانش افرنگ انھیں مسحور کر سکی، بلکہ دائرۂ علوم نبوت کے باہر سے جو بات بھی آئی، وہ دین و علوم نبوت کی خادم بن کر آئی، جوش طریقت و محبت ہو، یا ہوش علوم و عقلیت، ہر بات شریعت مطہرہ کی تابع ہی رہی۔ نہ غلبۂ محبت نے سنت کی راہ مستقیم کو نگاہوں سے اوجھل ہونے دیا، نہ ہوش خرد نے حریم نبوت کے انوار و برکات سے محروم رکھا۔ حقیقتاً دیوبندیت کا طرۂ امتیاز و کمال اعتصام و تمسک بالکتاب والسنہ اور جادۂ اعتدال ہی ہے

در کفی جام شریعت در کفی سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں
دل سراپا جوش ہے، لیکن زباں خاموش ہے

بوعلی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

لیکن دیوبند کے "اولی الایدی والابصار" کے لیے یہ بحر ذخار بھی قدرت الٰہیہ نے پایاب کر دیا اور علم کی وسعت و رسوخ کے ساتھ اعمال صالحہ و تقویٰ کے نور نے بھی ان سے فروغ پایا، علم و عمل کے سوتے ان کی ذوات عالیہ سے یکجا بہتے رہے اور ظاہر و باطن کا جمال و کمال ان کی جلوت و خلوت کی آرائش رہا۔ اتباع نبوت کی برکت سے فریضۂ دعوت و ارشاد کی ادائیگی اور ہدایت خیر و برکت کا جو فیضان عام ان نفوس قدسیہ سے جاری و ساری رہا۔ اس سے انکار کی گنجائش ممکن نہیں، دین کی اس ہمہ جہتی اشتغال کے باوجود "دیوبند" نے رہبانیت کو اپنا کیش نہیں بنایا اور مسلمانان ہند و پاک کے جملہ سیاسی و معاشرتی میدانوں میں اس کی حیثیت متبوع و امام کی رہی بستیا کے خارزار میں خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا تحریک پاکستان یا آزادیٔ ہند، ہم ہر جگہ دیوبند کے اساطین کو پہلی صف کے رہنماؤں میں پاتے ہیں اور یہ دیوبند کی اس جامعیت کا ایک ادنیٰ نشان ہے، جو اس کے تمام کمالات و خدمات دینی کی بنیاد ہے کہ دین کا ہر کام "جامعیت محمدیہ" کا پرتو پا کر ہی مکمل ہوا کرتا ہے، ذلک تقدیر العزیز العلیم

مسلک دیوبند کی جامعیت پر اپنے دعوے کی بین دلیل کے طور پر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا مضمون نقل کرتا ہوں،

دارالعلوم کا مسلک — "علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت

مسلکاً اہل السنت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع و قیاس پر قائم ہے اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس کے یہاں کتاب و سنت کی مرادات اقوال سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں، اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔

وہ روایات کے مجموعے سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اسی طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں، اس لیے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا، جب تک کہ وہ قابل احتجاج ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف محسوس نہیں ہوتا، بلکہ سارے کا سارا دین تعارض و اختلاف سے مبرا ہو کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار اور بری ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں جزو ہی ہے، اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار و استغناء (علمی حیثیت سے) اور غنائے نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوئے۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلت نفس اور مسکنت میں گرفتار، وہ جہاں، علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے، وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور لاامتیازی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور کاحد من الناس بھی رہے، جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے، وہیں مجاہدانہ اور مغازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے، غرض علم و اخلاق خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی سے بڑا اثر دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کا امتیازی نشان بن گئی۔

جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لیے ان کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم کلام کی صداقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی، (محسن) اور حکیم و مربی ثابت ہوا، جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حیاء و انکسار کے ساتھ عدم مداہنت و رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت اور انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے۔ ادھر علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔ بنابریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں، یا فقہاء، صوفیاء ہوں، یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں، اس لیے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پروا ہو جانا

اس کا مسلک نہیں، اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے سرد شمال میں، سائبیریا سے لے کر جنوب میں، سماٹرا اور بغداد تک اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلادی، جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں، دُوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کبھی وقت بھی پہلو تہی نہیں کی حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی سرکردگی میں ان کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب، اور ان کے منتسبین و متوسلین کی مساعی انقلاب جہادی اقدامات اور حریت و استقلالِ ملکی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جاسکتی ہیں، نہ بھلائی جاسکتی ہیں جو لوگ ان حالات پر محض اس لیے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہ سرفروشی میں قبول نہیں کئے گئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا، اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لا یعبأ بہ اور قطعاً ناقابل التفات ہیں اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن حوائل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک حزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں، ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ وہ قابل التفات ہیں

ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور ان ہی متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلے میں آگے آتے رہے، خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا استخلاصِ وطن اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کی مخصوص شعار لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا۔ اس لیے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع علم و اخلاص، جامع مجاہدہ و جہاد جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال و قال ہے، اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے، اگر اصطلاحی الفاظ میں لیا جائے، تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل السنۃ والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسباً دیوبندی ہے (اس سلسلے میں چونکہ "مسلک دارالعلوم" کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے، اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لیے گئے ہیں تفصیلات کے لیے اس رسالے کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص۲۲۱ ص۲۲۳)

مباحث بالا سے یہ بات واضح ہے کہ دیوبندی مدرسۂ فکر جامعیت

کبریٰ محمدیہ کا وارث اور سہ گانہ نبوت کا نائب امین و داعی ہے، دیوبندیت کی تشکیل جن پُرنور و مبارک بنیادوں پر ہوئی اور منہاجِ نبوت کا جو عظیم ورثہ اسے میسر آیا، اس کی وجہ سے دیوبندیت کا ہیولیٰ قرآن و سنت کی سلف صالحین کے محتاط رنگ میں تشریح، فقہ حنفی کی محدثانہ طرز میں توضیح، سلوک و تصوف کی طریق نبوت و شریعت کے مطابق تصریح اور معارف و حقائق دینی کی حکیمانہ پیش کش، توحید خالص اتباع سنت، حبِ الٰہی، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ اہلِ سلاسل، حقانی علماء و صوفیہ کے احترام سے وجود میں آیا، غیرتِ ایمانی نے احقاقِ حق، ابطالِ باطل، اشاعتِ دین، حفاظتِ ناموسِ رسالت، ردِ بدعات اور حریت و جہاد کا جذبہ بخشا، دیوبندیت کے ان بنیادی جواہر کی بنا پر دیوبند نے جن اعاظم رجال اور اساطین علم و عمل اور نفوس قدسیہ کو وجود بخشا، قرون متاخرہ میں اس کی مثال شاذ ہے، بیسیوں ایسی ہستیوں کے نام بے تکلف لیے جا سکتے ہیں جس میں ہر ایک بذاتِ خود جامع علم، دائرہ فضیلت، مجمع الفضائل اور اپنی ذات میں انجمن بلکہ اُمت تھی، علوم و فنون کی ریاست و امامت انہیں زیبا تھی، ورع و تقوے نے ان سے زینت پائی تھی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ، حضرت امام العصر علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ روحہ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حکیم الاُمت مجدد الملت اشرف علی تھانوی اعلی اللہ مقامہ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ، رئیس الاتقیاء محبوب ملت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، امام المبلغین حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔۔ فقیہ الامت حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، محدث کبیر حضرت مولانا علامہ ظفر احمد عثمانی، استاذ العلماء مولانا رسول خان صاحبؒ، مفتی دیوبند مولانا عزیز الرحمن صاحبؒ عثمانی، متکلم وقت حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، ادیب شہیر حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری نور اللہ مراقدہم، کس کس کا نام لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے، ہر فرد ممتاز اور اپنے رنگ میں یگانہ ہے۔

اس وقت بھی دیوبندی مدرسہ فکر کے اکابر میں بقیۃ السلف فخر العصر مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع دیوبندی، محدث کبیر علامہ محمد یوسف البنوری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک وغیرہم علم و دین کی مایہ ناز شخصیتیں ہیں استقصاء احتراز مقصود نہیں، چند نام جو زبانِ قلم پر آ گئے۔ لکھوائے گئے۔۔ ورنہ ہمارے لیے ان میں کا ہر شخص قابلِ صد عزت و احترام ہے۔

دیوبندی مدرسہ فکر کی یہی جامعیت اور نیابت محمدیہ کی برکت تھی کہ علوم نبوت کی جو تعلیم و تدریس و اشاعت و دعوت اور اس کے مطابق تربیت اور تزکیہ اس طبقہ کے حضرات سے ہوا۔ اس کی مثال قرون متاخرہ میں شاذ ہی ملے گی، اگر ایک طرف تعلیم کے رُخ سے احادیث مبارکہ کا تداول اور چلن اور صحاح ستہ بلکہ دیگر بعض کتب احادیث کا دورہ بستی بستی۔ قریہ قریہ پھیل گیا قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کا ذوق گھر گھر پہنچا۔ احناف کی فقہی مستند کتابوں کا چلن ہر مدرسہ کی ضرورت ٹھہرا۔ علوم عقلیہ درس نظامی کا جزو قرار دیکر ہر مدرسہ میں جاری ہوئے تو دوسری طرف اکابر دیوبند کے سلاسل سلوک نہ صرف برکوچک ہند و پاکستان بلکہ اقصائے عالم میں پھیل گئے، اور اگر یوں کہا جائے کہ سلسلہ مبارکہ امدادیہ کی وہ شاخیں جو قطب الارشاد حضرت رشید احمد گنگوہیؒ قاسم العلوم والخیرات مولانا نانوتویؒ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر دیوبند کے ذریعے سے پھیلیں، آج ان کی وسعت، ہمہ گیری، اثر انگیزی اور اثر پذیری روز روشن کی طرح عیاں ہے، جس کی عصر حاضر میں نظیر نہیں ملتی، یا یوں کہیئے کہ یہ شجرِ طوبیٰ آج پورے عالم پر محیط اور تزکیہ نبوت کے سنت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی طرح تبلیغ و دعوت کے عمومی مراکز وعظ و خطبات کی مجالس کے علاوہ عرف شاہ محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منسوب جماعت تبلیغ کی تاثیر و قبولیت مشرق و مغرب عرب و عجم کو اپنے آغوشِ کشش میں لیے ہوئے ہے۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

تیسری طرف علوم دینیہ کے تصنیف و تالیف کی کثرت، فضلائے دیوبند کے حصے میں جس طرح آئی اور جس کثرت سے علمائے دیوبند نے ہر نوع کے علوم دینیہ پر تصنیف و تالیف کے انبار لگا دیئے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ترجمہ اور تفسیر حدیث اور علوم حدیث، فقہ و فتاوٰی، علم کلام اور رد فرق باطلہ، تاریخ و سیر ہر عنوان پر اکابر و اصاغر دیوبند کی مستند کتابیں مل جائیں گی، صرف حضرت تھانویؒ تصنیف و تالیف کا وہ بے پایاں دفتر و کتب خانہ تالیف فرما گئے کہ ایک شخص کیا، بڑی بڑی اکاڈمیاں اس کے مرتب کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ایک ہزار سے اُوپر کتابیں جو بیس ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے مواعظ اور مکتوبات کا سلسلہ اس کے علاوہ ہے، دیگر کئی بزرگوں کی کتابیں مثلاً مفتی محمد شفیع، قاری محمد طیب، مولانا ادریس کاندھلویؒ، سو سے متجاوز ہو چکی ہیں، کوئی فن کوئی مسئلہ جدید ہو یا قدیم شاید ایسا ہی رہا ہو جس پر علماء دیوبند نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ تراجم میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ، حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے تراجم بے نظیر ہونے کے علاوہ ہر مسلمان کے گھر کی زینت ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ قرآنی، مفتی محمد شفیع صاحب کی معارف القرآن اور دیگر علمائے دیوبند کی قرآنی خدمات سے خلق کثیر مستفید ہو چکی ہے، جہاں تک احادیث مبارکہ کی اُردو میں خدمت کا تعلق ہے، مولانا منظور نعمانی کی معارف الحدیث، مولانا بدر عالم کی ترجمان السنہ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کا سلسلہ فضائل اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے دائرے میں خوب مقبول ہوا، بلکہ حضرت تھانوی کے بہشتی زیور کی طرح حضرت شیخ کی کتب فضائل سے شاید ہی کوئی گھر خالی ہو۔ فتاوٰی میں فتاوٰی رشیدیہ، فتاوٰی دیوبند اور فتاوٰی امدادیہ، دیوبند کی فقہی عظمت کا شاہکار ہیں، سلوک و تصوف کے بارے تصانیف کا جو سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہؒ سے شروع ہوا تھا، وہ حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر دیوبند کی تصانیف سے ایک بحر ناپیدا کنار بن چکا ہے جس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی، حضرات جنید و شبلی و بسطامی و جیلانی قدس اللہ اسرارہم کے علوم، غزالیؒ و رازیؒ، قشیریؒ، رومیؒ کے حکمت و معارف کو جس نے اس دور میں دیکھنا ہو، انہیں ان اکابر کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جدید مسائل اور ضروریات کے بارے میں بھی دیوبندی مکتبۂ فکر کی ہر نوع کی کتابیں ہمیں میسر آسکتی ہیں، متکلم وقت مناظر احسن گیلانی نے اپنے خاص رنگ میں جو جدید فتنوں کے بارے میں قلم اٹھایا ہے، وہ بے مثل اور اثر انگیزی میں اپنی نظیر آپ ہے، مجلس علمی ڈابھیل اور کراچی، ندوۃ المصنفین دہلی اور اسی نوع کی متعدد دیگر مجالس کی علم و دین کی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے، غرض علمی میدان میں ہر رُخ اور ہر ضرورت کے مطابق علمائے دیوبند نے اپنی علمی کاوشوں سے دین کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے، جہاں تک حدیث کی عربی میں خدمت کا تعلق ہے، پورے عالم اسلامی میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صحاح ستہ کے متعدد عربی میں حواشی، ان پر تقاریر کے علاوہ مستقل شرح کتب حدیث علماء ہند و پاک کا امتیاز ہے، یہاں تک کہ علامہ رشید رضا مصری کو مفتاح کنوز السنۃ کے مقدمہ میں لکھنا پڑا۔

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الهند
بعلوم الحدیث فی هذه العصر
لقضی علیها بالزوال۔

ترجمہ: اگر ہمارے برادران، علماء ہندوستان نے اس زمانہ میں علوم حدیث پر توجہ نہ کی ہوتی، تو اس علم کے زوال کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

بخاری کی شرح فیض الباری (حضرت مولانا انور شاہ کشمیری)، لامع الدراری (حضرت شیخ علامہ زکریا سہارنپوری)، فتح الملہم شرح مسلم (شبیر احمد عثمانی)، معارف السنن، شرح جامع ترمذی (علامہ محمد یوسف بنوری)، بذل المجہود شرح ابوداؤد (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری)، امانی الاحبار شرح معانی الآثار طحاوی (مولانا محمد یوسف کاندھلوی)، اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک (حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپوری)، التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (مولانا ادریس کاندھلوی)، اعلاء السنن (حضرت ظفر احمد عثمانی) وغیرہ دیوبندی مدرسہ فکر

کی وُہ خدماتِ جلیلہ ہیں جنکی مثال اس دور میں دُوسرے اسلامی ممالک بھی پیش نہیں کر سکتے۔

دیوبندی مدرسۂ فکر کے اصُول و فروع کا مسلک حنفی ہے۔ اسلیے کتب حدیث کی شروح میں فقہ حنفی پر بحث و استدلال کرتے ہوئے ——— فقہ حنفی کی ایک خاص نوع و طرز سے خدمت ہو گئی ہے کہ مذہب حنفی کے دلائل کو احادیث مبارکہ سے اس طرح مبرہن کر دیا گیا ہے کہ فقہی لحاظ سے اقرب الی السنۃ حنفی مذہب ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حنفیہ کے مفتی بہا مسائل سب احادیث مبارکہ کے مطابق اور ان سے مستفاد ہیں، گویا دیوبندی مدرسۂ فکر کی ان کاوشوں سے حدیث و فقہ کی خاص خدمت کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ مکاشفہ ایک حد تک پُورا ہو گیا، جسے انھوں نے فیوض الحرمین میں لکھا ہے:

عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذھب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھو اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ وذلک ان یؤخذ من اقوال الثلاثۃ قول اقربھم بھا فی المسئلۃ ثم بعد ذلک یتبع اختیارات الفقہاء الحنفیین الذین کانوا من اھل الحدیث فرب شیئ سکت عنہ الثلاثۃ فی الاصول وما تعرضوا لنفیہ ودلت الاحادیث علیہ فلیس بد من اثباتہ والکل مذھب حنفی...

(فیوض الحرمین (مشھد ۲۰)

ترجمہ: مجھے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ مذہب حنفی میں ایک طریقہ بڑا عمدہ ہے، جو اس طریق سُنت کے بہت موافق ہے، جو بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں مدون اور منقح ہو چکا ہے، وُہ یہ کہ ائمۂ ثلاثہ ابوحنیفہ و ابویوسف و محمد رحمہم اللہ کے اقوال میں سے اس قول کو لیا جائے جو اس مسئلہ میں سب سے زیادہ حدیث کے قریب ہو، پھر ان فقہائے حنفیہ کے جو محدثین میں سے تھے، اختیارات کا تتبع کیا جائے، کیونکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن سے ائمہ ثلاثہ نے ظاہر روایت میں سکوت کیا ہے اور ان کی نفی سے تعرض نہیں کیا اور احادیث ان پر دلالت کر رہی ہیں، توان کو ثابت ماننا ضروری ہے اور یہ سب مذہب حنفی ہوگا (مذہب سے خارج نہ ہوگا)

ایک دُوسرے مشہد میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے کو پُورا کر دیں، تو وُہ کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہوگا"

*

اللہ تبارک و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سرزمین دیوبند سے ہدایت و نُور، کا ایک بحر بیکراں جاری فرما دیا جس سے پُورا عالم بحمد اللہ سیراب ہوا اور ہو رہا ہے۔ اس مختصر مضمون میں دیوبندی مدرسۂ فکر کی جملہ خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، نمونۃً اس شجرۂ طیبہ کی پاکیزہ جڑوں، اس کے پاک پھلوں اور اس کے آثار و نتائج کی طرف معمولی سا اشارہ کر دیا ہے۔

*

طوفانِ اشک لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں!

اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ قائم و دائم رکھے اور انسانیت کو اس سے تاقیامت مستفید فرماتا رہے، آمین، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۲۴ ذو القعدہ ۱۳۹۵ھ

ریاست علی ظفر بجنوری
دیوبند

ترانۂ دارالعلوم

یہ علم و ہنر کا گہوارا، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اِک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

خود ساقیٔ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں

جو وادیٔ فاراں سے اُٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اُٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن سیراب ہے، جوئے یثرب سے

کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

ہر بوند ہے جس کی اَمرت جل، یہ بادل ایسا بادل ہے
سو ساگر جس سے بھر جائیں، یہ چھاگل ایسا چھاگل ہے

مہتاب یہاں کے ذرّوں کو ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے

یہ صحن چمن ہے برکھا رُت، ہر موسم ہے برسات یہاں
گلبانگ سحر بن جاتی ہے، ساون کی اندھیری رات یہاں،

اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بام حرم سے گونجی ہے سو بار اذاں آزادی کی

اس وادیٔ گل کا ہر غنچہ خورشید جہاں کہلایا ہے
جو رند یہاں سے اُٹھا ہے، وہ پیر مغاں کہلایا ہے

جو شمع یقین روشن ہے، یہاں وہ شمع حرم کا پرتو ہے
اس بزم ولی اللّٰہی میں تنویر نبوت کی ضو ہے

یہ مجلس وہ مجلس ہے، خود فطرت جسکی قائم ہے
اس بزم کا ساقی کیا کہیئے، جو صبح ازل سے قائم ہے

جس وقت کسی یعقوب کی نے اس گلشن میں بڑھ جاتی ہے
ذرّوں کی ضیا خورشید جہاں کو ایسے میں شرماتی ہے

عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا، اخلاص کا ایسا تاج محل

یہ ایک صنم خانہ ہے، جہاں محمودؔ بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرّے ذرّے سے کس درجہ شرر بیدار ہوئے

ہے عزم حسین احمدؔ سے بپا ہنگامۂ گیر و دار یہاں
شاخوں کی لچک بنجاتی ہے، باطل کے لیے تلوار یہاں

رُومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انورؔ سے پیمانۂ فخر الدین یہاں

ہر رند ہے ابراہیم یہاں، ہر مے کش ہے اعزاز یہاں
رندانِ ہدیٰ پر کھلتے ہیں، تقدیسِ طلب کے راز یہاں

ہیں کتنے عزیزؔ اس محفل کے انفاسِ حیات افروز ہمیں
اس سازِ معانی کے نغمے دیتے ہیں، یقیں کا سوز ہمیں

اس بزمِ جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک

سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس مُلک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو

جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وُہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کے لیے اعجاز ہیں ہم

اس برقِ تجلی نے سمجھا، پروانۂ شمع نور ہمیں
یہ وادیِ ایمن دیتی ہے، تعلیم کلیم طور ہمیں

دریائے طلب ہو جاتا ہے، ہر مئے کش کا پایاب یہاں
ہم تشنہ لبوں نے سیکھے ہیں مئے نوشی کے آداب یہاں

بلبل کی دعا جب گلشن میں فطرت کی زباں ہو جاتی ہے
انوارِ حرم کی تابانی، ہر سمت عیاں ہو جاتی ہے

ہر موج یہاں اک دریا ہے، اک ملت ہے ہر فرد یہاں
گونجا ہے ابد تک گونجے گا، آوازۂ اہل درد یہاں

امداد و رشید و اشرف کا یہ قلزمِ عرفاں پھیلے گا
یہ شجرۂ طیب پھیلا ہے تا وسعتِ امکاں پھیلے گا

خورشید یہ دین احمد کا، عالم کے افق پر چمکے گا
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور برابر چمکے گا

یوں سینۂ گیتی پر روشن، اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انوارِ حرم، سینہ میں دل بیدار رہے

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات

• سید محبوب رضوی

اسلام کا تعلیمی نظریہ

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر سا لفظ ہے، اتنا ہی اہم اور رُوح کی گہرائی تک کو متاثر کرنیوالا ہے۔ تعلیم محض نقوش حرُوف، خطوُط، آواز، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی ذہنی و دماغی اور عملی تربیت کا نام ہے، جس کے ذریعے انسان کی فطری قوّت و صلاحیّت کو اُبھار کر سنوارنا اور منظّم کرنا ہے اور انسانی جذبات و حسیّات کو ایک عُمدہ اور اعلیٰ نصب العین کے تحت لاکر مہذب اور شائستہ بنانا ہے، تاکہ نوعِ انسانی کے لیے مفید ثمرات و نتائج بروئے کار لائے جاسکیں؛ انسان کو اُس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دُشوار ہے اور جس قدر دُشوار ہے، اسی قدر ضرُوری بھی ہے، بالفاظِ دیگر یوں سمجھیے کہ اگر تعلیم صرف نہ جانی ہوئی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہو تو کوئی غیر معمُولی بات نہیں ہے، لیکن اگر اُسے عمل کا پابند بنا دیا جائے، تو پھر اُس کی دُشواریاں کئی گُنا بڑھ جاتی ہیں، اگرچہ علم کی قدر دُنیا کی ہر قوم کرتی ہے، لیکن علم کی نسبت مُسلمانوں کا جو نظریہ ہے۔ وُہ دُوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ غیر مُسلم علم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے دُنیا میں قوّت و عظمت اور ترقی و برتری حاصل کریں، علم کو عام طور پر حصُولِ دولت کے لیے وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مگر مُسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلہ کے بجائے مقصد سمجھا ہے، ذریعہ معاش نہیں سمجھا، مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لیے سیکھا ہے، انھوں نے علم کو کبھی اِس لیے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معیشت حاصل کریں مُسلمانوں کے نزدیک حصُولِ علم ایک فرض ہے، جس کو پُورا کرکے مُسلمان علاوہ دُنیوی مفاد کے اُخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ۔ یعنی ہر مُسلمان مَرد و عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے، یہ فرضیت علم ہی کے لیے ضرُوری قرار دی گئی ہے اور ہر شخص پر بقدرِ ضرُورت واجب ہے، تاریخ کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک سربلند نہیں ہو سکی، جب تک اُس میں علم و عمل کی قوتیں بیدار نہیں ہوئیں، تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت انسانی، تمدنی اور اخلاقی ترقی ہو سکتی ہے، جو انسانی تخلیق کا مقصدِ اعلیٰ ہے، ایسی ترقی کے پیشِ نظر یہ ضرُوری ہے کہ ہر طالب علم کو اس امر کا پُورا پُورا موقع دیا جائے کہ وُہ اپنی صلاحیتوں کی بہتر سے بہتر طریقے پر نشو و نما کر سکے، بالفاظِ دیگر معاشرے کا فرضِ اوّلین ہے کہ وُہ تمام ایسی سہولتیں مہیا کر دے، جس سے ہر طالب علم اپنے بہترین جوہر دکھا سکے، اِس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم سے قومیں بنتی اور جہل سے بگڑتی ہیں، بنا بریں ضرُور ہے کہ ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔

ہر ترقی کرنیوالی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیمیافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک آسان نہیں جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو، موجودہ طریقۂ تعلیم میں مصارف کی گراں باری نے اکثریت کو تعلیم کے فوائد سے محروم کر دیا ہے، صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائیگا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے۔

ہمارا قدیم نظامِ تعلیم

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے، چنانچہ ان مدارس میں تعلیم کا جو نہج اختیار کیا گیا تھا، اس میں تعلیمی مصارف کو طلبا کے بجائے درسگاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس عائد نہ تھی اور نہ صرف یہ بلکہ طلبہ کے لیے زیر درس اور معلومات عامہ کے لیے کتابوں کا انتظام بھی مفت ہوتا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی اور قیام گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ نادار اور غریب طلبہ کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات کے لیے نقد وظائف بھی دیئے جاتے تھے،

اس کے علاوہ مدارس عربیہ میں حصول علم پر کبھی کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی، جس کے ذریعے، قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہوں، بلکہ ان میں ہر وہ شخص جس کو اکتساب علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا، بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا، عمر اور پیشے کی قید سے ہمارے مدارس ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور ان میں رنگ و نسل، امیر، غریب اور آزاد و غلام کے مابین کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا ہے، اس بناء پر ہر شخص کے لیے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو۔ بلاتکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں، مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے، جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ و اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ادنیٰ پیشوں سے تعلیم کی پابندی اٹھانا یورپ نے درحقیقت مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے اور جس چیز کا سہرا آج یورپ کے سر باندھا جا رہا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مدارس عربیہ ہی کا پرتو ہے، البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا فلسفہ ابھی دنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے اور گو تعلیم بالغان کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے، تاہم حصول سند میں ابھی تک اس پر پابندی موجود ہے، بایں ہمہ اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب دنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ لعنت بھی اٹھا دی جائے گی۔

دارالعلوم کی تعلیم

ہمارے قدیم نظام تعلیم کی یہی روایات دارالعلوم دیوبند کی طرۂ امتیاز ہیں، یہاں بھی طلبہ سے تعلیمی فیس نہیں لی جاتی، غیر مستطیع اور ضرورتمند طلباء کو دارالعلوم کی جانب سے کھانا، کپڑا اور نقد وظائف دیئے جاتے ہیں، زیر درس کتابیں اور قیام کے لیے جگہ ہر مستطیع اور غیر مستطیع طالب علم کے لیے مفت مہیا کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم صرف دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ غریب شخص بھی اس کے ذریعے سے اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر سکتا ہے، اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تام ہے۔

تعلیمی آزادی

دارالعلوم ہی ہندوستان میں وہ سب سے

پہلی درس گاہ ہے، جس نے آزاد طریق تعلیم کو پیش کیا اور سیاسی غلامی کی فضا میں ملت کی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی، اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا، مگر دارالعلوم نے بعونہ تعالیٰ اس پر عمل کر کے اس مشکل کو آسان بنا دیا، دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جو بہت کم درسگاہوں میں پائی جاتی ہے۔ دارالعلوم نے برطانوی حکومت کی پیش کش کے باوجود کبھی اس کی امداد قبول نہیں کی اس لیے وہ بہت سی ایسی پابندیوں سے آزاد رہا ہے جو سرکاری زرِ امداد کے ساتھ ساتھ آتی لازمی ہیں، بعض لوگوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ جب حکومت دارالعلوم کو گراں قدر مالی امداد دینے پر آمادہ تھی، تو اس کو قبول امداد میں احتراز و انکار مناسب نہ تھا، قوم خواہ کتنی ہی فیاضی دکھائے، مگر پھر بھی وہ حکومت کی بیش قرار امداد (گرانٹ) کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ان لوگوں کی نظر غالباً اس امر پر نہیں گئی کہ مدارس عربیہ کو حکومت کے اثر سے اس لیے آزاد رکھنا ضروری ہے، کہ حکومت خواہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو، جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہ ہو۔ اس کی سیاست بے لاگ اور بے میل و غش نہیں ہو سکتی اور مدارس عربیہ کے لیے ایسی تعلیم درکار ہے۔ جو ہر قسم کے غیر اسلامی اثر اور خارجی عمل دخل سے بالکلیہ آزاد ہو، دارالعلوم دیوبند نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی حکومتِ وقت سے مالی امداد حاصل نہیں کی، اس کا تمام تر سرمایہ اعتماد علی اللہ ہے اور یہ صرف مسلمانوں کے بل بوتے پر علم اور دین کی خدمت میں منہمک رہا ہے اور لیل و نہار کی تند و تیز گردشوں کے باوجود اپنی قدیم شان اور روایات کے ساتھ قائم ہے۔

آج ہماری قومی بدقسمتی سے تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے کوئی اچھی اور پرمنفعت ملازمت حاصل کر کے معقول روزی کمائی جائے۔ گویا تعلیم کا مفہوم ہی سرے سے بدل ڈالا گیا ہے اور تعلیم برائے علم کے بجائے اب صرف حصول معاش کے دوسرے بہت سے ذرائع کی طرح یہ بھی ایک ذریعہ بنکر رہ گیا ہے، حالانکہ شرف علم کا قدرتی تقاضا ہے کہ اس کا نصب العین بلند ہو۔ بے شبہ دنیاوی علوم و فنون اس لیے حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے دنیاوی ترقی حاصل کی جا سکے، لیکن اگر اس نصب العین کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدود کر دیا جائے اور اپنی ہی منفعت سامنے رکھی جائے تو یہ خود غرضی ہے، علم جیسی گرانقدر دولت کو صرف اپنی اغراض پر خرچ کرنا، علم کی تعظیم نہیں، توہین ہے پس دنیاوی علوم و فنون حاصل کرنے کا مقصد بھی یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے سے پوری قوم کے سرمائے کو ترقی دی جا سکے اور یہ نہ صرف اپنے عروج و ترقی کا بلکہ ملک و ملت کی ترقی کا ذریعہ بن سکے!

بحمد للہ دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے حصول علم کا مقصد اور نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اس کی مخلوق کی بہترین خدمت ہے۔ اسلامی تاریخ کا یہ زریں واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور اس کے اساتذہ اور طلبا کے لیے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے اور حکومت کی جانب سے ہر قسم کا سامان آسائش مہیا کیا گیا، تو علماء بخارا نے زوال علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ اب علم، علم کے لیے نہیں جاہ و ثروت کے لیے حاصل کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے یہ مقصد نہ ہوگا، وہ یونیورسٹی کے بجائے دارالعلوم کا رُخ ہی کیوں کرے گا، جس کی سند کی قیمت حکومت کی نظر میں کھوٹے سکے سے زائد نہیں ہے۔

ایک مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمز مسٹن نے جب کہ وہ دیوبند کے معائنے کی غرض سے یہاں آئے تھے، دیوبند سے دور دراز

کے ایک طالب علم سے سوال کیا تھا:

"اتنی دُور سے تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟"

طالب علم نے بے ساختہ جواب دیا کہ:

"مَیں یہاں اس لیے پڑھنے آیا ہُوں تاکہ واپس جاکر اپنے وطن کے لوگوں کی دینی خدمت انجام دے سکوں!"

دارالعلوم کے نصاب تعلیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وُہ "السنۂ شرقیہ" کے سرکاری امتحانات "مولوی فاضل" وغیرہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے، اس لیے اگر دارالعلوم چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی سَند کو "مولوی فاضل" کے مساوی تسلیم کرا سکتا تھا، مگر اُس نے اپنی سَند کو سرکاری محکموں کی ملازمت کیلئے پروانۂ راہداری بنانے کے بجائے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وُہ طلباؔ میں ایسی علمی قابلیت وفضیلت پیدا کر دے کہ لوگ اس کے طالب علم اور اس کی سَند کو دیکھتے ہی یہ باور کرلیں کہ یہ کوئی کام کی چیز ہے اور یہ شخص دین کے جس کام کو اپنے ذمے لے گا، اس کو قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا۔

کتاب وار نظامِ تعلیم

مدارسِ عربیہ اور بالخصُوص دارالعلوم کے نظامِ تعلیم میں ایک خصُوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، یونیورسٹی نظام میں ابھی تک اس کی افادیت پر توجہ نہیں کی گئی ہے، وُہ یہ ہے کہ جماعت وار نظامِ تعلیم یعنی درجہ بندی جو عام طور پر علمی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ اسکے بجائے دارالعلوم میں کتاب وار نظامِ تعلیم اختیار کیا گیا ہے یعنی ہمارے مدارس میں "جماعت بندی" (کلاس سسٹم) نہیں ہے۔ بلکہ طلباؔ کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس دَور سے گزر رہا ہے، تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے، یا پڑھ رہا ہے، سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہوجاتا ہے اور بقیہ میں پاس تو وُہ کتابیں جن میں طالب علم فیل ہوا ہے۔ ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں حارج نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کرلی ہو، جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے، سالِ آئندہ میں صرف ان ہی کتابوں کا اُسے اعادہ کرنا ہوتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتاب کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادے پر بھی مجبُور کیا جائے جیسا کہ یونیورسٹی نظام میں بالعمُوم ہوتا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں بہت ہی کم طلباؔ ایسے نکلتے ہیں، جو جُزوی کتابوں میں ناکام ہوں۔ اس لیے طالب علم کی نفسیات پر اس کا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اسے اپنی جزئی ناکامی کا اس شدت سے احساس نہیں ہونے پاتا، جس شدت سے جماعت وار نظام کی کلی ناکامی میں ہوتا ہے، اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے۔ کہ طالبِ علم میں بد دلی پیدا ہونے نہیں پاتی، وَہیں دُوسری جانب اس کی مدت اور مصارفِ تعلیم میں بھی فی الجملہ وقت اور رُوپے کی کفایت ہوجاتی ہے۔

اس کے برخلاف "جماعت وار نظامِ تعلیم میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ امتحان میں فیل ہوجانے کی وَجہ سے بعض طلباؔ میں ایسی بے رغبتی اور بد دلی پیدا ہوجاتی ہے کہ وُہ مایُوس ہوکر تعلیم ہی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہدیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو امتحان کی ناکامی مختی اور غیُور طلباؔ میں خطرناک نتائج تک پیدا کر دینے کا باعث بن جاتی ہے، اور طالب علم اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کیلئے

خودکشی تک کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

کتاب وار تعلیمی نظام میں بالعموم ان میں سے کوئی بات پیش نہیں آتی، ذیل میں ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء سے ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء تک دارالعلوم کے دس سال کے امتحان کے نتائج کا گوشوارہ پیش ہے۔ گوشوارے کے تعداد طلبہ کے خانے میں طلبا کی وہ تعداد درج ہے، جو شروع سال میں موجود ہوتی ہے، دارالعلوم میں داخلہ شوال میں ہوتا ہے اور امتحان سن آئندہ کے شعبان میں، درمیان میں طلبا کی تعداد کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد کے خانے میں جو تعداد درج کی گئی ہے وہ شعبان میں سالانہ امتحان کے زمانے میں موجود طلبا کی ہے۔

ناکام طلبا کی تعداد میں وہ طلبا بھی شامل ہیں جو عین امتحان کے زمانے میں بیمار ہو گئے۔ یا امتحان کے دوران میں کسی وجہ سے غیر حاضر رہے۔ نتیجہ فی صد میں ان سب کو شامل کر لیا گیا ہے، اگر

نمبر شمار	سن	تعداد طلبا	شریک امتحان	کامیاب	ناکام	نتیجہ فی صد
۱	۱۳۵۰ھ	۱۰۰۶	۱۰۰۶	۸۷۳	۱۳۳	۸۷
۲	۱۳۵۱ھ	۱۱۴۰	۱۱۳۸	۱۰۶۹	۶۹	۹۴
۳	۱۳۵۲ھ	۱۰۹۰	۱۰۰۰	۹۲۶	۷۴	۹۳
۴	۱۳۵۳ھ	۱۱۴۲	۱۰۱۳	۸۶۱	۱۵۲	۸۵
۵	۱۳۵۴ھ	۱۱۱۴	۱۰۷۶	۸۶۰	۲۱۶	۷۱
۶	۱۳۵۵ھ	۱۱۹۶	۱۰۱۴	۸۵۳	۱۶۱	۷۴
۷	۱۳۵۶ھ	۱۲۲۶	۱۰۷۶	۱۰۰۴	۷۲	۹۳
۸	۱۳۵۷ھ	۱۴۱۶	۱۲۵۵	۱۱۶۶	۸۹	۹۳
۹	۱۳۵۸ھ	۱۴۹۳	۱۱۹۸	۱۱۲۱	۷۷	۹۴
۱۰	۱۳۵۹ھ	۱۴۲۲	۱۲۳۱	۱۱۴۸	۸۳	۹۳

ان کو محسوب نہ کیا جائے، جیسا کہ اصولاً ضروری ہے، تو کامیابی کا معیار اور زیادہ بڑھ جائے گا!

دس سال کے ان نتائج میں کامیابی کا عام معیار ۸۴ سے ۹۴ فی صد تک ہے۔ البتہ ۱۳۵۴ھ میں ۷۱ فی صد تک گرگیا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وبائی امراض کی کثرت کی وجہ سے بیشتر طلبا امتحان میں شرکت نہیں کر سکے۔

طریقِ تعلیم

دارالعلوم میں لکچروں کے بجائے تعلیم کا یہ طریقہ رائج ہے، کہ استاذ اور شاگرد دونوں کے سامنے کتاب ہوتی ہے، اُستاد کا فرض ہے کہ جب طالب علم سبق کی عبارت پڑھ چکے تو استاد فنی حیثیت سے اس پر ایک جامع تقریر کرے جس میں متعلقہ مسائل کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالے اور آخر میں اپنی تقریر کو کتاب کی عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کردے، طلبا درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور جتنے اعتراضات اس سبق کے بارے میں ہوں اُن کا تشفی بخش جواب اُستاد سے نہ سن لیں، اسے آگے نہ بڑھنے دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو طالب علم مطالعہ اور پوری تیاری کر کے درس میں آکر بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف اُستاد بھی پوری محنت اور تیاری کے ساتھ پڑھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

موجودہ طریق تعلیم کے مطابق دارالعلوم میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے کہ اُستاد آئے، مضمون پر لکچر دے دے اور طلبا لکچر نوٹ کرلیں۔

امتحان

یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارس عربیہ

میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا، تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں طلبہ کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ بیجاپور کی تاریخ "بستان السلاطین" میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے

"امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد"

یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلبہ کا امتحان ہوتا تھا، ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان کے سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے، لکھا ہے

"ہر سال امتحان می شد" (بحوالہ نظام تعلیم و تربیت ص۲۴۱ ج ۱)

مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانے میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد اور محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے مروج نہیں تھا، طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ چکتا تو اس سے مافوق، دوسری کتاب بغیر امتحان لیے شروع کرا دی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے اور پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا اور بسا اوقات ناقابل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا، دارالعلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقے کو ختم کر کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دیا!

دارالعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں، وہ فی الجملہ یونیورسٹیوں کے امتحانات سے زیادہ سخت ہیں، یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں ہے، یونیورسٹی کے امتحان میں ایک مضمون سے متعدد سوالات کیے جاتے ہیں اور ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں، نیز طالب علم کو اس کا حق بھی ہوتا ہے کہ جواب کے لیے ان میں سے اپنی مرضی اور معینہ تعداد کے مطابق سوالات کا انتخاب کر لے، پورے سوالات کے جوابات دینے لازمی نہیں ہوتے، لیکن دارالعلوم کے امتحان میں ہر کتاب سے متعلق تین سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچے میں تینوں کا حل اس لیے لازمی ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترکہ ہوتے ہیں، اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے، کامیابی کے نمبروں کا معیار ۴۰ فی صد رکھا گیا ہے، جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ فی صد سے کہیں زیادہ ہے۔

البتہ اگر کسی کتاب میں اس معیار سے کم نمبر مل سکے ہوں، تو اس صورت میں طالب علم کو مافوق کتاب پڑھنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت مل جاتی ہے کہ اس کتاب میں مکرر سالانہ امتحان دے کر کامیابی حاصل کرنی ہوگی، گویا یونیورسٹی کی موجودہ اصطلاح میں اس کو کمپارٹمنٹ سمجھنا چاہیے۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے پرچوں میں بعض کتابوں کے گروپ بھی مشترک کر دیے جاتے ہیں، مثلاً دو مضمون کی کتابیں ساتھ ساتھ ایک گروپ میں شامل کر دی جاتی ہیں، اور دونوں میں مجموعی طور پر کامیابی کے نمبر حاصل کرنے ہوتے ہیں جو کم از کم ۳۳ فی صد ہونے چاہئیں، اب خواہ دونوں میں نمبر برابر ہوں یا کم و بیش، مثلاً ایک میں ۲۰ اور دوسری میں تیرہ تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، اس میں یہ سہولت ہے کہ طالب علم کو دونوں مضمونوں میں سے اگر کسی ایک مضمون سے بھی مناسبت ہے، تو دوسرے میں معمولی شُد بُد سے بھی کام نکل جاتا ہے۔

مادری زبان میں تعلیم

دارالعلوم کی ایک اور خصوصیت جو قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں درس و تعلیم کی زبان اُردو قرار دی گئی ہے، جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابیں عربی زبان میں ہیں مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں، علوم و فنون کی تعلیم میں جو اہمیت مادری زبان کو حاصل ہے، اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے، یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں، وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے، مگر انگریزی اقتدار کے غلبہ نے قوم کے دماغوں کو اسقدر

متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی، بعض باتیں بظاہر معمولی دکھائی دیتی ہیں اور لوگ انھیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ انھیں بڑی بڑی باتوں کے لیے بنیاد بنایا جا سکتا ہے اور ان کے ذریعے پورے نظامِ زندگی کو استوار کیا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض دفعہ حقائق تو سامنے ہوتے ہیں مگر ان کی اہمیت کا ادراک نہیں ہوتا، ان کی اچھائی اور برائی بھی پیشِ نظر ہوتی ہے، لیکن طبیعت اس کا زیادہ احساس نہیں کرتی، چنانچہ طویل مدت کے بعد ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور جامعہ ملیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا، جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کر دی ہے اور اب تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے،

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے اس سلسلے میں دارالترجمہ قائم کر کے انگریزی اور عربی و فارسی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کرا کر اردو کے علمی سرمایہ میں بیش قرار اضافہ کر دیا ہے، اسی طرح جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں اوّلیت کا سہرا دارالعلوم ہی کے سر ہے ہمارے اکابر کی دوربین نظروں نے جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا تھا۔ بیسویں صدی کے ماہرینِ تعلیم بھی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے ہیں

اردو کی اشاعت و ترویج

یہ تو اس مسئلے کا تعلیمی پہلو تھا، لیکن اس کے علاوہ اس کا ایک لسانی پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دارالعلوم میں اردو کے درسی زبان ہونے سے اردو کو جو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے، گو اس پر اردو کے ترقی و اشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے تاہم اس کے نتائج و ثمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ دارالعلوم چونکہ عالمِ اسلامی کے مسلمانوں کی مرکزی درسگاہ ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلبا تحصیلِ علم کی غرض سے آتے ہیں جو اپنے دورانِ قیام میں خاصی اردو سیکھ جاتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی، دارالعلوم میں آئے تھے وہ کہتے تھے کہ:

"میں جب بخارا پہنچا، جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے، تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور دراز اتنی صاف اردو اس کو کیونکر آئی ہوگی، میرے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ "یہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو سمجھتا اور بولتا ہے"، اس شخص نے نہایت اخلاق اور محبت سے مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی، جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اردو میں کی۔"

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اردو کے دائرہ کو اپنے طلباء کے ذریعے دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے۔

تربیتِ اخلاق

اسلامی علوم کے پڑھنے پڑھانے کا مقصد تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن کے ہر شعبے میں اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی فضا پیدا کرنا ہے، جس کو صالح نظام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کو دارالعلوم

میں ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے دارالعلوم محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے، جس میں صرف قوتِ ادراک کو تیز کر دینے پر اکتفا کیا جاتا ہو، بلکہ وہ اسلامی تہذیب و اخلاق، ذہن و فکر، تہذیبِ نفس اور تعمیرِ سیرت کی ایسی تربیت گاہ بھی ہے، جس میں رہ کر طالب علم اسلامی تہذیب و معاشرت سے قریب تر اور اُس کا عادی ہو جاتا ہے تاکہ اپنی مخصوص صلاحیتوں سے اس مقصد کو پُورا کر سکے، جو علما کے لیے نہایت ضروری ہے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) اکثر اپنے درس میں فرمایا کرتے تھے: "جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں، اُن کا مقصدِ تحصیلِ علم یا تو دین ہوتا ہے یا فقط دُنیا، اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرتے ہیں، یہ بھی غنیمت ہے، لیکن علم سے معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لیے اُسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے، ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال اس لیے خرید کرتا ہے کہ اس سے وہ اپنے جُوتے صاف کیا کرے گا۔

اس کے بعد طلبا سے تاکیداً فرماتے کہ تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنی نیت اور ارادے کا جائزہ لینا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ تم میں سے کون شخص کس طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

دارالعلوم کے ماحول میں طلبا کو تقریباً ہر کام خود کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، کمرے کی صفائی اور اپنے کپڑے دھونا عام معمول ہے۔ مطبخ میں جا کر خود ہی اپنا کھانا لانا ہوتا ہے، اس طرزِ زندگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبا میں اپنی بڑائی کا احساس اور غرورِ علم پیدا نہیں ہونے پاتا اور وہ تواضع کے ساتھ فروتنی کے عادی بھی بن جاتے ہیں، غرض کہ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، جو سخت کوشی کے مرادف ہوتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک معمولی اور سستا لباس پہنتے ہیں، کُرتہ، پاجامہ، دو پلّی ٹوپی اور سلیم شاہی جُوتہ یا چپل اُن کا عمومی لباس ہوتا ہے، یہی حال کھانے کی سادگی کا ہے۔ وہ سادہ ترین خوراک استعمال کرتے ہیں، بس کھانے پینے میں بڑے سے بڑا تکلف چائے نوشی ہے، آرائشی فرنیچر کی انھیں چنداں ضرورت نہیں ہوتی، صرف چارپائی اور بوریہ یا ٹاٹ کا معمولی فرش ان کے بیٹھنے اور سونے کیلئے کافی ہوتا ہے۔

جدید تہذیب و تمدن کی طرح جس میں زندگی کے گوناں اور بے شمار تکلفات پیدا کر لیے گئے ہیں، وہ اپنے آپ کو گم کر دینے کے عادی نہیں ہوتے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ زندگی کی جد و جہد میں بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کر لینے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ طلبائے دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جو دوسری قدیم و جدید درسگاہوں سے اُسے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان لوگوں سے ملنے والا اولین لمحات میں محسوس کر لیتا ہے، یہ نہ بتلا سکنے کی بات ہے اور نہ سُننے سے متعلق ہے۔ بلکہ دارالعلوم کی اس کیفیت کے خط و خال کو صرف اس کی زندگی کے آئینے ہی میں ٹھیک طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

دارُالعلوم کے تعلیمی موقف پر ایک انگریز مبصّر کی شہادت

دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات کو دوسرے لوگوں نے کس نظر سے دیکھا ہے، اس کی تفصیل کی گنجائش تو اس مختصر کتابچے میں مشکل ہے، تاہم ایک انگریز مبصر جان پامر (JOHN PALMER) کے مشاہدات آئندہ سطور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (دارالعلوم جس زمانے میں قائم ہوا، اس وقت برطانوی حکومت مسلمانوں سے سخت بدظن اور بدگمان تھی اور ان کے ہر قول و فعل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے دارالعلوم کی نسبت سرِ حد تک خفیہ ملانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء

میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی نے ایک معتمد خاص جان پامر کو اسی غرض سے خفیہ طور پر دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ تحقیقات کرکے رپورٹ دے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد کیا ہے اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں۔

جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ مرتب کی اور جو تاثرات اخذ کئے وہ اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے بسط و تفصیل سے بیان کئے ہیں؛ جان پامر نے اس خط کی نقل دارالعلوم کو بھی بھیجی تھی؛ جو دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ یہ شخص چونکہ ایک ایسی سوسائٹی کا پروردہ ہے جو ایشیا کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، اس لیے جان پامر کے اعتراف حقیقت سے جہاں اس کے بیان کی صداقت اور انصاف پسندی کا ثبوت ملتا ہے، وہاں دارالعلوم کے تعلیمی خد و خال بھی زبان غیر سے متعین ہو جاتے ہیں)

جان پامر نے دارالعلوم کی تعلیمی زندگی کا انگریزی یونیورسٹیوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تاثرات کا جس غایت دلچسپ اور عالمانہ طریقے سے اظہار کیا ہے، وہ دارالعلوم کے تعلیمی موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ واقعہ دارالعلوم کی ابتدائی زندگی کا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کا تعلیمی موقف شروع سے کیا رہا ہے۔

جان پامر لکھتا ہے کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی کے حکم سے میں ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء ۱۲۹۱ھ کو اتوار کے دن اس مدرسہ (دارالعلوم) میں پہنچا، یہاں پہنچ کر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا، جس میں چٹائی کے فرش پر چھوٹے چھوٹے لڑکے کئی درجن کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک بڑا لڑکا ان کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے لڑکوں سے دریافت کیا کہ تمہارا اُستاد کون ہے؟ ایک نے اشارے سے بتایا، معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا تھا، وہی اُستاد ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا اُستاد ہوگا۔ میں نے پوچھا آپ کے لڑکے کیا پڑھتے ہیں؟ جواب دیا: یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے

یہاں سے آگے بڑھا، تو ایک صاحب میانہ قد، نہایت خوب صورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبا کی ایک قطار تھی، قریب پہنچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر یہ لوگ چونکیں گے، مگر کسی نے مطلقاً توجہ نہ کی، میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور اُستاد کی تقریر سننے لگا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی نہیں سُنے تھے، یہاں سے اُٹھ کر میں دُوسرے دالان میں گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے، یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالہ کی دُوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے تقریر کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیدس کی رُوح اُن میں آگئی ہے، میں ششدر تکتا رہ گیا، اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و مقابلہ ٹاڈ ہنٹر سے مساوات درجہ اوّل کا ایک ایسا مشکل سوال طلبا سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آگیا اور میں حیران رہ گیا، بعض طلبا نے جواب صحیح نکالا۔

یہاں سے اُٹھ کر میں تیسرے دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے، یہاں سے میں ایک زینے پر چڑھ کر دُوسری منزل میں پہنچا، اس کے تین طرف مکلف مکان تھے، بیچ میں ایک چھوٹی سی صحنچی تھی، جس میں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے، میں یہ سُننے کے لیے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں دبے پاؤں ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں، اتنے میں ایک اندھے نے دُوسرے اندھے سے کہا کہ:
"بھائی! کل کے سبق میں شکل عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر تم سمجھے ہو تو بتلاؤ۔" دُوسرے اندھے نے دعویٰ بیان کیا اور اس کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا، پھر جو آپس میں اُن کی بحث ہوئی تو میں دنگ رہ

گیا اور سٹر ریگر پرنسپل کی تقریر کا سماں میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ایک پیچ درجہ میں گیا، چھوٹے چھوٹے لڑکے صرف و نحو کی کتابیں نہایت ادب سے اُستاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے، تیسرے درجے میں علم منقول کا درس ہو رہا تھا۔

میں دُوسرے زینے سے اُتر کر نیچے آیا، میرا خیال تھا کہ مدرسہ بس اسی قدر ہے۔ اتفاقاً ایک شخص سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی، اُس نے کہا "نہیں! قرآن شریف دُوسری جگہ پڑھایا جاتا ہے۔" میں نے پُوچھا: کہاں؟ وُہ مجھ کو مسجد میں لے گیا، مسجد کے دالان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ایک نابینا حافظ کے سامنے قرآن شریف پڑھ رہے تھے، حافظ نے ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑ کر نہایت بے رحمی سے جھڑ جھڑایا، بچہ چلایا، میں نے اپنے رہنما سے کہا کہ ننھے ننھے بچوں سے ایسی سخت محنت لینا بڑا ظلم ہے، اس نے ہنس کر جواب دیا، یہ ظلم نہیں ہے، شفقت ہے۔ بچوں کو شروع ہی سے محنت شاقہ کا عادی بنا دینا عین حکمت اور اُن کی آئندہ زندگی میں پیش آنیوالی مشکلات پر قابو پانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ آج کل مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لیے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے۔

میں نے پوچھا سال گزشتہ اخباروں میں دیکھا تھا کہ چار طالب علموں کے دستارِ فضیلت باندھی گئی تھی، ان میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟ وُہ بولا کہ "ہاں ایک صاحب ہیں، چلئے میں ملا دیتا ہوں۔" وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا، جہاں ایک نوجوان شخص بیٹھا تھا، ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھی تھی اور دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے تھے، ایک طرف دو بندُوقیں پڑی ہوئی تھیں، میں نے سلام کیا، اُس نے کمال اخلاق سے جواب دیا، میں نے پوچھا کہ سال گزشتہ آپ ہی کے دستارِ فضیلت بندھی ہے؟ بولے کہ "اساتذہ کی عنایت ہے" میں نے کہا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ فرمایا: کہ یہ عربی میں ایک سنی کتاب ہے، ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لیے بھیجی ہے، اس کی اُجرت ایک ہزار رُوپے ٹھہری ہے، مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں اور تین چوتھائی کے قریب ہو چکا ہے، بقیہ انشاء اللہ ایک مہینے میں ہو جائے گا۔ میں نے پُوچھا کہ یہ بندُوقیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے کہ مجھ کو شکار کا شوق ہے، سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں گیارہ سے ایک تک شکار کھیلتا ہوں اور دو سے چار تک ترجمہ کرتا ہوں:

میں نے دریافت کیا کہ آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ بولے کہ خدا تعالےٰ گھر بیٹھے بٹھائے ڈھائی سو رُوپے مہینہ دیتا ہے، پھر کس لیے نوکری کروں؟

یہاں سے اُٹھ کر کتاب خانہ میں آیا، منتظم کتاب خانہ نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے کتابوں کی فہرست دکھلائی، میں حیران رہ گیا، کوئی فن ایسا نہ تھا، جس کی کتاب موجود نہ ہو، پھر ایک دُوسرا رجسٹر دکھلایا، جو طلبا کی حاضری کا تھا، اور نہایت صاف اور خوشخط لکھا ہوا تھا، منجملہ دو سو دس (۲۱۰) طلبا کے ۲۰۸ حاضر تھے۔

میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ ایک صاحب سبز رنگ آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے، میں نے پُوچھا کہ آپ کی تعریف؟ بولے کہ "میں مہتمم ہوں" اور تین بڑے بڑے رجسٹر میرے سامنے رکھ دیئے اور بتلایا کہ سال بھر کے آمد صرف کا حساب ہے، ملاحظہ کیجئے: میں نے دیکھا تو تاریخ وار نہایت صحت کے ساتھ حساب لکھا ہوا تھا۔

گوشوارے سے معلوم ہوا کہ گزشتہ سال کے آخر میں خرچ کے بعد کچھ روپیہ بچ گیا تھا، طبیعت چاہتی تھی کہ کتابوں کی کچھ سیر کروں مگر

لہ غالباً یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے، حضرت ممدوح ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں فارغ ہوئے اور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں بلا تنخواہ کے مدرس مقرر ہوئے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے فارغ ہونیوالے حضرات میں دیوبند کے رہنے والے صرف حضرت شیخ الہند ہی تھے، شکار کا بے حد شوق تھا۔ م

وقت تنگ ہو گیا تھا اور شام ہونے کی تھی مجبوراً واپس ہوا، میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی منڈوری فن ایسا نہیں جو یہاں پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرف سے ہوتا ہے، وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے، جو کام پروفیسر ہزار ہا روپیہ لے کر کرتا ہے، وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے۔ تو نفع سے خالی نہیں،

انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا، مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید وشاید۔

مجھے افسوس ہے کہ آج سر ولیم میور صاحب (سابق گورنر صوبہ متحدہ) موجود نہیں ہیں ورنہ وہ بکمال ذوق وشوق اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔"

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

اگر اس موقع پر بعض ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر دیا جائے جو بالعموم علماء اور مدارس عربیہ کی نسبت انگریزی تعلیم اور انگریزی مدارس سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے بارے میں عام طور پر پیدا کر دی گئی ہیں، تو شاید بے محل نہ ہوگا۔ علمائے کرام کے متعلق ابھی تک یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ انھوں نے انگریزی اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں انگریزی تعلیم کو ناجائز قرار دے کر مسلمانوں پر دنیاوی ترقی کے دروازے بند کر دیئے، جس سے وہ ترقی کے میدان میں برادران وطن کے مقابلے میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔

یہ ایک شدید غلط فہمی ہے، انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا، بلکہ وہ تہذیب و کلچر جو انگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کر کے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؛ ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ سرسید احمد مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز: فرنگی محل لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحی لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا کہ

> "لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبہ کے ہو تو ممنوع ہے، اور اگر اس لیے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لیے حکم فرمایا تو انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے سیکھ لیا۔ (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ باب العلم والعلماء جلد سوم صلا)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفسار کے جواب میں تحریر ہے کہ

> "انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ص۱۲)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ انگریزی پڑھنا جائز ہے، غرض کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا، بلکہ حصول معاش اور علم و آگاہی کے لیے صراحۃً اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ خود عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں مختلف

اسباب سے متعلق کے اعتماد و اعتقاد و ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور وہ غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتی ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ در اصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد اسباب تھے، سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حملہ آور انگریز کے خلاف جس نے انہیں حکومت و سلطنت سے محروم کر دیا تھا، شدید غیظ تھا، وہ اس کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے انگریز کے علوم اور اس تہذیب و تمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتا تھا، ہر چند، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے افراد شریک تھے اور دونوں قوموں نے مل کر بقدر استعداد اس جنگ میں حصہ لیا تھا، مگر انگریز کی نظر میں اس کا اصل مدمقابل مسلمان ہی تھا اس لیے انگریز نے قابو یافتہ ہونے کے بعد اسی کو اصل ہدف سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا، ملک کی ہر سربلندی اور آسودہ حالی سے مسلمان کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی، اس کا خیال تھا کہ تعلیمی لحاظ سے جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ بنا دیا جائے گا، اس وقت تک حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نہیں نکل سکے گا۔

یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا، جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ پشت پناہی بھی ان کو حاصل تھی، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے، انجیل کا درس لازمی تھا، اس چیز سے نہ صرف علماء کو اختلاف تھا، بلکہ کوئی عامی سے عامی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد، ۱۸۵۷ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنے زمانہ اسارت کی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے تمام باشندگان کو نصرانی بنانے کی مہم بنائی، ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا، اس لیے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی" (الثورۃ الہندیہ صفحہ ۳۵۶/۳۵۵)

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے سے مانع ہوئے، مگر انگریز نے نہایت ہوشیاری اور کمال چابکدستی کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے الزام سے بچانے کے لیے غریب علماء کے سر یہ الزام لگا دیا کہ مسلمانوں کو انگریزی کے حصول سے ان کے ملاؤں نے باز رکھا جس کی وجہ سے مسلمان تعلیمی میدان میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔ اس الزام کا اس شد و مد سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود مسلمانوں کو اس کا یقین آگیا۔

چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامی نے سرد کیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریز کی نفرت بھی کم ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے، اور رفتہ رفتہ غصہ و نفرت کی خلیج کم سے کم ہوتی چلی گئی۔

ایک اور غلط فہمی

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے حیات جاوید میں مدارس کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرسۃ العلوم (علیگڑھ کالج) کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر وہ انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنیکا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہوگئے اور برابر ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

خواجہ صاحب نے مدارس عربیہ کے قیام کا ذکر تہذیب الاخلاق کے نتائج کے عنوان کے تحت کچھ اس انداز سے کیا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدارس عربیہ کے قیام کا باعث تہذیب الاخلاق کی دعوت کا ردعمل تھا، وہ جوں جوں قوم کو انگریزی تعلیم کی طرف بلاتا تھا، لوگوں میں مدارس عربیہ کے قائم کرنے کا جوش بڑھتا جاتا تھا، یہ بات کہاں تک صحیح ہے اس کے لیے مدارس عربیہ کے قیام اور تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے کی تاریخ کا جان لینا کافی ہوگا۔ حیات جاوید میں خود خواجہ صاحب ہی نے لکھا ہے کہ:

"یکم شوال ۱۲۸۷ھ بمطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا (تہذیب الاخلاق) کا نمبر اول شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۲ھ تک پورے چھ سال برابر نکلتا رہا۔ (حیات جاوید ص ۱۳۳ حصہ اول)

دارالعلوم ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، اسکے متصلا ہی مختلف مقامات میں مدارس عربیہ قائم ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز تقریباً پانچ سال پہلے عالم وجود میں آچکی ہو، اس کو بعد کی چیز کے ردعمل سے کسی طرح بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ——

دارالعلوم دیوبند

کفیل الرحمٰن نشاط ایم اے (علیگ)
فاضل دیوبند

اے مرکز دیں، مرکز انوار نبوت
امت کے لیے ترکۂ سرکار نبوت

تو بحر ہے، دریا ہے کہ ہے چشمہ جاری
ترا نشۂ فیض ہے، مخلوق پہ طاری

تو مرجع ارباب جنوں، جان شریعت
کہتے ہیں تجھے لوگ گلستان شریعت

پھیلی ہے ہر اک سمت ترے علم کی خوشبو
چمکے ہیں اندھیروں میں ترے فیض کے جگنو

اس دور میں کیوں راہنما تجھ کو نہ کہدیں
کیوں اپنے اکابر کی دعا تجھ کو نہ کہدیں

ذرے بھی تری چشم کرم سے بنے مہتاب
حاصل ہوئی اک دولت دیں، دولت کمیاب

تعریف کے عنوان کی تعبیر کے قابل
الفاظ میسر نہیں تحریر کے قابل

مولانا سید نورالحسن بخاری

دارالعلوم دیوبند میں

طلباء دارالعلوم کا عظیم کردار

دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے جو عظمت عطا فرمائی ہے لاریب فیہ وہ اس کے عالی مقام اساتذہ کرام کی وجہ سے ہے، مگر میں حضرات اساتذہ سے قطع نظر طلباء دارالعلوم کی عظمت کا ذکر کروں گا. جس دارالعلوم کے پہلے متعلم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ ہوں، اسکے طلبا عظیم کردار کے مالک کیوں نہ ہوں؟

حصول علم کے دوران طالب علم کا کردار تحصیل علم ہے اور میں تحصیل علم ہی کے سلسلے میں مختصر طور پر طلباء دارالعلوم کا عظیم کردار بیان کروں گا.

غالبا ۱۹۲۰ء میں مجھے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے شرف نیاز حاصل ہوا اور اس کے دو تین سال بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ سے؛ پھر میری دعوت پر ان دونوں اکابر امت نے میرے دورافتادہ وطن سکھانی والا ضلع ڈیرہ غازیخان قدم رنجہ فرمایا. ان اکابر کی صحبت کے نتیجے میں مجھے تحصیل علم دین کا شوق دامنگیر ہوا اور میں غالبا ۲۶/۲۷ عیسوی میں ملازمت سے رخصت لے کر حصول علم کے لیے دارالعلوم دیوبند جا پہنچا. چونکہ میں سکولوں کے ماحول سے نکل کر گیا تھا جہاں دس بجے رات کے بعد پڑھنا صحت کے لیے مضر سمجھا جاتا ہے. لہذا جب دارالعلوم کے اندر میں نے اپنی پہلی شب اٹھ کر ایک جگہ نہیں کئی جگہ دیکھا کہ حضرات طلبہ بارہ ایک بجے رات کو کتابوں کے اوپر جھکے پڑے ہیں، تو مجھے ان کی یہ بات کچھ اچھی نہ لگی.

مگر یہ کوئی حادثہ یا اچانک واقعہ نہ تھا. یہ تو دارالعلوم کا معمول تھا. پھر لطف یہ کہ کوئی ذمہ کام نہیں کوئی استاد کہنے پوچھنے والا نہیں مگر طلبا کرام ہیں کہ آدھی رات سے پہلے تو عموما سونا جانتے ہی نہیں اور بعض تو آدھی رات کے بعد بھی پڑھتے رہتے ہیں. سارا دن پڑھائی، رات کا اکثر حصہ پڑھائی، نہ رات کو پوری نیند، نہ دن کو آرام، پھر خوراک کا یہ حال کہ دو چپاتیاں اور عموما دال، کبھی کبھار، بڑا گوشت، جس میں گھی برائے نام؛ میں سوچتا تھا کہ اس طرح ان کی صحت جواب دے جائے گی مگر اس ماحول میں رہتے رہتے میرا اپنا یہ حال ہو گیا کہ بعد جب دورۂ حدیث میں تھا، تو اسی رنگ میں رنگا گیا ؎

ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد

کے مصداق میں بھی اپنے دوسرے رفقاء ہم سبق حضرات کی طرح کتابوں کا کیڑا بن گیا اور آدھی آدھی رات تک کتابوں کاپیوں کے مطالعے میں مصروف و منہمک رہتا.

شیخ العرب والعجم و شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ دین و دنیا میں امام العصر تھے، پورے ہندوستان میں آپ کی مثال و نظیر نہ تھی؛ جہاں آپ عالم اسلام کے اس مرکزی دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے، وہاں کراچی سے سلہٹ

اور پشاور سے مدراس تک کی دینی اور سیاسی اسٹیج کو بھی آپ شرف مزین فرماتے، عموماً ایسا ہوتا کہ رات کو ۱۱۔۱۲ بجے آپ دور دراز کے طویل سفر سے واپس دارالعلوم تشریف لاتے۔ دارالعلوم پہنچتے ہی حضرت دارالحدیث پہنچ جاتے، نہ کوئی الارم نہ گھڑیال، مگر جانے کس طرح پورے دارالاقامہ میں خبر ہو جاتی اور طالب علم ہیں کہ کمروں اور بستروں سے نکل کر بھاگے بھاگے دارالحدیث پہنچ کر سبق میں شریک ہو رہے ہیں، یہ تو ہوا کہ نیند کے غلبے میں آنکھ لگ گئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، جاؤ آنکھیں دھو کر آؤ، مگر یہ بہت مشکل بلکہ شاید ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم بستر میں خواب غفلت کے مزے لے رہا ہو اور بخاری شریف کے سبق سے محروم رہ گیا ہو، خواب و بیداری، غفلت و ہشیاری جس حال میں بھی جو ہوتا تھا، چل کر نہیں تو رینا دوڑ کر دارالحدیث پہنچتا تھا اور آناً فاناً دارالحدیث طلبہ سے بھر جاتا تھا۔

امتحان

اب امتحان کا حال سنیے! امتحان کے دنوں تو یہ نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔ سالانہ امتحان کے دنوں میرا یہ حال تھا کہ دو راتیں جب کہ صبح صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا امتحان تھا، میں اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھا ایک کے بعد دوسری کاپی دیکھتا رہا، پل بھر کے لیے بھی بستر پر لیٹا، حتیٰ کہ صبح کی اذان ہو گئی۔

نماز میں نے دارالعلوم کی مسجد میں با جماعت ادا کی۔ میرے حواس تو بفضلہ تعالےٰ بجا رہے، مگر میرے ساتھ والے صاحب کا یہ حال تھا کہ ان پر نماز ہی کے اندر نیند کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہے۔ امام کے ساتھ رکوع اور سجدہ بھی نہ کر سکے۔

خوراک

اس شبانہ روز محنت کے ساتھ خوراک کا حال میں ضمناً بیان کرچکا ہوں، بالکل قوت لایموت! پھر یہ بھی سبھی طلبہ کو میسر نہ تھا، مجھے آج بھی وہ منظر اچھی طرح یاد ہے کہ رات کو غالباً عشاء سے قبل میں چہل قدمی کے لیے دارالعلوم سے باہر نکل گیا نہر کے کنارے ایک پُلی پر ایک طالب علم بیٹھے تھے، میں ان کے قریب ہو کر کیا دیکھتا ہوں کہ چنے چبا رہے ہیں۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدرسے سے کھانا نہیں ملتا، وجہ کیا بیان کی، یہ مجھے یاد نہیں ... اور گرہ سے کھانا کھانے کی استطاعت نہیں، اس لیے چنے کھا رہے ہیں۔

میں دارالعلوم کے اس عظیم فرزند کے اس پُرخلوص اور مجاہدانہ کردار سے بہت متاثر ہوا، مجھے اس بہادر بھائی کا نام اب تک یاد ہے یہ مولانا خوشی محمد تھے۔ غالباً ضلع جالندھر کے رہنے والے۔

میں بحر حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ حصول علم میں رات دن محنت کا وہ حال کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور خوراک کا یہ حال کہ دال روٹی بھی میسر نہیں۔

میرا یقین یہ ہے کہ روئے زمین پر کسی دنیوی کالج تو کجا، کسی دینی دارالعلوم میں بھی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے عظیم کردار کی مثال تلاش وتجسس کے باوجود نہیں مل سکے گی۔

دارالعلوم دیوبند پائندہ باد

ابنائے دارالعلوم زندہ باد

امن عالم کا بس اب سامان ہونا چاہیے

سب کا دستور العمل قرآن ہونا چاہیے

بس یہی دھن اب تجھ کو اب ہر آن ہونا چاہیے

حق کا جاری ہر جگہ فرمان ہونا چاہیے

(خواجہ عزیز الحسن مجذوب)

مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم
مدرس دارالعلوم دیوبند

دارالافتاء
دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم نے تقسیم ہند کے بعد ہوشمند اور فرض شناس علماء کی جو تعداد تیار کی، ان میں مولانا محمد نعیم استاد دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے عبداللہ سلیم نمایاں ہیں، یہ نوجوان فاضل صرف درس نظامی ہی کا فاضل نہیں بلکہ درس و افتاء، تحریر و تقریر سے بھی پوری دلچسپی رکھتا ہے، ایک مقرر کی حیثیت سے دینی جلسوں میں ان کی طلب ہے، ایک بہترین مجود کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو پر اکثر کلام پاک نشر ہوتے ہیں۔ تحریر سے طبعی مناسبت ہے، انہوں نے دارالعلوم کے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے :—

نوع انسانی کے عباداتی، معاشی اور معاشرتی امور میں خدائی احکام و ہدایات کی طرف علمی رہنمائی اور رہبری کرنے کو اسلام میں افتاء اور جس عظیم المرتبت خدمت سے متعلق ہے، اس کو مفتی کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کے اداری نظام کو دارالافتاء کا نام دے دیا جاتا ہے۔

افتاء کی اہمیت

افتاء کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دین، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو حاوی ایک جامع حقیقت کا نام ہے اور اسی وجہ سے زندگی کی ہر متغیر حالت میں وہ ہدایت و رہبری کرنے سے عاری نہیں ہے، خواہ قرآن و حدیث میں مصرح اصول و فروع کے ذریعے ہو، یا اُن سے مستنبط فقہی جزئیات کے ذریعے تو اسی صورت میں افتاء کا دائرہ بھی گوشہ ہائے زندگی کی وسعتوں سے ہم کنار ہی نہیں ہوتا، بلکہ اُن سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں دارالاسلام میں تو توقع تھا کہ مسلم معاشرہ کے زیر اثر بہت سے اسلامی قوانین و ہدایات پر خواہی نخواہی عمل ہو بھی جاتا ہے، لیکن جو ملک ایسا نہ ہو، وہاں بجا آوری احکام ہر فرد کے اپنے اختیار و تمیزی پر ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جگہ ایک مفتی کی مشغولیت اور ذمہ داریوں اور پیچیدگیوں میں کس قدر اضافہ ہو جاتا ہے — پھر مسلک حنفی کو چونکہ یہ امتیاز حاصل ہے کہ دیوانی اور فوجداری قوانین کے اصول و کلیات اور فروع و جزئیات غیر معمولی تفصیل کے ساتھ منضبط ہیں، اسلیے ایک حنفی مفتی کو عبادات و معاملات کے مسائل کے ساتھ قوانین محاکمہ مجادلات پر بھی گہری نظر رکھنی پڑتی ہے۔

منصب افتاء کی نزاکت

پھر چونکہ عام حالات میں کسی الجھن کے پیش آجانے پر ہی اصحاب فتویٰ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ان کا مطالعہ وسیع اور ذہن رسا ہونا نہایت ضروری ہے، اگر سوال کی کنہ کی طرف ذہن کی رسائی اور پھر اس کے جواب باصواب کا مع اپنے دلائل و مآخذ کے استحضار نہ ہو تو صحیح رہبری نہیں ہو سکتی، بلکہ بعض اوقات رہزنی ہوگی۔

آقائے دوجہاں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ"

جس شخص کو بغیر کسی علم کے فتوے دیا گیا ہے، تو اس کے گناہ (غلط عمل) کا ذمہ دار وہ شخص ہی ہوگا جس نے فتوے دیا ہے۔

اصل مفتی اللہ اور رسولؐ ہیں

اور چونکہ اس منصب جلیل کی نسبت اُس ذات گرامی سید الرسل خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے، جنکو بطور خلیفۃ اللہ کے منجانب مفتی حقیقی واصل جل علا کے افتاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اس لیے اگرچہ کسی بھی عالم کے لیے اس خطاب کی نسبت مجازاً ہی سہی لیکن منصب و خطاب کی جلالت قدر کا تقاضا ہے کہ مہارت علمی کے ساتھ کمال علم و تقوےٰ بھی حاصل ہو، اسی صورت میں استفتاء اور استفسار کرنیوالوں کو بھی وہ اعتماد نصیب ہوتا ہے جو اس فتوے کے مطابق عمل کرنے میں آمادہ کرنے میں کافی مؤثر ثابت ہو — مفتی اگر اخلاص اور تقوے سے بہرہ مند نہیں ہے، تو از رُوئے حدیث یہ بات دین کے لیے ایک بڑی آفت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا

"آفۃ الدین ثلاثۃ فقیہ فاجر و امام جائر و مجتہد جاہل" (المسند)

دین کے لیے تین باتیں آفت ہیں ایک بدکردار فقیہ دوسرے ظالم حاکم اور تیسرے جاہل مجتہد ـــ

اول جو مفتی علم و عمل کے اعتبار سے مضبوط ہوگا، وہی اصل میں ایک ایسا خادم ہوگا جس کی خدمت سے دین کو قوت بھی حاصل ہو اور مذہب دشمن طاغوتی اور شیطانی عناصر کے لیے اس کا وجود اور مساعی نقصان دہ ثابت ہوں ارشاد پیغمبری ہے:

فقیہ واحد اشد علی الشیطٰن من الف عابد

ایک فقیہ شیطان کے لیے سو عبادت گزاروں سے زیادہ سخت ہے۔

دارالعلوم دیوبند

کا تعارف یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جس وقت برطانوی سامراج نے ہندوستان پر پہلے سے کی جانے والی مسلسل ریشہ دوانیوں کے بعد بھرپور حملہ کر کے اپنا تسلط جمایا تو اس نے اپنے اور اپنے مذہب کے مدمقابل صرف اسلام اور مسلمانوں کو قرار دیا۔ ایک تو اس لیے کہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر اُن کی ایک ہزار سالہ تاریخ حکومت و سلطنت کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ صرف اسلام ہی اس بات کی صلاحیت مندانہ اہل ہے کہ مذاہب کے تقابل کی صورت میں وہ سینہ سپر ہو جائے۔

لہٰذا طاقت کے بل بوتے پر مسیحیت کے پرچار کے ساتھ ہی ساتھ اقتدار کے زیر سایہ منفی و مثبت طور پر اسلام کے خلاف کوششوں کو اس حد تک فروغ دیا کہ ذرا دیر اور توقف کر لیا جاتا اور بیدار مغزی نہ دکھلائی جاتی۔ تو برصغیر سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چکے ہوتے اور پھر اس کے دور رس اور ناگزیر جغرافیائی اثرات کے نتیجے میں دیگر اسلامی ممالک بھی متاثر ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں اسلام کا درخت بے برگ و بار نظر آنے لگا تھا، ٹھیک اسی وقت اس فرعون نژاد قوم کے مقابلے میں کچھ ہستیاں جانشین موسیٰ بن کر میدان میں آئیں تحفظ اسلام کا جوا اپنے کاندھوں پر رکھا، تعلیم و تبلیغ کے جھنڈے کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھالا اور اس کو سربلند کرنیکا تہیہ کر لیا۔

تاسیس دارالعلوم کا مقصد

چونکہ میدان کارزار کے عملی تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک ہزار سال تک غفلت کا شکار ہونیوالے عامۃ المسلمین سامراج کے

---

۱ قرآن حکیم میں ہے ویستفتونک قل اللہ یفتیکم (اور وہ لوگ آپ سے فتوے طلب کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتوے دیتے ہیں (الخ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فتوے دینے کی نسبت ظاہر کی ہے۔

کے ظالمانہ اور جابرانہ حملے سے اس قدر بے اوسان ہوچکے ہیں کہ اب اُنکے لیے تیغ و سناں سے مقابلہ بس میں نہیں رہا تو ایک اور صرف ایک ہی راستہ تجویز ہوا کہ ملت میں دینی علوم سے جو بُعد اور دُوری پیدا ہوچکی ہے، اُس کو دُور کیا جائے، علومِ اسلامیہ سے جس قدر بہرہ مندی ہوگی، اسی قدر عقائد اور اعمال میں پختگی آئے گی اور اسی کے نتیجے میں اسلام کے تحفظ کا حوصلہ بلند ہوگا، اور اسی طرح مسیحی قوم کی سازش ناکام ہوتی چلی جائے گی۔

ان حضرات نے عالمانہ اور عارفانہ بصیرت سے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ جب تک سینوں میں قرآن حکیم اور اُس کے علوم محفوظ ہیں اُس وقت تک اسلام کو کوئی آنچ نہیں پہنچ سکتی۔

اسی حقیقت نے ان حضرات کو ایک ایسا دارالعلوم قائم کرنے کی طرف متوجہ کیا، جو مفت دینی تعلیم کے ذریعے اسلام کی اس طرح خدمت کرے کہ سال بسال یہاں سے فارغ ہونیوالے مستند علماء و فضلاء فروغِ علم اور تحفظِ اسلام کے جذبہ سے سرشار ہوکر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر اسی طرز کے مدارس قائم کریں اور پھر وہ بھی دارالعلوم ہی کی طرح علماء خطباء، مجاہدین اور مصنفین کی فوجیں تیار کرکے میدان میں اتارتے رہیں۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم قائم ہوا، خدا نے مدد کی اور بالآخر چند ہی سال میں یہ اسلام اور علومِ اسلامیہ کی مضبوط چھاؤنی بن گیا

دارالافتاء دارالعلوم

دارالعلوم جس مقصد کے تحت قائم کیا گیا، اسی کی بناء پر از خود اس کے فرائض میں یہ بات داخل ہوجاتی ہے کہ بعنوان افتاء بھی عوام کی خدمت کرے۔ دارالعلوم نے اس فریضہ کی ادائیگی سے پہلوتہی نہیں کی اس ذمہ داری کو محسوس کیا۔ ابتدائی سالوں میں اساتذہ دارالعلوم بالخصوص قطب الاقطاب حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ حسب ضرورت دموقع فتاوٰی تحریر کرتے رہے۔ لیکن کام کی ذمہ دارانہ نوعیت و اہمیت نے اس بات پر مجبور کیا کہ کسی مناسب شخصیت کو باقاعدہ مفتی نامزد کرکے دارالافتاء کو مستقل حیثیت میں قائم کیا جائے۔

دارالافتاء کی رفتارِ ترقی

چنانچہ ۱۳۱۰ھ میں قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ نے مجلس میں تجویز پیش کی، مجلس کی منظوری کے بعد اسی جلیل القدر منصب کے لیے جس کو نامزد کیا گیا، اسی کے حالات نے ثابت کردیا کہ یہ نہ صرف اسی منصب کے لیے موزوں تھے، بلکہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے یہ عظیم المرتبت شخصیت فقیہ الامت، عالی مقام صوفی، ذی مرتبت عالم، باکرامت بزرگ حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ کی تھی جنھوں نے ۱۳۱۰ھ سے تادمِ آخر یعنی ۱۳۴۶ھ تک صدر مفتی کی حیثیت سے عوام و خواص کو دُور و نزدیک کے فرق کے بغیر فیض پہنچایا۔

افسوس کہ ۱۳۲۹ھ تک نقول فتاوٰی کا کام دارالافتاء میں نہیں کیا گیا۔ اس طرح ۱۹ سال تک برآمد ہونے والے فتاوٰی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کتنے تھے اور کیسے تھے۔ ۱۳۳۰ھ سے نقول فتاوٰی کا باقاعدہ نظام قائم ہوا۔ اس طرح اگرچہ دارالافتاء بہت پہلے سے قائم تھا، لیکن باقاعدہ دفتری ہیئت ۱۳۳۰ھ میں ہی ملی۔

دارالعلوم جو واحد مرکزی دینی یونیورسٹی بن چکا تھا، اس کی مرکزیت کا لازمی اثر دارالافتاء پر بھی سوالات کے جواب میں تحریر کیے جانے والے فتاوٰی عددی کثرت کے اعتبار سے بھی اور علمی دینی ہمہ گیری اور ساتھ ہی ان کی مقبولیت کے لحاظ سے بھی ایک بے مثال تاریخی ریکارڈ بن گئے۔

عددی کثرت کا یہ حال ہے کہ ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۹۴ھ کے اختتام تک چونسٹھ سال کے عرصے میں دارالافتاء سے موصولہ سوالات کے جو جوابات دیئے گئے اُن کی مجموعی تعداد چار لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو تیرہ (۴۱۵۸۱۳) ہے بلا شبہ یہ ایک زبردست علمی ترتیب اور تاریخ دارالعلوم میں علمی نوعیت سے نمایاں قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

ان فتاوٰی کی علمی اور دینی ہمہ گیری کا اندازہ اس مرحلے کو دیکھنے سے ہی بخوبی ہوسکتا ہے۔ فتاوٰی دارالعلوم کی تبویب کے بعد جو حصے اب تک شائع ہوچکے

ہیں اُن کا مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ شاید ہی کوئی عنوان ایسا ہوگا جس سے متعلق فتوے اس ذخیرے میں موجود نہ ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے نئے عنوانات اسی مجموعہ علمی کے ذریعہ سامنے آئے ہیں اور نہ صرف دینی اور مذہبی بلکہ غیر دینی مسائل پر بھی مستند رہبری کی گئی ہے۔

اس طرح اس عظیم ذخیرے کو بجا طور پر موسوعۃ دارالعلوم اور انسائیکلوپیڈیا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان فتاوے کے اندرون و بیرون ملک معتمد و مقبول ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ مشکل اور اختلافی مسائل پر دارالافتاء دارالعلوم ہی کے فتوے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ گویا مسائل شرعیہ میں فیصلے کے لیے اسی کو سپریم کورٹ کی حیثیت حاصل ہے۔

کافی عرصے تک دارالافتاء احاطہ مولسری کے شمال مشرقی جنوبی رویہ برآمدے کے کمرے میں رہا جس میں آج کل دفتر تبلیغ اور دفتر تنظیم ابنائے قدیم ہے، پھر جب عملے میں اضافہ اور کام میں پھیلاؤ نے اس جگہ کو تنگ بنا دیا، تو مسجد دارالعلوم کے مشرق میں وسیع صحن مسجد کے انتہا پر دو منزلہ وسیع و عریض عمارت بنائی گئی، نچلی مسجد میں مسجد کا خوبصورت اور حسین حوض بنا دیا گیا اور اوپر کے ۳ بڑے ہال کمرے دارالافتاء کے لیے خاص کر دیئے گئے۔ یہ عمارت ۱۳۹۶ھ میں مکمل ہوئی جس پر یہ کتبہ لگا ہے:

"الحمد للہ کہ این تعمیر مقدس موسوم بہ 'دارالافتاء' بزمانۂ اہتمام مولوی قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند در ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ حلیۂ تکمیل پوشید۔

مادہ تاریخش از نتائج فکر حاجی محمد قاسم صاحب نالم تعمیرات دارالعلوم حسب ذیل است۔

فاسئلوا اھل الذکر یہ ہے قول اللہ

سال تاریخ بہ سن ہجری یہی ہے واللہ"

کارکردگی دارالافتاء

ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس سے آغاز دارالافتاء سے اب تک جن حضرات مفتیان کرام نے بحیثیت صدر مفتی نائب مفتی کام کیا ہے، اُن کی مدت کارکردگی اور شعبے کی رفتار ترقی کو بیک نظر دیکھا جاسکتا ہے۔ بعد میں انشاء اللہ حتی المقدور ان حضرات کا مختصر تعارف بھی پیش کیا جائے گا۔

اسمائے گرامی حضرات صدور افتاء	مدت کارکردگی	ہر دور کے فتاویٰ کی تعداد
(۱) قطب الہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی	از ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۴۶ھ (۳۶ سال)	۴۲۵۱۹
(۲) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہی، حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب	۱۳۴۷ و ۱۳۴۸ھ (۲ سال)	۴۴۳۸
(۳) حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب	۱۳۴۹ھ (ایک سال)	۲۴۵۳
(۴) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ (حال مفتی اعظم پاکستان)	۱۳۵۰ھ تا ۱۳۵۴ھ (۵ سال)	۱۸۳۹۵
(۵) حضرت مولانا مفتی محمد سہول صاحب	۱۳۵۵ھ تا ۱۳۵۷ھ (۳ سال)	۱۵۱۸۵
(۶) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی	۱۳۵۸ھ (ایک سال)	۵۸۴۰
(۷) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ (ممدوح الصدر)	۱۳۵۹ھ تا ۱۳۶۱ھ (۳ سال)	۱۸۶۸۷
(۸) حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب	۱۳۶۲ھ تا ۱۳۶۳ھ (۲ سال)	۸۴۲۷

(۹) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب (ممدوح الصدر)	۱۳۶۴ھ تا ۱۳۶۶ھ (۳ سال)	۲۲۴۰۷
(۱۰) محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری مدظلہ	۱۳۶۰ھ تا ۱۳۸۶ھ (۲۰ سال)	۱۸۱۴۹۶
(۱۱) حضرت العلامہ مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی	۱۳۸۷ھ تا حال (یعنی ۹۴ء تک)	۹۶۰۰۰

حضرات نائبین افتاء

(۱) مولانا قاضی مسعود احمد صاحب دیوبندی	از ۱۳۴۳ھ تا
(۲) مولانا مفتی سید احمد علی سعید صاحب نگینوی	از ۱۳۵۹ھ تا حال
(۳) مولانا مفتی محمد جمیل الرحمن صاحب سیوہاروی	از ۱۳۷۴ھ تا

ان فتاویٰ کے ذیل میں اکثر مقالات اور رسالے بھی لکھے گئے جو فتاویٰ دارالعلوم کا جز ہیں۔ اور کچھ کو مستقل رسالے کی شکل میں شائع بھی کیا گیا۔ یہ مقالات ومضامین اپنی جگہ کافی تحقیق اور اہل علم عوام کے لیے مفید ہیں۔ اس طرح دارالافتاء کے زیر تصنیف کا سہارا بھی ہے۔ کچھ مقالات کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے۔

القول القریب فی اجابة الاذان بین یدی الخطیب

سائل نے ایک حدیث اور بحر الرائق کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ خطبۂ جمعہ سے پہلے کی اذان کا جواب بس میں کردینا چاہیئے؟ جواب میں فقہا نے احناف کے اختلاف اور ان کے دلائل کو نقل کرکے اپنے اکابر کی رائے کو مع وجوہ ترجیح کے تحریر فرمایا ہے۔ نہایت مختصر ہونے کے باوجود نہایت مکمل اور جامع فتویٰ بصورت مقالہ ہے۔

تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال

سائل نے سمت قبلہ کے سلسلے میں ہیئت دانوں کے اختلاف کو نقل کرکے کہ قبلہ کس درجہ عرض البلاد پر واقع ہے، سوال کیا ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت قبلہ کی سمت کا کیسے تعین کیا جاتا ہے؟ جواب میں نہایت تفصیل کے ساتھ استقبال قبلہ کی حد اور دور دراز علاقوں میں ضروری سمت قبلہ معلوم کرنے کے شرعی طریق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

الذکر التقوت کے شرعی احکام

سائنس دانوں کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر نہایت تحقیق سے بحث کی گئی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعے بلند ہونے والی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے یا اس کی بازگشت ہے اور دونوں صورتوں میں اس پر پڑھائی جانے والی نماز کا کیا حکم ہے؟

دارالافتاء اور دیگر فقہی مسالک

یہ دارالافتاء دارالعلوم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں حل مسائل میں کبھی جمود نہیں رہا۔ پیش آمدہ ہر مشکل مسئلہ میں علم وتحقیق کی رو سے سعت نظر وفکر کے ساتھ رہبری کی گئی۔ ناگزیر ضرورتیں پیش آنے پر قواعد اصول فقہیہ کے مطابق دوسرے فقہی مسلک سے بھی استفادہ کئے گئے اور عوام کو ابتلاء والجھن سے نجات دی۔ اسی کی ایک یادگار کتاب الحیلۃ الناجزہ بھی ہے، جس میں فقہ مالکی کے مطابق زوجۂ عنین اور زوجۂ مفقود الخبر وغیرہ کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔

طلبا دارالافتاء

دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر سال علوم عربیہ سے فارغ ہونیوالے ذی استعداد طلبا کو فتوے نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے یہ ایک سالہ کورس ہے جس میں رسم المفتی اور سراجی کے سبق بھی پڑھائے جاتے ہیں اور طلبا تفصیلی مطالعے میں مشغولیت کے ساتھ حضرات مفتیان کرام کی زیر نگرانی فتاوی بھی لکھتے ہیں۔ اس شعبے میں داخلے کے لیے ان ہی طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جنہوں نے حدیث اور فقہ کی اعلیٰ کتابوں میں بطور خاص امتیازی نمبر حاصل کرکے اپنی بہترین صلاحیت و مناسبت کی شہادت دی ہے۔

فتاوے دارالعلوم ترتیب جدید

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ نے حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے جو فتاوے بنام عزیز الفتاوے شائع کئے تھے وہ بہت مختصر تھے۔ غالباً ایک یا دو سالوں کے فتاوے کا مجموعہ تھے۔ اس لیے منجانب دارالعلوم حضرت مفتی اعظم کے تمام فتاوے کو جدید ترتیب سے شائع کرنے کا پروگرام جاری ہے محترم مولانا ظفیر الدین صاحب ترتیب فتاوے کا کام انجام دے رہے ہیں — اس وقت تک ۱۰ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

اب ہم ان حضرات مفتیانِ کرام کا تذکرہ ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ جنھوں نے بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم دیوبند میں کام کیا ہے۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا تعلق عثمانی شیوخ کے خاندان سے ہے، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں جو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے قریبی احباب میں سے اور دارالعلوم کے بانیین میں سے ہیں۔ مفتی صاحب کے دُوسرے بھائی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم اور علاتی بھائی حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب تھے۔

حضرت مفتی صاحب ۱۲۷۵ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ظفر الدین تھا، ۱۲۹۸ھ میں دارالعلوم دیوبند ہی میں تمام علوم و فنون سے فارغ ہوئے اور بسلسلہ تعلیم و تدریس میرٹھ تشریف لے گئے۔ وہاں کافی حضرات آپ کے ظاہری باطنی فیوض سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کی طلب پر آپ دیوبند تشریف لائے اور نیابت اہتمام کا منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا۔

پھر ۱۳۱۰ھ میں جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے آپ ہی کو منتخب فرمایا اور پھر اس وقت سے ۱۳۴۶ھ تک برابر بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم بلکہ مفتی اعظم ہندوستان فتاوے صادر فرماتے رہے۔

افسوس کہ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ تک دارالافتاء میں فتاوے کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا گیا۔ نقول فتاوے کا سلسلہ ذیقعدہ سنہ مذکور سے شروع ہوا۔ اس وقت سے اب تک کا ریکارڈ دارالافتاء میں محفوظ ہے۔ مفتی اعظم کا پندرہ سالہ فتاوی کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران آپ کے تحریر فرمودہ فتاوے کی مجموعی تعداد ۴۲۵۱۹ ہے جو ۲۰۵۶۱ خطوط کی صورت میں روانہ کئے گئے۔ حضرت مفتی اعظم کو فن افتاء میں اس قدر مہارت ہو گئی تھی کہ مشکل ترین معاملات پر بھی برجستہ فتوے تحریر فرما دیتے تھے۔ آپ کی حیات ہی میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے فتاوے کو درجہ استناد حاصل ہو گیا تھا۔ فتاوے میں آپ کا طرز تحریر نہایت جامع ہے۔ اور یہی اُس دور کے اکابر کا دستور بھی تھا۔ اکابر کی تصنیف اس پر شاہد ہیں نہایت مختصر اور جچے تُلے لفظوں میں مسئلے کے ہر پہلو پر روشنی پڑ جائے اردو فتاوی میں یہ حضرت مفتی اعظم کی اہم خصوصیت ہے، ہر فتوے میں دلیل و حوالہ لکھنے کا بھی معمول نہیں تھا۔

مثلاً سائل نے دریافت کیا کہ کنواں ناپاک ہونے کے وقت پے درپے ڈول نکالنا ضروری ہے، یا بتدریج بھی نکال سکتے ہیں، آپ نے جواب تحریر فرمایا الجواب: پے درپے نکالنا شرط نہیں۔ فقط۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو علوم ظاہری پر جس طرح درک تھا، اسی طرح

روحانیت و تصرف اور اخلاق باطنی میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ مہتمم اول[1] دارالعلوم سے بیعت و خلافت حاصل تھی، کرامات و تصرفات کے بہت واقعات آپ کی طرف منسوب ہیں، جن کے دیکھنے اور جاننے والے آج بھی دیوبند میں موجود ہیں۔ مزاج میں بے حد سادگی تھی۔ اہلِ محلہ کا سودا سلف خود ہی بازار سے لاتے تھے۔

۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو داعئ اجل کو لبیک کہا اور قبرستانِ قاسمی میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم اور جناب قاری جلیل الرحمٰن صاحب استاذ تجوید دارالعلوم آپ کے صاحبزادگان ہیں۔

شیخ الادب حضرت مولانا مفتی اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اصل وطن امروہہ ضلع مرادآباد، پیدائش ۱۳۰۰ھ بمقام بدایوں۔ والد منشی محمد مزاج علی صاحب سرکاری ملازمت پیشہ تھے، ان کو بچوں کی تعلیم کی طرف بوجہ کثرتِ کار توجہ نہیں تھی، والدہ کو بے حد شوق تھا کہ بچے حافظِ قرآن اور عالم بنیں۔ شیخ الادب صاحبؒ نے بچپن میں ہی بمقام شاہجہانپور حافظ شرف الدین صاحب کے پاس حفظِ قرآن مکمل کرلیا۔ جید حافظ ہوگئے، پھر استاذ کے کہنے پر کہ اُس وقت تک کیا فائدہ، جب تک کہ الفاظ کے معنے معلوم نہ ہوں عربی پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اپنے والد صاحب سے فارسی اور مولانا مقصود علی خاں صاحب سے تلہر بستی میں عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں، والد صاحب کا تلہر ہی میں تبادلہ ہوگیا تھا۔ پھر پنشن ہونے پر شاہجہانپور جاکر مقیم ہوگئے تھے۔ شیخ الادب صاحبؒ دس گیارہ سال کی عمر میں ہزاروں اشعار کے حافظ اور خود اپنے خلقے شاعر ہوگئے تھے۔ شاہجہانپور میں مدرسہ عین العلوم کے اندر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا بشیر احمد صاحب مرادآبادی سے عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر عربی کی تکمیل کے لیے دیوبند آنا چاہا، والدہ نے کم عمری کی وجہ سے سختی سے منع کردیا، لیکن لگن اور شوق نے مجبور کیا اور خاموشی سے دیوبند پہنچ گئے۔ دو ماہ کے بعد والدہ کا انتقال ہوگیا کچھ دنوں کے بعد میرٹھ جانا ہوا اور وہاں مولانا عاشق الٰہی صاحب کے اصرار پر مقیم ہوگئے۔ اور عربی کی تکمیل کی۔ پھر اپنے دیرینہ شوق کے مطابق دیوبند آگئے اور حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اساتذۂ معقولات و ادب و فقہ سے استفادہ کیا، بعد فراغت مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور اور پھر افضل المدارس شاہجہانپور میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں بُلا لیا گیا اور ابتدائی عربی کتابیں تدریس کے لیے سپرد کردی گئیں۔ ۹ سال تک بڑی محنت اور جانفشانی سے درس دیتے رہے۔ پھر ۱۳۴۷ھ اور پھر ۱۳۶۲ھ میں صدر مفتی کا عہدہ سپرد کردیا گیا۔ اوقات مدرسہ تدریس و افتاء کے علاوہ ہمیشہ مولانا کے خارجی اوقات بھی تعلیم و تربیت میں گھرے رہتے تھے۔ ہر محنتی طالب علم سے اولاد جیسا برتاؤ ہوتا تھا۔ وقت کے نہایت پابند تھے۔ کئی کتابوں پر حاشیے بھی تحریر فرمائے۔ نہایت سادہ مزاج، نہایت متقی اور کم گو تھے، آخر کئی سال ناظم تعلیمات رہے اور حدیث کے اعلیٰ اساتذہ میں شامل ہوگئے تھے، ۱۳۷۴ھ میں انتقال فرمایا اور قبرستانِ قاسمی میں مدفون ہوئے۔ دو صاحبزادے جناب قاری احمد میاں صاحب اور مولانا حامد میاں صاحب مدرسین دارالعلوم ہیں، طرزِ تحریر نہایت سادہ اور مختصر تھا۔

مفتی محمد شفیع صاحب

پیدائش ۱۳۱۴ھ۔ دیوبند کے عثمانی خاندان سے تعلق ہے، والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دارالعلوم کے درجہ فارسی کے مشہور استاذ تھے۔ مفتی صاحب کے دادا میاں جی امام علی صاحب دیوبند میں فارسی پڑھاتے تھے اور کافی لوگ اُن سے شرفِ تلمذ حاصل کیے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کی تحریر کے مطابق ان کا خاندان پہلے موضع جوڑا متصل قصبہ منگلور ضلع سہارنپور میں آباد تھا، مفتی صاحب کے پردادا میاں جی کریم صاحب دیوبند منتقل ہوگئے اور پھر یہیں گھرانہ آباد ہوگیا۔

مفتی صاحب ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

[1] مہتمم اول حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی تھے اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ مہتمم دوم تھے از مصحح

اور عربی کی ابتدائی کتب کا درس آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ اسرارہم سے بطور خاص ربط و تعلق تھا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ سے مفتی صاحب نے مشکوٰۃ شریف و جلالین پڑھی تھی اور حضرت توجہ خاص فرمایا کرتے تھے، اس لیے وقتاً فوقتاً کچھ فتاوے بھی لکھنے کے لیے مفتی صاحب کو دیتے تھے، مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے باقی نہ رہا اور مفتی صاحب بدستور تدریس ہی میں مشغول رہے، تا آنکہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کے بعد جب اُن کی جگہ متفرق حضرات سے کام لیا جاتا رہا، مگر ضرورت باقاعدہ اور مستقل کسی مفتی کے تقرر کی باقی رہی، تو ۱۳۴۹ھ میں مفتی صاحب کو باقاعدہ دارالافتاء میں منتقل کر کے مفتی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔

حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ کو آپ کے فتاوے کی نگرانی سپرد ہوئی، حضرت میاں صاحب کے علاوہ اہم اور مشکل فتاوے حضرت حکیم الامت کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کئے جاتے رہے۔ دارالافتاء میں آپ کے دو دور ہوئے ہیں، ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۵۴ھ اور پھر ۵۹ھ تا ۶۱ھ۔ مفتی صاحب نے علاوہ فتوے نویسی کے ایک اہم اور یادگار خدمت یہ انجام دی کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاوے کو مرتب صورت میں شائع کیا اور حضرت تھانوی کے مشورے کے مطابق اسی کے ساتھ اپنے تحریر کردہ فتاوے بھی امداد المفتین کے نام سے شریک اشاعت فرمائے۔ آٹھ جلدوں میں یہ مجموعہ دیوبند سے بارہا شائع ہوا۔

مولانا مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوری

پورینی ضلع بھاگلپور آپ کا وطن ہے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر شہر بھاگلپور میں حضرت مولانا شاہباز کی خانقاہ واقع ملاچک میں مولانا شاہ اشرف عالم سے پڑھتے رہے، پھر کانپور گئے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی سے اور مدرسہ فیض عام میں رہ کر مولانا محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا نور محمد پنجابی سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی مفتی حیدرآباد کے درس میں شریک ہونے کے لیے پیدل سفر کر کے حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں ۲½ سالہ قیام کے دوران مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق فلسفہ ہیئت ادب اور اصول فقہ کا درس لیا حیدرآباد سے دہلی آئے اور مولانا سید نذیر حسین مونگیری کے درس میں شریک ہوئے۔ پھر دارالعلوم دیوبند پہنچے اور حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد سات آٹھ سال تک یہیں درس دیتے رہے اسی دوران ۱۳۲۵ھ سے ۲۹ھ تک ۴ سال دارالافتاء میں منصب مفتی کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ۵۱۸۵ فتاوے تحریر کئے۔

اس کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث اور سولہ سال تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل بھی رہے۔

۱۳ رجب ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۴۹ء کو وفات پائی اور اپنے وطن میں ہی مدفون ہوئے۔ حواشی مکاتیب گیلانی ص۱۶۹۔

مولانا مفتی ریاض الدین صاحب

آپ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور غالباً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، نہایت نیک طبع سادہ دل اور ذی استعداد بزرگ تھے، عرصے تک دارالعلوم کے مفتی اور اس کے بعد مدرس اعلیٰ رہے اور معقولات و منقولات کی بڑی کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ ۱۳۵۶ھ کے لگ بھگ آپ کا انتقال ہوا۔ دارالعلوم کے دارالافتاء میں بھی آپ کی خدمات نہایت درجہ ممتاز اور اہم تھیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب

آپ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب ...... کے فرزند تھے اور حضرت مولانا محمد صدیق صاحب دارالعلوم

کے ابتدائی بزرگوں میں سے ہیں، مولانا محمد فاروق صاحب ملک کے مختلف حصوں میں درس و افتاء کی..... خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۶۲ھ کے قریب دارالعلوم کے دارالافتاء میں مفتی اول کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا، اور کئی برس آپ نے اس منصب جلیل کے فرائض ادا کئے۔ آخر میں آپ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں تشریف لے گئے۔ (گزشتہ سال بہاولپور میں ہی انتقال فرمایا)

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی بڑی خصوصیت یہ بھی کہ آپ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد رہتے عرصے تک رمضان المبارک میں تراویح میں آپ نے کلام پاک حضرت شیخ الہند کو سنایا دارالعلوم میں آپ مدرس بھی رہے اور مفتی بھی۔ آپ کی زندگی بہت سادہ تھی، مسائل علمیہ و فقہیہ میں نظر بہت عمیق اور فقہی مذاہب پر آپ کی واقفیت بہت وسیع تھی۔ دارالعلوم میں آپ کے افتاء کی خدمات اس عظیم الشان ادارے کے شایان شان تھیں۔

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب

والد: جناب سید کاظم حسن صاحب۔ بیس واسطوں سے مفتی صاحب کا سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے مل جاتا ہے، ساتویں پشت میں سید ابو اسحق ابراہیم ہوئے ہیں جو عہد شاہ جہانی میں بغداد سے دہلی آئے تھے۔ نو سال کے بعد پھر بغداد واپس چلے گئے، دوبارہ پھر ہندوستان آئے اور اورنگ آباد میں انتقال پا گئے۔

مفتی صاحب ۱۳۰۰ھ شاہجہانپور کے محلہ ملاخیل میں پیدا ہوئے خواجہ حسن نام رکھا گیا، جو بعد میں کسی عارف کے مشورے پر بدل کر مہدی حسن کر دیا گیا۔ بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے اور ابتدائی فارسی اپنے والد اور بڑے بھائی سے پڑھ کر مدرسہ عین العلم شاہجہانپور میں داخل ہو گئے وہاں صرف و نحو کی کتابیں مولانا شیخ عبدالحق صاحب بانی مدرسہ و خلیفہ حضرت گنگوہی اور مفتی کفایت اللہ صاحب رح کے پاس پڑھیں، جب مفتی کفایت اللہ صاحب مدرسہ امینیہ میں منتقل ہوئے، تو آپ بھی ان کے ہمراہ وہاں آ گئے اور مدرسہ امینیہ ہی میں تکمیل کر کے ۱۳۲۹ھ میں فارغ ہوئے۔ اور وہیں مدرس ہو گئے، پھر بخاری اور ترمذی پڑھنے کے لیے حضرت شیخ الہند کی خدمت میں دیوبند آئے اور ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اور پھر حضرت گنگوہی قدس سرہ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، لیکن خلافت و اجازت حضرت گنگوہی کے خلیفہ مولانا شیخ شفیع الدین مہاجر مکی سے حاصل ہوئی۔

پھر مدرسہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت میں صدر مدرس بنائے گئے۔ اور ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۶۸ھ تک مسلسل تیس سال گجرات و بمبئی کے علاقہ کے مفتی اعظم کی حیثیت سے بھی افادہ عام کرتے رہے۔ ۱۳۶۹ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند صدر مفتی کی حیثیت سے بلایا گیا۔ ۸۶ھ تک یہاں بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ فتوے نویسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ فقہ حنفی میں ہندوستان کے اندر آپ بے نظیر مہارت رکھتے ہیں ساتھ ہی حدیث اور فن اسماء الرجال پر بھی بڑی گہری نظر ہے۔ امام محمد کی کتاب الحجۃ اور کتاب الآثار پر آپ کی تعلیقات بڑی قابل قدر سرمایہ علمی ہیں۔ اپنی مسلسل علالت اور ضعف پیری کی وجہ سے اس وقت شاہجہانپور ہی میں ہیں، دو صاحبزادے ہیں، مولانا احمد میاں اور مولوی محمد میاں۔

تصنیفی رنگ کی عربی لکھنے پر بڑی اچھی قدرت ہے فتاوے میں طرز تحریر تفصیل پسندانہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب

پیدائش ۱۳۲۵ھ بمقام گنگوہ ضلع سہارنپور، والد بزرگوار حضرت مولانا حامد حسن صاحب، مدرس مدرسہ نہٹور ضلع بجنور، نہایت بزرگ متقی، محتاط اور سادہ مزاج تھے، حضرت شیخ الہند سے شرف تلمذ حاصل تھا، مفتی صاحب کی ابتدائی عربی تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں ہوئی پھر آخر کے تین سال کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، پھر مزید ایک سال کتب حدیث کی تعلیم کے لیے مظاہر العلوم میں گزارا بعد فراغت ۱۳۵۱ھ میں معین المفتی کے عہدے

پر مشاہرہ دس روپے ماہانہ تقرر ہوگیا۔ والد صاحب کے خط لکھنے پر کہ اس قدر قلیل مشاہرہ اہل خانہ کے لیے ناکافی ہے، اس لیے کسی اور جگہ مناسب تنخواہ پر ان کو بھیجدیا جاتے، مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ (مظاہر العلوم) نے جواب تحریر فرمایا تھا کہ ان کی اہلیت وصلاحیت کی وجہ سے ہی انکو یہاں رکھ کر ذمہ داریاں سپرد کی گئی تھیں جو ان کے لیے آئندہ چل کر نہایت مفید ہوں گی، لیکن اگر آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو تو ان کو کسی دوسری جگہ بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۳۷۱ھ میں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تشریف لے گئے، کانپور میں قیام کے دوران عام افادہ علمی ہوا، بحیثیت مفتی کافی شہرت ہوئی۔ رسالہ نظام اور دیگر رسائل میں مفید علمی تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس طرح کانپور کے اہل علم میں مرکزی شخصیت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے جلیل القدر منصب پر تقرر ہوا، نہایت سادہ مزاج، متواضع، پرہیزگار، کثیر المطالعہ اور ذاکر و شاغل ہیں توکلاً علی اللہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بخاری شریف جلد ثانی کا درس بھی متعلق ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہ سے بیعت وخلافت حاصل ہے، اسی وجہ سے ہر جمعہ سہارنپور میں گزارنے کا معمول ہے۔ طلباء کو ذکر وشغل کی تلقین بھی فرماتے رہتے ہیں۔ فتاوے میں طرز تحریر اختصار پسندانہ ہے، کم سے کم اور باریک حرفوں میں ہر جواب ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب

سن پیدائش: صبح صادق چہار شنبہ ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ تاریخی نام حفیظ الرحمٰن، جائے پیدائش، موضع اوندرا، ضلع اعظم گڑھ، والد صاحب کا نام، مولانا محمد رفیع صاحب، خاندانی سلسلہ شیخ الہند استاذ قدیم حضرت عالمگیر سے جا ملتا ہے، جو اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔

ابتدائی تعلیم دیہاتی مکتب میں اور فارسی وابتدائی عربی مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں، درمیانی تعلیم مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ فتحپوری دہلی میں اور پھر تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، دارالعلوم سے ۱۳۵۲ھ میں فراغت کے بعد مدرسہ جامع العلوم حسین پور ضلع اعظم گڑھ میں جاکر تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۵ سال کے بعد مدرسہ دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں استاذ عربی اور مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دارالعلوم تشریف لائے اور دارالافتاء میں مفتی کی حیثیت سے کام شروع کیا

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ارشد حضرت تھانوی قدس سرہٗ) سے ۱۳۴۴ھ میں جب وہ مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں دوبارہ مدرس بن کر تشریف لائے تو ان سے ربط وتعلق قائم ہوا، تاآنکہ حضرت ہی سے بیعت ہوئے اور ان ہی کی خدمت سے وابستہ ہوگئے۔ حضرتؒ سے آپ کو اجازت وخلافت حاصل ہے۔

تحریر فتاوے میں اختصار کے بجائے تفصیل وتشریح پسند ہے۔

حیرت انگیز اعداد وشمار

دارالعلوم کا قیام ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور اسی وقت سے افتاء کا کام شروع ہوگیا۔ لیکن ۱۳۲۹ھ تک (۴۷ سال) نقول فتاویٰ کا اہتمام نہ کیا گیا۔ ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۹۴ھ تک ۶۴ سال میں جو فتاویٰ جاری کیے گئے۔ ان کی تعداد پڑھیے اور سر دھنیے کہ ایک یہی خدمت کس قدر ہے۔ ۶۴ سال کے فتاوی ۴ لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو ستاون۔

۴۱۵۸۵۷

افتاء کی اہمیت وعظمت

اسلام ایک ہمہ گیر، وسیع اور دائمی نظام حیات ہے، جو انسان کو انسانیت بخشتا ہے، انسانی مجد و شرف سے ہم آغوش کرتا ہے رب العلمین نے اس عظیم الشان نظام حیات کے لیے قرآن مقدس کو نازل کیا، رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ رسول اور معلم کائنات بنا کر مبعوث فرمایا، اس نظام نے اپنی امتیازی شان ہمہ گیری اور دوامی حیثیت کے بقاء کی خاطر اپنے اندر ایسی لچک اور گنجائش رکھی ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ انسانی ضروریات کا ساتھ دے سکے؛ انسان ترقی کرتا گیا اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسائل و احکام کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہی ہے، ان میں ایک خاص انداز سے سب بیان کیا گیا ہے، لیکن چونکہ ہر زمانے میں ہر شخص کو یکساں حالات سے واسطہ نہیں پڑتا اور پھر ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ ہر حالت کے لیے قرآن و سنت سے صحیح جواب حاصل کر سکے، اسی کے پیش نظر ضرورت تھی کہ قرآن و حدیث پر نظر عمیق رکھنے والی ایک معتمد جماعت ضروری مسائل کو مستنبط کرتی رہے، ان ہی مستنبط احکام و مسائل کا نام فقہ و فتاوے ہے۔

مفتیان کرام کی جماعت جن کو فقہ سے مناسبت تام ہوتی ہے، ہر زمانے میں پائی گئی ہے اور عوام و خواص ہر ایک ان کی جانب رجوع کرتے رہے۔

دین کی خدمت

دین کی خدمت کے لیے امت کے دو طبقے مخصوص طور پر سامنے آتے اور دین کی خدمت میں پیش پیش رہے، ایک طبقہ محدثین کا، جنھوں نے حفاظت و صیانت حدیث نبوی کا مشغلہ اپنایا، انھوں نے احادیث نبوی کی روایات اور ان کے بیان و ضبط کا اہتمام کیا۔

دوسرا طبقہ فقہاء کا؛ جنھوں نے قرآن و حدیث سے مسائل و احکام منضبط کئے، ان کی نظر الفاظ حدیث سے زیادہ معانی اور اصول و قواعد پر مرکوز رہی۔

مفتیوں کا تعلق دوسری جماعت سے ہے، پھر اسی امت

کے سب سے پہلے مفتی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چنانچہ صحابہ کرام اور دوسرے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور اپنے پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں حکم دریافت کرتے اور آپ جواب ارشاد فرماتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس عظیم الشان منصب پر جلیل القدر، صاحب بصیرت، صحابہ کرامؓ فائز ہوئے جنھیں کتاب و سنت کا فہم خصوصی حاصل تھا، صحابہ کرامؓ کے بعد تبع تابعین، پھر بعد کے فقہاء و علماء نے اس سلسلے کو قائم رکھا اور یہی سلسلہ ہے جو ہمارے اس دور تک پہنچا ہے، دارالعلوم دیوبند کا دارالافتاء بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پس منظر

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی، نظام حکومت کے ہر شعبے پر انگریزوں کا تسلط ہوا، اس وقت انگریزوں کی حکومت میں اسلامی نظام ختم سا ہوگیا۔ دینی مدارس، علمی مراکز خاص طور پر نشانہ بنے، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی طور و طریق کے آثار مٹائے جانے لگے، مغربی تہذیب رائج ہونے لگی؛ چونکہ عنانِ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے وہ اپنے عقائد و نظریات افکار و خیالات کی بآسانی اشاعت کرنے لگے، دین پر ظاہری و باطنی ہر صورت سے یورش ہونے لگی، اس وقت خدا کے چند برگزیدہ بندوں نے اسلامی نظام کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا، ایسے ہی نازک وقت میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

مقصد یہ تھا کہ دین کی حفاظت ہو، اسلامی نظام کو باقی رکھا جائے، مسلمانوں کو فکری، دینی اور مذہبی فتنوں، گمراہیوں کی مسموم ہواؤں سے بچایا جائے، علم و فن، دین شریعت، تبلیغ و ہدایت اور تصنیف و تالیف کا ایک عظیم مستحکم قلعہ ہو، تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کر کے ان کے بقاء کا سامان کیا جائے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم و تربیت کے لیے مختلف شعبے قائم ہوئے جن میں سب سے اہم شعبہ دارالافتاء کا ہے۔

دارالافتاء کا قیام

مدرسہ قائم ہونے کے بعد افتاء کی یہ صورت رہی کہ جب کبھی کوئی مسئلہ میں استفسار کرتا ہوا وہ اساتذہ اور علماء ادارہ سے معلوم کرلیتا، اس وقت کوئی منظم نوعیت نہیں تھی، بس انفرادی طور پر مستفتیوں کو جواب مل جاتا، عملی انضباط کی کوئی صورت نہیں تھی، پھر استفتاء زیادہ آنے شروع ہوئے اور دارالعلوم کو دارالافتاء کی منظم شکل میں قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ ۱۳۰۴ھ میں جب کہ دارالعلوم کو قائم ہوئے ۲۲ سال گزر چکے تھے، منظم طور پر دارالافتاء کی داغ بیل ڈالی گئی، لیکن اس وقت بھی اس کے لیے افراد متعین نہیں کیے گئے اور ذمہ داری کسی مخصوص فرد کو نہیں دی گئی، اب بھی اس کی ارادی اور عملی انضباط کی کوئی صورت نہ تھی، ۱۳۱۰ھ میں باضابطہ طور پر دارالافتاء کو مستقل شعبہ بنانے کا منصوبہ سامنے آیا۔

منصب افتاء کیلئے نامزدگی

اب ضرورت پڑی ایسی شخصیت کی جو اس عظیم منصب کی اہل ہو، چونکہ منصب افتاء علمی شعبوں میں سب سے زیادہ اہم، مشکل اور دقیق سمجھا گیا ہے، فقہ کی بے شمار جزئیات اور ان سے متعلقہ احکام میں ذرا سی تبدیلی سے بھی حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے، جو فقہ سے کامل مناسبت ذہن و ذکاء میں خاص صلاحیت اور مادہ تفقہ کے

بغیر دشوار ہے، اُس کے لیے احوالِ زمانہ سے واقفیت، دینداری، دور اندیشی، بیدار مغزی، یقین و اعتماد کا ہونا بہت ضرورت ہے اس لیے دارالعلوم جیسے علمی مرکز جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے کہ دارالافتاء کے لیے ایسی شخصیت کی تلاش تھی، جو علم و تفقہ کی امتیازی استعداد کے ساتھ صلاح و تقویٰ اور برگزیدگی کی شان کی حامل ہو چنانچہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا جو گویا ازل سے اسی عہدے کے لیے پیدا کی گئی تھی وہ ذات گرامی تھی، مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا الشیخ عزیزالرحمٰن عثمانی دیوبندی قدس سرہٗ کی۔

وہ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک عہدہ افتاء پر فائز رہے، گویا ۳۶ سال تک افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن افسوس تو یہ کہ ۱۸ سال تک افتاء کی نقل نویسی نہ ہوئی، اس وجہ سے اس وقت کی نقل موجود نہیں،

۲۹ھ سے طلباء نے نقل شروع کیا، ۱۳۳۳ھ میں مولانا قاضی مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تقرر آپ کے رفیق سفر کی حیثیت سے ہوا، اسی وقت سے رجسٹر میں مستفتی کے سوالات اور ان کے جوابات کی نقل موجود ہے، جن کی مجموعی تعداد ۳۸ ہزار کے قریب ہے یہ تعداد درج رجسٹر کی ہے، علاوہ بریں کچھ ایسے حضرات بھی ہونگے جن کے فتاوے عجلت کی وجہ سے رجسٹر میں درج نہ ہوئے ہوں۔ نیز ایک مستفتی کئی کئی سوالات ایک کاغذ میں لکھتے ہیں، اگر وسطاً تین سوالات مان لیے جائیں تو فتاوے کی مجموعی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہوتی ہے اور یہ تعداد بھی ان فتاوے کی ہے جو رجسٹر میں درج ہوئے اس سے پہلے کی جب کہ نقل افتاء کا انتظام نہیں تھا، اتنی ہی تعداد فرض کرلی جائے، تو اس طرح مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوے کی تعداد کم و بیش ڈھائی لاکھ ہوتی ہے۔

ان کے بعد ایک بار پھر ضرورت محسوس ہوئی ایسی ہی جامع ہستی کی جو کہ حسن و خوبی اس عہدے کو سرانجام دے سکیں، چنانچہ ۴۶ھ میں منصب افتاء کے لیے شیخ الادب والفقہ مجمع علوم و فنون حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ افتاء کی خدمت پر مامور ہوتے ۶۶ھ تک رہے۔

پھر ایک دفعہ ضرورت پڑی، اس مسند کی زینت کے لیے کسی کامل ہستی کی، جو اس اہم ترین ذمہ داری کو انجام دے سکے، چنانچہ حضرت مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری کا انتخاب عمل میں آیا۔ وہ دن رات کد و کاوش اور غیر معمولی جانفشانی کے ساتھ لگے رہے۔ ۱۳۸۲ھ تک مسلسل دارالافتاء میں مفتی اعظم کے بطور منصب افتاء کی ذمہ داری نبھاتے رہے، حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمۃ کے بعد ان کی دوسری شخصیت تھی جنھوں نے طویل عرصے تک دارالافتاء کے ساتھ وابستہ رہ کر شعبے کی نگرانی اور عظیم خدمت انجام دی۔

ضعف لاحق ہونے کی بناء پر عہدے سے سبکدوش ہوکر وطن کوچ کرگئے، آج کل وہ اپنے وطن ہی میں ہیں۔ ادام اللہ بقاءہٗ مع الصحۃ والعافیۃ۔

ان کا زمانہ بھی دارالافتاء کی ترقی کا زمانہ تھا، جب دنیا کے ہر ہر گوشے سے بکثرت استفتاء آتے رہے اور تندہی کے ساتھ ان کے جوابات لکھے گئے، انکے معاون کی حیثیت سے حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی کو مفتی اعظم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، جو اس سے پہلے کانپور میں افتاء کا کام کرتے رہے تھے، لوگوں میں ان کے حسن عمل، علم و تفقہ کی وجہ سے کافی مقبولیت تھی، ان کی ہی شخصیت تھی جن کو عظیم منصب کا اہل مناسب خیال کیا گیا، تا حال اس عہدے پر فائز ہیں، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی مدظلہم العالی اور مفتی علی احمد سعید صاحب مدظلہم رفیق کار کی حیثیت سے افتاء اور طلبہ کی تمرین فتویٰ نویسی میں مشغول ہیں۔

ترتیب فتاوائے دارالعلوم

فتاوائے کا یہ بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا یہ بے مثال ذخیرہ عام نظروں سے اوجھل تھا، ان فتاوے سے صرف مستفتیوں نے فائدہ اٹھایا، دوسرے طالبوں کی ان تک رسائی کی کوئی صورت نہ تھی ضرورت تھی کہ انھیں مرتب کرکے شائع کیا جائے، تاکہ اس کا نفع عام ہو جائے چنانچہ قبلہ حضرت الحاج مولانا قاری طیب صاحب مدظلہم العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تجویز رکھی، جس کو اراکین شوریٰ نے منظور کر لیا، پھر ترتیب کا کام شروع ہو گیا۔ آخر میں ترتیب فتاوے کے لیے جناب مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی (بہاری) کو مامور کیا گیا، انھوں نے غیر معمولی جانفشانی اور تندہی سے ترتیب فتاوے کا کام حسن اسلوب سے انجام دینا شروع کیا، سب سے پہلے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاوے کی ترتیب دی جانے لگی، جس کی ۹ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو صرف طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، نکاح، طلاق پر مشتمل ہیں، تکمیل جانے کتنی جلدوں میں ہو!

تمرین فتوائے نویسی

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند جہاں ایک طرف امت اسلامیہ کو فتاوائے ارسال کرنے کی خدمت انجام دے رہا ہے، وہیں دوسری طرف ایسے افراد کو بھی تیار کرتا ہے، جو ملک کے دیگر اطراف میں افتاء کا کام کریں، اس واسطے ہر سال دارالعلوم سے فارغ ممتاز ذی فہم اور محنتی دس طلباء کا انتخاب کرکے افتاء کی تربیت دی جاتی ہے چنانچہ وہ طلباء مشق فتاوئے نویسی کے ساتھ کتب فقہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنے وطن جا کر فتوائے نویسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

اصحاب حق و اقتصاد

کا

طریقہ یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کو حق اور راستی پر یقین کرتے ہیں — اور تمام —
ائمہ مجتہدین اہل سنت کو اپنے اپنے مجتہدات میں
برسر حق و بصیرت سمجھتے ہیں
— اور سب کی —
محبت و تنظیم اور عموم حسن ظن کو اہل سنت کیلئے
ایک علامت بتلاتے ہیں
— سب کا —
علم و عمل کتاب و سنت پر تھا — کوئی نہیں
— جس نے —
بلا کسی دلیل و بصیرت کے اجتہاد کیا ہو، البتہ
عصمت صرف انبیاء کے لیے ہے۔ (انتہیٰ)

(ابوالکلام آزاد)

مدح طیب

یادگار حضرت قاسم نانوتوی عالی تبار
حضرت قاری محمد طیب صاحب وقار
حکمت احکام اسلامی کے ماہر بے بدل
علم کو بھی جن کی نسبت پر ہے فضل افتخار

فضل الفضل / حاصل رشیدیہ

مدحِ دار العلوم دیوبندیّہ

في الطويل المثمن والقافية متدارك

ناظم القصيدة مولوی محمد شفیق سلہٹی ... شیخ الحدیث ... مدرس صدر جامعہ العلوم ... ضلع سلہٹ

دَجَنْتُ بِدَارٍ دارِ علمٍ مُحَقَّقٍ   مَتٰى اَهْلُهَا فَضْلاً عَلَى الْمُتَفَوِّقِ
اَتَيْتُ عِمَارَةً تَلُوحُ مُخَشْخِلاً   حَسِبْنَا لِجَذْبٍ كَوْكَبٍ مُتَأَلِّقِ
رَحِيبًا جَمِيلاً بَلْ جِمَاعَ الْمَدَارِسِ   مَقَامُ بَنَائِهَا مِنَ اللهِ خَالِقِ
اَشَاعَتْ عُلُومَ الدِّيْنِ نَشْرًا بِعَالَمٍ   دَنَتْ اَهْلُهَا بِهَا ثُرَيَّا الْمُعَلَّقِ
لَقَدْ عَرَفَتْ حِمْدًا عُلُومَ نَبِيِّنَا   شِفَاءٌ عَنِ الْكُفْرَانِ بِدْعِ الْمُزَنْدِقِ
عَنِ الْجَهْلِ وَالطُّغْيَانِ فِسْقٍ مُسَلْسَلٍ   فَعَزَّتْ عَلٰى بِدْعِ الْعَدُوِّ الْمُحَلِّقِ
لِسَالَتْ نُهُوْرُ عِلْمِ دِيْنٍ مُتَرَفِّعٍ   يَفُوْزُ بِهَا مَنْ رَادَهُ مِنْ خَلَائِقِ
وَقَدْ زَيَّنَتْ اَهْلَ الْهُدٰى بِالْفَوَاضِلِ   قَضَاءٌ مِنَ الْمَوْلٰى الْقَدِيْرِ الْمُوَفِّقِ
مَحَتْ بِدْعَ دَارِنَا اُصُوْلاً تَرَوْنَ لَوْ   اَدَرْتُمْ عُيُوْنَكُمْ تُقًى فِي الْحَدَائِقِ
اَفَادَتْ وَجَادَتْ بَلْ تَرَقّٰى بِسُلَّمٍ   لِيَبْلُغَ اِلَى السَّمَاءِ صِيْتُ الشَّقَائِقِ
لَزَادَتْ بَنُوْهَا فِي الْوَرٰى فَوْقَ خَالِنَا   حُمَاةً لِدِيْنِنَا هُدَاةً لِعَائِقِ
دِرَايَةَ كُلِّهِمْ تَفُوْقُ لِمَا مِنَّا   قَضَاءً وَاِفْتَاءً وَدَرْسًا لِحَاذِقِ
يَعُدُّهُمُ الْوَرٰى بُدُوْرًا لِاَزْمُنٍ   اَنَارَتْ فَاَمْحَتْ اَنْجُمًا فِي الْمَغَانِقِ
وَاِنَّ بَنِيْهَا ثُمَّ اَبْنَاءَهُمْ سَمَوْا   لِمَحْضٍ فَزَادُوْا عَنْ نُجُوْمِ الطَّرَائِقِ
بِمَحْمُوْدِنَا وَاَنْوَرٍ طَارَ مَعْدِنُ   سَمَاحَتُهُ مِنَ الْحُسَيْنِ الْمُدَقِّقِ
نَرٰى طَيِّبًا مُكَمَّلاً فِي الْمَدِيْحِ اَذْ   لَبِيْبًا بِحَادِثٍ وَلُوْعَ الْحَقَائِقِ
دَلِيْلاً عَلٰى اَسْرَارِ بَانِيْهِ اَنْتَ تَ   هَدَايَا الْمَدِيْحِ مِنْ قُلُوْبِ الْبَطَارِقِ
يَفُوْتُ بِمَنِّهِ الْهِيِ الْاَنَامِ فَتُوْ   تَ عِلْمَ تَدَيُّنًا وَفَضْلَ مُوَفَّقِ
تَعَلَّمْ فَلَا تُحْرَمْ عَنِ الْعِلْمِ مُهْتَجِيْ   يَقِيْنًا وَاِنْ عَدَدْتَ وَقْتًا فَفَارِقِ

ئه اسم الادارة ، دار العلوم الديوبندية · ئه بانيها ، قاسم العلوم النانوتوي · ئه ناظم القصيدة

رانا جمشید علی جم
راجن پور

مکتبِ تدریسِ مسلم، حق نوا دارالعلوم — جوہرِ حسنِ تکلم حق رسا دارالعلوم

جوہرِ تدریسِ مومن بہرِ تنظیمِ رزمِ حق — جلوۂ نظمِ شریعت حق نما دارالعلوم

نغمۂ آدابِ محفل، بزمِ نورسِ حق نما — مرکزِ آداب روشن دل رسا دارالعلوم

قوتِ احساسِ الفت از اخوت چشم دید — کل مومن اخوۃ نظم بجا دارالعلوم

مرکزِ تدریسِ روشن، نظمِ بزمِ سیخ پا — جوہرِ تدریسِ اشرفؒ عزم وا دارالعلوم

مرکزِ درسِ حقائق شانِ شیخ الہندؒ پیش — بہرِ تنظیم، حق روا، گرم نوا دارالعلوم

جوہرِ تبلیغِ اولیٰ از ادارہ پیش پیش — گوہرِ الیاسؒ روشن نجمِ راہ دارالعلوم

مرکزِ دین و سیاست بہرِ تنظیمِ قومِ حق — روشنیِ درسِ قرآں حق بجا دارالعلوم

جوہرِ حسنِ شریعت از امیرِ شرح خوب — مرکزِ حسنِ بخاریؒ درس گاہ دارالعلوم

جلوۂ آدابِ مسلم نظمِ بزمِ حق شاداب — جوہرِ فارابِ مسلم، حق نگاہ دارالعلوم

جلوتِ آدابِ طیبۂ جلوتِ اسلامِ حق — جلوۂ قرآں ز قرآت، حق نوا دارالعلوم

جوہرِ نعتِ سیاست نظمِ بزمِ حق طلب — جذبۂ آزادِ مومن برملا........دارالعلوم

مرکزِ علمِ شریعت، حق طریقت، حق سرا — جوہرِ جذباتِ قاسمؒ حق طلب دارالعلوم

گردشِ آلام روشن بہرِ مسلم حق جہاد — ورزشِ مسلم بجا در ہند، پا دارالعلوم

جلوتِ آداب روشن بہرِ مسلم چار سو — جلوت خلوت نمایاں حق نگاہ دارالعلوم

جوہرِ حسنِ تکلف نظمِ بزمِ ادب وا — نظمِ بزمِ ادبِ شرع حق بپا دارالعلوم

گردشِ آدابِ مومن بہرِ مکتب سیخ پا — گوہرِ حسنِ جبلت چشم وا دارالعلوم

شیوۂ آدابِ الفت نظمِ شرع حق بساط — جوہرِ تکذیبِ باطل، جسم بجا دارالعلوم

جلوتِ احساس خلوت حق رسا مومن نوید
نظمِ بزمِ حق ندا ہو یا خدا دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند

— اور —

اُس کا مستقبل

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمی سے

ایک مُلاقات

○

بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا

مقام دعوت و تجدید

علمی، سیاسی، معاشرتی، تجدیدی، کارنامے

• انٹرویو • ضبط و ترتیب سمیع الحق ایڈیٹر ماہنامہ الحق ۲۰ رجب ۱۳۹۸ کو لیا گیا

پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بنا پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پُرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ الحق کے لیے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتویؒ کے علوم و اسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا جائے۔ اِدھر یہ خواہش، اُدھر حضرت کی مصروفیات اور دیگر پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تھکاوٹ سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لیے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

حضرت سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا، بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز سہی، لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا تو خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں کہ عشق است وہزار بدگمانی۔ ــ جس شجرۂ طوبیٰ کے لیے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف قاسمیہ کے امین اور بانیٔ دارالعلوم کے خلیفہ رشید مولانا محمد طیب صاحب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا، جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب مدظلہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، عقیدہ، ایمان اور توکل

سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں، اللہ بہتر کرے بنیاد تو اس کی ایسی ہے کہ مستقبل روشن ہے۔ انشاء اللہ اور یہ اس لیے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوتے، مگر اللہ کا فضل ہے، وہ بڑھتا ہی رہا۔

اطمینان اور تسلی کے لیے یہی کچھ کافی تھا مگر یکایک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب صدر اوّل دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفے یا پیشگوئی کی طرف گیا۔ جیسے کہیں پڑھا یا سنا تھا اور پھر جب یہ خیال آیا کہ دارالعلوم دیوبند اپنی زندگی کے سو سال تو پورے کر چکا ہے تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند پڑی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے اس بارے میں پوچھا کہ حضرت کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو۔ حضرت نے اس کا جواب دیا تو یکایک فکر و اضطراب کی گھٹائیں، اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہوگئیں۔

بات دُوسرے پیرائے میں دُہرائی۔

حضرت تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے، تو یہ تو دین، علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہیے۔ ابھی میں نے اپنی بات پُوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا امید افزا اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کی بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا:

"میں نے اپنے بزرگوں، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لیے شخص واحد کا ہونا ضرُوری نہیں بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی اور ان اکابر کی جماعت ہے۔ یہ سب مجدد ہیں، جنھوں نے سنّت اور بدعت میں معرُوف اور منکر میں تمیز پیدا کی اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند ہے۔ لہٰذا اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰن نے دُوسرا مقولہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو محل ہے، تجدید دین کا، اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے۔ دارالعلوم اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الرحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے، تو اس کے اردگرد کے پاٹ گھومتے ہیں، اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے۔"

- اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی

حضرت اپنی بات ابھی سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویو نگاروں کی ستم کاری کا

شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ:

آپ لوگوں کا منشا یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگتے ہو، دن کو بھی نہیں سونا چاہیئے، آج بھی جاگنا چاہیئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے، جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے، اس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری قدرشناس میزبان حکومت نے آپ کے تقریر و بیان پر پابندی[1] لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے، صبر، تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کی بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ جی ہاں! یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے، یا پھر میرے ضعیف بڑھاپے اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور جگہ جگہ دوستوں کے تقاضے پر مجھے بولنا پڑتا، تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی، گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا۔

عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس پذیرائی کا ذکر چھڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی، مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علو اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا اور ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے، حضرت کی طرف بڑھایا گیا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی داماں کو دیکھ کر مسکرانے لگے: "ارے بھئی یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں۔ اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشے پر گفتگو کے لیے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے"۔

مگر ایک سدابہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع و اقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن ہی سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے، تو یہی اور سرسبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں تھا جن کے سر پر خدا نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جد وجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم و تہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد میں اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں، حضرت حجۃ الاسلام یگانۂ روزگار تھے۔ ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بلاشبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی اخلاقی اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ شعرانی کا علم الکلام، غزالی کا سوز و گداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت و دانش، احمد سرہندی کی غیرت و حمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت، یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں اور بقول حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی، ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا دیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازیؒ اور غزالیؒ ہی سمجھیں گے۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت و عزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لیے کہا گیا تھا اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرما رہے تھے۔

---

[1] جس سفر کا ذکر ہے، اس دوران حکومت نے حضرت مدظلہ کی تقریر و تحریر پر پابندی لگا رکھی تھی۔

• حضرت نانوتوی نے زندگی میں جو کام انجام دیئے، وُہ تو بہت زیادہ ہیں، لیکن بنیادی طور پر ۳ بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ کام اتنا عظیم کام ہے کہ پُوری دُنیا پر اُس نے اثر ڈالا ہے۔ دُوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید صاحب خلیفہ تھے، گو وُہ نام کی رہ گئی تھی، مگر حضرت چاہتے تھے کہ وُہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالکِ اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لیے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوبؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی۔ یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں، اسلحہ مہیا کر رہے ہیں، غرض ہمہ وقت معروف رہتے۔ تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔ تاکہ تمام ممالک اسلامیہ میں کچھ نہ کچھ ارتباط تو قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح بیوگان کو انتہا درجے کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی۔ اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرائے میں اس کی تحریک شروع کی، جب اندرونی طور پر خوب کر اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔ ہمارے یہاں دیوان دروازہ جو ہے، وُہ نواب لطیف اللہ خاں مرحوم کا محل ہے، جو اورنگزیبؒ کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اس میں حضرت نے وعظ فرمایا، بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے کہ کیا کہنا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آگئی ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجا وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھیں۔ ۹۵ برس کی عمر تھی۔ نہ نکاح کے قابل، نہ کچھ، مگر اعتراض کرنیوالے کو اس کی کیا ضرورت ہے، وُہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دُنیا کو نصیحت کرتے ہیں، مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا، انھوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم تو عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو۔ فرمایا: بہرحال میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں، آج ایک سنتِ رسولؐ زندہ ہوتی ہے اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے، فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنتِ رسولؐ کا احیا میری وجہ سے ؟۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ مُنہ میں دانت نہیں ہے، کمر جھک گئی ہے، ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہُوں۔ اعتراض کرنیوالے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ اگر سنتِ رسولؐ میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہُوں۔ تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاوند کا وہاں پر چودہ پندرہ آدمی خاندان کے تھے، ان ہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے، اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، پھر وہی سائل کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہئے، اس نے کہا کہ آپ دُنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے، تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟ فرمایا کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔

اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لیے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ۷۰، ۸۰ نکاح پڑھائے گئے، پھر ریت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا، اس کی رُوح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہو جائے اور ایمان سنبھل جائیں، تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے، وُہ رہ گیا تو

آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لیے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ مراد آباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ ملیہ، دہلی میں مدرسہ اشاعت العلوم انبٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور گلاؤٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا اور جتنے متوسل تھے، خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ دین مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔ ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرے کے سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ بھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نمود باقی رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے۔ اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے، مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ جب امیر نادر خاں کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں، میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں، بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابر کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا، امیر بڑی عنایت اور شفقت سے پیش آئے۔ جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ ملاقات کے لیے شاید کمرے میں بلایا جائے گا، لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آ رہے ہیں ہم سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقے پر معانقہ، دایاں بایاں مونڈھا چوم کر بڑی محبت کا اظہار انھوں نے کیا اس کے بعد فرمایا: بفرمائید، آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا: نہ نہ خلاف ادب است، فرمایا: نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے، میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خاں اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب دمنصور انصاری اور ان کے پیچھے غازی حبیب اللہ۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو کرسی کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں اور وجہ مختصر یہ ہے کہ حکومت کابل کی خدمت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خاں صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان، یہ دونوں بیعت تھے، حضرت گنگوہیؒ کے اور برطانیہ نے انھیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا، تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آکر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ اور حضرت کوئی نصیحت فرما دیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا کہ جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا۔ انھیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟ امان اللہ کی حکومت

حضرت چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نمود قائم رہے اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے مربوط تو رہے۔ خلافت عثمانیہ کی حمایت کا مقصد بھی یہی تھا کہ عالم اسلام میں کچھ نہ کچھ مرکزیت — اور — باہمی روابط باقی

کابل کی حکومت ہمیں اکابرِ دیوبند کی دعاؤں سے ملی

صدر اعظم افغانستان

تھی، یہ لوگ بنی عام میں سے تھے۔ انہیں عہدے وزارتیں تو ملی تھیں، مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا، وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر یہ کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی، امان اللہ خان معزول ہوئے، کیونکہ اس نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے، وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدر اعظم نے فرمایا کہ ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی، جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اُڑھاتی تھی اور ہمیں شفا ہو جاتی تھی۔ آج ڈاکٹر رفیق بے دجو ترک ہے، کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں، مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی، جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اور فرمانے لگے کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لُٹا گیا۔ لاکھوں روپے کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے، پھر صدر اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

یہ تو تھے افغانستان سے روابط۔ اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا۔ جیسے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی، وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترکی اور افغانستان، سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں، حضرت کی یہ تحریک تھی اور وہ ہو بھی حملہ آور، مگر کچھ تو یہ کہ تیار نہ تھا، کچھ ناتربیت یافتہ تھے نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثے میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں تو گویا حضرت جوشِ جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطرافِ عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلے میں سہی، مگر ممالکِ اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے اس سلسلے میں حضرت نے دارالعلوم دیوبند میں محکمۂ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا، مگر انگریز نے آخر میں آکر توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا، جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا، چنانچہ وہ آیا، رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا، اس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور نہایت جرأت کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرعِ محمدی کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضا قائم کیا ہے؟ حضرتؒ نے بڑی نرمی سے کہا کہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں، جو لاکھوں

حضرت چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی کہ عالم اسلام متحد ہو۔ ترکی اور افغان مل ملا کر غلام ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ ۱۸۵۷ء میں تو حضرت نانوتویؒ جوشِ جہاد میں غرق اور جان دینے کے لیے بے تاب تھے

روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے، ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیا، مگر اس نے کہا کہ نہیں، آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، میں رپورٹ کروں گا۔ اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ کان پکڑ کر اسے نکال دو، طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو، اس شیطان کو یہاں سے، بہرحال عید کا دن آیا۔ تھانیدار کے ہاتھ دودھ کے بلٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے، اس کو فوری طور پر برخاست کیا جاتا ہے اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی، پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے، تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ لاتے ہوئے کہتا جاتا تھا کہ افسوس! میں نے رپورٹ نہیں کی، مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی، تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا، اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہوا۔ اس کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے جب لندن سے مسٹر مانڈے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا، تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد) علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لیے گئے اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمہ قضا قائم کر دیا جائے، جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں: نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا، اور پارلیمنٹ میں بھی لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، نہ اس نے یہ پیش کیا، نہ ایسا ہوا۔

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے ذریعے ہی سہی قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلے میں حضرت نانوتوی نے ایک کام یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لیے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی، وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے، تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلام کے جذبات لے کر آئیں گے، تو علم و معاشرت سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں، جو حضرت کی تمام خدمات کی محور رہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی، مگر یہ مجلس ذکر قاسمؒ میں ایسے محو کہ گویا آپ حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکایک حضرت قاری صاحب نے بساط لپیٹنی چاہی۔ سننے والے چونک پڑے! اور حضرت کے ضعف و نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتویؒ کی ایک مخصوص شان علمی کمالات کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے۔ کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے، ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو تکلیف دینے سے روک رہے تھے۔ مگر دل بضد تھا کہ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دو!!

حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرط و نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت کی جو تصانیف ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانی کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ سو برس تک فلسفہ کتنے ہی روپ بدل کر آئے۔ لیکن حضرت کی حکمت اس کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہو گی، سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا، اتنی حجتیں جمع فرما دیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے، جنھوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو یہ حضرت ہی کا حصہ ہے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے، کہ حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی، بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی۔

علم کے بارے میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے اور ان کے ہاں اخفا تھا ہی نہیں، جو واردات ہوتی، صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا۔ یہ الہام ہوا۔ یہ عادت تھی، تو ایک دن فرمایا کہ بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا، میرے مرنے میں کسر نہیں تھی، طلبہ نے عرض کیا کہ کیا پیش آئی؛ فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی، تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب میں گزرا اور اس کے بعد خود فرمایا کہ جس شخص کی توجہ کا اتنا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ کر سکے تو وہ شخص اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ ائمہ فن تھے مولانا سید احمد صاحب امام معقولات سمجھے جاتے تھے ان سب نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں، حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب صاحبؒ تو صدر مدرس تھے۔ تو حضرت نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرتؒ نے درس شروع کر دیا۔ الٓمّٓ سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو ڈھائی گھنٹے تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ یہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے، بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہذا تکرار کیا جاوے، تو درہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا۔ مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی، بیچ میں ایک جگہ کچھ بات یاد نہیں رہی، کسی اور کو بھی یاد نہ آئی تو کہا کہ میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا، تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آرہے تھے۔ تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا تو حضرتؒ نے کھڑے کھڑے یہ تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فرما رہے ہیں، تو عرض کیا کہ حضرت ذرا نازل ہو کر فرمائیے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی، تو الفاظ سب سمجھ میں آئے، مگر معانی نہیں، تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمائیے، ہم وہاں تک نہیں پہنچے، تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت لیجئے گا۔ تو اس وقت کہہ دیا تھا، تو علوم میں اس وقت عروج ہو گا کہ ادھر کو رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا، تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو زندہ ہے ہی۔ راقم نے عرض کیا کہ حضرت ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے، فرمایا ہاں ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھپایا بھی، تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں، اس لیے کہ ملا کی توجہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ مغلق مضامین ہیں میں نے کہا کہ بھئی حمداللہ، ملا حسن اور قاضی سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا، عرض کیا گیا کہ کاش! مولانا مناظر حسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔

الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں

(اُردُو ترجمہ)

سپاسنامہ

جو

خدام دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مولانا مولوی حبیب الرحمن صاحب معاون مہتمم نے

علامہ سید رشید رضا

کی

خدمت میں عربی میں پیش کیا جب وہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کیلئے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء میں تشریف لائے تھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم : اے بزرگان انجمن و مولانا سید رشید رضا ! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم زندہ سلامت رکھے۔

مہمان کی مدارات ایک ایسی برگزیدہ اور پسندیدہ خصلت ہے جو تمدن کا اقتضا، انسانیت کا جوہر، شریعت کی تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے، بالخصوص جب کہ مہمان کوئی کریم النفس عظیم الشان بلند مرتبہ شخص ہو جب کہ آپ نے از رہ بے تکلفی محض اخلاق اسلامیہ کے ادا کرنے اور بزرگان دین کے طریقے کو زندہ کرنے اور برقرار رکھنے کی غرض سے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ ہمارا فرض تھا کہ ہم آئین مہمانداری اپنے مہمان محترم کے شایان شان، شاندار جماعت کے ساتھ، پرتکلف دھوم دھام سے استقبال کرتے، لیکن سادگی کے جس کے ہم بہ فطرت سے ہم خوگر ہیں نیز اور ضروریات تکلف کا یہاں نہ ملنا کہ ہنوز اس قصبے میں شہریت کی شان پیدا نہیں ہوئی، تمدن کی ضروریات خاطرداری اور مہمان نوازی کے سامان آسائش و آرام کی چیزیں یہاں دستیاب نہیں ہوتیں اور نیز یہ خیال کہ چونکہ ہمارے برگزیدہ مہمان کا پاک دل علم کے انوار سے منور اور بزرگان دین کے اخلاق حمیدہ سے آراستہ ہے، لہذا آرائش و تکلفات مروجہ جو آج کل کے جدت پسند حضرات کا شعار ہے اور جس کو اسلام اور سچے کا مسلمان پسند نہیں کرتے۔ بالفرض ہمارے مہمان محترم کو پسند نہ ہوگا

داعی ہوئے کہ ہم ظاہری تکلفات کو چھوڑ کر صرف اپنے سچے دلی اخلاص، محبت ایمانی پر اکتفا کریں کہ جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو

یکجہتی کے رشتے میں وابستہ اور اتحاد کے سلسلے میں جکڑ کر بند کر دیا ہے اور ایک پائے دار اور ہمیشہ باقی رہنے والی شے ہے:

خدا کے واسطے ہے جو محبت
اسے ہر حال میں بے شک بقا ہے
سوا اس کے ہے جو الفت جہاں میں
وُہ خود غرضی کے شعلہ ... فنا ہے

یہی وجہ ہے یہ اسلامی رابطہ جس میں نہ ریا کا شائبہ ہے نہ کدورت کا۔ نہ طمع کی آمیزش ہے، نہ خود غرضی کی۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کہ اُن میں باوصف کمال علم اور صفائی قلب کے تکلفات کا نام ونشان نہ تھا۔ ہمارے لیے شمع راہ ہوئی کہ ہم تکلفات سے قطع نظر کر کے محض سادگی سے اپنے مہمان عزیز کا خیر مقدم کریں۔

اگر در سینۂ سنت طلبے میدہ دی
میانہ روی بادیست اے اخی

ہم کو سیدِ مکرم کے الطاف کریمانہ سے اُمید ہے کہ ہم سے جو کچھ فروگزاشت ہو اس سے چشم پوشی اور جو کچھ خطا ہو اس کو معاف فرما کر نظرِ عنایت والفت سے مسرور فرمائیں گے۔

خطاؤں کا کرے اقرار اپنی
تری خدمت میں جب کوئی خطا کا
نہ ہو ناخوش خطا کو بخش دے تو
کہ ہے یہ شیوہ احرار و ابرار

اے سیدِ مکرم: آپ کا وطنِ مالوف (مصر) سبز و شاداب پُر رونق پُرفضا خوش منظر، رفیع العمارات ہونے کے علاوہ اسلام کا قبہ اور اسلامی دُنیا کا گہوارہ ہے۔ ہمیشہ سے علم کا منظورِ نظر رہا ہے۔ شرف و فضائل کی گرم بازاری نے اہلِ مصر کی علمی تجارت کو نفع بخشا اور مالا مال کر دیا۔ ہر زمانے میں علم کے ارکان اور عظمت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نگہبان وہاں پیدا ہوتے، ہمیشہ اہلِ معارف واہلِ حکمت کا گنجینہ رہا اور انشاء اللہ تعالےٰ رہے گا۔ اُن ہی مصر کے اہلِ کمال میں سے ایک آپ کی ذات ہے: کہ مشرق و مغرب میں آپ کے علم کا ڈنکا بجا ہوا ہے اور عرب وعجم میں فضل و ہنر کا شور مچا ہوا ہے۔ آپ کی ذاتِ مقدس قوم کی ہمدردی میں منہمک ہے۔ اصلاحِ قوم کا آپ نے بیڑا اُٹھایا ہے۔ قوم کی کج روی دُور کرنے میں سعیِ بلیغ فرمائی ہے۔ راستی و درستی کی ہدایت کی ہے۔ اہلِ زمانہ کو فلاح کی سڑک پر ڈالنے اور گمراہی و کجی و فساد کے میل کچیل سے پاک صاف کرنے میں بے حد جد و جہد سے کام لیا ہے اور ہندوستان بلادِ اسلامیہ سے دُور پھر یہاں نہ وُہ تر و تازگی۔ نہ وُہ رونق و فضا — اس پر طرّہ یہ کہ بدقسمتی سے آئے دن اختلافات کی آندھیاں آتی ہیں۔ افتراق کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ہوا پرستی اور خود رائی نے ناس کر دیا ہے۔ جسے دیکھو، اپنی رائے کا متوالا، جسے دیکھو اپنے خیالات کا تابع ایک دُوسرے کی آبرو کا لیوا۔ خانہ جنگی، فرقہ بندی نے جمعیت کے شیرازے کو پریشان کر دیا۔ اس مہلک مرض نے تالب گور پہنچا دیا۔ ذلت و رُسوائی کا اچھی طرح ذائقہ چکھا دیا اور پھر یہ ہمارا وطن (دیوبند) جس کو آپ نے تشریف آوری کی عزت سے نوازا ہے اور ہندوستانی آبادی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کی مثال بعینہٖ ایک چٹیل زمین اور تیرہ و تاریک گھر سی ہے کہ جہاں کسی آنے والے مہمان کو مسرت و فرحت و دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہیں آتا، ہم شرم سے سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ہم حیران و دم بخود ہیں کہ آپ کی جناب میں کیا تحفہ پیش کریں اور کیونکر آپ کے اس بارِ احسان سے جو آپ نے ہماری گردن پر رکھا ہے، سبکدوش ہوں۔

ہاں ہمارے پاس کچھ علوم کی پونجی ہے کہ آج اہلِ زمانہ کی ناقدر شناسی سے جس کی کساد بازاری ہے جس کی دکانیں بند ہیں، جس کے بازاروں میں ہڑتال ہے۔ اللہ رے ویرانی کہ اب صرف اس کے آثار ویران شکستہ

ویرانی مکانات ہو کا عالم ہیں، نہ وہاں کوئی داعی ہے نہ مجیب، کوئی مونس ہے، نہ حبیب۔ یہ ہدیہ خدمت عالی میں پیش ہے، ہم کو خدا کے فضل سے یقین ہے کہ ہمارا یہ ہدیہ ضرور شرف قبول حاصل کرے گا، آپ کی گم شدہ دولت ہے، آپ اس کے مستحق ہیں۔ اور یہ آپ کا مال ہے جہاں آپ کو ملے۔

اے سید مکرم: ہندوستان میں اسلام پر ایسا پُر آشوب زمانہ آچکا ہے۔ قریب تھا کہ علوم شرعیہ کے خیمے اُٹھ جاتے۔ اُن کے چشمے سوکھ جاتے۔ ان کے عالی شان آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں منہدم ہو جاتیں، ان کے جھنڈے سرنگوں ہو جاتے، ان کی علامتیں مٹ جاتیں حق تعالیٰ شانہ کے احسان کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو کہ اُس نے اپنے اولیائے باخبر اور رازداران باصفا کی ایک جماعت کو ادھر متوجہ فرمایا۔ خدا تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے کہ انھوں نے تباہی اور استیصال سے پہلے اُمت مرحومہ کی دستگیری فرمائی۔ اس برگزیدہ جماعت نے اپنی فراست ویقین سے معلوم کر لیا تھا کہ اگر علوم شرعیہ کا انتظام نہ کیا گیا اور اس کی بقاء کے لیے کچھ قوانین وضوابط مہید نہ کیے گئے تو ہندوستان میں ان کا بقاء ناممکن ہو گا۔ بلکہ علمائے ربانیین کی وفات کے ساتھ یہ علوم بھی مُردہ اور ان کے ساتھ مدفون ہو جائیں گے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُمت مرحومہ کی دستگیری نہ فرماتا تو اس میں کچھ شک بھی نہ تھا کہ علم ہندوستان سے رخصت ہو جاتا۔ ان بزرگوں نے ۱۲۸۳ھ میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری پر اس مدرسے کی بنیاد رکھی۔ کسی خاص قوم یا جماعت یا شہر کی تخصیص نہیں کی، بلکہ ساری دُنیا کے مسلمانوں کو وُہی مساوی تعلق و استحقاق ہے جو دیوبند کے مسلمانوں کو اور نظام تعلیم و قواعد وضوابط مہید کیئے۔ اس مدرسے کی اصلی غرض اور مقصود یہ ہے کہ شریعت محمدی کی پُورے طور پر حفاظت اور حمایت کی جائے۔ لوگوں کو اسلام کے سیدھے اور روشن راستے پر چلایا جائے۔ نہ کسی کی بُرائی کے درپے ہوں نہ کسی سے جھگڑا کیا جائے۔ نہ کسی کے خلاف ہو۔ اپنے کام سے کام ہو۔ ہاں اگر اظہار حق اور تبلیغ دین کی ضرورت داعی ہو اور اس لیے کسی کا خلاف ہو جائے تو ناچاری ہے، مداہنت سے بچنا مسلمان کا فرض ہے:

مدرسے کا قائم ہونا تھا کہ دُور دُور سے طلبہ ٹوٹ پڑے تعلیم علوم اسلامیہ میں مصروف ہوئے۔ جو ہر علوم سے اپنی جیبیں بھر لیں علم کی دولت سے مالا مال آداب شریعت سے آراستہ ہو کر خلق خدا کی ہدایت اور حق کی طرف دعوت کرنے کے لیے دنیا میں پھیل گئے۔ یہ طرز پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اکثر شہر قصبات، دیہات میں مدارس اسلامیہ چھوٹے بڑے ہر قسم کے اسی طرز پر قائم ہوتے، جہالت کی آندھیاں، خواہشات نفسانی کے جھکّے۔ فتنوں کے بگولے، علم کے درخت کو مضمحل کرنا چاہتے تھے۔ الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے چھینٹوں سے درخت علم کی شاخیں ہری بھری، ترو تازہ نظر آنے لگیں، اور مدرسے کو اپنی امیدوں میں پوری کامیابی ہوئی کہ دُور دراز سے علم کے مشتاق سفر کی زحمتیں برداشت کرکے آتے ہیں اور فائز المرام ہو کر واپس جاتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اس مدت میں باوجود بے سروسامانی تقریباً ایک ہزار فاضل امین دینتین، حامل شرع و ناشر سنت، مبلغ الاسلام مدرسے نے پیدا کئے ہیں، جو تدریس تعلیم، ارشاد و تلقین، وعظ، مناظرہ، تصنیف و تالیف، افتاء کی گرانقدر خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ ہندوستان باوجود اپنی وسعت کے بحمد للہ تعالیٰ اس مدرسے کے شاگردوں سے اور علم برداروں اور فیض رسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمان علمی فیوض کے گلشن کے سائے میں راحت گزیں ہیں تو اسلام کے دشمن حصن شریعت کی طرف نظر اٹھانے سے معذور ہیں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ مدرسہ کے مقدس بانی یعنی حضرت امام مجدد ملت بیضاء و حامل لوائے شریعت غرا مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

اور اس کے مربی سرپرست نگہبان حضرت شیخ محدث ناقد فقیہ مجتہد امام شریعت و طریقت مولانا مولوی رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہ کی غرض اور مقصود گو یہ تھا کہ دین کی حمایت اسلام کی حفاظت جس طرح بھی حاجت داعی ہو کی جاوے، لیکن علم کے بازو کی تقویت اور جماعت علماء کا ابقاء کہ جن کی بقا پر مذہب کی روح کا بقا موقوف و منحصر ہے۔ اصلی غرض و اہم مقصود تھا۔ لہٰذا اولاً انہوں نے مدرسہ کے قواعد و ضوابط کے استحکام اصول کی مضبوطی نظامات تعلیم وغیرہ کی تکمیل کی طرف توجہ اور کوشش بلیغ فرمائی اور جب یہ امور مکمل ہو گئے اور مدرسہ اپنی مراد کو پہنچ گیا تو مدرسہ کے اراکین نے دوسرے مدارج کی تکمیل کی طرف توجہ فرمائی اور مدرسہ میں درجۂ تکمیل مقرر کیا کہ طالب علم بعد تکمیل نصاب درسی و تحصیل سند فضیلت درجۂ تکمیل میں ترقی کرے اور فنون ضروریہ میں یدطولیٰ حاصل کرے۔ اور ایک انجمن منعقد کی جس کا نام جمعیۃ الانصار ہے یہ اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ کی انجمن ہے۔ اس انجمن کا اصل اصول مدرسہ کے فیوض و برکات کو پھیلانا ہے۔ احکام شرعیہ کو عوام طبقے میں نیکی کے ساتھ پہنچانا اسلام کی حفاظت معاندین و مخالفین کی مدافعت کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس انجمن کے چند شعبے ہیں۔

دینی رسائل و کتب کی تالیف و تصنیف اور گمراہوں کے چنگل سے عوام اہل اسلام کی حفاظت کرنا، واعظین و مناظرین مقرر کرنا، دوسرے ملکوں میں اسلام کی اشاعت کرنا انگریزی دان فاضلوں (ایف اے۔ بی اے، ایم اے) کو بڑے بڑے وظائف دے کر دینیات کی تعلیم دینا۔ سرکاری مدارس میں مسلمان طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے مدرسین مقرر کرنا۔ دیہات میں مکتب قائم کرنا وغیرہ ذالک۔

لیکن ان مقاصد عالیہ میں جلد اور معمولی سعی سے کامیابی نہیں ہو سکتی، ان میں کامیابی کے لیے بہت سا روپیہ، سعی بلیغ، ایک مدت و محنت درکار ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان ضروریات دین سے غافل ہیں، مگر اللہ تعالیٰ ہر مشکل کو آسان فرمانے والا ہے۔

اے سید کرم

یہ جماعت جس کو آپ پرانی وضع، پھٹے پرانے لباس میں ملاحظہ فرماتے ہیں اور جن پر امیری اور دولتمندی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ایسی تنگ خیال نہیں ہے کہ دین و مذہب کی ضروریات پورا کرنے میں اس کو اس کا تعصب مانع ہو۔ اسلام کی ضروریات اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی مہمات سے ہم غافل نہیں ہیں۔ اور نہ ہم کاہل نکمے۔ تدبیر معاش سے ناآشنا ہیں، جیسا کہ عوام اور نادان دوستوں نے ہم کو خیال کر رکھا ہے، ہاں دین میں پختہ کاری کو ہم اپنا فرض مذہبی سمجھتے ہیں اور مداہنت کو ہم برا جانتے ہیں۔ اصول اسلام و مسائل دین کے مذاق اڑانے کو ہم گناہ کبیرہ اور سم قاتل خیال کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسی گستاخیوں سے قصر دین میں زلزلہ آجاتا ہے اور مذہب کا مستحکم قلعہ منہدم ہو جاتا ہے، شاہی چراگاہ کے پیچھے بکریاں چرانے کو ہم روا نہیں رکھتے۔ اس خوف سے کہ مبادا کوئی بکری اس چراگاہ میں داخل ہو جائے۔ اس لیے محارم خداوندی سے پرحذر رہنا ہمارا اولین فرض اور روشن عقیدہ ہے اور ہم کو یقین ہے کہ بزرگان دین اور سلف صالحین کے پختہ اصول اور سچے عقائد کی پیروی میں بقائے مذہب اسلام منحصر ہے۔ جب تک مسلمان ان محکم اصول اور سچے عقائد کی پیروی کے پابند رہیں گے۔ ذرائع کسب معاش اور دینی ترقی کے زینے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

الحاصل ہمارے نزدیک بقائے ملت اسلامیہ دو باتوں پر موقوف ہے۔ اول یہ کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے کہ جو مذہب کی خدمت گزار ہو، عوام الناس کو احکام شریعت پہنچاتے۔ دن رات تعلیم و ارشاد میں مشغول رہے۔ خدمت علوم دینیہ اور عبادت الٰہی میں اپنے آپ کو وقف کر دے۔ یہ جماعت، اسلام کا ستون ہے اور اس کے عدم و وجود پر اسلام کا عدم و وجود منحصر ہے۔ دوم یہ کہ ہمارے عوام جو کہ کسب معاش

اور تحصیل علوم مروجہ میں معروف ہیں، وہ دین سے واقف ہوں۔ ارکان اسلام پر عامل ہوں۔ دنیا کی طلب اور علوم مروجہ کی ذہن ان کو فرائض وحقوق مذہبی سے ناآشنا اور غافل نہ کردے۔ اگر یہ دونوں باتیں درست ہو جائیں تو اسلام کا ضعف اور جو نقائص ہماری غفلت کے بدولت پائے جاتے ہیں، رفع ہو جائیں، قرون اولیٰ اور اس کے بعد قرون صالحہ کے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔ سو بحمداللہ تعالیٰ جمعیۃ الانصار نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی دینی ضروریات اور اسلامی مہمات کے کفیل ہوں، مگر چونکہ ہندوستان میں تجربہ سے ہم کو یہ بات خوب ثابت ہو چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے دل دنیا کے ظاہری بناؤ سنگھار پر فدا و شیدا ہیں اور ان کی آنکھیں نئی روشنی پر فریفتہ ہیں۔ اور دنیا کی ان تیز خنجروں سے دین کے نورانی چہرے کو زخمی کر دیا ہے۔

آہ! ایسا تو کوئی شاذ و نادر ہی ملے گا، جس نے دین کو دنیا پر اختیار کیا ہو۔ لہٰذا ارکین جمعیۃ الانصار نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ دارالعلوم تعلیمی ترقیات میں کامیابی حاصل کرے، مگر اس کی قدیم وضع، اسلامی طرز، قاسمی شان، رشیدی انداز، بحال خود باقی رہیں۔ اس میں کسی ایسے امر کی آمیزش نہ ہونے پائے کہ علوم دینیہ خدانخواستہ مغلوب اور علوم مروجہ دنیویہ غالب ہو جائیں اور بقدر وسع یہ کوشش کی جائے کہ دارالعلوم کے طلبہ کے چہروں سے دینداری و تقویٰ شعاری ظاہر ہو، جو دارالعلوم کے امتیازات میں سے اولین امتیاز ہے۔

یہ جمعیۃ الانصار کے مقاصد کا اجمالی بیان ہے اور اگر جناب اس اجمالی تفصیل سے واقف ہونا چاہیں تو وہ مدرسہ کی سالانہ روداد اول اور مقاصد جمعیۃ الانصار و قواعد قاسم المعارف سنہ مطبوعہ میں موجود ہے، جو کہ جناب کی خدمت میں پیش کئے گئے اور اگر زیادہ وضاحت کی ضرورت سمجھی جائے تو مولانا محمد عبیداللہ صاحب ناظم جمعیۃ الانصار مفصل مشرح بیان فرما سکتے ہیں۔

اے سیدِ محترم: سب سے بڑی مصیبت جو اسلام پر پڑی ہے اور سب سے بڑا حادثہ جس نے مسلمانوں کا ناس کر دیا ہے۔ فریبی علماء کی خرابیاں ہیں۔ جب دل بگڑا اور خراب ہو گیا تو جسم کیونکر سالم رہ سکتا ہے، ہم علم کو دین کے لیے طلب نہیں کرتے بلکہ دنیا کے لیے، طلب کرتے ہیں، ہم علم کو ہدایت وارشاد خلق کا وسیلہ نہیں بناتے، بلکہ دنیا کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں، علماء اگر دین پر استقامت اختیار کریں تو وہ دین کے ستون اور ہدایت کے ستارے ہیں اور اگر وہ گمراہی اختیار کریں تو وہ شیطان کے جال اور گمراہی کے نشان ہیں۔

بھائیوں کی ناعاقبت اندیشی، زمانے کی گردش علم کی ذلت جہل کی عزت کا شکوہ کس سے کریں۔ ہائے اگر ہم علم کی قدر دانی کرتے اور اس کے پاکیزہ چہرے کو طمع اور سوال کے غبار سے آلودہ نہ کرتے، تو آج ہم سردار ہوتے۔ دنیا خود ہماری مطیع ہوتی اگر افسوس کہ کیا کیجئے، ہم نے دین کو بدلا ہم خود بدل گئے اور ذلیل ہوئے۔ پاک ہے وہ ذات کہ تغیر پر قادر ہے اور خود تغیر سے منزہ ہے۔

کیا اچھا اور سچا کلام ہے، کسی عربی شاعر کا، جس کا حاصل اردو نظم میں ہدیۂ ناظرین ہے۔

گرگ طمع آز کر جب حملہ آور پائیں ہم
ہے مناسب علم کے زینے پہ بس چڑھ جائیں ہم
علم سیکھا، تا کہ مخدوم جہاں کہلائیں ہم
خوب گلچھرے اڑائیں، کھائیں اور غرائیں ہم۔
چاہیئے تھا قوم کی خدمت گزاری کے لیے
علم حاصل کر کے قربان قوم پر ہو جائیں ہم
کیا شقاوت ہے کہ نخل علم سے عزت کے پھل
ہم نہ کھائیں، ڈوب جائیں، منہ نہ بس دکھلائیں ہم
اتباع جہل اسلم تھا ہمارے واسطے!

مصر کے مشہور عالم

حضرت السید الامام حکیم الاسلام السید محمد رشید رضا مصری

دارالعلوم دیوبند میں

۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم متحدہ ہندوستان تشریف لائے تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرستہ العلوم علی گڑھ (موجودہ مسلم یونیورسٹی) اور دارالعلوم دیوبند میں ملی تقاریر فرمائی تھیں۔ ان میں سے دارالعلوم دیوبند میں کی گئی عربی تقریر کا اردو ترجمہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ تقریر آج بھی ہمارے لیے سنگ میل ہے

حضرات علماء کرام! میں آپ کی اس حسن ضیافت اور مہمان نوازی اور عزت افزائی کا جو آپ نے میری کی ہے اور جو میری حیثیت سے بہت زیادہ ہے، صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، نیز جو عظیم الشان اور گراں بہا خدمات آپ علم اور دین کی انجام دے رہے ہیں۔ ان کے لحاظ سے آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں مجھے اس مدرسے کو دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ حضرات علماء کرام! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں مدرسہ کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین جاتا۔ ہندوستان میں آکر اس مدرسہ کی نسبت جو کچھ میں نے اب تک سنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا شیخ انور شاہ نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے ہیں اور جو مسلک مشائخ کا مجھے بتلایا ہے، میں اس کو پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں، میں یہاں

آنے سے پہلے یہ خیال کرتا تھا کہ دیوبند میں خاص فقہ حنفی کی تعلیم ہوتی ہے اور فقہ حنفی، اگر اس پر عمل کیا جائے تو بلاشبہ کافی ووافی ہے، لیکن استاذ نے بیان کیا کہ یہ مدرسہ ابھی اصلاح کا محتاج ہے اور یہ کہ یہاں کے اساتذہ اصلاح کی طرف مائل ہیں

حضرات! اس زمانے میں اصلاح طریقۂ تعلیم اور اشاعت اسلام مسلمانوں کی ضروریات میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ یہ امر معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائیں گے مجھے نہایت تعجب ہوا کہ قدیم زمانے کا یونانی فلسفہ (جو اب تقریباً پارینہ ہو کر محض بیکار ہو گیا ہے اور کوئی کام دین اور دنیا کا اس سے متعلق نہیں) ہندوستان کے اسلامی مدارس میں اب تک کیوں پڑھایا جاتا ہے اور اس کی

درس و تدریس میں کیوں اوقات ضائع کیئے جاتے ہیں، لیکن مجھ کو معلوم ہوا کہ جو مناظرات اہلِ سنت والجماعت کے شیعوں سے ہوتے ہیں، ان میں اس فلسفے کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر الحمد للہ کہ یہ ضرورت محض عارضی ہے اور جب یہ ضرورت زائل ہو جائے گی تو ہم اس کے ضرر سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔

حضرات! ارشاد اور تلقین کے لیے (جو ہمارا دینی فرض ہے) ہم کو عوام کے سوال کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ عوام کالانعام گوناگوں جہالتوں اور طرح طرح کے مفاسد میں گرفتار ہیں۔ ان سے کیونکر توقع ہو سکتی ہے کہ وُہ ہدایت اور تلقین حاصل کرنے کے لیے علما کی خدمت میں حاضر ہوں اور سوال کریں۔ اس لیے ہم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خوُد حرکت کر کے اسلام کی ضروریات کو عوام الناس تک پہنچا دے۔ عام گذرگاہوں میں، شاہراہوں میں، میلوں، ٹھیلوں میں اور لہو و لعب کے مجمعوں میں اور جہاں جہاں اس قسم کے لوگ بکثرت ہوتے ہیں، جائیں اور گمراہوں کو احکامِ اسلام کی تلقین کریں[1]۔ مجھے یہ معلوم ہو کر بہت تعجب ہوا کہ بعض مسلمان اسلام ترک کر کے عیسائی اور بُت پرست ہو گئے ہیں، میرے نزدیک اسلام کو چھوڑ کر بُت پرستی اختیار کرنا نہایت تعجب انگیز امر ہے، جس کے قلب میں کچھ بھی اسلام کا اثر ہو گا، وُہ ہرگز عیسائی یا بُت پرست نہیں ہو سکتا، جہاں کہیں تھوڑا سا بھی نوُر موجوُد ہو گا۔ وہاں تاریکی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جس قلب میں کچھ بھی اسلام کا نوُر ہو گا، وہاں کفر و بُت پرستی کی تاریکی نہیں پہنچ سکتی۔ سید جمال الدین (افغانی) مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان ہو کر نصرانی نہیں ہو سکتا، ہاں اگر کوئی محض نام کا مسلمان ہو اور اسلام سے اس کو کچھ لگاؤ نہ ہو تو یہ اور بات ہے۔ ایسے نام کے مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دے کر طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں کے سامان مہیا کر کے ہوشیار مشنری پھانس لیتے ہیں، میں نے نہایت افسوس کے ساتھ سُنا ہے کہ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں، جو بُت پرستوں سے اپنے آپ کو صرف اس لیے ممتاز سمجھتے ہیں کہ وُہ گائے کا گوشت کھاتے ہیں، گائے کا گوشت کھانے کے سوا ان میں کوئی علامت اسلام کی موجوُد نہیں ہے۔

حضرات! نہایت افسوسناک امر ہے کہ غریب عام مسلمان بھیڑ بکریوں سے زیادہ مہمل چھوڑ دیئے گئے ہیں، ہم میں سے کوئی شخص اُن کی خبر ہی نہیں لیتا، اور ان کی حالت نہایت قابلِ رحم ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کی ہدایت کا کون متکفل ہو سکتا ہے۔ آپ یا آپ جیسے عُلمائے کرام سے امید کی جاتی ہے کہ ایسے مسلمانوں کی ہدایت اور تلقین کے لیے کمربستہ ہوں گے۔ اور اس کے متعلق کوئی مستقل انتظام کریں گے۔

حضرات! آپ نے اپنی سادگی اور طلبہ کے زہد اور تقشف کا ذکر کیا ہے۔ مرشدوں اور ہادیوں کو جو دُوسروں کے لیے قدوہ اور نمونہ ہوں بالضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ گو تمام مسلمان ایسے نہیں ہو سکتے، ہم نے خوُد بھی اپنے مدرسے میں اس اصُول کو ملحوُظ رکھا ہے اور داخلے کے قواعد میں فقیروں کے لڑکوں کو دولتمندوں کے صاحبزادوں پر ترجیح دی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هى للذين امنوا فى

---

[1] الحمد للہ کہ حضرات اکابر دیوبند حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہم اللہ کے ایک سچے علمی اور روحانی وارث حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں، علامہ مرحوم و مغفور کی یہ آرزو پوری ہوئی تبلیغی جماعت کا انتظام اسی نہج پر شروع ہوا اور الحمد للہ کہ پورے کرۂ ارض کو محیط ہو گیا۔

اللہ کریم جماعتوں کو منصوُر و مقبوُل فرمائیں اور ہمیشہ صحیح نہج پر کام کرنے کی توفیق ارزانی رکھیں۔

محمد عبدالسلام ہوشیارپوری

الحیوٰة الدنیا خالصة یوم القیامة اور نیز فرمایا: واللہ فضل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برادی رزقہم علیٰ ما ملکت ایمانہم فہم فیہ سواءٌ

غرضکہ اسلام میں دولت کے لیے بھی کرامت و اجر و مرتبہ ہے، اگر وہ جائز ذرائع سے حاصل کی جاوے اور صحیح مصارف میں خرچ کی جائے۔ اور فقر کیلئے بھی کرامت و اجر و مرتبہ ہے اگر اس کے ساتھ استغناء و اہلیت ہو۔

حضرات! اشاعتِ اسلام کے اس وقت دو حصے ہیں۔ ایک اسلام کے احکام و روایات کا عام مسلمانوں تک پہنچانا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ میں نے قاہرہ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں بذاتِ خود جاکر اس کا تجربہ کیا ہے۔ میں اکثر قہوہ خانوں میں جہاں زیادہ تر رند اور اوباش لوگ جمع ہوتے ہیں، جایا کرتا تھا اور لوگوں کو جمع کرکے ان کی سمجھ کے موافق احکامِ اسلام سنایا کرتا تھا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر اس طریقے پر عمل کیا گیا تو اسلام کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

دوسرا حصہ اسلام کی اشاعت کافروں اور بت پرستوں کے درمیان ہے۔ ہندوستان میں صد ہا قسم کے بت پرست ہیں اور یہاں توں کے پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کے پوجنے والے۔ چاند سورج اور ستاروں اور بہت لغویات اور خرافات کے پوجنے والے موجود ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس دعاة اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آسکتی، اور ہم کو عیسائیوں سے بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے، جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بمقابلہ بت پرستوں کے اس قدر قلیل ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرضِ خطر میں سمجھنا چاہیئے۔ انگریزی حکومت نے بت پرستوں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کسی وقت اُٹھ جائے تو آپ خیال فرماسکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ غالبًا مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا، جو ان کا اندلس میں ہوا تھا۔ ایک جماعت ہم میں ایسی بھی ہونی چاہیئے، جو ان شبہات کو رفع کرے، جو اسلام پر کیے جاتے ہیں۔ اور خصوصًا وہ شبہات جو موجودہ زمانے کے علوم و فنون کی بناء پر کئے جاتے ہیں۔ مگر ایسے شبہات کا رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لیئے ضروری یہ ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس فلسفہ کو شروع کیا ہے اور جدید فلسفہ کی ابتدائی کتاب المنتقش فی الحجر کو درس میں داخل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ناکافی ہے اور میں آپ کو ایسی کتابیں بتلاؤں گا، جو اس سے زیادہ مفید ہوں گی، غالبًا اس امر میں آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم محتاجِ اصلاح ہے، طالب علموں کا بہت سا وقت تراجم و شرح و حواشی کے مطالعے اور لفظی بحثوں میں غارت ہو جاتا ہے اور جو اصل مقصود ہے، وہ فوت ہو جاتا ہے، موجودہ طریقے کے مطابق اوّل عربی زبان کی صرف و نحو پڑھائی جاتی ہے، حالانکہ طالب علم اس چیز سے ناواقف ہوتا ہے، جس کے اصول و قواعد کی اس کو تعلیم دی جارہی ہے۔ صحیح اور طبعی طریقہ یہ ہے کہ قواعد سے پیشتر معروض سے واقفیت ہو۔ بچہ کس قدر جلد اپنے ماں باپ کی زبان سیکھ لیتا ہے، بعض یورپین علاوہ علوم و فنون کے متعدد مشرقی زبانیں حاصل کر لیتے ہیں، حالانکہ بوجہ بُعد و اجنبیت یہ امر ان کے لیے ہماری نسبت زیادہ مشکل ہے، طریقۂ تعلیم کے ناقص ہونے کے علاوہ بعض درسی کتابیں بھی ناقص ہیں، جن میں بے حد ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے

حضرات! مجھے افسوس ہے، کہ میں نے ہندوستان میں علم کو اتنی

ضعیف و کمزور پایا کہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں کوئی قدیم مدرسہ موجود نہیں ہے، جامعہ ازہر میں (جو مصر کا قدیم مدرسہ ہے) بارہ ہزار طالب علم تعلیم پا رہے ہیں، جن میں اکثر مصری ہیں اور تین ملین مصری پونڈ اس کے اوقاف کی سالانہ آمدنی ہے۔ ازہر کے علاوہ دسوق، دمیاط اور اسکندریہ میں بڑے بڑے مدرسے ہیں، مگر طریقۂ تعلیم ہندوستان کی طرح مصر میں بھی ناقص ہے۔ وہاں بھی متقدمین کا طریقۂ تعلیم چھوڑ کر متاخرین کا طریقۂ تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔

حضرت الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہٗ رحمۃ اللہ علیہ نے ازہر کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح میں بہت کوشش کی، مگر ان کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، ازہر کی طرف سے مایوس ہوکر انھوں نے گورنمنٹ مصر سے ایک اور نیا مدرسہ جاری کرایا جس کا نام مدرسۃ القضاء الشرعی ہے۔ یہ مدرسہ بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور تھوڑی مدت میں زیادہ علوم کی تعلیم بغیر اس کے کہ طلباء کی استعداد اور قابلیت میں کچھ کمی ہو، وہاں ہو جاتی ہے

حضرات! ہم دیکھتے ہیں کہ تحصیل علوم میں ہماری ہمتیں بہت پست ہوگئی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں جب کہ ریل اور دخانی جہاز موجود نہ تھے علماء اندلس سے تحصیل علوم کے لیے بخارا تک جاتے تھے اور جو عمدہ کتاب مشرق میں تصنیف ہوتی تھی، بہت تھوڑے زمانے میں اس کی نقلیں مغرب میں شائع ہو جاتی تھیں، مگر ہماری موجودہ پست ہمتی ہمارے علمی افلاس اور تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اہل ایمان کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، وہ ہم پر غیر منطبق ہیں۔ مثلاً

لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین
سبیلا ولکن العزۃ للہ ولرسولہ
وللمؤمنین وعد اللہ الذین امنوا منکم
وعملوا الصٰلحت لیستخلفنھم فی الارض
کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن
لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم و
لیبدلنھم من بعد خوفھم امنا.

آپ کو غور کرنا چاہیے کہ جو صفات مؤمنین کی بیان فرمائی ہیں، کیا ہم ان صفات کے ساتھ متصف ہیں، کیا خدا نے ہماری حالت بدل دی ہے باوجودیکہ ہم نے اس کو نہیں بدلا ہے، خدا نے ہرگز ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہمارے کرتوت کا نتیجہ ہے۔ ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفوا عن کثیر، مصر میں بھی مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جو آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ ہم اور آپ متفق ہوکر اپنے اس علمی افلاس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ آپ ہماری تجاویز سے واقف ہوں اور ہم آپ کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھائیں۔

حضرات: اصلاح طریقۂ تعلیم کے متعلق جو خیالات میں نے آپ کے سنے ہیں، میں ان کو غیبی بشارت خیال کرتا ہوں۔ ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ حق غالب ہوکر رہے گا اور باطل مغلوب ہوگا۔ قل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا. بل نقذف بالحق علی الباطل وکان حقا علینا نصر المؤمنین.

حضرات! آپ نے بیان کیا ہے کہ ہماری جماعت ایک ضعیف جماعت ہے، میں اس معاملے میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں، مگر اختلاف ایسا نہیں ہے، جس میں ہم کو یا آپ کو مزید جرح و قدح یا تائید و تردید کی ضرورت پیش آئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہرگز ضعیف نہیں ہیں، آپ کے پاس ایسی زبردست قوت موجود ہے، جو دنیا کی تمام قوتوں سے بڑھ کر ہے۔ بلاشبہ قوت ایمان اور قوت اسلام ایسی قوت ہے، جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی جماعت کس قدر ضعیف تھی، مگر دنیا میں کس قدر عظیم الشان اصلاح اس ضعیف جماعت سے ظہور میں آئی تھی۔ یہ جماعت صرف قوت حق اور قوت ایمان سے دنیا

پر غالب ہوئی تھی، ہمارے طالب علم بھی ضعیف نہیں ہیں، مگر ہم کو ان میں حق کی روح پھونکنا چاہیئے۔

منجملہ اور مصائب کے ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ اب ہمارے ہاں قرآن مجید کی تفسیر کی تعلیم صرف نحو اور معانی بیان کی تعلیم رہ گئی ہے۔ حالانکہ تفسیر کی تعلیم اس حیثیت سے ہونی چاہیئے کہ وہ ذریعِ خداوندی اور مخلوق کے لیے ہدایت ہے۔

میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ علماء مسلمانوں کے تمام طبقوں کے پیشرو ہوں اور یہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ان کے اخلاق قرآن مجید سے ماخوذ نہ ہوں۔ اس لیے میرے نزدیک نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین کی تعلیم بھی دی جائے۔

بزم و رزم

سیل کی طرح جو نکلے تھے بیابانوں سے
آب جو بن گئے گزرے جو خیابانوں سے
تھا جو اپنوں سے وہی لطف تھا بیگانوں سے
گردنیں دب گئیں اسلام کے احسانوں سے

(مولانا ظفر علی خان مرحوم)

بقیہ طبقات شاہیر دارالعلوم دیوبند

۵۔۔۔ سید امین گیلانی زنگوپوری، بالواسطہ
۶۔۔۔ علامہ اقبال اہیل
۷۔۔۔ ریاست علی ظفر بجنوری
۸۔۔۔ مولانا محمد موسیٰ خان سرحدی
۹۔۔۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب
۱۰۔۔۔ زائر حرم حمید صدیقی
۱۱۔۔۔ مرزا غلام نبی جانباز
۱۲۔۔۔ سائیں محمد حیات پسروری

اکابر دارالعلوم سے متاثر حضرات

۱۔۔۔ مؤرخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ خلیفہ از حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔۔۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، متاثر از حضرت شیخ الہندؒ
۳۔۔۔ حکیم اجمل خانؒ طبیب اعظم ہندوستان " "
۴۔۔۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم دہلی " " "
۵۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسینؒ جامعی " " "
۶۔۔۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم " " "
۷۔۔۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم (متاثر از حضرۃ علامہ سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۸۔۔۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (از حضرت رائے پوریؒ)
۹۔۔۔ چودھری افضل حق (از حضرت امیر شریعتؒ)
۱۰۔۔۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم " " " "

علامہ سید رشید رضا شاہ مصر کے مشہور فاضل تھے، علامہ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص مفتی عبدہٗ کے تلمیذ رشید اور جانشین سمجھے جاتے تھے، مشہور ماہنامہ مجلۃ المنار کے مالک و مدیر تھے ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا۔ ارکان ندوۃ العلماء نے علامہ رشید رضا کو اس کی صدارت کے لیے دعوت دی، چنانچہ وہ تشریف لائے اور جلسے کی صدارت سے ۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو فارغ ہوئے دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کی ایک مشہور مرکزی دینی درسگاہ ہے۔ اس کی علمی شہرت کی بناء پر علامہ مرحوم کا خود بھی شوق تھا کہ اس معہد علمی کی زیارت سے مشرف ہوں اور دارالعلوم کے خیرخواہ حضرات مثلاً حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم وغیرہ نے بھی توجہ دلائی، چنانچہ علامہ موصوف ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی صبح ۸ بجے کی گاڑی سے دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ کا استقبال مناسب شان نہایت سادگی سے کیا گیا، لوازم مہمان داری میں وہی سادگی اور بے تکلفی ملحوظ رہی، جو اسلام کا شعار اور دیوبند کا قدیم طرز ہے۔ آپ پر اس سادگی کا گہرا اثر پڑا علم کے آثار دیکھ کر آپ بے حد محظوظ ہوئے۔ بعد نماز ظہر درسگاہ کلاں میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں سب سے اول مدرسے کی جانب سے ایک عربی تحریر میں آپ کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کرنے کے بعد مدرسہ اور اس کے اصول اور طرز عمل و مقاصد بیان کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری مدرس دارالعلوم نے عربی میں مبسوط اور نہایت فصیح و بلیغ برجستہ تقریر تقریباً ایک گھنٹے تک فرمائی۔ جس میں علامہ موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بزرگان مدرسہ کا طرز عمل اور مسائل مختلفہ میں ان کے طریق تحقیق کو مشرح و مبسوط بیان فرمایا، اس درمیان میں اپنی وہ نظم بھی سنائی، جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تحریر فرمائی تھی۔ یہ وہ باتیں تھیں جن سے علامہ موصوف پر اس مدرسے کی علمی شان و امتیاز صاف واضح وظاہر ہوگئی۔ پھر علامہ موصوف نے اپنی تقریر میں مدرسے کی حالت پر اطمینان و مسرت ظاہر فرماتے ہوئے بہت سی مفید و مؤثر باتیں بھی بیان فرمائیں۔ علامہ موصوف مدرسہ میں بارہ گھنٹے کے قیام کے بعد شام کو دیوبند سے سیدھے بمبئی تشریف لے گئے۔ بمبئی پہنچ کر آپ نے ... حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط [illegible]

جو محبت سے لبریز اور آپ کے قلبی میلان کا مظہر تھا۔

(خلاصہ از روئداد مدرسہ اسلامیہ دیوبند بابت ۱۳۳۰ھ)

اس زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسے کے مدرس شیخ الحدیث اور استاذ اکل تھے، مولانا حافظ محمد احمد صاحب مدرسے کے مہتمم تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدرسہ کے مہتمم تھے، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مدرسے کے مفتی تھے اور مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی، مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا محمد سہول صاحب بہاری، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب مدرسہ کے ممتاز مدرسین تھے اور یہ سب حضرات اس جلسے میں تشریف فرما تھے، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری کی یہ عربی تقریر جو ایک ایسے اہم جلسے اور اہل علم کی مجلس میں کی گئی تھی۔ ایک یادگار علمی تقریر ہے۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ علماء اور طلباء تک اس دور میں بھی یہ تقریر شائع کر کے پہنچائی جائے، تاکہ ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ حضرات اساتذۂ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کے ان درس حدیث اور تطبیق روایات کا کیا طریق کار رہا اور اس سے اندازہ ہو جائے گا، کہ ان حضرات کے ہاں کس قدر توسط اعتدال تھا۔ امید ہے کہ اہل علم اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں کتب احادیث کی تعلیم و تدریس کی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔

اگرچہ اہل علم خود بالاس عربی تقریر سے استفادہ کر سکتے ہیں اور ترجمے میں وہ لطف نہیں ہوتا، جو بلا واسطہ عربی سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن بعض احباب کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ خود عربی نہیں جانتے، ان کو بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان فیوضات سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ اگرچہ ترجمہ کے واسطے سے ہو، ان کو بھی استفادے کا موقع دینا چاہیئے، اس لیے ہم اصل عربی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کر رہے ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ محض لفظی ترجمہ نہ ہو، بلکہ اصل مقصود کو ذہن نشین کرنے کے لیے آزاد ترجمہ کیا جائے۔ امید ہے کہ عام اردو خوان مسلمانوں کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچے گا اور وہ حضرات اساتذۂ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کی فقاہت، ذہن ثاقب، فہم سلیم، رسوخ فی العلم توسط اعتدال کی روش معلوم کریں گے اور قلوب میں ان کی عظمت اور ان کے ساتھ محبت اور بڑھ جائے گی۔

والسلام

خاکپائے اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ

احقر سید صالح الدین

کاکاخیل عفی عنہ

تقریر عربی

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد: آپ

اصطفى يقدم الخويدم في الحضرة السامية تحية الاسلام حياكم الله تعالى انا. انسنا منكم مخائل الكرم والاعتناء بحالنا واحسسنا بنهضة اسلامية عطفت عليكم وعلينا وانا احوج اليكم منكم الينا هؤلاء اساتذتي واكابري وذخائري عند الله في يومي وغدي امروني بان امثل لكم شكرا على اسداء الخير وتشريفكم ايانا بانقدومكم المبارك احسن الله اليكم والينا ورفع درجاتكم في الدين والدنيا والآخرة آمين وبه نستعين.

مولانا ان حديثنا حديث ذو شجون والشيئ بالشيئ يذكر ان بلادنا هذه على شقة بعيدة ومسافة شاسعة من بلاد الاسلام كالعراق والشام ومصر فكانت شعائر الاسلام فيها على وهي ومنائر العلم على خفاء الا ماشاء الله ومن شاء وقليل ماهم. ان عصابتنا هذه عصابة على طريقة قديمة ليست بحديثة اسنادنا في الدين متصل بالصدر الكبير والبدر المنير والامام الشهير الشيخ الاجل ولي الله بن عبد الرحيم الفاروقي الدهلوي وحال الشيخ اظهر من ان يذكر فقد شرقت تصانيفه وغربت لكن بعض احوال الشيخ

حضرات کا ایک ادنیٰ خادم آپ کی خدمت عالیہ میں اسلامی طریقے کے مطابق تحیۂ سلام مسنون پیش کرتا ہے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ہم نے یہ دیکھا کہ آپ میں شرافت ونجابت کی علامات موجود ہیں۔ اور اس وقت آپ ہماری حالت کی طرف توجہ فرما رہے ہیں۔ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ اسلامی نہضت وترقی کا دور آپ کی طرف اور ہماری طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اس وقت جس قدر کہ ہم آپ کی طرف محتاج اور ضرورت مند ہیں۔ آپ کا احتیاج اس قدر ہماری طرف نہیں یہ حضرات میرے اساتذہ کرام اور میرے اکابر ہیں اور یہی حضرات ہی اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں میرے لیے ذخیرہ ہیں۔ ان حضرات اساتذہ کرام نے مجھے حکم دیا ہے اور میں اس حکم کی تعمیل کر رہا ہوں کہ میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر اس بات پر آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے شوق ورغبت سے تشریف لا کر خیر وبرکت، خلوص اور علمی قدر دانی کا مظاہرہ فرمایا، اللہ تعالیٰ آپ سے اور ہم سے بھلا کرے اور آپ کے دینی درجات کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور بلند فرمائے۔ آمین، ہم صرف اللہ ہی سے امداد حاصل کرتے ہیں۔

حضرت مولانا! ہمارا قصہ بھی عجیب قصہ ہے، اور بات سے بات نکلتی جاتی ہے، ہمارا یہ ملک ہندوستان بلاد اسلامیہ یعنی عراق، مصر، شام وغیرہ سے بہت دور کی مسافت پر واقع ہے تو اس دوری کی وجہ سے لازماً اسلام کے شعائر اس ملک میں کمزور حالت میں تھے اور علم دین کی نشانیاں مدھم تھیں۔ (الا ماشاء اللہ) ہماری یہ جماعت (جو جماعت دیوبند کہلاتی ہے) علما کی ایک ایسی جماعت ہے جو قدیم طریقہ پر کاربند ہے۔ کوئی نئی قسم کی جماعت نہیں، دین اور دینی مسائل میں ہمارا اسناد، صدر کبیر، بدر منیر امام شہیر، شیخ اجل شاہ ولی اللہ —— —— بن شاہ عبدالرحیم

يحتاج الى اخبار شفاهية وواقعات تلقيتها من مشائخنا كان من امر الشيخ رحمه الله انه اتقن العلوم الدينية ومبادئها اولاً على والده العلام الشيخ الهمام عبدالرحيم ثم رحل الى الحرمين زادهما الله شرفا وتكريما واستفاد من علمائهما وفقهائهما ولازم الشيخ ابا طاهرا لكردىؒ فى الحديث واجتهد فيه حتى صار الطرد والعكس فى الباب وكان الشيخ ابو طاهر يقول تلقن الفاظ منا وتلقنا المعنى منه يريد بذلك تبين ملاحظ الحديث وتعين مراد الشارع ثم رجع الشيخ ولى الله الى بلاده واشتغل باصلاح ما افسد الناس من سنة النبى الكريم صلى الله عليه وسلم وكان الله اَوْدَعَ فى صدره نورا ينظر به عواقب الامور فتفرس انه ستقوم الحرب بين الحق والباطل فاستعد رحمه الله للدفاع عن الدين والذب عنه فما اعد لذلك ان ترجم القران العزيز باللسان الفارسيه سماه فتح الرحمن جرده عن الاسرائيليات باسرها اراد بذلك تمهيد التوحيد ثم شرح الموطا وسماه المسوى على طريقة فقها الحديث مع تحقيق المناط

فاروقی دہلوی رحمۃ اللہ کے ساتھ متصل و مربوط ہے اور شاہ ولی اللہ کے حالات و سوانح اس قدر مشہور اور واضح ہیں کہ اس وقت ان کے ذکر کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی تصانیف مشرق و مغرب میں دُنیائے اسلام کے ہر گوشے میں اور ہر طرف پھیل چکی ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض احوال و سوانح ایسے بھی ہیں کہ زبانی طور سے ہی ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہے اور کچھ ایسے ضروری احوال بھی ہیں کہ جن کو ہم نے اپنے اساتذہ اور شیوخ سے حاصل کیا ہے، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے علوم دینیہ اور ان کے مبادی پہلے اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم سے حاصل کئے ہیں، پھر آپ نے حرمین زادہما اللہ تشریفاً و تکریماً کی طرف حج و زیارت اور استفادۂ علمی کے لیے سفر کیا۔ اور وہاں جاکر آپ نے وہاں کے علماء اور فقہاء سے علمی استفادہ فرمایا اور شیخ ابوطاہر کردیؒ کے ہاں تو خاص طور سے رہے اور ان سے حدیث پڑھی اور اس نے اخذ و استفادہ میں آپ نے خوب کوشش فرمائی۔ شیخ ابوطاہر فرمایا کرتے تھے کہ وہ (حضرت شاہ ولی اللہ) الفاظ حدیث ترجمہ سے سیکھا کرتے تھے، لیکن الفاظ حدیث کے معانی و مطالب میں اُن سے سیکھا کرتا تھا، دراصل ان کا مطلب یہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رح اپنی فقاہت و ذہانت کی بنا پر حدیث کے مطالب کی تبیین اور مراد شارع کی تعیین نہایت عمدہ و دلنشین طریقے سے کیا کرتے تھے۔ پھر دو سال وہاں رہنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ وہاں سے اپنے ملک ہندوستان کی طرف لوٹ کر آئے اور اس زمانے میں لوگوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جتنا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کی اصلاح اور درستگی میں سراسر مشغول ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سینۂ مبارک میں ایسی رُوحانی روشنی ودیعت فرمائی تھی، جس کی وجہ سے وہ امور کے عواقب اور انجام کو دیکھ لیا کرتے تھے، چنانچہ فراست

وتنقيحه وتخريجه اريد بذلك ما اصطلح عليه علماء الاصول فتحقيق المناط ان يصدر حكم من الشارع في صورة جزئية ثم يثبت ويحقق ذالك في سائر الجزئيات من نوع تلك الصورة مثاله تقويم جزاء الصيد فتعرف القيمة في جزئي هو تحقيق المناط وليس ذلك بقياس فلذا يشترك فيه الخاص والعام ولا يحتاج الى الاجتهاد وتنقيح المناط ان يصدر حكم من الشارع في صورة قد اجتمعت هناك امور واتفقت وبعض تلك الامور مناط ذلك الحكم وبعضها لا دخل لها فيه فتعرف الامر الذي هو العلة تنقيح المناط مثاله ما في الحديث عن ابي هريرة قال اتى رجل النبي صلى الله عليه وسلم فقال هلكت قال ما شانك قال وقعت على امرأتي في رمضان قال فهل تجد ما تعتق رقبة قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال فهل تستطيع ان تطعم ستين مسكينا قال لا الحديث فنقح ابوحنيفه والشافعي مناط وجوب الكفارة كون ذلك الفعل مفطرا كان جماعا كما في هذه الصورة او اكلا او شربا بعد ان يكون عمدا فكونه جماعا في هذه الواقعة امر اتفاقي كسائر الاتفاقيات

ایمانی سے انھوں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ عنقریب حق و باطل کے درمیان ایک عظیم الشان لڑائی شروع ہونے والی ہے تو آپ نے دین کی مدافعت و حمایت کی غرض سے اس آنے والی لڑائی کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں شروع فرمائیں۔ اس تیاری کے سلسلے میں سب سے پہلا کام تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے فتح الرحمٰن کے نام سے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو اسرائیلی روایات سے بالکل پاک رکھا اور مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے مسند توحید کے لیے راستہ ہموار ہو جائے۔

پھر مؤطا امام مالک کی شرح فارسی زبان میں "المسوّٰی" کے نام سے لکھی۔ اس میں انھوں نے فقہائے حدیث کے طریقے پر احادیث و آثار کی شرح فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی طرف بھی اس کتاب میں توجہ فرمائی، اس سے مراد وہ ہے، جو علماء اصولِ فقہ کی اصطلاح ہے۔

تحقیق مناط تو یہ ہے کہ شارع علیہ السلام سے ایک جزئی صورت میں کوئی حکم صادر ہو جاتا ہے، پھر یہی حکم اس صورت کے نوع کے سارے جزئیات میں ثابت اور محقق کر دیا جائے، مثلاً جزائے صید میں شکار کی قیمت لگا دینا، کسی جزئی میں قیمت کا معلوم کرنا تحقیق مناط ہے۔ یہ تحقیق مناط قیاس نہیں اور اس لیے اس میں خاص و عام سب شریک ہو سکتے ہیں اور اس میں اجتہاد کی طرف کوئی حاجت پیش نہیں آتی اور تنقیح مناط یہ ہے کہ کسی صورت میں شارع کی طرف سے ایک حکم صادر ہو جاتے اور اس صورت میں بہت سے امور جمع ہوئے ہوں، ان میں سے بعض امور میں تو یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس حکم مذکور کے لیے مناط یعنی علت بن جائیں اور بعض امور کو مدارِ حکم بننے میں کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا تو ان امور کثیرہ میں سے یہ پہچاننا کہ مناطِ حکم اور علتِ حکم ان میں کونسا ہے اور اسے متعین کرنا یہ تنقیح مناط ہے، اس کی مثال حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا

وذهب احمد الى ان المناط هو كونه جماعا فلا يعدى الحكم الى الاكل والشرب واحتج بحديث أخر عن ابى هريرة ايضا قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من افطر يوم من رمضان فى غير رخصة رخصها الله لم يقض عنه صيام الدهر حمله على الاكل والشرب عامدا وقال لا يقضى عنه صيام الدهر وتخريج المناط ان يصدر حكم من الشارع فى صورة تجتمع هناك امور يصلح كل منها للعلية فيرجح المجتهد امرا من بين تلك الامور للعلية ويجعله مناطا مثاله حديث النهى عن الربو فى الاشياء الستة اجتمع هناك امور القدر والجنسية والطعم والثمنية والاقتيات والادخار فذهب ابو حنيفة الى ان مناط الحكم هو الوصف الاول والشافعى الى انه الثانى ومالك الى انه الثالث على ما ادى اليه اجتهادهم فالفرق بين تنقيح المناط وتخريجه ان فى الاول اجتمعت امور لا دخل لها مع المناط فنقح المجتهد المناط وفى الثانى اجتمعت امور كل منها صالح لان يكون مناطا فرجح المجتهد احدها ان يكون مناطا وتنقيح المناط وتخريجه وظيفة المجتهد يزاحم فيه بعضهم بعضا ومن الامثلة فيه ايضا حديث مفتاح الصلوة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم فذهب اكثر

اور عرض کی یا رسول اللہ! میں تباہ و برباد ہوگیا۔ آپ نے فرمایا، بتاؤ کیا بات پیش آئی، اس نے کہا کہ رمضان شریف کے مہینے میں روزے کی حالت میں میں نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی ہے، تو آپؐ نے فرمایا: کیا تیرے بس میں ہے کہ ایک غلام آزاد کردے، اس نے کہا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ کرسکتے ہو کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اس نے کہا کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا یہ کرسکتے ہو کہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھ سکتے ہو، اس نے کہا کہ نہیں۔ تو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے ہاں وجوبِ کفارہ کے حکم کے لیے مناط اور علت رمضان شریف میں روزے کی حالت میں قصداً روزہ افطار کرنا ہے، خواہ وہ مفطر فعل جماع ہو جیسا کہ مندرجہ بالا واقعہ پیش آیا تھا، یا کھانا ہو یا پینا ہو، بشرطیکہ یہ عمل عمداً کیا جائے اور رمضان شریف کے مہینے میں کیا جائے اور یہ بات کہ اس واقعہ خاص میں وہ عمل جماع کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ محض ایک امر اتفاقی ہے اور امام احمدؒ کے ہاں وجوب کفارہ کے لیے مناط اور علت اس فعل کا خاص کر بصورتِ جماع ہونا ہے۔ لہٰذا جماع کی صورت میں اگر افطار ہوا ہو تو کفارہ ہوگا، لیکن کھانے اور پینے تک کفارہ کے اس حکم کو متعدی نہیں کرسکتے اور وہ دلیل میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک اور حدیث پیش فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی شخص رمضان شریف میں کسی رخصتِ شرعی کے بغیر روزہ توڑ دے تو خواہ بعد میں وہ عمر بھر بھی روزہ رکھے تو وہ کمی نہ پوری ہوسکے گی، وہ حدیث میں لفظ افطار سے کھانے پینے کے ذریعے سے عمداً روزہ توڑنا مراد لیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر قصداً کھا پی کر روزہ توڑا جائے تو پھر عمر بھر کے لیے بھی روزہ رکھنا اس کے لیے کافی نہ ہوسکے گا، لہٰذا اس کے سبب سے کفارہ نہیں ہوتا اور تخریج مناط یہ ہے کہ شارع سے کوئی حکم کسی ایسی صورت کا صادر ہو جائے، جس صورت میں بہت سے ایسے امور جمع ہوتے ہوں کہ ان میں سے ہر ایک میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ علتِ حکم

الائمۃ الی رکنیۃ صیغۃ التکبیر والتسلیم وخرج ابوحنیفۃ المناط فی کون الاول ذکرا مشعرا بالتعظیم وکون الثانی خروجا بصنع المصلی وقال بفرضیۃ ہذین لکن ثبتت مواظبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی صیغۃ التکبیر وصیغۃ التسلیم فلیکونا واجبین، وقد التزم الشیخ ابن الہمام وجوب صیغۃ التکبیر والمشہور انہ سنۃ وقد تحقق فیہا الذکر المشعر بالتعظیم والخروج بصنع المصلی کتحقق الکلی فی الجزئی فلیکونا فرضین وعلی ہذا القیاس امثلۃ کثیرۃ فہذا ما اراد الشیخ ولی اللہ فی شرح الموطا واختار فیہ ایضا فقہا جامعا وقد تحقق الشیخ ایضا فی کتاب الانصاف فی بیان سبب الاختلاف وعقد الجید فی مسائل الاجتہاد والتقلید ان الحق فی موضع الاجتہاد متعدد ویحکی عن الائمۃ الاربعۃ وارتضاہ واراد بموضع الاجتہاد ان لا یکون ہناک متعدد واذا کان ہناک قاطع فلیس بموضع اجتہاد والحق ہناک واحد وہو الموافق لذالک القاطع فمن وافقہ وافق الحق ومن خالفہ خالف الحق وصنف الشیخ فی حکم التشریع والعقائد الحقۃ تصانیف صارت لکل ات نبراسا ومقیاسا منہا حجۃ اللہ البالغۃ والتفہیمات الالٰہیۃ والخیر الکثیر وغیر ذلک ثم تبعہ علی ذلک اولادہ واحفادہ فمن

ہو سکتا ہے تو مجتہد اپنی قوتِ اجتہاد و استنباط کے ذریعے ان امور میں سے کسی ایک امر کو حکم کے لیے علت قرار دینے کے لیے راجح کر دیتا ہے اور اسی کو مناطِ حکم ٹھہرا دیتا ہے، اس کی مثال وہ حدیث ہے جس میں صریحاً ترجمہ اشیاء میں کمی بیشی کو اور دست بدست تبادلہ نہ کرنے کو ربوا قرار دیا گیا ہے، حضرات مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ان اشیاء ستہ میں بہت سے امر موجود ہیں، قدر، جنسیت، طعم، ثمنیۃ، اقتیات ادخار، اب یہ تعین کرنا چاہیئے کہ حرمتِ ربوا کے لیے علت کیا ہے، تو حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یہ اجتہاد فرمایا کہ مناطِ حکم یعنی تفاضل و نسئیہ کی حرمت کا دار و مدار وصف اوّل (قدر و جنس) پر ہے اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ علت حکم وصف ثانی یعنی طعم و ثمنیۃ ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ مدار حکم امر ثالث یعنی اقتیات و ادخار ہے، ان حضرات کا جیسا جیسا اجتہاد رہا، اسی کے مطابق ہر ایک نے حکم ربوا کیلئے علت کی تعیین و تشخیص فرمائی، تنقیح مناط اور تخریج مناط میں فرق یہ ہے کہ اوّل میں ایسے امور جمع ہو جاتے ہیں کہ ان کو حکم کے مناط ہونے میں اصل مناطِ حکم کے ساتھ کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس صورت میں مجتہد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوتِ اجتہادی سے اصل مناطِ حکم کی تنقیح کر کے واضح کر دیتا ہے کہ ان امور میں سے درحقیقت مناط یہ ہے اور دوسرے (تخریج مناط) میں ایسے امور مجتمع ہو گئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ حکم کے لیے مناط اور علت ہو تو مجتہد ان میں سے کسی ایک کی تعیین کر دیتا ہے اور اسے مناطِ حکم قرار دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ تنقیح مناط اور تخریج مناط یہ دونوں مجتہد کا کام ہے اور وہ حضرات مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ اس بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اجتہاد میں اختلاف کرتے ہیں[1]، کوئی اپنے اجتہاد سے کسی کو لیتا ہے

---

[1] تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی اصولی اصطلاحات کی مزید تحقیق کیلئے

اولاده الشيخ الاجل والصدر الاكمل الشيخ عبد العزيز ثم الشيخ رفيع الدين ثم الشيخ عبد القادر ثم خلف الشيخ عبد العزيز حفيده مفيد العصر ومسند المشتهر في الآفاق الشيخ محمد اسحق وابن اخيه محي السنة العلامة الجليل الشيخ محمد اسماعيل وكان الشيخ عبد العزيز يتلو الحمد لله الذي وهب لي على الكبر اسمعيل واسحق نفع الله بهما هذه البلاد دارس الشيخ محمد اسحق حديث النبي صلى الله عليه وسلم فصارحلة الاقطار وصنف الشيخ محمد اسمعيل كتبا في الفرق بين السنة والبدعة انطلماء فاحي السنة حين كانت اميتت ومات شهيدا وقد تلمذ على الشيخ محمد اسحق شيخ مشائخنا الشيخ عبد الغني صار مدار الرواية في عصره وارتحل آخرا الى المدينة الطيبة وصار سند تلك البلاد وكثر الاخذ عنه هنالك وتلمذ على الشيخ عبد الغني شمس الاسلام والمسلمين العارف الحافظ المحقق الشيخ محمد قاسم مؤسس هذه المدرسة العالية وبانيها والفقيه الحافظ المجتهد الولي الشيخ رشيد احمد صنف الشيخ محمد قاسم كتبا في المعارف والحقائق وكتبا في الرد على المخالفين من المادتين والدهريين فنفع الله به كثيرا وقد كنت انشأت هذه الاشعار في منقبته - قفايا صاحبيّ على الديار، فمن

کوئی کسی کر اور اس کی مثالوں میں سے ایک مثال حدیث "مفتاح الصلوٰۃ الطہور وتحریمہا التکبیر وتحلیلہا التسلیم" بھی ہے، اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر اکثر ائمہ کرام نے صیغۂ تکبیر اللہ اکبر اور صیغۂ تسلیم یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کو رکن نماز قرار دیا ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مناطِ حکم یہ ہے کہ تکبیر سے مراد ہر وہ ذکر الٰہی ہے جو مشعر تعظیم و تکبیر ہو اور تسلیم سے مراد اپنے ارادہ و اختیار سے مصلی کا نماز ختم کر کے خروج عن الصلوٰۃ ہے اور انہوں نے ان دو چیزوں الفاظ مشعر تعظیم کہہ دینے اور ارادے کے ساتھ نماز کو ختم کر دینے کو فرض اور رکن صلوٰۃ قرار دیا، لیکن چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً صیغۂ تکبیر اللہ اکبر اور صیغۂ تسلیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر مواظبت و دوام ثابت ہے۔ اس لیے بالتخصیص یہ دونوں واجب صلوٰۃ ہوں گے۔ شیخ ابن الہمامؒ نے وجوب صیغۂ تکبیر کا التزام کیا ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ [1] ان دونوں میں ذکر مشعر تعظیم اور خروج بصنع المصلی یوں پایا جاتا ہے، جیسا کہ کوئی کلی کسی جزئی میں پایا جاتا ہے۔ پس یہ دونوں فرض ہوں گے علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے موطا امام مالکؒ کی شرح المسوّی میں ان امور کی رعایت فرمائی ہے اور ایک فقہ جامع کو مختار کیا ہے۔ اسی طرح شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور "عقد الجید فی مسائل

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے)

علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز کتاب فتح الملہم شرح مسلم کا مقدمہ از صفحہ ۸۹ تا ۹۱ بغور ملاحظہ فرمایا جائے۔ نیز العرف الشذی، جلد اول صفحہ ۱۵/۱۶ اور معارف السنن جلد اول از صفحہ ۶۱ تا ۶۶ مطالعہ کیا جائے۔

---

[1] (حاشیہ صفحہ ہٰذا) اس حدیث کی مزید تحقیق کے لیے العرف الشذی طبع اول جلد اول صہ ۱۲ تا ۱۳ اور مولانا بنوری مدظلہ کی شرح ترمذی "معارف السنن" جلد اول از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۶۰ ملاحظہ فرمائی جائے۔

داب الشجی ہوی ان دیار الخ وکثرت الفتیا وازدحمت المسائل علی الشیخ رشید احمد حین التبس الحق بالباطل فاجاب فیہا بالصواب وکان فیہا مجتہدا فاخذنا ذلک امامنا فی الاصول وہذا امامنا فی الفروع وتنفح لنا منہما علم منقح مبیض ثم لما استولت الاجانب علی ہذہ البلاد وقامت الحرب بین الحق والباطل اسس الشیخ محمد قاسم ہذہ المدرسۃ العالیۃ فنفع اللہ بہا کثیرا جزاہ اللہ خیر الجزاء وغایۃ المدرسۃ درس الحدیث وفقہ الحدیث وکان یری ان المبادی ضروریۃ والضروری یقدر بقدر الضرورۃ حتی ان الشیخ رشید احمد خطر الفلسفۃ وحجر عنہا فی بعض السنین فی ہذہ المدرسۃ فہذا اسنادنا وطریقۃ مشائخنا فی الحدیث وفقہ الحدیث طریقۃ معتدلۃ مثلی یتوسطون بین الاطراف ارید بذلک ان للائمۃ الاربعۃ اصولا اربعۃ اکثریۃ وذلک ان الامام مالکا یاتی بعمل اہل المدینۃ بل قد یرجحۃ علی الحدیث المرفوع والشافعیؒ یأخذ باصح ما فی الباب واحمدہ یأخذ بالاصح والصحیح والحسن والضعیف اذا کان ضعف یسیرا ویجوز ہذا وذلک وعلی ہذا وضع مسندہ وابوحنیفۃ یاخذہ بہذہ الاقسام وینزل الاحادیث علی محل فلذا کثرت التاویلات عند الحنفیۃ وکثرت الجروح علی الرواۃ عند الشافعیۃ والشافعیؒ اول من ابطل

الاجتہاد والتقلید میں یہ بات پوری تحقیق کے ساتھ ثابت فرائی ہے کہ اجتہادی مسائل میں حق متعدد ہے، اسی کو آئمہ اربعہ سے نقل کیا ہے اور خود بھی اس رائے کو پسند فرمایا ہے۔ اجتہادی مسائل سے میری مراد وہ مسائل ہیں کہ جہاں کتاب اللہ یا سنت متواترہ سے کوئی یقینی بات ثابت نہ ہو تو ایسے مسائل میں حق متعدد ہے اور اگر کوئی قطعی دلیل موجود ہو تو وہ موضع اجتہاد نہیں اور وہ مسئلہ اجتہادی نہیں، وہاں حق صرف ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جو اس دلیل قطعی کے مطابق ہے، توجس نے اس کے ساتھ موافقت کی توحق کے ساتھ موافقت کی اور جس نے اس سے مخالفت کی تو اس نے حق سے مخالفت کی اور اس طرح شیخ ولی اللہؒ نے تشریح وعقائد حقہ کے حکم ومصالح کے بارے میں ایسی کتابیں تصنیف فرمائیں جو ہر آنے والے کے لیے روشن چراغ معیار کامل ہیں۔ ان میں سے حجۃ اللہ البالغہ "التفہیمات الالہیہ" الخیر الکثیر وغیر ذلک مشہور کتابیں ہیں، پھر ان کے بعد ان کے طریق کار کے مطابق ان کے صاحبزادوں اور پوتوں نواسوں نے ان کی پیروی کی۔ آپ کے صاحبزادوں میں سے بڑے شیخ اجل صدر اکمل حضرت مولانا الشیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ پھر شیخ شاہ رفیع الدینؒ اور پھر شیخ شاہ عبدالقادرؒ تھے، پھر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد ان کے نواسے مشتہر فی الآفاق حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے[1] (حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے صاحبزادے) علامہ جلیل حضرت شاہ محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے: الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمعیل واسحٰق (اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کے ذریعے اس ملک کو بہت بڑا

---

[1] یہ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ جو حضرت شاہ محمد اسحٰق ؒ کے جانشین تھے، وہ دوسرے ہیں۔

الاحتجاج بالمرسل الا اذا اعتضد واما م الصنعة ذلك الامام الهمام البخاريؒ قد اخذ اصل مالك والشافعى وركب بينهما فيأتى بامسع ما فى الباب ويراعى مساعدة على السلف فلذا لم يات بحديث. يعارض حديثا فى كتابه ولم يخرج فى الكسوف الا حديث الركوعين مشيا منه على اصله واعتمد مسلم على ثقة الرّواة فاخرج حديث ثلاث ركوعات وحديث اربع ركوعات بل حديث خمس ركوعات ايضا موقوفا على امير المؤمنين علی رضی الله عنه فالبخاريؒ قد انتقى واتّبع مسلم القاعدة فما نحنا يتوسطون فى مثل هذا لا يأخذون بالتشدد ولا بالتساهل ويوجهون الاحاديث المتعارضة بتوجيهات يكاد يقبلها من يسمعها مثاله حديث القلتين فقد رواه يزيد بن زريع وكامل بن طلحة وابراهيم الحجاج وهدبة بن خالد وكيع ويحيى بن حسان بلفظ اذا بلغ الماء القلتين او ثلاثا لم يحمل الخبث فيقال فيه ان هذا ليس بتحديد شرعى فقد قال القلتين او ثلاثا بالتنويع فهو تقريب واحالة على خصوص اثر النجاسة من جانب الى جانب وذلك اصل مذهب ابى حنيفة وصاحبيه صرح به الشيخ ابن الهمام والشيخ ابن نجيم وقد سلمت الاحاديث المعارضة الحديث القلتين كحديث النهى عن البول فى الماء الراكد وحديث النهى عن

فیض پہنچایا، حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ دہلی میں بیٹھ کر درس حدیث دیا کرتے اور ملک کے گوشے گوشے سے جوق درجوق طلبۂ علوم حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے اخذ فیوض کیا کرتے تھے اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ نے سُنّتِ مطہرہ اور بدعت کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کے لیے تصنیفات کیں اور ایسے دَور میں سنت کو از سرِ نو زندہ کیا اور تازہ کیا جب کہ اسے ختم کیا گیا تھا اور راہِ حق میں مسلسل جہاد بالسیف بھی کرتا رہا، یہاں تک کہ وُہ شہادت کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہُوئے۔

حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے تلمیذ خاص ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالغنیؒ صاحب مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت شاہ محمد اسحٰق کے بعد ان کی جگہ مسند تدریس حدیث کی زینت بنے اور اطراف ملک سے ان کی خدمت میں بھی طلبۂ علوم حدیث حاضر ہونے لگے اور استفادہ کرتے رہے اور آخر میں انھوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں ان بلادِ مقدسہ میں بھی وہ مسندِ حدیث رسول اللہ فرمارہے، وہاں بہت سے لوگوں نے ان سے حدیث پڑھی اور سند حاصل کی، اسی استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذۂ خصوصی شمس الاسلام والمسلمین العارف الحافظ المحقق مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ دیوبند اور فقیہہ و مجتہد، وَلی کامل الحافظ الشیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے دینی حقائق و معارف پر مشتمل اہم علمی کتابیں، اور مادّیین و دہریین مخالفین اسلام کی تردید میں کچھ کتابیں تصنیف فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے ان بلاد میں بہت زیادہ دینی فائدہ پہنچایا، میں نے آپ کے فضائل و مناقب میں کچھ اشعار کہے تھے۔ جو یہ ہیں: [۱]

قفا یا صاحبی علی الدّیار ۔۔۔ فمن داب الشجی هوی ازدیار

[۱] حضرت شاہ صاحبؒ نے اس جلسے میں پُورا قصیدہ پڑھ کر سنایا جیسا کہ تمہید میں لکھا بھی ہے لیکن مطبوعہ روئداد میں صرف یہ پہلا شعر درج ہے۔

ادخال الید فی الاناء اذا استیقظ وحدیث ولوغ الکلب فی الاناء ومثاله ایضا احادیث القرأة خلف الامام فانهم لما استدلوا علی ترك القرأة خلف الامام فی الصلوٰة بقوله صلی الله علیه وسلم واذا قرأ فانصتوا وبحدیث من کان له امام فقراءة الامام له قرأة اوّلوا حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوٰة لمن لم یقرأبها وذلك انه لم یصح فی شان نزول الآیة شیٔ من الروایات فالعبرة لعموم اللفظ وایضا فقد روی البیهقی فی کتاب القرأة عن الامام احمد انه اجمع العلماء علی ان هذه الآیة فی الصلوٰة وحدیث واذا قرأ فانصتوا حدیث صحیح صحّحه احمد بن حنبل ثم صاحب ابوبکر الاثرم ثم مسلم فی باب التشهد من حدیث ابی موسی الاشعریؓ واحال به علی حدیث ابی هریرة ثم صححه ابن خزیمة و الحافظ ابوجعفر بن جریر الطبری والحافظ ابو بن عبدالبر والحافظ ابن حزم الاندلسی الظاهری ثم الحافظ زکی الدین عبدالعظیم المنذری ثم خاتم الحفاظ الحافظ ابن حجر العسقلانی فی الفتح وهذا من حیث الاسناد واما من عمل السلف والائمة فقد عمل به جماعة من الصحابة ومالك واحمد وابوحنیفة والحدیث اذا کان رواته ثقات ثم ساعده العمل عمل السلف فهو صحیح وبلا ریب لا یقدح فیه قدح ولا یؤثر فیه جرح وحدیث

اور جب لوگوں کو دینی و فقہی مسائل میں اشتباہ پڑتا اور حق و باطل کی تمیز کی ضرورت ہوتی تو اطراف ملک سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس استفتاء کی صورت میں سوالات آتے اور آپ پوری تحقیق کے ساتھ فقیہانہ انداز میں جوابات لکھ دیا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فقیہ مجتہد تھے، تو حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اصول وعقاید میں ہمارے امام تھے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فروع و جزئیات فقہیہ میں ہمارے پیشوا اور رہنما تھے اور ان دونوں حضرات کی برکت سے ہمارا علم خوب منقح اور روشن ہوا اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی باقی نہ رہی۔

جب انگریز کی اجنبی حکومت نے اس ملک پر پورا قبضہ جما لیا اور حق و باطل کے درمیان کش مکش شروع ہوئی اور ایک مستقل لڑائی ٹھن گئی، تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مدرسہ دیوبند کی بنیاد[1] رکھی اور اللہ تعالیٰ نے اس مدرسے کے ذریعے سے بہت زیادہ نفع پہنچایا۔ جزاہ اللہ خیرالجزاء

اس مدرسہ کی غرض و غایت، حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس ہے اور اس اصل مقصد و غایت کی تحصیل کے لیے کچھ دوسرے علوم بھی بطور مبادی و آلات ضروری ہیں۔ ان مبادی کی تعلیم بھی یہاں دی جاتی ہے لیکن الضرورة تتقدر بقدر الضرورة کے قانون کے مطابق ان مبادی ضروریہ کی تعلیم بہ اندازۂ ضرورت ہی ہے، یہاں تک کہ ہمارے شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو چند سال اس مدرسہ میں فلسفہ اور منطق کی آخری کتابوں کا پڑھنا پڑھانا بالکل ہی روک دیا تھا اور ایک عرصے تک یہ سلسلہ رُکا ہی رہا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ یہ ہمارا اور ہمارے اساتذہ کا اسنادِ حدیث ہے، جو اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تک پہنچتا ہے۔

---

[1] ۱۲۸۳ھ میں

من كان له امام فقرأة الامام له قرأة
حكاه الشيخ ابن الهمام عن مسند احمد
بن منيع و صححه فان سنده على شرط
الشيخين ولم نقف الى الآن على علة فيه
واسناده اخبرنا اسحٰق بن يوسف الازرق قال
حدثنا سفيان وشريك عن موسى بن
ابى عائشة عن عبدالله بن شداد عن جابر
بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله
عليه وسلم الحديث وقد ساعده الموقوف عند
الترمذى والمرسل عند آخرين فاذن هو صحيح
فوجه شيخ مشائخنا الشيخ رشيد احمد حديث
عبادة من طريق محمد بن اسحٰق وسياقه
لعلكم تقرأون خلف امامكم قالوا نعم
يارسول الله ؛ نهذه هذا قال فلا تفعلوا الحديث
فقال هذا دليل الاباحة لا دليل الوجوب
وانهم كانوا يقرأن بغير امر منه صلى
الله علي وسلم ولذا سأل بقوله لعلكم
تقرأون خلف امامكم فلما قالوا نعم قال
فلا تفعلوا الا بام القرآن فانها سورة
متعينة من بين سائر القرآن لا غيرها من
السور فعلل النبى صلى الله عليه وسلم اباحتها
خلف الامام بكونها متعينة من بين السور لا
صلوٰة بدونها وظهر عدم كون الصلوٰة بدونها
فى حق الامام والمنفرد واثر ذلك فى الاباحة
فى حق المقتدى ومسئلة الاباحة والكراهة

حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس کے بارے میں ہمارے حضرات اساتذہ کرام کا طریقہ نہایت ہی معقول اور افراط و تفریط سے محفوظ طریقہ ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مسائل فقہیہ جزئیہ کے استخراج و استنباط کے بارے میں ائمہ اربعہ کے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق اکثر چار اصول ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ عمل اہل مدینہ کی اقتدار اور ان کی پیروی کو اصل چیز قرار دیتے ہیں، بلکہ کبھی تو اسے ایک حدیث مرفوع پر بھی ترجیح دیا کرتے ہیں؛ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اصح ما فی الباب حدیث کو لے کر باقی روایات کی یا تو تاویل کر دیتے ہیں یا ان کو اس اصح کے مقابلے میں ترک کر دیتے ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصح صحیح، حسن اور ضعیف (جب کہ اس کا ضعف معمولی درجے کا ہو) سب کو معمول بہا بنانے کے لیے قبول کر دیتے ہیں اور ہر ایک مدلول و مضمون کے مطابق عمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور انھوں نے اسی بنیاد پر اپنی کتاب مسند احمدؒ کو جمع کیا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان تمام اقسام حدیث کو لے لیتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے مضمون کو ایک قانون کلی ہونے کی وجہ سے اصل شرعی قانون قرار دے کر دوسری مختلف روایات کی مناسب توجیہ کرتے ہیں اور ہر حدیث کے لیے کوئی اچھے سے اچھا محل تلاش کر دیتے ہیں اور اس لیے حنفیہ کے ہاں تاویلات احادیث زیادہ ہوتی ہیں اور شافعیہ کے ہاں رُواۃ پر جرح و تنقید زیادہ ہوتی ہے اور امام شافعیؒ وہ اوّل بزرگ ہیں، جنھوں نے مرسل حدیث کو حجت تسلیم نہیں کیا، ہاں اگر اس کے مضمون کی تقویت و تائید دوسری روایات سے ہوتی ہو تو اس صورت میں وہ مان لیتے ہیں۔

امام فن حدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام

---

[1] تفصیل کے ساتھ اس کو حضرت گنگوہیؒ کی تقریر ترمذی الکوکب الدری جلد اوّل صفحہ ۸ اور حضرت علامہ کشمیریؒ کی تقریر العرف الشذی جلد اوّل ص۱۹ اور مولانا بنوریؒ مدظلہ کی شرح ترمذی معارف السنن جلد اوّل ص۱۰۲ میں مطالعہ کیا جائے۔

مختلف فیها عند الحنفیة وان اتفقوا علیٰ عدم الوجوب وقالوا فی مسئلة رفع الیدین وجهر آمین انه قد صح الرفع والجهر عن النبی صلی الله علیه وسلم وعن الصحابة وقد صح ترك الرفع باسناد صحیح عند ابی داوٗد والاخفاء وقد صح ترك الرفع عن امیرالمومنین عمر و امیرالمومنین علی وكذا صح الاخفاء بآمین عن جماعة من الصحابة والسلف الصالح فلیكن كلا الامرین سنة وانما یبقی الشان فی الترجیح هذا والله الموفق للسداد فی المبداء والمعاد ثم تلمذ علی الشیخ محمد قاسم شیخنا العدل الحجة مسند وقته الشیخ محمود حسن متع الله المسلمین بطول بقائه وهو شیخ المدرسة الآن وعلیه المدار فی الاسناد فی هذه البلاد وهو علی طریقة مشائخه ساعده التوفیق الالهی فی التوفیق بین المتعارضات وحل المشكلات مثاله ما قال لی مرة ان تعدد الركوع فی الكسوف قد ثبت عن النبی صلی الله علیه وسلم لامر اختص به ولكن ارشد الامة الی وحدة الركوع فقال صلوا كاحدث صلوة صلیتموها من المكتوبة فراجعته وقلت ان السادة الشافعیة یحملون التشبیه علی عدد الركعتین لا علی وحدة الركوع فقال ان هذا هو جعل البدیهی نظریا فانه اذا كان النبی صلی اللہ علیه وسلم

مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے اصول کو پسند فرمایا ہے اور انھوں نے پھر ان دونوں کے اصول کو ملا دیا ہے۔ اس لیے وہ اپنی کتاب الجامع الصحیح میں ..... اصح ما فی الباب حدیث لے آتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کی بھی رعایت فرماتے ہیں کہ عمل سلف کے ساتھ وہ موافق بھی ہو اور اسی لیے وہ اپنی صحیح میں کوئی ایسی حدیث نہیں لاتے، جو کسی دوسری حدیث کے ساتھ معارض ہو، اور صلوٰۃ کسوف کے بارے میں انھوں نے صرف دو روایت درج کی ہے، جس میں ہر رکعت میں دو رکوعوں کا ذکر ہے اور اس معاملے میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اصول کی رعایت کی ہے اور امام مسلمؒ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے رواۃ حدیث کی ثقاہت پر اعتماد کیا ہے۔ اس لیے انھوں نے ایک رکعت میں تین رکوعوں والی روایت، ایک رکعت میں چار رکوعوں والی روایت بھی اپنی کتاب میں درج کی ہے، بلکہ اُنھوں نے امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہر رکعت میں پانچ رکوعوں والی حدیث بھی روایت کی ہے تو دیکھئے۔ امام بخاریؒ نے انتخاب کر کے ایک روایت پسند فرمائی اور امام مسلمؒ نے قاعدے کی پیروی کر کے تخریج روایات کی ہے۔

ہمارے مشائخ کرام یعنی حضرات اساتذہ مدرسہ دیوبند اس بارے میں توسط و اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ نہ تو تشدد اور سختی سے کام لیتے ہیں اور نہ نرمی برتتے ہیں اور احادیث متعارضہ کی ایسی ایسی معقول و دلنشیں توجیہات کرتے ہیں کہ جن کو ہر سمجھدار سننے والا سن کر بدل و جان قبول کر لیتا ہے۔ اس کی ایک مثال حدیث قلتین دیکھئے، یزید بن زریع، کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدبہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے تو اس کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔ اذا بلغ الماء قلتین او ثلاثا لم یحمل الخبث تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ در اصل تحدید شرعی نہیں، کیونکہ یوں فرمایا: القلتین او ثلاثا یعنی او کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو تنویع کے لیے ہے تو یہ درحقیقت ایک تخمینی اندازہ ہے اور اصل مدار اس پر ہے کہ ایک جانب کی نجاست دوسری جانب تک

قد صلى الكسوف بتعدد الركوع بنفسه على اعين الناس ورؤس الشهاد وكان يشرع تعدد الركوع للامة فلم ترك الاحالة على ماشاهده وعدل الى التشبيه بالصبح ماذالك الا ان التعدد كان لعارض وارشد الامة الى المعروف فى الصلوٰة والله الموفق والمعين ، واٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين ، تمت بالخير

اثر انداز ہوتی ہے۔ یا نہیں نہ اور امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین رحمہم اللہ کا اصل مذہب یہی ہے، چنانچہ شیخ ابن الہمامؒ اور شیخ ابن نجیمؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے اور اس صورت میں وہ حدیثیں جو بظاہر حدیث قلتین سے متعارض و مخالف ہیں، تعارض و مخالفت سے محفوظ ہو جاتی ہیں، مثلاً حدیث النہی عن البول فی الماء الراکد (ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کرنیوالی حدیث) اور حدیث النہی عن ادخال الید فی الاناء (نیند سے بیدار ہونے کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے ممانعت کرنیوالی حدیث) اور حدیث ولوغ الکلب فی الاناء (کسی برتن میں کتے کے پانی پینے کے بارے میں حدیث) ان تمام احادیث کے ساتھ قلتین والی حدیث کا تعارض اس توجیہ پر باقی نہیں رہے گا۔

دوسری مثال قرأۃ خلف الامام کی حدیثیں ہیں۔ اس لیے کہ جب حضرات حنفیہ نے امام کے پیچھے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی دلیل اس آیت کو قرار دیا۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. اور یہ حدیث نبوی واذا قرأ فانصتوا جب امام قرآن پڑھے تو تم خاموش رہا کرو اور یہ ارشاد نبوی من کان له امام فقرأۃ الامام له قرأۃ (جس کا امام ہو تو امام کا قرآن پڑھنا، اس کا قرآن پڑھنا ہے)، تو انہوں نے اس سے بظاہر متعارض روایات مثلاً حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بها کی تاویل و توجیہ کی۔ آیت مذکورہ بالا کی شان نزول کے بارے میں کوئی صحیح روایت مروی نہیں، تو لازماً اس کے الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا۔ نیز امام بیہقیؒ نے کتاب القرأۃ میں امام احمدؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ علمائے کرام نے اجماع کیا ہے کہ یہ آیت قرأۃ فی الصلوٰۃ کے بارے میں وارد ہے اور اذا قرأ فانصتوا ایک صحیح حدیث ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ پھر ابوبکر بن الاثرمؒ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ پھر امام مسلمؒ نے باب التشہد میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ذکر کی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا حوالہ دیا ہے۔ پھر ابن خزیمہؒ، حافظ ابوجعفر بن جریر طبریؒ، حافظ ابوعمرو بن عبدالبرؒ، حافظ ابن حزم، الاندلسی الظاہری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے پھر حافظ ذکی الدین، عبدالعظیم المنذری اور پھر خاتم الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہم اللہ نے فتح الباری میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ از من حیث الاسناد اس حدیث کی اہمیت و قوت ہوئی۔ لیکن دوسری طرف سلف صالحین اور آئمہ کرام کے عمل کی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اس پر صحابہؓ کی جماعت نے اور امام مالکؒ امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے عمل کیا ہے اور جب کسی حدیث کے راوی ثقہ اور معتمد ہوں اور پھر سلف صالحین کا تعامل بھی اس کے مضمون و مدلول کی مساعدت کرے، تو وہ بلا ریب صحیح ہے اور کسی اعتراض کرنیوالے کا رد و قدح اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور کوئی جرح اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی اور حدیث من کان له امام فقرأۃ الامام له قرأۃ کو حضرت

شرح و تفصیل معارف السنن، جلد اول از صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۸ میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

شیخ ابن الہمامؒ نے مسند احمد بن منیع سے نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے۔ کیونکہ اس روایت کی سند حضرات شیخین (امام بخاریؒ و امام مسلمؒ) کی شرائط کے مطابق ہے اور ابھی تک ہمیں اس میں کسی علت قادحہ کا علم نہیں ہوا اور اس کی سند یہ ہے۔ اخبرنا اسحٰق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریك عن موسٰی بن ابی عائشة عن عبد الله بن شداد عن جابر بن عبد الله . قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من كان له امام الحديث اور ترمذی کے ہاں ایک موقوف روایت نے اور دوسرے محدثین کے ہاں ایک مرسل روایت نے اس کی تائید و مساعدت بھی کی ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ حدیث بالکل صحیح حدیث ہے تو ہمارے شیخ المشائخ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ والی حدیث کی توجیہ فرمائی جو محمد بن اسحٰق کے ذریعے سے مروی ہے اور اس کا سیاق یہ ہے۔ لعلکم تقرؤن خلف امامکم (شاید کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھا کرتے ہو) تو ان صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ ہاں ! یا رسول اللہ. تو آپؐ نے فرمایا: فلا تفعلوا (ایسا نہ کیا کرو) آپ نے توجیہ فرمائی ہے کہ یہ تو دلیل اباحت ہے، نہ دلیلِ وجوب اور یہ کہ وہ حضرات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بغیر از خود پڑھا کرتے تھے اور اسی لیے تو آپؐ نے ان سے پوچھا تھا کہ شاید تم امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھا کرتے ہو تو انھوں نے کہا کہ ہاں تو آپؐ نے فرمایا: فلا تفعلوا الا بام القرآن . اس لیے کہ یہ سورت قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں سے ایک متعین اور مخصوص سورت ہے، دوسری سورتیں اس طرح متعین نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے اس کے پڑھنے کی اباحت کی وجہ یہ ذکر فرمائی کہ یہ قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں سے ایک متعین اور مخصوص صورت ہے اور اس کے بغیر نماز کا نہ ہونا امام اور منفرد کے حق میں ظاہر ہو رہا ہے اور مقتدی کے حق میں اباحت کا اظہار ہوتا ہے اور اباحت و کراہت کا مسئلہ تو خود حنفیہ کے ہاں بھی مختلف ہے، اگرچہ اس پر سب حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وجوب قرأت فاتحہ مقتدی کے لیے نہیں ہے۔[1]

اور ہمارے مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسئلہ رفع یدین اور مسئلہ آمین بالجہر کے بارے میں بھی یہی فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے رفع یدین اور آمین بالجہر ثابت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور ترک رفع یدین بھی اسناد صحیح کے ساتھ امام ابو داؤد کے ہاں ثابت ہے اور اسی طرح اخفاء آمین میں بھی، اس کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا. نیز ترک رفع یدین امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایات صحیحہ کی بناء پر ثابت ہے اور اسی طرح اخفاء بالتامین بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت اور سلف صالحین سے صحیح روایات کی بنیاد پر منقول اور ثابت ہے۔ اس وجہ سے ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ دونوں کام سنت ہوں۔ اب البتہ اگر فرق ہے تو ترجیح کس کو دی جائے، یعنی حضرات حنفیہ کے ہاں رفع یدین اور ترک رفع یدین میں اور تامین بالجہر اور تامین بالاخفاء میں کس کو ترجیح دی جائے۔[2]

جو تفصیلات میں نے ذکر کی ہیں، ان مسائل میں ہمارے حضرات اساتذہ کرام کے مسلک کی حقیقت یہی ہے۔ و الله الموفق للسداد فی المبدا والمعاد.

---

[1] حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی تقریر ترمذی الکوکب الدری میں از صفحہ ۱۴۷ تا ۱۴۹ پوری تحقیق مطالعہ کی جائے۔

[2] ان مسائل میں اختلاف صرف راجح و مرجوح یا اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا ہے، اس کی مدلل تفصیل تحقیق فیض الباری جلد دوم از صفحہ ۲۵۵ تا ۲۶۲ میں مطالعہ کی جائے۔

ہاں پھر حضرت مولانا نانوتوی کے تلمیذ خاص حضرت شیخنا العدل الحجۃ مسند الوقت مولانا محمود حسن متعنا اللہ المسلمین بطول بقائہ ہیں، ابھی شیخ الدرس ہیں اور ہمارے ان بلاد میں اسناد حدیث کا مدار اب ان ہی پر ہے، وہ اساتذہ کرام کے مسلک اور طریق کار پر کاربند ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے خاص توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ متعارض روایات کی نہایت عمدہ اور دلنشین تطبیق فرماتے اور مشکلات ومہمات حدیث کا نہایت عمدہ حل پیش فرماتے ہیں۔ اس کی ایک مثال دیکھئے کہ انھوں نے ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ صلوٰۃ کسوف میں تعداد رکوع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، غالباً یہ کسی خاص وجہ کی بنا پر آپ کی خصوصیت ہے، لیکن آپ نے اپنی اُمت کو خطاب کرکے فرمایا: صلوا کاحدث صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (تم نے جو فرض نماز ابھی تازہ تازہ پڑھی ہے، یعنی فجر کی نماز اس صلوٰۃ کسوف کو بھی اس کی طرح پڑھو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت، حضرات علمائے شافعیہ اس تشبیہ کو محض تعداد رکعات پر محمول کرتے ہیں، وحدت رکوع پر محمول نہیں کرتے، آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک بدیہی کو نظر کرنا ہوا۔ اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کی نماز تعدد رکوع کے ساتھ خود ہی تمام لوگوں کے سامنے مجمع عظیم کو پڑھائی اور آپ اُمت کے لیے تعدد رکوع ہی کو مشروع قرار دینا چاہتے ہیں، تو آپ نے اس پر اکتفا کیوں نہیں فرمایا۔ آپ کا عمل تو لوگوں نے اس وقت دیکھا تھا۔ آپ کا فعل بھی حجت شرعی ہے۔ مگر عمل پر اکتفا کرتے ہوئے، آپ نے صبح کے ساتھ تشبیہ دی اور قول کے ساتھ امت کو حکم دیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ یہ واضح فرماتے ہیں کہ تعدد رکوع کسی عارض کی وجہ سے تھا اور اُمت کو وہ طریقہ بتلا دیا جو نماز کے بارے میں ایک معروف طریقہ تھا۔ واللہ الموفق المعین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے فیض الباری جلد دوم ص ۲۶۹ — تمت بالخیر

بقیہ، سپاس نامہ

جب کہ پہل ذلت کے نخل دیں سے کھائیں ہم
علم کا چقماق سے آتش نہ ہو کیوں کر بھلا
جب حقوق اس کے ادا کرنے سے کتراجائیں ہم
گر بچائیں علم کو ہم دستبرد ..... طمع ... سے
آپ پھر دیکھیں کہ کیسے کیسے رتبے پائیں ہم
عزتیں دنیا و دیں کی ہم کو حاصل ہوں ضرور
علم دین کے ساتھ گر تعظیم سے پیش آئیں ہم
کی اہانت علم کی دنیا میں رسوا ہو گئے
کاش اس غفلت شعاری پہ ذرا شرمائیں ہم
علم کے چہرے پہ ڈالی خاک دست طمع سے
ہائے وہ ناخوش ہوا، اب ڈوب کر مرجائیں ہم

*

احباب! اس سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور ملتجی ہوں کہ آپ ہمارے لیے اور دارالعلوم کے طلبہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اخلاص نصیب کرے، اللہ کی رضا اور خوشنودی میں سرگرم رہیں۔ اس کے دین کی خدمت گزاری کو سرمایہ حیات سمجھیں اور اور مسلمانوں کی نفع رسانی میں اپنی مساعی کو وقف کردیں۔

والسلام

طبقات

مشاہیر

دارالعلوم دیوبند

ترتیب فکر : فاضل شہابی الحسینی القاسمی مدراس

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل ، یک نیستان نالہ ، یک خم خانہ مے

ہندوستان میں لارڈ میکالے کے نظام تعلیم اور انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے اعلان و اجراء کے بعد بانیان دارالعلوم واکابر دیوبند نے ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھی جو اپنی ذات میں محض ایک انجمن ، اور اپنی صفات میں صرف اسلامی یونیورسٹی ہی نہیں ، بلکہ ایک عظیم اسلامی تحریک تھی ، جو پورے عالم اسلام کو متاثر کرگئی ۔ یہ تعلیمی تحریک دارالعلوم دیوبند کے نام سے چلائی گئی ، جس نے برصغیر ایشیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ملک میں انقلابی تحریکات میں بھی مدد دی اور ملک و ملت کو درس حریت دیا .... دارالعلوم کا اساسی کام تعلیم کتاب اللہ ، تدریس سنت حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تفقہ فی دین اللہ کی روشنی میں ایسے علماء ، مجاہدین ، محدثین ، فقہاء امت ، رجال کار پیدا کرنا تھا ، جو دل و دماغ کے اعتبار سے صحیح مسلمان اور قلب و فکر کی گہرائیوں سے مؤمنانہ کے مسلمان ہوں ، بحمد للہ دارالعلوم کی تعلیمات سے ملک میں متعدد طبقات ، مختلف علوم و فنون کے مشاہیر اور علم کے پہاڑ پیدا ہوئے ، جو ملک و ملت کے ہر شعبہ میں کام آئے اور ہر حلقے کے لیے مفید اور ہر محاذ پر کام کرنے کے اہل ثابت ہوئے ۔ ملک و ملت کا کوئی ایسا محاذ نہ ہوگا ، جہاں دیوبندی مکتب فکر کا عالم سینہ سپر نہ ہوگا ۔ اور کوئی عملی و علمی میدان علمائے دیوبند سے خالی نہ ہوگا ، نیز جہاد حریت ، تفسیر قرآن ، سنت و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، توحید باری ، تحفظ ناموس رسالت ، مقام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ، خدمت دین حنیف ، غرض دیوبندی اکابر نے اپنی تحقیقات و مزاج و حالات

کے مطابق پوری دیانتداری سے ہر دینی تحریک کی جدوجہد میں حصہ لیا اور ملک و ملت کی خدمات کا حق ادا کیا ..... راقم ہیچمداں، دارالعلوم دیوبند کا ادنیٰ طالب علم، اپنے ناقص معلومات کی بنا پر نہایت اختصار کیساتھ سولہ طبقات پر مشتمل چند اکابر و مشاہیر کے صرف اسمائے گرامی کی ایک کتاب نما فہرست پیش کر رہا ہے جن کے اسمائے گرامی سے ان کی ذات ستودہ صفات، اور ان حضرات کی جامعیت نیز ان کے کارہائے نمایاں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور دارالعلوم نے کیسے آفتاب و ماہتاب پیدا کیے، ان کی سیرۃ و سوانح سے پورے ملک کی تاریخ بنتی ہے۔ بعض بزرگ اور ان کے اسما پوری تحریک کا تعارف کراتے ہیں اور بعض حضرات اپنی ذات میں انجمن ہیں اور بعض اکابر کے نام سے تاریخ وابستہ ہے۔ اور بعض لوگوں کے کارنامے پوری ملت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ وہ یادگار زمانہ لوگ ہیں، جن کی مسانید اب تک خالی پڑی ہیں اور پوری قوم مل کر بھی اس کی تلافی نہ کرسکی۔ ع

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں یہ!

سالمے خانوادے سے دو بزرگوں کے سوانح ہی دیکھ لیجئے۔

۱۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، صاحب تصانیف کثیرہ، ایسی جامع شخصیت کہ ان کے خلفاء علماء لاتعد، و لاتحصیٰ حضرت تھانویؒ کا ہر خلیفہ مجاز ایک ستارہ اور ہزارہا مریدانِ باصفا کا سلسلہ جاری وساری ہے

۲۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا مرشدنا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات سے عرب و عجم مستفیض ہوئے اور ان کے خدام کا حلقۂ اثر پاک و ہند و بنگلہ دیش اور حرمین شریفین تک پھیلا ہوا ہے

یہ فہرست صرف نشاندہی ہے۔ اور حضرات علماؑ سے پوری معذرت کے ساتھ پیش کی جارہی ہے

حضرات مفسرین و مترجمین قرآن حکیم

۱۔۔۔ شیخ الہند حضرت مولانا سید محمود حسن دیوبندی (اسیر مالٹا) رحمۃ اللہ علیہ

۲۔۔۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔۔۔ شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔۔۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۵۔۔۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۶۔۔۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ التفسیر و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور)

۷۔۔۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع دیوبندی کراچی مدظلہٗ

۸۔۔۔ بدر العلماء حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی مدظلہٗ (شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ

۹۔۔۔ جناب حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ (واں بھچراں میانوالی)

جماعت محدثین کرام

۱۔۔۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔۔۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
۳۔۔۔ حضرت شیخ الہند دیوبندی (اسیر مالٹا) رحمۃ اللہ علیہ
۴۔۔۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث دارالعلوم)
۵۔۔۔ حضرت مولانا علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
۶۔۔۔ حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ
۷۔۔۔ حضرت مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ
۸۔۔۔ حضرت مولانا عبد العلی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۹۔۔۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی
۱۰۔۔۔ حضرت مولانا محمد اسحٰق امرتسری رحمۃ اللہ علیہ
۱۱۔۔۔ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ
۱۲۔۔۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (پاکستان)
۱۳۔۔۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور)
۱۴۔۔۔ حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ
۱۵۔۔۔ حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ
۱۶۔۔۔ حضرت مولانا فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ
۱۷۔۔۔ حضرت مولانا عبد السمیع رحمۃ اللہ علیہ
۱۸۔۔۔ حضرت مولانا عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (گوجرانوالہ)
۱۹۔۔۔ حضرت مولانا سید میرک شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

۲۰۔۔۔ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدظلہٗ
۲۱۔۔۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہٗ
۲۲۔۔۔ حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی مدظلہٗ (بالواسطہ)

متکلمین اسلام

۱۔۔۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (بانی دارالعلوم دیوبند)
۲۔۔۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم
۳۔۔۔ حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی مدظلہٗ
۴۔۔۔ حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
۵۔۔۔ حضرت علامہ خالد محمود ایم اے، پی، ایچ، ڈی

مفتی و فقہاء

۱۔۔۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ (مفتی دارالعلوم)
۲۔۔۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۳۔۔۔ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ
۴۔۔۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ
۵۔۔۔ حضرت مولانا مفتی ریاض الدین رحمۃ اللہ علیہ
۶۔۔۔ حضرت مولانا مفتی مہدی حسن رحمۃ اللہ علیہ
۷۔۔۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہٗ (کراچی)
۸۔۔۔ حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ رائپوری رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ رشیدیہ)
۹۔۔۔ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی (جامعہ اشرفیہ)
۱۰۔۔۔ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف (آزاد کشمیر)

معلمین و اساتذہ

۱۔۔۔ حضرت مولانا محمد مراد رحمۃ اللہ علیہ (پاکپتنی سابق مدرس دارالعلوم دیوبند)
۲۔۔۔ حضرت مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ
۳۔۔۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بھاگلپوری)
۴۔۔۔ حضرت مولانا منفعت علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۵ — حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۶ — حضرت مولانا عبدالحق نافع پشاوری (رحمۃ اللہ علیہ)

۷ — حضرت مولانا عبدالوہاب دربھنگوی (رحمۃ اللہ علیہ)

۸ — حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ

۹ — حضرت مولانا شمس الحق بنگالی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰ — حضرت مولانا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ (ڈھاکہ)

۱۱ — حضرت مولانا عرض محمد رحمۃ اللہ علیہ بلوچستان)

۱۲ — حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی

۱۳ — حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ

۱۴ — حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رحمۃ اللہ علیہ

۱۵ — حضرت مولانا عبدالسمیع انصاری رحمۃ اللہ علیہ

۱۶ — حضرت مولانا عبدالحق حقانی مدظلہ ایم این اے

۱۷ — حضرت علامہ محمد شریف کشمیری مدظلہ شیخ الحدیث د

۱۸ — حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیرالمدارس ملتان (بالواسطہ)

مصنفین و مؤرخین

۱ — حضرت مولانا علامہ مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

۲ — حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

۳ — حضرت مولانا سعید احمد ایم اے اکبرآبادی

۴ — حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

۵ — حضرت مولانا عبدالصمد صارم ازہری

۶ — حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۷ — حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

۸ — حضرت مولانا علامہ سرفراز خان صفدر گوجرانوالہ

۹ — حضرت علامہ خالد محمود ایم اے، پی، ایچ، ڈی۔

۱۰ — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی (جامعہ ملیہ)

۱۱ — سید نورالحسن شاہ صاحب بخاری، سربراہ تنظیم اہلسنت

مبلغین دین اسلام

۱ — حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (بانیٔ تبلیغ)

۲ — حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ خلف الرشید حضرۃ مولانا الیاسؒ)

۳ — حضرۃ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

۴ — حضرت مولانا سید منظم علی شاہ (مبلغ دارالعلوم)

۵ — حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن شاہؒ " " "

۶ — حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ

۷ — حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ حصاروی

۸ — حضرت مولانا مفتی زین العابدین لائلپوری

۹ — حضرت مولانا محمد علی جالندھری بانی مجلس تحفظ ختم نبوت

۱۰ — حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہؒ (مبلغ جامعہ رشیدیہ)

۱۱ — حضرت علامہ دوست محمد قریشی رحمۃ اللہ علیہ تنظیم اہل سنت

۱۲ — حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ (بالواسطہ)

۱۳ — حضرت مولانا عبدالشکور دین پوری (بالواسطہ)

۱۴ — حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی

مناظرین اسلام

۱ — حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن شاہ مناظر دارالعلوم

۲ — حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ

۳ — حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوریؒ

۴ — حضرت مولانا ابوالقاسم رحمۃ اللہ علیہ

۵ — حضرت مولانا اسعد اللہ مظاہر العلوم سہارنپور

۶ — حضرت علامہ خالد محمود ایم اے، پی، ایچ، ڈی

۷ — حضرت علامہ دوست محمد قریشی رحمۃ اللہ علیہ تنظیمی

۸۔۔۔۔ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (بالواسطہ)

۹۔۔۔۔ حضرت مولانا لال حسین اختر رحمۃ اللہ علیہ

۱۰۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد حیات فاتح قادیان

۱۱۔۔۔۔ حضرت علامہ عبدالستار تونسوی

۱۲۔۔۔۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی (بالواسطہ)

مجاہدین و قائدین ملت

۱۔۔۔۔ امام وقت حضرت شیخ الہند دیوبندی اسیر مالٹا

۲۔۔۔۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح

۳۔۔۔۔ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رح

۴۔۔۔۔ اسیر مالٹا حضرت مولانا عزیر گل پشاور مدظلہٗ

۵۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری رح

۶۔۔۔۔ حضرت مولانا سیف الرحمٰن رح (کابل)

۷۔۔۔۔ حضرت مولانا فضل ربی (افغانستان)

۸۔۔۔۔ حضرت مولانا عبدالرزاق (قاضی القضاۃ افغانستان)

۹۔۔۔۔ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد رح دین پوری

۱۰۔۔۔۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رح

۱۱۔۔۔۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ بخاری رح (بالواسطہ)

۱۲۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد صادق کراچی (سندھ)

۱۳۔۔۔۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح

۱۴۔۔۔۔ مجاہد ملت حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ ایم این اے، سابق وزیر اعلیٰ سرحد

۱۵۔۔۔۔ حضرت مولانا سید وحید احمد مدنی رح (اسیر مالٹا)

۱۶۔۔۔۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، (صدر جمعیۃ علماء ہند)

۱۷۔۔۔۔ شمس الملت مولانا شمس الدین شہید بلوچستان

ائمہ سلوک و حضرات مشائخ کرام و صوفیائے عظام

۱۔۔۔۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔۔۔۔ محدث اعظم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔۔۔۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔۔۔۔ امام وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی (اسیر مالٹا)

۵۔۔۔۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۶۔۔۔۔ حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۷۔۔۔۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

۸۔۔۔۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری رحمۃ اللہ علیہ

۹۔۔۔۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۰۔۔۔۔ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۔۔۔۔ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ دین پوری

۱۲۔۔۔۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۔۔۔۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ (بانی جامعہ اشرفیہ)

۱۴۔۔۔۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت تھانوی رح

۱۵۔۔۔۔ حضرت مولانا حافظ حاجی محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ رائپوری بانی جامعہ رشیدیہ

۱۶۔۔۔۔ حضرت مولانا مفتی رحمت علی . . . . . .

۱۷۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدظلہٗ

۱۸۔۔۔۔ حضرت مولانا عبداللہ بہلیم پوری رحمۃ اللہ علیہ (خانقاہ سراجیہ)

۱۹۔۔۔۔ حضرت مولانا عبدالہادی دین پوری مدظلہٗ

۲۰۔۔۔۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ (میرٹھی)

۲۱۔۔۔۔ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی (سندھ)

۲۲۔۔۔۔ حضرت پیر حماد اللہ ہالیجی شریف (سندھ)

۲۳۔۔۔۔ خلفائے حضرت تھانوی رحمہم اللہ علیہم

قراء و حفاظ

۱ـــ الاستاذ حضرت قاری عبدالوحید معلم دارالعلوم

۲ـــ قاری حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ معلم دارالعلوم

۳ـــ قاری اصغر علی رحمہ اللہ معلم دارالعلوم

۴ـــ قاری جلیل احمد رحمہ اللہ معلم دارالعلوم

۵ـــ حضرات قراء پانی پتی رحمہم اللہ (لا تعد و لا تحصیٰ)

ـ اولٰئک آبائی فجئنی بمثلہم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ناظمین و مہتمین

۱ـــ حضرت حاجی عابد حسین رح دیوبندی

۲ـــ حضرت شاہ رفیع الدینؒ

۳ـــ حضرت مولانا حافظ محمد احمد قاسمیؒ

۴ـــ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ

۵ـــ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ

۶ـــ حضرت مولانا عبداللطیف ناظم سہارنپوری

صحافی و اہل قلم

۱ـــ مولانا سعید احمد ایم۔ اے (مدیر برہان، استاذ علیگڑھ یونیورسٹی)

۲ـــ مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

۳ـــ مولانا حامد الانصاری غازی (مدیر مدینہ بجنور)

۴ـــ علامہ تاجور نجیب آبادی (ادبی دنیا) لاہور

۵ـــ سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر دارالعلوم

۶ـــ مولانا عزیز احمد قاسمی رح (الجمعیۃ)

۷ـــ مولانا عبدالوحید صدیقی (نئی دنیا دہلی)

۸ـــ مولانا شائق عثمانی عصر جدید کلکتہ

۹ـــ مولانا محمد تقی (مدیر البلاغ کراچی)

۱۰ـــ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن (ندوۃ المصنفین دہلی)

۱۱ـــ مولانا محمد یوسف مدیر بینات کراچی

۱۲ـــ مولانا سید عطاء المنعم بخاری ابن امیر شریعتؒ

۱۳ـــ مدیران گرامی۔ القاسم، الرشید، قاسم العلوم، محمود، الخلیل۔ جرائد دارالعلوم۔

اطباء و حکماء

۱ـــ جناب حکیم جمیل الدین نگینویؒ استاذ دارالعلوم و استاذ حکیم اجمل خاں مرحوم

۲ـــ جناب حکیم الدین بجنوری

۳ـــ حکیم عبدالوہاب دہلوی (مشہور نابینا طبیب)

۴ـــ حکیم محمد حسن دیوبندیؒ

۵ـــ حکیم سید محفوظ علیؒ

۶ـــ حکیم محمد رمضان نکیم پوریؒ

۷ـــ حکیم محمد عمر طبیب دارالعلوم

۸ـــ مولانا حافظ حکیم عبدالمجیدؒ بی اے (طبیب نابینا لائلپوری)

ادباء و شعراء

۱ـــ مولانا علامہ عبدالرشید نسیم طالوت مرحوم (ملتان)

۲ـــ مولانا عزیز الدین عظامیؒ (تلمیذ گرامی مرحوم، ہوشیارپوری)

۳ـــ جناب علامہ انور صابری دیوبندی

۴ـــ حضرت مولانا عبدالمنان دہلویؒ

بقیہ (صفحہ ۲۳۴)

از حضرت علامہ مولانا ابوالزاہد سرفراز خان صاحب صفدر گوجرانوالہ

بانیٔ دارالعلوم دیوبند

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم الصدیقی النانوتویؒ بن شیخ غلام شاہ الخ۔ آپ سیدنا حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل اور اولاد میں سے تھے۔ اور ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء کو قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ یہ قصبہ دیوبند سے بارہ کوس مغرب میں سہارنپور سے پندرہ کوس جنوب میں گنگوہ سے نو کوس مشرق میں اور دہلی سے ساٹھ کوس شمال میں واقع ہے۔ آپ کے والد بزرگوار تعلیم سے چنداں بہرہ ور نہ تھے۔ صرف ایک معمولی زمیندار تھے۔ البتہ بزرگوں کی نیک صحبت سے ضرور متاثر تھے اور دین سے کافی لگاؤ تھا۔

حضرت نانوتویؒ نے اکثر کتابیں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ) سے پڑھی تھیں جو اپنے وقت کے مشہور مدرس متبحر عالم اور مختلف علوم و فنون کی کامل مہارت رکھنے والے شفیق استاد تھے۔ رب ذوالمنن نے حضرت نانوتویؒ کو ابتداء ہی سے بڑی ذہانت اور عمدہ فطانت کی دولت نظیر سے وافر حصہ مرحمت فرمایا تھا۔ جب جملہ علوم و فنون کی تعلیم مکمل کر چکے۔ تو آخر میں حضرت مولانا قطب الارشاد رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے ساتھ مل کر راس الاتقیاء شیخ وقت محدث کامل اور یکتائے روزگار حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی الحنفی (المتوفی ۱۲۹۵ھ) سے حدیث شریف کا دورہ پڑھا اور اسی زمانے میں دونوں بزرگوں نے وقت کے رئیس الاولیاء مجاہد کبیر عالم باعمل مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) سے بیعت کر کے سلوک کی راہ اختیار کی اور ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم اور تصوف و ورع میں بھی وہ مقام حاصل کیا جو ان کے زمانہ میں انہیں کے لیے واہب حقیقی نے مخصوص کر رکھا تھا۔ جن کے ذریعہ سینکڑوں حضرات کو روحانی فیض بھی حاصل ہوا اور تزکیۃ النفس کے وہ اعلیٰ مراتب بھی قادر مطلق نے انہی کی بدولت مرحمت فرمائے جو اس دور میں بہت کم کسی اور کو حاصل اور نصیب ہوئے ہوں گے ؛ سچ ہے

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایامِ طالب علمی میں خواب

حضرت نانوتویؒ نے طالب علمی کے زمانہ میں بہت سے خواب دیکھے تھے جو آنے والے دور میں اُن کی دینی خدمات اور رفع درجات کی طرف مشیر اور رب قدیر کی طرف سے بشریٰ اور خوشخبری تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (المتوفی حدود ۱۳۰۲ھ) جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے قریبی رشتہ دار، ہم وطن، رفیق درس، استاد زادہ، بعض کتابوں میں شاگرد، ہم زلف اور پیر بھائی تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ :-

ایام طالب علمی میں مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ نے ایک بار خواب

دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ جناب والد صاحبؒ (یعنی حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ) سے ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا۔ (سوانح مولانا محمد قاسم صاحبؒ ص۹۔ یہ واقعہ ارواح ثلاثہ ص۲۰۲ میں بھی منقول ہے) اس میں ذرہ برابر شک وشبہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کی دیگر سینکڑوں شاخوں سے قرآن، حدیث، فقہ اور علم دین کی جو نشر و اشاعت ہوئی اس صدی کے اندر تمام جہان میں اس کی نظیر تلاش کرنا بے سود ہے۔ بلاشبہ قاہرہ یونیورسٹی صدیوں سے حکومتِ مصر کے زیرِ سایہ دینیات اور علم دین کی خدمت انجام دے رہی ہے، مگر صورت و سیرت گفتار و کردار ظاہر و باطن کے اعتبار سے علم و عمل کا جو نمونہ مادرِ علوم دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں نے قائم کیا ہے وہ اس دورِ انحطاط میں کبھی نہیں مل سکتا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی قائم کردہ (یا اس کے نمونہ اور اس کے نقشِ قدم پر قائم کردہ) شاخوں میں ہزاروں جید اور ربانی علماء کرام اور صوفیاء عظام پیدا ہوئے جن کی بدولت رب العزت نے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو توحید و سنت کا داعی و شیدائی بننے کا شرف عطا فرمایا اور علم ظاہری کے علاوہ جس طرح لوگوں کے دلوں کو اُن سے صفائی اور روشنی نصیب ہوئی اور شرک و بدعت، حسد و تکبر اور اتباعِ ہوا سے جس طرح ان کو چھٹکارا حاصل ہوا، وہ کسی منصف مزاج اور ہوشمند مسلمان سے اوجھل نہیں ہے۔ ایک طرف تو ان اکابر کے قائم کردہ اسلامی مدارس سینکڑوں ثقہ مدرس بہترین مبلغ، عمدہ ترین مناظر، اعلیٰ مصنف، نڈر مجاہد، بیباک سیاستدان اور محقق پروفیسر تیار ہوئے جو اپنے اپنے میدان اور فن میں گوئے سبقت لے گئے اور دوسری طرف قرآن و سنت اور سلف صالحین کی واضح ہدایات کی صریح روشنی میں ایسے اہل سلوک، صاحب باطن، زاہد اور صوفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خداداد بصیرت اور للہیت اور روحانیت سے لوگوں کے قلوب و اذہان کو منور کیا، اُن میں توحید و سنت کا جذبہ پیدا کیا۔ خدا خوفی اور فکرِ آخرت پیدا کی۔ دُنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا نقشہ ان کے دلوں میں نقش کیا، آنے والی قبر اور حشر و نشر کی حقیقی زندگی کے حاصل کرنے کا سبق دیا، جنت اور دوزخ کی ابدیت اور ان کی تحصیل و اجتناب کے منصوص احکام سنائے۔ خالق کے حقوق کے علاوہ مخلوق کے باہمی حقوق کو محفوظ و ملحوظ رکھنے کی شدت سے تلقین کی، نفس امارہ اور شیطان کی پیروی سے لوگوں کو ڈرایا اور سلف صالحین کے صحیح دینی جذبات اُن میں اُجاگر کیے۔ الغرض دل کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کے اخلاقِ ذمیمہ سے بچنے اور اوصافِ فاضلہ سے متصف ہونے کے وہ گُر بتلائے جو اس دور میں صرف انہی حضرات کا حصہ ہو سکتا ہے۔ دیوبند کی اس روحانی تعلیم کا یوپی کے مشہور گریجویٹ اور شگفتہ نگار شاعر اکبر الہ آبادیؒ نے کس خوبی سے ذکر کیا ہے ؎

دل روشن مثال دیوبند | اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
گر علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ دو | اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

(کلیات اکبر مرحوم)

بلاشک دیوبند کی وجہ سے سعید روحوں کو جلا اور تاریک دلوں کو بصیرت اور روشنی نصیب ہوئی۔

ایک اور خواب

ارواح ثلاثہ میں ہے کہ مولانا نانوتویؒ نے خواب میں دیکھا تھا کہ "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی چیز پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور اُدھر سے ایک نہر آتی ہے جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے" اس خواب کو انہوں نے مولوی محمد یعقوب صاحبؒ (المتوفی ۱۲۸۲ھ برادر شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے اس عنوان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ملے گی اور وہ پکا حنفی ہوگا اور اس کی خوب شہرت ہوگی، لیکن شہرت کے بعد جلد ہی اس کا انتقال ہو جائے گا۔

(ارواح ثلاثہ ص۱۶۹)

بلاریب ہندوستان میں قیام دارالعلوم دیوبند کے ذریعے جس طرح قرآن، حدیث

کے بعد مذہب حنفی کی علمی اور ٹھوس خدمت ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

تصحیح کتب

عالم نبیل محدث جلیل اور فقیہہ وقت حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری الحنفیؒ (جن پر پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا اور بالآخر ۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے) نے بعض کتب دینیہ کے احیاء و ترویج اور علوم و فنون اسلامیہ کے بقاء اور تحفظ کے لئے مطبع احمدی قائم کیا تھا جس کے ذریعہ درسی اور متداول کتب کی کافی حد تک تصحیح اور بعض کتب کے حواشی بھی لکھے گئے اور وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت اس طرح پوری ہوئی۔ اسی مطبع احمدی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تصحیح کتب کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور اس طریق سے علم دین کی خدمت بالحق ادا کرتے رہے۔ اور ضمنی طور پر اس تصحیح سے معمولی سا جو حق محنت ملتا اس پر گذر اوقات کرتے اور اعزہ وا قارب کے علاوہ مہمانوں کا حق ادا کرتے۔ زندگی نہایت سادہ بے تکلف اور زاہدانہ تھی۔ شکل و صورت سے دیکھنے والوں کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، مگر ان کو گودڑی کے اس لعل کی کیا خبر تھی جو وقت کے فراعنہ کے مقابلہ میں لسان ہارونی اور ید موسوی لے کر نکلے اور زبان و قلم سے ان کے دلائل باطلہ کے سیل رواں کو بہا کر اور ان کے گمراہ کن براہین کی نوجوں کو حقائق کے بحر قلزم کی موجوں کی نذر کر دیا۔ سچ ہے کہ ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی بصیرت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

بخاری شریف کے آخری پاروں کا حاشیہ

کتاب اللہ کے بعد دین و اسلام میں سب سے زیادہ صحیح ترین کتاب بخاری شریف ہے جس کی قدر و منزلت اور ضرورت و اہمیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے؟ جس میں ہمارا دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ ہمارا مذہب بھی ہے اور ہماری سیاست بھی۔ ہماری معیشت کے اصول بھی اس میں مذکور ہیں اور ہماری معاشرت کے احکام بھی۔ ہماری جسمانی خوراک کا اصول انتظام بھی اس میں موجود ہے اور ہماری روحانی غذا کا حل بھی اس میں مشرح ہے۔ سینکڑوں جید علماء اور فقہائے مختلف اور متعدد زبانوں میں اس کی شروح و حواشی لکھے ہیں۔ موجودہ بخاری شریف پر جو حاشیہ ہے (جو بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ بیسیوں شروح حدیث سے پوری توازی کے ساتھ اخذ کیا گیا ہے) اس کے چوبیس پچیس پاروں کا حاشیہ تو حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری نے کیا ہے اور باقی پانچ چھ پاروں کا حاشیہ (اور اہل علم تو جانتے ہیں کہ بخاری شریف کے آخری پارے کتنے مشکل ہیں) مولانا سہارنپوریؒ نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے سپرد کیا جو انہوں نے کمال حزم و احتیاط کے ساتھ لکھا اور بڑی عمدگی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح قاسمی میں ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"اس زمانہ میں جناب مولوی صاحب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوریؒ نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی پانچ چھ سیپارہ آخر کے باقی تھے (مولوی محمد قاسم) صاحب کے سپرد کیا۔ مولوی صاحبؒ نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحبؒ کے کمال سے آگاہ نہ تھے مولوی احمد علی صاحبؒ کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولوی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدوں سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحبؒ کا تحشیہ ان کو دکھلایا۔ جب لوگوں نے جانا۔ اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر حضرت امام بخاریؒ نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کتنے مشکل ہیں؟ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے؟ اور اس حاشیہ میں بھی یہ التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔ (ارواح ثلاثہ)

مولانا محمد قاسمؒ منتؒ)

راقم الحروف کے معلومات کی بنا پر ہندوستان میں حاشیہ کے ساتھ جتنی دفعہ اور جہاں بھی بخاری شریف طبع ہوتی ہے وہ اسی حاشیہ کے ساتھ طبع ہوتی اور ہوتی ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ یہ صدقہ جاریہ کس قدر ان حضرات کے ارفع درجات کا موجب اور حضرات علماء کے صحیح بخاری سے استفادہ کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تاقیامت اس صدقہ جاریہ کو جاری رکھے۔

ع "رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ"

قیام دارالعلوم دیوبند کے اسباب

دنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منصہ شہود پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سرزمین ایشیا کی مسخ شدہ تاریخ پہلے سے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں کیونکہ لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ ہم صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دور اقتدار رہا ہے۔ جس میں نہایت فراخدلی سے (بلکہ بعض بادشاہوں کی طرف سے بڑے ملحدانہ انداز میں) ہر فرقہ اور ہر اہل مذہب پر پابند رہنے اور مذہبی رسوم بجا لانے کی مکمل آزادی تھی۔ جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہوگیا اور اپنوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم اور جابر برطانیہ قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر نمودار ہوا تو اس کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کی دیگر اقوام عموماً اور مسلمان خصوصاً میدان میں نکلے اور عملی طور پر اس کے ساتھ جہاد کیا جس کو انگریز کے منحوس دور میں نمک خوار لوگ بطور غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اس جہاد میں کون کون حضرات شریک تھے، اور کس کس مقام پر لڑے؟ اور ہر مقام پر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ یہ اور اس قسم کے دیگر کئی امور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہونے کے علاوہ، ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمیں تو اثبات مدعیٰ کے لیے بانی دارالعلوم دیوبند اور ان کے چیدہ چیدہ بعض احباب و اصحاب کا تذکرہ کرنا ہے کہ انہوں نے کس حد تک انگریز کے خلاف جہاد کیا؟ اور انگریز نے ان کے خلاف کیا رائے قائم کی؟ اور اس وقت انگریز کے اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم تھے؟ اور وہ ہندوستان میں کیا دیکھنا اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ اور کس حد تک وہ کر چکا ہے؟ جب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں وہ دلگداز واقعات پڑھتے اور دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے دل سیماب کی طرح بیقرار ہو جاتا ہے۔ سانس رکنے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے سب واقعات تو تاریخ ہی میں پڑھیے۔ ہم مشتے نمونہ از خروارے چند حقائق کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن کا عقلمندوں کے لیے بڑی عبرت ہے

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ۝

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

جہادِ شاملی

اہل ہند جب انگریز کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اس کے خلاف لڑتے ہوئے لاکھوں جانیں جاتی رہیں اور ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور تیرہ ہزار سے زیادہ جید علماء کرام کو تختۂ دار پر چڑھایا گیا اور پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس وقت میدان کارزار کے آس پاس شاید ہی کوئی درخت ایسا ہوگا جس پر مظلوم ہندوستانیوں کی اور شہید مسلمانوں کی لاشیں نہ لٹکتی ہوں اور ظالم انگریز کے کارندے ان کو دیکھ کر نہ خوش ہوتے ہوں اسی دور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زیر قیادت تھانہ بھون سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر شاملی کی گڑھی کی طرف روانہ ہوا جو انگریز کے کارندوں اور اس کی فوج کا ایک مضبوط قلعہ تھا اس لشکر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حافظ محمد ضامن صاحب

شہید ہوئے ۱۸۵۷ء میں اسی شاملی کے مقام پر شہید ہوتے تھے) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ کہاں جابر اور ظالم برطانیہ جو ملک پر برسرِ اقتدار تھا اور کہاں نہتے اور بے سروسامان مجاہد؟ مگر ان بہادروں اور دلیروں نے اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت نانوتویؒ نے اپنی شجاعت کے خداداد جوہر اس جہادِ شاملی میں دکھائے۔ بالآخر ان حضرات کو شکست ہوئی، کچھ حضرات تو زخمی ہوئے اور حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہو گئے۔ الغرض مقابلہ خوب ہوا اور بعض دیو پیکر فوجیوں کو (جن میں ایک سکھ بھی تھا جس کو حضرت نانوتویؒ نے اپنی تلوار سے کاٹ کر مولی کی طرح دو ٹکڑے کر دیا تھا) جہنم رسید کیا گیا اور غالباً ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

جب انگریزوں کو اس کا علم ہوا کہ حضرت حاجی صاحبؒ، مولانا نانوتوی صاحبؒ اور مولانا گنگوہی صاحبؒ جو اپنے زمانہ کے نامور عالم اور صوفی تھے ہمارے خلاف جہاد میں شریک ہوئے تو ان تینوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی لکھتے ہیں کہ "ان تینوں حضرات کے نام چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلہ تجویز ہو چکا تھا اس لیے لوگ تلاش میں ساعی اور جراست کے لیے تگ و دو میں پھرتے رہے۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۵)

انگریز کے ایسے ظالم حکم سے بچنے کے لیے کچھ دن تو حضرت نانوتویؒ وغیرہ احباب کے شدید اصرار پر روپوش رہے پھر نکل آئے جیسا کہ بقدرِ ضرورت اس کا ذکر آئندہ آئے گا انشاء اللہ العزیز۔ جب لاکھوں انسانوں پر برطانیہ یہ مظالم کر چکا تو بیرونی دنیا کی مزید بدنامی سے بچنے کے لیے اور اہل ہند پر اپنا فرعونی احسان جتلانے کی خاطر کچھ عرصہ بعد وارنٹ گرفتاری اور دیگر کئی سخت احکام واپس لے لیے گئے اور اس طرح ان مظلوموں کی ظالم کے ہاتھ سے گلو خلاصی ہوئی۔ اس جہاد اور ہنگامہ میں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسٹر لیکی اس ہنگامہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کی بغاوت تھی۔

(بحوالہ حکومت خود اختیاری ص ۴۲)

اور اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بھی نمونہ دیکھتے جائیے۔ مسٹر رسل کا یہ مقولہ کہ مسلمانوں کو خنزیر کی کھال میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے قبل خنزیر کی چربی ان کے بدن پر مل گئی اور پھر انہیں جلا دیا گیا

(تمغہ کا دوسرا رخ، مصنفہ ایڈورڈ ٹامس ص ۴۸)

ملاحظہ کیجیے کہ ظالم برطانیہ نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں مسلمانوں پر روا رکھیں اور کس قدر ان کے بیگناہ خون سے ہولی کھیل گئی مگر با ایں ہمہ مسلمان مردانہ وار اس ظالم کے سامنے ایمان سے بھرپور سینے تان کر پیش ہوتے رہے اور زبانِ حال سے یوں خطاب کرتے تھے کہ

ع　گئے وہ دن کہ ہمیں زندگی کی حسرت تھی
فضول قتل کی دیتا ہے دھمکیاں صیاد

عزائم برطانیہ

انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو شیخ چلی کی طرح اس کے دل میں خفیہ اور نہاں آرزوئیں اور ارادے زبان اور قلم کی نوک سے بھی ظاہر ہونے لگے۔ گورنر جنرل لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا ہے کہ میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لیے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔"

(ان ہیپی انڈیا ص ۲۹۹)

انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلیوین جو حکومت کی طرف سے گورنری کے بلند عہدہ پر فائز تھا پورے وثوق سے یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا یقین ہے، یہ امیدیں قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے ملک کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اس طرح یہاں (ہندوستان) میں بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔" (بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۴۳)

اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر میگلس نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ "خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں تساہل نہ کرنا چاہیئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۱۳ اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اوّل ص۲) اور لارڈ ڈرابرٹس نے کہا کہ "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔" (علمائے ہند کا شاندار ماضی کا آخری حصہ، تصویر کا دوسرا رخ ص۳۳ طبع اوّل)

غور فرمایئے سایۂ بوم (ظالم برطانیہ) کے منحوس "برا قتدار میں ہندوستان کی سرزمین پر کس طرح زبوں حالی کا گھُپ اندھیرا چھا گیا تھا جس میں رائے قائم کرنے والوں نے یہاں تک رائے قائم کی کہ "اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔" (موج کوثر ص۱۲ مصنفہ شیخ محمد اکرام صاحب ایم اے)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم نے جس طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ آخر بتلایئے کہ اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظالم برطانیہ کے فولادی پنجہ سے کس نے ٹکر لی۔ جانِ عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر کس نے جہاد ۱۸۵۷ء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؟ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے تقریروں کے ذریعہ اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد اور عیاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؟ اور اس ہنگامے میں کس طبقہ کے علماء کے ساتھ انسانیت سوز بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا؟ اور ملک عزیز سے جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں کس طبقہ کی اکثریت کو دی گئیں؟ اور تختہ دار پر لٹکنے کے لیے زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے کس نے خوشیاں منائیں کہ ؎

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گذرا ہے جن کا یہ دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اور برطانیہ کے مغرور وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹون نے یہ کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم سنگینوں پر اُسے تھام سکتے ہیں (معاذ اللہ) اس دور میں بھی علمائے دیوبند نے اس ظالم برطانیہ کے خلاف صدائے حق بلند کی اور اس سے نبرد آزما ہوئے۔ چنانچہ یوپی کے گورنر سر جیمس امنسٹن نے اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) کے بارے میں ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا۔" نیز یہ بھی انہیں کا مقولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی (حاشیہ سوانح قاسمی جلد ۲ ص۸۳ مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، المتوفی ۱۳۷۵ھ) غالباً ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا گیا ہے کہ

؎ وہی مومن ہے جس کو دیکھ کر باطل پکار اٹھے
کہ اس مردِ خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

عیسائی بنانے کیلئے طریقِ کار

آپ بحوالہ پہلے یہ پڑھ آئے ہیں کہ انگریز نے ہندوستان میں نظام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ایک ساتھ عیسائی بنانے

کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اس کے لیے ملازمتوں اور عہدوں، نوکریوں اور ٹھیکہ داریوں کی پیشکش کے علاوہ اور بھی کئی حربے اختیار کیے گئے۔ ان میں سے ایک طریق یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اتنا غریب اور مفلوک الحال کر دیا جائے کہ وہ عیسائیوں کی جھولی میں پڑنے کے لیے مجبور و لاچار ہو جائیں۔ چنانچہ عوام کی غربت اس حد تک عمداً پہنچا دی گئی تھی کہ بقول سرسید صاحب ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہندوستانی اپنی گردن کٹوانے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔ (بغاوت ہند ص۲) اور سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک طریقہ جو انگریز نے تجویز اور اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن پاک اور اس کی تعلیم علوم اسلامیہ کو یکسر مٹا دیا جائے تاکہ ایمان و ایقان کی وہ پختگی جو مسلمانوں کو حاصل ہے بالکل ختم ہو جائے اور عیسائیت کا راستہ ان کے لیے سہل اور ہموار ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم کو اس قدر عام اور رائج کر دیا جائے کہ کوئی شخص اپنے لیے اس کے سوا چارہ کار نہ پائے۔ چنانچہ قرآن کریم جیسی جامع و مکمل، بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدحواس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ "جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی" (بحوالہ خطبہ صدارت ص۱۵ اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ از حضرت مدنیؒ)

اور ہنری ہربیگنن طامس نے کہا کہ "مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لیے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے" (بحوالہ حکومت خود اختیاری ص۵)

الغرض قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ گیا اور لارڈ میکالے نے تو صاف لفظوں میں کہا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل اور دماغ کے اعتبار سے فرنگی (بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء)

اور سچ پوچھیے تو ان کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ کسی بھی صاحب علم پر یہ مخفی نہیں ہے۔ یہ طریقہ وہ تھا جو براہ راست حکومت برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ پادری صاحبان کی طرف سے (جن کی حفاظت و نگرانی اور مالی سرپرستی خود انگریز کر رہا تھا) عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی گئی وہ اپنے مقام پر ایک سانحہ عظیم اور آفت ارضی میں سے ایک بہت بڑی آفت تھی۔ مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صدہا آئینی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی کرنے کے مجاز نہیں۔ مگر (العیاذ باللہ) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پادریوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی بقول کسے

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی دیر تھی کہ مختلف قسم کے مذہبی فتنے عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئے اور ساون کے مینڈکوں کی طرح بازاروں اور کوچوں گلیوں اور محلوں میں پادری صاحبان جوق در جوق اور جماعت در جماعت گردش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے نظر آنے لگے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور خوش نصیب قصبہ ایسا ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دور میں اپنے منحوس پاؤں سے نہ روندا ہو اور اسلام کے خلاف خوب زہر اگل کر مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو اور جارحانہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کمی چھوڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو۔ ایسے تمام واقعات کا استیعاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کا روگ ہے اور نہ ان پر ہمارا مدعی موقوف ہے اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین واقعات بطور نمونہ

سکتا ہے اور نادان کے لیے تو دفتر کے دفتر بھی بے سود ہیں۔

چاندپور کا مذہبی اجتماع

ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں میں بھی یہ جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور عیسائیوں کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی امور میں الجھتے رہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مشہور شہر شاہجہانپور سے پانچ چھ میل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاندپور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ میں ایک مذہبی جلسہ بنام "میلہ خدا شناسی" مقرر کیا۔ جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور تینوں فریق اس میں شریک ہوئے مگر لالہ جی نے کمال ہوشیاری اور انتہائی چالاکی سے مختصر سی نہایت بے معنی اور مہمل کسی ہوئی تقریریں شروع کی کہ میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا اور ان کے جنم میں جاگتے سوتے سانس چلتا رہتا تھا۔ الغرض جس کو چیستاں اور پہیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑالی اور اصل گفتگو عیسائیوں اور مسلمانوں میں ہی عیسائیوں کی طرف سے ان کے دیگر نامی گرامی پادریوں کے علاوہ پادری نولس صاحب انگلستانی بھی تھے جو بڑے لسان اعدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری نولس صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ تھا کہ مسیحی دین کے مقابلے میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں (العیاذ باللہ) اور اہلِ اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے ان میں مشاہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحب دہلویؒ امام فنِ مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء اور اہلِ دل اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن تو اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا اور پادری نولس صاحب کے مزعوم دلائل کے جوابات دیتے رہے اور اپنے دعاوی کا اثبات کرتے رہے، مگر دوسرے دن مناظرہ میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے حصہ لیا۔ اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کئے کہ مجمع داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا اور دین مسیح کے منسوخ اور ناقابلِ اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کئے کہ پادری باہم کہتے تھے آج ہم مغلوب ہوگئے (گفتگوئے مذہب بلقب تاریخی میلہ خداشناسی ص۳۵) اس مناظرہ کی مکمل روداد اسی کتاب میں ملاحظہ فرمایئے کہ پادریوں کا مغرور سر کیسے سرنگوں ہوا اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کس طرح آشکارا ہوئی۔ سچ ہے کہ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

شاہجہان پور

اس مناظرہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۲۹۵ھ میں شاہجہانپور میں اہلِ اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ اور مباحثہ طے ہوا جس میں پنڈت دیانند سرسوتی منشی اندرمن پادری اسکاٹ مفسر انجیل اور پادری نولس صاحب وغیرہ نے حصہ لیا اور اہلِ اسلام کی طرف سے متعدد علمائے اور مشاہیر اس وقت اور اس مقام پر موجود تھے مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا اور لالے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا گئے اس میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ مناظر تھے۔ انہوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے ان کا کوئی معقول جواب نہ بن پڑا اور اس موقع پر بھی اسلام اور اہلِ اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندوؤں نے بھی اقرار کیا۔ چنانچہ منشی پیارے لال نے یہ کہا کہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ کا کیا حال بیان کیجئے، ان کے دل پر علم کی سرمستی (علم کی دہن) بول رہی تھی (مباحثہ شاہجہانپور ص۹۲)

اور پورے بانوے صفحات پر اس مناظرہ کی روداد بارہا طبع ہو چکی ہے۔ اہل علم

اس سے استفادہ کریں اسی طرح ملاں حجۃ الاسلام نے پادری تارا چند سے بھی مناظرہ کیا۔ چنانچہ سوانح قاسمی ص۱۵ از مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں ہے کہ ایک پادری تارا چند نام تھا اس سے گفتگو ہوئی اور وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا سچ ہے شیروں کا مقابلہ لومڑیاں کیا کرسکیں۔

پادری فنڈر کا فتنہ

پادری ڈاکٹر کارل فنڈر جو ایک جرمنی مشنری تھا جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے گلے شوشا سے بدر کر دیا تھا۔ جس نے فارسی زبان میں میزان الحق نامی ایک کتاب شائع کی۔ پھر اس کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ ملاحظہ ہو اہل مسیحہ ص۳ مصنفہ اہل بیون جونز بی اے بی ڈی لندن المترجم عبدالستار بی اے بی ڈی پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انار کلی لاہور) نے ہندوستان میں پہنچ کر اور انگریزی کی سرپرستی حاصل کر کے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر اُگلا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں جو بہتان تراشی اتہام بازی اس نے اختیار کی اس سے مسلمان تو آخر مسلمان ہیں منصف مزاج غیر مسلم بھی صد نفرین کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پادری فنڈر جو اپنی بے باکی میں مشہور تھا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں سرگرم عمل تھا، چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کیرانویؒ ______ جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر اولیاء پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں تھے اور سلسلۂ ولی اللّٰہی میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے اور آپ کی ولادت جمادی الاول ۱۲۳۳ھ میں کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی) نے پادری فنڈر کے ساتھ خط و کتابت کی اور اس کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور تمام ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد اکبرآباد آگرہ میں کئی دن کے لیے مناظرہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کے لیے فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں اس موضوع کا سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا جس میں طرفین سے معزز مسلمان ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے جج اور منصف قرار دیئے گئے تھے چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری اور سچے دین کا حامی اور ناصر ہے۔ اس نے اسلام کی صداقت کا ظاہری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کو بنایا جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت عمدہ ذہانت اور تبحر علمی سے تین روز کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاہرہ اور براہین ساطع سے اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے بالکل محرف ہے جس میں ذرہ بھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور خود عیسائیوں کے مایہ ناز اور چوٹی کے مناظر پادری فنڈر صاحب کو عام جلسہ میں انجیل کی تحریف تسلیم کئے بغیر اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کی تاریکی ہی میں پادری فنڈر صاحب اپنے چیلوں سمیت بھاگ گئے۔ جب چوتھے دن حسب معمول مناظرہ کا وقت آیا تو پبلک اور منصف تو بھی حاضر ہو گئے مگر پادری فنڈر صاحب کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ ناچار تمام ججوں اور منصفوں کو جو طرفین کے حکم قرار دیئے گئے تھے عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا اور پادری فنڈر صاحب نے ہندوستان کو چھوڑ کر دیگر ممالک اسلامیہ میں اپنے دجل کا جال پھیلانے کی سعی اور کوشش کی، چنانچہ وہ پھرتا پھراتا ترکی بھی جا پہنچا اور وہاں کے علماء کو چیلنج کرتا پھرا۔ وہ بیچارے اس کے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اس لیے دریدہ دہن کے منہ لگتے تھے بالآخر سلطان عبدالعزیز خان ترکی کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک محقق اور مدلل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام اظہار الحق رکھا جس کا ترکی فارسی اور یورپ کی مختلف اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جب ۱۸۶۴ء میں انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تو مشہور اخبار ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی۔ (ملاحظہ ہو علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص۳)

راقم الحروف نے آج سے تقریباً سولہ ستر سال پہلے اظہار الحق کے

عربی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے بلاشبہ رد عیسائیت کے لیے بہترین اور لاجواب کتاب ہے مگر صرف اہل علم حضرات کے لیے

ع ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا رحمت علی صاحبؒ منگلوری، مولانا سید محمد علی صاحبؒ مونگیری، مولانا عنایت رسول صاحب آگروی نے بھی عیسائیت کا خوب رد کیا اور اسلام کے ناقابل شکست قلعہ کو محفوظ رکھنے کی سعی کی۔

آریہ کا فتنہ

آپ اوراق گذشتہ میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ انگریز نے اقتدار اور حکومت کے بل بوتے پر اور پادری جماعت نے حکومت برطانیہ ہی کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ کے ذریعہ کس طرح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کیں۔ یہ مصائب مسلمانوں کے لیے کیا کم تھے! مگر جب مصائب و آفات کے گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں تو ان سے مصیبت کا صرف ایک ہی قطرہ نہیں ٹپکتا بلکہ موسلا دھار بارش ہوتی ہے کرشمکات و بلیات کے سیلاب اُمڈ آتے ہیں ایک طرف انگریز اور عیسائیوں کا عظیم فتنہ تھا اور دوسری طرف انگریزوں کے چہیتے ہندوؤں اور آریاؤں کا کرتا دھرتا سوامی دیانند سرسوتی جو اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ استدلات میں مشہور تھا، پورے ہندوستان میں لوگوں کو آریہ بنانے اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی (معاذ اللہ) مہم چلا رہا تھا بیسیوں اس کے شاگرد اور چیلے تھے جو اسی کی ڈگر پر اسلام کے خلاف زہر اگلتے تھے سرسوتی کی حماقت اور دریدہ دہنی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس نے بخیال خویش قرآن کریم کی بسم اللہ سے لے کر والناس تک کی تمام سورتوں پر اعتراضات کئے اور ان کی کمی اور خامی بتلائی ہے (العیاذ باللہ) سرسوتی ہر مقام پر اسلام اور اسلامی عقائد پر خوب برستا تھا اور اہل اسلام کو جواب کے لیے للکارتا تھا، چنانچہ اپنا تبلیغی دورہ کرتا ہوا ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں وہ رڑکی جا پہنچا اور کئی دن تک وہاں قیام کر کے اسلام کے خلاف خوب زہر اگلتا رہا چونکہ اس وقت وہاں کوئی ایسا مستعد اور مناظر عالم نہ تھا جو اس کے فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دے سکتا۔ اس لیے میدان کو خالی دیکھ اس کی ہمت اور دو چند ہو گئی۔ حتیٰ کہ برملا اس نے اسلام کے خلاف نازیبا اور واہی تباہی باتیں کہنا شروع کر دیں۔

ان دنوں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (جو پہلے ہی سے ضیق النفس کے موذی مرض سے دوچار تھے) بخار اور کھانسی کے شدید مرض میں مبتلا تھے اور ان کی علالت کی خبریں باقاعدہ ان کے احباب و تلامذہ اور عقیدت مندوں کو پہنچتی رہتی تھیں، سرسوتی کے کانوں میں بھی حجۃ الاسلام کی بیماری کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جب رڑکی کے کچھ درد دل رکھنے والے اور غیرتمند مسلمانوں نے سرسوتی کو حسب استطاعت جواب دینا ضروری سمجھا تو پنڈت صاحب یہ کہہ کر بات ٹال گئے ______ کہ ہم تو جاہلوں سے گفتگو کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہی نہیں، اپنے کسی بڑے مذہبی عالم کو بلاؤ پھر ہم گفتگو کریں گے ______ پنڈت دیانند سرسوتی اس قسم کے مواقع پر اسی قسم کے پوچ حیلے بہانوں سے جان چھڑایا کرتے تھے۔ ______

______ اور حضرت نانوتویؒ کی علالت کی خبر سن کر اس سے پنڈت جی نے یہ ناجائز فائدہ اٹھایا کہ ہاں اگر مولوی کاسم (مولوی قاسمؒ) آئیں تو پھر ہم گفتگو کریں گے۔ پنڈت جی نے حالات سے یہ بھانپ لیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس شدید علالت میں کیونکر اور کیسے آسکتے ہیں؟ لہٰذا کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت ہی نہ آئے اور نہ پنڈت جی کے مبلغ علم کا بھرم کھلے اور نہ شرمندگی حاصل ہو۔ بقول شخصے "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی" جب لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ پنڈت جی آپ مولانا نانوتویؒ ہی سے گفتگو کرنے پر کیوں مصر ہیں تو وجہ تخصیص یہ بیان کی "میں تمام یورپ میں پھرا۔ اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں، ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی، ہر کوئی مولانا کو یکتائے زمانہ کہتا ہے اور میں نے مولانا کو شاہجہانپور کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر

ولادیہ سنی ہے اگر آدمی مباحثہ کرے تو ایسے کامل دکیاسے کرے جس سے کچھ فائدہ ہو کچھ نتیجہ نکلے۔"

(بحوالہ مقدمہ انتصار الاسلام ص۔ از مولانا فخرالحسن صاحبؒ)

اہلِ رڑکی نے جب حضرت نانوتویؒ سے پُر زور استدعا کی تو حضرت کے لیے خود شدتِ علالت میں وہاں پہنچنا تو ناممکن تھا، آپ نے اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجے جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ اور مولانا عبدالعدل صاحبؒ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات پا پیادہ جمعرات کے دن مغرب سے پہلے روانہ ہوئے اور شام کی نماز دیوبند کے باغوں میں پڑھی گئی۔ علی الصبح رڑکی پہنچے، حتیٰ کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مقامی باشندوں کے ہمراہ پنڈت جی کی کوٹھی پر پہنچے اور بحث و مباحثہ کی دعوت دی۔ مگر پنڈت جی اسی پرانی ضد پر مُصر تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ آئیں تو مباحثہ کروں گا، جب وہ کسی صورت مباحثہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یہ حضرات واپس ہوگئے اور اہلِ رڑکی نے باوجود حضرت نانوتویؒ کی علالت کے محض اتمام حجت کے لیے وہاں پہنچنے کی استدعا کی تو مولانا باوجود علالت و ضعف اور کمزوری کے جس طرح بھی ہوسکا رڑکی تشریف لے گئے۔

رڑکی میں اجتماع

حضرت مولاناؒ مع اپنے تلامذہ اور احباب کے شہر میں مقیم تھے اور سرسوتی صاحب رڑکی کی چھاؤنی میں براجمان تھے۔ بحث و مباحثہ کے لیے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے خط و کتابت ہوتی رہی مگر سرسوتی صاحب اور ان کے متعلقین اس سے بھی گھبرا گئے اور یہ بہانہ کیا کہ "ہمارے سارے کام بند ہوگئے آج سے ہمارے پاس کوئی تحریر نہ آئے۔ ہم ہرگز جواب نہ دیں گے"۔ (مقدمہ انتصار الاسلام ص)

دوسرے روز حضرت مولانا مع مولوی احسان اللہ صاحب میرٹھیؒ اور اپنے چند رفقاء کے چھاؤنی چلے گئے اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر انتظار کیا گیا۔ کپتان صاحب اور کرنل صاحب نے مولانا کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان سے تکلف

مضامین پر تبادلۂ خیال کیا اور داد تحسین دیتے رہے اور پنڈت سرسوتی کو وہاں بلا کر کہا کہ تم مولوی صاحب سے کیوں گفتگو نہیں کر لیتے مجمع عام میں تمہارا کیا نقصان ہے۔ پنڈت جی نے کہا کہ مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا جب پنڈت جی سرِبازار اسلام کے خلاف اعتراضات کرتے تھے اور خوب لوگوں کو سنا سنا کر کرتے تھے اس وقت تو کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ تھا، مگر اب اندیشہ پیدا ہوگیا (صفدر) اس پر کپتان صاحب نے کہا، اچھا ہماری کوٹھی پر گفتگو ہو جائے ہم فساد کا بندوبست کرلیں گے۔ پنڈت جی نے کہا ہم تو اپنی ہی کوٹھی پر گفتگو کریں گے اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہوا جناب مولانا نے پنڈت جی سے کہا کیجئے اب تو مجمع عام نہیں، دس بارہ ہی آدمی ہیں، اب سہی، آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا میں تو گفتگو کے ارادہ سے نہیں آیا تھا، تو مولوی قاسم کو للکارتے کاہے کو تھے اور ان کے ساتھ ہی گفتگو کرنے پر کیوں مُصر تھے۔ (صفدر) مولانا نے فرمایا کہ اب ارادہ کر لیجئے ہم آپ کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے یا آپ اعتراض ہم پر کیجئے اور ہم سے جواب لیجئے۔ پنڈت جی نے ایک نہ مانی۔ شرائط کے باب میں گفتگو رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجلس برخاست ہوئی۔ جناب مولانا بھی اپنی فرودگاہ پر تشریف لائے اور کئی روز تک شرائط میں ردّ و بدل رہی۔ آخر الامر مولانا نے یہ کہلا بھیجا کہ پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کرلیں، بر سرِ بازار کرلیں، عوام میں کریں، خواص میں کریں تنہائی میں کریں مگر کریں۔ پنڈت جی (اپنی رہائش) کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو راضی ہوئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ دو سو سے زیادہ آدمی نہ ہوں مولانا مرحوم پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے مگر سرکار کی طرف سے ممانعت ہوگئی کہ چھاؤنی کی حد میں کوئی شخص گفتگو نہ کرنے پائے۔ شہر میں، جنگل میں جہاں کہیں جی چاہے گفتگو کرلے۔ مولاناؒ نے پنڈت جی کو کہا کہ نہر کے کنارے پر یا عیدگاہ کے میدان میں یا اور کہیں مباحثہ کر لیجئے، مگر پنڈت جی کو بہانہ ہاتھ آگیا انہوں نے ایک نہ سنی۔ یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکار کی طرف سے ممانعت ہوگئی تھی (بلکہ پنڈت جی اور ان کے حواریوں نے ممانعت کروا دی تھی۔ صفدر) اس لیے جناب مولاناؒ کوٹھی پر نہ جاسکے اور پنڈت جی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔

اور مولانا حافظ عبدالعدل صاحبؒ نے کئی روز سر بازار پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور پنڈت جی اور ان کے حواریوں کو غیرت دلائی کہ جواب دو مگر پنڈت جی اور ان کے شاگردوں اور معتقدوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی اور ان کو کوئی ایسا سانپ سونگھ گیا کہ دہلتے ہی سے رہے۔ آخر مولانا نانوتویؒ نے فرمایا کہ اچھا پنڈت جی معہ اپنے شاگردوں اور معتقدوں کے میرا وعظ ہی سن لیں۔ مگر پنڈت جی وعظ میں تو کیا آتے رڑکی سے چل دیئے اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ چلا کہ کدھر گئے۔ آخر ش مولاناؒ نے بنفس نفیس بر سر بازار تین روز تک وعظ فرمایا۔ مسلمان ہندو، عیسائی اور سب چھوٹے بڑے انگریز جو رڑکی میں تھے ان وعظوں میں شامل تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ مولاناؒ نے وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے اہل جلسہ پر عالم سکتہ کا سا تھا۔ ہر شخص متاثر معلوم ہوتا تھا۔ پنڈت جی کے اعتراضات کے وہ وہ جواب دندان شکن دیئے کہ مخالف بھی مان گئے (تفصیلہ انتصار الاسلام ص۲

پنڈت سرستی صاحب نے بزعم خود اصولی طور پر اسلام پر گیارہ اعتراضات کیے ہیں جن میں سے دس کے جوابات حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتویؒ نے انتصار الاسلام میں اور گیارہویں اعتراض کا مجمل اور مفصل جواب قبلہ نما میں دیا ہے۔ دونوں کتابیں اہل علم حضرات کے لیے غنیمت باردہ ہیں۔

رڑکی کے بعد میرٹھ

جب پنڈت سرستی صاحب رڑکی سے بھاگ گئے تو پھرتے پھراتے میرٹھ پہنچ گئے اور وہاں بھی مذہب اسلام پر بے سروپا اعتراضات شروع کر دیئے حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ اگرچہ مرض اور ضعف میں مبتلا تھے۔ پھر بھی لسانے ... حاصل کرنے اور مذہب اسلام سے مدافعت کرنے کے لیے آپ باوجود ضعف و نا... میرٹھ پہنچے۔ چنانچہ پنڈت جی وہاں سے بھی کافور ہو گئے اور خود پنڈت جی وہاں سے بھی چل دیئے۔ البتہ ان کے حواری لالہ انند لال نے مذہب اسلام کے خلاف ایک مضمون لکھا جس کا جواب حضرت نانوتویؒ اپنی کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" میں دیا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" میں لکھا ہے کہ

پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے اور نیز ایسی ہی تصریح ہے کہ ہر چند مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب طاقت نہ تھی، مگر ہمت کر کے (میرٹھ) پہنچے اور پھر لکھا کر مولوی محمد قاسمؒ نے پنڈت جی کو میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں پہنچایا (ص۲) اور وہ (پنڈت جی) بہادر کے وہاں سے کافور ہو گیا۔ اس سب واقعہ کی تفصیل سوانح قاسمی (جلد دوم ص۱۰ ص۱۲ مصنفہ مولانا گیلانیؒ) میں مذکور ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کچھ ایسے حواس باختہ ہو گئے کہ ان کو نہ تو قرار کے بغیر کوئی اور راہ نظر آتی تھی اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی اوٹ ؎

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

ان حضرات کی یہ اسلامی خدمات صرف ہندوستان ہی میں مشہور نہیں بلکہ مرکز ایمان مکہ مکرمہ وغیرہ میں بھی معروف ہیں؛ چنانچہ مکہ مکرمہ کے ایک رسالہ میں نقل کیا گیا ہے کہ،

"در حقیقت یہ ہے کہ آریوں کے دیانند سرستی کے مقابلہ کے لیے خاص طور پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا ظہور تائید غیبی ہی کا نشان ہے اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں؟ (ملاحظہ ہو ایک مجاہد معمار ص۸ شائع کردہ مرکزی دفتر دارالعلوم حرم صولتیہ، مکہ مکرمہ) اور مورخ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ (المتوفی ۱۳۷۳ھ) نے حیات شبلی کے دیباچہ میں ان اکابر کی اور اصلاحی خدمات کا عمدہ تذکرہ کیا ہے۔

کچھ اپنوں کے بارے میں

یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے کہ جابر برطانیہ پادریوں اور آریوں کے فتنے اسلام کے خلاف جو کچھ کرتے رہے وہ تو انہوں نے کیا ہی مگر صد افسوس کہ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ اور خون اور پسینے سے سینچے ہوئے باغ کو دیان

کرنے کی کوشش میں صرف دشمن ہی نہیں بلکہ بعض نادوست بھی مصروف تھے بمعصیت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر ہندوستان پر محیط ہو گئی تھیں۔ بھولے بھالے مسلمان ہندوؤں کی روش اور ان کے رسم و رواج کے کچھ ایسے غلام اور دلدادہ بن چکے تھے کہ بجائے سنت نبوی (علی صاحبہا الف الف تحیۃ) اپنی رسوم و رواجوں میں ان کو جس کروٹ کوئی لٹا دیتا لیٹتے اور جس پہلو ان کو کوئی بٹھا دیتا بیٹھتے۔ دین سے غفلت اور بے خبری اکثر مسلمانوں کے دلوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی جس طرح موسم برسات میں سیاہ اور گھنے بادل آفتاب کو ڈھانپ لیتے اور دن کو رات بنا دیتے ہیں۔ غرضیکہ دلوں کا کایا کچھ ایسے رنگ میں پلٹی ہوئی تھی کہ بربادی کا نام شادی، جہل کا نام علم، مشرکانہ رسوم کا نام دین اور خرافات اور شعبدہ بازی کا نام کشف و کرامات تجویز کر رکھا تھا۔ جہالت و گمراہی کا طوفان ہدایت اور رشد کی مضبوط دیواروں سے ٹکراتا اور شور مچاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ علم شریعت کی تحقیر اور سنت نبویہ کی تذلیل و توہین بڑھتی جاتی تھی۔ عوام علماء حق سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتے تھے۔ محدثات و بدعات کو جزو اسلام بنا لیا گیا تھا۔ کہیں نیچریت سر اٹھاتی تھی تو کہیں اہل بدعت بدعات میں منہمک تھے۔ کہیں رفض و تشیع کا غلبہ تھا کہ کہیں ڈھول سارنگی کھڑکتی اور قوالیاں ہوتی تھیں تو کہیں بازاری عورتوں کے گالے وجد و حال کی محفلیں گرم دکھائی دیتی تھیں۔ کہیں گورپرستی اور تعزیہ پرستی کا عروج تھا تو کہیں حُبِ جاہ و مال اور طمع نفسانی کی اُمنگیں پورے جوبن پر تھیں۔ اس وقت ایسے حالات کو دیکھ کر اہل دل حضرات پر کیا گذری ہوگی، پوچھنا ہی کیا؟ ؎

بیمارِ غم کا حال خود آنکھوں سے دیکھ لو
کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گذری گذر گئی !

تاریخ قیام دارالعلوم دیوبند

یہی تھے وہ مختصر سے دل گداز اسباب و علل جن کی وجہ سے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقائے کار نے فراست ایمانی اور دیدۂ بصیرت سے اندازہ کر لیا کہ اگر ان نازک حالات میں مذہبی اور دینی طور پر مسلمانوں کی حفاظت و تربیت کا کوئی معقول اور خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا اور قرآن و حدیث فقہ و تاریخ اسلامی اور سلف صالحین کے اعلیٰ کارناموں اور اقدار سے ان کو باخبر نہ رکھا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ (العیاذ باللہ) مسلمان کہیں نصرانیت اور دیگر فتنوں کے دامِ ہمرنگ زمین ہی میں نہ اُلجھ جائیں۔ جس جال کو بچھانے میں شاطران افرنگ اور پنڈتوں اور دیگر باطل پرستوں کے عزائم و مساعی کوئی رازِ پنہاں نہ تھے۔ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کو پراگندہ کرنے اور آئندہ ان کو دینی ماحول اور دینی علوم و فنون سے بے بہرہ رکھنے کی جو کوشش و کاوش اس ملک میں ہو رہی تھی۔ ان تمام پریشانیوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقار کار کو نتیجہ رس دماغ اور سیماب کی طرح بے قرار دل مرحمت فرمایا تھا جو مستقبل بعیدہ کو اب تدبر و تفکر کے آئینہ میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے اور متلاشیانِ حق کے ایک ایک فرد کو زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے ؎

کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز جمعرات (اسی دن ہفتہ بھر کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتے ہیں) تاریخ کا وہ مبارک دن تھا جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمہ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد و ہدایت کا پرانا شجرہ طوبیٰ بن کر پھیلا جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہوئی اور جس کی سرسبز شاداب شاخوں کے سایہ کے نیچے جہالت و غفلت کی بادِ سموم میں جھلسنے والوں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اجڑے ہوئے قلوب کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیا۔ اس مبارک تقریب میں بہت سے باخدا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عالی شان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔

مولانا محمود الحسن صاحبؒ دیوبندی قرار پائے۔ اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا کی جائے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔

" سبحان اللہ۔ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ اُن ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے"۔ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول صفحہ سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۲۲ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی۔ آہ۔ ؎

پینے میں آ گیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں
اتنی ہے تندیٔ یہاں مست ہوں اور پی نہیں

حفظِ قرآن کریم

حضرت نانوتویؒ تصنیف کتب اور دینی بحث و مباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا موقع ہی ہاتھ نہ آسکا اور دل میں قرآن کریم کے حفظ کا جو شوق تھا وہ کب چین لینے دیتا تھا بالآخر دو سال کے صرف رمضان میں قرآن پاک یاد کر لیا اور ایسی روانی کے ساتھ سُناتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار حافظ بھی ایسا نہ سُنا سکتا ہو۔ چنانچہ خود ان کا بیان (سوانح قاسمی صفحہ ۱۷ از مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں) ہے کہ "فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے۔ اور جب یاد کیا پاؤ سپارہ کی قدر یا اس سے کچھ زائد یاد کر لیا۔ اور جب سُنایا ایسا صاف سُنایا جیسے اچھے پرانے حافظ" اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طرف پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہو گیا ؎

تر کی بھی شیریں تازی بھی شیریں۔ حرفِ محبت نہ ترکی نہ تازی

وفات حسرت آیات

آہ! وہ وقت بھی آ ہی پہنچا جس سے کسی مخلوق کو مفر نہیں۔ لاکھوں تدبیریں کی جائیں، پر اس سے چھٹکارا نہیں، ہزاروں انتظامات مہیا کر لیے جائیں لیکن اس سے خلاصی نہیں، سیکڑوں محافظ پاس کھڑے کر لیے جائیں مگر اس سے رہائی نہیں۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاوہ تعویذوں اور گنڈوں اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ کوئی مخلص تلاش کر لیا جائے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بھلا یہ قضائے مبرم بھی کبھی ٹلی ہے؟ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت کا پیالہ ہر ایک کو پینا ہے۔ اگر رہے گی تو صرف وہ ذات جس کے بغیر خالق و مالک اور کارخانۂ جہاں میں کوئی متصرف نہیں البقاء للہ وحدہٗ بالآخر ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء بروز جمعرات بعد از نماز ظہر ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ انگریز کے خلاف لڑنے والا بہادر سپاہی، پادریوں کا تعاقب کرنے والا نڈر مناظر آریوں کے چھکے چھڑانے والا بیباک ناقد، اسلام کے خلاف فتنوں کی سرکوبی کے لیے اپنی جان تک پیش کرنے والا جانثار مسلمان، سخاوت و ایثار کا پُتلا، ترحم و رقت کا مجسمہ، علوم دینیہ کے احیاء کا علمبردار حامیٔ سُنت اور ماحیٔ بدعت، حکیمانہ انداز میں حقانیت اسلام کو دلنشین کرنے والا فصیح مبلغ اور زادِ قلیل پر قناعت کرنے والا بے نفس صوفی، موت کی آغوش میں جا پہنچا اور ہزاروں دلوں کو زخمی کر گیا اور دیوبند ہی میں حکیم مشتاق احمد صاحبؒ کے خطۂ ارضی میں سب سے پہلی قبر ہی حضرت نانوتویؒ کی بنی۔ اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں اس بزرگ ہستی پر جس کے لگائے ہوئے مبارک پودے کی وجہ سے ہم روحِ اسلام سے سرفراز ہو گئے ہیں۔

ویرحم اللہ عبدا قال امینا

> گونجے کا چار کھونٹ میں نانوتویؒ کا نام
> بانٹا ہے اس نے بادۂ عرفانِ مصطفےٰ
>
> ——— شورش کاشمیریؒ

پاک و ہند میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ[1] کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ تحریک آزادی کے علمبردار اور اپنے وقت کے فقیہ و امام تھے۔ آپ نے علم کے تمام شعبوں میں بے پایاں خدمات انجام دیں۔ آپ ایک وقت میں فقیہ بھی ہیں۔ محدث و مفسر بھی اور شیخ وقت بھی ہیں۔ آپ کا رُوحانی و علمی فیض ملک اور بیرونِ ملک اس طرح پھیلا کہ آج تک آپ کی رُوحانی اولاد اس کو جاری کئے ہوئے ہے۔ آپ کی علمی قابلیت کے پیش نظر ہی مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "کیا مولانا نانوتویؒ و گنگوہیؒ غزالی اور رازی سے کم تھے؟ واللہ بعض تحقیقات میں یہ لوگ ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔"[2] علماء دیوبند کی سند حدیث کسی نہ کسی درجہ میں آپ تک پہنچتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سے حضرت گنگوہیؒ کا رابطہ

مولانا کو جتنا عشق علم دین پڑھانے سے تھا۔ اتنا ہی اُنس دینی مدارس سے بھی تھا۔ آپ اپنی استطاعت کے مطابق دینی مدارس کی خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ اور ان کو اپنے مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ آپ بلا تکلف مدارس کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سے آپ کو بہت دلچسپی تھی۔ حضرت نانوتویؒ اپنی حیات میں دارالعلوم کی سرپرستی فرماتے رہے اور حضرت گنگوہیؒ رکن شوریٰ اور اراکین کے ساتھ مدرسہ کو ترقی دینے میں کوشاں رہے۔ ۱۲۹۷ھ میں مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا تو آپ ہی مدرسہ کے سرپرست قرار دیئے گئے

---

[1] آپ کی ولادت ۹ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء بروز دوشنبہ بوقت چاشت بمقام گنگوہ ضلع سہارنپور ہوئی (عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید ص۱۳، ۱۴، مطبوعہ ۱۹۰۵ء میرٹھ)

[2] اشرف علی۔ مواعظ اشرفیہ ج ۲ ص۳۱۵ مطبوعہ ۱۹۵۸ء ملتان

آپ نے اپنی سرپرستی کا حق ادا کر دیا، اور ہر مخالف کا مردانہ وار مقابلہ کر کے دارالعلوم کو بام عروج پر پہنچایا۔ آپ مدرسہ کے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۵ء تک سرپرست رہے [1] دارالعلوم کے فتاووں کے جوابات خود ہی تحریر فرمایا کرتے تھے، جلسہ دستار بندی میں شریک ہوتے۔ دارالعلوم کا پہلا جلسہ دستار بندی ۱۲۹۰ھ جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ دوسرا جلسہ ۱۲۹۲ھ میں اور تیسرا جلسہ ۱۳۰۱ھ میں منعقد ہوا۔ اس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور مولانا گنگوہی نے اس میں تاریخی وعظ فرمایا۔ [2]

دارالعلوم کی پہلی مجلس شوریٰ میں ۱۲۹۸ھ سے ۱۳۲۲ھ تک آپ بھی حضرت نانوتوی کے ساتھ شامل تھے۔ دارالعلوم کو شروع ہی سے حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ جیسے بزرگوں کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا جنہوں نے دن رات مدرسے کی ترقی کے لیے کوشش کی اور اس کو بام عروج پر پہنچایا۔

مظاہر العلوم سہارنپور کا افتتاح دارالعلوم دیوبند کے قیام کے چھ ماہ بعد رجب ۱۲۸۳ھ میں حضرت نانوتویؒ کے ہاتھوں ہوا تھا جس کے صدر مدرس مولانا مظہر صاحب تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو جس طرح مدرسہ دیوبند سے عشق و محبت تھی۔ اسی طرح مظاہر العلوم کی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ مولانا محمد مظہر ۱۲۹۲ھ سے ۱۳۰۲ھ تک سرپرست رہے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو آپ کا انتقال ہو گیا ۱۳۱۴ھ کو مدرسہ کے ممبران نے مولانا گنگوہی کو سرپرست مقرر کیا [3] آپ ۱۳۲۰ھ تک بخیر و خوبی اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور اس عرصے میں مدرسے نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ مولانا خلیل احمد

---

[1] محمد طیب۔ دارالعلوم دیوبند ص۹۴ طبع اول ۱۹۶۵ء دیوبند

[2] محمد شفیع۔ مقدمہ فتاوےٰ دارالعلوم دیوبند ص۱ ۱۳۶۲ھ دیوبند۔

[3] عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، ص۱۳۰ مطبوعہ میرٹھ۔

دیوبند سے مظاہر العلوم ۸ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ کو حضرت گنگوہیؒ کے بلانے پر تشریف لائے تھے۔

اشاعت حدیث

مولانا گنگوہیؒ کو علوم اسلامیہ میں جو کمال اللہ نے عطا فرمایا تھا۔ وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ آپ ویسے تو تمام علوم مثلاً تفسیر، حدیث، منطق و فلسفہ فقہ و اصول وغیرہ کے امام تھے۔ مگر علم حدیث اور فقہ سے آپ کو بہت شغف تھا۔ دینی علوم کی تدریس کا شوق آپ کو اسی وقت ہو گیا تھا جب آپ دہلی سے فارغ ہو کر وطن واپس تشریف لائے۔ سب سے پہلے سید مومن علی کو شرح جامی شروع کرائی تھی [1] ابتدا میں آپ نے تمام علوم شرعیہ کا درس دینا شروع کیا۔ جس وقت مولوی قادر علی نے آپ سے ہدایہ پڑھی تو آپ نے فرمایا کہ "یہ چودھویں مرتبہ ہے کہ میں ہدایہ پڑھاتا ہوں۔" [2] تیسرا حج ادا کرنے کے بعد آپ نے دورۂ حدیث شروع کیا جس میں بلاد متفرقہ سے علوم معرفت کے پروانے کھنچ کھنچ کر آنے شروع ہو گئے۔ آپ نے علم حدیث کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دیا تھا اور جب تک بصارت نے ساتھ دیا۔ دورۂ حدیث پڑھاتے رہے۔ فتاویٰ نویسی کا سلسلہ تو نابینا ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کے درس میں ہر سال تقریباً چالیس طالب علم شریک ہوتے تھے جن کے قیام و طعام کا انتظام آپ خود ہی فرماتے تھے۔

احادیث میں آپ صحاح ستہ کا دورہ کراتے تھے اور سب سے پہلے ترمذی شروع کراتے۔ دوران درس کسی سے گفتگو نہ فرماتے۔ اول روایتاً و درایتاً تحقیق و پایہ اعتبار پر بحث فرماتے۔ پھر رفع تعارض اور مسائل کا استنباط و استخراج فرماتے تھے۔ مشکل مسائل کو آسان اور عام فہم زبان میں حل فرماتے تھے۔ پڑھاتے وقت طلباء سے اتنے بے تکلف ہو جاتے کہ کوئی بھی شک

---

[1] عزیز الرحمٰن، تذکرہ مشائخ دیوبند ص۱۱۱ [2] عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید حصہ اول ص۹۳

شبہ ظاہر کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتا۔ دوران درس طلبہ کے عقائد پر خاص توجہ رکھتے، جگہ جگہ شرک و بدعت کی تردید فرماتے جاتے تھے اور سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے جاتے تھے۔ ویسے تو آپ مشکل مسائل کو بار بار سمجھانے کی کوشش فرماتے، مگر پھر بھی اگر کوئی طالب علم اعتراض کرتا تو نہایت شفقت اور محبت سے سمجھاتے تھے۔

درس میں اصول حدیث اور اصول فقہ کے نکات بیان فرماتے۔ اور مدلل و مستند دلائل سے مذہب حنفی کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو امام صاحب کا مذہب حدیثوں میں ایسا روشن نظر آتا ہے کہ جیسا نصف النہار میں آفتاب[1] علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ آپ طلبا کی باطنی اور روحانی اصلاح بھی فرماتے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات کو شریعت کے مطابق ڈھالتے تھے۔ غرض یہ کہ آپ دوران درس ہی روحانی بیماریوں کا معالجہ فرماتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے حلقۂ درس سے ایسے متبع شریعت علما نکلے جنھوں نے دنیا کے گوشے گوشے میں علم و دین کی اشاعت و ترویج میں اپنی عمریں صرف کردیں۔ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۵ء دورہ کا آخری سال تھا، کیونکہ آپ کی بصارت میں کمی ہوتی جارہی تھی۔ حدیث کی تقاریر میں الکوکب الدری آپ کی مشہور تقریر ہے۔ فضلا کی تعداد [illegible] سے زائد ہے۔ فارغ ہونے پر آپ زبانی اور تحریری اجازت نامہ بھی عنایت فرماتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ بہ حیثیت فقیہ

مولانا کی فقہی حیثیت بھی اپنے دور میں لاثانی تھی۔ فقہ آپ کا خصوصی فن تھا۔ اسی میں آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا۔ آپ کی علمی اور فقہی تحقیقات پر ہر دور کے علما اور مشائخ نے اعتبار کیا ہے۔ فقہ کے وہ مسائل جن کو حل کرنے میں علما عصر قاصر رہتے تھے، آپ کے یہاں اشاروں میں حل ہوجاتے تھے

[1] اشرف علی، الافاضات الیومیہ، ج ۲ ص [illegible] مطبوعہ ۱۹۵۸ء کراچی۔

اسی فقہی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے "ابوحنیفہ عصر" کا لقب عطا فرمایا تھا۔ آپ کے متعلق حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کا فرمان ہے کہ "اب سے ایک صدی پہلے تک اس شان کا فقیہ النفس علما کی جماعت میں نظر نہیں آتا۔"[1] آپ کو فقہ کے ساتھ خصوصی تعلق تھا اور بہت ہی ذوق و شوق سے اس کو انجام دیتے تھے۔ آپ بڑے سے بڑا مسئلہ مختصر مگر جامع الفاظ میں حل فرمایا کرتے تھے۔ ہندوستان اور بیرون ہند آپ کے فتاووں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب نے ایک مکتوب میں احقر کے نام تحریر فرمایا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری کا یہ فیصلہ ہے کہ مولانا گنگوہیؒ تفقہ فی الدین میں علامہ شامی اور درمختار سے آگے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی آپ کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام اور مجتہد پایا۔[2] ایک مفتی کے لیے کامل یادداشت بھی بہت ضروری چیز ہے۔ مولانا کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد آپ نے مولانا یحییٰ سے فرمایا کہ فلاں مسئلہ شامی میں دیکھو۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ وہ شامی میں نہیں ہے۔ آپ نے شامی منگوائی اور اس کے دو ثلث اوراق دائیں جانب کرکے ایک ثلث بائیں جانب کرکے فرمایا کہ دیکھو بائیں طرف کے صفحے کے نیچے کی جانب دیکھو۔ دیکھا تو مسئلہ اسی جگہ موجود تھا۔[3] آپ نے جو فتاوے اور رسائل مذہب حنفی کی تائید میں تحریر فرمائے ہیں، ان کے مطالعے سے آپ کی ذہانت، قوت استنباط اور ملکہ استخراج کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

دارالافتاء میں مولانا کی خدمات

مشائخ دیوبند کی فقہی جماعت میں جو کمال حضرت گنگوہیؒ کو حاصل تھا

[1] محمد شفیع، مقدمہ فتاوی دارالعلوم دیوبند ج[illegible]
[2] عبیداللہ سندھی، سیاسی تحریک ص ۲۲، ۱۹۵۲ء لاہور
[3] عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، حصہ دوم ص ۲۶

کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ ابتداء میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ سوالات کے جوابات تحریر فرمایا کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ میں کیونکہ اشاعت دین کا جذبہ بہت تھا۔ اس لیے آپ خطوط کے جوابات فوراً تحریر فرمادیا کرتے تھے، اگر دن میں فرصت کم ملتی تو اپنے آرام کے وقت میں کمی فرماکر رات کو جوابات تحریر فرماتے، تاکہ سائل کو جواب جلد پہنچ جاتے۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ بہت سے سوالات حضرت کی خدمت میں بھیجے، لکھدیا: آشوب چشم میں مبتلا ہوں، چنانچہ چشم بند کرکے جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ تمام جوابات اپنے ہی قلم سے تحریر فرماتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی ابتداء کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ اور دارالعلوم کے فتووں کا دار و مدار آپ ہی کے سپرد تھا۔ آپ ہی کی یہ شان تھی کہ اگر کسی مسئلے میں خطا ہو جاتی تو بلاتکلف فرمادیتے کہ مجھے تحقیق نہیں تھی۔

مجموعۂ فتاویٰ رشیدیہ آپ کا فقہی اعتقادی مسائل کا بے نظیر ذخیرہ ہے اور متعدد بار پاک و ہند میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں مسائل فقہ کے ساتھ ایمانیات اور اعتقادات سے متعلق بھی اختصار کے ساتھ مسائل موجود ہیں۔ مثلاً صلیب اور زنار کے پہننے کے متعلق فرماتے ہیں کہ صلیب کا ڈالنا گلے میں کفر ہے کہ صلیب شعائر نصرانیہ کا ہے۔ قال علیہ السلام من تشبہ بقوم فهو منهم (الحدیث) پس دونوں چونکہ شعائر کفر ہیں، لہٰذا دونوں کفر ہوتے۔ اس کے علاوہ غیر اسلامی رسوم اور بدعات کا بھی رد فرمایا ہے۔ مثلاً میت کے لیے چنے اور کلمہ طیبہ پڑھنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ میت کے واسطے کلمہ طیبہ وغیرہ پڑھنا بہت بہتر اور ثواب ہے۔ مگر تخصیص تیسرے روز کی اور چنوں کی بدعت ہے، وہاں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ [1]

بعض فتاووں کے جواب میں آپ نے مختصر رسائل بھی تصنیف فرمائے ہیں، تاکہ عوام بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ علم غیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حافظ رحمت علی مدرس مدرسہ حنفیہ جودھپور نے فتویٰ دریافت کیا تو آپ نے اس مسئلے پر ایک رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔ اس میں تفصیل سے بحث فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ: "پس حاصل کلام یہ ہے کہ جملہ آیات کلام اللہ شریف و روایات کثیرہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ونیز اقوال سلف صالح سے یہ امر ظاہر ہوگیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہیں اور نہ ہر جگہ تشریف رکھتے ہیں پس اس کا اعتقاد رکھنا صریح خطا بلکہ شائبہ شرک ہے [1] اسی طرح جب آپ سے بیس رکعت تراویح کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے تفصیل سے اس کا جواب تحریر فرمایا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ جن کے باب میں رسول اللہ فرماتے ہیں کہ "اقتدوا بالذین بعدی ابی بکر وعمر وعثمان وعلی" نے جس کا امر فرمایا، تو بمقتضا "علیکم بسنتی وسنت خلفاء الراشدین المہدیین" اس کا عمل امت پر رسول اللہ نے لازم فرمایا۔ یہ امر دلیل ہے اس بات کی کہ سب کے نزدیک یہ مدد مستدین رسول اللہ سے انکے نزدیک محفوظ تھا کہ کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا اور سنت رسول اللہ سمجھ کر اس پر عمل کیا [2]

فرضیت جمعہ کے متعلق کہ گاؤں میں جمعہ فرض ہے کہ نہیں؟ آپ نے ایک مفصل رسالہ "اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعة فی القریٰ" تحریر فرمایا۔ اس میں تمام اعتراضات کا رد فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ الحاصل محقق ہوگیا کہ فرضیت جمعہ مکہ معظمہ میں ہوچکی تھی اور مکہ میں اقامت جمعہ سے تعذر تھا اور مدینہ میں کہ مصر تھا اور مسلمانوں کو تمکن اقامت جمعہ کا تھا۔ جمعہ بامر رسول اللہ جاری رہا اور مواقع ومحل اقامت جمعہ نہ تھے۔ مثل حوالی وقبا وغیرہ وہاں جمعہ جاری نہیں ہوا، حالانکہ وہاں

---

[1] رشید احمد۔ فتاویٰ رشیدیہ ص ۶۱، ۴۰ مطبوعہ قرآن محل کراچی

[1] رشید احمد۔ رسالہ علم الغیب ص ۱۵ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

[2] رشید احمد۔ الرای النجیح ص ۱۱ مطبوعہ ۱۹۰۳ء مجتبائی دہلی

بہت سے مسلمان مقیم تھے اور نہ کبھی بعد میں وہاں جمعہ پڑھا گیا۔ [1]

اوقاف القرآن کے بارے میں غیر مقلد علماء نے بدعت کا فتویٰ دے کر تمام قرأ کو اہل بدعت۔ قرار دیا تو اس کا رد مولانا گنگوہیؒ نے واضح طور پر فرمایا۔ تحریر فرماتے ہیں" کہ " پس قرأت قرآن میں دونوں طرح سے پڑھنا، یعنی قرأت معنوی حرفاً حرفاً اور مستعجلاً دونوں طرح سے درست ہے۔ ایسے ہی وقف علیٰ رؤس الآیات بھی درست ہے اور عدم وقف بھی اور اصل یہ ہے کہ اوقاف ہی تفسیر قرآن ہیں کہ فصل و وصل سے معنی قرآن کے واضح ہو جاتے ہیں۔ [2]

جماعت ثانیہ کے متعلق جب فتویٰ دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کی وضاحت میں ایک مفصل رسالہ " القطوف الدانیہ فی تحقیق الجماعۃ الثانیہ" تحریر فرمایا۔ جماعت ثانیہ کا رد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، کہ جامع صغیر میں ہے کہ کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا کہ محلہ والوں نے اس میں نماز ادا کر لی پس وہ بغیر اذان و اقامت کے پڑھے۔ کیونکہ تکرار جماعت اس کے قلت کا باعث ہے، چونکہ کوئی شخص جماعت فوت ہو جانے سے نہیں ڈرے گا، تو اس لیے مکروہ ہے۔ [3]

اس کے علاوہ مسائل کی کافی تعداد ایسی بھی ہے جو شائع نہ ہو سکی۔ کیونکہ شروع میں فتووں کی نقل نویسی کا انتظام نہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ دارالافتاء ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں قائم ہوا۔ جس کے مفتی مولانا عزیز الرحمٰن مقرر ہوئے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء سے ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۲ء تک ۱۹ سال کے فتووں کی تعداد کا علم نہیں ہے [4] منتشر خطوط کو جمع کر کے فتاویٰ رشیدیہ شائع کیا گیا ہے

---

[1] رشید احمد اوثق العریٰ ص۹ مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند
[2] رشید احمد۔ رد الطغیان ص۳۷ مشمولہ فتاوائے رشیدیہ
[3] رشید احمد۔ القطوف دانیہ ص۱۵ مطبوعہ قرآن محل کراچی
[4] محمد طیب۔ دارالعلوم دیوبند ص۱۰ طبع اول ۱۹۶۵ء دیوبند

حضرت گنگوہیؒ کی قرآن و حدیث میں دقیق النظری

مولانا کو اللہ نے وہ عقل و فہم عطا فرمایا تھا کہ جن مسائل کے حل کرنے میں فقہاء و علماء عصر عاجز ہو جاتے۔ آخر کار آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے آپ ان کا جواب ایسی بے تکلفی سے دیتے کہ علماء حیران رہ جاتے اور ایسے ایسے نکات و حکمتیں بیان فرماتے کہ جن کا علماء کو خیال تک نہ ہوتا تھا آپ قرآن و حدیث میں گہری نظر رکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے قرآن و حدیث میں آپ کی دقیق النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا خلیل احمد نے آپ کو ایک شبہ لکھ کر بھیجا کہ " وان من الحجارة لما یتفجر منه الانہار" اور "وان منہا لما یشقق فیخرج منه الماء" ہر دو آیات باعتبار معنی متحد معلوم ہوتی ہیں۔ پھر تکرار سے کیا نفع۔ نیز "وان منہا لما یہبط من خشیة اللہ" میں ہبوط و سقوط حجر کو ثمرہ خوف الٰہی بیان کیا ہے۔ پس تفجر اور تشقق اور ہبوط کی اس ترتیب مذکور فی القرآن کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ نیز وما اللہ بغافل الخ۔ اور افتطمعون الخ کو اس آیت سے کیا ربط ہے۔

مولانا گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی " تفجر الانہار اعلیٰ درجہ کا متاثر ہونا ہے کہ نہریں پھوٹ کر جاری ہوئیں اور تشقق ہو کر پانی نکلا۔ ادنیٰ درجہ کا اور لفظ ہبوط اس سے بھی کم درجہ۔ تو اعلیٰ سے اسفل کو کلام کا سوق ہوا کہ پتھروں کا یہ حال ہو کہ بعض سے نہریں جاری ہو گئیں اور بعض سے شق ہو کر پانی نکلا اور بعض ہابط ہو گئے مگر بنی اسرائیل کو باوصف ان معجزات باہرہ اور رویت قدرت قاہرہ اور احسانات بینہ ظاہرہ کے اعلیٰ تو کیا ادنیٰ تاثر بھی نہ ہوا۔ تو ادنیٰ ادنیٰ حال حجر سے بھی ان کا حال خوار و خراب ہوا۔ منفجر الانہار اعلیٰ درجہ کا متاثر ہو کر ہمہ تن خشیت سے پانی ہوا اور اس کا نفع خلق کثیر کو ہوا ہر قسم کا اور منشقق خود منتفع کسی درجے کا ہوا۔ اس کے مار سے بھی واحداً بعد واحداً کو کچھ نفع ہوا یا نہ ہوا۔ مگر خود منتفع خشیت ہوا اور منہبط کو خود تواضع و خشیہ حاصل ہوا

اگرچہ اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہوا، مگر متاثر ہو کر متقل امر ہوا۔ خلاف بنی اسرائیل کے کہ وہ اپنی جبلت عصیان پر برقرار ہیں اور جھٹ سے میل ان کے اور تیز بیانی لغو ہے۔ وما اللہ بغافل الخ۔ پس انہیں نے قدیم بد فہموں بدترین از حجارہ سے۔ الو قد سر کا بیہ۔ کیا توقع کرتے ہو۔ افتطمعون الخ۔ والسلام ۔[1]

،، اللہ فرما رہا ہے ان لوگوں کے اعتراض کا جواب جو کہتے ہیں کہ قرآن میں ایسی آیات ہیں جن کے معنی واضح نہیں تفصیل سے دیا۔ ترمذی کی ایک حدیث[2] کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ مخالفین نے یہ طعن کیا ہے کہ کتاب اللہ ایسی کلام پر مشتمل ہو جس کے کوئی خاص معنی واضح نہیں سمجھے جاتے تو متاخرین نے ان آیات کی کچھ تاویلات کی ہیں لیکن اس سے یقین مراد حق تعالیٰ نہیں بلکہ متصور یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو اور کتاب اللہ میں اس سے منع نہیں کیا گیا اور ان تاویلات صحیحہ کو اصول شرعیہ کی مطابقت پر حمل کیا جائے تو پھر وہ آیات متشابہ نہیں رہیں گی، بلکہ وہ محکمات بن جائیں گی جیسے وجہ اللہ، ید اللہ اور اگر مقطعات میں بھی یہی تاویلات جاری ہوں، تو وہ بھی متشابہ نہیں رہیں گی۔ پس اینما تولوا فثم وجہ اللہ میں مثلاً وجہ بمعنی معروف لیں تو اس وقت یہ آیت متشابہات میں ہو گی تو ہمارے اس خیال سے ایک ہی آیت ایک تاویل سے متشابہات سے خارج ہے، جب کہ وہ اپنے ظاہر معنی کے اعتبار سے متشابہ ہو۔ لیکن ہماری اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے کہ منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابہات۔ تو اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ متشابہات کسی حیثیت سے بھی محکم نہیں ہوں گی۔ ہم کہتے ہیں کہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ متشابہات محکمات کے مغایر ہیں۔ رہی بات یہ کہ متشابہات کسی جہت سے محکمات بن سکتے ہیں یا نہیں تو آیت میں اس نفی پر کوئی دلیل نہیں، تو حاصل یہ ہوا کہ کتاب اللہ میں بعض آیات تو صرف محکم ہیں اور بعض محکم اور متشابہ ہیں۔ لیکن اس آخری قسم کو منظر متشابہ سے تعبیر فرمایا ہے محض اس لیے کہ انہیں فتنے میں پڑنے سے روکا جائے تاکہ وہ اس کی ایسی معین تاویل کریں جس سے اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت پر ترجیح پائی جائے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ید اللہ فوق ایدیھم اور اس کی مثل دوسری آیات، اللہ نے ید سے جو مراد لی ہے، وہ حق ہے، لیکن اس کی کیفیت اور اس کا مصداق معلوم نہیں لیکن ممکن ہے کہ آیت میں ید سے مراد قوت ہے۔ پس اس لحاظ سے اس طرح کی آیات متشابہات باقی نہیں رہیں گی۔[3]

فلا جناح علیہ ان یطوف بہما کی تفسیر کرتے ہوئے اس شبہ کو صاف فرماتے ہیں کہ سعی امر جاہلیت میں سے ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں نفی حرج ہے کہ انصار اور مہاجرین صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں حرج سمجھتے ہیں، ان کا یہ خیال تھا کہ وہ امر جاہلیہ سے ہے۔ رہی یہ بات کہ صفا مروہ کے درمیان سعی مراتب احکام شرعیہ میں سے کس مرتبے کی ہے تو یہ نص قرآنی اس بات سے ساکت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری نص قرآن سے اس کا جواب بیان کیا ہے، تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ سعی امر جاہلیت میں سے نہیں، جیسا تم خیال کرتے ہو، بلکہ وہ تمہارے باپ ابراہیم کی شریعت قدیمہ ہے اور یہ فرما کر ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ اس شبہ کی نفی کر دی کہ وہ امر جاہلیت میں سے ہے اور یہ بات واضح کی کہ یہ پہلے کی طرح واجب ہے ...[1]

---

[1] عاشق الٰہی: تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول صفحہ ۱۵۶

[2] حدیث یہ ہے: عن عائشۃ سئل رسول اللہ ...... ؟ فاحذروھم ہذا حدیث حسن صحیح۔ ترمذی ج ۲ ص ۱۲۴ مطبوعہ دہلی

[1] رشید احمد۔ کوکب الدری ج ۲ ص ۲۰۱ مطبوعہ ۱۳۵۴ھ سہارنپور

[2] عن عروۃ قال قلت ...... والمروۃ شیئا الخ۔ ترمذی ج ۲ ص ۱۲۱ دہلی

[3] رشید احمد: کوکب الدری ج ۲ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

قرآن پاک کی آیت "وما کان اللہ لیضیع ایمانکم" [1] کی تشریح میں مولانا نے یہ اصول اخذ فرمایا کہ اطاعت نام ہی امتثال امر کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انقیاد اور تسلیم سب عمدہ ہے کیونکہ اطاعت امتثال امر کا نام ہے۔ اس لیے وہ بفضل اللہ ضائع نہیں ہوں گی۔ [2]

مولانا سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت اگر وظیفہ شب کو نہ ہو سکے تو دن میں قضا کرنے میں وہی ثواب ملے گا؟ آپ نے فوراً جواب میں فرمایا: کیوں نہیں: ہوالذی جعل اللیل والنہار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا۔ [3]

مولانا گنگوہیؒ کی حدیث میں دقیق النظری

مولانا حدیث کے مختلف فیہ مسائل کو اس طرح حل فرماتے تھے، کہ ہر طالب علم کی سمجھ میں آسانی سے آجاتے۔ ترمذی کی ایک طویل حدیث [4] کے جملہ فی نفسک اور قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ لہذا فی نفسک اس بات پر نص نہیں کہ ہر مصلی پر اس کی قرأت خود بذاتہ ضروری ہے، بلکہ یہ عام ہے کہ وہ فی نفسہ قرأت کرے۔ یہ اس کا وکیل جیسے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من له امام فقراۃ الامام له قراۃ۔ لہذا اس روایت سے اس آیت کا عموم باطل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون" اس کے بعد اسی حدیث کے جملہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی" کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد یہاں فاتحہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ جب رسول اللہؐ نے فاتحہ پر صلوٰۃ کا اطلاق فرمایا تو فاتحہ نماز کے فرائض میں اکمل فریضہ اور نماز کے ارکان میں اولیٰ رکن ٹھہری۔ پس جو فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاید ابوہریرہؓ کی یہ روایت اسی مقصد کے لیے وارد ہوئی ہو تو جواب ہے کہ ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ مقتدی کے لیے قرأت نہیں۔ غایت امر یہ ہو سکتا ہے کہ مقتدی قاری باللسان نہ ہوا اور اکثر ایسے ہوتا ہے کہ وکیل کے فعل کو موکل کی طرف منسوب کرتے ہیں (تو یہاں بھی امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہوئی) [1]

آپ سے مولوی ابوالبرکات نے دریافت کیا کہ حضرت صدق اللہ کذب بطن فلاں دالحدیث، او کما قال کا کیا مطلب ہے؟ اور کذب سے کیا مراد ہے؟" حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ دستوں کا جاری ہونا تو بظاہر مرض کا زیادہ ہونا تھا مگر واقع میں یہی سبب تندرستی تھا۔ اسی کو جناب رسول اللہؐ نے کذب سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ ظاہر اور باطن میں تخالف ہی کا نام "کذب" ہے۔ کما لایخفی [2] احادیث سے بھی آپ فقہی مسائل کا استنباط فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی کی ایک حدیث [3] جس میں حد قذف کا مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے اپنے مملوک پر تہمت لگائی جس سے وہ بری تھا تو مالک پر حد قذف جاری نہیں کی جائے گی۔ [4]

مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث سے تہجد اور تراویح کو جدا جدا ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہر دو صلوٰۃ جدا گانہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے، کبھی تداعی جماعت نہیں

---

[1] عن ابن عباس قال لما .... وما کان اللہ لیضیع ایمانکم (ترمذی ج ۲ ص ۱۲۱)۔

[2] رشید احمد۔ کوکب الدری۔ ج ۲ ص ۱۹۳

[3] عزیز الرحمٰن۔ تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۱۴

[4] قال قلت یا ابی ہریرہ..... اکون وراء الامام الخ (ترمذی۔ ج ۲ ص ۱۹۱)۔

---

[1] رشید احمد کوکب الدری۔ ج ۲ ص ۱۸۹-۱۹۰

[2] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول ص ۱۰۳

[3] حدیث یہ ہے: عن ابی ہریرۃ .... ابا القاسم ... کما قال هذا (ترمذی ج ۲ ص ۱۰)

[4] رشید احمد۔ کوکب الدری۔ ج ۲ ص ۱۰

فرمائی۔ اگر کوئی شخص آکر ملا ہوا تو مضائقہ نہیں، مثلاً ابن عباس خود ایک دفعہ آپ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تھے بخلاف تراویح کے اُس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کر کے ادا کیا۔ [1]

اس حدیث سے آپ نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ نماز تہجد بلا جماعت ہی پڑھنا درست ہے جب کہ تراویح با جماعت پڑھنا مسنون ہے ایک حدیث "لا نخل بیت فیہ کلب" سے آپنے یہ مسئلہ اخذ فرمایا کہ اس سے وُہ مراد ہے، جو حفاظت کا نہ ہو [2]

آہستہ آمین کہنے کے متعلق آپ نے فرمایا کہ آہستہ آمین کہنا حدیث سے ثابت ہے۔ مستدرک میں حاکم نے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ عن وائل ابن حجر انہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما بلغ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ قال آمین وخفض صوتہ" اس حدیث سے حضرت کا مخفیہ آمین کہنا ثابت ہوگیا۔ بعد اس کے انکار کرنا محض تعصب ہے۔ اس باب میں اور بھی روایات ہیں۔ پس کسی کو اشتباہ نہ ہونا چاہیئے [3]

مولانا گنگوہیؒ کی فقہ میں دقیق النظری

مولانا کو جس طرح قرآن و حدیث میں مہارت حاصل تھی۔ اسی طرح آپ فقہ کے بھی ماہر تھے۔ ایک مجلس نکاح میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ وُہ کون عورت ہے کہ کوئی عورت کسی اجنبی بچہ کو دُودھ پلاتے اور دُوسری عورت، یعنی اس کی سوکن اپنے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے۔ اس سوال پر تمام حضرات حیران تھے کہ دیکھیں مولانا کیا جواب دیتے ہیں؟ آپ نے بلا تکلف فرمایا کہ ایک نے اپنے صغیر سن خاوند کو دُودھ پلایا

پھر کسی دُوسرے سے نکاح کر لیا۔ اب اس کی سوکن اس بچے کو دُودھ پلائے تو دُوسری عورت یعنی بچے کو دُودھ پلانے والی اپنے موجودہ خاوند پر حرام ہو جائے گی [1]

آپ کی اس استعداد پر لوگ حیران تھے کہ حضرت نے یہ معمہ کتنی جلدی حل فرما دیا۔ اس سے آپ کی فقہی دقیق النظری کا اظہار ہوتا ہے اللہ نے آپ کو لاجواب فقہی فہم اور ذکاوت عطا فرمائی تھی۔ آپ سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ اکثر لوگ عورت کو مسلمان کر کے فوراً نکاح کر لیتے ہیں اور شوہر کافر پر اسلام نہیں پیش کرتے، یہ نکاح تو نہ ہوا اور پیش کرنے پر بھی اگر انکار کرے تو تفریق میں قاضی کی ضرورت ہے۔ وُہ یہاں ہے کہ نہیں البتہ اگر دار الحرب میں ہو تو تین حیض گزرنے پر بائنہ ہو جائے گی، آپ نے جواب میں فرمایا کہ "عورت کو مسلمان کرنے کے ساتھ ہی نکاح کرنا درست نہیں اور اگر ذات زوج ہو، جیسا آپ نے لکھا ہے۔ اسی طرح درست ہوگا۔ [2]

مالکیہ کے اس مسئلہ کے متعلق کہ بندوق سے شکار کیا ہوا، جانور، جو بلا ذبح مر جائے، حلال ہے۔

جب آپ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کو اس کی حلت کا اس وجہ سے شبہ ہوا کہ فقہ میں احراق بالنار کو قاطع لکھا ہے اور اسی بنا پر بندوق کی گولی کو بھی محرق اور قاطع سمجھ کر بعض علماء نے حلت کا فتوٰے دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا ملوک علی صاحب سے ہم نے اس کو دریافت کیا تھا تو فرمایا کہ رُوئی پر نشانہ لگاؤ۔ معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، گولی پار ہو گئی۔ اور رُوئی کچھ نہ جلی، سو گولی توڑنے والی ہے۔ محرق نہیں ہے جب تک

---

[1] رشید احمد الرای النجیح ص۲۷

[2] رشید احمد۔ فتاوٰی رشیدیہ ص۱۵۶ مطبوعہ قرآن محل کراچی

[3] 〃 〃 〃 ص۱۹۱

[1] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید حصہ اوّل ص۱۰۳

[2] 〃 〃 〃 〃 ص۱۲۵

ذبح نہ کیا جائے، بندوق کا شکار حلال نہیں [1]

تقلید شخصی کے متعلق، جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ قرون ثلاثہ میں تقلید شخصی کا ثبوت ہے کہ نہیں۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تقلید شخصی خود قرآن سے ثابت ہے، تو پھر قرون ثلاثہ کی کیا پوچھ۔ قولہ تعالیٰ فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون [2]

غرض یہ کہ حضرت گنگوہیؒ اپنے ہر فن میں یکتا تھے اور ہر شخص آپ کے کمالات کا معترف تھا۔

مولانا کی سیاسی خدمات

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور تحریک آزادیٔ ہند

تحریک آزادیٔ ہند جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ منظم تحریک تھی، جس میں مسلمانوں نے جابر برطانیہ سے ملک و قوم کو آزادی دلانے کی انتھک کوشش کی۔ یہاں تک کہ عملی طور پر بھی میدان جہاد میں نکل کھڑے ہوتے۔ جس میں ہزاروں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا اور تقریباً تیرہ ہزار علماء کرام کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ بچوں اور بوڑھوں کی بھی جان بخشی نہ ہو سکی۔ ایڈورڈ ٹامس نے شہادت دی کہ صرف دہلی شہر میں ۵۰۰ علما کو پھانسی دی گئی [3] جلادوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا جاتا کہ لاش کو زیادہ دیر تک لٹکائے رکھیں تاکہ لاش کے تڑپنے کی کیفیت سے مسرور ہوتے رہیں۔ پھانسی کے علاوہ تانبے کو گرم کر کے بدن کو داغا جاتا اور اسی حالت میں روح پرواز کر جاتی۔ ایک عینی شاہد نے اپنے بیان میں کہا کہ بدنصیب قیدیوں کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی [4]

غرضیکہ انگریز جو بھی ظالمانہ اور سفاکانہ حرکتیں کر سکتا تھا، کرتا رہا اور مسلمان مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ انگریز کی دلی آرزو تھی کہ ہند میں پرچم عیسائیت بلند ہو جس کا ثبوت اس تقریر سے ملتا ہے، جو کہ مسٹر مینگلس چیئرمین ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن کی پارلیمنٹ میں کی تھی۔ اس نے کہا: خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہو۔ تاکہ عیسیٰ کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے۔ اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرے۔ [1]

اس کے علاوہ میکالے نے بھی اپنی والدہ کو ایک خط ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو لکھا تھا جس میں ہندی قوم کو عیسائی بنانے کے متعلق یوں تحریر کیا تھا کہ اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا، تو مجھے پختہ یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۳۰ سال بعد بنگال میں ایک بھی بت پرست یعنی غیر عیسائی نہ رہے گا۔ [2]

انگریز نے مسلمانوں کی سرکوبی کرنے اور عیسائی بنانے کے لیے ہر طرح کے ظلم ڈھائے، جن کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انکا خیال تھا کہ اب ہندوستان پر ہمیشہ انگریز ہی مسلط رہیگا۔ لارڈ رابرٹس نے کہا تھا کہ ان بد بخت مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ [3]

انگریز نے ایسی ایسی حرکات کیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور انگریز کے خلاف نفرت پھیلنا شروع ہو گئی۔ اس نازک دور

---

[1] عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید ص ۱۳۹۔ [2] رشید احمد، فتاوٰی رشیدیہ ص ۱۹۵
[3] حسین احمد۔ ریشمی رومال ص ۴۵۔ مطبوعہ ۱۹۶۶ء لاہور [4] محمد میاں علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد ۴ ص ۵۲۱، ۵۲۲ مطبوعہ ۱۹۶۳ء دہلی

[1] محمد میاں، علماء حق۔ جلد ۱ ص ۲۱ مطبوعہ ۱۹۴۷ء دہلی
[2] بحوالہ اخبار کوہستان مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء، کالم ۲ ص ۹ ۱۰
[3] محمد میاں۔ شاندار ماضی جلد ۴ ص ۵۴۲

اور ناسازگار حالات میں اعلاءِ کلمۃ اللہ، مذہبی جذبہ اور مسلمانوں کی مظلومیت کے پیشِ نظر علماء کی ایک جماعت نے صدائے حق اور علمِ حریت بلند کیا۔ اسی جماعت کے ایک قائد مولانا رشید احمد گنگوہی بھی تھے۔ یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک طرف آپ کی خدمت سے ہند اور بیرونِ ہند میں علومِ شرعیہ کی اشاعت اور ترویج ہوئی تو دوسری طرف آپ کی سیاسی خدمات سے بھی پہلوتہی نہیں کی جاسکتی۔ مولانا گنگوہیؒ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی سرکردگی میں، منشائے انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت و استقلالِ ملی کی فداکارانہ جدوجہد میں جو حصہ لیا اس کو کسی طرح بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اسی سلسلے میں قید و بند کے جو مصائب برداشت کئے وہ ایسے تاریخی حقائق ہیں جن پر پردہ ڈالنا بہت مشکل ہے۔ ایسے پرآشوب دور میں ظالم برطانیہ کے فولادی پنجے سے ٹکر لینا ان ہی مردانِ حق کا کام تھا۔

جنگِ آزادی میں حصہ

انگریز کی جابرانہ اور ظالمانہ حرکات حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھیں ادھر سہارنپور کے کلکٹر "اسپنکی" کے ظالمانہ فیصلے نے مسلمانوں کو اور بھی مشتعل کر دیا جس کی وجہ سے جہاد کا شعلہ بھڑک اٹھا، واقعہ یوں پیش آیا کہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی کے برادر عبدالرحیم مع چند احباب ہاتھی کی خریداری کے لیے سہارنپور گئے۔ مخبر نے اطلاع دی کہ یہ لوگ فوج پر حملہ کرنے کی غرض سے ہاتھی خریدنے آئے ہیں جس وقت یہ اطلاع "اسپنکی" کو ملی تو اس نے بلا تحقیق و تفتیش پھانسی کا حکم دے دیا۔ قاضی صاحب کو مع ساتھیوں کے شہید کر دیا گیا۔ "اسپنکی" کے اس جابرانہ اقدام کی خبر سے تھانہ بھون میں صفِ ماتم بچھ گئی اور علماء نے حضرت حاجی صاحب کی موجودگی میں مجلسِ شوریٰ منعقد کی، تاکہ صورتِ حال پر غور کیا جائے اور جہاد کی تیاری کی جائے، اس میں حاجی صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے علاوہ شیخ محمد بھی تھے، جنہوں نے جہاد کی مخالفت کی تھی۔ کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے۔ اس اسلامی لشکر کی تشکیل اس طرح کی گئی۔

حضرت حاجی صاحبؒ، امیر المؤمنین۔ حافظ ضامن صاحبؒ امیرِ جہاد، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ امیر الافواج یعنی کمانڈر انچیف۔ مولانا منیر مولانا نانوتویؒ کے فوجی سیکرٹری اور مولانا گنگوہیؒ وزیرِ لام بندی مقرر ہوئے۔[1]

"اسپنکی" نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر یہ پیشکش کی کہ: یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے، آپ صبر و شکیب کو کام میں لائیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ ہم آپ کو مزید جائداد عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کر لیں گے[2] مسلمانوں کی طرف سے یہ پیشکش ٹھکرا دی گئی۔

مجاہدین کے حملے

مجاہدینؒ نے سب سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر انگریز فوج پر کیا۔ مولانا عاشق الٰہی نے تحریر کیا ہے کہ اتفاق سے چند فوجی سوار کہاروں کے کاندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے۔ قاضی صاحب کو اطلاع ملی، تو مع چند رفقاء حملہ آور ہوئے اور مال و اسباب لوٹ لیا۔[3]

دوسرا حملہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شاملی پر کیا گیا جس میں مولانا گنگوہیؒ نے حاضر دماغی سے کام لیا اور فتح حاصل کی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے اور ایک پلٹن لازمی پہنچے، رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی، کیونکہ

---

[1] مناظر احسن، سوانح قاسمی۔ ج ۲ ص ۱۲۳، ۱۲۰، مطبوعہ ۱۳۷۳ھ دیوبند

[2] ثناء الحق، مقدمہ وحدۃ الوجود ص ۴۱

[3] عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید ص ۷۴

جو ہتھیار ان مجاہدوں کے پاس تھے، وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے، مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔ توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ فکر مت کرو۔ سڑک باغ کے ایک کنارے سے گزرتی تھی۔ مولانا کو تیس یا چالیس مجاہدوں پر حاجی صاحب نے افسر مقرر کیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو، جب میں حکم کروں، سب کے سب فائر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے ایک دم فائر کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مولانا گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لا کر ڈال دیا۔[1]

مولانا کی اس جنگی منصوبہ بندی سے آپ کی فراست اور فنونِ حرب میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے اسی معرکہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس حملے میں مجاہدین کا بہت جانی نقصان ہوا اور سامانِ حرب ناکافی ہونے کی وجہ سے مجاہدین کے لیے آئندہ جہاد جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اس لیے یہ تحریک سرد پڑ گئی۔ جہادِ شاملی کے بعد انگریزوں نے تھانہ بھون پر حملہ کر کے قصبہ کو تباہ و برباد کر ڈالا اور گھروں کو آگ لگا کر خاک کر دیا۔

آزمائش

جہادِ آزادی میں حصہ لینے والوں کو تختۂ دار پر لٹکایا جا رہا تھا اور سخت سے سخت سزائیں دی جا رہی تھیں، حضرت حاجی صاحب، مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ گرفتار کرنیوالوں کو انعام کا لالچ دیا جا رہا تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے وطن کو خیرآباد کہہ کر حرمین شریفین، مکہ مکرمہ کی راہ بہ نیت ہجرت اختیار کی۔ ایسے پُرخطر دنوں میں بھی مولانا گنگوہیؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ کی زیارت کے شوق میں انبالہ اور پنگری کا سفر کیا اور بعد میں وطن واپس تشریف لائے۔ اعزا و اقربا کے کہنے پر آپ رام پور منہاراں تشریف لے گئے جو آپ کی دادھیال تھی۔ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کی آخری تاریخیں یا محرم ۱۲۷۶ھ کی ابتدائی یعنی جولائی ۱۸۵۹ء کو کپتان کرنیل فرانس نے گنگوہ میں غلط فہمی کی وجہ سے آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصر کو گرفتار کیا اور مار ا پیٹا۔ مولانا گنگوہیؒ کو ایک مسلمان حکیم امیر بخش کی مخبری پر رام پور سے حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر کے سہارنپور جیل میں تین چار یوم کال کوٹھڑی اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے بعد مظفر نگر جیل منتقل کر دیا گیا، جہاں آپ تقریباً چھ ماہ قید رہے۔[2]

اور مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تحقیق کے مطابق آپ نو ماہ اسیرِ فرنگ رہے۔ مطلوبہ ضمانت جو ۳ ہزار کی تین آدمیوں نے دینا چاہی تو یہ کہہ کر انگریز نے نامنظور کر دی کہ یہ تینوں گنگوہ کے باشندے ہیں۔

آپ پر مقدمہ چلتا رہا اور یہ خطرہ تھا کہ کہیں آپ کو پھانسی کا حکم نہ ہو جائے۔ ایک مرتبہ حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا۔ اللہ کو ابھی ان سے بہت کچھ کام لینا ہے۔ آپ کے خلاف تحقیقات ہوتی رہی۔ مقدمہ کی پیشی پر حاضر ہو کر حاکم کے سوالات کے جوابات بلا تکلف دیتے تھے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ تم سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھاتے ہو۔ آپ نے تسبیح کی طرف اشارا کر کے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا کام فساد کا نہیں اور نہ ہم مفسدوں کے ساتھی ہیں۔ جب آپ کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تو جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ یعنی جنوری ۱۸۶۰ء کو رہا کیا گیا۔

[1] حسین احمد، نقشِ حیات، جلد ۲ ص ۴۳، ۴۴ مطبوعہ ۱۹۵۴ء دہلی

[2] گیلانی، سوانح قاسمی ج ۱۔ ص ۱

ثمرۃ التربیت ○ نظارۃ المعارف

سے لے کر

ریشمی رومال کی تحریک تک

حیاتِ عثمانی غیر مطبوعہ کے چند اوراق

پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی کے قلم سے

دارالعلوم دیوبند قدرتِ ربّانی کا ایک الہامی شاہکار ہے۔ اس کی رحمت کا ایک چھینٹا جب سرزمین دارالعلوم دیوبند پر پڑا، تو اس خطۂ ارضی پر قال اللہ و قال الرسول کے وہ انوار برسے کہ ۱۵ محرم ۱۲۸۲ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۸ء سے آج ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء جس کو ہجری حساب سے ایک سو بارہ سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کی تجلیات اور برکات ہند، پاکستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر، اردن، انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نیز افریقہ کے برصغیر، غرضیکہ تمام دیارِ اسلام پر نازل ہو رہی ہیں اور ہزاروں علما اور فضلائے دیوبند کی مساعیٔ جمیلہ احیائے دین و ملت اور حریتِ اسلامی کے جذبات سے سرشار ہو کر دنیائے اسلام میں جلوہ افروز ہیں۔ یقین کیجئے اور یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ دین اور اور تقویٰ کا سب سے بڑا ادارہ دنیا میں اگر کوئی ہے تو وہ دارالعلوم دیوبند مانا کہ جامعہ ازہر مصر کا ایک بڑا مرکزی ادارہ ہے، لیکن وہاں تقوے اور، پرہیزگاری کی جنس نایاب ہے۔ آخر علم کے آگے تقویٰ ہی تو ہیم منزل ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پیشِ نظر ایک ایسے دینی دارالعلوم کی ضرورت تھی جو عالم باعمل، روشن ضمیر محقق، معقولات و منقولات کے ماہر پیدا کرے۔ مزید برآں یہ کہ ان میں جہاد کی سپرٹ اور مجاہدین کے نقشِ قدم پر چلنے والے وہ جذبات ہوں کہ جب اسلام ان کو جاھدوا فی سبیل اللہ راہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے کھڑے ہو جاؤ کا نعرہ بلند کر کے جہاد کی دعوت دے تو وہ سربکف ہو کر میدانِ جہاد میں بے تامل اتر پڑیں اور بلندیوں سے بے جھجک کود پڑیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

چنانچہ دارالعلوم نے منصۂ شہود پر آتے ہی ترقی کی منزلیں ایسی تیزی سے طے کرنی شروع کیں چنانچہ تھانہ بھون میں عربی کا جو ایک مدرسہ ۱۲۹۱ھ سے تھا جس کے مہتمم منشی عبدالرزاق صاحب اور مدرس مولوی شیخ محمد صاحب تھے انھوں نے اپنے مدرسے کا الحاق دیوبند سے کر دیا، بعد ازاں مظفر نگر، گلاوٹھی ضلع بلند شہر، کیرانہ ضلع مظفر نگر اور انبیٹھہ ضلع سہارنپور میں دارالعلوم کی شاخیں کھل گئیں اور ان کا الحاق دیوبند سے ہوا۔ بعد ازاں میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم کے زیرِ اہتمام مدرسہ کھولا گیا اور اس کے مدرس اولاً دیوبند کے فاضل مولوی

محمد مناظر حسن ہوئے۔ گلاوٹھی کا مدرسہ بے جان ہوکر رہ گیا تھا۔ لیکن منشی سید مہربان علی صاحب رئیس گلاوٹھی کی مساعی سے اس کا دوبارہ احیا کرکے دارالعلوم دیوبند سے الحاق ہوا۔ بعدازاں دانپور ضلع بلندشہر میں نواب محمد معشوق علی خاں رئیس قصبہ کی کوشش سے مدرسہ عربی جاری ہوا اور اس کے مدرس اول مولوی احمدالدین صاحب دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ فاضل تھے بعدازاں مُرادآباد میں مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم کے نام پر شاہی مسجد میں قاسم العلوم کے نام سے مدرسہ عربی جاری ہوا جس کے صدر مدرس مشہورِ زمانہ حضرت قاسم العلوم کے شاگرد مولانا احمد حسن صاحب امروہوی اور مہتمم مرزا محمد نبی بیگ ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کی ہی دیکھا دیکھی لکھنؤ میں مدرسہ رفاہ المسلمین قائم ہوا جس کے منتظم مولوی فتح محمد صاحب ہوئے۔ اسی دارالعلوم کے نقش قدم پر مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپور نے یکم رجب ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے صرف ۵ ماہ کے بعد محلہ قاضی میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد رکھی، مولوی سخاوت علی انبیٹھوی کو تیرہ روپے ہوار پر مدرس رکھا۔ مولانا سعادت علی بغیر تنخواہ مدرسے کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر مولانا احمد علی صاحب محدث محشی بخاری اور استاذ قاسم العلوم نے معاونت کی۔ ان کے تین ماہ بعد شوال ۱۲۸۳ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب صدر مدرس بن کر آئے۔ ۱۳۱۴ھ میں مولانا خلیل احمد صاحب محدث شارح ابوداؤد مظاہرالعلوم میں تشریف لے آئے۔

الغرض دارالعلوم دیوبند کی دیکھا دیکھی کتنے مدارس عربیہ تو اس کی شاخ کے طور پر ملحق تھے اور کتنے خودمختار۔ پھر مختلف صوبوں میں یہ مدارس پھیلتے چلے گئے اور آج پاکستان بننے کے بعد فضلائے دیوبند کی برکت سے جابجا پاکستان میں قائم ہیں۔

الغرض ایک طرف تو دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دیدہ ور علماء اور مفکر فضلاء پیدا کر رہا تھا اور دوسری طرف ان علماء اور فضلائے دیوبند کے اندر حریت اور آزادیٔ ہند کے شعلے اندر ہی اندر بھڑکا رہا تھا۔ یہ حریت کے شعلے جو جہاد کی شکل میں مولانا محمد قاسم کے سینے میں بھڑک رہے تھے اور ان سے منتقل ہوکر ان کے شاگردوں کے سینوں میں جا بھڑکے۔ یہ ذاتی طور پر مولانا محمد قاسم صاحب سے ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے دلوں میں منتقل ہوئے، خاص طور پر مولانا محمود حسن اسیر مالٹا وغیرہ کے سینے میں اور پھر یہ آگ بن میں دوں کی طرح تمام علماء حریت پسند کے سینوں میں بھڑکی۔

انجمن ثمرۃ التربیت

چنانچہ سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی مالی اعانت اور ہر قسم کی امداد کے لیے متحد ہوکر مولانا کی خدمت میں درخواست پیش کی اور انھوں نے سفارش کے ساتھ دیوبند کی مجلس شوریٰ میں درخواست کی۔ مولانا محمد قاسم صاحب اور مجلس شوریٰ کے ارکان نے ان فضلاء دیوبند کی خدمات کی تحسین و آفرین کے لیے ان کی درخواست کو قبول فرمایا اور سالانہ چندہ دہندگان کی اس انجمن کا نام حضرت نانوتویؒ نے خود ثمرۃ التربیت اور ثمرۃ خلوص نیت قرار دیا۔ یہ درخواست ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں جن دارالعلوم کے فارغ طلباء نے دی تھی ان کے نام نامی حسب ذیل ہیں۔

۱. شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اسیر مالٹا
۲. مولانا احمد حسن صاحب امروہوی
۳. مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی۔
۴. مولانا عبدالحق صاحب پرقاضوی
۵. مولوی محمد فاضل صاحب ساکن پھلت
۶. مولوی میر محمد صادق صاحب مدراسی
۷. مولوی عبدالقادر صاحب دیوبندی
۸. مولوی فتح محمد صاحب تھانوی
۹. مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھوی

۱۰. مولانا محمد مراد صاحب ساکن پاک پٹن
۱۱. مولانا عبداللہ صاحب گرالیاری
۱۲. مولانا عبدالعلی صاحب عبداللہ پوری ضلع میرٹھ
۱۳. مولوی نہال احمد صاحب دیوبندی
۱۴. مولوی عبداللہ صاحب ساکن جلال آباد
۱۵. مولوی عبداللطیف صاحب سہسوری (ضلع بجنور)
۱۶ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب انبیٹھوی
۱۷. مولانا عبدالعدل صاحب پھلتی
۱۸ مولانا کوثر علی صاحب نگینوی
۱۹. مولانا کرامت اللہ صاحب دہلوی

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد از مولانا عبیداللہ سندھی)

یہ سب فضلائے دیوبند سالانہ چندہ ادا کرتے رہے اور دارالعلوم دیوبند کی اعانت میں سرگرم رہے، لیکن یہ سلسلہ جس طرح بھی چلتا رہا، چلتے چلتے ایک خاص مقام پر پہنچا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا ...... دور آیا اور آپ کے زمانے میں آپ کی کوشش سے ثمرۃ التربیت نے جمعیۃ الانصار کا روپ دھارا۔

رمضان ۱۳۲۷ھ میں جمعیۃ الانصار کا آغاز

حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے میبذی، کنزالدقائق اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ، مشکوٰۃ اور مقامات وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۱۲۹۱ھ میں صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں۔ فراغت کے بعد ۱۲۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے معین مدرس بنے۔ ۱۲۹۰ھ میں دستار بندی ہوئی، مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد ۳۰ روپیہ پر مدرس سوم، ملا محمود صاحب کی وفات کے بعد مدرس دوم اور مولانا سید احمد صاحب کے بعد مدرس اول، ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد ۱۳۲۵ھ میں بمشاہرہ چالیس روپے شیخ الہندؒ صدر مدرس قرار دیئے گئے۔ آپ کی صدارت کے دو سال بعد ۱۳۲۷ھ رمضان المبارک میں شیخ الہندؒ کی تحریک پر جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند قائم کی گئی۔ اس کے جنرل سیکرٹری، مولانا عبیداللہ صاحب سندھی بنائے گئے "جمعیۃ الانصار" کے مختلف شعبے قائم کیے گئے جن میں اعلیٰ فکر و نظر کی کتابوں کی تدریس، تبلیغ کا اعلیٰ پیمانے پر کام، ہندوستان کے مختلف شہروں میں عظیم الشان جلسے، فراغت علم کے بعد درجۂ تکمیل وغیرہ ایسے امور تھے، جن کے قواعد و ضوابط جو موتمر الانصار مراد آباد کی رپورٹ میں درج ہیں، ایسے محیط اور جامع ہیں، جو تمام دنیائے اسلام کو محیط ہو سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ الانصار کی پوری سکیم سے بظاہر تبلیغ و اشاعت دین معلوم ہوتی ہے، لیکن اس انجمن کے ذریعے خلافت عادلہ اور راشدہ کی تمہید قائم کی جا رہی ہے اور اس انجمن کے ذریعے پبلسٹی اور نشر و اشاعت کا جو انتظام قائم کیا گیا ہے، اس کے ذریعے مسلمانانِ ہند میں حریت اور انگریز کی حکومت کے خلاف ایسے حالات اور ایسی فضا پیدا کرنی ہے، جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی گئی ہوئی حکومت کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد مرتبہ مولانا عبیداللہ سندھی)

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے شیخ الہندؒ کے ایماء اور اکابر دیوبند کے مشوروں سے جو قواعد و ضوابط تعلیم و تدریس، تبلیغ و ارشاد، رشد و ہدایت اور تقریر و تحریر، پند و مواعظ، مناظرہ و مباحثہ کے مرتب کئے ہیں، اگر اس راہ پر آج پاکستان کے مدارس عربیہ مثلاً مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کا دارالعلوم، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا جامعہ عربیہ، لاہور کا جامعہ اشرفیہ، ملتان کا خیرالمدارس، ساہیوال کا جامعہ رشیدیہ، ٹنڈو اللہ یار کا مدرسہ متحدہ طور پر اپنا لیں تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ شیخ الہندؒ کی اس تنظیم پر عملدرآمد سے عربی علوم کے طلبہ میں ایک انقلاب انگیز ایسی حرکت پیدا ہو سکتی ہے جو پاکستان میں خلافت راشدہ اور حکومت عادلہ اور سیاست فاضلہ کے لیے بڑی آسانی سے راہ ہموار کر سکتی ہے

پھر آپ دیکھیں گے کہ دینِ مصطفوی کے شعلے کیسے سینوں میں بھڑکتے ہیں۔ اس کے لیے قدرت خود رجال کار پیدا کرے گی اور ایسے مجاہدین کی جماعت تیار ہوگی، جیسے حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ اور ان کے صلحاء رفقاء کار تھے۔
اس کے لیے قدرت کچھ خاص لوگ پیدا کرتی ہے، جیساکہ شیخ الہندؒ اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے اور ایسی ہستیاں خاص خاص ہوتی ہیں، یہ قدرتی طور پر ابھرتی ہیں اور بنتی ہیں۔ جیساکہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

محبت کی نہیں جاتی ہے، خود ہی آپ ہوتی ہے
یہ شعلہ خود بخود اٹھتا ہے، بھڑکایا نہیں جاتا
محبت کے لیے دنیا میں دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نحیف الجثہ، کمزور جسم، لاغر بدن لیکن بقول مولانا گنگوہیؒ علم کے کھلا تھے اور سیاست میں بے حد ماہر۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریز کو ملک سے باہر نکال کر اسلامی حکومت قائم کی جائے، جتنے طلبہ افغانستان، صوبۂ سرحد اور آزاد قبائل سے دارالعلوم دیوبند میں آتے، آغازِ درس سے ہی ان کو انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا سبق پڑھاتے، تاآنکہ جب مولانا عبیداللہ سندھی افغانستان پہنچ کر معلوم ہوا، بہرحال ثمرۃ التربیت سے جمعیۃ الانصار دیوبند تک اور مرحوم جمعیۃ الانصار سے نظارۃ المعارف دہلی تک کا پورے کا پورا منصوبہ حریتِ انقلاب کا تھا اور اسی کے ضمن میں ریشمی رومال کے ذریعے کابل سے حجاز کو مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے شیخ الہند کو خط لکھا تھا، یا اپنے کام کی رپورٹ۔

چونکہ ہماری یہ کتاب "حیاتِ عثمانی" علامہ شبیر احمد کی شخصیت سے متعلق ہے، اس لیے جمعیۃ الانصار میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ضمن میں جمعیۃ الانصار کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

جمعیۃ الانصار میں علامہ عثمانی کی شاندار خدمات

شہرتِ عام اور بقائے دوام

سعادت مند پیشانیاں کسی بلند شخصیت کی جھلک لوگوں کی آنکھوں کو اس طرح دکھا دیتی ہیں کہ اہلِ بصیرت کے لیے سب کچھ ان میں نظر آجاتا ہے، علامہ عثمانی رح عہدِ طلبِ علم میں ہی طلبہ اور مدرسین میں شہرت حاصل کرتے جا رہے تھے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے نکل کر ندوۃ العلماء تک ان کی لیاقت کا ذکر پہنچا اور غائبانہ سید سلیمان ندوی سے جو ندوہ میں زیرِ تعلیم تھے تعارف ہوا۔ دونوں میں نامہ و پیام ہوا اور تبادلۂ سلام و کلام ہونے لگا۔ جب علامہ عثمانی رح عہدِ طلبِ علم سے نکل کر فتح پوری کے مدرسے کے صدر مدرس بن کر دہلی پہنچے تو مرکز میں تقریروں کے سلسلے نے آپ کے نام کو باہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچایا۔ ابھی آپ دہلی میں ہی تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو بلایا اور ان کی آمد پر دیوبند کی فضاؤں میں انقلابی حرکت اور تعلیمی پروگرام میں ایک خاص تبدیلی رونما ہونے کے آثار ہوئے۔ شیخ الہندؒ کے اشاروں پر جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوئی، مولانا عثمانی اس کے سرگرم رکن رہے۔

جمعیۃ الانصار ۲۷ر رمضان ۱۳۲۷ھ

اس انجمن کی تشکیل کا پس منظر اور تاریخی خاکہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی موتمر الانصار مرادآباد کے جلسے ۱۵/۱۶/۱۰ر اپریل ۱۹۱۱ء کی رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"مدت سے اس قسم کے خیالات میرے اور دیگر تعلیم یافتگان مدرسہ میں سے ایک بڑی جماعت کے ذہن میں خطور کر رہے تھے، مگر ان کے اظہار کی نوبت بتاریخ

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ بعد عشاء آئی۔ جب استاذ
العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہ العالی نے مدرسہ
کی روز افزوں ضروریات تعلیمی و مالی حالت کی طرف
تعلیم یافتگان مدرسہ کو متوجہ کرنے کی ضرورت بیان فرمائی
رمضان کی ستائیسویں شب مقدس کو حضرت مولانا
مدظلہ العالی اور سرپرستان جمعیۃ نے اس مجلس کے انعقاد
کی اجازت دی اور بروز چہارشنبہ ۲۷ رمضان بوقت
۹ بجے بصدارت جناب مولانا محمود حسن صاحب سلمہ
افتتاحی جلسہ ہوا، جس میں قدیم طلبہ مدرسہ کی ایک معقول
تعداد شامل ہوئی۔ اول قاری حافظ محمد طیب سلمہ ابن مولانا
حافظ احمد صاحب نے سورہ صف کی خوش الحانی سے
تلاوت کی۔ اس کے بعد بندہ نے اپنے مربی علمی مدرسہ
عالیہ دیوبند کے حقوق اور انعقاد مجلس کی ضرورت پر مختصر
تقریر کی...... بندہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو استاذ العلماء
حضرت مولانا مدظلہم نے اس کی تائید میں ایک مفصل تقریر
فرماتے ہوئے، مجلس کی ضرورت ظاہر فرمائی اور یہ بھی
فرمایا کہ اب ضرورتیں ایسی پیش آرہی ہیں، جن کی وجہ
سے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس درمیان میں جناب
مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ (ابن حضرت
مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور مولانا مولوی
حبیب الرحمن صاحب مددگار مہتمم نے بھی تقریریں فرمائیں
اور معمولی بحث کے بعد مجلس کے انعقاد کی ضرورت باتفاق
رائے تسلیم کی گئی اور مجلس کا نام "الانصار" تجویز ہوا۔"
(رپورٹ ص۵۴/۵۵)

شوال ۱۳۳۰ھ کے القاسم میں مولانا سندھی جمعیۃ الانصار کے آغاز کے
متعلق لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس سے
منتشر پروانے شمع کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے اور
یہ جمعیۃ الانصار کی ابتداء ہے، جو ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ
مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو مدرسہ عالیہ میں منعقد ہوئی"
(القاسم ص۱۱)

ان تحریروں سے تشکیل انجمن کی پوری روداد سامنے آگئی جس میں
بتایا گیا ہے کہ اس قسم کی انجمن کو جنم دینے کے لیے عرصے سے دماغ میں خیالات
کی کھچڑی پک رہی تھی اور بالآخر وہ وجود میں آگئی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد
مرتب ہوئے، جو مذکورہ رپورٹ میں تفصیل سے درج ہیں۔ قواعد و ضوابط
اور قوانین ترتیب دیئے گئے اور اسی "الانصار" کے ماتحت چھ شعبے قائم
کئے گئے۔ یہ رپورٹ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں نے اس کے تمام
اطراف و جوانب پر غور کیا ہے اور راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس
انجمن کو پھر زندہ کر کے اس کی سکیم کو از سر نو چلایا جائے، جو چھ شعبے جمعیت
میں قائم کئے گئے ان کے متعلق دفعہ ۱۱ کے ماتحت مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے
ہیں: "جمعیۃ (الانصار) اپنے فرائض (یعنی مدرسے کی تعلیمی
انتظامی مالی ترقی) کی تعیین و تشخیص کے لیے ۵ شعبے قرار دیتی
ہے (الف) تکمیل التعلیم، (ب) نظام التعلیم (ج) الارشاد
(د) التالیف والاشاعت (ہ) جلسہ علیہ (روداد مؤتمر
الانصار مراد آباد ص۱۰)

یہ پانچ شعبے اپنے اندر انقلاب کی ہمہ گیر قوت کے حامل ہیں۔ اسی کے
قواعد و ضوابط کے ضمن میں آگے چل کر قاعدہ ۸ دفعہ ۱۰ میں رپورٹر لکھتے ہیں:
"جمعیۃ الانصار کا وہ جلسہ علیہ جس میں (الف) قرآن شریف
و حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوں (ب)
اصلاح عقائد و اخلاق و اعمال کے متعلق علمی مضامین

پڑھے جائیں (ج) مسلمانوں کی مذہبی علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر غور اور مدارس و مساجد کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث و مشورہ ہو۔

(د) ان تجاویز پر عمل کرنیکا تہیہ کیا جائے، موتمر الانصار کے نام سے موسوم ہوگا۔" (رپورٹ موتمر الانصار ص۱۲)

غرض یہ ہے کہ دارالعلوم میں ایک خاص حرکت پیدا ہوئی اور ۱۳۲۷ھ میں جب کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مدرسہ فتحپوری دہلی میں ملازم تھے، دارالعلوم میں انقلابی ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس اثنا میں علامہ دہلی سے جمعیۃ الانصار میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لائے، یہاں سے حضرت عثمانی کی شہرت میں مزید اضافہ شروع ہوا، کیونکہ آپ بھی "الانصار" کے ایک ممتاز ممبر بنائے گئے، مولانا عبید اللہ صاحب نے رپورٹ میں اس حقیقت کا نشان اس طرح دیا ہے، لکھتے ہیں:

"اور ایک مجلس خاص جو نصاب اور نظام مدرسہ اور طرز تعلیم کے بارے میں غور و فکر کرے۔ جمعیت الانصار کے ارکان ذیل سے مرکب کی گئی، مولانا مولوی ناظر حسن صاحب، مولانا مولوی مرتضٰی حسن صاحب، مولانا شاہ وارث حسن صاحب بنارسی، مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا مولوی حسین احمد صاحب مدنی، مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری، مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی، مولانا مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی، عبید اللہ ناظم جمعیۃ الانصار۔

(رپورٹ ص۵۵)

مذکورہ فہرست سے مولانا عثمانی کا انجمن انصار نیز اصلاح تعلیم کی کمیٹی میں ہونا صاف ظاہر ہے۔

جمعیۃ الانصار میں حضرت عثمانی کی شاندار خدمات۔

ابھی آپ دہلی کے مدرسے سے ہی وابستہ تھے کہ اصلاح تعلیم کی کمیٹی کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ نے ۱۱، ۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ کی میٹنگ میں شرکت فرمائی، اس میٹنگ میں جو بغرض اصلاح نصاب و طریقہ تعلیم و تعلم منعقد کی گئی تھی، نہ صرف کمیٹی کے مذکورہ بالا افراد شامل ہوئے بلکہ دیگر حضرات کو بھی مشورے کے لیے دعوت دی گئی۔ رپورٹ کے صفحہ ۵۶ پر اس کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں حسب ذیل حضرات کے دستخط ہیں، جنہوں نے اس میں شرکت کی۔

العبد

محمد ناظر حسن، صدیق احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود، محمد اشرف علی عفی عنہ، احمد حسن امروہی غفرلہ، خلیل احمد غفرلہ، محمود حسن عفی عنہ عبید اللہ، ابو محمد احمد عفی عنہ، عبدالمومن، محمد کفایت اللہ، خاکسار سراج احمد عفی عنہ، بندہ محمد امین عفی عنہ، محمد سہول عفی عنہ، حارث حسن عفی عنہ، عبدالصمد عفی عنہ، احقر الزمان گل محمد خان عفی عنہ، بندہ محمد مرتضٰی حسن عفی عنہ، کفایت اللہ گنگوہی، احقر الطلبہ حسین احمد غفرلہ، عبدالوحید عفی عنہ، محمد شدرۃ اللہ غفرلہ، عبدالرحمٰن کان اللہ لہ ولوالدیہ ولجمیع المؤمنین، احقر محمد انور عفی اللہ عنہ، بندہ محمد صمصام الدین عفی عنہ، عاشق الٰہی عفی عنہ میرٹھی، بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ دیوبندی، شبیر احمد عفی عنہ، حبیب الرحمٰن عفی عنہ احمد مہتمم مدرسہ دیوبند۔

ان اسمائے گرامی کی فہرست میں جو اس میٹنگ میں شریک ہوئے مولانا عثمانی کے بھی دستخط موجود ہیں، ۱۱۔ ۱۲ محرم سے گزر کر یہ جلسہ ۱۲ محرم تک گذر گیا اور بقیہ کارروائی عمل میں لائی گئی، ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو پھر جلسہ ہوا جس میں ابنائے قدیم بھی اور نواب محی الدین صاحب قاضی ریاست بھوپال، حاجی سعید صاحب اتالیق نواب مالیر کوٹلہ، سرپرست حضرات اور دستار بندی ہونے والے طلبہ شامل ہوئے، اس روز مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جنکو رپورٹ میں مجلس کا سرپرست لکھا گیا ہے، تقریر فرمائی اور یہی وہ مجلس ہے جس

میں حضرت عثمانی کو حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے خاص نوازش سے شرف بخشا، مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں :

"حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کی تصانیف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب سے فرمایا کہ مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اول مدرسہ فتحپوری دہلی کو چونکہ مولانا مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں آپ اس امر کا اعلان فرمادیں، مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا کی اس قدر افزائی کا اعلان فرمایا؛ اس کے بعد حضرت سلطان العلماء (مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند) مدظلہم سے اجازت لے کر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب کے سر پر رکھا. (رپورٹ ص۵۹)

دیوبند میں آمد

یہ عزت افزائی کا واقعہ ہندوستان کے چیدہ علماء کے سامنے ہوا۔ جس نے علامہ عثمانی کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیے، اس کے بعد ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو ایک اور میٹنگ ہوئی، جس میں جمعیۃ الانصار کے ۲۰ ارکان کے علاوہ حضرت شیخ الہند، مولانا مسعود صاحب گنگوہی صاحبزادہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری وغیرہم شریک ہوئے۔ اس میں بھی علامہ عثمانی شریک تھے، یہ سب مجالس اس زمانے میں ہوئیں جب کہ آپ کا تعلق ابھی دہلی سے تھا، لیکن اس کے بعد موصوف شوال ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے، کیونکہ ان حالات میں کسی نے بھی آپ کا دہلی رہنا پسند نہ فرمایا، وجہ یہ تھی کہ ان جیسے اہم کاموں کو انجام دینے کے لیے ایک قادر الکلام مقرر اور انشا پرداز کی ضرورت تھی اور وہ ان دونوں باتوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

شعبۂ تکمیل التعلیم کا افتتاح

بعد ازاں ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا۔ اب حضرت عثمانی دارالعلوم کے پروفیسر کی حیثیت سے دیوبند میں موجود ہیں، اس میں بھی آپ نے شرکت کی بلکہ اس کی رپورٹ خود مرتب کی۔ مولانا عبید اللہ صاحب رپورٹ میں لکھتے ہیں؛

"۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو عام جلسے میں درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا جس کی روداد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی معتمد جمعیۃ الانصار کی لکھی ہوئی درج کی جاتی ہے۔"

(رپورٹ ص۶۲)

یہ پوری کی پوری درجۂ تکمیل کی رپورٹ حضرت عثمانی کی تحریر کی ہوئی مؤتمر الانصار مراد آباد کی روداد میں درج ہے جس میں اس کلاس کا نصاب درج ہے اور یہ بھی کہ اس درجہ کے طلبہ کے لیے ادب، تاریخ، تفسیر، کلام وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کا مطالعہ، اردو عربی لٹریچر کی مہارت اور مناظرہ یا تدریس وغیرہ کی مشق کرنا واجبات میں سے قرار دیا گیا ہے؛ اس میٹنگ کے بعد ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ میں ایک مختصر سا اجلاس ہوا تھا، جس میں مختلف قواعد منظور کیے گئے۔

مؤتمر الانصار مراد آباد ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

مولانا عثمانی دارالعلوم میں فرائض تدریس کے ساتھ کہ جس میں آپ کئی کئی گھنٹے مختلف کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ جمعیۃ الانصار کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ گویا علمی، مذہبی، قومی، ملی اور وطنی تمام ہی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تا آنکہ الانصار کے ماتحت ہر سال میں کسی خاص شہر میں جلسوں کا کیا جانا بھی مقاصد میں آ گیا تھا، اس لیے شوال ۱۳۲۸ھ میں

مُراد آباد کے چند ذی وجاہت حضرات کی کمیٹی کی تحریک سے ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل کی تاریخیں موتمر الانصار کے لیے مقرر کی گئیں اور مُراد آباد میں ہی پہلا جلسہ ہونا طے پایا۔ اس جلسے میں علامہ عثمانی نے اپنا معرکہ آرا مضمون "اسلام" کے عنوان سے پڑھا۔ ناظم جمعیۃ الانصار موتمر کے رپورٹر رُوداد میں لکھتے ہیں :

"آٹھ بجے مولانا مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی کھڑے ہوئے اور اسلام کے عنوان پر اپنی تقریر شروع کی۔ یہ وُہ زبردست تقریر ہے کہ جس کی کوئی بات دلائل عقلیہ سے خالی نہیں تھا فلسفۂ وحکمت اور علم کلام کے ذریعے سے جو آج کل تعلیمیافتہ گروہ کا تختۂ مشق ہیں ان تمام اعتراضات کو اٹھایا گیا جس کی نسبت مولوی حالی نے عربی تعلیمیافتہ گروہ کو بے کار سمجھ کر اپنے مسدس میں کہا تھا کہ وُہ دلائل حقیقتِ اسلام اور ضرورتِ نبوت ورسالت کو بھی ثابت نہیں کر سکتے اور نہ اُن کے پاس اس کا ذخیرہ ہے۔"

(رپورٹ صفحہ ۳)

علامہ صاحب کا یہ مضمون ۱۵ اپریل کے تیسرے اجلاس میں صبح کے وقت آٹھ بجے پڑھا گیا اور دس بجے ختم ہوا۔ اس جلسے میں علیگڑھ، ندوہ، دیوبند کے اکابر اور اماظم رجال جمع ہوئے تھے، علامہ شبلی بھی موجود تھے۔ حضرتِ عثمانی کے اس مقالے کا سب پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور خواص طبقے میں، ان کی عظمت وشہرت نے اس مقالے سے ہی ملک میں شہرت حاصل کی۔ آپ کی تقریر کے اثر کا نقشہ مولانا عبید اللہ صاحب رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں :

"اکابر علما نے اس تقریر کو جس ذوق وشوق سے سُنا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت مولانا محمد اشرف علی صاحب نے اپنا وعظ شروع کیا، تمہید ارشاد فرمائی کہ جو دلائل عقلیہ وجودِ صانع حقیقی اور ضرورتِ نبوت ورسالت پر مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان فرمائے ہیں میں اب ان سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا اشرف علی صاحب کا یہ فرمانا اگرچہ انکسار پر مبنی تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے جس خوبی اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ یہ تقریر فرمائی وہ تمام اہل علم حضرات کے دل پر نقش کالحجر ہو گئی۔ دس بجے یہ تقریر ختم ہوئی اور تمام حاضرین جلسہ نے مولوی شبیر احمد صاحب کی درازیٔ عمر کے واسطے دُعا کی۔" (صفحہ ۱۱)

موتمر الانصار کا یہ اجلاس مولانا عثمانی کی زندگی کو چمکانے کا سبب بن گیا۔ ملک کے زبردست اور جید علما، لیڈر، رؤسا اور عوام سے تعارف کا موقع ملا اور ہندوستان میں شہرت کا ذریعہ بنا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔

چوتھے اجلاس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ایک خصوصی اہل علم کا اجلاس ہوا جس میں علامہ عثمانی نے تقریر فرمائی۔ رپورٹر لکھتے ہیں :

"بعد نماز عصر مولوی شبیر احمد صاحب کا وعظ وجود وجوب اور خود اور بحث خلق افعال وغیرہ سے متعلق بالکل فلسفیانہ رنگ میں ہوا، جو مخصوص اہل علم کے لیے تھا، اور انھوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کو سُنا۔"

(رپورٹ صفحہ ۱۳)

اس تقریر سے اندازہ لگائیے کہ اتنے بڑے بڑے علما میں ایک چوبیس سالہ نوجوان عالم ایک خالص علمی اور فلسفیانہ تقریر کر کے اکابر سے داد لیاقت لے رہا ہے۔

کراچی میں علامہ عثمانی کا آریوں سے مناظرہ

موتمر الانصار مُراد آباد کے بعد علامہ آریوں سے مناظرے کے لیے

ریف لے گئے۔ القاسم شوال ۱۳۲۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اس مناظرے کی کارروائی کا حسب ذیل عبارت میں اظہار کیا گیا ہے۔

مدیر القاسم لکھتے ہیں:

"کراچی میں آریہ جماعت کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور اس میں اہل اسلام سے مناظرے کی قرارداد ہوگئی، تب انجمن ضیاء الاسلام کراچی کی جانب سے مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی عثمانی مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی طلب میں تار آیا چنانچہ مولوی صاحب موصوف ۲۲ رمضان کو کراچی روانہ ہوئے اور وہاں بحمد اللہ مولوی صاحب کے نہایت مؤثر بیانات ہوتے جو بہت ہی دلچسپی سے سُنے گئے۔ اور اہل کراچی پر ان بیانات کا گہرا اثر پڑا اور مولوی صاحب ہی کی موجودگی میں جمعیۃ الانصار کی شاخ قاسم المعارف کا باضابطہ انعقاد و افتتاح ہوا۔ ۲۸ رمضان ۱۳۲۹ھ کو عین تراویح کے وقت سیکرٹری صاحب انجمن ضیاء الاسلام کا تار بدیں مضمون موصول ہوا کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی حاصل کی اور آج کی میل میں روانہ دیوبند ہوگئے۔ ۳۰ رمضان کو دس بجے دن کے مولوی صاحب موصوف بخیریت تمام دیوبند پہنچے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

(القاسم شوال ۱۳۲۹ھ ص۵)

آپ کی شہرت کے نتیجے میں اہل کراچی نے آپ ہی کو مناظرے کے لیے منتخب کیا، حالانکہ رمضان مبارک کا مہینہ تھا۔ لیکن اس مشقت کو برداشت کیا اور روزہ برابر سفر میں رہے۔ اسی بشارت سے ظاہر ہے کہ آپ کی وجہ سے وہاں جمعیۃ الانصار کی شاخ قاسم المعارف قائم ہوئی

موتمر الانصار میرٹھ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء/۱۰ اپریل

مراد آباد کے جلسے سے ٹھیک ایک سال بعد جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ میرٹھ میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۶، ۷، ۸ اپریل ۱۹۱۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے کی کارروائی مولانا سراج احمد صاحب نائب ناظم جمعیۃ الانصار و نائب مدیر نے رسالہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ میں شائع کی ہے۔ یہ جلسہ تین دن رہا اور کُل ۵ نشستوں میں ختم ہوا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جلسے کے صدر تھے، لیکن مولانا احمد حسن صاحب کا اس سے پہلے ہی ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہو چکا تھا جنھوں نے مُراد آباد کے موتمر الانصار کی صدارت بھی فرمائی تھی اور تقریر بھی کی۔ آپ کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی دُوسرے اجلاس میں تقریریں ہوئیں ۱۸ ربیع الثانی بروز اتوار تیسرے اجلاس میں مولانا عثمانی کی تقریر ہوئی، مولانا سراج احمد صاحب نائب مدیر لکھتے ہیں:

"مولوی قاری محمد شفیع بڑھانوی کی تلاوت کلام مجید سے آغاز جلسہ ہوا۔ آپ نے قرأت سبعہ میں قرآن شریف پڑھا۔ پھر مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب امام جامع مسجد کلکتہ نے عربی لہجہ میں اور پھر چند طلباء نے دارالعلوم دیوبند نے مختلف قرأتوں میں کلام مجید پڑھا۔ جس سے اہل جلسہ پر ایک خاص اثر اور وارفتگی کا عالم تھا۔ اس کے بعد جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی مدرس دارالعلوم دیوبند نے اپنی وہ تقریر شروع کی جس کا عنوان الدار الآخرۃ ہے۔ عنوان بتلا رہا ہے کہ مضمون کیسا کچھ دقیق ہوگا۔ ادھر مولانا کا طرز تحریر و تقریر فلسفیانہ، مشکل تھا کہ عوام اس مضمون سے متمتع ہوتے، مگر جہاں مولانا کی تقریر فلسفیانہ ہے، وہاں خدائے تعالیٰ کے فضل سے طرز ادا ایسی عام فہم ہے کہ اس کی نظیر دُوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ نے دار آخرت کے ثبوت اور ضرورت پر کیں

بحث فرمائی اور درمیان میں بضرورت اثبات مدعا ابطال تناسخ پر متعدد دلائل قائم کئے۔ آپ کی تقریر سے موتمر الانصار اور دارالعلوم دیوبند کی ایک خاص شان ہویدا تھی اور سامعین محو حیرت تھے، اس کے بعد حضرت طبیب اُمت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کا وعظ شروع ہوا.... وعظ شروع کرنے سے قبل مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو اپنے برابر کھڑا کیا اور فرمایا: میں اپنے چھوٹوں کو بھی بڑا سمجھتا ہوں، اگر میرا کوئی معتقد نہ مانے تو وہ جانے، میں تو یہی خیال کرتا ہوں، یہ مولوی شبیر احمد صاحب جن کی تقریر آپ نے سنی ہے، میرے چھوٹے ہیں، مگر میں ان کو بڑا سمجھتا ہوں، ان کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ سب کچھ کریں گے، اب ہم کو موت کا ڈر نہیں رہا ہے، کیونکہ ہماری جماعت میں کام کے آدمی پیدا ہوتے جاتے ہیں، بعدہٗ مولانا نے دُعا کی، بعدہٗ خطبۂ ماثورہ پڑھ کر وعظ شروع کیا کہ میرا یہ بیان گویا مولوی شبیر احمد کی تقریر کا تتمہ ہے۔"

(القاسم دیوبند جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ ص ۲۹/۳۰)

جمعیۃ الانصار کے سالانہ اجلاس میرٹھ صدر میں بھی علامہ موجود ہیں اور ان کے مقالے کا جو اثر علماء و خواص عوام اور بالخصوص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب پر ہوا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ حضرت عثمانی کی یہ بڑی سعادت ہے کہ وہ ہر جلسے میں مولانا تھانوی سے داد اور دُعا وصول کر رہے ہیں اور خواص و عوام میں مقبول ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ مقالہ رسالہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ اور القاسم ماہ رجب ۱۳۳۰ھ کے صفحات پر دو قسطوں میں شائع ہوا ہے اور جس کے بعض اقتباسات ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کیے ہیں:

ان جلسوں میں بعض اکابر کو جیسا کہ رجب تا مولانا عثمانی کو سراہا گیا ہے، اشاروں و مدارس موتمر میں اور القاسم میں کسی اور کو نہیں سراہا گیا۔ ہر جلسے میں ان ہی کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدیر القاسم نے آپ کے اس مقالے کے اول میں ناظرین القاسم سے مقالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

"مضمون ذیل عزیزم مولوی شبیر احمد سلمہٗ نے اجلاس موتمر الانصار میرٹھ میں پڑھا تھا اور چونکہ یہ ایک مفید اور کارآمد مضمون ہے اور بعض بہی خواہان قوم کا تقاضا بھی ہے اس لیے القاسم میں اس کا درج کرنا قرین مصلحت معلوم ہوا۔"

(مدیر) القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ ص ۹)

علامہ نے یہ مقالہ جلسے سے تین روز پہلے لکھا تھا۔ چنانچہ اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"ہمارے محترم بزرگ مولانا عبیداللہ ناظم جمعیۃ الانصار جنہوں نے کسی نامعلوم مصلحت اور حسن ظن کی بنا پر یہ عنوان میرے سپرد کیا ہے، اس کے گواہ ہیں کہ میں نے اس مضمون کے لکھنے سے کس وقت تک اور کس حد تک پہلو تہی کی ہے لیکن آخر مولائے موصوف کے تقاضے میرے تکاسل اور تقاعد پر غالب آئے اور جلسے سے ۳ روز پہلے بنام خدا یہ تحریر لکھنا شروع کی:"

بہرحال ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان تاریخی جواہر پاروں کو میں ترتیب کے ساتھ جوڑ رہا ہوں کہ قارئین کو موصوف کے کارناموں اور مذہبی علمی، دینی اور قومی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

جمعیۃ الانصار کا علمی جلسہ شملے میں ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء

جس طرح مُراد آباد اور میرٹھ کے حضرات کی خواہشات اور کوششوں

ان دونوں مقامات پر جمعیۃ الانصار کے جلسے منعقد ہوئے۔ اسی طرح اہلِ شملہ کی خواہشات پر جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ ۹، ۱۰، ۱۱ راگست ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۱ھ شعبان میں منعقد ہوا۔ مولانا منظہر الدین شیرکوٹی شہید سفیر جمعیۃ الانصار کی شملہ میں تقریریں ہوئیں اور ان ہی کی مساعی سے علمائے دیوبند وہاں پہنچے۔ ۸ راگست کو شملہ کے اسٹیشن پر وفد علمائے دیوبند کا اتنا زبردست استقبال ہوا کہ اس سے پہلے ایسا شاندار استقبال کسی کا نہ ہوا تھا۔ شملہ اسٹیشن بھرا ہوا تھا کر دو بجکر دو منٹ پر کلکتہ میل اسٹیشن پر پہنچی۔ یہ وفد اُتر کر میرزا دلحسین صاحب رئیس شملہ کے یہاں ٹھیرا۔ سالارِ وفد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تھے۔ آپ کی گاڑی کو آدمیوں نے کھینچنا چاہا، لیکن آپ نے منع فرمایا

اس جلسے میں چھ اجلاس ہوئے، پہلا اجلاس بعد نماز جمعہ ۹ راگست کو دو بجے سے ۵ بجے تک ہوا، پہلے خان بہادر کرنل عبدالمجید خاں نے دارالعلوم دیوبند کے برکات اور خدمات پر تقریر فرمائی۔ اس جلسے میں اتفاق سے شیخ الاسلام افغانستان بھی موجود تھے، جو دیوبند کے فاضل تھے۔ بعد ازاں حکیم الامت نے تقریر فرمائی، جس نے لوگوں پر جادو کا کام کیا۔ دوسرے اجلاس میں مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے قرآن شریف کے اعجاز اور عربی زبان کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ تیسرے اجلاس میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعظ فرمایا اور ان کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے معجزات کی بحث پر ایک زبردست مدلل تقریر فرمائی چوتھے اجلاس میں مولانا محمد سہول صاحب نے علم کے فضائل اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے تعلیم نسواں پر تقریر فرمائی۔ پانچویں اجلاس میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ بعدہٗ مولانا تھانوی نے "تکمیل فلاح دارین کے وسائل" پر وعظ فرمایا۔

عبدالقادر صاحب جن کی مذکورہ بالا رپورٹ القاسم رمضان ۱۳۳۰ھ میں چھپی ہے، وہ اپنی اسی رپورٹ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہ پانچواں اجلاس آخری تھا اور اس کے بعد کوئی وقت پروگرام میں نہیں دیا گیا تھا، لیکن سامعین کے بے حد اصرار پر مولانا منظہر الدین صاحب نے ساڑھے نو بجے شب کے جلسے کا اعلان کیا، جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ پر نہایت پُرمغز اور مؤثر تقریر فرمائی۔ آپ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عقلاً و نقلاً اگر کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے" (القاسم رمضان ۱۳۳۰ھ ص۳)

یہ جلسہ نہایت ہی عظمت اور کامیابی سے ختم ہوا اور علمائے دیوبند ۱۲ راگست کو شملے سے دیوبند واپس ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان اجلاسوں میں بعض حضرات کی اگرچہ دو دو تقریریں ہوئیں، لیکن پانچویں اجلاس پر پروگرام ختم ہو جانے کے باوجود اہلِ شملہ نے جس فاضل کی تقریر کے لیے دوبارہ پوری تمنا اور خواہش سے اصرار کیا وہ علامہ عثمانی تھے، یہاں مجھے پھر یہ اطلاع دینی ہے کہ علامہ اس جلسے میں بھی برابر شریک ہیں اور لسانی جہاد میں مصروف ہیں اور وہ کسی جلسے سے بھی پیچھے نہیں رہے، جس سے ان کی سرگرمیاں اور محنت پسندیاں مترشح ہوتی ہیں۔

شملہ میں جمعیۃ الانصار کا ایک اور جلسہ

جمعیۃ الانصار کا یہ جلسہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ رشعبان ۱۳۳۲ھ مطابق ار ۲، ۳ راگست ۱۹۱۴ء کو پھر دوبارہ اہلِ شملہ کی خواہش پر شملہ میں منعقد ہوا۔ اس وفد میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا منظہر الدین صاحب تھے۔ پہلا اجلاس یکم اگست کو بعد نماز جمعہ ہوا۔ دوسرا اجلاس رات کو جس میں مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبدالسمیع صاحب نے تقریریں کیں۔ تیسرا اجلاس ہفتے کو ۲ بجے ہوا، اس میں علامہ عثمانیؒ کی تقریر ہوئی۔ اس جلسے کے رپورٹر عبدالقادر صاحب نائب منیجر آرمی پریس شملہ تحریر فرماتے ہیں:

"فصیح البیان مولانا شبیر احمد صاحب کا برکات رمضان شریف پر وعظ شروع ہوا، آپ کی تقریر نہایت دلفریب تھی اور ہر ہر جملے سے فصاحت ٹپکتی تھی، علمی نکات کا ذہن نشین کرنا آپ کا حصہ تھا۔ ۲ر اگست کے جلسے میں پہلے مولانا عبدالسمیع صاحب نے وعظ فرمایا اور بعد کو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے "حدوث عالم" پر اپنی مدلل تقریر شروع کی۔ اگرچہ مضمون فلسفی اور نہایت خشک تھا، مگر آپ کی صاف بیانی نے مجمع پر وہ جادو کیا کہ سب محوِ حیرت تھے، زورِ کلام سے سامعین نقشِ تصویر کی طرح خاموش تھے، کہیں کہیں آپ کی تمثیلیں اس غضب کی تھیں کہ لوگ پھڑک اٹھتے تھے۔ الحمد للہ کہ یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا لیکن سامعین کا شوق پورا نہ ہوا، چنانچہ نو تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے یہ درخواست کی گئی کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تقریر ہمارے تنزل اور ترقی کے اسباب پر آج بعد مغرب فرمائیں، مولانا نے اس کو منظور بھی فرمایا لیکن بعد میں خیال آیا کہ آج ۲۹ر شعبان ہے اور چاند ہونے کا احتمال ہے، اس لیے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور اگلے روز مسلمانانِ شملہ کو حضرات دیوبند سراپا حسرت و ارمان بنا کر رخصت ہو گئے۔"

عبدالستار تائب

منیجر آرمی پریس شملہ

تائب صاحب کی رپورٹ آپ کے سامنے ہے۔ اس سال کے جلسۃ الانصار میں بھی علامہ اپنی پوری شان امتیازی سے شریک رہے ہیں۔ آپ کی دو تقریریں ہو چکنے کے باوجود اہل شملہ نے آپ سے ایک اور تقریر کرنے کی خواہش کی ہے۔ یہ بار بار کی فرمائشیں آپ کے علم، تقریر کی بلند پروازی اور دل ربائی کے نشانات بتلا رہی ہیں، لیکن اس وفد میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نظر نہیں آ رہے ہیں، خدا خیر کرے کہیں جمعیۃ الانصار نظرِ بد کا شکار ہوتی تو نظر نہیں آتی۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ تاہم ان شاء اللہ ابھی ظہور میں آیا جاتا ہے۔ اس راز سے پردہ اٹھانے سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ ملازم کے حالات کے سلسلے میں ترتیب وار بعض ذاتی سوانح اور بھی بیان کرنے تھے کہ موتمر الانصار کے سن ۱۹۱۰ء کے حالات کا سلسلہ توڑنا پسند نہ آیا اور وہ بعض حالات رہ گئے، جنکو ۱۳۲۸ھ کے ماتحت پیش کیا جانا تھا، کیونکہ جمعیۃ الانصار کے ساتھ مولانا عثمانی کی بقیہ کوششوں کو آخری حد تک بیان کرنے کی ضرورت پیش نظر ہے۔ اس لیے اسے ختم کریں تو آگے بڑھیں، ہاں تو شملہ کے اس آخری جلسے میں ناظم جمعیۃ الانصار برات کے دولہا، مولانا عبیداللہ غائب ہیں اور پھر پورا سال ہو چکا، کوئی میٹنگ، کوئی موتمر الانصار اور کوئی اس کی کارروائی نہ القاسم میں اور نہ روئداد میں نظر آئی۔ اتنی شورا شوری اور یا یاں بے نمکی پر شبہات کا ہونا اور وسوسوں کا گزرنا لازمی امر ہے، آخر برات کا دولہا کہاں غائب ہوا۔ بالآخر ان کا پتہ چلا کہ دہلی میں موجود ہیں اور دیوبند سے

؎ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مولانا سندھی کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

دیوبند سے مولانا سندھیؒ دہلی چلے گئے، آپکا ایک بیان اخبار الجمعیۃ دہلی میں شائع ہوا تھا اور پھر رسالہ قائد مرادآباد کے ربیع الاول کے پرچے میں نکلا یہ بیان آپ نے ہندوستان کی طویل جلاوطنی سے واپسی کے بعد دیا تھا، جو حسب ذیل ہے:

"۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا، چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی

اور مولانا ابو محمد احمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے، پھر حضرت شیخ الہند کے اشارہ سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی، اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقارالملک ایک ہی طرح شریک تھے۔

حضرت شیخ الہند نے اس طرح ۴ سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا، اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان میں پہنچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے، انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا، مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندے تھے، اس کی ۵۰ سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیلِ حکم کے لیے تیار ہے اس میں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔"

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مولانا عبیداللہ سندھی دہلی چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں اور انقلاب و سیاست کا دھارا دوسری طرف کو بہنے لگا۔ جمعیۃ الانصار کی بجائے اب "نظارۃ المعارف" کی بنیاد ڈالی گئی مگر یہ انجمن سازیاں، یہ جمعیۃ الانصار کے جلسے، یہ ملک میں مذہبی بیداری کی روح نہیں بلکہ سوز کیوں پھونکا جا رہا ہے۔ اس کی کیفیت حکومت برطانیہ کی رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے سنئے "کمیٹی لکھتی ہے۔

ریشمی خطوط کی سازش یا تحریک

"اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے، اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے ۳ رفقاء فتح محمد اور محمد علی وغیرہ کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا، عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی، وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا ۔۔۔ وہ مولانا محمود حسن تھا

جو بنگال میں ہیبت وریک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے، عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدراہ ہوئے، انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔"

رولٹ ایکٹ کا تجزیہ

رولٹ ایکٹ کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبیداللہ اس انقلاب کے بانی تھے، یہ غلط ہے، بلکہ خود مولانا عبیداللہ صاحب کا بیان کہ شیخ الہندؒ نے مجھے ۱۳۲۷ھ میں دیوبند کام کرنے کے لیے بلایا تھا۔ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ کی تغلیط کرتا ہے، کمیٹی کا یہ خیال بھی غلط ہے، کہ مولانا عبیداللہ کو برخاست کیا گیا بلکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ تھے، ہاں دیوبند کے فاضل اور شیخ الہندؒ کے جاں نثار اور معتمد ہونے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور محرک شیخ الہندؒ تھے، چنانچہ مولانا سندھی کو جب کابل بھیجا گیا ہے، تو انھیں اپنے پروگرام کا خود پتہ نہ تھا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچ گئے، تو پھر ان کے سامنے وہ تمام سکیم آگئی، جو شیخ الہندؒ چلانا چاہتے تھے۔

شیخ الہندؒ کی سکیم

رولٹ ایکٹ کمیٹی کا یہ بیان درست ہے کہ شیخ الہندؒ ہندوستان سے حکومت برطانیہ کا بستر گول کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے قبائلی علاقے کے پٹھانوں، کابل، ایران اور ترکی حکومت میں اتحاد پیدا کر کے ان کے تعاون سے انگریزوں کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، اسی سلسلے میں شیخ الہندؒ ۱۹۱۹ء/۱۳۳۳ھ میں حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں مکہ معظمہ کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملے اور تمام سکیم سے ان کو آگاہ کیا اور ان کی وساطت سے انور پاشا اور جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں جب کہ وہ بعض جنگی ضروریات کے باعث اتفاقاً وہاں آئے تھے...... ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے بھی شیخ کی تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ شیخ الہندؒ خود ترکستان ایران اور کابل کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچیں لیکن ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ کرنل لارنس نے شریف حسین والی مکہ معظمہ کو ہموار کر لیا۔ حجاز میں اس وقت ترکی اقتدار تھا لیکن شریف حسین نے ترکوں سے غداری کی اور اس طرح انگریزی اقتدار نے حجاز میں پاؤں جمائے اور ترکوں کی حکومت حجاز سے ختم ہو گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ حجاز سے باہر نکلنے کی کوشش میں ناکام رہے اور بالآخر حکومت برطانیہ کے اشارے پر شریف مکہ نے ان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا — تفصیلات کے لیے حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ "اسیر مالٹا اور مسلمانوں کا روشن مستقبل" اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "حیات شیخ الہندؒ" ملاحظہ فرمائیے۔ بالآخر شیخ الہندؒ کو انگریزوں نے مالٹا میں اسیر کر دیا اور آپ ۵ سال تک نظر بند رہ کر پھر دیوبند تشریف لائے، اس تحریک کے ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ آزادی ہند کے پہلے علمبردار شیخ الہندؒ جن کے بنیادی تصورات پر، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاریؒ حکیم اجمل خانؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ نے آزادیٔ ہند کی تعمیر بلند کی

جمعیۃ الانصار کا انجام

جمعیۃ الانصار نے علمائے دیوبند کے ذریعے ہندوستان کے علمی لیڈروں، علماء اور معتقد طبقے میں ایک جوش برپا کر دیا، یہی وہ زینہ تھا جس کے ذریعے شیخ الہندؒ بام آزادی پر چڑھنا چاہتے تھے، چنانچہ جمعیۃ الانصار کے چند جلسوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ان جلسوں کے ضمن میں مختلف ریزولیشنوں کے ذریعے گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کا اظہار اور اس کے زیر سایہ مذہبی آزادی کے شکریے کے تار بھیجے گئے، جیسا کہ روداد

نظارۃ الانصار اور روئداد جلسہ ہائے شملہ کی تجویزوں میں یہ چیزیں موجود ہیں لیکن گورنمنٹ برطانیہ ان جلسوں سے چوکنی ضرور تھی، وہ جانتی تھی کہ اس مدرسے کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب انگریزی حکومت کے سخت مخالفین میں سے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی میں اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر جہاد کیا تھا اور ان ہی کے نقشِ قدم پر شیخ الہند چل رہے تھے، چنانچہ کہ مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جب آپ کو قاہرہ لے جایا گیا اور وہاں شیخ الہندؒ سے سوال و جواب کیے گئے۔ تو ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا:

سوال (انگریز افسر): مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟

جواب (شیخ الہندؒ): مدرسہ کے مفاد کے لیے۔

سوال: پھر علیحدہ کیوں کیا گیا؟

جواب: آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال: کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر تھا؟

جواب: نہیں۔

بہرحال جمعیۃ الانصار سے حکومت کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ یہ معاملات آگے بڑھ رہے تھے کہ مہتمم صاحبان نے بڑھتی ہوئی سیاسی کارروائیوں کی مخالفت تو نہیں کی، لیکن مدرسہ کے بچاؤ کے لیے یہ ضرور چاہا کہ مدرسہ مسلمانوں کی متاعِ عزیز ہے۔ اگر یہ بند ہو گیا تو پھر مسلمانوں میں دینی تعلیم پھیلانے کا سرچشمہ بند ہو جائے گا، اس لیے مدرسے کے اندر اس راہ سے آزادی کی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ضرورت تھی، شیخ الہندؒ بھی غلط راہ پر نہ تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ استاذِ محترم مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد دیوبند کے مدرسے سے جہاں تعلیمِ دین کی اشاعت تھا، وہاں حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی جیسے لوگوں کے جذبۂ جہاد اور روحِ حریت کو برقرار رکھنا بھی تھا، اس لیے مہتمم صاحبان کے نزدیک مدرسے کی حفاظت اور شیخ الہندؒ کے نزدیک دین کے ساتھ جذبۂ جہاد و آزادی کی روحانیت کے برقرار رکھنے میں ایک گونہ نظریاتی اختلاف پیدا ہونا لازمی بات تھی، شیخ الہندؒ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو دیوبند سے دہلی بھیج دیا اور جمعیۃ الانصار کو "نظارۃ المعارف" میں تبدیل کر دیا۔ اس صورتِ حال کو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان نے مولانا عبید اللہ اور ان کے ساتھیوں کو دیوبند کی ملازمت سے برخاست کر دینے کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

مسلمانوں کا جمعیۃ الانصار سے تعلق

جمعیۃ الانصار کے جلسوں سے مسلمانوں میں عام بیداری اور اسلامی جوش پیدا ہو چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ دیوبند سے جا چکے تھے، جلسے بھی رفتہ رفتہ بند ہو گئے تھے، شملے کے بعد جمعیۃ الانصار کا کوئی جلسہ نہ ہوا۔ یہ آخری جلسہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی ایک تعداد نے دیوبند خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ جمعیۃ الانصار کے جلسے کیوں نہیں ہوتے، مسلمانانِ ہندوستان کی طرف سے یہ استفسار یقیناً درست تھا، لیکن ذمہ دارانِ دارالعلوم نے اس کا کیا جواب دیا، اس کی حقیقت کا پتہ چلانا ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے دارالعلوم دیوبند کے رسالے "القاسم" کے پرچوں سے زیادہ اور کوئی چیز رہبری نہیں کر سکتی، چنانچہ تجسس اور ریسرچ سے ہمیں استاذِ محترم مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کا ایک مضمون مل گیا۔ جو اس وقت جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم اور القاسم کے نائب مدیر اور دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے تھے لکھتے ہیں:

"مدت سے القاسم کے صفحات جمعیۃ الانصار کے تذکرہ سے خالی ہیں، عرصے سے اس کا کوئی کارنامہ مسلمانوں کے روبرو پیش نہیں ہوا، سالِ گزشتہ میں جو نظارۃ الانصار کا اجلاس کہیں منعقد نہ ہونے سے بہت سے دردمندوں کو اس کے وجود میں وساوس پیدا ہونے لگے۔ اس پر جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی جمعیت سے علیحدگی ان وساوس کی

پیدائش کا کہا جاتا ہے کہ اچھا خاصہ ذریعہ بن گئی۔ یہاں سے علیحدگی کے بعد مولوی عبیداللہ صاحب کے دہلی میں اپنی نئی انجمن قائم کرنے سے اور دو غلط فہمیوں کا فتح باب ہوا۔ کسی کو کہیں سے یہ خبر ملی کہ جمعیۃ الانصار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بجائے دہلی میں نظارۃ المعارف قائم ہو گئی۔ کسی کو یہ اطلاع پہنچی کہ نظارہ جمعیت کا ایک شعبہ ہے، جو بعض مصالح کی بنا پر دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔ بعض احباب نے بزرگان دیوبند سے مل کر زبانی طمانیت حاصل کر لی اور بعض دوستوں نے مراسلات کے ذریعے سے واقعہ کی اصلیت معلوم کی، مگر عام مسلمانوں کو رفع غلط فہمی کا کوئی موقع نہیں ملا، ادھر استفسارات بھی زائد ہیں مصلحت ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

جمعیۃ الانصار خدا کے فضل سے زندہ ہے سال گزشتہ میں چونکہ جنگ بلقان کی وجہ سے ترک مظلوموں کی امداد کی طرف عامۂ مسلمین متوجہ تھے، ہر شہر، قصبہ اور اکثر دیہات میں ہلال احمر کی انجمنیں قائم تھیں وفود جا بجا پھرتے تھے اور خود دارالعلوم دیوبند اور اس کی جماعت کے اجزا اس کار خیر کے لیے وقف تھے، اس لیے قرین مصلحت نہ تھا کہ عامۂ مسلمین کو دوسرے کسی خیال کی طرف متوجہ کیا جائے اور درحقیقت جو حضرات موتمر الانصار کے کارکن ہوتے۔ ان کو اتنی فرصت کہاں تھی اور مظلوم ترکوں کی مرثیہ خوانی کے سوا کوئی دوسرا خیال کب ان کے دلوں میں خطور کر سکتا تھا، چنانچہ چند اخباروں میں موتمر الانصار کے جلسہ نہ ہونے کا موجب اعلان کر دیا گیا تھا۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی آمدنی ایک مدت تک بند رہی اور جمعیت کے سفرا کے روزنامچوں اور رسیدوں میں بجائے رقوم ہندسوں کے صفر رہ گیا۔ بد قسمتی سے اسی پُر آشوب زمانے میں جناب مولوی عبیداللہ صاحب جمعیت کی نظامت سے علیحدہ ہوئے اور نہ صرف نظامت سے علیحدہ بلکہ اپنی جماعت سے مفارقت گوارا فرما کر اور ایسے نازک وقت میں جمعیۃ کو زیر بار چھوڑ کر دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کر لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

جمعیت کے اراکین مجلس انتظامیہ نے اپنا جلسہ منعقد کیا اور بعد گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا کہ جمعیت دارالعلوم کی فرع (شاخ) ہے اور اصل کی بقا کے بغیر فرع باقی رہ سکتی ہے۔ نیز دارالعلوم کی مالی امداد کرنا جمعیت کا اوّلین فرض ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ طمطراق اور ناظم صاحب کی اولوالعزمیوں سے قطع نظر کر کے ان تجاویز پر عمل پیرا ہونا چاہئیے، جیسے دارالعلوم اپنی امتیازی شان کے ساتھ اپنے مالی نقصانات کی جبر و مکافات کر سکے اور جمعیت کا وجود باقی ہے چنانچہ اراکین انتظامیہ اور قائم مقام ناظم نے حضرات سرپرستان جمعیت کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ ہم خدام دارالعلوم چاہتے ہیں کہ ہم کو برائے چندے تعلیمی خدمات سے سبکدوش فرمایا جائے کہ ہم اپنا وفد لے کر چند مقامات کا سفر کریں اور دارالعلوم کے نقصانات کی کچھ مکافات کر سکیں، چونکہ زمانۂ امتحان سالانہ قریب تھا، اس لیے سب کو تو اجازت نہ مل سکی، مگر جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب، مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا مولوی عبدالسمیع صاحب، مولانا مولوی مظہر الدین صاحب اور قائم مقام ناظم (یعنی راقم الحروف مولانا سراج احمد صاحب اس خدمت پر مامور ہوئے

ہم نے اس زمانے میں موتمر کا جلسہ منعقد نہیں کیا۔ کسی گریجویٹ کو وظیفہ نہیں دیا۔ کوئی دھوم دھام کا کام ہم سے نہ ہو سکا۔ مگر ہم سے جو کچھ ہو سکا، اس کو ہم جمعیت کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھتے ہیں اور ہم خدام کی نیت کس درجے میں بارگاہ حضرت رب العزت

میں قبول ہوگئی، تو پھر سب کچھ پالیا

علمی مجالس کا انعقاد جمعیت کی مفید اور نمایاں متاع رہتے ہیں۔

ہم نے تا مقدور اس کو ترک نہیں کیا، میرٹھ اور شملہ و خورجہ وغیرہ میں متعدد جلسے نہایت مفید ثابت ہوئے، کسی اہل کار کی علٰحدگی یا عزل سے کیا کوئی محکمہ کوئی سررشتہ کوئی مدرسہ کوئی انجمن معدوم ہو جاتی ہے، بڑے بڑے کالجوں میں بڑے بڑے پروفیسر، پرنسپل، ناظم سیکرٹری علٰحدہ ہو جاتے ہیں، اور معزول کر دیئے جاتے ہیں اور فوراً ایک دوسرا اُن کا جانشین ہو جاتا ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ جمعیت الانصار سے جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی علٰحدگی پر یہ خطرہ دلوں میں کیوں پیدا ہوا۔

برائے کار خدا رہبرے ہمی آید
یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

بلاشک جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی مفارقت کا صدمہ ہے اور بہت بڑا صدمہ ہے۔ مگر ان کی علٰحدگی سے جمعیت کی موت آجائے: خدا نہ کرے۔

کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامت ندوہ سے علٰحدہ ہوئے کیا خدانخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہوگیا، علیگڑھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض جلیل القدر عہدے دار جدا ہوئے ہیں، کیا کالج بند ہوگیا، ہم نہیں سمجھتے کہ جمعیت کے متعلق ان بے معنی وساوس کی پیدائش کا مادہ کیوں ہیجان میں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جمعیت الانصار بند ہوگئی اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی انجمن جمعیۃ الانصار کا شعبہ ہے۔ یا دارالعلوم کی ساختہ اور ماتحت ہے اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ دارالعلوم یا جمعیۃ الانصار نے انگریزی خواں طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت سے انکار کر دیا۔ مولوی عبید اللہ صاحب دارالعلوم میں تعلیمی اور تدریسی باضابطہ کے جز اور رکن نہیں تھے کہ ان کے چلے جانے پر یہ دقت پیش آئی ہو، بعض انگریزی خواں طلبہ اس وقت بھی دارالعلوم میں تعلیم پا رہے ہیں اور دارالعلوم ہر وقت نہایت مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ گریجویٹ حضرات کی دینی تربیت کی کفالت کے لیے مستعد ہے، مگر جیسے کہ عربی خواں طلبہ اپنے خورد و نوش کی خود کفالت کرتے ہیں یا دارالعلوم کی معمولی کفالت پر قناعت کرتے ہیں، ایسے ہی اگر گریجوایٹوں کا طریق عمل ہو تو پھر کوئی دقت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جمعیۃ الانصار کے پاس اب نہ مالی رُوح باقی ہے اور نہ وظائف میں ایسا امتیاز مناسب ہے اور مشاہدہ کے بعد اب کسی میں یہ جرأت بھی باقی نہیں ہے۔

جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی علٰحدگی کا مسئلہ گو پیچیدہ نہیں ہے مگر تفصیل طلب ضرور ہے اور القاسم کے بقیہ صفحات اس کے لیے کافی نہیں ہیں اور ہمارے موضوع سخن کے اتمام میں سہیم و شریک بھی نہیں، اس لیے اگر ضرورت ہوئی، تو پھر کبھی اس کی بحث معرض بیان میں آجائے گی۔

جمعیۃ الانصار کا شعبہ الارشاد بحمدہ تعالیٰ اعتدال کے ساتھ مناظرہ اور تقریر و تحریر میں تدریجی ترقی کر رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ القاسم و الرشید کے صفحات میں آپ کو جمعیت الارشاد کی ترقیاں برابر نظر آیا کریں گی، جمعیت کا قانون نظر ثانی ہونے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ شائع کیا جائے گا اور اس کے مفید شعبوں کی ترقی میں سرِمو کوتاہی نہ ہوگی۔ اراکین جمعیت الانصار القاسم اور الرشید کے ذریعے تالیف و اشاعت کا مرقت التیوع سلسلہ جاری رکھیں گے اور مسلمانوں کی آگاہی کے لیے مفید مضامین کے ذخائر جمع کرتے رہیں گے۔ اراکین جمعیۃ الانصار کی خدمت میں بطور یاد دہانی عرض کیا جاتا ہے کہ جن حضرات کے ذمے چندہ دوامی جمعیت کا باقی ہے، وہ مہربانی سے جلد مرحمت فرمائیں اور جمعیت کے لیے مالی ذرائع پیدا کرنے میں نمایاں

حضرات مولانا سید ارشد مدنی صاحب ... حسنِ ظن اور نیک مشوروں سے دریغ نہ فرمائیں:"
خاکسار سراج احمد رشیدی، قائم مقام ناظم
جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند (القاسم ذی الحجہ
۱۳۳۱ھ صفحہ ۳۱-۳۲-۳۳)

تجزیۂ بیان از مرتب ازالجمن

جناب مولانا سراج احمد صاحب کا بیان آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں ان کی اس طویل تحریر میں جو کچھ نظر آیا وہ یہ ہے کہ مولانا عبیداللہ صاحب جمعیۃ الانصار کو خود چھوڑ کر چلے گئے، انھوں نے جمعیت سے بے وفائی کی اور انجمن کو زیر بار کرکے سدھار گئے۔ نیز جمعیۃ الانصار کے جلسے نہ ہونے کی وجہ جنگ بلقان میں علما کی غیر معمولی مصروفیت اور جنگ کے لیے چندے کی شدید طلب، ترکوں کے ساتھ تعاون، دیوبند کے خزانے کا خالی ہو جانا، الانصار کی طرف توجہ دینے کی بجائے اصل اور بنیاد کو قوت پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں کے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ نے نہ صرف ترکوں کو بلکہ مسلمانانِ ہند کو سخت مجروح کر دیا تھا، اس کا اثر دارالعلوم پر بھی پڑنا لازمی تھا، چنانچہ نہ صرف مسلمانانِ ہند کی توجہ ترکوں کی اعانت پر تھی، بلکہ علمائے دیوبند بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، تا آنکہ کچھ عرصے کے لیے دارالعلوم کو بند کرکے مدرسین اور طلبہ تک چندے کے حصول میں دیوبند سے باہر جا کر مصروف رہے۔ چنانچہ القاسم ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ میں چندہ ہلالِ احمر اور دارالعلوم دیوبند کے عنوان کے ماتحت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی، جو ابھی دارالعلوم دیوبند میں تھے۔ لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کا فتویٰ (جو گزشتہ نمبر میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود قصبات، دیہات تک ہند کے تمام اطراف میں دورہ کرکے رؤسا و علما، اور مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہتے ہیں محض ان لوگوں کے مراعی اور اس جماعت کی مساعی جمیلہ سے ایک بڑی مقدار جس کا تخمینہ ۲ لاکھ روپے سے کم نہیں کیا جاتا، مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے سے بھیجا گیا ہے، اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کی معرفت بھی ۵ ، ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بینک کی معرفت سے پریذیڈنٹ ہلالِ احمر قسطنطنیہ کے نام سے پہنچایا گیا ہے وفود دارالعلوم کے دورے اور خاص دیوبند میں جو روپیہ جمع ہو کر براہِ راست قسطنطنیہ بھیجا گیا، یا اراکین دارالعلوم کی کوششوں سے جمع ہو کر بھیجا گیا ہے، اس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسری اشاعت میں درج کریں گے، مگر اس قدر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب (مدرس اول مدرسہ مظاہر العلوم، صدر انجمن ہلالِ احمر سہارنپور) و مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی و مولانا حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی و حکیم محمد یوسف صاحب گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد صاحب رام پوری کی مساعی جمیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غربا اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقم جمع کر لینا آسان نہیں، مولانا خلیل احمد صاحب خالص سہارنپور سے زائد از بیس ہزار روپیہ اب تک بھیج چکے ہیں" (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ/ ص ۱۹-۲۰)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب "سفرنامہ شیخ الہند" میں لکھتے ہیں:

"بلقان کے خونریز اور خطرناک معرکوں کے سکون و انتہا نے مولانا محمود حسن صاحب کے دل و دماغ پر نہایت عجیب اثر

بے چینی کن اثر ڈالا..... مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کردیا طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی۔

ان بیانات کی روشنی میں مولانا سراج احمد صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ جنگ بلقان کے باعث جمعیۃ الانصار کے رکن حضرات مصروف رہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مدرسے کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ یہ بھی صحیح کہ جمعیۃ الانصار کا چندہ صفر پر پہنچ گیا تھا، لیکن ان وجوہات کے علاوہ منتظمین مدرسہ اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے خیالات اور آئندہ کے سیاسی نقشوں اور طریق کار نیز بعض مذہبی مسائل میں کش مکش پیدا ہو گئی تھی اور جمعیۃ الانصار سے بھی گورنمنٹ چوکنی ہو چکی تھی۔ ادھر جنگ بلقان ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۴ء سے گزر کر جنگ عظیم تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ جرمن اور ترک دونوں برطانیہ سے برسرپیکار تھے۔ ترکوں کی مدد انگریز کی دشمنی کے مترادف تھی۔ علمائے دیوبند نے لاکھوں روپے سے ترکوں کی مدد کی تھی، ان ہی حالات میں شیخ الہند حجاز روانہ ہوئے تھے، ادھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کابل پہنچ چکے تھے، وہاں سے انھوں نے ایک ریشمی کپڑے پر وہاں کے حالات لکھ کر مولوی عبدالرحیم صاحب سندھی کے ذریعے حج کے بہانے شیخ الہند کو بھیجے تھے، اس تحریک کا انکشاف اگرچہ پورے طور پر ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا، لیکن مدرسہ دیوبند گورنمنٹ برطانیہ کی نظروں میں کھٹک رہا تھا، اس لیے ارکان و ذمہ داران مدرسہ کے لیے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت تھی، اس لیے سرپرست جمعیۃ الانصار سے مولانا عبیداللہ کا علحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ اگرچہ ان کی جلائی ہوئی سکیم مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونک چکی تھی، شیخ الہند کے حج کو روانہ ہونے کے بعد، مذکورہ حالات میں لندن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کرنے کی تجویز بھی پیش ہو چکی تھی، جب یہ مسئلہ لندن کے دارالعلوم میں لیفٹیننٹ کرنل جیس نے اٹھایا، تو ہندوستان کے مسلم اخبارات سارے چیخ اٹھے۔ اخبار الخلیل بجنور نے حسب ذیل اداریہ سپرد قلم کیا، جو القاسم شعبان ۱۳۳۸ھ میں بھی شائع ہوا۔ الخلیل نے لکھا:۔

دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں

بجواب ایک سوال کے جو لیفٹیننٹ کرنل جیس نے کیا، دارالعوام میں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے فرمایا:

"جب سے کہ حجاز گورنمنٹ نے دارالعلوم دیوبند کے علامہ کو گرفتار کیا تھا، جو مالٹا میں نظر بند کئے گئے تھے۔ اس وقت سے اور جب تک کہ وہ مالٹا سے روانہ ہوئے مدرسہ عربی دیوبند کی کوئی باغیانہ تبلیغ کی شکایت جہاں تک انھیں علم ہے نہیں ہوئی اور اس تجویز پر عمل کرنے کی کہ مدرسہ موصوف بند کر دیا جائے، کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔"

اس سوال کے ساتھ بالشویک تحریک کے متعلق بھی ایک سوال تھا، جس کا جواب دیا گیا کہ گورنمنٹ ہند اس کے متعلق سرگرم کار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے آنریبل ممبران ہندوستان میں کسی بڑے پیمانے پر انقلاب عظیم کا خواب دیکھ رہے ہیں، حالانکہ یہاں روز بروز سکون ہو چلا تھا۔ مگر خود انگلستان کی عیسائی آبادی نے صلیبی جنگ کا سوال چھیڑ کر اور مسٹر لائڈ جارج نے اپنے صریح اعلان کے خلاف اور نہایت بے انصافی کے ساتھ ترکی پر الزامات قائم کرکے اس کو مٹانا چاہا ہے جس سے ہندوستان کی مسلم آبادی قدرتی طور پر بھڑک اٹھی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم دیوبند مسلمان بھی رہتا اور اس سے متاثر بھی نہ ہوتا، پھر بھی کارکنانِ مدرسہ دیوبند نے اس میں حصہ لیا ہے، اس سے وہ مشکل اسلامی

پوزیشن کو قائم رکھ سکتے ہیں لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ یا اور کوئی مسلمان ہونے کا مدعی ایسے موقع پر ہو اور وہ اسلامی معاملات سے جدا رہے۔ مگر آنریبل لیفٹیننٹ کرنل جیمس نے مدرسہ دیوبند، بند کر دینے کی جو بنا قرار دی ہے یعنی مولانا محمود حسن صاحب کی ذات گرامی صفات، وہ عرصہ ہوا کہ اس سے قطع تعلق کر چکے تھے اور گورنمنٹ کا تحقیقاتی ریکارڈ ابھی موجود ہوگا، جس سے مدرسہ کی بے تعلقی ثابت ہو سکتی ہے۔ نیز مولانا کی نظربندی کسی باضابطہ اس وقت کی انگریزی عدالتی تحقیقات سے ہرگز عمل میں نہیں آئی بلکہ وہ کھلی ہوئی یکطرفہ کارروائی تھی، اگر وہ انگریزی ذراعت پر بیت الحرام سے گرفتار کرائے گئے تھے اور اگر شاہ حجاز نے از خود گرفتار کر کے برطانیہ کے سپرد کیا ہے، تاکہ وہ نظربند رکھے جائیں تو اس کی وجہ صرف ایک ہی تھی کہ مولانا نے اس فتوے پر دستخط کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی، جس میں بغیر کسی موثر قطعی شرعی وجہ کے تمام ترکوں کے کفر کا فتوے ان سے چاہا تھا اور انھوں نے جائز طور پر خاموشی کو ترجیح دی۔

پارلیمنٹ میں مسٹر مانٹیگو کی معلومات اس سوال جواب کے زمانے تک ممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم کے متعلق ناقص ہوں کیونکہ بعض کارکنان مدرسۃ العلوم نے خلافت کے متعلق جو حصہ لیا، وہ اس کے بعد کا ہے، لیکن اگر یہ اس سے قبل کا بھی ہو تو یہاں اس سے زیادہ بڑھے ہوئے خیالات دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور جس قدر عربی مدارس ہندوستان میں ہیں سب ایک رشتۂ مذہبی میں منسلک ہیں، تو مدرسۃ العلوم دیوبند ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ مدرسۃ العلوم دیوبند کسی

افراد کے لیے قائم نہیں ہے، وہ ایک اسلامی درسگاہ ہے اگر گورنمنٹ اسے بند بھی کر دے گی تو بحیثیت ایک مسلمان کے وہ چار و ناچار اسے برداشت کریں گے، لیکن کیا یہ کوئی تدبر ہوگا؟ نہیں بلکہ ہزارہا مسلمان طلبہ اور استادوں کو جو خاموشی کے ساتھ ایک بے ضرر مذہبی شغل میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے منتشر کر دینا ہوگا کہ وہ سلطنت کے خلاف تمام ملک میں پروپیگنڈا پھیلاتے پھریں۔ ایسے ہی زیرِ دل نے موجودہ تکلیف دہ حالت پیدا کی ہے اور ایسے ہی ناعاقبت اندیش آئندہ اس کو مزید ترقی دینا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ اس تذکرے سے دیوبند میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوگی اور وہ جہاں ہے بے خوف وہیں کھڑا رہے گا، جو اس امر کی علامت ہوگی کہ "آنرا کہ حساب پاک است از محتسب چہ باک" اور یہ کہ اسلامی تعلیم صرف ایک خدائے قادر مطلق سے ہی ڈرنا سکھلاتی ہے اور اسی پر بھروسہ رکھتی ہے"

ایڈیٹر الخلیل

(القاسم، شعبان ۱۳۳۸ھ ص ۶)

الخلیل اخبار بجنور کے ایڈیٹر نے یہ ایڈوٹوریل (مقالۂ اداریہ) ۲ رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے اس کونے سے اس کونے تک بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی۔ دارالعلوم نے اگرچہ اس کی چنداں پروا نہ کی، جیسا کہ مذکورہ ماہ کے القاسم میں دارالعلوم کی طرف سے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے صرف ایک صفحہ کا نوٹ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ہم اس سے نہیں گھبراتے ہیں کہ ممبران پارلیمنٹ نے اس مدرسے کو کس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے، وہ جس نظر سے چاہیں اس کو دیکھیں، مگر ہم تو اس پر بھی یہی کہیں گے

و ان ساءنی ان تلقنی بساء
لقد سرنی انی خطرت ببالك

جس کا ترجمہ بقول غالب یہ ہے۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے:

یہ تھے وہ حالات جن کی پیش نظری و پیش بینی مہتمم صاحبان کو مولانا عبیداللہ صاحب کے متعلق فیصلہ کن نتیجہ کے لیے مجبور کر رہی تھی، یہ تیور جب شیخ الہندؒ اور ان کے جاں نثار سندھی شاگرد نے دیکھے تو خود بھی انھوں نے کارکنان مدرسہ کے ساتھ اشتراک عمل کو مناسب نہ سمجھا، چنانچہ دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے قسم کے جانبازوں یعنی مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی تجویز حریت میں شامل کر لیا، کہتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کی زبان پر یہ شعر اکثر آجاتا تھا۔

کاش اس فتنہ زار سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

بقیہ سرپرست دیوبند

مزید کہ ہماء حریت کے سلسلے میں جس طرح آپ نے مصائب برداشت کئے۔ اسی طرح آپ کے اعزا نے بھی تکلیفیں جھیلیں۔ خاص طور پر آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصر کو تو بہت ہی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، یہ جس صبر و استقلال سے ان آزمائشوں سے گزرے ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے زمانہ حراست میں نماز باجماعت ادا فرمائی اور قیدیوں کو نصیحت فرماتے رہے جس کی وجہ سے بہت سے قیدی تو بہ تائب ہو کر نیک ہو گئے۔ رہائی حاصل کرنے کے بعد آپ مستقل درس و تدریس اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے اور آخری وقت تک اسی سلسلے سے منسلک رہے

دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات

عبدالصمد صارم

برصغیر پاک و ہند میں دارالعلوم دیوبند نے جہاں مذہبی، علمی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں، ادبی خدمات بھی بڑے زور و شور سے کی ہیں، میری مراد اردو ادب کی خدمت سے ہے۔

یہاں سے اردو کے بڑے بڑے رائٹر پیدا ہوئے، جیسے مناظر احسن گیلانی، شمس العلماء تاجور نجیب آبادی، سعید احمد اکبر آبادی اور حفظ الرحمن سیوہاروی وغیرہ۔

نہ صرف مضمون نگار یا مصنف، بلکہ بے شمار ایڈیٹر اور شاعر بھی، حامد الانصاری غازی ایڈیٹر مدینہ بجنور، منظر الدین شیرکوٹی مدیر الامان دہلی کو کون نہیں جانتا۔

مولانا منظر الدین نے بہت سے ناول لکھے اور الامان اخبار نے ہندوستان میں بڑا نام پیدا کیا، حامد الانصاری غازی نے سینکڑوں کتابیں لکھیں اور بہت سے شعراء کو بروئے کار لائے۔

تاجور نجیب آبادی کی جہاں بے شمار خدمات ہیں، ان میں مرحوم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس ایک واحد شخص نے ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کو مقبول بنایا، پنجاب میں اردو کی ترویج میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے علاوہ سینکڑوں ہندو اور سکھ شاعر، ایڈیٹر، مضمون نگار، افسانہ اور ڈرامہ نویس پیدا کیے اور سینکڑوں رسالوں کی ایڈیٹری کی، تلوک چند محروم اور موہن سنگھ دیوانے جیسے بھی ان سے اصلاح لیتے تھے، انھوں نے ہزاروں اردو ٹیچر اور پروفیسر پیدا کیے۔

اس قسم کے فرزندان دارالعلوم کی بے شمار خدمات ہیں اور ان کی بڑی بھاری تعداد ہے۔ شاید ہی کوئی گاؤں یا قریہ ایسا ہوگا جہاں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل یا اُن کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد، ادبی خدمات انجام نہ دے رہے ہوں۔ انور صابری اگرچہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل نہ تھے، مگر انور صابری کو انور صابری دارالعلوم کی چہار دیواری ہی نے بنایا تھا۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کو میں دارالعلوم دیوبند کی ایک ادنیٰ سی خدمت شمار کرتا ہوں، سب سے بڑی خدمت جو دارالعلوم نے اردو ادب کی کی ہے اور جو بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس نے برما، بنگال، دکن، رنگون، کابل، بخارا، ایران، سماٹرا، جاوا، کشمیر اور نہ جانے کہاں کہاں دور دراز مقامات تک اردو زبان کو پھیلا دیا۔

اس درسگاہ میں دور دور سے تشنگان علوم اپنی پیاس بجھانے آتے تھے، چونکہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان رہی ہے، لہٰذا وہ اردو سے شناسا ہو جاتے تھے، نہ صرف شناسا بلکہ اردو کے بہترین مقرر اور خطیب

بن جاتے تھے، بہت سے شاعر اور ادیب بھی بن جاتے تھے، بنگال کی شاید ہی کوئی مسجد ایسی ہو جہاں دیوبند کا پڑھا ہوا امام نہ ہو، افغانستان و پشاور و سرحد وغیرہ کے بہت سے فارغ التحصیل ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں بڑے مشہور مدرس ہوتے، خود دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا رسول خان صاحب منطق کے مدرس رہے، وہ اہل زبان علما کی طرح اُردو نہایت صاف و شستہ بولتے تھے، شمس الحق افغانی، عزیر گل، نافع گل وغیرہ دارالعلوم کے بڑے اساتذہ میں سے تھے اور ہندوپاک کے بیشتر مدارس میں افغانی، گجراتی، سرحدی، مدراسی اور برمی وغیرہ اساتذہ و خطیب ہوتے ہیں۔

ان علماء کے بہت سے شاگردوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اُردو اخبارات و رسائل کی ایڈیٹری، نگرانی یا سرپرستی کی اور بہت سے مصنف و مضمون نگار پیدا کیے۔

پھر اگر ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے جرائد و اخبارات و تصانیف وغیرہ سے کتنے لوگوں نے اُردو سیکھی اور ان تقریروں سے کتنے عوام نے زبان سے شناسائی پیدا کی تو یہ دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے، جس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

میں نے سینکڑوں بنگالیوں اور سرحدی طالب علموں کو دیکھا کہ جب وہ دارالعلوم میں آتے تھے، تو ٹوٹی، پھوٹی اُردو بولتے تھے، پھر رفتہ رفتہ خوب بولنے لگتے تھے، حتیٰ کہ اچھے خطیب، مضمون نگار یا شاعر بھی بن جاتے تھے، دارالعلوم میں ہر صوبے یا ضلع کی ایک انجمن ہوتی تھی، جو جمعرات کو نمازِ عشاء کے بعد تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے۔ ان انجمنوں کے سالانہ اجلاس بھی ہوتے تھے تو ہم دیکھتے تھے کہ ہر نواح کی انجمن میں کیسے مقرر پیدا ہو چکے ہیں، جو اہلِ زبان کو بھی مات کرتے ہیں۔

دارالعلوم کی چہار دیواری میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے، ان مشاعروں کا یہ اثر دیکھا کہ غیر زبان کے طالب علم بھی اُردو شاعری کی ٹانگ توڑنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ اچھے خاصے شاعر بن گئے۔ ان مشاعروں میں بعض اوقات شاعرانہ نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی اور مہذب و غیر مہذب تنقید بھی، اس طرح وہ زبان کی اُونچ نیچ سے واقف ہو جاتے تھے،

مشاعرہ ایسی چیز ہے، جہاں تفریح کے لیے ہر شخص آجاتا ہے۔ خصوصاً دارالعلوم جیسے گھٹے ہوئے ماحول میں جہاں تفریح کا کوئی بھی سامان نہ ہو، ہر ملک کا طالب علم کھچا چلا آتا تھا اور شعر و شاعری سے متاثر ہوتا تھا،

ہر انجمن ماہانہ، سہ ماہی یا ششماہی رسالہ بھی نکالتی تھی۔ یہ رسالے سب کے سب اُردو زبان میں ہوتے تھے۔ اس طرح طالب علموں میں لکھنے کا ذوق بھی پیدا ہو جاتا تھا، انہی انجمنوں کے اثر سے دارالعلوم سے ادباء و شعراء پیدا ہوتے ورنہ دارالعلوم کو اُردو شاعری و ادب سے کیا تعلق، وہاں نہ اُردو پڑھائی جاتی تھی، نہ شعر و شاعری سکھائی جاتی تھی، بس ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ اثر انداز ہوتا تھا۔

بعض انجمنیں مناظرہ کرنا سکھاتی تھیں، ان میں وہ لوگ شریک ہوتے تھے، جو مناظر بننا چاہتے تھے اور ان شائقین میں بھی ہر نواح کے طالب علم نظر آتے تھے۔

بعض طالب علم جو ذہین اور قابل ہوتے تھے، تکرار کرایا کرتے تھے یعنی استاد کے پڑھائے ہوئے سبق کو دُہرایا کرتے تھے، ان میں بھی ہر نواح کے طالب علم نظر آتے تھے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ دارالعلوم میں ہر نواح کے طالب علم اچھی خاصی اُردو بولنے والے پیدا ہو جاتے ہیں، مگر بنگالیوں کو کبھی بھی اچھی اُردو بولنی نہ آئی، یہ ساری عمر تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرتے رہتے ہیں مگر ان میں بھی بعض بڑے اچھے خطیب دیکھے اور مولوی نور اللہ بنگالی کا حلقۂ درس اب تو بڑی شہرت رکھتا تھا، وہ بڑی صاف اور شستہ اُردو میں دیوان حماسہ و متنبی کا درس دیا کرتے تھے۔ [1]

---

[1] بہر حال ہندوپاک کے دُور دراز علاقوں میں دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا اور اس طرح اُردو کا احاطہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا کہ حد و حساب سے باہر ہے۔

از مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری
استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم دیوبند

درس حدیث

حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دوم کی تعلیم مدرسہ فتح پوری دہلی اور دارالعلوم میں ہوئی، حضرت مولانا مدنی رح اور حضرت مولانا اعزاز علی رح اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اُستاذ خاص ہیں، طالب علمی کے فوراً بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے، اب حدیث و تفسیر کی بڑی کتابیں زیر درس ہیں، شعبہ تعلیمات کے نائب ناظم، ملک کے مشہور مقرر، دیدہ ور مصنف اور اپنی ذہانت و فطانت میں معاصرین میں ممتاز اور بزرگوں میں پسندیدہ ہیں، ان کی کئی کتابیں، علمی دینی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ (ارشد)

کسی اور کا نہیں، خود اسلام ہی کے دامن کا جائزہ لیجئے یقین رکھتا ہوں کہ جن دولتوں سے یہ دامن لبریز ہے، اُن میں نمایاں قرآن و حدیث ہی ہیں، قرآن مجید کو اساس قرار دینے کے بعد اس مقدس متن کی دلآویز شرح احادیث کا وہی گرانمایہ مجموعہ ہے جو ختم نبوت علیہا وعلی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی درخشاں زبان مبارک سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقدس اجتماع میں پھیل رہا تھا، اسے حکمت و مصلحت پر مبنی ایک ٹھوس اقدام سمجھ لیجئے کہ اسلام کے صدر اول میں تمام تر اعتنا قرآن حکیم ہی سے رہا، مگر تصور اپنی ابتداء سے تا انتہا غلط ہی غلط ہے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیازی برتی گئی، جہاں تک اس ظلوم وجہول کے زیر نظر مضمون کا تعلق ہے، مجھے حدیث کی تدوینی مہم پر کچھ عرض کرنا نہیں ورنہ حقائق و وثائق کی روشنی میں بخوبی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کی تدوینی مساعی کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی جدوجہد، مغالطہ انگیزیوں کا ایک غلط طومار ہے۔ بہرحال یہ بحث یہیں چھوڑتے ہوئے، ہندوستان بشمول پاکستان میں اسلام کے اساسی مضامین میں حدیث رسول کے ساتھ جو خاص توجہ کی گئی، اس کا اعتراف کسی اور نے نہیں، مصر کے جلیل القدر عالم، صاحب المنار علامہ رشید رضا کے الفاظ میں یہ ہے:-

"اگر علوم حدیث کی جانب ہمارے ہندی علماء کی توجہ

والتفات مبذول نہ ہوتی، تو اسلام کے مشرقی
علاقوں میں (خدانخواستہ) حدیث کا خاتمہ ہی ہو چکا
ہوتا، کیونکہ مصر و شام، عراق و حجاز، دسویں صدی
ہجری میں سب ہی جگہ علمی زوال انتہا کو پہنچ چکا

" مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ "

میں یہ نہیں سمجھتا کہ عجمی ممالک کی علمی جدوجہد اور پاکیزہ ولولوں کو اس کھلے دل سے تسلیم کرنے کے بعد صاحب المنار کی ان نگارشات کو بے وقعت سمجھا جائے گا۔ کیا عرض کروں تاریخ کی ستم رانیاں، صدیوں سے دینی درسگاہوں میں امام زہری علیہ الرحمۃ کو حدیث کا مدون اول بتایا جا رہا ہے۔ امام ہمام کی علمی جلالت وعظمت کے اعتراف کے باوجود تدوین حدیث کا اولین کارنامہ جو ان کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اور جسے اب تاریخی حقائق کی روشنی میں تسلیم کرنا دشوار تر ہی ہوگا، ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں حدیثی خدمات کا معمار اول امام الحجۃ الشہید ولی اللہ طاب ثراہ کو بنا دیا گیا، خاکم بدہن، حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی علمی عظمتوں کو کم کر کے دکھلانے کا جرم یہ بے بضاعۃ ہیچ در ہیچ قلم کبھی نہیں کر سکتا، لیکن خود اس سے ہندوستان کی اس ناواقفیت کو جو فن حدیث کے ساتھ صدیوں پرانی ہے، نقصان پہنچنے کے جو امکانات پیدا کر دیئے گئے۔ راہ کے ان کانٹوں کو بھی دور کرنے کی بہر حال ضرورت ہے، تاریخ سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ تاتار کے لرزہ خیز معاملے کے بعد ہندوستان کی جانب جن علماء کے قدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ان ہی میں وہ اہل کمال بھی چلے آرہے تھے، جو حدیث کی گرانمایہ متاع کو اپنی جیب و دامن میں لے کر ہندوستان کی فضا کو منور کرنے کا منصوبہ رکھتے۔ فیروز شاہی نے اپنی مشہور تاریخ میں اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

" ملعون چنگیز خان کے حادثے سے دل شکستہ ہو کر
ہندوستان میں اہل علم آئے اور پھر یہ سلسلہ علماء
کی آمد کا برابر بڑھتا رہا اور سرزمین ہند علم و کمال، دین
دانش کی روشنیوں سے جگمگانے لگی، کہا تو یہی جارہا
ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
سے پہلے حدیث کے چرچوں سے ناآشنا تھا،

یہ وہ افسوسناک تاریخ سے ناواقفیت ہے، جسے ہندوستان کی علمی تاریخ کا المیہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے اگر تھوڑی سی زحمت اٹھا کر تاریخ کے دریچوں سے حقیقتوں کا تجسس و تلاش کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب سے پہلے بلکہ بہت پہلے یہ ملک حدیث سے اس درجہ واقف ہو چکا تھا کہ یہاں حافظ قرآن کی طرح، بخاری شریف کے حفاظ بھی موجود تھے۔

"یاد ایام" میں مولانا عبدالملک عباسی کے متعلق بتایا گیا: " صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی۔ بخاری کا درس ہمیشہ زبانی دیتے "

تذکرہ علماء ہند میں بابا داؤد مشکواتی کے حالات میں یہ بھی موجود ہے

" فقہ، حدیث، تفسیر اور حکمت و معانی میں کمال
رکھتے تھے اور مشکوٰۃ شریف کے حافظ تھے، اسی وجہ
سے ان کا لقب مشکواتی ہو گیا۔

غرضیکہ یہ صرف ایک پروپیگنڈا ہی ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے حدیث سے ناآشنا رہا، یہی نہیں کہ صرف حدیث کی واقفیت، بخاری شریف اور مشکوٰۃ شریف کے حفاظ بلکہ حدیث کی ابتدائی کتاب " مشارق الانوار " جو صدیوں ہندوستان میں حدیث کی اساسی کتاب قرار دے کر پڑھی، پڑھائی جاتی رہی، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے متعلق تحریر فرمایا ہے، کہ

مشارق الانوار ان کے یہاں زیر درس ہی اور سلطان جی نے اپنے معروف خلفاء کو اس کی باقاعدہ تعلیم دے کر ان خلفاء کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا دیا، تفصیلات کے لیے "فوائد الفواد" اور "سیر الاولیاء" کا مطالعہ کافی ہوگا۔ بلکہ اسی ہندوستان میں حدیث کی اہم شروحات بھی لکھی جا چکی تھیں، خود حضرت شیخ عبدالحق محدث اور ان کے صاحبزادے مولانا نور الحق صاحب، مشکوٰۃ شریف، بخاری شریف کی شروحات بالترتیب فارسی و عربی میں لکھ چکے تھے ـــــ اس میں شک نہیں کہ الدھلوی امام کے خانوادہ نیک نام سے حدیث کے درس کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ انشاء اللہ اب قیامت تک باقی رہے گا، ہند اور پاکستان میں جو اب دینی درسگاہوں میں حدیث کے سلسلے شاہ صاحب پر منتہی کئے جا رہے ہیں، ان کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ موجودہ سند شاہ صاحب ہی پر ختم ہوتی ہے۔ سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے یہ دو اساسی مضمون، قرآن اور حدیث اُمت کی خاص توجہات کے مرکز رہے ہیں، جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ قرآن سے متعلق مضامین مطالب میں جو گلکاریاں کی گئی ہیں، وہ بالیقین تمام امتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بائیبل کے اشاعتی عدد کو شمار کرنا بھی مشکل ہو گیا اور اسی طرح انجیل کے مقدس نسخے بھی بے شمار چھپ چکے ہیں، مگر جہاں تک تشریح و تفسیر اور بیان و تبیین کا تعلق ہے، جچی تلی اور متوازن شرح ان میں سے کسی ایک کی بھی پیش کرنا مشکل ہے، دوسری جانب قرآن حکیم کا یہ حال ہے کہ اس کے چہرۂ زیبا سے نقاب کشائی کے لیے اُمت مرحومہ کے کارنامے اس قدر تابناک ہیں کہ انھیں انصاف پسند بے مثال ہی کہیں گے۔ لغات القرآن، قراۃ القرآن، قرآنی نحو، قرآنی صرف، قرآن اور اس کا اعجاز، بلاغت قرآن، فصاحت قرآن، تفسیر قرآن، فقہ القرآن، مشکلات القرآن، معارف القرآن، نظائر القرآن، امثال القرآن اور خدا جانے کتنے عنوانات ہیں جن پر تیار شدہ ذخیرہ کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بن چکا ہے اور چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود آج تک قرآن مجید سے یہ اعتناء والتفات کم نہیں ہونے پاتا۔ ان دلچسپیوں کے بعد پھر ذہنی وداعی وابستگی اگر کسی عنوان و موضوع سے رہی تو وہ صرف حدیث ہے۔ بخاری شریف اور امام دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انسؓ کی مؤطا جو تدوین و تصنیف کی تاریخی حیثیت میں بخاری شریف سے بھی مقدم ہے، اس کی شروحات کا جہاں تک راقم السطور کا علم ہے۔ تیرہ کے لگ بھگ شروحات مؤطا مالک اور اصح الکتاب بخاری شریف پر اہل علم و دانش کی تحقیقاتی ژرف نگاہی کے انبار ۲۵ کی تعداد میں ہیں اور پھر حدیث کے ایک ایک رخ سے نقاب کشائی میں جن فنی جا بکدستیوں کا مظاہرہ کیا گیا، اس کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت مرحومہ کو الرسول اعظم کے ارشادات سے کیا کچھ دلچسپیاں رہی ہیں، فقہی مکاتیب کا باہمی اختلاف اور حدیث کے ذخیرے میں نت نئی موشگافیوں کا باعث بنا اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ خاص اس نقطۂ نظر کی باہمی آویزشیں سامنے نہ آتیں تو حدیث کے بہت سے پہلو مستور رہتے۔

ہندوستان میں تدریس حدیث

عرض کر چکا ہوں کہ حدیث کا درس باقاعدہ حضرت شاہ صاحب ہی کی درسگاہ سے اپنا تاریخی آغاز رکھتا ہے، اس لیے ہندوستان میں حدیث کی درسی خصوصیات کے لیے سب سے پہلے اسی عظیم درسگاہ کے طرز کو بیان کرنا پڑیگا، جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے، شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا زیادہ زور مشارق الانوار پر رہتا اور مباحث و مضامین متعلقہ اسی مشارق الانوار میں طلبا کے سامنے پیش کر دیئے جاتے، صحاح ستہ کی پوری تعلیم تبرکاً بطور قرأت ہوتی۔ خاص خاص مواقع پر کچھ تفصیلات بھی بیان کر دی جاتیں، شاہ صاحب کے مدرسے میں اس خصوصی انداز کو "سرد" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا لفظی ترجمہ رَوا روی اور ٹھیٹ

ترجمہ دورہ ہے، شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے اس معروف انداز درس میں انقلابی تبدیلیاں عالم اسلام کی عظیم ترین درس گاہ دارالعلوم دیوبند نے کیں، دارالعلوم کی ان انقلابی کوششوں کا جائزہ لینے کے لیے کچھ تفصیل کرنا ہوگی اور ان تاریخی مرحلوں کی تعیین و تشخص کے بغیر معروضات سمجھ ہی نہیں آسکیں گی، جہاں سے تبدیلیوں کا نقطۂ عروج ہوتا ہے، شر ہی سے خیر کا ظہور، جس کے بارے میں پہلے بھی توجہ دلاچکا ہوں، اسلام کے چودہ سو سالہ دور میں نئے نئے فتنے جو فکر و عقیدے کے حدود میں اُبل رہے تھے، اسلام کی جانب سے دفاع کرنے والوں نے دفاعی مسالہ اسی قرآن و حدیث کے ذخیرے سے بہم پہنچایا، جبر و قدر، شیعہ و رافضیت، اعتزال اور فتنۂ خلق قرآن غرضیکہ جو بھی فتنے سر اُٹھاتے اُن کے استیصال کے لیے قرآن و حدیث کا ہی استعمال ہوتا۔ اس دفاعی مہم میں قرآن اور حدیث کے رُخ زیبا سے کچھ اس طرح نقاب اُٹھا گیا۔ کہ لطیف اور نازک مضامین کا انبار لگتا چلا گیا۔ تقلید و عدم تقلید پھر چاروں فقیہوں اور اس کے ساتھ سلوک و معرفت کے مکاتیب فکر جب ایک دوسرے سے متصادم ہوئے تو اختلاف اُمت، رحمت کا موجب بن کر مطالب و مضامین میں ندرت اور تازہ افکار کی تمہید تھی اور اسی طرح یہ شر اس سطریہ کی تخلیق کا باعث بنا جس کی جانب سے اُمت مرحومہ غافل چلی آتی تھی، ہندوستان میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ چونکہ خود اجتہاد کے مدعی تھے اور فقہ حنفی کے ترجمان، اور اس سے گہری وابستگی کے باوجود اس ماحول میں جو حکومتوں کے روزمرہ انقلاب نے پیدا کر دیا تھا، خاص ان مباحث پر زور نہیں دینا چاہتے تھے، جو حدیث و قرآن کا قانونی اسلوب ہے اور جس کا تمامتر تعلق مسلمانوں کی عملی زندگی سے رہا ہے اور رہے گا۔ مرحوم شاہ صاحب کے عہد میں بدعت و سنت کی آویزشیں، شیعہ اور اُس کے بالمقابل سُنی افکار کی نمائندگی یا اسلام سے بڑھتا ہوا بعد۔ اور یہاں کے ماحول سے انفعال کی شدت، شاہ صاحب کے فکر و ذہن کو قوت سے متاثر کئے ہوئے تھی۔ اس لیے حدیث و قرآن پر اپنے انداز میں کام ہوا اور اُمت مرحومہ کو شقاق و نفاق سے بچانے کے لیے، شاہ صاحب مرحوم نے جس طرز پر کام کیا، وہ بھی اپنی جگہ وقیع اور مستحسن ہے۔ آج بھی حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے مطالعے سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن و حدیث کی ایک اچھی تفسیر و شرح عصری ضرورتوں کے مطابق وجود میں آگئیں، آپ کی درسگاہ سے تربیت یافتہ حلقہ جب دہلی سے علم موروثی کی امانت لے کر اقصائے ہندوستان میں پھیل گیا تو اس امانت کی اشاعت کا مرکز منتقل ہونا دیوبند کی تقدیر میں تھا، یہاں دارالعلوم میں علوم نبوی کے سرچشمے جاری ہوئے اور اس کی موجیں عرب کی حدود تک جا پہنچیں اس لیے ہندوستان میں درس حدیث اور اس کی منفرد خصوصیات کی تعمیر و تشکیل میں جو دارالعلوم کا اہم کردار ہے، اس سے انصاف پسند مؤرخ چشم پوشی نہیں کرسکتا، بھلا اس کا انکار کیسے ممکن ہے کہ ادھر ایک صدی میں ہند و پاکستان اور دور و دراز علاقوں میں درسگاہیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ دارالعلوم کے علمی فیوض کی تابناک مثالیں اور روشن شواہد ہیں، الامام الثانی حجۃ اللہ فی الارض مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ نے دارالعلوم کی تشکیل میں اور آپ کے رفیق خاص الامام الکبیر قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے خانقاہ کی صورت میں خانوادۂ ولی اللہی کی اس امانتِ خاص کی نشر و اشاعت باکمال انداز میں اس طرح کی کہ وہ اس راہ کے خود ہی سنگ میل بن گئے، دونوں حضرات کی تصانیف اور موخر الذکر کی ترمذی شریف سے متعلق درسی تقریر منظر عام پر آچکیں، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کا انداز طرز اور تدریس حدیث میں خاص لون کیا تھا۔ بخاری شریف کا جو حاشیہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے قلم سے تیار ہوا، کچھ خاص اجزاء کی شرح و تشریح حضرت نانوتوی کے علم ریز قلم سے بھی ہوئی ہے اور یہ علمی دستاویز آپ کی

درسی خصوصیات کے لیے مظہر ہیں تاہم اتنی حق بات تو واضح اور صاف ہے کہ حدیث پر طویل ترین مباحث کا ان حضرات کے یہاں سُراغ نہیں ملتا اور دونوں حضرات اس ماحول کے مطابق حدیث و قرآن سے دفاعی مہم میں شریک رہے۔ جو آپ کے عہد کے خاص فتنے تھے حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ ہی کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ کے سپرد تھی، جو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے فرزند ارجمند اور اکابر کے علوم کے امین تھے، آپ کے مشہور تلامذہ میں حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہ ہیں، مولانا تھانوی نے اپنے ان جلیل القدر اُستاذ کا کافی تذکرہ کیا ہے، اور کہیں کہیں مرحوم کے انداز درس کا بھی ذکر آیا، مثلاً ایک موقعہ پر اپنی مخصوص مجلس میں فرمایا۔

"مولانا محمد یعقوب صاحب کی تقریر میں علمی لغات بہت ہوتے تھے، مگر بے ساختہ اور اُن کے یہاں اتنے علوم تھے کہ سبحان اللہ! اُن کی تقریر سُن کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کتب خانہ کھول دیا۔"

آپ کی جامعیت کا یہ عالم تھا کہ علم ریاضی ایسا خشک مضمون، جس سے عام طور پر علماً نابلد ہی ہوتے ہیں، مولانا موصوف اس فن میں بھی ——— اس درجہ مہارت رکھتے تھے کہ بقول حضرت تھانویؒ:

"سرکاری مدارس کے ماسٹر صاحبان، ریاضی کے لاینحل مسائل ان سے حل کراتے۔"

درس گاہ کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی تھا کہ:

"درس گاہ دکان معرفت معلوم ہوتی، ایک خاص توجہ سب کے قلوب پر ہوتی۔" (بحوالہ یعقوب و مملوک)

مختلف احادیث میں تطبیق، آیات قرآنی سے مسائل کا استنباط و استخراج، مہدی لبستوں میں شرعی نصوص کے صحیح مقامات کی تعیین و تشخیص مولانا مرحوم کا امتیاز تھا، آپ کی مکمل سوانح پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے بنام "یعقوب و مملوک" تالیف کر دی ہیں۔ اہل ذوق کے لیے اس کا مطالعہ دل و دماغ کی روشنی اور روحانی غذا ہے۔

ان تمام ادوار میں برطانوی زیر تسلط ہندوستان کے خاص فتنوں کا توڑ حدیث و قرآن سے کیا جاتا رہا۔ فقہ حنفی کی تائید میں کچھ خاص اجتہادی نکات پر عمل کیا گیا اور تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں کی بھی جوابدہی کی گئی، یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں بریلوی فتنے کا آغاز ہو چکا تھا اور پاسبان سُنت بریلویت کی شکست و ریخت میں مصروف تھے، اس لیے حدیثی درس میں ایک خاص باب کا اضافہ ہو گیا۔ تاہم اپنے پیشرو کی طرح مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا درس بھی مختصر اور متوازن شرح و تفسیر کا حامل رہا اور اتنی ہی تقریر کی جاتی، جو حدیث کے خاص خاص پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کے بعد کچھ وقفے سے عہدۂ صدر مدرسی حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کے خاص تربیت کردہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہو گیا، آپ اپنی طبعی ذکاوت و ذہانت کے علاوہ اپنے استاذ اکبر کے علوم و معارف کے مبلغ و ترجمان تھے اور ذوق و مشرب کے اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی اور حریت پسندانہ جذبات کے حامل، اعلاء کلمۃ الحق کے جذبے سے سرشار اور ہند میں یہاں کے باشندوں کے اقتدار کے بحالی کے آرزومند تھے، مشہور ریشمی رومال کی تحریک ہندوستان، افغانستان، آزاد قبائل، ترکی اور ممالک اسلامیہ تک ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک کے مناد و داعی ہیں، اپنی سیاسی جد و جہد میں اخفاء راز کا جو اہتمام پیش نظر تھا، اس میں اس قدر کامیاب رہے۔ کہ درس میں کبھی یہ اندرونی

جذبات عام طلبا کے سامنے رُونما نہیں ہو سکے۔ زیادہ تر زور فقہ حنفی کی تائید پر رہا، حنفیت میں تصلب کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی قول میں امام اعظم منفرد رہتے، بلکہ امام کے مشہور تلامذہ بھی ان کی ہمنوائی میں نہ ہوتے تو صورتِ حال کی نزاکت سے چیں بہ جبیں ہونے کے بجائے حضرت فرماتے کہ یہاں ایک ایسا فقہی دقیقہ ہے، جس تک امام اعظمؒ کی دقتِ نظر ہی کامیابی سے پہنچ سکتی تھی ہ

اختصار پسندی کے باوجود اگر ضرورت ہوتی، تو حلِ مشکلات کے لیے طویل مباحث سے بھی گریز نہ ہوتا۔ زیرِ مطالعہ کتابوں سے حضرت ان اقوال کا انتخاب فرما لیتے، جو سب سے زیادہ جاندار اور بھاری بھرکم ہوتے، اپنے استاذِ اکبر حضرت نانوتویؒ کے افادات کی ترجمانی بھی فرماتے، بُخاری شریف کے ترجمۃ الابواب کو اہلِ علم جانتے ہیں کہ وُہ بُخاری شریف کا سب سے اہم حصّہ ہیں، جملہ شارحینِ بُخاری نے اُن پر خاص توجہ کی ہے، حافظ العصر الامام علامہ انور شاہ کشمیریؒ بارہا فرماتے:

"کاش کہ ابنِ تیمیہ ترجمۃ الابواب پر کچھ لکھتے تو ایک عجیب و غریب سرمایۂ علم سامنے آتا۔"

الامام الدہلوی نے بھی بُخاری کے تراجم پر مختصر لکھا ہے اور حضرت شیخ الہند کا بھی ایک رسالہ اس عنوان پر موجود ہے، جس کے مطالعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت موصُوف نے تراجم کو حل کرنے کے لیے کس ژرف نگاہی کا مظاہرہ فرمایا۔ بعض تصانیف بھی اہم عنوانات پر تیار کیں، جو موصُوف کے کمالاتِ علمی کا شاہد ہیں، آپ کا سب سے بڑا امتیاز و اختصاص ان تلامذہ کا آپ کے دامنِ تربیت سے تیار ہونا ہے، جو فضل و کمال، فقاہت و ذہانت میں اپنی نظیر آپ ہیں، غالباً ہندوستانی علما میں یہ حضرت مرحُوم کی منفرد حیثیت و خصُوصیت ہے کہ خدائے تعالٰی نے آپ کے حلقۂ درس میں علم کے آفتاب اور فضل کے ماہتاب اُٹھائے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ وغیرہ، آپ کی وُہ علمی یادگار ہیں، جن کی نظیر اب چشمِ فلک دیکھ نہیں سکتی۔ طلبا پر خاص بزرگانہ شفقت رہتی، بعض طلبا سے خصُوصی شفقت کا معاملہ رہتا، درس میں بھی ایسے طلبا کے مزاحی جملوں کا تبادلہ فرماتے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ جن کو حضرت کی بارگاہِ علم و کمال میں اختصاص حاصل تھا، اگر درس میں کبھی کوئی بات دریافت فرماتے، تو حضرت کی طرف سے ارشاد ہوتا:

"تم بدوی ہو ایسے نازک مسائل کیا خاک سمجھو گے۔"

اس طرح آپ کا درس معقول و منقول، فقہ و تفقہ، فضل و کمال اور دین و دانش کی فیض رسانیوں پر مکمل حاوی تھا، حضرت کی حیات ہی میں آپ کے معرُوف تلامذہ میں سے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ

ہ تقریر مختصر، جامع اور قولِ راجح کا رنگ لیے ہُوتے ہوتی، طلبا کو متیقظ رکھنے کے لیے کبھی کبھی حنفی نقطۂ نظر کی مخالف احادیث پر سکوت فرماتے اگر کوئی طالب علم توجہ دلاتا۔ کہ حضرت یہ حدیث احناف کے قطعاً خلاف ہے، ارشاد ہوتا:

"میں کیا کروں؟"

طالب علم عرض کرتا کہ حنفیہ کا بھی کوئی جواب ہوگا، جواباً ارشاد ہوتا:

"حاشیے پر جواب موجود ہوگا، دیکھ لو۔"

ادھر سے عرض کیا جاتا کہ حاشیہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، مزاحًا و متجسّسانہ انداز میں فرمایا جاتا: "کہ اگر سمجھ میں نہیں آتا تو سر دیوار سے دے مارو" اس پر شفقت ردّ و قدح کے بعد احناف کی جانب سے ایسا جچا تُلا جواب پیش کیا جاتا کہ زیرِ بحث حدیث مسلکِ احناف کے مخالف نہیں بلکہ موافق نظر آتی۔

صاحب الکشیریؒ کا بعہدہ صدرالمدرسین کے انتخاب ہوا، خدائے تعالیٰ نے آپ کو جس بے نظیر قوت حافظہ، یادداشت، حفظ و ذکاوت، مطالعہ، تبحر علمی کی دولتوں سے نوازا تھا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے عہد میں تدریسی و تعلیمی زندگی میں ایک خوش گوار انقلاب رونما ہوا۔ اب تک حدیث کے موضوع پر محدود تقریر اور مشہور رسائل کا تذکرہ ہوتا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طرز میں وہ مجتہدانہ تبدیلی کی جس کے نتیجے میں درآنحالیکہ آج آپ کے سانحۂ وفات پر نصف صدی گزرنے کو آتی ہے، ہند و پاکستان کی تمام درسگاہیں اسی طرز کی محافظ و امین بنی ہوئی ہیں، کیونکہ آپ کی بے پناہ شخصیت اس انقلاب کا سنگ میل ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تدریسی خصوصیات کو قدرے تفصیل کے ساتھ نذر قارئین کیا جائے، اس سے پہلے کہ اس عنوان پر کچھ عرض کروں، آپ کے ایک مخصوص شاگرد مولانا مفتی محمودؒ صاحب نانوتوی، جو نصف صدی "مالوہ" میں افتار نویسی کی وقیع خدمت انجام دیتے رہے اور سالہاسال دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے باوقار رکن بھی رہے۔ ایک موقعہ پر مرحوم نے اپنے استاد حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں بڑی وقیع اور دور رس بات فرمائی، فرمایا کہ:

"ہندوستان نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسا مصنف نہیں پیدا کیا اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسا بے مثال مدرس پھر پیدا نہ ہو سکا"۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی درسی ممیزات، اور آپ کی اجتہادی بصیرتوں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد یہ متوازن فیصلہ مفتی صاحب کی زبان پہ آیا۔ عرض کر چکا ہوں کہ آپ سے پہلے تدریس و تعلیم کی بندھی حدود ہی میں ہوتی، لیکن آپ نے حدیث کو اسلامی علوم کا آئینہ دار بنا کر طلبہ کے سامنے پیش کیا۔ ان حدود میں آپ کی مجددانہ و مجتہدانہ خصوصیات کا اعتراف خود آپ کے باکمال تلامذہ نے بھی کیا ہے، چنانچہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے سوانحی مقالے میں لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے مدارس میں نہ تھیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کا درس مُنتہائے درس و تدریس میں ایک انقلاب عظیم کا باعث ثابت ہوا"۔

یہ انقلاب کیا تھا: مولانا مناظر احسن گیلانی نے عام درسگاہوں کی ابتدائی تقریروں کی فرسودگی کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب کے نئے اور حیرت انگیز طریقۂ تدریس کو بیان کرتے ہوئے اطلاع دی ہے،

"لیکن الامام الکشمیریؒ نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ شروع ہو، ایک خاص دلچسپ ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی کہ کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا، تقریباً ۴۰ سال بعد اس کا دہرانا آسان نہیں لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظے پر اب بھی باقی ہے"

"پہلے ہی دن کے سبق میں معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونیوالے معلومات یکایک میرے سامنے آگئے" (بحوالہ حیات انور)

اس اجتہادی درس میں متنوع اور گوناگوں علوم کا فیضان جو حضرت مرحوم کی جانب سے ہوتا، مولانا گیلانی نے شاہ صاحب ہی کی زبان میں دفاعی مسائل سے انکا ذکر کیا ہے، چنانچہ رقمطراز ہیں:

"یادداشت اور حافظے کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم

پذیر رہتا، کسی مسئلے پر تقریر فرماتے ہوئے اُس کی
مناسبت سے ذہن کسی دُوسرے مسئلے کیطرف
منتقل ہوتا تو عموماً فرماتے ،

" دماغ ہو گیا مجھے اِس مسئلے کی طرف "

اسی طرح کی تفصیل مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بھی سُناتے
ہوئے بتایا ہے۔

" حضرت شاہ صاحبؒ کا درس حدیث محض حدیث
تک محدُود نہ تھا، بلکہ، فقہ، تاریخ، ادب کلام
فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس، غرضیکہ تمام
علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا۔" (بحوالہ کرن)

محدود تقریروں اور متعینہ لائنوں سے ہٹ کر آفاقی خطوط میں
اس توسیع نے طلباء کے ذہنوں میں جو تبدیلیاں پیدا کیں، بطور شہادت
مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا یہ بیان بہت وقیع ہے، لکھا ہے
کہ : " اس جامع درس کا طالب علم درس سے ہر علم
فن کا مذاق لے کر اُٹھتا اور اس میں یہ استعداد
پیدا ہو جاتی کہ وُہ بہ ضمن کلام خدا و رسُول ہر فن پر
محققانہ کلام کرے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا
ایک انقلاب تھا، جو زمانے کی رفتار کو دیکھ کر
الاستاذ، الامام، الکشمیری نے اختیار فرمایا تھا۔"

طلباء کی بے بضاعتی اور کوتاہ ہمتی کے پیش نظر ایک خاص کام یہ بھی کیا
کہ جس کسی مصنف کا تذکرہ آتا، اس کی مختصر سوانح بھی بیان فرماتے، اس کا
بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے فخر روزگار اشخاص
سے طلباء کو براہ راست واقفیت ہوتی، حضرت شاہ صاحب نے جہاں
طلباء کے اذہان کو علمی حدود میں وسعت پذیری سے آشنا فرمایا، عہدی
فتنوں پر بھی استشہاد درس کا خاص حصہ رہا، قادیانیت کے استیصال
و بیخ کنی پر درس میں اس تفصیل سے کام لیا کہ طلباء اور مستفیدین اس
دجالی فتنے کے قلع و قمع کے لیے ہمہ جہت مسلح ہو گئے۔

مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے خود حضرت شاہ صاحب
کے حوالے سے سُنایا ہے۔

" بھائی اِس زمانے کے علمی فتنوں کے مقابلے میں
جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا۔"

جیسا کہ معلوم ہے کہ سلوک و تصوف، معرفت و تزکیہ، باوجودیکہ شریعت
کا مغز اور اس کی رُوح ہیں اور اسرار و حکم جو شرعی احکام و اوامر منہیات
کو سمجھنے اور قلبی اطمینان کا ایک مضبوط ذریعہ ہیں، ہماری دینی درسگاہوں
میں ان دونوں اہم فنون اور پاکیزہ علوم سے کوئی اعتناء نہیں برتا جاتا
حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ صوفیاء کے
اقوال، اُن کی آراء اور اسرار و حکم، طلباء کے سامنے بقوۃ اور بکثرت
پیش فرما کر ان کے اذہان و قلوب، ان علوم سے بھی آشنا کرنے کے
لیے تیار و ہموار فرما دیتے۔ بلکہ بعض احادیث و قرآنی آیات میں تو
آپ نے صُوفیاء ہی کے افکار کو قول فیصل قرار دیا۔ اس ذیل میں شیخ محی الدین
بن عربی کی آراء کو بہت وقیع انداز میں پیش فرماتے، کبھی کبھی بطور تحدیث
نعمت بھی ارشاد ہوتا کہ :

" اسرار و حکم کو باستثناء شیخ محی الدین بن عربی سب سے بہتر جانتا
ہوں۔"

دارالعلوم دیوبند سے گہری نسبت اور دیوبندی ذوق و مشرب
سے بھرپور وابستگی کا یہ بھی نتیجہ تھا کہ شیخ بن عربی کے اقوال و تحقیق پر پُورے
اطمینان کے باوجود ان کے تفردات پر کھل کر رد بھی فرماتے، جہاں کہیں
شیخ کے غالی معتقدین نے شیخ کے تفردات کی ہوا خواہی اور اُن
کی جانب سے دفاع میں خواہ مخواہ کی کھینچ تان کی ہے، حضرت مرحوم
شیخ کی جلالت علم کے اعتراف کے ساتھ۔ ان کی تفردات جیسے متن و

غیر ثقہ پہلو کو نمایاں فرماتے، ایمان فرعون کے باب میں شیخ کی بلند پایہ کتاب کے متعلق بعض نے الحاق کے ذیل میں لانے کے لیے بڑی جد وجہد کی ہے، حضرت والا فرماتے کہ،

"شیخ کے مسلسل مطالعے کے بعد میں ان کی ضیع پر مطلع ہو چکا ہوں، یہ ان ہی کا کلام ہے، الحاق نہیں ہے"

غرضیکہ اس طرح آپ کی عقیدت و اعتراف متوازن حدود میں تھا، اس میں کبھی غلو کا دخل نہ ہوتا۔

منطق کی بادر ہوائی

صدیوں سے ہماری درس گاہوں اور درس و تدریس پر منطق و قدیم فلسفے کا تسلط و غلبہ ہے، بعض علمی شخصیتیں ان ہی فنون میں دستگاہ و دسترس پیدا کر کے غریب طلبا کے سامنے اپنی قابلیتوں کا مظاہرہ کرتیں۔ الامام کشمیری نے یہ بھی بڑا کام کیا کہ ان مناطقہ کے استیلاء سے کائنات درس و تدریس کو پاک فرمایا۔ اور ان کے بالمقابل حکمائے اسلام یعنی صوفیاء کے معارف و مطالب کے ذائقے سے طلبا کو روشناس کیا۔ بو علی سینا کی، موشگافیوں پر زبردست حملہ کرتے ہوئے بے ساختہ زبان پر یہ بھی آتا کہ "انا اعلم بابی سینا" اور اپنے اس دعوے کی دلیل اس طرح ارشاد ہوتی کہ،

"ارسطو کا فلسفہ شیخ الرئیس تک کل ایک ہی سند سے پہنچا، جب کہ اس فلسفے کو میں نے تین سندوں سے حاصل کیا ہے"

آپ کے ان پیہم حملوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ منطق و فلسفہ کا غلبہ آہستہ آہستہ ٹوٹا اور بتدریج صوفیائے اسلام کے علوم و معارف سے وابستگی بڑھتی گئی،

اسماء الرجال جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ حدیث کا نصف فن اسماء الرجال میں ہے، لیکن افسوس کہ پچھلی نصف صدی میں درسگاہیں اس بلند فن سے تقریباً ناواقف ہو گئیں، اب حدیث کا درس برابر ہوتا ہے، لیکن مدار حدیث، اسناد، احوال رواۃ، اقسام حدیث اور پھر اس فن کے دقیق مباحث زیر بحث نہیں آتے، امام العصر نے اس مرحوم فن کو درس میں دوبارہ زندہ کیا۔ اور بلا مبالغہ آپ اس کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار ہیں، ذیلاً یہ کام بھی کیا کہ جن احادیث سے احناف کو فائدہ پہنچتا، اور دوسرے فقہی مکاتیب کی اساسی شخصیتوں نے ان ہی احادیث کے اسنادی سلسلے کو مجروح بنا کر نا قابل استدلال کرنے کی کوشش کی، حضرت شاہ صاحب مرحوم نے ان رواۃ کی توثیق اور تعدیل فرما کر مسلک حنفیہ کے علمی ذخیرہ کو قابل استعمال کیا۔ یہی نہیں بلکہ احناف کی جانب سے دفاع و جواب دہی میں آپ نے ان گوشوں کو نمایاں کیا، جن پر تبحر علمی کے بغیر واقفیت ممکن نہیں حافظ ابن حجر عسقلانی کی زیادتیوں کو خاص طور پر زیر بحث لا کر ان کے تعدی و تجاوز کو اس طرح آشکارا فرمایا کہ کم از کم ان کے مستفیدین اب حافظ کے طرز و تعصب سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

کتابی حوالے اور استناد

آپ کی درسی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کتابی حوالہ جس سے اذہان خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں، ان کا رواج درس گاہوں میں یکسر ختم ہو گیا تھا، حالانکہ کسی ایک ہی حدیث کی مزید تفصیل، یا اسی حدیث کا باقی ماندہ حصہ مختصر احادیث میں سے کسی دوسری جگہ ملتا ہے، حدیث پر ناتمام واقفیت کی بنا پر ایک محدث تشریح و تفسیر کی ذمہ داریوں سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک احادیث کے پورے ذخیرے پر اس کی نظر نہ ہو۔ پھر مسلک احناف کے اثبات و تائید کے لیے جن احادیث سے کام لیا جاتا، وہ عام طور پر

حضرات شوافع کے ترتیب وار دہ مجموعوں میں موجود نہیں ہے، الامام کشمیریؒ اس گر پر خوب واقف تھے اور اپنی وسعت مطالعہ کے نتیجے میں کارآمد احادیث کے مواقع پر آپ کی اطلاع تام تھی، چنانچہ درس میں جا بجا آپ ان احادیث کی نشاندہی فرماتے، مولانا محمد منظور نعمانی آپ کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> "درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں، جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ دوران تقریر ہاتھ بے تکلف اسی کتاب پر جاتا، جس کا وہ حوالہ دینا چاہتے اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں پڑھتے ہوئے اس طرح کتاب کھولتے کہ اکثر تو وہی صفحہ کھلتا تھا، جس پر حدیث ہوتی ورنہ دو چار ورق الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے آجاتی۔"
>
> (بحوالہ تذکرہ)

آپ کے اس انداز سے درس خاص طور پر متاثر ہوا اور مسائل کی تنقیحات طبع زاد چیزیں نہ رہیں، بلکہ ان کو حقائق کے انداز میں قبول کیا گیا اور ایک خاص فائدہ اس صورت میں یہ بھی سامنے آیا کہ آپ سے استفادہ کرنیوالے اب ہوائی تقریروں کے نہ سننے کے عادی رہے اور نہ کرنے کے۔

حنفیت اور درس کی تائید

دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور فاضل اور مجاہد جلیل مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے مسلک دارالعلوم کا ایک مدبرانہ تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ دارالعلوم کا اساسی مقصد حنفیت کی تائید ہے، اب بے تکلف عرض ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کے درس سے یہ اہم مضمون اپنی مطلوب واقعیت کے ساتھ منصرص نہ ہو سکا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ حنفی نقطۂ نظر سے ہم آہنگی کے باوجود کیونکہ خود اجتہاد کا دعویٰ رکھتے تھے، اس لیے حنفیت کو حضرت شاہ صاحب کی غزارۂ علمی سے ممکن و متوقع فائدہ نہیں پہنچ سکا، لیکن اس کمی کی دارالعلوم دیوبند نے بھرپور تکمیل کی، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ نے حنفیت کی تائید کے لیے اپنی تدریس و تصنیف میں بے مثال کام انجام دیا، لیکن اس حقیقت کے اظہار میں بھی کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ سیدنا الامام کشمیری نے اپنی عبقریت خاص اس مقصد شریف کے لیے اس طرح صرف فرمائی کہ بقول آپ کے:

> "میں نے حنفیت کو اس طرح مستحکم کر دیا کہ اب انشاء اللہ سو سال تک اس کی بنیادیں غیر متزلزل رہیں گی۔"

بلکہ حنفی مکتبۂ فکر کی تائید میں جو کام خدائے تعالیٰ نے آپ سے لیا، اسی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو اس حقیقت کے بیان میں بھی کوئی تامل نہیں تھا۔

> "خدائے تعالیٰ نے مجھے اس عہد میں حنفیت کے استحکام کے لیے پیدا کیا ہے۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے بیانات پر کوئی شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، چونکہ حضرت مرحوم نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ فقہ حنفی کی مضبوط بنیادوں کی تلاش میں صرف کیا۔ آپ فقہ حنفی کے صرف مقلد ہی نہیں، بلکہ محقق تھے اور ان تمام مظالم پر آپ کی گہری نظر تھی، جن کا مقصد امام ابوحنیفہ کے فقہ کو کمزور و بے بنیاد ثابت کرنا تھا ڈابھیل میں ایک تقریر کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا،

"میں نے اپنی عمر کے ۳۰ سال صرف اس مقصد

کے لیے صرف کر دیئے کہ یہ دیکھوں کہ فقہ حنفی حدیث
کے مطابق ہے یا نہیں، سو میں اپنی ۳۰ سالہ محنت
کے بعد مطمئن ہوں کہ جہاں جس درجے کی حدیث
دوسرے فقہا کے پاس ہے، اسی درجے کی
حدیث امام اعظم کے پاس بھی ہے اور جہاں
حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام ہمام نے مسئلے
کی بنیاد قیاس پر رکھی ہے وہاں خصم کے پاس
بھی کوئی حدیث نہیں"

غرضیکہ حضرت شاہ صاحب فقہ حنفی کی حقانیت، صداقت اور اقرب الی السنۃ ہونے کے اپنی علمی کاوشوں کے نتیجے میں گہرے معتقد تھے اور آپ نے دارالعلوم دیوبند کے اس مسلک کی بھرپور تائید کی، جس کے اجزاء میں بقول مولانا سندھی:

"حنفیت کی تائید و استحکام جوہری حیثیت
سے شریک ہے"

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قدیم فلاسفہ کی موشگافیوں کو پسند نہ فرماتے اور اس کے مقابل طلباء کو سائنس جدید اور نئے علوم کی اہمیت پر بتاکید مطلع رکھتے۔ بھوپال میں ایک موقع پر کسی جدید تعلیمیافتہ کے اس سوال پر کہ فلسفہ قدیم اور سائنس جدید میں اسلام سے کون قریب ہے؟ آپ کا واشگاف اعلان تھا کہ:

"سائنس جدید اقرب الی الاسلام ہے"

الحاصل امام العصر کا عہد تعلیم و تدریس اپنی گوناں گوں خصوصیت کی بناء پر ایک ایسا انقلاب تھا، کہ نصف صدی سے ہند و پاکستان کے مدارس ہی ان پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں جو مرحوم نے اپنی غزارۂ علمی تبحر، گہرائی اور گیرائی سے پیش کی تھیں اور عملی طور پر یہ سمجھایا تھا کہ حدیث و قرآن ہی تمام اسلامی علوم کے سرچشمے بلکہ اسلام کی اساس ہیں اور جس وقت آپ دیوبند کو چھوڑ کر ڈابھیل منتقل ہو گئے۔

حضرت مولانا مدنی اور ان کی درسی خصوصیات

صداقتی ذمہ داریاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خاص تربیت دادہ عارف باللہ و حق آگاہ شخصیت یعنی مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کی جانب منتقل کی گئیں، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ کا کافی وقت مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں درس و تدریس میں گزرا۔ یہیں وہ رویائے صادقہ بھی پیش آیا کہ مرحوم نے رسالت مآب جناب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، اور اس ارشاد پر کہ کیا مانگتے ہو؟ عرض کیا کہ جو کچھ پڑھ چکا ہوں، اس میں رسوخ کی دولت عنایت ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا اپنے علوم میں بے نظیر اور حدیث کی تدریس و تعلیم میں اسلاف کے صحیح جانشین تھے، دارالعلوم دیوبند جسے الامام کشمیری ایک نئے رخ پر ڈال چکے تھے اور جہاں کی تعلیمی کیفیات ایک خوشگوار انقلاب کی امین تھیں؛ آپ ان ہی امتیازات و خصوصیات کو نبھانے کی کوشش فرماتے؛ اگرچہ اس راہ کی ان دشواریوں پر آپ مطلع تھے، جو ایک جلیل محدث کو پیش آسکتی ہیں، جس سال راقم السطور دورۂ حدیث شریف میں تھا تو ترمذی شریف کے ابتدائی درس میں فرمایا:

"کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے بے
نظیر حافظہ اور یادداشت سے کام لے کر درس کا
رنگ بدل دیا، وہ اپنی تبحر علمی کی بنا پر اس طرز کو
خوب نبھاتے، لیکن ہم ایسوں کے لیے بڑی دشواریاں
پیدا ہو گئیں"

اس اعتراف کے باوجود کبھی حل طلب مسئلے پر آپ کی تقریر جامع ہوتی، حنفیہ کا استحکام، عہدی فتنوں کی تردید، حدیث کے مالہٗ

وما علیہ پر مفصل کلام، اکابر کے اقوال خصوصاً حضرت مولانا نانوتوی کے معارف وعلوم سے دلچسپی اور ان کے ترجمان تھے، حدیث کی اکثر کتابیں سامنے رہتیں اور ضرورت پر کتابوں کو کھول کر جواب دیئے جاتے طلبا پر بے پناہ شفقت تھی اور ہر سوال خواہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو۔ اس کا جواب دینے میں کوئی تکدر محسوس نہ فرماتے ۔

تقریر میں بہت بسط اور کسی بھی مضمون کے تمام گوشوں کو واضح کر دینے کے عادی تھے. مطالعے کا خاص اہتمام رہتا، طویل اسفار کے بعد دیوبند واپسی ہوتی اور فوراً ہی درس کے لیے درسگاہ میں تشریف آوری لیکن اس مختصر وقفے میں بھی ضروری مطالعہ کر لیا جاتا، آپ کے متصلاً بعد حضرت مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی کا مشترک دور رہا ہے۔ اول الذکر منقولات کے ماہر اور ثانی الذکر معقولات میں متبحر تھے۔ دونوں حضرات دارالعلوم کی خصوصیات اور اس کے امتیاز کے حافظ و امین اور درس میں اسی اختصاصی پہلو کے ترجمان و داعی تھے، جو وراثۃً اپنے اکابر سے پہنچا تھا، مولانا فخرالدین صاحب، حضرت شیخ الہند اور سیدنا الامام کشمیری کے براہ راست شاگرد تھے، اور جناب مولانا بلیاوی صاحب حضرت شیخ الہند کے حلقہ درس کے مستفید مولانا مرادآبادی مرحوم کے درس میں بسط و تفصیل اور حاصل مطالعہ من وعن پیش کر دینے کی عادت تھی، مولانا بلیاوی صاحب ایجاز و اختصار کے خوگر، افسوس کہ جب یہ دونوں حضرات اس کائنات علم و فن سے جدا ہوئے تو علم کا وقار، دین و دانش کی آبرو، وجاہت علمی اور فضل و کمال بھی انکے جنازوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور ایک عظیم درسگاہ اس کمی کی تلافی کے لیے چشم براہ ہے جس کے آثار زوبشوں میں آج بھی نمایاں اور ایک خوش گوار عہد کی تمہید بننے کے لیے بے قرار ہیں ۔۔

ہ بخاری شریف کا سبق سال کے آخری حصے میں شب میں بھی ہوتا، گرمیوں کی مختصر راتیں اور شب و روز کی مسلسل مشغولیت کی بنا پر کچھ طلبا مصروف خواب ہوتے، قریب کا کوئی طالب علم حضرت والا کو مطلع کرتا تو ایک خاص لہجے میں "رئیس النائمین" کو ارشاد ہوتا، کہ

"اٹھیے، اٹھیے، مٹکے میں منہ لگا کر آئیے ۔

غریب طالب علم اپنی جگہ سے اٹھتا تو اس کے عقب سے یہ مزید جملہ ہوتا کہ "ہائے کیا بھری محفل میں رسوائی ہوئی":

اس پر پوری درسگاہ زعفران زار ..... بن جاتی، اتفاقاً ایک روز ایسا ہی حادثہ خود حضرت والا کو بھی پیش آگیا، ہوا یہ کہ ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد فوراً ہی درسگاہ تشریف لے آئے، سفر کی صعوبتوں کی بنا پر نیم جان ہو رہے تھے، چند ہی لمحات کے بعد اس قرینے و سلیقے سے بیٹھے بیٹھے مصروف خواب ہوئے کہ جسم میں جنبش کا نام و نشان نہ تھا، معمول یہ تھا کہ حدیث پر کچھ ارشاد فرمانا ہوتا، تو تقریر شروع ہو جاتی اور اگر سابق میں یہ مضمون گزر چکا تو فرماتے کہ چلیے اور اس روز حدیث ہوتی رہی اور حضرت کا مسلسل سکوت، طلبا محسوس کر گئے کہ حضرت مصروف خواب ہیں، قرأۃ حدیث روک دی گئی تاکہ آپ کے آرام میں خلل نہ آئے، پھر اس سکوت پر حضرت بیدار ہو گئے، طلبا کا اصرار کہ حضرت والا بھی اٹھ کر وضو فرمائیں، بہت دیر رد و قدح ہوتی رہی، بالآخر کھانے کی دعوت پر اس دلچسپ جنگ

کا اختتام ہو گیا. ۳۰ سال سے زائد اس واقعے پر گزر رہے ہیں، مگر ان حسین یادوں سے دل و دماغ آج تک لبریز ہیں. سر پر عربی سبز رومال، عبا زیب تن، پاؤں میں خفین، چوڑا چکلا جسم، وجیہ چہرہ، گھنی ڈاڑھی، پر نور و پر ہیبت آنکھیں، جب مصروف خرام ہوتے، تو حقیقۃً امیر المومنین فی الحدیث چلتا پھرتا نظر آتا، اسی سے متجاوز سن مبارک تھا، مگر بینائی اس قدر طاقتور کہ رات کا درس "قسطلانی" مطبوعہ مصر میں ہوتا، اور کسی چشمے کی مدد کے بغیر وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں اب جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تمت بالخیر ۔۔

[illegible]

دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں

دارالعلوم دیوبند کی شاندار اور پرشکوہ عمارات کا دلکش تحریری مرقع جسے پڑھ کر دارالعلوم کا سماں نظروں میں پھرنے لگتا ہے

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند — ہند میں تُو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

> اگرچہ عمارتیت کی ایک رنگا رنگ کا ضروری جزو نہیں ہیں، پہلے زمانہ میں استاذ درختوں کے سائے میں بیٹھ کر درس دیتے تھے اور طلبا فرش زمین پر بیٹھ کر تحصیل علم کرتے تھے، ہماری قدیم تعلیم کا طغریٰ امتیاز تھا لیکن پھر بھی کسی تعلیم گاہ سے دلچسپی رکھنے والے فطری طور پر یہ جاننے کے ضرور متمنی ہوتے ہیں کہ اس کی تعمیر کا نقشہ کیا ہے اور اس کا جغرافیہ کس طرح واقع ہوا ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ محض الفاظ کے ذریعے عمارتوں کی اصل ہیئت اور ان کے خط و خال کی تصویر پیش کرنا ممکن نہیں ہے، بایں ہمہ قلم نے باز جہل تھے کے پیش نظر امید ہے کہ اس خاکہ کے ذریعے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں اگر تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی کچھ نہ کچھ اندازہ آپ ضرور ہو جائے گا۔ —— مدیر

نارتھ رن ریلوے اسٹیشن کو شہر سے ملانے والی سڑک کے آخری سرے پر دیوبند کی آبادی کے شمال مغرب میں **دارالعلوم دیوبند** کی سادہ مگر پرشکوہ قلعہ نما عمارت وسیع قطعۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔

مسجد دارالعلوم

دارالعلوم میں آنے کے لیے آپ سب سے پہلے دارالعلوم کے مشرقی دروازے میں داخل ہوں گے۔ یہاں پہنچتے ہی داہنی جانب دارالعلوم کی شاندار دو منزلہ خوشنما مسجد ملتی ہے، مسجد کی روکار اور مینار سنگ خارا سے بنے ہوئے ہیں، ان پر نہایت دل آویز نقش و نگار کندہ ہیں۔ صحن مسجد میں سنگ مرمر کا خوب صورت مربع حوض ہے، جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے، وسط حوض میں فوارہ لگا ہوا ہے، جس میں بجلی کے ذریعے سے پانی آتا ہے ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۰ء میں وقت کے منتخب علماء و صلحاء نے مسجد کی بنیادیں خود اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کی تھیں۔

یہاں پنجگانہ اوقات میں نمازیوں کی کثرت اور ہجوم کو دیکھ کر جمعہ و عیدین کا منظر نظر آتا ہے، لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اذان کا سماں عجیب کیف آور ہوتا ہے، روکار کی پیشانی پر سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔

در مدرسہ مسجدے بنا شد
بر لوح جبینش اسم اعظم
در سجدۂ شکر چوں فتادم
مقروں شدہ عبادت و علم
۲۹ ۱۳ ھ

ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
خواندم چو بصحن او رسیدم
در گوش رسید ایں شنیدم
در مدرسہ خانقاہ دیدم
۲۹ ۱۳ ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے، بالائی منزل ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

دارالشفاء مسجد کے جنوب اور مشرق میں دارالشفاء واقع ہے۔ یہاں مریض طلبا اپنے مرض کی تشخیص اور نسخہ تجویز کرا کر ایسے عطار خانوں سے دوائے لیتے ہیں، جو دارالعلوم کی جانب سے طلبا کے لیے مقرر ہیں، امسال اس شعبے میں خاص ترقی ہوئی ہے اور دارالشفاء کے نام سے مخصوص کمرے، بستروں اور تیمارداروں کا بھی مناسب انتظام کیا گیا ہے، جس میں ضروری مرکبات اور پیٹنٹ ادویہ کا ذخیرہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔

سال گزشتہ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء میں مجموعی طور پر ۲۲۵۹ مریض طلبا اس شعبے میں زیر علاج رہے، ان کے معالجے پر ۸۲۱ روپے ۱۲ آنے ۳ پائی صرف ہوئے، گویا فی مریض ۶ آنے سے بھی کم کا اوسط ہے، مولانا حکیم محمد عمر صاحب اس شعبے کی تعلیمی اور معالجاتی خدمات انجام دیتے ہیں، خواہش مند طلبا کو باقاعدہ فن طب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، طبیب صاحب کی زیر نگرانی دو کارکن مقرر ہیں، دارالشفاء کا کام ابھی تک عارضی کمروں سے لیا جا رہا ہے، اس کے لیے مستقل عمارت ارباب خیر کی فیاضی کی منتظر ہے۔

دارالافتاء مسجد کی مشرقی جانب وہ سامنے بالائی منزل پر دارالافتاء کی جدید شاندار عمارت واقع ہے، یہ تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔ اس دارالافتاء سے ہندوستان و پاکستان کے ہزاروں مسلمان ہر سال خط و کتابت کے ذریعے شرعی مسائل میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ صرف ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء سے ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء تک دارالافتاء سے جو فتوے دیئے گئے، ان کی تعداد ۱،۱۰،۱۴۲ ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء کی تعمیر ہے۔

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب اور جناب مولانا قاضی مسعود احمد اور جناب مولانا سید احمد علی صاحب سعید فتاویٰ نویسی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ نقل فتاویٰ کے لیے تین محرر مامور ہیں۔

مہمان خانہ مسجد کے جنوبی گوشے میں دوسری منزل پر مہمان خانہ واقع ہے، جو دارالعلوم کے مہمانوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے یہاں ایک خادم مامور ہے، جو مہمانوں کی خدمات انجام دیتا ہے۔

دفتر تنظیم مہمان خانہ کے برابر ہی یہ شعبہ تنظیم ترقی کا دفتر ہے۔ اس شعبے کا مقصد دارالعلوم کی مالیات کو تقویت پہنچانا ہے، سال گزشتہ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء میں شعبہ تنظیم کے ذریعے سے دارالعلوم کو تقریباً ایک لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی، پچھلے دو سال سے دارالعلوم کے طلبا و ملازمین کی سال بھر کی خوراک کے لیے قریبی مقامات سے پانچ چھ ہزار من غلہ کی فراہمی بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔

شعبہ تنظیم میں ۱۹ سفیر مامور ہیں، جو ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے اپنے مقصد کی اشاعت کرتے ہیں اور کم و بیش ہر جگہ سے انھیں مالی اور اخلاقی امداد ملتی رہتی ہے، ہر سفیر کے لیے سال بھر میں کم از کم ڈھائی ہزار روپے کی فراہمی اور دو سو دن سفر میں گزارنا لازمی ہے مولانا محمود احمد صاحب گنگوہی اس شعبے کے ناظم ہیں اور سفراء کی مذکورہ تعداد کے علاوہ دفتری خدمات کے لیے تین محرر اور ایک چپراسی ہے۔

دفتر امور متفرقات مسجد دارالعلوم سے آگے بڑھنے پر صدر دروازے کے متصل ہی بائیں جانب آپ کو امور متفرقات کا دفتر ملے گا، دارالعلوم کی روشنی، آب رسانی، دربانی اور باغبانی کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔ ان امور کے علاوہ دارالعلوم کے مہمانوں

کے استقبال اور پذیرائی کے فرائض بھی یہی شعبہ انجام دیتا ہے، پیرجی محمد عمر صاحب نگوہی اس شعبے کے ناظم ہیں، ان کے تحت متعدد کارکن متعلقہ خدمات پر مامور ہیں۔

دفتر محاسبی

دفتر امور متعلقات کے اوپر یعنی مسجد کے بالمقابل بائیں جانب یہ شعبۂ محاسبی کا دفتر ہے اسکا خوبصورت حجرہ دیکھنے والے کو فوراً اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے، دارالعلوم کی جملہ آمد و صرف کا تعلق اسی شعبے سے ہے۔ سالِ رواں ۷۲-۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کے مصارف کی تعداد ۴،۱۵،۸۰۲ روپے ۹ آنے ۲ پائی ہے۔

دارالعلوم کے یہ عظیم الشان مصارف عام چندے کے ذریعے سے پورے ہوتے ہیں، اس سلسلے میں حکومت سے امداد لینا دارالعلوم کی روایات کے خلاف سمجھا گیا ہے۔

وہ دیکھئے دارالعلوم کا خزانہ بھی اسی دفتر کے مشرقی گوشے میں واقع ہے جس پر مضبوط آہنی سلاخوں کے کواڑ لگے ہوئے ہیں۔

دفتر کے محاسبی اندراجات مروجہ حسابی طریق کے مطابق نہایت واضح اور صاف رکھے جاتے ہیں اور جانچ پڑتال کے لیے اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا ہے، دفتر محاسبی کے حسابات کی عمدگی کو تقریباً ہر وارد و صادر نے سراہا ہے، ایک مرتبہ کانپور کے مشہور تاجر حافظ محمد حلیم صاحب نے اپنے معائنے میں لکھا تھا کہ:

> "مدرسہ کا حساب نہایت اطمینان بخش ہے، اندراج جمع وخرچ باقاعدہ ہوتا ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ معطی کا عطیہ اس کے حسب منشا مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔"

طلبا کے وظائف اور ان کے کپڑے کی تقسیم کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔ دارالعلوم میں مفت تعلیم کا انتظام ہونے کے ساتھ ساتھ غریب اور حاجت مند طلبہ کو کھانے کے علاوہ پہننے کے لیے کپڑے، جوتے اور دوسری ضروریات کی تکمیل کے لیے نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس سال ۷۲-۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے امداد پانے والے طلبا چھ سات سو کے درمیان ہیں۔ علی العموم فی کس مصارف طعام کا اوسط دس بارہ روپے ماہانہ رہتا ہے۔ دفتر محاسبی میں آٹھ کارکن کام کرتے ہیں، شعبے کے ناظم مولوی عبدالاحد صاحب ایک تجربہ کار محاسب ہیں، ان کو دارالعلوم کا سالانہ بجٹ تیار کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے، دارالعلوم کے اوقاف کی نگرانی بھی شعبہ کرتا ہے۔

شعبۂ تعمیرات کا دفتر بھی اسی شعبے میں واقع ہے، شعبۂ تعمیر میں بابو رفیق احمد صاحب سب اوورسیر مع ایک ماتحت ملازم کے مامور ہیں، دفتر محاسبی کی یہ عمارت ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

محافظ خانہ

دفتر محاسبی سے آگے بڑھنے پر آپ کو بالائی منزل ہی پر محافظ خانہ کی دو منزلہ عمارت ملے گی۔ یہاں دارالعلوم کی قیمتی دستاویزات اور تمام شعبوں کے اہم کاغذات نہایت مرتب طریق پر محفوظ رکھے جاتے ہیں اور دارالعلوم کے آغاز قیام ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء سے اب تک ۹۰ سال کا تاریخی سرمایہ نہایت احتیاط اور ترتیب کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ یہاں آپ کو الماریوں میں مختلف رنگ نظر آئیں گے۔ دارالعلوم میں ۱۰ شعبے ہیں، ہر شعبے کے کاغذات کے لیے ایک رنگ خاص کر دیا گیا ہے۔ ان مختلف رنگوں کی وجہ سے ہر شعبے کے کاغذات بآسانی پہچانے جاسکتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء کی تعمیر ہے، محافظ خانہ کی خدمات راقم السطور سے متعلق ہیں۔

ادارۂ اہتمام

مسجد میں جس زینے سے آپ داخل ہوئے تھے، اسی زینے میں ایک دوسرا زینہ ہے، ادارۂ اہتمام میں جانے کا

یہی راستہ ہے، ادارۂ اہتمام دارالعلوم کا وہ مرکزی مقام ہے جس سے پورے دارالعلوم کا انتظام وانصرام وابستہ ہے، صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر دوسرا دروازہ ہے۔ ادارۂ اہتمام کی شاندار اور وسیع عمارت اسی دروازے کے اوپر واقع ہے "جائے عجیب غریب" ۱۳۱۵ھ/ اس کی تعمیر کا مادۂ تاریخ ہے۔ ادارۂ اہتمام کی عمارت تین کمروں پر مشتمل ہے۔

فخر الاماثل حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مسند اہتمام پر اور حضرت مولانا سید مبارک علی صاحب نیابت اہتمام پر رونق افروز ہیں، مولانا عبدالحق صاحب غازی پوری حضرات ممدوحین کی پیشکاری کے فرائض اپنے ماتحت عملے کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

ماہنامہ دارالعلوم

ادارۂ اہتمام کے شمال میں ماہنامہ دارالعلوم کا دفتر ہے، یہ ماہنامہ دارالعلوم کی آواز اور اس کے مسلک کا ترجمان ہے، جو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی نگرانی اور صاحبزادہ سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، مجلہ "دارالعلوم" اپنے علمی، دینی اور اصلاحی مضامین کے ذریعے عامۂ مسلمین کی زبردست خدمات انجام دے رہا ہے، یہ ماہنامہ اپنے معنوی محاسن کے ساتھ کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی اردو کے بلند پایہ پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کا مختصر سا دفتر تین کارکنوں پر مشتمل ہے۔

شعبۂ دارالاقامہ

یہ شعبہ آٹھ (۸) وسیع احاطوں اور دو سو بیس کمروں پر مشتمل ہے، ہر کمرے میں اس کی وسعت کے لحاظ سے طلبا کو رکھا جاتا ہے، کم و بیش سات آٹھ سو طلبا اس دارالاقامہ میں ہر سال مقیم رہتے ہیں، یہاں ایشیا کے تقریباً ہر ملک کے طالبانِ علم آپ کو نظر آئیں گے جو اپنی اپنی زبان بولتے ہوئے ملیں گے، ہندوستان و پاکستان کے علاوہ، کابل ایران، وسطِ ایشیا، چین، برما، سیلون، سیام، ہند چینی، ملایا، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ، وغیرہ ممالک کے مختلف رنگ و نسل اور شکل و صورت اور وضع قطع کے لوگوں کا اجتماع ایشیائی مسلم ممالک کی تہذیب و تمدن کا ایک ایسا گلدستہ یہ دارالاقامہ پیش کرتا ہے، جو اپنی بوقلمونی اور ندرت کے اعتبار سے بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس درسگاہ کی کشش نے اپنے گلشن میں کیسے کیسے گل بوٹے جمع کر لیے ہیں۔ اس لیے احاطۂ دارالعلوم کو اگر ایک ایسے علمی اور بین الاقوامی شہر سے تعبیر کیا جائے، جو تمام ایشیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

ایک بڑے سرکاری افسر نے اپنے معائنہ دارالعلوم میں لکھا ہے:

" مجھے اس تعلیم گاہ کے طلبہ سے ملنے کا اکثر موقع ملتا ہے
اور کبھی کبھی مختلف بحثوں پر ان سے گفتگو بھی کرتا ہوں،
ان میں غیر معمولی قوتِ مناظرہ ہوتی ہے اور ہندوستان
کے گریجویٹوں کی قوتِ مناظرہ سے کہیں زیادہ ہوتی
ہے۔"

دارالاقامہ کے دفتر کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طلبا کے قیام کے لیے کمروں کی تجویز و تعین کرے۔ اور ان کے اخلاقی امور کی نگرانی رکھے، اس کام کیلئے متعدد اساتذہ منتخب کیے جاتے ہیں، جو ایک دفتری محرر کے ذریعے یہ فرائض انجام دیتے ہیں۔ احاطہ ہائے دارالعلوم کی شب و روز کی نگرانی کے لیے دس افراد دربانی و چوکیداری کی خدمت پر مامور ہیں۔

شعبۂ تعلیمات

دفتر دارالاقامہ سے آگے بڑھ کر مغرب کی جانب آپ کو دفتر تعلیمات نظر آئے گا، اس شعبے میں آپ فاضل اساتذہ کو صرف و نحو، معانی، عروض، ادب، تاریخ، منطق، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت تجوید و قرأت، طب، مناظرہ، عقائد، کلام، اصول فقہ، فقہ، فرائض

اصول حدیث، حدیث، اصول تفسیر اور تفسیر وغیرہ علوم کی ۱۰۶ کتابوں کی طلبا کو تعلیم دیتے ہوئے مصروف پائیں گے، یہ اساتذہ اپنے زبردست علم و فضل اور تبحر کے باوجود نہایت معمولی مشاہروں پر خلوص و ایثار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اپنے کام کو فرض شناسی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں علمائے جامعہ ازہر مصر کے ایک وفد نے جو ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں دیوبند آیا تھا۔ اساتذہ دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"یہاں ہم نے ایک ایسی جماعت کی زیارت کی جس نے اپنی زندگی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول وغیرہ علوم دینیہ کے لیے وقف کر دی ہے یہاں کے اساتذہ سے مذاکرۂ علمی کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ خدمت علوم میں انہیں کامل دسترس اور زبردست مہارت حاصل ہے۔"

ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا سید فخر الحسن صاحب، مولانا ظہور احمد صاحب، مولانا محمد جلیل صاحب، مولانا سید اختر حسین صاحب، مولانا عبد الاحد صاحب، مولانا معراج الحق صاحب، مولانا سید حسن صاحب، مولانا محمد حسین صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا نصیر احمد خاں صاحب، مولانا قاری اصغر علی صاحب، مولانا سعید احمد صاحب، مولانا محمد عثمان صاحب، مولانا محمد ہارون صاحب، مولانا محمد سالم صاحب، مولانا محمد اسعد صاحب، مولانا فیض علی شاہ صاحب، مولانا محمد انظر شاہ صاحب، قاری حفظ الرحمٰن صاحب، قاری محمد عتیق صاحب، قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانی، قاری احمد میاں صاحب:

مذکورہ اساتذہ کے علاوہ شعبۂ تعلیمات سے متعلق دفتری امور کی انجام دہی، طلبا کی حاضری و غیر حاضری کے رجسٹروں کی ترتیب سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحانات کے نتائج کا اندراج، طلبا کے سرپرستوں کو طلبا کے تعلیمی نتائج اور اخلاقی حالات سے باخبر رکھنا اور داخلہ وغیرہ امور دفتر تعلیمات کے فرائض ہیں۔ نظامت تعلیمات میں ۶ کارکن متعلقہ خدمات انجام دیتے ہیں، صدر المدرسین عموماً اس شعبے کے ناظم ہوتے ہیں، اور نائب صدر مدرس، نائب ناظم، اس وقت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ صدارت تدریس و نظامت تعلیمات اور حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نیابت کی مسند پر رونق افروز ہیں، منشی محمد عزیز صاحب دفتر تعلیمات کے نگراں ہیں۔

اب آئیے! ذرا ایک سرسری نظر امسال کے زیر تعلیم طلبا کے اجتماع پر بھی ڈال لیجیے۔ اگرچہ انقلاب زمانہ سے اس کی سابقہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ ہندو پاکستان کے درمیان پاسپورٹ سسٹم کی وجہ سے طلبا کی آمد و رفت میں پہلی سی سہولت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہر طرح کی دقتوں اور دشواریوں کے باوجود یہ چشمۂ فیض اپنی خصوصیات کے ساتھ تشنگان علم کی ایک بڑی تعداد کو سیراب کر رہا ہے۔

بیرون ہند

پاکستان (مشرقی و مغربی)	۲۰۳	کشمیر (پاکستان)	۲
بدخشان	۲	نیپال	۲
برما	۳۰	انڈونیشیا	۱

قندھار	۲	جنوبی افریقہ	۳
ختن	۲	انڈونیشیا و ملایا	۸
کابل	۱	سیلون	۲

کل میزان —— ۲۵۸

ہند

مغربی بنگال	۶۱	بمبئی	۴۱
آسام	۱۵۲	ریاست ہائے ہند	۲۶
بہار	۱۴۴	مشرقی پنجاب دہلی	۷
مدراس	۴	اترپردیش	۴۹۸
برار	۱		

کل میزان —— ۹۲۵

ان طلباء کی تعلیمی تقسیم یہ ہے :

عربی	۸۹۴	حفظ قرآن	۶۱
فارسی	۱۰۲	ناظرہ قرآن شریف	۸۹
قرأت و تجوید	۴۷		

کل میزان —— ۱۱۹۳

احاطۂ مولسری

ادارۂ اہتمام کے زیریں دروازے سے گزرنے پر احاطۂ مولسری آتا ہے، جس میں مولسری کے کھڑے ہوئے دو درخت اس احاطے کی وجہ تسمیہ کا پتہ دیتے ہیں، اسی احاطے میں وہ کنواں ہے، جو دارالعلوم کی ابتدائی تعمیر کے وقت بنا تھا یہ کنواں دارالعلوم میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ دارالعلوم کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ جو ایک صاحب حال بزرگ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ خلفاء میں تھے، اُن کے زمانہ اہتمام میں یہ کنواں تعمیر ہوا تھا، انھوں نے خواب میں دیکھا کہ :

"یہ کنواں دُودھ سے بھرا ہوا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالے سے دُودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دُودھ سے بھروا کر لے جا رہا ہے"

مولانا نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے کے فرق کی یہ تعبیر فرمائی کہ :

"اس سے ہر شخص کا "ظرف علم" مراد ہے، جس کا جتنا ظرف ہے، اسی قدر علم اس کے نصیب و حصے میں آئے گا!"

احاطۂ مولسری کے ہر چہار سمت میں درسگاہیں اور دارالاقامے واقع ہیں۔

نودرہ

احاطۂ مولسری کی مغربی جانب نودرہ کی وہ مشہور عمارت ہے، جو اپنی مضبوطی اور پرکاری میں دیکھنے والے کو محو حیرت کیے بغیر نہیں رہتی، دارالعلوم کی یہ سب سے قدیم درسگاہ اور سب سے پہلی عمارت ہے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء کے اواخر میں قیام دارالعلوم کے دس سال بعد اس کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۷ء سے تعمیر شروع ہوئی، اس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کاندھلویؒ جیسے علماء و صلحاء اور مشائخ وقت کا رکھا ہوا ہے، اس وقت دیوبند کے اطراف و جوانب کا بہت بڑا مجمع موجود تھا، سب لوگوں نے نہایت خشوع و خضوع اور الحاح و زاری کے ساتھ

دارالعلوم کے لیے (جو اپنی عمر کی دس منزلیں اب تک طے کر چکا تھا) دعا کی۔ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے فرمایا:

"عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا:

اشرف عمارات (۱۲۹۲ھ) اس کی تعمیر کا مادۂ تاریخ ہے، نودرہ کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجے میں ۹، ۹ دروازے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ (جن کے زمانۂ اہتمام میں نودرہ تعمیر ہوا) تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلوب میں الہام ہوا تھا"

احاطۂ مولسری کی تعمیر کے وقت مولانا رفیع الدین صاحبؒ ہی نے یہ خواب دیکھا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احاطۂ مولسری میں تشریف رکھتے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ "احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طول و عرض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ "ان نشانات پر تعمیر کی جائے" مولاناؒ نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرا دی گئی۔

ہمارے شاعر انقلاب انور صابری صاحب نے اپنے ان شعروں میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

خواب میں جس کے مبشر تھے شفیع دو جہاںؐ
نودرہ اس خواب ماضی کی حسیں تعبیر ہے
اس کے دامن سے ابلتے ہیں وہ چشمے فیض کے
جن کا حاصل زندگی کی آخری تفسیر ہے

احاطۂ باغ — احاطۂ مولسری کے شمال میں چند کمروں پر مشتمل یہ وہ مختصر سا خوبصورت دارالاقامہ ہے، جس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و سیاسی تلمیذ رشید اور مشہور انقلابی رہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا قیام رہا، آزادیٔ ہند کی کش مکش کا یہی وہ تاریخی مقام ہے، جہاں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مشہور "ریشمی خطوط" کی تحریک جاری ہوئی تھی۔

دارالحدیث

جس طرح دارالعلوم کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درس گاہ ہے، جو اسلامی علوم کے عین زوال کے وقت قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے۔ جو اس خاص نام سے عالم وجود میں آئی۔ نودرہ جس کو ابھی ابھی آپ نے دیکھا ہے، اسی کی بالائی منزل اور پشت پر دارالحدیث کی یہ طویل و عریض سر بفلک عمارت واقع ہے۔ یہ عمارت دو حصوں پر منقسم ہے، نودرہ کی پشت پر جو عمارت ہے۔ قدیم دارالحدیث یہی ہے، مگر آج کل اس میں درس کے بجائے دوسری مختلف جماعتیں پڑھتی ہیں۔ دارالحدیث کے گرد پیش ۱۳ کمرے ہیں جو درسگاہوں کے کام میں آتے ہیں۔ دارالحدیث کا طول ۶۸ فٹ اور عرض ۲۵ فٹ ہے، اس کی روکار مغرب کی جانب ہے، دارالحدیث کی بنیاد طلبہ نے باصرار مزدوروں کے بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود کھودی ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق اس وقت جس قدر لوگ موجود تھے سب نے اپنے اپنے ہاتھوں سے دو دو اینٹیں رکھی ہیں، یہ عمارت ۱۹ سال کی طویل مدت میں مکمل ہوئی ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں تکمیل، دوسرا دارالحدیث ہے جو نودرہ کے اوپر واقع ہے۔ یہ عمارت ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کی تعمیر ہے یہ بھی نہایت کشادہ اور وسیع ہال ہے، دارالعلوم کے بڑے بڑے جلسے عموماً ان ہی دونوں

ہالوں میں منعقد ہوتے ہیں

دارالتفسیر

قدیم دارالحدیث کے اُوپر یہ دارالتفسیر کی مُربع عمارت ہے، یہ طول و عرض میں ۳۰ × ۳۰ فٹ ہے، اسی کے اُوپر وہ نہایت پُرشکوہ گنبد بنا ہوا ہے، جو دُور دُور سے نظر آتا ہے اور اپنی رفعت و عظمت، بلندی اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، دارالتفسیر ۱۳۵۸ھ/۱۹۲۹ء کی تعمیر ہے، دارالحدیث و دارالتفسیر کی یہ سربفلک عمارت بہ ہیئت مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پُرشوکت ہے کہ دیکھنے والا غرقِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کا آسمان سے باتیں کرنے والا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے۔

دارِ جدید

دارالحدیث کے سامنے جدید دارالاقامہ ہے۔ یہ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہے، دارِ جدید کے کمروں کا سلسلہ دارالحدیث کی شمال جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گزرتا ہوا، جنوبی سمت تک چلا گیا ہے، کمرے وسیع اور کشادہ ہیں اور سب کے سامنے برآمدے ہیں، اس احاطے کے شمال و جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں۔ یہ مغربی دروازہ جو عین دارالحدیث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے موسوم ہے، دارِ جدید کا یہ احاطہ دارالعلوم کا سب سے زیادہ پُرفضا مقام ہے۔ یہ کئی ایکڑ زمین کا نہایت وسیع صحن ہے، جس کی تینوں سمتوں میں اقامت خانے اور مشرقی جانب دارالحدیث ہے۔ دارِ جدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں۔ ایک دارالحدیث سے شروع ہو کر "باب الظاہر" اور شہر سے گزرتی ہوئی ریلوے روڈ سے جا ملتی ہے اور دُوسری سڑک شمالی دروازے سے نکل کر جنوبی دروازے میں گم ہو جاتی ہے۔ ان سڑکوں نے دارِ جدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان قطعوں میں رنگ رنگ کے پُربہار اور جاذبِ نظر پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے جس نے منظر میں ایک ایسی دل کشی کی کیفیت پیدا کر دی ہے، جو بے ساختہ دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے، ہری بھری گھاس سے پُورا احاطہ نہایت پُرفضا اور خوش منظر نظر آتا ہے۔ یہاں آب رسانی کے لیے پائپ کے علاوہ جا بجا بورنگ کے نل بھی لگائے گئے ہیں۔

باب الظاہر

یہ دارِ جدید کا صدر دروازہ ہے، یہ دروازہ دارالعلوم کی ایک نہایت خوشنما اور عالیشان عمارت ہے ۱۳۵۵ھ/۱۹۴۰ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔ باب الظاہر سابقہ تاجدارِ افغانستان اعلیٰحضرت المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ کے گرانقدر شاہانہ عطیے اور دارالعلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

شعبۂ کتابت

باب الظاہر کی بالائی منزل میں متعدد چھوٹے بڑے کمرے بنائے گئے ہیں ان ہی میں سے چند کمروں میں شعبۂ کتابت کی تعلیم گاہیں قائم ہیں، دارالعلوم میں تعلیم کے ساتھ ساتھ خط کی درستگی اور پاکیزگی کی جانب بھی غیر معمولی توجہ کی جاتی ہے، چنانچہ اس کے لیے چار ماہرینِ کتابت مامور ہیں جو طلباء کو نستعلیق اور نسخ دونوں خطوں کی تعلیم اور اصلاح دیتے ہیں طلباء کو مشقِ خط کا امتحان دینا ہوتا ہے، یہ ایک ایسا فن ہے، جو علمی بھی ہے اور طلباء کے لیے فراغتِ تعلیم کے بعد حصولِ معاش کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے مولانا اشتیاق احمد صاحب جو فنِ کتابت کے مسلّم استاد سمجھے جاتے ہیں شعبۂ کتابت کے صدر ہیں۔

دارالقرآن

دارِ جدید کے جنوبی گوشے میں یہ دارالقرآن کی عمارت ہے، جو کورونڈہ کلکتہ کے مشہور تاجر الحاج فیروز الدین صاحب کی فیاضی اور خدمتِ قرآن کی یادگار ہے۔ یہ عمارت بھی اپنے نام کی ہندوستان میں سب سے پہلی عمارت ہے، جس میں مخصوص طور پر بچوں کو قرآن مجید کی ناظرہ

اور حفظ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں ہر سال کم و بیش ڈیڑھ سو دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں۔ دارالقرآن میں قرآن مجید کے ساتھ ساتھ بچوں کو اردو اور دینیات وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ۶ مدرس بچوں کی تعلیم پر مامور ہیں۔ دارالقرآن کے ۵ کشادہ کمرے ہیں ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء اس کی تعمیر ہوئی ہے۔

مطبخ

دار جدید کے جنوبی گوشہ میں دارالقرآن ہے۔ اور مشرقی گوشہ میں مطبخ کی عمارت واقع ہے پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ دارالعلوم میں چھ سات سو غریب اور نادار طلباء کو ہر سال مفت کھانا دیا جاتا ہے چنانچہ یہاں اُن کے لیے دونوں وقت کھانا پکتا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۱ء میں مطبخ قائم کیا گیا تھا۔ پہلے سال میں ۲۰ یا ۲۵ طلباء کا کھانا پکتا تھا، رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھتی گئی اور اب سات سو تک پہنچ گئی ہے۔ صرف ایک طباخ سے اس کی ابتدا ہوئی تھی، لیکن اب ۲۲ افراد کا عملہ اس کام میں لگا ہوا ہے۔ اور کم و بیش دس بارہ من آٹا یومیہ پکتا ہے۔ حافظ مظہر الحق صاحب اس شعبے کے ناظم ہیں اور دو محرر اُن کی اعانت کے لیے مقرر ہیں۔ مطبخ کی یہ عمارت دو حصوں پر منقسم ہے، ایک حصے میں اس کا دفتر ہے، دوسرے میں اجناس کا گودام ہے، تیسرے حصے میں نان کے تنور اور چپاتی کے چولہے ہیں چوتھے حصے میں سالن پکتا ہے اور پانچویں حصے میں سوختہ رکھا جاتا ہے کھانا تقسیم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ہر طالب علم کے پاس ایلومنیم کا مدور ٹکٹ ہوتا ہے۔ ٹکٹ صبح و شام کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں ٹکٹوں پر صبح شام کے الفاظ کی صراحت کے علاوہ اختلاف رنگ سے ان کو ممتاز کر دیا گیا ٹکٹ پر نمبر کندہ ہوتا ہے اور ہر نمبر کے صبح و شام کے دو ٹکٹ ہوتے ہیں۔ کھانا پانیوالے طلبا کے رجسٹر میں جس نمبر پر طالب علم کا نام درج ہوتا ہے، اور وہی نمبر اس کے ٹکٹ کا ہوتا ہے، تقسیم طعام کے کمرے کو کٹہرے لگا کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی کٹہرے سے گزر سکے۔ ایک طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے اور دوسری طرف سے نکلنے کا۔ ٹکٹ داخل کرنے پر اگلے وقت کے لیے اسی نمبر کا دوسرا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے آگے بڑھنے پر مہتمم طعام کھانا حوالے کر دیتا ہے، اسی طریق پر چھ سات سو طلبہ صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نہایت اطمینان اور سہولت کے ساتھ کھانا حاصل کر لیتے ہیں۔ ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں۔ جن کے خشک آٹے کا وزن ۲۲ تولے ہوتا ہے۔ شام کے کھانے میں گوشت پکتا ہے اور دوپہر کو دال دی جاتی ہے۔ مطبخ میں قیمتاً کھانا لینے کا بھی انتظام ہے، جس میں مذکورہ کھانے کے علاوہ دو اور قسم کا کھانا بفرق مراتب پکتا ہے بیمار طلبا کے لیے پرہیزی کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔

جمعیۃ الطلباء

مطبخ سے شمال کی جانب یہ جمعیۃ الطلباء کا دفتر ہے۔ اس کے تین وسیع کمرے ہیں جمعیۃ الطلباء دارالعلوم کی ایک باضابطہ جماعت ہے اس کے ارکان بطریق انتخاب چنے جاتے ہیں۔ یہاں طلبہ جمع ہو کر تقریر و تحریر اور مناظرے وغیرہ کی مشق کرتے ہیں، تاکہ تبلیغ اور حق و صداقت کے پیغام کو پہنچانے کے طور و طریق سے واقفیت حاصل کر سکیں یہاں کتابوں اور اخبارات و رسائل کے مطالعے کا بھی انتظام کیا گیا ہے، جمعیۃ الطلباء عہدہ دار طلبہ کے علاوہ دو تنخواہ دار کارکن بھی مامور ہیں۔

شعبہ تبلیغ

جمعیۃ الطلبا کے ساتھ ہی شعبۂ تبلیغ قائم ہے اس شعبے نے مسلمانوں میں دینی رُوح بیدار اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنیکا زبردست کام انجام دیا ہے، آج ہندوستان و پاکستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں دارالعلوم کے مبلغین نے سینکڑوں لوگوں کو کلمۂ حق نہ سنایا ہو، ملک کے تمام علمی اور عوامی حلقوں نے اس شعبے کی کارگزاری کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جہاں کہیں جلسے ہوتے ہیں ان میں عموماً دارالعلوم کے حضرات کو خصوصیت سے بلایا جاتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

صدر المدرسین اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مدظلہ بھی بغرض تبلیغی دورے فرماتے ہیں اس شعبے میں باضابطہ طور پر چار مبلغ مامور ہیں مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی بی اے، مولانا سید نور الحسن صاحب ہاشمی مولانا سید سیف اللہ صاحب ہاشمی اور مولانا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی۔

درجہ فارسی

جمعیۃ الطلبہ سے آگے بڑھ کر شمال ہی کی جانب یہ اُردو، فارسی اور ریاضی کے درجات ہیں، یہاں ابتدائی تعلیم کے ذریعے درجہ عربی کے لیے طلبار کو تیار کیا جاتا ہے، درجۂ فارسی کا نصاب تعلیم ۵ سال کا ہے، آمد نامہ اور حمد باری سے لے کر سکندر نامہ انوار سہیلی اور مثنوی مولانا روم تک فارسی پڑھائی جاتی ہے اور حساب تحریر ہندسہ سے لے کر اربعہ متناسبہ، مساحت اور مثلث تک پڑھایا جاتا ہے؛ اسی درجہ میں ہندوستان اور ایشیا کا جغرافیہ بھی شامل ہے، درجۂ فارسی میں ۵ مدرسین ہیں؛ مولانا ظہیر احمد صاحب جھنجھانوی درجۂ فارسی کے صدر مدرس ہیں۔ یہ عمارت یادگار سعدی کے نام سے موسوم ہے۔

دارالصنائع

درجۂ فارسی سے ملحق ہی دارالصنائع کا شعبہ ہے، جس میں طلبہ کو جلد سازی، خیاطی، چرم دوزی، گھڑی سازی، ہوزری اور پلاسٹک کی مختلف چیزیں بنانے کا کام سکھلایا جاتا ہے، مدارس دینیہ میں دارالعلوم کو جس چیز نے بے مثال بنا دیا ہے، وہ یہی شعبہ ہے، دارالصنائع کا مقصد طلبا کو صنعتی تربیت دے کر حصول علم کے بعد کی زندگی میں بے روزگاری سے بچانا اور ان کے لیے آزاد ذرائع معاش کی راہیں کھولنا ہے، مولانا حافظ سیف اللہ صاحب جو اس شعبے کے نگرانِ اعلیٰ ہیں، صنعتی کاموں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

کتب خانہ

دارالصنائع اور درجۂ فارسی کی بالائی منزل پر دارالعلوم کا یہ عظیم الشان کتب خانہ واقع ہے، جو ایک ہال اور چار وسیع کمروں پر مشتمل ہے، یہ کتب خانہ دارالعلوم کی جان اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی کا بے نظیر علمی سرمایہ ہے، اس میں درسی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جس کی کسی دوسری جگہ مثال نہیں ملتی۔ کتب خانہ میں جب تک آپ گھنٹوں ٹھہر کر تفصیلی سیر نہ کریں، اُس وقت تک اس کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتے؛ یہاں ۷۰ ہزار سے اُوپر کتابیں موجود ہیں، بیش بہا کتب کے اس عظیم الشان ذخیرے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مخطوطات (قلمی کتب) کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ان میں فنِ خطاطی کے لحاظ سے بعض مخطوطات بڑے عجیب و غریب ہیں، بعض کتابیں مختلف شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں۔ اس لیے تاریخی اہمیت کی مالک ہیں۔ چند مخطوطات ایسے بھی ہیں؛ جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نقل آج دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک ہے تو اس میں غالباً مبالغہ نہ ہوگا، بعض مخطوطات پر چھ چھ سو اور سات سات سو برس گزر چکے ہیں لیکن کاغذ اپنی حالت پر قائم ہے، سیاہی کا حال یہ ہے کہ گویا لکھنے والا ابھی لکھ کر اٹھا ہے۔ کاغذ اور حسن تحریر دیکھنے کے لائق ہے۔ کیا مجال کہ سینکڑوں صفحات لکھنے پر خط کی یکسانیت اور سیاہی کے رنگ یا قلم میں ادنیٰ فرق پیدا ہو جائے۔ اگر تاریخی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ کاغذ کی ساخت اور خط کی شان میں عہد بعہد ترقی ہوتی گئی ہے۔ ان کتابوں سے اسلامی ممالک کی تہذیب و تمدن اور علمی کاموں سے مسلمانوں کی دلچسپی اور شغف کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور گو بڑا ذخیرہ عربی فارسی اور اُردو میں ہے، تاہم عبرانی، یونانی، ترکی لاطینی انگریزی، ہندی، گجراتی، سندھی، پنجابی، پشتو، ٹامل، سنسکرت اور بھاکا وغیرہ

مختلف زبانوں کی کتابیں بھی کم و بیش موجود ہیں۔

یہاں عام مشرقی کتب خانوں کی طرح کتابوں کی تقسیم فن وار ہے یعنی ایک فن و موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام کتابیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں، اس فن کے تحت میں رکھی گئی ہیں، کتب خانہ بڑے بڑے اٹھائیس فنون پر منقسم ہے، کتب خانہ کی عمارت ناکافی ہونے کے باعث اکثر فنون میں ان کے مناسب فنون کو شامل کر دینا پڑا ہے، مثلاً تاریخ میں محاضرات، سیر سیرت، مناقب، سفرنامے اور جغرافیہ وغیرہ مستقل فنون شامل ہیں۔

سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، نفسیات اور حکمت و شعر وغیرہ علوم علیحدہ علیحدہ ہونے کے بجائے علوم متفرقات کے ذیل میں رکھے گئے ہیں۔ یہاں بھی محافظ خانہ کی طرح ہر علم کے لیے ایک رنگ مخصوص کر دیا گیا ہے اور اسی رنگ کی اَبری اس علم کی کتابوں کی پشت پر لگائی جاتی ہے

اب ذرا فن وار کتب کے اعداد و شمار بھی سن لیجئے، جن سے ہر ایک فن کی علیحدہ علیحدہ کتابوں کی تعداد معلوم ہوگی۔

نمبر	فن	تعداد
۱	تفسیر و اصول تفسیر و علوم قرآن	۲۰۸۲
۲	تجوید و قرأت	۲۸۲
۳	اوراد و وظائف	۲۸۲
۴	حدیث و اصول حدیث	۳۵۴۴
۵	رجال	۲۷۸
۶	اصول فقہ	۲۹۸
۷	فقہ	۳۲۵۶
۸	فرائض	۲۶۲
۹	عقائد و کلام	۱۳۷۱
۱۰	تاریخ و جغرافیہ وغیرہ	۲۹۲۲
۱۱	تصوف	۲۱۲۲
۱۲	اخلاق	۱۷۵
۱۳	وعظ	۹۳۲
۱۴	طب قدیم و طب جدید اور کیمیا وغیرہ	۷۰۸
۱۵	فلسفہ	۲۶۴
۱۶	منطق	۶۰۳
۱۷	ہیئت	۵۴
۱۸	ریاضی	۳۸۷
۱۹	مناظرہ اور مذاہب	۵۱۶۴
۲۰	صرف	۹۶۱
۲۱	نحو	۶۷۶
۲۲	معانی و بیان	۱۵۶
۲۳	عروض	۹۱
۲۴	لغت	۹۷۵
۲۵	ادب عربی	۱۲۵۹
۲۶	ادب فارسی	۱۲۵۲
۲۷	ادب اردو	۷۹۵
۲۸	متفرقات	۳۹۶
	کل میزان	۳۲۸۱۸

یہ تعداد صرف غیر درسی کتب کی ہے، درسیات کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار کے قریب ہے، ہمارے قدیم نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طلبا کے لیے زیر درس کتابوں کا مہیا کرنا بھی درسگاہ ہی کے ذمہ ہوتا ہے اسلیے ہر درسی کتاب کے نسخے اس جماعت کی تعداد کے مطابق موجود رکھے جاتے ہیں

جگہ کی قلت اور کتابوں کی کثرت کی وجہ سے کتب خانے کے کمرے چونکہ ناکافی ہیں، اس لیے فرش سے چھت تک دیو ہیکل الماریاں لگائی گئی ہیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ کتابیں کھپائی جا سکیں لیکن اس کے باوجود بھی ہزاروں کتابوں کے لیے جگہ مہیا نہیں کی جا سکی اور یوں ہی فرش پر ان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

کتب خانہ کی عمارت کا آغاز ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء سے ہوتا ہے۔ اس وقت سے لے کر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت چار کمرے اور تعمیر ہو چکے ہیں، مگر ابھی مزید دو تین کمروں کی ضرورت باقی ہے، مولانا سلطان الحق صاحب کتب خانے کے ناظم ہیں اور چار کارکنوں کا عملہ ان کے ماتحت کتب خانے کے نظم و نسق کو درست رکھنے اور کتابوں کی داد و ستد کے لیے مامور ہے

مسجد چھتہ

دارالعلوم دیوبند کی سیر اس وقت تک نامکمل رہے گی، جب تک آپ چھتہ کی مسجد کو نہ دیکھ لیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دارالعلوم کا آغاز بھی اسی جگہ سے ہوا تھا اور اس کی سیر بھی یہیں ختم ہوتی ہے۔ یہ مسجد احاطۂ دارالعلوم سے گو باہر ہے، مگر ہے بالکل اسی سے ملحق، اس کے لیے آپ کو کتب خانے سے مطبخ کی جانب لوٹنا پڑے گا، جس کے جنوب و مشرق میں

یہ مسجد واقع ہے۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جس کے صحن میں آج سے ۱۰۰ سال قبل نہایت معمولی مکتب کی صورت میں دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تھا یہ مسجد ابتدا سے مشائخ و اکابر اہل اللہ کی قیام گاہ رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرۃ بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے چلہ کشی کی ہے۔ دیوبند کے مشہور بزرگ حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی اسی مسجد میں رہتا تھا۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے اسی مسجد میں قیام پذیر رہے ہیں، غرضیکہ یہ مسجد دیوبند کے اکثر اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض رہ چکی ہے، مسجد کے صحن میں انار کا وہ تاریخی درخت بھی اب تک کھڑا ہوا ہے جس کے سائے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے ملا محمود صاحبؒ کے سامنے سب سے پہلے کتاب کھولی تھی۔

یہ مسجد ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی طرز تعمیر کا نہایت سادہ مگر پرشکوہ نمونہ ہے، لکھوری اینٹ، بغیر چونہ و پلاسٹر کی تعمیر ہے

اب آپ دارالعلوم کی سیر سے فارغ ہو چکے ہیں اور کوئی ایسا قابل ذکر مقام باقی نہیں رہا جس کو آپ دیکھ نہ چکے ہوں، اب اس مسجد کے بارے میں شاعر انقلاب انور صابری صاحب کے دو شعر بھی سن لیجئے!

مسجد چھتہ وہ پہلی درسگاہ علم دیں
جس جگہ محمود نے محمود پایا تھا مقام
قاسم الخیرات کے اس مرکز تبلیغ کا
آدمی تو کیا، فرشتے کر رہے ہیں احترام

دارالعلوم کی اس سیر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس درسگاہ کے مبارک وجود پر ہند و پاکستان کے مسلمان جس قدر فخر و مسرت کا اظہار کریں اس کے درست اور حق بجانب ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دیوبند کی اس سرزمین میں اس دینی درسگاہ کا قیام ہند و پاک کے مسلمانوں کی ایک متحدہ اور مرکزی تحریک کا نتیجہ ہے، دین کی خدمت، اسلام کی تائید، اسلامی علوم و فنون کا احیاء اور ان کی نشر و اشاعت، علم دین کے شائق اور ہونہار طلبہ کی دستگیری اس درس گاہ کے مخصوص اور عظیم الشان کارنامے ہیں مگر دارالعلوم دیوبند کے حالات سے اب تک بہت کم لوگ واقف ہیں، عدم شہرت کا پردہ اس وجہ سے اور بھی گہرا ہو گیا ہے کہ دارالعلوم نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اس کے پیش نظر کام رہا ہے، نام نہیں، زوال بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ (مصر) اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا، ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد دیوبند کو علمی مرکزیت نصیب ہوئی اور بڑی بڑی علمی شخصیتیں اس سرزمین سے پیدا ہوئیں، چودہ پندرہ ہزار سے زائد علماء و فضلاء اس وقت تک اس درسگاہ کی آغوش میں تعلیم و تربیت میں پرورش پا چکے ہیں جنھوں نے نسیم بہار بنکر دارالعلوم کی علمی خوشبو کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے ۔

کبھی جب ذکر آجاتا ہے ان کا
زباں دو دو پہر ہوتی نہیں بند

---

(۱)

لوگ کہتے ہیں:

بینا سارے، اندھا کوئی کوئی

میں کہتا ہوں:

اندھے سارے، بینا کوئی کوئی

(۲)

اللہ والوں کی جوتیوں میں وہ موتی ملتے ہیں، جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے۔

ماخوذ از ملفوظات حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

دارالعلوم دیوبند

علمی و تحقیقی مقالات

یہ مضمون حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی تحریرات سے ماخوذ و مستنبط ہے، اکثر جگہ فقرے بھی تبرکاً حضرت قاری صاحب کے ہیں (حامی)

تیرھویں صدی آخری سانس لے رہی تھی، تو ہندوستان میں مسلمانوں کی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف ہلکا ہلکا دھواں سا اُٹھ رہا تھا، جو چراغ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ مُغل حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی ساتھ مرکزیت ختم ہو گئی تھی اور مرکزیت کے خاتمے نے افراتفری اور ہر شعبہ حیات میں بے راہ روی اور پستی کو جنم دے دیا تھا۔ یہ زوال اور نشیب جس طرح محسوس ہو رہا تھا۔ مذہب اور تعلیم کے معاملے میں اس کی حالت اور بھی زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ سرکاری حمایت اور پناہ کے خاتمے کی وجہ سے ہر طرح کی درسگاہوں کا حال روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دینی درسگاہوں کا حال اور بھی خراب تھا جو عوام کے سہارے یہ تمام درسگاہیں چلا کرتی ہیں اور مفلوک الحالی نے عوام کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ سوچ سکیں۔

دینی درسگاہوں کے ابتلاء میں سب سے زیادہ ہاتھ اس امر کا تھا کہ عوام و خواص کے دل و دماغ سے دینی شعور رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا جا رہا تھا جہل و گمراہی کا دلوں پر راج تھا اور یہ جہالت کا راج ہر نئے دن کچھ زیادہ ہی مستحکم ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ اب کہاں رہ گیا تھا کہ سنت پیغمبر یا حکم الٰہی کا اجراء ہو۔ اب قرآن کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہوا و ہوس کا راج تھا۔ وہ روشنی جو مشرق کی خصوصیت تھی ختم ہو رہی تھی۔ اس کی جگہ وہ آفتاب طلوع ہو رہا تھا، جو مغربی تہذیب و تمدن سے متعلق تھا جس کی کرنیں اپنی جلو میں دہریت، الحاد، فطرت پرستی نفس پروری لیے ہوئے تھیں۔ ان خواہشات نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا دلوں کو بے ذوق بنا دیا تھا، اب وہ انسان خال خال ہی نظر آتے تھے جو اسلامی خد و خال کو پہچان سکیں۔ غرض کہ چمن ہند میں ہر طرف خزاں کا دور دورہ تھا۔ بہار رخصت ہو چکی تھی۔ خوش آواز و خوش الحان پرندے اب داستان ماضی بھول چکے تھے۔ ان کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی۔ یہ تو مختصر سا تذکرہ ہے۔ کس کس چیز کا رونا روتے

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

اُن حالات میں یقین ہو چلا تھا کہ سرزمین ہند سے اسلام کا چمن کسی لمحہ بھی اُجڑ سکتا ہے۔ یہاں بھی اب وہی تاریخ دہرائی جانے والی ہے جس کا ایک مظاہرہ سرزمین اسپین میں ہو چکا ہے۔ اس لیے چند نفوس قدسیہ کے دلوں میں خلش اور کسک کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ ان حضرات نے

الہامی طور پر یہ ضرورت محسوس کی کہ دین کے تحفظ کی قدرتی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کی جائے۔ کوئی نہ کوئی سبیل ایسی نکالی جائے کہ ستم رسیدہ مسلمان محفوظ ہو سکیں۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اپنے اپنے ارادات قلبی کو بیان کیا۔ اس سب کا خلاصہ صرف یہ تھا کہ اس وقت بقائے دین کی ضرورت اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں علوم نبویہ کی تعلیم کا انتظام ہو اور اس کی مدد سے مسلمانوں کی دینی معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ایسا مدرسہ ہی مسلمانوں کی داخلی راہنمائی کر سکتا ہے اور ایسے مدرسے کے ذریعے ہی مسلمانوں کی خارجی مدافعت ہو سکتی ہے۔

ان مقاصد کے لیے جو حضرات کمربستہ ہوتے تھے۔ وہ رسمی قسم کے لیڈر یا راہنما نہ تھے۔ بلکہ خدارسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ اُن کی یہ باہمی گفت و شنید رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلہ خیال نہ تھا، بلکہ تبادلہ الہامات تھا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب کا قول ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان تمام اولیاء اللہ پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے تحفظ اور بقا کی وجہ صورت قیام مدرسہ ہے۔ چنانچہ کسی نے دیکھا کہ خواب میں، حفظ دین و مسلم کے لیے مدرسہ کے قیام کا حکم ملتا ہے۔ کسی کو کشف ہوا کہ مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ غرض یہ کہ سب کا قیام مدرسہ پر جمع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قیام مدرسہ کا فیصلہ من جانب اللہ تھا[1]

اس سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی۔ وہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پس منظر میں ملک گیر اصلاح کا پروگرام پوشیدہ تھا۔ تحریک اصلاح ہنگامی یا مقامی نوعیت کی نہ تھی۔ بلکہ انگریز جس لادینی نظام حیات کو پورے ملک پر مسلط کرنے کی فکر میں تھا۔ یہ تحریک اسے پورے ملک سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے شروع ہوئی تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی۔ مگر اس تخم میں ایک تناور شجر طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے غیبی اشارات کا تفصیلی ذکر کر چکے ہیں۔ موصوف ہی کی ذات گرامی نے اس تجویز کو عملی شکل عطا کی۔

بنائے دارالعلوم

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو مسجد چھتہ کہلاتی ہے۔ ایک انار کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۲ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کے روز سعید آب حیات کا یہ چشمہ پھوٹا۔ اور اس چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کی۔ دوسری طرف شرک و بدعت فطرت پرستی الحاد اور دہریت کے ان خس و خاشاک کو بہانا شروع کیا؛ جو مسلمانوں کے قلوب میں جڑیں پکڑ چکے تھے اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ پستی اور روز بد دیکھنا پڑ رہا تھا۔

بانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں کی بیسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں" پورا ہوا۔ اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں، خواب ہی نہ رہا۔ بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہو گیا اور اس مدرسے کے ذریعے ان قلوب کے تالے کھولے گئے جو علم کا بذات خود ظرف تھے، یا ظرف بننے والے تھے۔ اور جن سے علم کے چشمے

---

[1] تاریخ دیوبند۔ از قاری محمد طیب صاحب ص۱۲۔

ہر چہار سُو پھوٹتے تھے۔ حضرت سید احمد بریلوی دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے، تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بُو آتی ہے۔ وُہ خوشبو جس کو سید صاحب کی رُوحانی قوتِ شامہ نے سونگھ لیا تھا۔ ایک سدا بہار گلاب کے پھول بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں وقوع پذیر ہوئی۔ جس سے ہزاروں پھول کھلے اور سرزمین ہند کا اُجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بن جائے گی۔ کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گا، اور پھول سے گلدستہ بن کر اس کی خوشبو سے سارا عالمِ انسانی مہک اٹھے گا؟ اور کسے معلوم تھا کہ برطانوی ہند میں جہاں انگریز جیسی فاتح عیار قوم کی یہ فکر کہ دل و دماغ یورپین سانچے میں کسی طرح ڈھالا جاسکے اور جو تعلیم کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا چکی تھی۔ اس پودے کی مہک، ان جراثیم کے خاتمے کا سبب بنے گی، جو مغربی استعماریت پھیلا رہی ہے۔

لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کرتے ہوئے نعرہ بلند کیا تھا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔

یہ آواز ایک فاتح اور برسرِ اقتدار قوم کی آواز تھی اور اس نے اس آواز کو حقیقت بنانے کے لیے بھی تعلیم کو ذریعہ بنایا تھا جو بذاتِ خود انقلاب آفریں حربہ ہے۔ یہ حربہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی کارگر ہو رہا تھا اور تعلیم سے ایسی نسلیں اُبھرنی شروع ہوگئیں، جو گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں، اس خطرناک انقلاب کو دیکھ کر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کیا اور نعرہ لگایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے مسلمان ہوں۔ جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات پیدا ہوں اور دین و سیاست کے اعتبار سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔

اس مدرسہ کے قیام کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کی راہ میں بند کھڑا ہو گیا۔ اب تک بات یکطرفہ تھی، مگر اب یکطرفہ نہ رہی، بلکہ ایک طرف اگر مغربیت کے پرستار طبقے نے پھیلنا شروع کیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اسلامیت طراز طبقہ پیدا ہونے لگا۔

اب یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے ملک و قوم کو بہالے جائے گا۔ بلکہ یہ خیال ہونے لگا کہ اس کی زد کا ریلا بہاؤ پا جائیگا تو ایسے بند باندھ دیئے گئے ہیں کہ یہ ریلا آزادی سے بڑھ نہ سکے گا۔ بلکہ اس کے راستے میں مدافعتی بند موجود ہوں گے۔ جو اُسے آزادی سے آگے بڑھنے نہ دیں گے۔ بہرحال وُہ نیک ساعت آگئی کہ مدرسہ کا کام شروع ہوا۔ ملا محمود دیوبندی نے اپنے سامنے ایک شاگرد کو جو خود بھی محمود (محمود الحسن شیخ الہند) تھے بٹھا کر چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے زیرِ سایہ دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی نہ نام و نمود کا سلسلہ۔ بس ایک شاگرد تھا اور ایک اُستاد، شاگرد بھی محمود تھا اور اُستاد بھی محمود تھا۔ ان دو نفوس کے اجتماع سے لاکھوں افراد کے ایمان کی حفاظت کی سکیم معرضِ وجود میں آگئی اور ندرتِ ایمان کا دور دورہ شروع ہوگیا۔

دارالعلوم کا سلسلۂ سند و استناد

دارالعلوم کے سلسلۂ سند کے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مرشدِ اعلیٰ ہیں۔ انھیں کے مکتبِ فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی، کیونکہ موصوف کی ذاتِ والا صفات ہی تھی جس نے سب سے پہلے ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کے مزاج کو پرکھا اور علومِ شریعت کو محفوظ طرز میں پیش کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ اس رنگ کو اپنایا، بلکہ اس کے نقش و نگار میں رنگ بھرا۔ اور جو

منقولات بشاہ ولی اللہ صاحب کے ہاں معقولات کا رنگ لئے تھے وُہ محسوسات میں بدل گئے۔ اسی لیے عموماً کہا جاتا ہے کہ ولی اللٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی سرپرستی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو حاصل ہوئی جنھوں نے دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا اور اس طرح اصول پسندی کے ساتھ فروعِ شرعیہ اور جزئیات کا قوام اس پر مستزاد ہوگیا۔

ان دونوں حضرات کے بعد شاہ عبدالعزیز ثانی اور مولانا محمد یعقوب صاحب آئے جنھوں نے تعلیمات کو عاشقانہ اور مجذوبانہ جذبات عطا کئے۔ اس طرح یہ صہبائے دیانت سے آتشہ ہوگئی۔ مولانا محمود حسن رح آئے اور ان کے چالیس سالہ دورِ صدارت میں علوم و فنون نے تمام عالمِ اسلام میں پھیلنا شروع کیا۔ چنانچہ ہزارہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو ہو کر اطرافِ عالم میں پھیلے۔ اس لحاظ سے یُوں سمجھنا چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ جماعت دارالعلوم کے جدِ امجد ہیں، حضرت گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوبؒ اور شیخ الہند وغیرہم ان کے رُوحانی بیٹے ہیں

دارالعلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے ولی اللٰہی مسلک، اہلِ سنت والجماعت کہلاتا ہے جس کی بنیاد کتاب، سنت، اجماع اور قیاس پر ہے۔ اس جماعت کے نزدیک تمام مسائل میں اوّلین درجہ نقل اور روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہے۔ اس جماعت کو یقین ہے کہ کتاب و سنت سے مراد اقوالِ سلف اور ان سے ملتے جلتے مذاق ہیں۔ اس کا حصول محض قوتِ مطالعہ سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت اور تربیت اوّلین شرط ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے عقل و درایت اور تفقہ فی الدین کا ہونا ضروری ہے۔ روایات کے مجموعے کے سلسلے میں اہلِ سنت والجماعت حنفی فقہ کو بہتر سمجھتے ہیں اور اُن ہی کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کو سمجھتے ہیں، وُہ تمام روایات کو اسی سے وابستہ کرتے ہیں اور انھیں درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتے ہیں کہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جمع بین الروایات اور مقابلے کے وقت تطبیق اس جماعت کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا اور غرض یہ ہے کہ ضعیف سے ضعیف روایات کو بھی چھوڑنا اور ترک کرنا نہیں چاہتی، حتیٰ کہ وُہ قابلِ احتجاج ہو۔ اسی بناء پر اس جماعت کی نگاہ میں امورِ شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں ملتا، بلکہ سلسلے کا سارا دین اختلاف اور تضاد سے مبرّا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر رنگ کے علمی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ سلوک کے طریقے کے مطابق جو رسمیات رواجیات اور نمائشی حال و قال سے بیزار ہے۔ اس جماعت کے ہاں بھی تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن پر بہت زور ملتا ہے۔

ولی اللٰہی جماعت اپنے پیروؤں کو علم کی روشنیوں سے نوازتی ہے، عبدیت اور تواضع جیسے اعلیٰ اخلاق سے مزیّن کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار اور غنائے نفس کی بلندیوں پر فائز نظر آتے ہیں، تو دُوسری طرف فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبہ سے بھی بھرپور ملتے ہیں۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ذلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار رہتے ہیں، وُہ جہاں علم و اخلاق کی بلندی پر پہنچ کر عوام سے اُونچے دکھائی دیتے ہیں، وہیں عجز و نیاز، تواضع اور فروتنی کے جوہر سے مزیّن ہو کر عوام میں کاحدٍ من الناس کا مصداق بنتے ہیں۔ ایک طرف اگر وُہ مجاہدانہ اور مراقبہ سے خلوت پسند ہیں تو دوسری طرف مجاہدانہ و غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ اعتدال اور میانہ روی ان کا خاصہ ہے اور یہ علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا

قدرتی ثمر ہے۔ ان کے اس محدث ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقہ سے لڑائی ہے۔ اسی طرح صوفی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علوم کلام یا متکلم سے بیزاری ہے۔ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم کا فاضل بیک وقت (درجہ بدرجہ) محدث، فقیہ، متکلم، صوفی، حکیم اور مربی بنتا ہے۔ جس میں زہد و قناعت کے عدم تقشف، معیارِ انکسار کے ساتھ، عدم مداہنت، رافت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت کے ملے جلے جذبات راسخ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل و کمال اور راسخ فی العلم، خواہ محدث ہوں، فقیہ ہوں، عارف ہوں، صوفی ہوں متکلم ہوں یا اصولی، امیرِ اسلام ہوں، یا خلیفۃ المسلمین، اس جماعت کے نزدیک واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہوتے ہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر کسی فرد یا طبقے کو بڑھانا یا کسی کو گرانا، حدودِ شرعیہ سے بے پروا ہو کر مدح و ذم کرنا اس جماعت کے مسلک میں جائز نہیں۔

یہی وہ جامع مسلک ہے، جس کو اپنا کر دارالعلوم نے اپنی خدمات سے سائبیریا سے لے کر جاوا سماٹرا اور برما سے لے کر عرب اور افریقہ تک علومِ نبوّیہ کی روشنی پھیلائی۔ ایک طرف پاکیزہ اخلاق کی شاہراہ کو واضح اور منور کیا تو دوسری طرف سیاسی خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ ۱۸۰۳ سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ یہ قربانیاں تاریخ کی پیشانی پر ثبت ہیں اور ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ ڈالنا ناممکن ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں خصوصاً مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت خصوصیت سے، مولانا امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کی سرپرستی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی نیز اس کے متوسلین کی انقلاب کے لیے کوشش اور آزادی و استحکام کے لیے جدوجہد اور گرفتاری۔ وارنٹ اور قید و بند و جلاوطنی کی صعوبتیں، وہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں نہ تو جھٹلایا جا سکتا ہے، نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس لیے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں شامل نہ تھے، تو اس سے ان کی نامقبولیت تو ظاہر ہوتی ہے، ملا رحق کے کارنامہ پر اثر نہیں پڑتا۔

اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ دیوبندی النسب کی ہوں، یا غیر دیوبندی نسبت کی، جن سے ان حضرات کی خدمات کی نفی ہوتی ہو، ناقابلِ اعتبار و التفات ہیں۔ اگر حسنِ ظن سے کام لیا جائے، تو ان تحریروں کی زیادہ سے زیادہ یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن مراحل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک احتیاط کے مظاہرے ہیں ورنہ تاریخی اور بدیہی شواہد کے پیشِ نظر نہ اُن کی کوئی اہمیت ہے اور نہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک چلا اور انہیں جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلے میں آگے بڑھتے رہے، وہ تحریکِ خلافت ہو، یا آزادیٔ وطن ہر ہر تحریک میں ہر ہر فرد نے حسبِ استطاعت حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مستند تعلیم ہی کو حاصل رہی ہے۔ جب کہ یہ تمام شعبے علم کی روشنی میں صحیح طریقے پر بروئے کار آ سکتے ہیں اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا ہے۔ اسی لیے اس سلسلۂ مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت جامع عقل و عشق، جامع علم و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و

سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع علم وحکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال وقال ہے یہ مسلک جو سلف خلف کی نیت سے حاصل شدہ ہے، کو اصطلاحاً مسلم فرقہ کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت، مذہب کے لحاظ سے حنفی، مشرب کے لحاظ سے صوفی، کلام کے اعتبار سے اشعری، سلوک کے اعتبار سے چشتی، فکر کے اعتبار سے ولی اللٰہی، اصول کے اعتبار سے قاسمی، فروع کے اعتبار سے رشیدی اور نسبت کے لحاظ سے دیوبندی ہے۔

دارالعلوم کا مجموعی مذاق اور تربیت

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں، جب ہندوستان سے مسلمانوں کی شوکت پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آ چکی تھی — دارالعلوم نے سب سے بڑا یہ کام کیا کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین و مذہب اور بلحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی۔ حالات کے دھارے میں بہنے سے روکا۔ پختگی اور عزم کے ساتھ انھیں اسلامی سادگی اور دینی ثقاہت کے زاہدانہ اور متوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا۔ مگر اس حکمت و دانائی کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرون حدود جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرت میں طبعی طور پر ضروری تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا، جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا۔ جدید تمدن و معاشرت اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی حمیت و عزیمت باقی رہ گئی۔ مرعوبیت اور احساس کمتری قلوب میں نہ جم سکی۔ ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ ہوا اور اتباع مغرب سے بچا کے، سنت کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے۔ جس سے عام تمدن اور معاشرت میں پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت کے تصور اجاگر رہے۔

بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے بزرگوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس و بنیاد فلسفہ اور عقل محض پر نہ تھی، بلکہ انبیاء علیہ السلام کے ڈالے ہوئے راستے پر یعنی عشق و محبت پر تھی، جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادیٔ فکر کی راہ لے جاتا ہے اور عشق و محبت، اتباع و ادب کی راہ چلاتا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات ہیں، اسلیے اگلا فلسفی پچھلے کی تحقیر و تذلیل کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد جو کہ دین اللہ عشق و محبت خداوندی پر ہے۔ اس لیے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق و محبت کو جزو ایمان بتاتا ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔ بس دارالعلوم کے طرز تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چونکہ ولی اللٰہی کے ساتھ ہر وقتی شغل و اشتغال اور قال اللہ اور قال الرسول ہی کا مشغلہ تھا۔ اس لیے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت وعبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لیے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقش قدم کو برقرار رکھا اور زمانے کی رَو میں بہہ کر عوام کو نقال بننے نہ دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت دوستوں اور مخالفوں سب نے تسلیم کی۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسن نیت و اخلاق سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزت نفس اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادی سربلندی کے لیے مساعی سرانجام دیں۔ اپنے سے کبھی آویزش نہ کی البتہ ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ و عمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزادیٔ فکر، آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے۔

دارالعلوم کی مجالس

دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔

۱. مجلس شوریٰ ۲. مجلس عاملہ ۳. مجلس علمیہ

مجلس شوریٰ دارالعلوم کی سب سے بڑی با اختیار مجلس ہے۔ دارالعلوم کا تمام تر نظم و نسق اسی جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ انتظام و تعلیم کے سلسلے میں اس کی تجاویز.... کارکنوں کے لیے واجب التعمیل ہوتی ہیں۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد ۲۱ ہوتی ہے، جن میں سے مقامی کم از کم گیارہ ہوتے ہیں۔ باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں، اگرچہ حتی الامکان دو ممبر باشندگان دیوبند میں سے لیے جاتے ہیں، مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں۔ بقیہ سات ممبر مجلس شوریٰ میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے اور اس کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں۔ پہلا ربیع الاوّل میں دوسرا جمادی الاوّل، تیسرا شعبان اور چوتھا ذی قعدہ میں۔ مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہے۔

مجلس علمیہ کا کام تمام درجات عربی، فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر المدرسین کو مشورہ دینا ہے۔ اس کے ممبران میں صدر مدرسین مہتمم دارالعلوم اور طبقۂ اعلیٰ کے اساتذہ شامل ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کے شعبہ جات

دارالعلوم میں تین قسم کے شعبہ جات موجود ہیں۔

تعلیمی شعبہ جات ۔ انتظامی شعبہ جات ۔ مالی شعبہ جات

تعلیمی شعبہ جات کے تحت مندرجہ ذیل ۱۴ شعبے آتے ہیں

۱. شعبۂ تعلیم عربی

اس شعبے میں میزان الصرف سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اگرچہ کتب تمام تر عربی میں ہیں، مگر ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ نصاب کی تکمیل کی مدت گیارہ سال ہے۔

۲. شعبۂ تعلیم فارسی

اس شعبے میں فارسی کی ابتدائی تعلیم سے لے کر مثنوی مولانا رُوم تک کے پڑھانے کا انتظام ہے۔ یہاں بھی ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ فارسی کے علاوہ حساب، اقلیدس، جغرافیہ، ہندی اور تاریخ وغیرہ بھی نصاب میں شامل ہے۔ شعبے کا نصاب ۵ سال کا ہے۔

۳. شعبۂ تجوید و قرأت

اس شعبے میں تمام طلبہ کو لازمی مضمون کے طور پر پارہ عم کی مشق قواعد تجوید کے ماتحت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بغیر طالب علم کو سند الفراغ نہیں دی جاتی اور جو طلبہ باقاعدہ فن تجوید کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں، انھیں تجوید کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور عملی مشق کے بعد باقاعدہ سند دی جاتی ہے۔

۴. شعبۂ تعلیم قرآن ناظرہ

گو اس شعبے میں ناظرہ قرآن کا بندوبست ہے، مگر جو طلبہ حفظ کرنا چاہیں وہ حفظ بھی کر سکتے ہیں۔

۵. شعبہ ابتدائی دینیات و تعلیم القرآن

اس شعبے میں چھوٹے بچوں کو قرآن شریف ناظرہ پڑھایا جاتا ہے اسی کے ساتھ اُردو زبان، دینیات، ہندی، حساب، جغرافیہ، تاریخ جیسے اہم مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ نصاب کی تکمیل ۴ سال میں ہوتی ہے۔

۶. صف عربی

اس شعبے میں طلبہ کو جدید عربی میں تقریر و تحریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

۷. صفِ انگریزی

اس شعبے میں طلبہ کو انگریزی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے جس کے تحت وہ دینی علوم و مسائل کی انگریزی زبان میں تشریح و توضیح کے قابل ہو جاتے ہیں۔

۸. شعبۂ خوشنویسی

اس شعبے میں تمام طلبا کو خوشنویسی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس شعبے کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ محض خط کی صفائی کا ہے تاکہ طالب علم بدخطی کے عیب سے محفوظ ہو جائے اور دوسرا فنِ کتابت کی فنی تکمیل کا ہے جس کے لیے طلبا کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں اور اس درجہ کی مدتِ نصاب پوری کر کے وہ اس فن کی سند کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو طلبا فنِ کتابت سیکھنا چاہتے ہیں، انھیں کتابت سکھائی جاتی ہے لیکن یہ درجہ لازمی مضمون کا نہیں ہے۔

۹. جامعہ طبیہ

اس شعبے میں طلبہ کو طبِ قدیم و جدید معہ سرجری وغیرہ پڑھائی جاتی ہے اور اس کی تکمیل پر باقاعدہ سند دی جاتی ہے جو حکومت کی طرف سے تسلیم شدہ ہے۔

۱۰. دارالصنائع

اس شعبے میں طلبا کو ابتدائی درجہ کی کچھ دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں اور اس کی تکمیل پر باقاعدہ سند دی جاتی ہے۔ تاکہ طلبا حسبِ ضرورت کسبِ معاش کر سکیں، مثلاً بیدروکس خیاطی اور جلد سازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۱. شعبۂ مطالعہ علومِ قرآنی

اس شعبے میں قرآن پر ریسرچ کا انتظام ہے۔

۱۲. شعبۂ تعلیم الافتاء

منتخب طلبہ کو فتویٰ نویسی کی مشق کرانے کے لیے یہ شعبہ دارالافتاء کی نگرانی میں قائم ہے، جس میں ہر سال اعلیٰ استعداد کے طلبا کی ایک مختصر جماعت افتاء نویسی کے لیے منتخب کی جاتی ہے جس کے لیے ایک کمیٹی زیرِ صدارت مہتمم دارالعلوم انتخاب کا کام انجام دیتی ہے اور فارغ شدہ طلباء کو افتاء کی سند دی جاتی ہے۔

۱۳. مجلس معارف القرآن

یہ ایک تحقیقی ادارہ ہے، جو اپنے نظم اور کاموں میں مستقل اور آزاد ہے، مگر دارالعلوم کی سرپرستی میں قائم ہے۔ اس کی مجلس منتظمہ الگ ہے اس کا مقصد قرآنی علوم کی ریسرچ اور تحقیق کے ساتھ وقت کے الجھے ہوئے مسائل کو قرآن کی روشنی میں حل کر کے اس طرح پیش کرنا ہے کہ قرآن حکیم دنیا کا راہنما اور امام ثابت ہو اور دنیا کو قرآن حکیم کی روشنی میں حاصل کرنے کی رغبت اور اُمنگ پیدا ہو۔

۱۴. دارالافتاء

اس شعبے سے ملک اور بیرونِ ملک سے آنے والے سوالات پر فتوے دیئے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ درحقیقت اسلامی عدلیہ کا شعبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں کا پرسنل لاء ان کے ذاتی خانگی اور اجتماعی معاملات میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے، جس سے اسلام بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ اوپر کے شعبے تعلیمِ خواص کے ہیں اور یہ شعبہ تعلیمِ عوام کا ہے۔

انتظامی شعبہ جات میں مندرجہ ذیل پندرہ شعبہ جات ہیں

۱. کتب خانہ

اس شعبے میں درسی، غیر درسی کتب اور مخطوطات کے عظیم ذخیرے محفوظ ہیں، جن سے طلبا اور اساتذہ کو مفت کتب فراہم کی جاتی ہیں، اور جو حضرات باہر سے تحقیق کرنے آتے ہیں، ان کو بھی مطالعے کی مکمل سہولت دی جاتی ہے۔

۲. مطبخ

یہ شعبہ کھانے سے متعلق ہے۔ تقریباً دونوں اوقات میں ۲۰۰۰ طلبا کا کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ عموماً طلبہ کو کھانا مفت ملتا ہے۔ مگر صاحب استطاعت طلبا اگر کھانے کی قیمت ادا کرنا چاہیں، تو صرف اصل لاگت وصول کی جاتی ہے۔ نفع وغیرہ نہیں لیا جاتا۔

۳. تعمیرات

یہ ایک مستقل شعبہ ہے، جس کا کام بارہ مہینے جاری رہتا ہے۔ چنانچہ پرانی عمارتوں کی مرمت، ترمیم و تنسیخ اور حسب ضرورت نئی عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے کام اسی شعبے کے تحت ہیں۔

۴. دارالمطالعہ

اس شعبے میں طلبا کے مطالعے کے لیے اخبارات رسائل اور ضروری کتب کا انتظام ہے۔ یہ ایک ذمہ دار نگران کی نگرانی میں ہر وقت کھلا رہتا ہے اور طلبا جب چاہیں یہاں آکر مطالعہ میں مصروف ہو سکتے ہیں۔

۵. دارالتربیت :-

یہ ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس شعبے میں کم عمر طلبا کی تربیت اور اخلاق نگرانی کا انتظام ہے۔

۶. ترتیب فتاوے

اس شعبے میں دارالعلوم کے دارالافتا سے جو فتوے صادر کیے گئے ہیں، ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا ہے۔ انھیں ترتیب دینا اور کتابی صورت میں شائع کرنا اسی شعبے کا فرض ہے۔ اب تک یہ شعبہ کئی کتب شائع کر چکا ہے۔

۷. دارالاقامہ

یہ شعبہ بورڈنگ سے متعلق ہے۔ چنانچہ دارالاقامہ میں رہنے والے طلبا کی جائے رہائش اور ان سے متعلق جملہ امور اسی شعبے کے تحت آتے ہیں۔

۸. شعبہ تنظیم ابنائے قدیم

اس شعبے کے ذریعے ابتدا سے اب تک جتنے طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں۔ ان کی تنظیم و تنظیم کی جاتی ہے اور ان خدمات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے جو مختلف دائروں میں انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے کی رپورٹ وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہے۔

۹. شعبہ برقیات و متفرقات

اس شعبے کے ذمہ دارالعلوم کی صفائی، آب رسانی، مہمانوں کی ضروریات، طلبا کی تعلیم ... دارالعلوم میں روشنی کا انتظام ہے

۱۰. محافظ خانہ

اس شعبے میں دارالعلوم کی ابتدا سے آج تک کے تمام شعبہ جات کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

۱۱. شعبہ امورِ خارجہ

اس شعبے میں بیرونی طلبا کے پاسپورٹ، ویزا کے سلسلے میں ضروری تحفظات اور اندراجات اور عام طلبہ کے ریلوے کنسیشن وغیرہ کے انتظام وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

۱۲. شعبہ نشریات دارالعلوم

اس شعبے سے دارالعلوم کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے — دارالعلوم کے سلسلے میں ذمہ دارانہ اطلاعات نیز اس کی ضروریات کے اظہار وغیرہ کی نشر و اشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کے علمی و دینی مضامین اور معلومات پر تبصرے مقبول ہیں۔ ایک رسالہ "دعوت الحق" کے نام سے عربی میں شائع ہوتا ہے، تاکہ اکابر دارالعلوم کے خیالات عرب دنیا تک بھی پہنچ جائیں اور ان سے نہ صرف یہ کہ عرب دنیا واقف ہو بلکہ انہیں دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں کا بھی علم ہو سکے۔

۱۳. شعبہ تبلیغ

اس شعبے سے ملک کے مختلف حصوں میں مبلغین روانہ کئے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اقدامی تبلیغ کے لیے الگ اور عام اصلاحی جلسوں کے لیے الگ مبلغ نامزد کئے جاتے ہیں، جو باقاعدہ اور منظم پروگرام کے تحت بھیجے جاتے ہیں۔

۱۴. شعبہ ورزش

اس شعبے کا تعلق طلبا کی جسمانی صحت سے ہے۔ ورزش کا باقاعدہ انتظام ہے۔ تاکہ ساتھ ساتھ صحت کا بھی التزام رہے۔

۱۵. جمعیۃ الطلبہ

یہ طلبائے دارالعلوم کی انجمن ہے۔ جس کے تحت طلبا تقریر و تحریر اور مناظرے کی مشق کرتے ہیں۔

*

مالی شعبہ جات میں مندرجہ ذیل چار شعبے آتے ہیں۔

۱. محاسبی

اس شعبے میں دارالعلوم کی آمدنی و خرچ کا تفصیلی حساب رکھا جاتا ہے۔ تمام بنیادی کاغذات و کھاتہ روزانہ اور ماہانہ وغیرہ کے گوشوارے مرتب کیے جاتے ہیں۔ حساب کتاب ہر سال سرکاری آڈیٹروں کے ذریعے آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔

۲. شعبہ اوقاف

اس دفتر کے ذمہ دارالعلوم کے نام جس قدر جائیداد از قسم صحرائی و سکنائی وقف ہیں۔ ان کا حساب رکھنا ہے۔ تحصیل و وصول کا باقاعدہ منظم دفتر ہے، جو آمدنی اور خرچ اور داد و ستد کا باقاعدہ حساب رکھتا ہے۔

۳. شعبہ تنظیم و ترقی

اس شعبے کے تحت تحصیل جاریہ کے لیے سفیروں کا تقرر ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں حلقہ وار پھیل کر دارالعلوم کے لیے چندہ فراہم کرتے ہیں نیز مقررہ چندوں کی وصولیابی کرتے ہیں۔

۴. ادارہ اہتمام :

ان سب پر آخری اور مرکزی ادارہ اہتمام ہے۔ جس سے ہر شعبے کے بارے میں خواہ تعلیمی ہو یا مالی، یا انتظامی تجاویز اور احکام نافذ ہوتے ہیں

دارالعلوم کا نصاب تعلیم

دارالعلوم کا قیام تحریک ولی اللہی کو عملی شکل دینے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ اس لیے یہاں وہی نصاب تعلیم رائج ہے۔ جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز فرمایا تھا۔ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نصاب کی مختصر تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔

مدرسہ نظامیہ بغداد

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ درس نظامی نظام الملک یا نصیرالدین محقق طوسی کا وضع کردہ ہے جو انہوں نے مدرسہ نظامیہ بغداد کے لیے تیار کیا تھا۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کا سنہ تاسیس ۴۵۷ھ مطابق ۱۰۶۴ء ہے۔ ۱۰ ذوالقعدہ ۴۵۹ھ مطابق ۱۰۶۸ء بروز شنبہ اس کا افتتاح عمل میں آیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی رسم افتتاح نہایت تزک و احتشام سے ادا ہوئی، افتتاح کے وقت سارا بغداد امڈ آیا تھا۔

محقق طوسی نے اس دارالعلوم کے لیے دو لاکھ دینار کی رقم خلیفہ وقت کی، موجودہ سکے کے اعتبار سے دس لاکھ روپے ہوتی ہے سالانہ اخراجات کے لیے پندرہ ہزار دینار یعنی ۵ ہزار روپیہ منظور کیا۔ اس دارالعلوم میں بیک وقت چھ ہزار طلبہ کی تعلیم و تدریس کا انتظام تھا۔ طلباء میں غریب اور نادار بچوں سے لے کر امراء و رؤسا کے صاحبزادے تک شامل ہوتے تھے۔ علامہ ابو اسحٰق شیرازی مدرسہ کے صدر معلم تھے۔ طلبہ کے لیے نقد وظائف اور اساتذہ کے بیش قرار مشاہرے مقرر تھے۔

(ملاحظہ ہو رسالہ شبلی اسلامی مدارس۔ صہ ۴۴۹/۴۵۰۔)

قدیم نصاب میں اصلاح

محقق طوسی کے وضع کردہ نصاب میں سب سے قابل قدر اضافے سکندر لودی کے عہد میں شیخ عزیزاللہ اور شیخ عبداللہ نے کئے۔ انہوں نے قاضی عبدالملک کی تصانیف مطالع اور مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم کو داخل نصاب کیا۔ علامہ بدایونی کے قول کے مطابق علم منطق کو ہند میں انہیں حضرات کے وجود سے فروغ ہوا۔ ورنہ ان کے آنے سے قبل اس علم کی صرف دو کتابیں رائج تھیں۔

ان کے بعد سید شریف جرجانی کے تلامذہ اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے اپنے اساتذہ کی شرح کو نصاب میں داخل کیا۔ (ہندوستان کی قدیم درسگاہیں (صفحہ ۹۲۔۹۵)

بعد ازاں اکبری عہد میں عضدالملک، مولانا فتح اللہ شیرازی نے نصاب میں کچھ اور اضافے کئے اور علماء نے انہیں بصد خوشی قبول کر لیا۔ عہد عالمگیری کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء) نے اس نصاب میں اہم ترمیمات کیں اور کتابوں کی ترتیب کو بھی بہت حد تک بدل ڈالا۔ آپ نے اپنے رسالہ الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے۔

ولی اللہی نصاب

نحو میں : ——— کافیہ، شرح جامی

منطق میں : ——— شرح شمسیہ، شرح مطالع

فلسفہ میں : ——— شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام میں : ——— شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی و شرح مواقف

فقہ میں : ——— شرح وقایہ، ہدایہ (کامل)

اصول فقہ میں : ——— حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح

بلاغت میں :ـــــــ مختصر مطول

طب میں :ـــــــ موجز القانون

حدیث میں :ـــــــ مشکٰوۃ المصابیح کامل، ترمذی کامل، کبھی قدرے صحیح بخاری

تفسیر میں :ـــــــ مدارک، بیضاوی

سلوک و تصوف میں :ـــــــ عوارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص

درس نظامی میں اصلاح

ہمارے پیش نظر محقق طوسی کا وضع کردہ نصاب نہیں، بلکہ ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) کا تیار کردہ نصاب زیر بحث ہے۔ ہم اس وقت اس کا مختصر خاکہ پیش کر رہے ہیں۔

سہالوی مرحوم کا یہ نصاب مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ ہی نے نہیں اپنایا، بلکہ پاک و ہند کی ہر دینی درس گاہ نے اس نصاب کو قبول کیا۔ کچھ عرصے بعد غالباً سب سے پہلے رسالہ نظامیہ فرنگی محل کے شیخ الجامعہ مولانا قطب الدین عبدالولی صاحب نے اس نصاب میں متعدد اصلاحات کیں۔ انھوں نے بعض کتب اور مضامین میں رد و بدل بھی کیا۔ یہی درس نظامی معمولی تبدیلی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور بلاتخصیص مسلک پاک و ہند کے جملہ مدارس عربیہ اسلامیہ میں تاحال رائج ہے۔ اگر مختلف مسالک کے نصاب میں کچھ فرق ہے تو صرف فقہ و عقائد اور تفسیر و حدیث کی کتب میں ہے۔

گزشتہ دو صدیوں کے اندر نصاب میں تبدیلی کی متعدد کوششیں ہوئیں مثلاً علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور متعدد دیگر علمائے کرام نے اس کے لیے مساعی کیں۔ خصوصاً اہل حدیث مکتب فکر کے مدارس میں انتخاب حدیث اور تفسیر قرآن کے سلسلے میں نمایاں اضافہ ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ترمیم شدہ جدید نصاب رائج بھی ہوگئی۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور و بعد ازاں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں جدید نصاب رائج ہوا۔ وفاق المدارس العربیہ ملتان نے بھی نصاب میں تبدیلیاں کیں۔

ہند و پاک میں درس نظامی سے مختلف نصاب اور نظام تعلیم کی جو منظم کوششیں معرض وجود میں آئیں اور مستقل درس گاہیں قائم ہوئیں۔ ان میں نمایاں ترین حسب ذیل ہیں۔

مدرسہ عالیہ (کلکتہ)، مدرسۃ العلوم (مسلم یونیورسٹی) علیگڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ عباسیہ بہاولپور، جامعہ سلفیہ لائلپور۔

ان تمام درس گاہوں کا نظم، طریق کار، مزاج، نصاب اور نظام تعلیم بہت حد تک اور بعض صورتوں میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ تفصیلات میں داخل ہوئے بغیر ان کا اجمالی تعارف ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں ذاتی طور پر کلکتہ میں درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ ۵۷۴۴۱/۰ روپے اس کی تعمیر پر خرچ ہوئے اور ۶۲۵ روپے ماہانہ کے اخراجات منظور ہوتے۔ چند سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے اپنی تحویل میں لیا اور اس کے لیے ۲۹۱۴۲ روپے سالانہ بجٹ منظور کیا۔ ۱۸۲۴ء میں مدرسہ عالیہ اپنی موجودہ عمارت ولزلی چوک میں منتقل ہوگیا۔

قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ شہر (مشرقی پاکستان) میں بھی مدرسہ عالیہ کے نام سے ایک عظیم درس گاہ قائم ہوئی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ، ملک میں برطانوی حکومت کی طرف سے مشرقی زبانیں اور دینی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نصاب میں فلسفہ و دینیات

فقہ، علم حیات، ریاضی، منطق، صرف و نحو اور عروض کے مضامین شامل تھے۔ ۱۸۵۰ء میں شعبۂ عربی کے ساتھ، شعبۂ اینگلو عربی، شعبۂ انگریزی اور شعبۂ بنگالی کا بھی اضافہ ہوگیا۔

مدرسۃ العلوم علیگڑھ

برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اندر انگریزی تعلیم کے اوّلین داعی اور مؤسسِ اوّل سرسیّد نے علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ یہی مدرسہ آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بنا اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان و پاک میں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے مرکزی جامعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ سرسیّد نے تبلیغِ دین کے جس نصب العین کا بار بار ذکر کیا اور اپنی زندگی میں جس کیلئے انھوں نے مخلصانہ مساعی بھی کی تھیں، وُہ اس جامعہ سے پُورا نہ ہو سکا۔ شیعہ اور سُنّی دینیات کا مضمون ضرور شاملِ نصاب رہا، لیکن ضمیمہ کی صورت میں؛

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تحریکِ ترکِ موالات کے دوران علیگڑھ میں چند خیموں کے اندر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بُنیاد پڑی۔ کچھ عرصے بعد دہلی کے اندر اوکھلے میں یہ درسگاہ اپنی موجُودہ مستقل عمارات میں منتقل ہوگئی۔ چند ہی سالوں میں اوکھلے کا ویرانہ جیتی جاگتی زندگی کی شکل اختیار کر گیا اور جامعہ نے ایک مستقل یُونیورسٹی کی حیثیت اختیار کرلی۔

جامعہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر سیّد ذاکر حسین صاحب، خواجہ عبدالحیٔ صاحب فارُوقی، مولانا محمد اسلم جیراجپُوری جیسے بلند پایہ اصحاب شامل تھے۔ حدیث و تفسیر اور فقہ و دینیات کے مضامین نصاب میں شامل رہے، لیکن جامعہ کے پیشِ نظر دیندار گریجویٹ پیدا کرنا تھا نہ کہ دین کے مبلّغ اور عالم، چنانچہ عرصے بعد اس عظیم ادارے کا نام بھی صرف جامعہ ملیہ رہ گیا۔

★

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد

۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ کی خصُوصیت یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک اُردُو کو ذریعۂ تعلیم رکھا گیا ہے۔ ہر علم و فن کی اہم اور معیاری کتابوں کے اُردُو میں ترجمے کرائے گئے ہیں۔ لیکن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور جامعہ ملیہ دہلی کی طرح یہاں بھی، میٹرک، ایف اے اور بی اے، ایم اے کے نصابات زیرِ تدریس آئے۔ ان امتحانات میں دینیات کے دو دو اور تین تین پرچے ضرور رکھے گئے؛ لیکن عالم اور مبلّغ پیدا کرنا کبھی ان کا نصب العین اور منشا نہ ہوا۔

جامعہ کے نصاب میٹرک میں عقائد، منطق، فقہ اور حدیث کی چند کتابیں، ایف اے میں، فقہ، اصُولِ فقہ، تفسیر اور حدیث کی کچھ کتابیں یا ان کے منتخب حصے اور اسی طرح بی اے کے نصاب میں فقہ، اصُولِ فقہ، تفسیر، حدیث اور علم الکلام کی چند کتابیں شامل کی گئیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم لکھنؤ قائم ہوا۔ یہ درسگاہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ اور دارالعلوم دیوبند اور فرنگی محل کی درمیانی کڑی ثابت ہوئی۔ گومتی ندی کے کنارے لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ وہ اپنی شاندار عمارات میں قائم ہے۔ ان درسگاہوں اور دارالاقامہ کی عمارات کے درمیان عالی شان مسجد ہے۔

علامہ شبلی نعمانی، نواب علی حسن خان، مولانا حکیم عبدالحیٔ مرحومین اور ان کے رفقاء اس کے ابتدائی مؤسس اور محرک تھے۔ ندوۃ العلماء کے تعلیمی نصاب کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

درجہ ابتدائیہ:

اُردُو زبان میں ابتدائی تعلیم اور دینیات کا چار سالہ نصاب۔

عربی میں کمزور طلباء کے لیے ایک سالہ نصاب

درجہ ثانیہ :

عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا چار سالہ نصاب۔
اس درجہ سے ذریعہ تعلیم عربی ہو جاتا ہے۔ ادب عربی اور ترجمتین پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

درجہ عالیہ :

علوم اسلامیہ کا سہ سالہ نصاب، ان درجات میں حدیث اور تفسیر کے علاوہ علوم حاضرہ اور بقدر ضرورت انگریزی زبان کی تدریس بھی نصاب میں شامل ہے۔

درجہ فضیلت :

تفسیر، اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث اور دوسرے متعلقہ علوم پر مشتمل دو سالہ نصاب۔

درجہ تخصص :

عربی ادب اور ادبیات کا دو سالہ کورس۔
اس درس گاہ اور اس کے نصاب کے تعین سے ارباب بست و کشاد کے پیش نظر جو اصلاحات تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے :

۱. علوم میں کتابی مہارت کی بجائے فنی مہارت پیدا کی جائے۔
۲. علوم حاضرہ کو بقدر ضرورت رکھا جائے اور جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کی جائے۔
۳. عربی ادب خصوصاً دور جاہلیت کے شعراء اور ادباء وغیرہ کو شامل نصاب کیا جائے۔
۴. تاریخ اور جغرافیہ کے ابواب کا اضافہ کیا جائے۔
۵. انگریزی کو بحیثیت زبان داخل نصاب کیا جائے۔
۶. تقابل ادیان کی طرف خصوصی توجہ دی جائے

۷. تدریس و تعلیم جماعتی عصبیت سے یکسر پاک ہو۔

ندوۃ کے طلباء قدیم میں مولانا سلیمان ندوی، مسعود عالم ندوی ــ عبدالسلام ندوی صاحب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے نے جس قدر مصنف، مؤلف اور عظیم افراد پیدا کئے ہیں۔ ان کی مثال اور کسی ادارے میں نہیں ملتی۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

۱۹۱۰ء میں مولانا محمد شفیع مرحوم نے اس ادارے کی بنیاد رکھی اور ایک وقت یہ بھی آیا کہ شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کو اپنے عزائم کی تکمیل کے سلسلے میں غیر مکتفی پایا تو اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا فراہی بھی اس سے وابستہ ہوئے اور دم آخر تک خدمت قوم کرتے رہے۔ اس مدرسے میں ابتدائی اور عربی دونوں طرح کا نصاب رائج ہے۔ ابتدائی درجات کا نصاب ۵ سالہ اور عربی ۸ سالہ ہے۔ الف تے کے معیار تک انگریزی زبان بھی سکھائی جاتی ہے۔ مدرسہ کے مقاصد کے سلسلے میں مؤسسین کے الفاظ یہ ہیں۔

۱. علوم کو خدام قرآن کے لحاظ سے اخذ کیا جائے
۲. قرآن فہمی کے لیے عربی ادب پر عبور حاصل کیا جائے۔
۳. فقہ بطریق تفقہ سکھایا جائے۔
۴. اساتذہ اور طلباء سادگی اور مذہبیت کے رنگ کو اپنائیں۔
۵. یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے جملہ فرقوں کا سنگم ہو۔
۶. مدرسہ سرکاری اثر سے ہر طرح آزاد رہے۔
قدیم تقریری طریقہ جاری رکھا جائے۔

جامعہ عباسیہ بہاولپور

۱۹۲۵ء میں ادارے کی بنیاد پڑی اور نواب صاحب نے

اس کی سرپرستی قبول کی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ فرشتہ رُستہ مستقل عربی یونیورسٹی میں بدلا جاسکے۔ چنانچہ ایک جامع نصاب بنایا گیا، مگر پوری طرح اس پر عمل نہ ہو سکا۔

دارالعلوم کا طرزِ تعلیم

دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبا کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم محترم عبادت ہے۔ اسی عقیدے کی بدولت یہاں تعلیم کے جتنے عنوان ہیں، سب میں عبدیت، فروتنی اور سنجیدگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہاں گو مختلف الخیال اور مکاتبِ فکر کے طلبا علم حاصل کرتے ہیں، مگر کیا مجال کہ اساتذہ کے احترام میں فرق آئے۔ طلبا عموماً اساتذہ کی آمد پر احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کی کتب یا جوتے تھام لینا معمولات میں شامل ہے۔ گو اساتذہ کی نشست ممتاز ہوتی ہے، مگر کمال سادگی اور فروتنی کا مرقع ہوتی ہے۔

سبق کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے اور عموماً طلبا اور اساتذہ کی زبان پر رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَیْر کے الفاظ جاری ہوتے ہیں۔ استاذ لیکچر کا انداز اپناتے ہیں۔ مطالعہ پر زور ہے اور خلاصوں یا کلید کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہر نئے سبق سے پہلے گزشتہ اسباق کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ استاذ یہ بھی اندازہ کرتا رہتا ہے کہ طلبہ رات کا مطالعہ کر رہے ہیں یا نہیں۔

امتحانات کا سہ ماہی، ششماہی، نہ ماہی اور سالانہ نظام ہے۔

یہ امتحانات تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی۔ امتحان میں کامیابی کے لیے کم از کم ۵۰ نمبر لینے ضروری ہوتے ہیں۔ امتحان کے بعد سند ملتی ہے جو درجات کے مطابق ہوتی ہے، ہر سال فارغ التحصیل طلبہ کو دستارِ فضیلت عنایت ہوتی ہے۔

دارالعلوم کی اسناد :

دارالعلوم میں درجات عربیہ سے فارغ ہونے والوں کو ۳ سندیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ سند العالم ؛ یہ سند دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد دی جاتی ہے۔

۲۔ سند الفاضل ؛ اس کے لیے دورۂ حدیث اور دورۂ تفسیر دونوں کی تکمیل ضروری ہے۔

۳۔ سند الکامل ؛ یہ سند اس طالب علم کو دی جاتی ہے جو درجۂ تکمیل کے علوم و فنون کو پڑھ چکا ہو۔ پھر مذکورہ بالا تینوں سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے ۳ درجے کی ہوتی ہیں۔ اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ، جن میں یہ تفاوت الفاظ و عنوان امتیاز رکھا گیا ہے۔ سب سندیں عربی میں ہوتی ہیں اور انکو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ اور مدینہ یونیورسٹی تسلیم کرتی ہے۔

درج بالا سندوں کے علاوہ مندرجہ ذیل سندیں بھی دی جاتی ہیں؛

۱۔ درجاتِ فارسی سے فارغ ہونے والوں کی سند

۲۔ درجۂ تجوید سے فارغ ہونیوالوں کی سند

۳۔ ابتدائی دینیات سے فارغ ہونیوالوں کی سند

۴۔ تکمیل سے قبل چھوڑ جانے والوں کو سرٹیفکیٹ۔

حصہ اوّل

تنقید ــــ بر ــــ تحقیقی مقالہ

حصہ دوم

مفروضہ کی جانچ اور سفارشات

تنقید بر تحقیقی مقالہ ؛ تحقیق میں تنقید کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے کیونکہ یہی ذوکسی

ہے، جو تحقیق کو یہ کہ کر اس کی حقیقت تک پہنچاتی ہے۔ محقق جو مواد حاصل کرتا ہے جہاں اسے مرتب اور باقاعدہ انداز میں تحریر کرتا ہے، وہیں اس کا جواز پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مواد محصلہ کس حد تک معتبر ہے۔

تحقیق کی تنقید کے دو طریقے ہوتے ہیں، یعنی داخلی اور خارجی تنقید میں مواد محصلہ کا معنوی جواز اعتباریت جانی جاتی ہے۔ اسباب علل اور اُن کی نوعیت سے بحث ہوتی ہے اور مدلل بحث سے وضاحت کی جاتی ہے جب کہ خارجی تحقیق میں محقق یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جن مسائل اور دستاویزات کو تحقیق کا ماخذ بنایا گیا، وہ کب اور کن حالات میں وقوع پذیر ہوئے، ان کی لسانی و صوری معتبری کا کیا حال ہے۔

تنقیدی مواد سے تحقیق کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور انھیں نتائج کی روشنی میں محقق اپنی سفارشات پیش کرتا ہے۔

زیر نظر تحقیقی مقالہ میں دونوں طریقے اپنائے گئے ہیں، باب دوم اور سوم میں جو کچھ درج کیا گیا ہے، اس کے ہر ہر پہلو پر باب چہارم میں خاطر خواہ تبصرہ کر کے سفارشات پیش کی گئی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی تحریک اور خدمات کو سمجھنے کے لیے اس دور کو ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے کے دور کو سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر دارالعلوم کی اہمیت کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے رفقاء نے جس زمانہ میں مسلمانوں کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا، وہ ہندوستانی مسلمانوں کا سخت ترین دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد جو سیاسی زوال ہوا، اس نے زندگی کے ہر ہر شعبے کو رُو بہ انحطاط کر دیا تھا۔ مسلمان سماجی، علمی، تہذیبی، اقتصادی غرض کہ ہر ہر شعبے میں ناگفتہ بہ حالت کا شکار بن چکے تھے، انگریز جو سات سمندر پار سے بطور تاجر اس ملک میں آئے تھے، اب حاکم تھے، ان پر سیاسی و سماجی دونوں طرح ذمہ داریاں آن پڑی تھیں، جہاں تک ہو سکا انھوں نے سیاسی فوائد سے فائدہ اُٹھایا، مگر سماجی فرائض سے کنارہ کش ہی رہے، مگر

تاہم کچھ تو تاریخی شہادت کہ حکومت وقت سماجی و فلاحی امور کی ذمہ دار رہا کرتی ہے کچھ چند حقیقت پسند انگلستان کی ہمدرد باسیوں کے اصرار پر وہ مجبور ہو گئے کہ کم از کم تعلیمی میدان میں کچھ نہ کچھ کام کریں۔

کام کی ابتداء پرانے تعلیمی نظام کی چھان بین سے ہوئی، چنانچہ بمبئی اور بنگال کی رسمی تعلیم پر تحقیق ہوئی۔ یہ تحقیق گو پوری طرح یقینی نہیں کہلا سکتی، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مقامی حالات اور ضروریات کی روشنی میں پرانا طریقہ کم خرچ اور بالانشین والا تھا۔ آدم کی رپورٹ میں تو واضح الفاظ میں سفارش ملتی ہے کہ جدید تعلیم کی بنیاد قدیم اداروں پر قائم کی جائے، تاکہ ایک طرف اہلِ ہند راضی رہیں، تو دوسری طرف حکومت کو بھی زیادہ مالی بار اُٹھانا پڑے۔

مگر کمپنی کے ناخداؤں کو یہ سفارش پسند نہ آئی، ان کے پیشِ نظر تو تعلیم پھیلانے کی نسبت اپنا منفرد مقصد حاصل کرنا زیادہ اہم تھا۔ بقول این این لاء وہ تو ایسی تعلیم کے حق میں تھے، جو عیسائیت کے فروغ میں ممد ثابت ہو سکے۔ اسلئے ۱۸۱۴ء میں ایسے اقدامات کیے گئے کہ کمپنی کے خرچ پر پادری وہ علم پھیلائیں، جو ان کے عقیدے اور کمپنی کے مقاصد کے شایان شان ہو۔ اسی طرح ۱۸۵۹ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے فیصلہ کیا کہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں عیسائی مذہب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ پادری صاحبان کو بھی احساس تھا کہ عوام تک رسائی کا مؤثر ترین ذریعہ مدارس ہی ہیں، اس لیے انھوں نے کمپنی کی آواز پر لبیک کہا۔ اس طرح کمپنی اپنے طور پر تعلیم کے فرض سے سبکدوش ہو گئی اور مشنریز نے بطور مبلغ یہ کام شروع کر دیا۔

۱۷۶۵ء میں کمپنی کو ہر طرح سے سیاسی بالادستی حاصل ہو گئی، تو اس نے رویہ بدلا اور یہ ظاہر کیا جانے لگا کہ حکومت لادینی نظریات کی حامل ہے۔ مشن والے بھلا یہ تبدیلی کس طرح گوارا کرتے۔ اس لیے ولبر فورس نے ۱۷۹۳ء میں چارٹر کی توثیق کے وقت ہندوستانیوں کی اخلاقی ،

اور مذہبی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دینے کا مطالبہ کیا، اس سلسلے میں سیاسی مصالح کا لحاظ بھی ضروری تھا اس لیے انھوں نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ ایسے قابل افراد کی خدمات حاصل کی جائیں، جو بلا معلم یا مشنری کام کرتے رہیں، کمپنی کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی اور یہ تجویز رد ہو گئی، مگر مشنری بہ درجہ سیخ پا ہوئے۔ انھوں نے تقریر کا وہ سلسلہ شروع کیا، جو ذاتی حملوں تک پہنچ گیا۔ مشنری کا سب سے بڑا نمائندہ چارلس گرانٹ تھا جس کا طویل مضمون حد درجہ نفرت اور تضحیک کا مظہر تھا، اس نے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے متنفر کرنے کے لیے ان کے کردار کو زیادہ سے زیادہ گھناؤنا کر کے دکھایا اور پھر ان کی اصلاح کے لیے واحد علاج یہ تجویز کیا۔ کہ مغربی ادب اور فلسفۂ حیات کو اس طرح پھیلایا جائے کہ رفتہ رفتہ پورا ہندوستان مسیح کا پیرو بن جائے۔

اس مضمون کے چھپتے ہی گرانٹ کے دوستوں نے ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۱۳ء کا ایکٹ پاس ہوا۔ اور مشنری کو نئے سرے سے جان مل گئی۔

مشنری نے نئے سرے سے کام شروع کیا تو اب ان کا رہبر میکالے تھا، جو ہر طرح سے گرانٹ کا جانشین تھا، اس نے سب سے پہلے مطالبہ یہ کیا کہ کمپنی ہر سال جو ایک لاکھ روپیہ دینے پر مجبور ہے۔ اسے مشنری کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم کو ترویج دی جا سکے، گو لارڈ منٹو مشرقی علوم کا طرف دار تھا۔ مگر راجا رام موہن رائے کی درخواست کی وجہ سے لارڈ میکالے کو کافی تقویت ملی اور اس نے ہندوستانی السنہ پر دل کھول کر طعن و تشنیع کیا، وہ اس حد تک غلو کا شکار ہو گیا کہ مشرقی تہذیب اور مذاہب تک کا مذاق اڑانے لگا۔ اس کی چرب زبانی رنگ لائی اور وائسرائے نے ۱۸۳۵ء میں اس کی تمام تجاویز کو مانتے ہوئے خطیر رقم انگریزی علم و ادب کی ترویج کے لیے وقف کر دی، اس طرح ہندوستانیوں کو وہ تعلیم دی جانے لگی، جو بقول لارڈ میکالے ایسے نوجوان پیدا کرنے کے قابل تھی، جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں، مگر دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی ہوں اور جس کا واحد مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستان کو ایسی سرزمین میں بدل دے، جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عیسیٰ مسیح کا جھنڈا لہرا رہا ہو۔

عام کہاوت ہے کہ شامت اور بدنصیبی کبھی تنہا نہیں آتی، یہی صورت حال ہندوستانی مسلمانوں کو پیش آئی۔ انگریز اپنے اقتدار کے نشے میں مست ہو رہا تھا۔ اور بھولے بھالے مفلوک الحال افراد کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ اس کی شہ پر ہندوؤں کو بھی یہ جرأت ہوئی کہ مسلمانوں سے الجھیں اور اپنے مذہب کا پرچار کریں، چنانچہ شاہ جہان پور میں منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک مذہبی جلسہ منعقد کرایا اور اس میں مسلمانوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے مناظرہ کا بندوبست کرا دیا۔ ہندوؤں نے تو سرسری سی بات کر کے جان چھڑائی، مگر پادریوں اور علماء میں خاصی تکرار ہوئی۔

اسی قسم کا دوسرا جلسہ شاہجہانپور میں ہوا، جس میں دیانند سرسوتی اندین وغیرہ نے خاصی ہرزہ سرائی کی۔ پادری تارا چند پادری کارل فنڈر وغیرہ کا زہر اگلنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

آریہ فتنہ دو ہاتھ اور آگے بڑھ گیا۔ ان کے کرتا دھرتا دیانند سرسوتی نے انگریزوں کی شہ پر مسلمانوں کو مرتد بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے سینکڑوں چیلے بھی میدان میں آگئے۔ رڑکی میرٹھ وغیرہ میں اس نے خاصے عرصے طوفان برپا کئے رکھا۔

جابر حکومت پادری اور آریا سماجی فتنے ہی کیا کم تھے کہ گلشن اسلام کو ویران کرنے کے لیے کچھ دوست نما دشمن بھی شریک ہو گئے۔ ادھر عوام کا یہ حال کہ بھولے بھالے مسلمان رسوم و رواج کو اپنائے ہوئے تھے بجائے اس کے کہ سنت نبوی پر کار فرما ہوتے، ان کے دلوں کی کایا کچھ اس طرح پلٹ چکی تھی کہ بربادی کا شادی، جہل کا نام علم اور شرک اور رسوم کا نام اسلام رکھ دیا تھا، جمعیت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں امڈ امڈ کر ہندوستان پر محیط ہو رہی تھی — ہر چہار جانب سے جہالت ضلالت اور گمراہی کا طوفان تشنۂ ہدایت سے

بڑاتا تھا، سرشتگی تحقیر اور سنت نبویؐ کی توہین روز بروز بڑھ رہی تھی، عوام خود کو ملاحق سے مستغنی تصور کرنے لگے تھے۔ کہیں رفض و تشیع کا زور تھا، تو کہیں عدم تقلید جنم لے رہی تھی، ڈھول سارنگی، ٹھمکے کی قوالی ہوتی، بازاری عورتوں کے گانوں پر وجد و حال ہوتا، گور پرستی، تعزیہ پرستی، حب جاہ، حب مال وغیرہ کا یہ حال کر بے ساختہ دل سے یہ شعر نکلتا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد، آن آشنا کرد

یہ تھے وہ دل گداز اور صبر آزما حالات جن کی وجہ سے علماء وقت یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر فوری طور پر دینی اور مذہبی طور پر مسلمانوں کی حفاظت اور تربیت کا سامان نہ کیا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ مسلمان ارتداد کا شکار ہو جائیں گے، ان کے خیال میں سب سے مقدم یہ ضرورت تھی کہ قرآن و حدیث، فقہ، تاریخ، سلف صالحین کے کارناموں اور اقدار کو مسلمانوں تک پہنچایا جائے۔ یہ فیصلہ کسی ایک فرد کا نہ تھا، بلکہ دس بیس دلوں کا فیصلہ تھا۔ یہ حضرات مستقبل بعید کو اپنے تدبر اور فکر کے آئینے میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے، اور متلاشیان حق کو پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ،

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء بروز جمعرات تاریخ کا وہ مبارک دن ہے، جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمۂ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد و ہدایت کا پودا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا، جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہونے لگی اور جس کی سرسبز و شاداب شاخوں کے سائے کے نیچے جہالت اور غفلت کی بادسموم میں جھلسے ہوؤں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اجڑے قلوب کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیا، اس مبارک تقریب میں بہت سے باخدا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم کی موجودہ عالی شان عمارت کی متصل جنوب کی طرف محلہ چھتہ میں انار کے درخت کے ٹہنیوں کے زیر سایہ اس مدرسے کا افتتاح ہوا۔ سب سے پہلے معلم حضرت ملا محمود صاحب اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قرار پائے اس مبارک مدرسے کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ کو پہنچائی اور دعا کی درخواست کی تو موصوف نے فرمایا۔

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے: یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر! یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔"

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی ہے۔

پینے میں آ گیا، کہاں لپٹی ہیں مستیاں
اتنی ہے تند مے، یہاں مست ہوں اور پی نہیں

لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کرتے ہوئے نعرہ بلند کیا تھا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے، جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔ یہ آواز ایک فاتح اور برسراقتدار قوم کی آواز تھی اور اس نے اس آواز کو حقیقت بننے کے لیے بھی تعلیم کو ذریعہ بنایا تھا، جو بذات خود انقلاب آفرین حربہ ہے۔ یہ حربہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی کارگر رہا تھا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھرنی شروع ہو گئیں جو گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں، لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ سے خالص انگریز بن چکی تھیں۔ اس خطرناک انقلاب کو دیکھ کر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کیا

اور نعرہ لگایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے مسلمان ہوں، جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے اعتبار سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔

اس مدرسہ کے قیام کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغربیت کے برگزیدہ اثرات کی راہ میں بند کھڑا ہوگیا۔ اب تک بات یک طرفہ تھی، مگر اب یکطرفہ نہ رہی، بلکہ ایک طرف اگر مغربیت کے پرستار طبقے نے پھیلنا شروع کیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز طبقہ بھی بیدار ہونے لگا اب یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک و تر کو بہا لے جائے گا۔ بلکہ یہ خیال ہونے لگا کہ اس کی زد کا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو اسکے بند باندھ دیئے گئے ہیں کہ یہ ریلا آزادی سے بڑھ نہ سکے گا۔ بلکہ اس کے راستے میں مدافعتی بند موجود ہوں گے، جو اُسے آزادی سے آگے بڑھنے نہ دینگے۔ بہرحال وُہ نیک ساعت آگئی کہ مدرسہ کا کام شروع ہوا۔ محمودِ دیوبندی نے اپنے سامنے ایک شاگرد (کہ جو خود بھی محمود دمحمود الحسن شیخ الہند) تھے۔ بٹھاکر چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے زیرِ سایہ دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی یا نام و نمود کا سلسلہ۔ بس ایک شاگرد تھا اور ایک اُستاد۔ شاگرد بھی محمود تھا اور اُستاد بھی محمود تھا، ان نفوس کے اجتماع سے لاکھوں افراد کے ایمان کی حفاظت کی سکیم معرضِ وجود میں آگئی اور قدرتِ ایمانی کا دَور دَورہ شروع ہوگیا۔

نتائج قیام دارالعلوم

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لیے سینہ سپر رہی ہے۔ خواہ فتنہ نقل و روایت کی راہ سے آیا ہو۔ یا عقلیت پسندی کی بنیاد سے اٹھا ہو۔ اس جماعت نے ہر دَور میں اعلائے کلمۃ الحق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کیا ہے، اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ سے فتنہ نے سر اٹھایا۔ بتصرفین نے تصوف کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں اُبھرا، تو اس کا روایتی طور پر ہی مقابلہ کیا، اور فتنے کی بے سروپا اور بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت، طریقت کی مستند نقل سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات کا بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔ مدعیان عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادیٔ فکر عدم اتباعِ سلف اور نیچریت کا فتنہ عقلِ محض کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا، تو اس نے عقل و دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی اور جس کے حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ نے ایک مستقل حکمتِ عملی مدون فرما دی، جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا، تو اس نے فلسفہ کے انداز کو پہچان کر اسکے راستے روک دیئے

مفروضہ کی جانچ

دارالعلوم کے منافع

دارالعلوم نے اس نوعیت کے بے شمار افراد پیدا کئے، جنہوں نے تعلیم نفس، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، تبلیغ، حکمت اور طب میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں، ان افراد نے مخصوص حصے میں نہیں بلکہ ہند و پاک کے ہر ہر صوبے اور بیرونی ممالک میں قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں، آج جب کہ قیام کو سو سال ہو چکے ہیں ہم اس قابل ہیں کہ اس کی خدمت کا سرسری جائزہ لیں مگر یہ کام خاصا طویل اور صبر آزما ہے۔ اس مقالے کی گنجائش اسے سمونے سے قاصر ہے، اس لیے صرف مغربی پاکستان کا سرسری ذکر کر کے ہم صرف گوشواروں کی مدد سے اپنے جائزے کو محدود اور مختصر کریں گے۔

دار العلوم دیوبند اور مغربی پاکستان

تحریک احیائے دین کرتے کر چلا تھا۔ اللہ کے فضل اور اس کے بانیوں کی نیک نیتی کی بنا پر وہ روز بروز آگے بڑھتا گیا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، ہم مختصر اس کی ترقی کا حال درج کئے دے رہے ہیں۔

پنجاب

پنجاب میں ۱۹۷۱ء تک ۵۸۰ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا میں سے ۱۴۹۵ طلبا بطور اساتذہ خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ۱۱۷۲ اساتذہ ان ہی مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور ۱۷۱۲ اساتذہ سرکاری سندات کے حامل تھے — جہاں تک طلبا کا تعلق ہے، ان مدارس میں ۱۹۷۱ء میں ۲۹۰۹۶ طلبا زیر تعلیم تھے، جن میں سے ۴۵۱۰۵ طلبا مدارس کے دارالاقامہ میں تھے، اور ان پر اس سال خرچ کا میزان ۴۴۲۴۸۵۱۱۷۱ روپے ہوا تھا۔

سندھ

سندھ میں ۱۹۷۱ء میں ۱۲۰ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں فارغ التحصیل طلبا میں سے ۲۱۰ طلبا مدرس تھے۔ ۵۷ اساتذہ انہیں مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور ۴۰ اساتذہ سرکاری سندات کے حامل تھے، جہاں تک طلبا کا تعلق ہے۔ ان مدارس میں ۱۹۷۱ء میں ۵۴۳۱ طلبا زیر تعلیم تھے، جن میں سے ۴۲۲۴ طلبا دارالاقامہ میں مقیم تھے اور ان پر اس سال کا خرچہ ۲۶ ۱۲۴۸۷۵ روپے تھا۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد میں ۱۹۷۱ء میں ۱۴۹ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا میں سے ۴۴۵ مدرس ہیں، ۵۲ مدرس ان ہی مدارس کے فارغ التحصیل ہیں اور ۴۳ مدرس سرکاری

۲۴۸۰ ——

سند رکھتے ہیں، طلبا کی تعداد ۹۵۰۶ ہے۔ جس میں سے ۱۹۶۱ طلبا دارالاقامہ میں مقیم تھے اور ۱۹۷۱ء میں ان کا صرفہ ۱۷۰۰۰۰۵۰ روپے تھا۔

بلوچستان

بلوچستان میں ۱۹۷۱ء تک ۴۴ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل ۳ اساتذہ، مقامی مدارس کے فارغ التحصیل ۱۲ اساتذہ ہیں۔ سرکاری سندات کے حامل ۵ اساتذہ تھے، طلبا کی تعداد ۱۲۰۷ تھی۔ جن میں سے ۴۲۰ طلبہ دارالاقامہ میں رہتے تھے۔ ان کا اس سال کا خرچہ ۴۰۰ ۴۵۲۵۶ روپے تھا۔

مدارس کی صوبہ وار تقسیم

مغربی پاکستان میں مدارس عربیہ کی، مسلک کے اعتبار سے تقسیم اس طرح ہے

نام صوبہ	تعداد مدارس	دیوبندی	بریلوی	متفرق
پنجاب	۵۸۰	۱۷۳	۹۳	۲۱۴
سندھ	۱۲۰	۴۶	۱۵	۵۹
بلوچستان	۴۴	۱۸	۱	۲۵
سرحد	۱۴۹	۹۸	۱۱	۴۰

اس سرسری جائزہ کے بعد ہم خصوصیت سے چارٹ نمبر ۱ تا نمبر ۱۰ شامل کر رہے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ خیر جاری کس حد تک جاری اور مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ فارغ التحصیل طلبا۔ دارالعلوم سے گزشتہ سو سال میں ہزاروں طلبا

تعلیم پاکر نکلے۔ یہ طلبا ہندوستان کے باشندوں میں سے بھی تھے، اور غیر ممالک سے آئے ہوئے بھی تھے۔ گوشوارہ نمبر ۱ میں، ان طلبا کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ مصنفین دارالعلوم

درج بالا ہزارہا فضلا میں سے بے شمار نے عملی زندگی میں مسلمانوں کی خدمت اور دین متین کی حمایت کو اپنا شعار بنایا، ہر ہر فرد نے عوام کی دینی خدمت کی، مگر چند ہستیاں ایسی ہیں جن کے قلم سے مسلمانوں کی اصلاح کا خصوصی التزام ہوا۔ گوشوارہ نمبر ۲ میں چند معروف مصنفین کے اسمائے گرامی اور ان کی تحریر کا رنگ بتایا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم نے جانے پہچانے حضرات کے نام درج کئے ہیں، ورنہ فہرست بہت طویل ہو جاتی ہے۔

۳۔ مغربی پاکستان کے عربی مدارس

جیسا کہ ہم نے درج بالا سطور میں عرض کیا تھا، دارالعلوم سے فارغ التحصیل عالم نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنایا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ہر ممکنہ قدم اٹھائے گا۔ عموماً ان کی رائے بھی یہی تھی کہ اشاعت اس کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ جو حضرات دارالعلوم سے فیضیاب ہو کر نکلے انھوں نے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کئے۔ گوشوارہ نمبر ۳ اور ۴ میں مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تعداد کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اسی طرح گوشوارہ نمبر ۵ میں چند مشہور مدارس کے ۱۹۷۱ء کے کوائف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

درج بالا حقائق کے پیش نظر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہ دارالعلوم دیوبند نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ میں سب سے مضبوط بند کھڑا کیا۔ اور آج ہم ہندوستان و پاکستان میں مشرق نواز اور اسلام طراز طبقہ کا جو وجود پاتے ہیں، وہ اسی کی طفیل ہے، کہنے کو تو کم و بیش اسی قسم کے مقاصد لے کر مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسۃ الاسلام علیگڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی قائم ہوئے تھے۔ مگر ان میں سے ہر ایک حکومت برطانیہ اپنے مزاج کے مطابق پاتی گئی بہرحال ان کے فارغ التحصیل طلبا کا مقصد اول اپنے علم کے ذریعے حلب زر ہوا کرتا تھا، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبا میں سے الا ماشاء اللہ ایک نے بھی مسلمانوں کی فلاح کے لیے نمایاں کام سرانجام نہیں دیا، ممکن ہے، بعض حضرات قیام پاکستان کو اپنے ثبوت کے طور پر پیش کریں۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ اسلام کی آڑ لے کر سیاسی مفاد کا حصول ان کے پیش نظر رہا ہے۔ اسلام یا مسلمانوں کی خدمت کبھی کے ان کی نیت تھی اور اس کا ثبوت وہ حالات اور واقعات ہیں جن کا عملی مظاہرہ گزشتہ ۲۴ سال میں ہوا۔ کاش یہ افراد صحیح خطوط پر تربیت پائے ہوئے ہوتے کاش! ان کے دلوں میں خوف خدا، خدمت اسلام اور فلاح مسلمان کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا تاکہ پاکستان کی تقدیر اس سے مختلف ہوتی، جو آج نظر آ رہی ہے۔ اگر ان مدارس کے قیام کا مقصد بھی سرکاری ملازمتوں کے لیے کلرک افسر یا اسی قسم کی کوئی اور شخصیت پیدا کرنا تھا، تو میکالے کے قائم کردہ مدارس کیا بُرے تھے، اگر ان فارغ التحصیل طلبا کی دینی معلومات کا دائرہ بھی اسی قدر محدود اور تنگ رہنا تھا کہ یہ نہ کلمہ طیبہ جانتے ہوں، نہ نماز روزہ کے قیام کا التزام کر سکتے ہوں، تو ان میں دینیات (نظری) وغیرہ پڑھانے اور اس طرح ان کا اسلامی نام رکھنے کا جواز نکال لینے کی کیا ضرورت تھی۔

اندکے باتو بگفتم و بدل ترسیدم
کہ آزردہ خاطر نشوی ورنہ سخن بسیارست

والسلام خیر ختام
قسیمہ نیاز

پیرزادہ احمد حسن جامی ایم اے

از قلم مولانا محمد اسحاق خان کشمیری ، متعلم الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب راقم الحروف نے معقولات کی کتابیں حضرت علامہ کشمیری صاحب مدظلہ العالی سے پڑھنے کے لیے مدرسہ خیرالمدارس ملتان میں درجہ تکمیل میں داخلہ لیا، ۱۹۷۲ء کا یہ سال حضرت علامہ دامت برکاتہم سے استفادہ میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور علمی ذخیرۃ المدارس کا سہ روزہ سالانہ اجلاس مدرسہ کے گراؤنڈ میں ہو رہا تھا، آخری نشست تھی جو نسبتاً زیادہ اہتمام سے منعقد کی جاتی ہے، وسیع و عریض پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سٹیج پر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا نورانی چہرہ لاٹیں مار رہا تھا، شیخ التفسیر حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ جیسی شخصیات بھی سٹیج پر تشریف فرما تھیں۔ سکون و اطمینان اور نور و وقار کی ایک نورانی چادر ساری جلسہ گاہ پر تنی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور پاکستان کے ایک ممتاز و معروف خطیب جو اب تک بقید حیات ہیں، اپنے مخصوص و مؤثر انداز خطابت سے سامعین کو محظوظ فرما رہے تھے۔

ایک عجیب واقعہ

خطیب صاحب نے اپنے خطاب کے دوران ارشاد فرمایا کہ ۱۹۷۲ء میں ہمیں ایک گروپ کے طور پر چین کے مختلف علاقوں کے دورہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران ہم ایک دور دراز علاقے میں پہنچے، جہاں ہم نے معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی بڑی عمر کے شخص کے بارے میں پوچھا، تو بتایا گیا کہ یہاں قریب ہی ایک بڑی عمر کے شیخ موجود ہیں، ہم نے ایک شخص کو بھیجا کہ جا کر ان سے کہو کہ پاکستان سے آئے ہوئے چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، تو اُن بڑے میاں نے کہا کہ پاکستان کیا اور کہاں ہے، جب اس شخص نے واپس آکر بڑے میاں کا یہ جواب سُنایا تو انھوں نے اسے سمجھایا کہ ہندستان جو ایک بڑا ملک تھا، آج سے کوئی ۲۵ سال قبل (۱۹۴۷ء) میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک حصّے کو بھارت کہتے ہیں اور دوسرے کو پاکستان، جو دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، لیکن اس پر بھی بڑے میاں کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا اور اس شخص سے کہلوا بھیجا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ دیوبند کو جانتے ہو۔ اس شخص نے جب واپس آکر بڑے میاں کا یہ جواب ہمیں سُنایا تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ ایک شخص جو پاکستان جیسے عظیم ملک کو اس کے ۲۵ سال بعد بھی نہیں جانتا، حالانکہ اس کی تشہیر اور نشر و اشاعت کے بیسیوں ذرائع ہیں، وہ دیوبند کے ایک چھوٹے سے قصبے کو کیونکر جانتا ہے، خیر ہم نے استعجاب کے ان جذبات کے ساتھ اس شخص سے کہا

کہاں ہم دیوبند کو جانتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ مبارز خیالات کے دوران ہم نے اُن سے پوچھا کہ میاں آپ جو پاکستان جیسے بڑے ملک کو نہیں جانتے۔ دیوبند کو کیونکر جانتے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ میں نے ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھا ہے۔ سبحان اللہ آپ اندازہ فرمائیے، سلسلۂ ہائے ہمالیہ کے اُس پار رہنے والے اس گوشہ نشین اور دُنیا سے بے خبر انسان کو دیوبند کے قصبے کا پتہ کیونکر چلا اور وہ کس طرح اپنی علمی پیاس بجھانے وہاں پہنچ گیا۔

ایک اور واقعہ

آج سے کوئی تین چار سال قبل راقم الحروف مظفرآباد (آزاد کشمیر کے دارالحکومت) کی سیکرٹریٹ کی مسجد میں نماز فجر کے بعد قرآن پاک کا درس دے رہا تھا، سامنے ایک سادہ قسم کے پہاڑی دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے جن کی عمر تو کافی تھی، لیکن پہاڑی آب و ہوا کے سبب ان کی صحت بہت اچھی تھی، دوران کلام ایک علمی بات پر وہ بڑے میاں بولے جس سے ان کے ٹھوس علمی ذوق و ادراک کا پتہ چلا، گھنٹہ سوا گھنٹہ کے اس درس سے فراغت کے بعد دُوسرے ملنے والے دوست احباب کے جھرمٹ میں وہ بزرگ بھی ملنے بیٹھ گئے۔ تعارف کے لیے عرض کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مظفرآباد کے دُور دراز پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ۸۰ سال سے متجاوز عمر ہے اور ۱۳۴۴ھ یعنی اس وقت سے ٹھیک ۵۰ سال قبل خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف پڑھا ہے۔ ویسے بھی الحمدللہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان بڑی تعداد میں آزاد کشمیر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف خدمات میں مصروف و منہمک ہیں۔

ایک اور واقعہ

خود راقم الحروف ایک مرتبہ مظفرآباد جانے کے لیے راولپنڈی سے ایک بس میں سوار ہوا، تورش کی وجہ سے درمیان میں کھڑا ہیٹ دیکھنے لگا کہ اتنے میں بس کی پچھلی سیٹوں سے ایک ادھیڑ عمر کے معزز بزرگ نے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا علیک سلیک کے بعد جانبین کا تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ صاحب دیوبند ہی کے فیض یافتہ ایک بزرگ ہیں جو ایک محکمہ میں اعلیٰ درجہ کے ملازم ہیں۔ مجھ کو انہوں نے ایسے انداز میں بلایا، جیسے پرانے واقف کار اور جانکار ہوں تو اس پر راقم نے تعجب آمیز لہجے میں ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے مجھے کس طرح پہچان کر بلایا تو جواباً فرمایا: بس آپ کو دیکھ کر دیوبند کی خوشبو محسوس ہوئی تو بلالیا۔ پھر انہوں نے دیوبند کے بارے میں کافی کچھ سنایا، اپنے گھر واقع مری میں مجھے دعوت دی اور حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب سے متعلق اپنا ایک منظوم کلام بھی اپنی عمدہ و دیدہ زیب تحریر میں مجھے عنایت فرمایا، پھر ایک عرصے تک ہماری باہمی خط و کتابت بھی رہی لیکن حوادث زمانہ نے زیادہ عرصہ تک اسے جاری نہ رہنے دیا، یہاں تک کہ وہ سروس کی جکڑ بندیوں میں خدا جانے کہاں گئے اور ہم آب و دانہ کے ہیر پھیر سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ؎

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

آزاد کشمیر میں دیوبند کی نورانی شعاعیں

دیوبند کے آفتاب عالمتاب نے جہاں ایک دُنیا کو منور کیا اور ہمارے پاکستان کو بھی نور نور کیا، وہاں اس نے کشمیر کے بلند و بالا برف پوش پہاڑوں حسین مرغزاروں اور دل رُبا لالہ زاروں کو بھی محروم نہیں کیا، وہاں تعلیم القرآن کے بیسیوں مدارس چپے چپے پر فرزندانِ دارالعلوم نے قائم فرما کر نونہالانِ ملک و ملت کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام و انتظام فرمایا، اور سب سے بڑا دینی مدرسہ "دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری پونچھ آزاد کشمیر" جیسا ایک مرکزی علمی و دینی ادارہ دارالعلوم دیوبند ہی کے تعلیم یافتہ حضرت مولانا محمد یوسف خان صاحب دامت برکاتہم نے قائم فرمایا اور جو ان ہی کی نگرانی میں جہالت کی تاریکیوں کے خلاف جہاد مسلسل

میں معروف ہے اور اس کے بزرگ صفت جوان ہمت مدیر و مہتمم دین و علم دین کی خدمت کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی میدانوں میں بھی خدمت خلق کے لیے رواں دواں ہیں، جس پر وہاں کے عوام نے قدر شناسی کے طور پر انھیں اسمبلی کا ممبر منتخب کرکے نئی آرزوؤں و تمناؤں کے ساتھ آگے بھیجا ہے۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں علم و عمل کی یہ سوزش و تمازت دیوبند ہی کے وجود با جود کی ضیا پاشیوں کا نتیجہ ہے، خاص کر دیوبند کے ایک عظیم و بے مثیل چشم و چراغ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی رحمہ اللہ کی تربیت و صحبت کیمیا اثر کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ اس طرح دیوبند کے منبع فیض کی ضیا پاشیاں وہاں رنگ لا رہی ہیں۔

دیوبند کے اثرات حجاز مقدس میں

دارالعلوم دیوبند کی اس ہمہ گیر فیض رسانی کے اثرات منبع و مرکز اسلام (حجاز مقدس) میں بھی اپنی گرمی دکھاتے رہے ہے۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ ترک وطن کر کے حجاز مقدس تشریف لائے اور یہاں بیت الحرام کے جوار رحمت میں رہ کر اطراف و اکناف عالم میں فیض رسانی شروع کی، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو ہندوستان کے ہی ایک عظیم فرزند حضرت مولانا رحمت اللہ رح کے ایمانی جذبے اور نورانی سعی کا ثمرہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے اپنا مسکن و مرکز بنایا اور حضرت بانی مدرسہ رحمہ اللہ کی رحلت کے بعد اس کی سرپرستی بھی فرمانے لگے اور حضرت کی سکونت کا کمرہ ابنائے و شیوخ دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک مقدس و متبرک مقام کے طور پر اب تک محل استفادہ ہے اور مدرسہ صولتیہ جو بانیان دیوبند ہی کے ایک قافلہ سالار (حضرت مولانا رحمت اللہ) کی مقدس یادگار ہے، جو انھوں نے ہندوستان میں پادری فنڈر جیسے دندناتے عیسائیوں کو شکست فاش اور وہیں نکالا دینے کے بعد یہاں آکر ۱۲۹۰ھ میں قائم فرمایا تھا مستقل ایک تاریخ رکھتا ہے جس پر الگ اور مستقل مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے، بہرکیف اس طرح علماء دیوبند (کثر اللہ سوادہم) کی یہاں حاضری اور دنیا میں دیوبند کے تعارف کی طرح پڑ گئی۔

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا درس مسجد نبویؐ میں

یہاں تک کہ مادر علمی دیوبند کے ایک مایہ ناز فرزند جانشین شیخ الہند حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان سے یہاں تشریف لاکر مسجد نبویؐ میں قرآن و حدیث کا درس دینا شروع کیا، حدیث پڑھانے اور قال اللہ و قال رسول اللہ کہنے کی سعادت تو الحمد للہ آج بھی بہت سے خوش نصیب بزرگان دین کو ملتی ہے، لیکن " قال صاحب ہذا الروضۃ " کہہ کر اور در رسولؐ پر بیٹھ کر حدیث رسولؐ پڑھانے کا جو شرف و اعزاز حضرت مدنیؒ کو حاصل ہوا، وہ کبھی کسی ہی کو نصیب ہو سکتا ہے، زہے نصیب۔ اٹھارہ سال تک مسجد نبویؐ میں روضۂ رسولؐ کے سامنے حضرت مدنیؒ نے علوم قرآن و حدیث کی تدریس فرمائی اور اس دوران برصغیر ہند و پاک کے علاوہ افغانستان، ترکی، سمرقند تاشقند، بخارا، جاوا، سماٹرا، ہند چینی اور حبشہ سے عرب ممالک کے طلبہ نے حضرت سے استفادہ کیا اور دیوبند کا فیض ان تک پہنچا، اور حضرت رحمہ اللہ کے مستفیدین و متوسلین اور دیوبند کے بالواسطہ فیض یافتگان اب تک موجود ہیں۔

مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ

اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے حقیقی بھائی حضرت مولانا محمود احمد المدنی رحمہ اللہ نے مسجد نبویؐ کے بالکل جوار میں ایک باضابطہ دینی درسگاہ "مدرسۃ العلوم الشرعیہ" کے نام سے قائم کی، جو آج سے ٹھیک ۵۵ سال قبل ۱۳۴۰ھ میں قائم کی گئی تھی۔ اور حرم شریف کے باب الملک کے بالکل جوار میں اب تک موجود و فیض رساں ہے، اس کے بانی دیوبند ہی کے ایک تربیت یافتہ و متخرج متبحر عالم تھے، اس مدرسہ سے اب تک سینکڑوں علماء نے اکتساب علم و فضل کی سعادت حاصل کی، جن میں سے بعض سعودیہ میں اور بعض دوسرے

ممالک میں مصروفِ خدمت ہیں اور اس کا وسیع کتب خانہ جو عظیم و ضخیم امہاتِ
کتب پر مشتمل ہے، آج تک علمی استفادہ کے لیے موجود ہے اور بقیۃ السلف
شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا سہارنپوری دامت برکاتہم مقیم مدینہ منورہ اسی
مدرسہ مظاہر علوم میں اقامت پذیر ہیں اور مشرق و مغرب کے عوام و خواص کیلئے
مرجع بنے ہوئے ہیں سب کی علمی پیاس بجھاتے اور روحانی و باطنی تربیت
فرماتے ہیں، اللہ ان کا سایہ سلامت رکھے۔

ایک عام نظر

غرضیکہ بر عظیم ایشیا کی اس عظیم بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی نوعیت کی
واحد و بے مثال یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کا فیض ایشیا کے علاوہ،
یورپ، افریقہ وغیرہ پوری ربع مسکون پر پھیلا، پہلے بھی یہ سُنتے سناتے آتے
تھے، لیکن مرکزِ اسلام حرمین شریفین، راقم کے دو تین سالہ قیام کے دوران دُنیا
کے جو حالات سُننے دیکھنے کا اتفاق زیادہ وسیع پیمانے پر ہوا۔ اس سے راقم
نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رُوئے زمین پر انسانی آبادی کا شاید ہی کوئی ایسا حصّہ خطّہ
ہو، جہاں بالواسطہ یا بلاواسطہ دیوبند کا فیض نہ پہنچا ہو۔ اور ہندوستان میں
جہالت کی دبیز تاریکیوں، شرک و بدعت کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں اور غیر ملکی سامراج
کیخلاف جہاد میں علمی و عملی میدان میں جو قربانیاں دیوبند نے پیش کیں، اس کا تو
ایک زمانہ شاہد ہے۔ اور اس کا انکار یا اس میں انگشت نمائی تو سورج پر تھوکنے
کے مترادف ہوگی، جس کا ارتکاب شاید کوئی احمق سے احمق اور انتہائی متعصب
اور سرپھرا ہی کر سکے گا۔

دیوبند کا علمی فیض عربی زبان میں

یوں تو دیوبند نے عربی زبان و بیان کی بھی جو ٹھوس اور وقیع خدمت
کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، کتنے خطباء، فصحاء اور شعراء دیوبند نے پیدا کیے
اس سب کی تفصیل کے لیے تو ایک مستقل دفتر چاہیئے، راقم صرف چند نمونے ان
کے پیش کرنا چاہتا ہے کہ دیوبند کے علم حدیث خصوصاً خدمتِ حدیث سے عرب
کس قدر مستفید ہو رہے ہیں، اس سلسلے میں صرف چند ہی علمی کتابوں کے نام پیش
کرتا ہوں۔ (۱) بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد جو حضرت العلامہ خلیل احمد سہارنپوری
کی دس سالہ محنت و عرق ریزی کا نتیجہ ہے، سنن ابی داؤد کی یہ عظیم و بے مثال شرح
جو حال ہی میں قاہرہ مصر میں بیس بیس جلدوں میں ٹائپ پر چھپی ہے، خود عربوں کے
لیے باعثِ حیرت و استعجاب ہے (۲) اوجز المسالک الیٰ مؤطا امام مالکؒ کی یہ
انتہائی ضخیم اور وقیع شرح جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی تالیف
ہے، سولہ جلدوں میں بیروت میں چھپ رہی ہے۔ (۳) لامع الدراری علیٰ
جامع البخاری جو شیخ الحدیث مدظلہٗ کی تعلیقات کے ساتھ دس جلدوں میں
قاہرہ میں چھپ رہی ہے (۴) معارف السنن فی شرح سنن الترمذی جو شیخ الحدیث
حضرت مولانا محمد یوسف البنوری دامت برکاتہم کے علمی جواہر پاروں کا مجموعہ ہے
دس ضخیم جلدوں میں مکمل ہو رہی ہے، جن میں سے چھ چھپ کر اور شائع ہو کر شرح
حدیث کے علاوہ عربیت کے بھی ایک شاہکار کے طور پر قبول عام حاصل کر چکی ہیں
یہ تو بطور نمونہ ان چند عظیم کتابوں کا ذکر ہے، جن سے عرب دُنیا بھی دیوبند
کی خدمتِ حدیث و فیض رسانی سے مستفید ہو رہی ہے، ورنہ اس سلسلے کا
احصار تو بڑے طویل بیان اور وسیع فرصت کا متقاضی ہے۔

بے مثال جامعیت

غرضیکہ دارالعلوم دیوبند کو جو جامعیت نصیب ہوئی، اس کی مثال تاریخ
کے صفحات میں بھی شاید ہی کہیں مل سکے، اگر آپ دیوبند کی خدمت تفسیر سے
مستفید ہونا چاہیں، تو بیان القرآن للشیخ التھانویؒ فوائد عثمانیہ للشیخ العثمانیؒ
اور معارف القرآن للشیخ الدیوبندی مدظلہٗ وغیرہ وغیرہ ابنائے دیوبند کے علمی شہکاروں
سے اپنی پیاس بجھایئے، اگر آپ حدیث رسولؐ کو سمجھنا چاہتے ہیں، تو بذل المجہود
(کی ۲۰ جلدیں) اوجز المسالک کی (۱۶ جلدیں) معارف السنن (کی دس جلدیں)
لامع الدراری علیٰ جامع البخاری کی (دس جلدیں)، فیض الباری فی شرح البخاری (کی

چار جلدوں) فضل الباری فی حل البخاری (کی دو جلدوں) اور انوار الباری فی شرح صحیح البخاری وغیرہ وغیرہ دیوبند کے نادرۂ روزگار علمی جواہر پاروں سے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کریں، علیٰ ہٰذا القیاس فقہ، ادب، معانی، بیان وغیرہ جس فن اور جس علم کو دیکھیں گے، وہاں آپ کو دیوبند کی خدمات چمکتی نظر آئیں گی۔ اگر علمائے ربانیین کے تذکرے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہوں، تو شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ خاتم المحدثین علامہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، ابوحنیفۂ وقت علامہ مفتی کفایت اللہؒ، شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتا تھا اور اِنَّ ابراہیم کان اُمّۃً کا مصداق تھا اور ان سب کے شیخ و مربی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ کی کردار ساز زندگی سے اپنے لیے علم و عمل کی راہیں استوار کریں، اگر آپ زہد و تصوف اور تقویٰ و طہارت کے معیار پر پرکھنا چاہیں تو آپ کو تربیت گاہ دیوبند میں ایسے نجوم نظر آئیں گے، جو اپنے اپنے دور کے شبلی و بغدادی تھے، اگر عربی اُردو اور فارسی زبانوں کی ادبی خدمات کے بارے میں جاننا چاہیں گے، تو اس میں بھی یہی اساطین امت پیش پیش نظر آئیں گے۔ اگر آپ انگریزی سامراج اور غیر ملکی استعمار کے خلاف جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں گے، تو اس میں دیوبند کے پروردہ سربکف اور کفن بدوش مجاہدوں کی داستانیں ایک ایک ورق پر موتیوں کی طرح بکھری نظر آئیں گی، اگر آپ عیسائیت، قادیانیت پرویزیت، رافضیت اور الحاد و دہریت جیسے اندرونی و بیرونی فتنوں اور سازشوں کی سرکوبی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں گے، تو اس میں علمی، قلمی اور عملی ہر میدان میں دیوبند کے مایۂ ناز سپوت ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آئیں گے خطباء و ادباء کے اوصاف و کمالات جاننے کا شوق رکھتے ہوں تو سلسلۂ دیوبند کے ایسے اساطین نظر آئیں گے، جن کے زبان و بیان کے سحر کے سامنے پہاڑ بھی وجد میں آجائیں، سمندروں کی لہروں میں جزر و مد آجائے اور ہواؤں کے رُخ مڑ جائیں، غرضیکہ کوئی گوشہ و زاویہ اور کوئی کنارہ و پہلو ایسا نہ پا سکیں گے، جہاں فیض دیوبند کی کرشمہ سازیاں جھلمل جھلمل کرتی نہ نظر آتی ہوں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیوبند کے اس ادارے کو یہ ہمہ گیر درس اور دیرپا اثر و نفوذ اور مقام و مرتبہ کس طرح حاصل ہو گیا۔ ایک ایسا ادارہ جو عام دُنیاوی اداروں کی ٹھاٹھ باٹھ اور آن بان و نمود و نمائش کے برعکس انار کے ایک درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد کے مٹی پر بیٹھ کر درس و تدریس کے آغاز سے اپنا سفر شروع کرتا ہے، جو وقت کی جابر و قاہر حکومت سے معاونت و مساعدت کی بجائے اس کی مخالفت اور اس کو دیس نکالا دینے کو اپنا نصب العین و مقصد قرار دیتا ہو، جو حکومت سے امداد کی درخواست کرنے کی بجائے اس کی از خود ملنے والی کسی امداد کو لینا بھی اپنے لیے روا نہ رکھتا ہو اور بطور خاص یہ اصول بنا رکھا ہو کہ "حکومت کی کسی بھی قسم کی کوئی امداد قبول نہیں کرنی" جو نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے معروف ذرائع کو نہ صرف یہ کہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ نمود و نمائش کے اس کاروبار کو جائز ہی نہیں سمجھتا، وہ کس طرح ایک صدی سے زیادہ عرصے تک نہ صرف یہ کہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، بلکہ ہمیشہ رُو بہ ترقی رہا، شرق و غرب کی دنیا کو علم کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔ ہر میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا، ہر جابر و طاغوتی طاقت سے ٹکرایا، ہر ظالم حکومت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی شرق و مغرب میں اس کا آوازہ بلند ہوا، اطراف و اکناف عالم سے تشنگانِ علم و حکمت اپنی اپنی پیاس بجھانے کے لیے کھنچے کھنچے وہاں پہنچے۔ ایک استاذ و ایک شاگرد کے مختصر ترین قافلے سے شروع ہونے والے اس گروہ --- میں ہزارہا علماء، صلحاء کی جماعت کیونکر جمع ہو گئی۔ چند روپوں کی معمولی پونجی سے اپنے سفر کا آغاز کرنے والے یہ گہوارۂ دانش و بینش لاکھوں کے مصارف کہاں سے اور کیسے برداشت کرتا چلا گیا وغیرہ وغیرہ اس انتہائی سنجیدہ اور معقول سوال کا جواب بھی نہایت واضح اور انتہائی آسان ہے کہ یہ اس قادر مطلق کی بے پایاں قدرت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے، جو کن فیکون کا مالک ہے اور یہ اسلیے

کہ اس کے بانیوں کے بے انتہا اخلاص و للّٰہیت کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔

ایک مقدس مشابہت

ایک روز راقم الحروف بیت اللہ کے سامنے حجر اسود و استلام کرنے کے عین مقابل بکریہ و ازاں میزے کی جگہ کے نیچے بیٹھا، بیت اللہ الحرام کے حالے غلاف اور اس سے پھوٹنے والی نورانی شعاعوں کو دیکھ رہا تھا کہ بیت اللہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے، تو یکایک ہزاروں سال پہلے کے اس منظر و ماحول میں کھو گیا، جہاں جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بے آب وگیاہ ویرانے میں اپنے اہل خانہ کو تنہا چھوڑ کر واپس ہوتے وقت اپنے رب سے اس طرح مخاطب ہو رہے ہیں" اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب وگیاہ بستی میں تیرے مقدس گھر کے پاس عبادت کے لیے بسا دیا ہے، میرے رب! پس تو ان کی طرف لوگوں کے دل پھیر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عنایت فرما تاکہ تیرا شکریہ ادا کر سکیں"۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کو اس کے غایت اخلاص کے سبب اس قدر بے مثال قبولیت سے نوازا کہ ان ہزاروں سالوں میں کروڑہا لوگ جو مشرق و مغرب کے مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے، مختلف زبانیں اور معاشرے رکھنے والے مختلف رنگ و روپ اور مختلف قد و قامت رکھنے والے سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اس گھر کا طواف کر چکے ہیں، اور دن رات کا کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا، جب اس گھر کا طواف نہ ہو رہا ہو اور دنیا کا کوئی پھل ایسا نہیں جو ہر موسم میں یہاں نہ ملتا ہو۔ یہ قبولیت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غایت اخلاص کے سبب تھی۔ اگرچہ کسی اُمتی کی کسی نبی کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی، لیکن عرض صرف اس قدر کرنا ہے کہ دعائے ابراہیمی کی طرح بانیانِ دارالعلوم دیوبند کی مساعی جمیلہ کو بھی خصوصی عنایت و قبولیت سے جو ان کے بے مثال اخلاص کی وجہ سے قدرت نے نوازا، تو دیوبند کے اس ادارے نے امت مسلمہ کو اس قدر فیض پہنچایا...

...... خداوند قدوس محض اپنی عنایت سے اسے ہمیشہ قائم و دائم رکھے، آمین

ایک حقیقت اور خاتمہ کلام

یہ ایک حقیقت ہے کہ دارالعلوم کی خدمات کے بارے میں کچھ لکھنا کسی فرد کا کام نہیں بلکہ اس جامع المجددین کی رشد و ہدایت پر لکھنے کے لیے مستقل اکاڈمیاں درکار ہیں خدائے تعالیٰ کسی کو اس کی توفیق دے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

قندیلِ معلق

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ

متعلقہ

وصایا دارالعلوم دیوبند

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ اس کے لیے
کوئی سرمایہ، بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیلِ معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین
ایک اگر جائے گا، پیدا دوسرا ہو جائے گا

مدارس کے قیام کا مقصد

اپنے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ہندوستان میں عربی مدارس کے قیام کے پس منظر میں کیا جذبہ کارفرما تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے بعد دینی، مذہبی تعلیم کے لیے قوم کے سرمائے سے چلنے والا سب سے پہلا مدرسہ دارالعلوم تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا تھا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، گجرات لکھنؤ، خیرآباد، بنگال، مدراس اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امراء کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا تمام تر دار و مدار انہی جائدادوں پر تھا۔ ۱۸۳۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کے بقول، "مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۰۰ سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یکسر مٹ گئے" (ہمارے ہندوستانی مسلمان" اردو ترجمہ ص۲۰۲)

دوسری جگہ وہ صاف صاف لفظوں میں اوقاف کی تباہی کا اعتراف کرتا ہے "مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے اُن کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ؟ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لیے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی، ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے، تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار ادارے موجود ہوتے (حوالۂ سابق ص۲۰۷)

اُس زمانے کی تعلیمی حالت کا اندازہ مہاتما گاندھی کی اس تقریر سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو ۱۹۲۰ء میں انھوں نے بنارس میں کی تھی اور جس میں انھوں نے کہا تھا، "برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں ۴۰ ہزار مدرسے تھے، جن میں دو لاکھ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ آج حکومت دفتری بمشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے" (اخبار مسافر آگرہ ۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا، تو دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم کو رواج دیا گیا، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ تھی۔ سرکاری تعلیم گاہیں دراصل وہ کارخانے تھے، جہاں سے مسلمان بچے الحاد و لادینیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے۔

لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء/۱۸۳۰ء) کے عہدِ حکومت میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو شروع میں انگریزوں کا خیال یہ تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں ہونی چاہیئے، لیکن انگریز کے انتہا پسند طبقوں نے جن میں پادری بھی شامل تھے، اس کی مخالفت کی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا۔ ان کا یہ مطالبہ منظور کیا گیا اس کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو عیسائیت سے قریب تر ہونے لگے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے: "ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں:"

(ترجمہ خطبات گارساں دتاسی ص ۸۰۴)

اس صورتحال میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک اہم سوال آیا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا۔ جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدوجہد کی، جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کئے۔ لاتعداد دانش گاہیں دیں درسگاہیں دیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو جائے؟ اس سوال نے یہاں کے اہلِ فکر کو متاثر کیا، ۵۷ء کی شکست نے یہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا کہ ہم اپنی آزادی فنا کر چکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، جو ہماری سیاست ہی پر اثر انداز نہیں ہوگی، بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی اسی طرز کے مطابق تبدیلی ناگزیر ہے، ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں، مفتوح کی حیثیت سے ہمیں زندہ رہنا ہے، فاتح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا سب سے اہم مسئلہ پیدا کیا کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے زیر اثر رہنے دیں، اپنی تہذیب، ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کر دیں۔ اس سوال کے دو جواب اور مسئلے کے دو حل سوچے گئے۔ ایک علیگڑھ میں اور دوسرا دیوبند میں۔ علیگڑھ حل کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم پر ایک قوم تسلط حاصل کر چکی ہے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تاکہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے۔ اسی طرزِ فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی جسے آج مسلم یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء کے سالانہ اجلاس علیگڑھ میں فرمایا تھا:

"اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہو سکے
ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں، جو
ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں
سر آوردہ ہوں (روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء علیگڑھ)

دیوبند میں جو حل تجویز ہوا، اس کا حاصل یہ تھا کہ ہمیں حاکم وقت کی زبان اور اس کے علوم کے بجائے اپنے مذہب اور اپنی زبان و علوم کی بقا و تحفظ کے لیے کوشش کرنی چاہیئے، یہی فکر دارالعلوم کی بنیاد کا سبب بنا۔ دارالعلوم کے بانیوں کا مقصد اسلام کی حفاظت کے لیے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی تعمیر کرنا تھا تاکہ اسلام کو ہر خطرے سے بچایا جا سکے۔ اور جو چراغ ہزار برس تک ہندوستان میں جلتا رہا وہ لادینیت کی تیز ہواؤں سے گل نہ ہونے پائے، قوم کے نونہال الحاد و تشکیک کے کارخانوں میں جانے کے بجائے ان اداروں میں پلیں، بڑھیں اور پروان چڑھیں، جہاں ان کے مذہب کے بارے میں بتلایا جا سکے۔ ان کا ذہن، ان کا دماغ ان کا کردار، سب کچھ اسلام کے مطابق بنایا جا سکے، حجاز میں دارالعلوم کے قیام کی اطلاع جب مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کو دی گئی تو ان کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا کہ۔

"اے اللہ! اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی
حفاظت کا ذریعہ بنا۔" (سوانح قاسمی ص ۲۲۳ ج ۲)

یہ کہنا کہ دارالعلوم صرف نصابی کتابوں کو پڑھنے پڑھانے کا ادارہ تھا، میرے خیال میں اس سے بڑھ کر دارالعلوم کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوسکتی.... دارالعلوم تو ایک ایسا کارخانہ تھا جہاں اسلام کے مجاہد اور جاں نثار ڈھلا کرتے تھے۔

مجموعی طور سے دیوبند تحریک نے اس وقت مایوس کُن حالات میں امید کے چراغ جلائے اور اس خوفناک ماحول میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جس نے مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دی تھی اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت پر زور دینے لگے تھے۔ دیوبند نے ان حالات کا رُخ موڑا، ہندوستان کے مایوس و مجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، نئے عزائم کی رُوح پھونکی اور اس طرح اسلام کے خلاف سازشوں پر سخت پہرے بٹھادیئے۔

دارالعلوم کا قیام

اس الہامی تحریک کی ابتداء ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ہوئی، یہ تحریک اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بالکل مختلف تھی ہندوستان میں عربی مدارس اور دینی درسگاہوں کی کبھی کمی نہیں رہی، لیکن یہ مدرسہ عربی علوم و فنون کی تعلیم سے زیادہ اسلام کی اشاعت اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے جدوجہد کا عظیم مرکز بن رہا تھا، ابتداء میں اس کی نہ کوئی مستقل عمارت تھی اور نہ ایسی کوئی باقاعدہ جگہ جہاں اس کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوسکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی قدیم مسجد تھی جو یہاں مسجد چھتہ کے نام سے مشہور رہی ہے۔ یہی مسجد اس مدرسے کی سب سے پہلی عمارت تھی درسگاہ کے نام پر ایک درخت انار کا موجود تھا، جو آج بھی موجود ہے۔ یہیں سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک شاگرد اور ایک استاذ، قصبے کے ملا جی محمد محمود نے سب سے پہلا سبق پڑھایا۔ اور دیوبند ہی کے ایک طالب علم محمود حسن نے سب سے پہلا حرف پڑھا بعد میں یہی طالب علم شیخ الحدیث اور صدر مدرس بنا اور شیخ الہند کہلایا۔ ہندوستان کی، دینی، ملی، سیاسی تاریخ آج بھی اس کی عظمت کے احترام میں سرنگوں ہے، جن لوگوں نے اس عظیم جدوجہد کا آغاز کیا، اور جن مبارک ہاتھوں سے اس عظیم ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی، ان میں حاجی سید عابد حسینؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ جیسی ہستیاں شخصیتیں تھیں۔

ابتداء میں یہ ایک معمولی ادارہ تھا، مگر قیام کے پہلے روز ہی سے اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، قرب و جوار کے بہت سے طلباء اس مدرسے میں تعلیم کی غرض سے جمع ہوگئے، پہلے تعلیمی سال کے اختتام کے موقع پر جو رپورٹ مدرسہ عربی دیوبند کی طرف سے جاری کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا:

> "ابتدائے محرم ۱۲۸۳ھ میں تعداد طلبہ ۲۱ تھی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ میں ۷۸ ہوگئے، منجملہ ان کے ۵۸ طلبا بیرونجات کے ہیں جن میں سے ۵۲ طلبہ کو اہل دیوبند کی طرف سے کھانا ملتا ہے اور ۶ طلبا اپنے پاس سے کھاتے ہیں۔"
>
> روداد ۱۲۸۳ھ ص۱/۲ بحوالہ تاریخ دیوبند مصنفہ سید محبوب رضوی ص۳۲۴/۳۲۵

مدرسہ عربی سے دارالعلوم تک

دارالعلوم قائم ہوا تو اس کا نام بزرگوں نے مدرسہ عربی، فارسی اور ریاضی رکھا، مگر اس نے مختصر سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی اور تیرہ برس ابھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ ذمہ داران مدرسہ کے ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہوگیا کہ اب یہ مدرسہ صرف عربی فارسی اور ریاضی کا مدرسہ نہیں ہے، بلکہ تمام علوم و فنون کا مرکز ہے اور ایسے مدرسے کیلئے مدرسے کی تعمیر

سے بہتر دارالعلوم کی تعبیر ہے۔

دارالعلوم نے بہت کم وقت میں ہندوستانی مسلمانوں کے مرکزی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی، سینکڑوں کی تعداد میں ایسے علما تیار کیے جنھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں بیرونِ ہند میں بھی دینی جدوجہد میں قائدانہ حیثیت سے شرکت کی اور جگہ جگہ مستحکم دینی قلعوں کی تعمیری مہم شروع کر دی، یہ ایک زبردست امتیاز تھا اور غیر معمولی ترقی تھی، جو دارالعلوم کو حاصل ہوئی، سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ مدرسہ صرف ان چندوں پر چل رہا تھا جو لوگ وقتاً فوقتاً دیا کرتے تھے، اتنے کم پیسوں پر اتنا زبردست کام ایک اعجاز ہی کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے پہلے اس طرح کی نظیریں موجود نہیں ہیں سلطنتوں اور امرا و حکام کی نگرانی میں مدارس اور درسگاہیں ہوتیں، تمام مصارف اور اخراجات برداشت کیے جاتے، لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا معمولی چندوں پر گزر بسر تھی اور تعلیمی سے لے کر انتظامی امور تک کے لیے اخراجات کا انتظام ان ہی چندوں سے ہوتا تھا، تعلیم مفت کھانا مفت، رہائش مفت، کتابیں مفت، سب کچھ مفت تھا اور کسی کو وظائف بھی دیتے جاتے تھے۔ آج بھی دارالعلوم ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔ اب بھی یہاں طالب علم ہر فکر سے آزاد اور ہر پریشانی سے یکسو ہو کر تعلیم حاصل کرسکتا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اساسی اصول ہشتگانہ میں اس پر زور دیا ہے کہ اخراجات کا یہی نہج باقی رہے، چندوں کی تکثیر پر نظر رہے، خود بھی کوشش کریں اور دوسروں سے بھی اس کی کوشش کرائیں طلبا کے کھانے کو نہ صرف باقی رکھا جائے، بلکہ ہمیشہ اسے بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے، حکومت وقت اور امرا کی شرکت بہت زیادہ مضر ہے، چندوں پر اکتفا کیا جائے، اس لیے کہ ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندوں سے ناموری مقصود نہ ہو، جب تک اس مدرسے کی کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے، اس وقت تک یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر ایسی سبیل نکل آئی تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ آمدن اور تعمیر میں ایک نوع کی بے سروسامانی ضروری ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے، "دارالعلوم کی صد سالہ زندگی" ص۱۸-۱۹ مصنفہ مولانا محمد طیب صاحب)

بحمد اللہ آج بھی دارالعلوم ان ہی اساسی اصولوں کی رہنمائی میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے، ابھی حکومت یوپی (ہند) نے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ دارالعلوم کو دینا چاہی تھی، مگر دارالعلوم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اسی توکل اور اعتماد علی اللہ کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کا بجٹ برابر بڑھ رہا ہے اور کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔

دارالعلوم کی جدوجہد

دارالعلوم نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں ان بلند تر مقاصد کو پیش نظر رکھا جن کے لیے وہ قائم کیا گیا تھا، اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس ادارے سے ایسی نسل تیار کی جائے جو ہر اعتبار سے مکمل ہو، ہر پہلو سے مسلمانوں کی قیادت کا نازک فریضہ انجام دے سکتی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ دارالعلوم اپنے اس بلند تر مقصد میں کامیاب رہا۔ تو ایسی بات ہوگی، جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں دارالعلوم کے متعلق ایک انگریز مفکر نے یہ رائے دی تھی:

"دیوبند اسلام کی حدود کی نگہداشت میں بہت سخت ہے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، وہ عقلیت پسند بھی ہے، وہ گمراہی، نفاق اور ذہنی کاہلی کو شکست دینے کے لیے برابر کوشاں ہے اس کا دینی اصول مکمل طور پر کلاسیکی ہے، عملی میدان میں دیوبندی علماء عزم راسخ کے ساتھ، اس غلط کاری، اوہام پرستی اور لوازم جہالت کے خلاف کمربستہ ہیں جو پسماندہ دیہاتی

سوسائٹی کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے ان کا نقطۂ نظر روایتی اسلام ہے، جو اپنی خالص ترین شکل میں ہو وہ سختی کے ساتھ شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں، اسلامی تاریخ کے بارے میں ان کا تخیل محققانہ ہے، بخیال آزاد خیال طبقے کے، جو اگرچہ زمانۂ ماضی میں ایک مثالی دور کا بہت خوشنما اور رنگین نقشہ پیش کرتا ہے، مگر اس نقشے میں تعلیماتِ اسلامی کی مہذب معلومات کا رنگ بھرنے کے بجائے وہ موجودہ زمانے کے آزادانہ خیالات و نظریات کا رنگ بھر دیتا ہے۔

معاشرتی اعتبار سے دیوبند اس حد تک ترقی پسند ہے کہ وہ توہمانہ خیالات کے امتزاج کو ختم کرنے کی کوشش میں بہت شدت سے مصروف ہے (ماڈرن اسلام ان انڈیا مصنفہ ڈاکٹر کانٹویل اسمتھ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز میک گل یونیورسٹی کناڈا۔ صفحہ ۳۲۲ و ۳۲۱ بحوالہ تاریخ دیوبند (ص ۳۶۰)

یہاں سے جو نسل تیار ہوئی، اُس نے عام مسلمانوں کے دلوں میں اپنا اعتبار قائم کیا ہے، ہندوستان کے اسلامی معاشرے نے اس صحیح الفکر گروہ کی رہنمائی قبول کی، اس گروہ میں بڑے بڑے علماء مشائخ، فقیہ، مدرسین، مبلغین، مناظرین، اہلِ قلم اور اربابِ تصانیف نظر آتے ہیں، ان لوگوں نے جو دینی خدمت انجام دی ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے، مختصر لفظوں میں اس کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

دارالعلوم نے اس وقت دین کی حفاظت کی، جب کہ اس کا چراغ گل ہو رہا تھا، بے دین آذر الحاد کے بُت تراش رہے تھے، ایسے جانگسل دور میں دارالعلوم نے اسلام کی حفاظت کی اُس کا دفاع کیا، ہر داخلی اور خارجی فتنے سے نمٹنے کی کوشش کی اس وقت کی دو مشہور تحریکوں، عیسائیت اور آریہ سماج سے برسوں تک کشتی رہی، مناظرے ہوئے اور جیت ہمیشہ دیوبند کی ہوئی۔ یہ دونوں تحریکیں مسلمانوں کا تشخص مجروح کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ اس مقصد کیلئے بڑے پیمانے پر جد وجہد جاری تھی، جگہ جگہ عیسائی مشن اور آریہ سماجی سنجائیں قائم کی جا رہی تھیں وہ انتہائی سخت اور صبر آزما دور تھا، مسلمانوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا سید ین کی تحریک کی ناکامی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ مسلمان اعتقادی طور پر بڑے مضمحل اور کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے، صحیح فکر ختم ہو رہا تھا، غلط خیالات جڑ پکڑ رہے تھے۔

اگر دارالعلوم نے ایسے موقع پر ہمت نہ کی ہوتی، تو یہاں کا سیاسی اور مذہبی نقشہ بڑی حد تک مختلف ہوتا، دیوبند کی جد وجہد نے ان تحریکوں کا اثر و رسوخ ختم کیا، ان کے غلط معتقدات کے پردے چاک کئے اور ان سازشوں کے چہرے سے نقاب اُٹھا جو اسلام کے خلاف کی جا رہی تھیں، یہ انگریزوں کی زبردست شکست تھی۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے مسلمانوں میں نئے فتنوں کا بیج بویا، قادیان سے مرزا غلام احمد قادیانی اور ملک کے مختلف حصوں سے مختلف علماء سو کو کھڑا کیا گیا۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کمزور کریں۔ ان کے خیالات تبدیل کر دیں اور اسلام کے بنیادی عقیدوں پر پتھر برسائیں، اس موقع پر بھی علماء دیوبند میدان میں آئے۔ انھوں نے اپنی تحریری اور تقریری کوششوں سے ان دونوں تحریکوں کا زور ختم کیا، ہزاروں گمراہوں کو صحیح راستہ دکھایا۔ اور لاکھوں کروڑوں کو حق کے راستے پر نہایت، استقلال اور عزیمت کے ساتھ ڈٹے رہنے کا طریقہ سکھلایا۔

دارالعلوم نے اپنی سو سال سے زیادہ پرانی تاریخ میں لاکھوں کتابوں پر مشتمل لٹریچر مسلمانوں کو دیا ہے۔ یہ لٹریچر ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، علمی موضوعات

پر ان گنت کتابیں یہاں سے نکلیں حدیث، تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم و فنون پر اُردو، عربی اور فارسی وغیرہ میں زبردست ذخیرہ فراہم کیا گیا۔ درسِ نظامیہ کی شرحات اور حواشی و تراجم تیار کیے گئے، مناظرانہ لٹریچر مرتب کیا گیا۔ دارالعلوم کی تحریری خدمت کے لیے صرف حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا اسمِ گرامی کافی ہے، جنھوں نے ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھ کر وسعتِ مطالعہ اور قوتِ تحریر کی ناقابلِ فراموش نظیر پیش کی ہے، اور اس زبردست خدمت پر اخلاص و ایثار کا یہ عالم کہ کسی بھی کتاب کی رائلٹی اپنے نام، اپنے وارثوں کے نام محفوظ نہیں کی اور نہ کسی ورق پر کوئی معاوضہ قبول کیا۔ دارالعلوم کا لٹریچر ایک مستند حیثیت رکھتا ہے اور اعتبار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

دارالعلوم نے علمی اور تدریسی میدانوں میں بھی زبردست ترقی کی ہے علمی دُنیا کو تدریس کا وُہ رنگ بخشا ہے، جو عقل، نقل اور وجدان، تینوں پہ صحیح اُترتا ہے تعلیم کو تربیت کے ساتھ وابستہ رکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تبلیغ و دعوت کا کام بھی برابر جاری رہا ہے، سیاسی جدوجہد میں بھی دارالعلوم کی شرکت رہی ہے۔ اگرچہ من حیث الجماعت دارالعلوم کا نہ پہلے کوئی سیاسی نقطۂ نظر تھا اور نہ آج ہے، مگر دارالعلوم کے تمام اہم افراد کار کسی نہ کسی صورت سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔

دارالعلوم کا حال

یہ تو ماضی کی ایک مختصر سی جھلک تھی۔ اس عظیم ادارے پر ایک سو تیرہ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، مگر یہ آج بھی عالمِ اسلام کے دلوں کی دھڑکن ہے آج بھی لوگ اس کے اتباع کو فخر سمجھتے ہیں اور اس کی رہنمائی کو باعثِ نجات تصور کرتے ہیں، اس کے فیوض آج بھی جاری ہیں اور اپنے موجودہ سرپرست حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی قیادت اور رہنمائی میں برابر ترقی کر رہا ہے۔

آج بھی دارالعلوم کو مختلف داخلی فتنوں کی سرکوبی کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے، بریلی اور قادیانی فتنوں کی سرکوبی کے لیے اس نے مسلسل جدوجہد کی ہے اور آج بھی اسے یہ امتحان درپیش ہے، دُوسری طرف یہاں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی عظیم تر ہے، موجودہ حالات میں دارالعلوم نے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ہمہ گیر جدوجہد کا آغاز کر کے اپنی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ دارالعلوم کے سربراہ کی سربراہی میں دو سال پہلے اس مقصد کیلئے جو ادارہ تشکیل دیا گیا تھا، وُہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دارالعلوم پر ہر مکتبِ فکر کو مکمل اعتماد ہے۔

دارالعلوم کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ یہاں کے اساتذہ میں باہمی یگانگت اور اخلاص قائم رہا ہے۔ طلبا کے ساتھ مشفقانہ روابط رہے ہیں۔ اس دَور میں بھی کسی نہ کسی صورت آج بھی یہ امتیاز قائم ہے اور دارالعلوم کے بیشتر اساتذہ نہایت اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دارالعلوم جن اصولوں پر قائم کیا گیا تھا، آج بھی ان ہی اصولوں پہ قائم ہے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند ہے، نصاب میں بھی عمومی تقاضوں کے مطابق ترمیم کی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ یہ ترمیم ہمہ جہتی ہو، اور ہر اعتبار سے مفید ثابت ہو۔ ہمارا طریقۂ تعلیم اگرچہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، مگر اس میں بھی بعض تبدیلیاں ضروری ہیں، طریقۂ تعلیم میں ایسی اصلاحات ہونی چاہئیں، جن سے تعلیم مشکل دُشوار ہونے کے بجائے سہل اور مفید تر بن جائے۔

سب سے بڑی کمی تحریر کے میدان میں محسوس ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ وُہ تھا جب کہ دارالعلوم کا ہر فرد صاحبِ قلم تھا، مگر آج اس میدان میں بڑا خلا ہے، کتابیں لکھنے کا سلسلہ تو نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، خود اکابر کی کتابیں بھی دوبارہ تصحیح و ترتیب کے ساتھ چھاپنے کا انتظام نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس میدان کے لیے بھروسے کی نسل تیار نہیں ہو رہی ہے، جو لوگ از خود اس میدان میں آنا چاہتے ہیں ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ دارالعلوم کو اللہ نے سہولتیں دی ہیں، وُہ چاہے تو ایسی نسل تیار کرنا مشکل نہیں ہے۔

■■

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اکابرِ دیوبند کیا تھے؟

(مولانا محمد تقی عثمانی - ایم اے - ایل ایل بی - مدیر "البلاغ" دارالعلوم کراچی)

اکابر دیوبند کیا تھے؟ اس کا جواب مختصر لفظوں میں یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ خیر القرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ لیکن ان مختصر جملوں کی تشریح و تفصیل کرنے بیٹھیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی خصوصیات کو لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ان کی خصوصیات کا تعلق درحقیقت اس مزاج و مذاق سے ہے جو صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم) کی سیرتوں اور ان کے طرز زندگی سے مستنیر تھا اور مزاج و مذاق وہ چیز ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ کے ذریعے ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کو سونگھا تو جا سکتا ہے لیکن اس کی پوری کیفیت کو الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں، اسی طرح ان حضرات کے مزاج و مذاق کو ان کی صحبتوں اور ان کے واقعات سے سمجھا جا سکتا ہے مگر اس کی منطقی تعبیر ناممکن ہے۔

لہٰذا اس مضمون میں اکابر دیوبند کی خصوصیات و امتیازات کو نظری طور سے بیان کرنے کے بجائے ان کے چند متفرق واقعات سنانے مقصود ہیں جن سے ان کی خصوصیات زیادہ واضح اور آسان طریقے سے سمجھ میں آسکیں گی۔۔۔۔

وباللہ التوفیق!

علم و فضل اور اس کے ساتھ تواضع و للّٰہیت

اگر صرف وسعت مطالعہ، قوت استعداد اور کثرت معلومات کا نام علم ہو تو یہ صفت آج بھی ایسی کمیاب نہیں لیکن اکابر دیوبند کی خصوصیت یہ ہے کہ علم و فضل کے سمندر سینے میں جذب کر لینے کے باوجود ان کی تواضع، فنائیت اور للّٰہیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ محاورہ زبان زد عام ہے کہ "پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ جھکتی ہے" لیکن ہمارے زمانے میں اس محاورے کا عملی مظاہرہ جتنا اکابر دیوبند کی زندگی میں نظر آتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بحر ناپیدا کنار تھے۔ ان کی تصانیف آب حیات، تقریر دلپذیر، قاسم العلوم اور مباحثۂ شاہجہان پور وغیرہ سے ان کے مقام بلند کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض تصانیف تو ایسی ہیں کہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ حالت یہ ہے کہ ان کے ہم عصر بزرگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا یہ جملہ دارالعلوم میں معروف تھا کہ "میں نے آب حیات کا چھ مرتبہ مطالعہ کیا ہے، اب وہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے"۔

اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں کہ:

"اب بھی مولانا (نانوتوی) کی تحریریں میری سمجھ میں نہیں
آتیں اور زیادہ غور و خوض کی مشقت مجھ سے برداشت ہوتی
نہیں، اس لیے مستفید ہونے سے محروم رہتا ہوں اور اپنے
دل کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے
لیے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں پھر کیوں مشقت اٹھائی جائے"۔ [۱]

ایسے وسیع و عمیق علم کے بعد، بالخصوص جب کہ اس پر عقلیات کا غلبہ ہو، عموماً علم و فضل کا زبردست پندار پیدا ہو جایا کرتا ہے لیکن حضرت نانوتویؒ کا حال یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

"جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا
دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے، اس لیے پھونک پھونک کر
قدم رکھنا پڑتا ہے، اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی
خاک کا بھی پتہ نہ چلتا"۔ [۲]

چنانچہ اُن کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ بقول مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ:

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ جس طالب علم کے اندر تکبر
دیکھتے تھے اُس سے کبھی کبھی جوتے اٹھوایا کرتے تھے اور
جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے اُس کے جوتے خود اٹھا
لیا کرتے تھے"۔ [۳]

۲۔ یہی حال حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ انہیں اُنکے تفقہ کے مقام بلند کی بنا پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے "ابوحنیفۂ عصر" کا لقب دیا تھا اور وہ اپنے عہد میں اسی لقب سے معروف تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے بلند پایہ محقق جو علامہ شامیؒ کو "فقیہ النفس" کا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، حضرت گنگوہیؒ کو "فقیہ النفس" فرمایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ واقعہ سناتے ہیں کہ:

"حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حدیث کا سبق
پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی۔ سب طلباء کتابیں لے لے کر
اندر کو بھاگے مگر مولانا سب طلباء کی جوتیاں جمع کر رہے
تھے کہ اٹھا کر لے چلیں۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے"۔ [۴]

۳۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے علم و فضل کا کیا ٹھکانا، لیکن حضرت تھانویؒ راوی ہیں کہ "ایک مرتبہ مراد آباد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے وعظ کہنے کے لیے اصرار کیا۔ مولانا نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے مگر لوگ نہ مانے تو اصرار پر وعظ کے لیے کھڑے ہو گئے اور حدیث "فقیہ واحد أشد على الشيطٰن من ألف عابد" پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ:

"ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے"۔

مجمع میں ایک مشہور عالم موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ:

"یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آوے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں"۔

حضرت شیخ الہندؒ کا جوابی ردِ عمل معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ذرا دیر گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ اگر اُن کی جگہ ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ ترجمہ صحیح تھا اور اُن صاحب کا انداز بیان توہین آمیز ہی نہیں، اشتعال انگیز بھی تھا لیکن اس شیخ وقت کا طرزِ عمل سنیے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر:

"مولانا فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے
وعظ کی لیاقت نہیں ہے مگر ان لوگوں نے نہیں مانا، خیر
اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہو گئی یعنی آپ کی شہادت"۔

چنانچہ وعظ تو پہلے ہی مرحلے پر ختم فرما دیا۔ اس کے بعد اُن عالم صاحب سے بطرزِ استفادہ پوچھا کہ "غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں"۔ انھوں نے فرمایا کہ

[۱] اشرف السوانح ص ۱۳۶، ۱۳۷ ج ۱　[۲] ارواح ثلاثہ ص ۱۷۶ سے ۲۳۰　[۳] ایضاً ص ۲۰۶ سے ۲۸۵
[۴] ایضاً ص ۲۲۷ سے ۳۳۸

أشد کا ترجمہ أثقل (زیادہ بھاری) نہیں بلکہ أضر (زیادہ نقصان دہ) کا آیا ہے"۔ مولانا نے برجستہ فرمایا کہ حدیث وحی میں ہے "یاتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو أشد علی" (کبھی مجھ پر وحی گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) کیا یہاں بھی أضر (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ہیں؟ اس پر وہ صاحب دم بخود رہ گئے [1]

۴: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جب کانپور میں مدرس تھے، انھوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مدعو کیا۔ کانپور میں بعض اہل علم معقولات کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف بھی مائل تھے۔ ادھر علمائے دیوبند کی زیادہ توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لیے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علمائے دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ اس وقت نوجوان تھے اور ان کے دل میں حضرت شیخ الہندؒ کو مدعو کرنے کا ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ یہاں حضرتؒ کی تقریر ہوگی تو کانپور کے ان علماء کو پتہ چلے گا کہ علمائے دیوبند کا علمی مقام کیا ہے؟ اور وہ منقولات و معقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہوئی۔ حسن اتفاق سے تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانویؒ شیخ الہندؒ کی تقریر سنانا چاہتے تھے، جلسہ میں نہیں آئے تھے جب حضرتؒ کی تقریر شباب پر پہنچی اور اس معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لے آئے جن کا حضرت تھانویؒ کو انتظار تھا۔ حضرت تھانویؒ اس موقع پر بہت مسرور ہوئے کہ اب ان حضرات کو شیخ الہندؒ کے علمی مقام کا اندازہ ہوگا لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہندؒ نے ان علماء کو دیکھا، تقریر کو مختصر کرکے فوراً ختم کر دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ موجود تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ:

"حضرت! اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا، آپ بیٹھ کیوں گئے؟"

شیخ الہندؒ نے جواب دیا: "ہاں! در اصل یہی خیال مجھے بھی آ گیا تھا"۔

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ کسی یہودی نے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر دی تھی تو وہ اس پر چڑھ دوڑے اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جب اپنے آپ کو بے بس پایا تو کھسیانا ہو کر اس نے حضرت علیؓ کے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ اس کو چھوڑ کر فوراً الگ ہو گئے اور پوچھنے پر بتایا کہ میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بنا پر اس یہودی سے الجھا تھا۔ اگر تھوکنے کے بعد کوئی اور کارروائی کرتا تو یہ اپنے نفس کی مدافعت ہوتی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس عمل سے حضرت علیؓ کی یہ سنت تازہ فرمادی۔ مطلب یہی تھا کہ اب تک تو تقریر نیک نیتی سے خالص اللہ کے لیے ہو رہی تھی لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لیے ہوتی، اس لیے اسے روک دیا [2]

۵۔ مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب معقولات کے مسلّم عالم تھے۔ انھوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی شہرت سن رکھی تھی، ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۲۹۶ ۔ ۴۳۶

[2] یہ واقعہ مذکورہ تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے۔ اسی کا خلاصہ حضرت میاں صاحب نے حیات شیخ الہند ص ۱۲۷ میں بھی کیا ہے۔

معین الدین صاحب نے اُن سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ مجھے حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے ملنا ہے" وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیریؒ کو اندر لے گئے، آرام سے بٹھایا اور کہا کہ "ابھی ملاقات ہو جاتی ہے" مولانا اجمیریؒ منتظر رہے، اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا، اس کے بعد مولانا اجمیری نے کہا کہ "حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کو اطلاع دیجئے" اُن صاحب نے فرمایا "آپ بے فکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں" تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا، مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ "میں مولانا محمود حسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، آپ انہیں اطلاع کر دیجئے"۔ اُن صاحب نے فرمایا "انہیں اطلاع ہو گئی ہے آپ کھانا تناول فرمائیں ابھی ملاقات ہو جاتی ہے"۔ مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھا لیا تو ان صاحب نے انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ جب دیر گذر گئی تو مولانا اجمیریؒ برہم ہو گئے اور فرمایا کہ آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں، میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہو چکی ہے، ابھی تک آپ نے اُن سے ملاقات نہیں کرائی۔ اس پر وہ صاحب بولے کہ:

"دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں، البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے"۔

مولانا معین الدین صاحب یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور پتہ چل گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چیز ہیں۔[1]

۶۔ امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں نقل کیا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ "اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے" یہ واقعہ بیان کر کے حکیم الامتؒ نے فرمایا:

"میں کہتا ہوں کہ میرے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے"۔[2]

انہی حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعہ حضرت مولانا محمد انوری صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ مقدمہ بہاولپور کے موقع پر جب حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے کفر پر بے نظیر تقریر فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ "جو چیز دین میں تواتر سے ثابت ہو اس کا منکر کافر ہے" تو قادیانیوں کے گواہ نے اس پر اعتراض کیا:

"آپ کو چاہیے کہ امام رازیؒ پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں علامہ بحرالعلومؒ نے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے"۔

اس وقت بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، سب کو پریشانی ہوئی کہ فواتح الرحموت اس وقت پاس نہیں ہے، اس اعتراض کا جواب کس طرح دیا جائے؟ مولانا محمد انوریؒ جو اس واقعے کے وقت موجود تھے، فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب نہ تھی، مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب حیران تھے کہ کیا جواب دیں گے؟"

لیکن اسی حیرانی کے عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ کی آواز گونجی:

"جج صاحب! لکھیے، میں نے تئیس سال ہوئے، یہ کتاب

---

[1] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے ایک ہم سبق عالم مولانا مغیث الدین صاحب سے سنا تھا جو دیوبند سے فارغ ہو کر معقولات پڑھنے کے لیے اجمیر چلے گئے تھے اور آخر میں مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے لیکن چونکہ واقعہ سنے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا، اس لیے چند سال پہلے حضرت والد صاحب مدظلہم نے ان سے حرم نبویؐ میں اس کی تصدیق فرمائی۔

[2] حیات انور ص ۱۱۹ بروایت مولانا محمد ادریس کاندھلوی

دیکھی تھی، اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے۔ امام رازیؒ در اصل یہ فرماتے ہیں کہ حدیث لا تجتمع امتی علی الضلالۃ تواترِ معنوی کے رتبے کو نہیں پہنچی، لہٰذا انھوں نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے، نہ کہ تواترِ معنوی کے حجت ہونے کا۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے۔ ان کو کہو کہ عبارت پڑھیں۔ ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں۔"

چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی۔ واقعی اس کا مفہوم وہی تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا۔ مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں انشاء اللہ مفحم نہیں ہونے کا۔"[۵]

ایک طرف علم و فضل اور قوتِ حافظہ کا یہ محیر العقول کارنامہ دیکھیے کہ بتیس سال پہلے دیکھی ہوئی کتاب کا ایک جزوی حوالہ کتنی جزرسی کے ساتھ یاد رہا، دوسری طرف اس موقع پر کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کتنے بلند بانگ دعوے کرتا، لیکن خط کشیدہ جملہ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ تواضع کے کس مقام کی غمازی کر رہا ہے؟ اور یہ محض لفظ ہی نہیں ہیں وہ واقعۃً اپنے تمام کمالات کے باوصف اپنے آپ کو ایک معمولی طالب علم سمجھتے تھے اور اس دعائے نبویؐ کے مظہر تھے کہ اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی أعین الناس کبیرا

۶۔ حضرت مولانا محمد انوریؒ ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر تشریف لے جا رہے تھے، بس کے انتظار میں سیالکوٹ اڈے پر تشریف فرما تھے، ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا "نہیں! میں طالب علم ہوں"۔ اس نے کہا "آپ کو اسلام کے متعلق علم ہے؟" فرمایا "کچھ کچھ"۔ پھر اُن کی صلیب کے متعلق فرمایا کہ "تم غلط سمجھے ہو۔ اس کی یہ شکل نہیں ہے"۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر چالیس دلائل دیے۔ دس قرآن سے، دس تورات سے، دس انجیل سے اور دس عقلی۔ وہ پادری آپ کی تقریر سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے اپنے مفادات کا خیال نہ ہوتا تو میں مسلمان ہو جاتا۔ نیز یہ کہ مجھے خود اپنے مذہب کی بہت سی باتیں آپ سے معلوم ہوئیں۔[۶]

۷۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بارہا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں ملاحسن پڑھاتا تھا تو ایک روز اس کی عبارت پر کچھ شبہ ہوا جو حل نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کے بارے میں استفسار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں کتاب لے کر ان کی تلاش میں نکلا، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے اور جب اپنی جگہ پر نہ ہوں تو ان کا کتب خانہ میں ہونا متعین تھا۔ میں کتب خانہ میں پہنچا تو وہ کتب خانے کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعہ میں مشغول تھے۔ میں ابھی نیچے ہی تھا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا اور اوپر ہی سے میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا کہ "ملاحسن کے ایک مقام پر کچھ اشکال ہے، وہ سمجھنا تھا"۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا "عبارت پڑھیے"۔ میں نے عبارت پڑھنی شروع کی تو بیچ ہی میں روک کر فرمایا: "اچھا! یہاں آپ کو یہ شبہ ہوا ہوگا"۔ اور پھر بعینہ وہی اشکال دہرا دیا جو میرے دل میں تھا۔ میں نے تصدیق کی کہ واقعی یہی شبہ ہے، اس پر انھوں نے اس کے جواب میں وہیں سے ایسی تقریر فرمائی کہ تمام اشکال کافور ہو گئے۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصۂ دراز سے حدیث کی تدریس میں مصروف تھے اور منطق کی کتابوں سے واسطہ تقریباً ختم ہو گیا تھا

---

[۵] انوار انوری، مؤلفہ مولانا محمد انوریؒ ص ۳۲ [۶] ایضاً ص ۳۶

لیکن اس کے باوجود یہ حافظہ اور یہ استحضار کرشمۂ قدرت نہیں تو اور کیا ہے۔

۸۔ احقر نے اپنے والد ماجد سے بھی سنا ہے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم سے بھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۳۱۱ھ میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ کی مشہور شرح ہدایہ "فتح القدیر" اور اس کے تکملہ کا مطالعہ بیس سے کچھ زائد ایام میں کیا تھا اور کتاب الحج تک اسکی تلخیص لکھی تھی اور انھوں نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں اُنکا جواب بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد مدت العمر فتح القدیر کی مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور کسی تازہ مطالعہ کے بغیر اس کی نہ صرف باتوں بلکہ طویل عبارتوں تک کا حوالہ سبق میں دیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ انھوں نے ۱۳۴۷ھ میں ہم سے یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا:

"چھتیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا، اگر مراجعت کروگے تفاوت کم پاؤگے"۔ [۱]

۹۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ درس سے فراغت کے بعد میں جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلے سے لکھے ہوئے متعدد سوالات کے جواب اُن سے معلوم کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا حوالہ میں نے دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہو سکا۔ فرمایا "مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں اور انھیں پتہ نہیں چلتا، ورنہ یہ اشکال سب کو پیش آنا چاہیے" پھر فرمایا کہ "صحیح عبارت اس طرح ہے" مولانا نعمانی مدظلہم لکھتے ہیں:

"اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات فرمائی تھی"۔ [۲]

۱۰۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے حالات کی ضرورت تھی۔ مجھے ان کی تاریخ نہ ملی، چنانچہ میں حسب معمول حضرت شاہ صاحبؒ کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرض وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتے بعد وصال ہونے والا تھا۔ کمزوری بے حد ہو چکی تھی۔ ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے آنے کی غرض بتائی تو انھوں نے فرمایا کہ ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجیے اور تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء یاد بھی نہ رہیں گے۔ نیز انتظامی مہمات کے کھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لیے اتنا طویل و عریض مطالعہ کروں۔ بس آپ ہی اس شخص کی دروغ گوئی کے متعلق واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرما دیں، میں اُنہی کو آپ کے حوالے سے جزو کتاب بنا دوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ، اُس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کر دی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب و غریب واقعات بیان فرماتے رہے۔ آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا پھر اُس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان اس طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرما رہے ہیں چنانچہ میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ "حضرت! شاید کسی قریبی زمانے ہی میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی"؟ سادگی سے فرمایا "جی نہیں! آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا۔ خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لیے پہنچا تو

۱۔ نفحۃ العنبر ص ۲۷ طبع مجلس علمی کراچی ۲۔ حیات انور ص ۱۳۹

اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا اور اس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا، بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہو گئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہو گئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا"۔ [1]

۱۱۔ یہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ تحریک خلافت کے دور میں جب امارت شرعیہ (عوام کی طرف سے قاضی مقرر کرنے) کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اپنے بعض نقاط نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطہ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرے میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحۃً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ استنجا کے لیے تشریف لے گئے ہوئے تھے وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق بن نہیں پڑتی۔ حضرت ممدوح حسب عادت "حسبنا اللہ" کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی۔ دیکھا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی۔ جونہی اس سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیر رفع ہو گیا۔ [2]

۱۲۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ طلاق کے ایک مسئلہ میں کشمیر کے علماء میں اختلاف ہو گیا۔ فریقین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حکم بنایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دونوں کے دلائل غور سے سنے۔ اُن میں سے ایک فریق اپنے موقف پر فتاوٰی عمادیہ کی ایک عبارت سے استدلال کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔

"میں نے دارالعلوم کے کتب خانے میں فتاوٰی عمادیہ کے ایک صحیح قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز نہیں ہے لہٰذا یا تو ان کا نسخہ غلط ہے یا یہ لوگ کوئی مغالطہ انگیزی کر رہے ہیں"۔ [3]

ایسے علم و فضل اور ایسے حافظہ کا شخص اگر بلند بانگ دعوے کرنے لگے تو کسی درجہ میں اس کو حق پہنچ سکتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اس قافلۂ رشد و ہدایت کے فرد تھے جس نے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ کی حدیث کا عملی پیکر بن کر دکھایا تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب انھوں نے حضرت مولانا بنوری مدظلہم کو اپنا فیصلہ لکھنے کا حکم دیا تو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ "الحبر البحر" (عالم متبحر) کے دو تعظیمی لفظ لکھ دیے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا تو قلم ہاتھ سے لے کر زبردستی خود یہ الفاظ مٹائے اور غصہ کے لہجہ میں مولانا بنوری سے فرمایا:

"آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے"۔ [4]

پھر ایسا شخص جو ہمہ وقت کتابوں ہی میں مستغرق رہتا ہو، اس کا یہ جملہ ادب و تعظیم کتب کے کس مقام کی نشان دہی کرتا ہے کہ:

"میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں"۔

چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

[1] حیات انور ص ۲۲۵ تا ۲۲۸ [2] حیات انور ص ۲۲۹، ۲۳۰ [3] نفحۃ العنبر ص ۲۷
[4] حیات انور ص ۲۳۳

"سفر و حضر میں ہم اُن کو کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر
مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں
مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز
سے بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ
کر رہے ہوں":

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات
کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا"۔ [1]

۱۳ ۔ دارالعلوم کی تاریخ میں یہ جملہ بہت معروف ہے کہ دارالعلوم کی
ابتداء دو ایسے بزرگوں سے ہوئی جن دونوں کا نام محمود تھا اور دونوں قصبہ
دیوبند کے باشندے تھے۔ ان میں شاگرد تو وہ محمود تھے جو شیخ الہند حضرت
مولانا محمود حسن صاحبؒ کے نام سے معروف ہوئے اور استاد حضرت مُلّا محمود
صاحبؒ تھے۔ راقم الحروف کے جدّ امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ مُلّا محمود صاحبؒ نے فرمایا کہ سنن ابن ماجہؒ پر جو
حاشیہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ محدث دہلویؒ کے نام سے چھپا ہوا ہے
اس کا بڑا حصہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے مجھ سے لکھوایا ہے۔ ان کی
سادگی کا یہ عالم تھا کہ طلباء نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ علم کے دکھاوے
اور نام و نمود کی خواہشات سے اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ خصلت بزرگ کو ایسا
پاک رکھا تھا کہ عام آدمی کو یہ پہچاننا بھی مشکل تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہیں۔
اپنا گھر کا سودا سلف اور گوشت ترکاری خود بازار سے خرید کر لاتے
اور گھر میں عام آدمیوں کی طرح زندگی گزارتے تھے مگر علوم کے استحضار اور
حفظ کا عالم یہ تھا کہ راقم کے جدّ امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کی ایک
بڑی کتاب (جو غالباً منطق یا اصولِ فقہ کی کتاب تھی) اتفاقاً درس سے
رہ گئی تھی، انہیں یہ فکر تھی کہ دورۂ حدیث شروع ہونے سے پہلے یہ کتاب
پوری ہو جائے چنانچہ انہوں نے مُلّا محمود صاحبؒ سے درخواست کی۔ مُلّا
صاحبؒ نے فرمایا کہ اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ بھی میرے تمام اوقات اسباق
سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ایک وقت ہے کہ جب میں گھر کا گوشت
ترکاری لینے کے لیے بازار جاتا ہوں، یہ وقت خالی گزرتا ہے، تم ساتھ ہو جاؤ
تو اس وقفے میں سبق پڑھا دوں گا۔ احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ
فرماتے تھے کہ کتاب بڑی اور مشکل تھی جس کو دوسرے علماء خود مطالعہ کے بعد
بھی مشکل سے پڑھا سکتے تھے۔ مگر مُلّا محمود صاحبؒ نے کچھ راستے میں کچھ قصاب
کی دوکان پر یہ تمام کتاب ہمیں اس طرح پڑھا دی کہ کوئی مشکل ہی نظر نہ آئی۔ [2]

۱۴ ۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کے علم و فضل کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، حضرت طالب علمی
کے زمانے ہی سے اپنی قوتِ استعداد، ذہانت و فطانت اور علم و عمل میں معروف
تھے لیکن جب ۱۳۰۰ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، تو بعد
دستار بندی کے لیے دیوبند میں بہت بڑا اور شاندار جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی
تو حضرت تھانویؒ اپنے ہم سبقوں کو لے کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ
کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ "حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی
دستار بندی کی جائے گی اور سندِ فراغ دی جائے گی، حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں
لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرما دیا جائے ورنہ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی
ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی"۔ حضرت نانوتویؒ کو یہ سن کر جوش آ گیا
اور فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس
لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے، باہر
جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے۔ [3]

---

[1] حیاتِ انور ص ۲۴۳ [2] "میرے والد ماجد" مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم: ص ۵۲، ۵۵

[3] اشرف السوانح۔ ج ۱ ص ۳۲

سادگی اور مخلوقِ خدا کا خیال

۱۵۔ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی اکابر دیوبند میں ہے۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ہم سبق ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک بڑھا ملا جو بوجھ لیے جا رہا تھا، بوجھ زیادہ تھا اور وہ بمشکل چل رہا تھا، حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے یہ حال دیکھا تو اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس بڑھے نے اُن سے پوچھا: "اجی! تم کہاں رہتے ہو؟" انھوں نے کہا "بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں۔" اس نے کہا: "وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں" اور یہ کہہ کر ان کی بڑی تعریفیں کیں، مگر مولاناؒ نے فرمایا: "اور تو اس میں کوئی بات نہیں ہے، ہاں نماز تو پڑھ لے ہے۔" اس نے کہا "واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟" مولاناؒ نے فرمایا: "میں ٹھیک کہتا ہوں" وہ بڑھا ان کے سر ہو گیا، اتنے میں ایک اور شخص آ گیا جو مولاناؒ کو جانتا تھا، اس نے بڑھے سے کہا "بھلے مانس! مولوی مظفر حسین یہی ہیں" اس پر وہ بڑھا مولانا سے لپٹ کر رونے لگا۔ [۱]

۱۶۔ انہی مولانا مظفر حسین صاحبؒ کی عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے جس کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا اس سے پوچھ کر لا دیتے اور طُرّہ یہ کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے کم ہوتے تھے، عموماً چیزیں غلّے کے عوض خریدی جاتی تھیں چنانچہ آپ گھروں سے غلّہ باندھ کر لے جاتے اور اس سے اشیاءِ ضرورت خرید کر لاتے تھے۔ [۲]

۱۷۔ یہی حال دیوبند کے مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا تھا۔ علم و فضل کا تو یہ عالم کہ آج ان کی "عزیز الفتاویٰ" عہدِ حاضر کے تمام مفتیوں کے لیے ماخذ بنی ہوئی ہے اور فتوٰی کے ساتھ شغف کا یہ حال کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جسے موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا تھا۔[۳] لیکن سادگی، تواضع اور خدمتِ خلق کا یہ عالم کہ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

"کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحبِ کرامات صوفی اور صاحبِ نسبت شیخ ہیں جب کہ غایتِ تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلّے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے۔ بوجھ زیادہ ہو جاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کو پہنچاتے۔" [۴]

راقم الحروف نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ہی سے زبانی سُنا کہ اسی سودا سلف لانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کسی عورت کو سودا دینے کے لیے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی: "مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں اتنی منگائی تھی۔" چنانچہ یہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دُور کرتا۔

۱۸۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ کے لقب سے معروف تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے درجۂ علیا کے استاد تھے، ان سے ابُو داؤد پڑھنے والے اب بھی برّصغیر میں ہزاروں ہوں گے، علومِ قرآن و سُنّت کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم و فنون کے کامل محقق مگر بہت کم گو، حدیث کے درس میں نہایت مختصر مگر جامع تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اُتر جاتا اور شبہات خود بخود کافور ہو جاتیں۔

انہی کا واقعہ ہے کہ آپ کا زنانہ مکان اور نشست گاہ کچی مٹی کی بنی

---

[۱] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۴۸ تا ۱۵۵ [۲] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۵۳ تا ۱۹۷ [۳] نقوش و تاثرات، مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ص ۴۴

[۴] مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ج ۱ ص ۴۳

ہوئی تھیں، ہر سال برسات کے موقع پر اس کی لپائی پتائی اگرچہ معمولی تھی، جس میں کافی پیسہ اور وقت خرچ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم) نے حضرت میاں صاحبؒ سے کہا کہ "حضرت! جتنا خرچ سالانہ اس کی لپائی پر کرتے ہیں، اگر ایک مرتبہ پختہ اینٹوں سے بنانے میں خرچ کریں تو دو تین سال میں یہ خرچ برابر ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس محنت سے نجات ہو۔"

یہ سن کر پہلے تو فرمایا: "ماشاء اللہ بات تو بہت عقل کی کہی، ہم بڈھے ہو گئے ادھر دھیان ہی نہ آیا۔" پھر کچھ توقف کے بعد جو حقیقت حال تھی وہ بتائی اور تب پتہ چلا کہ یہ حضرات کس مقام سے سوچتے تھے؟ فرمایا کہ:

"میرے پڑوس میں سب غریبوں کے کچے مکان ہیں، اگر میں اپنا مکان پکا بنواؤں تو غریب پڑوسیوں کو حسرت ہوگی اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے مکان پکے بنواؤں۔"

حضرت والد صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت معلوم ہوا کہ یہ حضرات جو کچھ سوچتے ہیں وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہو سکتی، چنانچہ انہوں نے اس وقت تک اپنے مکان کو پختہ نہیں کیا جب تک پڑوسیوں کے مکان پکے نہیں بن گئے۔"[1]

۱۹ - انہی حضرت میاں صاحبؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب مدظلہم ان کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے آموں سے تواضع کی جب آم چوس کر فارغ ہو گئے تو والد صاحب مدظلہم گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے چلے۔ حضرت میاں صاحبؒ نے دیکھا تو پوچھا، "یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے؟" عرض کیا: "چھلکے باہر پھینکنے جا رہا ہوں۔" ارشاد ہوا "پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟" والد صاحب نے کہا کہ "حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟" فرمایا: "ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ، مجھے دو۔" خود ٹوکری اٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کیے، اس کے بعد باہر تشریف لے گئے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے متعین جگہوں پر چھلکے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں، والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ "ہمارے مکان کے قرب و جوار میں تمام غرباء و مساکین رہتے ہیں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نان جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے، اگر وہ پھلوں کے چھلکے یکجا دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا اس لیے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گذرتے ہیں، یہ چھلکے ان کے کام آ جاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے رہتے ہیں، وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھا لیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہیں، ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔" راقم الحروف کے برادر مرحوم مولانا محمد زکی کیفی صاحب جو اس واقعے کے وقت موجود تھے تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھ لیتے ہوں، عموماً مہمانوں ہی کے لیے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود چھلکے گٹھلیوں کا یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں۔"[2]

۲۰ - انہی حضرت میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ جو کھانا گھر سے آتا تھا، خود تو بہت کم خوراک کھاتے تھے باقی کھانا محلے کے بچوں کو کھلا دیتے تھے جو روٹی بچ جائے اس کو بلی کے لیے دیوار پر رکھ دیتے اور جو ٹکڑے بچ جاتے ان کو چوہا

---

[1] نقوش و تاثرات ص ۴۰

[2] ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ ص ۳۸، ۳۹ ج ۱ مضمون "حضرت میاں صاحبؒ"

بچھوٹا کھرکے چڑیوں کے لیے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہو۔ [1]

۲۱۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کے عشاق اب بھی شاید لاکھوں سے کم نہ ہوں، ان کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ طلباء ان کے نام سے تھرتھراتے تھے حالانکہ مارنے پیٹنے کا کوئی معمول نہ تھا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم بھی ان کے شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے ساتھ ہم چند آدمی سفر پر روانہ ہوئے، سفر کے آغاز میں مولانا نے فرمایا کہ کسی کو اپنا امیر بنا لو۔ ہم نے عرض کیا کہ "امیر تو متعین ہے" مولانا نے فرمایا "تم مجھے امیر بنانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن امیر کی اطاعت کرنی ہو گی"۔ ہم نے عرض کیا "انشاء اللہ ضرور!" اب جو روانگی ہوئی تو مولانا نے اپنا اور ساتھیوں کا سامان خود اٹھا لیا۔ ہم نے دوڑ کر سامان لینا چاہا تو فرمایا "نہیں! امیر کی اطاعت ضروری ہے"۔ پھر سفر کے ہر مرحلے میں مشقت کا ہر کام خود کرنے کے لیے آگے بڑھتے اور کوئی کچھ بولتا تو اطاعتِ امیر کا حکم سناتے۔

۲۲۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خسر محترم جناب مولانا محمود صاحب رامپوری رامپور کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے دینی شغف اور دنیوی وجاہت و ریاست دونوں کے اعتبار سے ممتاز تھا، اور تمام اکابر دیوبند سے اس کے تعلقات تھے، جب یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند آئے تو ان کا قیام دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرے میں ہوا جو چھوٹی مسجد ہی کے نام سے معروف تھی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم سے آتے جاتے ادھر ہی سے گزرا کرتے تھے ایک روز وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں مولانا محمود صاحب رامپوری کھڑے تھے، حضرت شیخ الہند کو ان کے دیوبند آنے کا حال معلوم نہ تھا، اس لیے ان سے پوچھا کہ کب آئے؟ کیسے آئے؟ انھوں نے تفصیل بیان کی اور بتایا کہ اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہوں۔ حضرتؒ حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور ان کے رہنے کی جگہ دیکھی، وہاں ان کے سونے کے لیے ایک بستر فرش ہی پر بچھا ہوا تھا، اس وقت تو حضرتؒ یہ دیکھ کر تشریف لے آئے لیکن یہ خیال رہا کہ مولانا محمود صاحب رامپور کے رئیس زادے ہیں انھیں زمین پر سونے کی عادت نہیں ہو گی اور یہاں تکلیف اٹھاتے ہوں گے، چنانچہ گھر جا کر ایک چارپائی خود اٹھائی اور اسے لے کر چھوٹی مسجد کی طرف چلے، وہاں سے فاصلہ کافی تھا لیکن حضرتؒ اسی حالت میں گلیوں اور بازار سے گزرتے ہوئے چھوٹی مسجد پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا محمود صاحبؒ مسجد سے نکل رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کو خیال آیا کہ یہ مجھے چارپائی اٹھاتے ہوئے دیکھیں گے تو انھیں ندامت ہو گی کہ میری خاطر شیخ الہندؒ نے اتنی تکلیف اٹھائی، چنانچہ انھیں دیکھتے ہی چارپائی نیچے رکھ دی اور فرمایا:

"لو میاں! یہ اپنی چارپائی خود اندر لے جاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں کسی کا نوکر نہیں"۔ [2]

انابت و تقویٰ

۲۳۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو انابت و تقویٰ کے ایسے سانچوں میں ڈھالا تھا کہ یہ "سیماهم فی وجوههم" کی مثال بن گئے تھے۔ اور لوگ ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ مولانا محمد انوریؒ فرماتے ہیں کہ مظفر گڑھ کے سفر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر فجر کی نماز سے قبل حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے، اردگرد خدام کا مجمع تھا، ریلوے کے ایک ہندو بابو صاحب لیمپ ہاتھ میں لیے آ رہے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کا منور چہرہ دیکھ کر

---

[1] ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ ص ۳۹ ج ۱

[2] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور ان کو خود حضرت مولانا محمود صاحب رامپوری رحمۃ اللہ نے سنایا تھا۔

سامنے کھڑے ہو گئے اور زنار و قلادہ رونے لگے اور پھر زیارت ہی ان کے ایمان کا ذریعہ بن گئی، وہ کہتے تھے کہ "ان بزرگوں کا روشن چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام سچا دین ہے"۔ [1]

۲۴ - تمام اکابر دیوبند کا مشترک رنگ یہ تھا کہ وہ حروف و نقوش کے کتابی علم کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے تھے جب تک اس کے ساتھ انابت الی اللہ اور صلاح و تقویٰ نہ ہو، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے جب خانقاہ تھانہ بھون میں مدرسہ امدادیہ قائم فرمایا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کو اس کی اطلاع دی، حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"اچھا ہے بھائی، مگر خوشی تو جب ہو گی جب میاں اللہ اللہ کرنے والے جمع ہو جاویں گے"۔ [2]

۲۵ - چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی انابت الی اللہ پر تھی، راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ:

"ہم نے دارالعلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور درحقیقت یہی اس دارالعلوم کا طغرائے امتیاز تھا"۔ [3]

۲۶ - دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ اگرچہ ضابطے کے عالم نہ تھے لیکن حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے خلیفہ اور اس درجہ کے بزرگ تھے کہ حضرت نانوتویؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

"مولانا رفیع الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ مولانا گنگوہیؒ عالم ہیں اور وہ عالم نہیں، ورنہ نسبت باطنی کے لحاظ سے دونوں ایک درجہ کے ہیں"۔ [4]

ان کا واقعہ ہے کہ انھوں نے ایک گائے پال رکھی تھی جس کی دیکھ بھال ایک خادم کے سپرد تھی۔ ایک روز اتفاقاً وہ خادم کسی وجہ سے گائے کو مدرسہ کے صحن میں باندھ کر کسی کام چلا گیا۔ دیوبند کے باشندے کوئی صاحب ادھر آنکلے مولاناؒ کی گائے کو مدرسہ کے صحن میں دیکھا تو مولانا سے شکایت کی کہ "کیا مدرسہ کا صحن آپ کی گائے پالنے کے لیے ہے؟" مولاناؒ نے ان سے کوئی عذر بیان کرنے کے بجائے یہ گائے دارالعلوم ہی کو دے دی اور قصہ ختم کر دیا، حالانکہ مولاناؒ کا عذر بالکل واضح اور ظاہر تھا مگر یہ حضرات اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کا پہلو اختیار ہی نہ کرتے تھے۔ [5]

۲۷ - حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور کے مہتمم تھے جب دارالعلوم کا کام بہت زیادہ پھیل گیا تھا، طلباء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی، بہت سے نئے شعبے قائم ہو چکے تھے اور ان کا انتظام شبانہ روز مصروفیت کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن احقر نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ اس دور میں بھی نماز اور تلاوت کے دیگر معمولات کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوتا تھا اور اللہ پر توکل کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان اٹھا اور بعض لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی جان کے بھی دشمن ہو گئے، ایسے حالات میں وہ رات کو دارالعلوم کی کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے، بعض بہی خواہوں نے عرض کیا کہ ایسے

---

[1] ارواح الذکیٰ ص ۴۰ [2] ارواح ثلاثہ: ص ۲۲۴ ح ۳۲۷ [3] "میرے والد ماجد": از حضرت مفتی محمد شفیع مدظلہم ص ۵۲ [4] اشرف السوانح ج ۱ ص ۱۳۹ [5] "میرے والد ماجد" ص ۶۰

حالات میں آپ کو اس طرح نہ سونا چاہیے بلکہ احتیاط کے مدِنظر کمرے کے اندر سونا چاہیے۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ: میں تو اس باپ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار اُٹھانے والے بھی میسر نہ آسکے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔" [1]

یہ دیوبند کے وہ بزرگ ہیں جو خالص انتظامی کاموں میں مصروف تھے اور جیسا کہ انتظامی امور کا خاصہ ہے وہ بعض مرتبہ موردِ اعتراض بھی بنے اور عموماً اولیاء اللہ کی فہرست میں ان کا شمار نہیں ہوتا ؎ قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

۲۸۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ سارا دن تعلیم و تدریس کی محنت اُٹھانے کے باوجود رات کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور فجر تک نوافل و ذکر میں مشغول رہتے تھے اور رمضان المبارک میں تو تمام رات جاگنے کا معمول تھا۔ حضرتؒ کے یہاں تراویح سحری سے ذرا پہلے تک جاری رہتی تھی اور مختلف حفاظ کئی کئی پارے سناتے تھے، یہاں تک کہ حضرتؒ کے پاؤں پر ورم آجاتا اور حتّٰی تورّمت قدماہ کی سُنّتِ نبویہ ؐ نصیب ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ خوراک اور نیند کی کمی اور طویل قیام کے اثر سے حضرتؒ کا ضعف بہت زیادہ ہو گیا، اس کے باوجود رات بھر کی تراویح کا یہ معمول ترک نہیں فرمایا۔ آخر مجبور ہو کر گھر کی خواتین نے تراویح کے امام مولوی کفایت اللہ صاحب سے کہلایا کہ آج کسی بہانے سے تھوڑا سا پڑھ کر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کر دیجئے حضرتؒ کو دوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے خوشی سے منظور کر لیا۔ تراویح ختم ہو گئی اور اندر حافظ صاحب لیٹ گئے اور باہر حضرت شیخ الہند۔ لیکن تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے، انھوں نے ہوشیار ہو کر دیکھا تو خود حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ ان کی حیرت و ندامت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا، وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے لیکن مولانا فرمانے لگے کہ: "نہیں بھائی، کیا حرج ہے؟ تمہاری طبیعت اچھی نہیں، ذرا راحت آجائے گی۔" [2]

۲۹۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے واقعات پہلے بھی آچکے ہیں، اُن کا علم و فضل اور حیرت انگیز حافظہ اس قدر مشہور ہوا کہ ان کی دوسری خوبیاں اس میں گم ہو گئیں ورنہ انابت و تقویٰ اور سلوک و تصوف میں بھی انھیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم سے انھوں نے خود بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ میں کشمیر سے آرہا تھا۔ راستہ میں ایک صاحب مل گئے جو پنجاب کے ایک مشہور پیر کے مرید تھے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں پڑتا تھا۔ اس لیے میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ ہم پیر صاحب کے پاس پہنچے تو وہ بڑے اکرام سے پیش آئے، کچھ باتیں ہوئیں، پھر وہ مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی جس سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں۔" انھوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بے چاروں نے بہت زور لگایا لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ بتاتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ واقعہ سنا کر غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

"کچھ نہیں ہے۔ لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے

---

[1] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سُنا ہے (م ت ع)

[2] حیاتِ شیخ الہند از مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ ص ۱۸۹

لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں۔ اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت وسنت پر استقامت ہے۔" [1]

تبلیغ و دعوت کا انداز

۳۰ - اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو جہاں تبلیغ و دعوت دین کا جذبہ عطا فرمایا تھا وہاں اسے "حکمت" اور "موعظہ حسنہ" کے اصول پر انجام دینے کی توفیق بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران آپ کا گزر جلال آباد یا شاملی سے ہوا، وہاں ایک مسجد ویران پڑی تھی، آپ نے پانی کھینچ کر وضو کیا، مسجد میں جھاڑو دی اور بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں ؟ اس نے کہا کہ سامنے خان صاحب کا مکان ہے جو شرابی ہیں اور رنڈی باز ہیں، اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں۔

مولانا یہ سن کر خان صاحب کے پاس تشریف لے گئے، وہ نشہ میں مست تھے اور رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مولانا نے ان سے فرمایا "بھائی خان صاحب! اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور یہ مسجد آباد ہو جائے۔" خان صاحب نے کہا کہ مجھ سے وضو نہیں ہوتی لہٰذا یہ دو بُری عادتیں چھٹتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی پڑھ لیا کرو اور شراب نہیں چھوٹتی تو وہ بھی پی لیا کرو۔ اس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو ہی پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے، کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدے میں خوب روئے۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ سے دو باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو کبھی نہ ہوئی تھیں، ایک یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دے دی۔ دوسرے یہ کہ آپ سجدے میں بہت روئے۔ فرمایا کہ "سجدے میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت! کفر تو میں نے کر دیا اب دل تیرے ہاتھ میں ہے۔" چنانچہ ان خان صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈی ان پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا، اپنا عہد یاد آیا، پھر خیال آیا کہ آج پہلا دن ہے۔ لاؤ، غسل کر لیں، کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ چنانچہ غسل کیا، پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی، نماز کے بعد باغ کو چلے گئے۔ عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی، مغرب کے بعد گھر پہنچے تو ایک طوائف موجود تھی۔ پہلے کھانا کھانے گھر میں گئے۔ وہاں جو بیوی پر نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ باہر آکر رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا۔ [2]

۳۱ - امیر شاہ خان صاحب مرحوم راوی ہیں کہ جب منشی ممتاز علی کا مطبع میرٹھ میں تھا، اس زمانے میں ان کے مطبع میں مولانا نانوتویؒ بھی ملازم تھے اور ایک حافظ جی بھی نوکر تھے۔ یہ حافظ جی بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے، داڑھی چڑھاتے تھے، نماز کبھی نہ پڑھتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ان کی نہایت گہری دوستی تھی۔ وہ مولانا کو نہلاتے اور کھلاتے تھے اور مولانا اُن کو نہلاتے اور کھلاتے تھے۔ مولانا ان کے کنگھا کرتے تھے اور وہ مولانا کے کنگھا کرتے تھے۔ اگر کبھی مٹھائی وغیرہ مولانا کے پاس آتی تو ان کا حصہ ضرور رکھتے تھے، غرض بہت گہرے تعلقات تھے۔ مولانا کے مقدس دوست ایسے آزاد شخص کے ساتھ مولانا کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جمعہ کا دن تھا حسب معمول مولانا نے حافظ جی کو نہلایا۔ اور حافظ جی نے مولانا کو۔ جب نہا چکے تو مولانا نے فرمایا: حافظ جی! مجھ میں اور تم میں دوستی ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارا رنگ اور ہو اور میرا رنگ اور، اس لیے میں بھی تمہاری ہی وضع اختیار کر لیتا ہوں، تم اپنے کپڑے لاؤ، میں بھی وہی کپڑے پہنوں گا اور میری یہ داڑھی موجود ہے تم اس کو بھی چڑھا دو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کپڑے اتاروں گا نہ داڑھی۔ وہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے،

---

[1] حیات القدس ص ۱۵۵ تا ۱۵۷

[2] ارواح ثلاثہ ص ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۹۱

اور کہا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ مجھے اپنے کپڑے دے دیجیے، میں آپ کے کپڑے پہنوں گا اور یہ ڈاڑھی موجود ہے اس کو آپ اُتار دیں۔ چنانچہ مولانا نے ان کو کپڑے پہنائے اور ڈاڑھی اُتار دی اور وہ اسی روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے۔ ؎1

۳۲۔ دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محسوس کیا کہ بعض حضرات مدرسین دارالعلوم کے مقررہ وقت سے کچھ دیر میں آتے ہیں تو آپ نے حاکمانہ محاسبہ کے بجائے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ صبح کو دارالعلوم کا وقت شروع ہونے پر دارالعلوم کے دروازے کے قریب ایک چارپائی ڈال کر اس پر بیٹھ جاتے اور جب کوئی استاد آتے تو سلام ومصافحہ اور دریافتِ خیریت پر اکتفا فرماتے، زبان سے کچھ نہ کہتے کہ آپ دیر سے کیوں آتے ہیں؟ اس حکیمانہ سرزنش نے تمام مدرسین کو وقت کا پابند بنا دیا۔

البتہ صرف ایک مدرس اس کے بعد بھی کچھ دیر سے آتے تھے ایک روز جب وہ وقتِ مقررہ کے کافی بعد مدرسہ میں داخل ہوئے تو سلام اور دریافتِ خیریت کے بعد اُنھیں پاس بٹھا کر فرمایا:

"مولانا! میں جانتا ہوں کہ آپ کے مشاغل بہت ہیں، ان کی وجہ سے دارالعلوم پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے، اور میں ایک بے کار آدمی ہوں خالی پڑا رہتا ہوں، آپ ایسا کریں کہ اپنے گھر کا کام مجھے بتلا دیا کریں، میں خود جا کر ان کو انجام دے دیا کروں گا تاکہ آپ کا وقت تعلیم کے لیے فارغ ہو جائے۔"

اس حکیمانہ طرزِ خطاب کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا اور وہ مدرس بھی آئندہ ہمیشہ کے لیے وقت کے پابند ہو گئے۔ ؎2

۳۳۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اصلاحِ خلق کی توفیقِ خاص اور اس کا انتہائی حکیمانہ اسلوب مرحمت فرمایا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب جگر مرادآبادی مرحوم کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانویؒ سے ذکر کیا کہ "جگر مرادآبادی سے ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ تھانہ بھون جانے اور زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے مجبور ہوں کہ کیا منہ لے کر وہاں جاؤں" حضرتؒ نے خواجہ صاحبؒ سے پوچھا "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" خواجہ صاحبؒ نے عرض کیا کہ میں نے کہہ دیا "ہاں! یہ تو صحیح ہے، ایسی حالت میں بزرگوں کے پاس جانا کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟" حضرتؒ نے فرمایا: "واہ خواجہ صاحب! ہم تو سمجھتے تھے کہ اب آپ طریق کو سمجھ گئے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارا خیال غلط تھا" خواجہ صاحبؒ کے تعجب پر حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ "آپ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہو اسی میں چلے جاؤ، ممکن ہے کہ یہ ملاقات ہی اس بلا سے نجات کا ذریعہ بن جائے"۔

چنانچہ خواجہ صاحبؒ یہاں سے واپس گئے تو پھر اتفاقاً جگر صاحب سے ملاقات ہو گئی تو یہ سارا واقعہ جگر صاحب کو سنا دیا۔ انھوں نے حضرت کے یہ کلمات سن کر زار زار رونا شروع کر دیا اور بالآخر یہ عہد کر لیا کہ اب مر بھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شراب چھوڑنے سے بیمار پڑ گئے، حالت نازک ہو گئی، اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس حالت میں بقدرِ ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی لیکن یہ جگر صاحب کا جگر تھا کہ اس کے باوجود انھوں نے اس اُم الخبائث کو ہاتھ نہ لگایا۔ اللہ تعالیٰ اہلِ عزم وہمت کی مدد فرماتے ہیں، اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مدد سے چند روز ہی میں شفاءِ کامل حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرتؒ نے اکرام فرمایا۔ ؎3

؎1 ارواح ثلاثہ ص ۱۸۴، ۲۲۶ ؎2 "میرے والد ماجد" از حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۹

؎3 مجالس حکیم الامت، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۸

۳۴ ۔ غالباً شملہ کے کسی کالج میں حضرت تھانویؒ کا بیان ہوا، وہاں آپ نے فرمایا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جو شبہات پیدا ہوتے ہیں، وہ صرف نصاب تعلیم ہی کا قصور نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب وہ لادینی ماحول ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بزرگ علماء و صلحاء کی مجلسیں بحمد اللہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ قائم ہیں، کچھ دن اس ماحول میں رہنے کی عادت ڈالیں۔

غالباً اسی مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کو انگریزی پڑھنے والوں سے نفرت ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں! ان لوگوں سے کوئی نفرت نہیں، البتہ ان کے بعض اعمال و افعال سے نفرت ہے جو شریعت کے خلاف ہیں" یہ صاحب بولے "وہ اعمال و افعال کیا ہیں؟" حضرتؒ نے فرمایا کہ "مختلف لوگوں کے مختلف اعمال ہیں، سب یکساں نہیں" یہ صاحب بھی خوب آزاد آدمی تھے، کہنے لگے کہ "مثلاً مجھ میں کیا ہیں؟" آجکل کے عام وضع طلباء کی طرح ان کی بھی ڈاڑھی صاف تھی، حضرتؒ نے فرمایا: "بعض چیزیں تو ظاہر ہیں، مگر مجمع میں اس کا اظہار کرنے سے حیا مانع ہے اور آپ کے باقی حالات و معاملات مجھے معلوم نہیں جس پر کوئی رائے ظاہر کر سکوں"۔

یہ جلسہ ختم ہوا، حضرتؒ تھانہ بھون واپس آگئے پھر اتفاقاً کالج کی تعطیل ہوئی تو ایک طالب علم کا خط آیا، خط میں لکھا تھا کہ ہماری اس وقت تعطیل ہے، میں آپ کے تبلائے ہوئے طریقے کے مطابق کچھ دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں مگر میری ظاہری صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں اور اعمال و افعال میں بھی بہت گڑبڑ ہے، ان حالات میں حاضری کی اجازت ہو تو میں حاضر ہو جاؤں۔ حضرت نے تحریر فرمایا "جس حالت میں ہیں، چلے آئیے، کوئی فکر نہ کریں"۔ یہ صاحب آگئے اور عرض کیا کہ مجھے بہت سے شبہات و اشکالات ہیں، ان کو حل کرنا چاہتا ہوں، حضرتؒ نے فرمایا کہ مناسب ہے مگر اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ آپ کے جتنے شبہات ہیں ان سب کو لکھ لیں اور آپ مجلس میں بیٹھ کر ہماری باتیں سنیں، کوئی سوال نہ کریں، جب آپ کی مدت قیام کے تین دن رہ جائیں اس وقت یاد دلائیں تو میں آپ کو سوالات کا مستقل وقت دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ جو سوالات آپ لکھ کر رکھیں گے، اس عرصہ میں کسی سوال کا جواب سمجھ میں آ جائے تو اس کو کاٹ دیں۔

ان صاحب نے ایسا ہی کیا اور جب رخصت سے تین روز پہلے حضرتؒ نے سوالات کا وقت دیا تو انھوں نے بتلایا کہ میرے سوالات کی بہت طویل فہرست تھی مگر دوران قیام اکثر سوالات کے جواب خود سمجھ میں آگئے، ان کو کاٹتا رہا، اب صرف چند سوال باقی ہیں چنانچہ یہ سوالات انھوں نے پیش کیے اور حضرتؒ سے ان کے جوابات پاکر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئے۔ [1]

مخالفین سے سلوک

۳۵ ۔ اکابر دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مخالف مسلک والوں سے بھی بد اخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے نہ ان کی تردید میں دلآزار اسلوب کو پسند کرتے تھے اور نہ طعن آمیز القاب سے یاد کرنا پسند کرتے تھے بلکہ جہاں تک ہو سکتا بد اخلاقی کا جواب خوش خلقی سے دیتے اور مخالفین کی دینی ہمدردی و خیرخواہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت امیر شاہ خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولاناؒ خورجہ تشریف لائے اور وہاں ایک مجلس میں مولوی فضل رسول بدایونی کا تذکرہ چل گیا (چونکہ وہ مخالف مسلک کے تھے اس لیے) میری زبان سے (طنز کے طور پر) بجائے فضل رسول "فصل رسول" کے فصل رسول نکل گیا، مولاناؒ نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ "لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا "فضل رسول" آپ نے فرمایا "تم فصل رسول کیوں کہتے ہو؟" حضرت تھانویؒ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ حضرات تھے جو لا تلمزوا انفسکم ولا

---

[1] مجالس حکیم الامت، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۶۰ - ۶۲

تنابزوا بالالقاب کے پورے عامل
تھے حتٰی کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی"۔ [1]

۳۶ ۔ بریلی کے مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اکابر دیوبند کی تکفیر اور ان پر سب و شتم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ ہر پڑھے لکھے انسان کو معلوم ہے۔ ان ذشتہ خصلت اکابر پر گالیوں کی بوچھاڑ کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس دشنام طرازی کا سب سے بڑا نشانہ تھے، ایک روز اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ان کی تصنیفیں ہمیں سنادو۔ حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحبؒ نے عرض کیا کہ "حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں"۔ اس پر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:

"اجی دور کی گالیوں کا کیا ہے؟ پڑی دلیتی بلا سے،
گالیاں ہوں، تم سناؤ۔ آخر اس کے دلائل تو دیکھیں، شاید
کوئی معقول بات ہی لکھی ہو تو ہم ہی رجوع کر لیں"۔ [2]

اللہ اکبر! یہ ہے حق پرستوں کا شیوہ، کہ مخالفین بلکہ دشمنوں کی باتیں بھی، اُن کی دشنام طرازیوں سے قطع نظر، اس نیت سے سُنی جائیں کہ اگر اس سے اپنی کوئی غلطی معلوم ہو تو اس سے رجوع کر لیا جائے۔

۳۷ ۔ مولانا محمود صاحب رام پوریؒ (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے۔ میں حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں مہمان ہوا اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھانا کھا کر میرے پاس آگیا کہ میں بھی یہاں ہی رہوں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی۔ جب سب سوگئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولاناؒ زنانہ میں سے تشریف لائے۔ میں لیٹا رہا اور یہ سمجھا تھا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو میں امداد کروں گا ورنہ خواہ مخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کر کے کیوں پریشان کروں۔ میں نے دیکھا کہ مولاناؒ اس ہندو کی طرف بڑھے اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے شروع کیے۔ وہ خوانٹے لے کر خوب سوتا رہا۔ مولانا محمود صاحب کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ تکلیف نہ کریں، میں دباؤں گا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ تم جا کر سوؤ، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس خدمت کو انجام دوںگا۔ مجبوراً میں چپ رہ گیا اور مولاناؒ اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔ [3]

۳۸ ۔ مولانا احمد حسن صاحب پنجابی مدرس کانپور نے "ابطال امکان کذب" میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کر کے شائع کیا جس میں حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقۂ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابر دین کی نسبت زبان درازی کی انتہا کر دی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ رسالہ دیکھ کر طیش تو بہت آیا لیکن علم و تقویٰ کا مقام بلند ملاحظہ فرمائیے کہ غیظ و غضب کے جذبات کو پی کر ارشاد فرمایا:

"ان گستاخ لوگوں کو بُرا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں
لیا جا سکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل
ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور و بے قصور ہیں"۔ [4]

۳۹ ۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ سے اُمت کو جو بے مثال نفع پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرتؒ کے مواعظ کا فیض آج تک جاری ہے اور جن حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ مواعظ دین کی بیشتر ضروریات پر حاوی ہیں اور اصلاح و تربیت کے لیے بے نظیر تاثیر رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ جونپور میں آپ کا ایک وعظ ہونا تھا۔ وہاں بریلوی حضرات کا خاصا مجمع تھا، آپ کے پاس ایک بے ہودہ خط پہنچا جس میں چار باتیں کہی گئی تھیں ایک تو یہ کہ تم جُلاہے ہو دوسرے یہ کہ جاہل ہو، تیسرے یہ کہ کافر ہو۔ اور

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۷۵ ۲۲۸
[2] ارواح ثلاثہ ص ۲۱۱ ۳۱۵
[3] ارواح ثلاثہ ص ۲۸۵ ۴۳۲
[4] حیات شیخ الہندؒ از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ ص ۱۸۲

پڑھئے یہ کہ سنبھل کر بیان کرنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ شروع کرنے سے پہلے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کا ایک خط میرے پاس آیا ہے پھر وہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ "یہ جو لکھا ہے کہ تم جلاہے ہو، تو اگر میں جلاہا ہوں بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں یہاں کوئی رشتے ناطے کرنے تو آیا نہیں، احکام الٰہی سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، سو اس کو قومیت سے کیا علاقہ؟ دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرما دیا، سب قومیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں اور سب اچھی ہیں اگر اعمال و اخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو مسئلہ کی تحقیق تھی۔ رہی واقعہ کی تحقیق سو مسئلہ کی تحقیق کے بعد واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی اگر کسی کو تحقیق واقعہ کا شوق ہی ہو تو میں آپ کو اپنے وطن کے علماء کے نام اور پتے لکھوائے دیتا ہوں، ان سے تحقیق کر لیجیے، معلوم ہو جائے گا کہ میں جلاہا ہوں یا کس قوم کا؟ اور اگر مجھ پر اطمینان ہو تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جلاہا نہیں ہوں —— رہا جاہل ہونا، اس کا البتہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اس کو نقل کر دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو اس پر عمل نہ کرے —— اور کافر ہونے کو جو لکھا تو اس میں زیادہ قیل و قال کی حاجت نہیں، میں آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں:

أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن
محمد رسول الله (صلى الله عليه وسلم)

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا بھی تو لیجیے اب نہیں رہا —— آخر میں سنبھل کر بیان کرنے کی دھمکی دی گئی ہے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وعظ گوئی کوئی میرا پیشہ نہیں ہے، جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے تو جیسا کچھ مجھے بیان کرنا آتا ہے بیان کر دیتا ہوں، اگر آپ صاحبان نہ چاہیں گے تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے۔ قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں بیان کرتا جس میں کسی گروہ کی دل آزاری ہو یا فساد پیدا ہو، لیکن اگر اصول شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کے ذکر کی ضرورت ہی پیش آ جاتی ہے جس کا رسوم و بدعات سے تعلق ہے تو پھر میں رکتا بھی نہیں، اس لیے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے —— سب باتیں سننے کے بعد اب بیان کے متعلق جو آپ صاحبوں کی رائے ہو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ اگر اس وقت کوئی بات کسی کے خلاف طبع بیان کرنے لگوں تو فوراً مجھ کو روک دیا جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھے روک دے گا تو میں اپنے بیان کو فوراً منقطع کر دوں گا اور بیٹھ جاؤں گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ وہی صاحب روک دیں جنہوں نے یہ خط بھیجا ہے یا اگر خود کہتے ہوئے انہیں شرم آئے یا ہمت نہ ہو تو چپکے سے کسی لڑکے ہی کو سکھا پڑھا دیں، ان کی طرف سے وہ مجھے روک دیں۔

یہ سن کر ایک معقولی مولوی صاحب جو بدعتی خیال کے تھے اور جن کا وہاں بہت اثر تھا، کڑک کر بولے: "یہ خط لکھنے والا کوئی حرام زادہ ہے، آپ وعظ کہیے آپ کیسے فاروقی ہیں؟" حضرتؒ نے فرمایا: "میں ایسی جگہ کا فاروقی ہوں جہاں کے فاروقیوں کو یہاں کے لوگ جلاہے سمجھتے ہیں"۔

جب سارا مجمع خط لکھنے والے کو برا بھلا کہنے لگا، خاص طور سے وہ مولوی صاحب فحش فحش گالیاں دینے لگے تو حضرت والا نے روکا کہ گالیاں نہ دیجیے، مسجد کا تو احترام کیجیے —— پھر حضرت والا کا وعظ ہوا اور بڑے زور شور کا وعظ ہوا۔ اتفاق سے دوران وعظ میں بلا قصد کسی علمی تحقیق کے ضمن میں کچھ رسوم و بدعات کا بھی ذکر چھڑ گیا پھر تو حضرت والا نے بلا خوف لومۃ لائم خوب ہی رد کیا، لوگوں کو یہ اختیار دے چکے تھے کہ وہ چاہیں تو وعظ کو روک دیں، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ معقولی مولوی صاحب شروع شروع میں تو بہت تحسین کرتے رہے اور بار بار سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتے رہے، کیونکہ اس وقت تصوف کے رنگ پر بیان ہو رہا تھا لیکن جب رد بدعات ہونے لگا تو پھر چپ ہو گئے

مگر بیٹھے سنتے رہے، یہ بھی خدا کا بڑا فضل تھا کیونکہ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے کٹر اور سخت ہیں کہ جہاں کسی واعظ نے کوئی بات خلافِ طبع کہی، انھوں نے وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیا، لیکن اس وقت انھوں نے دم نہیں مارا، چپکے بیٹھے سنتے رہے۔ لیکن جب وعظ ختم ہوا اور مجمع رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہو گیا تو اُس وقت اُن مولوی صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ "ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس پر ایک دوسرے ذی استعداد مولوی صاحب (جو خود بدعتی خیال کے تھے) بڑھے اور جواب دینا چاہا لیکن حضرت والا نے انھیں روک دیا کہ خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں، مجھے عرض کرنے دیں پھر حضرت والا نے اُن معتقل مولوی صاحب سے فرمایا کہ آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے نہ فرمائی، ورنہ میں احتیاط کرتا، میں نے تو جو کچھ بیان کیا ضروری ہی سمجھ کر کیا، مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو بیان ہو چکا۔ ہاں! ایک صورت اب بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ابھی تو مجمع موجود ہے، آپ پکار کر کہہ دیجیے کہ صاحبو! اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی، پھر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا اور آپ ہی کی بات اخیر رہے گی۔" اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور مولوی صاحب اُن سے رخصت ہو گئے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد سب لوگ اُن کو بُرا بھلا کہنے لگے، جب بہت شور و غل ہوا تو حضرت والا نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "صاحبو! ایک پردیسی کی وجہ سے آپ مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں، میں آج پھلی شہر جا رہا ہوں۔ اب آپ صاحبان یہ کریں اور میں ان صاحب کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں جنھوں نے خط بھیجا ہے کہ وہ میرے بیان کا رد کرا دیں پھر دونوں راہیں سب کے سامنے ہوں گی جو جس کو چاہے اختیار کرے، فساد کی ہرگز ضرورت نہیں۔"

پھر ان دوسرے مولوی صاحب نے (جو بدعتی خیال کے ہونے کے باوجود جواب کے لیے آگے بڑھے تھے) کھڑے ہو کر فرمایا کہ:

"صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ میں مولود یہ بھی ہوں، قیامیہ بھی ہوں مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے صحیح وہی ہے۔"[1]

۴۰۔ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سُنا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہلِ بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اہلِ بدعت نے اس کا جو رد لکھا، اس میں انھیں کافر قرار دیا۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست ۔۔۔ چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش ۔۔۔ دروغے را جزا باشد دروغے[2]

انھوں نے حضرت شیخ الہند کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعری لطافت کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ "تم نے اُن کو لطافت کے ساتھ ہی سہی، کافر تو کہہ دیا حالانکہ فتوے کی رُو سے وہ کافر نہیں ہیں اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کر لو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مومنی فبہا، و الّا
دروغے را جزا باشد دروغے[3]

---

[1] اشرف السوانح، ج ۱ ص ۶۸-۶۲۔

[2] "تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیونکہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہو سکتی ہے۔"

[3] "تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہو سکتی ہے۔"

یہ چند واقعات ہیں جو کسی خاص اہتمام اور تحقیق و جستجو کے بغیر نوکِ قلم
آ گئے۔ اس مختصر مضمون میں اس قسم کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں۔ اگر کوئی بندۂ خدا
مزید تحقیق و جستجو اور مطالعہ کے بعد ان حضرات کے ایسے واقعات کو یکجا کر دے تو علم و
دین کی بڑی خدمت ہو لیکن بزرگوں کے چند واقعات اکابرِ دیوبند کے علمی و جمالی کی ایک
جھلک دکھانے کے لیے، امید ہے کافی ہوں گے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً

نعت شریف

از حضرت مولانا سید محمد عالم میاں جوہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ہر جلوہ پُر ضیا رُخِ انور کا نور ہے — شانوں میں کیا بلند یہ شانِ حضور ہے

جو جلوہ ہے وہ رشکِ تماشائے طور ہے — واللہ کیا بلند یہ شانِ حضور ہے

مکہ کے تاجدار، مدینہ کے حکمراں — عالم کے رہنما ہیں یہ شانِ حضور ہے

بے چین دل کا چین ہیں، آنکھوں کا نور ہیں — منزل ہیں عاشقوں کی یہ شانِ حضور ہے

عفو و کرم کا ابر ہیں، بخشش کی ہیں گھٹا — بارش ہیں رحمتوں کی یہ شانِ حضور ہے

بحرِ سخا ہیں اور سمندر ہیں جود کا — لطف و کرم کی موج یہ شانِ حضور ہے

شافع ہیں روزِ حشر کے سب کے ہیں پیشوا — محبوبِ کبریا ہیں یہ شانِ حضور ہے

مرکز ہیں دائرہ کے یکتائے روزگار — بے مثل و بے نظیر یہ شانِ حضور ہے

مخزن ہیں حکمتوں کے ہدایت کے آفتاب — خاتم ہیں انبیا کے یہ شانِ حضور ہے

ضرب المثل ہیں حلم میں، کوہِ وقار ہیں — انسانیت کے تاج یہ شانِ حضور ہے

وعدہ کے کیسے سچے، صدوق و امین بھی — اخلاق کیا شگفتہ یہ شانِ حضور ہے

بارُعب بھی کمال کے اس پر وہ مہربان — سب میں گھُلے ملے ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

حسن و اَدا غضب کے تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ — شمس و قمر ہیں ماند یہ شانِ حضورؐ ہے

خود نازنین ہیں اس پہ جفائیں جہان کی — کس شوق سے اٹھائیں یہ شانِ حضورؐ ہے

سب پر حریص اور رؤف و رحیم ہیں — سب میں عزیز تر ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

حاصل ہے زندگی کا اک ان کا وجود پاک — جیسے ثمر شجر کا یہ شانِ حضورؐ ہے

منشا ہیں خلق و امر کا مبدا ہیں منتہٰی — منبع وجود کا ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

قرآن نے خود ہی آپ کو پیارا لقب دیا — سب نے کہا کہ خوب یہ شانِ حضورؐ ہے

ساقی ہیں صرف آپ ہی کوثر کے روزِ حشر — سب کو بلا بلا کے یہ شانِ حضورؐ ہے

کیا کیا لکھوں صفات کہ ہر شان ہے نئی — لکھ لکھ کے تھک رہا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

مجھ سے سیاہ رُو کی جو بخشش بھی ہو گئی — یہ شانِ مغفرت ہے یہ شانِ حضورؐ ہے

میں نعت کیا کہوں گا کہ عاصی ہوں شرمسار — جو کچھ بھی کہہ گیا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

ہر چند خستہ حال ہوں درماندہ اور تباہ — اس پر بھی مطمئن ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

جز ناز ان کے دَر کا میرے پاس کچھ نہیں — ایک آسرا یہی ہے، یہ شانِ حضورؐ ہے

مہمانِ بے نوا کو معزز بنا لیا — خدمت میں اپنی رکھ کے یہ شانِ حضورؐ ہے

نسبت ہے ایک شیخ سے جن کے طفیل ہیں

مجھ کو بسا لیا ہے، یہ شانِ حضورؐ ہے

○

دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس

ابن الانور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر
مدیر ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند

یہ مضمون حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا جیسا کہ اس مضمون میں ضرورت ظاہر کی گئی تھی۔ حضرت مدنیؒ کے بعد صدر مدرسی کیلئے حضرت مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا اور مرحوم نے سات آٹھ سال بڑی کامیابی کے ساتھ دارالعلوم میں بخاری شریف کا درس دیا۔ اب مولانا فخرالدین کے بعد ضابطہ کے صدر مدرس مولانا فخرالحسن صاحب اور مولانا شریف حسن صاحب دیوبندی بخاری شریف پڑھاتے ہیں۔ بحمداللہ دارالعلوم میں بخاری شریف اور صحاح ستہ کا درس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جاری ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کی مسند کو جو دراصل پورے دارالعلوم کی صدارت و سیادت کی مسند عظیم ہے، قدرتی طور پر یہ شرف و فخر حاصل رہا ہے کہ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم، بے مثال محدث، عارف باللہ اور اپنے کردار کی خصوصیات کے لحاظ سے سرآمد روزگار انسانوں نے اس مسند پر بیٹھ کر پورے ہندوستان اور پورے عالم اسلامی کو اپنے علم و عمل، زہد و تقویٰ، سادہ زندگی، توکل و استغنا، خدا خواہی اور خدا ترسی، نیک مشاغل اور اعمال کے فیوض سے مستفید فرمایا۔ یہ خود قدرت الٰہیہ کا ایک انتظام ہے کہ اب تک دارالعلوم کو صدر مدرس اور شیخ الحدیث ایسے میسر آتے رہے، جنھوں نے اندرونی طور پر دارالعلوم کی دینی خصوصیات اور بیرونی طور پر دارالعلوم کی عظیم شہرت کو باقی رکھا اور آگے بڑھایا۔ دارالعلوم کے کمالات اور کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ بلاشبہ ان میں سے ہر شخص کے حالات پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور لکھی گئی ہیں۔ میں اپنی اس تحریر میں اختصار کی شرط کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ صرف اجمالی طور پر ان بزرگوں کا ذکر کرتا ہوں

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ

یہ دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، رشتہ داری اور معاصرت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نانوتوی قدس سرہٗ کے ساتھ شریک تھے، متبحر عالم، فاضل عصر، عارف باللہ اور مجذوب قسم کے انسان تھے، بڑی سادہ زندگی رکھتے تھے، مکاشفات و مراقبات کا آپ کی زندگی میں خاص حصہ تھا، اکثر اپنے مکاشفات اپنے دوستوں سے بیان کر دیتے تھے، جس

زمانے میں انگریزی نئی دہلی آباد کر رہے تھے، آپ نے اس وقت پیشن گوئی فرمائی تھی کہ انگریز اپنی بسائی ہوئی ان بستیوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے، اور ہندوستان میں بہت جلد ان کے عروج کا آفتاب گہن میں آجائے گا۔ یہ پیشگوئی اپنے وقت پر پوری ہوئی، انتقال سے کچھ دن پہلے دیوبند سے اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے، دیوبند سے جاتے وقت سب ملنے جلنے والوں سے مل کر کہا سنا معاف کرا گئے، وطن میں جس دن انتقال ہوا، اس دن اپنی مسجد کے ملا سے کہہ بھی دیا کہ آج ہمارا سفر ہے اور اسی دن انتقال فرمایا۔ نانوتہ میں آپ کے مزار پر مجھے حاضری کا موقع ملا ہے، صاف طور پر یہ محسوس ہوا کہ اس تودہ خاک کے نیچے وقت کا شیخ کامل آسودۂ اور محوِ خواب ہے، بڑے کمالات کے انسان تھے، ہمارے بزرگ حضرت علامۃ العصر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ہمیں اکثر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے حالات سنایا کرتے تھے، آپ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے استاذ تھے، حضرت تھانویؒ کی مجلسوں اور ملفوظات میں بھی آپکا ذکر بکثرت و مرات ملتا ہے۔

مولانا سید احمد دہلویؒ

دارالعلوم کے دوسرے صدر مدرس، ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ کا علم بے حد، پختہ اور زندگی بڑی متوکلانہ تھی۔ دارالعلوم کے لیے آپ کی دینی اور علمی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ

دارالعلوم کے احاطے میں حدیث و تفسیر کے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے دارالعلوم کی مسند پر قدم رکھا تو چار سُو شور مچ گیا کہ برات کا دولہا آگیا ہے، نحیف و نزار بدن میں عزم و حوصلہ، نیکی، دینداری کی ایک بڑی مضبوط روح تھی، جس نے عالم اسلامی میں ہنگامہ مچا دیا، مرشد کامل اور شیخ وقت، خلوتوں میں خدا کے اطاعت گزار بندے، اور سیاسی میدان میں محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خانؒ، خان عبدالغفار خان، مولانا حسین احمد مدنی اور حسرت موہانی جیسے مشہور لیڈروں کے رہنما، ان کے نفس میں اللہ نے برکت اور سعادت بخشی تھی، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا اعزاز علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا فخرالدین مرادآبادی اور مولانا محمد ابراہیم بلیاوی جیسے شاگرد، اگر کسی اور استاذ کو میسر آئے ہوں تو نام لیجئے۔ شیخ الہندؒ کی صحبت ایک نعمت تھی، کہ جسے حاصل ہوئی وہ سچا مسلمان اور بڑا انسان بن گیا۔ علم و شریعت کی دنیا میں ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے وقت پر حکمرانی کی ہے۔ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ نے علوم و معارف کے دریا بہائے۔ آزادی وطن کی طرف توجہ دلائی تو ہندوستان، آزاد قبائل، افغانستان اور ٹرکی کو انگریزوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ آزادیٔ وطن کے لیے انھوں نے ایک آگ لگائی تھی۔ اس آگ نے آگے چل کر انگریزوں کے اقتدار کی ساری کائنات کو جلا دیا۔ مالٹا کا وہ قلعہ جہاں حضرت شیخؒ نے اپنی اسارت کا زمانہ گزارا ہے، جب تک باقی ہے، اس مردِ مومن کی شرافت، عزم و ہمت اور بزرگانہ اوصاف کی شہادت دے گا۔ دیوبند کی زندگی کے قدم قدم پر شیخ الہند کی علمی و عملی خصوصیات کا ایک ایک نقش ابھا رہا ہے۔

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لائق شاگرد، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کشمیری کی صدارت تدریس کی سفارش فرمائی، علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گزشتہ پانچ چھ صدی میں اس شان کا عالم منصۂ شہود پر نہیں آیا، قوت حافظہ، ذکاوت، ذہانت، علوم عقلیہ نقلیہ میں مہارت، مضامین حدیث و تفسیر میں نئے نئے، استنباط علمی شغف

سادہ معصوم زندگی، تبحر وجامعیت، وسعت معلومات کے لحاظ سے ان کی ذات بے مثال تھی، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ان کے جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے برملا کہا تھا کہ،

"سات صدی میں ایسا جامع عالم اور کوئی نہیں آیا"

قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھا، چالیس سال بعد بھی اس کے مضامین محفوظ رہے اور ضرورت کے وقت ۴۰ سال اور تیس سال پہلے پڑھی ہوئی اس کتاب کے صفحے کے صفحے پڑھ دیتے، ان کا درسِ حدیث امتیازی حیثیت رکھتا تھا، آج پورے ہندوستان میں درسِ حدیث میں تحقیقاتِ علمیہ اور دلائلِ عقلیہ کا جو رواج ہے، اس کے موجد حضرت شاہ صاحبؒ ہیں. آپ کے شاگردوں میں مولانا اعزاز علی صاحب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا فخر الدین صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا میرک شاہ کشمیری، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا حمید الدین صاحب فیض آبادی، مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا محمد انوری صاحب لائلپوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا محمود احمد نانوتوی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ اور مولانا محمد یوسف میرٹھ جیسے سینکڑوں علماء ہیں؛ ممالکِ اسلامیہ کے علماء نے آپ کی تصانیف دیکھ کر آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، سید رشید رضا مرحوم اور علامہ زاہد کوثری کے مضمون جو حضرت شاہ صاحب رح کے متعلق لکھے گئے ہیں؛ اس کے شاہد ہیں؛ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا دورِ صدارت دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کا دورِ شباب تھا. آج درس و تدریس، تصانیف و تالیفات، قومی اور سیاسی تحریکات اور تقریر و مواعظ کے میدانوں میں آپ کے شاگرد نمایاں خدمات سرانجام دے رہے ہیں؛ حضرت شاہ صاحبؒ کی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں، بہت بڑا ذخیرہ ابھی غیر مطبوعہ ہے. آپ کے فداکار شاگرد الحاج مولانا محمد میاں افریقی آپ کی تصانیف کی طباعت و اشاعت پر لاکھوں روپے خرچ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں. اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور علمی مقاصد کے لیے ان کے خزانے لبالب بھر دے اشاعتِ علم کے سلسلے میں اس نیک نفس انسان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں.

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کو صوبہ گجرات کی زمین نے اپنی طرف کھینچ لیا تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، حرارتِ دینی، جوشِ جہاد، استقلال و فداکاری، عزیمت و جانبازی، سادگی و تواضع، علم و عمل، زہد و تقویٰ، شجاعت و بہادری، نیکی و پرہیزگاری، سخاوت و فیاضی کا یہ ایک خزانہ تھا، جسے ۶ دسمبر ۱۹۵۷ء کی شب میں ہم سب نے زمین میں دفن کر دیا، وہ دیوبندی علوم کے جامع اور دیوبندی کمالات کے سرمایہ دار تھے، حق تعالیٰ نے پوری سخاوت کے ساتھ انھیں عظمتِ شخصیت، مقبولیت اور مرکزیت عنایت فرمائی تھی؛ جتنی معروف باکار اور سخت زندگی آپ گزار گئے، ہم جیسے ناکاروں کے لیے اس کا تصور بھی مشکل ہے. یہ واقعہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں سے صرف تین گھنٹے آپ سوتے تھے؛ بقیہ سارا وقت درس و تدریس اور دینی خدمات میں صرف ہوتا تھا. آخر وقت تک اپنے معمولات کے پابند رہے. انگریز کے مقابلے میں پہاڑ تھے؛ ایسا پہاڑ جو ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا، اپنے عقائد و مسلک میں ناقابلِ جنبش تھے. اپنی زندگی کے دسیوں سال جیلوں میں گزار دیئے. کوئی تکلیف ایسی نہ تھی؛ جو اپنے عقیدے کے لیے انھوں نے برداشت نہیں کی؛ خوف طمع و حرص آپ کو چھو کر بھی نہیں گیا، دین کے معاملے میں بے حد متشدد اور متعصب —— ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد

پچاس سال تن من اور دھن سے مصروف رہے، آزادی مل گئی، تو ایوان حکومت کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھا، اُن کے قدموں میں بیٹھنے والے وزیر و مشیر بن گئے، مگر اُنھوں نے اپنے بوریے سے باہر قدم نہیں نکالا زندگی کے آخری دس سال حضرت مرحوم کی مقبولیت اور محبوبیت کے عالم تھے، جدھر سے نکل گئے، ہزاروں مسلمان حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ تصوف و طریقت میں شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے علوم عقلیہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اور علم حدیث و فقہ میں شیخ العصر مولانا رشید احمد گنگوہی کے اور اخلاق و کردار میں اپنے اُستاد حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے صحیح جانشین تھے۔

میخانۂ چشت کا کشادہ دل ساقی، تصوف و طریقت کا امام وقت حدیث و تفسیر کا عالم باعمل، سخاوت و فیاضی میں فاتح دوراں، جرأت و شجاعت میں خالد بن ولید، عزم و استقلال میں اپنی مثال آپ دارالعلوم کی عظمت، جمعیۃ علما کی شان، اپنے شاگردوں کے امام، اپنے مریدوں کے شیخ اور معتقدین کے محبوب۔

حق تعالیٰ کارساز حقیقی ہیں، شخصیتیں بنانا اور انھیں ختم کر دینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، وہ چاہیں تو دارالعلوم کو پھر حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کو آپ سا صدر مل سکتا ہے۔ ورنہ بظاہر اسباب و بحالات موجودہ ان کی مثال دور دور تک کہیں نہیں ملتی اور علم و دیانت کی جو مسندیں وہ خالی کر گئے۔ اُن کا پھر سے آباد ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

مولانا فخر الدین مُرادآبادی

سبھوں کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے معتمد خاص اور حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو اپنے جانشین کی حیثیت سے بخاری شریف کے درس میں دارالعلوم میں مامور فرمایا۔ اس کی توقع کی جاتی ہے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس تقرر و انتخاب کو باقی رکھے گی۔ مولانا فخر الدین حدیث کے مشہور استاذ اور علمی خصوصیات میں منفرد ہیں۔ علمی دنیا آپ کے کمالات علمی پر اعتماد کرتی ہے۔ دارالعلوم کے وہ کثیر طلبا جنھوں نے اس سال کے شروع میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف کا درس شروع کیا تھا۔ اب حضرت کی وفات کے بعد مولانا فخر الدین صاحب ہی سے اپنی علمی توقعات رکھتے ہیں۔

حرفِ آخر

آج ملک، بیرونِ ملک میں حضرت مدنیؒ کے انتقال پُر ملال کے گہرے جذبات چھائے ہوئے ہیں، میں دیوبند کی پوری علمی برادری کو ان کے ایک بہت بڑے فرض کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، وہ فرض ہے ہمارے سب بزرگوں اور حضرت مدنیؒ کی زندہ یادگار دارالعلوم کے تحفظ و بقا کیلئے اس نازک مرحلے پر ہم سب کی پُرخلوص جدوجہد کا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام شاگردوں اور معتقدین کو سمجھ لینا چاہیئے، کہ حضرت مرحوم کی حقیقی یادگار دارالعلوم ہے۔ دارالعلوم اگر زندہ ہے، تو ہندوستان میں اسلامی علوم کا چراغ روشن ہے، دارالعلوم اگر زندہ ہے تو اُوپر کے سارے بزرگوں اور حضرت مدنیؒ کی یادگار زندہ ہے، جو شخص جہاں بھی ہے، اُسے دارالعلوم کی خیرخواہی کو اپنا مشن بنا لینا چاہیئے۔ حضرت مدنیؒ کے بعد دارالعلوم کے سلسلے میں ہم سب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوں۔

انگریزی دَور کے علماءِ ہند کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے، تو آج سے بہت پہلے نہ محض ہند بلکہ افریقہ اور ایشیا کے دیگر ممالک بھی استعماریت کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہوتے۔

علماءِ ہند اپنے آپ کو اسلامی احکام کی بقا اور ترقی کے لیے ذمہ دار سمجھتے تھے چنانچہ بقاءِ دین اور محافظتِ اسلام کے لیے نئی نئی تحریکیں اٹھاتے اور انھیں کامیاب بنانے کے لیے رات اور دن ایک کر دیا کرتے تھے شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جب دیکھا کہ دہلی میں اسلامی احکام کی جڑیں کمزور ہو رہی ہیں اور دینِ اسلام خطرے میں ہے، تو بعض مؤرخین کے قول کے مطابق شاہِ ایران کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، تاکہ عصمتِ اسلام سے کھیلنے والے استعماری عناصر سے ہندوستان محفوظ رہ سکے۔

آخر وہی ہوا، جسے شاہ صاحب کی دُور رس نظروں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا، آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے زمانے میں (ایسٹ انڈیا) کمپنی نے ہندوستان پر ناجائز دباؤ ڈال کر اسے اپنا تابع بنا لیا۔ ۱۰۸۱،۱۱۱م ۱۷۹۲ء میں بکسر کے میدان میں اسلامی جمعیت کو شکست دینے کے بعد تو ان کے لیے میدان بالکل ہی صاف ہو گیا۔ عوام و خواص پر مظالم توڑنے کے ساتھ ساتھ خلعتِ مُغلیہ کا بھی مذاق اُڑانے لگے، حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے منیجر نے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں ارکانِ سلطنت پر دباؤ ڈالا کہ ہماری اِس قرار داد کو منظور کر دو، جس کے ۳ جز ہیں۔

۱. مخلوق خدا کی ہوگی۔ ۲. ملک بادشاہ کے قبضے میں ہوگا۔ ۳. اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی کا جاری کیا جائے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو اس کی خبر ہوئی تو بادشاہ کی حمایت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس مطالبے کی تردید کے لیے آپ نے عوام کو ... لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو ۱۲۱۸ھ میں ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دے دیا اور اعلان کر دیا کہ تمام مسلمانوں پر انگریزوں سے جہاد کرنا ضروری ہے۔ یہ فتویٰ آج بھی فتاویٰ عزیزیہ کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی زبان کا یہ رسالہ ۱۶ / ۱۷ صفحات پر دہلی سے شائع کیا جا چکا ہے۔ عوام نے علماء کے دوش بدوش چل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا اور تحریک

آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن امداد کی۔ اس جنگ آزادی کا ہر ہر
سپاہی اپنے دین کا پرستار اور مذہب کا فدائی تھا۔ بیک وقت اسلامی
احکام اور کمپنی کے فرمان کا بجا لانا محال تھا۔ جس وقت سید احمد بریلوی
نے ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کی آواز اٹھائی، تو
تقریباً دس ہزار ہندو اور مسلمانوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا، آپ نے
اس ہندوستانی لشکر کا رخ پنجاب کی طرف پھیر دیا، کیونکہ فرقہ
پرست اور تنگ نظر قوتوں کی سرکوبی کے بغیر انگریزوں کی غلامی سے نجات
محال تھی۔ پنجاب کی مہم سے فراغت اور مفتوحہ بلاد میں احکام الٰہی کے نفاذ
کے بعد ابھی آپ نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ انگریزوں کے جور و
استبداد کا ہاتھ بڑھا اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت کے سرپرست اور
دستِ راست شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد
بھی علمائے ہند کی تحریکِ آزادی اندر ہی اندر زور پکڑتی رہی۔ چنانچہ انقلاب
۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں علماء کا گروہ سب سے آگے تھا۔ جو نہ تو قواعدِ جنگ
کا حقہٗ واقف تھا، نہ اس کے پاس جدید آلاتِ حرب کی فراوانی تھی، اس
کے باوجود بھی نہ محض میدان میں اترا، بلکہ مجاہدینِ آزادی کی قیادت بھی کی۔
تاریخ انقلاب نے علمائے ہند کو ایک اور مخصوص موقع دیا۔ وہ تھا، تھانہ بھون
اور شاملی (جو دہلی سے نوّے میل کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہیں)
کا حادثہ، یہیں سے زوال حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر
مکی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب
گنگوہی تھے، میسرہ اور میمنہ پر دوسرے علماء مقرر کئے گئے۔ جن کے اعلام کے
نیچے مجاہدین کی بڑی تعداد جمع ہو رہی تھی، جو بھی آتا اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی
قدیم آلۂ حرب ضرور لاتا۔ لیکن ایمان کی روشنی انگریزوں کے اسلحہ جات جدیدہ
اور مجاہدین کے آلات قدیمہ کے ساتھ مساوات قائم کر دیتی۔ آخر مجاہدین
آزادی نے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں کو شکست فاش دے
کر پیچھے ہٹا دیا اور تھانہ بھون میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کر لی۔

اس کے بعد سہارنپور سے انگریزی فوج مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاملی جانب
روانہ ہوئی۔ ادھر راستے میں ہی شاملی کے پاس مجاہدین نے اپنی کمین گاہ
بنائی جس کی قیادت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرما رہے تھے
درختوں کی آڑ میں چھپ کر انگریزی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ اب کی دفعہ
بھی میدان مجاہدین کے ہاتھ لگا اور جس کے نتیجے میں بہت سے ہتھیار اور
مالِ غنیمت ہاتھ آئے اور مجاہدین نے آگے بڑھ کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔
اب مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے اور انگریزی فوج کو شکست دینے کیلئے
ہر اس چیز کا استعمال کیا جو وقت پر ہاتھ آگئی حتیٰ کہ مشین گن اور برستی
ہوئی گولیوں کا کامیاب جواب لاٹھی اور پتھر سے دیا۔ اسی اثناء میں خبر ملی
کہ دہلی کی جنگ ناکام ہوگئی اور مجاہدین پسپا ہو گئے، جسے سن کر جوش
ٹھنڈے پڑنے لگے۔ علماء نے جنگ کا جاری رکھنا خلافِ مصلحت سمجھا
اور میدان چھوڑ دیا، بہت سے مجاہدین شہید ہوئے، بہت سے روپوش
ہوگئے۔ انگریزوں کو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو گرفتار کرنے میں کامیابی ہوئی
جنہیں چھ ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا، لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو
نہ پا سکے، آپ اس وقت ظاہر ہوئے جب انگریزوں نے باغیوں کو عام
معافی دے دی، تاکہ اب جہاد کی ابتداء دوسرے کامیاب طریقے سے
کی جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایک جید عالمِ دین ہونے کے
ساتھ ساتھ ایک مردِ مجاہد بھی تھے، جنھوں نے مجاہدین کی قیادت بھی کی۔
انگریزوں سے مقابلہ بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی لیے پیدا کیا تھا کہ
جنگ و جدال کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھی مسلمانوں کی قیادت کریں، اور
صلح و امان کے زمانے میں بھی۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد آپ نے اپنی بقیہ
عمر دیوبند میں گزاری، جہاں آپ کے اعزا و اقارب بھی موجود تھے۔ اسی
قصبے میں آپ نے ایک دینی مدرسے کی داغ بیل بھی ڈالی۔
اس زمانے کے عام علماء کی عام پالیسی یہی تھی کہ جہاں تک

ہوسکے، دینی تعلیم پر زور دیا جائے اور اسے عام کیا جائے، جو مغربی تعلیم سے الگ تھلگ فقط علوم عربیہ کی حامل ہو۔ اس نظریئے پر سختی سے عمل کیا گیا اور مغربی نظریئے کو ٹھکرا دیا گیا، علماء کی نظر میں ہر وہ چیز کھٹکتی جو انگریز پیش کرتے اور ہر اس شے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے جسے سامراج یورپ کی منڈیوں سے خرید لاتے، تعلیم، تقلید، لباس کے علاوہ ہر اس چیز سے نفرت کرتے، جس میں مغربیت کی ذرا سی بو محسوس ہوتی، جو ان کے تمدن و معاشرت، تہذیب و کلچر سے مشابہ ہوتی، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ انگریزوں سے بالکل کنارہ کش رہیں، تاکہ ان کو اس کا موقع ہی نہ ملے کہ اسلام اور مسلمانوں میں اپنے خیالات و افکار ڈال کر ایمان کو متزلزل کر سکیں۔

اسی نظریئے کو لے کر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح اور ان کے ہم خیال علماء نے دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو آج بھی موجود ہے اور مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایک انار کے درخت کے نیچے جو دروازے سے متصل مسجد کے صحن میں اب تک موجود ہے۔ ایک دینی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی۔ جس کا کل سرمایہ ایک مدرس ملا محمود اور ایک طالب علم محمود حسن تھا، یہی طالب علم آگے چل کر شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔ انھوں نے پہلی عالمگیر جنگ سے کچھ پہلے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک بڑے اونچے پیمانے پر اٹھائی تھی جس کی وجہ سے انگریزوں نے انھیں قید کر کے مالٹا بھیجا، آپ وہاں سے جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان واپس آئے، اس کی عظمت و شخصیت کا تقاضا ہے کہ اس کا نام آئے تو ہم تھوڑی دیر اپنی جسمانی مشینری کو روک کر اس کے ان آثار علمیہ اور دینیہ پر نظر کریں جو سرزمین ہند پر بکھرے ہوئے ہیں اور جب تک مسلمان رہیں گے انھیں باقی رکھیں گے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں نانوتہ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں عام ہے کہ کوئی شخص اپنے نام سے اتنا زیادہ متعارف نہیں ہوتا، جتنا کہ اپنے گاؤں، قصبے، شہر یا ضلع کی نسبت سے مشہور ہو جاتا ہے۔ نانوتہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور سہارنپور کی مغربی حدود میں واقع ہے اور دہلی سے جانب شمال ۱۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے۔ بچپن ہی سے علو مرتبت اور رفعت شان کے خطوط پیشانی پر ابھرے ہوئے تھے، حصول علم کے لیے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں سے علوم شرعیہ میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار و خیالات سے بھی خوب واقفیت حاصل کی، تکمیل تعلیم کے بعد ۲۵ برس کی عمر میں انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر باغیوں کی قیادت کی۔ انقلاب آزادی کے ناکام ہونے کے بعد آپ روپوش ہو گئے۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھنے کے لیے منظر عام پر آئے۔ اس مبارک کام میں مخلصوں نے آپ کا ہاتھ بٹایا، آپ نے محض دارالعلوم دیوبند ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے ہم مشرب ساتھیوں کو لے کر شہر شہر میں دینی مدارس قائم کرنے کی کوشش کی، آپ کے نام سے ہندوستان میں دو مدرسے بہت مشہور ہیں، مدرسہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ قاسمیہ مراد آباد۔ آپ تمام مسلمانوں میں افکار اسلامیہ کے مجدد کی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے فضلا اپنے آپ کو آپ کی ذات کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے محمد قاسمی، عبداللہ قاسمی۔

ان آثار علمیہ کے علاوہ آپ نے بہت سی قیمتی کتابیں چھوڑی ہیں جن کے مضامین ادق اور عبارتیں بہت اونچی ہیں، بڑے بڑے علماء عرق ریزی کے بعد بھی مشکل ہی سے ان کے مطالب کی تہہ تک پہنچتے ہوں گے۔ آپ کے خلف رشید حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند، ہندوستان کے مشہور ترین علماء و خطباء میں

شمار کئے جاتے ہیں، ہندوستان کی صحافت اسلامیہ نے آپ کو حکیم الاسلام کا خطاب دیا ہے، جیسے کہ آپ کے دادا کو حجۃ الاسلام کا خطاب دیا گیا تھا۔

۱۲۹۷ھ، ۱۸۷۹ء میں مولانا نانوتوی کی وفات ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر پچاس سال سے بھی کم تھی۔ آپ دارالعلوم کے قریب جانب شمال و مغرب ایک بسیط مقبرے میں مدفون ہیں، جہاں آپ کے پہلو میں آپ کے بعد دو عظیم عالم و مجاہد، حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (شیخ الاسلام) جن کا وصال دسمبر ۱۹۵۷ء میں ہوا ہے، آرام فرما رہے ہیں، وہ مکتب جس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے رکھی تھی، آج ایک صدی گزرنے سے پہلے ہی ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مسجد جھتہ سے متصل ۲۰ فدان (ایک فدان چار سو گز کا ہوتا ہے) کی لمبائی چوڑائی میں پھیلی ہوئی جامعہ کی عمارت اپنی عظمت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

۱۲۹۲ھ، ۱۸۷۵ء میں اس جامعہ کا تعمیری کام شروع ہوا۔ مختلف ادوار سے گزرتا ہوا، آج وسعت کے اس مرتبے پر پہنچ چکا ہے کہ اس کے اندر خود اپنی درسگاہیں بھی ہیں، طلبہ کے قیام کے لیے کمرے بھی، صنعت و حرفت کے مختلف ادارے بھی ہیں، مطبخ کے لیے عمارتیں بھی۔

۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۷ء میں طلباء کی تعداد ۱۳۰۰ سو تھی، جن میں سے ۱۱۰۹ طلباء علوم دینیہ عربیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور بقیہ ابتدائی اور فارسی تعلیم پا رہے تھے، جن میں پارسی زبان، حفظ، ناظرہ اور تجوید کی تعلیم ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر طلباء کی ضروریات زندگی مثلاً طعام، لباس، کتابیں، علاج اور سکونت کا کفیل دارالعلوم ہی ہے۔

گزشتہ برس مدرسہ کا بجٹ چھ لاکھ روپے تھا۔ ایک سو چالیس ماہرین فن جامعہ کی مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں، جن میں اکتالیس ماہرین فن اساتذہ اور بقیہ دوسرے مختلف دفاتر کے سرگرم اور مستعد کارکن حضرات، ان کی تنخواہیں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہیں لیکن اسے تبرک اور تبرعات مسلمین سمجھ کر اسی پر قناعت کرتے ہیں، کیونکہ یہ خطیر رقم مسلمانوں کے چندے سے جمع ہوتی ہے، دارالعلوم کیا، ہندوستان کے تمام مدارس دینیہ انہیں مسلمانوں کی نظر عنایت سے چلتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کو اپنی دینی و علمی شہرت، اخراجات اور کثرت طلاب میں، تمام مدارس دینیہ پر فوقیت حاصل ہے۔ دارالعلوم کی امداد و معاونت میں، امیر و غریب، فقیر، مالدار سبھی برابر کے شریک ہوتے ہیں؛ روپیہ، پیسہ، کپڑا، غلہ حتیٰ کہ وہ لکڑی جو مطبخ میں جلانے کے کام آتی ہے، وہ بھی کبھی کبھی ارباب خیر ہی مہیا کرتے ہیں اور کتابیں کچھ تو مختلف مطبعات اور مکتبات سے آتی ہیں اور کچھ مدرسہ خریدتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے کارنامے ایسے ہیں (جن کی بنا پر وہ شکریے کے مستحق ہیں) کہ بلاد اسلامیہ میں بھی ان کی مثال ملنی مشکل ہے، کیونکہ ان مدارس دینیہ کی دیکھ بھال کے ساتھ مساجد کی جملہ ضروریات پوری کرتے ہیں، ناانصافی ہوگی اگر اس بات کی طرف اشارہ نہ کیا جائے کہ برما اور جنوبی افریقہ کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ممالک کے مسلمان بھی دل کھول کر اس کارِ خیر میں شریک ہوتے ہیں۔ دارالعلوم کے ساتھ ساتھ دوسرے مدارس کی بھی امداد کرتے ہیں، دارالعلوم کا طریقہ تعلیم وہی ہے، جو ہندوستان کے عام دینی مدارس کا ہے۔ جب کہ دارالعلوم ان تمام مدارس میں مقتدا اور پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے، جو درس نظامی میں تغیر و تبدل پر آمادہ ہوتا پہلے دارالعلوم کو دیکھتا ہے۔ اس جامعہ کے ممبران مجلس شوریٰ اور ماہرین تعلیم حضرات نصاب میں تبدیلی کے حامی نظر آتے ہیں، لیکن وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں تعلیمی نصاب میں تبدیلی سے پہلے دارالعلوم میں ہی تغیر و تبدل نہ کرنا پڑ جائے۔

دارالعلوم کے نصاب کی بنیاد محافظت دین اور مغربیت کی مخالفت پر قائم ہے۔ اسی لیے درس نظامی ان کے لیے کافی ہے، کیونکہ

اس نصاب میں حفاظتِ دین کی صلاحیت ہے اور علوم شرعیہ کی بھی عربی لغت، منطق، فلسفۂ قدیم کے ساتھ ساتھ تفسیر، احادیث، فقہ بھی داخلِ نصاب ہیں، ہندوستان میں فضلاء دارالعلوم کا وہی مرتبہ ہے جو مصر و دیگر بلادِ اسلامیہ میں فارغین جامعہ ازہر کا۔ شیخ محمد عبدہٗ کے زمانے سے کچھ قبل ہوتا تھا۔ میں جب سے دارالعلوم دیوبند گیا، وہاں کے علماء سے تعلیمی گفتگو کرتا اور اپنا خیال ظاہر کرتا رہا کہ آج کے ماحول کا تقاضا ہے کہ جدید تعلیم کو بھی علوم دینیہ و عربیہ کے دوش بدوش لے چلنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں مجھے بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں، لیکن میں نے صبر و ضبط سے کام لے کر مجلس شوریٰ کے ممبروں سے تعلق پیدا کیا، جن میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیت علماء ہند و ممبر پارلیمنٹ، مولانا محمد میاں صاحب سیکرٹری جمعیت علماء ہند، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدیر ندوۃ المصنفین دہلی قابلِ ذکر ہیں۔

یہ حضرات مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے ہم خیال ہیں، جو نصاب میں تبدیلی کے قائل ہیں، لیکن قدامت پسندوں کی بغاوت سے ڈرتے ہیں۔

میری دو سالہ جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممبرانِ مجلسِ شوریٰ نے عربی کی جدید علمی کتابوں کے داخل کرنے پر آمادہ ہو گئے اور مؤتمر اسلامی اور جامعہ ازہر کو ان کتابوں کے بارے میں لکھا، جسے مجلس شوریٰ نے پاس کیا، جامعہ ازہر اور مؤتمر سے میری گزارش ہے کہ دارالعلوم کی اس دعوت پر لبیک کہیں اور جلد از جلد مطلوبہ کتابیں روانہ کریں۔ مجھے ہند اور بلادِ اسلامیہ کے ایک شہرت یافتہ عالم استاذ ابوالحسن علی ندوی نے بتلایا کہ ہندوستان کے مدارسِ دینیہ اور آثارِ علمیہ کی تاریخ میں یہ تغیر و تبدل ایک عظیم حادثہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند ہند و پاک اور بلادِ شرقیہ کا سب سے بڑا دینی مدرسہ ہے۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ، پاکستان، افغانستان، برما، سیلون، ملایا، تبت اور مشرقی افریقہ کے طلباء کی ایک بڑی جماعت تعلیم پا رہی ہے۔

۱۹۵۵ء میں سید انور السادات جب ہندوستان کے دورے پر گئے تھے، تو دارالعلوم بھی تشریف لے گئے تھے۔ تو مؤتمر کی جانب سے ۲۰ ہزار روپے کا عطیہ بھی دارالعلوم کو پیش کیا گیا۔ میرے قیام دیوبند کے زمانے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے دارالعلوم کے علمی و وطنی کارناموں سے متاثر ہو کر طواف زیارت کیا۔ ۱۹۵۷ء میں میں نے مؤتمر کے نام سے مصر، ازہر اور مؤتمر اسلام سے متعلق انگریزی اردو کی کتابیں صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیں۔ فروری ۱۹۵۸ء میں شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ نے دورۂ ہند کے وقت دارالعلوم کی زیارت کی، میں نے ان کی خدمت میں بعثہ کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا اور قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ اور مصر و اسلام سے متعلق انگریزی کتب بطور ہدیہ پیش کیں۔ شاہ صاحب نعرۂ تکبیر کی گونج میں اپنے سر پر رکھا اور بوسہ دیا۔

دارالعلوم سے متعلق ظاہر شاہ کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ ہے ۱۳۵۸ھ میں مہتمم دارالعلوم جب افغانستان تشریف لے گئے تھے، تو ایک خطیر رقم شاہ افغانستان نے عنایت کی تھی، جس کے صرف سے دارالعلوم کا عظیم الشان مکان بنایا گیا، جو باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے۔ اسی میں صرف عربیہ کے نام سے جدید عربی ادب کا شعبہ کھولا گیا، جس میں مؤتمر اسلامی کی عنایت کی ہوئی جدید علمی، ادبی، تاریخی، ثقافتی کتابیں ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

لہ شیخ عبدالمنعم صاحب کے اس خیال سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے، کہ حضرات قدامت پسندوں کی مخالفت سے ڈرتے ہیں بلکہ ہمارا خیال اور تجربہ یہ ہے کہ یہ حضرات ہی، جن کا حوالہ اس مقام پر دیا گیا ہے، اگرچہ تبدیلی اصلاح و ترمیم نصاب کے حامی ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ نصاب میں کوئی ایسا تغیر ہو، جس سے دارالعلوم کی اصل روح متاثر ہو جائے، یہ جدید ضرورتوں کے ساتھ قدیم محاسن کو بھی نصاب میں باقی رکھنے کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے برابر کوشش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

۱۸۵۷ء کے بعد

دینی تعلیم کے لئے

حضرت نانوتویؒ کا لائحہ عمل

مولانا عبدالحق غازی پوری
دارالعلوم دیوبند

انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑا نازک دور تھا۔ برطانوی اقتدار ہندوستان کے طول و عرض میں اپنی بنیادیں مستحکم کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ انگریزوں نے قدیم تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و فنون کو مٹا کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد قائم کی اور قدیم تعلیم کے بجائے انگریزی تعلیمی اسکیم سرکاری طور پر رائج کر دی گئی۔ ان حالات میں سخت اندیشہ تھا کہ اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ خدانخواستہ کہیں اسلامی علوم بھی رخصت نہ ہو جائیں۔ علمائے وقت میں اس خطرے کی شدت کا سب سے زیادہ احساس حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کو تھا۔ حضرت نانوتویؒ، ۵۷ء کی جنگِ آزادی میں برطانوی اقتدار پر ایک زبردست ضرب لگا چکے تھے جو معرکۂ شاملی کے نام سے تاریخ کا ایک روشن عنوان ہے۔ انگریزی زبردست قوت کے مقابلے میں اگرچہ یہ مہم ناکامی پر منتج ہوئی اور ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا۔ مگر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ اور فکر و نظر نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے اس سپاہی کی طرح جو میدانِ جنگ سے ہٹ کر نئے مورچے کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تعلیمی میدان کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں دو مقصد پیشِ نظر تھے، پہلا مقصد برطانوی سامراج کا ہندوستان سے انخلاء، دوسرا مقصد مسلمانوں کو دینی مدرسے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء دیوبند میں قائم ہوا، جو آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے ایشیا کا جامعہ ازہر سمجھا جاتا ہے۔ اور جس سے ہزاروں تشنگانِ علوم سیراب ہو کر نہ صرف ہندوستان، بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، درس و تدریس، وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت، سیاست و خطابت اور حکمت و صحافت کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے، جس میں فضلائے دارالعلوم دیوبند کی خدمات نمایاں ترین نہ ہوں۔

دیوبند کی طرح حضرت نانوتویؒ نے مراد آباد اور گلاؤٹھی وغیرہ مختلف مقامات میں مدارسِ عربیہ قائم فرمائے۔ ان مدارس سے بھی ان کے فضلاء کی ایک بڑی تعداد اطرافِ ملک میں پھیلی ہوئی ہمہ تن دینی خدمات کی انجام دہی میں مشغول ہے،

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ مدارس اوقاف کے بجائے عوامی چندوں پر قائم کئے گئے تھے۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ مدارس کے پرانے نقشے میں نئے رنگ بھرے جائیں جو وقتی حالات کے مطابق اور ان سے

ہم آہنگ ہوں، اس کے لیے حضرت نانوتویؒ نے جو دستور العمل تجویز فرمایا ہے، وہ درحقیقت تعلیمی اداروں کے لیے بنیادی دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہی وہ دستور العمل ہے جس کے محور پر آج ہند و پاک کے تمام مذہبی ادارے گردش کر رہے ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔ یہ دستور العمل آٹھ دفعات پر مشتمل ہے۔

۱. پہلی دفعہ میں زیادہ سے زیادہ چندے کی فراہمی پر زور دیا گیا۔

۲. دوسری دفعہ میں اس امر پر توجہ دلائی گئی ہے کہ طلباء کے خورد و نوش کے مسئلے کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

۳. تیسری دفعہ مدارس کے انتظامی امور سے متعلق ہے۔ اس میں منتظمین کے باہمی اتحاد و یک جہتی اور اخلاص کی تلقین کرتے ہوئے تنبیہ کی گئی ہے کہ دوسروں کے مخلصانہ مشورے کو محض اپنی بات کی پچ کے لیے رد نہ کیا جائے۔ اگر اس امر پر عمل نہ کیا گیا تو مدارس کا بقاء اور ان کی زندگی دشوار ہو جائے گی۔

۴. چوتھی دفعہ میں اساتذہ کے متفق المشرب ہونے پر زور دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کی گئی ہے کہ اساتذہ کو خود بینی اور دوسروں کے درپے آزار نہ ہونا چاہیے، ورنہ مدارس کے لیے یہ چیز موت کا پیغام ثابت ہوگی۔

۵. پانچویں دفعہ میں کتابوں کی مقررہ خواندگی پر زور دیا گیا ہے، اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو مدارس کی تعلیمی روح مضمحل ہو جائے گی۔

۶. چھٹی دفعہ چندے سے متعلق ہے۔ اس میں بطور خاص اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دولت مندوں کے چندوں کے بجائے غریبوں کے چندے کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ مستقل آمدنی کے بجائے ایک قسم کی بے سرو سامانی زیادہ مفید ہوگی، اس میں خدا کا خوف و رجاء اور رجوع الی اللہ کا سلسلہ جو اصل دولت ہے، ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔

۷. ساتویں دفعہ میں حکومت کی امداد سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے۔

۸. آٹھویں دفعہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت ہے جو اپنے چندے سے شہرت اور ناموری کے امیدوار نہ ہوں۔

ذیل میں اس دستور العمل کا پورا متن ملاحظہ فرمائیں۔

> دارالعلوم دیوبند و دیگر مدارس عربیہ کے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص دست مبارک کے لکھے ہوئے چند اصولوں کے عکس کی نقل

وہ اصول

جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں

۱. اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں، خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲. ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳. مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسے کی خوبی اور اسلوبی ہو..... اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالف رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو اس مدرسے کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے تامل نہ (باقی)

تا اَبد اُونچا رہے گا ان کی عظمت کا نشاں

حافظ نور محمد انور

آشناؤں نیں سمجھے ان ہستیوں کی داستاں — کہ جنہوں نے دین کی تبلیغ میں ہے وقف جاں
گلشن ہستی میں تھے یہ لوگ بے شک کامراں — عالمان دین میں یہ لوگ تھے ذی عزوشاں

سب کے سب تھے نیک سیرت اور تھے عالی دماغ
جل رہے ہیں، اب بھی جن کے علم کے روشن چراغ

ان کے سینوں میں نہاں تھا، عشق ختم المرسلینؐ — ان کے چہروں سے عیاں تھا، جذبۂ صدق و یقیں
ان پہ تھا اللہ راضی اور شفیع المذنبینؐ — شک نہیں اس میں ٹھکانا ان کا ہے خلد بریں

قریہ قریہ جاکے یہ تبلیغ دیں کرتے رہے
عمر بھر سینوں میں دین حق کا دم بھرتے رہے

نور ایمانی سے ان کا دل سدا روشن رہا — ہر گھڑی اللہ کا ان پر رہا لطف و عطا
جب تلک زندہ رہے ان کا یہی شیوہ رہا — چارسو پھیلے جہاں میں دین محبوب خدا

ان کے زریں کارناموں کی ہے شاہد کائنات
خدمت دین نبیؐ میں ان کی گزری ہے حیات

راہ حق میں اہل باطل کے ستم سہتے رہے — کوہ استقلال بن کر بات حق کہتے رہے
درد ملت کا سدا قالب میں دم بھرتے رہے — دین قیم پر فدا یہ مال و جاں کرتے رہے

پرچم توحید کو ہر آن رکھ کر سربلند
دونوں عالم میں یہی حضرات ٹھہرے ارجمند

قاسم و محمود و احمد اور انور شاہ بھی — حاجیؒ امداد بھی الیاس و اشرف شاہ بھی
یوسف و احمد علی بھی اور بخاری شاہ بھی — حضرت رائے پوری بھی مدنی عالم شاہ بھی

دین و ملت کے بلاشک تھے حقیقی پاسباں
تا اَبد اونچا رہے گا ان کی عظمت کا نشاں

سرخرو ہوکر ہوئے سب راہیٔ ملک عدم — ان پر ہر لمحہ رہا ہے حق تعالیٰ کا کرم
قبر میں ان کو نہ پہنچے گا گزند حق کی قسم — ان کو خوف آخرت کا کوئی نہیں ہے فکر و غم

عالم دین خدا تھے، عاشق خیر الانامؐ
ان کی ارواح مبارک کو ہزاروں ہوں سلام

تاریخ کے دوباب

○ سقوط بغداد سے قیام دارالعلوم تک

از حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ

بعد الحمد والصلوٰۃ

اھیم بلیلیٰ ما حییت وان امت
اوکل بلیلیٰ من یھیم بھا بعدی

میں نے دیکھی ہیں غزالوں کی نگاہیں
میں نہیں حجلہ نشینوں کی نظر کا قائل

علامہ شبلی نعمانی ؒ نے اپنی کسی کتاب میں ایک سوال اٹھایا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے، جس کا خلاصہ میرے لفظوں میں یہ ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں مرشدانِ طریقت اور اربابِ معرفت مشائخ کی ایک بڑی کھیپ میدان میں آگئی تھی، حضرات صوفیاء کرام کثیر تعداد میں سامنے آئے اور اسی دور سے مشہور سلاسل طریقت کا آغاز ہوا

جواب: انسان کی فطری خصوصیت ہے کہ مصیبت کے وقت اسے خدا بہت یاد آتا ہے۔ اس میں تضرع اور انابت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ واذا مسہ الشر فذو دعاء عریض۔ یہی معاملہ امت مسلمہ کے ساتھ ساتویں صدی ہجری میں پیش آیا۔ تاتاریوں کی چیرہ دستیوں اور تباہ کاریوں کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بالعموم خشیت الٰہی انابت اور خشوع خضوع کی کیفیت پیدا ہوئی، اور پھر اللہ نے اپنے اقبالِ مجرم مخلوق کی خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر فرماتے ہوئے اس کی اشک شوئی اس شکل میں کی کہ رشد و ہدایت کے درخشندہ تارے اور علم و معرفت کے نیر تاباں پیدا کر دیئے۔

علامہ شبلی ؒ خود کوچۂ طریقت کے راہی نہیں ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس منزل کے کوئی سالک ان کی رائے سے سو فی صد اتفاق نہ کر سکیں، لیکن بہرحال اسے غلط بھی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اگر واقعات اور حقائق کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ آیئے ایک سرسری نظر تاریخ کے اس باب پر ڈال لیجئے۔

فتنۂ تاتار

چھٹی صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا طوفان صحرائے گوبی سے اٹھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ابر سیاہ کی مانند ترکستان سے لے کر چین اور روس تک پھیل گیا، چنگیز خان جہاں سے اپنی فوج لے کر

گزرتا تھا، خون کی ندیاں بہاتے چلا جاتا تھا، وہ ظالم ہرات کے شہر میں پہنچا تو اس کی ایک لاکھ آبادی میں سے ساٹھ ہزار کو اس نے تہ تیغ کیا، بلخ اور سمرقند کی پوری آبادی کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

مشہور محدث امام مسلم کے مولد و مسکن شہر نیشاپور کی کیفیت سُنیئے۔
اس کے محاصرے کے دوران منگول سردار کا ایک بیٹا مارا گیا۔ بس پھر کیا تھا، نیشاپور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ تمام انسانوں کو قتل کر دیا گیا۔ جانوروں کو ذبح کر دیا گیا۔ پورے شہر کا اثاثہ جمع کر کے اسے آگ لگا دی، فلک بوس عمارتوں کی بنیادیں تک کھود ڈالیں، مکانوں کو ڈھا کر وہاں ہل چلا دیئے

عروس البلاد بغداد جو اس وقت عباسی سلطنت کا پایۂ تخت تھا ۶۵۵ھ میں چنگیز کے پوتے اور جانشین ہلاکو خاں نے اُس کا محاصرہ کیا بدقسمتی سے بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم کا بدطینت اور بدنہاد وزیر ابن علقمی ہلاکو خاں سے مل گیا[1] مرتا کیا نہ کرتا، حالات سے مجبور ہو کر خلیفہ نے اپنی فوج اور شہریوں کو ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ ہلاکو کے حکم سے منگولوں نے شہر کو تاخت و تاراج کیا۔ انسان نما درندوں نے کئی روز تک شہری آبادی کا قتل عام جاری رکھا، بغداد کی سڑکیں اور گلیاں خون کی ندیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو اور مدارس میں علماء و طلباء تک کو قتل کیا گیا، قبروں سے علماء و رؤسا کی ہڈیاں تک نکال کر جلا دی گئیں۔

خود خلیفہ کو آہنی سلاخوں سے پٹوایا گیا اور پھر اُسے کھولتے ہوئے چولہے کے تغار میں ڈال کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ ناز و نعمت سے پلی ہوئی عباسی مخدرات کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور ان سے وحشیانہ سلوک کیا گیا، خلفائے بغداد کے صدیوں کے جمع کئے ہوئے علمی ذخائر کو نذرِ آتش یا دریا بُرد کر دیا گیا۔

وہ رحمٰن و رحیم اللہ جس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے جو توبہ و استغفار کے بعد گنہ گار بندوں کی سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے، جو فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی بستیوں پر گناہوں کی پاداش میں وبائی امراض مسلط کر دیتا ہے، لیکن پھر مرنے والوں کی موت کو شہادت کا درجہ دے دیتا ہے۔ (المطعون شہیدٌ) حدیث، اگر وہ مہربان خدا ایسے ایسے روح فرسا حوادث اور محشر خیز سوانح کے بعد سسکتی ہوئی انسانیت اور فغاں بلب مخلوق کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے، تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اصحاب خرقہ و خلافت کی شکلوں میں ائمۃ الہدیٰ کی ایک بڑی جماعت کی منصۂ شہود پر آئی۔ ان کے فیوض و برکات نے شکستہ خاطر اور رنجیدہ انسانوں کو مومیائی مہیا کی، ان کی تربیت باطنی نے اُجڑے دلوں کی دُنیا کو پھر سے آباد کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مندرجہ بالا تلاطم خیز واقعات قارئین کو سنائے گئے ہیں، وہاں کچھ مردانِ حق آگاہ کے حالات بھی بطور نمونہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں۔

(۱) حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

(وفات — ۶۳۲ھ)

آپ سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ہیں، نسباً صدیقی ہیں، بغداد میں حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی، جامعہ نظامیہ بغداد میں تدریس کی خدمت سرانجام دیتے رہے، پھر بغداد ہی میں ان کا افادۂ باطنی کا سلسلہ شروع ہوا، دربارِ خلافت میں اُن کا بڑا احترام تھا، ان کے علم و فضل اور رُشد و ہدایت کا شہرہ دُور دُور

---

[1] ابن علقمی نے خلیفہ کو یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ، ہلاکو خاں سے صلح کر لیجئے، وہ اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دینا چاہتا ہے۔ اس سے آپ کا تعلق ایسا ہی رہیگا جیسا کہ سلجوقیوں سے رہا ہے، آپ چل کر اس سے بات کیجئے، چنانچہ خلیفہ اعیانِ مملکت، علماء و مشائخ وقت کو ہمراہ لے کر گیا، ہلاکو نے سب کی گردنیں کٹوا دیں۔

(حیاۃ الحیوان دمیری ص۹۹/ج۱)

تک پھیل گیا۔ شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدیؒ، پند نامہ کے مصنف شیخ فرید الدین عطارؒ، خواجہ حافظ شیرازی کے پیر طریقت شیخ نجم الدین کبریٰؒ، سید جلال الدین تبریزیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ جیسے کبار مشائخ آپ کے خلفاء یا استفادہ کرنے والوں میں شامل ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے ایک دنیا کو بدل ڈالا

۲ خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ

وفات: ۶۳۳ ہجری

سنجر میں ولادت ہوئی، سمرقند اور بغداد وغیرہ میں ظاہری اور باطنی علوم حاصل کئے۔ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو کر اپنے شیخ کے حکم کے مطابق ہند کے کفرستان میں پہنچے، ملتان، لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے اور یہاں اسلام کا چراغ روشن کر کے بیٹھ گئے۔ راجپوتانہ میں حضرت شیخؒ کا اسلام کی تبلیغ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، راجپوت راجہ اور ہندو ٹھاکروں نے مخالفت میں کوئی کسر نہ چھوڑی جادو منتر سے بھی کام لیا لیکن حضرت خواجہ استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹ گئے۔ کفر کو شکست ہوئی اور اسلام کو فتح، لاکھوں ہندو آپ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور راجپوتانہ کا علاقہ کلمۂ توحید سے گونج اٹھا۔ اگر برصغیر کے باشندگان پر ایک طرف محمد بن قاسم کا احسان ہے جو اموی دور سلطنت میں اسلام کا پرچم لے کر سندھ کے راستے سے داخل ہوا اور وسط پنجاب تک اسلام کا کلمہ پہنچا دیا تو دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ کے سید الطائفہ حضرت اجمیریؒ کا یہاں کے مسلمانوں پر احسان عظیم ہے کہ اقلیم روحانیت کے اس تاجدار نے کایا ہی پلٹ دی۔ پھر آگے ان سے وہ سلسلۃ الذہب چلا، جس کا ایک ایک دانہ گوہر آبدار اور دُر بے بہا تھا۔ آپ کے خلیفۂ ارشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ۔ (وفات ۶۳۴ھ) نے آپ ہی کے حکم سے دہلی میں قیام فرمایا اور تزکیہ و اصلاح کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان کے بعد ان کے خلیفۂ اجل حضرت بابا فرید گنج شکر بزرگ (وفات ۶۶۴ھ) نے اجودھن کو اپنا مسکن بنایا اور یہاں کے باسیوں کو توحید کا گیت سنایا۔ بابا صاحبؒ کے سب سے بڑے خلیفہ سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۷۲۵ھ) ہیں..... ان بزرگوں کے علاوہ ملتان اور اوچ کی سرزمین جن کبار اولیاء سے اٹی پڑی ہے، ان کے تذکرے اور حالات تو بجائے خود ماخذ ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ بہرصورت اگر کوئی چاہے تو سوانح اور تذکروں کے سمندر میں گھس کر ان جواہر ریزوں کا پتہ لگالے، جو تاتاریوں کے لائے ہوئے قیامت خیز مظالم کے بعد امت مسلمہ کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے۔

دوسرا باب

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آپ تاریخی صحیفوں کو الٹ پلٹ کر دیکھیں، تو نیکی کے بعد بدی، بدی کے بعد نیکی، خوشحالی کے بعد بدحالی اور جبر و استبداد کے بعد عدل و انصاف کی داستانیں بار ہا آپ کے سامنے آئیں گی، برصغیر پاک و ہند میں اسلام دو طرف سے آیا: مغرب سے مسلمان جرنیل محمد بن قاسم کے ذریعے اور مشرق سے مسلمان تاجروں کے ذریعے۔ ۱۰۰۱ء میں سلطان محمود غزنویؒ نے پہلی مرتبہ لاہور پر حملہ کیا، اس کے بعد شہاب الدین محمد غوریؒ نے فوج کشی کی اور تراوڑی کے میدان میں راجپوت راجہ رائے پتھورا سے مقابلہ کیا، پہلی بار شکست کھا گیا، غیرت مند مسلمان تھا، قسم کھالی کہ جب تک شکست کا داغ نہیں دھو ڈالوں گا، اس وقت تک غسل نہیں کروں گا ایک سال تک تیاری میں مصروف رہا، اگلے سال پھر آکر لڑائی کی اور فتح یاب ہوا، اس کے بعد مختلف خاندان یکے بعد دیگرے برصغیر میں حکومت کرتے

حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ کابل سے لے کر آسام کی پہاڑیوں اور کراچی سے مدراس تک دہلی کے مسلمان تاجداروں کا فرمان چل رہا تھا۔ مغل فرمانرواؤں میں جہانگیر ایک مدبر، دلیر اور نہایت باانصاف بادشاہ تھا، شاہ جہاں ایک تنظیم اور تعمیری ذہن رکھنے والا فرمانروا تھا، عالمگیر ہوشیار اور بہادر ہونے کے ساتھ دیندار اور صاحب علم بھی تھا۔ اُس کا انتقال ۰۰۔۱ھ میں ہوا۔ اس کے بعد جو لوگ تخت نشین ہوئے، اُن کی اکثریت نہ صرف یہ کہ نااہل تھی، بلکہ بدعمل اور عیاش بھی، عالمگیر کے پوتے جہاندار شاہ نے تخت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ایک منظورِ نظر طوائف کے بھائی کو دہلی کا افسر مقرر کیا، پھر جہاندار شاہ کے پڑپوتے محمد شاہ رنگیلے نے تو کمال ہی کر دیا، اس نے لال قلعے کے اندر حوضوں میں شراب بھروائی۔ ابن علقمی کے جانشین اندر ہی اندر مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کا قلع قمع کرنا چاہا تو میر جعفر نے غداری کر کے اسے شہید کرا دیا۔ بنگال پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں غازی احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہ لڑائی امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایما پر ہوئی، انھیں کے نامۂ گرامی کا احترام کرتے ہوئے غازی احمد شاہ نے لڑائی کی۔ سلطنت دہلی کے ایک بڑے عہدے دار نجف خاں ایرانی کو شاہ ولی اللہ سے اختلاف تھا، ابن علقمی کے اس روحانی فرزند نے شاہ صاحب کے پہونچے نکلوا دیئے اور بعد میں ان کے نابغۂ روزگار فرزندوں کے ساتھ بھی اس نے ظالمانہ برتاؤ کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے بدن پر زہریلی چھپکلی کا اُبٹنا لگوایا، جس سے انھیں برص ہو گیا۔ چاروں بھائیوں کو شہر بدر کیا۔ جنوبی ہند میں حیدر علی خاں اور پھر اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے استیصال کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، یہاں بھی انگریزوں کو میر صادق جیسے غدار میسر آگئے۔ نتیجتاً ٹیپو شہید ہوا اور سرنگاپٹم پر انگریزی پرچم لہرانے لگا۔

قدرت کا اٹل قانون ہے: اِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا۔ یعنی تم جب بھی سرکشی دکھاؤ گے۔ اور احکام خداوندی سے بغاوت کرو گے تمہارے سروں پر جوتے برسیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ مغلوں کی سلطنت کمزور ہو جانے کے بعد کہیں صوبیداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، کہیں مرہٹے حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ کہیں سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے راجدھانی قائم کر لی اور پھر رفتہ رفتہ وہ پورے برصغیر پر چھا گئے قدرت کی انتقامی کارروائی اسی پر ختم نہ ہو گئی، بلکہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ اپنے جلو میں حوادث کا ایک نہ رُکنے والا سیلاب اور مصائب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ لیئے ہوئے وقوع میں آیا، مؤرخ کا قلم جس طرح یورشِ بغداد کے واقعہ ہائلہ کا ذکر کرتے ہوئے خون کے چھینٹے برساتا ہے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ خون کے آنسو صفحۂ قرطاس پر چھوڑتا ہے۔

یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟ اس کے اسباب و علل کی تفصیل کیا ہے یہاں اس کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ البتہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج کن صورتوں میں رونما ہوئے۔

معرکہ ۱۸۵۷ء کے تلخ نتائج

جبکہ ۱۸۵۷ء میں اپنوں کی بے وفائیوں اور غداریوں اور دشمن کی فریب کارانہ چالوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا، تو اب انھوں نے دل کھول کر انتقامی کارروائیاں کیں ۵ لاکھ ہندوستانی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ دہلی میں جہاں کوئی مقامی باشندہ نظر آتا۔ اُسے گولی کا نشانہ بنایا جاتا۔

صرف ایک دن میں ۲۴ مغل شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا

بہادروں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اُڑادیئے جانے، بعض لوگوں کو سور کی کھالوں میں سی کر دریا میں پھینک دیا گیا، لال قلعہ کے قریب شاندار عمارتوں اور بازار کو مسمار کرکے چٹیل میدان بنادیا گیا، دہلی کے علاوہ بھی ہر بڑے شہر میں عارضی پھانسی گھر بنائے گئے۔ پانچ سو بلند پایہ علماء سولیوں پر لٹکائے گئے، پاکباز خواتین کی آبرو اس طرح برباد ہوئی، جیسے قصاب کی دوکان کے آگے کتے چھیچھڑوں کو نوچتے پھرتے ہیں۔ صدیوں میں جمع کئے ہوئے سلاطین دہلی کے علمی خزانے آگ کی نذر ہوئے یا دریائے جمنا کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی اکھاڑ پچھاڑ

بات ادھوری نہ رہ جائے، یہاں پر یہ بھی بتادینا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء مسلمانوں کی حکومت کا کلی خاتمہ ہوگیا، اسلامی سطوت خاک میں مل گئی، بادِ صرصر کے تیز و تند جھونکوں نے چمن کو اُجاڑ کے رکھ دیا، تو حرماں نصیبی اور بدبختی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مسلمانانِ ہند کو "عشق کے ابھی اور امتحانی مراحل" سے گزرنا تھا ـــ اہلِ علم کو ایک جلیل القدر انصاری صحابی حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ یاد ہوگا۔ جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں پورے ۳ صفحات پر نقل کیا ہے۔ حضرت کعبؓ کی ایک لغزش کی بنا پر بارگاہِ رسالتؐ سے پچاس دن کے بائیکاٹ کا حکم صادر ہوا۔ حضرات صحابہؓ کی پوری جماعت حتیٰ کہ تمام خویش و اقارب بیوی، بچوں کی طرف سے مکمل بائیکاٹ تھا۔ یہ شوقِ دید میں نماز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہوکر پڑھتے ـــ نماز کے دوران کن انکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے کہ کیا حضورؐ ان کی طرف دیکھتے ہیں، یا نہیں۔ وہ نماز میں ہوتے تو حضورؐ بھی ان کی طرف نظر فرمالیتے، فارغ ہوتے تو حضورؐ اپنا رُخ پھیر لیتے۔ اندازہ لگایئے کہ عاشقِ صادق پر کیا گزری ہوگی، کوئی حد ہوگی ـــ بے قراری اور اضطراب کی؟

تڑپ تڑپ کے گزر رہی ہیں ہجر کی راتیں
گواہ ہیں شکنیں، ہیں جو قید بستر پر

کعبؓ کا ایک ایک لمحہ، یوم الحساب کی طرح گزر رہا ہوگا، اس دوران میں شام کا ایک نبطی کاروبار کے سلسلے سے مدینہ منورہ آیا، کعبؓ بازار گئے تو وہ لوگوں سے ان کا نام پوچھتا پھر رہا تھا، انھوں نے اشارے سے رہنمائی کی۔ واللہ، اللہ!! کس قدر پاس ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا، زبان سے پتہ بھی نہیں دیتے۔ بہرحال کعب رضی اللہ عنہ کی اس سے ملاقات ہوئی، تو اس نے بادشاہ غسان کا ریشم پر لکھا ہوا خط انھیں دیا، جس میں لکھا تھا: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر زیادتی کی ہے، تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری قدردانی کریں گے۔"
کعبؓ فرماتے ہیں: میں نے سوچا یہ میرے لیے کٹھن آزمائش ہے اور پھر فوراً ہی خط لے کر تنور میں جھونک دیا۔

حضرت کعبؓ تو بدری صحابی ہیں، صحابہؓ کی تو پوری جماعت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے جان و مال، عزیز و اقارب گویا سب کچھ اسلام کی خاطر داؤں پر لگا دیا تھا۔ تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن۔ اسلام کے قدردان وہ نہ ہوتے تو اور کون ہوتا؟ کعبؓ سے تو توقع ہی یہی ہوسکتی ہے کہ وہ شاہِ غسان کے نامہ سے یہی برتاؤ کرتے۔ لیکن ہند کے لٹے پٹے، ضعیف البنیان اور ضعیف الایمان باشندوں کے بارے میں کیا سوچا جاسکتا ہے؟

بیچاروں سے حکومت تو گئی ہی تھی، اب ان کے دین و ایمان پر ڈاکے پڑنے لگے، دو طرف سے ان پر کفر کی یلغار شروع ہوئی۔ ایک طرف انگریز کی حکومت قاہرہ کی سرپرستی میں عیسائیت کا فتنہ اُٹھا، وہ ڈنڈے کے زور سے عیسائیت پھیلا رہی تھی، انگلینڈ سے پادری درآمد کئے، دیسی اور بدیسی پادریوں سے مکمل تعاون کیا۔ نئے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا، برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے دارالعوام

میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے، کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرِ نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیئے۔"

انگریز ماہرِ تعلیم میکالے نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا:

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

بے دینی کا سیلاب یہیں نہیں رُکتا۔ مغربی قوم حکمران بنی، تو یورپ کی مغربی تہذیب اپنے تمام آثار و عواقب ہمراہ لائی، عریانی، فحاشی، شراب خوری اور تمام وُہ غلاظتیں جو یورپ کی گندی تہذیب کے اجزاءِ لازمہ ہیں، پھیلنے لگیں۔ الغرض، مسلمان سیاست سے محروم ہوئے۔ اُن کا مذہب خطرے میں پڑا۔ ان کی معیشت متاثر ہوئی، آدابِ معاشرت بدلے اور یہ وُہ پُرآشوب حالات تھے، جو معرکۂ ۱۸۵۷ء کے بعد رُونما ہوئے۔

تصویر کا دُوسرا رُخ

آئیے۔ اب تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھئے۔ جب دیارِ ہند میں اُمّتِ مسلمہ اس طرح پر چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی تھی، پے در پے مصائب اور فتن نے اس کا بھُرکس نکال کے رکھ دیا تھا تو قُدرت کی طرف سے مظلوم و مقہور بندوں کی اشک شوئی کا کیا بندوبست ہوا؟ وُہ کونسا گروہ تھا جو آیۂ رحمت بن کر ان کی دست گیری کے لیے آگے بڑھا۔ اللہ تعالیٰ اکابرِ دیوبند کی قبروں کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھے کہ ابتلاء و آزمائش کے دَور میں قلندروں کا یہی گروہ آگے بڑھا، اور اُس نے کُشتۂ نیم جان اُمّتِ مسلمہ کے لیے مسیحائی کا کام دیا، فغاں بلب مِلّت کا وُہ کونسا درد تھا جس کی دوا اُس نے مہیا نہ کی اور کونسا زخم تھا، جس کی اُس نے تدبیر نہ کی؟ نانِ شعیر پر گزارہ کرنے والے یہ مردانِ بے نوا، فقر و غنا کے خیال سے بے نیاز ہو کر میدان میں کود پڑے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کے نسبی و رُوحانی فرزند اور خواجگانِ چشت و نقشبند کے جانشینؒ زور و زر کے مقابلے میں

---

[1] اکابرِ دیوبند میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب صاحب

اُنڑآئے۔ عیسائیت کا فتنہ اُٹھا، تو مولانا قاسم نانوتویؒ نے اسے جڑسے اکھاڑ دیا۔ آریوں نے سر اُٹھایا تو یہی درویش سینہ سپر ہوگئے۔ ملی حقوق کا سوال پیدا ہوا تو یہی بے سروسامان دیوانے وقت کے طاغوت سے بھڑ گئے۔ دینی علوم کی حفاظت کا سوال آیا تو اللہ کا نام لے کر انھوں نے درس و تدریس کی ہزاروں مسندیں بچھا دیں۔ لاکھوں سینوں کو قرآن و حدیث سے منور کر دیا۔ سینکڑوں بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ نکال دیئے۔ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا شعبہ سامنے آیا تو بیسیوں تفسیریں اور پچاسوں حدیث کی شرحیں لکھ دیں، کتابوں کے حواشی اور شروح لکھ کر بلادِ اسلامیہ سے بازی جیت لی، رشد و ہدایت، افادہ و افاضہ، تزکیہ و اصلاح کا کام ہاتھ میں لیا، تو ایک عالم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

ہے کوئی ماں کا لال، جو گزشتہ ایک صدی میں پورے عالم اسلام میں حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ جیسا مجتہد، علامہ انور شاہؒ جیسا عالم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا مصنف اور شیخ طریقت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسا جامع صفات بزرگ پیش کر سکے۔ ان حضرات کے مناقب و مراتب بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیئے، نہ مجھ میں بیان کی قوت، نہ آپ میں سننے کا یارا۔

بیرون تشنہ مستقی و دریا ہم چناں باقی

ائمہ سلف میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید امام عبداللہ بن مبارک کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ علمی و عملی کمالات کے ایک ایسے گلدستہ سدا بہار تھے کہ اُن کی جس کسی خصلت کو دیکھا جاتا، نگاہ تجسس محو حیرت ہو کر رہ جاتی تھی۔

ابن مبارکؒ حدیث، فقہ، ایام، رجال، بہادری، سخاوت، تجارت ہر العزیزی ان تمام کے جامع تھے ... ان کی ذات ستودہ صفات میں علم فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، خوش قیام لیل، عبادت، حج، غزوہ، شہسواری، شجاعت، تندرستی، فضول اور لغو باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات جمع تھیں۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں میں نے صحابہ کرام کے حالات میں غور کیا ہے اور ادھر عبداللہ بن مبارک کے حالات بھی دیکھے ہیں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرات صحابہ کو ابن مبارک پر اس وجہ سے فضیلت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پایا ہے اور آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے ہیں[1]

انصاف سے کہیئے کہ امام عبداللہ بن مبارکؒ کا کونسا وصف کمال ہے، جو مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ، سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہم کو قدرت نے نہیں عطا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ گنہگار راقم السطور کو دیوبند کے دارالعلوم سے براہ راست تلمذ کا تعلق بھی نہیں ہے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے کسی اندھی عقیدت کی بنا پر نہیں، بلکہ جس طرح امام نوویؒ نے امام عبداللہ بن مبارک کے بارے میں فرمایا ہے:

"ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے"

بڑے تفحص اور تتبع کے بعد یہی رائے اس گنہگار نے اکابر دیوبند کے متعلق قائم کی ہے۔ اور یہ چند سطور صفحۂ قرطاس پر آگئی ہیں۔ اب اس فتنہ دور و دراز کو سمیٹنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک مختصر حکایت اس سلسلہ میں اور بھی ہدیہ قارئین کر دوں۔

نسباً صدیقی ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ فاروقی ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ عثمانی ہیں، حضرت مدنیؒ اور بہت سے دوسرے حضرات سید ہیں۔ اور یہ سب حضرات سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] غلامان اسلام مصنفہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی بحوالہ تہذیب التہذیب

دارالعلوم دیوبند کی خدمات

دورِ جاہلیت میں "فنِ قیافہ" عربوں میں بہت مروج تھا اور بنو مدلج کا قبیلہ اس میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رنگ کے لحاظ سے گورے چٹے تھے۔ ان کی شادی ایک سیاہ فام عورت سے ہوئی اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ بھی سیاہ فام تھے۔ منافق بہانے ڈھونڈتے تھے، وہ حضرت اُسامہؓ کے نسب پر اعتراض کرنے لگے۔ ایک روز اتفاق ایسا ہوا کہ حضرت زیدؓ اور ان کے صاحبزادے اکٹھے سو رہے تھے۔ ان کے سر ڈھکے ہوئے تھے، لیکن پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ بنو مدلج کا ایک آدمی مجزز نامی ان کے پاس سے گزرا، اُس نے پاؤں کو دیکھ کر کہا،

"یہ پاؤں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔"

شرعی لحاظ سے خواہ قیافہ کی کوئی حیثیت نہ ہو، بہرحال ایک ماہر فن کی حیثیت سے عربوں کے نزدیک اس شخص کی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ بدگوؤں کے منہ پر چپت لگی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعًا خوشی ہوئی، جس کا اظہار آپؐ نے اپنی زوجۂ مطہرہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے سامنے فرمایا اور وہی اس واقعہ کی راوی ہیں۔

جاہلیت جدیدہ بہت حد تک جاہلیت قدیمہ سے مماثلت رکھتی ہے، وہی اندازِ فکر اور وہی طور طریق ... دین کی کوئی بات بھی اس وقت سُنی اور مانی جاتی ہے، جبکہ "یورپ" کے سب دین اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں، ذیل کا واقعہ دینی حلقوں میں شاید زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو، لیکن مغربیت زدہ ذہنوں کے لیے یقینًا جاذبِ توجہ ہوگا۔

تقسیم ملک کے بعد سابق ریاست بہاولپور میں جب کہ مائر حفیظ الرحمٰن یہاں کے وزیرِ تعلیم تھے، بہاولپور کی اعلیٰ دینی درسگاہ جامعہ عباسیہ، جو اب اسلامی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکی ہے، کے بارے میں ماہرینِ تعلیم اور بڑے بڑے افسران کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اجلاس میں حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ ناظم امورِ مذہبیہ اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی شیخ الجامعہ اور دیگر حضرات کے علاوہ سید حسین احمد شاہ صاحب مرحوم چیف انجینیئر بھی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے اپنا ایک واقعہ سُنایا کہ میں تقسیم سے پہلے ایک دفعہ امریکہ گیا۔ وہاں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ اونچے طبقہ کے دو امریکن وہاں آئے، نشستیں سنبھالنے کے بعد ادھر وہ خورد و نوش میں مشغول ہوئے، ادھر انھوں نے ایک موضوع چھیڑ دیا، جو میرے لیے بڑا دلچسپ تھا، ان میں حسبِ ذیل گفتگو ہوئی،

ایک بولا: کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں مذہب کا اثر و رسوخ زیادہ پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ملک بھی ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟

دوسرے نے جواب دیا: مشرقِ وسطیٰ جغرافیائی لحاظ سے یورپ کے قریب تر ہے۔ اس لیے یہاں یورپ کے اثرات زیادہ پہنچے ہیں، ہندوستان دور رہ جاتا ہے۔"

پہلا: "نہیں یہ بات نہیں ہے، ہندوستان مکمل طور پر طاغوتی حکومت کے زیرِ تسلط ہے اور اس تسلط کو تقریبًا ایک صدی کا عرصہ گزر چکا ہے، پھر بھی فاتح قوم وہاں کے مسلمانوں سے مذہب کا دامن نہیں چھڑوا سکی۔

دوسرا: شاید یہ بات ہو کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اس لیے تہذیب نو وہاں قدم نہیں جما سکی۔

پہلا: یہ بات بھی نہیں ہے، اول تو وہ اتنا غریب نہیں ہے اور

لہ یعنی علامات اور خط و خال سے پہچان لینا۔

اور اگر واقعی غریب ہو تو غریب کو اپنی طرف مائل کرلیتا زیادہ آسان ہے۔ اس طرح پر دو چار سوال و جواب کے بعد پہلا بولا ، جہاں تک میں نے اس مسئلہ پر سوچا ہے ، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان میں دینی تعلیم کا ایک ادارہ ہے ، جس کا نام دیوبند ہے ، وہ تحریر و تقریر کے ذریعے مذہبی تعلیم کی اشاعت کر رہا ہے اور وہی ادارہ وہاں پر مذہبی اقدار کے بقاء کا ضامن ہے۔

سید حسین احمد شاہ صاحب ایک بڑے عہدے دار ہونے کے علاوہ اثنا عشری خاندان کے فرد تھے ، گو وہ خود بڑے وسیع القلب انسان تھے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اعتراف صرف اپنوں ہی نے نہیں ، غیروں نے بھی کیا ہے۔

والفضل ما شهدت به الاعداء

اس قصہ کے سنانے سے شاہ صاحب کا مقصد بھی جامعہ کے ارباب حل و عقد کو اس طرف توجہ دلانا تھا کہ جامعہ کا نصاب بھی دیوبند کے طرز پر ترتیب دیا جائے تاکہ اصلی غرض یعنی دین کی نشر و اشاعت حاصل ہو سکے۔ نصاب تعلیم میں عصری تقاضوں کے نام پر غیر ضروری آمیزشیں اصلی مقصد کو فوت کر دیتی ہیں۔

بہر حال ، یہ نہ تو غالیانہ عقیدت مندی ہے ، نہ بے جا حسن ظن ، بلکہ واقعات اور حقائق ہیں اکابر دیوبند کے علمی اور عملی کمالات کے اعتراف پر مجبور کر دیتے ہیں ، خدانخواستہ اگر یہ طائفہ منصورہ نہ ہوتا ، تو آج یقیناً برصغیر کی مذہبی اور سیاسی تاریخ بہت مختلف ہوتی اور کم از کم ، شاید ہندوستان کے اندر بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہوتا جو اندلس میں ہوا۔

فقط ہٰذا تم منا الکلام
علیٰ مصطفٰنا الوف السلام

بقیہ (حضرت نانوتوی کا لائحہ عمل)

نہ ہوں ، اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی ، تو اگرچہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو ، بدل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو ، اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر ہر شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا ، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے تجویز ہو جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے پوری ہو جایا کرے ، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہو گا ، اگر ہو گا تو بے فائدہ ہو گا۔

۶۔ اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی حاصل ہو گئی ، جیسے جاگیر یا کارخانہ ، تجارت ، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے۔ جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری

علمائے دیوبند سرحد کی تصنیفی خدمات

از۔ حافظ قاری فیوض الرحمن جدون۔ ایم اے (عربی، علوم اسلامیہ، اُردو، فارسی) ایم۔ او۔ ایل۔ صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے اکثر علمائے دیوبند کی زندگیاں زیادہ تر درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور جہاد میں گزری ہیں۔ مگر ان خدمات کے باوجود تصنیف کے میدان میں بھی ان کی گرانقدر کوششیں اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ یہاں انھیں ایسے وسائل حاصل نہیں تھے۔ عام طور پر ان کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تصنیف کے میدان میں کوئی کام نہیں کیا، اس مضمون سے اندازہ ہوگا کہ یہ درست نہیں ہے۔

تذکرہ میں کسی بھی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا، حسب ما اتفق مؤلف و مصنف حضرات کی فہرست بنا دی ہے......

ہمارا خیال تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے تمام مصنف حضرات کا تراجم علمائے دیوبند کے عنوان سے مختصر تعارف کرایا جاتے، لیکن جب اعداد و شمار کرکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف اسی عنوان کے لیے دوہزار صفحات درکار ہیں۔ لہٰذا اس ارادے کی تکمیل کے لیے آئندہ سال کا انتخاب کیا کہ ایک مستقل نمبر اسی عنوان سے نکالا جاتے، تاہم مثال کے طور پر صرف علمائے سرحد کا تعارف پیش خدمت ہے، اس سے ایک سرسری اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکناف عالم میں علمائے دیوبند نے جو تصنیفی تالیفی کام کیا ہے، وہ کس قدر ہوگا۔ (جب کہ یہ بھی تمام علمائے سرحد کا احاطہ نہیں) (ارشد)

مولانا حافظ قاری فیوض الرحمٰن صاحب جنہوں نے یہ مضمون ترتیب کیا ہے۔ ماشاء اللہ خوب کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے یہ مضمون تیار کیا ہے۔ ضروری ہے کہ شروع میں قارئین ان سے متعارف ہوں (ارشد) ولادت ۱۳ مئی ۱۹۴۱ء کو تحصیل ایبٹ آباد کے ایک گاؤں ڈھیری کیمال میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم والد مکرم سے حاصل کی۔ درس نظامی کی کتابیں برادر بزرگ مولانا قاری محمد عارف صاحب مدظلہم فاضل جامعہ اشرفیہ سے پڑھیں۔ ۱۹۵۹ء میں پنجاب کے تعلیمی بورڈ سے ادیب عربی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۰ء میں میٹرک کا، حفظ اور روایت حفص کی تکمیل مدرسہ

تجوید القرآن مرتی بازار لاہور میں کی۔ روایت حفص کی میں دوسری سند قاری عبدالوہاب صاحب مکی سے حاصل کی۔

۱۹۶۱ء میں فاضل فارسی کا امتحان پاس کیا۔ پھر وطن گئے وہاں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ اول میں (جبکہ پورے بورڈ میں پانچویں پوزیشن تھی) پاس کیا۔

۱۹۶۵ء میں پشاور یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان یونیورسٹی بھر کے طلبہ میں اول آکر پاس کیا۔ ۱۹۶۵ء میں شعبۂ عربی جامعہ پشاور میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے (عربی) پریویس ——— یونیورسٹی کے لازمی امتحان میں یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۶۷ء میں اورنٹیل کالج جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے عربی کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

۱۹۶۸ء میں اورنٹیل کالج جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے اسلامیات کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

۱۹۶۹ء میں اورنٹیل کالج جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے اُردو کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔

۱۹۷۰ء میں اورنٹیل کالج جامعہ پنجاب سے ایم اے فارسی کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

۱۹۷۲ء میں اورنٹیل کالج جامعہ پنجاب سے ایم او ایل کی ڈگری حاصل کی۔

ولیسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن میں لیکچرارشپ کے لئے امتحان دیا ۱۶۰۰ امیدواروں میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ء کو گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ میں پہلی تقرری ہوئی۔ ون یونٹ کے خاتمہ پر صوبہ سرحد جانا ہوا اور گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں پوسٹنگ ہوئی۔ لاہور کے عرصہ قیام میں پہلے مزنگ مارکیٹ کی جامع مسجد میں خطیب رہے۔ پھر جامع ست گرہ انارکلی میں، دورۂ حدیث کا سماع پہلے جامعہ نعیمیہ اور دوبارہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں کیا۔ ۱۹۶۹ء میں دورۂ حدیث کے امتحان اوایام۔ اے اُردو کے امتحان کی تاریخیں ایک تھیں اس لئے امتحان نہ دے سکے۔

۱۹۶۲ء کی چھٹیوں میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی سے تجرید تفسیر کی سند حاصل کی۔ سند اجازۃ فی التفسیر والحدیث علامہ سید شمس الحق صاحب افغانی نے بھی عنایت فرمائی ہے اور خصوصی وظائف کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

صوفیانہ مسلک : پہلی بیعت حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر ہوئی اور انہی کے ارشاد پر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے استفادہ کرتے رہے۔ ان کے وصال کے بعد استاذ العلماء حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب ہزارویؒ سے تجدید بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد مولانا مفتی بشیر احمد پسروریؒ سے تعلق قائم ہوا اور انہی سے خلافت عطا ہوئی۔

تصانیف : (۱) "الھمزیۃ النبویۃ" مصر کے قومی شاعر احمد شوقیؒ کے نعتیہ قصیدہ کا اُردو ترجمہ وتشریح۔ شروع میں شاعر کی زندگی اور شاعری پر تبصرہ۔

(۲) "قصائد حسانؓ" (رحمانی جان کی معیت میں) شاعر رسول حضرت حسانؓ کے ان پانچ قصیدوں کا ترجمہ وتشریح جو جامعہ پنجاب میں ایم۔ اے عربی کے نصاب میں داخل ہیں۔

(۳) "ذکرالشاعرین" حافظ ابراہیم مصری کے دو قصیدوں کا ترجمہ وتشریح

(۴) "فضائل درود شریف" صفحات ۴۸۔

(۵)

(۶) "فلسفۂ عیدقرباں (۷) "تعارف قرآن" صفحات ۸۰ (۸) سورۂ حجرات — مع ترجمہ وتشریح۔

(۹) سورۂ لقمان مع ترجمہ وتشریح (رحمانی جان کی معیت میں)

(۱۰) آداب ملاقات (۱۱) آداب گفتگو (۱۲) آداب طعام۔

(۱۳) مسواک کی اہمیت (۱۴) آدابِ طہارت (۱۵) جدید قرآنی قاعدہ برائے مساجد (۱۶) جدید قرآنی قاعدہ برائے سکولز صفحات ۴۸۔

(۱۷) جدید قرآنی قاعدہ برائے اساتذہ

(۱۸) دُعائیں (قرآنی و مسنون دعاؤں کا مجموعہ)

(۱۹) حقیقتِ توبہ ۶۴ صفحات (۲۰) حقوق والدین ۶۴ صفحات

(۲۱) حقوق اولاد ۹۶ صفحات (۲۲) حقوق الجار

(۲۳) نصاب برائے قراء

(۲۴) اسلامیات لازمی برائے میٹرک (ایک حصہ) پشاور بورڈ صوبہ سرحد

(۲۵) جواہر الحدیث

(۲۶) سوانح حضرت قاری فضل کریم صاحبؒ صفحات ۱۲۸

(۲۷) سوانح حضرت مولانا محمد رسول خان صاحبؒ صفحات ۷۶ مجلد

(۲۸) سوانح حیات مولانا مفتی بشیر احمد پسروری اور ان کے خلفاء صفحات ۱۲۸

(۲۹) سوانح مولانا عبدالغفور مدنیؒ (۳۰) سوانح مولانا غلام ربانی لودھی

(۳۱) سوانح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

(۳۲) غازی عبدالقیوم شہیدؒ

(۳۳) شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری اور ان کے خلفاء ۸ ۲۲ سائز کے ۲۲۸ صفحات۔ (۳۴) علمائے ہزارہ

(۳۵) سرحد کے ممتاز علمائے دین ۱۸۵۷ء تا حال

(۳۶) سیرۃ المصطفیٰ (۳۷) اسلامی جہاد (۳۸) تاریخ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد (۳۹) سوانح کیپٹن دریافت خان شہیدؒ

(۴۰) اسلام کا نظام حیات ۴۰۰ صفحات (مجلد)

(۴۱) علمائے سرحد کی تصنیفی خدمات (زیر طبع) (۴۲) نماز (زیر طبع)

(۴۳) ارکانِ اسلام (زیر طبع) (۴۴) کتاب التجوید (زیر طبع)

(۴۵) پاکستان کے ممتاز علمائے دین (زیر ترتیب)

(۴۶) پاکستان کے عربی شعراء (زیر طبع) (۴۷) اسلامی زندگی کے کچھ پہلو (۴۸) حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور ان کے خلفاء (ترتیب کے آخری مراحل میں)

مولانا عبدالکریم ہزاروی ۱۸۴۹ء تا ۱۸۸۵ء

آپ ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء کے قریب لبر کوٹ تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں جناب عبدالرزاق بن کمال الدین بن کرم میر کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم مانسہرہ کے مشہور عالم مولانا نور عالم سے حاصل کی تکمیل دارالعلوم دیوبند اور رامپور میں کی، آپ معقول و منقول کے سرکردہ علماء میں سے تھے۔ کچھ عرصہ رامپور، شاہجہانپور اور دارالعلوم لکھنؤ میں تدریس کرتے رہے۔

آپ کی تصانیف میں سے "زمین کی حرکت کے ابطال" ہی کا نام معلوم ہو سکا، اس کے علاوہ کئی اور رسائل بھی آپ نے لکھے ہیں، مگر ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ علامہ حکیم سید عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں:

"الشیخ الفاضل عبد الکریم بن عبد الرزاق بن کمال الدین بن کرم میر العلوی الحنفی الهزاروی احد العلماء المبرزین فی المعقول والمنقول ..... ثم سافر الی دیوبند وقرء فی المدرسة العربیة بها الفقه والحدیث والاصول والکلام وشیئا من المنطق والحکمة ..... له رسالة فی ابطال حرکة الارض ورسائل اخری: (عبدالحیٔ الحسنی، مولانا حکیم سید، نزہۃ الخواطر ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ج ۸ ص ۲۸۰ دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد دکن (آپ محمد نواز ساکن لبر کوٹ کے دادا جان تھے) کو

۱۹۰۹ء آپ کا لکھنؤ ہی میں ۶۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد سعید شاہ خطیب ہزاروی ۱۸۴۹ء/۱۹۰۹ء

آپ سید عبدالماجد شاہ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔ ساکن ڈھینڈہ کے دادا تھے۔ ڈھینڈہ مہری پور ہزارہ میں سید میر محمد شاہ بن مولانا سید شاہ حسن بن پیر شاہ مشہدی کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور چچا دوست سے حاصل کی۔ علم قرأت کی تحصیل قاری میر عبداللہ صاحب ساکن سرلسئے صالح (ہزارہ) سے کی، بعدازاں حافظ محمد صاحب ساکن لکھو کے، ضلع فیروزپور میں تکمیل کی۔

آپ نے خطابت میں نام پیدا کیا۔ جب قرآن پڑھتے تھے، تو یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے نازل ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے آواز بھی خوب دی تھی بعض حاسدوں نے آپ پر غلط الزام درباره عقائد لگائے جن کا رد آپ نے "عقیدہ محمودیہ" میں کیا۔ آپ نے اس کے علاوہ "تبصرة الجمعہ" عربی صفحات ۱۸۴ بڑا سائز، مطبوعہ، ریاض الہند امرتسر۔

(۲) مجموعہ خطب، یہ حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر حضرات کے خطبات کا مجموعہ ہے، مع اردو ترجمہ، صفحات ۶، بڑا سائز (۳) حاشیہ تنبیہ المشرکین مطبوعہ لاہور ۱۸۹۶ء ۱۹۰۹ء میں ڈھینڈہ میں وصال ہوا۔

مولانا محمد صدیق ڈاگئی مردان

۱۲۵۴/۱۳۳۷ھ/۱۸۳۸...... /۱۹۱۹ء

آپ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء کے قریب مولوی رحمت اللہ صاحب کے گھر ڈاگئی، ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے رامپور سے ہوتے ہوئے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور دورۂ حدیث حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھ کر سند حاصل کی، فراغت کے بعد واپس وطن آئے اور ۴۰ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دے کر ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

آپ نے شرح ہدایۃ الحکمۃ کی شرح بنام صدریہ لکھی ہے، جو مطبوعہ ہے۔

مولانا قاضی غلام سرور ہزاروی ۱۸۵۹/۱۹۲۲ء

آپ شمدرہ، اگرور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کی شاخ آرہ شاہ آباد میں داخل ہو کر ۱۸۸۶ء کو سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد اسلامی درسگاہ زنگپور مشرقی بنگال میں بحیثیت صدر مدرس چند سال تک تدریس کی، واپسی پر شنکیاری ہزارہ میں تدریس کی۔ ۱۹۱۰ء میں شنکیاری سے نقل مکانی کر کے خاکی، مانسہرہ گئے۔ اور آخری وقت تک وہیں تدریس و تصنیف میں لگے رہے۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے، کہا گیا ہے کہ آپ حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔

تصانیف: علم منطق میں "مرآۃ المتون" آپ کی اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ میرایساغوجی، میزان البدیع، مرزا قطبیہ اور شرح جامی کے شروح لکھے، یہ سب غیر مطبوعہ ہیں، جو آپ کے فرزند مولانا قاضی محمد یونس فیسر (ریٹائرڈ) کے پاس محفوظ ہیں۔

مولانا قاضی غلام نبی ہزاروی ۱۸۶۵/۱۹۳۱ء

آپ "ڈیشان" حال تحصیل بٹگرام، ہزارہ میں شاکراللہ سواتی کے گھر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم علاقے کے علماء سے حاصل کی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں کافی عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں، خوانین گیدڑپور، مانسہرہ ہزارہ کے اصرار پر ان کے قاضی ہو کر آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی آخری وقت تک جاری رکھا۔

۱۸ جنوری ۱۹۳۱ء کو آپ کا گیدڑپور، مانسہرہ، ہزارہ میں انتقال ہوا

تصانیف: قیام گلاوٹھی کے دوران آپ نے حمداللہ کا حاشیہ رفع

الاشتباہ لکھا، جو اسی دوران طبع ہوا۔ اسی طرح قصیدہ بردہ اور "غلام یحییٰ" کی شرحیں بھی لکھیں، مگر مؤخر الذکر دونوں شروح کے بارے میں یہ علم نہ ہو سکا کہ مطبوعہ ہیں، یا غیر مطبوعہ۔

مولانا سید عبداللہ قطب شاہ عباسی مردانی ۱۸۵۰ء / ۱۹۲۴ء

آپ ۱۸۵۰ء کو حبیب شاہ صاحب کے گھر طورو ضلع مردان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ کے علماء سے حاصل کی، پھر بھوپال میں تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ سعودی عرب بھی گئے۔ وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا، واپسی پر میرٹھ آئے اور وہاں تدریس اور تصنیف کرتے رہے، پھر وطن واپس آئے، صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب کے ساتھ گہرے مراسم تھے، اسلامیہ کالج کی تحریک کے دوران ان کے دست و بازو بنے۔ ۱۹۱۲ء میں جب اسلامیہ کالج پشاور کی تاسیس ہوئی، تو آپ اس کے پہلے ڈین (اسلامیات) مقرر ہوئے، ۱۹۲۴ء تک تدریس کرتے رہے، اسی دوران نمونیہ کے حملے سے آپ کا ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا اور موضع "معیار" میں "مزار چندو بابا" میں آپ کی تدفین ہوئی۔

تصانیف: (۱) اسماء القرآن ۲۲/۱۸ سائز کے ۴۸ صفحات ۱۸۹۰ء کو مطبع احمدی میرٹھ میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں کلام اللہ کے ۶۰ ناموں کی تشریح کی گئی ہے

(۲) رسالہ حدیقۂ عرفان! اس میں ایمان کے ۷۰ شعبوں کا بیان ہے۔

(۳) نجوم القرآن فی اطراف القرآن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۴) شرح شعب الایمان۔ (۵) ہدیۃ القراء ۲۲/۱۸ سائز کے ۵۲ صفحات، علم تجوید کی درسی کتاب مقدمہ جزری کی فارسی نظم میں شرح ہے۔ ان میں سے اکثر تصانیف آپ کے پوتے جناب الحاج رشید احمد باچا پرنسپل گورنمنٹ کالج مردان کے پاس ہیں۔

مولانا قاضی میر احمد ہزاروی ۱۸۶۳ء / ۱۹۳۶ء

آپ کے تعارف میں لکھا گیا ہے کہ "قاضی صاحب صوبہ سرحد میں اردو زبان کے پہلے مؤرخ ہیں۔ آپ ۱۸۶۳ء میں بمقام ایبٹ آباد پیدا ہوئے، اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند چلے گئے، جہاں فقہ، حدیث، اور تفسیر کی تکمیل کی واپسی پر مدرس مقرر ہوئے اور مالاکنڈ ایجنسی میں تبادلہ ہو گیا، جہاں آخری عمر تک قیام رہا۔

علم و ادب سے فطری شغف تھا۔ کئی ایک اردو فارسی کتابیں یادگار چھوڑیں، تاریخ کی طرف طبعی میلان تھا۔ "تاریخ صوبہ سرحد" دو ضخیم جلدوں میں لکھ کر ۱۹۱۱ء میں طبع کرائی، طرز تحریر قدیم ہے، جس میں الجھاؤ یا گنجلک پن نہیں پایا جاتا۔

(فارغ بخاری؛ ادبیات سرحد: صفحہ ۹۸ (زیر عنوان تاریخ))

مولانا عبداللہ پھوار ہزاروی ۱۸۶۷ء / ۱۹۴۰ء

آپ مہاں نزد دھمتوڑ، ایبٹ آباد، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی تکمیل حضرت مولانا سکندر علی فاضل مظاہر العلوم سہارنپور سے کی، چند سال ہری پور سکول میں عربی کے استاد رہے، پھر مدرسہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ میں چھ سال اور "تلی خان" میں آخری وقت تک تدریس کرتے رہے، آپ کی صرف ایک تصنیف "قرع اللبیب علی سمع الخطیب" ہی کا علم ہوا ہے، جو مولوی فضل الرحمٰن خطیب جامع مسجد اہلحدیث ہری پور ہزارہ کے رد میں لکھی گئی، مطبوعہ ہے، مولوی عبدالقادر جامی کی کتاب تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن پر آپ کی تقریظ بزبان عربی و اردو شائع ہوئی ہے۔

مولانا مفتاح الدین محدث سواتی ۱۳۰۲ / ۱۳۶۲ھ — ۱۸۸۵ / ۱۹۴۳ء

آپ "سلدہ کئی" سوات میں فراش الدین بن فضل الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء کو امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری

مولانا سید اصغر حسین، مولانا محمد رسول خان ہزاروی، مولانا اعزاز علی صاحب وغیرہم حضرات سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی

فراغت کے بعد کئی مدارس میں تدریس کی، آخر میں جورۂ سوات میں ۱۸ سال تک دیگر کتب کے علاوہ کتب حدیث کی تدریس کی۔ آپ سوات کے قاضی بھی تھے، مگر کم مقدمات لیتے تھے، تاکہ تدریس میں فرق نہ آئے۔

تصانیف : (۱) اصلاح الرسوم، مطبوعہ بزبان پشتو رد بدعات کا ایک شاہکار ہے۔ (۲) جمال القرآن، مولانا اشرف علی تھانوی کی اس کتاب تجوید کا پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ (۳) تحقیق حرف ضاد، موخرالذکر دونوں کتابیں قلمی ہیں

وصال : ۱۲ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء بروز جمعۃ المبارک بوقت عصر جورہ" سوات میں وصال ہوا اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا قاضی عبدالسلام سلیم ہزاروی ۱۸۹۸ / ۱۹۴۶ء

آپ ریاست امب دربند، ہزارہ میں مولانا قاضی..... محمد علی بن قاضی مولانا سید علی کے گھر پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل اپنے والد صاحب سے کی، پھر مدرسہ عالیہ رامپور سے سند الفراغ اور دہلی سے علوم شرقیہ کی سندات حاصل کی۔

فراغت کے بعد ۱۵ گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں اسلامیات کی تدریس کرتے رہے۔ پھر وہاں سے مستعفی ہوکر حجاز کا قصد کیا، وہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور نظامیہ مدینہ منورہ میں ادب عربی کی تدریس کرتے رہے۔

حجاز سے واپسی کے بعد ٹیچرز ٹریننگ سکول میسور میں عربی ادب کے استاذ رہے اور آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ وہیں ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئے۔

آپ چاروں زبانوں، عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے شاعر تھے۔ آپ کے ۳ مجموعے روض الازہار، نالہ درد اور الجذبۃ الشوقیۃ الی الحضرۃ النبویۃ۔ آخری مجموعہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک حسین مجموعہ ہے سب مطبوعہ ہیں۔

آپ قاضی حبیب اللہ فضل حکیم استاذ اردو، گورنمنٹ کالج، ایبٹ آباد ہزارہ کے چچا تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی ۱۹۰۰ / ۱۹۴۷ء

آپ "دوبندی" خانپور، تحصیل ہری پور، ہزارہ میں برہان الدین صاحب کے گھر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کرنے کے بعد لاہور مدرسہ نعمانیہ میں پڑھتے رہے، پھر وہاں سے امرتسر چلے گئے، جہاں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے چند کتابیں پڑھیں، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، دو سال میں موقوف علیہ کی تکمیل کی اور تیسرے سال ۱۳۴۴ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد ۳ سال تک مدرسہ نصرۃ الحق" امرتسر میں تدریس کی، پھر مدرسہ نعمانیہ امرتسر میں مدرس اول کے طور پر تقسیم ملک تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء کو وہاں سے بیمار ہوکر واپس وطن آئے اور ۲۶ رمضان ۱۳۶۶ھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور "دوبندی" میں تدفین ہوئی

تصانیف : آپ کی تصانیف میں ۱- الطلاق الدفعی فی الطلاق الرجعی احکام الاحبار باحکام الاخیار اور رفع الملام عن شیخ الاسلام، یہ تینوں کتابیں

> کریم السجایا جمیل الشیم
> نبی البرایا شفیع الامم
> امام رسل پیشوائے سبیل
> امین خدا مہبط جبرئیل
>
> سعدیؒ

مطبوعہ ہیں۔ (آپ مولانا حافظ عبیدالرحمٰن صاحب امام و خطیب جامع مسجد الٰہی او۔ کالج لاہور کے والد تھے، آخری کتاب حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے دفاع میں لکھی تھی، ...)

مولانا فضل حق ہزاروی : ۱۸۷۴ / ۱۹۲۷ء

آپ ڈھیری تحصیل ایبٹ آباد، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی، فراغت کے بعد واپس وطن آئے، ہریپور کے مرکز دربند ہزارہ میں دو سال تک کام کیا، پھر ڈھیری سے نقل مکانی کرکے سلطان پور، حویلیاں ضلع ہزارہ آگئے، پھر شاہی جامع مسجد چنیوٹ میں امام و خطیب مقرر ہوئے اور ۳۰ سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہیں سے بیمار ہو کر واپس وطن آتے اور ایک ڈیڑھ کی علالت کے بعد ۱۹۴۹ء کو انتقال ہوا۔

تصنیف: قادیانیت اور رافضیت کے رد میں الخلافۃ و القرآن نامی کتاب ۱۴ ضخیم جلدوں میں لکھی، جو کوئی پانچ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، غیر مطبوعہ (آپ مولانا قاضی غلام جیلانی و مولانا مفتی محمد ابراہیم سلطانپوری کے خسر ہیں) عزیزوں نے وفا نہ کی، اس لیے یہ کتاب غیر مطبوعہ ان کے عزیزوں کے ہاں پڑی ہے۔

مولانا نقیب احمد اوچوی ۱۸۹۰ / ۱۹۴۹ء

آپ ۱۸۹۰ء کو "اوچ" ضلع دیر میں صاحب زادہ شریف احمد کے گھر پیدا ہوئے۔ قومیت کے لحاظ سے صدیقی تھے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء کو امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ محمد رسول خان ہزارویؒ، مولانا میاں اصغر حسینؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

علم ادب اور شعر و شاعری میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء کو تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہنچے، ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پھر حضرت کے مدرسہ امداد العلوم میں تین چار سال تک پڑھاتے رہے۔

۱۹۳۰ء کو وطن واپس آئے، اور پھر اپنے وطن میں آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ آپ عربی، فارسی اور پشتو کے قادر الکلام شاعر بھی تھے، ۱۹۴۶ء میں حج بیت اللہ کی سعادت ملی۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء کو "اوچ" میں آپ کا وصال ہوا۔

آپ نے جن کتابوں پر پشتو اور فارسی میں حاشیے بطور شرح لکھے ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں۔

گلستان سعدی، بوستان سعدی، سکندر نامہ، انشائے دل کشا، زلیخا، شمہ وغیرہ کل ۱۴ کتابوں پر آپ نے حواشی لکھے، جو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۰ء کے عرصے میں لکھے گئے اور پھر شائع ہوئے۔

مولانا حیدر زمان صدیقی ہزاروی ۱۹۰۰ / ۱۹۵۲ء

آپ ۲۲ جنوری ۱۹۰۰ء کو احمد دین صاحب کے گھر بریال متصل ریحانہ، ہری پور، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، دورۂ حدیث کی تکمیل ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کی۔

۱۹۴۰ء میں مسجد قاضیاں پٹھان کوٹ میں خطیب رہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہری پور میں آپ کا انتقال ہوا۔

تصانیف: (۱) اسلامی نظریہ اجتماع مطبوعہ نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن صفحات ۲۴۴

(۲) اسلامی نظریہ ستیا، پہلی بار پشتو مکتبہ دین و دانش سے اور دوبارہ شیخ غلام علی لاہور سے۔
(۳) اسلام کا معاشیاتی نظام، مطبوعہ ۱۹۴۹ء۔ شیخ غلام علی۔
(۴) اسلام کا نظریہ جہاد، باراول ۱۹۴۹ء، صفحات ۱۹۲
(۵) تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول وحکمت ۱۹۵۰ء، صفحات ۲۲۴
(۶) جہاد استقلال تھی۔ یہ رسالہ تحریک پاکستان کے دوران شائع ہوا

مولانا حافظ محمد ادریس طوروی ۱۹۱۵ء / ۱۹۶۵ء

آپ حافظ احمد شاہ صاحب کے گھر "طورو" ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید اپنے والد صاحب سے حفظ کیا، درس نظامی کی کتابیں اپنے نانا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے پڑھیں۔ تکمیل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کی۔

۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے "مولوی فاضل" کا امتحان پاس کرکے ۳۰۰ روپے نقد اور ایک تمغہ حاصل کیا۔

۱۹۳۵ء میں "منشی فاضل" اور ۱۹۴۰ء میں "ادیب فاضل" کے امتحانات پاس کیے۔

۱۹۳۹ء میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں دینیات اور عربی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

۴۲-۱۹۴۲ء میں اسلامیہ کالج پشاور میں اُردو اور اسلامیہ کا لجیٹ میں پشتو کی تدریس کی۔

۱۹۴۰ء میں میٹرک ۱۹۴۲ء میں انٹر، ۱۹۴۴ء میں بی اے، ۱۹۴۶ء میں ایم اے، فارسی، ۱۹۴۷ء میں ایم اے عربی کے امتحانات پاس کئے ایم اے عربی میں تمغہ حاصل کیا۔

پنجاب یونیورسٹی کے وظیفے پر بہاولپور کالج میں ریسرچ سکالر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۰ء میں محکمہ اطلاعات صوبہ سرحد میں ملازم ہوئے، ۱۹۵۱ء میں وہاں سے محکمہ تعلیم میں آگئے۔ پہلے گورنمنٹ کالج مردان، پھر ایبٹ آباد میں زبان عربی کے لیکچرر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی کے لیے بطور صدر شعبہ آپ کی خدمات مستعار لی گئیں۔

۱۹۶۵ء میں جامعہ پشاور کی طرف سے بطور ریسرچ سکالر تین ماہ کے لیے قاہرہ روانہ ہوئے۔

۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو بوئنگ طیارہ جب قاہرہ کے ہوائی اڈے کے قریب پہنچا، تو اس میں اچانک ایک دھماکہ ہوا جس سے جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، اس میں آپ کے علاوہ ملک کے ممتاز ادیب اور صحافی بھی واصل بحق ہوئے اور قاہرہ کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

تصانیف: (۱) الکشاف القرآن، تفسیر قرآن در زبان پشتو مکمل، (۲) دراستہ القرآن (۳) معجزات رسولؐ (۴) خطبات نبوی کا ترجمہ (۵) النحو الواضح لعلی جارم مصری کے پہلے تین حصوں کا اردو ترجمہ۔ (۶) میراث کہن، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کی کتاب کا اُردو ترجمہ (۷) تعلیمی قصے (۸) اسلامی قصے (۹) جمال الدین افغانی (۱۰) پشتو گرامر صفحات ۱۶۰، (۱۱) عربی ہمارے مدارس میں، صفحات ۶۴ (۱۲) چہل حدیث کا ترجمہ پشتو میں (۱۳) ذہن سے فیصلے (۱۴) خوبرزے لطیفے (۱۵) کپری نادیدہ (۱۶) ازھار الادب برائے جماعت نہم و دہم (۱۷) تعلیم الدین: حضرت مولانا اشرف علیؒ کی کتاب کے ۲۲۰ صفحات کا بزبان پشتو ترجمہ۔ یہ سب مطبوعہ ہیں۔

آپ جناب ولی اللہ صاحب لیکچرر گورنمنٹ کالج مردان کے والد محترم تھے۔ مفصل تذکرہ "سرحد کے ممتاز علمائے دین" میں ہے۔

مولانا سید انوار الحق کاکا خیل ۱۹۲۰ء / ۱۹۶۸ء

آپ عیاص بابا جد خاندان سرشتہ میاں گان کی اولاد سے ہیں، اور آگے شجرہ حضرت شیخ رحمکارؒ سے جا ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم علاقے کے علماء سے حاصل کی، تکمیل دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح سے کی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ علامہ شبیر احمد عثمانی رح کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کی، ازاں بعد اسلامیہ کالجیٹ سکول جامعہ پشاور میں کچھ مدت پڑھاتے رہے، پھر بطور لیکچرار اسلامیات آپ کا تقرر ہوا اور ایک عرصے تک تدریس کرنے کے بعد وراثِ ملازمت دسمبر ۱۹۹۰ء کو پشاور میں وصال ہوا۔

تصانیف : جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے عرصۂ تدریس میں تصنیف کا آغاز ہوا، جو آخر تک جاری رہا۔

(۱) انوار القرآن تفسیر قرآن بزبان پشتو (دو ترجمہ والی) [۲]
(۲) انوار النظر علی شرح نخبۃ الفکر :
(۳) انوار العلوم شرح سلم العلوم اردو
(۴) ردّ بدعات صفحات ۱۹۲، مطبوعہ پشاور ۱۳۶۶ھ
(۵) چہل حدیث مع ترجمہ و تشریح
(۶) اسلامیات برائے بی۔ اے، آپشنل
(۷) اسلامیات برائے انٹر
(۸) انوار الاسلام (مڈل جماعتوں کے لیے)
(۹) انوار مرقع چہل حدیث کا مجموعہ

(۱۰) ان کے علاوہ چند رسائل: گفتۂ نیکان، ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، رفقائے محسن اعظم، نماز کی سورتیں، امت کی مائیں، حج و زکوٰۃ، اور ان کے مسئلے، اسلامی عقیدے اور افتتاح تعلیمات قرآن ... یادگار چھوڑے ہیں [۱]

(اولاد میں چار فرزند، افتخار علی شاہ، وقار علی شاہ، نجم الحسن اور ذوالفقار علی شاہ ہیں)

مولانا عبدالغفور ہزاروی ثم المدنی ۱۸۹۴ء – ۱۹۶۹ء

آپ ہاشم خیل بانڈہ تخدہ، برکلی علاقہ جیزرئی، دربند ہری پور ہزارہ میں مولانا شاہ سید عباسی کے گھر پیدا ہوئے، درسیات کی تکمیل حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی سے کر کے سند الفراغ حاصل کی، پھر اسی مدرسہ امینیہ میں پانچ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا فضل علی قریشی مسکین پوری (ضلع مظفرگڑھ) سے روحانی اسباق کی تکمیل کر کے خلافت حاصل کی۔

۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں حج کے ارادہ سے حجاز پہنچے، پھر مدینہ منورہ میں قیام کرلیا۔ ۲ ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ/ ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء کو آپ کا وصال ہوا اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ تاریخ وصال درج ذیل شعر میں کہی گئی ہے۔ ؎

بزم جنت یافت از راہ بقیع
۱۳۸۹ھ
رہنمائے راہ دین عبدالغفور
۱۹۶۹ء

آپ کی تصانیف: مجموعہ دعوات فضلیہ، اوراد فضلیہ، اذکار نقشبندیہ۔

---

[۱] مولانا سراج الدین لکھتے ہیں کہ حیاض بابا کے دو صاحبزادے تھے ..... ان کی اولاد سرشتہ میاں گان کے نام سے مشہور ہے ..... ہمارے محترم دوست مولانا انوار الحق صاحب صابر فاضل دیوبند، مولوی فاضل، منشی فاضل ـــــ مدرس دینیات اسلامیہ کالجیٹ ہائی سکول پشاور کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے (تذکرہ شیخ رحمکار رح ص۱۵۱)

[۲] ذ ، ، ایم اے، سکوارڈن لیڈر، مفہوم القرآن، لپٹ ور یونیورسٹی بک ایجنسی ص

[۳] محمد مدنی عباسی، پشتو زبان اور ادب کی تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۹ء بار اوّل ص۱۱۱

مولانا عبدالغنی قریشی کوہاٹی ۱۸۸۴ء/۱۹۷۰ء

آپ ۱۸۸۴ء کو "شیری" ضلع کوہاٹ میں الحاج مولانا محمد یٰسین بن حبیب اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ وطن آکر دارالعلوم تعلیم القرآن کوہاٹ میں تدریس کا آغاز کیا، آخری سالوں میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہ کر تدریس حدیث کرتے رہے —، ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ شب جمعہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو وصال ہوا اور آبائی گاؤں میں دفن کئے گئے۔

تصانیف : (۱) تبعید اھل الایمان من ضرب الطبل و مزامیر الشیطان۔ مطبوعہ

(۲) متعدد قلمی

(۳) القضاء عمری فی صیام (قلمی)

(۴) التوسل باھل بدر الکرام (قلمی)

مولانا محمد اسحٰق خطیب ہزارہ ۱۸۹۰ء/۱۹۷۱ء

آپ "لستان" علاقہ اپر تناول، ہزارہ میں مولوی احمد گل لودھی کے گھر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کی، پھر حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب سے چند کتب کا درس لے کر دارالعلوم دیوبند پہنچے اور ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کو علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ اصغر حسین، علامہ محمد رسول خان ہزاروی سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ مدرسہ اسلامیہ گلاوٹی ضلع بلند شہر اور مدرسہ نعمانیہ لاہور میں تدریس کی۔

۱۹۲۲ء کو جامع صدر ایبٹ آباد کے خطیب مقرر ہوئے اور ۲۱ اگست ۱۹۷۱ء بروز منگل بوقت عصر وصال ہوا اور قبرستان ایبٹ آباد میں دفن کئے گئے۔ نشتر ہزاروی مرحوم نے تاریخ وصال لکھی۔

زمانے کی ہر چیز ہے بے ثبات

ہے باقی و قائم خدا ہی کی ذات

سر حادثہ چھوڑ کر لکھو نشتر

"خطیب ہزارہ" نے پائی وفات

آپ کی تصانیف میں مخزن العلوم شرح سلم العلوم، شرح میر قطبی، شرح تصریح، السیف الفارق اور پردہ ہیں۔ ان میں سے صرف "پردہ" ہی مطبوعہ ہے۔

آپ مولانا خلیل الرحمٰن شیخ الحدیث احمد المدارس، سکندر پور، ہری پور ہزارہ کے استاذ تھے۔ .... غیر مطبوعہ کتب، آپ کے فرزند، جناب محمد الیاس لودھی اسسٹنٹ سیکرٹری اسلام آباد کے پاس محفوظ ہیں۔

مولانا محمد نذیر صاحب حق سواتی! ۱۳۰۰/۱۳۹۱ھ — ۱۸۸۴/۱۹۷۱ء

آپ مولانا فضل احمد صاحب کے گھر "چکیسر" ضلع سوات میں پیدا ہوئے ۱۹۱۰ء میں حضرت مولانا قطب الدین غورغشتوی کیمبلپوری سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ پھر سرحد کے ممتاز دینی اداروں میں آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ سرحد کے اکثر علماء آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

۲۱ رمضان ۱۳۹۱ھ/۱۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو فالج کے حملہ سے وصال ہوا۔ **تصانیف :** (۱) کشف الظلم فی حل مشکلات السلم، مطبوعہ ۱۹۲۰ء بار اول۔

(۲) شرح قاضی مبارک، صفحات ۴۰۰ مطبوعہ ۱۹۷۵ء

(۳) شرح بیضاوی قلمی۔

(۴) شرح بخاری قلمی

مولانا شیر زمان ہزاروی ۱۸۹۱ء/۱۹۷۲ء

آپ بفہ تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں جناب لطف اللہ خاں سواتی کے گھر پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر اوّل سے آخر تک تمام کتب پڑھیں۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۴ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔ پھر مختلف مدارس میں تدریس کرتے رہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گورنمنٹ مدرسہ عالیہ سلہٹ میں تدریس پر مامور ہوئے اور ۲۷ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں، آخر میں ۹ ماہ تک وہاں کے مدیر بھی رہے، ۱۹۴۷ء کو وہاں سے واپس وطن آئے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء کو بفہ میں انتقال ہوا، بیعت کا تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے تھا۔

تصانیف : (۱) ابت باہ الرقود فی حل سنن ابی داؤد (صرف کتاب الصلوٰۃ، صفحات ۲۰۰ (قلمی)

(۲) فرحت القاری علی صحیح البخاری صفحات ۱۶۸ (قلمی)

آپ عزیز الرحمٰن، سعید الاسلام، امین الاسلام اور ولی اللہ خاں صاحبان کے والدِ محترم تھے۔

مولانا قاضی عبد الرب پشاوری ۱۸۸۶ / ۱۹۷۲ء

آپ مولانا قاضی دیرکنوں صاحب کے گھر زیارت کاکا صاحب، تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی اور متوسط تعلیم مولانا محمد اسرائیل طورو دی مردانی سے حاصل کر کے مدرسہ عبد الرب دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۵ء کو حضرت مولانا عبد العلیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ مختلف مقامات پر تدریس کرنے کے بعد جمرود، پشاور میں خطیب مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک خطابت کرتے رہے۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ/۲۰ جون ۱۹۷۲ء کو آپ کا وصال ہوا۔

آپ کی تصانیف میں ایک **قصص القرآن** (بزبان پشتو) قلمی ہے، جو آپ کے فرزند مولانا عبد القدوس صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کے پاس محفوظ ہے۔

پیغمبرِ اسلام کے نام سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کمیٹی پتّی ضلع لاہور کی شائع شدہ کتاب کا ترجمہ کیا، جو شائع ہو چکا ہے۔

مولانا مفتی محمود حسن ہزاروی ۱۸۹۲ - ۱۹۷۳ء

آپ ۵ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء کو ذیدل کاپچ، علاقہ جیغرزئی ضلع ہزارہ میں مولانا حاجی احمد خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، پھر کچھ عرصہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے سندھ میں پڑھتے رہے۔ تکمیل مدرسہ معینیہ اجمیر شریف میں مولانا معین الدین صاحب سے کی۔ پھر اسی مدرسہ اور "صوفیہ" میں کچھ عرصہ تدریس کرنے کے بعد جامعہ حسینیہ راندیر سورت میں پہلے بطور صدر مدرس اور شیخ الحدیث ۲۶ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ تقسیم ملک کے باعث وطن آئے اور پھر کچھ عرصہ "مطلع العلوم" بروری روڈ کوئٹہ میں تدریس کی۔

۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں جامعہ عربیہ اسلامیہ نزد عید گاہ کوئٹہ کی بنیاد رکھی اور ایک مسجد بھی اس میں بنوائی، آخری وقت تک یہاں تدریس و افتاء کے کام میں لگے رہے۔ یکم ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء کو آپ کا وصال ہوا، اور اسی مدرسہ کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔

تصانیف : آپ کی تصانیف میں معین العقائد صفحات ۹۶ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء

(۲) "معین الحکمت" صفحات ۱۰۴، مطبوعہ حیدرآباد دکن

(۳) "معین الفرائض" مطبوعہ دہلی صفحات ۱۲۶،

(۴) "معین المنطق اوّل و دوم" صفحات حصہ اوّل ۴۸ اور حصہ دوم ۱۴۸ بار دوم کراچی۔

(۵) "التذکرۃ المحمودۃ" اپنا مختصر سوانحی تذکرہ بزبان عربی۔ مطبوعہ سندھ۔ (آپ پیر سید غلام مصطفےٰ قادری کلیدار کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔)

مولانا عبدالعزیز ہزاروی ۱۹۲۲ء – ۱۹۷۲ء

آپ ۱۹۲۲ء کو کنو کرہ، تحصیل بگرام، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ عالیہ رامپور میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند الفراغ حاصل کی، پھر کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بھی پڑھتے رہے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی سے مولوی، عالم، فاضل اور پنجاب سے مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے، فراغت کے بعد لاہور آئے اور پھر لاہور سے کوئٹہ پہنچے، وہاں اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس دینیات مقرر ہوئے اور ساتھ ہی مطلع العلوم میں تدریس کرتے رہے۔ پھر دارالرشاد کی بنیاد رکھی جامع مسجد چمن گیٹ میں امام و خطیب تھے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو وہیں آپ کا وصال ہوا۔ اور وہیں دفن کئے گئے۔

تصنیفات: (۱) احکام القرآن (اردو ترجمہ) (۲) سوشلزم اور دین و مذہب (۳) سورۃ بقرہ (تفسیر) (۴) سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کے بعض اجزاء کا ناتمام ترجمہ۔

مولانا عبدالحق نافع پشاوری ۱۳۱۳ – ۱۳۹۳ھ / ۱۸۹۵ – ۱۹۷۳ء

آپ ۹ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء کو میاں شاہ گل صاحب کے ہاں زیارت کاکا صاحبؒ۔ نوشہرہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے کی، تکمیل دورۂ حدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے دارالعلوم دیوبند میں کی۔ فراغت کے بعد کچھ عرصہ نواکھلی بنگال میں تدریس کی، پھر ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء کو دارالعلوم دیوبند میں استاذ درجۂ علیا کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۵ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں

تقسیم ملک کی وجہ سے وطن آئے، پھر مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں ۲ سال، دارالعلوم چارسدہ پشاور میں دو سال، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں دو سال تک شیخ الحدیث رہے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ/۹ جنوری ۱۹۷۳ء بوقت ۲½ بجے شام سخاکوٹ (مردان) میانشاہ زکلے میں وصال ہوا

تصانیف: آپ کی تصانیف میں نفع المتندی اور ایضاح فتاویٰ۔ دونوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔

آپ مولانا سید عبداللہ صاحب کاکاخیل، فاضل مدینہ یونیورسٹی، استاذ مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کے والد محترم تھے۔

مولانا غلام ربانی لودھی ہزاروی ۱۸۹۹ء – ۱۹۷۴ء

آپ ۱۸۹۹ء کو سرائے صالح ہری پور ہزارہ میں مولوی برکت اللہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انٹر کا امتحان اسلامیہ کالج پشاور سے پاس کرکے بی۔ اے میں داخلہ لیا، ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کے امتحان کے رولنمبر مل چکے تھے کہ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہوکر جامعہ ملیہ دہلی چلے گئے۔ وہاں مولانا محمد علی جوہر، خواجہ عبدالحیٔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، صحافت کے میدان میں آئے، تو یہاں بھی جرأت و مردانگی کے ساتھ اس پیشے کے وقار کو قائم رکھا۔ روزنامہ "وکیل" امرتسر، روزنامہ "زمیندار" لاہور، "انقلاب" لاہور، "احسان" لاہور اور "مساوات" لاہور میں دو، دو سال تک بطور مدیر معاون کام کیا، ہفت روزہ "شہاب" راولپنڈی کے دو سال تک مدیر رہے، اسی طرح ماہنامہ "ترجمان" سرائے صالح کے ۳ سال تک مدیر رہے، پشاور کے سہ روزہ "رضیتے خدائی خدمت گار" میں بھی کچھ عرصہ بطور مدیر کام کیا۔

۱۹۴۰ء میں مولانا میر واعظ محمد یوسف کی دعوت پر نصرۃ الاسلام کالج سری نگر میں دو سال تک تدریس کی، اسی دوران بی اے کا وہ امتحان، جو ۱۹۲۰ء کو دینا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں دیا اور پاس ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں اینگلو محمڈن

ڈگری کالج امرتسر میں بطور لیکچرار آپ کا تقرر ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد ایم اے او کالج لاہور میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۴ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

درس نظامی کی اکثر کتابیں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے قیام امرتسر کے دوران پڑھیں، دورۂ حدیث کی تکمیل مدرسہ غزنویہ میں کی۔

تصنیفی خدمات: (۱) مشیر قوم صفحات ۲۷۰ (۲) سیرۃ النبیؐ پانچویں سے آٹھویں تک سکول کے طلبہ کے لیے (۳) ذخیرۃ المضامین (۴) سیرۃ الغازی کمال پاشا، (عربی کتاب کا اردو ترجمہ) (۵) دختر سمرنا (عربی سے اردو ترجمہ) (۶) مشکوٰۃ الانوار (اردو ترجمہ) (۷) دیدارالٰہی (امام ابن رجب کی عربی کتاب کا ترجمہ) (۸) ترجمہ سورۃ اخلاص، (۹) الفرقان (۱۰) بدایۃ الہدایۃ وغیرہ کتب مطبوعہ ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی ۱۹۱۳ء / ۱۹۷۵ء

آپ مینئی تحصیل صوابی ضلع مردان میں مولوی سید امیر بن سرطبہ خان کے گھر پیدا ہوئے۔

دورۂ حدیث کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۵۸ھ/۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کی۔ فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے۔ آخر میں دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث تھے۔ ۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو آپ کا وصال ہوا۔

تصانیف: (۱) جواہر الاصول فی اصول الحدیث (عربی) مطبوعہ بار سوم (۲) رسالہ فیضان الباری شرح حدیث عبداللہ بن زبیر فی البخاری مطبوعہ۔ (۳) الکوثر الجاری علی ریاض البخاری حصہ اول، مطبوعہ پشاور

مولانا سرفراز صفدر صاحب

شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

آپ ۱۹۱۴ء کو جناب نور احمد خان بن گل احمد خان کے گھر ڈھکی چیڑاں" داخلی کڑمنگ بالا، علاقہ کونش تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں پیدا ہوئے، قومیت کے لحاظ سے سواتی (پٹھان) ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی، پھر سیالکوٹ اور ملتان کے علماء سے استفادہ کیا۔ ازاں بعد انوار العلوم گوجرانوالہ کے صدر مدرس مولانا عبدالقدیر صاحب سے پڑھتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے چھوٹے بھائی مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد چودھری فخرالدین اور ماسٹر کرم دین کی دعوت پر گکھڑ (گوجرانوالہ) تشریف لائے اور جامع کی خطابت کے ساتھ تدریس کا آغاز کیا۔ اس دوران ہمیشہ بیس پچیس طلبہ آپ سے پڑھتے رہے۔ ۱۳۷۲ھ کو نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں آپ کا تقرر ہوا اور اب کئی سال سے دورۂ حدیث پڑھا رہے ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے آپ گورنمنٹ ٹریننگ سکول گکھڑ میں ۔۔۔۔ درس قرآن دیتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج کی سعادت بخشی۔

تبلیغی خدمات: جامع گکھڑ کے علاوہ ملک کی اہم تبلیغی کانفرنسوں میں آپ کے عالمانہ خطاب ہوتے ہیں۔

تصنیفی خدمات: تدریس کے ساتھ اللہ نے آپ کو لکھنے کی اعلیٰ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں (۱) احسن الکلام حصہ اوّل و دوم (۲) راہ سنت (۳) علم غیب (۴) صرف ایک اسلام چراغ کی روشنی، گلدستہ توحید، راہِ ہدایت، آنکھوں کی ٹھنڈک، مسئلہ قربانی، آئینہ محمدی، مقام حضرت امام ابوحنیفہؒ، باب جنت، دل کا سرور، تبلیغ اسلام، انکار حدیث کے نتائج، عیسائیت کا پس منظر، طائفہ منصورہ، ۔۔۔۔۔۔ بانی دارالعلوم دیوبند، تحقیق الدعاء بعد نماز جنازہ، چالیس دعائیں ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ مرزائی کا جنازہ اور مسلمان، درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ، نماز مسنون مع اذکار و ادعیہ، الکلام الحاوی علی الطحاوی، شوق حدیث، مسئلہ طلاق ثلاثہ، حکم الذکر بالجہر، مسئلہ حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور عبارات اکابر

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رسالوں میں سب سے بڑے مولانا ناراہ مالاشذی ہیں جنہوں نے احسن الکلام کا خلاصہ اطیب الکلام کے نام سے کیا ہے۔

جناب مولانا سید بادشاہ گل صاحب

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک پشاور

آپ بروز جمعہ ماہ صفر ۱۳۳۲ھ / دسمبر ۱۹۱۴ء کو جناب سید سران علی شاہ بن سید حبیب شاہ بخاری کے گھر اکوڑہ خٹک تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی، پھر ملوگی مضافات پشاور کے کوہستان ملا سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مولانا محمد اسماعیل صاحب آف شیدو نزد اکوڑہ سے شرح جامی، منطق اور اصول کی کتب پڑھیں۔ زاں بعد مسجد طرق الباتع پشاور کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مولانا عبدالحنان صاحب فاضل دیوبند سے فنون کی تمام کتابیں پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۵۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۷ھ میں بخاری و ترمذی حضرت مدنیؒ سے، مسلم مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سے، ابوداؤد مولانا میاں اصغر حسین صاحب سے، موطا امام مالک مفتی محمد شفیع صاحب سے اور طحاوی مولانا شمس الحق صاحب افغانی سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

تدریسی خدمات: فراغت کے بعد اکوڑہ واپس آکر مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی، اولاً مسجد باباجی صاحب میں تدریس شروع کی، پھر بر لب سڑک اپنی زمین میں عظیم الشان عمارت میں تدریس کا کام شروع ہوا۔ آپ کے ساتھ آپ کے استاذ مولانا عبدالحنان صاحب بھی تدریس پر فائز رہے۔

بیعت کا تعلق اپنے والد صاحب سے ہے۔ انہوں نے آپ کو سلسلہ قادریہ اور نقشبندیہ میں خلافت دی۔ زاں بعد آپ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور انہوں نے بھی آپ کو خوب نوازا اور بہت سے عملیات کی اجازت بھی دی۔

تصنیفی خدمات:

۱۔ "فیوضات حسینیہ" پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تقریظ ثبت ہے۔

۲۔ "دعوت الحق" چار سوالوں کا مدلل اور مفصل جواب (سماع، زیارۃ القبور و تدوین حدیث)۔

۳۔ "زیارۃ القبور" دو تین سو صفحات کی کتاب ہے۔

۴۔ "کتاب الوسیلہ" تین سو صفحات

۵۔ "نور و بشر" ۷۰ صفحات

۶۔ اعفاء اللحی من سنن النبی المصطفیٰ المعروف بہ مسنون داڑھی صفحات ۸۰ (مطبوعہ)

ان کے علاوہ "محمد التعال علی تراجم صحیح البخاری" (عربی) جلد اول کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔

"شرح ترمذی" (عربی) کے بھی تین سو کے قریب صفحات ہو چکے ہیں۔ شرح ایساغوجی، ہدایۃ النحو (پشتو میں) شرح "ضابطۃ النحو" ۵۰۰ کے قریب، زاد الذاکرین، ارشاد السالک الی کلام المالک، کافیہ کی مکمل ترکیب چار پانچ سو صفحات — یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔

اولاد میں چھ فرزند سید محمد قاسم، محمد طاہر علی شاہ، سید انور علی شاہ، اظہر علی شاہ، سید حسین احمد، طیب علی شاہ ثانی اور دو بچیاں ہیں۔

حضرت مولانا سید شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ

آپ قصبہ ترنگزئی، تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ آپ پاکستان کے چوٹی کے صاحب سواد اور استعداد علماء میں سے ہیں۔ گیارہ سال تک ریاست ہائے متحدہ بلوچستان (قلات، خاران، مکران اور لس بیلہ) کے وزیر معارف

شرعیہ (زیر تعلیم) رہ چکے ہیں۔ بیسیوں مدرسوں میں اعلیٰ تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔ صاحب نسبت بزرگ ہیں۔ تین سلسلوں میں مجاز بیعت ہیں۔ جید عالم اور بہترین مصنف ہیں۔ آپ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

اکابر علمائے دیوبند کی یادگار ہیں۔ اس پیرانہ سالی اور مصروفیت کے باوجود درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ ہم آئندہ سطور میں ان کی زندگی کی ایک جھلک پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک انہیں تادیر سلامت رکھیں اور مزید علمی خدمات کی توفیق بخشیں اور ہم مسلمانوں کو ان کی برکات سے محروم نہ فرمائیں (آمین ثم آمین)

قمری سن کے مطابق آپ ۶ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ اور سکول کے ریکارڈ کے مطابق آپ ۹ ستمبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔

نام و نسب: نام شمس الحق رکھا گیا۔ آپ سید جلال الدین حیدرؒ کی اولاد سے ہیں جن کا سلسلہ حسینی۔ مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی کی کتاب "صوفیائے پنجاب" کے صفحہ ۱۵۵ پر درج ہے۔ مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:

شمس الحق ابن مولانا غلام حیدر ابن مولانا خان عالم ابن مولانا سعد اللہ

آپ کے والد بزرگوار مولانا غلام حیدر، مولانا عبدالحلیمؒ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ علوم دینیہ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ پشتو اور فارسی زبان کے بلند پایہ اور صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کے کلام میں عالمانہ شان اور صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کے پردادا مولوی سعد اللہ صاحبؒ مجاہد کبیر، حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ تھے۔ انہی کی امارت میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ مشہور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سیرت احمد شہید" میں خلفاء کی فہرست میں چوتھے نمبر پر ان کا نام نامی تحریر فرمایا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ ۲۸ جولائی ۱۹۰۹ء کو پرائمری سکول میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۳ء میں فارغ ہوئے۔ بعد ازاں سرحد و افغانستان کے مختلف مشاہیر علماء سے تمام فنون کی تکمیل کر کے تکمیل حدیث کے لئے امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی خدمت میں پہنچے ۱۹۲۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں سند فراغ حاصل کی۔ حدیث کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں علم طب کی بھی تکمیل کی۔

تبلیغی خدمات: جون ۱۹۲۲ء میں حج بیت اللہ و زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو کر واپس ہندوستان تشریف لائے۔

اس مبارک سفر سے واپس آئے تو ہندوستان میں شدھی تحریک زوروں پر تھی۔ دارالعلوم دیوبند نے شردھانند کے فتنہ ارتداد اور شدھی تحریک کی روک تھام کے لئے جو پچاس مبلغین راجپوتانہ بھیجے۔ ان کی قیادت و سرپرستی آپ کے سپرد کی گئی۔ تبلیغ کا مرکز آریہ سماج کے خلاف شہر آگرہ محلہ دھولی کھار میں قائم کیا گیا۔ تبلیغی کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ راجپوتانہ کے ہزاروں برائے نام مسلمانوں کو پختہ مسلمان بنا کر ارتداد سے بچا لیا۔ آپ کی مخلصانہ اور موثرانہ تبلیغی مساعی کی وجہ سے ہزاروں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ انہوں نے چوٹی کٹوائی، یہ سیروں بال بطور یادگار دارالعلوم دیوبند بھیجے گئے۔ آریوں کے مختلف مشہور مناظرین کو عام جلسوں میں عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ پنڈت رام چندر، دلیپ سنگھ اور خود شردھانند میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب فتنہ ارتداد کے خاتمہ پر کامیابی کے ساتھ واپسی ہوئی تو دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانی تشریف فرما تھے۔ ان کے ارشاد پر آپ نے تبلیغی حالات و کوائف پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ ان بزرگوں نے دل کھول کر دعائیں دیں۔

کم و بیش ایک سال تک دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں نادر کتب کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر آپ کا قیام

حجاز میں تقریباً دو برس مارہا۔ اس دوران میں بھی آپ نے سلطان عبدالحمید خان کے کتب خانہ میں اپنا وقت قیمتی اور نادر کتب کے مطالعہ میں صرف فرمایا۔

تدریسی خدمات: آپ کی علمی اور تدریسی زندگی کا مختصر سا خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ کی علمی عظمت و شان کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

- صدر مدرس مدرسہ مظہر العلوم، کھڈہ کراچی ۱۳۲۱ھ
- صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور ۱۳۳۱ھ
- صدر مدرس مدرسہ دارالرشاد جھنڈہ سندھ
- وزیر معارف ریاست قلات ۱۹۳۹ء
- دوبارہ وزیر معارف قلات ۱۹۴۷ء
- صدر شعبہ تفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور ۱۹۶۳ء
- صدر مدرس مدرسہ دارالرشاد العلوم قصبہ علی خاں لاڑکانہ سندھ ۱۳۴۲ھ
- صدر مدرس دارالفیوض ہاشمیہ سجاول سندھ ۱۳۵۰ھ
- مدرس اعلیٰ و شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند ۱۹۲۵ء
- صدر مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۹۴۴ء
- شیخ التفسیر والحدیث اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ ۱۹۶۲ء

وزارت تعلیم: ۱۹۳۹ء میں آپ کو ریاست ہائے متحدہ بلوچستان قلات کے والی کی طرف سے وزارت تعلیم کی پیشکش کی گئی، چنانچہ اکابر دیوبند کے مشورہ پر آپ نے یہ پیشکش قبول فرمائی اور اسی سال آپ نے قلات کی وزارت سنبھالی۔ آپ کے وزارت میں آنے سے ریاست کے شعبہ ہائے قضا میں جان پڑ گئی۔

تمام تنازعات کا فیصلہ جلد از جلد قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ ریاست کے عوام کو خوشی و اطمینان کی زندگی ملی۔ اس ذمہ دارانہ منصب پر آپ ۱۹۳۹ء اور بعد از پاکستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک پورے گیارہ سال فائز رہے۔ ان سالوں میں آپ نے قوم و ملت کی جی بھر کر خدمت کی۔ اسی دوران میں آپ نے قضا اور افتاء کے متعلق فقہ اسلامی سے چیدہ چیدہ اصول منتخب کرکے ایک کتاب معین القضاۃ والمفتین عربی زبان میں لکھی اور اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس میں اسلامی قوانین کو بحوالہ کتب جدید طرز پر بشکل دفعات مرتب کیا ہے۔ اس کتاب پر آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند نے قرارداد کے ذریعہ مبارک باد بھیجی جو اخبار الجمعیۃ و رسالہ الصدیق میں چھپی۔ یہ کتاب افغانستان، ترکی، عراق، مصر، لبنان اور شام والوں نے طلب کی اور بغداد شارع الشیخ میں اس کی ایجنسی قائم ہوئی۔

وزارت سے استعفیٰ: ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بن جانے کے بعد بھی شاہی اور منصب بدستور قائم تھا، لیکن وزارت کا عہدہ قانوناً ممکن نہ تھا اور شرعی فیصلہ پر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں اپیل کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی اور جس کے ارکان شرعی قانون کی پوری واقفیت نہ رکھتے تھے، اس لئے آپ نے استعفیٰ دے دیا، حالانکہ استعفیٰ نہ دینے کی صورت میں بڑی تنخواہ اور بڑی پنشن سے آپ مستفید ہو سکتے تھے، لیکن آپ نے غیر عالم دین کو عالم دین کے فیصلہ پر حق اپیل دینے کو شان و وقار شریعت کے خلاف سمجھ کر مالی فائدہ کو نظر انداز فرما دیا، بقول شاعر ؎

اس کے سوا جہاد کے معنی ہیں اور کیا
اسلام کا وقار بڑھاتے ہوئے چلو

تصنیفی خدمات: ۱۔ آپ کی ایک عربی کتاب معین القضاۃ و المفتین کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ شرعی ضابطہ دیوانی: یہ اردو زبان میں ہے۔ اس میں اسلامی فقہ کے تمام دیوانی قوانین دفعات کی صورت میں جمع کئے گئے ہیں۔ ملک کے ممتاز قانون دان اے کے بروہی نے اسے بہت پسند کیا اور طلب فرمائی۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں مکتبہ صدیقیہ ملتان سے مل سکتی ہیں۔

۳۔ علوم القرآن: اردو زبان میں ہے۔ مہتمم مدرسہ فاروقیہ

بہاول پور نے اسے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پشاور یونیورسٹی ایم اے اسلامیات کے نصاب میں داخل ہے۔

۴۔ "ترقی اور اسلام": یہ کتاب پشاور اور لاہور میں شائع ہو چکی ہے اور اس کا بنگالی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ "سوشلزم اور اسلام": جامعہ اسلامیہ بہاول پور اور مفتی عبدالغنی صاحب بہاول پور نے چھاپی ہے۔

۶۔ "سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا موازنہ اسلام سے": مولانا عبدالرحمن صدیقی صاحب نوشہرہ صدر پشاور والوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ لاہور سے طبع کروائی ہے۔

۷۔ "اسلام دین فطرت ہے"
۸۔ "اسلام عالمگیر مذہب ہے"
یہ دونوں کتابیں مجلس تحفظ ختم نبوت احمد پور شرقیہ نے شائع کروائی ہے۔

۹۔ "عائلی مشکلات اور اس کا قرآنی حل": ناشر جامعہ اسلامیہ بہاول پور
۱۰۔ "مدارس کا معاشرہ پر اثر": ناشر جامعہ اسلامیہ بہاول پور

۱۱۔ "معدن السرور فی فتوی بہاول پور"
۱۲۔ "متنازعہ مسائل کا حقیقی حل"
مولوی نعمت معدن جلسہ پشاور

۱۳۔ "آئینۂ آریہ": مطبوعہ لاہور ۱۹۳۵ء اس میں مضبوط دلائل سے آریہ سماج کی تردید کی گئی ہے۔ یہ کتاب نایاب ہے۔

۱۴۔ "تصوف اور تعمیر کردار": شائع کردہ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان لاہور۔

۱۵۔ "اسلامی جہاد"؛

۱۶۔ "کمیونزم اور اسلام" (اردو) اس کا بنگالی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۷۔ "احکام القرآن"؛
۱۸۔ "مفردات القرآن"؛
۱۹۔ "مشکلات القرآن"؛
۲۰۔ "حقیقت زمان و مکان"؛
۲۱۔ "تنقیح الشذی علی جامع الترمذی"
یہ کتابیں زیر طبع ہیں

ان کتابوں کے علاوہ آپ کے علمی اور تحقیقی مضامین پاکستان کے جرائد و مجلات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر "انوار مدینہ" اور "الحق" میں لکھتے ہیں۔

موتمر عالم اسلامی کوالالمپور میں شرکت: حضرت مولانا نے کئی ایک بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر کے پاکستان کا وقار دنیائے اسلام میں بلند کر دیا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کوالالمپور، ملائیشیا میں آپ نے بحیثیت پاکستانی وفد کے ایک رکن کے شرکت فرمائی اور "تعدد ازواج" کے مسئلہ پر ایسی عالمانہ بحث فرمائی کہ آپ کے علمی دلائل کو عالم اسلامی کے علماء نے تسلیم کیا اور رمضان و عید کے ثبوت کے لئے رویت پر مدار رکھنا اور حساب پر نہ رکھنے کے بارے میں بھی آپ کے دلائل کی روشنی میں فیصلہ ہوا کہ "تعدد بشرط العدل" درست ہے اور رمضانیت و عیدیت کا مدار رویت پر ہے نہ کہ حساب پر۔ اسی طرح موتمر عالم اسلامی اسلام آباد میں آپ نے سود، بیمہ، انشورنس کی کمیٹی کے سامنے جب ..... مضبوط دلائل پیش فرمائے، تو عالم اسلام کے علماء عش عش کر اٹھے۔ آپ نے دلائل حضرت کچھ ایسے انداز سے بیان فرمائے کہ عالمی علماء نے ان کے حرام ہونے کا فیصلہ آپ کے دلائل کے مطابق دے دیا۔ ان کانفرنسوں میں آپ کی نمائندگی کا عالمی ریکارڈ موجود ہے۔

صوفیانہ مسلک: سلسلہ قادریہ میں آپ اپنے والد مولانا غلام حیدر مرحوم سے بیعت ہوئے۔ پھر حضرت مولانا غلام محمد صاحب دین پوری سے اس کی تکمیل کی۔

سلسلہ نقشبندیہ میں مجاز بیعت: سلسلہ نقشبندیہ سرزمین حجاز میں شیخ عثمانی جامع الطریقین النقشبندیہ والقادریہ علاؤالدین عراقی، بیارہ ضلع سلیمانیہ سے حاصل کیا۔

چونکہ یہ بحث تقریباً آٹھ ماہ تک رہی، اس لئے حضرت نے اجازت بیعت بھی مرحمت فرمادی جو آپ کے پاس مرشدہ محفوظ ہے۔

سلسلہ چشتیہ صابریہ کی بیعت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے، اور اجازت حضرت مفتی محمد حسن سے حاصل ہوئی، یہ سب سلاسل سلسلۂ علماء ربانی مطبوعہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں موجود ہیں۔ من شاء فلیراجع

آپ کے چند مشاہیر تلامذہ: آپ کے تلامذہ کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور دور دراز تک پھیلا ہوا ہے

ان چند مشاہیر تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو اب بھی دین محمدی کی اشاعت میں شب و روز مصروف عمل ہیں:

۱۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، کراچی

۲۔ مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب استاذ الحدیث خیر المدارس ملتان

۳۔ مولانا محمد شریف صاحب استاذ اعلیٰ خیر المدارس ملتان

۴۔ مولانا نور محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ ہاشمیہ بہاولکراچی

۵۔ مولانا فضل احمد صاحب شیخ الحدیث مظہر العلوم کھڈہ کراچی

۶۔ مولانا عبدالکریم صاحب شیخ الحدیث نجم المدارس کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان۔

۷۔ مولانا عبدالرحمن صاحب شیخ الحدیث تعلیم القرآن راولپنڈی

۸۔ مولانا عبدالرؤف صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ چارسدہ۔

۹۔ مولانا مجاہد الحسینی صاحب
خطیب جامع مسجد کلاں لائلپور

۱۰۔ حضرت مولانا قاضی عبدالحی چن پیر صاحب ہاشمی سابق استاذ جامعہ اسلامیہ بہاولپور و خطیب مرکزی جامع مسجد حویلیاں، ہزارہ۔

۱۱۔ مولانا لطائف الرحمن صاحب سواتی، استاد جامعہ اسلامیہ بہاولپور۔

۱۲۔ مولانا حافظ محمد الیاس صاحب خطیب مسجد پڑیاں لہ راولپنڈی لاہور

۱۳۔ مولانا علی اصغر صاحب ڈسٹرکٹ خطیب نیلا گنبد لاہور

یہ حضرت مولانا کی زندگی کی ایک جھلک ہیں، ویسے مولانا کی شخصیت اس سے کہیں بلند ہے۔ عربی شاعر نے بجا کہا ہے ؎

فَإِنِّي إِنْ أَكْثَرْتُ فِيهِ مَدَائِحِيْ
فَأَكْثَرُ مِمَّا قُلْتُ مَا أَنَا تَارِكٌ

ماخذ و مصادر: (۱) ماہنامہ الحق (۲) اسلام اور سوشلزم کا مقدمہ (۳) سیرت سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر (۴) حضرت موصوف کا ارسال کردہ مواد۔ (۵) مقدمہ بخاری از مولانا لطائف الرحمن صاحب (۶) سلاسل سلسلۂ علماء ربانی (۷) اسلامی تعلیمات، حضرت مولانا قاضی عبدالحی چن پیر صاحب اور مولانا کی تصانیف۔

۱۴ جون ۱۹۷۳ء کو جامعہ اسلامیہ سے سبکدوش ہو کر آبائی وطن آگئے ہیں۔

مولانا محمد اشرف خان صاحب

صدر شعبۂ عربی　　　　اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

آپ ۲ مئی ۱۹۲۵ء کو محلہ مقرب خان شہر پشاور میں محمد اکبر خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ قبائل افاغنہ کی مہند اکبرخیل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں اسلامیہ ہائی سکول پشاور سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء میں اسی یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا، پھر سیاست میں آگئے اور مسلم لیگ ضلع پشاور کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے ایماء پر سیاست کو خیرباد کہہ کر دوبارہ حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا داخلہ

لیا اور ۱۹۵۲ء میں درجہ اول میں ایم۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا، پھر پرائیویٹ ایم۔ اے فارسی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

دینی تعلیم آپ نے قاضی مولانا انور الاعظم باجوڑی سے حاصل کی۔ صحاح ستہ (الا ابن ماجہ) انہی سے حرفاً حرفاً پڑھیں۔ آپ کی دینی تعلیم زیادہ تر انہی کا فیض ہے۔ بعد میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نے بھی آپ کو سند حدیث عطا فرمائی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا فقیر محمد صاحب کی طرف سے آپ مجاز بیعت بھی ہیں۔

تصنیفی کام: ۱۱ سال کی عمر میں آپ کی ایک تقریر "ہمارا نبیؐ" نامی کتاب میں سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کے عبدالمجید قریشی نے اخوت و مساوات کے نام سے شائع کی۔ مضامین لکھنے کا سلسلہ اس وقت سے اب تک جاری ہے۔

۱۹۵۷ء میں آپ کو تبلیغی جماعت کے ساتھ جرمنی جانا ہوا تو "جادۂ حبیب" کے نام سے ایک سفرنامہ لکھا جو بالاقساط "الفرقان" لکھنؤ میں شائع ہوتا رہا۔ اب یہ سفرنامہ مکمل شائع ہونے والا ہے۔

(۲) پیام رسالت : ۸۰ صفحات،

(۳) سلوک سلیمانی ۱۷۶ صفحات

(۴) اسلام کا نظریہ عدل وجزا (اس کا عربی اور بنگالی میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے)

(۵) ایک انگریزی کتاب

بڑے سائز کے ۱۰۰ صفحات پر ٹائپ شدہ

(۶) "شاہراہ معرفت": بڑے سائز کے ۱۱سو صفحات پر مشتمل ہے

(۷) "نظام ہدایت": اس کا مسودہ بھی ۶۰ صفحات کا ہے

(۸) "مکتوبات سلیمانی": سید سلیمان ندوی کے ۴۰ غیر مطبوعہ مکتوبات کا مجموعہ

(۹) رومی کا پیغام عصر حاضر کے نام!

(۱۰) رسول اکرمؐ کا معاشی نظام۔ (۱۱) حدیث ناگفتنی

مولانا محمد طاہر صاحب پنج پیر، مردان شیخ الحدیث والتفسیر، دارالقرآن، پنج پیر، تحصیل صوابی ضلع مردان

آپ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۱۷ء کو پنج پیر تحصیل صوابی ضلع مردان میں جناب غلام نبی بن آصف خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ ازاں بعد حضرت مولانا حسین علی صاحب سے تفسیر اور حدیث کا درس لیا۔ پھر انہی کے ارشاد پر حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتوی کیمبلپوری سے دورۂ حدیث پڑھا۔ پھر مولانا حسین علی صاحب سے صحاح ستہ کے بعض مقامات کا درس لیا اور روحانی اسباق اور ذکر اذکار کا طریقہ سیکھا۔ فلسفہ حکمت کی کتب کا درس مولانا غلام رسول ساکن انہی ضلع گجرات سے لیا۔ علمی پیاس بجھانے کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور وہاں کے اساتذہ سے خوب خوب استفادہ کیا۔ ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی۔ مولانا اعزاز علی صاحب کے ارشاد پر مدرسہ منبع العلوم گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں ایک سال تدریس کی۔ ۱۹۳۸ء کو حج کے لئے جانا ہوا، وہاں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے قرآن مجید، حجۃ اللہ البالغہ اور طبقات کا درس لیا۔

۱۳۵۷ھ سے پنج پیر میں اپنے اساتذہ کے ارشاد پر تفسیر و حدیث کا درس دینے میں مشغول ہیں، قاطع بدعات ہیں۔

تصانیف: ۱۔ ضیاء النور: صفحات ۳۰۸ مطبوعہ منظور عام پریس پشاور۔

۲۔ البصائر للمتوسلین بالمقابر۔ صفحات ۱۹۶ 〃 〃 〃

۳۔ نیل السائرین فی طبقات المفسرین صفحات ۳۶۸ 〃 〃 〃

۴۔ بسط الدرر فی ربط الآیات والسور صفحات ۲۵۴ بار چہارم مکتبہ علمیہ لاہور۔

۵۔ الانتصار لسنۃ سید الابرار

۶۔ النشاط من حیلۃ الاسقاط۔ بار دوم حیدریہ پریس پشاور صفحات ۶۶

۷. اصول السنۃ لرد البدعۃ (عربی) ،، ،، ۱۰۲ صفحات
۸. الرسالۃ البیضاء فی مسئلۃ الدعاء ،، ،، ،،
۹. رسالہ فی التردید الصارمۃ لعہد العیدین ،، ،،
۱۰. منشور جماعت اشاعۃ التوحید والسنۃ صفحات ۲۲
۱۱. حقیقۃ مودودی
۱۲. الحواشی علی البخاری
۱۳. مرشد الحیران الی فہم القرآن
۱۴. العرفان فی اصول القرآن ۴۰۰ صفحات (غیر مطبوعہ)
۱۵. تیسیر القرآن الکریم وترجمتہ بالافغانیۃ
۱۶. البرہان فی اصول القرآن

مولانا خان زمان ہزاروی ۱۸۸۵ —— ۱۹۶۰ء

آپ ۱۸۸۵ء کے قریب مانسہرہ (ہزارہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے جامع العلوم، کانپور کے صدر مدرس حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب ہزاروی سے موقوف علیہ کی تکمیل کر کے سند الفراغ حاصل کی۔

تدریس: فراغت کے بعد اپنے استاذ مکرم کی معیت میں تدریس کا آغاز کیا۔ ابھی پانچ سال ہی پڑھانے پائے تھے کہ آپ کے استاذ جامع العلوم سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی علیحدگی کے بعد ایک عرصہ تک آپ نے بحیثیت صدر مدرس اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں سے صرف ایک کتاب حل الغوامض فی شرح التلخیص (مطبوعہ) ہی کا نام معلوم ہو سکا ہے۔

شادی: کانپور کے مشہور طبیب اور سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالصمد کی بہن آپ کے نکاح میں آئیں، مگر اولاد نہیں ہوئی۔

آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کانپور کے مشہور طبیب اور سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالصمد جو ایک زمانے میں یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر اور کانپور مسلم لیگ کے صدر تھے کے بہنوئی مولانا خان زمان صاحب بھی مدرسہ جامع العلوم کانپور کے صدر مدرس رہے ہیں، مرزا صاحب نے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ان کی نیکی کا مجھ پر اب تک اثر ہے، کبھی نہیں اٹھاتے تھے، سودا سلف خرید کر لاتے تھے۔[1]

وصال: ۱۹۶۰ء یا اس کے کچھ بعد آپ کا کانپور ہی میں وصال ہوا اور وہیں دفن کئے گئے۔[2]

علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ[3]

شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی

آپ حضرت مولانا سید محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بنوری کے گھر ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء شب جمعرات بوقت سحر پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب، ماموں اور علاقہ کے علماء کے علاوہ علماء کابل سے حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا حافظ عبداللہ بن خیراللہ پشاوری (المتوفی ۱۳۳۲ھ)، مولانا عبدالقدیر قاضی القضاۃ جلال آباد کابل اور شیخ محمد صالح قیلنوی افغانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ دو سال میں موقوف علیہ کی تکمیل کر کے امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری

---

[1] اشتیاق اظہر: عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کانپور، البلاغ (ماہنامہ) کراچی ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ ص ۹۰

[2] سوانحی تذکرہ کا اکثر مواد مولانا محمد اسماعیل ذبیح صاحب بن حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب ہزاروی، خیبر ہوٹل، صدر پشاور اور کچھ مولانا حکیم قاضی محمد یونس صاحب یونانی معالج مانسہرہ سے لیا گیا۔

[3] آپ کا مفصل سوانحی تذکرہ "سرحد کے ممتاز علمائے دین" میں مطالعہ کیا جائے۔

سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ فراغت کے بعد علامہ انور شاہ صاحب کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) میں تدریس کا آغاز کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد آپ اس ادارہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔

۱۳۵۶ھ میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے مصر، یونان، ترکی اور حجاز مقدس کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ نے بڑی بڑی علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، اور ان سے استفادہ کیا۔

دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار سندھ کے ارباب حل وعقد کے شدید اصرار پر مسند شیخ کو چھوڑ کر جنوری ۱۹۵۱ء میں اس ادارہ کے شیخ التفسیر اور شیخ الحدیث ہو کر تشریف لائے۔ تین سال کے بعد مستعفی ہو کر کراچی تشریف لے گئے، وہاں سے حرمین کا سفر اختیار کیا۔ واپسی پر ایک علمی ادارہ —— مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کی نیو ٹاؤن کراچی میں بنیاد رکھی۔ آپ اس ادارہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ عربی زبان کے صاحب طرز ادیب ہیں، شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ نعت رسول پر آپ کے قصائد اس کے شاہد ہیں جو مصر کے علمی رسالہ "الاسلام" میں شائع ہو چکے ہیں۔

آپ اردو، پشتو، فارسی اور عربی چاروں زبانوں کے ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ دمشق کی مجلس علمی کے ممبر ہیں۔

تصنیفی خدمات ۱۔ عوارف المنن مقدمہ معارف السنن (عربی) مصر سے شائع ہوا ہے۔

۲۔ معارف السنن شرح جامع ترمذی (عربی) جلد اول، مطبوعہ ۲۰ شوال ۱۳۸۳ھ بڑے سائز کے ۵۲۹ صفحات

معارف السنن جلد دوم صفحات ۵۰۱،

معارف السنن جلد سوم، ۳ رمضان ۱۳۸۶ھ، ۴۰۴ صفحات

معارف السنن جلد چہارم ۱۳۸۸ھ، ۵۰۰ صفحات

معارف السنن جلد پنجم، ۱۳۸۹ھ، ۴۴۲ صفحات

معارف السنن جلد ششم، مطبوعہ ۱۹۶۹ء، ۵۰۰ صفحات

آپ کی تصانیف میں سب سے بڑی تصنیف یہی ہے جو چھ جلدوں میں کوئی تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ عرب دنیا میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اہل علم اسے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ابھی جاری ہے۔

۳۔ بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب (عربی) آپ کی یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں پہلی بار مصر سے شائع ہوئی۔

۴۔ نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ الانور (عربی) اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری کی سوانح ہے جو ۱۹۳۵ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

۵۔ یتیمۃ البیان فی مشکلات القرآن۔ مطبوعہ دہلی

۶۔ تسخیر کائنات اور اسلام

۷۔ ختم نبوت

اور ان کے علاوہ جن کتابوں پر آپ نے مقدمے تحریر فرمائے ہیں وہ بجائے خود ایک تصنیف ہیں۔ ان میں سے فیض الباری شرح بخاری مطبوعہ مصر۔ مقدمۃ مشکلات القرآن، مقدمہ مبہمات، مقدمہ عقیدۃ الاسلام بنزول عیسیٰ علیہ السلام مطبوعہ کراچی۔ مقدمہ نصب الرایہ لتخریج الہدایہ، مطبوعہ قاہرہ۔ مقدمہ مقالات الکوثری مطبوعہ قاہرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

صوفیانہ مسلک: آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز صحبت ہیں۔ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ کو مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا محمد شفیع الدین نگینوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے۔

مولانا محمد ہلال صاحب ہزاروی

آپ ۱۵ اگست ۱۹۲۲ء کو ڈاگئی تحصیل بٹگرام، ہزارہ میں جناب

حبیب اللہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ تربیت کے لحاظ سے سواتی پٹھان ہیں مگر اب مستقل سکونت لوہار بانڈہ، مانسہرہ، ہزارہ میں ہے۔ ابتدائی تعلیم جلالیہ (کیمبلپور) کے مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا سلیمان شاہ سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین صاحب کی خدمت میں غورغشتی (کیمبلپور) پہنچے اور ان سے ۱۹۴۷ء میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

۱۹۴۸ء میں دوبارہ دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث مولانا عبدالرؤف صاحب ہزاروی فاضل دیوبند سے دورۂ حدیث پڑھ کر دوسری سند حاصل کی۔

تدریس: اسی سال مدرسہ فتح اللہ شریف ضلع کیمبلپور میں مدرس مقرر ہوئے، پھر بل تحصیل مانسہرہ کی جامع میں خطابت کے ساتھ فنون کی کتب زیر درس رہیں۔

پھر مانسہرہ جامع مسجد شنکیاری روڈ میں خطیب مقرر ہوئے اور ساتھ کتب فنون کی تدریس بھی جاری رہی۔ آپ سے پڑھنے والے بیسوں حضرات اب فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔

۱۹۶۲ء تک قیام مانسہرہ کے دوران سرکاری فیصلے بھی آپ کے پاس آتے رہے۔

۱۹۶۲ء کے آخر میں مانسہرہ سے منگلا ڈیم کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب ہو کر چلے گئے۔

یکم جنوری ۱۹۶۹ء میں مرکزی جامع مسجد نشاط سٹی، تربیلہ ڈیم کے خطیب مقرر ہوئے اور اب تک وہاں خطابت کر رہے ہیں

صوفیانہ مسلک: شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ کے ہاتھ پر نقشبندی سلسلہ میں بیعت ہوئے اور انہی کے ساتھ وابستگی ہے۔

سیاسی مسلک: آپ جمعیۃ علماء اسلام ہزارہ کے سات سال تک صدر رہے ہیں، مگر ان دنوں سیاست سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے۔

تصانیف: آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کافی ہیں، مطبوعہ صرف ایک ہی رسالہ ہے جو "ناصحۃ العوام باتحاد العلماء والحکام فی مسئلۃ العید والصیام" کے ۱۸×۲۲ سائز کے ۲۲ صفحات پر ۱۹۶۰ء میں خوبصورتی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

مولانا سید محمد تقویم الحق کاکاخیل

آپ ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ نصرۃ الاسلام زیارت کاکا صاحبؒ میں حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۶ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

۱۹۴۵ء میں "مولوی فاضل" اور ۱۹۴۷ء میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۵۰ء میں میٹرک (صرف انگریزی)، ۱۹۵۱ء میں انٹر (صرف انگریزی)، ۱۹۵۲ء میں بی۔اے (صرف انگریزی) کے امتحانات پاس کئے۔

۱۹۶۱ء میں ایم۔اے عربی کا امتحان جامعہ پشاور سے اول آکر پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

۱۹۵۲ء میں بطور لیکچرر ملازمت کا آغاز کیا۔ آپ اس وقت پشتو کے پروفیسر اور گورنمنٹ کالج کوہاٹ کے پرنسپل ہیں اور شاہین ٹاؤن سٹریٹ ۲ پشاور یونیورسٹی میں رہائش پذیر ہیں۔

تصانیف: (۱) تاریخ ادبیات پشتو (۲) پشتو قواعد (۳) مقدمہ دیوان علی خان پشتو (۴) مقدمہ مخزن (پشتو) (۵) ترجمہ زبور عجم (منظوم پشتو) (۶) ترجمہ ضرب کلیم (منظوم پشتو) (۷) ترجمہ پس چہ باید کرد (منظوم پشتو) وغیرہ آپ کی تصانیف میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اولاد: اولاد میں چار فرزند اور تین دختران ہیں انجم، اطہر، ارشد

تبسم، امجد، احسن، ترنم۔

جناب مولانا قاضی مقدار الدین صاحب شاکر پشاوری ؒ

خطیب سنہری مسجد پشاور صدر

آپ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں جناب ابصار الدین صاحب کے گھر زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا۔ مولانا قاضی عصمت اللہ صاحب (م ۱۹۱۹ء) اور مولانا میاں سعد اللہ صاحب سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ۲۸ شوال المکرم ۱۳۵۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے، موقوف علیہ کی تکمیل کے بعد ۱۳۶۲ھ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

فراغت کے بعد موتمر مصنفین دہلی میں بطور رفیق مولانا احمد سعید صاحبؒ کے ساتھ کام شروع کیا، ان کی دو کتابوں "جنت کی کنجی" اور "دوزخ کا کھٹکا" کی تخریج کی جو تیسری اشاعت میں شامل کی گئی۔ تفسیر قرآن کے لئے انہوں نے ...... چار علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنا رکھا تھا جس میں ایک آپ بھی تھے۔

تصنیفی خدمات: ۱۔ کافی النحب کے نام سے الکامل للمبرد کی شرح مع ترجمہ اردو ۳۰۰ صفحات میں شائع کی۔ اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ نے تقریظ لکھی، آخری فقرہ یوں ہے۔ "الکامل — داخل فی نصاب المدارس الہندیۃ وطلابہا الہندیون کانوا کثیر الاحتیاج الی ترجمتہ بالہندیۃ وشرح غوامضہ فتکفل بہذا اخونا العزیز مولوی مقدار الدین ودفی حقہ" کہ یہ کتاب ہندوستان کے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ ہندوستانی طلبہ کو اس کے اردو ترجمہ اور مشکل الفاظ کی شرح کی ضرورت تھی جسے ہمارے عزیز بھائی مولوی مقدار الدین نے اپنے ذمہ لیا اور اس کا حق ادا کر دیا۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریظ کے آخر میں لم أر لہ شبیہہ ولا نظیرہ (کہ میں نے اس کی مثل نہیں دیکھی) کا فقرہ لکھ کر اس کی قیمت بڑھا دی۔

ناظم اسلامیات: انجمن خادمان اسلام جالندھر کی جانب سے ان کے قائم کردہ ایک کالج اور چار ہائی سکولوں کے لئے آپ ناظم اسلامیات مقرر کئے گئے۔ اس عرصہ میں آپ نے ۲۰×۳۰ سائز کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل۔

۲۔ میٹرک کے طلبہ کے لئے ایک کتاب "برہان الاسلام" لکھی جو پہلے جالندھر اور پھر میسرز کریم بخش انارکلی لاہور کے اہتمام سے شائع ہوئی۔

۳۔ "سفر نامہ حجاز" ۱۹۵۱ء میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بخشی اور مسلمان ملکوں سے ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچے۔ اس سفر کے حالات ۴۰۰ صفحات میں تحریر کئے جو شائع ہو رہے ہیں۔

۴۔ "ہماری اردو" برائے جماعت ششم ہر دو حصے بورڈ نے منظور کئے۔

۵۔ ایک قاعدہ "تسہیل القرآن" ابتدائی قرآن مجید پڑھنے والے بچوں کے لئے لکھا جو ۱۹۴۷ء میں جالندھر میں شائع ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد چوک ناصر خان کی مسجد چھوڑ گراں میں امام اور سنہری مسجد صدر میں خطیب ہیں، پشاور شہر کی مختلف مساجد میں درس قرآن بھی دیتے ہیں، شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ قطعات تاریخ لکھنے میں ماہر ہیں۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ سے ہے۔

جناب مولانا قاضی عبد الکریم صاحب کلاچوی ؒ

صدر مدرس نجم المدارس کلاچی ڈیرہ اسماعیل خان

آپ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں جناب مولانا قاضی نجم الدین صاحب کے گھر کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ ۱۰ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ

۱؎ آپ کا سوانحی تذکرہ میرے قلم سے ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء کے خدام الدین لاہور میں ص۱۲ اور ص۱۳ پر شائع ہوا۔

کیا، پھر پرائمری سکول کی تعلیم چھ ماہ کے عرصہ میں مکمل کی۔ درس نظامی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں۔ پھر سراج العلوم سرگودھا اور خیر المدارس جالندھر میں درس نظامی کی مروجہ علیہ تک تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۸ء/۱۳۷۵ھ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

خطابت و تدریس : فراغت کے بعد انجمن اسلامیہ فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) کی جامع میں ۵ سال تک خطابت کے ساتھ مدرسہ عربیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے مستعفی ہو کر آپ مطلع العلوم کوئٹہ میں بطور صدر مدرس مقرر ہوئے، وہاں ایک سال تک آپ نے تدریس کی۔

پھر اپنے آبائی قصبہ کلاچی میں مرفروری ۱۹۴۹ء کو مدرسہ نجم المدارس کی بنیاد رکھی۔ آپ اس وقت سے .... اس مدرسہ میں اہتمام کے ساتھ اپنی تدریسی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔

عموماً کتب احادیث زیر درس رہتی ہیں۔ اس مدرسہ کا الحاق وفاق المدارس العربیہ" کے ساتھ ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے تحریر و تقریر کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ آپ کے مضامین اکثر دینی مجلات بینات (کراچی)، الصدیق (ملتان)، خدام الدین (لاہور) اور الحق (اکوڑہ، پشاور) میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

"خیر التعلیقات علی المشکوٰۃ" کے نام سے مشکوٰۃ شریف پر حواشی لکھ رہے ہیں۔

ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند ماہ جمادی الاخریٰ/۴۲، ۲۰/ فروری ۱۹۵۹ء میں آپ کا تعارف یوں کرایا گیا ہے :

"مدرسہ نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے مہتمم مولانا عبدالکریم صاحب علمی صلاحیتوں کے ساتھ دل زندہ، نفس گرم، نگہ شوخ اور تگ و دو مسلسل کے انسان ہیں۔ ان کی ترقی پسندی راستہ کے پتھروں اور چٹانوں سے گزرتے وقت ابلہ پائی کا خطرہ محسوس نہیں کرتی، بلکہ ان سب خطرات کو زندگی کا شریک بنا کر وہ اپنی منزل مقصد پر رُست سفر کر لیتی ہے"

بیعت کا تعلق حضرت مدنیؒ سے ہے۔

اولاد میں دو فرزند — مولوی حافظ عبدالحلیم صاحب فاضل دارالعلوم حقانیہ اور حافظ محمد نسیم ہیں۔

آپ جمعیۃ علمائے اسلام ڈیرہ اسماعیل خان کے امیر اور صوبہ سرحد کے نائب امیر ہیں۔ [1]

جناب مولوی میر ولی اللہ میر ہزاروی

پرنسپل لاء کالج پشاور (سابق)

آپ ۲۴ دسمبر ۱۸۸۸ء کو ایبٹ آباد، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ مقامی سکول سے میٹرک اور ایف سی کالج لاہور سے بی۔ اے اور لاء کالج لاہور

---

[1] آپ کا سوانحی تذکرہ راقم کے قلم سے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں ص۲ پر شائع ہوا۔

قاضی محمد عثمان ہے۔ اے وی ٹیچر نے اپنی کتاب تاریخ اعوان کلاچی میں آپ کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

فرمودۂ حضرت مدنیؒ

عبادت اور ذکر پر مداومت، اتباعِ سنت و شریعت پر قیام، یہی امور ہیں جن کے ہم مکلف ہیں اور جن پر استقلال سے عمل پیدا ہوتا اور درجاتِ احسان کا حامل ہوتا کاملِ ایمان بنے۔ خوفِ خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں

(مکتوبات شیخ الاسلام ص۲۹)

سے وکالت کا امتحان پاس کر کے واپس وطن آئے۔ ۱۹۲۰ء میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ پھر لاء کالج پشاور کے پرنسپل رہے۔ دینی تعلیم اپنے نانا مولوی شریف الدین صاحب سے حاصل کی۔ باقی درسیات کی تکمیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند کے شاگرد۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب گنجوی خطیب جامع مسجد ایبٹ آباد سے کی۔ پانچ سات سال ہوئے کہ آپ کا انتقال ہوا۔

تصانیف: (۱) دیوان حافظ کی شرح "لسان الغیب" ۴ جلد میں ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ (۲) رباعیات خیام کی شرح "کاس الکرام" (۳) نمکدان فصاحت (۴) ماہ دو ہفتہ (۵) کلبانگ وارد و منظومات کا مجموعہ (۶) بادۂ ناب (فارسی منظومات کا مجموعہ) (۷) رومی۔ (۸) خلق عظیم (احادیث کا مجموعہ)

مولانا مدرار اللہ مدرار نقشبندی مردانی!

آپ ہوتی، مردان کے رہنے والے ہیں۔ علماء دیوبند کے فیض یافتہ ہیں۔ ہفت روزہ "نوائے ملت" مردان کے مدیر ہیں۔ آپ کے قلم سے چند رسائل اور کتب منظر عام پر آ چکی ہیں،

(۱) رسالہ بینات (۲) قول فیصل (۳) شاتم رسول شرع کی نظر میں (۴) جہاد کشمیر اسلامی ملک کی دشمنی میں (۵) آئینہ جہاد (۶) دستور العمل ادارہ اصلاح المسلمین (۷) تیسیر قرأت قرآن مسمّٰی بہ اعجاز القرآن، پشاور ۱۹۶۹ء صفحات ۱۴۴۔ (۸) سوانح حضرت مولانا عبدالمالک صاحب نقشبندی۔

مولانا حکیم صوفی عبدالحمید صاحب ہزاروی

آپ ۱۹۱۷ء کو ڈھکی چیڑاں "داخلی کرمنگ" تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں جناب نور احمد خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے چھوٹے بھائی ہیں، حصول تعلیم کے سلسلہ میں دونوں بھائی اکٹھے رہے۔ ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

دارالمبلغین لکھنؤ میں فرق باطلہ کے ساتھ فن مناظرہ کی تکمیل علامہ عبدالشکور صاحب لکھنوی سے کر کے سند حاصل کی۔

طبیہ کالج حیدرآباد دکن کے چار سالہ کورس کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ واپسی پر پہلے گوجرانوالہ میں مطب کیا اور پھر تدریس کا آغاز فرمایا۔ آپ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم اور مسجد نور گوجرانوالہ کے خطیب ہیں۔ آپ کے قلم سے کئی کتب کے عمدہ تراجم منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ ان میں سے (۱) ترجمہ شرح اکبر (۲) ترجمہ اردو الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فارسی کتاب کا) (۳) تکمیل الاذہان (عربی) از حضرت شاہ رفیع الدینؒ (۴) اسرار محبت (عربی) از حضرت شاہ رفیع الدینؒ (۵) تفسیر آیت نور (عربی) از حضرت شاہ رفیع الدینؒ (۶) مجموعہ رسائل (فارسی) از حضرت شاہ رفیع الدینؒ (۷) فیوضات حسینی المعروف تحفہ ابراہیمیہ فارسی مع اردو ترجمہ از حضرت مولانا حسین علیؒ (۸) دلیل المشرکین (عربی) از حضرت مولانا احمد الدین بگویؒ مع اردو ترجمہ ایضاح المومنین، بڑے سائز کے ۲۰۰ صفحات۔

مولانا عزیز الرحمٰن المعروف بہ صاحبزادہ محمد امیر خسرو دہلوی

محلہ ڈب، مانسہرہ، ہزارہ

آپ کا نام عزیز الرحمٰن، کنیت ابوالفیض اور تخلص اشعری ہے، ککھڑ قوم سے تعلق رکھتے ہیں، سلسلہ چشتی ہے۔

نومبر ۱۹۱۹ء کو ترناوئی شریف، تحصیل ایبٹ آباد، ہزارہ میں صاحبزادہ محمد حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، مختلف علوم و فنون اور صحاح ستہ حضرت مولانا حمید الدین مانسہرویؒ فاضل دیوبند سے "مدرسہ اسلامیہ حمیدیہ" مانسہرہ میں پڑھیں اور ان سے

۱۳۵۵ھ میں سند حاصل کی۔ انہی کے ارشاد پر مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۱ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ آپ کی سند کا نمبر ۹۳ ہے۔

دارالعلوم دیوبند بھی گئے اور وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درس بخاری میں شریک رہے۔ مولانا اعزاز علی صاحب سے حماسہ اور متنبی پڑھیں۔ واپسی پر کچھ عرصہ پرائمری سکول مانسہرہ میں معلم دینیات رہے ہیں۔ علم طب چونکہ خاندانی ہے، اس لئے اب مطب کر رہے ہیں۔ ایوبی دور میں ٹاؤن کمیٹی مانسہرہ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ ملک کے کئی رسائل میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔

تصانیف: (۱) کواکب توحید (۲) کوکب رسالت (۳) فتاویٰ ابوالفیض (غیر مطبوعہ) (۴) کوکب ہدایت (دینی مسائل پر مشتمل ہے) (۵) تفسیر فاتحہ (۶) ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ کلام) (۷) شکوۂ امیر خسرو (نظم) (۸) گلزار عاشقانہ (غیر مطبوعہ) (۹) دیدار مولیٰ (نظم) (۱۰) مکالمہ خدا و شیطان (۱۱) معراج طریقت (غیر مطبوعہ) (۱۲) یوم الحساب (غیر مطبوعہ) (۱۳) رہنمائے تجارت (۱۴) تخیلات امیر خسرو (نظم) غیر مطبوعہ (۱۵) قصیدۂ اشعریہ (عربی اشعار) وغیرہ کتب و رسائل ہیں۔

مولانا قاضی شمس الدین ہزاروی

آپ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء کو کوٹ نجیب اللہ، ہری پور ہزارہ میں مولانا فیروز الدین صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا صدر الدین اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۹ سال تک درویش ہری پور ہزارہ میں تدریس کی۔

۱۳۶۰ھ میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف ضلع میانوالی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مجاز طریقت قرار پائے۔

تصانیف: (۱) داڑھی کی اسلامی حیثیت، صفحات ۸۶ اردو، عربی ترجمہ غیر مطبوعہ (۲) سیرۃ خلفائے اسلام ۱۸۶ صفحات مطبوعہ، مکتبہ احرار اسلام ملتان (۳) مسئلہ رویت ہلال (۴) بے باک محاسبہ (۵) مصنوعی آواز کی کہانی (۶) عیسائی تبلیغ کے خفیہ گوشے شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا مفتی سیاح الدین پشاوری

صدر مدرس اشاعۃ العلوم جامع، لائل پور

آپ ۸ شوال ۱۳۳۴ھ / ۸ اگست ۱۹۱۶ء کو مولانا حافظ اسعد گل صاحب کے گھر زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

مولانا محمد ابراہیم سواتی

آپ "بازارگئی" بونیر ضلع سوات میں مولانا عبدالمجید بن سید احمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور دیگر درسگاہوں میں حاصل کی۔ ۱۵ سال کی عمر میں موقوف علیہ کی تکمیل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث کے امتحان میں اول آئے۔ مزید تعلیم کے لئے اجمیر گئے اور وہاں مولانا عبداللہ ٹونکی سے افق المبین، شرح اشارات، شرح مطالعہ، ریاضی کا درس لیا۔ پھر اسی مدرسہ میں بطور مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ اور ساتھ ہی جامع کے خطیب بھی مقرر ہوئے۔ وہاں تدریس و خطابت کی اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ وہاں سے والیٔ ریاست بادشاہ صاحب نے آپ کو بلا لیا۔ چند سال دارالعلوم سیدو شریف سوات

میں تدریس کی۔ پھر بادشاہ صاحب نے آپ کو بلالیا، تاکہ ان کے فرزند شہزادہ سلطان روم کو علم دین پڑھائیں۔ وہاں بادشاہ صاحب خود اور ان کے فرزند آپ سے پڑھتے رہے۔ اچانک ٹی بی کا شکار ہوگئے بادشاہ صاحب نے بھی علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر بے سود ۱۹۶۱ء میں آپ کا وصال ہوا، اپنے آبائی قبرستان "بانارگئی" میں دفن کئے گئے

تصانیف: (۱) خیر الکلام فی شہر صیام ـ اُردو، مطبوعہ، اجمیر شریف کے قیام کے دوران لکھی۔ (۲) علم الصرف میں کتاب الصرف جو مدرسہ چار باغ سوات میں داخل نصاب ہے (۳) علم ریاضی میں "اشکال ریاضی" مطبوعہ (۴) خطبہ جمعہ (۵) فتاویٰ دو دو دیہ جلد اوّل و دوم مطبوعہ۔

آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے، افسوس کہ بہت تھوڑی عمر لے کر آئے اور جلد چلے گئے۔

مولانا عبد الشکور پشاوری

استاد اسلامیات جامعہ پشاور

آپ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو زر جڑ تحصیل چارسدہ پشاور میں سید مبارک شاہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور دار العلوم ربڑ کے مولانا مغیث الدین صاحب سے حاصل کر کے ۱۹۳۶ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورہ حدیث پڑھا۔ ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں اسسٹنٹ ٹیچر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ کالج اور ۱۹۶۴ء میں شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی میں تدریس پر مامور ہوئے۔ اب تک پڑھا رہے ہیں

تصانیف: (۱) علوم اسلامیہ میں فلسفۂ عقائد و عبادات آپ کے قلم سے ہے۔

حدیث کی تشریحات بھی آپ کی ہیں، دو مقالے غیر مطبوعہ ہیں

مولانا سید عبد الرحمٰن ہزاروی

ایم۔اے، پی ایچ ڈی (الازہر)

آپ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو کنڈی علاقہ ذریشان تحصیل بٹگرام، ہزارہ میں جناب شاہ ولی صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں مولانا حافظ مہر محمد صاحب سے پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۵ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ بعض کتابوں کے انعامی نتیجہ پر چند کتب انعام میں ملیں۔

فراغت کے بعد دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو الٰہیار سندھ میں دو سال تک بطور صدر مدرس تدریس کی۔ ۱۹۶۲ء میں مزید تعلیم کے لئے مصر گئے۔ وہاں "جامعۃ الازہر" میں ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔ ساتھ ہی قاہرہ یونیورسٹی میں بی۔اے (ادب عربی) میں کامیاب ہوگئے، اور "جامعۃ الازہر" کے التخصص فی علوم العقیدۃ والفلسفۃ (ایم۔اے فلسفہ) کے امتحان میں ایک ہزار میں سے ۸۰۲ نمبر لے کر پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے

جز وقتی ملازمت بھی کر رکھی تھی کہ جو خطوط جمال عبد الناصر مرحوم کی طرف اُردو، فارسی اور پشتو میں آتے تھے۔ ان کا آپ عربی میں ترجمہ کر دیتے تھے۔ پھر قاہرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (ادب عربی) کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

۱۹۶۶ء میں آپ نے "الازہر" میں پی۔ایچ۔ڈی کا داخلہ لیا، مقالہ کا عنوان "الکندی و آراؤہ الفلسفیہ" (کندی اور ان کے فلسفیانہ افکار)

تھا۔ ۵۰۴ صفحات کے اس مقالہ پر ۱۹۶۰ء میں آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ پھر پاکستان آگئے۔ پہلے ادارہ تحقیقات اسلامی میں فیلو اور اب پیپلز اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ عربی کے انچارج ہیں۔

تصانیف: (۱) الکندی و آراءہ الفلسفیہ۔ (عربی)
(۲) الحیاۃ الاجتماعیہ عند نجم الدین الرازی (عربی) زیر طبع

مولانا محمد اجمل صاحب ہزاروی

خطیب جامع رحمانیہ، قلعہ گوجر سنگھ۔ لاہور

آپ جنوری ۱۹۳۳ء کو جناب مولانا غلام ربانی صاحب کے گھر نما ئنجز تحصیل ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم رحمانیہ ہری پور ہزارہ کے صدر مدرس استاذ العلماء حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب فاضل دیوبند سے تکمیل کی۔ پھر اسی مدرسہ میں تین سال تدریس کی۔

۱۹۵۲ء میں مولوی فاضل کا امتحان دینے لاہور جانا ہوا کامیابی کے بعد مدرسہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور میں بطور ثالث مدرس تین سال تک پڑھاتے رہے۔ پھر مغل پورہ ہائی سکول میں بطور عربک ٹیچر ۹ سال تک پڑھاتے رہے۔

عبدالکریم روڈ جہاں آج مسجد کی سہ منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ یہاں قد آدم گڑھے تھے، درس قرآن کی برکت سے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی۔ اس میں مدرسہ بھی ہے۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ کے ساتھ کئی تقریریں کیں۔ آپ کا انداز تکلم، بڑا پیارا، موثر اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اچھی تقریر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اچھی تحریر کا بھی ملکہ عطا فرما رکھا ہے۔ (بیعت کا تعلق مرشدی مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے ہے۔

تصانیف: (۱) آداب القرآن — موضوع نام سے ظاہر ہے۔ مکتبہ اشاعت الاسلام، انہ دبازار لاہور، نومبر ۱۹۶۸ء بار اول، صفحات ۱۹۲، کتابی سائز مجلد بڑی عمدہ اور پیاری کتاب ہے۔
(۲) تدریس القرآن، لاہور، مئی ۱۹۶۳ء، ۱۸×۲۲ سائز کے صفحات
(۳) تدریس القرآن معہ ازل بے شمار اضافوں کے ساتھ ۱۹۷۰ء بڑے سائز کے ۱۴۰ صفحات۔

(۴) آداب دعا: ۱۸×۲۲ کے سائز کے ۱۸۴ صفحات — سرد کتابیں
(۵) قربانی (۶) لغات القرآن (عربی) (۷) آداب المساجد — بعض زیر طبع ہیں
(۸) شراب خانہ خراب ۱۸×۲۲ کے سائز کے ۴۴ صفحات طبور

ان میں لغات القرآن (عربی) آپ کی ایک عظیم علمی خدمت ہے۔

مولانا سمیع الحق اکوڑوی

آپ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب کے فرزند ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے فارغ التحصیل ہیں، ماہنامہ الحق کے مدیر ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے مدرس ہیں، ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم حقانیہ میں تدریس پر مامور ہوئے اب تک پڑھا رہے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ایک کتاب قرآن مجید اور تعمیر اخلاق طبع ہو چکی ہے۔

مولانا محمد طاسین صاحب ہزاروی

ناظم مجلس علمی، کراچی

آپ ۱۹۲۳ء کو "ذرگڑی" تحصیل ہری پور ہزارہ میں جناب عبدالرحمن صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے حسن پور ضلع مرادآباد میں مولانا ولی احمد صاحب براہوی کیمبلپوری سے درس لیا ۱۹۴۳ء میں تکمیل جامعہ اسلامیہ امروہہ میں حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب تلمیذ علامہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کی، انہی سے بیعت کا تعلق بھی ہے۔

فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں ۵ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں رباط العلوم الاسلامیہ کراچی کے ناظم رہے۔ پھر دارالعلوم کراچی میں ایک سال تدریس کی، ۱۹۵۱ء میں مجلس علمی کراچی سے منسلک ہوگئے۔

تصانیف: (۱) خطبات ماثورہ ــ مجلس علمی مع اردو ترجمہ (۲) اسلامی معاشیات اور (۳) اسلامی نظام حیات پر مسودے تیار ہیں۔ آپ کے علمی مقالات اکثر علمی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا قاری محمد امین صاحب ہزاروی

ضلعی خطیب شیخوپورہ

آپ یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ / اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مولانا عبدالرحیم صاحب کے گھر سری کوٹ، ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ ہری پور میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، مولانا عبداللہ اور مولانا سکندر علی صاحب سے حاصل کی۔

۱۳۶۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۳ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ انعام میں کتابیں ملیں۔

فراغت کے بعد جامع شیخوپورہ میں خطیب مقرر ہوئے۔ خطابت کے ساتھ تدریس کا سلسلہ جاری ہے ۱۹۷۰ء میں مسجد محکمہ اوقاف ان کی تحویل میں چلی گئی۔ آپ ضلعی خطیب ہیں۔

تصانیف: (۱) میلاد النبیؐ (۲) مسلمان اور شہری دفاع (۳) جہاد د شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا لطافت الرحمٰن سواتی

انچارج فقہ و قانون جامعہ اسلامیہ بہاولپور

ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے مطابق آپ کا سن ولادت ۱۹۲۸ء ہے۔ تورنیال ضلع سوات میں مولانا قاضی فضل مولیٰ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم والد صاحب اور مولانا مفتاح الدین صاحب سے حاصل کی۔ ۱۳۵۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورہ حدیث پڑھا۔ نمایاں کامیابی پر ایک پگڑی اور کتب انعام میں حاصل کیں۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریس کی۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۹ اپریل ۱۹۶۷ء سے جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں تدریس پر مامور ہوئے ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں۔

تصانیف: (۱) اشرف المقال فی مسئلۃ رویۃ الہلال بار دوم (۲) پشتو ترجمہ فتاویٰ رشیدیہ کتب خانہ اسلامیہ قصہ خوانی پشاور سے (۳) رجال التوحید (۴) درس التوحید (۵) منظوم کلام ــ موخرالذکر تینوں کتابیں ابھی زیر طباعت سے آراستہ نہیں ہوئیں۔

مولانا قاضی عبدالسلام صاحب نوشہروی

آپ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۲۱ھ / مارچ ۱۹۰۳ء کو قاضی عصمت اللہ کے گھر زیارت کاکا صاحبؒ تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور دادا ــ مولانا قاضی ذوالنون صاحب سے حاصل کی۔

۱۳۴۱ھ میں حضرت مولانا عبدالعلی صاحب سے مدرسہ عبدالرب دہلی میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، انہی سے مدارج سلوک طے کر کے ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ کو خلافت حاصل کی۔ واپسی پر تدریس کا آغاز کیا۔ ایک عرصہ تک پڑھاتے رہے آجکل جامع مسجد نوشہرہ صدر کے خطیب ہیں۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں (۱) سبیل المومنین (۲) صراط مستقیم (۳) شرح دیوان حافظ الپوری (۴) شرح دیوان علی خان

یہ دونوں کتابیں پشتو فاضل کے نصاب میں داخل رہی ہیں۔
(۵) ادبی سرغات صفحات ۳۹۲۔ پرانیشنسی اور انٹر پشتو کے نصاب میں رہی ہے۔ ان کے علاوہ العسام اور مسئلہ تملیک پر کتابچے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔

مولانا سید امین الحق صاحب مردانی

آپ ۱۹۰۷ء کو طورو ضلع مردان میں محمد اسحاق کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۶ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اصغر حسین، مولانا محمد رسول خان صاحب ہزاروی وغیرہم حضرات سے دورہ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آج کل جامع مسجد شیخوپورہ کے خطیب مولانا احمد علیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور تکمیل اسباق کے بعد ۱۹۶۱ء میں خلافت سے سرفراز کئے گئے۔

تفصیلی حالات کے لئے راقم کی مرتبہ "شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی اور ان کے خلفاء" کا مطالعہ فرمایئے۔

تصانیف: (۱) "بصائر السنۃ" دو حصوں میں ۸۰۰ کے قریب صفحات، حجیت حدیث کے موضوع پر ہے۔
(۲) "السہم الحدید فی نحر العنید" نتائج التقلید کے جواب میں
(۳) "تنبیہ الاغبیاء علی حیوۃ الانبیاء"، مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ کے جواب میں (۴) عجالہ نافعہ (۵) بائیبل اور قرآن — عیسائی مبلغ ایس ایم پال کے رسالہ قرآن کے جواب میں (۶) صحابہ معیار حق ہیں۔ (۷) تذکرۃ الرسول (۸) زمینداری کا شرعی نظام (۹) اسلام کا معاشی نظام (۱۰) اسلام اور قربانی۔

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی

مہتمم امداد العلوم، ملک پورہ، ایبٹ آباد

آپ ورہند، ہری پور ہزارہ کے ایک گاؤں "سرکال" میں مولانا عبدالحکیم صاحبؒ[1] کے گھر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی و متوسط درجہ کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ "نصرۃ الحق" امرتسر میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹ شوال ۱۳۴۱ھ / مئی ۱۹۲۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ پہلے سال موقوف علیہ کی تکمیل اور دوسرے سال بخاری اور ترمذی امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے، مسلم شریف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے، نسائی شریف و بیضاوی علامہ محمد رسول خان ہزارویؒ، ابوداؤد مولانا میاں اصغر حسین سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک دینی مدارس میں تدریس کی۔ اسی اثناء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بطور مدرس عربی تدریس کرتے رہے اور آخر میں [illegible] گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے ریٹائر ہوئے۔
آجکل مدرسہ امداد العلوم، نو ملک پورہ ایبٹ آباد، ہزارہ کے مہتمم ہیں۔
بیعت کا تعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تھا۔ تکمیل سلوک ان کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور سے کی۔

تصانیف: (۱) فیوض الرحمٰن (حضرت تھانوی کے مواعظ کا مجموعہ)

---

[1] آپ کے والد بھی ایک اچھے عالم تھے، عمر بھر تدریس کرتے رہے۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ / ۱۴ اگست ۱۹۲۱ء کو ان کا وصال ہوا اور اپنے گاؤں "سرکال" میں دفن کئے گئے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ "علمائے ہزارہ" میں مطالعہ کیا جائے۔

(۲) القول العزیز حصہ اوّل و دوم
(۳) نصائح عزیزیہ ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۱۲۸ صفحات کراچی ۱۹۶۲ء
(۴) مجموعہ منتخب مجموعہ کلام د شعراء کے اچھے کلام کا ایک اچھا انتخاب، ۱۹۷۵ء

مولانا حافظ عبدالواحد علوی ہزاروی

آپ ۱۹۰۵ء کے قریب بانڈی علاق خان تحصیل ایبٹ آباد ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی، تکمیل رامپور میں کی۔

فراغت کے بعد مختلف مدارس میں مدرس اسلامیات رہ کر ریٹائر ہوئے۔ آج کل لنک روڈ "بیت العلوی" ایبٹ آباد میں رہائش پذیر ہیں، آپ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں

تصانیف: (۱) شراب دجواد (۲) تفسیر سورہ فیل (نظم)، (۳) تفسیر آیات قرآنی حافظ علوی کی زبانی" اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۹۶
(۴) تفسیر سورہ مزمل اور ان کے علاوہ کئی رسائل ہیں۔

مولانا قاضی محمد احمد صاحب، ایم۔اے

پروفیسر گورنمنٹ کالج مانسہرہ (سابقاً) کہیال۔ ایبٹ آباد!

آپ ۱۹۰۰ء کو مولانا قاضی غلام سرور صاحب خاک کے گھر خاکی تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی و متوسط تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ پھر رامپور اور دیوبند میں تکمیل کی۔ فراغت کے بعد لاہور آنا ہوا۔ وہاں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل، منشی فاضل کے امتحانات پاس کر کے سکول میں تدریس پر مامور ہوئے۔ ساتھ ہی پرائیویٹ طور پر امتحانات دیتے رہے۔ اسی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ پھر کالج سروس میں آگئے۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں عربی پڑھاتے رہے۔ پھر مانسہرہ کالج میں تبدیلی ہوگئی اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ آجکل کہیال، ایبٹ آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

تصانیف: (۱) جواہر البحور کا اردو ترجمہ کیا جو تین بار شیر بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔
(۲) قواعد عربی، شیخ غلام علی نے شائع کی، اسی طرح دیگر کئی کتب کے ترجمے کئے جو شائع ہوئے۔

مولانا سید معروف شاہ شیرازی [1]

ایڈووکیٹ، بٹگرام، ہزارہ

آپ ۲۷ ذیقعد ۱۳۵۰ھ ۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو تہرڈری تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں مولانا سید سخی شاہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے، حسینی سید ہیں۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ پھر مختلف مدارس، مدرسہ قاسم العلوم ملتان — میں مولانا عبدالخالق صاحب اور مولانا مفتی محمود صاحب (ایم۔ این۔ اے) سے پڑھتے رہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ ٹنڈوالہ یار میں مولانا مصباح اللہ شاہ صاحب کی معیت میں حضرت مولانا عبدالرحمن اور حضرت علامہ محمد یوسف بنوری سے پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں منشی فاضل، ۱۹۵۴ء میں مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ اسی سال حضرت مولانا محمد رسول خان اور مولانا محمد ادریس صاحب سے جامعہ اشرفیہ لاہور میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ پھر

---

[1] آپ کے والد بھی دارالعلوم دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا فیض علی شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرس بھی رہے ہیں جو آجکل مولانا مفتی زین العابدین کے مدرسہ میں لائل پور میں حدیث پڑھاتے ہیں۔

مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ تک دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کے ماہنامہ تعلیم القرآن کے مدیر بھی رہے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں اوپنڈی سے ماہنامہ اسوۂ نکالا جس پر سنہ ۱۹۶۴ء میں حکومت نے پابندی لگادی۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں آپ کو مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں کراچی جانا ہوا تو وہاں سے ایل ایل بی کرکے واپس آئے۔

سنہ ۱۹۶۵ء میں پروفیسر خورشید احمد کی دعوت پر ادارہ معارف اسلامی کراچی کی رفاقت قبول کرلی، سنہ ۱۹۷۰ء تک رفیق رہے۔

ادارہ میں دو سال آپ نے "سیارہ ڈائجسٹ" کے قرآن نمبر کی ترتیب وتدوین کا کام کیا۔ قرآن نمبر کی پہلی دو جلدوں کا اکثر کام آپ نے کیا۔ پھر سیرۃ النبیؐ کی طرز
پر قرآن کریم پر سات آٹھ جلدوں میں مفصل تحقیقی کام کرنے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلہ کی پہلی کتاب "نزولِ قرآن" مرتب کی اگر پروفیسر خورشید صاحب کی اس تجویز کہ مواد آپ کا ہو اور ترتیب ان کی ہو۔ جب آپ نے رد کردیا، توان کا طرز عمل آپ کے ساتھ ہمدردانہ نہ رہا جس کی وجہ سے آپ نے ادارہ کی رفاقت چھوڑدی۔

تصانیف : (۱) ادارہ کی رفاقت کے دوران آپ نے سید قطب مرحوم کی مشہور کتاب "معالم فی الطریق" کا ترجمہ کیا۔ آپ کا یہ ترجمہ اکیڈیمی میں پڑا رہا اور اس دوران خلیل حامدی صاحب کا ترجمہ شائع ہوگیا۔

(۲) مصطفیٰ السباعی مرحوم کی کتاب کا ترجمہ "ہماری تہذیب کے درخشاں پہلو" کے نام سے اسلامک پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوا۔

(۳) ڈاکٹر عامر کی کتاب کا ترجمہ "اسلام کا نظام تعزیرات" کے نام سے شروع کیا جو ساتھ ساتھ "ترجمان القرآن" لاہور میں شائع ہوکر مکمل ہوا۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں آپ واپس آئے اور پریکٹس کررہے ہیں۔

مولانا محمد موسیٰ صاحب روحانی بازی

استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

آپ بکہ خیل تحصیل وضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ سید احمد روحانیؒ کی اولاد سے ہیں۔ آگے یہ سلسلہ حضرت امام زین العابدینؓ تک جا پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ، پشاور میں ۲ سال تک مولانا عبدالحق شیخ الحدیث، مولانا عبدالغفور سواتی، مولانا قاضی حبیب الرحمٰن، مولانا محمد فیاض اور مولانا سلطان الرحمٰن سواتی سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے امتحان میں اوّل آتے رہے۔ دارالعلوم حقانیہ کے بعد مدرسہ قاسم العلوم ملتان شہر میں داخلہ لیا اور موقوف علیہ کی تکمیل کے بعد تیسرے سال سنہ ۱۳۷۳ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ امتحان میں آپ نے اوّل اگر جو ریکارڈ قائم کیا، وہ اب تک قائم ہے۔ یہاں کے اساتذہ میں مولانا عبدالخالق سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا علی محمد صاحب، مولانا محمود اختر صاحب تفسیر قرآن کی سند بشیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب سے دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ "قاسم العلوم" میں افتاء کا کام کرنے کے بعد حضرت مولانا عرض محمد صاحبؒ کے مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ میں بطور صدر مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ تین سال کے بعد وہاں سے منڈی بوریوالہ کے مدرسہ میں ایک سال تدریس کی، پھر مدرسہ قاسم العلوم میں بطور مدرس اعلیٰ آپ کا تقرر ہوا۔ چند سال وہاں اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد سنہ ۱۹۷۰ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں برائے تدریس لائے گئے۔ اب وہاں تدریس اور نیو کیمپس جامعہ پنجاب کی جامع میں خطابت کرتے ہیں۔ عربی، اردو، فارسی اور پشتو چاروں زبانوں کے ادیب اور شاعر ہیں۔

تصانیف: آپ نے موضوعات پر لکھتے ہیں، آپ کی تصانیف کی تعداد کوئی ساٹھ کے قریب ہے جن میں سے بیس تو فلسفہ سائنس اور جدید و قدیم ہیئت پر ہیں جن کی زبان اردو، عربی، فارسی ہے۔ ان میں سے فلکیات جدیدہ وسیر القمر وعید الفطر بہفت سموات کے متعلق اسلام ادیان عالم اور فلاسفہ کے نظریات" شرح جامع صحیح للترمذی، شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد اوّل۔ "الفوائد الملکوتیہ فی أن الاحادیث حجۃ فی العربیۃ" (عربی ضخیم جلد) "الیانع الجنی فی الفروق بین الرسول والنبی" (عربی) "رسالہ مباحث مقدمۃ الکتب (عربی) رسالہ اقسام الشفاعۃ الثلاثون" شرح تصریح (عربی، علم ہیئت) تعلیقات شرح جغمینی دیوان اشعار (عربی، فارسی) "بیان المذاہب فی حقیقۃ الحرث" (عربی) "نور کی حقیقت (اردو) "کتاب التاریخ الکبیر" (اردو) "کتاب الاعیان والکبراء (عربی دو ضخیم جلدوں میں) تلخیص الہیئۃ الجدیدۃ (اردو) "کتاب الہیئۃ الجدیدہ (عربی ضخیم جلد) "النجم السعد فی مباحث اما بعد (عربی) وغیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ ہیں۔ آپ کی تصانیف اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان موضوعات پر لکھتے ہیں جن پر عموماً علماء نے کم لکھا ہے، یہی وجہ ہے جامعہ پنجاب نے "فلکیاتِ جدیدہ" کو بہت سراہا ہے۔

مولانا محمد امین صاحب مردانی

شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ شیر گڑھ۔ مردان

آپ ۱۹۰۹ء کو کھوئی برمول" ضلع مردان میں جناب شاہ جی گل صاحب علوی کے گھر پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب محمد بن علی (محمد ابن حنفیہ) کی وساطت سے قریش ہاشمی علوی سادات تک جا پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ ثابت بابا کی دختر نیک اختر تھیں جو شیخ کبیر عنایت بابا المعروف بہ شیخ ناتت بابا کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اور بزرگ تھے ان کا مزار تھانہ مالاکنڈ ایجنسی میں واقع ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ والدہ ماجدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن عمرؓ تک جا پہنچتا ہے، اس لحاظ سے آپ فاروقی قریشی بھی ہیں۔

ابتدائی تعلیم: چھ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد صاحب سے قرآن پاک پڑھا، ابتدائی کتب علاقہ کے علماء سے پڑھیں۔ مقامی سکول سے پرائمری پاس کر کے ہمہ تن درس نظامی کی طرف متوجہ ہوئے۔

مولانا عبدالحنان خلف مولانا عبدالحکیم صاحب سے شرح الیاس اور مولانا عبدالرحمٰن فاروقی ساکن سنگاہو (مردان) سے صرف، منطق اور "ہدایہ اولین" وغیرہ کتب پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم: ۱۹۲۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے "مظاہر العلوم" سہارنپور میں داخلہ لیا اور مسجد عیدی شاہ میں مقیم ہوئے۔ آپ کے رفیق درس مولانا غلام نبی فاروقی مردانی بھی ہمراہ تھے۔ چند دن بعد مکمل داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۶ء تک "مظاہر العلوم" کے فاضل اساتذہ سے پڑھتے رہے۔ پھر "مظاہر العلوم" "مدرسہ نعمانیہ" فراش خانہ دہلی میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا عبدالحنان ساکن چھچھ سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۳۰ء میں مدرسہ حسین بخش دہلی میں دورہ حدیث پڑھنے کے لئے داخلہ لیا اور حضرت مولانا انور الحسن دیوبندی تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی، دورۂ حدیث کے امتحان میں اوّل رہے۔ اساتذہ کرام نے آپ کو اپنی معیت میں تدریس کی دعوت دی، مگر گھریلو مجبوریوں کے باعث کے باعث آپ کو واپس آنا پڑا

تدریسی خدمات: اپنے "محلہ بالا میاں گان" کھوئی برمول" مردان میں تدریس کا آغاز کیا جس میں دُور دُور سے طلبہ آکر تحصیل علم کرتے

۱؎ راقم کی مرتبہ "سوانح حضرت مولانا محمد رسول خانؒ" میں آپ کا مضمون اور نمونہ کلام موجود ہے۔

رہے۔ آپ نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے علاوہ ایک سال یہاں دورۂ حدیث بھی پڑھایا۔

احمد آباد میں: پھر احمد آباد (انڈیا) میں دو سال کے قریب تدریس کی، اسی دوران ملک تقسیم ہوا اور آپ احمد آباد سے واپس وطن آ گئے۔

کوہاٹ میں: ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو دارالعلوم عربیہ اسلامیہ ٹل ضلع کوہاٹ میں بحیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث آپ کا تقرر ہوا۔ آپ نے دس سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت ملی، دارالعلوم عربیہ سے استعفیٰ دے کر واپس گھر آ گئے۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک پشاور میں بحیثیت استاذ حدیث اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ارباب جمعیتہ کے شدید اصرار پر جمعیتہ علمائے اسلام کی طرف سے انتخاب میں حصہ لیا۔ جامعہ اسلامیہ سے مستعفی ہو کر میدانِ انتخاب میں نکل آئے۔ آپ صرف چند ووٹوں سے رہ گئے۔

مردان میں: مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، شیر گڑھ، مردان کے اصرار پر ان کے مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث تقرر ہوا۔ ۱۹۷۲ء سے اسی مدرسہ میں تدریس حدیث میں مشغول ہیں۔

صوفیانہ مسلک: پہلی بیعت مجاہد کبیر حضرت حاجی فضل واحد صاحب المعروف بہ "حاجی ترنگزئی" کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں ہوئی پھر حضرت مولانا عبدالغفور مدنی نقشبندی سے رجوع کیا اور پھر انہی کے ہو رہے۔

سیاسی مسلک: پہلے جمعیتہ علماء ہند سے منسلک رہے، مئی ۱۹۴۵ء کو سہارنپور کے اجتماع میں جمعیتہ علماء ہند کے مرکزی ممبر کی حیثیت شرکت کی۔ قیام پاکستان کے بعد جمعیتہ علماء اسلام سے وابستہ ہیں۔

اولاد: اولاد میں آپ کے دو فرزند مولوی روح الامین صاحب اور پروفیسر محمد امین گورنمنٹ کالج مردان ہیں۔

تصانیف: (۱) شمائل رسول (دو جلد) — مولانا حبیب الرحمن دیوبندیؒ کی "لامیۃ المعجزات" کی جو شرح مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے "بینات" کے نام سے کی تھی، اس کا پشتو میں آپ نے ترجمہ کیا اور مزید شرح بھی لکھی: جلد دوم ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۲) سیرۃ الرسول (پشتو)، پشتو بائی پرائیشنی کے نصاب میں داخل ہے۔

(۳) شاہ ولی اللہ (پشتو) غیر مطبوعہ۔

(۴) ایمن الکلام فیما یتعلق بہ بین الحلال والحرام (اردو) غیر مطبوعہ

اور (۵) تاریخ تدوین فقہ — غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا سید محمد زکریا بنوری ۱۲۹۵ھ — ۱۲۹۵ھ

آپ ۱۲۹۵ھ کے لگ بھگ پشاور میں مولانا سید مزمل شاہ بنوری کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی و انتہائی تعلیم کے اساتذہ کا علم نہیں ہو سکا اور نہ سالِ فراغت معلوم ہو سکا ہے۔ ذریعہ معاش تجارت رہا آخر عمر کے تیس سال یاد خدا میں گزارے۔

علمی مقام: آپ کے بارے میں مولانا سید محمد یوسف بنوری تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک دفعہ ۱۳۴۶ھ میں حضرت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی زیارت کی غرض سے تشریف لائے۔ ان دنوں حضرت شیخ مجھے اپنی کتاب "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" پڑھاتے تھے۔ درس میں بیٹھ گئے اور تقریر سنتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے علم کلام کا مسئلہ "خلق افعال عباد" جو مشکل ترین مسئلہ ہے، زیر بحث آیا۔ شیخ نے تقریر فرمائی اور مشکلات سلجھاتے رہے۔ درمیان میں حضرت والد صاحب سوالات کرتے رہے۔ حضرت شیخ جوابات دیتے رہے۔ فراغت درس کے بعد حضرت

شیخ نے دریافت فرمایا حضرت! علمی شغلہ کب سے متروک ہے؟ فرمایا پچیس برس ہوئے۔ حضرت شیخ نے بہت تعجب سے سُنا اور پھر مختلف مجالس میں بار ہا فرمایا کہ ان کے والد کا علمی شغلہ پچیس سال سے متروک ہے لیکن معلومات عمدہ اور تازہ — امام العصر جیسے علمی سند کی یہ داد کتنی وزنی ہے۔

تصنیفی خدمات: عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں عمدہ مصنف تھے، تسطالع الانوار فی فضائل اہل بیت النبی المختار عربی میں اور ایضاح المشکلات اردو میں جس میں وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود وغیرہ مشکلات تصوف اور مشکلات کلام پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، دو جلدوں میں تحریر فرمائی۔ اپنے خوابوں کو جمع کیا ہے؛ "البشرات" نام رکھا ہے اور تعلیقات میں ان کی تعبیرات "عبیر المسرات" کے نام سے لکھی ہیں، مسئلہ روح ونفس کا مقالہ مجلس علمی (کراچی) نے طبع کرادیا ہے۔

تین چیزوں سے محبت: فرماتے تھے کہ مجھے تین چیزوں سے محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اپنی خوابوں سے — ۱۶ سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک ۱۰۰ مرتبہ سے زیادہ رسول پاکؐ کی خواب میں زیارت بابرکت سے شرف یابی ہوئی اور آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

وصال: ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ / ۵ جون ۱۹۷۵ء دن کے پونے دس بجے بروز جمعرات آپ کا کراچی میں وصال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ "بصائر وعبر" میں لکھتے ہیں کہ:

والد مکرم کی وفات حسرت آیات صرف ایک والد کی مرثیہ خوانی نہیں، بلکہ علم وعرفان کا مرثیہ ہے۔ ایک صاحب کرامات وخوارق عارف باللہ کا ماتم ہے۔ ایک محقق روزگار کا نوحہ ہے، ایک فیلسوف عصر کا غم ہے۔ ایک اولوالعزم وجود کی جدائی پر اظہار حزن ہے۔ مجاہدات وریاضیات میں مصروف رہنے والی عظیم شخصیت کا درد والم ہے۔ ایک صاحب کمال مُعتبر کا نوحہ ہے۔ ایک باخدا صاحب مکارم اخلاق جود وسخا، ہمت وشجاعت کا نالہ وشیون ہے۔ ایک گوشہ نشین صوفی صاحب صدق وصفا کی جدائی و فراق کا درد وغم ہے۔ ایک عاشق رسولؐ کا درد واضطراب ہے۔ حقائق و معارف کے عالم کی مرثیہ خوانی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے یگانہ روزگار فاضل کے لئے نالہ وفریاد ہے۔ طریقت وحقیقت کے واقف رموز کا حزن وغم ہے۔ والد ماجد کیا تھے۔ ایک گمنام ہستی جس نے ایک عالم اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا۔ [1]

تاریخہائے وصال: مولانا محمد احمد تھانوی نے چند تاریخہائے وصال لکھی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخہائے وصال مولوی حاجی زکریا مغفور

۱۹۷۵ء

(۲) ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ مولانا محمد زکریا بنوری رحمۃ اللہ جل مجدہ لابد

۱۹۷۵ء

(۳) وقال الله جل جلالك ووحيه
فوقاهم الله شر ذالك اليوم [2]

۱۹۷۵ء

---

[1] مولانا محمد یوسف بنوری: "بصائر وعبر" بینات کراچی رجب ۱۳۹۵ھ ص ۲ تا ۱۱

[2] مولانا محمد احمد تھانوی مہتمم مدرسہ اشرفیہ سکھر: تاریخ ہائے وصال، بینات کراچی شعبان ۱۳۹۵ھ ص ۱۴

مولانا قاضی عبدالحی بن پیر صاحب ہاشمی ہزاروی

آپ ۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو مولانا قاضی عبدالقادر صاحب کے گھر جوڑیہ تحصیل ایبٹ آباد ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا قاضی عبدالواحد صاحب سے حاصل کی، پھر جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں مولانا حافظ مہر محمد صاحب سے پڑھتے رہے۔

دورۂ حدیث کی سند جامعہ عربیہ مفتاح العلوم طوالی (کیمبلپور) کے حضرت مولانا نور محمد صاحب تلمیذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ "احیاء العلوم جامع دوڑ حویلیاں" ہزارہ میں بطور صدر مدرس کئی سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

۱۹۵۰ء میں مرکزی جامع مسجد حویلیاں سٹیشن کے امام و خطیب مقرر ہوئے اور اب تک یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ اس علاقہ کے قاضی بھی ہیں۔ مئی ۱۹۶۲ء کو اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ میں ۲۵ علماء نے برائے تربیت شرکت کی تھی۔ ان سب میں آپ اول آئے، پھر وہاں آپ کو بطور فیلو لے لیا گیا۔ اسی عرصہ اثناء میں آپ نے

تصانیف: ۱۔ "اسلامی تعلیمات": نامی کتاب لکھی جو بعد میں جامعہ اسلامیہ بہاول پور سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ شائع ہوئی ــ $\frac{18}{8}$×۲۲ کے سائز پر اس کے ۴۴۳ صفحات ہیں۔

۲۔ "العروۃ الوثقیٰ": احادیث و دعاؤں کا مجموعہ ناشر تعلیم القرآن ٹرسٹ راہوالی ضلع گوجرانوالہ۔ تعداد ۱۵ ہزار۔ ۳۔ مسائل نماز۔ ۴۔ ترجمہ پارہ اول (حافظ نذر احمدؒ مولانا عنایت اللہ صاحب کے ساتھ آپ بھی شریک رہے ہیں۔ وہی ناشر بیعت کا تعلق آخر میں حضرت مولانا مفتی بشیر احمد پسروریؒ سے ہوا اور ۱۹۵۲ء میں ان کی طرف سے مجاز بھی ہوئے۔

لہ بعد میں آپ کو لیکچرر لے لیا گیا اور جامعہ اسلامیہ میں علماء کو پڑھاتے رہے۔ عوام کے شدید اصرار پر واپس حویلیاں آگئے، اب تبلیغی اور اصلاحی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔

مولانا عبدالرزاق سکندر ہزاروی

آپ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بروز جمعہ جناب سکندر خان بن خان زمان صاحب کے گھر کرکل تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرکے کچھ مدرسہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ میں حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سے پڑھتے رہے۔ جب آپ کے استاذ رحمانیہ سے احمد المدارس سکندر پور ہری پور ہزارہ میں منتقل ہوئے تو آپ بھی ساتھ چلے گئے، وہاں دو سال تک پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کراچی میں موقوف علیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۵ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۶ء میں علامہ سید محمد یوسف بنوری سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں یہیں درجہ تکمیل و تخصص کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۷ء میں یہیں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۶ء میں چار سالہ کورس کی تکمیل کرکے سند حاصل کی۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جن چھ طلبہ نے امتیازی نمبر حاصل کئے تھے، ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ اسی دوران جامعہ اسلامیہ کی سند کی بنیاد پر آپ نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے عربی کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۶۷ء کو "المجلس الاعلیٰ لشئون الاسلامیہ" کے وظیفہ پر علامہ بنوری کی معیت میں قاہرہ پہنچے اور مارچ ۱۹۶۷ء کو باقاعدہ پی ایچ ڈی کا داخلہ قاہرہ یونیورسٹی میں لیا۔ عنوان ہے: "عبداللہ بن مسعودؓ ــ امام الفقہ العراقی"۔ ۱۹۶۷ء میں آپ نے مقالہ کو مکمل کیا، مگر نگران کے انتقال کی وجہ سے ابھی تک آپ کا فیصلہ

لہ اسی موضوع پر ڈاکٹر حنیفہ رضی نے علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ہے۔ جسے بعد میں "ندوۃ المصنفین" دہلی نے شائع کیا ہے۔

نہیں ہوا۔ اب یہ مقالہ دوسرے نگران کے پاس ہے۔

تصانیف: "الطریقۃ العصریہ لتعلیم العربیۃ" حصہ اول مطبوعہ مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی۔

۲۔ "ملتِ اسلامیہ کا موقف" کا عربی ترجمہ "موقف الامۃ الاسلامیۃ من القادیانیۃ" کے نام سے بڑے سائز پر ۱۸۸ صفحات میں کیا ہے، جسے مرکزی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان نے شائع کیا ہے۔ تقدیم علامہ بنوری کے قلم سے ہے۔

مولانا قاضی سید عبدالعزیز جیلانی

آپ ۷ محرم ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۱ء کو جناب مولانا غلام قادر صاحب کے گھر گالوچ "ڈاکخانہ دیولی" تحصیل کبل ضلع سوات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب اور چچاؤں سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں ۱۳۵۱ھ کو داخلہ لیا اور ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۹ء کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا عبدالغفور ہزاروی مدنی سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ جامعہ طبیہ قرول باغ دہلی سے "مستند الاطباء" کا کورس مکمل کرکے سند حاصل کی۔ مختلف مدارس جامع الکلم دہلی، جامع عظمت کرنال اور مدرسہ رحمانیہ دہلی میں تدریس کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل، اور ۱۹۵۰ء میں "منشی فاضل" ۱۹۵۱ء میں پشاور یونیورسٹی سے پشتو فاضل کیا

۱۹۵۵ء میں بطور عربی استاذ گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ میں آپ کا تقرر ہوا۔ اب بھی وہیں پڑھا رہے ہیں۔ ۱۴ سال تک مسجد تقوی نوشہرہ میں درسِ قرآن دیا۔

تصانیف: ۱۔ سراج القواعد ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۱۰۴ صفحات مطبوعہ ۱۹۶۹ء لاہور۔

۲۔ دروس الصرف۔ ۳۔ دروس النحو — تینوں مطبوعہ ہیں۔

مولانا عبدالشکور طوروی

خطیب مرکزی جامع مسجد کوئٹہ

آپ ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو جناب مولانا حکیم غلام رسول صاحب کے گھر طورو ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں حاصل کی۔ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء کو دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ امتحان میں نمایاں کامیابی پر کچھ کتابیں انعام میں ملیں۔ مئی ۱۹۳۷ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل، ۱۹۳۸ء میں منشی فاضل اور ۱۹۴۲ء میں پشتو فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ پشتو فاضل کے امتحان میں اوّل آئے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ میں مدرس عربی و اسلامیات آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں جامعہ پنجاب سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۴ء میں میٹرک کا۔ ۱۹۴۵ء میں آپ کا مرکزی جامع مسجد کوئٹہ میں بطورِ خطیب تقرر ہوا۔ اب تک وہیں ہیں۔

تصانیف: ۱۔ پارہ اوّل مع ترجمہ و تشریح بزبان پشتو۔

۲۔ دین کی باتیں حصہ اوّل، دوم، سوم

۳۔ تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت کے لئے احکام الاسلام حصہ اوّل، دوم و سوم منظور ہو کر شامل نصاب رہی ہیں۔

۴۔ انوار القواعد — اُردو گرامر کی کتاب اکثر بار شائع ہوئی۔

قرآن مجید کی تفسیر کے چند پارے اور احکام الاسلام چہارم، پنجم و ششم غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا قاری محمد عارف ہزاروی

ایم۔ اے، ایم او ایل خطیب مسجد ہاسٹل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور

آپ ۱۹۲۷ء کو ڈھیری کیال تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں پیدا ہوئے قومیت کے لحاظ سے پٹھان ہیں۔ ترجمیہ سے لوئر مڈل کا امتحان پاس کرکے

مدرسہ احیاء العلوم" جامع ووڈ حویلیاں ہزارہ میں داخلہ لیا اور اس کے صدر مدرس حضرت مولانا قاضی عبدالحی چن پیر صاحب سے عربی صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ پھر جامعہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور میں مولانا سید غازی شاہ صاحب فاضل دیوبند سے پڑھتے رہے۔ اسی دوران جامعہ پنجاب سے "مولوی" مولوی عالم میٹرک اور "فاضل عربی" کے امتحانات پاس کئے۔ فاضل عربی اورینٹل کالج سے کیا۔ جب یہاں سے حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب ہزارویؒ جامعہ اشرفیہ منتقل ہوئے تو آپ نے بھی وہاں داخلہ لے لیا۔ دورۂ حدیث کا سماع دو بار کیا، پھر جامعہ اشرفیہ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

فراغت کے بعد جامعہ فتحیہ اچھرہ میں پانچ سال تک مختلف علوم و فنون کی کتابیں زیر درس رہیں۔ اسی دوران انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔

۱۹۶۴ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں بطور امام و خطیب آپ کا تقرر ہوا۔ ہاسٹل کی اس مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا جو اب تک جاری ہے۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ایم۔ اے عربی کا امتحان ۱۹۶۶ء میں، ایم اے اسلامیات ۱۹۶۷ء میں، ایم اے اردو ۱۹۶۹ء میں ایم۔ اے فارسی ۱۹۷۰ء میں پاس کئے۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی نے ایم، او، ایل کی ڈگری عطا کی۔ روایتِ حفصؒ کا نصاب قاری محمد شاکر انور، قاری عطاء اللہ اور قاری عبدالرحمٰن ڈیروی صاحبان سے مکمل کیا۔

اولاً علم طب کی تحصیل حضرت مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب فاضل دیوبند سے کی۔ پھر باقاعدہ طبیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اب "فاضل الطب والجراحۃ" کے آخری سال میں ہیں۔

آپ ایک اچھے خطیب اور اچھے مصنف ہیں۔ راقم کے بڑے بھائی ہیں۔

تصانیف: ۱۔ المنزیۃ النبویۃ۔ مصر کے قومی شاعر احمد شوقی کے نعتیہ قصیدہ کا اردو ترجمہ و تشریح میں راقم کے ساتھ ان کا تعاون ہے۔

۲۔ قصائدِ حسانؓ: شاعرِ رسول حضرت حسانؓ کی زندگی اور شاعری، ان پانچ قصیدوں کا اردو ترجمہ و تشریح جو ایم۔ اے عربی پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں۔

۳۔ اربعین نووی: ترجمہ و تشریح مع مقدمہ تدوین حدیث و حجیت حدیث، ۱۲۸ صفحات مجلد۔

۴۔ جواہر الحدیث: برائے انٹر۔ ۴۰ حدیثوں کا اردو ترجمہ و تشریح۔ پاکستان بک سینٹر اردو بازار لاہور۔

۵۔ فلسفہ اسلامی عقائد و عبادات۔ بڑی عجیب کتاب ہے مطبوعہ

۶۔ قدوری (کتاب الصلوٰۃ) ترجمہ و تشریح۔

۷۔ سورۃ البقرہ ترجمہ و تشریح زیر طبع

مولانا حافظ محمد حسن جان مدنی پشاوری

آپ مولانا علی اکبر جان صاحب قریشی کے گھر یکم ذوالقعدہ ۱۳۵۷ھ / ۶ جنوری ۱۹۳۸ء بمقام "بڑا ٹنگ" محلہ میاں کلے تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ اشرفیہ لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۳۷۶ھ میں حضرت مولانا محمد رسول خان ہزارویؒ اور مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلویؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک سے فاضل دینیات کا امتحان پاس کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے مولوی عالم اور فاضل کے امتحانات تمام امیدواروں میں اول آکر اور منشی فاضل کا دوم آکر پاس کئے۔

۷ محرم ۱۳۸۲ھ / ۱۱ جون ۱۹۶۲ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

میں سعودی حکومت کے وظیفہ پر قسم عالی میں داخلہ لیا۔ جامعہ کے ہر امتحان میں دوم آتے رہے اور چوتھے سال کے آخری امتحان — امتیاز الشہادۃ النہایۃ العالیۃ میں ۴۰۰ نمبر میں سے ۲۹۱ نمبر حاصل کر کے پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور آخری ڈگری "اللیسانس" "الامتیاز بمرتبۃ الشرف الاولیٰ" حاصل کی۔ مدینہ منورہ کے عرصۂ قیام میں الشیخ عبدالفتاح القاری اور الشیخ محمود البخاری سے ۱۳۸۵ھ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اگست ۱۹۶۶ء کو واپس آئے۔

دارالعلوم نعمانیہ اتمان زئی چارسدہ پشاور میں بطور صدر مدرس آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۹۲ھ تک پڑھاتے رہے۔

۱۳۹۲ھ میں دارالعلوم عربیہ ٹل کوہاٹ میں شیخ الحدیث ہو کر چلے گئے اب بھی وہیں ہیں۔ دوران تدریس پرائیویٹ طور پر ۱۹۷۱ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے دیا اور ۸۰۰ میں سے ۶۶۱ نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی میں اول آئے۔ طلائی تمغہ کے ساتھ صدارتی انعام بھی حاصل کیا۔

آپ کے کئی مقالات "المجتمع" لبنانی رسالے میں شائع ہوئے۔

تصانیف: ۱۔ "النظم الاقتصادیۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ"

۲۔ "احسن الخبر فی مبادی علم الاثر"

۳۔ "مقدمہ فی علوم القرآن"

(زیور طباعت سے آراستہ ہونے والی ہیں)

مولانا محمد زمان جدون

آپ ۱۸۹۶ء کو ڈھیری کسیال تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں جناب فیض اللہ خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ پیدائشی نام کرم خان ہے، مگر محمد زمان کے نام سے شہرت پائی۔ نسباً پٹھان (جدون) ہیں۔ دورۂ حدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھا۔

علم طب کی تحصیل و تکمیل مولانا حکیم عطاء اللہ خان دہلوی (ملتان) سے کی۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجوی شریف سے ہے۔

ایک عرصہ تک جامع ٹوبہ ٹیک سنگھ (لائلپور) اور جامع لورالائی بلوچستان میں خطیب رہے ہیں۔

تصانیف: ۱۔ گلدستہ وعظ (کافی ضخیم اور معلوماتی مسودہ ہے)

۲۔ کتاب روحانی عملیات "

۳۔ طبی مجربات "، آپ کی قلمی تصانیف ہیں۔

مولانا عبدالدیان کلیم

آپ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو جناب شجاعت خان صاحب کے گھر میٹھا خیل نوشہرہ کلاں ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

۱۹۵۳ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے انعام حاصل کیا۔

۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور پھر منشی فاضل .... اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے۔ آجکل آپ اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور یونیورسٹی میں اسسٹنٹ ٹرین ہیں۔ آپ ہی کی کوششوں سے دارالعلوم دیوبند کی سند ایم۔ اے کے برابر قرار دی گئی ہے۔ آپ کی تصانیف میں تدریس اردو گرامر؛ صفحات ۱۲۸ ہے۔

مولانا محمد اسرائیل صاحب بالاکوٹی ہزاروی

آپ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۶ء کو بالاکوٹ، تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں قاضی محمد اسماعیل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ دورۂ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۰ء مدرسہ رحمانیہ اہل حدیث میں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران آپ نے علم طب کی تکمیل کی۔ پھر مدرسہ ضیاء الاسلام عرف مسجد حبیب اللہ، مانسہرہ ہزارہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۸ ر اکتوبر ۱۹۵۱ء سے دارالعلوم محمدیہ بالاکوٹ میں جو شہدائے بالاکوٹ کی یاد میں قائم کیا گیا ہے، تدریس پر مامور ہیں۔ علاقہ کے اکثر علماء آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

تصانیف: علم ادب کی شہرہ آفاق کتاب "دیوان متنبی" اور "نزہۃ الاذہان" پر آپ نے حواشی لکھے جو شیخ محمد نذیر تاجر کتب مانسہرہ نے شائع کرائے ہیں۔

مولانا عبدالرؤف صاحب ہزاروی

آپ ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء کو نمبریاں تحصیل ہری پور ہزارہ میں .... مولانا عبدالکریم صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۶ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد مختلف دینی اداروں میں آج تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں ایک "فضل الباری فی فقہ البخاری" ہے جو چار ضخیم جلدوں میں ہے، یہ طباعت کی منزل سے گزر رہی ہے۔

مولانا غلام غوث ہزاروی

آپ جون ۱۸۹۶ء کو بفہ، تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں حکیم سید گل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ امتحان میں مولانا محمد اسحاق کانپوری اول اور آپ دوم آئے تھے۔

آپ کی تصانیف میں (۱) ایمان (۲) کالج میں ایمان (۳) سیرۃ النبیؐ (۴) مجاہدانہ تقریریں۔ (۵) اور جواب محضر نامہ کہ مرزائی قطعی کافر ہیں۔ صفحات ۲۶۰، سب مطبوعہ ہیں۔

آپ اس سے قبل صوبائی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ آج کل قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ "الجمعیۃ" راولپنڈی کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

مولانا عبدالقادر جامی ہزاروی

آپ تہار نورودی، تحصیل ہری پور، ہزارہ میں سید احمد (متوفی ۱۹۵۰ء) بن شرف دین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ پھر ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء میں امرتسر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں رہ کر ان سے تفسیر پڑھ کر سند التفسیر حاصل کی۔

مختلف مدارس میں تدریس کی، آج کل اپنے گاؤں میں امام ہیں۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔

تصانیف: "تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن" بڑے سائز کے ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جن میں ۱۳۶ صفحات تو سورہ فاتحہ کی تفسیر پر اور باقی حج بیت اللہ کے اسرار پر ہیں۔ اس کتاب پر حضرت مولانا محمد رسول خان، حضرت مولانا احمد علی اور عبداللہ بھوار ہزاروی کی تقاریظ ہیں۔ ۱۳۵۵ھ میں یہ لاہور سے شائع ہوئی۔

۲۔ عمدۃ الفکر فی تفسیر سورۃ العصر اس کے ۲۲ صفحات ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں امرتسر سے شائع ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مردانی

دارالتصنیف رکستم، مردان

آپ مولانا محمود الحسن صاحب کے گھر جولائی ۱۹۰۸ء کو تربان بانڈہ شیر بہادر خان علاقہ سدھوم میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد محمود الحسن صاحب فاضل مظاہر العلوم سہارنپور سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھ کر ۱۹۲۲ء میں علامہ سید محمد انور شاہؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

۱۹۲۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کرکے مردان کے ایک قومی سکول میں مدرس ہوگئے۔ ۱۹۳۲ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ ہائی سکولوں میں مدرس عربی کے طور پر تدریس کرتے رہے۔ ساتھ ہی جمعہ کی تقریر اور درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

۱۹۴۱ء میں صوبہ سرحد کے مدرسین کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ قیام پاکستان کی تحریک میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تھانہ رستم پر پاکستانی جھنڈا آپ کے ہاتھوں سے گاڑھا گیا۔

۱۹۴۴ء میں بستی نظام الدین جانا ہوا، وہاں سے تبلیغی جماعت کے ساتھ تعلق قائم ہوا اور ۱۹۵۸ء میں چھ ماہ کے لئے عرب گئے اور تبلیغی کام کرتے رہے۔

تصانیف: ۱۔ تفسیر حبیبی مکمل (پشتو) دراصل تفسیر منار (عربی) کا ترجمہ ہے۔ (الگ الگ پاروں میں) مطبوعہ

۲۔ تشریح بخاری (پشتو) " " " "

۳۔ تبلیغی نصاب (پشتو) مکمل، ۴۔ تحفہ حج۔ ان کے علاوہ سیر صحابہ، بنات الرسولؐ، امہات المومنین، مہاجرین، انصار وغیرہ زیر طبع ہیں۔

> **فرمودہ حضرت مدنیؒ**
>
> محبوب حقیقی ہر چیز کو جانتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے، ہر چیز کو سنتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ شدید الغیرت ہے۔ اس کے سامنے بجز خشوع و خضوع اور راز ہائے سربستہ کے اخفاء اور اظہار عبودیت کامل اور اتباع سید العشاق (علیہ السلام) کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔ (جبہ نمبر سلاسل ص۲۵)

جذباتِ حبیب
بدیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم

فاضلے رشیدی

میں آج دیارِ پاک میں ہوں | دامانِ شہ لولاک میں ہوں
سر خم ہے مقدر سے اُس جا | بیٹھے تھے جہاں محبوبِ خدا
اے شاہ تیرا اک ادنیٰ گدا | ہے فرقت کا تڑپایا ہُوا
بے حد عاصی، شیطاں مارا ہوا | کل دنیا کا ٹھکرایا ہُوا
ہے بوجھ گناہوں کا سر پہ | آنے ہی گرا تیرے در پہ
دنیا میں جنس وفا دے دے | آخر میں اپنی رضا دے دے
بیکس ہوں، غم کا مارا ہوں | میں عاجز ہوں بے چارا ہوں
اعمال سے دامن خالی ہے | یہ حال ہے یہ بدحالی ہے
میں اشکِ ندامت لایا ہوں | امیدِ شفاعت لایا ہوں
بیٹھا ہوں، تصور عرش پہ ہے | ایسا ہے کہ عرش اس فرش پہ ہے
جذبات مرے سرشار ہوئے | احساس حسیں بیدار ہوئے
جنت کی فضائیں پاس مرے | روضے کی ہوائیں پاس مرے
یہ باغِ ارم کا ہے نقشہ | یہ گنبدِ خضرا کا جلوہ
جلووں میں طور کا عالم ہے | اک نور میں نور کا عالم ہے
مسرور ہے دل، آزاد ہے دل | سرمست فضا ہے شاد ہے دل
دل رنج و محن کو بھول گیا | میں یادِ وطن کو بھول گیا
یہ قربِ محمدؐ کی عظمت | اللہ کی بندے پر رحمت

یہ کون ہیں میرے پیش نظر
اے وقت ذرا آہستہ گذر

مسئلۂ تکفیر

— اور —

اکابرِ دارالعلوم

(علامہ خالد محمود۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برمنگھم))

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ واللہ خیرا ما یشرکون۔ اما بعد

بیسویں صدی کے افسوسناک واقعات میں تکفیر بین المسلین کی سازش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تکفیر مسلم کی تحریک نے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے اور اسلام کی کشتی وقت کے ہر موڑ پر اس کے ہچکولوں سے ہمکنار ہوئی۔ معلوم نہیں مسلم مفادات کی کتنی لاشیں اس کے نیچے دفن ہوئیں۔ افسوس کہ تکفیر مسلین کی یہ تحریک ابھی تک جاری ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ دوسروں پر بے دریغ کفر کے گولے برسا رہا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے بجا شکایت کی تھی ؎

مشغلہ اُن کا ہے تکفیر مسلمانِ ہند
ہے وہ کافر جس کو ہو ان سے ذرا بھی اختلاف

جو لوگ علماء دین سے دُور تھے انھیں اچھا خاصہ بہانہ مل گیا۔ وہ دین کی ہر دعوت پر ہنسنے لگے۔ کس کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ قرآن و حدیث کا نام ہر فریق لے رہا ہے ؎

کس کا یقین کیجیے کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں بزم یار سے لوگ خبر الگ الگ

دونوں کی بات مان لی جائے تو باقی کون بچا اور پھر لائحہ عمل کیا رہا؟ حق کے پرستار تو یہاں بھی کوئی راہ نکال لیں گے لیکن جن کے ذہن کی پرواز اتنی اونچی نہیں اور ان کا دل دین کے درد میں وہ گداز نہیں رکھتا جو اس ملت کی مایۂ ناز میراث تھی! وہ لوگ کنارے کھڑے کفر کی اس گولہ باری کا نظارہ کر رہے ہیں اور جس نے سب سے پہلے یہ تکفیر جاری کی تھی دن رات اس کے بارگناہ میں اضافہ ہو رہا ہے ؎

اے موجِ بلا فدا ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

ہو سکتا ہے کہ تکفیر بین المسلین سے زخمی دل کچھ اس طرح بھی سوچتے ہوں کہ شاید ہر مدرسہ اور دارالعلوم اس میں برابر کا شریک ہے۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ یہ صرف انہی لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے جو ان مدارس علمی کے قریب سے واقف نہیں اور انھیں ان مراکز دینی کے بزرگوں کی مجلس میں بیٹھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

مسلمانوں پر ایک ایسا وقت آگیا ہے کہ وہ دینی اور علمی مراکز جہاں واقعی رشد و یقین کے چشمے پھوٹتے رہے اور ہر وارد و صادر سکون و طمانیت کی دولت پاتا رہا وہ بھی اس بدنامی کی زد میں آنے لگے ہیں اور کئی لوگوں کو غلط فہمی ہونے لگی کہ شاید یہاں بھی تکفیر بین المسلین کی کوئی مشین چل رہی ہو۔ ان حالات میں عزیزم مولانا عبدالرشید ارشد کی فرمائش ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کا موقف اس سلسلے میں واضح کر دیا جائے

راقم الحروف ملک سے دور ایسی جگہ مقیم ہے جہاں وہ کتابیں اور تحریرات موجود نہیں جن میں موضوع زیرِ عنوان کی جزئیات مل سکتی ہیں، ان تحریرات اور اکابر کے ارشادات کے جو نقوش ذہن میں باقی ہیں ان کے ساتھ اتنے اہم موضوع سے عہدہ برآ ہونا یہ بھی ممکن نہیں تاہم تعمیلِ ارشاد اور حصولِ ثواب کے لیے کچھ باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ واللہ المستعان — بیشتر اس کے کہ زیرِ بحث عنوان پر براہِ راست کچھ کہا جائے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکابرِ دارالعلوم کے اصولِ عمل پر کچھ تبصرہ ہو جائے۔

اس سے یہ بات خود سمجھ میں آنے لگے گی کہ جس دارالعلوم کی اساس علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور اسلام کی عملاً دعوت دینے پر ہو جس کے اکابر مسلمانوں کو تزکیۂ دل کی صفائی اور غیر مسلموں کو اسلام کا سکون بخشنے کے لیے دن رات کوشاں ہوں وہ مسلمانوں کو کافر بنانے کے لیے کیسے آمادہ ہوں گے۔ غور کیجیے اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ان بزرگوں کا مزاج عمل تکفیر بین المسلمین جیسے ملت کش عمل سے کیسے لگا کھا سکتا ہے۔

اکابرِ دارالعلوم کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ یہ بزرگ مسلمانوں کو کافر بنانے کے لیے نہیں کافروں کو اسلام میں لانے کی علمی، فکری اور عملی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ تکفیرِ مسلمین کا شغلہ اساسی طور پر ان کے فکر و عمل سے ٹکراتا ہے۔ دارالعلوم کے شاندار ماضی اس کی عالمی شہرت کی تصنیفات اس کی خداداد ترقیات اور اس کے اکابر کی تزکیہ پسند سیرت پر نظر رکھیے ان کے ارشادات و مواعظ کا تجزیہ کیجیے اور پھر کہیے کہ دارالعلوم اسلام کا مرکز رہا ہے یا تکفیر کا؟ اس نے غلط فہمی کا شکار ہونے والوں کو اصلاح کی دعوت دی یا ان سے ایک فرقہ کے طور پر تفریق قائم کی؟ اپنے حلقۂ ارشاد میں ان سے امتیازات قائم کیے۔ یا سب کو ایک ہی شجرِ ہدایت کے نیچے آنے کی تلقین کی؟ بھائیوں کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے یا اپنے سے اختلاف کرنے والوں پر کفر کے گولے برسائے؟ یقین کیجیے دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والا مؤرخ اس باب میں اکابرِ دارالعلوم کو آفرین کہے بغیر آگے نہ جا سکے گا۔

دارالعلوم کا اپنے اسلاف سے رشتہ

پہلے دور میں مسلمانوں کے دینی مراکز، تحریکِ اسلام اور تعلیمِ شریعت کے گہوارے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رشد و ہدایت کے روشن ستارے اور ساری اُمت کے لیے عظیم علمی سہارے تھے۔ ان کے بعد تابعین کرام اور مجتہدین عظام نے سندِ علم کو جلا بخشی۔ امام مالکؒ حجاز میں، امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ عراق میں، امام اوزاعیؒ شام میں اور امام مالکؒ کے تلامذہ مغرب میں قرآنی علوم اور فقہ و حدیث کا سرچشمہ تھے۔ انہی مراکزِ علمی سے پورے عالمِ اسلام کی ضیا باریاں تھیں۔

سقوطِ بغداد میں جہاں مسلمانوں کی سیاسی شوکت چھنی، لاتعداد دینی مدارس بھی پامال ہوئے، مایہ ناز کتب خانے برباد ہوئے۔ بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی جہاں کبھی امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ درس دیتے تھے تاراج ہوئی۔ علوم و فنون کے موتی کچھ دریا برد ہوئے اور کچھ یورپ کی یونیورسٹیوں کی زینت بنے۔ اس المیہ پر اقبال کی آہ بڑی دردناک ہے ؎

کہاں وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

عالمِ اسلام میں صرف مصر کی شوکتِ علمی باقی تھی اور ازہر یونیورسٹی کے فضلاء تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے تھے۔ یہیں علوم و فنون کا مرکز تھا اور یہیں قرآن و حدیث کی سند تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ اسلام کی دوسری عظیم شخصیتیں بھی اقطارِ ارض اور اکنافِ عالم میں اپنی اپنی جگہ علم و فن کی خدمت کر رہی تھیں لیکن یہ حضرات خود علم و عرفان کا مرکز تھے۔ ازہر جیسے کسی مرکزی نظام سے وابستہ نہ تھے۔ مصر کی روشنی عہدِ اسلام سے پہلے بھی علم و فن میں معروف تھی۔ اسلام کے بعد یہ سرزمین اسلامی علوم و فنون کا مرکز بن گئی۔ حالی مرحوم نے ایک تذکرہ میں کہا تھا ؎

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی

جب مسلمان بیدار تھے یورپ تاریخ کی تاریکیوں میں سو رہا تھا۔ جب یورپ بیدار ہوا تو اس نے علم و فن کے ہتھیاروں سے نہیں، سیاست کی شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں سے شوکت چھینی، یورپ کا مردِ بیمار آخر دم تک

اسلام کی مرکزیت کے لیے لڑتا، لیکن ٹوٹنے والی صبح لاکر ستاروں کی قربانی مانگتی تھی۔ یہ قربانی احساسِ زیاں نہیں، روشن مستقبل کی امید تھی۔ اقبال مرحوم بجا کہہ گئے ہے

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہندوستان سے جب مسلمانوں کی شوکت چھنی تھی تو مالکِ ارض و سماء حکیمِ مطلق نے سیاسی انقلاب کے انہی کھنڈرات میں کچھ علم و فن کے موتی چھپا دیے تھے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مع اپنی اولاد و احفاد کے اسلامی تہذیب کو بچانے کے لیے آگے آگئے تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے انگریز ہندوستان کو دارالحرب کہا تھا۔

اس مرکزِ علمی کے سامنے دو منزلیں تھیں۔ مسلمانوں کی چھنی شوکت کیسے واپس لی جائے اور سیاسی تنزل کے دور میں مسلمانوں کی گرتی دیوار کو کس طرح سہارا دیا جائے۔ پہلی منزل تک پہنچنے کے لیے شاہ صاحب نے معاشی انقلاب (بین الملکی اتحاد، اور صحابہؓ سے انتساب کا فلسفہ پیش کیا اور قوم کو جہاد اور ملک کل نظام (یعنی نظام باطل کے توڑنے) کی راہ دکھائی۔ ان تین لائنوں پر حجۃ اللہ البالغہ، مصفیٰ اور مسوی اور ازالۃ الخفاء جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل محدث دہلوی، حضرت شاہ سید احمد بریلویؒ کے ساتھ عملاً جہاد میں نکلے۔

دوسری منزل تک پہنچنے کے لیے ان محدثینِ دہلی نے قرآن و حدیث کے درس اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت سے مسلمانوں کی گرتی دیوار کو سہارا دیا جب شاہ اسمٰعیل میدانِ جہاد میں سربکف تھے۔ شاہ محمد اسحٰق دہلی کی مسندِ حدیث پر قال اللہ اور قال الرسولؐ کا درس دے رہے تھے۔ محدثینِ دہلی نے ظلمت کدہ ہند میں مسلمانوں کو مسلمان رکھنے اور ان کے ذہن و فکر کو غیر اسلامی تہذیب سے بچانے کے لیے علم و عمل کے چراغ روشن کیے۔ تربیتِ اخلاق کے پھول چنے، جہاد کے فیصلے کیے اور خونِ شہادت میں غوطے کھائے۔ ہے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دارالعلوم دیوبند کے بزرگ اسی علم و فکر کے وارث اور محدثینِ دہلی کے اسی خاندان سے وابستہ تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اہل السنۃ والجماعۃ کا مرکز یہی حضرات تھے اور آج بھی علم و عمل کے چراغ اور سلوک و تربیت کی شمعیں انہی حضرات کے رسوخ و خلوص سے روشن ہیں۔ یہ تاریخی پس منظر یہ بتی شہادت ہے کہ یہ حضرات ملتِ اسلامیہ کی خیر و نصرت میں مصروف اور تفریق بین المسلمین سے کوسوں دور تھے۔

علم کا مرکز ولی اللہ محدث دہلویؒ
اُن کے بیٹے چار علم و عمل کے تھے تاجدار
ساقیٔ دہلی کے مستوں نے بارضِ دیوبند
جب رکھی بنیاد مے خانۂ بطورِ یادگار
دور دورہ ساغرِ صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ نوشانِ ازل آنے قطار اندر قطار

اکابرِ دیوبند کے سامنے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو غیر مسلم ہونے سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ہر اس محاذ کو پہچانا جہاں سے مسلمانوں پر فکری اور عملی یلغار ہو سکتی تھی اور پھر اپنی بساط کے مطابق ہر محاذ پر روک تھام کے بند باندھے اور ہر محاذ پر پوری طرح دفاع کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

ہندوستان میں اسلام کے خلاف فکری محاذ

پہلا محاذ: انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں اقتدار ہندو اکثریت کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان زیادہ تر وہی تھے جو پہلے ہندو رہے تھے اور اسلام کی توحید کی دعوت میں فطری کشش تھی۔ انگریزی سیاست نے ہندوؤں کو اس طرف لگا دیا کہ تمہاری قوم کٹ رہی ہے اسے سنبھالو اور مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے کام کرو۔ سناتن دھرم کے دائرہ میں رہ کر یہ کام مشکل تھا۔ ہندوؤں نے اپنے مذہب میں تجدید کی اور آریہ سماج کو ترتیب دیا۔ اس محاذ پر آریہ سماج سے علمی اور فکری جنگ نا گزیر تھی۔ اکابرِ دیوبند نے تحریر، تقریر، مناظرہ اور روحانی اثر و نفوذ سے اس سیلاب کے آگے پوری قوت سے بند باندھے۔ ہندوؤں نے شدھی اور سنگٹھن جیسی تحریکیں بھی چلائیں مگر خدا کا فضل ہے کہ مسلمان بڑے

استقلال سے اپنے عقائد پر ثابت قدم رہے۔

دوسرا محاذ: انگریزی عملداری میں عیسائی مشنری اس زعم سے داخل ہوئے تھے کہ وہ ایک فاتح قوم ہیں، مفتوح قومیں فاتح قوم کے تہذیب و اثرات کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے اسلام کے تہذیبی اثرات ختم یا کمزور کر دیے جائیں اور پھر آہستہ آہستہ انھیں اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ اگر وہ عیسائی نہ بن سکیں تو کم از کم یہ ہو کہ وہ مسلمان بھی نہ رہیں۔ اس محاذ پر اکابر دیوبند نے عیسائی مشنریوں اور مسیحی مستشرقین سے پوری علمی قوت سے ٹکر لی۔ علم و استدلال سے ان کے حملے پسپا کیے، عیسائی تہذیب پر کھلی تنقید کی۔ اسلام کا ہر طرف سے دفاع کیا اور جدید مذہبی تصورات کی پوری حوصلہ شکنی کی۔

تیسرا محاذ: انگریزی مدارس کے سہارے عربی مدارس کو کمزور کیا جانے لگا۔ عربی مدارس کے لیے دنیوی ترقی کی تمام راہیں بند کر دی گئیں۔ اس محاذ پر ضروری تھا کہ قرآن و حدیث کی صحیح تعلیم اور اسلام کے آبرومندانہ احوال کیلیے عربی مدارس کو پوری قوت اور قربانی سے باقی رکھا جائے اور مدارس قائم کیے جائیں اور کوئی بات اسلام کے نام پر اسلام میں گھسنے نہ دی جائے۔ جدید عصری نظریات سلف صالحین کے اسلام کو کمزور نہ کر سکیں اور اسلام کے چشمہ صافی کو شرک و بدعت کی آلائش سے بچایا جائے۔ اکابر دیوبند نے اس محاذ پر پوری ذمہ داری ادا کی اور اسلام کو اسکی اصل شکل و صورت میں باقی رکھا، اسے کسی طرف سے گدلا نہ ہونے دیا۔

چوتھا محاذ: جو مسلمان دینی تعلیم کے لیے باقاعدہ عربی مدارس سے مستفید نہ ہو سکتے تھے، انھیں اپنے اسلاف سے بیگانہ کرنے کی سازش کی گئی کوشش کی گئی کہ ان کے دینی ذوق کو بگاڑ دیا جائے اور وہ اسلام کے اس ذوقِ متوارث سے محروم ہو جائیں جس کے سہارے دنیوی تعلیم رکھنے والے تمام مسلمان صحیح مسلمان رہ سکتے تھے اس کام کے لیے حکام نے اپنے انگریزی مدارس میں دینی تعلیم کے لیے نئے نقشے داخل کیے۔

اس محاذ پر لادینی نظریات حیات اور دین سے غافل کرنے والے خیالات سے جنگ ناگزیر تھی۔ اکابر دیوبند نے اپنے علمی و فکری سرمایے سے اس طبقہ میں بھی اسلام کی پوری حفاظت کی

پانچواں محاذ: ہندوستان میں معاشرتی اور سماجی زندگی اس طرح ترتیب پانے لگی کہ دور دراز آبادیوں کے اَن پڑھ مسلمان برائے نام مسلمان رہ جائیں اور ان کی اولادوں کو ہندو بنانا آسان ہو جائے۔ علماء وہاں پہنچیں تو یہ لوگ ان کی بات سمجھ نہ سکیں اور خود انھیں دین سیکھنے کے لیے علماء کے پاس جانے کی رغبت نہ رہے انھیں ہندو تہذیب میں گھرا رکھا جائے یہاں تک کہ وہ آہستہ آہستہ ہندو اکثریت میں ضم ہو جائیں۔ اس محاذ پر ایسے تبلیغی نظام کی ضرورت تھی کہ مسلمان جماعتیں دور دراز کی آبادیوں میں پہنچیں، یہ جماعتیں صرف علماء کی نہ ہوں، عام مسلمان بھی ان میں شامل ہوں اور یہ لوگ ان مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر اس دینی محنت پر لا سکیں جس کے لیے وہ خود نکلے تھے اور اس طرح ان دور دراز کی آبادیوں میں بھی اسلام کی آواز پہنچتی رہے اور جماعتیں گشت کرتی رہیں۔

پہلے اور دوسرے محاذ پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے آریوں اور عیسائیوں کا پوری قوت اور کامیابی سے مقابلہ کیا اور سامنے آنے والے پر ہر پنڈت اور پادری کو شکست پر شکست دی، ان کے مقابلے میں کتابیں لکھیں اور مسلمانوں کو اس باب میں ہر طرح کے علمی ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ تیسرے محاذ پر قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے کام کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جدید عصری نظریات سے اسلام کے قلعے کا پہرہ دیا اور وہ شاگرد تیار کیے جو اپنے حلقہ میں علم و عرفان کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ چوتھے محاذ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے مواعظ اور ارشادات سے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سامنے وابستگی کی روح پھونکی، راسخ العقیدہ مسلمان انھیں بنانے میں عجیب ربانی خدمات سرانجام دیں۔ پانچویں محاذ پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے شاگرد حضرت مولانا محمد الیاس میدان میں نکلے اور لاکھوں مسلمانوں کو ارتداد کی آغوش میں جانے سے بچا لیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

جو جماعت ان پانچ محاذوں پر اسلام کے خلاف چلنے والی ہر تحریک سے ٹکر لے رہی ہو اس سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود مسلمانوں کے خلاف تکفیری مہم چلا دے اور ملت اسلامی کو دو حصوں میں تقسیم کر دے۔ مسلمانوں کو آپس

میں لانا اور تکفیر بین المسلمین کی مہم چلانا اپنی افراد اور جماعتوں کا کام ہے جن کے سامنے کوئی تعمیری کام نہ ہو نہ ان کی غیر مسلم تحریکات پر نظر ہو جو اکابر غیر طور پر اسلام کا سکون بخشنا چاہتے ہوں وہ مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کو کب تار تار دیکھنا چاہیں گے۔ یہاں سے کیسے ہو سکے گا کہ وہ مسلمانوں کے ہی ایک طبقہ پر جماعتی کفر کا حکم لگا دیں اور مسلمانوں کو ہی غیر مسلموں کی صف میں کھڑا کر دیں۔ اس سے زیادہ ملت کش حرکت اور کیا ہوگی؟ ؎

اُمت کو مار ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام سہنے شریفو ممنون بہت تمہارا

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دارالعلوم کے بزرگوں کا مزاج مسلمانوں کی تعمیر کا داعی رہا ہے۔ تخریب کا نہیں اتحاد کا رہا ہے تفریق کا نہیں انکا طریق کار دائرہ اسلام کو وسعت دینا تھا۔ مسلمانوں کی تکفیر نہیں اور ان کا موضوع علم و دانش کو فروغ دینا تھا۔ محض تردید نہیں علم و عمل کے ان دیوانوں میں تکفیر مسلم کا شغل کسی طور راہ نہیں پا سکتا۔ یہاں صہبائے مدینہ کے جرعہ کش اپنی اپنی بساط کے مطابق سیراب ہوتے رہے۔

دور دورہ ساغر صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ نوشان ازل آئے قطار اندر قطار
قاسم و محمود و انور سے لنڈھائے خم کے خم
اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار
چشمہ جاری تھا رشید و اشرف و شبیر کا
پھر حسین احمد کی مسند سلف کی تھی یادگار

احقاق حق اور اصلاح علمی

تکفیر سے کنارہ کشی کا یہ مقصد نہیں کہ غلط کو غلط نہ کہا جائے تعلیم و تحقیق کی راہ میں جو غلطی راہ پائے اس کی نشاندہی اور اصلاح لازمی ہے۔ علم کا مقصد طالب علم کو خلافی الفکر سے بچانا ہے۔ علماء دیوبند نے ایسے تمام مواقع پر غلط کو غلط کہا اور اپنی ہمت کے مطابق اس غلطی کی پوری نشاندہی کی لیکن انکا طریق اصلاح اور غلطیوں کا ازالہ رہا ہے۔ محاذ آرائی نہیں، کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی تھی کسی طبقے کی تکفیر نہیں۔

معجزات کے باب میں سرسید احمد خاں کی رائے غلط اور مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف تھی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے خاص پر سرسید احمد خاں سے خط و کتابت کی اور افہام و تفہیم کی پوری کوشش کی۔ یہ تحریرات تصفیۃ العقائد کے نام سے چھپ چکی ہیں۔

کتاب و سنت کی صحیح مرادات معلوم کرنے اور ان کی تدریس و اشاعت میں بزرگان دیوبند خدا کے فضل سے اپنی ذمہ داریوں سے پورے باخبر رہے ہیں اور انہیں پوری فکر سے ادا کرتے رہے ہیں۔ غلط تعبیر اور فاسد تشریح کے ہر موڑ پر ان بزرگوں نے بر وقت نوٹس لیا ہے لیکن کسی طبقے کے خلاف تکفیر کی کوئی مہم نہیں چلائی۔

ندوہ سے اختلاف

اکابر دیوبند اور مولانا شبلی نعمانی کا کئی باتوں میں شدید اختلاف تھا۔ بزرگان دیوبند مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے پوری طرح پابند تھے اور مولانا شبلی کی فکر بعض تعبیرات میں معتزلہ کے قریب جا رہی تھی۔ علماء دیوبند نے یہاں تساہل سے کام نہیں لیا۔ اپنی پوری ذمہ داری ادا کی۔ یہ اختلاف بھی علمی اور قلمی حدود میں رہا۔ جماعتی سطح پر کبھی تکفیر کا میدان نہ بنا نہ اس نے کبھی دو مستقل فرقوں کی شکل اختیار کی۔ پھر علماء دیوبند کی حق پسندی کا یہ ثمرہ بھی دنیا نے آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا شبلی کے جانشین علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارشاد میں داخل ہوئے اور سلوک و تربیت میں ان سے خلافت پائی۔ اس کے بعد یہ دونوں علمی درسگاہیں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئیں۔ اگر پہلے مرحلہ میں ضد اور نفرت کی فضا قائم کر دی جاتی تو معلوم نہیں کتنے مسلم مفادات اس ملبے کے نیچے دب جاتے۔

مرزائیوں کی تکفیر

جب اختلاف ضروریات دین تک جا پہنچے۔ ضروریات دین میں سے

کسی کا انکار ہو یا کسی ضروریِ دین میں اس طرح کی تاویل ہو جو مستلزم انکار ہو تو یہ انکار اور الحاد انسان کو کفر کی سرحد میں داخل کر دیتا ہے۔ کسی عقیدہ کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کے یقینی اور متوارث معنی کے خلاف ہو، وہ بالخصوص کے بھی خلاف ہو اور اجماع امت بھی اس کے برعکس ہو تو اس تاویل کو کوئی رعایت نہ ملے گی اور یہ ضروریِ دین کا کھلا انکار شمار ہوگا۔

اسلام جملہ ضروریات دین کو تسلیم کرنا ہے۔ کفر کے لیے ضروری نہیں کہ جملہ ضروریات دین کا انکار ہو۔ ایک ضروری دین کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ صریح انکار ہو یا کسی تاویل سے انکار ہو۔ انکار بہر حال انکار ہے جب کفر ثابت ہو جائے اور اس عقیدہ کفر کا ملزم خود بھی اقبال کرے تو لزوم اور التزام دونوں کا تحقق ہو جاتا ہے ایسے حال میں کفر کو کفر نہ کہنا کفر کو اسلام تسلیم کرنا ہے اور یہ خود کفر ہے۔ ایسے موقع پر تکفیر سے گریز ممکن نہیں۔ اب اس سے احتراز خود دین میں تحریف ہے۔ یہاں اہل حق خاموش نہ رہ سکیں گے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

مرزائیوں نے ختم نبوت کی ایسی تاویل کی جس سے وہ معنی قائم نہ رہے جو دوسری آیات، صحیح روایات اور فہم امت کی روشنی میں قطعی اور یقینی درجہ رکھتے تھے۔ پھر مرزائیوں نے ختم نبوت کے اسلامی معنی کا انکار ہی نہیں کیا مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی بھی تسلیم کیا۔ نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کے انکار کو کفر کہا۔ قادیانی اسے حقیقی نبی کہتے رہے اور لاہوری جماعت اسے ظلی نبی قرار دیتی رہی اور حوزۂ اسلام سے اس طرح دونوں فریق باہر آ گئے۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ علماء دیوبند کے لیے مرزائیوں کی تکفیر سے گریز ممکن نہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند نے مرزائیوں کی تکفیر کا فیصلہ نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف زیادہ تر پنجاب میں تھا اور پنجاب کے علماء ہی مرزائیت سے صحیح طور پر آشنا تھے۔ علماء لدھیانہ نے سب سے پہلے مرزائیوں پر فتوی کفر دیا۔ علماء امرتسر نے ان کی تصدیق کی۔ چلتے چلتے یہ معاملہ علماء دیوبند تک پہنچا۔ انھوں نے پوری چھان بین کے بعد علماء پنجاب کے موقف کو صحیح پایا اور ان کی تصدیق کر دی۔

مرزائیوں کی تکفیر میں بھی علماء دیوبند کی پہل نہیں۔ فتوی کفر ان پر پنجاب میں پہلے لگ چکا تھا پھر علماء دیوبند نے مرزائیوں کی تکفیر محض جذباتی اور عوامی رنگ میں نہیں کی اسے اصولی طور پر پیش کیا اس کے قواعد علمی بتلائے ان قواعد پر سلف صالحین کی تصدیقات پیش کیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفریہ عقائد اس کی ایک ایک عبارت سے نہیں متعدد عبارات اور مختلف تعبیرات سے سامنے لاتے جب اس کے عقائد میں کسی احتمال ثانی کا دخل نہ رہا اور مرزائیوں نے اقراراً ان عقائد کو تسلیم کر لیا تو علماء دیوبند، علماء پنجاب کی تصدیق میں بالکل حق بجانب تھے۔

مرزائیوں پر یہ حکم کفر اپنی جگہ اتنا واضح اور صریح تھا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے مفکرین نے ان کے غیر مسلم اقلیت ہونے کی تجویز پیش کر دی۔ نہ ان کی مسلمانوں کے جنازے میں شرکت رہی نہ مسلمان ان سے رشتہ نکاح میں منسلک رہے عدالتیں فسخ نکاح کے فیصلے کرتی رہیں اور چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان نے قائد اعظم کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کر کے اس اصولی اختلاف کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ یہ صورت حال ۱۹۷۴ء تک قائم رہی یہاں تک کہ رابطہ عالم اسلامی نے اپنے اجتماع عام میں اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے اپنے تاریخی فیصلے میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ علماء دیوبند اگر کسی تکفیر میں آگے بڑھے تو وہ کفر اپنی جگہ اتنا قطعی اور صریح تھا کہ آخر کار حکومتوں کو بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اس سے پہلے بھی مسلمان اپنے معاشرتی اور سماجی امور میں اپنے سب اختلافات کے باوجود ان سے دور اور ان کے کفر پر متحد العقیدہ تھے۔

تکفیر کی مہم بزرگان دین کے عام مزاج عمل کے خلاف تھی اور دارالعلوم کی تاریخ میں یہ ایک نیا باب تھا۔ اس لیے انھوں نے ضرورت سمجھی کہ مسئلہ کفر و اسلام کو اصولی طور پر منقح کر دیا جائے اور اہل علم کے ہاتھ میں ایک ایسی دستاویز دی جائے جو ہمیشہ کفر و اسلام کے اس اصولی فرق کو علمی بنیادوں پر قائم رکھے۔

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیری نے اکفار الملحدین فی

انکار شیٔ من ضروریات الدین" نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تحریر فرمائی۔ اس پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے دستخط فرمائے، اور اہل علم کو ہمیشہ کے لیے اس باب میں مزید تلاش سے مستغنی کر دیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے "وصول الافکار الی اصول الاکفار" کے نام سے اردو زبان میں ایک رسالہ لکھا اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے "مسلمان کون ہے اور کافر کون" کے نام سے مسلمانوں کے سامنے ایک اصولی یادداشت پیش کی۔ حکومت افغانستان نے دو مرزائیوں پر مرتد کی حد جاری کی تو مرزائیوں نے ہندوستان میں بہت شور مچایا جب مرزائی انگریزوں کو مشتعل کر کے افغانستان کو غلام بنانے کی مہم چلا رہے تھے اور یہ سزائے ارتداد ان کا نعرۂ تحریک تھا تو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے رسالہ "الشہاب لرجم الخاطف المرتاب" تحریر فرما کر مرزائیوں پر اسلام کی حجت تمام کر دی اور افغانستان کے خلاف تحریک رک گئی۔

واعظانہ تکفیر اور فرقہ وارانہ تکفیر

ترک عمل یا شعائر اسلام سے بے اعتنائی برتنے پر کسی مسلمان کو پند و نصائح کے طور پر کافر کہہ دینا واعظانہ تکفیر ہے اور اختلاف عقیدہ کے عنوان سے مخالفین کو کافر قرار دینا فرقہ وارانہ تکفیر ہے۔ اکابر دارالعلوم تکفیر میں اس قدر محتاط رہے ہیں کہ انھوں نے دائرہ اسلام میں نہ کسی کی واعظانہ تکفیر کی نہ فرقہ وارانہ۔ حتیٰ کہ جنھوں نے انھیں کافر کہا انھوں نے ان پر بھی محبت کے پھول برسائے۔

واعظانہ تکفیر کی تاریخ

واعظانہ تکفیر کی تاریخ خوارج سے شروع ہوتی ہے۔ خوارج نماز اور روزے کے پابند اور گناہوں سے بہت گریزاں تھے۔ ان کی راتیں یاد الٰہی میں گزرتیں لیکن وہ دین کی صحیح مرادات معلوم کرنے میں غلطی کھا چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سوا تقریباً سب صحابہ اور اہل بیت کے خلاف تھے۔ انھوں نے پہلے مسلمانوں کو پند و نصائح کے طور پر بات بات پر کافر کہا پھر یہی ان کا عقیدہ بن گیا کہ انسان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اسلام سے نکل جاتا ہے۔ وہ آیات جو کفار کے حق میں نازل ہوئی تھیں انھیں یہ مسلمانوں پر منطبق کرتے اور ارتکاب معصیت کو کفر سمجھتے تھے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں۔ انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المومنین (صحیح بخاری ج ۲ ص۱۰۲۴ مصر)

قرآن کریم کی حج کے سلسلہ میں یہ آیت من کفر فان اللہ غنی عن العلمین (پ۴) جو انکار کرے تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں تھی جو حج کی فضیلت سے انکار کریں ظاہر ہے کہ وہ کافر ہی ہو سکتے ہیں۔ اب اس آیت کو ان مسلمانوں پر جو باوجود استطاعت کے حج نہیں کرتے منطبق کرنا کافروں کے حالات کو مسلمانوں پر منطبق کرنا ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور عطاءؒ جیسے ائمہ تفسیر اس آیت کو انہی لوگوں کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ جو حج کے عبادت ہونے سے انکار کریں اور اس کے ترک کو گناہ نہ سمجھیں (دیکھیے سنن کبریٰ امام بیہقیؒ جلد ۴ ص۳۲۴) پس کفر سے مراد فرضیت حج کا انکار ہے (تفسیر مظہری ص۴۲) ترک عمل پر کسی کو اسلام کے دائرہ سے باہر بتلانا ہرگز صحیح نہیں۔ ہاں کلام میں پند و نصائح کے طور پر کسی مسلمان کو کافر کہنے کا جواز ہے۔

عقیدہ کے لحاظ سے خوارج اہل حق میں سے نہیں۔ علماء دیوبند نے ان پر سخت مواخذے کیے ہیں۔ ان کی ناصحانہ تکفیر کی مشین ہر وقت حرکت میں رہتی تھی۔ علماء دیوبند اس قدر محتاط ہیں کہ انھوں نے کبھی کسی مسلمان کی واعظانہ تکفیر نہیں کی۔

واعظانہ تکفیر پر علماء دیوبند کی گرفت

جو لوگ باوجود قدرت کے حج نہیں کرتے۔ حجاز کے پاس سے بھی گزرتے ہیں مگر حج کا ارادہ تک ان کے دلوں میں نہیں گزرتا۔ ان کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> "وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ حج بھی کوئی
> فرض ان کے ذمہ ہے، دنیا بھر سے سفر کرتے پھرتے ہیں
> کعبہ یورپ کو آتے جاتے حجاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے
> ہیں جہاں سے مکہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر
> بھی حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا وہ قطعاً مسلمان

نہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں
اور قرآن سے جاہل ہے جو انہیں مسلمان سمجھتا ہے (خطبات ص ۳۰۹)

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس واغلانہ تکفیر کی پُرزور تردید فرمائی ہے۔ مولانا مودودی نے ایسے لوگوں کو اسلام سے خارج کرنے میں جو دلائل دیے ہیں حضرت مدنیؒ نے ان کے ضعف کو واضح فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ترکِ عمل سے مسلمان گناہگار تو ہوتا ہے لیکن کافر نہیں ہوتا۔ علماء دیوبند کا مزاج عمل کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ کسی مسلمان کے بارے میں گو وہ کتنا گناہگار کیوں نہ ہو، یہ کسی قسم کی تکفیر جائز نہیں سمجھتے۔

مولانا احمد رضا اور مسئلہ تکفیر

عام طور پر مشہور ہے کہ مولانا احمد رضا نے علماء دیوبند پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ درست نہیں نہ کسی شخص نے اس سلسلہ میں ان سے استفتاء کیا نہ مولوی صاحب نے فتویٰ دیا بلکہ مولانا احمد رضا ان علماء کے خلاف خود سائل بن کر علماء حرمین سے فتوے لینے گئے تھے۔ مولوی صاحب کی اپنی شخصیت اور شہرت ان دنوں ایسی نہ تھی کہ کوئی ان کے فتوے پر دھیان کرتا۔ مولوی صاحب نے خود سوال مرتب کیے۔ علماء دیوبند کی اردو عبارات کا خود عربی میں ترجمہ کیا اور خود ہی سائل بن کر علماء حرمین شریفین سے فتوے لینے گئے اور خود ہی حسام الحرمین (حرمین کی تلوار) شائع کیا۔ وہ حرم پاک جہاں تلوار اٹھانا حرام تھا اسی نام سے مولوی صاحب نے تلوار چلا دی۔

اس صورت حال میں ایک غیر جانبدار شخص یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

۱۔ مولوی صاحب کو کیا ضرورت درپیش ہوئی تھی کہ وہ خود مستفتی ہوئے

۲۔ ان کا استفتاء کرنا کیا واقعی حقیقت معلوم کرنے کے لیے تھا یا ان کے پیش نظر ایک تحریک چلانی تھی۔

۳۔ کیا مصلحت تھی کہ علماء دیوبند کی اردو عبارات کا عربی ترجمہ انھوں نے خود کیا علماء دیوبند سے نہ کرایا تا کہ ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۴۔ ان تراجم پر انھوں نے کسی غیر جانبدار عربی دان سے تصدیق کیوں نہ کرائی۔

۵۔ جن الزامات پر فتوے لینا تھا ان کی فردِ جرم علماء دیوبند پر لگا کر اور ان کے جوابات لے کر یہ فردِ جرم اور جوابات علماء حرمین کے سامنے کیوں پیش نہ کیے تا کہ یک طرفہ کارروائی عمل میں نہ آتی۔

۶۔ علماء دیوبند کے خلاف یہ سوالات علماء دیوبند تک محدود کیوں نہ رکھے ان میں مرزا غلام احمد کو شمار کرنے میں کیا حکمت تھی

۷۔ مولانا احمد رضا کی تحریرات میں یہ بات ساتھ ساتھ کیوں چلتی رہی کہ انگریزی حکومت میں ہندوستان دارالاسلام ہے۔

ہمیں اس وقت ان سوالات کے جوابات میں نہیں جانا۔ تکفیر کا یہ ڈرامہ جس انداز میں کھیلا گیا یہ خود منہ بولتی تصویر ہے کہ تکفیر بین المسلمین کی اس تحریک کے محرکات کیا تھے۔ ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خاں نے ان علماء حرمین سے جو اردو اچھی طرح نہ جانتے تھے، علماء دیوبند کے خلاف فتوے حاصل کر لیے پھر جب علماء دیوبند کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے اصل صورت حال سے علماء حرمین کو مطلع کر دیا اور مولانا احمد رضا کی سازش ناکام ہو گئی۔ ہندوستان کے چند جہلاء رہ گئے جو اس دامِ فریب میں مبتلا رہے اور انہی کی ذریت باقی ہے جو اب بھی اس تکفیر کی گردان کر کے مولانا احمد رضا کے آخرت کے بوجھ میں دن رات اضافہ کر رہی ہے۔

جب مولوی صاحب نے ہندوستان میں یہ تکفیری مہم چلائی تو ان دنوں مولانا احمد رضا کی اپنی اہمیت اتنی نہ تھی کہ خود ان کے بارے میں علماء دیوبند سے پوچھا جاتا کہ یہ خود کیا ہیں مسلمان یا کافر؟ دارالعلوم دیوبند کے فتاوے کے رجسٹروں میں ۱۳۲۵ھ تک اس قسم کا کوئی سوال نہیں ملتا۔ مولوی صاحب کی وفات کے بعد جب انہیں کچھ شہرت ہوئی تو علماء دیوبند سے ان کے پیروؤں کے بارے میں استفسار ہوا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں یا کافر؟ مفتی مسعود احمد صاحب نے اس کا جواب لکھا اور محدث جلیل حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے اس پر دستخط فرمائے۔

علماء دیوبند اگر جوابی کارروائی کرتے اور انتقامی جذبہ سے جواب دیتے تو ظاہر ہے کہ کیا جواب ہوتا مگر علماء دیوبند نے اپنی پوری عالمانہ ذمہ داری ادا کی اور وہ موقف اختیار کیا جو اہلِ حق کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جائیگا۔

صورت حال یہ تھی کہ علماء دیوبند کے عقائد میں وہ بنائے کفر ہرگز موجود نہ تھی جس پر فتویٰ کفر دیا گیا تھا اور جو عبارات اس مسئلہ میں پیش کی گئی تھیں، علماء دیوبند کے ہاں ان کے وہ معنی مراد نہ تھے بلکہ ان معنی کو وہ خود بھی کفر سمجھتے تھے۔

قائل کی مراد کو نظر انداز کر کے کسی عبارت پر حکم کفر لگانا بہتان اور الزام تراشی ہو سکتا ہے یا جہالت اور کج فہمی۔ ظاہر ہے کہ بہتان باندھنا فسق و معصیت ہے، کفر نہیں اور جہالت تو معصیت بھی نہیں۔ ہاں جہالت کے ساتھ دینی مسائل میں دخل دینا اور مسلمانوں کو کافر کہنا یہ سخت گناہ اور فسق ہے مگر کج فہمی کی تاویل کے باعث اس پر حکم کفر نہ دیا جائے گا۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی دوسری جلد میں مولوی احمد رضا کے متعلقین کے متعلق یہ حکم مرقوم ہے:

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے متعلقین کو کافر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ ان کے کلام میں تاویل ہو سکتی ہے اور تکفیر مسلم میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بہت احتیاط فرمائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے کلام میں ننانوے وجوہ (احتمالات) کفر کے ہوں اور ایک وجہ ضعیف اسلام کی ہو تو مفتی کو اس ضعیف وجہ (احتمال) کی بناء پر فتویٰ دینا چاہیے یعنی اس کو مسلمان کہنا چاہیے اگر وہ فی الواقع عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان ہے تو فبہا ورنہ مفتی کا فتویٰ اس کو نفع نہ دے گا۔ بناءً علیہ تکفیر کرنا صحیح نہیں بلکہ وہ مسلمان ہے لیکن فاسق فاجر کیونکہ اس کے عقائد مذکورہ سراسر خلاف شرع ہیں اور وہ ایک ایسے شخص کا مرید اور معتقد ہو گیا ہے جو ہرگز مقتدا بنانے کے قابل نہیں ہے۔ (جلد دوم ص ۵۵ مطبوعہ کراچی)

دارالعلوم کے مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"علماء دیوبند کی متبرک و مقبول جماعت کو کافر مرتد وغیرہ کہہ کر لکھنے والے نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اس کا جواب تو صرف یہ ہے۔ فصبر جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون (اب صبر ہی بن آوے اور اللہ ہی سے فریاد ہے) وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون (اور عنقریب جان لیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ بیٹھتے ہیں، اگر کسی کو ان حضرات کی کسی خاص عبارت کے متعلق شبہ ہے یا ان لوگوں کے ورغلانے سے پیدا ہو جائے تو اس کا مفصل جواب سائل میں مذکور ہے ان کو دیکھا جاوے تو انشاء اللہ آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گا کہ ان حضرات پر جو کچھ الزامات لگائے ہیں وہ سب بدفہمی کا نتیجہ ہیں یا افتراء و بہتان ہیں"۔

(فتاویٰ دارالعلوم جلد ۲ ص ۹۴)

مفتی صاحب ایک دوسرے مقام پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی عبارات پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"حضرات علماء دیوبند اکابر سے لے کر اصاغر تک اپنی تمام تصانیف اور تقریر و تحریر میں ہمیشہ اس کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ ہمارے عقائد وہی ہیں جو کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ دین کے رہے ہیں۔ تمام علمائے حنفیہ رحمہم اللہ کے عقائد میں کوئی عقیدہ ان کے مخالف نہیں اور یہی سبق دارالعلوم دیوبند میں تمام طلبہ کو دیا جاتا ہے اور وہی کتب عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کی پڑھائی جاتی ہیں اور جس کسی نے اس کے خلاف ہماری طرف منسوب کیا ہے یا ہماری عبارتوں میں تحریف کر کے اس پر الزام کیا ہے وہ سب افتراء محض ہے۔ ہم اور ہمارے اکابر اس سے بری ہیں"۔ (فتاویٰ دارالعلوم جلد ۲ ص ۴۸)

مولوی احمد رضا خاں نے حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے ذمہ یہ عقیدہ لگایا تھا کہ وہ شیطان کے علم کو (معاذ اللہ) حضورؐ کے علم سے زیادہ جانتے ہیں اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ذمہ یہ بات لگائی کہ وہ حضور پاکؐ کے علم کو (معاذ اللہ) جانوروں کے علم کے برابر کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

میں مفتی صاحب نے ان حضرات کی یہ عبارتیں نقل کی ہیں :

" مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو بندہ پر الزام لگایا ہے بالکل بے اصل اور لغو ہے۔ میں اور میرے اساتذہ ایسے شخص کو کافر مرتد اور ملعون کہتے ہیں جو کہ شیطان علیہ اللعن کو کیا بلکہ کسی مخلوق کو بھی جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم میں زیادہ کہے۔ غرض خاں صاحب بریلوی نے محض اتہام اور کذب خالص بندہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ مجھ کو تو مدت العمر اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ شیطان تو کیا کوئی ولی اور فرشتہ بھی آپ کے علوم کی برابری کر سکے چہ جائیکہ علم میں زیادہ ہو یہ عقیدہ جو خانصاحب نے بندہ کی طرف منسوب کیا ہے اس کا مطالبہ خانصاحب سے روزِ جزا ہوگا۔ میں اس سے بالکل بری ہوں اور پاک۔ وکفیٰ باللہ شہیدا اور اس پر خدا گواہ ہے) فقط۔ (حررہ خلیل احمد عفا اللہ عنہ)

خط حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بنام مولانا مرتضیٰ حسن صاحب۔ ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند۔

مشفق مکرم سلمہم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

آپ کے خط کے جواب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ خبیث مضمون میں نے کسی کتاب میں نہیں لکھا اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں بھی اس مضمون کا خطرہ نہیں گزرا۔

۲۔ میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم نہیں آتا۔

۳۔ جو شخص ایسا اعتقاد رکھے یا بلا اعتقاد صراحۃً یا اشارۃً یہ بات کہے میں اس کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں۔ میرا اور میرے سب بزرگوں کا عقیدہ ہمیشہ سے آپ کے افضل المخلوقات فی جمیع الکمالات العلمیہ والعملیہ ہونے کے باب میں یہ ہے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (فتاویٰ دارالعلوم جلد ۲ ص ۲۰۱)

اس خط کو نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ارشاد فرماتے ہیں :

ادھر حضرات فقہاء کرام کا یہ ارشاد کہ اگر کسی شخص کے کلام میں ننانوے وجہ سے کفر کا مضمون ثابت ہو اور ایک وجہ سے اسلامی معنی بن سکتے ہوں تو ایسے معنی کو ترجیح دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور ادھر ان حضرات کی اس قدر صاف اور صریح تحریریں اور ان کفریہ مضامین سے تبری اور تحاشی۔ اس کو دیکھ کر کوئی مسلمان اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ان فرشتہ صفت انسانوں پر الزام کفر عائد کرے۔ اس عناد و تعصب سے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمائیں۔ ان حضرات کے حالات و مقالات کا کوئی شخص تھوڑا سا بھی مطالعہ کرے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ لوگ مسلمان نہیں تو دنیا میں کوئی مسلمان نہیں، ان کی تکفیر جمہوریت کی تکفیر ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم جلد ۲ ص ۵)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا عقیدہ :

مولوی احمد رضا خاں نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی کتاب تحذیر الناس کے تین مختلف مقامات سے عبارتوں کو جوڑ کر ایک مسلسل عبارت بنا دی۔ پھر اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ترجمے میں بھی کچھ خیانت کر دی۔ وہ عبارت اپنی نئی ترتیب اور غلط ترجمے سے ختم نبوت کے خلاف ایک مضمون بن گیا۔ ایک عبارت ص ۳ سے دوسری ص سے اور تیسری ص سے لے کر ایک جگہ جوڑی گئی تھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم پر جب ختم نبوت کے انکار کا الزام قائم کیا گیا تو آپ نے فرمایا :

" خاتمیت زمانی اپنا دین و ایمان ہے۔ ناحق تہمت کا البتہ کچھ علاج نہیں۔" (جوابات محذورات ص ۳۹)

" اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے۔ اسے کافر سمجھتا ہوں۔" (مکتوبات مولانا محمد قاسم ص ۱۰۳)

اب اس کے باوجود کوئی شخص ضد کی لکیر پیٹتا رہے اور ان اہل اللہ پر کفر کے الزامات لگاتا رہے تو یہ بے شک ایک بڑا گناہ اور سخت قومی جرم ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا عقیدہ :

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے حضرت قطب الارشاد پر تہمت لگائی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا ہے اور اس غلط بیانی سے علماء

حرمین سے اُن کے خلاف فتوے حاصل کر لیا۔ ہم نے اس سلسلہ میں اس مسئلہ کو فتاویٰ رشیدیہ میں سے تلاش کیا۔ اس میں اس کے برعکس یہ عبارت ملی۔

"مگر امکان کذب باین معنی کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اس کے خلاف پر وہ قادر ہے مگر باختیار خود اس کو نہ کرے گا۔ یہ عقیدہ بندہ کا ہے اور اس عقیدہ پر قرآن شریف اور احادیث صحاح شاہد ہیں اور علماء امت کا بھی یہی عقیدہ ہے مثلاً فرعون پر ادخال نار کی وعید ہے مگر ادخال جنت فرعون پر بھی قادر ہے اگرچہ ہرگز جنت اس کو نہ دے گا اور یہی مسئلہ بصورت اس وقت میں ہے بندہ کے جملہ احباب یہی کہتے ہیں اسکو اعداء نے دوسری طرح پر بیان کیا ہوگا۔ اس قدرت اور عدم ایقاع کو امکان ذاتی ممتنع بالغیر سے تعبیر کرتے ہیں"

فقط والسلام رشید احمد عفی عنہ

(فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۱۲ ج ۱ مطبوعہ دہلی ۱۳۴۸ھ)

ان سب تہمتوں اور الزام تراشیوں کے باوجود بزرگان دیوبند نے خانصاحب اور ان کے متعلقین پر کفر کا حکم نہیں لگایا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ خانصاحب کے الزامات غلط ہیں۔ اُن کی بناء بہتان اور الزام تراشی پر ہے یا جہالت اور کج فہمی پر۔ اس کے سوا اس سلسلہ میں تکفیر کی۔ اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ انگریزی سیاست ہے جس کی خیر مسلمانوں کی تفریق میں اور جس کا استحکام مسلمانوں کی فرقہ بندی میں تھا۔

انگریزوں کے اشارے پر قوم کے دو ٹکڑے کرنا فسق و فتنہ کی انتہاء ہے لیکن کفر نہیں، کُفر کا تعلق عقیدے سے ہے مصلحت اور مفاد سے نہیں۔ علماء دیوبند جواباً کُفر کی گولہ باری کرتے تو انگریزوں کی سکیم اور کامیاب ہو جاتی۔ لیکن اللہ ان بزرگوں پر رحمت برسائے۔ یہ شرعی حدود سے باہر نہیں نکلے اپنے کو کافر کہنے والوں کو کافر نہیں کہا اور انگریزی سیاست کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔ انھوں نے شیرازہ ملت کو یکجا رکھنے کی آخری حد تک کوشش کی اور یہ علماء دیوبند کا تاریخی کارنامہ ہے کہ مسلمان اب تک قومی سطح پر سب ایک ہیں اور ملی ضرورت کے ہر موقع پر سب ایک ہو جاتے رہے ہیں۔ تحریک پاکستان سے لے کر تحریک ختم نبوت تک تاریخ کا ہر شذرہ علماء دیوبند کی اعتدال پسندی اور ملت پروری پر شہادت دے رہا ہے۔ مولانا احمد رضا کی تکفیر بین المسلمین کی تحریک عالمی سطح پر ناکام ہو چکی ہے اور پاک و ہند کے حجاج کرام میں ایک فیصدی سے زیادہ لوگ نہ ہوں گے جو وہاں کے اماموں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور انہیں کافر سمجھتے ہیں جمہور مسلمانوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر کافروں کا قبضہ نہیں ہو سکتا اور اگر پورے حالات پر نظر کی جائے تو یہ علماء دیوبند کی عالمی سطح پر ایک فتح عظیم ہے۔

اب بعض بریلوی بھی کہنے لگے ہیں کہ علماء دیوبند کی متنازع عبارات میں مراد کلام اگر واقعی وہ نہ ہو جس پر مولانا احمد رضا نے تکفیر کی تھی تو پھر ان پر حکم کفر نہیں دیا جا سکتا اور جو شخص اب بھی ان عبارات کا وہ مطلب سمجھے جو کفر نہیں تو وہ کافر شمار نہ ہوگا۔ بریلویوں کے مفتی مظہر اللہ صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"قسام ازل نے کسے سمجھ ہی ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کی سمجھ میں کسی عبارت کے ایسے ظاہری معنی نہیں آتے جو موجب کفر ہوں تو ایسے شخص کی دیانۃً تکفیر نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسے معنی کا قائل نہیں جو موجب تکفیر ہیں۔

(فتاویٰ مظہری صفحہ ۳۷۸)

سب بریلوی لوگ اگر اس اصول کو تسلیم کریں کہ تصنیف کی مراد وہی معتبر بھی جائے جو مصنف بتلائے اور ان عبارات کے وہ معنی مراد نہ لیں جنھیں علماء دیوبند بھی کفر کہتے ہیں بلکہ ان کے وہی معنی مراد لیے جائیں جو علماء دیوبند نے بیان کیے ہیں تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔ تو آج بھی ملت اسلامی راہ اتحاد میں ماضی کی شوکت کو تازہ کر سکتی ہے۔ علماء دیوبند کی حق پرستی، اعتدال پسندی اور عدم تکفیر انشاء اللہ ایک دن رنگ لائے گی اور سب مسلمان فرقہ بندی کے بندھن توڑ کر کتاب و سنت اور سلف صالحین کی شاہراہ اتحاد پر گامزن ہوں گے۔ اللہ والوں کی قربانیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ دیر تو ہوتی ہے مگر اندھیر نہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ اختلاف کے

سارے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

علماء دیوبند پر مداہنت کا الزام :

علماء دیوبند کی اس اعتدال پسندی کو بعض لوگوں نے مصلحت کیشی اور بعض نے مداہنت سمجھا ہے، یہ درست نہیں۔ علماء دیوبند کا عدم تکفیر کا فیصلہ حق پسندی اور دلائل شرعی پر مبنی ہے۔ اہل حق کے ان مصلحت سے فتوے نہیں بدلتے۔

علماء دیوبند نے جو مولانا احمد رضا اور ان کے متعلقین کی تکفیر نہیں کی تو اس میں ان حضرات کا مناط حکم معلوم کرنا چاہیے۔ پھر فیصلہ کریں کہ ان کا حکم تکفیر نہ کرنا ازراہ حقیقت تھا یا ازراہ مصلحت۔ ان بزرگوں کی عدم تکفیر سے مراد یہ تھی کہ ان لوگوں پر علماء دیوبند کو کافر کہنے، ان اکابر پر بہتان باندھنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی زد جرم سے شرعاً حکم کفر ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امور بڑے گناہ اور سخت قومی جرم ہیں لیکن کفر نہیں۔

اس عدم تکفیر سے یہ مراد نہ تھی کہ یہ لوگ اپنے غلط عقائد میں واقعی حد کفر تک نہیں پہنچے۔ اکابر دیوبند کے سامنے مولانا احمد رضا کے عقائد پوری تفصیل سے نہ کسی نے پیش کیے۔ نہ علماء دیوبند نے ان کے بارے میں تکفیر یا عدم تکفیر کا کوئی فیصلہ کیا اور نہ کبھی کسی نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ ان دنوں مولانا احمد رضا کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ خود ان کے عقائد پر کوئی بحث کی جاتی۔ ان کی جتنی شہرت ہوئی وہ اس بنا پر تھی کہ انھوں نے اکابر دیوبند کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی تھی ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

علماء دیوبند کا ان پر حکم کفر نہ کرنا محض ان کی الزام تراشیوں کے مقابل ہے ان کے تفصیلی عقائد کے مقابل نہیں۔ ان لوگوں کے کلام عقائد یا عمل میں اگر واقعی کوئی کفر کی بات ہو تو علماء دیوبند اس کے بارے میں حکم شرعی بیان کرنے سے قطعاً گریز نہ کریں گے۔ اہل حق میں مداہنت نہیں ہوتی لیکن یہ حکم ان افراد کا ہوگا جو واقعی اس کفر کے اس کی پوری تفصیل سے مرتکب ہوں۔ جماعتی سطح پر سب بریلویوں پر کفر کا فتوے نہ دیا جائے گا عام بریلوی خاص طور پر خطۂ پنجاب کے مولانا احمد رضا کے عقائد سے تفصیلاً واقف نہیں۔ محض رسم و رواج کی پابندی سے انھیں بریلوی سمجھا جاتا ہے انھیں مولانا احمد رضا کے عقائد سے مجرم ٹھہرانا ہرگز ہرگز درست نہیں۔ یہ قومی سطح پر ایک ظلم ہوگا۔

جہاں تک مولانا احمد رضا کے اپنے عقائد کا تعلق ہے۔ اگر کبھی کوئی ان کی تحریرات میں شرک و کفر کی باتیں معلوم ہوں اور وہ از روئے شرع مبین ان پر مواخذہ کرے تو علماء دیوبند کو اس سے تعرض نہ ہوگا انھوں نے نہ ان کے عقائد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ نہ اس کی ضرورت سمجھی اور نہ ان پر کوئی حکم دیا ہے۔ ان کی عدم تکفیر محض ان کی الزام تراشی کے مقابل تھی۔ ان کے پورے عقائد پر عدم تکفیر کا فیصلہ نہ تھا پس ان اہل حق پر مداہنت کا الزام درست نہیں۔ جو لوگ ہر باطل کے سامنے تیغ براں ہو کر چمکتے رہے اور زندگی بھر انھوں نے عزم و ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کفر و اسلام جیسے امتیازات میں وہ کسی مصلحت کے دھارے میں بہہ جائیں۔

عام بریلوی پوری ملت کے ساتھ برابر کے مسلمان ہیں۔ جوں جوں ان لوگوں کو مولانا احمد رضا کا تعارف ہو جائے گا یہ بریلوی کہلانے سے خود پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ جمہور مسلمان پسند نہیں کرتے کہ مولانا احمد رضا کے نام پر کوئی فرقہ بندی کی جائے۔

یہ بات لائق تحسین ہے کہ علماء دیوبند مسئلہ تکفیر میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں۔ فقہاء اسلام اس سلسلے میں جتنی احتیاط کا حکم دے گئے۔ علماء دیوبند اس احتیاط کا پورا عملی نمونہ ہیں۔ یہ حضرات ایک ایک بات میں کئی پہلوؤں سے سوچتے ہیں اور ایک پہلو بھی اسلام کے مطابق ہو تو یہ وہی معنی مراد لے کر باقی سب کفریہ احتمالات کو نظر انداز کر دیں گے۔ مسلمان کے بارے میں نیک گمان اس بات میں اصل الاصول ہے اور یہی سلف صالحین کی روش ہے اور یہی شریعت کا حکم ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم جلد اوّل ص۲۵ پر فقہاء اسلام کے اس موقف کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

ممالک اسلامی سے دینی روابط :

پوری دنیا کے مسلمان ایک ملت واحدہ ہیں۔ گو موجودہ جغرافیائی حالات اس عظیم مرکزی قومیت میں حارج نہیں۔ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ انما المومنون اخوۃ۔ ممالک اسلامی کی ملی اور ملی تقریبات میں ہمیشہ علماء دیوبند برصغیر پاک و ہند کے اسلامی نمائندوں کے طور پر شامل ہوتے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی ہو یا جامع ازہر، رابطہ عالم اسلامی ہو یا الندوۃ کی مجلس اسلامی لاہور کی تاریخی مجلس مذاکرہ ہو یا دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں کا کوئی علمی دائرہ دیوبند سے نسبت رکھنے والے اہل علم ہر ایسے موقع پر علم کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں اور اس عزت شرف میں علماء دیوبند کی عظیم علمی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی اعتدال پسندی، فرقہ وارانہ رجحانات سے دوری اور سب دنیا کے مسلمانوں کو ملت واحدہ سمجھنے کے عظیم قومی احساس کو بڑا دخل ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اہل علم کا یہی ایک طبقہ ہے جو ملی اور سماجی تمام وسعتوں اور عصری ضرورتوں پر نظر رکھتے ہوئے سلف صالحین سے پوری طرح وابستہ ہے۔ ان کے ہاں علمی بصیرت کے چراغ پوری تابانی سے روشن ہیں تو سلوک و طریقت کی راہوں سے بھی گزر جاری ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل کے ساتھ ساتھ قوم و ملت کے عظیم اجتماعی مقاصد پر بھی ان کی نظر رہتی ہے لہٰذا تمام اللہ تعالیٰ نے انھیں اس پیرایہ بنایا ہے کہ مسئلہ تکفیر میں یہ طبقہ افراط و تفریط سے محفوظ حق و اعتدال کی راہ پر گامزن ہے ؎

و ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء

و لو كره الاعداء من كل حاسد

مولانا ابوالکلام

علم خدا کی ایک امانت ہے

ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے — علم خدا کی ایک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا شوق اس لیے دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں۔ مشتاقان علم و شیفتگان حقیقت سے؟ نہیں ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصول تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ علم کی اس عام توہین و تذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی روشنی برابر چمکتی رہی ہے۔ یہ ملت کے طالبان علم کی وہ جماعتیں ہیں، جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدارس میں حاصل کر رہی ہیں —— آپ یقین کیجیے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لے کر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور ایک کلرک سے لے کر ڈاکٹر بننے کی نوکری تک صرف انگریزی کی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے، ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا۔ حتیٰ کہ روٹی بھی اس کے ذریعے نہیں مل سکتی۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقت ور جذبہ موجود ہے، جو انگریزی تعلیم کی طرف لے جانے نہیں دیتا اور اس کس مپرسی میں عربی تعلیم ہی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں، یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اور اس لیے دنیا بھر میں علم کو علم کے لیے اگر پڑھنے والی جماعت ہے تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہے"۔۔۔۔۔۔

(تحریک خلافت کے دور کے ایک خطبے سے مقتبس)

تحفظ و احیاء اسلام کی عالمگیر تحریک

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ — قائد حزب اختلاف

برصغیر جو اس وقت کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے تاریخی اعتبار سے بڑی خصوصیات کا حامل ہے سبحۃ المرجان کے فاضل مصنف نے ان خصوصیات کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں مستند شہادتیں پیش کی ہیں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضرت آدم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام جو سب سے پہلے انسان، خلیفۃ اللہ اور پیغمبر ہیں کی جنت سے جب زمین پر آمد ہوئی تو اسی خطہ میں وہ سب سے پہلے تشریف لائے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اس خطہ کو ساری دنیا سے ممتاز کرتی ہے

جب سلسلہ نبوت اپنے کمال و اتمام کو پہنچا اور حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو یہ خطہ بھی دوسرے خطوں کی طرح ضلالت و گمراہی کا شکار تھا لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے فضل خصوصی سے جن خطوں کو بالکل ابتدا میں نور اسلام سے منور فرمایا ان میں یہ خطہ بھی ہے، یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام سلام اللہ علیہم و رضوانہ کے عہد سعادت میں ہی یہاں نور ہدایت کی کرنیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نوجوان غازی محمد بن قاسم رحمۃ اللہ تعالیٰ کی جہادی مہم اس ملک میں ابتداءِ اسلام کا باعث بنی لیکن یہ بات صحیح نہیں کیونکہ ایسا تو دورِ صحابہ میں ہو چکا تھا، اور مشرقی اطراف نور اسلام سے منور ہو چکی تھیں اس کے بعد یہاں

قدرت مشعل اسلام کو فروزاں رکھنے کا ہمیشہ اہتمام فرماتی رہی اور اس اہتمام کا سب سے اہم حصہ حضرات صوفیائے کرام علماء ربانیین اور اسی طرح کے اصحاب فضل و کمال ہیں جن کی سعی و جہد سے گلشن اسلام پھلتا پھولتا رہا اور ہوا کی تیزی اور تندی کے باوصف اس کی رونق اب بھی قائم ہے۔

ابتدائی دور میں جن بزرگوں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں شیخ اسماعیل محدث لاہوری، الشیخ سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ اسرارہم جیسے بزرگان سلف بہت اہم حیثیتوں کے مالک ہیں۔

برصغیر کی پوری تاریخ میں جن بادشاہوں اور سلاطین و ملوک کا نام خادم دین کی حیثیت سے زیادہ اہتمام سے لیا جاتا ہے مثلاً سلطان محمود غزنوی، اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی، غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمہم اللہ وغیرہ تو ان کی پشت پر بھی اصحاب علم و طریقت کا سوز دروں آپ کو نظر آئے گا۔

اور جب کبھی گلشن اسلام کو پامال کرنے کی کوئی کوشش ہوئی تو جو لوگ سینہ سپر ہو کر سامنے آئے اور اندرونی و بیرونی فتنوں کو دبا کر گلشن اسلام کی تازگی کو قائم رکھا وہ بھی یہی بوریہ نشین مسند نشینان علم و فقر تھے۔

ہندی تاریخ میں اکبر کا دین الٰہی بہت مشہور ہے اور اس کا موجد اکبر اپنی بے راہ روی اسلام سے دوری وغیرہ میں اپنی مثال

آپ سے۔ لیکن جس ذات نے اس خود ساختہ دین کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیریں اور مقام تجدید پر فائز ہو کر دعوت و عزیمت کی دنیا میں نمایاں کارنامہ سرانجام دیا وہ بھی ایک گدڑی پوش اور فقر غیور کے مالک تھے۔

میری مراد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے ہے جو صدی کے نہیں بلکہ الف ثانی کے مجدد ہیں اور جنہیں عصر حاضر کے معروف اسکالر از حکیم امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ جیسے صاحب بصیرت لوگ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا باعث قرار دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے مجاہدانہ کردار و طرز عمل نے "اکبر دی گریٹ" کے طرز فکر کا ایسا رخ بدلا کہ وہی مغل جن کے متعلق خدشہ ہو چکا تھا کہ یہ اسلام کو اس ملک سے دیس نکالا دیدیں گے وہ اسلام کے خادم بن گئے جن میں اورنگ زیب کو تو بڑی اہمیت حاصل ہے جو حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کے صاحبزادہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کا خادم اور تربیت یافتہ تھا اور ملا جیون علیہ الرحمۃ جیسی عظیم شخصیت کا شاگرد و خادم ا غالباً یہی وجہ ہے کہ امام سندھی عالمگیر مرحوم کو سلطان مجدد کہتے ہیں کہ انہوں نے مجدد صاحب قدس سرہ کی متعین کردہ راہ پر نظام کو چلایا اور اس طرح خدمت اسلام کی۔

ہندوستان میں اسلام بیزار قوتوں کی کمی نہیں رہی جنہیں بت پرست طبقہ سب سے آگے ہے لیکن اسلام کے لئے سب سے زیادہ جو نازک موڑ آئے وہ دو تھے

پہلا تو وہی اکبری دور جس کا ابھی اشارہ کیا جسکو حضرت مجدد صاحب نے بہت جلد بفضل الٰہی دبا دیا اور اس طرح وہ سازش ناکام ہوئی دوسرا فتنہ جو اپنے اثرات کے اعتبار سے انتہائی مضر و نقصان رساں تھا، وہ تھا انگریزی راج! یہ واقعہ ہے کہ جس طرح یہاں ہر دور میں نمودار ہونے والے فتنوں کا علماء حق نے قلع قمع کیا اسیطرح اس فتنہ کی بیخ کنی بھی علماء کے سر ہے۔

یورپین طاقتوں کے تجارتی بہروپ کی ابتدائی آمد کا دور اکبری میں پتہ چلتا ہے جب نوروز کی محفل عیش و طرب میں دنیا بھر سے تاجروں سفیروں اور اسی قماش کے لوگوں کو بلایا گیا تو سمندر پار کی اس مخلوق کو بھی بلایا گیا۔

شاطر یورپینوں نے یہاں آکر معلوم کیا جادو کیا کہ بادشاہ سلامت ان پر فریفتہ ہو گئے اور اسی دور کے خصوصی مصاحب ابوالفضل کو انجیل کا ترجمہ کرنے اور اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو چند اسباق تبرکاً پڑھنے کا حکم دیا۔

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ اکبری فکر و نظریات کو اسلام کے لئے زہر قاتل سمجھتے ہی تھے پھر انہوں نے خاص طور پر جس طرف توجہ دلائی وہ تھا "کافر از فرنگ" کا مسئلہ، کافر از فرنگ کے کفر اور اس کی عیاری و فریب کاری پر ان کی رگ فاروقیت پھڑک اٹھتی ہے اور ان کے قلم سے انگارے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کے مغل بادشاہوں نے روائتی ہمدردی کے چکر میں ان لوگوں پر احسان کیا تجارت وغیرہ کی کھلی اجازت دیدی تو یہ لوگ بے جا جرأت یا بالفاظ صحیح فریب کاری و مکاری کے حربوں سے ملک پر قابض ہونے کی سوچنے لگے۔

فرماں روا طبقہ میں سے جس نے سب سے پہلے ان کی فریب کاریوں پر توجہ دی وہ سلطان ٹیپو شہید ہیں جن کا تعلق حضرت الامام السید شہید بریلوی کے بزرگوں سے تھا، لیکن مرحوم ٹیپو کی ساری کوششیں اس لئے بارآور نہ ہوئیں کہ انگریز کو تحفظ دینے کی خاطر کئی اور گماشتے موجود تھے جنہوں نے مسلم کاز سے غداری کی۔

اورنگ زیب کے بعد بے چین اور مضطرب ماحول میں قدرت نے حضرت فیلسوف اسلام حکیم الامت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کو کھڑا کر دیا، انہوں نے جہاں ملکی حالات کی بہتری کے لئے احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا

وہاں علمی و فکری بنیاد پر خوب کام کیا اور مت کر مجبوراً علیگڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب رشید احمد نے "مکتوب شاہ بنام شاہ" میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی اس دعوت کا پورا پس منظر بیان کر دیا ہے جو آپ نے احمد شاہ ابدالی کو دی۔ یہ دعوت قبول ہوئی ابدالی آئے اور مرہٹوں کی طاقت ختم کر دی۔ اس کے بعد ابدالی واپس چلے گئے۔ اگر وہ اس موقع پر یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو صورت حال تبدیل ہو سکتی تھی۔

شاہ صاحب نے سب سے اہم کام جو کیا وہ ہے فکری محاذ پر قوم کی صحیح رہنمائی۔ قرآن عزیز کا ملکی زبان میں ترجمہ کرنا ان کا مجددانہ اور شانی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاست و اقتصاد کے مسائل پر سیر حاصل بحث اور ان شعبہ ہائے حیات میں رونما ہونے والی بے اعتدالیوں کی نشاندہی سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں حجۃ اللہ البالغۃ، بدور بازغہ، تفہیمات الہیہ، ازالۃ الخفاء وغیرہ کتابیں آپ پڑھیں قرآن مسائل حیات کے ساتھ آپ کو تاریخی حقائق کا ایک بحر بے کنار نظر آئے گا۔

اس ساری جد و جہد کا اصل مقصد یہ تھا کہ دنیا میں تمام نظام ہائے باطلہ کو مٹا کر "اسلام کے نظام عدل و مساوات" کے اجراء و نفاذ کی کوششیں کی جائیں۔

دراصل آپ چونکہ مجدد تھے اور مقام تجدید موہبت الٰہی ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد سے مترشح ہوتا ہے ان اللہ یبعث الحدیث کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مقام تجدید کے لئے انتخاب بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور قدرت کی خاموش رہنمائی اس سلسلہ میں انسانیت کی پناہ ہوتی ہے اس لئے آپ نے "مجدد" ہونے کی حیثیت سے حالات پر نظر ڈالی اس موڑ پر ان کی جو رہنمائی کی گئی اس پروگرام کا نام آپ نے فک کل نظام رکھا یعنی نظام ہائے باطلہ کی بیخ کنی۔

آج دنیا میں انقلاب فرانس، مغربی جمہوریت اور رشین بلاک کے کمیونزم وغیرہ کا بڑا چرچا ہے اور دنیا کا ایک طبقہ سیاسی استحکام اور معاشی مساوات کے لئے اس قسم کے نظاموں کے گن گاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام نے دنیا کے مسائل سلجھانے کے بجائے اور الجھا کر رکھ دیئے ہیں، لیکن شاہ صاحب قدس سرہ نے انقلاب فرانس سے نصف صدی سے زائد عرصہ پیشتر اور کمیونزم کے بانی کارل مارکس کی پیدائش سے ایک صدی قبل قرآن و سنت کی روشنی میں جو پروگرام مرتب فرمایا تھا اس کی اہمیت کو کمیونسٹ انقلاب کے رہنماؤں نے انسانی مسائل کے حل کا شافی نسخہ قرار دیا اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہ پیغام اس وقت ہمیں پہنچا جب روس وغیرہ میں کمیونزم کے نام پر انقلاب آ چکا ہے۔

امام انقلاب مولانا سندھی قدس سرہ اپنے شیخ و مربی شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے حکم سے جب افغانستان گئے اور سات سال قیام کے بعد انہیں روس جانا پڑا تو اس وقت کے زعماء سے اس قسم کی گفتگو ہوئی۔

شاہ صاحب اپنے اس دینی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انقلابی جماعت بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور مقصد سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے رضاکاروں کے واسطے سے یہ کام لینا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا اور بالکل صحیح کہ تنخواہ دار اور ملازم پیشہ لوگ وہ کام نہیں کر سکتے جو مخلص رضاکار کر سکتے ہیں۔

انقلابی جماعت بنانے اور قوت کے ساتھ حالات کا نقشہ پلٹنے کی تجویز ذہن میں اس لئے آئی کہ آپ کی نظر حالات پر تھی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت بچوں کا کھیل بن چکی ہے شیعہ اور دوسرے عناصر کے ہاتھوں میں حکمران کٹھ پتلی ہیں آئے دن انقلاب آتے ہیں اور پوری قوم افراتفری کا شکار ہے، انتظامیہ بدکردار ہے، فوجی پیشہ ور بے راہرو ہو چکے ہیں اور ظلم و ناانصافی اپنے جوبن پر ہے۔

لیکن آپ کو مہلت نہ ملی اور آپ پروگرام وضع کرنے کے بعد عملی جامہ پہنانے سے قبل دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے فرزند رشید سراج الہند

حضرت الشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ سعادت مند جانشین نے تحریک کو منظم کرنے کی غرض سے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ہندوستان کی ایک حیثیت متعین کر دی۔ اب تک لوگوں کے ذہن حالات کے مطابق اطمینان سے خالی تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ملک کو دارالاسلام کہا جائے یا دارالحرب یا دارالامن؟

شاہ صاحب نے کمال جرأت و دیانت سے حالات کا جائزہ لیا اور ایک مفصل فتویٰ جاری فرمایا جس میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان فرمایا آپ نے ہندوستان کے حالات کے ضمن میں انگریز نصاریٰ کی دھاندلیوں اور مکر و فریب کا بالخصوص اپنے فتویٰ میں ذکر فرمایا۔

چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے مدرسہ رحیمیہ قائم فرمایا تھا جس کے علمی فرزند ملک کے گوشہ گوشہ میں موجود تھے اس لئے خاندان رحیمی و ولی اللہی کے وارث و جانشین کی یہ صدائے حق پوری سرعت کے ساتھ ملک کے چپہ چپہ میں پھیل گئی۔

فتویٰ جاری فرمانے کے ساتھ ساتھ آپ نے مجاہدین کی تیاری کے لئے بھرپور کوشش جاری رکھی اس سلسلہ میں حسن اتفاق سے رائے بریلی کے قدیم بزرگوں کی اولاد کا ایک ہونہار فرزند انہیں مل گیا جس کی تعلیم و تربیت آپ نے اور آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمۃ نے کی، تعلیم کے بجائے اس صاحبزادے کا زیادہ رجحان اس طرف تھا کہ جہادی مہم میں حصہ لیا جائے اور پھر اس نے انتظامی معاملات کا وسیع تجربہ بھی حاصل کر لیا تھا اس لئے شاہ صاحب نے اس صاحبزادے حضرت الامام الامیر السید احمد بریلوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کو تحریک مجاہدین کا سربراہ بنایا اور اپنے مخصوص عزیزوں یعنی مولانا عبدالحئی بڈھانوی اور مولانا محمد اسماعیل قدس سرہما کو ان سے متعلق کر دیا اور ان کی ان سے بیعت کرا دی باوجودیکہ دونوں بزرگ عمر اور علم میں سید بریلوی سے بڑے تھے۔

اس تحریک کا باضابطہ اجرا ہونا تھا کہ ایک ہلچل مچ گئی سید صاحب نے اپنے رفقاء سمیت دورے شروع کر دیئے ان دوروں میں جس کثرت سے لوگ ان کے ساتھ شامل ہوئے اور جانی و مالی قربانی دی اس کا اندازہ ایک متعصب انگریز دشمن لارڈ ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے ہو سکتا ہے۔ لوگوں کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی تنخواہوں کا ایک حصہ اور سالانہ چھٹیاں اس مقدس مہم میں خرچ کرتے تھے اسی دوران سفر حج بھی پیش آیا اور اس کا مقصد بھی دراصل جہاد کے معاملہ میں تیاری ہی تھا۔ یار لوگوں نے سید صاحب کے سفر حج کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیں اور مشہور کر دیا کہ مکہ معظمہ میں ان کی ملاقاتیں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کے زعماء سے ہوئیں جہاں سے وہ "نجدی وہابی" عقائد سے متاثر ہوئے وغیرہ ذالک۔ حالانکہ انگریز مورخین خود تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب کے وہاں پہنچنے سے کئی سال قبل نجدی تحریک اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی لیکن دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے مصداق یہ تسلیم کرنے والے اپنی ہی کتابوں کے دوسرے صفحہ پر سید صاحب اور نجدیوں کی ملاقاتوں کے افسانے تراشنا شروع کر دیتے ہیں۔

بہرحال سید صاحب نے جب جہاد کا سلسلہ شروع کیا تو ابتداء میں خاطر خواہ کامیابیاں ہوئیں جو دو طرف پھیلی ہوئی تھیں ایک طرف سرحد میں آپ خود نبرد آزما تھے تو دوسری طرف بنگال میں حاجی شریعت اللہ، تیتو میر وغیرہ سرگرم عمل۔ لیکن خدا کو ایسا ہی منظور تھا کہ کچھ بدبخت عناصر آڑے آگئے اور ۱۸۳۱ء کے وسط میں آپ اور آپ کے اہم رفقاء شہید کر دیئے گئے

ہر چند کہ اس سے تحریک کو نقصان پہنچا لیکن مسٹر ہنٹر کے مطابق یہ تحریک قائدین کی موت و حیات سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

اس لئے سلسلہ چلتا رہا بچے کچھے حضرات نے سرحد میں ستیانہ کے مقام پر کیمپ قائم کر کے انگریز بہادر کو مسلسل پریشان کئے رکھا اور تھوڑے

ہی عرصہ بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں ایک بار پھر پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی اس اشاراتی مضمون میں تفصیلات کا موقع نہیں ورنہ اس بات کے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا سہرا بھی انہی لوگوں کے سر ہے جو تحریک ولی اللّٰہی سے نسلاً بعد نسل منسلک تھے اور اسی نہج پر تربیت یافتہ تھے۔

اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں محسوس ہوتا تھا کہ انگریز راج ختم ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اندرونی غداروں کی سازشوں اور ہیم قوم فروشیوں نے ملت کے کاز کو سخت نقصان پہنچایا۔

اس مرحلہ پر جو لوگ توپ و تفنگ اور جذبات صادقہ لیکر میدان میں آئے اُن میں سید الطائفہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ بھی تھے۔ جو علماً عملاً ہر طرح ولی اللّٰہی سلسلہ کے وارث تھے اور جن کا روحانی تعلق بھی اس تحریک کے بزرگوں سے تھا۔ حاجی صاحب اپنے رفقاء سمیت جہاد و قتال کے میدان میں آئے اور ایک وقت میں ایک حصہ اپنے قبضہ میں لیکر "اسلامی حکومت" کی بنیاد بھی رکھدی لیکن ابھی آزمائشی دور ختم نہیں ہوا تھا اس لئے آخری نتیجہ انگریز کے حق میں نکلا۔

آزادی کی اس تحریک کی ناکامی کے بعد انگریز نے ظلم و جبر کے تمام روایتی طریقے اپنائے، انسانیت کے بے پناہ قتل کے ساتھ مساجد و مدارس کی بربادی میں بھی خوب خوب ہاتھ رنگے اور اپنے طور پر ملت اور اس کے آثار و نشان مٹانے کی خاطر تمام ممکنہ تدابیر اختیار کیں، یہی وہ دور ہے جب ملت اسلامیہ اپنے مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس ہو ہو چکی تھی اور دشمن مطمئن تھا کہ اس نے ہندوستان کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرا لیا لیکن جو خطہ ارضی ابتداء سے آسمانی رشد و ہدایت سے نوازا گیا ہو اس سے آثار دینی مٹانا کسی کے بس میں نہ تھا اور قدرت اغیار کی ریشہ دوانیوں پر مسکرا رہی تھی۔

کے ذریعے خدمت اسلام کی تھی اور ملت کو بچانے کا فریضہ سرانجام دیا تھا قدرت نے پھر ان کی رہنمائی کی اور اب وہ نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں آئے۔ اس مقصد کی خاطر جو بنیاد سوچی گئی وہ تھا "علم کا میدان"

ظاہر ہے کہ ایک تو ویسے ہی خدائے بزرگ و برتر نے علم کی بڑی اہمیت بیان کی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ قومی اور ملی سطح پر ہر انقلاب "علم" کا مرہون احسان ہوتا ہے، انگریز نے بھی علمی میدان تجویز کیا تھا۔ اور اسی تجویز کی روشنی میں اس نے مدارس کا قلع قمع کر کے اپنا خود ساختہ نظام تعلیم رائج کیا تا کہ ساری دھرتی کو "خداوند یسوع مسیح" کی بادشاہت میں شامل کیا جائے۔

مستقبل میں تحفظ و احیاء اسلام کی خاطر جد وجہد کے لئے "علمی میدان" حقیقت میں کسی نے تجویز نہ کیا تھا بلکہ القاء ربانی نے ارباب قلوب کو اس تجویز پر متفق کیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سمیت دوسرے بانیان دارالعلوم نے جب مل بیٹھ کر اپنی اپنی رائے بیان کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کے لئے جو راہ سُجھائی ہے وہ ہے "علمی تحریک"۔

چنانچہ اس رہنمائی کے مطابق مدرسہ کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جگہ وہ تجویز کی گئی جو شہری شور و غوغا سے دور تھی یعنی دیوبند کا قصبہ!

اس قصبہ کی تجویز کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے پہلے علمبردار حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور بعد میں تحریک مجاہدین کے سربراہ حضرت السید بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "اس جگہ سے بوئے علم آرہی ہے"۔

مدرسہ کی ابتداء کے لئے کسی اشتہار و منادی کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بس سادہ طریق سے چند باخدا لوگوں نے ملا محمود صاحب قدس سرہ کو میرٹھ سے

۰ مجاہدین حریت جنہوں نے اب تک "جہاد بالسیف"

بلاکر بٹھا دیا اور دیوبند کے ہونہار فرزند محمود الحسن نے کتاب کھول کر مدرسہ کی ابتدا کر دی۔ مدرسہ شروع ہوا تو امیر ملت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کو مکہ معظمہ میں اطلاع دی گئی، آپ نے فرمایا:

"سبحان اللہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ بنایا، معلوم نہیں کتنی پیشانیاں سحری کے وقت اس مقصد کے لئے بارگاہ ربوبیت میں سجدہ ریز ہوتی رہی ہیں۔"

ان تفصیلات سے مدرسہ بنانے یا ملی تحریک جاری کرنے کا پس منظر اور اس سلسلہ کی سوچ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور جب بعد کے نتائج کو دیکھا جاتا ہے تو پھر معاملہ اور بھی زیادہ نکھر جاتا ہے۔

تفصیلی گفتگو کا تو وقت نہیں مختصراً یوں سمجھیں:

کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی تو مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہو گئی، مایوسیوں نے گھیر لیا اور سوچا یہ جانے لگا کہ یہ قوم اب کبھی انگڑائی نہ لے سکے گی لیکن اسی ملی تحریک کی داغ بیل نے جس کی پہلی کڑی دارالعلوم دیوبند کا قیام تھا۔ افراتفری کا شکار دکھی مسلمانوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا اور نئے سرے سے ایک مرکزِ وحدت میسر آ گیا۔

یہی مرکزِ وحدت ہے جو آج ایک سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی اسی حیثیت میں موجود ہے اور ملت کی ہر نوع کی رہنمائی اس کے دم قدم سے ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے بھی مختلف النوع فتنے اسلامی عقائد کے خلاف سامنے آ چکے تھے لیکن اس کے بعد جس طرح چاروں طرف سے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تاتاریوں کا ظلم و ستم بہت مشہور ہے اور اندلس کا خونی ڈرامہ اپنی مثال آپ ہے لیکن آج تو مکر و فریب کے ہر نوایجاد طریق سے متاعِ حیات لوٹی جا رہی تھی، اور عیسائی مشنریز کے ساتھ ساتھ آریہ سماجی وغیرہ اور پھر بعد کے ادوار میں انکارِ ختم نبوت، انکارِ حدیث و معجزاتِ نبوی اور بدعات و رسوم جاہلیت کا جو اس دور میں ہوا اس نے انتہائی خطرناک صورت پیدا کر دی۔

ساتھ ہی تعلیم جدید کے فتنہ کو بھی شامل کر لیں جس کا ظاہری عنوان تو دلفریب تھا لیکن فی الحقیقت لارڈ میکالے کی تعلیمی سکیم کو خود نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھانے کی ایک گہری سازش تھی۔

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ جدید علوم و فنون وغیرہ کے متعلق علماء پر جو طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ سراپا غلط ہے، علماء تنگ نظر نہیں کہ وہ اس قسم کے کردار کا مظاہرہ کریں، انہوں نے تمام علوم و فنون کی اجازت دی جیسا کہ خود سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حوالے سے تسلیم کیا ہے۔ اور حضرت مولانا گنگوہی اور علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے فتوے بھی موجود ہیں۔ البتہ علماء کو جس بات سے اختلاف تھا وہ یہ تھی کہ مذہب و دینیات سے الگ رہ کر جو تعلیمی ڈھانچہ رچایا جائے گا اس کے برگ و بار انتہائی نقصان دہ ہوں گے۔ اور قوم اپنے مرکز سے دور ہو جائے گی۔

تعصب و ہٹ دھرمی سے الگ تھلگ ہو کر اگر علماء کی اس بات کو دیکھا جائے تو آج وہ سو فیصد درست ثابت ہو گی۔

بہرحال بات ان فتنوں کی ہو رہی تھی جو متاعِ ایمان و اسلام کو مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ لیکن دیوبند اور اس کے فرزندوں نے جس طرح ایک ایک فتنہ کے سامنے بند باندھا وہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں۔

انگریز، مشنری، آریہ سماجی، مرزائی، منکرین حدیث، دشمنانِ صحابہ اور اہل بدعت کی تمام ترگتاخیوں کے جواب میں قلمی اور لسانی جہاد اسی تحریک

کے خدام نے کیا اور ہر ایک کو منہ کی کھانی پڑی ۔ والحمد للہ

بانی دارالعلوم کے وہ مناظرے اور علمی کاوشیں جو آریہ سماج کے خلاف ہوئیں ایک ریکارڈ ہے جسے تاریخ نے محفوظ کر دیا ہے۔ عیسائیت کی بات آتی ہے تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا ابوالمنصور وغیرہ کی خدمات سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

مرزائیت کے خلاف مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ ہے۔ اس کے بعد حضرت العلام السید محمد انور شاہ کاشمیری کا علمی جہاد، پھر آپ نے اپنے شاگردوں مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا محمد یوسف بنوری کو تصنیفی میدان میں لگا دیا۔

مجلس احرار اسلام جس کے وارث کے طور پر آج مجلس تحفظ ختم نبوت موجود ہے کو حضرت شاہ صاحب نے اس محاذ پر کھڑا کیا پھر مجلس کے خدام نے جنہیں امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا قاضی احسان احمد، الشیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین، مولانا لال حسین اختر اور مولانا محمد حیات فاتح قادیان وغیرہ شامل ہیں نے اس محاذ پر جو کام کیا وہ تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت ہو یا ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اسی مادر علمی کے فرزندوں نے ان میں ہراول دستے کی حیثیت سے کام کیا۔ آج مجلس تحفظ ختم نبوت نے اپنے امیر مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں مجلس عمل کے پلیٹ فارم پر ساری دنیا کو اکٹھا کر کے تحریک منظم کی اسمبلی کے باہر حالات پر کنٹرول کیا تو یہ انہی مرحوم بزرگوں کی قربانیوں کا ثمر تھا اور اسمبلی کے اندر مجھ جیسے ناچیز سے جو کام ہوا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل اور اپنے اسلاف کی توجہات کی برکت سے تھا۔

علاوہ ازیں مجلس کا بیرون ملک یورپ، افریقہ، مشرق وسطیٰ انڈونیشیا اور دوسرے مقامات پر مرزائیت کا تعاقب جاری ہے اور الحمد للہ خاطر خواہ نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ گذارش بھی ضروری ہے کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے مرزائیت کے خلاف جو آواز بلند کی تو وہ بھی حضرت سید محمد انور شاہ صاحب کی نظر کرم کا صدقہ تھی اور ۲۵ء کے مقدمہ بہاولپور میں اہل اسلام کو مرزائیوں کے مقابلے میں کامیابی بھی محدث کاشمیری کی جد و جہد سے ہوئی۔ منکرین حدیث و معجزات کا فتنہ ہے تو سر سید سے لیکر غلام احمد پرویز تک ایک ایک علمبردار فتنہ کو اپنی موت آپ سلانے والے یہی اکابر ہیں۔ دیال سنگھ کالج کے جلسہ میں قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی پرویز کے تلبیس پر بمباری اور پھر تمام اکابرین کا متفقہ فتویٰ کہ پرویز کافر ہے، کل کی بات ہے۔

ملک کے ایک معقول حصے میں سبائیت کے اثرات کا قلع قمع کرنا اور لکھنؤ میں حق صحابہ کو منوانا مجلس احرار کی قربانی کا نتیجہ ہے جو اس شجرۂ طیبہ کی ایک ٹہنی تھی اور آج بھی اس میدان میں جو افراد اور جماعتیں سرگرم عمل ہیں اور سبائیت کے اثرات سے ملت کو بچانے کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں وہ سبھی حضرت نانوتوی اور دوسرے اکابرین دیوبند کی معنوی اولاد ہیں۔

اہل بدع و ہوا جو ایک طرف بدعات و رسومات جاہلیت کی وجہ سے اسلام کے چشمۂ صافی کو گدلا کر رہے تھے تو دوسری طرف "اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام" جیسی کتابیں لکھ کر اور انگریزی فوج میں شامل فوجیوں کو ترکوں کے مقابلہ میں تعویذ دے کر ملت سے غداری کر رہے تھے ان کا مقابلہ کیا اور اب تک کیا جا رہا ہے، جدید تعلیم کے نام پر جو تحریک چلائی گئی اور جس کے لئے ملک بھر کے وڈیروں نے دورے کئے اور انجمن ہائے اسلامیہ قائم کیں یا دوسرے ناموں سے انجمنیں قائم کیں، ان کے مضر اور منفی اثرات سے خلق خدا کو آگاہ کیا اور دینی علوم کی اشاعت عقائد اسلامیہ کے تحفظ کے لئے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کئے جنہیں ابتدائی،

وسطانی اور فوقانی ہر درجے کے مدارس بنائے اور خلق خدا کو فیض یاب کیا۔ ان مدارس کی خوبی یہ تھی کہ سرکاری اثرات سے آزاد رکھ کر محض غریب عوام کے مخلصانہ چندوں سے ان مدارس کو چلایا گیا اور طلباء کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچا کر انہیں علم کی روشنی سے منور کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے۔ اس وقت صرف پاکستان میں ہزاروں چھوٹے بڑے مدارس ہیں جو دین کی خدمت میں مشغول ہیں۔ اس کے علاوہ دیوبند نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ ہے غیر ملکی سامراج کا خاتمہ اور ملک کو آزاد کرانا۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جب سے انگریز نے اس ملک میں قدم رکھا اس وقت سے جو حضرات اور طبقہ انگریز کے خلاف سرگرم عمل تھا وہ یہی طبقہ تھا اور اسی طبقہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برابر حصہ لیا۔ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہم اللہ سرفہرست ہیں۔ حضرت نانوتوی مدرسے کے بانی اور حضرت گنگوہی سرپرست تھے اور ان کے محبوب ترین شاگرد حضرت شیخ الہند قدس سرہ تھے جو دیوبند کے پہلے طالب علم تھے حضرت شیخ الہندؒ نے فراغت علم کے بعد مدرسہ میں تدریس اختیار کر لی اور ابتدا میں جب آپ مدرس ہوئے تو آپ کی حیثیت یہ تھی کہ آپ مدرس چہارم تھے اور بڑھتے بڑھتے سلسلہ وہاں تک پہنچا کہ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ کے بعد مدرس اول ہو گئے۔ آپ کا طویل دور تدریس امتیازی شان کا مالک ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں حضرت امامنا الہمام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو شاگرد ملے اور پھر آپ کو! فہرست دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے حضرت مدنی، حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری، مولانا سندھی، حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا منصور انصاری، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مولانا فضل ربی افغانستان، مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا رسول خانصاحب، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، میاں اصغر حسین صاحب، مولانا محمد صادق کراچوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور مولانا عزیز گل مدظلہ جیسی نادر روزگار شخصیتیں آپ کو نظر آئیں گی۔ اور یہ فہرست اصل کا دسواں حصہ بھی نہیں۔

تلامذہ میں چند بزرگ جو میدان رزم میں سامنے نہیں آئے لیکن انہوں نے اور دوسرے اعتبارات سے جو خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثلاً ہزار کتابوں سے زائد کے مصنف حضرت تھانوی قرآن کے مفسر اور حدیث کے شارح مولانا عثمانی امام المعقولیین مولانا محمد ابراہیم اور مولانا رسول خان صاحب وغیرہ باقی اکثر حضرات حضرت کے مشن کے مطابق میدان رزم میں آئے اور شیخ کی ہدایات کے مطابق خوب کام کیا۔

ان حضرات کو حضرت نے جہاں اور جس ڈیوٹی پر متعین کیا انہوں نے وہاں کام کرنا سعادت سمجھا، مولانا مدنی قدس سرہ جو حدیث کے بہترین اسکالر اور مجاہد انسان تھے حضرت کے مشن کے لئے ایک عرصہ تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے جیسا کہ الجمعیۃ کے شیخ الاسلام نمبر کے ایک مضمون کے مطابق علامہ سید انور شاہ کاشمیری کے سوال کے جواب میں حضرت کا ارشاد موجود ہے۔

مولانا سندھی ہیں تو ربع صدی تک بادیہ پیمائی کرتے رہے اور تحریک شیخ الہند کو خوب پروان چڑھایا۔ مولانا منصور انصاری اور مولانا فضل ربی جیسے بزرگ ہیں تو وہ مسافرت و مہاجرت کی زندگی میں خدا کو پیارے ہو گئے، علامہ انور شاہ ہیں تو آپ نے پشاور جمعیۃ کے عظیم الشان اجلاس میں خطبۂ صدارت میں جس طرح تحریک شیخ الہند کے مقاصد کی وضاحت کی اور ترک موالات پر دلائل و براہین کے انبار لگائے وہ انہی کا حصہ تھا۔

حضرت مفتی کفایت اللہ ایک مدت تک تحریک کی مرکزی قوت رہے، حضرت لاہوری ہیں تو وہ دہلی اور پھر دہلی کے بعد لاہور میں مشن کے ایک داعی رہے۔

ساتھ ہی حضرت شیخ الہند نے دوسرے معروف لوگوں سے رابطہ قائم کیا جو تحریک میں مؤثر کردار ادا کر سکتے تھے ان میں حضرت قطب الاقطاب مولانا تاج محمود امروٹی، حضرت قطب زمان دین پوری رحمہم اللہ تعالیٰ قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اپنی خانقاہوں کو فوجی چھاؤنیوں میں بدل ڈالا اور انگریز کو ناک چنے چبوا دیئے۔

ادھر مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ ہیں جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد تو نہ تھے لیکن آپ کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور آخر تک شامل رہے اور خوب سے خوب تر کام کیا۔

اس تحریک کا ابتدائی مرحلہ تو باقاعدہ مسلح جنگ تھی جس کے لئے حکومت ترکی و افغانستان وغیرہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن جب یہاں کامیابی نہ ہوئی تو مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد عدم تشدد اور عدم تعاون کی راہ اپنائی اور اس کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم کو مضبوط کرنے پر زور دیا جس کی ابتدا آپ کی رہائی سے ایک سال پہلے آپ ہی کے خدام کر چکے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند نے جو قابل فخر کردار ادا کیا اس کا مقابلہ کوئی تحریک نہیں کر سکتی، مسلم لیگ کو تو چھوڑیں کہ جدوجہد کا لفظ اس کی لغت میں ہی نہ تھا، کانگریس بھی ابھی تک پوری طرح بیداری کے موڑ پر نہ آئی تھی کہ بیسوی صدی کے پہلے ربع کے اختتام پر جمعیۃ نے کامل آزادی کا نعرہ لگا کر جدوجہد کو نیا رنگ دیا

اس موقع پر جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا سرسری خلاصہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا۔

(۱) عدم تعاون کا فتویٰ جو پہلی جنگ عظیم کے موقع پر دیا گیا اور اس کی بنیاد پر کانگریس و خلافت کے کارکن بھی میدان میں آئے یہ فتویٰ ضبط ہوا اور ہزار ہا علماء کو بے پناہ مصائب برداشت کرنا پڑیں تھیں، خدا نے استقامت عطا فرمائی۔

(۲) حجاز میں شریف مکہ کے بعد ابن سعود کی حکومت بنی تو جمعیۃ نے موتمر مکہ میں اپنا وفد بھیجا جس سے خاطر خواہ دینی فائدہ ہوا۔

(۳) فلسطینیوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہوا تو جمعیۃ نے ملک بھر میں فلسطینی ریلیف فنڈ کا اہتمام کیا، ان کے مطالبات کو تحریک کی شکل دی اور دنیا بھر کے نمائندوں کی کانفرنس منعقدہ مصر میں صدر جمعیۃ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی نیابت میں وفد بھیجا۔

(۴) اسی دور میں معلمین حج کا بل اسمبلی میں آیا جس کے پس پردہ برطانوی سازشیں کارفرما تھیں، جمعیۃ نے پیہم جدوجہد سے اس سازش کو ناکام کر دیا۔

(۵) ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی رہنمائی میں آل پارٹیز کانفرنس میں جب ہندوستان کے لئے دستوری خاکہ تیار ہوا تو واحد جماعت جمعیۃ تھی جس نے اسلامی نظام و مفاد کے پیش نظر تنقیدی رپورٹ تیار کر کے کانگریس کا دُم چھلہ ہونے کے احمقانہ الزام کی عملی تردید کی۔

(۶) ۱۹۲۹ء میں دہلی میں تمام اسلامی جماعتوں نے جلسہ کر کے مسلمانوں کے قومی و ملی حقوق کے لئے ایک متفقہ فارمولا تیار کرنے کا پروگرام بنایا تو جمعیتی نمائندے اس میں شریک ہوئے اور بالخصوص حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی جدوجہد اور خلوص نے کامیابی کی منزل آسان کر دی یہ الگ بات ہے کہ گول میز کانفرنس میں جانے والے خود غرض مسلم نمائندے اپنی کوتاہی کے پیش نظر اس مسودہ کو دستور میں شامل نہ کرا سکے۔

(۷) ساردا ایکٹ جو اس دور کا گویا پاکستانی عائلی قوانین تھا ۱۹۲۹ء میں اسمبلی میں پاس ہوا۔ جمعیۃ نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا اور

حکومت سے اس باطل قانون کی مکمل خلاف ورزی کی

(۸) اسی دور میں حجاج کے لئے نیا قانون منظور ہوا جس سے زائرین حرمین کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں جمعیۃ نے بے پناہ جد وجہد سے کچھ ترامیم منظور کرائیں ۔

(۹) بعض صوبوں مثلاً سرحد وغیرہ میں شریعت اسلامیہ کو رواج پر ترجیح دینے اور عملاً اس کے نفاذ میں جمعیۃ کی پوری کوشش شامل ہے ۔ بدقسمتی سے مرکزی اسمبلی میں یہ کوشش لیگی رہنماؤں نے پروان نہ چڑھنے دی

(۱۰) ۳۱ء کے کانگریس کے دستوری فارمولا کے مقابلہ میں صرف جمعیۃ نے اپنا فارمولا مرتب کیا کیونکہ کانگریس نے کہا تھا کہ اس سے بہتر فارمولا ہو تو پیش کیا جائے

(۱۱) ۳۲ء کے کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ مسائل کا فیصلہ) شائع ہوا اور وزیر اعظم نے خود شائع کیا تو قوم پرور مسلمانوں کو جمعیۃ نے اکٹھا کیا تو لیگ شامل نہ ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کی امداد شامل ہوئی اور ایکٹ ۳۵ء میں صحت اور بنیادی باتیں شامل کر لی گئیں ۔

(۱۲) اسلامی اوقاف کی حفاظت کے لئے جمعیۃ علماء نے اپنے ممبران اسمبلی کی وساطت سے مسودہ بل اسمبلی میں پیش کر دیا تو اس سے اسلامی اوقاف کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہوگیا ۔

(۱۳) کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زمانہ میں اوقاف پر ٹیکس کی تجویز ہوئی تو جمعیۃ و امارت شرعیہ بہار نے سول نافرمانی کی دھمکی دیدی آخر مولانا آزاد علیہ الرحمہ نے کانگریسی حکومت کو قانون واپس لینے کا حکم دیدیا اور جمعیۃ کے اقدام کو صحیح قرار دیا ۔

(۱۴) علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے اور یہ فخر جمعیۃ کو حاصل ہے کہ اس نے دیوبندی بریلوی، اہلحدیث وغیرہ علماء کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا ۔ جمعیۃ کی مجالس میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے اور بحمد اللہ کوئی الجھاؤ آپس میں نہ تھا ۔

(۱۵) امارت شرعیہ فی الہند کا اہتمام کر کے مسلمانوں کے لئے دینی وحدت کا اہتمام کیا ۔ یہ پروگرام بہار میں سب سے زیادہ کامیاب ہوا اور اب تک ہے ۔

۱۶ مکمل آزادی کا نصب العین سب سے پہلے جمعیۃ نے اختیار کیا اس کے بعد کانگریس نے مسلم لیگ نے تو ۴۰ء میں ایسا کیا وہ بھی بامر مجبوری ۔

(۱۷) ۲۷ء کے سائمن کمیشن کے سلسلہ میں سب سے پہلے جمعیۃ نے اپنے اجلاس پشاور میں امام العصر محدث کاشمیری کی زیر صدارت بائیکاٹ کیا ۔

(۱۸) ۳۰ء کے خونی حادثہ قصہ خوانی پشاور کے متعلق حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مفتی محمد نعیم صاحب پر مشتمل جمعیۃ نے تحقیقاتی کمیٹی بھیجی جسے پشاور نہ جانے دیا گیا تو راولپنڈی میں بیٹھ کر اس نے کام کیا ۔ رپورٹ مرتب کی جسے حکومت نے ضبط کر لیا ۔ یہ وہ وقت تھا جب سرحد کے مظلوم عوام مسلم لیگ سمیت سب کے دروازے پر گئے لیکن کسی نے کلمہ خیر تک نہ کہا ۔

(۱۹) ۲۱ء میں موپلا کے مظلوموں کے لئے فنڈ اکٹھا کیا اور ہر طرح امداد و اعانت کی ۔

(۲۰) اردو زبان کی خدمت میں جمعیۃ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ بہار میں اس کے زیر اثر حکومت ۲۰ء میں بنی تو اس نے دفتری زبان بھی قرار دی بعد میں کانگریسی حکومت نے اس فیصلہ کو بحال رکھا ۔

(۲۱) ۲۲ء کے شدھی سنگھٹن کے فتنوں کا مقابلہ جمعیۃ نے اس طرح کیا کہ لاکھوں مسلمانوں کے ایمان محفوظ ہو گئے شعبہ تبلیغ و حفاظت اسلام کی داستان ایک سنہری داستان ہے ۔

(۲۲) کانگریس کی واردھا تعلیمی اسکیم پر تنقیدی رپورٹ مرتب کرکے ۱۹۳۹ء میں شائع کی۔ اس کمیٹی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا حفظ الرحمن، مولانا احمد سعید اور مولانا نورالدین بہاری قدس سرہم شامل تھے۔

(۲۳) ہندو مسلم فسادات اس ملک کا المیہ رہے ہیں لیکن جمعیۃ نے ہمیشہ مظلوم کی حمایت میں آواز اٹھائی اور کسی تعصب کا شکار نہ ہوئی کہ منشائے اسلام یہی تھا۔

(۲۴) مدراس اسمبلی میں ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کا بل مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ کی مداخلت پر رد کر دیا گیا۔ نیز بمبئی حکومت نے رنگیلا رسول جیسی ناپاک کتاب شائع کرنے کی اجازت دی تو مولانا موصوف کی ہی کوشش سے اس کی اشاعت رکی۔

(۲۵) دوسرے ممالک کے مسلم برادران کی جمعیت نے جس طرح خدمت کی اور مختلف علاقوں میں باقاعدہ جماعتی نظم قائم کیا وہ ایک مستقل داستان ہے۔

(۲۶) شرعی حدود میں رہ کر برصغیر کے تمام لوگوں کو حصول حقوق کے لئے متحد کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔

یہ چند نمبرات ہیں جو اصل خدمات کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور انہیں سے ہر ہر نمبر پر ایک مستقل مقالہ لکھا جا سکتا ہے، ہم نے محض تعارف کرانے کی غرض سے یہ چند جملے لکھ دیئے ہیں تاکہ نسل نو کو دیوبند کے سپوتوں کا پتہ چل سکے۔

نہ تو میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ ہی شاید الرشید کے صفحات میں اتنی وسعت ہو کہ وہ اتنی طویل تاریخ شامل کر سکے، ضرورت یہ ہے کہ کوئی مستقل ادارہ دیوبند کے ایک ایک شعبہ پر مستقل کام کرے اور آئندہ نسلوں کے لئے وہ تمام دستاویزات مرتب کر دے۔

حضرت شیخ الہند کے ان خدام و متعلقین کی صبر آزما جدوجہد بالآخر رنگ لائی اور آزادی کا سورج طلوع ہوا لیکن بدقسمتی سے آزادی کی صبح اسطرح طلوع ہوئی کہ برصغیر خاک و خون میں لت پت تھا اور ایک بار پھر ملت اسلامیہ زبوں حالی کا شکار تھی۔ اس موڑ پر تقسیم شدہ ملک کے اس حصے میں مولانا مدنی، مولانا آزاد، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمن اور مولانا محمد میاں اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رحمہم اللہ جیسے لوگوں نے اگر ملت کو دستبرد زمانہ سے بچایا تو ادھر حضرت لاہوری قدس سرہ اور حضرت امیر شریعت قدس سرہ جیسے بزرگ کام آئے جنہوں نے تعمیر ملک کے لئے بے بہا قربانیاں دیں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ جس مقصد کی خاطر پاکستان معرض وجود میں آیا تھا اسکو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسی قافلہ نے خدمت کی اور آج تک خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت لاہوری قدس سرہ کے بعد حضرت درخواستی زید مجدہم قافلہ سالار ہونے کی حیثیت سے مصروف عمل ہیں جن کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام سرگرم عمل ہے، ملک بھر میں ہزاروں علماء صلحاء جماعت سے وابستہ ہیں، جن میں حضرت دین پوری، مولانا سید محمد شاہ امروٹی، مولانا عبدالکریم بیر شریف والے، مولانا عبیداللہ انور، مولانا خان محمد کندیاں، مولانا عبداللہ بہلوی جیسے سراپا علم و عمل لوگ شامل ہیں تو مولانا عبدالحق اکوڑوی، مولانا محمد ایوب جان بنوری، مولانا محمد شریف مچھن آبادی، مولانا مفتی محمد عبداللہ ملتانی جیسے ارباب علم و فضل بھی ہیں۔

جمعیۃ کی پشت پر پہلے کی طرح قربانیوں کا ایک سلسلہ آج بھی ہے جن میں عزیزان گرامی مولانا سید شمس الدین اور منیر شہید امروٹی کی شہادت تو تازہ واقعات ہیں۔ پھر ملک میں کوئی تحریک ہو یہی قافلہ ہے جو سب سے آگے ہوتا ہے۔

جمعیۃ کو خدا نے کچھ دن اقتدار کا موقع دیا تو اس نے توکلا علی اللہ اس ذمہ داری کو سنبھالا اور اس طریق سے سنبھالا کہ باید و شاید؟ دنیا کا ذہن اسلامی نظام کے متعلق یہ تھا کہ یہ نظام معاذ اللہ اس دور میں ناقابل عمل ہے۔ اس ژولیدگی اور ژاژ خائی کے اثرات اس طرح ختم ہوئے تو مولوی کے حق میں

یہ سوچا گروہ انقلابی ساعات میں کوئی کردار نہیں ادا کر سکتا، بھی غلط ثابت ہوا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل خصوصی اور جمعیتی کارکنوں کے خلوص و محبت کا ثمرہ تھا جو خدا نے عطا فرمایا ہے جمعیۃ علماء اسلام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اس لئے نہیں لکھتا کہ اس کی قربانیاں تازہ ہیں اور قوم کے سامنے ہیں۔

یہ تو ہوا پاکستان کا مسئلہ کہ اس میں دیوبندی مکتب فکر کے لاتعداد مدارس اور جماعتیں مصروف عمل ہیں تو سابقہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بھی حضرت مدنی و حضرت تھانوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے لاتعداد خلفاء اور سینکڑوں مدارس کام کر رہے ہیں اور وہاں کے دینی ذہن کا دارومدار ان لوگوں پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اخوت و مساوات کے سنہری اصولوں پر عمل ہوتا تو علیحدگی و تفریق کا روز بد ہمیں نہ دیکھنا پڑتا۔

اور موجودہ ہندوستان کی بات ہے تو دارالعلوم دیوبند آج بھی وہاں موجود ہے، ہزاروں طلباء سینکڑوں کا عملہ اور لاکھوں کا خرچہ ہے، پھر سہارنپور، دہلی، مراد آباد، امروہہ، کلکتہ وغیرہ کے مدارس ہیں ساتھ ہی دینی تنظیم کے طور پر جمعیۃ علماء ہے جس کا اپنا پریس ہے اخبار ہے تنظیم ہے اور آزادی کے بعد مسلمانوں کی جو خدمت کی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہزاروں مساجد کی آبادی کا اہتمام کیا اور لاتعداد شبینہ مدارس کھولے، مسلم اوقاف، مسلم پرسنل لاء وغیرہ اب بھی محفوظ ہے وغیر ذالک۔ اور ذرا اس خطے سے نکلیں تو مکہ معظمہ کا مدرسہ صولتیہ انہی بزرگوں کا، مدینہ طیبہ کا مدرسہ شرعیہ ان کا، جس کے بانی حضرت مدنی کے بھائی تھے اور جو آج بھی مصروف عمل ہے، پھر آپ افریقہ، یورپ مشرق وسطیٰ حتیٰ کہ کمیونسٹ ممالک میں روس وغیرہ جائیں تو جو دینی رونق ہوگی وہ ان بزرگوں اور تحریک کے کارکنوں کے صدقہ ہوگی۔

مستحق تبریک ہے ادارہ الرشید جس نے اس تحریک و ادارہ کی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے کے لئے یہ بیڑا اٹھایا اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف حصول سعادت کی غرض سے یہ سطور لکھ دیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

دینی و مذہبی مدارس کے متعلق

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کی رائے گرامی

حکیم احمد شجاع اپنی کتاب خوں بہا حصہ اول صفحہ ۴۳۹ پر رقم طراز ہیں :- لاہور آکر میں نے پاک پٹن شریف (منٹگمری) کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبال کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں میرے احساسات سے ہمدردی نہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگے، جب میں اپنی کہانی سنا چکا، تو فرمایا: جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا، جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:- ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مکتبوں میں پڑھنے دو - اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا، جو کچھ ہوگا، میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے، تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمرا اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرو دل اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرے، تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا" (انتہیٰ کلام اقبال)

برِصغیر میں مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں — اور — عُلمائے دیوبند

— اختر راہی ایم۔اے —

○

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کا ایک سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں عیسائی پادریوں کی جارحانہ سرگرمیاں تھیں بعض ضلعوں میں یہ رواج بن گیا تھا کہ جب پادری منادی کے لیے روانہ ہوتا تو تھانے کا چپراسی اس کے ساتھ رہتا۔ اہل ہند کی غربت و افلاس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پادریوں نے مالی منفعت اور تعلیم کا لالچ دے کر انھیں دام عیسائیت میں پھانسنا شروع کیا۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں یتیم ہونے والے بچوں کو "کفالت" کے نام پر عیسائی بنا لیا گیا تھا۔ انگریز افسروں کا طرز عمل یہ تھا کہ "بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا" [۱]

۱۸۵۵ء میں پادری اے۔ ایڈمنڈ (A. ADMOND) نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہو گئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ عیسائی ہو جاؤ" [۲]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بارے میں عوام بجا طور پہ یہ سمجھتے تھے کہ "ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کیے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے۔" [۳]

نواب قیصر جہاں بیگم نے اپنے روزنامچہ میں ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لکھا :

"ریاستی الحاق (اودھ) کے علاوہ کمپنی نے علی الاعلان تبلیغ نصرانیت شروع کر دی اور وقاصی کے قول کے مطابق جامع مسجد دہلی کو کلیسا میں تبدیل کرنے کے لیے مشن اور عیسائی دنیا کوشش میں ہے کہ جامع ایا صوفیہ کا بدلہ لیا جا سکے۔ مسیحی پادریوں کی ہمت اس حد تک بڑھ چکی ہے

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۱۲۰

کہ وہ اسلام سے مناظرے پر اتر آئے ہیں۔ تقریری اور تحریری مقابلوں کے علاوہ اب جھگڑے بھی شروع ہو چکے ہیں۔ کمپنی نے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اس خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی مذہبی جذبات کے تحت بغاوت شروع کر دی۔ میرے والد سید عبدالکریم نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ اب عیسائی پادری برملا مذہب اسلام کی مذمت کرنے لگے ہیں جس سے شدید ارکان تنازعہ ہے۔ میرزا یا قوش (فرزند بہادر شاہ ظفر) سے میں نے ایک مرتبہ عرض کیا۔ انھوں نے فرزند صاحب سے شکایت کرنے کا وعدہ کیا اور عیسائیوں کی اس جرأت پر ملال خاطر پایا۔ کشمیری دروازے کا بڑا گرجا گھر آج کل نصرانیوں کا مرکز ہے اور عام لوگ کہتے ہیں۔ اب بھی اب دین کی خیر نہیں"۔ [1]

بیگم موصوف کے روزنامچہ کا ایک دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو:

"دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا گیا ہے۔ بے گناہ شہریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہزارہا نوجوانوں، بوڑھوں عورتوں، اور معصوم بچوں کو مکان میں بند کر کے خاکستر کر دیا گیا۔ انگریز جنرل غضب ناک ہے۔ اس نے میجر رینارڈ (RENARD) کو حکم دیا ہے کہ تمام قصبہ فتح پور کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا جائے کیوں کہ اس جگہ ایک عیسائی گرجا کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی گئی تھی اور نصاریٰ کے پادریوں نے اس کی جنرل سے شکایت کی تھی"۔ [2]

کمپنی کی حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ امن وامان کی خاطر عیسائی پادریوں کی دلآزار سرگرمیاں ختم کر دیتی مگر اہل اقتدار کا رویہ مندرجہ ذیل بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے۔

سر چارلس ٹریولین، آئی سی ایس نے جو کونسل کا ممبر تھا اور بعد میں گورنر ہوا، ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:

"میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ کتابوں، اخباروں اور دیسیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی حتیٰ کہ عیسوی علوم سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے"۔ [3]

برطانوی دارالعوام کے رکن میگلس نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن اس لیے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت ہندوستان کے زیر نگین رہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہیے"۔ [4]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے عیسائی پادریوں کی ساعی کو نقصان پہنچا اور وقتی طور پر ان کی مہم میں پہلی سی تیزی اور سرگرمی نہ رہی۔ برطانوی حکومت سوچنے لگی کہ مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار رہا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

---

[1] ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص ۱۰۵، ۱۰۶ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] بحوالہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۳۸

[4] PUNJAB AND SIND MISSONS P. 294

ہندوستان کی حکومت ہی ہاتھ سے نکل جائے چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو الٰہ آباد کے دربار عام میں ملکہ وکٹوریہ نے اعلان کیا :

" دین عیسائیت پر پختہ ایمان رکھتے ہوئے اور مذہب کی طمانیت کا جذبات تشکر سے اقرار کرتے ہوئے ہم اعلان کرتے ہیں کہ نہ تو یہ ہمارا حق ہے اور نہ ہماری خواہش ہی کہ ہم اپنے عقائد کو اپنی رعایا کے کسی حصے پر ٹھونسنے کی کوشش کریں۔ ہمارا شاہانہ ارادہ اور خوشی یہ ہے کہ ہماری رعایا میں کسی شخص کو اس کے مذہبی عقیدہ اور رسوم کی بنا پر نہ تو کسی رعایت کا مستحق سمجھا جائے اور نہ تنگ کیا جائے۔ نہ کسی کا سکون چھینا جائے۔ بلکہ قانون کی نظر میں تمام لوگ مساوی طور پر غیر جانبدارانہ رنگ میں پوری حفاظت کے حقدار ہوں "

ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے باوجود عیسائیت کے علمبرداروں کی رائے یہ تھی کہ ہنگامہ کا سبب عیسائیت کی تبلیغ میں کوتاہی ہے۔ پادری فانڈر کہا کرتا تھا کہ " خدا نے یہ ہولناک دن برطانوی گورنمنٹ پر اس لیے بھیجے ہیں کہ وہ ہندوستان میں بت پرستی کی معاون اور مسیحیت کی مددگار ہونے سے قاصر رہی ہے " [1]

سر ہربرٹ ایڈورڈ کہتا تھا کہ غدر برپا ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ کی گئی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ نہ کی گئی [2]

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان لفظی جمع خرچ ثابت ہوا۔ پادریوں کی سرگرمیاں پہلے سے بڑھ گئیں۔ سرکاری اہل کاروں نے مشنریوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور صلیب کی علمبرداری کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔

۱۸۵۸ء میں انگلستان میں ایک انجمن اس غرض سے قائم کی گئی کہ ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کے لیے لٹریچر فراہم کیا جائے۔ اس انجمن (CHRISTIAN LITERARY SOCIETY FOR INDIA) نے ۱۸۶۰ء میں اپنی کوششوں کو پُراثر بنانے اور مساعی کو منظم کرنے کے لیے " لیورپول " میں مبلغوں کی کانفرنس طلب کی اور بڑے پیمانے پر ہندوستانیوں کو بپتسمہ دینے کا پروگرام بنایا۔

۱۸۶۲ء میں انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن اور وزیر ہند چارلس ووڈ سے ایک وفد نے ملاقات کی۔ وفد کا سربراہ بشپ آف کنٹربری تھا۔ وفد نے ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی تو چارلس ووڈ نے کہا :

" میرا ایمان ہے کہ وہ نیا عیسائی جو ہندوستان میں عیسائیت قبول کرتا ہے وہ انگلستان سے نئے رابطہ کا باعث بنتا ہے اور حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہے " [3]

وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے اس موقع پر کہا :

" میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اپنے مقصد میں متحد ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ خود ہمارا مفاد بھی اس امر سے وابستہ ہے کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان کے کونے کونے تک پھیلادیں " [4]

لارڈ لارنس (وائسرائے ہند ۱۸۶۴ء - ۱۸۶۹ء) نے ایک موقع پر کہا تھا :

" کوئی چیز بھی ہماری سلطنت کے استحکام کا اس سے بڑھ کر سبب نہیں ہو سکتی کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان میں پھیلادیں " [5]

۱۸۶۴ء میں کشمیر میں مشن قائم ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر سر ڈی. منٹگمری نے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ چرچ تعمیر ہوتے رہے اور مشنریوں کی تعداد میں

---

[1] صلیب کے علمبردار ص ۲۵ [2] حکومت خود اختیاری [3] THE MISSIONS P. 234

[4] THE MISSIONS P. 234 [5] LORD LAWRENCE'S LIFE P. 313

اضافہ ہوتا رہا۔

۱۸۷۱ء میں گارساں دتاسی نے "ورنیکلر ایجوکیشن سوسائٹی" کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سوسائٹی کی تیسری رپورٹ میرے پیش نظر ہے۔ اس انجمن نے بیس ہزار پونڈ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کتابیں چھپوانے پر صرف کیے۔ یہ کتابیں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہیں (جو رعایائے انگریزی میں سے ۱۸ کروڑ اہل ہند بولتے ہیں) طبع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے نسخوں کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ یہ کتابیں کرلبز تک بھیجی جاتی ہیں۔ اس انجمن میں اس وقت سترہ مدارس چل رہے ہیں جن میں ۶۲۲۰ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ ان مدارس میں عیسائی مدرس دنیوی اور مذہبی تعلیم دیتے ہیں" [1]

انگریز مشنریوں کے علاوہ سکاٹ لینڈ، جرمنی، بلجیم، فرانس اور امریکہ کے مشنری بھی اس کوشش میں شریک تھے۔ مختلف فرقوں سے متعلق مشنوں نے اپنے اختلافات کو بھلا کر کام جاری رکھا اور تصادم سے بچنے کی خاطر انھوں نے ملک کے مختلف حصوں کو آپس میں بانٹ لیا۔

جرمن مبلغوں کی کوششوں پر گارساں دتاسی نے روشنی ڈالی ہے:

"جرمن مبلغین بھی ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک ہیں۔ ان کا سرگروہ برلن کا مبلغ گوسنر (GOSSNER) ہے۔ اس نے کرل لوگوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی۔ (کرل لوگ بنگال کے اس ضلع میں آباد ہیں جس کا صدر مقام چھوٹا ناگپور ہے) اس وقت اس علاقے میں ۱۲ ہزار سے ۱۴ ہزار تک عیسائی ہیں۔ چونکہ جرمن مبلغین کا تعلق حاکم قوم سے نہیں، اس واسطے غالباً دیسی لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں ...... ۱۸۷۰ء میں صرف مظفر پور کے جرمن مشن سے ۱۴،۷۶۰ نسخے ہندی رسائل کے ۳۵۰۴ نسخے اردو کے شائع کیے" [2]

۱۸۷۲ء میں غیر انگریز مبلغین کے علاوہ چھ سو چھ انگریز مبلغین مشنری کام کر رہے تھے اور پانچ سو بائیس مقامات پر مشن قائم کیے [3]

پادریوں کے دوش بدوش گورنروں اور دوسرے اہلکاروں نے بھی تبلیغی مساعی جاری رکھیں۔ پنجاب کے گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ نے کانگڑہ مشن کی بنیاد رکھی تھی اور کہتا تھا کہ "ہم سرزمین ہند پر اپنی سلطنت کا تحفظ جب ہی کر سکتے ہیں کہ یہ ملک عیسائی ہو جائے"۔ پنجاب کے دوسرے گورنر چارلس ایچی سن کا مذہبی جذبہ تو پادریوں کے لیے بھی نمونہ تھا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۲ء کو ایچی سن نے مشن چرچ بٹالہ کا سنگ بنیاد رکھا تو ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو ضروری قرار دیا۔ پنجاب میں مشنری سرگرمیوں میں سرکاری افسران لارنس، منٹگمری، ایڈورڈ، میکلوڈ، رینل اور ٹیلر کا حصہ غالباً پادری حضرات سے کم نہیں۔

راولپنڈی اور امرتسر کا کمشنر ایچ۔ ای۔ پرکنز تیس سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۶ء میں باقاعدہ مبلغ بن گیا تھا۔

عیسائی مشنری تحریک سے مسلمانوں کا ایک طبقہ متاثر ہوا جس نے اسلام کو بزعم خویش "دین فطرت" ثابت کرنے کے لیے معجزات کی عجیب و غریب تاویلیں کیں۔ ملائکہ اور جنوں کے الگ وجود سے انکار کر دیا۔ جنت اور دوزخ کو دنیوی زندگی کی خوشحالی اور افلاس پر محمول کیا۔ اس طبقے کے سرخیل سر سید احمد خاں، سید امیر علی اور مولوی چراغ علی جیسے لوگ تھے۔ اسلام کے بارے میں ان حضرات کا رویہ معذرت آمیز رہا۔ انہوں نے جہاد کی اصل روح مسخ کر دی اور جہاد کو صرف دفاعی جنگ تک محدود کر دیا۔ معراج نبی کو روحانی قرار دیا۔ تعدد ازواج کے بارے میں معذرت کر لی اور حیات عیسیٰ کا انکار کر دیا۔

---

[1] مقالات گارساں دتاسی ص ۱۴۸ [2] مقالات گارساں دتاسی ص ۱۵۰، ۱۵۱ [3] ایضاً ص ۳۸۴

یہ طبقہ سیاسی طور پر جدید تہذیب و تمدن اور نظامِ تعلیم اپنا لینے میں کوئی نقصان نہیں خیال کرتا تھا۔ انگریزوں سے اچھے تعلقات استوار کرنے کے لیے اس طبقہ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ممکن ہے سیاسی سطح پر اس رویہ سے مسلمان قوم کو فائدہ پہنچا ہو مگر مذہبی میدان میں اس سے فتنہ برپا ہوا۔ اسی اندازِ فکر کا اظہار مرزا غلام احمد قادیانی اور منکرینِ سُنّت کی صورت میں ہوا

ہندو بھی مشنری تحریک سے اثر پذیر ہوئے۔ اُن میں بھی مذہب کی تبلیغ کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمان تجدد پسندوں کی طرح ہندوؤں کے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے ویدوں کی تعلیمات کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ویدوں کے احیاء کے لیے "آریہ سماج" کی تحریک اُٹھی۔ ہندو مذہب جو کسی زمانے میں بھی تبلیغی نہیں رہا۔ اُس میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو اپنے مذہب کو ہندوستان کے حدود اربعہ سے باہر پھیلانا چاہتے تھے۔ "آریہ سماج" جو مشنری تحریک کے ردِ عمل میں قائم ہوا۔ کچھ عرصہ تو اس کا رُخ عیسائیت کے خلاف رہا مگر آخر میں اس کی تمام طاقت "اسلام" کے خلاف خرچ ہونے لگی۔

ان حالات میں ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم کی روحِ رواں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات تھی۔ شیخ اکرام مرحوم لکھتے ہیں "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مدرسہ دارالعلوم کے اصل بانی نہ تھے لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابلِ عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا۔ شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں جاری رہ سکتا ہو لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند رکھا اور مدرسے کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالیشان عمارت تعمیر ہو سکی۔" [1]

دارالعلوم دیوبند ایک "مدرسہ" سے "تحریک" بن گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ سیاسی میدان میں اس کا ایک "فکر" تھی۔ مذہبی میدان میں اس کا ایک ڈھنگ تھا۔ مثبت انداز میں دارالعلوم نے اسلامی علوم اور تمدن کی حفاظت کی ان کی ترویج کی کوشش کی۔ ہزاروں افراد ہر سال اکتسابِ فیض کے لیے اندرونِ ملک اور دوسرے مسلم ممالک سے دارالعلوم آتے رہے اور اس معدنِ علم سے واپس جا کر تحریکِ دیوبند کے دست و بازو بنتے رہے۔ اسلامی علوم و تہذیب کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند نے اُن حملوں کو بھی رد کیا جو اسلامی علوم اور تہذیب کو تباہ کرنے کیلیے کیے جا رہے تھے۔ عیسائی مشنری ہوں یا آریہ سماجی، قادیانی یا تجدد پسند ہر گروہ کے حملوں کا جواب دینے کے لیے علمائے دیوبند پیش پیش رہے۔

ایک مختصر مضمون میں (جو نہایت قلیل وقت میں لکھا گیا ہو) علمائے دیوبند کی ان تمام کوششوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں دیوبند کے چند فرزندوں کی صرف اُن سرگرمیوں کی ہلکی سی جھلک پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے عیسائی مشنری تحریک کی روک تھام کے لیے کی۔

تحریکِ دیوبند کے "سابقون الاولون" میں سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے عیسائی پادریوں کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ واپس آئے تو منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میں بطور مصحح کام کرنے لگے۔ اس عرصے میں انھوں نے پادریوں کے بر سرِ عام وعظ و تبلیغ کا جائزہ لیا اور اسی انداز میں اُن کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے تدارک کا پروگرام بنایا۔ اپنے شاگردوں کو اس کام کے لیے تیار کیا کہ وہ بازاروں اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر پادریوں کا جواب دیں اور اسلام کی حقانیت دلائل و براہین سے ثابت کریں۔

ایک روز خود بھی بازار میں بغرضِ تبلیغ پہنچے تو وہاں وعظ کرتے ہوئے پادری تارا چند سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ پادری تارا چند کو بر سرِ عام لاجواب کیا۔ یہ واقعہ ربیع الاوّل ۱۲۹۲ھ تا جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ کے درمیان کا ہے۔ [2]

اگلے سال ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں قصبہ چاند پور (شاہجہانپور سے پانچ میل کی مسافت پر یہ قصبہ ہے) کے ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک مذہبی مباحثہ کا اہتمام کیا اور "میلہ خدا شناسی" اس کا نام رکھا۔

---

[1] موجِ کوثر ص ۲۰۰ [2] محمد احسن نانوتوی ص ۲۱۹

میلہ میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تین مذاہب کے نمائندوں کو دعوت گفتگو دی گئی کہ ہر ایک دلائل و براہین سے اپنے دین کی حقانیت ثابت کرے۔

مسلمانوں کے نمائندے مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد احسن اور مولانا ابوالمنصور دہلوی تھے۔ مولانا نانوتوی نے جلسہ کے لیے ایک تقریر لکھی مگر جلسہ میں وقت کی کمی کی وجہ سے لکھی ہوئی تقریر نہ پڑھی جا سکی اور حقانیت اسلام پر فی البدیہہ گفتگو کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں ابطال تثلیث، تردید شرک اور اثبات توحید پر ایسے دلنشین انداز میں روشنی ڈالی کہ مخالف و موافق سب ہی نے تحسین و آفرین کہی۔ ایک اخبار کی رپورٹ ہے۔

"۸ مئی سن حال (۱۸۷۶ء) کے جلسے میں مولانا محمد قاسم صاحب نے درس دیا اور فضائل اسلام بیان کیے۔ پادری صاحب نے تثلیث کا بیان عجب طور سے ادا کیا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں۔ طول، عرض اور عمق سو تثلیث ہر طرح ثابت ہے۔ مولوی موصوف نے اس کا رد اسی وقت کر دیا۔ پھر پادری صاحب اور مولوی صاحب تقریر کے معاملے میں بحث کرتے رہے۔ اس میں جلسہ برخاست ہو گیا۔ تمام قرب و جوار اور چاروں طرف شور و غل مچ گیا کہ مسلمان جیت گئے جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے۔ اول روز کے جلسے میں جو اعتراضات اہل اسلام کے تھے اُن کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے جواب حرف بہ حرف دیئے اور فتح یاب ہوئے۔" [1]

مولانا نانوتوی کی جلسہ کے لیے لکھی ہوئی تقریر مولانا فخر الحسن گنگوہی نے "حجۃ الاسلام" کے نام سے شائع کی۔ اسی طرح میلے کی زبانی تقریر اور روداد مکالمۂ مذہبی (میلہ خدا شناسی) مطبع مجتبائی سے چھپ کر مقبول عام ہوئی اور ایک عرصہ تک پادریوں کا ناطقہ بند کرتی رہی۔

چاند پور کے "میلہ خدا شناسی" کے دو سال بعد ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں شاہجہانپور میں ایک مباحثہ ہوا جس میں منشی انجیل پادری اسکاٹ، پادری نولس، بانی آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی (م ۱۸۸۳ء) اور منشی اندرمن شریک تھے۔ اہل اسلام کی نمائندگی مولانا محمد علی بچھرایونی اور مولانا نانوتوی نے کی۔ اس مباحثہ میں انھوں نے توحید اور قدیم کتابوں کی تحریف پر اظہار خیال کیا۔ تقریر کے بارے میں منشی پیارے لال (جو میلہ خداشناسی کا اہتمام کرتا تھا) نے لکھا:

"مولوی قاسم صاحب کا حال کیا بیان کیجیے اُن کے دل پر علم کی سرمستی (وہبی) برس رہی تھی۔" [2]

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو بہت دن جینا نصیب نہ ہوا۔ وہ ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو دیوبند میں فوت ہوئے۔ تاہم اُن کا مشن اُن کے ساتھیوں اور شاگردوں نے آگے بڑھایا۔

"میلہ خدا شناسی" میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ایک ساتھی مولانا ابوالمنصور دہلوی تھے۔ ان کا اصل وطن قصبہ ستیاباد (مضافات قنوج) تھا مگر ان کے والد سید محمد علی ناگپور ریذیڈنسی میں منشی تھے۔ وہیں ناصر الدین ابوالمنصور پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم کے علاوہ تورات و انجیل کی تعلیم خود اہل کتاب کے عالموں سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ نواب جہانگیر محمد خان والی بھوپال کی مصاحبت میں رہے۔ آخر دہلی چلے آئے اور عمر بھر مشنری تحریک کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

تردید عیسائیت میں اُن کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

---

[1] خیر خواہ عالم (دہلی) ۱۸ مئی ۱۸۷۶ء بحوالہ تاریخ صحافت اردو حصہ دوم ص ۱۴۱۔

[2] مباحثہ شاہجہانپور

۱. نوید جاوید — عیسائیوں کے مختلف اعتراضات کے جوابات۔

۲. عقوبت الضالین — پادری عماد الدین کی کتاب "ہدایت المسلمین" کا جواب ہے۔

۳. لحن داؤدی — پادری عماد الدین کی کتاب "نغمۂ طنبوری" پر تبصرہ و تنقید ہے۔

۴. تصحیح التاویل — پادری عماد الدین کی "تفسیر مکاشفات" کا جائزہ ہے۔

۵. استیصال — پادری رام چندر کے رسالہ "مسیح الدجال" کا جواب ہے۔

۶. اعجاز قرآن — پادری رام چندر کے ایک دوسرے رسالہ "اعجاز قرآن" کا جائزہ ہے اور قرآن کے اعجاز بلاغت پر گفتگو کی ہے۔

۷. انعام عام — امریکن مشن لکھنؤ کے پادری سموئیل جانسن اور پادری رجب علی نے "آئینۂ اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کے جواب میں "انعام عام" تالیف ہوئی۔ گارساں دتاسی نے ایک اخبار "پنجابی" سے اس کتاب پر تبصرہ نقل کیا ہے —

تبصرہ نگار لکھتا ہے:

"آئینۂ اسلام میں مشنریوں نے مسلمانوں میں ۱۵۰ فرقے کیے ہیں اور لکھا ہے کہ شروع اسلام ہی سے یہ حال تھا اور اُن کا دعویٰ ہے کہ عیسائی فرقوں کا یہ حال نہیں مصنف نے ان اعتراضات کا مکمل اور فیصلہ کن جواب دیا ہے۔ مشنریوں نے غلط طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان فرقوں میں سے آٹھ خدا کو نہیں مانتے۔ ۱۴ رسول اور ۱۵ قرآن کو نہیں مانتے اور ۷۴ ملائکہ سلام سے بالکل خارج ہیں۔

مولوی صاحب نے جواب میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں میں اٹھاسی فرقے موجود ہیں جن میں سے چھ روح القدس کو نہیں مانتے۔ پچیس حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے قائل نہیں۔ آٹھ مسلمانوں کی طرح حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے قائل نہیں، سولہ عہدنامہ جدید و قدیم کے آسمانی کتاب ہونے پر ایمان نہیں لاتے اور باقی فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مصنف نے ان کتابوں کے حوالے دیتے ہیں جن کا مستند ہونا مسلم ہے۔ مصنف نے جو محنت برداشت کی ہے۔ اس کی تحسین ہمارا فرض ہے کیوں کہ اس کتاب کے لیے انھوں نے مختلف زبانوں کی کتابوں کے حوالے جمع کیے ہیں، برخلاف اس کے "آئینۂ اسلام" میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں صفحات و سطور کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن ابو المنصور کی تصنیف میں صفحات، سطور اور جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی اشاعت اور مقام کی بھی تشریح کی گئی ہے جس سے اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔" [1]

۸. افحام الخصام — پادری راجرس کی تصنیف "تفتیش الاسلام" کا جواب ہے۔

۹. میزان المیزان — پادری فانڈر کی کتاب "میزان الحق" کا جواب ہے۔

۱۰. مصباح الاسرار — پادری فانڈر کی کتاب "مفتاح الاسرار" کا جواب ہے جس میں الوہیت مسیح اور تثلیث پر بحث کی گئی ہے۔

---

[1] مقالات گارساں دتاسی جلد اوّل

۱۱. رقیمۃ الوداد

۱۲. حرز جان بجواب اصلیت قرآن

۱۳. تبیان ــــــ اہل صلیب کے بارہ سوالوں کے جوابات ہیں۔

مولانا نانوتوی کے ساتھیوں میں سے ایک بزرگ مولوی رنگین بریلوی تھے۔ اُن کا اصل نام مولوی الہٰی بخش تھا۔ تردید عیسائیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شاہجہانپور کے مباحثہ میں انھوں ہی نے مولانا نانوتوی کو بلوایا تھا۔ افسوس کہ مولوی رنگین بریلوی کے حالات نہیں ملتے۔ [1]

دارالعلوم دیوبند کے مُربیّوں میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ خاموش طبع، حلیم اور رسیدہ بلند پایہ عالم دین تھے وہ حدیث کا درس دیتے تھے اور تزکیۂ نفس اور مجاہدات سے بھی گزارتے تھے۔ تردید عیسائیت میں اُن کی تحریر نہیں ملتی البتہ اُن کے مریدوں میں مولوی شرف الحق دہلوی کا نام بہت نمایاں ہے جنھوں نے زندگی بھر مشنری تحریک کے خلاف جہاد کیا۔

مولانا شرف الحق دہلوی ۱۸۶۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد حافظ جلال الدین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا چنانچہ کمپنی بہادر نے انھیں گرفتار کرلیا۔ والدہ، مولانا رحیم بخش دہلوی سے ارادت رکھتی تھیں اس لیے مولانا شرف الحق کی پرورش مولانا رحیم بخش نے کی۔ ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ ۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک سکول میں داخلہ لیا۔ ۱۸۸۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں عربی زبان و انشاء کی تعلیم پائی اور ایک ہندو پنڈت درگا پرشاد سے سنسکرت کی تکمیل کی۔

اسلامی مدارس میں نصرانیت کا مطالعہ ہونے لگا تھا۔ مولانا شرف الحق بھی نصرانیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک روز گھنٹہ گھر دہلی میں ایک پادری کا وعظ سنا۔ اس نے عوام پر رعب جمانے کے لیے کہا کہ مسلمان اپنے نبی کو حبیب اللہ کہتے ہیں لیکن جب اُن کے نواسے حضرت حسینؓ شہید کیے جا رہے تھے تو اس وقت (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا سے فریاد نہ کی۔ اگر مسلمانوں کا نبی خدا کا محبوب ہوتا تو وہ ضرور فریاد کرتا اور خدا اپنے نواسے کی جان بچا لیتا۔

پادری کی اس عامیانہ گفتگو سے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ مولانا شرف الحق جو ابھی طالب علم تھے، اُٹھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے الفاظ میں کہا کہ ہمارے نبیؐ نے خدا سے فریاد کی تھی مگر خدا تعالیٰ نے جواب دیا کہ تم اپنے نواسے کی جان بچانا چاہتے ہو ان ظالموں نے تو میرے اکلوتے یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھا دیا اور اس کا غم مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ ہمارے نبی نے یہ جواب سُن کر محسوس کیا کہ جب خدا کا اکلوتا نہ بچ سکا تو میرا نواسہ کس شمار قطار میں ہے۔

مولانا شرف الحق کے اس جواب پر پادری اپنی ساری منطق بھول گیا اور اُسے راہ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔

اس واقعہ کے بعد مناظرہ کا شغل بڑھتا گیا مگر بزرگوں کے مشورہ پر تکمیل تعلیم کو اہمیت دی۔ دہلی سے دیوبند گئے۔ کچھ عرصہ قیام اور حصول تعلیم کے بعد گنگوہ میں مولانا گنگوہی کے حضور حاضر رہتے۔ مولانا گنگوہی نے ان کے رجحان طبع کے مطابق تردید عیسائیت پر مامور کردیا۔

اس مقصد کے لیے عبرانی اور یونانی زبانیں سیکھیں تاکہ بائبل کا اصل زبانوں میں مطالعہ کیا جاسکے۔ دوسری زبانوں میں سے پشتو، مولانا عبدالحکیم افغانی سے اور ترکی مولانا ابوالخیر سے سیکھی۔ ۱۳۰۵ھ۔ ۱۸۸۸ء میں بغرض حج حجاز گئے اور مولانا کیرانویؒ کی خدمت میں تین ماہ گزارے۔ مولانا کیرانویؒ نے تردید نصرانیت کی سند دی اور اپنی تصانیف بطور تحفہ عنایت کیں۔

مولانا کی شہرت ایک مناظر کی حیثیت سے برصغیر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ انھوں نے کئی پادریوں سے تبادلۂ خیالات کیا اور علمی مناظرے کیے۔ ان پادریوں میں والپی فرنچ، لیفرائے، ہومرلوم گولڈ سمتھ کے نام نمایاں

---

[1] محمد احسن نانوتوی ص۱۲

ہیں۔ مولانا کے بیسیوں مناظروں میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۸۹۱ء میں مسجد فتح پوری دہلی میں پادری لیفرائے سے مناظرہ ہوا۔ موضوع "تحریف انجیل" تھا۔ اس مناظرے سے دہلی اور گرد و نواح کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہلچل مچ گئی کیونکہ مناظرین کے درمیان طے ہو گیا تھا کہ شکست خوردہ فریق مجمع عام میں اپنی شکست کے اعتراف میں شکست نامہ لکھ کر دے گا۔ اس مجمع میں حکیم محمد اجمل خاں، مولانا عبدالحق حقانی (مؤلف تفسیر حقانی) حافظ عزیز الدین اور کئی دوسرے اہل علم موجود تھے۔ مناظرہ دو دن جاری رہا۔ پہلے روز چھ سات گھنٹے بحث رہی لیکن ناتمام دوسرے روز بحث ختم ہوئی اور پادری لیفرائے لاجواب ہو گیا۔ پادری نے درج ذیل شکست نامہ لکھ دیا:

"میں اقرار کرتا ہوں کہ یونانی انجیل شریف کے ترجمے اور علاوہ اس کے اصلی نسخوں میں جو اس وقت موجود نہیں، چند آیتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کی گئی ہیں۔ یہ بات سب سے قدیم نسخوں اور نسخوں کے ملانے سے معلوم ظاہر ہوئی۔ وہ آیتیں ان میں نہیں لہٰذا میں وہی اصل انجیل کی باتیں سچی مانتا ہوں۔ چند مستشرقین شعراء کے قول انجیل میں ملے ہوئے ہیں۔"

دستخط جی ایلے۔ لیفرائے [1]

بحث و مباحثہ کس ماحول میں ہوا۔ خود پادری لیفرائے کہتا ہے،

"میں اس ہفتہ دو دفعہ ایک مسجد میں گیا ہوں۔ جہاں چار گھنٹے تک میں نے علماء سے بات چیت کی ہے۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے گفتگو کی ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ بغیر کسی تعصب اور ہٹ دھرمی کے وہ بحث کرتے ہیں۔" [2]

دسمبر ۱۸۹۱ء میں پادری ایم۔ جی۔ گولڈ سمتھ سے حیدرآباد (دکن) میں مناظرہ ہوا۔ اسی طرح ۱۸ فروری ۱۸۹۲ء کو پادری جے ہیگل سے پونہ میں مناظرہ کیا اور پادری صاحب کو مبہوت کیا۔

مولانا شرف الحق مناظرہ میں مخالف فریق کی مستند کتابوں سے دلائل لاتے اور اسی کے ہتھیار سے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ان کی گفتگو عامیانہ نہیں بلکہ عالمانہ اور محققانہ ہوتی تھی۔ کج بحثی سے نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیکچروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بکثرت شریک ہوتے تھے۔

مولانا نے یو۔پی کے گاؤں گاؤں میں مناظرے کیے اور عیسائی پادریوں کی تحریک ناکام کر دی۔ ستر برس کی عمر میں ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء و ۳۰ ذیقعدہ ۱۲۳۵ھ کو انتقال کیا۔ تردید عیسائیت میں مولانا سے مندرجہ ذیل تالیفات یادگار ہیں:

۱. دافع البہتان بہ تنزیل الرحمان (دو حصے)
۲. استیصال مذہب عیسوی
۳. مناظرہ غازی پور
۴. مناظرہ حیدرآباد دکن
۵. مناظرہ کالکا
۶. دینی مناظرہ ہنکنڈہ
۷. مناظرہ دہلی
۸. مناظرہ پونہ
۹. لیکچر امریکہ

مفتی کفایت اللہ اپنے دور کے مسلم مفتی اور فقیہ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تدریس و افتاء اور سیاسی ذمہ داریوں نے انہیں تردید عیسائیت کا کام نہ کرنے دیا مگر مشنری سرگرمیوں پر ان کی کڑی نظر تھی۔

مولانا اعزاز علی لکھتے ہیں:

"میں آپ (مفتی صاحب) سے شاہجہانپور میں سکندر نامہ

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۵۲ [2] صلیب کے علمبردار ص ۱۲۹

پڑھتا تھا کہ معلوم ہوا کہ سبزی منڈی میں عیسائیوں نے اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف کچھ کہنا شروع کر دیا ہے۔ اسی روز حضرت مفتی صاحب مجھ کو اور مولوی اکرام اللہ خاں ندوی ایڈیٹر کانفرنس گزٹ (علی گڑھ) کو ساتھ لے کر مجمع میں جا گھسے اور ان بد زبانوں پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ اول تو وہ سمجھے کہ کوئی ناواقف بول رہا ہے مگر اعتراضات کی اہمیت نے جب ان کو بتایا کہ معترض معمولی انسان نہیں ہے تو مناظرے سے انکار کر کے سب نے ٹالنا شروع کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تقریباً بس قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر ان اعتراضات کے جواب دیئے اور پھر خود ان کے مسلمات سے اُن پر اعتراضات شروع کر دیئے تھے۔ ۱؎

یہ سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا۔ مولانا مسلسل پادریوں کے اسٹیج پر جا کر اعتراضات کا جواب دیتے رہے اور اسلام کے اصول و عقائد کی برتری ثابت کرتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک ہفتہ بعد پادریوں کا وعظ سننے کوئی متنفس نہ گیا البتہ مولانا اعزاز علی اور ان کے ساتھی پادریوں کے وعظ کے نوٹس لینے پہنچ جاتے تھے۔ مولانا اعزاز علی صاحب ایک دوسرا واقعہ لکھتے ہیں:

"اس کے غالباً دو ایک سال بعد امریکن مشن کے ایک مشہور مبلغ پادری جوالا پرشاد نے رمضان المبارک (شدید گرما کے موسم میں) جلسہ کا اعلان کیا اور اشتہار میں شائع کیا کہ آریوں اور اہلِ اسلام کو بھی رفع شبہات کا موقع دیا جائے گا۔

یہ اجلاس مشن سکول کے وسیع ہال میں ہوا۔ حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا عبدالکریم لغوی ظہر کے بعد سے موجود تھے۔ پادری صاحب وقت معینہ سے دو گھنٹے بعد تشریف لائے تقریر شروع کی بحث کا وقت آگیا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالکریم کے ساتھ ہم نے مسجد میں پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا مگر اب بھوک زیادہ تھی۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ مجھے قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے۔ میں چلا آیا مگر یہ حضرات وہاں شب کے بارہ بجے تک رہے۔ یہ جلسہ کس وقت ختم ہوا؟ مجھے معلوم نہ ہوا کہ صبح کو ہر کہ و مہ کی زبان پر یہ تھا کہ دونوں مولویوں نے اسلام کی لاج رکھ لی۔ خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے (ان دونوں صاحبان سے شاہجہانپور کے لوگ ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اس کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ ایک شخص نے کہا:

مگر ان میں جو دُبلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا تم نے دیکھا۔ وہ شیر کی طرح غُرّاتا تھا اور اس کی ہر بات پہ پادری صاحب کو پسینہ آجاتا تھا۔" ۲؎

مشہور اہلحدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں دارالعلوم اور وہاں کے بزرگوں کا حصہ نہیں ان کے ذوقِ مناظرہ کی داغ بیل دارالعلوم میں پڑی اور بجا طور پر فرقِ باطلہ کی تردید میں وہ اُمتِ مسلمہ کے لیے مایۂ ناز عالم تھے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب نے پادریوں سے ان گنت مناظرے کیے اور برصغیر کے طول و عرض میں اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجایا۔ ذیل میں حیاتِ ثنائیؒ سے چند مناظرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱؎ مفتیٔ اعظم کی یاد میں صفحہ ۱۱۲ بحوالہ "بیس بڑے مسلمان"

۲؎ مفتیٔ اعظم کی یاد میں صفحہ ۱۱۴ بحوالہ "بیس بڑے مسلمان"

۱۔ ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ لاہور میں پادری جوالا سنگھ سے مولانا کا مناظرہ ہوا۔ موضوع "الوہیت مسیح" تھا۔ پادری صاحب جو دلیل دیتے مولانا مدلائل توڑ کر اسے کاٹ دیتے۔ آخر پادری صاحب جھلا کر بولے کہ مولانا میری کسی دلیل کو تو رہنے دیجیے۔ سامعین پادری صاحب کی اس التجا پر خوب محظوظ ہوئے اور ایک عیسائی خاندان حلقۂ اسلام میں شامل ہو گیا۔

۲۔ پادری عبدالحق عیسائی حلقوں میں اپنی منطق اور قرآن وحدیث کے مطالعہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ مولانا ثناء اللہ نے پادری صاحب سے کئی مناظرے کیے۔

۳۔ ۲۷، ۲۸، فروری ۱۹۲۶ء کو انجمن اہلحدیث گوجرانوالہ کے سالانہ جلسہ میں اہل صلیب سے مناظرہ ہوا۔ مولانا نے توحید کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اہل صلیب کو دعوت دی کہ وہ بالمشافہ گفتگو کریں۔ ان کی طرف سے پادری محمد سلطان پال تشریف لائے۔ آٹھ دس ہزار کے مجمع میں شکست کھائی اور ایک مسیحی نوجوان نے اسلام قبول کیا۔

۴۔ ۲ ستمبر ۱۹۱۶ء کو پادری جوالا سنگھ سے ہوشیارپور میں مناظرہ ہوا۔

۵۔ ۲، ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں "اسلامی توحید اور الوہیت مسیح" پر پادری سلطان محمد پال، پروفیسر ایف۔ سی۔ آئی۔ بی آئی سے مناظرہ ہوا۔ پادری صاحبان بے بس ہو گئے۔ اہالیان حافظ آباد کی جانب سے مناظرے کی رپورٹ شائع ہوئی جس پر حافظ آباد کے غیر جانبدار ہندوؤں اور سکھوں نے بھی دستخط کیے اور پادری صاحبان کی شکست کی گواہی دی۔

مولانا موصوف نے تردید عیسائیت میں قلم سے خوب کام لیا ہفت روزہ "اہلحدیث امرتسر" میں ان کے قلم سے بیسیوں مضامین شائع ہوئے جن کا احاطہ مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ مستقل بالذات تردید عیسائیت میں مندرجہ ذیل تین کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ تقابل ثلاثہ ـــــ پادری ٹھاکر دت نے ایک کتاب "عدم ضرورت قرآن" لکھی جس کے جواب میں مولانا ثناء اللہ نے "تقابل ثلاثہ" (یعنی قرآن، توراۃ اور انجیل کا تقابلہ) لکھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر جامع اور بہت مفید ہے۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ ایک قادیانی شمس نامی نے کیا مگر مترجم نے مولانا ثناء اللہ کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

۲۔ اسلام اور عیسائیت ـــــ پادری برکت اللہ کی تین کتابوں (ا) عالمگیر اسلام ہے یا عیسائیت (ب) دین فطرت اسلام ہے یا عیسائیت۔ (ج) اصول البیان فی توضیح القرآن کا جواب ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے عام طور پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۳۔ توحید و تثلیث ـــــ اثبات توحید کے موضوع پر ایک اچھی تحریر ہے۔

علمائے دیوبند میں سے مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے "قصص القرآن" میں بائبل اور قرآن کے تقابلی مطالعہ کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالحق حقانی اور دوسرے بزرگوں نے اپنی تالیفات میں بالواسطہ طور پر عیسائیت کا جائزہ پیش کیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس مکتب فکر کے رسائل و جرائد میں بلا مبالغہ سینکڑوں مقالات تردید عیسائیت میں شائع ہو چکے ہیں۔

ـــــ ماخذ ـــــ

۱۔ اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۲۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی
۳۔ ہمیں ٹٹے مسلمان	عبدالرشید ارشد	مکتبہ رشیدیہ۔ لاہور
۴۔ تاریخ صحافت اردو (حصہ دوم)	امداد صابری	مطبوعہ دہلی
۵۔ ترجمان الحدیث (ماہنامہ) (مشنری سرگرمیاں اور مسلمان علماء)	اختر راہی	دفتر ترجمان الحدیث لاہور
۶۔ حکومت خود اختیاری	طفیل احمد منگلوری	
۷۔ دارالعلوم دیوبند	قاری محمد طیب	دارالعلوم دیوبند
۸۔ سیرت ثنائی	عبدالمجید خادم	دفتر "اہلحدیث" سوہدرہ
۹۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری	محمد حسنی	ندوۃ العلماء لکھنو

(بقیہ: ص ۴۸۸)

دارالعلوم دیوبند

دلِ افرنگ کا کانٹا

عین حق ہے جو تجھے علم کا دریا کہدوں
یہ بھی سچ ہے کہ تجھے گلشن تقوےٰ کہدوں

ایشیا ہے جو انگوٹھی تو پھر اُس میں تجھ کو
کیوں نہ مَیں ایک چمکتا ہوا ہیرا کہدوں

جتنے دل والے ہیں وُہ تجھ پہ ہیں شیدا دل سے
کیوں نہ دل والوں کی مَیں تجھ کو تمنا کہدوں

تُو نے پیدا کیئے، محمُودؒ و رشیدؒ و انورؒ
زیب دیتا ہے انھیں جس قدر اچھا کہدوں

ہاں بجا ہوگا! کہ مَیں تیرے حسینؒ احمد کو
پیکرِ عشق کہوں، علم سراپا کہدوں

ہاں تیرے اشرفؒ و عثمانیؒ و طیبؒ کو میں
جھوٹ کیا ہوگا، اگر فخرِ زمانا کہدوں

ایک دو چار جو ہوتے تو گِنا دیتا میں
حق ہے یہ، تجھ کو نوادر کا خزانا کہدُوں

بار بار آتا ہے گیلانی کے دل میں کہ تجھے
دلِ افرنگ میں اٹکا ہوا کانٹا کہدُوں

سید امین گیلانی شیخوپورہ

مولانا ابو سلمان شاہجہانپوری

دارالعلوم دیوبند

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ عام معنوں میں تو عملی آدمی نہیں تھے، اگرچہ اُنھوں نے مسلمانوں کے وقار و سطوت کی گرتی ہوئی عمارت کو بچانے، اس کی بنیادوں کو خرابیوں سے محفوظ اور مستحکم کرنے کی عملی طور پر بھی کوشش کی اور اُس کے نتائج نہایت دُور رس نکلے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وُہ بنیادی طور پر ایک مفکر اور فلسفی تھے اور اُن کا اصلی کارنامہ عملی نہیں علمی اور فکری ہے۔

شاہ صاحبؒ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں وفات پائی اس ساٹھ سال کی مدت میں دس بادشاہ تختِ حکومت پر بیٹھے اور مختلف اسباب کی بنا پر تخت سے اُترے، عام نگاہیں تو شاید صرف سیاسی مفاد و اقتدار کی جنگ پر تھیں، لیکن شاہ ولی اللہؒ کی عمیق و دُور بین نظریں مسلمانوں کے ذہنی، فکری، اخلاقی انحطاط پر اشک ریز او رزبان مسلمانوں کے انتشارِ ملی پر ماتم کناں تھی، شاہ صاحبؒ نے حالات کو سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کی، لیکن انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سررشتۂ فکر و عمل مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور خود ان میں نہ تو حالات کی سنگینی اور اپنے زوال و انحطاط کا احساس ہے نہ اُن میں اصلاح کی کوئی تحریک موجود ہے۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے اپنی جو ذمہ داری محسوس کی، وُہ یہ تھی کہ وُہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی فکر مرتب کر دیں کہ جب مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کی بحالی کا خیال پیدا ہو اور جب ان میں احیائے اسلام اور تجدیدِ ملت کا احساس بیدار ہو جائے تو وُہ اس فکر کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی عظمت کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ اس رہنمائے عظیم نے اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس کی تعلیم و اشاعت سے مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا کر دی جو شاہ ولی اللہ کی فکر کی اہمیت اور ضرورت کی اندازہ شناس تھی اسی سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ایما اور مشورے سے سید احمد شہیدؒ نے عملی بنیادوں پر ایک جماعت تشکیل دی جس کے رکن رکین مولانا عبدالحیؒ (داماد شاہ عبدالعزیزؒ) اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (برادر زادہ شاہ عبدالعزیزؒ) تھے۔

ان حضرات نے مسلمانوں میں اصلاح احوال و رسوم کی ایک زبردست تحریک شروع کی جس کے نتائج نہایت شاندار نکلے، لیکن شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد ۲۵، ۳۰ سال کی مدت میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ چکا تھا اور مسلمانوں کی دشمن قوتوں نے پورے اسلامی ہند کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ برٹش استعمار کے پنجے ہندوستان کے سیاسی نظام میں پوری طرح گڑ چکے تھے، اور استعمار کے اس عفریت سے ملک و ملت کو نجات دلانے کے لیے ایک زبردست انقلابی اقدام کی ضرورت تھی حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان

کے رفقاء نے حالات و وقت کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا اور غور و
فکر کے بعد اپنی دعوت تجدید و احیاءِ اسلام کا رُخ تحریکِ جہاد کی طرف موڑ دیا
اور رفتہ رفتہ مجاہدین کی ایک جمعیت فراہم کر کے صوبہ سرحد کو
اپنی تحریک کا مرکز بنا کر احیاءِ ملت کی سعی شروع کر دی، لیکن مسلمانوں کی بد
قسمتی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ یہ تحریک بیگانوں کی ریشہ دوانیوں
اور اپنوں کی عاقبت نااندیشیوں کی بدولت مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے
مقام پر ناکام ہو گئی۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل اس معرکے میں شہید ہو گئے
اور مجاہدین کی جمعیت و قوت منتشر ہو گئی، لیکن اس سلسلے کے بزرگوں نے
ہمت نہ ہاری، وہ اپنی منتشر جمعیت کی فراہمی اور پامال قوتوں کی بحالی میں مصروف
ہو گئے اور ۲۵، ۲۶ سال کی کوششوں کے نتیجے میں، وہ پھر اس قابل ہو گئے کہ کسی
معرکۂ کرب و بلا میں اپنا سر و سینہ آزمائیں لیکن وہ ابھی کسی معرکے میں حصہ لینے
کے لیے پوری طرح منظم نہیں ہو سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے مبادیات شروع ہو گئے
اور چند دنوں میں حالات اس درجے خراب ہو گئے کہ اب ان کے لیے صبر
ناممکن اور میدانِ حریت و جہاد میں کود پڑنا ناگزیر ہو گیا، وہ خاک و خون میں
تڑپے اور اسلام کے عشق اور ملت کی غمخواری کی آزمائش میں پورے اترے۔
لیکن ان کا یہ خاک و خون میں تڑپنا ملت کی قسمت کو نہ بدل سکا

ہزار ہا مجاہدین ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں کام آئے۔ یہ ہنگامہ
ختم ہوا تو دار و رسن اور طوق و سلاسل کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ملک
کی جیلوں کو آزمائش گاہ عشق و ملت اور بیرون ملک جزائر انڈمان کو نمائش گاہ
جذبۂ حریت میں تبدیل کر دیا گیا، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی قسمت کا ستارہ ایک
نئی گردش میں مبتلا ہو گیا۔ افسوس یہ نہیں کہ مجاہدین نے میدانِ جنگ میں
شکست کھائی اور جذبۂ حریت کے امتحان میں پورے نہ اترے، ملت سے
ان کا عشق خام تھا یا سر و سینہ کی آزمائش میں وہ ناکام رہے بلکہ شکست وہ نہیں
جو دشمن نے میدانِ جنگ میں دی، اصل شکست یہ تھی کہ اس نے ہمارے ذہن و
فکر کو مغلوب کر لیا۔ اگر جنگ میں ایک سپاہی کی تلوار ٹوٹ جائے تو دوسری
تلوار اسے مل سکتی ہے، لیکن جذبۂ حریت فنا اور سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ
لٹ جائے تو دوسرا سپاہی کہاں سے آسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کا
سب سے المناک اور غم انگیز پہلو یہی تھا کہ سپاہی کی تلوار نہیں ٹوٹی تھی بلکہ
اس کا جذبۂ حریت فنا ہو گیا تھا اور اس کی سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ لٹ
گیا تھا۔

ایک بہت بڑا سانحہ یہ تھا کہ ولی اللّٰہی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی
ایک گروہ نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اقتدار کے دربست
سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے کاسہ لیسی کی زندگی کو اپنا شعار بنالیا۔
دوسرا گروہ حق کے اسی جادۂ قدیمہ پر استوار رہا، جو امام الہند شاہ ولی اللہ
محدث دہلویؒ کی حکمتِ بالغہ نے مسلمانانِ ہند کے لیے متعین کیا تھا۔ اس گروہ
کے رہنما حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

دیوبند کا امتیاز دوسرے مکاتب فکر کے مقابلے میں یہی تھا
وہ اسی قافلۂ سخت جان کے مسافر تھے۔ جو ہندوستان کی سیاسی کربلا میں
کئی بار لٹ چکا تھا، ان کے ذوق و عزم سفر کو کئی بار آزمایا جا چکا تھا اور وہ اس
امتحان میں پورے اترے تھے۔ اگرچہ حالات نے ان سے مساعدت نہ کی تھی
لیکن ان کی حق پرستی نے اس کی تباہی کب کی تھی، انھوں نے کانٹوں پر زندگی
بسر کرنا سیکھ لیا تھا، خدمتِ حق میں انھوں نے صرف فرض کی ادائیگی
کا سبق سیکھا تھا، دنیا کی ہار جیت کے تصور سے ان کا ذہن ناآشنا تھا۔
ناکامیوں کے بعد انھیں کسی بات کا خیال آیا تو فرائض کی ادائیگی میں صرف
سعی و عمل کی کوتاہی کا آیا اور جان دے کر بھی کوئی حسرت پیدا ہوئی، تو صرف
یہ کہ ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دارالعلوم دیوبند کا قیام حضرت شاہ ولی اللہ کی انقلابی فکر کے سلسلے ہی کا
ایک اقدام تھا جو حالات و مصالح وقت کے پیشِ
نظر اٹھایا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک اس تحریک کے قائدین کا خیال تھا کہ وہ

طاقت اور قوت کے زور سے مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی جستجو میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انھوں نے سمجھ لیا کہ کسی انقلابی تحریک کے لیے حالات سازگار نہیں۔ اور وقت کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت فکر کے تحفظ کی ہے، گویا کہ صدی کی جدوجہد کے بعد تحریک پھر اسی مقام پر آگئی تھی جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا اور اب پھر اس کے سامنے نئے حالات میں فکر کے تحفظ و تدوین، اشاعت، جماعت کی تیاری اور پھر عملی میدان میں مصروف سعی و جہد ہونے کے مراحل تھے، پہلے مرحلے کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوتا ہے۔ اس مرحلے کے رہنما وہی حضرات تھے جو گزشتہ دور میں آخری مرحلے کے قافلے کے سالار تھے یہ اصحاب عزیمت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے دیگر رفقائے کرام رحمہم اللہ اجمعین تھے۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ضلع سہارنپور کے ایک قصبے دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی، عام طور پر دنیا نے اس کو علوم اسلامی کی ایک درس گاہ کی حیثیت میں نظر ڈالی ہے اور بلاشبہ علوم اسلامی کی درس و تدریس ہی اس کا سب سے بڑا امتیاز تسلیم کیا گیا۔

مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

• ہندوستان میں گیارہ سو برس مسلمانوں کی شاندار حکومت قائم رہی، مگر کیا کوئی درسگاہ ملتی ہے، جس میں اہتمام کے ساتھ حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہو بے شک مدارس لاکھوں تھے، چپہ چپہ پر اسکول تھے، مگر افسوس ہندوستان کے طول و عرض میں دارالحدیث یا دارالتفسیر ایک بھی نہ تھا، ہاں بے شک مصر و بغداد میں بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں جامعہ ازھر آج بھی اپنی جامعیت میں شہرۂ آفاق ہے، لیکن ان تمام کا قیام و بقا حکومت کے خزانوں پر تھا۔ سوال تو یہ ہے کہ بے کس و بے درماں مفلس قوم کا مدرسہ جو اپنی خدمات میں جامعہ ازہر، جامعہ نظامیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹی سے بازی لے جائے، کیا اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں وجود میں آیا تھا، بلاشبہ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے، جو سرزمین ہند میں ظاہر ہے اور جس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد حدیث و قرآن کے درس و تدریس اور علوم اسلامی کے تحفظ و بقا کے انتظام سے کچھ آگے بھی تھا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے لیے جو آٹھ اصول قائم کر دیئے تھے اور ان اصولوں میں جن نکات کو بیان کر کے ان پر زبان و بیان کے لطیف اسلوب کا پردہ ڈال دیا تھا، مولانا محمد میاں نے اس پردے کو ہٹا دیا ہے۔ اور دارالعلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مندرجہ ذیل مقاصد کی طرف توجہ دلائی ہے:

الف: آزادئ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان ہو، کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ، یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔

ب: اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو تاکہ یہ خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے ورنہ کم از کم اس وقت کے لیے محفوظ ہو جائے، جب تک یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکلت علی اللہ اور عوام کی طرف احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹھ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو، بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا

محتاج بنائے رکھے اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے۔

ج: کارکنان، خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ افراجات سے محفوظ اور مامون رہ کر ولی اللّٰہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا ہے، جس کے متعلق تمام عالم اسلامی کا اتفاق ہے کہ وہ سنتِ قدیمہ ہے، مسلکِ اسلاف کے عین مطابق ہے، افراط و تفریط سے پاک، صراطِ مستقیم اور معیار صحیح ہے۔

د: خود رائی اور استبداد (جو شرعی نیز تاریخی حیثیت سے بربادی مسلم کا واحد ذمہ دار ہے) کے خلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

ان اصول و مقاصد کو ذہن میں رکھ کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تعلیم و تربیت سے آراستہ شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے سیاسی و دینی افکار، سیرت اور خدمات پر نظر ڈالیے اور پھر اُن کی قائم کردہ جمعیتوں ثمرۃ الترتیب (۱۸۷۹ء) جمعیۃ الانصار (۱۹۱۰ء) اور پھر نظارۃ المعارف (۱۹۱۳ء) کے اغراض و مقاصد اور اُن کے کاموں پر نظر ڈالیے تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند علوم اسلامی کی ایک قدیم طرز کی درسگاہ نہیں بلکہ احیائے اسلام و تعلیم ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے، دارالعلوم دیوبند انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ تھی۔

اس نے اسلام کے جانثاروں اور ملت کے غمگساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جو ملت کے غم میں خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلایا، جو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کے لیے خود بھی تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا، انھوں نے آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لیے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دوسروں کو بھی جاں نثاری اور ایثار پیشگی کا سبق دیا۔ انھوں نے، مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑا، برٹش استعمار کے سحر کو توڑا۔ انھوں نے وقت کی استبدادی قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور ملک کے ذہنوں سے خوف و ہراس کو دور کیا، اتنا ہی نہیں انھوں نے ملیگڑھ کے سیاسی ویرانے میں آزادی کی شمع روشن کی۔ نصب العین کی پستی سے نکالا، مقصد کی سطحیت کا احساس پیدا کیا اور اس محفل میں جہاں زبان بندی کا دستور نافذ تھا، جہاں بات کرنے پر زبان کشی تھی اور ذہنوں پر پہرے بٹھائے جاتے تھے، وہاں انقلاب کا صور پھونکا اور نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کاسہ لیسانہ زندگی کی غلاظت سے نکال کر ملک کی آزادی کی جدوجہد میں سپاہی کے منصب پر فائز کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں علیگڑھ میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی، وہ دیوبند یا ملک کی دوسری انقلابی و سیاسی تحریکات کی رہین منت تھی اور جو انقلابی اور حریت پسند اٹھے، وہ دیوبند کے سرچشمہ فکر کا فیضان تھا۔

دیوبند کے اکابر نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لیا، اس راستے کی تمام صعوبتوں کو برداشت کیا اور ہر آزمائش پر پورے اترے، دارالعلوم کے قیام کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا دور حضرت شیخ الہندؒ سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے حضرت شیخ الہند کی زندگی کو تحریک ولی اللّٰہی کا ایک مستقل عہد تسلیم کیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی سرکردگی میں اصحاب عزیمت کا جو قافلہ تیار ہوا تھا، اُس میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، فضل ربیؒ (رکن ہیئت تمیز افغانستان) مولانا سیف الرحمٰن، مولانا حافظ محمد صادقؒ اور دوسرے بہت سے اکابر شامل تھے آج بھی ہندوستان سے پاکستان تک دارالعلوم دیوبند کے فضلا سیاسی میدان میں ملک و ملت کی رہنمائی کر رہے ہیں، دیوبند کے نامور عالم اور صوفی مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض مسائل میں جو روش اختیار کی، اس سے تحریک پاکستان کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا، مولانا شبیر احمد عثمانی تو تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں شامل تھے اور انھوں نے اپنی بہترین

عالمانہ صلاحیتوں سے مسلم لیگ کو اسلامی ریاست کے نصب العین پر مستحکم کرنے اور استوار رکھنے کی کوشش کی، پھر قیامِ پاکستان کے بعد دیوبند کے ہندوستانی رہنماؤں نے نہایت خراب حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا اور پاکستان میں اس سلسلے کے بزرگوں نے ملک و ملت کی تعمیر و خدمت کے ایک نئے عزم کے ساتھ بیڑا اٹھایا اور پاکستان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملت کی رہبری کی۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اس کے فرزند علمی و ادبی خدمت کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اس کے بانیوں میں حاجی امداد اللہ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ اردو کے بہترین ادیب اور صاحبِ تصنیف و تالیف بزرگ تھے، حضرت شیخ الہندؒ دیوبند کے نامور سپوت اور اس کے رہنماؤں میں تھے، بہت بڑے صاحبِ قلم بزرگ تھے، ان کا ترجمہ قرآن مجید اردو ادب کا شاہکار ہے۔ ان کے علاوہ علامہ انور شاہ کاشمیری شبیر احمد عثمانیؒ، بدر عالم میرٹھی، مولانا سید محمد میاںؒ، مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تحریریں عالمانہ اور محققانہ ہی نہیں، زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی وقت کی معیاری ادبی تحریریں ہوتی ہیں تاجور نجیب آبادی، منظر الدین بجنوری، حامد انصاری غازی، شائق احمد عثمانی تر ادب و شعر کی دنیا میں معروف ہی ادبی حیثیت سے ہیں، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور بہت سے اکابر دیوبند اگرچہ ادبی حیثیت سے مشہور نہیں ہو سکے، لیکن وہ اپنی تصانیف کی کثرت یا تصانیف کی علمی، تاریخی، سیاسی حیثیت کی بنا پر علمی، ادبی دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں، ان کی خدمت سے ہر شخص واقف ہے، اگر ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اس پر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے مرکز علمی میں ہونے والے کام کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھے تو دارالعلوم دیوبند کو بھی اس کا حق ہے کہ اس کے عظیم فرزندوں نے ندوۃ المصنفین دہلی میں بیٹھ کر علم و ادب اور تصنیف و تحقیق کے جو ہفت خواں طے کیے ہیں، وہ ان پر فخر کرے یا اس کے فرزندوں نے علم و ادب کے جس میدان میں بھی اور کسی علمی ادارے کے گوشۂ خلوت میں یا کسی مجلّہ و اخبار میں کوئی علمی و صحافتی اور ادبی خدمت انجام دی ہے، وہ اسے اپنی تاریخ و تذکرے میں بیان کرے۔

دارالعلوم دیوبند کے اپنے اہتمام سے مختلف اوقات میں مختلف رسائل نکلے، "القاسم" "الرشید" اس کے مشہور علمی و دینی جرائد ہیں، آج کل دارالعلوم ہی کے نام سے ایک بلند پایہ دینی مجلّہ نکل رہا ہے۔ ان رسائل میں بلند پایہ علمی، تحقیقی، دینی، اصلاحی اور اسلامی ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں اور اسلامی علوم و فنون کی مختلف شاخوں کے بارے میں بیش بہا ذخیرہ اس کے دامن میں جمع ہو گیا ہے، وقت کے سیاسی، سماجی اور جدید مسائل میں ان رسائل نے مسلمانوں کی اسلامی رہنمائی کی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مصنفین نے دورِ جدید کے فتنوں کے اثرات سے مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو بچانے اور اسلام کے دفاع کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے قیام سے سو سال کی مدت میں تقریباً ہزار مشائخ طریقت، مدرس، خطیب، مبلغ، مفتی، مناظر، مصنف، صحافی، طبیب اور ماہرینِ صنعت و حرفت پیدا کیے ہیں، ان میں سے اعلیٰ درجے کے اصحاب علم و فن کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد بھی ڈھائی ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۶۵ء تک کے ایک جائزے کے مطابق تفصیل حسب ذیل ہے۔

عالم و مدرس	۴۴۸	مصنف	۲۷۶
مفتی	۱۹۴	مناظر	۱۱۲
صحافی	۱۰۸	خطیب و مبلغ	۲۸۸
طبیب	۱۹۴	صنّاع و اہل حرفہ	۷۴۸

اس جائزے سے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، صحافت و طباعت وغیرہ کے میدانوں میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، درس و تدریس کے میدان میں دیوبند کی عظیم الشان خدمات کا

اندازہ اس سے کیجئے کہ سو سال کی مدت میں ابنائے دیوبند نے تقریباً ۹ ہزار مدرسے ہندوستان، پاکستان اور بیرونِ ملک قائم کئے ہیں

دارالعلوم دیوبند کا دینی فیضان ہندوستان، پاکستان سے گزر کر، افغانستان، رُوس، چین، برما، ملائشیا، انڈونیشیا، عراق، کویت، ایران، سیلون، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، سیام، یمن وغیرہ تک جا پہنچا، اس وقت پُورے عالمِ اسلامی میں دارالعلوم دیوبند کے تقریباً ۱۰ ہزار فارغ التحصیل عُلماء موجود ہیں، جو اسلام اور مسلمانوں کی مختلف اطراف سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند ظاہر ہے ایک قدیم طرز کی اسلامی درسگاہ ہے اس میں اسلامی علوم و فنون کی ایک مخصوص انداز سے تعلیم دی جاتی ہے ہمیں اس کی تعلیم اور اس کے نتائج کو کسی جدید علمی درسگاہ کے معیار پر نہیں جانچنا چاہیئے، لیکن دارالعلوم دیوبند کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس کے فارغ التحصیل ذہن و فکر اور اخلاق و سیرت کے ان پیمانوں سے بہت بلند ہیں جنکا تصور کیا جا سکتا ہے، ان میں دُوسرے دینی مدارس اور مکاتب فکر کے لوگوں کی نسبت وسعت قلبی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی اور اخلاص عمل کی زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں دُوسرے مکاتب فکر کے عُلماء کے مقابلے میں وہ ہمیشہ اور ہر دور میں زیادہ بیدار مغز ثابت ہوئے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ دیوبند کے نصاب تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور حالات و وقت کے مطابق دیوبند کے اکابر نے اپنے طلبہ کو جدید علوم و فنون کے مطالعہ و غور و فکر کی زیادہ آزادی دی اور اُن کی رہنمائی کی۔ اور غیر نصابی مضامین کی حیثیت سے جدید علم ہیئت، فلسفہ، سائنس، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ مضامین کے مطالعے کی دعوت دی، یہ مرحلہ اس وجہ سے اور زیادہ آسان ہو گیا کہ اس کے بعض نامور فضلاء نے مختلف موضوعات پر نہایت احتیاط کے ساتھ قلم اُٹھایا، ایسی تصانیف پیش کیں جو اگر ایک طرف اسلامی فکر کی حامل تھیں، تو دُوسری طرف اُن کا علمی و فنی پایہ بھی بہت بلند تھا

ابنائے دارالعلوم کے ظرف کی بلندی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ دارالعلوم نے اپنے طلبہ کو محض ملائے مکتبی یا دو رکعت کے امام بننے کی تعلیم نہیں دی تعلیم میں انھوں نے مقصد کی پستی کو کبھی گوارا نہیں کیا، ساتھ ہی مختلف صنعتوں کی تعلیم و تربیت کے اہتمام و انتظام سے طلبہ کے بہت سے مادی و معاشی مسائل حل ہو گئے۔ جبکہ بے وقت عمل نہ ہونا انسان کو اخلاق و کردار کی پستی میں دھکیل دیتا ہے، شیخ محمد اکرام دارالعلوم کی مذہبی و علمی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے، دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دورِ حاضر کے مصری علما کی تصنیفات سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی علمائے ندوۃ العلما کو ہے لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے، وہاں سے ہزاروں علما اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں، جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے، مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مُضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی، یہ درست ہے کہ وہ جدید ضرُوریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں باخبر نہیں لیکن آخران میں تقویٰ پرہیزگاری اور رُوحانیت دُوسروں سے زیادہ ہے اور صرف اسی کا فیض ملک کے دُور دراز حصّوں میں پہنچانا ملک اور قوم کی قابلِ قدر خدمت ہے، دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے، وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور انھیں اس پر فخر کا

جائز حق ہے:

اگرچہ ہم ندوہ اور دارالعلوم کے موازنے اور جدید ضروریات سے ناواقفیت کے سلسلے میں اکرام صاحب مرحوم کے خیالات سے پوری طرح متفق نہیں ہیں لیکن ہم اس پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس رائے میں شیخ اکرام کے اخلاص سے انکار نہیں کیا جاسکتا، وہ یہاں پر دارالعلوم دیوبند کو ایک ایسے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا وہ خود مدعی نہیں، یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہیئے کہ دارالعلوم دیوبند اسلامی علوم کی ایک قدیم درسگاہ ہے، وہ موجودہ دور کی یونیورسٹی نہیں ہے۔ ۱۹۱۲ء میں علامہ رشید رضا مصری ہندوستان آئے تو دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے دارالعلوم کے معائنے کے بعد فرمایا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں:

کتابیات

تاریخ دارالعلوم دیوبند (مولانا محمد طیب صاحب)، علماء حق (مولانا سید محمد میاں)، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (مولانا عبید اللہ سندھی)، الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر (مولانا محمد منظور نعمانی)، موج کوثر (شیخ محمد اکرم)، فرنگیوں کا جال (امداد صابری)، مسلمانوں کا روشن مستقبل (سید طفیل احمد منگلوری)، سرسید احمد خاں بحیثیت ولی اللّٰہی (ابو سلمان شاہجہان پوری)، تذکرہ خانوادہ ولی اللّٰہی (ابو سلمان شاہجہان پوری)۔

بشکریہ: "علم و آگہی" کراچی

حمد و غزل

(حضرۃ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی)

الٰہی یہ عالم ہے گلزار تیرا
عجب نقش قدرت نمودار تیرا

خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں
عجب تیری قدرت عجب کار تیرا

الٰہی عطا ذرۂ درد دل ہو
کہ تڑپا ہے بے درد بیمار تیرا

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے
میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا

نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلوب
تو مطلوب، میں ہوں طلب گار تیرا

اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے
تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

بقیہ: مسیحی مشنریاں

۱۰۔ صلیب کے علمبردار	پادری برکت اللہ	پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور
۱۱۔ فرنگیوں کا جال	امداد صابری	مطبوعہ دہلی
۱۲۔ تاریخ الکتب	مفتی انتظام اللہ شہابی	انجمن ترقی اردو
۱۳۔ مباحثہ شاہجہانپور	مولانا محمد قاسم نانوتوی	مطبع مجتبائی دہلی
۱۴۔ محمد احسن نانوتوی	محمد ایوب قادری	روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی
۱۵۔ مقالات گارساں دتاسی (جلد اول)	گارساں دتاسی	انجمن ترقی اردو، کراچی
۱۶۔ موج کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز، لاہور

THE MISSIONS .16

دار العلوم دیوبند

ایک ادارہ۔ ایک تحریک

— پروفیسر محمد ایوب قادری —

شاہ ولی اللہ (ف ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور ان کے خاندان نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع کی اور اس خاندان نے اکناف و اطراف پاک و ہند میں علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے مسلمانوں کے نظری و فکری میلانات اور عملی و سیاسی رجحانات کو بدلا۔ ان میں جہاد و عمل کی روح پھونکی۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے لائق فرزندان شاہ عبدالعزیز (ف ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر نیز ان کے پوتے شاہ محمد اسماعیل اور نواسے شاہ محمد اسحاق (ف ۱۸۴۵ء) نے علوم و فلسفۂ ولی اللہی کی خوب نشر و اشاعت کی۔ اصلاح عقائد و معاشرت کے سلسلے میں شاہ اسماعیل کی کتاب تقویۃ الایمان معروف ہے۔ شاہ اسماعیل سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے میدان میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ان کے جانشین شاہ محمد اسحاق ہوئے انہوں نے علم حدیث اور اصلاح معاشرت کی بہت کوشش کی۔ وہ تحریک جہاد کے معین و مددگار رہے۔ جب شاہ محمد اسحاق نے برصغیر پاک و ہند میں حالات موافق نہ دیکھے تو ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں حجاز کو ہجرت کر گئے۔ شاہ محمد اسحاق نے اصلاح عقائد و معاشرت سے متعلق دو کتابیں مسائل اربعین اور مأۃ مسائل مرتب کیں۔ پہلی کتاب محمد زمان خاں شروانی رئیس بھیکم پور کی تحریک پر ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۹ء میں اور دوسری کتاب ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء میں قلعہ معلیٰ دہلی کے بعض شہزادوں اور سلاطین کی فرمائش پر مرتب ہوئی۔ یہ کتابیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں مسلمانوں کی معاشرتی و سماجی ترقی کا خاص طور سے خیال رکھا گیا۔ اس طرح بالواسطہ ان کی اقتصادی و معاشی اصلاح کی کوشش کی گئی۔

شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اس زمانے کے مشہور علماء تھے، جنہوں نے علم حدیث اور اصلاح معاشرت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں مفتی عنایت احمد کاکوری، مولوی نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ/۱۸۶۹ء)، مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات نے اردو زبان میں عام فہم اردو لٹریچر شائع کیا اور اس طرح مسلم معاشرے کی بڑی خدمات انجام دیں۔ نواب قطب الدین خاں نے اردو زبان میں متعدد اصلاحی کتابیں لکھیں۔ حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ المصابیح کا اردو ترجمہ کیا۔ اردو زبان میں قرآن کریم کی ایک تفسیر "جامع التفاسیر" کے نام سے لکھی۔ شاہ محمد اسحاق رح، جب کے آخر الذکر دونوں شاگردوں مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی نے علم حدیث کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ مولانا احمد علی سہارنپوری نے دہلی میں ایک پریس مطبع احمدی کے نام سے قائم کر کے حدیث کی مشہور کتب جامع ترمذی ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں اور صحیح بخاری ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء

میں شائع کیں۔

شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کرنے کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ وہ حدیث کے بڑے عالم اور شاہ مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ انہوں نے حدیث کی خوب نشر و اشاعت کی۔ دیوبند کے نامور علماء ان کے شاگرد ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کا ایک ذیل لکھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ حجاز کو ہجرت کر گئے۔

شاہ محمد اسحاق کے علاوہ خاندان عزیزی کے فیض یافتگان میں مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا مملوک علی نانوتوی بھی قابل ذکر ہیں۔ مفتی صدر الدین نامور عالم اور سرکار انگریزی کی طرف سے دہلی میں مفتی کے عہدے پر سرفراز تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں معتوب و مقید ہوئے اور مولانا مملوک علی، دہلی کالج کے صدر مدرس تھے جو اپنے استاد مولانا رشید الدین خاں کے انتقال ۱۲۴۹ھ کے بعد دہلی کالج میں شعبہ مشرقی کے صدر مدرس بنے۔ علم و فضل کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مدرسے کے علاوہ گھر پر بھی طلبہ کو درس دیتے تھے اور طلباء ان سے بہت مطمئن تھے۔ مولانا مملوک علی کی تصنیفات میں دو کتابیں تحریر اقلیدس اور تاریخ یمینی قابل ذکر ہیں۔ مولانا مملوک علی کے نامور شاگردوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ مشہور و معروف ہیں اور یہ تمام حضرات کسی نہ کسی طرح دار العلوم کی تاسیس و قیام و انتظام میں شریک و ممد رہے۔

مندرجہ بالا تمام علماء علم حدیث میں شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد ہیں۔ ان میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا احمد علی سہارنپوری کے علاوہ تمام علماء دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ تمام حضرات تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ مولانا محمد یعقوب پہلے اجمیر کالج میں اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے، مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمٰن ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی، اجمیر، بنارس اور بریلی کالج میں پروفیسر رہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد برصغیر پاک و ہند میں نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی برتری ختم ہوئی، بلکہ ان کے تعلیمی و علمی ادارے بھی تباہ و برباد ہو گئے۔ چونکہ برصغیر کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور وہی ان کے سیاسی حریف تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی انہی نے قیادت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ لہٰذا انتقام میں انگریزوں نے ان ہی کو سب سے زیادہ ہدف بنایا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد شاہ محمد اسحاق کے جانشین شاہ عبدالغنی مجددی اور حاجی امداد اللہ ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور ان کے فیض یافتگان نے دہلی کے ولی اللّٰہی تدریسی مرکز کو دوبارہ بحال ہوتے نہ دیکھا تو انہوں نے اس مقصد کے لیے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کو انتخاب کیا تاکہ وہاں ایک درسگاہ قائم کر کے اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کر سکیں اور ملک گیر پیمانے پر ان نظریات کو پھیلا سکیں۔

مولانا فضل الرحمٰن، مولانا ذوالفقار علی اور ایک صوفی بزرگ حاجی عابد حسین نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو دیوبند کی مشہور چھتہ والی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس تاریخی درس گاہ کا آغاز ہوا جس کی سرپرستی اور رہنمائی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی اور درحقیقت وہی اس مدرسے کے بانی تھے۔ اس درس گاہ کے سب سے پہلے طالب علم محمود (شیخ الہند محمود الحسن) اور پہلے استاد ملا محمود تھے۔ ——— جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حاجی عابد حسین تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے۔ ۱۹ محرم ۱۲۸۳ھ (۴ مئی ۱۸۶۶ء) کو ایک اشتہار کے ذریعے قیام مدرسہ کا اعلان کیا گیا۔ پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد اٹھتر ہو گئی جس میں بیرون ہند کے طلبہ بھی شامل تھے۔ طلبہ کے اضافے کے ساتھ مدرسین میں بھی اضافہ ہوا اور اس سے مدرسے کے مہتمم شاہ رفیع الدین مقرر ہوئے، جو شاہ عبدالغنی مجددی کے خلیفہ ارشد تھے اور صدر مدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی مقرر ہوگئے جو سرکاری ملازمت

سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انہوں نے صرف تین روپیہ ماہوار پر ملازمت قبول کر لی۔ اس درسگاہ کی شہرت دن بدن اندرون ملک بلکہ اس سے باہر بھی پھیلتی گئی اور طلبہ کی تعداد میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ چھتہ کی مسجد اس مدرسے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور مدرسہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں دیوبند کی جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا جس کے دالان اور حجرے طلبہ کی ضروریات کے لیے موزوں سمجھے گئے، مگر جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی۔ پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مدرسے کے لیے آبادی کے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت بنانے کی تجویز پیش کی اور ایک وسیع قطعہ اراضی خریدنے کے بعد ۲، ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء کو جمعہ کے دن موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی عابد حسین اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے علی الترتیب ایک ایک اینٹ رکھی۔ اس مدرسے نے یوماً فیوماً خوب ترقی کی، اہتمام و انتظام کے لحاظ سے دارالعلوم کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ۱۸۶۷ء تا ۱۸۹۵ء

(۲) ۱۸۹۶ء تا ۱۹۲۹ء

(۳) ۱۹۳۰ء تا حال

دوسرا دور اہتمام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے شمس العلماء حافظ محمد احمد کا ہے۔ ان کے طویل دور اہتمام میں مدرسے نے بہت ترقی کی اور ان ہی کے زمانے میں یہ درسگاہ مدرسے کے درجے سے دارالعلوم بنی۔ ان کے فرزند مولانا محمد طیب لکھتے ہیں۔

"مالی امدادیں بڑھیں۔ بڑی بڑی عمارتیں، دارالطلبہ قدیم دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تحتانی، مسجد دارالعلوم کتب خانہ دارالمشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا حاصل یہ کہ اس درسگاہ نے مدرسے سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اس زمانے میں اختیار کی۔"

موجودہ مہتمم مولانا محمد طیب کے زمانے میں دارالعلوم نے ان کے والد کے دور سے بھی زیادہ ترقی کی۔ آج دارالعلوم دیوبند ایشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم کا نظام جمہوری بنیادوں پر رکھا ہے۔ دارالعلوم کی سب سے بڑی با اختیار جماعت مجلس شوریٰ ہے دارالعلوم کا تمام نظم و نسق اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ماتحت ایک مجلس عاملہ ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے آٹھ اساسی اصول مقرر کیے ہیں۔ انہوں نے صادر و وارد اہل علم و عقل کے مشورے کو بھی قبول کرنے کی رائے دی۔ مولانا نانوتوی نے سرکار اور امرا کی شرکت کو بھی مدرسے کے لیے مضر بتایا ہے۔ اور عوام کے چندے پر زیادہ زور دیا ہے تاکہ یہ درسگاہ جمہوری و عوامی ادارہ ہے۔ اور حکومت کے تسلط و اثر سے بھی آزاد رہے۔

برصغیر پاک و ہند میں عربی مدارس میں درس نظامی مروج ہے۔ اس نصاب میں معقولات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مگر دارالعلوم دیوبند نے ولی اللہی نصاب کو اپنایا جس میں علوم منقول تفسیر و حدیث و فقہ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ علوم حدیث پر دارالعلوم دیوبند میں بہت کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم، مولانا یوسف بنوری، مولانا منظور احمد نعمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی کی تو ساری عمر ہی حدیث کی خدمت میں گزری۔ مولانا کشمیری نے جامع ترمذی کی شرح العرف الشذی، مولانا عثمانی نے صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم مولانا ظفر احمد تھانوی نے اعلاء السنن اور مولانا بنوری نے معارف السنن جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں یہ سارا کام عربی زبان میں ہوا ہے۔ اردو زبان میں مولانا بدر عالم کی ترجمان السنہ، مولانا منظور احمد نعمانی کی معارف الحدیث۔ مولانا فخر الدین کی ایضاح البخاری، احادیث کی مشہور و معروف کتب ہیں۔

قرآن کریم کے اردو تراجم و تفاسیر میں مولانا محمود الحسن کا ترجمہ قرآن

مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن اور مفتی محمد شفیع کی معارف القرآن بھی قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی نمایاں خصوصیت قرآن و حدیث کی خدمت ہے۔ حسب ضرورت علم معقول کی کتابیں بھی داخل نصاب ہیں۔ نصاب کی تکمیل کی مدت ۸ سال ہے۔ جس میں دو سال درجہ تکمیل کے ہیں۔ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو عصری تقاضوں کا پورا پورا احساس تھا انہوں نے یہ بھی رائے ظاہر کی کہ دارالعلوم میں انگریزی زبان اور سائنس وغیرہ کی بھی تعلیم دی جائے بلکہ مولانا نانوتوی نے خود بھی انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی جو پوری نہ ہو سکی۔ طلبا کو معاشی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے لیے دارالعلوم میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں مثلاً کتابت، جلد سازی، خیاطی، پارچہ بافی اور جفت سازی وغیرہ کا بھی اجرا کیا گیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوؤں کو ہر شعبہ حیات میں آگے بڑھایا۔ مسلمان ان سے پیچھے رہ گئے۔ گو اس سے پہلے مسلمان ہر شعبہ حیات میں ہندوؤں سے برتر اور ممتاز تھے۔ انگریزوں کی شہ پر ہندوؤں میں مذہبی و سماجی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ برہمو سماج اور آریہ سماج اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آریہ سماج نے غیر ہندوؤں کو ہندو مذہب میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ پادریوں نے انگریزی حکومت کے زیر سایہ عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ غرض مسلمانوں کے لیے نصرانیت اور آریہ دو بڑے فتنے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دہلی کے قیام کے زمانے (۱۸۶۱ء) میں جب یہ صورت حال دیکھی کہ پادری بازاروں، میلوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ وہ بھی اسی طرح کھڑے ہو کر بازاروں میں وعظ کیا کریں اور پادریوں کا رد کریں اور ایک روز خود بھی بغیر تعارف اور اظہار نام مجمع میں پہنچ گئے اور ایک پادری تارا چند سے مناظرہ کیا اور اس کو شکست دی۔ اس

زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی (دہلی) میں مقیم تھے۔

شاہجہان پور (یو۔ پی) کے قریب چاند پور میں وہاں کے زمیندار پیارے لال کبیر پنتھی کی سرپرستی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رابرٹ جارج گری کی اجازت و تائید سے مئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلہ خدا شناسی منعقد ہوا۔ جس میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تینوں مذاہب کے نمائندوں کو بذریعہ اشتہارات دعوت دی گئی کہ وہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں۔ مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الٰہی بخش رنگین بریلوی کی تحریک پر مولانا محمود الحسن، مولانا فخر الحسن اور مولوی رحیم اللہ بجنوری کے ہمراہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ابطال تثلیث و شرک اور اثبات توحید میں ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ موافق و مخالف مان گئے۔

دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں یہ میلہ پھر منعقد ہوا۔ اس مرتبہ بھی مولانا محمد قاسم نانوتوی پہنچے۔ اس مرتبہ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (ف ۱۸۸۳ء) اور اس علاقے کے مشہور لیڈر منشی اندرمن مراد آبادی بھی آئے عیسائی پادریوں اور دیانند سرسوتی نے بھی تقریریں کیں۔ مولانا محمد قاسم کی تقاریر بحث وجود توحید اور تحریف انجیل پر ہوئیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دونوں سال شریک ہو کر عیسائیوں اور ہندوؤں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔

مولانا محمد قاسم کے بعد دوسرے اکابر علماء نے عیسائیت اور آریہ سماج کا خاص طور سے رد کیا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد الیاس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انہوں نے میوات میں تبلیغ کا کام نہایت استقلال اور صبر سے انجام دیا اور اس علاقے کو اسلام سے روشناس کرایا۔

مولانا محمد الیاس بن مولوی محمد اسماعیل ۱۳۰۳ھ میں کاندھلہ میں پیدا ہوئے اپنے بھائی محمد یحییٰ (ف ۱۳۳۴ھ) اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سے تکمیل علم کی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید ہوئے۔ تبلیغ کا آغاز ان کے والد مولوی محمد اسماعیل کر چکے تھے۔ مولانا محمد الیاس نے اس کو باقاعدہ تحریک کی شکل دی اور اس کا مرکز درگاہ نظام الدین اولیاء دہلی کو بنایا۔ مولانا الیاس نے میواتیوں کو خاص طور سے تبلیغ کی اور ان کو پکا مسلمان بنایا۔ ورنہ وہ لوگ غیر اسلامی زندگی گزارتے تھے۔ انہوں نے

تبلیغ کے لیے عمومی رحمت کا پروگرام بنایا۔ تبلیغی گشت شروع کیے۔ کلمہ، نماز اور اسلام کے اصول و ارکان کی تبلیغ شروع کی۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک میوات کے علاقے سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلی۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں۔

"جس علاقے میں کوسوں مسجد نظر نہیں آتی تھی، وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں اور دیکھتے دیکھتے اس ملک (میوات) میں ہزاروں مسجدیں بن کر کھڑی ہو گئیں۔ صدہا مکتب اور متعدد عربی مدرسے قائم ہو گئے۔ حفاظ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز پہنچی۔ فارغ التحصیل علماء کی ایک خاصی بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔"

مولانا محمد الیاس کے انتقال (۱۳ر جولائی ۱۹۴۴ء) کے بعد ان کے جانشین ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف ہوئے۔ مولانا محمد یوسف ۱۹۱۷ء میں کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کی۔ مولانا محمد یوسف کے زمانے میں تبلیغ کی تحریک برصغیر پاک و ہند سے نکل کر بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی اور اس کے چرچے دنیا کے کونے کونے میں ہونے لگے اور مولانا محمد یوسف نے مختصر سی مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو میوات کے ان پڑھ مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے کی تحریک کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین الاقوامی تحریک بنا دیا۔ ۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو مولانا محمد یوسف کا انتقال ہوا۔ وہ ایک مبلغ کے علاوہ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے انداز پر پورے برصغیر پاک و ہند میں بہت سے مدارس جاری ہوئے۔ جن کی تفاصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ ان میں سے بعض خود مرکزی حیثیت کے حامل ہو گئے۔ ایسے مدارس میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم کراچی، مدرسہ عربیہ اسلامیہ (نیو ٹاؤن) کراچی، خیر المدارس ملتان، مدرسہ اشرفیہ لاہور، مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک خاص طور سے قابل ذکر ہیں بلکہ دارالعلوم کے زیر اثر مدارس برما، نیپال اور مکہ معظمہ میں قائم ہوئے۔ مکہ کی مشہور درسگاہ مدرسہ صولتیہ، دارالعلوم دیوبند کا SISTER INSTITUTION ہے۔ اس کے بانی مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی دیوبند کے اکابر میں تھے۔ مدینہ منورہ میں مدرسہ علوم شرعیہ قائم ہوا جو مولانا حسین احمد مدنی کے بھائی نے قائم کیا۔

مکہ اور مدینہ میں اس تحریک کے نامور علماء نے انفرادی حیثیت سے بھی درس و تبلیغ کے فرائض انجام دیے۔ اس طرح ان کے افکار و خیالات تمام دنیا کے مسلمانوں تک پہنچے۔ ان علماء میں شاہ عبدالغنی مجددی، حاجی امداد اللہ کے علاوہ، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولوی سراج احمد، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد عالم اور مولانا عبدالغفور عباسی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل علماء نے نہ صرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ و تذکیر اور افتاء و مناظرہ کے فرائض انجام دیے بلکہ صحافت و ادب کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی (ادبی دنیا لاہور) مولانا مظہر الدین (الامان وحدت دہلی) مولانا شائق احمد عثمانی (عصر جدید کلکتہ) مولانا حامد الانصاری (مدینہ بجنور) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (برہان دہلی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اثرات سے دینی اور مذہبی صحافت کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ خاص دارالعلوم دیوبند اور اس کے حلقے سے "القاسم" "الرشید" "المحمود" "الامداد" اور "ہادی" وغیرہ مؤقر ماہنامے جاری ہوئے۔ آج بھی دارالعلوم دیوبند سے دو ماہنامے "دارالعلوم" (اردو) اور "دعوت الحق" (عربی) شائع ہوتے ہیں۔ اس فہرست میں البلاغ (کراچی) الحق (اکوڑہ خٹک) بینات (کراچی) تعلیم القرآن (راولپنڈی) جامعہ (جھنگ) اور الرشید (ساہیوال) کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پرچے دینی صحافت کے قابل قدر آرگن ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں چونکہ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ لہٰذا یہ اردو کی نشر و اشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماء بنگال، برما، قبائلی علاقے، سرحد اور افغانستان وغیرہ میں اردو کو متعارف کراتے ہیں۔ ——

مرقعِ عقیدت

از حضرت مولانا قاری محمد عبد العزیز شوقی اسعدآبادی رحمۃ اللہ علیہ بخدمت عالی جناب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم زید مجدہم

اے حکیم عالم اسلام ! اے شیخ جلیل ۔۔۔ ذوقِ علم و فن کی رونق ہے تیرا ذکر جمیل

اے خطیبِ ملک ! اے ملت کے سحبانِ کبیر ۔۔۔ حُسنِ رازیؒ و غزالیؒ زینتِ ابنِ کثیرؒ

اے مجاہد، اے زعیمِ قوم، دانائے عظیم! ۔۔۔ زیب دیتا ہے۔ اگر تجھ کو کہیں فخرِ کلیم

اے علومِ قاسمی کے شارعِ شیریں اَدا ۔۔۔ نُدرتِ انشا تری کلکِ اَزل کی ہم نوا

اے سریر آرائے بزمِ مرشد، اے قطبِ زماں ۔۔۔ تیرے فیضِ خاص سے سیراب ہے سارا جہاں

ثانیٔ قاسمؒ ہے، احمدؒ کا جگر پارہ ہے تو ۔۔۔ ہاں رشیدؒ و اشرفؒ و محمودؒ کا پیارا ہے تو

تو صلاح و خیر کی اقلیم کا ہے تاجدار ۔۔۔ شوکتِ تقوائے تری ہر ہر اَدا سے آشکار

تو نے رکھا پرچمِ اسلاف دُنیا میں بلند ۔۔۔ تجھ پہ نازاں کیوں نہ ہو دارالعلوم دیوبند

تیرے اخلاقِ کریمانہ کا ہر خاطر اسیر ۔۔۔ نورِ باطن سے ترے ہر ذرّۂ دل مستنیر

نطق کو تیرے میسر قوتِ روح الامیں ۔۔۔ فکر تیرا لامکانی سطوتوں کا ہے مکیں

صورتِ طیب تری آوازۂ طوبیٰ نصیب ۔۔۔ سیرتِ اکمل میں ہے اسلاف کا رنگِ عجیب

تیری ایمانی فراست روکشِ اعجاز ہے ۔۔۔ تیری آنکھوں میں خداوالوں کا ہر انداز ہے

علم تیرا بے نظیر، اعمال تیرے بے مثال

شوقیٔ ناکارہ کو تعریف کی ہے کب مجال

بشکریہ قاری حبیب الرحمٰن صاحب
تلمیذ رشید حضرت شوقی صاحب

اکابر دیوبند کی یاد میں

مشرف علی تھانوی
خطیب
جامع مسجد
واپڈا کالونی
اپر مال لاہور

بھول کر بھی نہ آئیں گے یہ لوگ — جا کے واپس نہ آئیں گے یہ لوگ

سرمدی ہو گیا ہے ان کا سفر — اب کہاں پائے جائیں گے یہ لوگ

اپنے حق میں وسیع و بے پایاں — رحمت حق کو پائیں گے یہ لوگ

اب تو فردوس خلد میں جا کر — اپنی محفل سجائیں گے یہ لوگ

بے حجابانہ ہوگا نظارہ — جلوہ حق کو پائیں گے یہ لوگ

کون ملک عدم سے داعی سنے — کس کی مجلس میں جائیں گے یہ لوگ

بستیاں کر کے چل دیے ویراں — اپنی دنیا بسائیں گے یہ لوگ

ایک ہی راہ کے تو سالک تھے — ایک منزل پہ جائیں گے یہ لوگ

جا رہے ہیں جو آج کر کے حجاب — چھپ کے پھر دل میں آئیں گے یہ لوگ

کون پھر اس نظر میں جچتا ہے — جس نظر میں سمائیں گے یہ لوگ

ہم انہیں آج تک نہیں بھولے — کیا ہمیں بھول جائیں گے یہ لوگ؟

دل کی گہرائیوں میں بستے ہیں — کیوں نہ پھر یاد آئیں گے یہ لوگ

جتنی مدت گزرتی جائے گی — اور بھی یاد آئیں گے یہ لوگ

ہم بھلا بھول جائیں کیسے انہیں — جب نہ ہم کو بھلائیں گے یہ لوگ

محفل لامکاں میں اے عارف
ہم کو کس دن بلائیں گے یہ لوگ

نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از حضرت مولانا محمد اسعد اللہ اسعد استاذ مظاہر العلوم سہارنپور

مجھے کیا علم کیا تم ہو، خدا جانے کہ کیا تم ہو
بس اتنا جانتا ہوں محترم بعد از خدا تم ہو

کسی کی آرزو کچھ ہو! کسی کا مدعا کچھ ہو
ہماری آرزو تم ہو، ہمارا مدعا تم ہو

زمانہ جانتا ہے صاحب لولاکما تم ہو
جہاں کی ابتداء تم ہو جہاں کی انتہا تم ہو

نہ یہ قدرت زباں میں ہے نہ یہ طاقت بیاں میں ہے
خدا جانے تو جانے! کوئی کیا جانے کہ کیا تم ہو

رسالت کو شرف ہے ذات اقدس کے تعلق سے
نبوت ناز کرتی ہے کہ ختم الانبیاء تم ہو

کہاں ممکن تمہاری نعت حضرت مختصر یہ ہے
دو عالم مل کے جو کچھ بھی کہیں اس سے سوا تم ہو

گروہ رازداں "نظم فطرت" پر نہیں مخفی
یہ سب ہنگامۂ دنیا خبر ہے، مبتدا تم ہو

نہیں شرمندۂ اظہار، اوصاف گرامی قدر
بتاؤں کیا کہ کیا تم ہو، سناؤں کیا کہ کیا تم ہو

فصاحت کو تحیر ہے، بلاغت کو پریشانی
کہ لفظوں سے بہت بالا جناب مصطفےٰ تم ہو

گناہگاران امت کا سہارا ذات والا ہے
خوشا قسمت کہ حضرت شافع روز جزا تم ہو

یہ ربط باہمی امت کو وجہ صد تفاخر ہے
تمہارا ہے خدا محبوب! محبوب خدا تم ہو

تمہارے واسطے اسعد کہیں بہتر ہے شاہی سے
کہ اک ادنیٰ غلام بارگاہِ مصطفےٰ تم ہو

حضرة احسان دانش

اکابرِ دیوبند

جہانِ دانش جلد دوم (زیرِ طبع)

جب میں دیوبند ایک مشاعرے میں گیا. تو میرا قیام مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کے یہاں ہوا مولانا ازہر شاہ قیصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں نثر اور نظم پر دسترس ہے. اور دارالعلوم کے رسالہ "دارالعلوم" کو مرتب کرتے ہیں. اس سے ان کے قلم کی جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے. بحیثیت انسان نہایت خوش خلق، حلیم، محنتی اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں. ان سے میرے تعلقات آج تک اسی ایک انداز پر چلے آرہے ہیں. وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی حضرت سید انور شاہ صاحب کی طرح اپنا مقام پیدا کر لیں گے. خدا انہیں اس دور کے فتنوں اور مصائب سے محفوظ رکھے. آمین

میں گے ہاتھ ان کے والد مولانا سید انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کا ذکر بھی کرتا چلوں. تو مناسب ہوگا.

مولانا سید انور شاہ کشمیری:

موصوف دارالعلوم دیوبند میں صدر المدرسین تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگرد. وہ ذہن اور حافظے کے اعتبار سے ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھے. حضرت شیخ الہندؒ جہاں مناظرے کو جاتے حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ہمراہ ہوتے. اس وقت دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں قریب قریب ڈیڑھ لاکھ کتب تھیں. اور مولانا موصوف کے ذہن میں وہ اس طرح تھیں جیسے آئینے میں عکس اگر کبھی ایسا موقع آتا شیخ الہندؒ کے ساتھ مولانا انور شاہ صاحب نہ ہوتے تو شیخ الہندؒ فرماتے کہ آج میرا کتب خانہ میرے ساتھ نہیں حوالوں کے لئے دقت پیش آئے گی. کیونکہ جب مناظرے میں کتاب کے حوالے کی ضرورت پڑتی کتاب کا نام صفحے کا نمبر اور مصنف کی نشان دہی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا کام تھا.

ویسے بھی انہیں تمام علوم معقولات و منقولات میں دستگاہ تھی شاید یہی سبب تھا کہ آپ کے دور کا درسِ حدیث یادگار درس حدیث کہا جاتا ہے جو بیان و عرفان کے علاوہ ابلاغ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے. آپ نے اپنی خداداد ذہانت اور حافظے کے کمال سے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا رکھا تھا اور آپ کے درس نے اسلامی دنیا میں باہر کے فتنوں کے راستے بند کر رکھے تھے. اس گئے گذرے زمانے میں بھی جو علما علمی اور تعلیمی مسندیں لئے بیٹھے ہیں وہ زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ سے نظر آتے ہیں. مولانا انور شاہ صاحب کو ردِ قادیانیت میں شغف تھا. وہ اس تحریک کو اعظم الفتن کہتے تھے. اس سلسلے میں ان کی کتنی معرکۃ الآرا کتابیں بھی ہیں اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق تصنیف و تالیف میں ردِ قادیانیت پر اصرار کیا ہے. مولانا کے سامنے جب کوئی ردِ قادیانیت پر کوئی تحریر لاتا تو آپ سنتے اور اصلاح

فرماتے۔ اور اس کے ساتھ دعائیں بھی دیتے۔ آپ نے گیارہ بارہ سال دارالعلوم دیوبند میں درس دیا۔ اور آپ کے دورِ صدر مدرسی میں آٹھ نو سو طلباء نے علم حدیث پڑھا۔ اور اس فن کو تقریر و تحریر سے دور دور تک پہنچا دیا۔

ان کے دریائے فیض سے علامہ اقبال بھی فیضیاب ہوئے اور میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے انہیں کے خطوط پر تبلیغ دین کی ہے۔ کیونکہ حقیقت خواہ کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہو۔ پُر خلوص نگاہیں اور بھرپور تجسس کے علاوہ تحریر دگداز سے مالا مال دل اُسے پہچان لیتے ہیں۔ اور جب تک وہ اپنی لگن میں کامیاب نہیں ہوتے بے اطمینانی کا شکار رہتے ہیں عموماً ایسے لوگوں کی نیکی، خلوص، سخاوت اور محبت ہی سرمایہ انہیں لوگوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے وجدان کی روشنی خود بخود آدمی کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ اور عشق خود جنون کی طرف مڑ جاتا ہے۔

مولانا انظر شاہ کشمیری:

یہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نہایت ذہین اور فطین نوجوان زہد و اتقا کے معاملے میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بقدم چل رہے ہیں خدا انہیں علم کی دولت سے مالا مال کرے۔ اور کامیاب زندگی عطا فرمائے۔ میں اپنے تیاقہ کی رو سے ان میں بلندیاں دیکھ رہا ہوں خدا کرے وہ ایسے ہی نکلیں۔ جو میرا قیاس ہے۔ آمین

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ:

حضرت نانوتویؒ دارالعلوم کے بانی تھے۔ اور جماعت کی حیثیت سے اس گروہ کے سربراہ جن کی کوششوں اور محنتوں سے ملت میں ایسے ایسے جید علماء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے علوم القرآن اور تفہیم حدیث پر دن رات محنت کر کے فقہ، حدیث، تفسیر اور روایت سے خدا پرستی اخلاق اور اصلاح کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی امور کے قائد تیار کئے۔

عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کر کے دین حق کے راستے سے کانٹے صاف کئے اور راہروانِ حق کے لئے پگڈنڈیاں نکالیں۔ اصولِ اسلامیہ اور اساسی عقائد کو عقلی دلائل سے صاف اور مستحکم کر کے تبلیغ و اشاعت کی چار دیواری کو بلندی اور وسعت دی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شاملی کے مقام پر جو جنگ ہوئی اس میں سپاہیانہ حیثیت سے حصہ لیا۔ معاشرے سے غلط رسوم و رواج سے پھیلی ہوئی ابتری کو ختم کیا۔ جس کی تفصیل سوانح قاسمی میں درج ہے۔

آپ سے ہزاروں انسانوں نے دینی مسائل اور تصوف کے رموز و غور کا عرفان پایا۔ تصنیف و تالیف میں بھی کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ:

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے سینکڑوں ہزاروں تشنگانِ علم نے استفادہ کیا۔ آپ کو علم فقہ، حدیث اور تصوف سے شغف تھا۔ اس راہ کے مسافروں کو انہوں نے راہ راست پر لا کر ایک اسلامی خدمت انجام دی ہے بلکہ آپ سے اس دور کے علماء نے بھی تربیت پائی ہے۔ اور انہیں دین کے معاملے میں اس قدر راسخ العقیدہ کر دیا کہ ان پر زمانے کی نقشہ پردازی کا کوئی اثر نہ ہوا گویا کفر و الحاد کے راستے بند کر دئے گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب میں آپؒ نے حضرت نانوتوی کے دوش بدوش کام کیا اور نو ماہ اسیر فرنگ بھی رہے مگر ان کا انقلابی تصور ایک ایسا شعلہ تھا جو بجھنے کی بجائے مشتعل ہوتا چلا گیا بالآخر ان کا مشن کامیاب ہوا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ

موصوف معروف عالم دین، فقیہ، محدث اور عارف باللہ تھے جہاں تک دین کا تعلق ہے مولانا ہر شعبہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ نے چودہ

برس کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں قرآن وحدیث کا درس دیا۔ اور آپ کے تلامذہ ہندوستان میں تبلیغ کرتے رہے۔ خود مولانا تھانویؒ نے بھی ہندوستان کے کونے کونے پھر کر اپنے مواعظ سے دنیا کو مستفید کیا۔ اور جہاں تک تصنیف وتالیف کا تعلق ہے آپؒ نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ تصانیف وتالیفات چھوڑیں۔ جو مختلف علوم وفنون پر ہیں۔ آخر میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہوگئے اور وہیں سے رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ہزاروں آدمی ان سے بیعت ہوئے۔

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے مستفید تھے آپ کے خلفاء ملک بھر میں اپنی اپنی جگہ اصلاح وتربیت میں مشغول رہے اور ہیں۔

آپ تفسیری مسائل اور مسائل حدیث کے بعض رموز وغوامض میں حضرت نانوتویؒ ہی سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت کا لقب آپ ہی کی ذات بابرکات کو زیب دیتا ہے۔ آپ کی تبلیغ و تلقین اور تصنیفات تالیفات سے ہزاروں بندگان خدا کو نیکی کا راستہ ملا۔ اور باطن میں اُجالے ہوئے۔ آپ جب حصول علم کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اُسی سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوگیا۔ اور موصوف حسب دلخواہ استفادہ نہیں کرسکے۔ مگر حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ۔ مثلاً مولانا محمد یعقوبؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبدالعلی سے کسب کمال کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب دیوبندی

آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے حضرت کے بعد قاسمی علوم کی تبلیغ وتوسیع آپ ہی کی ذات سے ہوئی۔ درس وتدریس کے علاوہ ارشاد وتلقین اور جہاد کی تبلیغ کا بے مثال کام آپ نے کیا اور نانوتویؒ علوم کو امانت خیال کرتے تھے اس لئے زندگی بھر اسی کی توسیع واشاعت اور تفہیم ووضاحت میں لگے رہے۔ حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کی اعلیٰ طباعت میں بھی آپ ہی کی سعی قابل تحسین ہے۔ حضرت نانوتویؒ کی تصانیف بھی انہی کے فکر کا نتیجہ ہیں حجۃ الاسلام کو آپ ہی نے عنوانات دیئے۔ اور قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا۔ بخاری شریف کے ابواب وتراجم پر ایک جامع رسالہ لکھا اس کے علاوہ متعدد مناظرانہ رسالے تصنیف کئے جن سے مسلمانوں کو دین پر قائم رہنے میں بڑی مدد ملی۔ آپ نے دیوبند میں چالیس سال درس حدیث دیا۔ اور وہیں درس دے کر آٹھ سو سا بڑا اعلیٰ استعداد کے صاحبان علم وفن اور علمائے دین، رشد وہدایت سے مسلح کر کے اطراف وجوانب میں پھیلا دیئے اور خود بھی مناظرے کر کر کے لوگوں کو گمراہی سے بچایا۔

آپ کو علماء مصر نے محدث عصر تسلیم کیا۔ اور آپ نے بیعت وارشاد سے ہزاروں تشنگان معرفت وطریقت کو عارف باللہ کر دیا اور یہ سلسلہ ہندوستان سے لیکر افغانستان اور عرب تک پھیلا ہوا تھا۔

ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے آپ نے تحریک چلائی۔ جیسے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے ادا کیا گیا اگرچہ یہ تحریک راز نہ رہ سکی اور اس میں کام کرنے والے مجاہدوں سے ہندوستان کی جیلیں بھردی گئیں۔ لیکن جن کے سینوں میں یہ شعلے بھڑکے ہوئے تھے انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرا کے چھوڑا۔ موصوف پانچ سال مالٹا میں اسیر رہے۔ مگر وہاں بھی زبان، قلم تبلیغ وتحریر سے باز نہ رہے اور آپ نے کئی ایک تصانیف چھوڑیں۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

موصوف سکھ مذہب سے دائرہ اسلام میں آئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ دیوبند سے فضیلت کے بعد جمعیت الانصار دیوبند کے ناظم بھی رہے۔ ذکاوت وذہانت اور بلا کا حافظہ پایا تھا۔ دماغ فطری طور پر سیاسی تھا۔ یورپ اور ایشیا کے کئی انقلاب مشاہدے کئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سیاسی حال کی ساخت وپرداخت اور اصول وضوابط متعین کرنے میں

خاص ملکہ تھا۔ شاید یوں ہی وہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں بھی پیش پیش
تھے اور اسی جرم وفا میں ۲۵ سال جلا وطن رہے، اور اسی دوران میں افغانستان کی
آزادی کی سکیم مکمل کر لی۔

جلا وطنی کے دوران وہ روس چلے گئے۔ یا بھیج دیا گیا تھا۔ واپس آئے تو
مولانا ظفر علی مرحوم کے ایما پر کشمیر بلڈنگ میں اخبار کے دفتر میں تقریباً دو سو معززین
کو مولانا کے اعزاز میں چائے دی گئی اور وہیں علامہ اقبالؒ پر دو مقالے بھی پڑھے
گئے اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے تقریر بھی کی لیکن آج تک وہ تقریر کسی اخبار یا
رسالے میں یا مقرر و سامع نے دہرائی نہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ علامہ اقبالؒ کی دو
نظموں کے متعلق انہوں نے کچھ کہا تھا جن میں ایک تو "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو
جگا دو" اور ایک اسی قسم کی کوئی دوسری تھی۔

یہ مولانا ہی کا دم تھا کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفے
کو روشناس کرایا، سندھ ساگر اکیڈمی اور محمد ہاشم ولی اللّٰہی سوسائٹی قائم کی اور ان
اداروں نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت نانوتویؒ کی تعلیم کو ملک کے عوام تک
پہنچایا۔ میرے خیال میں پیغمبرؐ کے بعد ایسے ہی علماء کی ضرورت تھی جو بندگانِ خدا کو
عقائد اور اعمال صالح سے خبردار رکھتے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے زندگی بھر شعار
رسولؐ اور سیاست کاملہ کی تبلیغ کی ہے۔ انہوں نے قید و بند کی صورت میں بھی اخلاق
حسنہ سے زبان کو بغاوت نہیں کرنے دی۔ وہ ذلت و خواری کے اندھیروں میں
اعمال کی روشنیاں لئے پھرتے رہے اور روحانی تجلیوں سے اپنی شمعوں کے
دونوں سروں کو روشن رکھا۔ انہوں نے ہر آدمی کے کان تک یہ پیغام پہنچایا کہ محمد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی اطاعت خداوند تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اور یہی بات حقیقت
معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ پیغمبرؐ کے بعد علماء میں سے خاص خاص عالموں کو مخلوق کی
ہدایت کے لئے متعین فرماتا ہے۔ اور وہ اللہ جل شانہٗ کے احکام و رضا سے دنیا
کو باخبر کرتے رہتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ مسلمان آج تک مادیات کے سامنے
سربسجود نہیں ہوتے۔

اپنی جگہ محبت بھی یہ کمی محبت ناتمام ہے۔ اگر وہ بلوغ و ابلاغ کے بلند
منزلوں تک رسائی نہیں ہوتی اور مادہ پرست حق کے راستوں کی دھوپ اور
خار زاروں کو دیکھ کر پیراندازہ نظر آتے ہیں وہ اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ
خدمت خلق اور تلاش حق ایسے میوے ہیں کہ جو چکھنے میں کڑوے اور چبانے میں
میٹھے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلّمہ ہے کہ مشکلات و شدائد کے پل سے گذر کر
ہی عقبیٰ کے مرغزار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس پل پر کہیں لاشیں اور کہیں اپنی
کے نقش قدم بھی نظر آتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری:

آپ صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں اور حضرت مولانا محمد انور شاہ
صاحبؒ کے ان شاگردوں میں سے ہیں جنہیں حضرت شاہ صاحب کے علوم
وفیوض کا امین کہا جا سکتا ہے۔ ان کا علم امانت تک ہی نہیں رہا بلکہ انہوں نے
صحیح معنی میں شاہ صاحبؒ کے علم دین کی تبلیغ و اشاعت کی ہے۔ جہاں علمی اور
ادبی دنیا میں ان کا ایک خاص مقام ہے وہیں عربی و فارسی زبان و محاورے
پر اعلیٰ درجے کا عبور ہے۔ عربی، فارسی زبان کو مادری زبان کی طرح روانی اور
برجستگی سے بولتے اور پڑھاتے ہیں۔ تقریر ہو یا تحریر تدریس ہو یا انشاپردازی
آپ کے لئے کوئی راستہ محدود نہیں۔ آپ نے عراق، شام، بیروت، حجاز اور
مصر وغیرہ کے سفر بھی کئے۔ مصر میں علماء دیوبند کا تعارف سب سے پہلے آپ
ہی نے کرایا تھا۔ اور وہاں کے جرائد میں مضامین لکھ کر اور مختلف مقامات پر
تقریر کر کے اہلِ مصر پر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان میں بھی علم و ادب اور فکر و
انشاء کے اساتذہ موجود ہیں۔

جب مصر میں علامہ طنطاوی سے ان کی گفتگو ہوئی اور تنقید و تبصرے تک
بات پہنچی تو مصنف "تفسیر طنطاوی" نے کئی مقامات پر ان کے علم کا اعتراف کیا
اور استاد کے لقب سے یاد کیا۔

کراچی میں جب آپ پہنچے تو آپ نے اپنے اسلاف کے نقش قدم
پر نیو ٹاؤن میں بے سروسامانی کے ساتھ تعلیم دینا شروع کیا۔ اور صبر و قناعت و قیام

سکے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ نا قوں کے مرحلوں سے گذرے اور تقسیم ملک میں کشش سے رشتہ توڑنا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ دارالعلوم کسی اور کی امانت ہے۔ جس میں پندرہ بیس دیگر اساتذہ بھی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں آپ متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی ہیں۔ اور ان میں ترمذی شریف کی شرح اپنے معیار کے اعتبار سے اور طرز ادا کے لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے۔ خدا ان کے دینی عزائم اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

یہ حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے فرزند رشید ہیں۔ دیوبند سے دستار فضیلت ملی۔ اور حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ فضیلت کے بعد درس و تدریس کے سلسلے میں لگ گئے۔ اور پھر دارالافتاء میں اپنے والد بزرگوار سے تربیت لے کر افتاء نویسی میں مہارت حاصل کر لی پھر وہیں دارالافتاء میں نائب مفتی کے منصب پر فائز ہو گئے۔ ایک مدت ڈابھیل میں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کی معیت میں تدریس کی اس کے بعد عرصہ تک کلکتے میں قیام کیا اور وہاں بھی دینی تعلیم دیتے رہے پھر دہلی میں آ کر ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ جو وقت اور موقع کے اعتبار سے بہترین ادارہ ہے۔ اس میں آئے دن اعلیٰ قسم کے علماء اور اہلِ قلم کی معیاری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اور آج تک اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مختلف دینی اداروں کے ممبر اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں۔ اور آزادئ ہند کی تحریک کے جانباز سپاہیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ میں بھی بیسوں بار انکی صحبت بابرکت سے فیضیاب ہوا ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی معیت میں ان کے یہاں کی ایک نشست مجھے اب تک یاد ہے۔ مفتی صاحب نہایت خلیق اور معاملہ فہم انسان واقع ہوئے ہیں۔ غالباً یہی وصف تھا کہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے دست راست تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے وصال کے بعد سے وہ جمعیۃ العلماء ہند کے صدر عامل کے عہدے پر ہیں۔ تقریر و تحریر میں زبان و قلم نہایت مؤثر پایا ہے۔ بیرونی ممالک سے آمد و رفت اور خصوصاً روس کے سفر نے تو ان میں عوام کی بہبود کے سیکڑوں راستے کھول دیئے ہیں صرف کو بجا طور پر دارالعلوم کا ممتاز فاضل کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ندوۃ المصنفین قائم کر کے اکثر ایسی کتابیں شائع کی ہیں جنہیں وقت کی آواز اور موقع کی ضرورت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے نکلتے ہوئے شاگردوں میں سے تھے۔ نہایت طباع، ذہین، اور نوکی قسم کے فاضل اور اعلیٰ درجے کے مصنفین میں سے تھے میں دہلی جا کر جب بھی برہان کے دفتر گیا ہوں تو مولانا سے ملاقات ہوئی اور مولانا اس طرح ملے جیسے برسوں کے ترسے ہوئے ملتے ہیں وہ ابتداء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے۔ اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ پھر دارالعلوم نے مدراس بھیج دیا۔ اور وہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں معلم کی حیثیت سے رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اعلیٰ درجے کے مقرر اور خطیب ہونے کے علاوہ جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ بھی تھے۔ اور کانگریس میں صف اول کے سیاستدان تسلیم کئے جاتے تھے۔ اسی سلسلے میں انہیں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں انہوں نے سینکڑوں انسانوں کو موت کے منہ سے نکالا اس وقت پارلیمنٹ کے ایک جری اور بے لوث ممبر تھے۔ اُن کی خدمت سے جو فرقہ پرست آگاہ تھے وہ سب اُن کا لوہا مانتے تھے۔ ہندوستان کی گورنمنٹ انہیں ایماندار اور پبلک معتبر سمجھتی تھی۔ وہ ایک جامع کمالات اور مؤثر شخصیت کے انسان تھے۔ یہی سبب تھا کہ تمام علمی، دینی اور سیاسی حلقوں،

میں اُن کا اثر تھا۔ دیوبند سے دستار فضیلت حاصل کئے ہوئے انہیں ایک زمانہ ہوچکا تھا۔ مگر وہ عمر بھر مجلس شوریٰ کے رکن اور خاص خاص مشوروں میں شریک رہے۔

خدا مغفرت کرے عجیب شخصیت تھی اُن کی

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کی انسانی عظمت اور بلندی کی بنیاد اعتماد نفس اور عزت نفس پر تھی۔ ایسے لوگوں کی زینت و آرائش قدرت خود اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے کرتی ہے۔ اور اظہار صداقت کے ساتھ جرأت بیان اور افسون زبان سے نواز کر اپنے پیغامات کی توضیح و حصول کا شعور عطا کرتی ہے۔ اور اس قسم کے لوگ قدرت کی نشان دہی سے وعدۂ موعودیت کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کو نظر انداز کرکے اپنی حق رسی کو پس پشت ڈال کر مستحق لوگوں کے حقوق دلوانے میں زیادہ جھک رہتے۔ اور اطمینان محسوس کرتے ہیں ان کا یہی اطمینان کچھ روز کے بعد ان کے لئے ابدی طمانیت ہوجاتا ہے۔

اس طبقے کے تمام افراد دنیاوی مفادات اور ذاتی اعزازات کے مقابلے میں ترویج صداقت اور خدمت خلق کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جو خود کو نظرانداز کردیتا ہے۔ اس کے اجر و انعام کی ذمہ داری قدرت پر آجاتی ہے۔ انہیں حیات بعد الممات کی عظمتوں کا اعتراف شکوہ و شکایت تک نہیں آنے دیتا۔ وہ ہر مشکل پر خاموش اور ہر مصیبت پر شکر کے عادی ہوجاتے ہیں۔ اور یہ ایسی لذت ہے جو بڑے سے بڑے نشے اور حسین سے حسین خد و خال میں بھی نہیں ملتی۔ ان کی آنکھوں کے آنسو تو خشک نہیں ہوتے۔ مگر ہونٹوں کا تبسم بھی نہیں مرجھاتا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحبؒ دیوبند کے معتمد علیہ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ صاحب کے خاص شاگرد تھے۔ مولانا محمد ادریس کا حدیث، فقہ اور تفسیر میں ایک خاص مقام ہے۔ جو بہت کم علماء کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ نے بلا کا حافظہ پایا تھا یوں سمجھئے کہ علوم و کتب کا استحضار تام ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ بلند و برتر مقام تدریس میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ فضیلت سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں درس و تدریس سے منسلک رہے اور بالآخر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے۔ کتب تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتب حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر و بیشتر انہیں کے درس میں رہتی تھی۔ میرے ہم وطن تھے اس لئے گاہے گاہے ان سے ملتا رہتا تھا۔ میرے خیال میں مولانا محمد ادریس کا اتقاء بہت کم علماء میں ملے گا اتباع سنت کا شغف اپنی حد سے متجاوز تھا۔ اور عظمت سلف کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علوم شرعیہ کی نشر و اشاعت اور رد مذاہب باطلہ پر توجہ مرکوز رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ جن میں انہوں نے محققانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان کتب کا مطالعہ قاری کو ایسا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ جو ہر مصنف کی کتاب سے نہیں ملتا۔ ان کی کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کی شرح "التعلیق الصبیح" پانچ جلدوں میں ہے۔ جو ان کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے ممالک اسلامیہ کے سفر بھی کئے۔ اور بیروت جاکر اپنی کتاب شرح مشکوٰۃ کو طبع کرایا۔ اس کے علاوہ سیرت المصطفیٰ کے نام سے ایک محققانہ سیرت کئی جلدوں میں لکھی ہے۔ جس میں آزاد خیال مصنفین پر آزادی سے تنقید بھی کی ہے۔ میرے خیال میں ان کا یہ شاہکار سیرت کی کئی کتب پر بھاری ہے اس کے مطالعہ سے کئی شکوک و شبہات بھی دور ہوجاتے ہیں۔

شاعری کاندھلے کے لوگوں کا حصہ ہے۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس صاحب بھی عربی اور فارسی میں بلا تکلف شعر کہتے تھے۔ پاکستان بننے پر آپ نے پاکستانی سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور یہ اس ملک کی خوش نصیبی تھی کہ یہاں ایسا عالم بے بدل آکر آباد ہوگیا تھا۔ ایک مدت جامعہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ ہر جمعہ کو نیلا گنبد والی مسجد میں وعظ فرماتے رہے۔ اور سینکڑوں تشنگان علم دور دراز سے آکر مستفید ہوتے۔ مولانا کی حق شناسی انہیں حق گوئی سے نہیں روکتی تھی اس لئے وہ حکیمانہ انداز سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل سمجھا

جاتے تھے۔ میں ان سے قریب ہونے کے باوصف ان سے گھبراتا تھا کیونکہ ان کی خشیت اور تقویٰ دونوں آنکھ نہیں اٹھانے دیتے تھے ان کی حق گوئی اور حق نگاری میں کے الفاظ کو کندن کی جھنکار دے رہی تھی۔ ان کے فکر کی بلندی اور گفتگو کی ملائمت مروجہ دانش شیرینی سے دلوں کو متاثر کرتی چلی جاتی تھی ان کی سیدھی سادی زبان کا لہجہ صداقت میں شرابور اور فقروں کے تاثراتی رستہ سلسلہ سارے سے پھٹے دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ معاشرے کی کجروی کو درد و کرب سے بیان کرتے تو ان کا آہنگ مرثیہ کا پیرہن اختیار کر لیتا جس سے ان کا ہر سانس دلوں کے بند دروازوں پر دستک دیتا محسوس ہوتا تھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور علم منقول و معقول سے مالا مال تھے علم کلام اور فلسفے کے علاوہ منطق اور دیگر علوم عقلیہ سے بھی بہرہ ور تھے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کے بل پر حکمت قاسمیہ کے شارح ہونے کی فضیلت میں شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز رہے۔ بلکہ انداز سے مسلم کی شرح کی جو اہلِ علم میں ناقابلِ فراموش کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے تفسیری فوائد کو ترجمے کے ساتھ شروع کیا تھا جس کی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تکمیل کی۔ بے مثال خطیب اور بے بدل مبلغ تھے۔

تبلیغ اور خطابت میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم کو شرح و بسط سے بیان فرماتے تھے۔ سیاسی شعور بلند اور قوت فیصلہ نہایت معتبر پائی تھی ملکی معاملات کے اتار چڑھاؤ ان کی نظر میں رہتے۔ کیونکہ حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال، میں بھی سرگرم کارکن تھے یہی سبب تھا کہ سیاست کے معاملات میں جچی تلی رائے رکھتے تھے جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ اور آخر میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے دیوبند میں مدرس اور مسجد فتح پوری دہلی میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ اور پھر اسی دارالعلوم میں صدر مدرس ہو کر خدمات انجام دیں۔

آزادی ملک کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ اور پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے۔ اسلامی قانون کے نفاذ میں سعی بلیغ کی اور قرار داد مقاصد پاس کرائی پاکستان انہیں بالاتفاق شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔

ایک سفر کے دوران میں بہاولپور کے مقام پر وفات پائی اور کراچی میں مدفون ہوئے عرصہ تک عوام و خواص ان کا سوگ مناتے رہے۔ اور آج تک ان کے خلوص کے نقوش تابندہ ہیں مجھے ان کی کئی مجلسوں میں شریک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ میرے اشعار کو پسند فرماتے اور دعائیں دیتے تھے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے آمین ثم آمین۔

مولانا شبیر احمد جیسے عالم روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کانگرس میں سے مسلم لیگ میں آئے تھے لیکن یہ تو انہی اپنی بصیرت ہے دنیا میں ہر انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور بمقدار ذوق ہر شخص کی منزل و رستہ اور طریق جستجو جدا ہے۔ اور اسی طرح تمام کائنات میں یہ فطرت کے نمائندے اور قدرت کے مبلغین پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کو بھی سرچشمہ حیات کی تلاش ہے۔ وہ اسی کا شارح اور ترجمان بھی ہے۔ اور اسی شعبے کی مخلوق بھی لت میسر آجاتی ہے۔

ایسے لوگوں کے ہاں اعترافِ علم و کمال بھی ہوتا ہے۔ اور عجز و انکساری بھی کیونکہ اپنے سے عظیم قوت کے آگے جھکنا۔ احترام کرنا۔ اور عقیدت مند ہو جانا ایک فطری جذبہ ہے جس کا مرکزی نقطہ حق بینی اور حق پسندی ہے۔ ہر چند کہ اس کے اعتراف و احترام کے نام جدا جدا ہیں لیکن ان تمام صورتوں کے پیچھے وہی ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے جسے ہم کہیں دروں بینی کا نام دیتے ہیں کہیں حق پسندی کا لقب مگر بات ایک ہی ہے۔ اور نقطہ نظر وہی ذاتِ واحد اور اس کی تحقیق ہوتی ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

مولانا موصوف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز اور حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ صاحب کے عظیم تلامذہ میں سے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ ذہانت اور تخلیقی دماغ پایا تھا۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد محترم کے ساتھ مدینہ طیبہ چلے گئے۔ اور اٹھارہ برس وہیں علم حدیث اور دیگر

علوم وفنون پڑھائے۔ اس مدت میں جو زندگی بسر ہوئی وہ نہایت زہد وقناعت کا دور تھا۔ اور آپ نے نہایت شکر و تحمل سے گذارا۔ مدینے کے دوران قیام میں یعنی ۱۳۱۸ھ میں آپ ہندوستان تشریف لے آئے۔ اور دو برس میں واپس مدینہ منورہ چلے گئے پھر سات برس بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا اور دو سال ۱۳۲۹ھ تک درس دیا۔ پھر مدینے تشریف لے گئے دو سال رہ کر پھر ہندوستان واپس آئے اسی سال پھر واپسی ہو گئی۔

۱۳۲۵ھ میں شیخ الحدیث کے ساتھ حجاز میں ہی اسیر ہو کر مالٹا بھیج دیئے گئے۔ اور ۱۳۳۸ھ میں مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ہندوستان آ گئے اکابر کے ایماء پر جامعہ اسلامیہ امروہہ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اور ۱۳۳۹ھ مدرسہ عالیہ میں صدر مدرس ہوئے لیکن ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔ اور ۱۳۴۵ھ سلہٹ ہی میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری ڈابھیل تشریف لے گئے تو دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا۔

آپ اونچے درجے کے محدث اور علم حدیث کے معروف اسکالر تھے یہی قابلیت ذہانت اور علمیت تھی کہ آپ دارالعلوم میں ۳۲ برس ناظم تعلیمات اور صدر مدرس رہے۔ آپ نے تصوف اور سیاست پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔ اور ۴۴۸۳ طلبہ آپ سے بخاری اور ترمذی پڑھ کر دورہ حدیث سے فارغ ہوئے۔

اتنی مصروفیت کے باوجود آپ اسلام کے سیاسی رخ سے بھی غافل نہ تھے۔ بڑی ہی تندہی سے فرائض انجام دیتے رہے۔ جمعیت علماء ہند کے کئی بار صدر ہوئے اور کانگریس کے مشہور قائدین میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ ہندوستان میں تحریک آزادی کے ایسے کارکن تھے کہ کئی بار قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں بالآخر ملک کو آزاد کرا لیا۔ میرے خیال میں ایسے عالم دین کو اسی طرح شیخ وقت، مجاہد، مجزی،، اولوالعزم ہونا چاہیئے کیونکہ فقیہ وہ ہے جو صوفی بھی ہو۔ اور صوفی وہ ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کو عزیز جانے۔

اصل میں نور وہدایت بھی ایسے ہی شاکر، صابر، اور قانع کے علاوہ محنتی لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔ جو حقیقت کی تلاش اور خدمت خلق میں خون پانی ایک کئے رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنی روحانی کیفیتوں کے دجلہ وفرات پر اپنے خیمے نصب رکھتے۔ اور طرز آدمیت کی ترویج پر سوچتے رہتے ہیں۔ اس طرز آدمیت کو جو آبادیوں کے جرم وگناہ ختم کرتی اور زمان ومکان سے دور سرحدوں پر مستقبل کے حرکات وسکنات کے مناظر دکھاتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے شعور، شرافت اور جمال انسانیت کا سرچشمہ گنگناتا رہتا ہے۔

ایسے لوگوں کے قول وعمل کے نتائج توقعات سے زیادہ اور جلدی برآمد ہوتے ہیں اس لئے کہ خدا کی رحمت اور قدرت کی طاقت ان کی اعانت اور دستگیری کرتی ہے۔

ماورائیت کا فلسفہ ایسے ہی لوگوں کے حالات اور واقعات پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن جب تک ابدی قوتیں اثاثہ حیات میں نہ ہوں اس وقت تک انسانی جسم کا میسر ختم ہوتا اور زمین کی مٹی روح کے پاؤں نہیں پکڑتی۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب

قاری محمد طیب صاحب حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم کے صاحبزادے اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے چہیتے شاگرد ہیں۔ آپ نے دارالعلوم سے دستار فضیلت کے بعد وہیں سے درس وتدریس کا آغاز کیا۔ پھر دارالعلوم کے نائب مہتمم ہوئے۔ اس کے بعد عرصے سے مہتمم چلے آ رہے ہیں۔ پورے ملک میں ان کی خطابت کی دھوم ہے اور بڑے بڑے خطیب ان کے انداز بیان کے ثناخوان ہیں وہ ہر خطے میں پہنچ کر دین اور دارالعلوم کے مقاصد کی تبلیغ وترویج کرتے ہیں۔ متعدد کتابیں لکھی ہیں اور مستقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کر رہا ہے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب شعر و سخن میں بھی اپنے اسلاف کی طرح ایک خاص انداز کے مالک ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے رسالے دارالعلوم میں شائع ہوتے ہیں۔ آپ متعدد مدارس کے بانی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں۔

دارالعلوم کے ذمہ دار کارکنان میں آپ کی پہلی شخصیت ہے جنہوں نے بیرونی ممالک کے سفر کئے اور دارالعلوم کے لئے بہبود کا زیادہ سے زیادہ سامان بہم پہنچایا۔ ان کے زمانے میں دارالعلوم نے جو ترقی کی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ تعلیمی اور تعمیری شعبوں میں ترقی سے شعبوں اور شعبہ داروں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

مولانا طیب صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت اور حضرت مولینا اشرف علی تھانوی کے خلیفۂ مجاز ہیں ان کی بیعت کا سلسلہ ہند اور بیرون ہند دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اتنی مصروفیات کے باوجود درس و تدریس کا شغل بھی برابر جاری ہے۔ دیوبند میں آپ کی ایک باقاعدہ مجلس مذاکرہ قائم ہے جس میں مدرسے کے طلباء اور شہر کے علاوہ بیرون شہر کے تشنگان علم اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

اصل میں جب کوئی عالم اپنے جنون کامہ سے روحانیت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس وقت ربانی قوتیں اپنی عادلانہ قوت جولانی کے ساتھ اس کے خون میں گردش کرنے لگتی ہیں۔ وہ رسمی تعقلیات و منطقیات کی الجھنوں سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کا رخ خود بخود ماورائیت کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور اسے زمین و آسمان کی درمیانی مسافتیں چاند سورج کا فاصلہ معلوم نہیں ہوتیں وہ اپنے اندر جھانک کر خود پر حقیقت و فرائض کو آشکار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس پر گمراہ معاشرے کی اصلاح اور بھٹکے قدم مسافروں کی راہنمائی فرض ہو جاتی ہے اسی وقت وہ اس خدمت خلق اور فرض کی ادائیگی کے لئے بیتاب سنے لگتا ہے اور قدرت اسے راستہ دکھانے اور پگڈنڈیاں روشن کرنے کے لئے رنگ برنگ کی روشنیاں لئے آگے آگے چلنے لگتی ہے جس سے نئے ارتے اور جدید مقاصد تخلیق ہوتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے عمل کی تیز رفتاری مشکلات آلام کے راستوں کی پلیوں کو نہال کی رفتار سے عبور کرنے لگتی ہے۔ اور قوت عمل پر انسان کسی غیر مرئی طاقت کا سایہ محسوس کرتا ہے اور کسی کا ذہبل نہیں ہونے پاتا۔ اس میں روحانی قوتوں کے ساتھ جسمانی قدرتیں بھی قدرت اس کے ساتھ کر دیتی ہے۔ اور اس وقت وہ قدرت کا دست راست ہوتا ہے۔

مولانا محمد شفیع صاحب:

مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے اُن علماء میں سے ہیں جن پر دارالعلوم بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ قوی الاستعداد اور وسیع المعلومات معروف خواص و عام ہیں۔ یہ منزل بمنزل طبقہ وسطی سے طبقہ اوّل میں آئے ہیں اور فقہ و حدیث میں امتیازی مقام رکھتے ہیں اسی علمی بلندی کی بناء پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مفتی دارالعلوم کے حلقہ افتاء میں شامل ہونے۔ اور بہ مہارت فتویٰ نویسی ثابت ہونے کے باعث مفتی اعظم کی وفات کے بعد دارالعلوم کے عہدۂ افتاء پر مفتی دارالعلوم کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے اسارت مالٹے رہائی کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا۔ اور بہت کم عرصہ میں ان سے بھی خلافت حاصل کر لی اور تعلیم ظاہر کے ساتھ ساتھ تعلیم باطنی میں مشغول ہو گئے۔

تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق اوّل سے تھا۔ چنانچہ فقہ و حدیث اور فن مناظرہ میں کئی کتابیں ان کی مرہونِ قلم ہیں۔ مفتی صاحب شعر و شاعری میں بھی کم استعداد نہیں رکھتے۔ انہوں نے واقعاتی نظمیں مراثی اور قصائد کہے ہیں جن کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

آزادیٔ ملک کے بعد آپ نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی اور آج وہ ملک کے مشہور علماء اور مفتیوں کی صف میں نمایاں ہیں۔ گورنمنٹ پاکستان نے جو اسلامی قانون کی تدوین کے لئے کمیٹی بنائی اس میں آپ رکن رکین ہے

پھر آپ نے کورنگی ٹاؤن کراچی میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ جو آج اس دور کے ممتاز دارالعلوموں میں اپنی طرز و معیار کی واحد درسگاہ ہے۔ میں جب بھی مفتی صاحب سے ملا ہوں۔ میں نے انہیں ہمہ جہتی انداز کا عالم پایا ہے۔

ہر چند کہ انہیں دارالعلوم اور حکومت کے علاوہ عوام اور اپنے خانگی مسائل میں بے حد مصروفیت رہتی ہے۔ لیکن یہ تو حرکت کائنات کی فطری گردش ہے۔ جو ازل سے لے کر ابد تک اختتام پذیر نہیں ہوگی۔ اور یہ جمال کائنات یا مقصد کائنات کی نو بہ نو ساختیں یا رنگ و صوت کا نزول و صعود مختلف ناموں سے ہوتا رہے گا۔ اور یہ حرکت دور تقسیم علم کی ہی جگہ ہے۔ اس کا فنائیت سے کوئی رشتہ نہیں۔ بلکہ یہ تغیرات تو انقلاب کی زنجیروں کی کڑیاں ہیں۔ یہ نو بنو عالم اور مصروفیات انسانی کا تو اتر ابد تک کی فیصلوں تک کہیں رکنے کا نام نہیں لے گا۔ یہ آتار چڑھاؤ کے اصول دائم قائم اسی طرح ادلتے بدلتے رہیں گے۔

مولانا زکی کیفیؒ

یہ مفتی محمد شفیع کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مفتی صاحب کے دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی زیور علم سے آراستہ تھے لاہور میں ادارہ اسلامیات کے مالک و مہتمم تھے جو دینی کتابوں کا بڑا ادارہ ہے۔ کیفی نہایت اچھے اور نغز گو شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں پر انہیں عبور تھا۔ اور دونوں میں یکساں رفتار۔ گذشتہ تین چار سال سے ان کا کلام ایسا شستہ اور منجھا ہوا آ رہا تھا کہ بعض اوقات سب حیران رہ جاتے تھے کہ زکی صاحب نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے۔ وہ اس رفتار سے چل رہے تھے کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس دور کے بڑے شاعر ہوتے مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ "چٹ پٹ" ہو گئے۔ اور ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب ادارہ اسلامیات کو ان کے بچے سنبھالے ہوئے ہیں۔ خدا انہیں کامیاب کرے اور صحت عطا فرمائے۔ آمین

مولانا سید محمد میاںؒ :

آپ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے تلامذہ رشیدہ سے ہیں۔ علوم درسیہ سے فراغت پا کر مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس اور مفتی کے منصب پر رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے رکن تو پہلے ہی تھے۔ حضرت مدنیؒ کے حکم پر جمعیۃ کے ناظم ہو گئے اور مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ بنے جمعیۃ کے سپاہی تھے۔ اور کانگرس کے نودار لوگوں میں سے تھے۔ کئی بار جیل گئے۔ جو لیڈری کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کئی معیاری اور مفید کتب کے مصنف ہیں۔ جن میں علماء ہند کا شاندار ماضی اور تاریخ اسلام معروف و معتبر کتابیں ہیں۔ آپ کو بچوں کی دینی اور اسلامی تعلیم سے شغف رہا اور اسی لئے تاریخ اسلام جواب و سوال کی صورت میں لکھ کر طالب علموں کے لئے تاریخ اسلام کو آسان کر دیا۔ میرے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے اور میں نے اسے بہت مفید پایا۔

مولانا مفتی محمود صاحب :

موصوف بھی فاضل دیوبند ہیں۔ اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کی وزارت کو ان کی علمی بلندی و استعداد کے سامنے پر کاہ کے برابر بھی خیال نہیں کرتا۔ ان کے علمی اقتدار کے سامنے تو تاج شاہی بھی جھلکار نہیں دیتا۔ مگر اس اقتدار کو بھی علمی حلقے ہی جانتے ہیں۔ ان کے سینے میں فقہی اور قرآنی سرمائے کے ساتھ موجودہ دور کی معلومات کا ذخیرہ قابل رشک ہے۔

ان کی تقریروں میں جہاں شرعی مسائل اتفاقی انکشاف ہوتے ہیں وہیں تاریخ کی بیش بہا معلومات بھی ملتی ہیں۔ اور وہ ملک کے صاحب شعور طبقے میں وقعت کی اور اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے ان کے شاگردوں کو ان

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

کے محاسن میں رطب اللسان پایا ہے اور یہ عالمانہ خصوصیت ہر عالم کا حصہ نہیں ہوتی.

مولانا غلام غوث ہزاروی:

مولانا دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے شمار ہوتے ہیں. علمی استعداد کے اعتبار سے مضبوط اور تقریر کے لحاظ سے افسوں ساز مقرر ہیں. رہنے والے ہزارہ کے ہیں لیکن آپ کی حق گوئی اور حق پسندی کے باعث "جمعیۃ علماء اسلام" کے ناظم مقرر ہوئے تھے. فضیلت اور شہرت کے ساتھ ان کے اعمال و اشغال اعتماد و اعتقاد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں. اسی علمی دینی تخصیص کی بناء پر مصر میں آپ کو بطور نمائندہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی اور وہاں عالمی مؤتمر میں آپ نے علماء عالم کو خطاب کیا.

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے رہنے والے اور تبلیغی جماعت کے عالم ہیں. انہوں نے اپنی سوانح "یاد ایام" کے نام سے لکھی ہے. جو مطالعہ کے قابل ہے. تبلیغی جماعت کے نصاب کی تمام کتب انہیں کے قلم کی صنعت ہیں. جو کئی کئی لاکھ چھپ چکی ہیں. مولانا صاحب ایک عالم باعمل ہیں جو کاندھلہ کے علماء کا طرۂ امتیاز ہے.

مولانا زکریا کاندھلوی کی تحریروں میں ایسا سلجھاؤ ہے. کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے. اور یہی تحریروں کی خوبی ہے. یہ خوبی صرف تحریر میں نہیں تقریر میں بھی کامیاب رہتی ہے. اور مقرر اپنے دل کی بات کو عوام کے سینوں میں انڈیل دیتا ہے. علمی گفتگو اور منطق الفاظ تبلیغ دین کے سلسلے میں کند ہتھیار قرار پاتے ہیں. مولانا کا طرز تحریر قابل تقلید ہے. خدا انہیں تندرستی کے ساتھ تبلیغ کے لئے عمر طویل عطا فرمائے. وہ لاہور تشریف لائے تو میں کوشش کے باوجود اُن سے نہیں مل سکا. پھر معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور پر مکہ یا مدینہ چلے گئے انشاءاللہ وہاں ہی ملاقات ہوگی.

مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی:

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے فیض یاب ہیں وہیں ایک عرصہ درس و تدریس میں منہمک رہے. تقسیم ملک کے بعد لاہور آگئے. اور جامعہ اشرفیہ میں مفتی کے عہدے پر فائز ہو گئے. وہ فقہ بھی پڑھاتے ہیں اور حدیث بھی دونوں میں ان کا طرز کلام گنجلک نہیں ہوتا. بلکہ جہاں عقدہ ہوتا ہے وہیں وہ اپنے طرز بیان سے شگفتگی اور سلجھاؤ پیدا کر دیتے ہیں محبت اور احترام کے قابل بزرگ ہیں.

قاری عبدالعزیز شوقی انبالوی:

شوقی صاحب خود مظاہری لکھتے تھے غالباً وہ بھی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے تربیت یافتہ تھے بڑے خلیق اور ملنسار انسان تھے. انہیں آزادی ملک سے پہلے سے جانتا ہوں. اور اُن کے اخلاق کا گرویدہ تھا. وہ نہایت اچھے شعر کہتے تھے لیکن چھپوانے میں حجاب محسوس کرتے تھے. نہ جانے ان کا کلام کہاں اور کس کی تحویل میں ہوگا.

فرمودۂ حضرت لاہوریؒ

اگر کوئی ہوا میں اُڑتا آئے اور لاکھوں مُرید پیچھے لائے مگر سُنت نبوی کا مخالف ہو تو اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا ناجائز اس کی بیعت کرنا حرام اور اگر کوئی کر چکا ہو تو توڑنا فرض عین ہے.

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

بحیثیت

مناظرِ اسلام

مولانا اشرف علی تھانوی

۱۸۵۷ء میں سرزمین ہند پر انگریز کے تسلط اور اہل اسلام کے ہاتھوں سے زمام اقتدار کے زوال کے بعد باطل کی طرف سے اسلام پر جس جس راہ سے حملے ہونے شروع ہوئے اس کا اندازہ اس وقت کے حالات کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص بخوبی لگا سکتا ہے۔ اسلام کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد سے ۱۲ سو سال تک مسلسل عیسائیت پر زوال آتا رہا اہل اسلام کے ہاتھوں طاقت کے مقابلہ میں شکست کھا کر یہود و نصاریٰ کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں سے لیکر ہندوستان تک ہزاروں میل کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں دینا پڑا تو اقتصادی میدان میں بھی مسلمان تاجروں نے ہر محاذ پر انکو شکست دی، اخلاقی برتری کا ڈھونگ بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں عالم پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ مذہبی اور نظریاتی اعتبار سے تو عیسائیت اور یہودیت کے مینار پہلے ہی مسمار ہو چکے تھے، اس ہمہ گیر زوال کے دور رس اثرات و نتائج سے گھبرا کر بالآخر عیسائی مفکر یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ان اسباب پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور قوم کو اس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے "پریچنگ آف اسلام" کے نام سے کتاب لکھی جس میں دنیا سے عیسائیت کے زوال اور اسلام کے عروج پر علاقہ وار مفصل روشنی ڈالی گئی، شاید مصنف کا مقصد اس کتاب سے یہ ہوگا کہ عیسائی اہل اسلام کو آئندہ ایسے مواقع فراہم نہ کریں گے اور اس طرح اسلام کی علاقائی وسعت محدود ہو جائے گی لیکن اس کی نظر یہاں تک نہیں پہنچ سکی کہ اسلام کے بارے میں اللہ رب العالمین نے قرآن پاک میں اعلان فرمایا هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ، وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اس کے دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "الاسلام يعلو ولا يعلىٰ عليه"، اسلام سربلند اور غالب ہوگا، اس پر کوئی دین غالب نہیں آسکتا، جس دین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پھیلنے اور غالب آنے ہی کا ارادہ کر لیا ہو اس کے لئے نہ کسی کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی کی ذاتی جد و جہد پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔ جس دین کا مقدر ہی غالب آنا ہو اسے ایک زمانہ تک غلبہ حاصل ہونے والے ذرائع و وسائل کو زمانہ مستقبل میں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالیٰ اسلام کی سربلندی کے لئے ہر دور میں نئے ہادی و رہنما بھیجتا رہتا ہے جو نت نئے اسلوب بیان اور انوکھے انداز تبلیغ کے ذریعے قوم کو ہدایت

حق کی راہ دکھاتے رہتے ہیں۔

ہندوستان پر غلبہ حاصل ہو جانے کے بعد انگریز نے سمجھا کہ اب مسلمانوں کے دین کے راستے مسدود کرنا ہمارے لئے آسان ہوگا مگر شاید اس نے کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ مسلمان قوم جان و مال عزت و آبرو کے لئے مرنا کوئی فخر نہیں جانتی بلکہ دین و مذہب کے لئے کٹ مرنا اور سینہ سپر ہونا اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ بہرحال انگریز نے جس راہ سے دین میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی اہل اسلام نے اسی راستہ سے ہر طرح مقابلہ کیا۔

یہاں یہ اعتراف قابل ذکر ہے کہ انگریز حکومت نے حکمرانی تسلط کے باوجود اہل اسلام پر تبلیغی پابندی نہیں لگائی بلکہ دلائل و براہین سے غلبہ حاصل کرنا چاہا۔

ظاہر ہے کہ اس راہ کے شہسواروں سے مقابلہ کرنا عیسائیوں کے بس میں نہیں تھا۔ ہندوستان میں انگریز کے حربوں کا مختلف انداز سے جواب دیا گیا اور متفرق تدابیر سے اسلام کی حفاظت کی گئی۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "انگریزی اقتدار کے بعد تمام عیسائی حکومتوں نے عیسائیت کی تبلیغ کا جال بچھا دیا ہندوستان سے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد انگریزی اقتدار آیا انگریزی حکومت کیونکہ مذہباً عیسائی تھی اس طرح سے عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر علمائے دین پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ علماء دین تبلیغ کے لئے کھڑے ہوگئے اور تقریر و تحریر سے رد عیسائیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بلکہ باوجود بے سر و سامانی کے علماء دین کا پلہ بھاری رہا۔ اور انگریزی حکومت نے تبلیغ اسلام اور عیسائیت میں علماء پر کوئی پابندی نہیں لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحمدہ تعالیٰ ہندوستان میں دین اسلام محفوظ رہا اور لاکھوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اگر علماء دین ہندوستان میں دینی مدارس قائم نہ کرتے اور عیسائیوں سے مناظرے اور عیسائیت کا رد نہ کرتے تو پھر نا معلوم اسلام کا کیا حال ہوتا اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی۔ ہندوستان سے اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب انگریزی دور حکومت شروع ہوا تو سرسید نے علی گڑھ کالج قائم کیا تاکہ مسلمان انگریزی زبان پڑھ کر موجودہ حکومت میں عہدے حاصل کر سکیں۔ اور حضرت مولانا نانوتوی نے خالص دین کی تعلیم کے لئے دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا اور اس کے قریب سہارنپور میں حضرت مولانا احمد مظہر نانوتوی نے مظاہر العلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ ان حضرات نے دنیا سے قطع نظر کی اور حکومت کے عہدوں کے خیال کو دل سے نکال دیا اور دینی تعلیم کو زندگی کا نصب العین بنا لیا اور دین کے تحفظ کے لئے دینی مدارس قائم کئے[1]۔"

اگر اسلاف متقدمین میں حق کی حمایت میں سینہ سپر ہونے والوں کی جماعت نظر آتی ہے تو باشبہ اسلاف متاخرین میں بھی جذبہ جاں نثاری اور ہمت بے پایاں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسلام کے فرزندوں میں اگر ایک دور بلال حبشی اور خالد بن ولید کا گزرا۔ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی پیدا ہوئے۔ غزالی اور رازی نے جنم لیا تو اسی کے فرزندوں میں یہ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہیں مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہم العالی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

علماء کی اجتماعی جدوجہد

آج سے کم و بیش سو سال پہلے بھی ہندوستان پر عیسائی مشنریوں کا طوفان مسلط ہوا تھا اس وقت یہ فتنہ آج سے کہیں زیادہ شدید تھا اور اس کو توپ اور بندوق کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے علماء حق کی ایک بڑی جماعت کو کھڑا کر دیا تھا۔ جس نے اپنی جان و مال پر کھیل کر اس فتنہ کا مقابلہ کیا دلیل و حجت کے ہر

---

[1] دستور اسلام مولانا ادریس صاحب صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ نقیبی پریس لاہور

میدان میں عیسائیت کو شکست فاش دیکر یہ ثابت کرایا کہ اسلام اور علماء اسلام وقت کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

ان علمائے حق میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ متوفی ۱۳۰۸ھ، جناب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب مرحوم، مولانا سید آل حسن متوفی ۱۲۸۷ھ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی متوفی ۱۲۹۷ھ، ۱۸۷۹ء، مولانا شرف الحق صاحب صدیقی متوفی ۱۲۵۷ھ، مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ متوفی ۱۲۹۳ھ مولانا سید ابو حسن صاحبؒ مولانا سید عبدالباری متوفیٰ ۱۲۰۳ھ مولانا سید ابو المنصور ناصر علی صاحب متوفیٰ ۱۳۲۰ھ کے اسماء گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں[عـ۹]

مناظرین اسلام کی اس مستعدی نے ایک طرف اگر ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کی تو دوسری طرف ہندوستان میں بھرپور طاقت مل جانے کے باوجود عیسائیت کے قدم اکھاڑ کر رکھدیئے اور بالآخر انگریز کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف رہی اور بعد میں کیونکہ حکومت ہی ان کے ہاتھ میں آگئی تھی اس لئے جتنی بھی کوشش ہوتی اور جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا وہ ممکن تھا۔ مگر اسلام کے فرزندوں میں اگر ظاہری شکست کے بعد کسی نے عیسائیت کے مقابلہ سے ہمت نہیں ہاری تو ظاہر ہے کہ شکست سے پہلے تو کیسے ممکن تھا کہ مسلمان عیسائیوں کی برہانی بالادستی قبول کر لیتے۔ چنانچہ الحمد اللہ مذکورۃ علماء نے ۱۸۵۷ء سے قبل عیسائیوں کو ہر میدان میں ایسا ذلیل کیا کہ عوام کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا پادری فنڈر سے مناظرہ ہوا اس میں فنڈر کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ اسکے بعد جب اس نے مولانا کا نام سنا اور وہ بھاگا۔

عـ۹ پیش لفظ کتاب بائیبل سے قرآن تک صفحہ ۱۸

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں مولانا شرف الحق نے جو مولانا رحمت اللہ کے شاگرد تھے لارڈ بشپ جے لے لیفرائے مشن کالج دہلی کو مناظرہ میں شکست فاش دیکر اسلام کی سربلندی کا جھنڈا لہرایا۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کا دور مناظرہ

اس دور کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اس بطل جلیل نے اگر ۱۸۵۷ء میں اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ہمراہ عیسائیت، یہودیت اور ہر کفر و شرک کے خلاف سیف و سنان سے جہاد کیا تو عمر کے آخری دور میں قلم و لسان کے جہاد کا فریضہ بھی اس خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک حجت اور دستاویز ہے۔

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہ ایک صاحب نسبت مرد قلندر تھے انہیں حق تعالیٰ نے اصلاح و تبلیغ ہی کے لئے مامور فرمایا تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا[عـ۱۰]۔

چنانچہ اس علم کی خدمت سے ہی حضرت کے ذمہ احقاق حق کی ذمہ داری لگادی تھی، اہل تشیع سے مباحثے ہوئے، دلائل سے لبریز خطوط لکھے گئے، اہل بدعت حضرات کو ہر طرح کی فہمائش کی، بریلوی مکتب فکر کے طبقہ کی اصلاح کے لئے سنت و بدعت کی حقیقت واضح فرمائی، اس سلسلہ کا ایک واقعہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زبانی نقل کرنا مناسب ہوگا جو انہوں نے اپنے والد محترم سے اور انہوں نے دیران محمد یسین سے سنا۔

عـ۱۰۔ ارواح ثلثہ حضرت تھانوی۔ صفحہ ۲۷۱۔

قاضی پور کے شیعوں کا فرار

دیوان محمد یسین صاحب مرحوم نے فرمایا کہ قاضی پور میں جب حضرت نانوتوی تشریف لے گئے تو عشرۂ محرم تھا۔ روافض نے حضرت مولانا کو اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی حضرت نے فرمایا منظور ہے مگر اس شرط سے کہ جب آپ لوگ مجلس میں کہہ سن چکیں گے تو ہم بھی کچھ کہیں گے۔ وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور وہیں کچھ مذہبی گفتگو کرتے ہوئے ان سب روافض نے کہا کہ اگر آپ بیداری میں ہمکو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادیں اور حضورؐ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادیں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو ہم اہل سنت والجماعت میں داخل ہوجائیں گے۔ فرمایا تم سب اس پر پختہ رہو تو میں بیداری میں زیارت کرانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر یہ روافض کچھ کچے ہوگئے۔[ا]

اس قسم کے واقعات ہر مرحلہ پر ملیں گے جو یقیناً اس حدیث کا مصداق ہیں:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوعٍ بِالْاَبْوَابِ
لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهُ۔

(بہت سے پھٹے پرانے لباس والے غبار آلود جنہیں دروازوں سے دھکے دیئے جائیں، ایسے بھی ہیں کہ اگر اللہ پر بھروسہ کرکے قسم کھالیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کردیں)

عیسائیت کیخلاف مناظرانہ جہاد

اسلام کے اس جرنیل نے دہلی کے دوران قیام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پادری تاراچند سے مناظرہ کرکے عیسائیت کے خلاف مناظرانہ جہاد کا آغاز کیا۔

پادری تاراچند دہلی کے مشہور مذہبی پادریوں میں سے تھا اور عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم تھا۔ ۸ اپریل ۱۸۷۰ء کے مناظرہ میں تاراچند کے مکان پر پادری عماد الدین سے مسلمان طالب علم محمد مرزا کی باتوں کا جواب نہ بن پڑا تو تاراچند پادری نے مسلمانوں سے کہا کہ آپ اس وقت ملاقات کرنے آئے ہیں یا مباحثہ کرنے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تاراچند سے مناظرہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا جس میں تاراچند سے حضرت کے اعتراضات کا جواب بن نہ پڑا اور بالآخر وہ بند ہوگیا۔[۲]

اس کے بعد سے مسلسل زندگی مناظرانہ گزری بعض سفروں میں میلوں پیدل چلنا پڑا مگر حضرت کے جذبۂ جہاد کے سامنے اس قسم کی تکالیف اور مشقتوں کی کیا حیثیت تھی۔

چاندپور کے مذہبی اجتماعات

چاندپور ضلع شاہجہاں پور میں ہے، شاہجہاں پور سے چھ سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں اور آریہ سماج کو جرأت ہوئی کہ اپنے مذہب کا کھلے بندوں دعوت تبلیغ کے انداز سے پرچار کریں اور عیسائیوں کی طرح مذہبی امور میں مسلمانوں سے باقاعدہ مباحثے و مناظرے کریں دلیل و برہان سے اپنے مذہب کی برتری ثابت کریں۔

چنانچہ چاندپور ضلع شاہجہاں پور میں ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ ۷ ربیع الاول مطابق ۷ مئی ۱۸۷۶ء میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا مناظرہ طے پایا اس جلسہ کا نام میلہ خداشناسی رکھا گیا۔ اس جلسہ میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال

[ا] ارواح ثلثہ، صفحہ ۲۶۵، حکایت ۲۶۰

[۲] انوار قاسمی صفحہ ۱۴۰-۱۹۵

کیرانوی اور عیسائیوں کی طرف سے پادری ٹومس انگلستانی شریک ہوئے۔

مولانا محمد منیر صاحب مدرس مدرسہ سرکاری بریلی نے جو غالباً حضرت نانوتوی کے رشتہ میں بھائی بھی تھے۔ مولوی الٰہی بخش صاحب عرف مولوی رنگین بریلوی کی طرف سے (جو رد نصاریٰ میں سرگرم تھے)

اس اشتہار کی اطلاع حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو دی اور اس جلسہ میں شرکت کی دعوت بھی پیش کر دی اس پر حضرت نے انہیں جواب لکھا کہ اس مناظرہ کی تفصیلات لکھیں ابھی جواب آنہ سکا تھا کہ چندا پور سے تار آگیا کہ فوراً پہنچیں حضرت نانوتوی مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند اور مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری کے ہمراہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو روانہ ہو گئے۔

شاہجہاں پور پہنچنے کے بعد رات کو قیام کیا اور صبح نماز کے بعد وہاں سے پیدل چندا پور پہنچے۔[۹]

مناظرہ اگرچہ تینوں فریقوں کے مابین تھا مگر اصل گفتگو مسلمانوں میں اور عیسائیوں میں رہی ہندو ایک کنارہ کش علیحدہ ہو گئے۔

اس جلسہ میں مقرر کے لئے وقت پندرہ منٹ مقرر ہوا تھا مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے تقریر میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ دنیا میں جتنے کافر و مشرک ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح توحید کے سب ہی قائل ہیں اس سے کسی کو مفر نہیں، توحید کے بارے میں تمام مذاہب کا اشتراک بیان فرما کر نتیجہ ان الفاظ میں نکالتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ توحید سے کسی کو انکار نہیں، بلکہ اصل اصول سب کے نزدیک توحید ہی ہے اور توحید مسلّم اور اصل ٹھہری تو پھر جو باتیں مخالف توحید ہوں گی وہ خود غلط ہوں گی یعنی شرک، بت پرستی اور کثرت معبوداں اپنے آپ غلط ہوں گی۔[۱۰]

اس تقریر میں وجود باری کا مسئلہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا۔ حضرت کی تقریر ایک بحر بے کنار کی طرح جاری تھی کہ پادری نولس نے کہا کہ ٹائم ہو گیا، اس لئے یہ تقریر حضرت کو درمیان میں چھوڑنی پڑی جس پر اہل اسلام کو کافی افسوس رہا۔

اس کے بعد اس روز حضرت نانوتویؒ کی تقریر نہ ہو سکی صبح ۹ بجے شروع ہو کر ۲ بجے یہ جلسہ ختم ہوا۔ آخری وقت میں عیسائی گالیوں پر اتر آئے جس سے عوام میں نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں اور عیسائیوں نے بھی برا بھلا کہا۔ اس جلسہ میں آخری تقریر مولوی ابو المنصور دہلوی کی ہوئی جنہوں نے بائیبل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت ثابت کی۔ اس جلسہ میں تین روز تک نشستیں ہوتی رہیں، حضرت نانوتویؒ کی مختلف تقاریر ہوئیں جن سے ہر شخص بے حد متاثر ہوا۔ روداد میلہ خدا شناسی کے آخر میں ایک تاثر درج ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

غرض بعد مباحثہ مولوی عبدالوہاب کا اور پادری رینک کا اتفاق ملاقات ہوا تو مولوی صاحب نے پادری صاحب سے جلسہ کی کیفیت پوچھی پادری صاحب نے فرمایا: "کیا پوچھتے ہو ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا پر نہ یہ تقریریں سنیں نہ ایسا عالم دیکھا، ایک پتلا دبلا سا آدمی میلے سے کپڑے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے۔ پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔[۱۱]

شاہجہاں پور کے کھتری حضرت کے بارے میں تصور کرتے رہے کہ یہ کوئی اوتار ہے اور اس طرح لاجواب تقریریں کرتا ہے۔

---

[۹] روداد میلہ خدا شناسی، صفحہ ۲
[۱۰] " " " [illegible]
[۱۱] " " "

[۱۲] رسالہ میلہ خداشناسی صفحہ ۲۰

شاہجہاں پور کا دوسرا مناظرہ

گزشتہ سال کی طرح چاندا پور ضلع شاہجہاں پور میں ۱۲۹۴ھ میں پھر جلسہ کا اہتمام ہوا چاندا پور کے جلسہ کا نام ہر سال میلہ خدا شناسی ہی رکھا جاتا تھا۔ اس جلسہ میں بھی حکیم الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ نے عجیب معرکۃ الآرا تقریر فرمائی یہ تقریر حجۃ الاسلام کے نام سے مطبع قاسمی میں چھپی ہے مگر افسوس ہے کہ تقریر کی دو قسطیں میسر آسکیں پوری تقریر دستیاب نہیں ہوتی تاہم جس قدر موجود ہے وہ اپنی مثال نہیں رکھتی مولانا فخرالحسن گنگوہی نے ضبط کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ حرف حرف ضبط کر لیا گیا۔

تیسرا مناظرہ

۱۲۹۵ھ میں پھر اسی مقام پر مناظرہ ہوا اس مناظرہ کی تاریخ ۲۰ مارچ طے ہوئی۔ گزشتہ سالوں کی مسلسل جد و جہد اور عیسائیوں کے لاجواب ہو چکنے کے باوجود کیونکہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی ابو المنصور صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارادہ کیا کہ اس مرتبہ اس میں شرکت نہ کی جائے کیونکہ سوائے نشستند و گفتند و برخاستند کے کوئی فائدہ نہیں مگر ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ اگر ہم لوگ شریک نہ ہوئے تو لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور اہل اسلام کو سبکی ہوگی اس لئے دونوں حضرات بعض دوسرے رفقاء کے ساتھ شاہجہاں پور روانہ ہوئے اور ۱۸ مارچ کو وہاں پہنچ گئے ۱۹ کو آرام کیا ۲۰ مارچ کو آخر شب میں اٹھ کر پیدل چاندا پور کے لئے روانہ ہو گئے راستے میں ندی کے کنارے حضرت نانوتوی نے نماز ادا کر کے خوب خشوع و خضوع سے دعا مانگی اور آگے روانہ ہو کر چاندا پور پہنچ گئے۔

شرائط مباحثہ طے کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے مولانا قاسم صاحب مولوی عبد المجید صاحب۔ پادریوں میں سے پادری نولس اور پادری واٹ صاحبان اور ہندوؤں میں سے پنڈت دیانند صاحب سرستی اور منشی اندرمن صاحب منتخب ہوئے اور مولوی میاں صاحب منتظم جلسہ بھی شریک ہوئے پہلے سالوں کے جلسوں سے کیونکہ پادری گھبرائے ہوئے تھے اس لئے اس مرتبہ ہندوؤں اور پادریوں نے مل بھگت کر کے یہ طے کیا کہ ہر مقرر کی تقریر کا وقت صرف ۵ منٹ رکھا جائے، غالباً اس میں یہ چال پوشیدہ تھی کہ ہم اعتراض کریں گے اور مسلمان جواب دیں گے اور ظاہر ہے کہ ۵ منٹ میں اعتراض تو با آسانی ہو سکتا ہے مگر جواب دینے والا ۵ منٹ میں کیا جواب دے سکے گا۔ اس طرح مسلمان عاجز ہو کر شکست کھا لیں گے۔ لیکن علماء اسلام نے کہا کہ ہم اس سے کم وقت پر بھی تیار ہیں بالآخر یہ جلسہ شروع ہوا سب سے پہلے منشی پیارے لال نے ایک کاغذ نکالا جس میں ۵ سوال تھے کہ ہماری طرف سے یہ سوال ہیں پہلے ان کا جواب دیا جائے گا۔

(۱) دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

(۲) پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

(۳) پرمیشر عادل ہے اور رحیم ہے دونوں کس طرح ہے؟

(۴) وید اور بائبل اور قرآن کے کلام الہی ہونے میں کیا دلیل ہے؟

(۵) نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

کیونکہ یہ سوالات بانی جلسہ کی طرف سے تھے اس لئے ان کا جواب پنڈت عیسائی اور مسلمان سب کو دینا تھا، عیسائی تو ریت لعل کرتے رہے سب سے پہلے ان کے جوابات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے دئے، اور ایسی تقریر فرمائی کہ سامعین پر ایک سکتہ کا عالم تھا: ظاہر ہے کہ ۵ منٹ یا ۱۰ منٹ میں کتنا کچھ کہا جا سکتا ہے! مگر اس دو روزہ جلسے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے توحید، رسالت، ضرورت نبوت، وحی، عصمت انبیاء، معجزات انبیاء میں فرق غرض بنیادی مباحث پر مسکت تقریر فرما کر اسلام کی فتح و نصرت

کا جھنڈا گاڑ دیا۔

اس مناظرہ کی کامیابی کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی نیلی لنگی کی شیخ ایک نعرۂ حق بن گیا۔

اس مناظرہ کے بارے میں قاری محمد طیب صاحب نے اپنے والد ماجد کے حوالے سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد نقل فرمایا ہے "اب مجھے ان کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتنے ہیں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت اس کے بندوں پر پوری ہو جائے سو وہ اس میلہ خدا شناسی و مباحثہ شاہجہانپور میں ہو چکی۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وفات ہو گئی"[9] ۴ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ میں حضرت کی وفات ہو گئی۔ ویسے تو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عام حالات میں بھی بہت سادہ رہتے تھے مگر اجتماعات کے موقع پر اہتمام لباس نہیں ہوتا تھا بلکہ اسی سادہ لباس میں شرکت فرماتے تھے۔ اسی شاہجہانپور کے مناظرہ میں شرکت کا ایک نقشہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ایک وعظ میں بیان فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں: حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ لباس ایسا پہنتے تھے جس سے کوئی نہ سمجھ سکے کہ یہ عالم ہیں۔ نہ عبا پہنتے تھے نہ جوتہ نہ ململ پہنتے تھے نہ تن زیب بلکہ گاڑھا اور کبھی آپ کا لباس تھا اور اسی لباس سے آپ بڑے بڑے مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے مگر آپ کے سامنے سارے جبہ و جبے والے دھرے رہ جاتے تھے آپ ہی کا نام چمکتا تھا اور کسی کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ چنانچہ مباحثہ شاہجہانپور میں جو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا بڑے بڑے جبہ و قبا والے موجود تھے اور حضرت مولانا اسی معمولی کرتے اور لنگی میں تھے مگر جب آپ نے تقریر کی ہے تو عوام پر اتنا اثر تھا کہ سہارنپور کے ہندو برہمن اور بنئے یہ کہتے تھے کہ نیلی لنگی والا مولوی جیت گیا ایسی تقریر کی کہ کسی کو اس کی بات کا جواب نہیں آیا۔[10]

حضرت کا معمول تھا کہ راستہ میں کسی کو اپنا نام نہیں بتاتے تھے بلکہ اپنا تاریخی نام جو قطعاً غیر معروف تھا وہ بتا دیا کرتے تھے کہ میرا نام خورشید حسن ہے مقصد یہ تھا کہ لوگ آپ کو ایک معمولی آدمی سمجھیں اور اگر کبھی کوئی وطن کا نام بھی پوچھ لیتا تو فرماتے اللہ آباد۔ رفقاء نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ اللہ آباد تو آپ کا وطن نہیں پھر بات کیسے سچ ہو گی تو فوراً فرماتے بھائی ہر شہر خدا ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔[11]

مناظرہ میں شرکت کے وقت اپنے علم اور اپنی لیاقت پر قطعاً بھروسہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر آن خدائے قادر کی قدرت پر نظر رہتی اس سے دعائیں کرتے رہتے۔ اسی مباحثہ شاہجہانپور کا قصہ نقل کرتے ہوئے مولانا فخر الحسن گنگوہی فرماتے ہیں "مولوی محمد قاسم صاحب نے ندی پر استنجے سے فراغت حاصل کر کے وضو کیا اور نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی غالب وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو گی کیونکہ مولوی صاحب دل سے برابر ہی ہر شخص سے فرماتے تھے کہ اس بے نیاز سے دعا کرو کہ کلمۂ حق غالب آئے۔"[12]

مناظرۂ رڑکی

۱۲ شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۷۸ء پنڈت دیانند نے رڑکی میں آکر سر بازار مذہب اسلام پر اعتراضات کئے اسی سال کے شروع میں مارچ میں شاہجہانپور کا مشہور مناظرہ عیسائیوں سے ہو چکا تھا۔ اب پنڈتوں کو خباثت سوجھی اور دوا فروشوں کی طرح بازاروں میں مجمع لگا کر مذہب پر اعتراضات شروع کئے۔ بعض احباب نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا

---

[9] ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۵

[10] وعظ العاظ القرآن صفحہ ۸۱ مطبوعہ اشرف العلوم

[11] کوثر الفوائد، [12] قصص الاکابر ۲۶ صفحہ ۱۵۰ - ص ۹

مباحثہ شاہجہانپور مطبوعہ مطبع قاسمی صفحہ ۵

کو قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لاکر اس کے جوابات دیں۔ چنانچہ حضرت نانوتوی اپنے رفقاء کو ساتھ لیکر تشریف لے گئے اس مناظرہ کا کچھ نقشہ بزرنگ حقائق و برنگ لطائف حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ نے پیش کیا ہے وہ درج کرتا ہوں۔

فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رڑکی واسطے مناظرہ کے لے گئے اور بھی چند آدمی ساتھ ہو گئے۔ جناب مولانا ایک جگہ ٹھہر گئے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا کہ کھانا بازار میں کھا دیں۔ مجسٹریٹ کو خبر ہوئی تو اول وہ سمجھا کہ یہ بھی رعوت خوردے آئے ہوں گے مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں تو اس کے دل میں بڑی قدر ہوئی اور اس نے مولانا کو بلایا اور اشتیاق ظاہر کیا مولانا کی عادت تھی کہ کبھی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور گئے نواب صاحب کو خبر ہوئی تو مولانا کو بلایا مگر مولانا نہیں گئے اور یہ حیلہ کیا کہ ہم دیہاتی لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں خدا جانے کیا بے ادبی ہو جائے، نواب صاحب نے کہا آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں آپ تشریف لائیے ہم کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق آپ کو ہو چلنے کا اور آؤں میں غرض نہ گئے باوجود ایسی آزادی کے رڑکی میں مجسٹریٹ سے ملنے سے انکار نہیں کیا کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔ اس نے مولانا سے بارش کی کمی کی وجہ پوچھی تو مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے، وہ بہت ہی محظوظ ہوا اور مولانا کے علم کا قائل ہو گیا اور بہت ہی اچھی طرح پیش آیا۔ پھر مولانا سے رڑکی آنے کی وجہ پوچھی، فرمایا دیانند سے مناظرہ کے لئے آیا ہوں مگر وہ پہلے تو مناظرہ کی دعوت دیتا پھرتا تھا اب جو میں آگیا تو پیچھے ہٹتا ہے، مجسٹریٹ نے کہا ہم اس کو بلاتے ہیں، چنانچہ بلایا اور پوچھا کیوں مناظرہ نہیں کرتے۔ کہا فساد کا خوف ہے مجسٹریٹ نے کہا فساد کے ہم ذمہ دار ہیں، دیانند نے کہا اس ارادہ سے نہیں آیا ہوں۔ مولانا نے کہا ارادہ فعل اختیاری ہے اب وہ کر لیجئے مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا

آخر بھاگ گیا [1]

اس مناظرہ میں بھی حضرت کے ہمراہ کچھ رفقاء تھے امیر شاہ خاں صاحب جو ان حضرات کے بچے شیدائی تھے اور ان کی حکایات و قصے انہیں حرف حرف ازبر یاد تھے، ان سے سنی ہوئی ایک حکایت حضرت تھانوی نے نقل کی ہے۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب دیانند سرستی کے مقابلہ میں رڑکی تشریف لے گئے تو علاوہ اور خدام کے منشی نہال احمد دیوبندی اور شاہ جی عاشق علی بھی ہمراہ تھے۔ منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے دیانند کے پاس شرائط مناظرہ طے کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ منشی صاحب اس کی قیام گاہ پر موجود تھے کہ کھانے کا وقت آگیا اور اس کے لئے کھانا لایا گیا کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں اور سیروں مٹھائی تھی جس کو کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے مگر وہ اس اکیلے کے لئے آیا تھا اور اس تنہا نے سب تھالیں صاف کر دیں۔

منشی صاحب نے اپنی ایک بے تکلف مجلس میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بطور مزاح کہا کہ اگر ہمارے مولانا سے علم و عقل میں مناظرہ ہوا تو ان شاء اللہ مولانا غالب آئیں گے ہی لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ کی ٹھن گئی تو کیا ہوگا کیونکہ حضرت بہت ہی کم کھاتے تھے۔ یہ قول حضرت تک پہنچا تو منشی نہال احمد صاحب بلائے گئے۔ حضرت نانوتوی قیام گاہ کی چوکھٹ پکڑے ہوئے کھڑے تھے کہ یہ حاضر ہوئے اور دل میں سمجھے ہوئے تھے کہ دیکھئے اب کیا حال ہوگا اور کہیں وہ بات پہنچ گئی ہے تو دیکھئے کیسی ڈانٹ پڑتی ہے۔ حضرت نے فرمایا منشی جی تم نے کیا کہا تھا جب تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں انہوں نے وہی مقولہ دبی زبان سے دہرا دیا۔

فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو تم ساتھ ہو اس کا جواب تم دو گے اور دوسری بات جو حقیقت ہے

---

[1] قصص الاکابر ص ۲۴، صفحہ ۸

وہ یہ کہ تمہارے دل میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا، یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر ترک اہل دنہ کیا سنہ بھی، اور ناقوں میں مناظرہ ہوگا تو کون غالب ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ کھانا کس کی صنعت ہے، بہائم اور جانوروں کی، اور نہ کھانا کس کی صفت ہے، حق تعالیٰ کی۔ اور اس کے کی تو تم مجھ سے مناظرہ جہالت میں کر انا چاہتے ہو۔ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہل میں؟ اگر اسی میں مناظرہ ہو تو کسی بھینسے یا ہاتھی کو لا کر دیا نہ سے کے مقابلہ میں ٹھہرا کر دیا کہ کون زیادہ کھاتا ہے؟[1]

اس مناظرہ کے لئے حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہ نے انتہائی کوشش کی کہ دیانند سرسوتی مناظرہ کے لئے آمادہ ہو جائے لیکن وہ بھی کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اس مناظرہ کی اصل روداد ہم اپنی تعبیر اور اپنے الفاظ کے بجائے خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم مبارک کی لکھی ہوئی رُوداد پیش کرتے ہیں جس سے حضرت کی مسلسل جد وجہد اور فریق مخالف کی طرف سے ٹال مٹول کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

فرمایا: بعد حمد و صلوٰۃ بندہ ہیچمداں سراپا گناہ محمد قاسم ناظرین اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ بارہ سو پچانوے ہجری آخر رجب میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب پر چند اعتراض کئے۔ حسب الطلب بعض احباب اور بتقاضائے غیرت اسلام یہ ننگ اہل اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں پہنچا اور آرزوئے مناظرہ میں سولہ سترہ روز وہاں ٹھہرا رہا۔ ہرچند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بعنایت خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں۔ مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے جو میدان مناظرہ میں آتے جان چرانے کے لئے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کو کسی کو سوجھتے ہیں۔

اعتراض تو مجمع عام میں ہوا پر مناظرہ میں دو بدو گفتگو کھلنے کا وقت آیا تو پچاس آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ تھے وجہ پوچھی تو اندیشہ فساد زیب زبان تھا مگر نہ پہلے مناظروں کی نظیروں کا کچھ جواب نہ حسن انتظام سرکاری پر کچھ اعتراض

تھا۔ سننے کے لئے دعوائے بلا دلیل سے مطلب تھا۔ رمضان کی آمد آمد ان کو بھی معلوم تھی کہ کچھ اور دن ٹلیں تو یہ لوگ آپ ٹل جائیں اس لئے منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، جیتیں کیں، سیسیں کرائیں مگر وہاں وہی نہیں کی نہیں رہی۔ مجمع عام کی جا بدشواری دو سو تک آئے مگر اپنے مکان تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام سے ٹھہرائی تھی، وقت کی شکایت کی تو نو بجے تک کی اجازت آئی۔

مطلب یہ تھا کہ ہماری فرودگاہ سے بلکہ شہر سے ان کا مکان ڈیڑھ میل پر تھا نو بجے فارغ ہو کر چلے تو دس بجے پہنچے ایک گھنٹہ میں نماز سے فارغ ہوئے اس وقت نہ بازار کھلا ہوا جو کچھ مول لیجئے نہ خود پکانے کی ہمت جو یوں انتظام کیجئے۔

علاوہ بریں برسات کا موسم مینہ برس گیا تو اور بھی اللہ کی رحمت ہوگئی غرض ان کی یہ غرض تھی کہ یہ لوگ تنگ ہو کر چلے جائیں اور ہم بیٹھے ہوئے بغلیں بجائیں پھر اس پر تحریر و تقریر کی شاخ اور اڑنگے بازی۔ غرض کچھ تو بوجہ نماز مغرب وقت مذکورہ میں گنجائش کم تھی، رہی سہی اس تدبیر سے گئی گذری۔ مگر جب بنام خدا ہم نے ان سب باتوں کو سر کھا تو منجملہ ان شرائط کے ان کے مکان پر مناظرہ ہونے کا سرکار نے اڑا دیا، حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی اور رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے اور اس سے خارج ہو کر کچھ ممانعت نہیں۔

اس پر ہم نے میدان عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا تو پنڈت جی کو اپنے دن نظر آئے اور سوائے انکار اور کچھ نظر نہ آیا۔ لاچار ہو کر یہ نے یہ چاہا کہ اپنے اعتراض ہی بھیج دو تاکہ ہم ہی مجمع عام میں ان کے جواب سنا دیں اور مرضی ہو تو آؤ مناظرہ تحریری ہی سہی مگر جواب تو در کنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی، شکرم میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔

مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی کہ جو ان کے اعتراض سننے والوں سے سنے ہیں ان کے جواب مجمع عام میں سنا دیں مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی اور ہم کو دو بارہ

[1] ارواح ثلاثہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۸

ترجمہ رسالت وغیرہ ضروریات دین واسلام بھی کچھ کہنا تھا اور بوجوہ بارش وخرابی راہ وقرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنائے جو سب میں مشکل تھے اور دو جلسوں میں توحید ورسالت کا ذکر کرکے شب بست وسوم ۲۳ ماہ شعبان سے رڑکی روانہ ہوا اور ایک دن منگلور اور تین دن دیوبند ٹھہر کر تاریخ مذکور کو اس قصبۂ ویرانہ میں پہنچا جس کو نانوتہ کہتے ہیں اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے۔

اس روداد سے معلوم ہوگیا کہ رڑکی میں پنڈت صاحب صرف حضرت کا وجود دیکھ کر ہی حضرت کے جلال روحانی سے مغلوب ہوکر بھاگ گئے۔ اس کے بعد حضرت نے اسی پنڈت کے تمام اعتراضات کا جواب لکھ کر پیش کیا جو کتابی شکل میں کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوا ہے۔

سرزمین دیوبند کا بچہ بچہ مناظر پیدا ہوا

بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جذبۂ جہاد نے دارالعلوم کو ایسا رنگا ہے کہ اب جو بھی وہاں سے نکلتا ہے وہ محمد قاسم بن کر ہی نکلتا ہے

بانی دارالعلوم نے انگریز کے خلاف بیج بو کر جس پودے کی بنیاد رکھی تھی آج وہ ایک تناور درخت ہے جس کے پتے پتے سے عیسائیت یہودیت کے خلاف جہاد کی بو آتی ہے۔

اگر بانی دارالعلوم کی ذات جامع صفات وکمالات تھی تو گویا اس مادر علمی کا وجود ہی سراپا صفات بن گیا۔

فرزندان دارالعلوم میں اگر سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کا جذبۂ جہاد ہے تو شاہ ولی اللہ کی فراست ہے، شاہ عبدالعزیز کا تفقہ ہے تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا تقویٰ ان کی درویشی اور بصیرت عالیہ بھی موجود ہے، کفر وشرک

الحاد وزندقہ جس عنوان وتعبیر سے دنیا میں نمودار ہوا فرزندان دارالعلوم دیوبند نے فوراً للکارا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

دارالعلوم کا دفاع عن الدین

مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی خواہ وہ فتنہ نقل وروایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اٹھا اس جماعت نے ہمیشہ اعلاء کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا۔[1]

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہمیں بھی اس مرد حق پرست کی روحانی اولاد میں شامل فرمائے اور وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم کا مصداق بنا دے آمین وما علینا الا البلاغ ناچیز شرف علی تھانوی۔

پیکر زہد وتقدس، جانشین انبیاء
شان تقدیس امم، ناموس دین مصطفیٰ
رہنمائے عالم اسلام، فخر ایشیا
یعنی مولانا حسین احمد اسیر مالٹا
جن کے لکھتے ہی جبین جاودانہ خم ہوگئی
ایک ساعت کے لئے نبض دو عالم رک گئی

ع[1] رسالہ قبلہ نما صفحہ ۱ مطبوعہ دیوبند

---

[1] تاریخ دارالعلوم از قاری محمد طیب صاحب صفحہ ۵۰ مطبوعہ دیوبند

عشقِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

اور

اکابرِ دیوبند

حضرت مولانا محمد اجمل خطیب لاہور

حضرت مولانا نانوتوی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ عشق و محبت اور اخلاص و عقیدت تھی اور آپ کی سنتوں کے شیدائی اور فدائی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اُن کے گوشت پوست میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ مدینہ منورہ کی گلیوں اور کوچوں کے ذرات پر جان نثار کرتے تھے۔ ذیل کے واقعات و حالات مندرجہ بالا دعاوی کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔

حضرت مولانا جب حج کیلئے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ سے کئی میل دور ہی سے پا برہنہ چلتے رہے آپ کے دل اور ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں جوتا پہن کر چلیں حالانکہ وہاں سخت نوکدار پتھر اور چبھنے والے سنگریزے بہت ہوتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، جناب مولانا حکیم منصور علی خان حیدرآبادیؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جو اس سفرِ حج میں حجۃ الاسلام کے رفیقِ سفر تھے کہ مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر برہنہ پہنچ گئے (سوانح قاسمی جلد ۲)

نیز حکیم صاحب مرحوم کے حوالے سے ارقام فرماتے ہیں کہ جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں روضہ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا، فوراً جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ مرحوم نے اپنے جوتے اتار کر بغل میں دبا لئے اور پا برہنہ چلنا شروع کیا۔ (صفحہ ۲، ص ۶۱)

مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہ اصل واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نانوتویؒ کو مدینہ طیبہ اور گنبدِ خضرا کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی وارفتگی تھی اور دیکھئے کہ تادب حسن کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرطِ محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت و محبت جناب امام الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے ورنہ یہ ایک سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین ہے۔ جو کچھ بھی ہے اور جتنا کچھ بھی ہے وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہے اور آپ ہی کے واسطے سے ہے اور ایسے ہی موقع کے لیے کسی کشتہ عشق نے یہ کہا ہے ؎

وما حب الديار شغفن قلبي
ولكن حب من سكن الديار

نیز اللہ میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ حصہ جو آپ کے جسدِ اطہر سے لگ چکا ہے وہ عرشِ عظیم سے

سے بھی زیادہ مرتبہ اور فوقیت رکھتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء (جلد ۱ ص۹۱ سیرت شبلی جلد ۲ ص۳۱) اور روح المعانی جلد ۵ ص۲۲۱ اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ؎

عرش پر گرفوقیت بھاری ہے تو ہے اس خاک سے
جس میں محو خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار

ہندوستان میں بعض حضرات کیمخت (سبز رنگ) کا جوتا بڑے شوق سے پہنتے تھے اور اب بھی پہنتے ہیں لیکن حضرت نانوتویؒ نے ایسا جوتا مدت العمر کبھی نہیں پہنا۔ اور اگر کوئی تحفۃً لا دیتا تو اس کے پہننے سے اجتناب وگریز کرتے اور کسی اور کو ہدیہ دے دیتے۔ سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لئے گریز کرتے کہ سرور دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد خضراء کا رنگ سبز ہے۔ پھر بھلا ایسے رنگ کے جوتے پاؤں میں کیسے اور کیونکر استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ: "تمام عمر کیمخت کا جوتا اس وجہ سے کہ قبہ مبارک سبز رنگ کا ہے نہ پہنا۔ اگر کوئی ہدیہ لے آیا تو کسی دوسرے کو دے دیا۔" (الشہاب الثاقب صفحہ ۵) اندازہ کیجئے اس نظر بصیرت اور فریفتگی کا کہ گنبد خضراء کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر عقیدت و الفت ہے جس کے اندر عظیم المرتبت مکین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں جن کا نظیر اور جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ قیامت تک آ سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مرحوم نے شاید اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

رخ مصطفےٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکان آئینہ ساز میں

حضرت حجۃ الاسلامؒ نے نظم و نثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعریف و توصیف بیان کی ہے اور جس خلوص و عقیدت سے اس کا اظہار کیا ہے، ان کی کتابوں (مثلاً آب حیات، قبلہ نما، ابرو اربعین، تحذیر الناس وغیرہ) کو پڑھنے اور دیکھنے والا بجز کسی متعصب کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام کتابوں کی عبارتیں تو نظم و نثر میں آپ نے سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں بیان فرمائی ہیں سب کا نقل کرنا تو کار دارد صرف بطور نمونہ ہم قصائد قاسمی کے پہلے قصیدہ سے (جو ایک سو اکاون اشعار پر مشتمل ہے) چند اشعار بلا رعایت ترتیب پیش کرتے ہیں ؎

تو فخر کون و مکاں زبدۂ زمین و زماں
امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
لگا تا ہاتھ نہ پتلے کو ابو البشر کے خدا
اگر وجود نہ ہوتا تمہارا آخر کار
کہاں بلندی طور اور کہاں تیری معراج
کہیں ہوئے ہیں زمین اور آسمان ہموار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا
بنے گا کون ہمارا ترے سوا غم خوار
جمال کو ترے کب پہنچے حسن یوسف کا
وہ دلربائے زلیخا تو شاہد ستار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی
کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا سردار

حضرت مولانا شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ "الشہاب الثاقب" میں لکھتے ہیں کہ حضرت نانوتویؒ کو کس قدر عقیدت، محبت ذات پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور کس قدر تعظیم آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے قلب انور میں بھری ہوئی ہے۔

عشق و محبت: عقیدت و الفت میں ڈوبے ہوئے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے
کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد میری مشتِ خاک کو پسِ مرگ
کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار
و لے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار
تمہارے عشق میں رو رو کے ہوں نحیف اتنا
کہ آنکھیں چشمۂ آبی ذرہ دل غبار

حضرت ان اشعار کے مضامین پر غور فرمائیں کہ کس قدر اخلاص و نسبت اور عقیدت بات بات سے ٹپکتی ہے۔ گویا کہ محبت خاتم المرسلین علیہ السلام میں چُور چُور ہیں اور اس قدر منہمک ہیں کہ ماسوا کی خبر نہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے ایک قصیدہ مشائخ چشتیہ صابریہ کے ساتھ توسل کے بارے میں تحریر فرمایا ہے جو مناجاتِ مقبول کے اخیر میں موجود ہے۔ جس کی ابتدا یوں فرمائی ہے ؎

الٰہی غرق دریائے گناہم　تو میدانی و خود ہستی گواہم
گدا خود را تیرا سلطان چو دیدم　بدرگاہ تو اے رحمان دویدم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں ؎

بحق آنکہ او جانِ جہان است　خدائے رہنمائش ہفت آسمان است
بحق آنکہ محبوبش گرفتی　براے خویش مطلوبش گرفتی
پسندیدی ز جملہ عالم آں را　بما بگذاشتی باقی جہاں را
گزیدی از ہمہ گلہا تو او را　نمودی صرف او ہر رنگ و بو را
ہمہ نعمت بنام او نمودی　دو عالم را بکام او نمودی
بآں کو رحمۃ للعالمین است　بدرگاہت شفیع المذنبین است
بحق سرورِ عالم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)　بحق برترِ عالم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
بذاتِ پاک خود کاں اصل ہستی است　ازو قائم بلندی یا و پستی است
ثنائے او زِ مقصد در جہاں است　کہ کنہش برتر از کون و مکان است

خاتمے پر اللہ تعالیٰ سے دعا اس انداز میں کررہے ہیں

درونم را بعشق خویشتن سوز　بہ تیر درد خود جان و دلم دوز
دلم را محو یاد خویش گرداں　مرا حسب مراد خویش گرداں
اگرچہ لائقم قدرت تو داری　کہ خار عیب از جانم برآری
بخوبی زشت را مبدل نمائی　سیاہی را بہ بخشی روشنائی
گناہم را اگر دیدی نگر ہم　بعفو و فضل خدا اے شاہ عالم
بچشم لطف اے حکم تو برسر　بحال قاسم بے چارہ بنگر

انگریز کے خلاف جہاد ۱۸۵۷ء میں دیگر اکابر کی طرح حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حافظ محمد ضامن صاحب شہید (جو ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر شہید ہوئے) حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بھی بنفس نفیس خود شاملی وغیرہ میں شامل تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے۔ اور تذکرۃ الرشید کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ جب ظالم انگریز کی طرف سے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور گرفتار کنندگان کے لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا۔ اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے تھے تو چونکہ حضرت نانوتویؒ کو کمال شجاعت، استقلال اور ہمت

کلب معاذ مالی تھی، اس لئے وہ ہر قسم کے نتیجہ سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں پھرتے تھے۔ مگر اعزہ اور اقارب اور ہمدردوں کی طرف سے جب شدید اور بلیغ اصرار ہوا کہ حضرت وقت کی نزاکت کے پیش نظر ضرور روپوش ہو جائیں۔ تو ان کے اصرار کی وجہ سے تین دن روپوش رہے۔ اور لکھا ہے، تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔ لوگوں نے بہت روپوشی کے لئے عرض کیا تو فرمایا تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن روپوش رہے ہیں۔" (سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳ از مولانا گیلانی)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

(ماخوذ از ضیاء القلوب مصنفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔ کلمات پند و وصیت نیز کہ از فقیر محبت و عقیدت و ارادت وارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ ایشاں بجائے من و من بمقام ایشاں شدم و صحبت ایشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ نوشتہ شد در نظر شاں تحصیل نمائند انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نخواہند ماند اللہ تعالیٰ در عمر شاں برکت دہد و از تمام نعمائے عرفانی کمالات و قرب بینت خود مشرف گرداند و بمراتب عالیہ رساند و نور ہدایت شاں عالم را منور گرداند و تا قیامت فیض ایشاں جاری دارد بحرمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ الامجاد۔

ملفوظ (۳۵۷) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کو حضرت مولینا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت ظاہر فرمایا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ہر ایک بزرگ کو ایک خاص لسان دی جاتی ہے۔ میری لسان مولوی محمد قاسم صاحبؒ ہیں۔

حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی شخصیت اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ (جو جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں) کی نظر میں:

حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو مکہ مکرمہ سے خطوط تحریر فرماتے ہیں کہ جن میں سے بعض کے مضامین اور القاب مندرجہ ذیل ہیں۔

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ، بخدمت فیض درجت منبع علوم شریعت و طریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر قرب مراتب و درجات عالیات عطا فرماوے اور آپ کی ذات بابرکات کو ذریعہ ہدایت خلق فرماوے آمین

الحمد للہ آپ کی کیفیات باطنی و حالات متقدمہ سن کر کرو شکر اللہ کا بجا لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات اور قرب کو ترقی بالائے ترقی بخشے اور ہم بے بہروں کی نجات کا وسیلہ بنائے۔

ایک اور خط میں تحریر فرمایا: از مکہ معظمہ حارۃ الباب ۳۰ رجب ۱۳۰۷ھ، ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی اور جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے

از مکہ مکرمہ ۲۳ رمضان شریف ۱۳۱۰ھ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت، سراپا خیر و برکت، سرمہر خلوص محبت

عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
الحمدللہ فقیر خیریت سے ہے۔ آپ کے واسطے دعا خیر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
آپ کو اپنے عشق و محبت، رضا و تسلیم میں رکھ کر آپ کا فیض جاری کر کے
حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔

ایک دوسرے خط میں عارف باللہ کے مبارک لقب سے یاد فرما
رہے ہیں۔ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہٗ۔ بخدمت فیض درجت، سراپا خیر و
برکت عارف باللہ عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمدللہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی
صحت و سلامتی خداتعالیٰ کی جناب سے مطلوب۔ از مکہ مکرمہ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ

خط نمبر۔ ملاحظہ ہو۔ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہٗ۔ بخدمت فیض درجت
جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی
ادام اللہ فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات
بابرکات کو باعث استقامت خلق و وسیلہ ہدایت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم
سب کو اپنی مرضیات پر چلاوے اور ہمارے اور فقیر کا بھی وقت
قریب ہے دعا حسن خاتمہ سے مدد فرماویں۔

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہٗ۔ بخدمت بابرکت و فیض درجت
عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔

سلام علیکم چو در خاطری۔ گر از چشم دوری بدل حاضری۔
عرض داشت از مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ بخدمت مرشد
برحق قدوۃ السالکین اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ۔

حضرت نے جو بندۂ نالائق کے حالات سے استفسار فرمایا ہے
میرے ماوائے دارین! اس ناکس کے کیا حالات اور کس درجہ کی کوئی خوبی
ہے جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں۔ بخدا سخت شرمندہ ہوں
کچھ نہیں ہوں۔ مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں، ناچاری کچھ لکھنا پڑتا
ہے۔ حضرت مرشدمن! اعلم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے
دور ہوئے۔ غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے۔ اس سال تک
دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے ہیں اور
اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء
میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین اُن سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ
کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے اور حضرت کے ہاں حاضری کے ثمرہ
کا یہ خلاصہ ہے کہ بند قلب (دل کی گہرائی) میں غیر حق تعالیٰ سے نفع و ضرر
کا التفات نہیں واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی
ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی کے مدح و ذم کی پرواہ نہیں رہی۔ معصیت کی طبعاً
نفرت، اور طاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت
یادداشت بیرنگ کا ہے جو مشکوٰۃ انوار حضرت سے پہنچا ہے بس زیادہ عرض
کرنا گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ یا اللہ معاف فرما کہ حضرت کے ارشاد سے
تحریر ہوا ہے۔ والسلام ۱۳۰۶ھ۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اپنی کتاب
"الشہاب الثاقب" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ
سرہٗ العزیز کے حالات جس نے مشاہدہ کئے ہیں وہ بیشک آپ کی محبت مصطفویہ
اور تعظیم احمدی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ ہم چند باتیں چشم دید کر جن سے
اکثر حضرات واقف ہوں گے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے یہاں تبرکات میں حجرہ مطہرہ نبویہ کے غلاف
کا ایک سبز ٹکڑا بھی تھا۔ بروز جمعہ کبھی کبھی حاضرین و خدام کو جب
ان تبرکات کی زیارت خود کرایا کرتے تھے۔ تو صندوقچہ خود اپنے
دست مبارک سے کھولتے اور غلاف کو نکال کر اول اپنی آنکھوں
سے لگاتے اور منہ سے چومتے تھے پھر اوروں کی آنکھوں سے لگاتے
اور اُن کے سروں پر رکھتے۔

۲۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں آتیں تو نہایت عظمت و حفاظت سے رکھی جاتیں
اور اوقات مبارکہ متعددہ میں خود بھی استعمال فرماتے اور حضار بارگاہ

مخلصین کو بھی نہایت تعظیم وادب سے اس طرح تقسیم فرماتے گویا نعمت غیر مترقبہ اور اثمار جنت ہاتھ آگئے ہیں۔ حالانکہ بصرہ اور سندھ وغیرہ کی کھجوریں ہمیشہ آتی رہتی تھیں، مگر ان کی وقعت اس سے زیادہ ہرگز نہ تھی کہ تمام میووں میں سے یہ بھی ایک میوہ ہے۔

۳ مدینہ منورہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں نہایت حفاظت سے رکھتے۔ لوگوں کو پھینکنے نہ دیتے اور نہ خود پھینکتے تھے۔ ان کو ہاون دستہ میں کُٹوا کر نوش فرماتے، بشکل چھالیوں کے کتر واکر لوگوں کو استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔

۴ احقر ماہ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ میں ہمراہی بھائی محمد صدیق صاحب جب حاضر خدمت ہوا تھا، تو بھائی صاحب سے پہلے ہی حاضری میں حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے دریافت فرمایا کہ حجرہ شریف علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خاک بھی لائے ہو یا نہیں، چونکہ وہ احقر کے پاس موجود تھی، اس لئے باادب ایستادہ پیشکش خدمت اقدس کیا، تو نہایت وقعت وعظمت سے قبول فرما کر سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ بعد نماز عشاء خواب استراحت فرماتے وقت اپنا غالباً اس سرمہ کو آخر وقت تک استعمال کرتے رہے۔ اس قصے سے عام خدام واقف ہیں۔

۵ بعض مخلصین نے کچھ کپڑے مدینہ منورہ سے خدمت اقدس میں تبرکاً ارسال کئے حضرت نے نہایت تعظیم اور وقعت کی نظر سے اُن کو دیکھا۔ بعض طلبہ اور حضار مجلس نے عرض کیا کہ حضرت اس کپڑے میں کیا برکت حاصل ہوئی، یورپ کا بنا ہوا ہے، تاجر مدینہ میں لائے، وہاں سے دوسرے لوگ خرید لائے اس میں تو کوئی وجہ تبرک ہونے کی معلوم نہیں ہوتی۔ حضرت نے شبہ کو رد فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ کی اس کو ہوا لگی ہے۔ اس وجہ سے اس کو یہ اعزاز اور برکت حاصل ہوئی۔ پس خیال کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کو محبت نبوی میں یہ حال ہو کہ دیار محبوب کی گٹھلیاں اور دوسری چیزیں محبوب کے دوست اور دیگر وہ اشیاء جن کو بوجہ دیار محبوب ہونے کے تبرک عظیم بن جاویں (جس کا تذکرہ شہر مدینہ منورہ کی خاک تک پہنچا حال ہے) اس عظمت سے رکھا ہو — اور وہ چیزیں جن کو کفار نے وہاں کی سرزمین اپنے ہاتھ سے بنایا ہو۔ — محبوب کی چند روزہ ہوا کھانے کی وجہ سے تبرک عظیم بن جاویں۔ خود احقر (حضرت مدنیؒ)[1] کا مشاہدہ ہے کہ مدینہ والے ان کھجوروں کے بھی نام مقرر ہوئی ہیں۔ اسی سال لاکر حضرت اعلیٰ کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ان کی حضرت نے اس قدر وقعت فرمائی کہ نہایت اہتمام سے ان کے متبرکہ کھجوروں حصے فرما کر اپنے اقرباء، مخلصین و محبین میں تقسیم فرمائے اور اپنا بھی اُن میں ایک حصہ قرار دیا۔ صاحبو! ہزاروں مدعین محبت سے احقر کو ملاقات کی نوبت آئی اور وہ خاص کھجوریں اُن کو دی گئیں، لیکن کسی کو اس اخلاص وعظمت کے ساتھ لیتے ہوئے نہیں دیکھا

۶ حجرہ مطہرہ نبویہ کا جلا ہوا زیتون کا تیل وہاں سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مخلصین نے ارسال کیا تھا۔ حضرت نے (باوجود نزاکت طبعی کے جس کی حالت عام لوگوں میں ظاہر ہے) اس کو پی لیا۔ حالانکہ اولاً زیتون کا تیل خود بے مزہ ہوتا ہے۔ ثانیاً بعد جلنے کے اس میں اور بھی تیزی ہو جاتا ہے۔ مگر واہ رے عاشق سیدالرسل وشیدائے خاتم الانبیاء علیہم السلام باوجود اس نزاکت ولطافت کے، اسے بلا تامل خوشگوار لذیذ چیز کی طرح نوش فرمایا اور اسے بجائے اس کے کہ کل کرجزو بدن بناتے، پی کر جزو بدن بنالیا۔

۷ حضرت گنگوہیؒ کو سنت مصطفویہ کے ساتھ عشق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی مہینے چھوڑ کر بلا ضرورت انگریزی مہینوں کا استعمال بھی گراں گزرتا تھا۔ مولوی انیس صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ گوالیار کب جاؤ گے۔ انہوں نے جواب دیا جولائی کی فلاں تاریخ کو۔ حضرت مولانا نے تأسف کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ

---

[1] حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

اور ماہ و تاریخ نہیں ہیں جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جاوے یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تحریرات میں کہیں انگریزی یا ہندی مہینوں کا نام نہیں۔

۸ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز زبدۃ المناسک میں فرماتے ہیں۔ اور جب مدینہ منورہ کو چلے، تو کثرت درود شریف کی راہ میں بہت کرتا ہے پھر جب درخت وہاں کے نظر پڑیں، تو اور زیادہ کثرت کرے جب عمارت وہاں کی نظر آوے، تو درود پڑھ کر کہے۔

اللھم ھذا حرم نبیك فاجعله وقایة الی من النار و امانًا من العذاب سوء الحساب۔

اور مستحب ہے کہ غسل کرے یا وضو اور کپڑا پاک صاف اچھا لباس پہنے اور نئے کپڑے ہوں تو بہتر۔ اور خوشبو لگانے اور پہلے سے تیار ہو لے اور خشوع اور خضوع جس قدر ہو سکے فرد گذاشت نہ کرے، اور عظمت مکاں کی خیال کئے ہوئے درود شریف پڑھتا ہوا چلے۔ جب مدینہ منورہ میں داخل ہو کہے رب ادخلنی الخ اور ادب اور حضور قلب کے ساتھ دعا کرتا رہے اور درود شریف بہت پڑھے۔ وہاں جا بجا موقع قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں سوار نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھ کو حیا آتی ہے کہ سواری کے کھروں سے اس سرزمین کو پامال کروں کہ جس میں حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے پھرے ہوں اور بعد تحیۃ المسجد کے سجدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس کے نصیب کی ہو پھر روضہ کے پاس حاضر ہو اور باادب تمام خشوع کھڑا ہو اور زیادہ قریب نہ ہو اور دیوار کو ہاتھ نہ لگاوے کہ محل ادب اور ہیبت ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد شریف میں آنجناب کو قبلہ کی طرف چہرہ مبارک کئے ہوئے تصور کرے اور کہے السلام علیک یا رسول اللہ الخ اور بہت پکار کر نہ بولے۔ آہستہ خضوع سے ادب سے بہ نرمی عرض کرے۔ اور پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرے اور شفاعت چاہے کہے: یارسول اللہ اسئلك الشفاعة واتوسل به الی اللہ فی ان اموت مسلما

علی ملتك و سنتك اور ان الفاظ میں جس قدر چاہے زیادہ کرے، مگر ادب اور عجز کے کلمات ہوں اور درود شریف اور دعا سے غافل نہ ہو جس قدر کثرت ہو سکے بہتر ہے۔ اور جب تک مدینہ منورہ میں رہے تلاوت اور ذکر کرتا رہے اور صلوٰۃ و سلام خوب پڑھتا رہے، اور راتوں میں بہت جاگے اور وقت ضائع نہ کرے۔

۹ حضرت مولانا گنگوہیؒ چونکہ بہت متبع سنت تھے (اتباع سنت واصل ثمرہ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے) ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ مسجد سے بایاں پاؤں نکالنا اور جوتا سیدھے پاؤں میں پہننا سنت ہے۔ دیکھیں حضرت ان دونوں سنتوں کو کیسے جمع فرماتے ہیں۔ لوگوں نے اس کا اندازہ کیا جب حضرت مولانا مسجد سے نکلنے لگے تو آپ نے پہلے بایاں پاؤں نکال کر کھڑاؤں پر رکھا پھر سیدھا پاؤں نکالا، تو کھڑاؤں کی کھونٹی انگوٹھے میں ڈالی۔ اس کے بعد بایاں پاؤں میں کھڑاؤں پہنی۔ سبحان اللہ کیسا دونوں سنتوں کو یکجا جمع فرمایا ہے (ازارواح ثلاثہ)

حضرت گنگوہیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ

"بر تصویر روضہ منورہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم و نقشہ مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفاً و نقشہ مکہ مکرمہ کہ در دلائل الخیرات واقع است بوسہ دادن و چشم مالیدن از روئے شرع جائز است یا نہ"؟

الجواب بوسہ دادن و چشم مالیدن بریں نقشہا ثابت نیست و اگر از غایت شوق سرزد ملامت ہم بر جانباشد، کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔

الجواب صحیح، اشرف علی عفی عنہ ۲، محرم ۱۳۲۲ھ امداد الفتاوی۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۶۵۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو دیکھا ہے کہ ہر وقت درود شریف کا ورد رہتا تھا اور بات چیت بہت کم کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ جو لوگ سال بھر میں صرف ربیع الاول میں ایک مرتبہ آئیں

وہ تو سب اور عاشق ہوں اور جو ہر وقت سرشار ہے۔ اس کو منکر سمجھا جائے کیسا غضب ہے۔ صاحبو! کہاں گیا انصاف اور تدین۔ (ماخوذ از وانذالنور صفحہ ۲۰۶)

حضرت حکیم الامتؒ نے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ کتنے غضب اور ظلم کی بات ہے کہ ہمارے بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں اور وہابی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے قریب میں ایک قصبہ ہے جلال آباد۔ وہاں پر ایک جبہ شریف ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے، اس کی زیارت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اس کے متعلق میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر منکرات سے خالی وقت میں زیارت میسر آنا ممکن ہو تو ہرگز دریغ نہ کریں۔ تبلایئے یہ باتیں وہابیت کی ہیں۔ (ملفوظ صفحہ ۱۸۴ حصہ چہارم الافاضات الیومیہ)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ ولادت ۱۲۴۹ھ متوفی ۱۳۰۲ھ

مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد محترم کا نام مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہما ہے جو عربی کالج دہلی کے صدر رہے تھے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی اور دیگر اکابر ہند کے استاد تھے اپنے زمانہ کے زبردست عالم اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ نیز مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحب دونوں ہم زلف ہیں۔ مولانا آخری عمر تک دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے رہے اور دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کی۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسے آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

قصیدہ میمیہ در نعت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کہاں کہاں پھرانے گی گردش ایام
کبھی تو پائے کہیں خاطر حزیں آرام
رسول ایسا کہ رسل ہیں امتی اس کے
وہ بادشاہ سب بادشاہ اس کے غلام
خدا ہے عارف مداح ذات عالی کا
جو کوئی مدح کا دعویٰ کرے خیال ہے خام
جو کوئی آپ کی الفت میں ہو رہے دیوانہ
نہیں ہے اس کو جنون اور نہیں اسے برسام
جو دیکھے آپ کو دیکھا ہے اس نے بے شک حق
وہ خواب خواب ہے اضغاث ہے نہ وہ احلام
تمہارے حق میں زمیں مسجد و طہور ہوئی
ہرا ہے رعب سے مشرق و روم سے تا شام
یبایعونك انما یبایعون اللہ
تمہارے ہاتھ پہ بیعت کا ہوا اکرام
اطاعت آپؐ کی بالکل اطاعت حق ہے
وَمَنْ یُطِع میں نہیں کسی نوع کا نہیں ابہام
کہا نہ آپؐ کا مانے وہ کیوں نہ ہو کافر
کلام آپ کا ہے وحی اور خدا کا کلام
شرف ہے آپؐ نے آباد اور ابناء کو
مکرم آپؐ سے اخوال اور سب اعمام
وہ کون ہے کہ نہیں ذات پاک کا خادم
مقام غار میں حاجب ہیں عنکبوت و حمام

گواہ آپ کے ہیں سوسمار و مار و شتر
بہائم اور طیور اور وحوش اور ہوام
ہے سنگریزوں کا نطق اور طعام کو تسبیح
ستون چوب کا گریہ ہے اور حجر کا سلام
ہوا ہے انگلیوں سے بحر بیکراں کا جوش
ہے ایک جام سے سیراب سارے تشنہ کام
تمہاری وصف سے ایمان تازہ ہوتا ہے
تمہارا وصف زبان پہ علامت اسلام
بدولت آپ کے پائی ہے دولت ایمان
کیا ہے آپ نے آغاز کیجئے اتمام
یہ سچ ہے ہم نہیں لائق نگاہ عالی کے
مگر بجز در دولت کدھر کو جائیں غلام
تمام خلق کی ہو وے گی آپ پر ہی نگاہ
جب آپ بحر شفاعت کریں گے وہاں اقدام
وہ جتنے آپ کے ہیں آل پاک یا ش مل
صحابہ آپ کے جو ہیں فدائی اور خدام
الٰہی سب پہ نازل ہزار لاکھ کروڑ
زیادہ سنکہ ہما شکوے صلوٰۃ و سلام
یہ آرزو ہے کہ ورد زباں سدا ہی رہے
جہاں سے جاؤں تو ہو وے زباں پہ آپکا نام

نعت بزبان فارسی

روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت عشق و محبت کا مؤثر منظر جرہ

برسرم کوہ گناہے یا رسولؐ — پیش لطفت برگ کاہے یا رسولؐ
من خستہ جگر ہم کن کرم — از سر لطف نگاہے یا رسولؐ
گر سلام ما چو یابد یک جواب — پس بود ایں عز و جاہے یا رسولؐ
نیست در کونین ہمچو من گدا — در دو عالم چوں تو شاہے یا رسولؐ
بر درت با پشت دوتا آمدم — بستہ ام بار گناہے یا رسولؐ
بر در نیعنت رسیدم کن نگاہ — بر چنیں حال تباہے یا رسولؐ

کن بر من خستہ جگر یا رحمۃ للعالمین — ہم از سر لطفے نظر یا رحمۃ للعالمین
من بدترین دو جہاں من کہترین کون و مکاں — سرگشتہ حیران در بدر یا رحمۃ للعالمین
گمنام را اندر جہاں پس کیست ز ہیچ کسے — رفت اندرت محروم اگر یا رحمۃ للعالمین

نوٹ: حضرت مولانا مرحوم کا تخلص گمنام تھا۔ (ماخوذ از بیاض یعقوبی)

مولانا خلیل احمد صاحب المدنی المہاجر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۶ھ)

آپ مولانا مملوک علی استاذ العلماء کے نواسے اور مولانا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے ہیں۔

۱۔ ایک بار فرمایا کہ میں نے اللہ تعالےٰ سے تین دعائیں کی تھیں۔ ایک دعا یہ مانگی تھی کہ عرب میں حکومت اسلامیہ شرعیہ دیکھ لوں دوسری دعا یہ تھی کہ بذل المجہود شرح ابی داؤد شریف زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ تیسری دعا یہ تھی کہ جنت البقیع جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہونا نصیب ہو۔ الحمد للہ دو دعاؤں کی قبولیت تو آنکھوں سے دیکھ لی تیسری دعا کا انتظار ہے۔

حضرت مولانا صاحب مستجاب الدعوات تھے اللہ تعالےٰ نے آخری دعا کو بھی شرف قبولیت سے نوازا۔ ۱۵ ربیع الثانی ۴۶ھ بروز چہارشنبہ بعد نماز عصر مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً میں واصل بحق ہوئے اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ اللہم اکرم نزلہ و اجعل الجنۃ مثواہ ۔

می پذیرد آں مراد متقین

۲۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ۱۳۲۳ھ میں حج کے لئے گیا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مکہ مکرمہ میں مقیم تھے حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی سارا وقت

حرم شریف میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے پاس گذارتا اور المینان کے ساتھ طواف اور ملازمت میں مشغول رہتا۔ جب حج سے فارغ ہو کر قافلہ کے مدینہ منورہ چلنے کا وقت آیا اور چاروں طرف یہ افواہ پھیلی کہ راستہ مامون نہیں ہے اور جان و مال کا ہر وقت خطرہ ہے تو حضرت حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی خلیل احمد کہو اب کیا ارادہ ہے میں سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستہ میں امن نہیں ہے اور اسی واسطے حجاج بکثرت واپس وطن جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا قصد تو مدینہ منورہ کا پختہ ہے۔ کہ موت کے لئے جو وقت مقرر اور مقدر ہو چکا ہے وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا ہے اور اس راستہ میں اگر موت آ جائے تو زہے نصیب ؎

میں موت ڈھونڈھتا ہوں زمین حجاز میں

اب اگر موت کے ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑ دوں تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہے۔ یہ سن کر اعلیٰ حضرت کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا اور فرمایا تم ضرور جاؤ اور ان شاء اللہ تعالیٰ با امن و امان پہنچ گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بخیریت آستانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچا دیا۔

پہلی دعا کی قبولیت۔ الحمد للہ مکہ شریف میں شرعی احکام کا اجرا اور راستوں میں امن و امان آنکھوں سے دیکھ لیا۔

دوسری دعا ابو داؤد شریف کی شرح بذل المجہود ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ شروع کی ۲۱ شعبان ۱۳۴۵ھ پورے دس برس پانچ ماہ دس دن میں بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل پانچ جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی (بذل المجہود کی خصوصیات) (۱) ہر مسئلہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تشریح اور باہمی محاکمہ کیا گیا ہے۔ (۲) مذہب حنفیہ کی تحقیق اور کافی دلائل کے بعد دوسرے مذاہب کے دلائل کے بہترین اور متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ (۳) ہر راوی کے متعلق پوری جرح و تعدیل کی گئی۔ (۴) جو روایات ترجمۃ الباب کے موافق نہیں ان کی نہایت عمدہ توجیہ اور موافقت ظاہر کی گئی ہے۔ (۵) مصنف نے جن روایات کو تعلیقاً بیان کیا ہے دوسری کتابوں سے ان کی سند اتصال لکھی گئی ہے۔ (۶) جو روایات یہاں مختصر آئی ہیں۔ دوسری کتب میں مفصل آئی ہیں ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا منشا ظاہر کر کے وہ محاسن و حقائق بیان فرماتے ہیں جس کا حظ و لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو فن حدیث سے مناسبت اور صاحب حدیث سے عشق و محبت ہو۔

۱۳۴۴ سہارنپور سے آئے ہوئے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اب میرا پختہ ارادہ ہے کہ شرح ابی داؤد کی تکمیل کے لئے مدینہ منورہ میں اگلے سال بھی قیام کروں گا اور حج کے لئے بھی مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ نہیں کروں گا۔ یہ بات بالکل صحیح اور سچی ہے کہ یثرب کی مٹی میں ملنے کی خواہش اور محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اشتغال اور شرح ابی داؤد کی تکمیل تعلق مکہ سے بدرجہا زیادہ پیاری چیز ہے۔

؎ خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

۱۳۴۴ عرب کے آدمی ہی نہیں بلکہ ہر چیز بالخصوص مدینہ منورہ کی مٹی تک آپ کو بہت پیاری تھی زائرین کو آپ سات کنوؤں کا پانی اور تراب مدینہ منورہ لے جانے کی ترغیب دیا کرتے اور فرماتے کہ ان میں شفا ہے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں لکھتے ہیں: بندہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی معیت میں تھا اور میرے ساتھ چچا صاحب تھے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر سخت بیماری میں مبتلا ہو گئے طبیب نے حرکت کرنا اور ہوا لگنا سخت مضر بتایا اور تاکید کی کہ منہ پر ہر وقت روئی لپٹی رہے کہ ہوا نہ لگنے پائے ورنہ جان کا خطرہ ہے حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ آستانہ شریف کی مٹی لے لو اور وہ چچا صاحب کے منہ پر ملو میں نے کہا حضرت وہاں مٹی کہاں فرمایا قالین کے نیچے زمین پر جو بھی گرد و غبار ہو وہ اپنے ہاتھ کو مل لو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ان کے چہرے پر ہاتھ مل کر روئی لپیٹ دی عشاء کی نماز سے آکر

چچا صاحب کی مزاج پرسی کی تو چچا صاحب نے مسرت کے ساتھ فرمایا کہ ذرا میرا منہ کھول کر دیکھو مجھے تو افاقہ معلوم ہوتا ہے اب نہ وہ سوزش ہے نہ بے چینی یہ خاک مبارک تو اکسیر ثابت ہوئی دوائیں سب پھینک دو پھر وہی تھوڑی سی مٹی لے آؤ مجھے انتہائی فرحت و مسرت ہوئی پھر جا کر قالینوں کے نیچے سے خاک آستانہ عالیہ کافی مقدار میں فراہم کر کے ساتھ لایا حسب سابق خاک شفا استعمال کی مرض ختم ہو گیا سارے سرخ دانے مرجھا کر بیاہ پڑ چکے تھے اب بجز ضعف اور نقاہت کے کوئی مرض نہ تھا۔

۵ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ روضہ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں روشن ہونے والا موم خدام روضہ سے تبرکاً لینا کیسا ہے؟ فرمایا بڑا موجب برکت ہے مگر مال وقف ہے کہ یہیں کے استعمال کے لئے بھیجا جاتا ہے اس لئے یوں کرو کہ اپنے طور پر بازار سے موم بتی خرید کر خدام کو دے دو کہ وہ روشن کریں پھر اس کو لے لو۔

۶ روضہ اطہر پر حاضری کے وقت حضرت مولانا کی عجیب کیفیت ہوتی تھی آواز نکالنا تو کیا مواجہہ شریف کے قریب یا مقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے خوفزدہ، مؤدبانہ دبے پاؤں آتے دور کھڑے ہوئے بکمال خشوع صلوٰۃ وسلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے زائرین جو اونچی آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے اس سے آپ کو بہت کوفت اور تکلیف ہوتی اور فرمایا کرتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں اور ایسی آواز سے سلام عرض کرنا بے ادبی اور آپ کی ایذاء کا سبب ہے لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہئے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۲ھ)

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے ہیں علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپ تمام علوم منقولات و معقولات میں کامل مہارت رکھتے تھے قوت حافظہ میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا آپ کے یہاں رد قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے اس سلسلہ میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں بخاری شریف کے درس کی تقریر فیض الباری چار ضخیم جلدوں میں مصر میں طبع ہو چکی ہے جامع ترمذی کی تقریر العرف الشذی دو جلدوں میں ہے ابوداؤد کی تقریر دو جلدوں میں ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی کتب عربی، فارسی میں تصنیف فرمائیں۔ حضرت شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تو نے شیخ تقی الدین بن دقیق العیدؒ، علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں استعارۃً کہوں گا کہ ہاں! میں نے دیکھا ہے کیونکہ حضرت شاہ صاحب کو دیکھا تو گویا ان کو دیکھا۔ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو نورانی وجود والا فرمایا ہے۔ (تحریر مسرت)

حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ جب بہاولپور مرزائیوں کے مشہور و معروف مقدمہ میں دارالعلوم دیوبند سے فریق بن کر تشریف لائے تھے تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہی ہے شاید یہ بات مغفرت کا سبب بن جائے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانبدار اور طرفدار ہو کر بہاولپور میں آیا تھا۔ یہ سن کر ہزاروں کا مجمع چیخیں مار اٹھا اور زار و قطار رونے لگا۔ یہ بات مولانا محمد انوری لائلپوری نے حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی مجلس میں بیان کی تو اس واقعہ کو سن کر حضرت رائے پوریؒ پر رقت طاری ہوئی فرمایا کہ واقعی حضرت شاہ صاحب تو آیۃ من آیات اللہ تھے۔

نوٹ، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت کمزور اور ناتواں ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

وسلم کی طرف دری کی خاطر متواتر پانچ ماہ تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے ویسے عالت میں تشریف لاکر علم و عرفان کے دریا بہاتے رہے مرزائیت کے کفر و ارتداد اور دجل و فریب کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر خوب روشنی ڈالی۔

(دارالعلوم رسالہ)

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری فرماتے تھے کہ جس روز حضرت شاہ صاحب کا وصال ہوا اسا ہے کہ صبح سویرے خلاف معمول بچوں کے ساتھ پیار کرنے لگے سب اہل خانہ خوش تھے کہ آج بفضلہ تعالیٰ طبیعت اچھی ہے بارہ بجے رات تک طبیعت اچھی رہی پھر اچانک خواب ہوگئی پانی طلب فرمایا خادم نے پانی دیا فرمایا کہ مجھے اٹھا لیجئے دو سہارا لگا کر کھانا پینا خلاف سنت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے پانی پی کر لیٹ گئے اور خود قبلہ رخ ہو گئے اور کچھ پڑھنے لگے مولوی حکیم سید محفوظ علی صاحب کو جو (شاہ صاحب کے برادر نسبتی ہیں) اطلاع دی گئی جب وہ آئے تو حضرت شاہ صاحب حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھ رہے تھے اسی کے ساتھ روح مبارک ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ (رسالہ دارالعلوم) یہ تھے عاشق صادق کہ آخری وقت نزع کے عالم میں محبوب خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کا خیال دامنگیر رہا اور اسے کر کے دکھایا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے آپ کا ارشاد ہے من احب سنتی فقد احبنی وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّةِ (ترمذی) جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ آپ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی سنت کے ساتھ محبت کی جائے کیونکہ محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے اسی بات کو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنی ایک رباعی میں خوب بیان فرمایا ہے۔

تعصی الرسول وانت تظہر حبہ
رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ان کی محبت کا اظہار

ھذا العمری فی الفعال بدیع
بھی کرتا ہے یہ بات بالکل انوکھی ہے

لو کان حبک صادقا لاطعتہ
اگر تیری محبت سچی ہوتی تو ان کی اطاعت کرتا

ان المحب لمن یحب مطیع
عاشق جو ہوتا ہے محبوب کا مطیع ہوتا ہے

سعدی شیرازی نے بھی خوب نقشہ کھینچا ہے:

خلاف پیمبر کسے راہ گزید ... کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
محال است سعدی کہ راہ صفا ... تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

قصیدہ مدحیہ انوریہ

شَفِیْعٌ مُطَاعٌ نَبِیٌّ کَرِیْمٌ
آپ شفیع ہیں اور آپ کی ہستی قابل اطاعت ہے اور آپ نبی کریم ہیں

قَسِیْمٌ جَسِیْمٌ نَسِیْمٌ وَسِیْمٌ
اور آپ صاحب جمال ہیں، خوش قامت ہیں، مسکرانے والے ہیں اور خوبصورت ہیں

شَفِیْعُ الْاَنَامِ مُطَاعُ الْمَقَامِ
سارے عالم کے بخشوانے والے اور آپ کا مرتبہ واجب الاطاعت

کَرِیْمُ الْکِرَامِ نَبِیُّ الْاَنِیْمِ
سخیوں کے سخی اور ساری کائنات کے نبی ہیں

اَسِیْلٌ ذَسِیْلٌ کَحِیْلٌ جَمِیْلٌ
چہرہ مبارک آپ کا کتابی ہے اور قد میانہ اور آنکھیں سرگیں و جمیل ہیں

صَبِیْحٌ مَلِیْحٌ عَطِیْبُ الشَّھِیْمِ
چہرۂ مبارک سفید مائل بسرخی ہے اور آپ ملیح ہیں اور خوشبو پھیلانے والے

صَبِيْحٌ مَلِيْحٌ مُطِيْبُ الشَّمِيْمِ
چہرہ مبارک سفید مائل بسرخی ہے اور آپ ملیح ہیں اور خوشبو پھیلانے والے

حَسِيْبٌ نَسِيْبٌ وَنُوْرٌ قَدِيْمٌ
صاحب نسب ہیں اور نور قدیم ہیں

وُسَامُ الْجَبِيْنِ كَبَدْرٍ مُبِيْنٍ
آپ کشادہ پیشانی والے ہیں جو بدر کی طرح روشن ہے

بَشِيْرٌ نَذِيْرٌ سِرَاجٌ مُنِيْرٌ
خوشخبری دینے والے ڈرانے والے روشن چراغ ہیں

بِثَغْرٍ بَسِيْمٍ كَدُرٍّ يَتِيْمٍ
دندان مبارک تبسم کنندہ مثل در یکتا کے ہیں

خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ دَلِيْلٌ عَلِيْمٌ
وہ صاحب اسرار ہیں بصیر ہیں رہنما و علیم ہیں

شِفَاءُ الْعَلِيْلِ دَوَاءُ الْغَلِيْلِ
آپ کی ہستی بیمار کے حق میں شفا اور پیاسے کی تشنگی بجھانے والی ہے

تَقِيٌّ نَقِيٌّ صَفِيٌّ وَفِيٌّ
آپ متقی پاکیزہ خصائل برگزیدہ وفا شعار ہیں

بِشْرِ الْمُحَيَّا وَنَشْرٍ لَخِيْمٍ
اپنے ہنس مکھ چہرے اور پاکیزہ خصلتوں کے ساتھ

وَجِيْهٌ نَبِيْهٌ مُبِيْنٌ حَكِيْمٌ
صاحب وجاہت و بلند مرتبہ ہیں اظہار حق کرنے والے حکیم ہیں

رَسُوْلٌ وَصُوْلٌ وَلِيٌّ حَفِيٌّ
آپ اللہ کے رسول صلہ رحمی کرنے والے آقا و مہربان اور مہربان عالم ہیں

هُدًى مُقْتَدًى مُصْطَفَى الْأَصْفِيَاءِ
آپ ہادی عالم و مقتدائے خلق ہیں اور برگزیدہ خلائق ہیں

أَمِيْنٌ مَكِيْنٌ عَزِيْزٌ عَظِيْمٌ
امین ہیں عزت والے ہیں غالب ہیں عظمت والے ہیں۔

صَبُوْرٌ شَكُوْرٌ مُقَفًّى مُقِيْمٌ
بے حد صابر و شاکر خاتم الانبیاء سنت قائم کرنے والے ہیں

صَدُوْقٌ فَرُوْقٌ فَصِيْحٌ نَصِيْحٌ
آپ راست گو ہیں حق و باطل میں فرق کرنے والے فصیح البیان خیر خواہ عالم ہیں۔

دَلِيْلٌ وَهَادٌ سَبِيْلَ الرَّشَادِ (...)
آپ راہ حق دکھانے والے اور ہدایت کرنے والے ہیں

عَرُوْفٌ عَطُوْفٌ رَؤُوْفٌ رَحِيْمٌ
مصائب پر صبر کرنے والے خلق پر مہربانی، شفقت و رحمت کرنے والے

وَخَيْرُ الْعِبَادِ ثِمَالُ الْعَدِيْمِ
خیرالبشر ہیں اور ناداروں کے لئے ملجاء و ماویٰ ہیں

شَفِيْقٌ رَفِيْقٌ خَلِيْقٌ طَلِيْقٌ
آپ خلق پر شفیق رحمدل ہیں خلیق ہیں کشادہ پیشانی والے ہیں۔

وَمُزَّمِّلٌ ثُمَّ مُدَّثِّرٌ
اور آپ مزمل و مدثر (ممدوح رب) ہیں

صَفُوْحٌ نَصُوْحٌ عَفُوٌّ حَلِيْمٌ
درگذر فرمانے والے ناصح و معاف فرمانے والے بردبار ہیں

سَعِيْدٌ رَشِيْدٌ خَلِيْلٌ كَلِيْمٌ
صاحب رشد و سعادت ہیں اللہ کے دوست و کلیم ہیں

مُجِيْبٌ مُنِيْبٌ نَقِيْبٌ نَجِيْبٌ
آپ قبول کرنے والے ہیں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اور سردار و شرافت والے ہیں

عَفِيْفٌ حَنِيْفٌ حَبِيْبٌ خَطِيْبٌ
آپ باعفت و مائل بحق ہیں حبیب اور خطیب ہیں

هُوَ الْقُدْوَةُ الْأُسْوَةُ الْمُسْتَقِيمُ
اور آپ ہی قابل اقتداء اور نمونہ عمل اور راہ حق پر قائم ہیں

نَبِيُّ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ
آپ تمام انبیاء و مرسلین کے نبی ہیں،

وَطٰهٗ وَيٰسِين فَيْضُهٗ عَمِيمٌ
اور طٰہٰ و یٰسین ہیں اور آپ کا فیض عام ہے

نَبِيُّ الْوَرٰى سَيِّدُ الْأَنْبِيَاء
آپ ساری مخلوق کے نبی اور سید الانبیاء ہیں

نَجِيُّ الْإِلٰهِ جَلِيلٌ فَخِيمٌ
اللہ کے ساتھ سرگوشی کرنے والے اور جلیل القدر و عظیم المرتبت ہیں

إِمَامُ الْهُدٰى رَحْمَةُ الْعَالَمِينَ
امام الہدیٰ و رحمۃ للعالمین ہیں

غِيَاثُ الْوَرٰى مُسْتَغَاثُ الْمَضِيمِ
عالم کی فریاد رسی کرنے والے اور ستم زادوں کی داد خواہی کرنیوالے ہیں

أَحِيدٌ وَحِيدٌ مَجِيدٌ حَمِيدٌ
آپ عدیم المثال و یگانہ ہیں اور بزرگ و ستودہ صفات ہیں

وَخَيْرُ الْبَرَايَا بِفَضْلٍ جَسِيمٍ
اپنی عظیم الشان بزرگیوں میں افضل ترین عالم ہیں

وَأَسْرٰى بِهٖ رَبُّهٗ فِي السَّمَاءِ
آپ کے رب نے راتوں رات آسمان کی سیر کرائی

كَنُورٍ تَجَلّٰى بِلَيْلٍ بَهِيمٍ
مثل چمکنے والے نور کے رات کی تاریکی میں

وَآتَاهُ مَا شَاءَهٗ مِنْ عُلَاءٍ
آپ کا اللہ تعالیٰ نے جس قدر چاہا مرتبہ بلند فرمایا

وَأَوْحٰى إِلَيْهِ بِوَحْيٍ رَقِيمٍ
اور نازل فرمائی آپ کی طرف وحی مکتوب

فَأَكْرِمْ بِشَأْنٍ سَنِيٍّ بَهِيٍّ
پس کس قدر بلند و روشن ہے مرتبہ آپ کا

وَعِزٍّ عَزِيزٍ وَجَاهٍ قَوِيمٍ
اور آپ کس قدر صاحب عزت و بلند مرتبہ ہیں

فَيَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ
پس اے رب کریم آنحضرتؐ پر درود و سلام نازل فرما

مَتٰى فَاحَ طِيبٌ وَدَافَ نَسِيمٌ
جب تک کہ عالم میں خوشبو پھیلے اور باد نسیم چلے

وَأَنْ عَافِنِي وَاعْفُ عَنِّي مِنْ آثَامٍ
الٰہی مجھے عافیت بخشئے اور گناہوں سے درگذر فرمائیے

إِلٰهِي بِجَاهِ النَّبِيِّ الْكَرِيمِ
تصدق سے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

حکیم الامت تھانویؒ — اپنی نظر میں

میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف۔ نہ صاحب تصرف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم۔ نہ امور دنیویہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

اسم بامسمّٰی

تحریر
سید اکبر شاہ فیصل
جامعہ رشیدیہ ساہیوال

قرآن وحدیث میں جہاں لفظ علم آیا ہے، اس سے مراد محض اور فقط علم دین ہے، نہ کہ دنیوی علوم و فنون وغیرہ، آج کل بعض اسکولوں اور کالجوں کی نمایاں دیواروں پر حدیث، طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ لکھی جاتی ہے میرے استاذ و مربی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک اس حدیث کو اسکولوں اور کالجوں پر لکھنا اور اس سے دنیوی علوم کا مراد لینا اندیشۂ کفر ہے۔

علم دین ایک امانت خداوندی ہے، جو کہ انبیا کرام علیہم السلام کی وراثت ہے اور یہ ورثہ علمائے عظام کو ملا، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد العلماء ورثۃ الانبیاء میں تو علما ہی کو انبیا کا ورثہ قرار دیا گیا ہے، صرف اسی لیے کہ علما کرام علم دین کی اشاعت و تبلیغ میں ہمہ تن کوشاں مصروف رہتے ہیں، اشاعت دین، تقریر تحریر یا عام وعظ و نصیحت کے ذریعے ہو یا خانقاہوں اور مدارس میں دینی طلبہ کو علوم دینیہ کی تعلیم و تربیت کے ذریعے ہو۔ بہرکیف اشاعت دین ضروری ہے، کیونکہ حفاظت دین کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اگر دین کی اشاعت ختم ہو گئی تو دین بھی ختم ہو جائے گا جیسا کہ قیامت کی علامات میں مذکور ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں دہلی کا تخت مغل حکمرانوں کے اقتدار سے خالی ہوا، تو دینی شعور بھی ختم ہونے کو آیا، دینی درسگاہوں کی حیثیت بھی

پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے انتہائی ناگفتہ بہ ہوگئی، اسلامی شعائر غیر محفوظ اور رُو بہ زوال ہوئے، مغربی تہذیب کے پجاریوں نے الحاد و زندقہ اتنے حتیٰ کہ سادہ لوح مسلمان ہی اسلام سے ناواقف ہو کر اپنا نام محمد کرشن اور علی چند رکھنے لگے، ان سنگین حالات میں اشاعت دین کی خاطر دارالعلوم (دیوبند) کا قیام عمل میں آیا، کیونکہ دارالعلوم کے قیام کی نشاندہی چند اولیاء اللہ رحمہم اللہ کو بذریعہ القاء و الہام منجانب اللہ ہوئی تھی کہ دینی ادارہ کے قیام ہی سے ہندوستان میں دین، اسلام محفوظ رہ سکتا ہے، چنانچہ آج بحمد للہ و توفیقہ دارالعلوم کو قائم ہوئے بھی ایک صدی اُوپر چودہ سال بیت گئے ہیں۔ مگر دارالعلوم سال بہ سال منازل ترقی طے کرتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔

کوئی آنکھوں سے اندھی اور نام سے نور بھری ہو، یا کوئی دین اسلام سے قطعی گمراہ اور نام فخر الاسلام ہو، تو بات کچھ جچتی نہیں اور یہ کوئی مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے کہ دارالعلوم (دیوبند) اسم بامسمّیٰ دارالعلوم ہے لفظ علوم جن علوم و فنون کی غمازی کرتا ہے۔ دارالعلوم میں ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دینی علوم کی خدمت و اشاعت جتنی اس ادارے نے کی ہے، دنیا کی سابقہ و موجودہ کوئی بھی یونیورسٹی یا دارالعلوم اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء۔ دارالعلوم کے اسم بامسمّیٰ ہونے کی واضح دلیل یہی ہے کہ اس کے نام اور کام میں کوئی فرق نہیں اور اس نے اپنی عظیم کارکردگی کا لوہا اغیار سے بھی منوایا۔ دارالعلوم سے بلاشک ایسے جید اور متبحر علماء تیار ہوئے کہ جو آیت ربانی۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کے صحیح مصداق ثابت ہوئے اور علوم نبویہ و دینیہ کے ہر ہر علم کا ایسا مدرس پیدا ہوا کہ گویا اُسے وہ علم، علم لدنی کے طور پر حاصل ہے۔ مزید کمال یہ کہ جو حضرات دارالعلوم کے اکابر یا فیض یافتہ ہوئے وہ بھی اسم بامسمّیٰ ہی ثابت ہوئے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مرحوم علوم الٰہیہ کے خزائن میں انما انا قاسم واللہ یعطی کا مصداق تھے، مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم، ان نصر اللہ ینصرکم کی عملی تفسیر تھے۔ علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری مرحوم نے انوار الباری میں بنظر نور باللہ، کا مظاہرہ کیا۔

مولانا محمود حسن صاحب مرحوم قرآن پاک کی مختصر مگر جامع تفسیر لکھ کر رہتی دُنیا تک محمود قرار پائے۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے سیاسیات میں قدم رنجہ فرمایا تو، اِک ضرب یداللّٰہی اور اک سجدۂ شبیری، کا درس دیا، دیگر سینکڑوں امثلہ صرف طوالت مضمون کے خوف سے حذف کرنے پر مجبور ہوں۔ کسی ہستی یا ادارے کا اسم بامسمّیٰ ہونا بھی خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کے افعال کے مقبول ہونے کی دلیل ہوتی ہے، دُنیا میں ایسی بھی اسلامی یونیورسٹیاں اور دارالعلوم ہیں، جو کہ مُسلّم قدیم اور معروف ہیں۔ مگر کسی میں طلبہ کی تربیت کے خصوصی انتظام کی بجائے انہیں مکمل آزادی دی جاتی ہے، بعض میں احادیث شریف کی کتب کے صرف خلاصے پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور بعض میں نظر بد دُور، اساتذہ ہی فیشن پرست ہیں۔ انگریزی بال اور انگریزی لباس میں رہتے ہیں اور ان کے چہرے بھی سنت رسولؐ سے عاری ہیں۔ ہمیں تو یہاں تک روایت ملی ہے کہ اساتذہ کرام دوران اسباق حدیث، سگرٹ نوشی کرتے ہیں۔ (دروغ برگردن راوی)

بہرکیف دارالعلوم نے اسم بامسمّیٰ کا لقب حاصل ہونے کی وجہ سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اسلامی علوم و فنون کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ تاریخ کو ان پر فخر ہے۔ دنیا بھر کے طلبہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور ان کی سہولت کی خاطر ہر زبان میں اسباق پڑھائے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ہندی اور انگریزی زبان میں بھی اسلامی علوم کی تدریس کا انتظام ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اُدب، منطق، فلسفہ، ریاضی اور میراث و ہندسہ وغیرہ کے عظیم علوم کے عظیم عالم تیار ہو کر پوری دُنیا میں پھیلے اور دیوبندی کہلوا کر روشناس عالم ہوتے ہیں، کیونکہ دارالعلوم کی برکات نے دیوبند شہر کو بھی چار دانگ عالم میں زد عام و خاص کر دیا ہے۔

دارالعلوم میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام ہے۔ اسی لیے

پوری دنیا میں فاضل دارالعلوم کو مقبول نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، طلبہ کو عربی و انگریزی زبان میں تقریر و تحریر کے علاوہ خیاطی و جلد سازی اور شعبہ دارالصنائع میں دستکاریاں سکھانے کا بھی خاطر خواہ انتظام ہے مثلاً لیدر ورک (سوٹ کیس) ہولڈال وغیرہ۔ شعبہ طب میں طب قدیم و جدید مع سرجری کا، شعبہ افتاء میں فتویٰ نویسی، شعبہ ورزش میں طلبہ کی جسمانی ورزش اور شعبہ مطالعہ علوم قرآنی میں قرآن پاک پر ریسرچ کا کام سکھایا جاتا ہے، اساتذہ کرام شفیق و خلیق اور مجسمۂ عجز و انکسار ہیں۔ علوم عالیہ اور علوم آلیہ کی کتب کی جتنی تفاسیر و تصانیف دارالعلوم سے وابستگان و فیض یافتگان نے کیں۔ وہ غالباً ۸۰ھ سے امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رح کے دور سے ۲۱۰ھ تک کے تمام فقہا و متکلمین و محدثین کی تصنیفی خدمات سے کم نہ ہوں گی۔ دارالعلوم دیوبند نے اعلیٰ درجہ کے مصنفین کے علاوہ سینکڑوں بلند پایہ مشائخ طریقت، متبحر عالم دقیق النظر مدرسین، محقق مفتی، عظیم مناظر، چوٹی کے صحافی، شعلہ بیان خطیب، بہترین طبیب اور دردمند مصلحین قوم و ملت پیدا کیے یہ سب کچھ دارالعلوم کے ملقب بہ لقب اسم بامسمّٰی اور عنداللہ مقبول و معلوم ہونے کی دلیل ہے۔

درسگاہِ عظیم مدرسہ دیوبند

جانباز مرزا

دیوبند ہے انوارِ مدینہ کی تجلّی — توحید کی اس شمع سے روشن ہے زمانہ

اس مکتبۂ فکر کے ممنون ولی ہیں — مذہب کی حقیقت ہے یہ، باقی ہے فسانہ

کاشانۂ رحمت ہے زمانے کی نظر میں — بیٹھا تھا جہاں تنہا اللہ کا دیوانہ

محمودؒ جہاں سوتے مدنیؒ جہاں لیٹے — اس خاک میں محفوظ ہے ملت کا خزانہ

ایمان ہے آئینِ فرنگی سے بغاوت — بخشا ہے اسی خاک نے ملت کو ترانہ

نکلے ہیں اسی ساز سے توحید کے نغمے — قائل ہیں اسی بات کے اغیار و یگانہ

اُبھرے نہ کبھی ہند میں دیوبند کا سورج — ڈھونڈا ہے کئی بار فرنگی نے بہانہ

اللہ کرے ہند میں خود اس کی حفاظت
مرکز ہے یہ جانباز کے ایمان کا یگانہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

اور

دارالعلوم دیوبند

از: سید نسیم احمد فریدی

○

ساقیٔ دہلی کے مستوں نے بارض دیوبند — جب رکھی بنیادِ مےخانہ بطورِ یادگار
دور دورہ ساغرِ صہبائے طیبہ کا ہوا — جرعہ نوشانِ ازل آنے قطار اندر قطار
قاسمؔ و محمودؔ و انورؔ نے لنڈھائے خم کے خم — اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار
آج بھی ساقی کی چشمِ خاص کی تاثیر دیکھ — بادۂ مغرب کے متوالوں کا ٹوٹا ہے خمار
آج بھی آفاق میں اس میکدہ کی دھوم ہے — چار جانب سے سمٹ کر آرہے ہیں بادہ خوار
در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق — یہ خصوصیت یہاں ہر فرد میں ہے آشکار
اس کے ہر مے خوار کو پیرِ مغاں کا حکم ہے — باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار
کاش اسے ساقیٔ دہلی تو بھی آ کر دیکھتا — اپنے مے خانے کی رونق اپنے رندوں کی بہار
تیرا دورِ جام دورِ چرخ سے بھی تیز تر — تیرا مستقبل تیرے ماضی سے بڑھ کر شاندار
یا الٰہی حشر تک باقی رہے یہ مے کدہ — دور میں ساغر رہے تا گردشِ لیل و نہار
اس کی ہر ہر اینٹ میں تاریخِ ماضی ثبت ہے — ہند میں بزمِ ولی کی ہے یہ واحد یادگار
مسلم ہندی اگرچہ مفلس و نادار ہے — پھر بھی اس سرمایۂ ملت کا ہے سرمایہ دار
شوکتیں جب دہلیٔ مرحوم کی آتی ہیں یاد — دیکھ کر اس کو بہل جاتا ہے قلبِ سوگوار
جن کی کوشش سے چلا ہے دورِ صہبائے حجاز — نور سے معمور کر دے اے خدا ان کے مزار

آ فریدی تو بھی ہو ساغر بکف مینا بدوش
طالب جوشِ عمل ہے، ساقیٔ ابرِ بہار

دارُالعُلومِ دیوبند

برِّصغیر میں آزادی حُریّت کی درسگاہ

جانباز مرزا

تاریخ جیسے جیسے اپنے عروج و زوال سے گذرتی ہے قوموں کے خدوخال میں اسی انداز سے تغیر آتا چلا جاتا ہے واقعات کو سنبھال مؤرخ کی دیانت پر ہے۔ وزن رائی کا پہاڑ اور پہاڑ کا ذرّوں میں تبدیل ہو کر بکھر جانا کوئی دشوار نہیں۔ اس طرح کا تماشہ کبھی کبھار اقتدار کے سہارے بھی کھیلا جاتا ہے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں سے تاریخ اپنا رخ تبدیل کرتی ہے۔ اگر مؤرخ اپنے ضمیر سے غداری نہ کرے تو آندھیوں کے ہزاروں طوفان بھی راستوں کی متعینہ پگڈنڈیوں کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے غیر ملکی حکمرانوں کا اس طرح ساتھ دیا کہ وقت کے بگاڑ میں دیرینہ لگ سکی۔ خصوصاً ہندوستان کا مسلمان جس نے ہنوز گذرے ہوئے کل ہندوستان کی اٹھارہ لاکھ مربع میل زمین پر اپنے اقتدار کے گھوڑوں کی چاپ سنی تھی۔ برطانوی پرچم کی لہرانوں کے سر دھننے لگا۔ خیرات بانٹنے والے ہاتھ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے لگے۔ جو پاؤں مخملی فرش پر زخمی ہو جاتے تھے وہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔ اذانوں کی جگہ گرجوں کے گھڑیال بجنے لگے اور غلامی کی زنجیریں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ نہ صرف دہلی کا لال قلعہ اپنے مکینوں کے لئے جیل خانہ بن گیا۔ بلکہ سارا ہندوستان فرنگی سلطنت کے زیرِ اقتدار آگیا۔ یونین جیک کے سائے جوں جوں پھیلتے گئے۔ ہندوستان کا تمدن سکڑتا چلا گیا۔ اسلام کے اصول عیسائی سلطنت کے تابع نظر آنے لگے۔

مسلمان اپنے ہی گھر اجنبی دکھائی دینے لگا۔ انسانیت کی دیواریں آہستہ آہستہ گرنے لگیں۔ ایمان متزلزل ہونے کے خدشات بڑھنے لگے۔ ایسے ہی منحوس دن تھے۔ جب ان لوگوں کے جذبات و احساسات نے پھر انگڑائی لی جو ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں شامل کے مقام پر انگریزوں سے نبرد آزما ہو چکے تھے۔ ہنوز ان کی ہمتوں میں فرنگی کے خلاف دبی آگ سلگ رہی تھی جس نے انہیں ایمان کی پختگی کے تحت میدانِ کارزار میں لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن آج کے حالات اس سے مختلف تھے۔ غیر ملکی طاقت کا مقابلہ تشدد یا فوج سے ہی ممکن تھا۔ مگر اب یہ سب چیزیں مفقود ہو چکی تھیں۔ ملک غلام ہو چکا تھا۔ اپنے بھی غیر نظروں سے دیکھ رہے تھے تاہم ہندوستانی تمدن طرزِ معاشرت اور اسلام کی گرتی ہوئی قدروں کا تقاضا تھا کہ یہ وقت تن آسانی کا نہیں ہمت ہار کر بیٹھ جانے سے ایمان کی رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو جانے کا احتمال تھا لہٰذا وہ لوگ پھر اٹھے اور ایک دوسرے رخ سے فرنگی پر حملے کا انداز سوچا۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں دیوبند کی ایک ویران مگر تاریخی مسجد چھتہ میں ایک معمولی عربی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن (رحمۃ اللہ علیہ) اور سب سے پہلے

مدرس حضرت مولانا ملّا محمود مقرر ہوئے - یہ مختصر قافلہ جس کے سالار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا گیا - پھر اس قافلے سے جدا یا فارغ ہونے والا ہر طالب علم انگریز کے خلاف جہاد کے جذبات سے معمور ہو کر نکلتا - اس کے دل میں ایمان کی وہی شمع روشن ہوتی جو اس مدرسہ کے بانیوں کے دلوں میں کارفرما تھی -

مسجد چھتہ دیوبند کی سرزمین — ابتدا سے مشائخ و اکابر اہل اللہ کا مسکن اور قیامگاہ رہی ہے - یہ روایت بھی ہے کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسجد میں چلہ کشی کی ہے - دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت حاجی عابد حسین کا قیام بھی اس مسجد میں تھا - حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور دیگر احباب جو دارالعلوم کے سب سے پہلے مدرس تھے اسی مسجد میں مدتوں قیام پذیر رہے - مسجد کے صحن میں شاندار انار کا بوٹا اب بھی ہے جس کے سائے میں دارالعلوم کا مبارک آغاز ہوا تھا -

دیوبند:- ایک تاریخی بستی ہے جو اپنے دامن میں ایک تاریخ کا کثیر سرمایہ رکھتی ہے - اس کی ایک ایک اینٹ پہ ہزاروں سالوں کی بیتی داستان کندہ ہے - انقلابات زمانہ کے کئی دور اس پر سے گذرے ہیں کہ اس شہر کی خستہ عمارتوں کو بھی یاد نہیں - شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں معروف ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس بستی کا ذکر کیا ہے - مہاراجہ بکرماجیت کے عہد میں بھی دیوبند کا نام آیا ہے - طوفان نوح کے متصل دور میں بھی اس بستی کے نشان ملتے ہیں - سنسکرت کے مصنفین نے کورو پانڈو کے عہد میں بھی دیوبند کا ذکر کیا ہے - مغل سلطنت تو ابھی کل کی بات ہے ؎

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

دیوبند مغل شہنشاہوں کے راستے کی ایک منزل اور عارضی ٹھہراؤں کا اکثر کیمپ رہا ہے - اگر موجودہ آبادی سے تقریباً دو میل مشرق کی جانب دیکھیں تو یہاں کی پختہ عمارتوں کے اکثر نشان ملیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ ہزاروں سال پہلے دیوبند کی اصل آبادی یہ رہی ہے -

شہر میں ایک بلند عمارت ہے - جس میں اب سرکاری دفاتر ہیں - "آئین اکبری" جلد دوم میں اسے ایک قلعہ لکھا گیا ہے - مگر اب اس قلعہ کا کوئی نشان نہیں - اس قلعہ کے ایک کنوئیں کے متعلق یہ روایت مشہور رہی ہے کہ

"اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا "

بہرحال تلاش کرنے پر کھنڈرات میں سے بہت کچھ دستیاب ہو سکتا ہے - مگر مضمون اس طوالت کا متحمل نہیں - مختصر یہ کہ اس صحرا سے وہ پھول کھلے ہیں کہ جن کی مہک عرب و عجم تک پہنچی اور انہیں پھولوں کی پتیوں سے بکھر کر عالم انسانیت کو توحید کے نغمے سنائے - بات دور نکل گئی -

انگریز دیوبند کے اس دارالعلوم سے غافل نہیں تھا - اس کی نگاہیں دل، دماغ اپنے باغی گروہ کے کارناموں سے شب و روز متفکر تھا - لیکن فرد جرم کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکی - لیکن فرنگی دزدیدہ نگاہوں سے اس قافلے کی رفتار دیکھتا رہا - تا آنکہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علیگڑھ سے ایک آواز نکلی -

مسلمانو: انگریزی تعلیم حاصل کرو -

مسلمانو: انگریزی تعلیم حاصل کرو

اس مسلسل اور پیہم آواز کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء کا غیر ملکی ظلم و جور دکھائی دے رہا تھا - انگریز کی دہشت گردی اور بربریت

خوف سے لرزہ براندام مسلمان علیگڑھ کی طرف دوڑنے لگا - ہنوز علیگڑھ کی آواز مدہم نہ ہونے پائی تھی کہ پنجاب کے ایک قصبہ قادیان کے رئیس نے انگریز کو اولی الامر کا خطاب دے کر مسلمان کے ایمان کو نیلام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حاکم وقت کا ہر فعل حکم اور رفیش کا درجہ رکھتا ہے۔ نیکی اور بدی اس ترازو میں ہم وزن قرار پاتی ہیں۔ طرز تعلیم سے لباس کی کنز بیورنت تک میں حاکم کی رضا شامل ہوتی ہے ۔

اجنبی حکمرانوں کی گرفت، علیگڑھ کا تعلیمی کھلونا اور قادیان کا فتویٰ، ان سب نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور قریب تھا کہ ہندوستان میں اسلام پر عیسائیت کی چھاپ پختہ ہو جاتی۔ دیوبند دارالعلوم سے پھر ایک صدا بلند ہوئی

"زمین اللہ کی ہے اور حاکمیت بھی اسی کی رہے گی۔ قرآن کے بغیر ہر تعلیم باطل کی تعلیم ہے۔"

یہ آواز کفر کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ وہ اپنی تمام حشر سامانیوں سے لیس ہو کر اس آواز کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ لوہے کی زنجیریں، جیل خانے، بندوق اور توپوں کے دہانے وحشی کتوں کی طرح اس آواز پر بھونکنے لگے۔ لیکن یہ آواز ایک مرد درویش کی صدا تھی۔ جو ماسوا اللہ کے اپنے دل سے تمام خوف مٹا چکا تھا۔ حرم ہوا، کے تمام بتوں کو توڑ کر توحید کا یہ پجاری بتکدۂ ہند میں دنیاوی طاقتوں سے بے نیاز تھا۔ میدان شاملی کی طرح جرنیل حضرت مولانا محمود حسن اس مرتبہ جہاد بالسیف نہیں۔ بلکہ قلم کے جہاد کا اعلان کر رہا تھا۔ اور تلوار کی بجائے قلم لیکر فرنگی کے سامنے آنکلا۔

غلام ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے یہ دور نہایت پر خطر دور تھا۔ اگر ایک طرف سرسید لارڈ میکالے کا پرچم اٹھائے ہوئے تھا تو دوسری طرف انگریز نے ہم رنگ زمین دام بچھا دیئے تھے۔ مسئلہ ختم نبوت جو اسلام کا بنیادی پتھر تھا۔ اس کی بیخ کنی کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ قادیانی ٹولہ بظاہر اسلام کی نمائندگی کے لئے آریہ سماج سے مناظرے کرتا سنائی دینے لگا۔ دہشت و بربریت کے اس دور میں علمائے دیوبند نے حالات کی نزاکت سے ماوریٰ ہو کر حضرت مولانا محمد صاحب لدھیانویؒ (دادا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ) کے فتویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے قادیانی ٹولے کے کفر پر مہر لگا دی۔ اس سے پیشتر علیگڑھ کے تعلیمی کھلونے کو بھی یہی گروہ توڑ چکا تھا اور سرسید کی برطانوی عبا کو اس بری طرح تار تار کیا کہ فرنگی منصوبے خاک میں مل گئے ۔

اس طرح اس محاذ پر بھی انگریز کو منہ کی کھانی پڑی - اس شکست کے بعد فرنگی اور مکتبۂ فکر دیوبند کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی گئی اور لمبی لکیر — انگریز کا منشا تھا کہ ہندوستان سیاست سے اس ذہن کو جیسے کیسے ہو ختم کیا جائے چنانچہ مالٹا سے ہندوستان کے جیل خانوں تک کوئی سنگلاخ وادی ایسی نہیں جہاں سے دیوبندی علماء کو پابجولاں گزرنا نہ پڑا ہو اور کوئی بازار اور گلی ایسی نہیں جہاں سے یہ لوگ گزرے ہوں تو فرنگی ایجنٹوں نے انہیں گالیاں نہ دی ہوں اس پر بھی تقریباً ایک صدی تک ان تمام مصائب و آلام کے باوجود یہ قافلہ رواں دواں رہا۔ آخر فرنگی برصغیر کو چھوڑ کر سمندر کی ان اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ جہاں کبھی اس کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دیوبند کا یہ قافلہ جس کی کمان حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پھر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اور آخر کو شیخ عرب و عجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہاتھ رہی چلتا رہا اور چلتا رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز ؎

سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

دارالعلوم دیوبند کے نامور سپوت

حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ

قاری فیوض الرحمٰن۔ ایم اے

آپ ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء کے قریب "زیارت کاکا صاحب" تحصیل نوشہرہ پشاور میں جناب محمد شاہد گل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ مشہور بزرگ حضرت رحمکار، کی اولاد سے ہیں۔ لہ

ابتدائی تعلیم علاقہ میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور موقوف علیہ کی تکمیل کر کے ۱۳۳۲ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

آغاز تعلیم دیوبند ہی سے حضرت شیخ الہندؒ آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

تدریسی خدمات

آپ نے تین چار سال تک مانسہرہ کے عربی مدرسہ میں تدریس کی اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خواہش پر اتنی ہی مدت ڈاکمل (مشرقی پاکستان) میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔

مدرسہ عربیہ "رورکی" میں آٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ٢ه

حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں

، ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کو حضرت شیخ الہند کی رفاقت میں سفر حج پر روانہ ہوئے (بمبئی سے اسی تاریخ کو بحری جہاز کے ذریعہ روانہ ہوئے تھے) اور ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کو جدہ سے بذریعہ اونٹوں کی سواری کہ معظمہ کیلئے روانہ ہوئے اور انتیسویں کی شب کو وہاں پہنچے۔ حج کی سعادت حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں حاصل ہوئی۔

فرنگی حکومت کے ایما پر شریف کہ نے حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرا کے بروز جمعہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ/۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو جدہ سے برٹش سوئیز خدیوی آگبوٹ پر آپ کو سوار کرا دیا گیا۔ ۱۴ جنوری کو سوئز پہنچے، اٹھارہ بیس گوروں پر مشتمل ایک گارد آپ حضرات پر متعین تھی۔ وہاں سے ۱۷ جنوری کو بذریعہ ریل قاہرہ پہنچے اور پھر وہاں سے "جیزہ" لے جائے گئے۔ وہاں آپ سے اور حضرت شیخ الہند مع دیگر رفقاء کے بیانات لئے گئے۔ آپ کے بیان کی بابت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ "اسیر مالٹا" ص۹۵ پر یوں لکھتے ہیں "محمد عزیر صاحب نے نہایت استقلال سے اپنے ولایتی افسر پنے سے سب کا جواب دیا اور بہت ہی متین جواب دیا"

لہ تذکرہ شیخ رحمکار، از مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکا خیل کے ص۱۹۱ پر آپ کا مکمل شجرہ نسب موجود ہے ٢ه یہ کل مدت تدریس ہے جو میں نے یکجا کر دی ہے۔ اس میں اسارت مالٹا کے دوران وقفہ بھی یقینی امر ہے۔

وہاں سے ۱۶ر فروری ۱۹۱۷ء کو بذریعہ بحری جہاز آپ کو مالٹا بھیجا گیا ۲۱ر فروری ۱۹۱۷ء کو دس بجے صبح یہ جہاز مالٹا میں لنگر انداز ہوا مگر ۴ بجے شام تک آپ کو جہاز سے نہ اتارا گیا۔ ۴ بجے شام حضرت شیخ الہند کو انگریز افسر اپنے ساتھ اکّے پر بٹھا کر لے گیا اور آپ چاروں، مولانا عزیر گل صاحب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم نصرت حسین صاحب اور وحید احمد صاحب، کو پیدل کیمپ تک لے جایا گیا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "شام کے وقت ہم سب اتارے گئے تاکہ اہل شہر کو خبر ہو جائے اور وہ تماشا دیکھنے کے لئے راستہ میں آ جائیں۔ جس سے ان کے دلوں میں انگریز حکومت کا دبدبہ اور مسلمانوں اور ان کے متفق ملکوں کا ضعف ظاہر ہو۔ مسلمانوں کی بری طرح تذلیل ہو۔ مصر میں بھی اس قسم کا معاملہ ہوتا تھا۔ مگر کم۔ جب ایسی صورت ہوتی تھی تو مجھ کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (امداد اللہؒ) کا شعر یاد آ جاتا تھا ؎

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا
تماشے کو بھی تو لیکن نہ آیا

تھوڑا پہلے لکھتے ہیں۔ راستہ میں اہل شہر اور ان کے لڑکے، عورتیں ہماری اسارت پر خوشیاں مناتے تھے۔ مذاق اڑاتے تھے اور جھنڈ کے جھنڈ چڑھے باندھے ہوئے تماشا دیکھتے تھے کیونکہ سب کے سب عیسائی تھے ان کو مسلمانوں کے اسیر ہونے کی نہایت زیادہ خوشی ہوتی تھی ": (۱۱۴، ۱۱۵) آپ کے "نمبر مالٹا" میں یہ تھے۔ مولوی عزیر گل صاحب ۲۲۱۵، حکیم نصرت حسین صاحب ۲۲۱۶، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ۲۲۱۷، وحید احمد ۲۲۱۸، حضرت شیخ الہندؒ ۲۲۱۹ ۱۹۱۸ء میں مسٹر برن چیف سیکرٹری گورنر یوپی نے مالٹا آفس میں بلوا کر آپ سے جو بیان لیا، حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں پڑھیے ": "مولوی عزیر گل صاحب کا بھی بیان لیا اور ان سے سرحدی اخبار وغیرہ پوچھیں مگر انہوں نے حسب عادت سختی ہی سے جواب دیا۔ اس نے جہاد کی نسبت بھی ان سے پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ " آپ مجھ کو مسلمان سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ " ہاں۔ کہا کہ " پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کوئی شخص بغیر قرآن کی تصدیق کئے ہوئے اور اس کے تمام حصوں کو مانے ہوئے مسلمان ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ " نہیں " انہوں نے کہا کہ پھر اس کے کیا معنی کہ آپ مجھ سے ایسی بات پوچھ رہے ہیں جس کو آپ خود جانتے ہیں کہ قرآن میں مذکور ہے۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں ہوئیں ": (ص۱۵۷)

ص۱۹۱ پر حضرت مدنیؒ اسارت مالٹا کے دوران آپ کے پروگرام کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں۔

مولوی عزیر گل صاحب کا اشتغال

مولوی عزیر گل صاحب مختلف اوقات میں اعمال سلوک تعلیم کردہ مولانا مرحوم (شیخ الہندؒ) میں مشغول رہتے تھے اور پھر کچھ وقت قرآن شریف کے یاد کرنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ انہوں نے زبان ترکی کے سیکھنے کی طرف بھی توجہ کی اور تھوڑے ہی دنوں میں بحمداللہ اچھی خاصی ترکی بولنے لگے۔ اس کے بعد انگریزی زبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر سوئے بخت یا خوش نصیبی نے اس میں دستگیری نہ کی۔ ان کو حسب خواہش کوئی استاد نہ ملا اور کچھ طبعی عدم استقلالی بھی اس فن کے کمال سے مانع ہوئی۔ قرآن شریف کی طرف توجہ بہت کی مگر ضعیف حافظہ اور عدم استقلالِ طبع سدِ راہ ہوتا رہا۔ موصوف کو اس کا شوق بہت ہے۔ یاد بھی جلد کر لیتے ہیں مگر بھول بھی جلد جاتے ہیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الہندؒ) کی نظر عنایت ان پر بہت زیادہ تھی۔ اور بہت بے تکلفی سے ان سے رہتے تھے جو بے تکلفی ان سے برتتے رہے وہ کسی اور کے ساتھ عمل میں نہیں آئی ——— (اسیر مالٹا ص۱۹۱)

۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ/۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء بروز جمعہ بوقت دس بجے صبح آپ کو مالٹا سے آگبوٹ پر سوار کر دیا گیا۔ ۱۵ر مارچ کو یہ آگبوٹ سکندریہ پہنچا، وہاں سے ٹرین میں سوار کر کے سیدی بشرہ گوروں کے فوجی

کیمپ میں لے جائے گئے اور مجرم سپاہیوں کے کیمپ میں رکھا گیا۔ حضرت مدنی لکھتے ہیں کہ: ہم پر اسی طرح سخت پہرہ کر دیا جیسا کہ ان لوگوں پر تھا۔ (ملخصاً) اٹھارہ دنوں کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ/۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز کے لئے روانگی ہوئی اور اسی طرح سنگینوں کے بیچ میں آپ سٹیشن پر پہنچائے گئے۔ آگبوٹ تیار نہ ہونے کی وجہ سے پھر قیدیوں کے کیمپ میں ڈال دیئے گئے۔

سویز سے روانگی

۵ رمضان ۱۳۳۸ھ/۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن دس بجے صبح کیمپ سے سویز پہنچائے گئے اور اسی شام آگبوٹ پر آپ کو سوار کر دیا گیا۔ ۱۲ رمضان المبارک کو اتوار ہی کے دن آگبوٹ عدن پہنچا اور پھر ۲۰ رمضان المبارک کو پیر کے دن بمبئی پہنچا ہوا۔ حضرت مدنی لکھتے ہیں کہ "میں اور مولوی عزیز گل صاحب اکثر اسباب لے کر کنارہ پہنچے اور ہوڑی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور وحید کے لینے کے لئے روانہ کیا۔ اتنی ہی دیر میں بارش ہو گئی۔ دریا میں طوفان آگیا جس کی وجہ سے اس روز مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور وحید نہ آسکے[1]۔ اگلے دن بمشکل تمام مولانا کو اتارا گیا۔ بمبئی پہنچنے پر

شریک تھے۔ اسی زمانہ طلب میں مولانا شیخ الہند مرحوم سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ گھر پر جاگیر زمینداری کا انتظامات اور مطب میں مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں انگریزی بھی کچھ پڑھ لی مگر مشق جاری نہ تھی۔ اس سفر میں بولتے بولتے اچھی طرح کام چلانے لگے تھے۔ تقویٰ طبیعت میں ابتداء ہی سے تھا۔ اس لئے نمازوں کو ہمیشہ اول وقت پر پڑھتے تھے۔ تہجد کا بہت ہی زیادہ خیال تھا۔ لغویات کی طرف طبیعت کو رغبت نہ تھی۔ اسلام کا درد اور وطن اور قوم کی محبت نہایت زیادہ تھی۔ سیاسی امور میں پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی ہمیشہ دھن لگی رہتی تھی۔ نہایت معزز خاندان کے نونہال تھے۔ کوڑا جہاں آباد (ضلع فتح پور ہسوہ) ان کا آبائی وطن ہے۔ جب یہ نظر بند ہو گئے تو ان کو جدہ ہی سے خیال ہوا کہ اس وقت کو ضائع نہ کرنا چاہیئے انہوں نے مولانا مرحوم سے اس کی درخواست کی۔ مولانا نے کوئی ذکر مناسب تعلیم فرمایا، چنانچہ انہوں نے نہایت پابندی سے جملہ امور تعلیم کردہ مولانا مرحوم پر عمل کرنا شروع کیا۔ عموماً ہر وقت ذکر اسم ذات جاری رہتا تھا اور کچھ اوقات معینہ میں مراقبہ وغیرہ بھی کیا کرتے تھے وہ اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہتے اور اپنی جملہ کیفیات مولانا مرحوم سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ بعد مولانا مرحوم کے ہماری جماعت میں کوئی بھی بالوقت شب خیز تہجد گذار ان سے زیادہ نہ تھا۔ بلکہ تمام کیمپ کے اسرائے مالٹا میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ مولانا کی نظر عنایت بھی ان پر بہت تھی۔ ان کو ضعف معدہ کی شکایت بھی تھی اور ہمیشہ گھر پر بھی بخار وغیرہ میں مبتلا رہا کرتے تھے۔ یہ اپنے اوقات قرآن شریف، دلائل الخیرات، ذکر، مراقبہ وغیرہ میں صرف کرتے تھے۔ خود اپنی خواہش سے ایک مدت تک کھانا بھی پکاتے تھے۔ ان کی طبیعت کچھ عرصہ کے بعد مالٹا میں خوب سنبھل گئی تھی۔ مگر رجب ۱۳۳۶ھ سے ان کو پھر تپ ولرزہ کے دورے شروع ہوئے۔ رمضان آنے پر انہوں نے روزے بھی رکھے، ڈاکٹر کی دوائیں شب کو استعمال فرماتے تھے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

---

[1] اس مبارک قافلہ کے ایک قیمتی فرد جناب حکیم نصرت حسین صاحب کا واپسی میں ذکر اس لئے نہیں کہ ان کا اسارت مالٹا کے دوران مالٹا ہی میں نمونیہ سے انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی قبر مالٹا میں ان عظیم مجاہدوں کی عظیم قربانیوں کا آج بھی پتہ دیتی ہے۔ حضرت مدنی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مولوی حکیم نصرت حسین صاحب نہایت سلیم الطبع، ذکی الفریحہ مستقیم الاوقات تھے۔ انہوں نے علم حدیث وغیرہ دیوبند میں پڑھا تھا، باقی کتابیں لاہور، کانپور، دہلی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ دیوبند سے تکمیل کے بعد لکھنؤ وغیرہ میں طب کی تکمیل کی۔ جلسہ دستار بندی دیوبند میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کے ساتھ دورہ میں

معلوم ہوا کہ ہم بالکل آزاد ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک ہم کو نہیں ۔"
(ص۲۰۰، اسیر مالٹا)

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری "تذکرہ شیخ الہند" میں یوں لکھتے ہیں :۔

آپ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور
مولانا عزیر گل صاحب کے باشندے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے معتمد خاص اور جاں نثار شاگرد ہیں۔ آپ ابتدا ہی سے تحریک ریشمی

عید کے بعد (ڈاکٹر کے کہنے پر) اسپتال داخل کئے گئے، ہر تیسرے دن دو بجے کے بعد مل سکنے کی اجازت تھی (ہر روز کی اجازت دیر سے ملی اور وہ بھی کاغذی) نویں تاریخ ذیقعدہ کو جب ہم اجازت لینے گئے تو ہم کو خبر دی گئی کہ ان کا شب کو صبح کے قریب انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ انہوں نے جب جب جانا ہوا تو کہا کہ ذکر میرا جاری ہے اور تعلق خداوند ذوالجلال سے بندھا ہوا ہے : بڑی مشکل سے تیمم کرا کے کفنا کے گئے اور مقبرہ تک ۱۰ آدمیوں کی اجازت لی۔ کمانڈر نے اجازت دے دی ایسا اجتماع کسی شخص کے جنازہ میں وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر مولانا مرحوم نے باول غمگین نماز پڑھائی اور دروازہ کے قریب ہی ان کی قبر کھود ی ہوئی تیار تھی۔ اس میں دفن کر دیئے گئے۔ لوح قبر کی عبارت ایک پتھر پر یوں کندہ ہے :۔

هذا قبر الحكيم السيد نصرت حسين من اهل كوڑا جهان آباد الهند. أسر بمكة المكرمة مع حضرة العلامة مولانا الشيخ محمود حسن صدر المدرسين بكلية ديوبند في الحرب العمومى وتوفى أسيرا فى تاسع ذى القعده ١٣٣٧ه‍ هجرة النبى سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم رحمة الله رحمة واسعة ولة الفاتحة .

اس پتھر کو کرنیل اشرف بیگ نے کندہ کرایا تھا۔ (ص۱۹۸)

خطوط کے رکن خاص تھے۔ دیوبند ۔سے علاقہ یاغستان میں خبر رسانی اور اور وہاں پر تحریک کو زور سے چلانا آپ کے ذمہ تھا۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے دسیوں مرتبہ جانی خطروں میں مبتلا ہوئے مگر بفضلہ تعالیٰ بچ گئے۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ گرفتار ہو کر مالٹا بھی گئے تھے۔ وہاں بھی حضرت کی دل وجان سے خدمات انجام دیں۔

مالٹا سے آنے پر دیوبند کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے چونکہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے حضرت شیخ الہند کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا اور دیوبند میں لکڑیوں کی ایک ٹال ذریعہ معاش کے لئے کر لی تھی۔ اس بیوی کے انتقال کے بعد رڑکی تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ رحمانیہ میں صدر مدرس ہو گئے اور ایک میم (نومسلم) سے اس کی خواہش پر نکاح کر لیا۔ اس کے بعد اپنے وطن تشریف لے گئے (تذکرہ شیخ الہند مطبوعہ بجنور ۱۹۶۵ء ص۱۹۱،۱۹۰)۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند "حیات شیخ الہند" میں آپ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :۔
مولانا حاجی عزیر گل صاحب کاکاخیل ۔ ساکن زیارت

ؒ اس کتاب کے ص۱۵، ۱۸۲، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۹، ۲۲۹، ۲۹۷، اور ۲۹۸ پر آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے" اسیر مالٹا میں حضرت مدنی نے ص۱۷، ۱۸، ۳۰، ۵۰، ۲۶، ۲۷، ۴۰، ۶۹، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۶، ۱۲۶، ۱۳۸، ۱۳۸، ۱۴۶، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۰۲ اور ۲۰۵ پر آپ کا تذکرہ فرمایا ہے (مطبوعہ دیوبند) اسی طرح سفر نامہ شیخ الہند کے نام سے یہ کتاب جامعہ مدینہ کریم پارک لاہور سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ سن ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے اسمیں بھی اتنے ہی مقامات پر آپ کا ذکر کیا گیا ہے۔

کاکاخیل علاقہ پشاور، ۱۳۲۰ھ میں دہلی سے بغرض تحصیل علوم دین ہندوستان آئے اور پانی پت میں مقیم ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد خوش قسمتی نے دارالعلوم دیوبند کی طرف ہدایت کی۔ یہاں پہنچ کر مدرسہ میں جب باقاعدہ ابتداءً امتحانی داخلہ خود حضرت مولانا شیخ الہند نے لیا تو خصوصی توجہ اور شفقت کے اثر نے مولوی صاحب کے قلب میں حضرت شیخ سے ایک باطنی تعلق پیدا کرکے بندۂ بے درم بنا دیا اور اس امتحان کی کامیابی آئندہ امتحانات کے لئے نیک شگون اور فال حسن سمجھی گئی۔ دو سال میں مختلف اساتذہ دارالعلوم سے تحصیل علوم کرکے مشکوٰۃ شریف تک پہنچے، باطنی عظمت و عقیدت کا تو یہ حال تھا کہ جب تک حضرت مولانا کہیں دور تک بھی نظر کے سامنے رہتے غایت ادب سے بیٹھنا حرام سمجھتے مگر حاضری خدمت اور کسی عرض و معروض کی نوبت نہ آئی تھی۔

۱۳۲۰ھ میں ولایتی مشہور بزرگ اڈہ ملا صاحب کے دو خلفاء دیوبند تشریف لائے تو حسن اتفاق سے مولوی صاحب کو حضرت کی مخصوص ملاقات کے لئے واسطہ بنایا، حضرت نے ملاقات منظور فرما کر ان بزرگ مہمانوں کے ہمراہ براہ شفقت ان کو بھی مدعو فرمایا واقع میں ان کی عقیدت اور ظاہر میں یہ دعوت ان کے لئے باعث ہزار سعادت ہو گئی۔ آمد و رفت کی جرأت ہوئی۔ رفتہ رفتہ بمقتضائے "اذا خالطہ الحبہ" ترقی عقیدت سے باضابطہ حلقہ خدام میں شامل ہو گئے اور فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے۔ تین مرتبہ حضرت سے بخاری شریف پڑھی اور چار مرتبہ ترمذی شریف۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۳۲ھ تک تکمیل علوم کرکے فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت نے قصد سفر فرمایا تو ان کے دیندار و بزرگ والد ماجد نے باوجود اپنی ضرورتوں کے ان کے لئے فلاح دارین سمجھ کر ان کو معیت و خدمت کی اجازت دے دی۔ اور سفر حرمین شریفین اور اسیری میں پورے شریک حال و خادم رہنے کے ساتھ تحصیل فیوض باطنی اور ذکر و شغل سے بھی غافل نہ رہے (اور حضرت کی صحبت فیض خود ہزاروں شغلوں سے بڑھ کر ایک شغل تھا ہی) آخر دم تک خدمت میں حاضر رہے۔ ان کو حضرت کے مزاج میں بہت دخل تھا اور بمقتضائے "کرمہائے تو مارا کرد گستاخ" بعض مواقع پر حضرت کے سامنے ایسی جرأت سے کلام کرتے تھے کہ حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔ مگر حضرت ان کے اس طرز سے مانوس تھے۔ کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے اور مثل اولاد کے ان پر شفقت رکھتے تھے۔ لیکن مناسب مواقع پر سختی سے تنبیہ و عتاب فرماتے تھے لیکن یہ ہر حال میں سر تسلیم خم کئے ہوئے خدمت میں حاضر رہتے تھے ایسے دیانتدار و جاں نثار خادم بہت کم بزرگوں کو میسر آتے ہیں بوقت تحریر دیوبند میں مقیم ہیں اور بعد الوفات حضرت کی بہترین خدمت سمجھ کر تحریک خلافت اور اصلاح المسلمین میں خالصاً للہ مساعی جمیلہ دکھلا رہے ہیں۔ بڑے جوشیلے مسلمان اور قوی الایمان جوان ہیں۔ زاد اللہ تعالیٰ برکاتہم (حیات شیخ الہند ص ۲۱۱، ۲۱۲ مطبوعہ دیوبند ۱۹۴۸ء)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح نقش حیات (ج ۲ مطبوعہ ۱۹۵۴ء دیوبند انڈیا) میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۵) مولانا عزیز گل صاحب قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رح کے خادم خاص ہیں۔ مشن کے ابتداء سے ممبر رہے اور نہایت اہم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انہوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً شیخ الہند رح ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس انہیں کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گزار اور خطرناک راستوں کو قطع کرکے نہایت رازداری اور ہمت و استقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو

رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علاقہ سرحد و یاغستان اور دیگر خوانین کو مشن کا ممبر بنانا اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہنچانا، ان کو ہموار کرنا، ان کا اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی۔ مگر انہوں نے کبھی اس کو پتہ چلنے نہیں دیا۔ بارہا ان کو بھیس بدلنا اور ان جان علاقوں میں گذرنا پڑا۔ مگر نڈر ہو کر ان کو قطع کیا۔ ہر قسم کے خطرات میں بلاخوف وخطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت مخلص فدائی ہیں۔ کسی قسم کی طمع اور غرض نفسانی نہیں رکھی نہ حضرت سے جدا ہوئے۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں مگر انہوں نے گوارا نہ کیا اور ہمیشہ عاشقانہ ولولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے حتیٰ کہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دلچسپی سے شریک اور رفیق رہے ہر قسم کی خدمت کو اپنے لئے خوش نصیبی سمجھا کئے۔ لوگوں نے ان کو سی آئی۔ ڈی مشہور کیا۔ آوازے کسے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھڑکایا اور بدظن کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر حضرت مردم شناس دماغ اور قلب رکھتے تھے ان کی طرف سے اخیر تک بدظن نہ ہوئے اور آخر وقت تک ان کو ساتھ رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے رازدار اور مالی سرمایہ کے خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی عرصۂ دراز تک حضرت کے مکان ہی پر قیام پذیر رہے۔ چونکہ ایام اسارت مالٹا میں اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح بھی ہو گیا۔ اس سے ان کے دو لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئیں جو کہ ماشاءاللہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کی صدارت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مزید برآں معاشیہ کی بنا پر سوختنی (جلانی لکڑی) کی تجارت بھی کرتے رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے۔ وہاں ہی ایک بیتیم سے اس کی خواہش پر دوسری اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا، پھر اپنے بچوں اور تیسری اہلیہ کو لے کر وطن ضلع پشاور میں چلے گئے۔ اب وہاں ہی اقامت گزیں ہیں (نقش حیات ص۱۹۱، ۱۹۲) فروری ۱۹۴۵ء کو واپس وطن آئے اور پھر میاں کاکا خیل "سخاکوٹ" میں سکونت اختیار کر کے زندگی ذکر و فکر اور مطالعہ میں گذار رہے ہیں"۔

۱۹۷۲ء کی ملاقات میں آپ نے راقم کو ان مجاہدانہ کارناموں کی کچھ تفصیل سنائی تھی۔

ایک ضروری وضاحت "تحریک ریشمی رومال" نامی کتاب کلاسیک ۴۲ دی مال لاہور سے نے دین محمدی پریس سے ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا حسین احمد کی تصنیف کے طور پر شائع کی جس میں ترتیب مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی کی ہے۔ یہ کتاب مجاہدین آزادی کی لازوال مجاہدانہ سرگرمیوں کو چھپانے یا پردہ ڈالنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ سرے سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تصنیف ہی نہیں بلکہ عبدالرحمٰن ہزاروی صاحب کی روایات پر مبنی ہے۔

حضرت مدنی کے فرزند ارجمند مولانا اسعد مدنی تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ آپ کی یہ اہلیہ محترمہ نہایت صالحہ تھیں۔ انہوں نے آپ کے تعاون سے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کا انگریزی میں ترجمہ لکھا، جسے بعد میں مولانا سلیمان ندوی نے دیکھا تو بہت پسند کیا۔ فیروز سنز لاہور والوں نے برائے اشاعت لیکر نامعلوم کہاں رکھ دیا ہے؟ اسلام کی حقانیت اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کا موازنہ بنام (BALANCE WAY) بھی لکھا ہے۔ انگریز کمانڈر ان چیف لارڈ کچنر کے خاندان سے تھیں۔ راہِ حق کی تلاش میں سب کو قربان کر کے حضرت مولانا مدنیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ آپ کے نکاح میں آئیں اور ۱۹۷۲ء میں وصال ہوا۔

"تحریک ریشمی رومال، مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن ہزاروی کی تصنیف کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی طرف منسوب کرنا بدترین افتراء ہے۔ یہ تصنیف مولوی عبدالرحمٰن صاحب ہزاروی کی طبع زاد ہے۔ جس میں تاریخی واقعات کو مسخ کرکے انتہائی مکروہ صورت میں پیش کیا گیا ہے اور حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے بعض اقتباسات پیش کرکے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب حضرت قدس سرہٗ کی تصنیف ہے اس میں خاص طور پر وہ حصہ انتہائی مکروہ افتراء ہے جس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مخلص خادم و جان نثار اور رفیق اسارت اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مخلص ترین رفیق حضرت مولانا عزیر گل اسیر مالٹا کو ریشمی خطوط کی تحریک میں انگریزوں کا آلۂ کار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں مولوی عبدالرحمٰن ہزاروی کی اس قسم کی تمام افتراپردازیوں کی پرزور تردید کرتا ہوں جو انہوں نے حضرت مولانا عزیر گل صاحب کے متعلق اس کتاب میں کی ہیں اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے تعلقات حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ سے انتہائی یگانگت اور اخلاص کے ساتھ قائم رہے ہیں اور والدِ محترم کے انہیں تعلقات کے احترام میں انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود میں نے ان کی زیارت کی۔ بیس سالہ تمنا کے حصول کے لئے ان کے دیہاتی خام مکان پر حاضر ہونے کی آج ہی سعادت حاصل کی ہے۔ جہاں وہ اسی درویشانہ اور تبتل کی زندگی گذار رہے ہیں جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے مخلصین کا طرۂ امتیاز اور حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ کی طویل تاریخی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت رہی ہے"

(بیان مطبوعہ الحق، ۱۷ر جولائی ۱۹۷۹ء
پشاور صـ۳۲ بابت اگست ۱۹۷۹ء)

سی۔آئی۔ڈی کی شہادت بعنوان "ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری"

آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "۲۹ — عزیر گل — پسر شہید گل کاکا خیل پٹھانؒ[1] وہ کوٹی[2] شمال مغربی سرحدی صوبہ میں رہتا ہے۔ بڑا آتشیں مزاج ہے جب وہ دیوبند میں طالب علم تھا اسی وقت سے مولانا محمود الحسن کا پکا مرید ہو گیا تھا۔ بڑا اہم سازشی ہے ہجرت کا بڑا خواہشمند ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ہمیشہ مولانا کو اکسایا ہے کہ وہ جہاد کے لئے ہجرت کر جائیں۔

وہ دیوبند میں خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور ستمبر ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود الحسن کے ہمراہ عرب گیا تھا۔ اس کے سفر حجاز سے قبل مولانا محمود الحسن نے اس کو آزاد علاقہ میں بھیجا تھا تاکہ حاجی صاحب[3] سیف الرحمٰن اور دوسرے معروف لوگوں کو مطلع کر سکے کہ حضرت مولانا کا ارادہ ہندوستان سے ہجرت کرنے کا ہے۔ نیز لڑائی کو اور جہاد کی تیاریوں کا مشاہدہ کر سکے۔ وہ حضرت مولانا کے ہمراہ اس وقت بھی ٹھہرا رہا جب کہ ان کے اکثر پیرو اور مریدین ہندوستان کو واپس کرائے گئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ عزیر گل انور پاشا اور جمال پاشا کے فرمان لے کر عنقریب ہندوستان آئے گا۔ اور اس فرمان کو افغانستان لے جانا ہوگا لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مکہ میں شریف مکہ کے حکم سے ۱۰ دسمبر کو یا اس کے لگ

---

[1] آپ حضرت شیخ رحمکارؒ کی اولاد سے ہیں کاکا خیل ہیں۔ قومیت کے لحاظ سے پٹھان نہیں ہیں بلکہ پشتو بولنے کی وجہ سے شاید پٹھان لکھ دیا گیا ہے جو قومیت کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔ آپ کے والد صاحب کا نام شاہد گل ہے نہ کہ شہید گل۔

[2] یہ "زرگئی" ہے۔ "درگائی" نہیں۔ آپ کے والد کا وہاں قیام رہا۔

[3] حاجی فضل واحد المعروف بہ حاجی ترنگ زئی مراد ہیں۔

ہنگ گرفتار کر لیا گیا اور بہ ترہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو اسے مصر روانہ کر دیا گیا۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں مولوی عزیر گل کا نام میجر کا دکھایا گیا ہے۔[1]

سی آئی ڈی کی اس شہادت سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ آپ اس تحریک کے اہم سازشی تھے۔ الزام لگانے والوں کو اب توجیا آنی چاہیئے کہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب نے اس تحریک کا کوئی راز افشا نہیں کیا، ورنہ انگریزی سرکار انہیں "آتشین مزاج" اور "اہم سازشی" کے القاب سے نہ نوازتی۔

مولانا سید اسعد مدنی لکھتے ہیں کہ "اس جماعت کے ارکان کی مدح وستائش یا ان کی سفارش کرنا ان سطور کا موضوع نہیں ہے جو پیش لفظ کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔ نہ ان میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ اس جماعت کے ایک رکن مولانا عزیر گل صاحب کے متعلق چند کلمات لکھنے ضروری ہیں۔

پاکستان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ بنام "تحریک ریشمی رومال مولانا حسین احمد" کتاب کے مصنف ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن، اس کتاب میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے یہ گل افشانی کی ہے کہ مولانا عزیر گل صاحب جاسوسی کیا کرتے تھے۔

اس نفرت انگیز الزام کے ثبوت کے لئے صرف ایک غیر مستند بیان پیش کیا ہے باقی خود ساختہ قرائن درج فرمائے ہیں۔ کتاب کی تحریر کا ایسا انداز ہے کہ گویا حضرت والد صاحب و حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ نے خاص مجلسوں میں سربستہ راز ظاہر فرمائے تھے۔ اور عبدالرحمٰن صاحب نے ان کو قلم بند فرما لیا تھا۔ میں سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جو تحریر کے انداز سے پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ کو نہ اتنی فرصت ملتی تھی اور نہ یہ عادت تھی کہ طلبا کے ساتھ خاص مجلسیں کریں۔ وہ چشمہ فیض اور علم کے دریا تھے۔ حلقۂ درس میں یہ دریا موجزن ہوتا تھا۔ تشنگانِ علوم دین سیراب ہوتے تھے۔ طلبہ کو دعوت دے کر مجلس جمانا، یہ ان کا طریقہ نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ بادزن تو کیا ہوتے ایسے بھی نہیں ہیں کہ کسی سنجیدہ مجلس میں ان کا تذکرہ کیا جائے۔ ان کا نام بھی "رسوائے زمانہ" جیسے توہین آمیز خطاب کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ طلبہ کے حلقہ میں بہت سی باتیں پھیلتی ہیں جو اکثر خود ساختہ ہوتی ہیں۔ جن سے گرمئ مجلس کا کام لیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے انہیں ہفوات کو جمع کر کے جاذب توجہ نام رکھ دیا ہے "تحریک ریشمی رومال" بہرحال نہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی شخصیت قابلِ اعتماد ہے۔ نہ وہ قرائن قابلِ التفات ہیں جن پر مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے اس الزام کی بنیاد رکھی ہے۔ مگر تعجب بھی ہے اور افسوس بھی کہ ایک صاحب جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ جس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔ انہوں نے تقریباً دو صفحے اس ہفوات کو نقل کرنے میں رنگے ہیں۔ اور ان قرائن کے متعلق فرمایا ہے "محل غور" ہیں۔

غالباً مقالہ نگار صاحب کے نزدیک تحقیق کے معنی یہی ہیں۔ کہ متضاد قسم کے رطب و یابس جمع کر کے اپنی طرف سے محققانہ فیصلہ کرنے کے بجائے بارِ تحقیق پڑھنے والوں پر ڈال دیں اور فریضۂ غور و فکر اپنے بجائے ناظرین کے ذمہ کر دیں۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے پیش کردہ قرائن میں سب سے قوی قرینہ یہ ہے کہ مولانا عزیر گل صاحب نے آخر میں ایک میم سے شادی کر لی تھی اب فرماتے ہیں کیا حضرت شیخ الہند قدس

---

[1] مولانا سید محمد میاں، "تحریک شیخ الہند؛ انگریزی سرکار کی زبان میں: ریشمی خطوط سازش کیس اور کون کیا تھا۔ (انڈیا آفس لندن میں محفوظ ریکارڈ کا اردو ترجمہ) لاہور، نومبر ۱۹۷۵ء مکتبہ رشیدیہ۔ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰۔

کے مسلک کا فدائی انگریز سے رشتہ کر سکتا ہے؟ اس قرینہ کا ایک جزء یہ ہے کہ کیا ایک مولوی کی مولویانہ آمدنی سے ایک میم کا تمدن پورا ہو سکتا ہے؟ مولوی عبدالرحمٰن صاحب یہ قرینہ پیش کر رہے ہیں اور مقالہ نگار صاحب اس کو نقل کر رہے ہیں اور محقق مقالہ نگار صاحب کو یاد نہیں رہا کہ انہوں نے خود اس محققانہ مقالہ میں یہ درج کر دیا ہے کہ یہ نکاح مولانا عزیر گل صاحب کی خواہش پر نہیں بلکہ خود میم صاحب کی خواہش پر ہوا تھا۔

یہ میم صاحبہ نکاح کے بعد رڑکی پھر دیوبند میں بھی کئی سال تک رہیں۔ کہا جاتا تھا کہ ان کا تعلق لندن کے معزز خاندان سے تھا۔ ذی علم اور صاحب مطالعہ تھیں۔ بیوہ تھیں۔ ان کے پہلے شوہر ہندوستان میں اونچے عہدوں پر رہے تھے لیکن جب اسلام سے مشرف ہوئیں تو زاہدانہ زندگی اختیار کر لی۔ یورپین تمدن کے بجائے دیوبند اور رڑکی کا قصباتی تمدن اپنایا۔ شدت سے پردہ کی پابند ہو گئیں۔ صوم و صلوٰۃ اوراد و وظائف اور تلاوت قرآن کریم ان کا مشغلہ تھا۔ تفسیر کا مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی انگریزی میں لکھا مگر افسوس طباعت کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ایسی خاتون کے متعلق بدظنی گناہِ عظیم اور کسی خود ساختہ قرینہ کے لئے ایسی واجب الاحترام خاتون کا نام لینا "لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" کے تحت حرام ہے۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے سامنے کوئی خیالی عزیر گل ہیں جن کی زندگی بلند پایہ دولت مند کی سی رہی کیونکہ شیخ الہند رحمۃ اللہ کے رفیق اسیر مالٹا عزیر گل جن کا تعلق والد صاحب رحمۃ اللہ سے برادرانہ تھا اور بڑے بھائی کی طرح حضرت بھی ان پر شفقت فرماتے اور ضرورت کے وقت تکفل بھی فرماتے تھے۔ ان کی زندگی تو ہمیشہ مولویانہ بلکہ طالب علمانہ رہی نہایت سادہ، بے تکلف۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کی نشست گاہ میں رہا کرتے تھے پھر مسجد یا مدرسہ کے حجرہ یا کرایہ کے مکان میں زندگی بسر کی۔ کوٹھی یا پختہ مکان تو کیا اپنے لئے جھونپڑی بھی نہیں بنائی۔

مالٹا سے پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے خادم خاص تھے۔ واپس ہوئے تو زمانہ تحریک میں "خلافت کمیٹی" دیوبند کے صدر رہے۔ کچھ معمولی سی تجارت بھی کرتے رہے، تنہا تھے۔ کسی کا خرچ ان کے ذمہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ لکڑیوں کی ٹال بھی کر لی۔ اسی میں اپنا اثاثہ ختم کر دیا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ نے رڑکی کے مدرسہ رحمانیہ میں تقرر کرا دیا۔ عرصہ تک اسی مدرسہ کے صدر مدرس رہے۔ اسی زمانہ میں میم صاحبہ کی متجسانہ نظر نے آپ کو اپنی زوجیت کے لئے منتخب کر لیا۔ چند سال بعد آپ اپنے وطن تشریف لے گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ نکاح کا زمانہ ۱۹۴۰ء کے قریب کا ہے جبکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کی تحریک کا زمانہ جس میں جاسوسی ہو سکتی تھی اس سے تقریباً ۲۵ سال پہلے یعنی ۱۵-۱۹۱۴ء کا تھا۔

قرائن کے سلسلہ میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے دو مجلسوں کا ذکر کیا ہے کہ ان کی گفتگو کی خبر حکومت کو ہو گئی اور آپ کا خیال یہ ہے کہ شرکائے مجلس میں صرف مولانا عزیر گل صاحب ہی ایسے تھے جن کے ذریعہ خبر پہنچ سکتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جن کارروائیوں میں مولانا عزیر گل صاحب نہیں تھے اور حکومت کے پاس ان کا بھی ریکارڈ تھا ان کی خبر کس نے پہنچائی؟ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو کسی وجہ سے ذاتی طور پر حضرت مولانا عزیر گل صاحب سے کاوش ہے۔ اسی لئے تو تہمات کو قرائن (قرار) دے رہے ہیں اور اس میں خود اپنی ناتجربہ کاری اور ناواقفیت کی دلیل بھی پیش کر رہے ہیں۔ خبر پہنچانے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجلس کا کوئی شریک ہی خبر پہنچائے۔ شرکائے مجلس کے دوسرے لوگوں سے بھی ذاتی تعلقات اس درجہ کے ہوتے ہیں کہ وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے، ان کے سامنے کوئی

---

[1] شیخ الہند مولانا محمود حسن از اقبال حسن خان ص۲۰۳۔

جملہ بے احتیاطی اور بے خیالی میں نکل گیا تو وہ اسی کی خبر بنا کر جہاں چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں۔ ہر بڑے شخص کے ساتھ ایسے لوگ لگے رہتے ہیں۔ مولانا عزیرگل صاحب کا ماحول بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوگا۔ اس الزام کو مولانا عزیرگل صاحب کے سر تھوپنا عناد اور کینہ پروری کی دلیل ہے۔

جن صاحب کے بیان کو مولوی عبدالرحمن صاحب نے شہادت میں پیش کیا ہے اول تو خود ان کی شخصیت غیر معروف ہے[۱]۔ پھر وہ ایسے شخص کی روایت پیش فرما رہے ہیں جو مولانا عزیرگل صاحب کو پہچانتا نہیں تھا۔ صرف اس بنا پر وہ ایک شخص کو عزیرگل قرار دے رہا ہے کہ وہ پشتو بولتا تھا گویا ہر پشتو بولنے والا عزیرگل ہے۔ بہرحال عبدالرحمن صاحب کوئی سنجیدہ اور قابل اعتماد شخص نہیں ہیں کہ ان کی باتوں کا خیال کیا جائے۔ تعجب ہے کہ مقالہ نگار صاحب نے ان عنوانات کو اہمیت دی اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ نے جس طرح مولانا عزیرگل صاحب کی توثیق کی ہے اور ان کی فداکارانہ خدمات بیان کی ہیں ان کو اپنے مقالہ میں دو جگہ ص۳۵ اور ص۳۰ پر نقل کیا مگر ان پر اعتماد نہیں کیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس تحریک کے متعلق سی۔آئی۔ڈی کا ریکارڈ سامنے آیا تو اس میں بھی وہی ہے جو حضرت والد صاحبؒ نے "نقش حیات" میں تحریر فرمایا ہے۔ پورے ریکارڈ کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے[۲]۔ اس کے پیش لفظ کے طور پر یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ اس کے دوسرے حصہ میں "کون کیا ہے" کے تحت میں نمبر ۶۹ ملاحظہ فرمایئے، بقول مولانا عبدالرحمن صاحب حضرت مولانا عزیرگل صاحب جن کے لئے جاسوسی کیا کرتے تھے وہی لکھ رہے ہیں: "جب سے وہ دیوبند میں تھا تب ہی سے مولانا محمود حسن کا پکا مرید ہو گیا تھا۔ بڑا اہم سازشی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ہمیشہ مولانا کو اکسایا کہ جہاد کے لئے ہجرت کر جائیں۔" پورا بیان تقریباً ایک صفحہ میں ہے اوراق پلٹیئے اور پورا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ کہیں کسی فقرہ سے بھی کوئی اشارہ اس الزام کا نہیں ہے جو اس ناخدا ترس عبدالرحمن نے مولانا عزیرگل صاحب پر لگایا ہے اور جس کو محقق مقالہ نگار نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے مقالہ میں سجایا ہے۔ پیش لفظ طویل ہو گیا مگر حضرت مولانا عزیرگل صاحب کے تقدس اور انکے اس احترام نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے متوسلین کے دلوں میں ہے۔ اس ناکارہ کو اس طوالت پر مجبور کیا کہ ایک پاکباز کے دامن سے یہ ناپاک دھبہ دور کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

اسعد ۲۸ صفر ۱۳۹۵ھ/۱۲/مارچ ۱۹۷۵ء

ماخذ و مصادر

(۱) ہیں بڑے مسلمان ص۲۵۲ پر حضرت مدنیؒ کے قلم سے "نقش حیات" کا اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

(۲) تحریک ریشمی رومال۔ مولوی عبدالرحمن ہزاروی۔

(۳) نقش حیات ج ۲ از حضرت مدنیؒ۔

۴ ۔ تذکرہ شیخ الہند۔ از مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری۔

۵ ۔ اسیر مالٹا۔ حضرت مدنیؒ۔

۶ ۔ حیات شیخ الہند از حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ۔

۷ ۔ تذکرہ شیخ رحمکار از مفتی سیاح الدین صاحب۔

۸ ۔ نزہۃ الخواطر ۸ ص۲۶۷۔ از مولانا حکیم عبدالحی صاحب لکھنویؒ۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تذکرہ میں آپ کا نام رفقائے سفر و اسیران مالٹا میں عزیزگل آیا ہے نام عزیرگل ہے۔

۹ ۔ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے از مولانا محمد میاں صاحب۔

۱۰ ۔ ذاتی ڈائری۔ مولانا عبیداللہ سندھی مطبوعہ ادبستان لاہور ۱۹۴۲ء ص۲۰۔

ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک، پشاور اکتوبر ۱۹۶۶ء، اگست ۱۹۶۹ء نیز ۱۹۷۲ء میں اپنی ملاقات کے دوران آپ سے جو مواد لیا گیا۔

۱؎ ان کا صحیح تعارف وہ ہے جو مولانا مفتی سیاح الدین کاکا خیل نے اپنے دو قسط کے مضمون ماہنامہ بینات کراچی بابت ماہ جون؛ جولائی ۱۹۷۵ء میں کرایا ہے (قاری)

۲؎ مولانا سید محمد میاں؛ تحریک شیخ الہند؛ انگریزی سرکار کی زبان میں؛ لاہور مطبوعہ نومبر ۱۹۷۵ء؛ مکتبہ رشیدیہ ص۱ تا ۲۴ (پیش لفظ از حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند)۔

ڈاکٹر
غلام جیلانی برق ایم اے، پی ایچ ڈی، کیمبل پور

دارالعلوم دیوبند
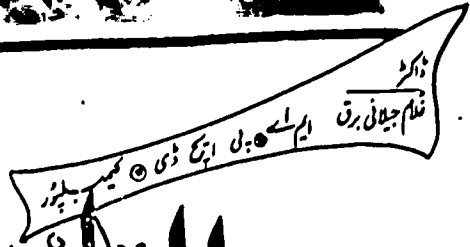
مغلوں کے زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمانانِ ہند ذلیل و رسوا ہو گئے تھے، لیکن اس خاکستر مردہ میں ابھی زندگی کی چنگاری باقی تھی۔ اسے شعلۂ جوالہ بنانے کے لیے بے شمار افراد آگے آئے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے شمشیر و سناں سے کام لیا، بعض نے ایک طاقت ور فلسفے سے قوم میں ایک نیا ولولہ پیدا کرنا چاہا۔ بعض نے عوام کو اپنی تند و تیز تقریروں سے اور شعروں سے گرمایا۔ اور بعض نے بڑی بڑی درسگاہیں قائم کیں۔ جن میں علیگڑھ کی یونیورسٹی، لکھنؤ کا ندوۃ العلمأ اور دیوبند کا دارالعلوم سرفہرست ہیں۔ سرسید کا مطمح نظر قوم کو نئے افکار سے رُوشناس کرانا اور نئی تعلیم دلا کر انگریز کے تحت بلند مناصب کا اہل بنانا تھا۔ اہل دیوبند کا مقصد مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علمی دینی اور رُوحانی مرکز قائم کرنا تھا۔ رہا ندوہ تو وہ درس نظامی کی اصلاح اور علمائے دین کو جدید افکار اور نئے اسلوب تحقیق و تحریر سے متعارف کرانے کے لیے قائم ہوا تھا۔

سرسید (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) کو چند ممتاز شخصیتوں کا تعاون حاصل تھا، یعنی نواب محسن الملک (۱۸۳۷ - ۱۹۰۷ء) نواب وقار الملک (۱۸۳۹ - ۱۹۱۷ء) نواب اعظم یار جنگ۔ مولوی چراغ علی (۱۸۴۴-۹۴ء) ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۱ء-۱۹۱۲ء) مولانا حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) علامہ شبلی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) مولوی ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲ — ۱۹۱۰ء) وغیرہ۔

ندوۃ العلمأ کے محرک ایک سرکاری ملازم مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ تھے۔ کانپور کے ایک عالم مولوی محمد علی اس کے پہلے ناظم تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانی نے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ بیگم بھوپال، سر آغا خان، اور نواب وقار الملک نے مالی امداد کی اور ۱۸۹۸ء میں اس ادارے نے کام شروع کر دیا۔ ۱۹۰۴ء میں شبلی بھی اس کے رکن بن گئے۔

ندوہ نے چند ایسے علمأ پیدا کئے ہیں، جن کے کارنامے ملت کا

قیمتی سرمایہ ہیں، اگر علمائے ندوہ کا ادب اردو سے چھین لیا جائے، تو پیچھے کچھ نہیں رہتا۔ چند علما کے نام یہ ہیں:

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، ابوالحسن ندوی، مسعود عالم ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید ریاست علی ندوی، محمد اویس ندوی، سید ابوظفر ندوی، مسعود علی ندوی اور کئی دیگر۔ ان کی علمی تخلیقات کی فہرست کافی طویل ہے۔ مثلاً سیرت سید احمد شہید، سیرت محمد بن عبدالوہاب، سیرت النبی، تاریخ اخلاق اسلام، یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ، وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ۱۰ سال بعد ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء (۱۵ محرم ۱۲۸۴ھ) کو چند اہل ہمت نے چندہ جمع کر کے دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو چھتہ مسجد کے نام سے مشہور تھی، ایک مدرسے کی بنا ڈال دی۔ اس کار خیر کے اصلی محرک مولانا فضل الرحمٰن[1]، مولوی ذوالفقار علی[2] اور ملا محمود[3] تھے۔ آخر الذکر کو ۱۵ روپے ماہانہ پر مدرس مقرر کر دیا۔ پہلے ہی دن طلبہ کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی اور پھر بڑھتے بڑھتے ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں ۸۳۰ ہو گئی۔

ان تمام کے قیام، طعام اور دیگر ضروریات کا انتظام کرنا آسان نہ تھا، لیکن دیوبند کے اہل ہمت نے اس بارگراں کو یوں اٹھایا کہ زمین و آسمان نے ان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ سنا ہے کہ آجکل طلبہ کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس مہنگے زمانے میں اتنی بڑی تعداد کو دو وقت روٹی دینا، ان کی کتابوں اور کپڑوں کا انتظام کرنا کوئی کھیل نہیں ہے، لیکن وہ لوگ اس فرض کو بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔

تعمیرات مدرسہ

مدرسہ کی باقاعدہ عمارت کا آغاز ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں ہوا تھا۔ خشت اول سہارنپور کے نامور محدث مولانا احمد علی صاحب (۱۲۹۷ھ) نے رکھی، دوسری حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے اور تیسری حضرت رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۴ء) نے۔

اس وقت اس میں ۲۳۰ کمرے، آٹھ ہاسٹل، چار سو رہائشی کمرے اور ایک شاندار کتب خانہ ہے۔

انتظامیہ

پہلی مجلس انتظامیہ سات ارکان پر مشتمل تھی، یعنی

سرپرست: مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مہتمم: حاجی عابد حسین دیوبندی

ارکان شوریٰ: (ا) مولانا مہتاب علی دیوبندی (ب) مولانا ذوالفقار علی والد شیخ الہند (ج) مولانا فضل الرحمٰن مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد۔ (د) شیخ نہال احمد دیوبندی (ہ) منشی فضل حق دیوبندی۔

ایک سال بعد، حاجی عابد حسین صاحب حج پر چلے گئے اور فرائض اہتمام مولانا نانوتویؒ نے سنبھال لیے۔ آپ کی وفات ۱۸۸۰ء کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس منصب کے لیے منتخب ہوئے۔ پھر مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے فرزند مولانا محمد یعقوب، بعدازاں شیخ الہند

---

[1] مولانا فضل الرحمٰن، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عزیز الرحمٰن سابق مفتی دیوبند اور مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم کے والد تھے۔

[2] مولانا ذوالفقار علی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد تھے۔

[3] ملا محمود مدرسہ دیوبند کے پہلے مدرس تھے اور شیخ الہندؒ، پہلا طالب علم تھا جس نے ملا صاحب سے پہلا سبق لیا تھا۔

اور پھر مولانا اشرف علی تھانوی، تقسیم ہند کے وقت مولانا محمد طیب قاری مہتمم تھے، سنا ہے کہ اب بھی وہی ہیں۔ [1]

صدر مدرس

دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس مولانا محمود احمد تھے۔ دوسرے مولانا محمد یعقوب صاحب، تیسرے شیخ الہند۔ چوتھے سید انور شاہ کاشمیری، پانچویں ________ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ یہ حضرات صدر مدرس کے ساتھ شیخ الحدیث بھی رہے۔

دستار و سند

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء سے انتظامیہ نے دستار بندی و عطائے سند کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دارالعلوم کے سرپرست، فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر اپنے ہاتھ سے سبز دستار باندھتے اور سند عطا فرماتے تھے۔

انعامات

باقی طلبہ میں انعامات تقسیم ہوتے تھے۔ دارالعلوم کے جریدے قاسم العلوم کی ایک پرانی اشاعت میں انعامات کی شرح حسب ذیل درج تھی:

۱۔ اول درجہ کے حفاظ کو	ایک روپیہ
۲۔ اول درجہ کے طلبائے فارسی کو	"
۳۔ اول درجہ کے طلبائے عربی کو	"
۴۔ طلبائے درجہ دوم	سات آنے فی انعام
۵۔ طلبائے درجہ سوم	پانچ آنے فی انعام

دارالعلوم کی اہم شخصیتیں

دارالعلوم کی تاسیس، تعمیر، تنظیم، اور تکمیل میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان میں سے چند ایک کا مختصر سا تعارف ضروری ہے

مولانا محمد قاسم نانوتوی

نانوتہ ایک قصبے کا نام ہے، جو دیوبند سے بارہ کوس مغرب میں واقع ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا مولد یہی قصبہ ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر مختلف علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان میں سے ایک مولانا مملوک علی نانوتوی (م ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۱ء) تھے۔ یہ بعد میں اینگلو عربک کالج میں پروفیسر ہو گئے اور اپنے شاگرد کو ساتھ لے گئے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی

۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء

حضرت گنگوہی جن کے حالات و مکاتیب کو مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے مرتب کیا ہے۔ یہ بڑے پائے کے عالم اور صوفی تھے۔ گنگوہ ہی میں درس دیتے تھے۔ مولانا انور شاہ صاحب نہ صرف ان کے شاگرد تھے، بلکہ ان کی صفات کا عکس بھی۔ بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان جہان بیگم آپ کی نسبت عقیدت مند تھی۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب کو سہو ہو گیا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانوی سرپرست رہے ہیں، مہتمم نہیں اسی طرح حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند سرپرست اور صدر مدرس رہے ہیں، مہتمم نہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی حضرت مولانا مملوک علیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔

ابن قاسم ________

مولانا محمود حسن

آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے تھے، بعد از تعلیم ۱۸۷۴ء میں دارالعلوم کے استاد مقرر ہوئے۔ اور چار سال بعد منصب صدارت تک جا پہنچے، جس پر وہ ۳۳ سال تک فائز رہے۔ آپ نے اصلاح و تبلیغ کی خاطر ۱۹۰۹ء میں ایک انجمن جمعیۃ الانصار کے نام سے قائم کی اور مولانا عبیداللہ سندھی کو اس کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ آپ انگریز کے مظالم سے تنگ آکر کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے تھے اور جب واپس آئے تو بیمار ہوگئے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری دہلوی کے مکان پر ان کی وفات ہوگئی اور آپ کو دیوبند میں دفن کیا گیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی

آپ ۱۹ ستمبر ۱۸۶۳ء کو مظفر نگر یوپی کے ایک قصبے تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ۱۸۸۱ء میں بذریعہ خط وکتابت حاجی امداداللہ صاحب سے بیعت کی۔ تکمیل علم کے بعد کانپور کے ایک مدرسہ فیض عام میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ چودہ برس تدریس میں گزارے پھر تصنیف و تالیف اور تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بہت سی کتابیں لکھیں اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

اسلامی معاشرہ پر دیوبند کے اثرات

دارالعلوم دیوبند کی بنا ۱۸۶۷ء میں ڈالی گئی تھی۔ آج (۱۹۷۵ء) اس واقعے کو ایک سو آٹھ برس ہو چکے ہیں۔ محتاط سا اندازہ یہ ہے کہ اس عرصے میں کم از کم دس ہزار طلبہ سند فضیلت لے کر نکلے اور برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ ان کے دو ہی کام تھے۔ تدریس و تبلیغ۔ تبلیغ کے لیے انھوں نے مساجد کے منبر سے کام لیا۔ وعظ کے لیے دیہات میں گھومے بڑے بڑے شہری اجتماعات کو خطاب کیا اور یوں خدا و رسولؐ کا پیغام ہر گھر تک پہنچایا۔ اگر آج برصغیر کے مسلمان مغرب کی بے حیائی، عیاشی، فحاشی اور ذہنی آوارگی سے بڑی حد تک محفوظ ہیں تو اس کی وجہ علمائے دیوبند کی سو سالہ کوششیں ہیں۔ انگریز نے اپنے صد سالہ دور حکومت میں ہم سے مذہب چھیننے اور ہمیں آوارہ، بداخلاق اور مادر پدر آزاد بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن علمائے دیوبند نے انھیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ ان کی بہت بڑی تعداد مساجد میں فرائض امامت سرانجام دے رہی تھی یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے دسمبر اور جنوری کی سرد راتوں میں سحر کے وقت ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے اذانیں دیں۔ نمازیں ادا کیں۔ پھر چاشت تک محلے کے بچوں کو قرآن پڑھایا۔ اور یوں اپنی نظریاتی و دینی سرحدات کی حفاظت کی۔

ورباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا (ترمذی)

ترجمہ: "اللہ کی راہوں میں ایک دن کا پہرہ دنیا کے ہر عمل سے بہتر ہے۔"

تدریس کے سلسلے میں ان لوگوں نے دو راستے اختیار کیے۔ اول انفرادی کہ ہر مسجد میں قرآن اور دینی کتابیں پڑھانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ دوم، اجتماعی کہ عوام کو مدارس جاری کرنے کی ترغیب دی۔ اگر آج آپ کو مدراس سے خیبر تک ہزاروں دینی مدارس نظر آتے ہیں، تو ان میں ۹۵ فی صد ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت ۱۹۷۵ء پاکستان میں تقریباً ساڑھے سو دینی مدارس ہیں جن کی تقسیم باعتبار مسلک یوں ہے۔

مدارس شیعہ:	۱۸
احناف بریلوی	۹۸

مسلک دیوبند ۵۰۵

میزان ۶۲۱

(حافظ نذر احمد)

(جائزہ مدارس عربیہ ۱۹۶)

ان میں سے چند مشہور مدارس یہ ہیں:

۱— جامعہ اشرفیہ پشاور
۲— دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ
۳— تعلیم الاسلام جہلم
۴— جامعہ عربیہ چنیوٹ
۵— مدرسہ عربیہ۔ رحیم یار خان
۶— سراج العلوم۔ سرگودھا
۷— ام المدارس۔ ٹنڈو اللہ یار
۸— مظہر الاسلام۔ کراچی
۹— جامعہ مدنیہ۔ کیمبل پور
۱۰— نصرت العلوم۔ گوجرانوالہ
۱۱— اشاعت العلوم۔ لائل پور
۱۲— جامعہ اشرفیہ۔ لاہور
۱۳— قاسم العلوم۔ ملتان
۱۴— مدرسہ عربیہ۔ کراچی
۱۵— خیر المدارس۔ ملتان
۱۶— جامعہ رشیدیہ ساہیوال
۱۷— دارالعلوم۔ کراچی
۱۸— مدرسہ تفہیم القرآن۔ نواب شاہ
۱۹— جامعہ عباسیہ۔ بہاولپور

دیوبندی مسلک کے تمام مدارس کو، جن کی تعداد برصغیر میں پانچ ہزار سے کم نہیں ہوگی، دارالعلوم دیوبند ہی کی شاخیں تصور فرمائیے اور ان کے فارغ التحصیل طلباء کو فکری لحاظ سے دیوبندی ہی سمجھئے۔ اگر ہر مدرسے سے سال میں اوسطاً ۲۰ طلبہ تعلیم پا کر نکلتے ہوں تو یہ سال میں ایک لاکھ اور سو سال میں ایک کروڑ بنتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں مسلمانان ہند کا متاثر ہونا یقینی تھا۔

میں اور میرا گھرانہ

گھر میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے بعد انگریزی تعلیم یافتوں میں شمار ہوتا ہوں، لیکن بنیادی طور پر میں دیوبند ہی کا ایک طالب علم ہوں میرے دو بڑے بھائی دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔

اول: محمد نور الحق ، ولادت ۱۸۸۸ء ضلع اٹک کے مختلف مدارس عربیہ میں تعلیم پانے کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔ فارغ ہوئے تو وہیں معلم بن گئے ۱۶/۱۵ ماہ کام کیا اور پھر واپس آگئے— یہاں آکر تین جگہ کام کیا۔ پہلے ضلع جہلم کے ایک مدرسے میں جو تحصیل پنڈ دادن خاں کے ایک قصبے ڈریالہ جالپ میں قائم ہوا تھا۔ ۸/۷ سال رہے۔ پھر پیر جھنڈو، سندھ کے دارالعلوم میں صدر مدرس بن کر چلے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہاں سے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر بن کر آگئے۔ وہاں سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں وفات پاگئے۔

آپ اسلامی تاریخ، عربی ادب، رجال، حدیث اور تفسیر کے بہت بڑے عالم تھے۔ عربی زبان عام عربوں سے بہتر جانتے اور لکھتے تھے میں ان سے برسوں پڑھتا رہا اور بعد میں ان سے علمی مشکلات میں مدد لیتا رہا۔ میرے پاس ان کے چند طویل علمی خطوط محفوظ ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی تصنیف طبع ہوئی تھی، یعنی شرح الکامل للمبرد

دوم: پروفیسر غلام ربانی عزیز۔ ایم اے۔ عربی و فارسی۔ مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، جو پورے تیس برس تک کالجوں

میں پروفیسر اور پرنسپل رہے۔ فاضل دیوبند بھی ہیں۔

۲۔ لائلپور میں وہ اور میں ۱۱/۱۲ برس تک مختلف درس گاہوں میں درس نظامی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ وہ بالآخر دورۂ حدیث کے لیے ۱۹۱۸ء میں دیوبند چلے گئے اور میں یہیں رہ کر معقول فقہ اور عربی ادب کی تکمیل کر آیا۔ پروفیسر عزیز کئی کتابوں کے مصنف، مترجم اور ... ان کی تاریخ خوارزم شاہی کے اردو اور انگریزی ایڈیشن زیر طبع ہیں۔ سیرت النبیؐ بھی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے زیر غور ہے۔ آپ آفرین لاہوری — دلشاد پسروری، غنیمت گجراتی اور واقف کے دیوان ایڈٹ کر چکے ہیں۔ بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اور بہت ادیبانہ اسلوب تحریر کے مالک ہیں۔ آپ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور تاحال (۱۹۷۵ء) ان کی صحت بہت عمدہ ہے۔ اللہ انھیں خدمت علم کے لیے دیر تک باقی رکھے۔

۳۔ میں

درس نظامی کی تکمیل (سوائے دورۂ حدیث) اور پنجاب یونیورسٹی، مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں سکول ماسٹر بن گیا اور انگریزی سیکھنی شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے عربی ۱۹۳۴ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۴۰ء میں عربی کی ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ مقالہ کا موضوع تھا "امام ابن تیمیہ"

ولادت ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء اور وفات کا منتظر

میرے اساتذہ

میرے اساتذۂ درس نظامی میں سے درج ذیل حضرات دیوبندی تھے:

نام	سکونت	امتیاز	وفات
مولانا عبدالرؤف	بگ آباد ضلع اٹک	فقہ، گرامر اور منطق میں مہارت	۱۹۵۱ء کے قریب
مولانا عبدالرحمٰن	پنڈی سرال " "	منطق، ادب اور فقہ میں مہارت	۱۹۵۴ء " "
مولانا قطب الدین	عزرغشتی " "	منطق میں بہت قابل	۱۹۴۶ء " "
مولانا محمد جی	گوجر خان	" " "	۱۹۳۰ء " "
مولانا نجم الدین	ڈریالہ جالپ۔ ضلع جہلم	تفسیر، حدیث، ادب	۱۹۵۲ء " "
مولانا غلام مرشد	ڈگہ ضلع سرگودھا	خطیب۔ منطق۔ ادیب	ابھی بقید حیات ہیں۔

نوٹ: مولانا غلام مرشد صاحب کے بارے میں مجھے پورا یقین نہیں کہ وہ دیوبندی تھے، لیکن خیالات، عقائد اور فکر و نظر سے دیوبندی معلوم ہوتے تھے۔

★

جب ۱۹۱۲ء میں مصر کے شہرہ آفاق، مفکر و فلسفی علامہ رشید رضا ندوہ کے سالانہ جلسے میں شامل ہونے کے لیے تشریف لائے۔ تو انھوں نے دارالعلوم دیوبند کا بھی معائنہ فرمایا اور کہا:

"اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔"

(محمد اکرام: موج کوثر ص۲۷۰)

★

کوئی ہے، جو علامہ کی اس رائے سے اختلاف کرے؟

کرامات اولیائے دیوبند

محمد دین شوق

کرامات اولیاء دیوبند کے بیان سے پہلے "نفس کرامت" کے متعلق حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ایک مختصر نوٹ پیش قارئین ہے۔

عقیدہ اہلسنت

علماء احناف کا یہ معروف مسلمہ عقیدہ ہے کہ جس طرح خداوند قدوس وحی کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیبی اور مخفی حقائق سے مطلع فرماتا ہے اسی طرح ان کے سچے متبعین عباد اللہ الصالحین کو جن کو اولیاء اللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کشف الہام اور رویائے صالحہ صادقہ وغیرہ سے پوشیدہ امور کی اطلاع کبھی کبھی منجانب اللہ ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی جن حقائق و رموز سے آگاہ کیا جاتا ہے وہ مبنی بر حقیقت یقینی اور قطعی ہوتی ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی اور اولیاء اللہ کرام کا کشف یا الہام ایسا قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں خود ان کو کبھی کبھی غلطی اور غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

تعریف کرامت

جس طرح باری تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر خوارق کا اظہار فرماتا ہے۔ جن کو "معجزات" کے نام سے پکارا جاتا ہے بالکل اسی طرح کبھی کبھار ان کے سچے متبعین اولیاء اللہ کی مقبولیت و قرب کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر بھی خوارق ظاہر فرماتا ہے۔ اور ان کو کرامت کہا جاتا ہے۔

باطل نظریات والے اگر ان خوارق کو علم غیب یا استمداد من غیر اللہ کہیں یا سمجھیں تو ماسوائے جہالت کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے ہاتھ پر جو کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ دراصل وہ اس ولی کا فعل اور تصرف نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہے۔ ولی صرف اس کا مظہر ہوتا ہے۔

(انہی اولیاء کرام کی صفوں میں سے علماء دیوبند کا ایک خاص حصہ ہے۔ اس سے پہلے کہ اولیائے دیوبند کی کرامات نقل کروں کرامت کی اقسام کو سمجھ لینا از حد ضروری ہے کہ کرامت دو قسم کی ہوا کرتی ہیں)

کرامت معنوی

آدمی کا کوئی فعل خلاف شرع واقع نہ ہو۔ کبیرہ کی بجائے صغیرہ سے بھی احتراز کرے اور عشق رسالت کا نمونہ ہو۔

کرامت حسی

یعنی مافی الضمیر سے مطلع ہونا۔ پانی پر چلنا۔ ہوا پر اڑنا اشیاء

خوردنی کا بڑھنا، آواز کا دور تک پہنچنا اور سننا وغیرہ عوام لوگ اسی کو کمال شمار کرتے ہیں، حالانکہ درحقیقت کمال کرامت معنوی ہے، یعنی شریعت پر مستقیم رہنا، مکارم اخلاق کا خوگر ہوجانا، نیک کاموں کا پابندی اور بے تکلفی سے صادر ہونا حسد وکینہ اور دیگر صفات مذمومہ سے قلب کا طاہر ہونا۔

حدِ کرامت

بعض علماء نے کرامت کی قوت ایک خاص حد تک معین کی ہے اور جو امور نہایت عظیم ہیں، جیسے بدون والد کے اولاد پیدا ہونا یا کسی جماد کا حیوان بن جانا یا ملائکہ کا باتیں کرنا اس کا صدور کرامت سے ممتنع قرار دیا ہے، مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں، کیونکہ جو فعل پیدا ہوا ہے وہ منجانب اللہ ہے، صرف ولی اللہ اس کا مظہر ہے تاکہ ولی کا قرب معلوم ہو اور مقبولیت خداوندی ظاہر ہو، جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد متعین نہیں پھر حد کرامت کیسے متعین ہوسکتی ہے۔

یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ معجزہ کے ساتھ مساوات لازم آئے گی، اس کا جواب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب صاحب کرامت خود یہ کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام وخادم ہوں تو جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے بہ تبعیت اس نبی کے ہے استقلالاً تو نہیں لہٰذا یہ احتمال بالکل ہیچ ہے۔ ہاں البتہ جس خرق عادت کی نسبت پیغمبر خدا کا ارشاد ہو کہ اس کا صدور دظہور مطلقاً محال ہے، وہ بطور کرامت کے بھی سرزد نہیں ہوسکتا۔ جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔

اظہارِ کرامت

اکابر نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا پوشیدہ رکھنا واجب ہے مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو یا غیب سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو کہ اس میں قصد واختیار باقی نہ رہے یا کسی طالب حق ومرید کے یقین کا قوی کرنا مقصود ہو وہاں پر اظہار جائز ہے۔

ہاں البتہ بعض اولیاء کا مقام غلبہ عبودیت ورضا کا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی شے میں وہ تصرف نہیں کرتے، اس وجہ سے ان کی کرامتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ اور بعضوں کو قوت تصرف ہی عنایت نہیں ہوتی۔ تسلیم وتفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کے لیے کرامت کا وجود یا ظہور ضروری نہیں۔

علمِ کرامت

کرامت کے لیے نہ اس ولی کو اس کا علم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کے قصد وارادہ کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ کبھی علم ہوتا ہے اور قصد نہیں، اور کبھی علم وقصد دونوں امر ہوتے ہیں۔

بنا برایں کرامت کی تین قسمیں ہوتی ہیں

نمبر ۱: جس کا علم بھی ہو اور قصد بھی ہو، جیسے حضرت فاروق اعظمؓ کے فرمان مبارک سے نیل کا جاری ہونا۔

نمبر ۲: جس کا علم ہو قصد نہ ہو، جیسے مریم علیہا السلام کے پاس بے فصل میووں کا آجانا۔

نمبر ۳: جہاں علم وقصد دونوں نہ ہوں، جیسے ابوبکر صدیقؓ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کے وقت کھانے کا دو چند اور زیادہ ہو جانا، چنانچہ خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تعجب ہوا جس سے ان کے علم وقصد کا پہلے سے متعلق نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پہلی قسم پر لفظ تصرف وہمت کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسری وتیسری پر برکت وکرامت کا اس کو تصرف نہیں کہا جاتا (منقول از کمالات امدادیہ حضرت تھانویؒ)

حرفِ مطلب

اب اولیاء وصلحاء دیوبند کی چند کرامات نمونہ مشتے از خروارے نقل کی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے برصغیر میں کتاب وسنت کی تعلیم عام ہوئی شرک

وحدت کی تاریک ظلمتوں سے عوام الناس نکل کر صراط مستقیم پر آئے سرفہرست سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا نام نامی آتا ہے جن کی وجہ سے یہ شمع روشن ہوئی اور کروڑوں انسانوں نے دیوبند کے فیض سے اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگایا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کرامات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہ

آؤ ذرا سیر کریں (مدینے کی)

مولوی محمد اسماعیل صاحب روایت کرتے ہیں کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب نے فرمایا کہ اب جو میں حج کے لیے بیت اللہ شریف گیا تھا تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا قصہ سرگذشت بیان کیا کہ میں جب مدینہ منورہ میں گیا، وہاں چند روز تک رہا۔ چند روز کے بعد حضرت سرور کائنات ختم الرسل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو طواف میں دیکھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم خاندان صابریہ کے مرید ہو جاؤ۔ یہ ناچیز بسبب ارشاد مکہ معظمہ میں ایک بزرگ سے مرید ہوا اور حاجی صاحب کی خدمت میں آیا کرتا تھا۔ ایک روز چونکہ بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ مکہ معظمہ سے ایک ایسا راستہ ہے کہ اگر انسان ظہر کی نماز پڑھ کر چلے تو مدینہ منورہ میں عصر کی نماز پڑھ کر مغرب کی نماز مکہ معظمہ میں واپس آکر پڑھ سکتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو معلوم نہیں چونکہ میں بہت بے تکلف تھا۔ عرض کیا کہ جب آپ کو یہ معلوم نہیں تو یہاں یعنی مکہ معظمہ میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ کر چلا آیا۔

چند روز کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے مجھے فرمایا کہ آؤ ذرا سیر کریں۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ مبارک میں لے کر باہر چلے ایک پہاڑ پر چڑھے اور اس سے اترتے ہی فوراً مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ وہاں نماز پڑھ کر عصر کی نماز مکہ معظمہ میں لوٹ کر پڑھی۔ میں نے اپنے جی میں خیال خام کیا کہ اب تو راستہ معلوم ہی ہو گیا ہے۔ ہمیشہ جایا کریں گے حاجی صاحب کی کیا ضرورت ہے۔ جب موافق اپنے خیال خام کے اس راستے سے جانا چاہا تو اس پہاڑ پر چڑھا ہی نہ جا سکا۔ مولوی احمد حسن صاحب نے کہا کہ کبھی ہم تو اتنا روپیہ خرچ کر کے مدینہ طیبہ گئے اگر ہم کو پہلے معلوم ہوتا تو ہم بھی حضرت حاجی صاحب سے عرض کرتے۔

(ماخوذ از کرامات امدادیہ)

آسیب دور

ایک روز نصف شب کے قریب ایک سفید باش آیا اور آپ کو جگا کر عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی خلش سے بہت تکلیف ہے آپ تشریف لے چلیں اور اس کا علاج فرما دیں۔ اسی وقت آپ اس کے ہمراہ ہوئے وہاں جا کر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اس کے سر پر موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ایسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے۔ اس لیے ہم یہاں آگئے تھے۔ آپ تشریف لے آئے ہیں ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آویں گے۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لایا کریں۔ صرف ایک پرچہ اس کے ہاتھ بھیج دیا کریں موافق اس کے تعمیل کیا کروں گا۔ مجھ سے آپ کی یہ تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ پھر جب کبھی ایسی شکایت ہوئی۔ آپ ایک پرچے پر اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہو جاتی (ایضاً)

مفرور کی واپسی

بعض لڑکے بلا اطلاع کہیں چلے جاتے اور ان کے رشتہ دار پریشان ہوتے

حضرت کے روبرو جس وقت کسی لڑکے کے چلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے۔ وہ لڑکا جس جگہ اس وقت ہوتا تھا اس سے آگے نہ بڑھتا۔ وہاں سے واپس اپنے گھر چلا آتا۔ آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہوا کرے فوراً بیان کر دیا کریں جس قدر جلدی بیان کر دیا جاوے گا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجاوے گا اور جس قدر دیر کی جائے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔ (ایضاً)

کیا خط نہیں آیا؟

ایام حج میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ مولوی اشرف علی صاحبؒ کا خط نہیں آیا۔ احقر نے جواب دیا کہ حضور اس وقت تک تو نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا کہ آنا چاہتا ہے یا آیا۔ اسی وقت جب حرم محترم میں بندہ پہنچا ڈاک والا حضرت تھانوی کا خط لے کر آیا۔ (ایضاً)

طعام میں برکت

ایک دفعہ شیخ احمد مجاہد نے حضرت حاجی صاحب اور چند معززین مشائخ کی جمعہ کے روز دعوت کی حضرت نے قبول فرمالی۔ جب حضرت اعلیٰؒ مدعو ہوئے تو بہت سے لوگ آپ سے ملنے کی غرض سے جمع ہو گئے۔ مجاہد صاحب نے دروازہ مکان کا بند کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس جلسہ میں مولوی محمد اسماعیل والد ملا نواب صاحب مرحوم اور مولوی محمد سعید صاحب اور قاری عبداللہ صاحب وغیرہم شامل تھے۔ انبوہ کثیر کو دیکھ کر مجاہد صاحب بہت پریشان ہوئے اور دوسری دفعہ کھانا پکانے کا ارادہ کیا۔ حضرت اعلیٰؒ نے احقر سے ارشاد فرمایا کہ مجاہد صاحب کو بلا دو حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ کھانا پکانے کی حاجت نہیں جو ہے اس وقت اہلِ دعوت کو کھلا دو۔ اور اس مجلس کو آخر میں رکھو۔ مجاہد صاحب قدموں پر گر پڑے اور کہا یا حضرت یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سے پہلے لوگوں کو کھانا کھلاؤں۔ آپ نے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں اور اسی میں میری خوشی ہے۔ بموجب حکم (الامر فوق الادب) مجاہد صاحب نے ایسا ہی کیا۔ سو آدمی کا کھانا تقریباً تین سو آدمی نے کھایا۔ لیکن مجاہد صاحب نے آخر میں گھبرا کر کچھ روٹی نکال لی آخر میں وہی روٹیاں بچ گئیں۔ (روایت مولوی قاری احمد مکیؒ از کرامات امدادیہ)

درد دور ہوگیا

میں ایک بار رام پور میں حضرت حاجی صاحب کے ہمرکاب تھا رات کو میری ٹانگوں میں شدت سے درد پیدا ہو گیا کہ کسی طرح قرار نہ ہو سکا اور نہایت درجہ بیتاب ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر حضرت میرے پاس تشریف لائے اور باصرار مجھ کو چت لٹا کر ایک ٹانگ میری حضرت نے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور دوسری ٹانگ حضرت مولانا ممدوح نے دبانا شروع کی۔ میں اس وقت اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا اور اسی وقت درد بالکل جاتا رہا۔ (ایضاً)

زیارت کرنا

حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب ملا غلام مرتضیٰ صاحب مصروف کی ملاقات کے لیے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہو کر منتظر بیٹھے رہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے۔ جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت ہو جاتے۔

(منقول از کرامات امدادیہ)

کراماتِ حضرت گنگوہیؒ

ہاتھ جھٹک دیئے

ایک دفعہ ایک نابینا شخص پا پیادہ میرٹھ سے گنگوہ پہنچا اور کہا کہ اللہ نام

سیکھنے آیا ہوں۔ اہلِ خانقاہ اس کے عاشقانہ شوق سے بہت متاثر ہوتے اور خوب خاطر مدارت کی۔ حضرت مسجد میں تشریف لائے۔ اس نے مصافحہ کرنا چاہا تو آپ نے ہاتھ جھٹک لیا اور بڑی لاپرواہی سے علیحدہ کر دیا۔ ہر چند اس نے اپنی طلب کا سچا ہونا اور مدت دراز سے زیارت کا متمنی و آرزومند ہونا ظاہر کیا، مگر حضرت نے مطلق التفات نہ فرمایا۔ اہلِ خانقاہ کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے مگر کسی کو پوچھنے کی یا کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی بعض مخلصین نے بالآخر سفارش کر ہی دی تو آپ کو یہ بات ناگوار گزری اور غصہ سے فرمایا۔

"جب تمہیں دخل نہیں تو اس کام میں بولا کیوں کرتے ہو۔ اس کے قلب کو تو دیکھو دُنیا بھری پڑی ہے یہ"

خیر وہ نابینا چلا گیا۔ دس بارہ روز کے بعد عرس تھا۔ کسی نے دیکھا کہ قوالی میں خوب حال کھیل رہا ہے۔ جس نے خانقاہ میں اس کا لائق شوق حضرت کے متعلق دیکھا تھا پوچھا کہ "میاں حضرت کے ساتھ شوق و ولولہ کہاں گیا" وہ نابینا ہیچ اُگل پڑا کہنے لگا — بھیا یہ تو یاروں کے دھندے میں خیال تھا تمہارے میاں صاحب پر سکہ جم جائے گا تو خوب آؤ بھگت ہوگی عرس تک دن نکال لوں گا۔ پھر عرس میں حال قال میں بھرم بندھے گا۔ باقی کیسا شوق اور کیسی تمنا زیارت، ہم تو سیلانی قسم کے آدمی ہیں یوں ہی دن گزارتے پھرتے ہیں۔

نے خادم نہ ہیچ کسی نہ مخدوم کسے
گر شاد بزی کہ خوشش جہانے دارد

(بیس بڑے مسلمان) ص۲۲۱

اچھا جلدی کیا ہے

افسر الاطبا حکیم احمد سعید امروہی بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ ٹکی اسی خیال سے گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباعِ سنت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی مگر پھر خیال یہ ہوا کہ جب تک ادھر ہی سے قلب کو نہ کھینچا جائے گا بیعت نہ کروں گا کئی دن کے قیام میں معمولات پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی حضرت نے صاف انکار کر دیا کہ نہیں، بیعت نہیں کروں گا، بڑے اُن کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے۔ کوئی سفارش کراتا ہے۔ کوئی الزام لگاتا ہے۔ غرض ٹھیک نہیں ؟

حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرتبۂ عالی اور کامل راہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن نہ رہ گئے آخر ایک دن حضرت کو حجرہ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت مجھ کو محرومی کی امید نہ تھی۔ گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب قابل ہیں حضرت نے ان کو فرمایا: "اچھا جلدی کیا ہے؟ ابھی اپنے قلب کا اطمینان تو کر لو" حکیم صاحب اپنے وسوسے پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں بیعت سے متعلق انسان کو ہر طرح سے قلب مطمئن کر ہی لینا چاہیئے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے است　　پس بہر دستے نباید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالیٰ برکت دے گا۔ وہ واپس گئے تو قلب پرسکون، بے چینی دور اور افسر الاطبا اور دُنیاوی برکات سے مالامال۔　　(ایضاً) ص۲۲۳

دو رکعت پڑھو

ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے۔ سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "دو رکعت پڑھو" حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر چپکے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازے سے باہر ہوئے تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی رافضی تھے (ایضاً) ص۲۲۳

جاڑے میں برکت

مولوی شریف حسین مدراسی جو حضرت کے شاگرد تھے

حضرت کے دیوبند تشریف لانے پر ایک سماوار میں بڑی عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لائے۔ دیکھا تو بیٹھک اشخاص سے بھری ہوئی تھی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو پلا دیتا ہوں دہلیز پر بیٹھ کر پلانے لگا تو حضرت نے ارشاد فرمایا مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کر دو۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں داہنے ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کر دی۔ تقریباً پچیس آدمی کا مجمع موجود تھا۔ سب نے چائے پی لی تو سماوار کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی چائے موجود تھی۔ حالانکہ برتن صرف چھ پیالی کا تھا۔

(ایضاً) ص۲۲۲

بادل کا پھٹنا

حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھڑیاں دھوپ گھڑی سے ملانے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ متواتر کئی دن ابر چھایا رہا اور دھوپ نہ نکلی۔ ایک دن دھوپ نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل۔ حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لائے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب بارہ بجیں مجھے خبر کرنا۔ اور خود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے۔ جب آئے تو دھوپ تھی۔ لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲ کے خط کے قریب) پہنچنے لگا تو دفعتاً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی ہے۔ آپ اٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آگئے۔ آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے پھٹ گئے۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے۔ یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا۔ یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوئی بقوت منہ کو نکال کر جھروکے سے جھانکنے لگے۔ (ایضاً) ص۲۲۲

مرزا قادیانی کی گمراہی کی خبر

مرزا غلام احمد قادیانی لعنتی جس زمانے میں براہین لکھ رہا تھا اور ان کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا۔ اس وقت تک اُن کو حضرت امام ربانیؒ سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ مولانا اچھی طرح ہیں؛ دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اسی زمانے میں حضرت نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے، مگر پیر کی ضرورت ہے۔ ورنہ گمراہی کا احتمال ہے۔ اس کے بعد ہی مجددیت، مہدویت وعیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور نبوت کا دعویٰ کیا۔ (ایضاً) ص۲۲۳

"ہمارا اسلام کہہ دینا"

مولوی عبد السبحان صاحب انسپکٹر پولیس گرالیار کے ایک تحصیلدار دست برخاست کر دیئے گئے۔ خاصی کوشش کی دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دُعا کے لیے گنگوہ پہنچے۔ حضرت نے فرمایا، تمہارے وطن کے قریب جو میدان ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں۔ "اُن سے ہمارا سلام کہہ دینا۔" تحصیلدار صاحب سمجھے کہ ٹال دیا۔ دل برداشتہ ہو کر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اتفاقیہ اُدھر سے گزر ہوا تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دور ہی سے ان کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا۔ "بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔ جا جا پہاڑ پر چڑھ جا۔" یہ سن کر انہوں نے حضرت کا سلام تو پہنچا دیا۔ مگر رنجیدہ و مغموم یہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے یوں ٹالا اور فقیر نے اس طرح ٹالا۔ کام کچھ بھی نہ ہوا۔ اسی ادھیڑ بن میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال کئے گئے۔ اور نینی تال کا تبادلہ ہوا۔ (ایضاً) ص۲۲۳

شیخ عبد القادر گیلانیؒ کے حکم سے بیعت

حضرت منشی علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ حضرت گنگوہی کے بیعت ہوئے تھے۔ اُن کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہ جاؤ اور مولوی رشید احمد سے بیعت کرو۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت کے بیعت ہو گئے۔ (ایضاً) ص۲۲۳

کرامات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری

حلال نہیں حرام ہے

ایک دفعہ آپ حج پر تشریف لے جا رہے تھے کہ عدن پر جہاز ٹھہرا تو کشتی والے طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے آتے۔ مینڈک جیسا ایک جانور بھی کہ بیچ میں چاک کرکے گوشت کا حلقہ سا بنا لیتے ہیں۔ بکثرت (فروخت ہوتا) اور عرب اس کو خاص رغبت سے کھاتے ہیں۔ حضرت کو مچھلی سے رغبت تھی اور ایک عرب نے شوق دلایا کہ اس کو کھا کر دیکھئے۔ مچھلی سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے آپ نے اس کو خریدنے کے لیے مجھ سے فرمایا، چنانچہ میں نے دو کشتی میں ڈال دیے کہ جتنا آدھے دیدے۔ وہ جہاز پر بھی نہ آنے پایا تھا کہ آپ دفعۃً گھبرائے اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی ذرا ٹھہرو، میرے خیال میں تو یہ حرام ہے حلال نہیں کہ مچھلی نہیں ہے۔ کوئی دریائی جانور ہے مگر احناف کے نزدیک سوائے مچھلی کے کوئی بحری جانور حلال نہیں ہے۔ چنانچہ تحقیق ہوا کہ حضرت کا خیال صحیح ہے اور عرب چونکہ زیادہ تر شافعی ہیں اس لیے اس کو حلال سمجھتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی سب خرید کر بلا تکلف کھاتے ہیں کہ حلت، حرمت کی تحقیق کا داعیہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

(تذکرۃ الخلیل)

مرد نہیں عورت ہے

ایک بار حرم میں تلاوت قرآن مجید کی آواز آئی جس کی طرف بے اختیار دل کھنچتا تھا۔ ذرا دیر میں ڈھٹ لگ گئے، آپ بھی چلتے چلتے رک گئے اور سننے لگے مگر شاید ایک منٹ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ آپ نے یہ فرما کر کہ پڑھنے والی عورت معلوم ہوتی ہے، سننا جائز نہیں۔ وہاں سے چل دیئے۔ منہ پر چونکہ نقاب تھا اس لیے عورت مرد کی شناخت ناممکن تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے عرض کیا حضرت نے کیسے سمجھا کہ یہ عورت ہے؟ فرمایا اس کی گنگری بتا رہی ہے کہ مرد کی آواز نہیں تب مجھے کرید ہوئی اور معلوم ہوا کہ بیشک وہ عورت مصریہ تھی۔

(تذکرۃ الخلیل)

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

مولانا عاشق الٰہی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اہل وطن شیوہ میں میرے خلاف شورش برپا ہوئی اور اتفاق سے کوتوال شہر شیوہ آگیا جس پر ناتواں ہو کر انہوں نے کوشش کی کہ مجھ پر آفت آسکے۔ میں نے پریشان ہو کر وطن چھوڑنا چاہا اور حضرت کو لکھا تو جواب آیا بالکل نہ ڈرو، دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است، وطن کیا محلہ بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں میں دعا کرتا ہوں ان شاء اللہ بال بھی بیکا نہ ہوگا اور دشمن خائب و خاسر ہوگا۔ حضرت مستجاب الدعوات تھے ہی اسی وقت دل کو سکون ہوگیا اور چند ہی روز گزرے تھے کہ کوتوال کا بدنامی و ذلت کے ساتھ تبادلہ کا حکم آگیا۔

(تذکرۃ الخلیل)

جواب آیا اور مشکل حل ہوگئی

مولوی لطیف احمد صاحب لکھتے ہیں بندہ جب ۱۳۲۳ھ میں ضلع سورت میں ملازم ہو کر آیا تو ایک دیندار شخص حافظ عبدالرحیم ہم سے آئے اور کہنے لگے تم مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی واقف ہو؟ میں نے کہا خوب اچھی طرح، کہنے لگے مولانا کی اس وقت بڑی تعریف ہے۔ بلا وصل ہو گئے۔ مجھے ایک مصیبت پیش آئی اور میں گھبرا گیا۔ غیبی مدد کہ ایک ردی کا کاغذ پڑا پایا۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا مولوی خلیل احمد مستجاب الدعوات ہیں۔ اور ان کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ اس وقت میں نے مولانا کو خط لکھا اور اپنی مصیبت کا حل چاہا۔ ادھر جواب خط آیا ادھر میری مشکل حل ہو گئی اور چونکہ میں بھی اس وقت سخت مشکلات میں مبتلا تھا اس لیے وہ بھی لکھیں حالانکہ اس وقت تک مجھے حضرت سے بیعت نہ تھی مگر حضرت کا جواب مسرت بخش آیا اور اس کے آنے ہی کی دیر تھی کہ آسان کام اور میرا کام ایسا ہوا کہ خود مجھے بھی تعجب ہے۔ پھر بندہ بیعت بھی ہوا۔

(تذکرۃ الخلیل)

پانی اور درد

ایک دفعہ کوئی صاحب آئے اور عرض کیا گھر والی کی چھاتی میں شدید درد کی

کی وجہ سے درد ہے جس کی وجہ سے کل دن اور رات بھر تکلیف رہی اور اس وقت درد اور کرب کا ٹھکانا ہی نہیں۔ حضرت کوئی عمل بتا دیں فرمایا بھائی مجھے عمل ویرہ تو آتا نہیں، صرف اللہ کا نام آتا ہے۔ پھر تو پڑھ دوں درد کسی عامل کو تلاش کرو انہوں نے معافی مانگی اور عرض کیا حضرت عجلت میں زبان سے نکل گیا۔ مقصود صرف دعا کرانا تھا۔ آپ نے پانی منگا کر اس پر دم کیا اور ان کو دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ وہی دفعہ کے پلانے سے مریضہ کی تکلیف رفع دفع ہو گئی اور دودھ جاری ہو گیا۔ پانی پر دم کرنے کے بعد آپ اس میں سے ایک گھونٹ خود پی لیا کرتے تھے تاکہ شفا ہو جائے جس کو آنحضرتؐ نے شفا فرمایا ہے۔ (تذکرۃ الخلیلؒ)

مفرور واپس آگیا

حافظ فخرالدین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکا اپنے والدین سے بیزار ہو کر گھر سے نکل گیا اور مدت سے پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ اس کی ماں بیحد پریشان تھی۔ میں نے حضرت کی خدمت میں لکھا تو آپ نے ایک آیت تحریر فرمائی کہ اس کو مکان میں کسی اونچی جگہ لٹکا دیں، یا رکھ دیں، چنانچہ ایسا کیا گیا اور دوسرے تیسرے دن لڑکا آگیا اور کہنے لگا دو روز سے طبیعت بے چین تھی کہ کسی طرح گھر چل کر ماں سے ملوں۔ آج بازار میں کسی ضرورت کی غرض سے نکلا تھا کہ بے اختیار اسٹیشن کی طرف کو ہو لیا اسی وجہ سے نہ کوئی سامان سفر ساتھ ہے نہ کپڑے بدل سکا۔ (تذکرۃ الخلیلؒ)

کراماتِ حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کھانے میں برکت

مولانا عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ میں نے ایک دن حضرت مدنیؒ کی دعوت کی تھی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان تھوڑے تھے۔ حضرت شیخ نے دعوت قبول فرمائی۔ جب کھانے کا وقت قریب آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت مدنی تمام مہمانوں کو لے کر میرے (مولانا عبدالسمیع صاحب کے) مکان پر تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت دیکھ کر میں پریشان ہوا۔ جس کو حضرت نے محسوس فرمالیا اور مجھے علیحدہ لے گئے۔ میں نے تمام صورت حال حضرت کے سامنے رکھ دی اور گذارش کی اتنی دیر ٹھہریں کہ مزید کھانے کا انتظام کر لوں۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ یہی کھانا کافی ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی و ترکاری آپ کے پاس لا کر رکھ دی گئی۔ روٹیوں پر ایک کپڑا ڈھک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ اپنے ہاتھ سے کھانا نکال نکال کر دیتے رہے۔ مولانا عبدالسمیع صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ وہی کھانا سب کو کافی ہو گیا گھر والوں نے بھی کھا لیا اور کچھ بچ بھی رہا۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۱۵۰)

پھولوں میں تروتازگی

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے داماد مولانا رشید الدین صاحب حمیدی روایت کرتے ہیں کہ مولوی شوکت علی متعلم دارالعلوم دیوبند حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے پپیا کے پھول لائے۔ ایک بوتل میں پانی بھر کر پھول اس میں ڈال دیئے گئے۔ اس طرح خوشنما بھی معلوم ہوتے ہیں اور اُن کی عمر بھی چار ماہ ہو جاتی ہے۔ یعنی چار ماہ تک پژمردہ نہیں ہوتے۔

حضرت نے اس ہدیہ کو مسرت سے قبول فرمایا اور حکم دیا کہ یہ بوتل اُن کے کمرے میں میز پر رکھ دی جائے۔ چار ماہ کی بجائے تین سال اور تین ماہ گزر گئے تھے پھول اسی طرح تروتازہ تھے۔ ان کی تازگی و شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر افسوس ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء[1] کے حادثہ جانکاہ کی تاب وہ بھی نہ لا سکے اور دفعتہً ان کی تازگی پژمردگی سے بدل گئی۔ وہ سارے پھول سیاہ ہو گئے حتیٰ کہ پانی میں بھی سیاہی کا اثر ہو گیا۔ (ایضاً ص۱۵۹)

---

[1] وفات کا دن

سر پر بادل کا سایہ اور بارش میں سوکھے

حضرت مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ نے تحریر فرمایا کہ ان سے ریاست علی خاں صاحب مرحوم ساکن رسول پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں اور مولانا مدنی تنال پور ضلع اعظم گڑھ جا رہے تھے۔ تینوں گھوڑے پر سوار تھے۔ گرمی کی شدت زوروں پر تھی۔ اسی پریشانی کی حالت میں میں نے حضرت مدنیؒ سے عرض کیا کہ حضرت دھوپ کی شدت سے سخت پریشانی ہے۔ حضرت مولانا خاموش رہے۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ ابر کا ٹکڑا نمودار ہوا اور بڑھتے بڑھتے ہم لوگوں پر سایہ فگن ہو گیا۔ اور نہایت آرام سے ہم لوگ چلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ دوسرے بادل آ رہے ہیں۔ میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ حضرت وہ دھوپ ہی اچھی تھی اب تو بھیگے ہوئے سسرال پہونچیں گے۔ حضرت مولاناؒ پھر خاموش رہے یہاں تک کہ بادل سر پر آ گیا لیکن خدا کی قدرت ہر چہار طرف پانی برس رہا تھا۔ گھوڑے پانی میں چل رہے تھے لیکن ہم لوگوں پر پانی کا کوئی قطرہ نہیں پڑ رہا تھا۔

(حکایات و عملیات مدنیؒ)

ضرور کوئی بات ہے

مولانا مقبول احمد صاحب ناظم جامعہ رشیدیہ ساہیوال والے فرماتے ہیں کہ میرے طالبعلمی کے زمانے میں ہی ایک دن مجھے حضرت اقدس رائپوری کا والا نامہ مرقومہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب متولی خانقاہ ملا کہ حضرت کا منشا دیوبند تشریف لانے کا ہے۔ مگر خواہش یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کو ہمارے آنے سے قبل اطلاع نہ ہو اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ حضرت مدنیؒ اس جمعہ کو دیوبند تشریف فرما ہوں گے یا نہیں۔ آپ پروگرام معلوم کر کے جواب دیں۔ اس خط کے بعد میں حسب معمول نماز عصر کے بعد حضرت مدنیؒ کی خدمت میں گیا۔ جب مجلس برخاست ہونے لگی تو میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ اس جمعہ کو قیام رکھیں گے یا سفر پر ہوں گے۔ فرمایا سی۔ آئی۔ ڈی تو نہیں ہو۔ عرض کیا۔ حضرت معاذ اللہ میں تو یونہی پوچھ رہا ہوں، مگر حضرت نے فرمایا نہیں "ضرور کوئی بات ہے"! مجھے خیال ہوا کہ حضرت کو ضرور کوئی بات کھٹک رہی ہے اس لیے خلاف عادت اصرار فرما رہے ہیں۔ مجبوراً حضرت رائپوری کا والا نامہ حاضر کر دیا۔ حضرت مدنی نے خط کو پڑھ کر نہایت ادب و احترام سے آنکھوں اور پیشانی پر لگایا پھر فرمایا میں خود جواب تحریر کروں گا۔ میں نے عرض کیا حضرت وہ تو یہی خیال فرمائیں گے کہ مقبول احمد نے راز داری سے کام نہ لیا۔ اس پر حضرت مدنی نے فرمایا۔ اچھا خط لکھ دو کہ اس جمعہ کو قیام ہوگا۔ اور پھر مجھے فرمایا اگر جانا بھی ہوا تو نہیں جاؤں گا۔

(از چند ملاحق، دستید امین گیلانی)

کرامات حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائپوریؒ

کھانا پھر بھی بچ گیا

حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی نے ایک مجلس میں یہ واقعہ سنایا کہ حضرت اقدس ایک دفعہ شجاع آباد تشریف لائے۔ حضرت کے ہمراہ کچھ اور حضرات بھی تھے۔ میں نے مہمانوں کے اندازہ کے مطابق کھانا پکوا لیا۔ مگر کھانے کے وقت تک بہت سے احباب اور جمع ہو گئے۔ اب مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ طعام کم اور انام زیادہ۔ حضرت پر میری پریشانی منکشف ہو گئی۔ مجھے بلا کر فرمایا فکر نہ کرو۔ اپنا رومال دے کر فرمایا کھانے کے برتن کے منہ پر ڈال دو اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا تقسیم کرنا شروع کر دو۔ اللہ میاں برکت دیں گے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں میں نے ایسا ہی کیا۔ تمام حاضرین کو کھانا کھلا دیا گیا لیکن کھانا پھر بھی بچ گیا۔ (چند ملاحق)

حق بحقدار رسید

رانا نذر محمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رائپور حضرت کی خدمت میں گیا اور میری رقم گم ہو گئی۔ مسافر تھا پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر خاموش رہا اچانک ایک صاحب نے حضرت سے کہا کہ کسی کی یہ رقم ملی ہے۔ میں ابھی چپ تھا کہ حضرت نے فرمایا۔ نذر محمد کو دے دو جس کی ہوگی اسے دے دیں گے۔ ان صاحب نے رقم

مجھے دے دی۔ پھر نہیں لے کر آ، میری ہی ہے۔ (چند ملاء حق) سید امین گیلانی

کیلے کھانے کا شوق

حاجی محب النبی صاحب انباری (جو قصبہ فتح پور تحصیل شکر گڑھ میں مقیم ہیں) نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ان کے ایک رشتہ دار کسی اللہ والے کی تلاش میں تھے۔ جس شخص کی شہرت سنتے وہ اسے دیکھنے کے لیے جاتے۔ انہوں نے اللہ والے کی پہچان کا ایک خود ساختہ معیار بنا رکھا تھا۔ اس لیے ہر جگہ سے مایوس لوٹتے۔ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا تو کہا چلو ان کو بھی دیکھ لیں۔ اگر میرے نظریے کے مطابق بات ہوئی تو مان لیں گے کہ اللہ کے ولی ہیں اور بیعت کر لیں گے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کس نظریہ پر پرکھو گے۔ کہا جب تک کوئی کرامت نہ دیکھوں طبیعت مطمئن نہیں۔ میں نے کہا کیسی کرامت دیکھنا چاہتے ہو۔ کہنے لگا آج کل کیلے کا موسم نہیں ہے۔ اگر آپ کے حضرت کیلے کھلا دیں تو مان جائیں۔ یہ بات سن کر میں نے اسے سمجھانا چاہا، مگر وہ اپنی بات پر بضد رہا۔ خیر جب حضرت کے ہاں پہنچے ابھی تھوڑی دیر بیٹھے ہوں گے کہ ایک صاحب تحفۃً کیلوں کا ایک گچھا لیے ہوئے آگئے اور حضرت کی نذر کیے۔ حضرت نے فرمایا بھئی مجھے تو شوق نہیں، اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا انہیں دے دو۔ انہیں کیلے کھانے کا شوق ہے۔ چنانچہ حضرت نے وہ کیلے انہیں دے کر فرمایا۔ لو بھئی کھا لو، جو بچیں وہ ساتھ لے جانا۔ یہ واقعہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے اور سر عقیدت جھکانا ہی پڑا۔ (ایضاً)

غالیچہ

جناب سید الرحمن صاحب لدھیانوی ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ نے ایک واقعہ بتایا کہ ۱۹۴۷ء میں جب حضرت پاکستان تشریف لائے تو مولانا غلام رسول صاحب جو حضرت کے اجل خلفاء میں سے تھے کی خواہش اور اصرار پر شیخوپورہ تشریف لے آئے اور خوش قسمتی سے ہمارے مکان پر ہی قیام فرمایا۔ جب حضرت ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ اس وقت ہم بے سروسامانی کے عالم میں تھے۔ کچھ عرصہ قبل ہی لدھیانہ سے ہجرت کر کے شیخوپورہ میں آباد ہوئے تھے۔ میں کسٹوڈین کے دفتر میں کلرک تھا۔ وہاں کچھ سامان نیلام ہوا تو میں نے بھی خرید لیا۔ سامان خرید چکنے کے بعد کسٹوڈین صاحب نے ایک چھوٹا سا پرانا غالیچہ مجھے یونہی مفت دے دیا۔ میں سب سامان گھر لے آیا۔ حضرت جب تشریف لائے تو والد صاحب نے وہ غالیچہ حضرت کے لیے بچھا دیا۔ حضرت نے بیٹھنے سے قبل فرمایا، یہ تو لوٹ کا مال ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ والد صاحب کو چونکہ حقیقت حال کا پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ تو نیلامی میں خریدا ہوا ہے۔ مگر حضرت نے اٹھوا دیا اور ایک معمولی سی تلائی بچھا دی۔ حضرت اس پر بیٹھ گئے۔ (ایضاً)

کرامات حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری ؒ

حلال حرام کی پہچان

مولانا عبداللطیف صاحب خطیب گنبد والی مسجد جہلم فرماتے ہیں ایک روز لاہور حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص ایک برتن میں دودھ اور دوسرے برتن میں دہی لے کر آیا اور عرض کیا۔ حضرت دم کر دیں۔ حضرت نے دیکھا اور فرمایا: "اور لے آؤ، یہ تو اچھے نہیں ہیں۔" حضرت عملی توجہ سے حلت اور حرمت معلوم کر لیا کرتے تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہ دونوں اشیاء حرام طریق سے حاصل کی گئی تھیں۔

(ملاء حق) مصنفہ سید امین گیلانی

کھانڈ درست نہیں

چودھری محمد اکبر صاحب خیر اپر میاں ضلع شیخوپورہ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ۱۹۴۲ء بھاگن کا مہینہ تھا۔ میں نے اپنے گنے کی تقریباً چھ من کھانڈ تیار کی۔ اس میں سے کچھ کھانڈ لے کر حضرت کی خدمت میں گیا۔ کھانڈ پیش کی تو حضرت نے فرمایا کھانڈ درست نہیں۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ لیکن آپ نے یہی فرما کر لینے سے انکار کر دیا۔ میں حیران

ہوا۔ بہرحال واپس آکر سوچا تو دو باتیں ذہن میں آئیں۔ ایک تو میں نے ابھی تک مشین والے کو کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ دوسرا میں نے ابھی تک چینی کا عشر ادا کیا تھا میں نے فوراً دونوں کام کیے۔ عشر بھی نکالا اور مشین کا کرایہ بھی مشین والے کو دے آیا۔

فرمایا ایک ماہ کے بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ پھر حضرت کی خدمت میں گیا۔ کیونکہ میری بیوی بھی حضرت کی بیعت تھی۔ اسے سبق سنانا تھا۔ حاضر ہونے پر میں نے عرض کیا۔ کہ حضرت جی چاہتا تھا کہ تھوڑا سا گھی آپ کے لیے لیتا آؤں۔ مگر گھانڈی کی واپسی کے باعث ہمت نہ پڑی۔ ڈرتا تھا آپ کہیں خفا نہ ہوں۔ حضرت نے فرمایا گھی کہاں پڑا ہے۔ میری بیوی نے بتایا گھر کی فلاں سمت کے کرہ میں پرات کے اندر رکھا ہے۔ حضرت نے سر مبارک کو دو منٹ تک سینے کی طرف جھکایا، پھر فرمایا گھی تو پاکیزہ ہے۔ پھر فرمایا چینی کہاں پڑی ہے۔ میں نے بتا دیا تو حضرت نے پھر توجہ کی اور بعد میں فرمایا۔ اب تو چینی بھی پاکیزہ ہے۔

چودھری محمد اکبر کہتے ہیں میں سمجھ گیا کہ واقعی عشر اور کرایہ ادا نہ کرنے کے باعث حضرت نے واپس کر دی تھی۔ (ایضاً)

اچھا یہ ٹھیک نہیں ہوتا

حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحبؒ شجاع آبادی فرماتے تھے۔

بائیس سال ہوئے میرا بایاں بازو ٹوٹ گیا تھا۔ جوڑنے کے بعد وہ تقریباً سیدھا رہتا تھا۔ اس میں لچک نہ تھی۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں بھی ملتان جیل میں تھا۔ ایک روز حضرت نے فرمایا۔ قاضی صاحب نماز آپ پڑھایا کریں۔ میں نے معذرت کی کہ حضرت میرا یہ بازو خم نہیں کھاتا۔ وضو میں بھی مشکل پڑتی ہے اور ہاتھ باندھنے میں بھی۔ حضرت نے میرا بازو تھام کر ٹوٹی ہوئی جگہ پہ دست مبارک پھیر کر دو تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا "اچھا یہ ٹھیک نہیں ہوتا؟" پھر فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر کریں گے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد نماز کا وقت آیا۔ میں وضو کرنے بیٹھا تو بالکل بے خیالی میں ناک صاف کرنے

کے لیے میرا بایاں ہاتھ بے تکلف ناک تک پہنچ گیا۔ یکدم میرے ذہن میں آیا کہ آج میرا بازو صحیح کام کرنے لگ گیا ہے۔ میں نے ہلا جلا کر دیکھا تو وہ صحیح کام کر رہا تھا۔ یقین ہو گیا کہ یہ حضرت کی توجہ کی برکت اور کرامت ہے۔ (ایضاً)

مدینہ کا حال

قاضی منظر حسین صاحب چکوال فرماتے ہیں کہ حضرت نے ایک دفعہ خلوت میں فرمایا مولوی حبیب اللہ صاحب (حضرت کے صاحبزادے) مدینہ منورہ میں رہتا ہے۔ جب کبھی خط کو دیر ہو جاتی ہے تو اس کی والدہ پریشان ہو جاتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے۔ اس کا کیا حال ہے تو میں اللہ کے فضل و کرم سے پانچ منٹ میں بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

مینار پر حرام کا مال

قاضی صاحب محترم فرماتے ہیں ایک دفعہ گفتگو میں حضرت نے فرمایا میں اور میرا لڑکا مولوی عبید اللہ انور تانگے میں جا رہے تھے۔ ایک نئی مسجد راہ میں دیکھی۔ میں نے دیکھتے ہی کہا کہ اس مینار پر حرام کا مال لگا ہوا ہے۔ (ایضاً)

زنا کی بُو

بشیر احمد صاحب جو ان موضع میاں علی خانقاہ ڈوگراں ضلع شیخوپورہ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا حضرت میاں علی تشریف لائے۔ حضرت کے پاس کافی لوگ جمع ہو گئے کہ حضرت نے اچانک فرمایا مجھے زنا کی بُو آ رہی ہے۔ لہٰذا آپ سب حضرات تشریف لے جائیں۔ تمام مجمع رخصت ہو گیا۔ بعد ازاں مرتفع پاکدامن شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اقرار کے بعد توبہ کی اور حضرت کی بیعت ہوا۔ حج ادا کیا بقایا عمر شریعت کے مطابق بسر کرنے لگا۔ تا دم تحریر وہ صاحب حیات ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی اور شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(ایضاً) ۲۸

حالت تو اچھی ہے مگر پاؤں ننگے ہیں

مرزا جانباز فرماتے ہیں کہ ان سے حاجی دین محمد صاحب مدظلہ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک شخص محمد حسین جو حضرت کے مخلص عقیدت مندوں میں سے تھا اور ایک بار حضرت کے ہمراہ عمرہ کرنے کا بھی شرف حاصل کر چکا تھا۔ لاہور میں اچانک بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ ہم نے دوسرے روز حضرت سے اس کی وفات کا ذکر کیا حضرت نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے بعد فرمایا مجھے بروقت اطلاع کیوں نہ دی۔ ہم نے عرض کی آپ کی ضعیفی اور ناسازئ طبع کے پیش نظر۔ فرمایا چلو مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ قبر پر پہنچ کر حضرت نے دعا فرمائی اور مراقبہ کیا۔ پھر فرمایا "محمد حسین کی حالت تو اچھی ہے مگر پاؤں ننگے ہیں" عرض کیا وہ جو بیت اللہ سے کفن لایا تھا وہ اتفاق سے چھوٹا نکلا۔ اس لیے سر ڈھانپ دیا اور پاؤں ننگے رہنے دیئے۔ (ایضاً)

حرام موت

محمد اکبر خیرپور ملیاں ضلع شیخوپورہ بیان کرتے ہیں۔ میں ایک روز لاہور حضرت کی خدمت میں تھا۔ کشف اور توجہ کا ذکر آ گیا۔ اس سلسلہ میں فرمایا ہمارے محلہ میں ایک عورت رہتی ہے۔ اسے اچانک کراچی سے تار آیا کہ تمہارا لڑکا فوت ہو گیا ہے۔ وہ میرے پاس آئی۔ اور کہنے لگی پتہ نہیں میرا لڑکا کیسے مر گیا۔ اس سے قبل اس کی علالت وغیرہ کی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ میں نے توجہ کی تو معلوم ہوا۔ وہ حرام موت مرا ہے کچھ دنوں کے بعد وہ عورت آئی تو بتایا کہ اس کے لڑکے کی موت زہر کھانے سے واقع ہوئی تھی۔ (ایضاً)

کراماتِ سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ

ہم کسی اپنے کام تو نہیں جا رہے ہے؟

مولانا عبدالرحمن صاحب میانوی فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ شاہ صاحب اور میں مظفر گڑھ کے ایک قصبہ میں وعظ کے لیے جا رہے تھے۔ راستہ کچا کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ دو ڈیڑھ میل آگے پیدل جانا تھا۔ تھوڑی دور چلے کہ مجھے بہت گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کہا شاہ جی ڈیوٹی اور گرمی کا عالم، ابھی کتنی دور پہنچنا ہے۔ کیا بنے گا؟ یہ سن کر شاہ جی نے مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ ایک دم آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا ہم کسی اپنے کام تو نہیں جا رہے؟ چند منٹوں میں کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں دور دور تک بادل کا نشان نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں ہر طرف سے بادل گھِر گھِر کر آنے لگے نہ گرمی رہی نہ وہ دھوپ اور ابر کا موسم ہو گیا۔ (ایضاً)

بھنگی کا قبولِ اسلام

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مولانا سید نور الحسن صاحب بخاری تحریر فرماتے ہیں اور راقم الحروف (امین گیلانی) نے بھی یہ واقعہ خود حضرت شاہ صاحبؒ کی زبانی سنا کہ خیر المدارس جالندھر کے جلسہ میں شریک تھے۔ کھانے کے دسترخوان پر بیٹھے تو سامنے ایک نوجوان پربھو نامی بھنگی کو دیکھا۔ شاہ جی نے فرمایا آؤ بھئی کھانا کھا لو۔ اس نے عرض کیا۔ جی میں تو بھنگی ہوں۔ شاہ جی نے درد بھرے لہجے میں فرمایا انسان تو ہو۔ اور بھوک تو لگتی ہے۔ یہ کہہ کر خود اٹھے اس کے ہاتھ دھلا کر ساتھ بٹھا لیا۔ وہ بیچارہ تھر تھر کانپتا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ جی میں تو بھنگی ہوں۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے خود لقمہ توڑا شوربے میں بھگو کر اس کے منہ میں دے دیا۔ اس کا کچھ حجاب دور ہوا تو شاہ جی نے ایک آم اس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے جب آدھا آم دانتوں سے کاٹ لیا تو باقی آدھا خود کھا لیا۔ اسی طرح اس نے پانی پیا تو اس کا بچا ہوا پانی خود پی لیا۔ وقت گزر گیا۔ وہ کھانے سے فارغ ہو کر غائب ہو گیا۔ اس پر رقت طاری تھی وہ خوب رویا۔ اس کی کیفیت بدل گئی۔ عصر کے وقت اپنی نوجوان بیوی جس کی گود میں ایک بچہ تھا ساتھ لے کر آیا اور کہا شاہ جی اللہ کے لیے ہمیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیجئے۔ اور میاں بیوی اسلام لے آئے (ایضاً)

بارش رُک گئی

صوفی غلام مصطفیٰ صاحب میریا فرماتے ہیں. ایک دفعہ شاہ جیؒ لاہور میں خطاب فرما رہے تھے تو اچانک بارش شروع ہو گئی. بعض لوگ کچھ حرکت کرنے لگے. شاہ جیؒ نے والہانہ انداز میں گرج کر فرمایا: بیٹھو کوئی شخص نہ اٹھنے پائے. میں تقریر کروں گا اور تم سنو گے. بارش رُک سکتی ہے مگر بخاری کی تقریر نہیں رُک سکتی. خدا کی شان دیکھیے. اُدھر شاہ جیؒ نے یہ الفاظ فرمائے. اُدھر بارش رُک گئی. بادل چھٹ گئے. اور چاند اپنی نورانی صورت دکھانے لگا. بخاری اپنی تقریر کے جوہر دکھانے لگا۔

(ایضاً)

پان میں زہر

قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ اکثر یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ شجاع آباد میں تقریر کرتے ہوئے شاہ صاحب نے پان مانگا. میں نے پان منگوا بھیجا. پان لانے والے کو کسی اور نے کہہ دیا کہ میں پان لاتا ہوں. پان آیا تو میں نے شاہ جی کو دے دیا. شاہ جی نے پان کو منہ میں ڈالتے ہی جلدی سے کہا. کیوں قاضی جی مجھے مارنے کا ارادہ ہے. یہ کہہ کر میرے ہاتھ پر پان اُگل دیا. قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ پان کے اثر سے میرا ہاتھ سیاہ ہو گیا. معلوم ہوا کہ پان میں زہر ڈال دیا گیا تھا. شاہ جی کئی روز تک وہیں صاحب فراش رہے۔

(ایضاً)

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

مراکز ہدایت

نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم. تم کو اجرامِ سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالمِ انسانیت کے نظامِ مراکز کے کشف کے لیے کتنا زمانہ درکار ہوگا؛ تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکزِ شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکزِ محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جسطرح نظامِ شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لیے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے. اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکزِ انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں. زمین والوں پر ہی موقوف نہیں. آسمانوں میں بھی صرف انہی کے کارناموں کی پکار ہوتی ہے۔ (ابوالکلام آزاد، تذکرہ)

پُرامن راہ

" توفیقِ الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں. ہدایت و تربیتِ غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں. سب سے زیادہ آسان و پُرامن راہ یہ ہے کہ رہنمایانِ طریق میں سے کسی صاحبِ ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے" (تذکرہ (ابوالکلام آزاد)

جوہرِ احساسِ ملت الرشید — جلوۂ حسنِ جبلت الرشید

رہبرِ امدادِ حق برحق جلا — شہپرِ ارشاد، عدم شق رَوا

جلوۂ رُشد و ہدایت برمقام — جلوۂ رزم شہادت پیش گام

مخزنِ تدریس از عدم فسوق — شیوۂ تدریس روشن حق رسوخ

جوہرِ تدریس کامل حق بجام — درس برحق جلوۂ حق انعام

جذبۂ تعبیر روشن نظم قوم — نظم برحق برملا از حزمِ قوم

رہبرِ نظم سعادت حق رَوا — ہادیٔ نظمِ کرامت حق رسا

جوہرِ تہذیب سُلم حق شنید — جلوۂ حزب مُعلم چشم دید

برملا تہذیب کامل از ادب — حق روا تدریسِ ناقص حق طلب

نغمۂ تدریس حق، برحق سُرود — شیوۂ تقریب لاحق، حق درُود

جاذبِ تدریس روشن الرشید — جوہرِ تعمیرِ فن از الرشید

جلوتِ تدریس حق یارب بجام

خلوتِ تدریس حق جم صبح و شام

رانا جمشید علی حسن
نمازی کوچہ
ساہیوال

مولانا حکیم انیس احمد صدیقی

دارُالعلوم کی تفسیری خدمات

تفسیر کے سلسلہ میں اکابر علماءِ دیوبند کا مسلک

علمائے دیوبند کا حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے صاحبزادگان و احفاد سے تلمذ اور نیازمندی کا تعلق ہے اس لیے اکابر علمائے دیوبند و مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ مدارس عربیہ میں قرآن حکیم کے درس، ترجمہ اور تفسیر میں حضرت شاہ صاحب ان کے صاحبزادگان و احفاد کے فکر و نظر کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علمی سلسلہ سے وابستگی کو اپنے لیے باعث سعادت دارین سمجھتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کا سلسلہ علمی دنیا میں سلسلۃ الذہب (خالص سونے کی زنجیر) کے نام سے موسوم ہے، اس سلسلہ کی کڑیاں اور کڑیاں سلسلہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں،

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا محمود حسنؒ درس میں اگر کوئی بات کسی مشہور عالم مفسر یا محدث کی تردید میں فرماتے تو ارشاد فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے، مدتوں کے بعد معلوم ہوا کہ محققین سے مراد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ اور مختصر تفسیر جس کا نام فتح الرحمٰن ہے فارسی زبان میں موجود ہے اور حقیقت میں فہم کلام اللہ کے لیے مفتاح کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ عبد القادرؒ بن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ اور تفسیر اردو زبان میں موضح قرآنؒ کے نام سے ہے، جو اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے، یہ ترجمہ سلیس اردو میں ہے،

نیز حضرت شاہ رفیع الدینؒ بن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ یہ تراجم ہی علمائے دیوبند کے تراجم و تفاسیر کی بنیاد و اساس ہیں۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کے تراجم و حواشی اور تفسیری نوٹ موجود نہ رہتے تو قرآن شریف کا ترجمہ کرنا کسی بڑے سے بڑے عالم کے لیے بھی آسان کام نہ رہتا، ان بزرگوں کے بعد جس شخص نے بھی ترجمہ کیا ہے وہ ان تینوں تراجم سے یا دو ترجموں سے یا کسی ایک ترجمہ سے ضرور مستفیض ہوا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں ترجمہ قرآن شریف کا تفسیر جلالین شریف دورہ حدیث شریف کے لیے موقوف علیہ ہیں، ان کے بغیر دورہ حدیث میں داخلہ نہیں دیا جا سکتا۔

دورہ تفسیر میں تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی شریف داخل نصاب ہیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے القرآن یفسر بعضہ بعضاً اور عقلاً و نقلاً سب سے زیادہ معتبر اور مستند تفسیر یہی ہے۔

تفسیر بالحدیث

چونکہ تفسیر ابن کثیر میں وہ تمام احادیث جمع کر دی گئی ہیں جو تفسیر قرآن سے متعلق ہیں، اس لئے احادیث کی روشنی میں قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ابن کثیر کو داخل نصاب کیا ہے۔

اکابر دارالعلوم دیوبند ضعیف سے ضعیف حدیث کو بھی ذاتی رائے کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھتے ہیں، اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ آیات کا مطلب احادیث کی روشنی میں حل کیا جائے اور اگر بظاہر متضاد روایات موجود ہیں تو ان میں تطبیق پیدا کر دی جائے۔

امام ابن کثیر کا ۷۷۴ھ میں وصال ہوا ہے، تفسیر ابن کثیر میں احادیث کے علاوہ آثار صحابہ و تابعین بھی موجود ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

تفسیر بیضاوی قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ کی تالیف ہے، قاضی صاحب شافعی المسلک ہیں، اس تفسیر میں تفسیر بالماثور کے علاوہ بعض اور چیزوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، فصاحت و بلاغت میں علامہ جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی تفسیر کشاف سے استفادہ کیا ہے، اور اسرار و رموز میں امام رازی کی تفسیر کبیر سے اخذ کیا ہے،

تفسیر بیضاوی کا شرح و حاشیہ شیخزادہ بہت خوب ہے، شیخزادہ حنفی المسلک ہے اور نہایت درجہ علم و فضل کا مالک ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے صاحب کشاف کے اتباع میں بعض چیزیں ایسی لکھی ہیں جو اہل علم کے طبع سلیم پر ناگوار گزرتی ہیں، آئندہ اس کی مثال تحریر کی جائے گی۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ

بانی دارالعلوم دیوبند وفات ۱۲۹۷ھ

حضرت مولانا نانوتوی نے قرآن حکیم کی بعض سورتوں اور آیتوں کی تفسیر لکھی ہے لسلا معوذتین کی تفسیر بنام القاسم دارالعلوم دیوبند میں شائع ہو چکی ہے، اور حضرت کے بعض رسائل میں بھی موجود ہے اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کا اختصار اپنی تفسیر کے حاشیہ میں نقل فرمایا ہے، اسی طرح بعض دوسری آیات کی تفسیر آپ کے مطبوعہ رسائل میں موجود ہے، آیت خاتم النبیین کی حکیمانہ اور محققانہ تفسیر رسالہ تحذیر الناس میں موجود ہے،

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین زمانی یعنی نبی آخر الزمان ہیں اور آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوگا، لیکن آپ خاتم النبیین رتبی بھی ہیں یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت و رسالت کی انتہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت خاتم النبیین اس درجہ اور مرتبہ پر فائز ہیں کہ تمام مراتب کمال آپ کی ذات اقدس پر ختم ہیں۔

محمد مصطفیٰ صدر نشین است — کہ فخر اولین و آخرین است
سریر آرا ختم المرسلین است — بمنصب رحمۃ للعالمین است

امیر

حضرت اپنے شاگردوں کو قرآن حکیم کی تفسیر اسی انداز سے پڑھاتے تھے، ناچیز راقم الحروف نے آپ کے ایک شاگرد حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن امروہوی سے ۱۳۴۳ھ میں چند اسباق تبرکاً پڑھے ہیں اور وہ

لذت و ذائقہ حاصل کیا ہے جس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

لیکن افسوس ہے کہ تفسیر ضبط تحریر میں نہیں آسکی۔ ہمارے سامنے جن آیات اور سورتوں کی تفسیر موجود ہے ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ پورے قرآن حکیم کی تفسیر لکھتے تو تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف سے زیادہ مفید اور بہتر و برتر ہوتی۔

بہرحال جن آیات اور سورتوں کی تفسیر ہمارے سامنے ہے۔ اس میں علماء اور فضلاء مفسرین و محققین کے لیے بہت زیادہ رہنمائی موجود ہے۔

بقول سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حضرت نانوتوی علم و فضل تقویٰ و طہارت سادگی میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ اسحٰقؒ دہلوی کا نمونہ تھے اور وسعت مطالعہ میں اگر زیادہ نہ تھے تو اپنی دوسری خوبیوں کے اعتبار سے کم بھی نہ تھے، مادرزاد ولی تھے (مقالات سرسید)

والفضل ماشهدت به الاعداء

حضرت نانوتویؒ نے ایک معریٰ قرآن شریف جو منشی ممتاز علیؒ کا کتابت شدہ ہے تصحیح فرمائی تھی، یہ قرآن شریف کتابت کے اعتبار سے بھی معیاری ہے اور تصحیح کے اعتبار سے اصح ترین معریٰ قرآن شریف ہے، حال میں اس قرآن شریف کا عکس کراچی کے ایک ادارہ نے شائع کیا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ وفات ۱۳۳۹ھ
شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ وفات ۱۹۴۹ء

حضرت علامہ عثمانی علم تفسیر علم حدیث اور علم کلام میں یگانہ روزگار شخصیت و حیثیت کے مالک تھے حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں مسلم شریف کا درس دیتے تھے، فتح الملہم شرح مسلم کی تالیف کا عظیم کارنامہ اہل علم کے سامنے ہے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مرحوم نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں حضرت عثمانی کو لکھا ہے کہ میں علم و فضل میں آپ کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں ہوں اور شیخ الحدیث کے عہدہ کے لیے آپ سب سے زیادہ مناسب ہیں (انوار عثمانی) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور فوائد لکھنے شروع کیے، ابھی سورہ نساء تک فوائد لکھے تھے کہ حضرتؒ کا ۱۳۳۹ھ میں وصال ہوگیا ترجمہ کرنے میں حضرتؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ کے ترجمہ کو اصل قرار دیا اور ایک صدی کی مدت میں اردو زبان میں جو غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں ان کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کی زبان میں جدت پیدا کر دی اور اصل ترجمہ حضرت شاہ صاحب کا برقرار رکھا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے سے قبل ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ حضرت اس مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ کئی احباب اور معززین نے قرآن شریف کا سلیس ترجمہ کرنے کی فرمائش کی لیکن میں نے اپنی بے بضاعتی کے علاوہ یہ عرض کیا کہ متقدمین اکابر کے فارسی اُردو تراجم موجود ہیں اور علمائے متاخرین زمانہ حال کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی سلمہٗ اور مولانا اشرف علی تھانوی سلمہٗ کے ترجموں کو احقر نے تفصیل سے دیکھا ہے جو آزاد و خود غرض مترجمین کے تراجم کی غلطیوں سے پاک و صاف ہیں اور عمدہ ترجمے ہیں پھر اب کسی جدید ترجمہ کی کیا ضرورت ہے بجز اس کے کہ مترجمین کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو، احباب نے پھر بھی اصرار جاری رکھا مجبور ہو کر میں نے عرض کیا کہ میں تراجم قدیمہ اور جدیدہ کو غور سے دیکھتا ہوں اس کے بعد اگر کوئی نفع سمجھ میں آیا تو اس کے بعد آپ حضرات کے فرمانے کی تعمیل کروں گا ورنہ معذور ہوں، اس کے بعد میں نے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ اسرارہم کو غور سے دیکھا تو یہ امر بے تامل معلوم ہوگیا کہ اگر یہ متقدمین

اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دیتے تو اس شدید ضرورت کے وقت ترجمہ کرنا بہت دشوار ہو جاتا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جو انعامات شمار کئے ہیں ان میں ترجمہ فتح الرحمٰن کو بھی شمار کیا ہے

حضرت شاہ عبدالقادرؒ بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں اور اس کے بعد جس نے ترجمہ کیا ہے وہ بامحاورہ ہی ترجمہ کیا ہے، چونکہ بامحاورہ ترجمہ سے قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور یہی ترجموں کا مقصد اعلیٰ ہے، حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا کمال یہ ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم و ترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک نبا ہا ہے کہ ہم جیسے لوگوں سے نہیں ہو سکتا۔ ہم ان کے کلام کی خوبیوں اور ان اغراض و اشارات کو جو ان کے بہت سادے مختصر الفاظ میں ہیں سمجھ جائیں تو ہم جیسے لوگوں کے لیے فخر کی بات ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدین کا کمال یہ ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ترجموں کی بے انتہا خوبیوں کے باوجود ہمارا جدید ترجمہ کرنا خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔

اس لیے کہ نہ ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہو یا سابقہ ترجموں میں کوئی نقص یا خلل ہو جس کا تدارک کیا جائے، حاشا وکلا یہ تراجم ان مقدسین نے ایسے کیے ہیں، کہ ان جیسا یا ان سے بہتر ترجمہ کرنا تو ممکن نہیں ہے بلکہ ان کا پوری طرح سمجھ لینا ہی ہمارے لیے باعث افتخار ہے۔

اس حیص بیص میں ایک بات دل میں بیٹھ گئی کہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا افضل و مقبول اور مفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ نہ ہو جائے یہ کس قدر ناقدردانی ہے اور بد قسمتی بلکہ کفران نعمت ہوگا جس میں قصور بھی ترجمہ کا نہیں ہوگا بلکہ لوگوں کی طلب کا قصور ہوگا۔

اس لیے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کی خدمت اس طرح کی جائے کہ جو الفاظ اور محاورے متروک ہو گئے ہیں ان کو تبدیل کر دیا جائے۔ اور بعض مواقع میں ترجمہ کے مختصر الفاظ جو دراصل ترجمہ کی خوبی ہے۔ لیکن ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت، اب یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ جس کی وجہ سے ایسے مفید اور قابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی جگہ کوئی مختصر لفظ زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے۔ پھر انشاء اللہ شاہ صاحبؒ کا یہ صدقہ فاضلہ جاری رہے گا اور اس طرح سے اس ملازم نے بنام خدا دوشالہ میں کمبل سے رفو کرنے کا ارادہ کر لیا ــــ ۱۳۳۶ھ میں یہ ترجمہ پورا ہوا۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

یادگار شہ عبدالقادرؒ ترجمہ موضح قرآن مجید

دہ کہ آن معدن صد خوبی را سال او فرقان حمید

بے شش و پنج بگفتہ محمود کرد ترمیم اقل العبید ۱۳۳۶ھ

آخر میں فرماتے ہیں: ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید ہے۔ ایک تھوڑے سے بہانے سے نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ ہو جائیں اس لیے ہم نے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ میں ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل ترجمہ کی خوبیوں پر بھی آپ نے کافی روشنی ڈالی ہے

سورۂ نساء کے بعد جو فوائد ہیں وہ حضرت علامہ عثمانی کے تحریر کردہ ہیں۔ حضرت نے سورہ بقرہ اور سورہ نساء کے فوائد میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ یہ حضرت شیخؒ کے تحریر کردہ ہیں اور ان میں کچھ ترمیم و اضافہ میں سوء ادبی کا احتمال ہے۔ حضرت مولانا عثمانی نے اپنے فوائد میں محققانہ انداز میں مطالب کلام اللہ کی تشریح فرمائی ہے، لطائف و معارف کا ایک سمندر ان فوائد میں جمع کر دیا ہے بہت سے اشکالات جو زائغین اور ملحدین نے پیدا کیے تھے، ان کو حل کرنے

کے لیے بڑے بڑے دفاتر بھی کفایت نہ کرتے وہ حضرت نے ان فوائد میں جمع فرما دیئے ہیں۔

خاص طور سے فرقہ مرزائیہ اور ملحدین کے ابہام کا قلع قمع فرما دیا ہے جو کہ اس زمانہ کی بہت بڑی ضرورت تھی، وہ حضرت کے ان فوائد سے پوری ہو گئی ہے۔ حضرت کے فوائد میں آپ کا مخصوص رنگ محققانہ، مفسرانہ اور محدثانہ پوری طرح موجود ہے۔ آپ نے روح المعانی، تفسیر ابن کثیر وغیرہ تفاسیر کو پیش نظر رکھا ہے، ان مختصر فوائد کو کئی بڑی بڑی تفاسیر پر فوقیت حاصل ہے، جس کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

یہ ترجمہ اور فوائد ہند و پاک میں بار بار چھپ چکے ہیں۔ تاج کمپنی نے بھی شائع کیا ہے، کراچی کی انجمن اشاعت قرآن نے نہایت عمدہ کاغذ پر ہانگ کانگ سے چھپوا کر کئی ہزار نسخے مفت تقسیم کیے ہیں۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ

یہ ترجمہ اور فوائد فارسی زبان میں منتقل کر کے حکومت افغانستان نے نہایت اہتمام سے ۱۳۲۳ھ میں طبع کر کے شائع کیا

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ نے عام مسلمانوں میں قرآن حکیم کے درس کا سلسلہ شروع فرمایا اور اپنے تلامذہ کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلہ کو پھیلائیں۔

حضرت نے جو سلسلہ درس جاری فرمایا تھا، اس میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد شفیع مفتی صاحب وغیرہ آپ کے درس میں شریک ہوتے۔ لیکن آپ کا وصال ہو جانے سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، بہرصورت ملک کے گوشہ گوشہ میں جو درس قرآن جاری ہوا اس کے محرک حضرتؒ تھے۔ حضرت علامہ عثمانیؒ کی ایک تصنیف اعجاز القرآن بھی ہے۔

حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا محمد اشرف علی اعلی اللہ مقامہٗ

وفات رجب ۱۳۶۲ھ

حضرت حکیم الامت نے قرآن کریم کے دو ترجمے کیے ہیں، ایک ترجمہ علیحدہ شائع ہوا ہے

دوسرا ترجمہ تفسیر بیان القرآن کی تالیف کے ساتھ لکھا ہے حضرت حکیم الامت کی چھوٹی بڑی کتابیں ملا کر تالیفات و تصنیفات کی تعداد تقریباً ایک ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت نے ایک بار خواب میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی اس وقت سے حضرت کے ذوق قرآن فہمی میں نمایاں جلا محسوس ہوا۔ اور اس کے انوار و برکات تفسیری کتب میں موجود ہیں۔

البیان فی علوم القرآن

حضرت کے عزیز ہمشیرزادہ مولانا سعید احمد مرحوم نے حضرت کے تفسیر پڑھنے کے وقت حضرت کی تقاریر کو ضبط کر لیا تھا۔ اس کتاب کا نام البیان ہے، یہ مسودہ مرحوم مولانا سعید احمد کی وفات کے باعث مکمل نہ ہو سکا۔ اور غالباً شائع بھی نہ ہوا۔ بیان القرآن کے حاشیہ میں اس کا ذکر ہے۔

اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن

حضرت نے قرآن و حدیث کے متعلق بعض اوقات تحریر و تقریر میں کچھ رموز و نکات بیان فرمائے، ان کو ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔

بیان القرآن

حضرت نے بیان القرآن میں اختصار اور ایجاز کے ساتھ آیات کے معانی اور مطالب بیان فرمائے ہیں جس شخص کا علم تفسیر کے متعلق گہرا مطالعہ ہے اور اس کو تفاسیر کے پڑھنے سے کچھ اشکالات اس کے

علم میں ہیں یہ وہ مشکلات قرآن سے واقف ہے اور وہ ضخیم و عظیم تفاسیر کا مطالعہ کرکے قرآن حکیم کی اصل مراد متعین کرنا چاہتا ہے اور علمی طور پر اشکال و شبہات کو دفع کرنا چاہتا ہے، وہ بیان القرآن سے استفادہ کر سکتا ہے اور ایسا شخص ہی بیان القرآن کی صحیح عظمت اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتا ہے، حضرت مفتی صاحب نے بیان القرآن کی جو تسہیل فرمائی ہے، اس سے بیان القرآن کا ہم جیسے کم علم لوگوں کے لیے سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

بیان القرآن کے متعلق حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت ہے کہ تفسیر بیان القرآن کا مطالعہ حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری نے کیا تو فرمایا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ تفسیر بیان القرآن عوام الناس کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن تفسیر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس سے علما بھی استفادہ کر سکتے ہیں، حضرت تھانوی نے یہ ترجمہ و تفسیر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں شروع فرمائی تھی اور بقول حضرت تھانوی اس میں سات چیزوں کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ ترجمہ آسان زبان میں ہو تاکہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ اور تحت لفظی کی رعایت بھی رہے۔

۲۔ ترجمہ میں محاورات استعمال نہ کیے جائیں، چونکہ محاورات ہر علاقہ کے جدا جدا ہوتے ہیں، اس لیے کتابی زبان اختیار کی ہے تاکہ فصاحت کے ساتھ سلاست بھی رہے۔

۳۔ حل قرآن اس تفسیر و ترجمہ کا مقصد ہے، اگرچہ ترجمہ میں کسی توضیح کی ضرورت پیش آتی یا کوئی شبہ قرآن کے مضمون سے پیدا ہوا اس کو ف، بنا کر لکھ دیا ہے۔ لطائف و نکات سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا۔

۴۔ اگر کسی آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں تو اس میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی صرف اس کو نقل کیا۔

۵۔ مطالب آیات کی تقریر اس طرح کی گئی ہے کہ ربط و ارتباط خود معلوم ہو جاتا ہے اور کہیں ربط کی سرخی لکھ کر اس کی تقریر لکھ دی ہے۔

۶۔ چاروں فقہوں میں سے مذہب اہل سنت والجماعت حنفی مسلک کو لیا ہے، دوسرے مذاہب بقدر ضرورت حاشیہ میں لکھ دیئے ہیں۔

۷۔ افادہ خواص کے لیے عربی حاشیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں مکی، مدنی سورتوں اور آیات کی تفصیل، غیر مشہور لغات کا حل، وجوہ بلاغت کا بیان اور متعلق ترکیب و معنی الاستنباط فقہیات و کلامیات اور اسباب نزول و روایات و اختلاف قرات مغیرہ ترکیب یا حکم اور توجیہ ترجمہ و تفسیر ایجاز کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یہ عربی حاشیہ دراصل عربی تفسیر ہے تو طلباء اور علماء کے لیے بڑی کام کی چیز ہے۔ بیان القرآن کی سابقہ طباعت میں یہ حاشیہ موجود ہے، لیکن تاج کمپنی نے اس حاشیہ کو علیحدہ کر دیا ہے بقول ناشر اس حاشیہ کے ساتھ ضخامت ڈیڑھ گنا ہو جاتی۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ اگر اہل علم صرف قرآن کا مطالعہ کرکے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کرکے اس تفسیر کا مطالعہ کریں تو انشاء اللہ دوبالا لطف اور حظ حاصل ہو۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ سات امور کے علاوہ اس تفسیر میں حسب ذیل امور کا التزام ہے۔

۱۔ تفسیر لکھنے کے وقت میرے پاس بیضاوی، جلالین، تفاسیر رحمانی، اتقان، معالم التنزیل، روح المعانی، مدارک، خازن، فتح المنان، ابن کثیر، لباب، درمنثور، کشاف اور بعض تراجم قرآن موجود تھے۔ بعض کتابیں کچھ لکھنے کے بعد آئیں اور بعض بالکل آخر میں حوالوں سے اس کی تعیین

ہو سکتی ہے۔

۲۔ سورتوں اور آیات کا ربط اور سورتوں کا خلاصہ بھی لکھ دیا ہے۔

۳۔ جن آیات کی تفسیر اتحاد یا تقارب معانی کی وجہ سے ایک جگہ لکھی گئی ہے، اس کو عنوان دے کر لکھ دیا ہے۔

۴۔ جن روایات پر تفسیر کو مبنی کیا ہے ان کا التزام کیا گیا ہے کہ وہ روایات صحیح ہوں، لیکن آیات جن کے الفاظ سے ایک مفہوم ثابت یا ظاہر ہوتا ہے، ان کی تائید میں احادیث صحیحہ کے علاوہ حسن اور غریب احادیث بھی بیان کر دی گئی ہیں۔

۵۔ شبہات کے جواب میں صرف ان شبہات کا جواب دیا ہے جن کا منشا کوئی دلیل صحیح موجود تھا۔

۶۔ زائد مضمون سے اکثر احتراز کیا ہے۔

۷۔ ترجمہ میں محاورے کے بجائے ترکیب کی رعایت زیادہ کی ہے۔

۸۔ کتب سماویہ سابقہ کے متعلق تمام مضامین تفسیر حقانی سے منقول ہیں۔

۹۔ تمام تفسیر میں دو تین مقامات ہیں جہاں جیسا جی چاہتا تھا شرح صدر نہ ہوا، اس موقعہ پر تصریح ہے کہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر میسّر ہو تو وہ راجح سمجھے۔

۱۰۔ مسائل فقہیہ و کلامیہ پر اس قدر کلام کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں جس قدر ضرورت تھی۔

۱۱۔ جو مضامین مفصل لکھنے کے قابل تھے ان کو ایک جگہ لکھ کر دوسری جگہ حوالہ دے دیا گیا ہے۔

۱۲۔ تفسیر میں سلف صالحین کا مکمل اتباع کیا ہے، متاخرین کے اقوال جو سلف کے خلاف تھے ان کو نہیں لیا۔

۱۳۔ مفسرین کے مختلف اقوال میں جو قول عربیت یا روایت کے اعتبار سے راجح تھا اس کو نقل کر دیا۔ اگر دو وجہیں برابر نظر آئیں تو دونوں کو بیان کر دیا ہے۔

۱۴۔ تقریر دالوں میں قواعد میزانیہ منطقیہ کی پوری رعایت موجود ہے، جس کا لطف علماء واذکیاء محسوس کرتے ہیں۔

۱۵۔ کسی کسی جگہ تقریر قدرے تنگ ہے لیکن وہ کفایت میں خلل پیدا نہیں کرتی، اس لیے بعض مضامین ایسے بھی آگئے ہیں، جن کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں یا سمجھا سکتے ہیں، اس تفسیر سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لیے علوم متعارفہ میں مہارت اور کتب تفسیر کے مطالعہ ومراجعت میں تجربہ پیدا ہونے کے بعد اس تفسیر کا ملاحظہ کرنا ہے

ناچیز نے حضرت کاندھلوی کو دیکھا ہے کہ مشکلات قرآن میں کئی تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد بیان القرآن کی طرف رجوع فرماتے تھے اور بے حد مسرور اور محظوظ ہوتے۔ ایک بار سورہ احزاب میں ربط آیات پر تفاسیر کا مطالعہ فرماتے رہے کہ جن آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کا ذکر ہے، ان کے ساتھ امہات المومنین کے ذکر والی آیات کا آپس میں کیا ربط ہے۔

کئی تفاسیر روح المعانی، تفسیر کبیر، کشاف، تفسیر مظہری کے بعد بیان القرآن کا مطالعہ کیا تو بہت مسرور ہوئے اور مجھے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ جو مضامین کئی صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے وہ حضرت کی چند سطور میں آجاتے ہیں۔

۱۶۔ کئی امور ضروریہ، لطائف تفسیر و ترجمہ بیان میں نہیں آسکتے مطالعہ سے محسوس ہوں گے۔

۱۷۔ جو لطائف و نکات حل آیات اور مضامین قرآنیہ سے متعلق نہ تھے، ان کو بالکل حذف کر دیا ہے۔

۱۸۔ جن احادیث کی تفسیر میں واضح حدیث موجود ہے اس کے مقابلہ میں کسی کا قول نہیں لیا ہے۔

۱۹۔ التزامات مذکورہ کی ضرورت "تدریجاً" آتی رہی اس لیے اول اجزا میں التزام پورا نہ ہو سکا۔

۲۰۔ عربی حاشیہ کے مضامین خاص اہل علم کے لیے ہیں، ان کے التزامات متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے بعض تراجم قرآنیہ پر تنقید بھی فرمائی ہے اور ان کی اغلاط پر متنبہ فرمایا ہے۔ ان تراجم میں ایک ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ہے، شمس العلماء نذیر احمد سرسید احمد خاں کے رفقاء میں سے تھے۔ اس لیے ان کے ترجمہ میں بعض چیزیں ایسی آگئی ہیں، جو سلف صالحین کے مسلک کے خلاف ہیں، یہ ترجمہ اگرچہ بہت با محاورہ ہے لیکن معانی اور مطالب کی وجہ سے حضرت تھانوی صاحب نے ایک کتاب "اصلاح ترجمہ دہلویہ" تالیف فرمائی۔

پھر مرزا حیرت دہلوی نے ایک ترجمہ شائع کیا۔ جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ پر اعتراضات بھی کیے۔ اور خود ایک ترجمہ پیش کیا۔ حضرت تھانویؒ نے اس ترجمہ کی اصلاح کے لیے "اصلاح ترجمہ حیرت" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اسی طرح بعض دوسرے حضرات کے تراجم میں کوئی خامی یا نقص محسوس ہوا تو اس کی اصلاح کی طرف فوراً متوجہ فرمایا۔

حضرت تھانویؒ مسلک میں صحابہؓ و تابعینؒ اور دیگر سلف صالحینؒ کے نہایت سختی سے پابند تھے۔ جدت پسندی جو جادۂ مستقیم سے انحراف کا باعث ہو، ہرگز پسند نہ فرماتے، حضرتؒ اپنے اور غیر کی تمیز بھی اس سلسلہ میں روا نہ رکھتے تھے۔

خود اپنے لیے اپنے متعلقین بالخصوص علماء سے فرماتے کہ میری کوئی تحریر یا تقریر غلط نظر آئے، سلف صالحین کے مسلک کے خلاف محسوس ہو تو مجھے مطلع کر دیں۔ چنانچہ "ترجیح راجح" کی سالانہ اشاعت فرماتے۔ یعنی جن مسائل میں رجوع فرماتے ان کی اشاعت ضروری سمجھتے تاکہ صائب الرائے دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے۔ حضرت کے متعلقین و منتسبین میں بھی یہ اثر موجود ہے

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ کے بہت سے مضامین سے رجوع کیا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں اگر کوئی مجھے میری غلطی کے متعلق لکھتا ہے تو میرا اول یہی کہنا ہے کہ میں نے ضرور غلطی کی ہوگی اور جس نے مجھے غلطی پر متنبہ کیا ہے، اس نے مجھ پر احسان کیا ہے، اس کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ کیا لکھا ہے۔ اگر اصول و قواعد کے مطابق میری غلطی ہوتی ہے۔ تو میں ضرور تسلیم کر لیتا ہوں ورنہ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔

مسائل السلوک

حضرت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن کے حاشیہ میں مسائل سلوک کے نام سے قرآنی آیات سے مسائل طریقت یعنی تصوف کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ مضامین کتابی صورت میں مستقل کتاب کے طور پر بھی شائع ہو چکے ہیں، اہل طریقت پر حضرت کا احسان عظیم ہے۔

معارف قرآنی اور مواعظ حسنہ

حضرت تھانویؒ کا وعظ و تقریر کے سلسلہ میں یہ طریقہ تھا کہ جس مضمون اور آیت کو مناسب حال سمجھا بیان فرما دیا۔ اور وعظ کے مضامین القاء و آمد کا حصہ زیادہ ہوتا تھا، چونکہ آپ وعظ فرمانے سے قبل مطالعہ کرنے کے عادی نہ تھے۔ حضرت کاندھلویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مدتوں دیکھا ہے کہ جمعہ کے روز مختلف موضوعات پر تقریر فرماتے اور کبھی تقریر یا وعظ کے لیے پہلے سے تیاری نہ کرتے۔

وعظ میں مضامین کی آمد اور القاء کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے بہت سے وہ مضامین جو آپ کے مواعظ میں پائے جاتے ہیں وہ تفسیر بیان القرآن میں نہیں ہیں۔ حضرت کاندھلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے مواعظ سے تمام آیات کی حکیمانہ تفاسیر اور معارف و اسرار جو حضرت القاء ربانی سے بیان

جاتے تھے ان کو جمع کرنے کی ضرورت ہے، بیان القرآن میں لکھا ہے وہ کتابوں کے مطالعہ کے بعد جس کی تائید و تصدیب متقدمین سے ہوئی وہ بات تحریر میں آئی۔ مواعظ کا رنگ اس کے برعکس تھا کبھی وعظ و تقریر کے لیے کتابوں کا مطالعہ فرمایا نہ اہتمام کیا۔ القاء ربانی اور علوم معانی کی روانی دیکھنے کی چیز تھی۔ مواعظ حسنہ میں جن آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے اور جو اسرار و معارف حضرت نے وعظ کے دوران بیان فرمائے ہیں ان کو مدون کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ علوم و معارف مفسر اول واعظم کی زیارت کے برکات و انوار ہیں۔

جمال القرآن

یہ فن تجوید و قرأت میں ایک نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے جو اکثر اسلامی اور عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔

اعمال قرآنی

قرآن شریف کی آیات سے عملیات اور وظائف بیان کئے ہیں۔

خواص قرآنی

قرآنی آیات کے خواص جو عملیات کے شائقین کے لئے مفید ہے۔

احسن الاثاث فی النظر الثانی فی التفسیر المقامات الثلاث

سورۂ بقرہ کی تین آیات پر نظر کرنے کے بعد تفسیر تالیف فرمائی ہے۔

تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات

خاندان کی چند لڑکیاں جو قرآن شریف کی تفسیر حضرت سے پڑھتی تھیں ان کے تحریر کردہ تفسیری نوٹ ہیں۔

اصلاح ترجمہ حیرت

مرزا حیرت دہلوی کے ترجمے کی اصلاح سے متعلق ہے۔

التعقیب فی التفسیر

لاہور کے ایک ترجمہ میں جو تفاسیری نوٹ ہیں ان میں بعض تسامح کی نشان دہی کی ہے۔

احکام القرآن یا دلائل القرآن علی مسائل النعمان

۱۳۵۱ھ میں حضرت نے فقہ حنفی کی تائید میں اعلاء السنن کی تکمیل کے بعد قرآنی آیات سے مسلک حنفیہ کی تائید میں جو آیات ہیں ان کو جمع کرانے کے لئے علماء و فضلاء کا انتخاب فرمایا۔ حسب ذیل علمائے کرام کو حکم دیا کہ یہ کام آپ کے سپرد ہے (۱) حضرت مولینا ظفر احمد عثمانی مرحوم (۲) حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم (۳) حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ (۴) حضرت مولینا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ۔ الحمد للہ یہ کتاب مستقل کئی حصص میں ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے۔

الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان

تفصیل البیان فی علوم القرآن کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے مصنف نے حضرت سے درخواست کی کہ جس جو مقام پر نظر آئیں ان سے اطلاع فرمائیں، حضرت نے مصنف کی خواہش کے مطابق یہ کتاب تالیف فرمائی ہے۔

سبق الغایات فی نسق الآیات

یہ عربی زبان میں ہے آیات کے ربط و ضبط اور نظم پر روشنی ڈالی ہے ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

آداب القرآن

قرآن کریم کی تلاوت کے آداب اور قرآن حکیم کے آداب پر مختصر تالیف ہے۔

حضرت استاذی حافظ عبدالرحمان صاحب امروہوی مرحوم

تلمیذ حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ

حضرت حافظ صاحب مرحوم حضرت مولانا نانوتوی کے شاگرد تھے حضرت نانوتوی سے قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر پڑھنے کا شرف آپ کو حاصل تھا۔

حضرت امروہوی کے درس کا طریقہ متاخرین کے درس سے بالکل مختلف تھا، متقدمین کے طرز پر جو طلباء مطالعہ کتب اور علم کے شائق رہتے تھے اور مغلقات کو خوب سمجھتے تھے خود کتاب کی عبارت سے نفس معانی آسانی سے حل کر لیتے تھے، استاد ان کو صرف اہم اور خاص چیزیں بتاتے تھے یعنی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طلباء کو نہیں پڑھایا جا رہا بلکہ اساتذہ اور علماء کو درس دیا جا رہا ہے۔ آپ کے درس کی چند باتیں بطور تبریک اور یادگار تحریر کرتا ہوں جو مجھے یاد رہ گئی ہیں اگر الفاظ و بیان میں کچھ نقص محسوس ہو وہ میری طرف نسبت کریں اور جو علمی لطافت و حلاوت محسوس کریں وہ حضرت مرحوم کا حصہ ہے۔

ایصال ثواب

حضرت نے فرمایا مُردوں کو ایصالِ ثواب میں اختلاف ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ قرآن شریف پڑھ کر یا صدقہ یا خیرات وغیرہ کسی قسم کا ایصال ثواب اگر کئی مُردوں کو کیا جائے تو برابر تقسیم ہو کر پہنچے گا، اور بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ ایصال ثواب جو متعدد مردوں کو کیا جاتا ہے اسمیں تقسیم نہیں ہوتی پورا پورا سب کو پہنچ جاتا ہے۔ فرمایا یہی عقلاً اور نقلاً زیادہ صحیح اور ہمارے لئے

زیادہ انفع ہے۔ عقلاً اس طرح صحیح کہ مرنے کے بعد اموات عالم برزخ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ عالم معانی ہے عالم مادی نہیں ہے۔ عالم مادی میں تو ایک روپیہ چار آدمیوں کو تقسیم ہو کر ہی پہنچ سکتا ہے لیکن عالم معانی اور روحانی میں پورا پورا پہنچ سکتا ہے۔ ایک استاد کے دس طالب علم شاگرد ہیں وہ ایک مسئلہ سب کو سمجھاتا ہے، تمام طالب علم مسئلہ سمجھنے کے لئے مستعد ہیں اور صلاحیت فہم توجہ موجود ہے وہ سب اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھ جائینگے، وہ مسئلہ ہر ایک شاگرد کو پورا پورا بغیر تقسیم کے پہنچ جائے گا، اسمیں تقسیم نہ ہوگی۔ استاد جس نے وہ مسئلہ بیان کیا ہے اس کے پاس بھی وہ باقی رہے گا۔ بلکہ تازگی اور نکھار کے ساتھ ذہن میں آجائے گا، کسی طرح کی کمی نہ ہوگی بلکہ اضافہ ہی ہوگا، علم بھی معنوی چیز ہے، عالم روحانی اور عالم معانی سے تعلق ہے اس لئے بغیر تقسیم کے پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح عید الاضحیٰ میں مُردوں کی طرف سے قربانی میں ایک کے بجائے کئی مردے شامل کئے جا سکتے ہیں، حالانکہ زندوں میں ایک حصہ صرف ایک شخص کے لئے ہوگا خواہ جانور کتنا ہی قوی الجثہ ہو، فربہ ہو لیکن شرعی حکم کے مطابق ایک شخص کا حصہ ممکن ہے۔ لیکن اس کے برعکس اموات میں خواہ ایک حصہ دس دس آدمی شریک کر دیں چونکہ مرنے کے بعد عالم معانی اور روحانی میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں مادی دنیا کی طرح تقسیم نہیں ہے، ناچیز عرض کرتا ہے کہ ایک حدیث نبوی میں بھی اموات کے لئے غیر منقسم ثواب تقسیم ہونے کا ذکر موجود ہے، حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور میں بھی یہ مسئلہ بیان کیا ہے اور وہ حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔

طہارت کا فلسفہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پیشاب و پائخانہ کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور وضو دوبارہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے یہ بات بظاہر غلط نظر آتی ہے اس لئے کہ پیشاب اور پائخانہ کے خارج ہونے سے جسم میں طہارت پیدا ہوتی ہے۔

نجاست خارج ہو جانے سے طہارت پیدا ہوتی ہے لیکن شریعت نے ان چیزوں کو ناقض وضو قرار دیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیشاب اور پاخانہ کے خارج ہونے سے نجاست جسم سے مکمل خارج نہیں ہوئی بلکہ جسم میں یہ غلاظت اور نجاست ہنوز موجود ہے، پیشاب اور پاخانہ کے خارج ہونے سے جسم میں اسی کی کیفیت کا اظہار ہوا ہے یعنی ہمارے جسم کے اندر جو ناپاکی بھری پڑی ہے اس کی نکیاں ہر کر بہنے لگی ہیں۔ جو کچھ برتن میں ہوتا ہے برتن سے وہی کچھ نکلتا ہے۔ چونکہ ہمارے جسم سے غلاظت اور نجاست بول و براز کا اخراج ہوا ہے اور جسم سے ان چیزوں کو کلیتہً پاک و صاف کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے ان کے نکلنے سے طبیعت پر جو تکدر ہوا ہے اور روحانی لطافت و نظافت میں جو کمی آئی ہے وہ وضو سے دوبارہ کر کے حاصل کر لی جائے اور وضو سے یقینی طور پر ایک خاص نظافت اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر جسم کو نجاست سے پوری طرح پاک صاف کرنے کا حکم دیا جاتا تو یہ ناممکن اور ناقابل عمل تھا اور شریعت حقہ تکلیف مالایطاق کا حکم نہیں دیتی اس لئے امور عادیہ بمنزل امر حقیقی سمجھا گیا اور اس پر حکم لگا دیا گیا فافہم۔

غسل اور وضو کی حکمت

بظاہر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جسم انسانی سے بول و براز کافی مقدار میں خارج ہوتا ہے اور ان کی گندگی اور نجاست محسوس بھی ہوتی ہے لیکن ان کے خارج ہونے سے صرف مقام نجاست کو صاف کرنے اور وضو کا حکم ہے لیکن احتلام یا مباشرت میں صرف چند قطرے منی کے خارج ہوتے ہیں جس کی نجاست بھی متفق علیہ نہیں ہے بلکہ بعض ائمہ نے اس کو پاک کہا ہے۔ لیکن اس کے خارج ہونے پر تمام جسم کو پاک کرنے یعنی غسل کا حکم دیا جاتا ہے، یہ حکم عجیب اور خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ بول و براز پاخانہ اور پیشاب کا خارج ہونا اکل و شرب کھانے پینے کی طرح ایک لازمہ زندگی ہے اگر ان امور میں غسل کا حکم دیا جاتا تو طہارت کا حاصل کرنا بے حد دشوار ہو جاتا۔ علاوہ ازیں بول و براز کے خارج ہونے کے بعد طبیعت انسانی پر خوشگوار اثر ہوتا ہے صرف ان کے اخراج کے وقت ایک قسم کا تکدر پیدا ہوتا ہے جو نجاست کی جگہ صاف کر کے اور وضو کر کے نظافت اور حلاوت سے تبدیل ہو جاتی ہے۔

لیکن احتلام اور مباشرت میں نفسانی اور حیوانی قوتوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور مادی منوی کا تعلق جسم کے تمام اعضاء سے ہے ایک قطرۂ آب میں تمام انسانی صفات عادات اور اشکال کا خلاصہ موجود ہوتا ہے جو نشو و نما کے بعد محسوس ہوتا ہے اس لئے قوت حیوانی اور نفسانی کے اشتعالُ استعمال کے بعد ضروری ہوا کہ تمام جسم کو دھونے یعنی غسل کرنے کا حکم دیا جائے بلکہ مباشرت کے مبادیات یعنی مرد اور عورت کی شرمگاہ کے اتصال پر غسل کا حکم واجب کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ غسل کا حکم دراصل قوت حیوانی اور قوت نفسانی و شہوانی کے اشتعال کی وجہ سے ہے اور ان قوتوں کو ضبط اور اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کے متعلق ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ قوت ملکوتی اور روحانی کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور حیوانیت اور شہوانیت کے پیچھے لگ کر انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جائے۔

حضرت فخر المحدثین والمفسرین

مولینا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ

شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وفات ۱۹۳۳ء

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ علوم قرآنی و معارف ربانی کے سمندر تھے، آپ نے اپنے دست مبارک سے بہت کم لکھا ہے اور تلامذہ کو ایسا پڑھایا ہے کہ ان کو زندہ کتب خانہ بنا دیا، حضرت مولینا

محمد ادریس کاندھلوی مرحوم، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی، حضرت مولینا محمد یوسف بنوری مدظلہ وغیرہ وغیرہ بے شمار علماء اور فضلاء آپ کے ارشد تلامذہ میں شامل ہیں اور ان بزرگوں نے جو خدمت کتاب و سنت کی فرمائی ہے وہ حضرت شاہ صاحب کا فیض ہے۔

مشکلات القرآن

حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے قرآن حکیم کی تفسیری مشکلات کو حل کرنے کے لئے تالیف فرمائی ہے اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اسمیں قرآنی مشکلات و مبہمات کا حل موجود ہے اہل علم اور مفسرین کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے لیکن آپ کو علم حدیث کے ساتھ قرآنی علوم سے خاص شغف تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے تلامذہ بحیثیت محدث کے بھی مشہور ہیں اور بحیثیت مفسر کے بھی فائق و لائق ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ ہی آپ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کے معاصرین بھی اہم اور مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے قرآن و حدیث کے کئی مسائل مشکلہ اور امور مہمہ میں آپ کی طرف رجوع کیا اور پھر کتابوں میں بھی آپ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے۔

مولینا حفظ الرحمن صاحب قصص القرآن میں فرماتے ہیں کہ سورۂ نجم کے اسرار و معارف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے مشکلات القرآن میں بیان فرمائے ہیں وہ قابل مراجعت ہیں علمائے کرام کو ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اسی طرح حضرت علامہ عثمانی نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں وہ اسرار و معارف نقل فرمائے ہیں۔

حضرت مولینا محمد طاہر قاسمی نبیرہ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولینا نانوتویؒ

مولینا محمد طاہر قاسمی، حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی اور پاکستان کے مشہور و معروف قاری ظاہر القاسمی کے والد بزرگوار تھے۔

آپ نے عقائد کے سلسلہ میں عقائد اسلام کتاب تالیف فرمائی ہے۔ اور تفسیر معوذتین، حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ کے اسرار و معارف کو قلم بند فرمایا ہے اس کا نام التعود فی الاسلام ہے۔ تفسیر سورۂ یوسف بھی آپ کی تالیف ہے۔

حضرت مولینا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم و مغفور

حضرت مولانا عاشق الٰہی مرحوم بڑے علم دوست اور وسیع المطالعہ اور کثیر التالیف والتراجم بزرگ تھے، حضرت گنگوہیؒ کی سوانح "تذکرۃ الرشید" اور حضرت سہارنپوری کی سوانح "تذکرۃ الخلیل" کے مؤلف ہیں۔

مولینا نے بہت سی کتابیں تالیف فرمائی ہیں ہیں اور بہت سے ترجمے بھی کئے ہیں۔ قرآن حکیم ترجمہ اور اس کے فوائد بھی تحریر کئے ہیں جو کئی بار شائع ہو چکے ہیں

اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ حضرت مولینا محمود حسن قدس اللہ سرہ کی نظر سے گزرا ہے اور اس کے فوائد و حواشی میں مولف علام نے بہت سی مستند تفاسیر کا خلاصہ پیش کیا ہے وہاں آپ نے ایک عظیم کارنامہ یہ سرانجام دیا ہے کہ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر مولد حضرت شاہ ولی اللہ مولد و مرقد حضرت شاہ اہل اللہ مرحوم تشریف لے گئے اور وہاں سے جناب منشی رحمت اللہ صاحب سے خاندان ولی اللہ کا ایک

نقلی نسخہ حاصل کیا۔ مولینا عاشق الہٰی اپنے دیباچہ ترجمہ قرآن میں لکھتے ہیں۔

آیات قرآنیہ کا سمجھنا اسباب نزول پر موقوف ہے کہ آیت کب اور کس مقصد میں نازل ہوئی اور اس کا التزام کسی کلام مجید یا تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا اس لئے جی چاہتا تھا کہ اس کی تدوین بدرجہ کمال ہو جائے۔ چنانچہ سب اول ۱۳۲۰ھ میں جبکہ میں نے ترجمہ کی طرف توجہ کی تو اس کا زیادہ اہتمام کیا اور الحمد للہ کامیابی کے سامان مہیا ہونے لگے۔ ایک قلمی حمائل شریف قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر میں منشی رحمت اللہ صاحب سے دستیاب ہوگئی جو منشی صاحب کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے پوتے مولوی محمد حسین بن مولوی شاہ رفیع الدین صاحب سے حاصل ہوئی تھی جس کے حواشی پر شان نزول کا بزبان فارسی کافی ذخیرہ موجود تھا۔ حاشی مذکور میں قلمی نسخہ کا رمز بھی مقرر کیا ہے۔

(ص ۳۰۵ مطبوعہ ۱۳۳۳ھ برگتی ابراہیمی پریس لکھنؤ)

حضرت مولینا مفتی محمد حسن صاحب (مرحوم)، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور (وصال ۱۹۶۱ء یکم جون)

حضرت نے قرآن حکیم کی تفسیر تحریر نہیں فرمائی لیکن برسوں قرآن حکیم کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور ہزارہا لوگوں نے آپ کے علوم و معارف سے استفادہ کیا ہے۔

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ مصنف معارف القرآن فرماتے ہیں۔

یہ اعجاز بفیض و فضل مولینا حسن دیکھا
کہ امرتسر میں ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
سنا وہ درس قرآں دل کی آنکھیں کھل گئیں جس نے
معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا

الٰہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوق قرآں ہو
اسی میں ان کا جینا ہو اسی میں ان کا مرنا ہو

قرآن حکیم کے درس کا سلسلہ آپ کے صاحبزادہ مولینا عبدالرحمٰن صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ نے جامعہ اشرفیہ میں شروع کیا ہے اللہ تعالیٰ جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد نیلا گنبد میں بھی درس دیا کرتے تھے۔

بتاؤں آپ کو کیا درس مولینا حسن دیکھا
ہوا نیلا گنبد میں نیا تھانہ بھون دیکھا
حکیم دین شہ اشرف علی تھانوی دیکھے
وہاں پر گلستاں دیکھا یہاں ہم نے چمن دیکھا

(انیس)

حضرت حکیم الاسلام مولینا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

حضرت قاری طیب صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے ہیں اور علوم و معارف میں حضرت حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی قاسم العلوم والخیرات کے روحانی و جسمانی وارث ہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصنیفات صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ قاری صاحب مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے تفہیم و تقریر کا یہ مادہ و ملکہ عطا فرمایا ہے کہ آپ بڑے سے بڑے علمی نکات اور اسرار و رموز کو نہایت آسان الفاظ میں بیان فرما دیتے ہیں۔ آپ نے لاہور میں علم دین کے متعلق تقریر فرمائی ضمناً روح کا بیان بھی ایسا آگیا معلوم ہوتا تھا کہ روح کا مسئلہ نہایت آسان اور بدیہی ہے۔ آپ کی تقاریر میں حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ کے علوم و معارف کی تفہیم و تفسیر ہوتی ہے۔

دیوبند کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو کسی آیت کی تفسیر بیان کرنے کا معمول رہا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ آپ قرآن کریم کی ایک تفسیر تالیف فرما رہے ہیں

لیکن دارالاہتمام کے انتظام و انصرام کی مشغولیت و معروفیت کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا وقت کم ملتا ہے۔ کاش حضرت قاری صاحب قرآن کریم کی تفسیر مکمل فرمائیں۔ حضرت نانوتوی کے علوم و معارف کا بے بہا خزانہ عام فہم زبان میں پیش کرنا ایک عظیم سعادت کے علاوہ زمانہ کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ حضرت قاری صاحب کے صاحب زادہ مولانا محمد سالم صاحب اس سلسلہ میں خاص توجہ کریں اور حضرت قاری صاحب کا ہاتھ بٹائیں، حضرت قاری صاحب صاحبزادہ صاحب یا تلامذہ میں سے کسی کو معاون خاص بنا کر اس اہم کام کی تکمیل فرمائیں۔

مقدمۃ القرآن

حضرت قاری صاحب مدظلہ نے ایک نہایت مفصل اور جامع مقالہ "مقدمۃ القرآن" کے نام سے تالیف فرمایا ہے، یہ مقالہ بعض تفاسیر کے ساتھ اور مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) دارالعلوم دیوبند کا ایک تالیفی ادارہ ہے جو حضرت قاری صاحب کی زیر نگرانی و صدارت کام کر رہا ہے، اس کی مجلس منتظمہ علیحدہ ہے۔

اس ادارہ کا مقصد قرآنی علوم کی ریسرچ اور تحقیق ہے۔

وقت کے الجھے ہوئے مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کرکے اس طرح پیش کیا جائے کہ قرآن حکیم کو دنیا کا رہنما اور امام ثابت کیا جائے اور دنیا کو قرآن حکیم کی روشنی سے رغبت پیدا ہو اور معارف ربانی سے فیوض و برکات حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہو۔

حضرت شیخ التفسیر والحدیث

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت کاندھلویؒ دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کے منصب پر فائز تھے، اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں تا وفات شیخ الجامعہ اور شیخ الحدیث رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں دورہ تفسیر کے اسباق اور قرآن حکیم درس آپ دیا کرتے تھے دورہ تفسیر کے طلباء کے علاوہ بہت سے دوسرے طالب علم جن کو قرآنی علوم سے خاص شغف ہوتا وہ شریک ہو جاتے۔

دورہ تفسیر میں بیضاوی شریف	ثلث اول از ربع ثانی پارہ سیقول تا سورۂ مائدہ	
"	"	ثلث ثانی از سورہ یونس تا سورہ مریم
"	"	ثلث ثالث از سورہ ق تا ختم قرآن شریف
تفسیر ابن کثیر "	ثلث اول از سورہ آل عمران تا سورہ یونس۔	
"	"	ثلث ثانی از سورہ رعد تا سورہ روم
"	"	ثلث ثالث از سورہ روم تا سورہ صف

دورہ تفسیر سال نہم میں پڑھایا جاتا ہے، بیضاوی شریف سورہ بقرہ ½ پارہ ساتویں سال میں دورہ حدیث سے قبل پڑھایا جاتا ہے۔ قرآن شریف کے پندرہ پارے چہارم میں اور پندرہ پارے سال پنجم میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جلالین شریف مکمل سال ششم میں اور اس کے ساتھ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر از حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ پڑھائی جاتی ہے اور قرآن شریف کا ترجمہ، جلالین شریف اور الفوز الکبیر موقوف علیہ دورہ ہیں۔ یعنی ان کے بغیر پڑھے دورہ حدیث یعنی شرکت نہیں ہو سکتی۔

دارالعلوم میں حضرت شیخ التفسیر کے عہدہ پر فائز رہے لیکن علم حدیث کے درس سے بھی تعلق قائم رکھا۔ اکثر آپ ابوداؤد شریف پڑھایا کرتے تھے۔ قرآن شریف کے درس کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت نے قرآن شریف کا ترجمہ اور ضروری تفسیر کے علاوہ آسان زبان میں ایسا درس دیا کہ آپ کے درس میں بے شمار طلباء اور دوسرے حضرات شریک ہونے لگے۔ دورہ

طلبا سے برابر ہوتا تھا بلکہ بہت سے اصحاب باہر کے شریک ہوتے تھے کسی اور درس اور سبق میں یہ شان نہیں پائی جاتی تھی جو اس درس کی شان تھی۔ آسان زبان میں بیضاوی شریف، کشاف، تفسیر کبیر اور ابن کثیر کا خلاصہ اور جوہر دو سطر پیش کر دیتے تھے۔ آپ کے درس قرآن کے بعد جلالین شریف کا سبق بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ جلالین میں کچھ پڑھایا جاتا تھا درس قرآن کے طلبا اس سے زیادہ پڑھ کر آتے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم پر حضرت کئی روز تک درس فرماتے آپ نے فرمایا کہ بسم اللہ میں ب استعانت کے لئے، قاضی بیضاوی نے اس کو مصاحبت کے لئے قرار دیا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ب استعانت کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور مصاحبت کے لئے بھی لیکن علامہ زمخشری نے کشاف میں ب کو مصاحبت کے لئے قرار دیا ہے اور اس انداز سے کلام کیا ہے کہ قاضی بیضاوی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی مصاحبت ہی کے لئے قرار دے دیا۔

فرمایا چونکہ علامہ زمخشری صاحب کشاف معتزلی ہیں اور ان کے ب کو مصاحبت کے لئے قرار دینے میں ب کو استعانت سے دور رکھنا مقصود ہے معتزلہ کے عقیدہ میں یہ بات ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا خود خالق ہے۔ اگر ب کو استعانت کے لئے قرار دیا جائے تو اس عقیدہ پر زد آتی ہے اس لئے علامہ زمخشری نے استعانت کے بجائے مصاحبت کے لئے قرار دیا اور مجھے اس میں اعتزال کا رائحہ محسوس ہوا اس لئے میں کہتا ہوں کہ ب استعانت کے لئے ہے ذکر مصاحبت کے لئے اور بندہ استعانت کے بغیر کوئی کام کرنے کے لائق نہیں ہے۔ سورہ فاتحہ میں صاف طور پر آ رہا ہے وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن۔

حضرت نے فرمایا کہ قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف اور علامہ رازی کی تفسیر کبیر سے استفادہ کرتے ہیں اور ان دونوں تفاسیر کے علوم کی تلخیص نہایت جامع الفاظ میں کرتے ہیں لیکن بعض مقامات پر علامہ جار اللہ زمخشری کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر ایسا قول اختیار کر لیتے ہیں جس میں مسلک حقہ اہل السنت والجماعت کے خلاف رائحہ اعتزال موجود ہوتا ہے۔

حضرت اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں

بسم اللہ کے شروع میں جو با ہے بعض علما کے نزدیک مصاحب اور الصاق کے لئے ہے اور بعض علما کے نزدیک استعانت کے لئے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں ابتدا ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استعانت کا اظہار ہوگا اور اول وہلہ میں اپنی حول و قوت سے تبری کا اعلان ہو جائے گا یعنی اسی کی اعانت و توفیق سے شروع کرتے ہیں حاشا اپنی حول و قوت سے نہیں لاحول ولاقوۃ الا باللہ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کا مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل کا ہی اظہار ہو۔ اور جاء مصاحبت نہ ہو تعالی جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ اور یہی معنی ایاک نستعین کے مناسب اور قریب ہیں اور لاحول ولاقوۃ کے مترادف ہو جانے کی وجہ سے کنز من کنوز الجنۃ یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کو ملانے کا مصداق ہوگا (۱) ص ۶ و ۷۔

راقم آثم نے زمانہ طالب علمی میں حضرت کاندھلوی کے درس قرآن میں تفسیری نوٹ قلم بند کئے تھے جن کو میں بہت عزیز رکھتا تھا لیکن حضرت کی تفسیر معارف القرآن شائع ہونے اور مطالعہ کرنے کے بعد میرے تحریر کردہ نوٹ کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی، حضرت کاندھلوی فرماتے ہیں،

تفسیر قرآن کا پہلا سنگ بنیاد وہ ترجمہ ہے جو قواعد عربیت اور قوانین شریعت کے پورا پورا مطابق ہو، تفسیر قرآن کا یہ سنگ میل یعنی ترجمہ قرآن شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا اور ہندوپاک میں یہ خیر کثیر اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں

جاری ہوئی اور یہی تینوں ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے لئے سنگ بنیاد بنے اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

غرض یہ حضرات ترجمہ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علوم دینیہ میں تمام ہند و پاک کے استاد ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس و ناکس کو ترجمے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لئے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک کہ مترجم دونوں زبان کے لغات، محاورات اور استعارات و کنایات اور حقیقت و مجاز اور اسالیب کلام سے پوری طرح واقف نہ ہو یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے بڑے علما کو ترجمہ کرنا دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا زور فہم اور نور تقویٰ کس کے پاس ہے جو ایسا ترجمہ کر سکے۔

بحمدہ تعالیٰ جب قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گزر گئی تو اس کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطی کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا کیا جائے اور لطائف و نکات اور مذاہب باطلہ کی تفصیلی تردید سے گریز کیا جائے۔

یہ خدمت اور سعادت حضرت حکیم الامت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہ کے حصہ میں آئی آپ نے ۱۹۲۰ء میں بیان القرآن کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو افادیت اور جامعیت میں ثریٰ زمین سے ثریا افلاک تک پہنچ گئی ہے۔

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے لئے کافی و شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی یہ تفسیر فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔

معارف القرآن

فہم قرآن کی دو منزلیں اول صحیح ترجمہ دوم مختصر اور جامع تفسیر کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہؓ و تابعین پر مشتمل ہو بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات و اعتراضات کے جوابات پر حاوی ہو تاکہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ سامنے آجائے اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر بھی ہٹی ہوئی نہ ہو۔ عہد نبوت اور عہد صحابہؓ و تابعین سے لیکر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآن کریم کا مطلب سمجھا ہے۔ اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت کے مسلمانوں تک پہنچا دی جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال یا نظریہ کو قرآن کے بہانہ سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ آجکل آزاد منشوں کا یہ طریقہ ہے۔ آزاد مفسروں کی ہمہ تن یہ کوشش ہوتی ہے کہ لفظاً تو عربی ہوں اور معنیً مغربی ہوں اور یورپ کے ملحدوں کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلا دیا جائے۔

اس فتنہ سے بچنے کے لئے یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے۔ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کرنے کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے۔

حضرت راس المفسرین والمحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ کی تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی جو ہمارے پاس ناتمام پہنچی ہے، پارہ الم اور سیقول کے پارہ کی آیت وان تصوموا خیر لکم اور پارہ عم اور تبارک الذی دستیاب ہے بقول مولانا کاندھلوی اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بسیط ارض

پر اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی دراصل حضرت کاندھلوی نے دوری کے بجز تفسیر معارف القرآن تالیف فرما کر تفسیر عزیزی کی تکمیل فرمائی ہے۔

اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ بھی اس تفسیر کو ملاحظہ فرمائیں تو انتہائی مسرور ہوں کہ میری روحانی اولاد نے میرا کام اور مشن پورا کر دیا۔

ع اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ کے شاگرد خاص حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ جنہوں نے مثنوی مولینا روم کی تکمیل کی ہے معروف و مشہور شخصیت ہیں مولانا کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

معارف القرآن جلد اول سائز کلاں ۴۳۴ صفحات پر مشتمل ہے پہلی جلد میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر ہے۔

معارف القرآن جلد دوم سائز کلاں ۲۰۸ صفحات تفسیر سورۃ النساءٔ پر مشتمل ہے۔

معارف القرآن جلد سوم سائز کلاں ۲۰۲ صفحات تفسیر سورہ نساء پر مشتمل ہے۔

" " جلد چہارم ۴۱۰ صفحات سائز کلاں پر مشتمل ہے، سورہ مائدہ اور سورہ انعام کی تفسیر ہے۔

" " جلد پنجم ۴۲۶ صفحات سائز کلاں پر مشتمل ہے اس میں سورہ اعراف سورہ انفال اور سورہ توبہ کی تفسیر ہے۔

" " جلد ششم سائز کلاں ۴۱۴ صفحات پر مشتمل ہے سورہ یونس تا سورہ حجر کی تفسیر ہے۔

حضرت کاندھلوی نے اپنی تفسیر میں خود ترجمہ اپنی طرف سے نہیں کیا۔ بلکہ حضرت مولینا شاہ عبدالقادرؒ خلف الرشید حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ جو اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے نقل کر دیا ہے۔

حضرت مولینا کاندھلوی کی تفسیر متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر کا جوہر و لباب ہے، حقائق و معارف قرآن حکیم میں یہ تفسیر خصوصاً امام رازی کی تفسیر کبیر علامہ ابو حیان کی تفسیر البحر المحیط، علامہ سید محمود آلوسی کی روح المعانی اور قاضی ابوبکر ابن العربی کی تفسیر احکام القرآن اور تفسیر ابو السعود کا انتخاب ہے، حقائق اسرار اور باطنی لطائف میں ملا مخدوم مہائمی کی تفسیر قاضی بیضاوی کی تلخیص ہے۔ بیان احکام میں احکام القرآن جصاص اور تفسیر مظہری مولینا ثناء اللہ پانی پتی اس کی بنیاد ہے۔ تحقیق مفردات میں امام راغب کی مفردات اس کا اہم ترین ماخذ ہے جگہ جگہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز نور اللہ مرقدہ کے خصوصی علوم و معارف اس تفسیر میں شامل فرمائے ہیں یہ تفسیر ابھی زیر تالیف تھی کہ ۱۰ رجب المرجب ۱۳۹۴ھ کو حضرت کا وصال ہو گیا، حضرت نے سورہ فاطر تک مکمل تفسیر تالیف فرمائی ہے۔

اور پورے قرآن حکیم کے مشکل اور اہم مقامات کی مکمل تفسیر اپنے قلم مبارک سے تحریر فرما چکے ہیں۔

چھٹا حصہ حضرت کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادہ اور جانشین حضرت مولانا محمد مالک شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نے شائع کیا ہے امید ہے کہ دوسرے حصص بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو جائیں گے، تفسیر میں جو کمی رہ گئی ہے وہ بھی انشاءاللہ حضرت حافظ مولینا محمد مالک صاحب باحسن وجوہ پوری کر دیں گے، اور یہاں پھر وہ مصرعہ لکھتا ہوں:

ع اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

آپ کے صاحبزادہ حضرت مولینا محمد مالک صاحب حضرت کے جانشین اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں وہ بالکل حضرت کے ثانی نظر آتے ہیں الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔

حضرت کاندھلوی کی اس تفسیر معارف القرآن کے علاوہ جامع مسجد نیلا گنبد میں ہر جمعہ کو کسی ایک آیت کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور تقریباً بیس سال

تک حضرت کے مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری رہا ہے اس درس قرآن سے بلا مبالغہ ہزاروں لوگوں نے استفادہ کیا ہے۔ لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں گوجرانوالہ، گکھڑ، شیخوپورہ وغیرہ شہروں سے حضرت کا وعظ یا درس قرآن سننے کے لئے آتے تھے، افسوس کہ جامع مسجد نیلا گنبد کا سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا۔ اب جو امیں خطیب ہیں وہ بھی حضرت کے تلمیذ ہیں حضرت الحاج مولینا محمد مالک صاحب کاندھلوی نے درس قرآن کا سلسلہ عکس جمیل جامع مسجد سمن آباد میں شروع کیا ہے روزانہ مغرب کے بعد درس دیتے ہیں، ماشاء اللہ سمن آباد کی لکھی پڑھی آبادی میں درس کی طرف اچھی خاصی رجوعات ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ لوگوں کو شرکت کرنے اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت مولینا کاندھلوی کا ایک مقالہ مفسر و مترجم بھی ہے جو شائع ہو چکا ہے اور آپ نے تفسیر بیضاوی کی شرح بھی تالیف فرمائی ہے اور غیر مطبوعہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے علماء اور مفسرین کے لئے یہ تالیف بڑی گرانقدر ہے۔

التحریر فی اصول التفسیر

حضرت مولینا محمد مالک شیخ الحدیث

جامعہ اشرفیہ لاہور

قرآن حکیم کی حقیقی عظمتوں اس کے مقاصد عالیہ اعجاز و احکام فصاحت بلاغت کو سمجھنے کے لئے اصول التفسیر کا مطالعہ ضروری ہے فاضل علام نے اس کتاب میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور الاتقان فی علوم القرآن شیخ جلال الدین سیوطی اور التبیان فی علوم القرآن للعلامۃ الجزائری، تفسیر ابن کثیر، روح المعانی اور کتب احادیث سے پوری طرح استفادہ کیا ہے فاضل مولف کو اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم و مغفور سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ حضرت عثمانی نے مولینا محمد مالک کو بخاری شریف پڑھانے کے لئے اپنے دولت کدہ پر بخاری شریف کا درس دینا شروع فرمایا تھا۔ فاضل مولف پر دونوں بزرگوں کا رنگ ہے اسی رنگ میں یہ کتاب التحریر فی اصول التفسیر رنگین ہے۔ کراچی یونیورسٹی اور حیدر آباد سندھ میں ایم اے اسلامیات، ایم اے عربی کے نصاب میں شامل ہے ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اصول التفسیر کے موضوع پر ایک بلند پایہ تالیف ہے۔ جس میں اصول و قواعد تفسیر نہایت تحقیق و جستجو اور تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ قرآن محل کراچی نے یہ کتاب شائع کی ہے۔

حضرت مولینا محمد مالک صاحب نے قرآن علوم پر ایک عظیم و ضخیم کتاب بھی تالیف فرمائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب جو مطالب قرآن پر نہایت جامع اور مفید تالیف ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ یہ کتاب مستطاب ناشران قرآن شائع کر رہے ہیں تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی، اس کا نام منازل العرفان فی علوم القرآن ہے۔

حضرت مولینا حفظ الرحمٰن

سیوہاروی مرحوم و مغفور

قصص القرآن ہر چہار جلد

حضرت مولینا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیت العلماء ہند کی روح رواں اور دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت اور رہنمائی اور حکومت وقت کے سامنے ان کے مطالبات پیش کرنے کا کام جو مرحوم نے کیا ہے وہ کسی اور کا حصہ نہیں۔

موصوف تحریر و تقریر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ حضرت انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے تھے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر تو تالیف نہیں کی ہے لیکن قرآن شریف میں جن انبیاءؑ کا ذکر ہے ان کے تفصیلی حالات و واقعات معتبر کتابوں سے اخذ و نقل کر کے تحریر کئے ہیں یہ کتاب چار

مضمون پر مشتمل ہے۔

قصص القرآن حصہ اول ۰۰۲ صفحات حضرت آدم علیہ السلام سے
حضرت ہارون علیہ السلام تک قصص و واقعات پر مشتمل ہے۔
قصص القرآن حصہ دوم صفحات ،
" " " سوم "
" " چہارم ۴۹۲ صفحات حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اور آنحضرت محمد مصطفیٰ خاتم النبیین رحمت للعالمین کے حالات پر مشتمل ہے قرآن حکیم کا تفصیل مطالعہ کرنے اور اسلامی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قصص القرآن ایک بہترین کتاب ہے جس میں رطب و یابس روایات وحکایات سے احتراز کیا گیا ہے مولینا سیوہاروی نے کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں، اسلام کا اقتصادی نظام بھی مولینا کی ایک اہم تالیف ہے یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور اور حکمت کی روشنی میں لکھی گئی ہے، اس سلسلہ میں ابھی اور کام کرنے کی ضرورت ہے مولینا سیوہاروی کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ اور ان کے خاندان سے جو روحانی نسبت اور تعلق تھا غالباً یہ اس ہی کا اثر ہے کہ انتقال کے بعد آپ کو حضرت شاہ صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے

شیخ المفسرین حضرت مولینا حسین علی صاحب مرحوم ومغفور

حضرت نہایت سادہ مزاج بزرگ تھے، اپنے ہاتھ سے کام کرتے مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار محسوس نہ فرماتے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا لباس پہنتے پنجاب کے اطراف غلط قسم کے لوگوں نے عوام الناس کے عقائد کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ عام آدمی بزرگوں کے مزاروں پر حاضر ہو کر شرعی حدود قائم نہیں رکھتا۔ بزرگوں سے عقیدت بہت جلد افراط کا شکار ہو کر عبادت تک پہنچ جاتی ہے۔ حضرتؒ نے ماحول کا پوری طرح جائزہ لے کر اپنے اکثر مواعظ اور اسباق میں توحید کو موضوع قرار دیا، توحید کے عنوان پر آپ نے عوام الناس کو بھی خطاب فرمایا، طلبا اور علما کو بھی متوجہ کیا۔ حضرت کا اوڑھنا بچھونا مسئلہ توحید تھا۔ حضرت مولینا قاضی شمس الدین صاحب مدظلہ جو آجکل گوجرانوالہ میں دینی خدمات میں مصروف ہیں۔ حضرت مولینا حسین علی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے ہیں۔ آپ نے قرآن شریف نصف آخر کا درس دارالعلوم دیوبند میں دیا تھا۔ احقر بھی درس میں شریک ہوتا تھا۔

حضرت کے تلامذہ میں مولینا غلام اللہ خاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔

حضرت کے ذمودات وارشادات کی روشنی میں آپ کے شاگرد رشید نے جواہر القرآن تالیف فرمائی ہے جو قابل مطالعہ تالیف ہے اور بلغۃ الحیران نے تفسیر القرآن بھی آپ کے ارشادات و فرمودات پر مشتمل ہے۔

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی
بانی دارالعلوم کورنگی کراچی

حضرت مفتی صاحب مدظلہ دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم اور محدث کے استاد تھے قیام پاکستان تحریک میں جدوجہد فرمائی اور دیوبند سے ہجرت کرنے کے بعد کراچی میں رہائش اختیار کر لی۔ علم وفضل میں حضرت کا مقام بہت بلند ہے۔ حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے معاصر اور خاص احباب میں تھے۔ آپس میں ایکدوسرے کے ساتھ جو محبت اور خلوص تھا وہ معاصرین میں مفقود ہے حضرت مفتی صاحب کے علم اور وسعت مطالعہ کی قدر حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ بھی کرتے تھے اور حضرت عثمانیؒ بھی۔

حضرت مولینا مفتی عزیز الرحمن علم وفضل اور تقویٰ وطہارت

کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، علامہ مولینا عثمانی کے بڑے بھائی تھے، مولینا عثمانی ان کے بوتے سیدھے کیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت انتقال کے وقت تک فتوے لکھتے رہے، مولینا عثمانی نے اس خیال سے شدت مرض وفات کے وقت کوئی بات بغیر سوچے سمجھے غلط نہ لکھی گئی، وہ تمام فتاویٰ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو دیکھنے کے لئے فرمایا۔

علامہ عثمانی کی نظروں میں مفتی محمد شفیع صاحب کی کیا عظمت تھی کہ حضرت مفتی عزیزالرحمن جیسے فرشتہ صفت انسان اور اپنے مربی اور استاد کے فتویٰ پر نظر ثانی کرنے کا اعزاز دیا جارہا ہے، حضرت مفتی صاحب نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف فرمائی ہیں خاص طور سے معارف القرآن جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے نہایت عظیم تالیف ہے۔ اسی نام سے حضرت مولینا کاندھلوی نے تفسیر تالیف فرمائی ہے اور اسی نام سے حضرت مفتی صاحب نے دونوں بزرگوں کی تفسیریں چھپنے کے بعد معلوم ہوا کہ نام میں توارد ہوگیا۔

حضرت مولینا کاندھلوی فرماتے تھے کہ نام دونوں تفاسیر کا ایک ہے تو کیا ہے ہم بھی تو ایک ہی ہیں۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ حضرت کاندھلوی کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو تکرار مضامین کے بجائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے آپس میں طے کر لیا ہے کہ آپ فلاں امور کی وضاحت کریں، میں فلاں امور کی تشریح کروں گا۔ قرآن فہمی کے لئے مولینا کاندھلوی کی تفسیر اہم و انفع ہے اور مسائل حاضرہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے مفتی صاحب کی تفسیر اکمل و انفع ہے۔ دراصل حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے معارف القرآن میں حضرت حکیم الامت کی تفسیر بیان القرآن کی تسہیل و تشریح فرمائی ہے، معارف القرآن کے مطالعہ سے بیان القرآن کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، سرسری نظر سے بیان القرآن میں جو جلال و جمال ہے وہ نظر نہیں آتا، حضرت مفتی صاحب کا یہ کمال و نوال ہے، آپ نے معارف القرآن میں اس کو واضح اور نمایاں کر کے دکھا دیا ہے۔

ایک مرتبہ ناچیز اور حضرت مولینا کاندھلوی کے چھوٹے صاحبزادے نے حضرت سے عرض کیا کہ بیان القرآن کے مقابلہ میں مولینا عثمانی کے فوائد زیادہ مفید ہیں، حضرت کاندھلوی نے فرمایا کہ تم لوگ حضرت عثمانی کے فوائد کو کچھ سمجھ لیتے ہو اور حضرت کے بیان القرآن کی رفعت تک تمہاری رسائی نہیں ہوئی، حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے اس کی رسائی کا ذریعہ بنا دیا ہے جس کا دل چاہے وہ بیان القرآن اور قرآن کی عظمت تک رسائی حاصل کر سکے۔

میرے دارالعلوم دیوبند کے ساتھیوں میں میاں مولینا تقدیم الحق صاحب کاکاخیل پشاور کے رہنے والے بھی شامل ہیں موصوف نے مولوی فاضل وغیرہ علوم شرقیہ کے امتحان دینے کے بعد ایم اے اور دوسرے امتحانات میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور آجکل آپ گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں پرنسپل ہیں آپ نے معارف القرآن کے متعلق بتایا کہ میں آجکل اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اس تفسیر کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ دور حاضر کی سب سے بہتر اور جامع تفسیر ہے اور اس تفسیر سے حکیم الامت مولینا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کی عظمت اور رفعت دلنشیں ہو جاتی ہے۔ آپ نے کہا کہ میں اس تفسیر کو روح المعانی اور تفسیر مظہری یا تفسیر عزیزی کسی طرح کم درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں بلکہ یہ تفسیر ان تفاسیر سے کچھ زیادہ ہی نافع اور جامع ہے۔

جلد اول سائز کلاں ۰۰۰ صفحات، جلد دوم ۷۰۸ صفحات جلد سوم ۷۳۰ صفحات، جلد چہارم ۷۸۰، جلد پنجم ۶۵۲ صفحات جلد ششم ۵۷۰ صفحات، جلد ہفتم ۸۱۶ صفحات جلد ہشتم ۸۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں۔ کتابت و طباعت معیاری۔

کاغذ معیاری اور خوبصورت ہے۔

(۱) ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ جو اصل میں حضرت شاہ عبد القادر قدس اللہ سرہ کا ترجمہ ہے اور حضرت شیخ الہندؒ نے اسمیں تسہیل فرمائی ہے نقل کیا گیا ہے۔

(۲) خلاصہ تفسیر کے تحت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بیان القرآن کے شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کو پورا کا پورا لے لیا گیا ہے البتہ اس خلاصہ میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی ہے۔

(۳) حضرت تھانوی نے اس خلاصہ تفسیر میں ترجمہ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے اور تفسیری زیادت کو بغیر خط کے قوسین کے درمیان لکھا ہے اس طرح تفسیر میں حکیم الامت کا پورا ترجمہ اور ضروری تفسیر بھی آگئی اور دو مستند تراجم مستقل سامنے آگئے۔

(۴) معارف ومسائل کے عنوان سے حضرت مفتی صاحب نے عصر حاضر کی بہترین اور نہایت مفید بلکہ شاہکار تفسیر تالیف فرمائی ہے حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ احقر کی صرف اردو عبارت ہے، مضامین سب علماء سلف کی تفاسیر سے لئے گئے ہیں جن کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں یہ معارف ومسائل اس تفسیر کی جان ہیں، اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے فیوض وبرکات سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔ معارف ومسائل کے تحت حضرت نے بے شمار عصری مسائل پر عالمانہ اور محققانہ بحث فرمائی ہے۔

(۵) حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس تفسیر میں حل لغات اور فن بلاغت کے نکات اور اختلاف قرأت جو عالموں کے لئے مفید ہے لیکن عوام کے لئے تفسیر سمجھنے میں دشواری کا باعث ہو جاتے ہیں اس لئے صرف قول راجح کو نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر ہم نے قرآن کو آسان کر دیا نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔ اس لئے اس تفسیر میں عوام الناس کی سہولت اور ان کو قرآن حکیم سے ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے جس قدر ممکن ہوا ہے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۶) مستند اور معتبر تفاسیر سے ان مضامین کو نقل کیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور محبت پیدا کرنے کا باعث ہوں اللہ تعالیٰ کی محبت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیروی کا شوق پیدا کریں۔

(۷) اس زمانہ کے مشینی دور نے جو نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، سلف صالحین کے ارشادات کی روشنی میں قرآن حکیم کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے بلکہ بعض علماء عصر سے مشورے بھی کئے ہیں اور سلف کے طریقے پر قائم رہتے ہوئے ان مسائل کا حل تلاش کیا ہے جنہیں الحمد للہ بڑی کامیابی ہوئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ملحدانہ خیالات شکوک وشبہات کے ازالہ میں بھی پوری اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو قبول نہیں کیا گیا اور نہ ہی جدید معترضین سے ڈر کر اسلامی مسائل کی تاویلیں کی گئی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی اس تفسیر کے متعلق فرماتے ہیں

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کے جو اس زمانہ میں بے نظیر متوسط تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمون قرآن سمجھنا دشوار نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو پھر خداداد علم وذکاوت اور تقویٰ وطہارت کی برکت سے اقوال مختلفہ میں ایک کو ترجیح دیکر لکھتے جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر یہ تفسیر حضرت نے اہل علم کے لئے انہی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانے کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات

سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کے لئے اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے مضامین عجیبہ کو آج کل کی آسان زبان میں لکھا جائے۔

قضاء و قدر کی طرف سے اس تفسیر کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر نے حضرت مفتی صاحب سے معارف قرآن کا سلسلہ جاری کرنے کی خواہش کا اظہار کیا حضرت مفتی صاحب نے محض لوجہ اللہ یہ خدمت قبول فرمائی اور ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک یہ سلسلہ معارف قرآن جاری رہا۔ اس کے متعلق محکمہ نے اپنی پالیسی کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ لیکن اس دوران جو اس سلسلہ سے مستفیض ہوئے پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں مثلاً افریقہ میں اس سلسلہ کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے تبلیغی مجالس میں بار بار سنانے کا پروگرام جاری ہوا اور سب طرف سے اس تفسیر کی تدوین اور اشاعت کا تقاضا شروع ہوا بہر حال اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب سے یہ کام لینا تھا اور یقیناً مفتی صاحب اس کام کے لئے نہایت موزوں اور منتخب شخصیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انکو قرآن حکیم کی مکمل تفسیر لکھنے کی سعادت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب بار بار یہی فرماتے ہیں کہ میرا اس تفسیر میں کچھ نہیں ہے۔ سب بزرگوں کا ہی ہے۔ میں نے بزرگوں کی تفاسیر کو آسان کر کے پیش کیا ہے۔

آج کل مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب بر سر جماعت اسلامی کی بہت شہرت ہے لیکن چند اہل علم دوستوں نے جو علوم عربیہ عقلیہ ونقلیہ کے علاوہ علوم جدیدہ سے واقف اور انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے دونوں تفاسیر کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کا یہ بیان ہے کہ معارف القرآن مولانا مودودی کی تفسیر کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ وارفع ہے اور مسلک حقہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے مطابق ہے۔ ایک خاص بات حضرت مفتی صاحب کی تفسیر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مفتی صاحب عاجزی اور انکساری میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں اور اپنے متعلق یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ کوئی تفسیر تصنیف کریں۔ جیسا کہ حضرت مفتی صاحب کی عبارت نقل کی گئی ہے لیکن مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی اپنی رائے اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ سلف صالحین کی رائے سے ہماری رائے کچھ کم نہیں ہے اور اکثر ایسے مواقع پر ان سے لغزش ہوگئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں جو عاجزی انکساری اور تواضع پائی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت شیخ الہند کی عبارت نقل کی گئی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن کریم کا نیا ترجمہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے کہ صرف نام کے لئے کوئی کام کرنا بے سود ہے بالآخر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس اللہ سرہ کے ترجمہ کو آسان کرنا منظور فرمایا۔ حضرت شیخ الہند نے اس ترجمہ کا کچھ حاشیہ لکھ دیا ہے۔ اس میں علامہ عثمانی نے اضافہ کرنا گستاخی سمجھا۔ اور کسی ترمیم واضافہ سے احتراز کیا اکابر کا یہ ادب واحترام جو ان بزرگوں میں تھا وہ دوسروں میں ناپید ہے

حضرت مفتی صاحب کے معارف القرآن حصہ اول کی طباعت دوم میں ترمیم واضافہ کے علاوہ ایک مقدمہ جو طویل مقالہ (علوم قرآن) کا خلاصہ ہے اور بڑے سائز کے تقریباً ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدرس دارالعلوم کراچی نے تحریر کیا ہے۔ علوم قرآن کے نام سے مقالہ علیحدہ شائع ہو چکا ہے۔

مفکر اسلام قائد حریت حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ

وصال ۱۔ رمضان ۱۳۶۳ھ

حضرت استاذی مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے۔ جذبہ آزادی اور تحریک حریت کی روح رواں ہونے کی وجہ سے قائد حریت کے مصداق تھے۔ آپ نے حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ ولی اللہ اعلی اللہ مقامہ کی کتابوں کا نہایت غائر مطالعہ کیا اور حضرت شاہ صاحب کی بیان فرمودہ حکمت اور دعوت انقلاب یا اسلامی انقلاب کے خود داعی و مبلغ کی حیثیت سے کام کیا۔

حضرت مولانا سندھیؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں پر خاص تحقیق و ریسرچ فرمائی اور دوسرے علماء کو تحقیق کی دعوت دی۔

حضرت مولانا سندھیؒ نے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے بکھرے ہوئے موتی جمع کیے اور ان کو مرتب اور مزین کر کے پیش کیا۔

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات پر عمل کیا جاتا۔ تو کم از کم ہند میں ایسی نظریاتی حکومت وجود میں آجاتی جو ساری دنیا کی قائد بن جاتی۔ نہ کارل مارکس اور اس کے نظریہ کو کوئی جانتا نہ سوشلزم اور کمیونزم کا وجود ہوتا۔ اسلام کی فطری اور حکیمانہ تعلیم میں وہ سب چیزیں موجود ہیں۔ جن کی دنیا کو ضرورت ہے اور جن کے ذریعے دنیا کے پیچیدہ مسائل کا صحیح حل کیا جا سکتا ہے چونکہ آپ نے کارل مارکس کی پیدائش سے ایک صدی قبل بین الاقوامی لائحہ عمل پیش کیا ہے اس سلسلہ میں فلسفہ "عمرانیات و معاشرت" کا مطالعہ کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب نے صرف نماز اور روزہ کے مسائل بیان نہیں کیے ہیں بلکہ اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جس میں روحانیت کے علاوہ مادیات پر بھی پوری بحث کی گئی ہے۔ اور تمام اقتصادی، معاشی، معاشرتی، تجارتی، اجیری، مالیاتی اور نظام اراضی ملکیت و زراعت وغیرہ مسائل پر حکیمانہ روشنی ڈالی ہے۔ اگر حضرت شاہ صاحب کو اپنی حکمت اسلام اور دعوت انقلاب کے لیے ابلاغ کے ذرائع حاصل ہو جاتے اور لوگ ان کو قبول کر کے ان پر عمل پیرا ہو جاتے تو آج دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

سوشلزم اور کمیونزم، عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں عالم وجود میں آتے ہیں اور ناشناس خدا لوگوں بلکہ مذہب کے باغیوں اور دشمنوں کے ذہن اور فکر سے نکلی ہوئی چیز کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رب العالمین اور احکم الحاکمین ہے اور تمام کائنات میں اس کا قانون اور دستور جاری و ساری ہے کوئی چیز قانون قدرت اور آئین فطرت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتی۔ سورج کے طلوع و غروب، چاند کے نکلنے بڑھنے پیدا ہونے اور گھٹنے کا جو دستور حق تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ جو اس میں فرق کرے۔

انسان بہت سی چیزوں میں مجبور محض ہے۔ مثلاً پیدا ہونا، مرنا، کھانا کھانے کے بعد اس کا ہضم ہونا، خون اور فضلہ بننا یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسان کو ان کی کوئی خبر نہیں کس طرح انجام پاتے ہیں۔ لیکن کچھ امور اختیاری ہیں جو انسان کے کسب و اختیار میں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس سرزمین پر جہاں ہم بستے ہیں اور بستے ہیں بلکہ تمام جہان میں اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون فطرت، اور آئین حکمت جاری و ساری کیا جائے یہی وہ بار امانت ہے جو حضرت انسان نے اٹھایا اور خلافت ربانی کا مستحق ہوا۔

حضرت شاہ صاحب کی دعوت کو سمجھانے کے لیے حضرت استاذی مولانا سندھیؒ نے اپنی پوری زندگی ختم کر دی۔ اصل اللہ متعامہ حجۃ اللہ البالغہ۔

حضرت نے قرآن حکیم کی کئی سورتوں کی تفسیر تالیف فرمائی ہے۔ سورۂ معوذتین اور سورۂ اخلاص کی تفسیر قرآنی فکر انقلاب کے عنوان سے اور سورۂ مزمل و سورۂ مدثر کی تفسیر قرآنی دستور انقلاب کے نام سے اور سورۂ قتال کی تفسیر جنگ انقلاب سے موسوم ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ کلاسوں کے طلباء کو دارالحدیث میں خطاب فرمایا اور سورۂ کوثر کی عجیب و غریب حکیمانہ تفسیر بیان فرمائی: ناچیز نے یہ تفسیر قلم بند کر کے شائع کر دی ہے، طبع دوم ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ تفسیر سورۂ نبا، تمدن عرب، قرآن حکیم کا مقدمہ اور تفسیر سورہ فاتحہ، قرآن کریم کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔ حضرت مولانا سندھی کو قرآن حکیم سے بہت زیادہ شغف تھا اور شاہ ولی اللہ کی حکمت کے بڑے مفسر اور مبلغ ہیں۔ آپ نے قرآن شریف کی انقلابی تفسیر تحریر اور تقریر کے

ذریعہ بیان فرمائی ہے۔ دنیا میں آپ کے بعض شاگردوں نے آپ سے تفسیر پڑھتے ہوئے آپ کے ارشادات قلمبند کیے تھے۔ جو جامعہ ملیہ کی لائبریری میں موجود ہیں۔

علامہ حسین جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی حیدر آباد اپنی کتاب شاہ ولی اللہ کی تعلیم میں تمہید کے تحت لکھتے ہیں

۱۹۳۹ء میں پہلی بار حج کے لیے گیا تھا، مکہ معظمہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے ملاقات ہوئی مل کر بے حد خوش ہوتے۔ اور مجھے اپنی رہائش گاہ پر لے گئے جہاں تفسیر فتح الرحمٰن کھول کر بعض مقامات پر شاہ ولی اللہ کی تشریح دکھائی۔ بعد میں ان کی تعلیم کی جانب رغبت دلاتے رہے (ص الف)

علامہ حسین جلبانی کی یہ کتاب شاہ ولی اللہ کی تعلیم پر نہایت جامع اور مفید کتاب ہے شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ہے

حضرت شاہ ولی اللہ جس حقیقت کی جانب راہ نمائی کرانا چاہتے ہیں اس کا لب لباب یہ ہے کہ دین حنیف (اسلام) ارتفاق رابع یعنی بین الاقوامی حکومت کی اقامت کے لیے آیا ہے اس کا مکمل اظہار غلبہ صحیح معنیٰ میں صرف اسی وقت ہوگا، جب اس کے علاوہ تمام ادیان کو بیک دم مٹا دیا جائے گا اور ان کی ظاہری شان و شوکت کو کاری ضرب لگائی جائے گی ص ۲۰۷

حضرت مولانا سندھی نے ۱۹۳۰ء میں مولانا غلام رسول صاحب مہر مدیر انقلاب لاہور کو تحریر ۔ ۔ نوشت لکھ کر بھیجی اس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کو امام الحکمۃ اور مجتہد مستقل قرار دینے کے بعد لکھا کہ ہندوستان میں آنے کے بعد

میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا۔

پھر جمعیۃ العلمائے بنگال کے اجلاس میں خطبہ دیا۔ امام ولی اللہ دہلوی کی حدیث و فقہ میں جس قدر ضرورت ہے اس سے زیادہ ہم ان کی حکمت و فلسفہ و سیاست سمجھنے کے محتاج ہیں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ یورپ کا فلسفہ سمجھنے کے لیے اور انقلابی سیاست پر قابلیت کے ساتھ غور کرنے کے لیے مذہبی خودی قائم رکھنے کے لیے امام کی کتابیں بے حد ضروری ہیں اس کا مقابلہ کوئی دوسرا مصنف نہیں کر سکتا۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ۱۹۶۲ء

حضرت مولانا سندھی کے تربیت یافتہ اور دارالعلوم دیوبند کے ابنائے قدیم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے آپ کے مواعظ حسنہ نے لاہور میں دینی شعور کتاب و سنت سے محبت اور بدعت سے نفرت پیدا کرنے میں بہت زیادہ کام کیا ہے۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تالیف فرمائی ہیں اور آپ کی زیر نگرانی رسالہ خدام الدین برسوں سے اشاعت تبلیغ اسلام کا کام کر رہا ہے۔ حضرت لاہوری نے قرآن حکیم کا ترجمہ اور اس کی مختصر تفسیر بھی تالیف فرمائی ہے۔ اشاعت اول ۱۹۲۸ء آپ کی تفسیر اور ترجمہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت سندھیؒ کا حکیمانہ انداز بھی ہے اور حضرت شیخ الہندؒ کی سادگی کتاب و سنت کی دل میں عقیدت اور محبت پیدا کرنے والی باتیں بھی موجود ہیں حضرت نے فارغ التحصیل طلباء کو قرآنی علوم کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ایک خاص کورس مقرر فرمایا تھا اور بے شمار طلباء اس میں شریک ہو کر استفادہ کرتے تھے تھوڑی سی مدت میں قرآنی علوم پر عبور تو ممکن نہیں ہے لیکن کلام سے ایک مناسبت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور قرآن حکیم کے سمجھنے کا ذوق و شوق پیدا ہو جاتا ہے حضرت کے ترجمہ اور تفسیر کا نیا ایڈیشن ۱۳۹۱ھ میں اہتمام سے شائع ہوا ہے حضرت شیخ التفسیر مولانا عبید اللہ سندھی کے فرزند نسبتی اور روحانی فرزند تھے۔ آپ کی تحریر و تقریر اور تفسیر میں حضرت علامہ سندھی کا رنگ پایا جاتا ہے حضرت مولانا سندھی کا غیر مطبوعہ کام جو قرآن شریف کی تفسیر اور تحقیق میں کیا ہے۔ وہ بیت الحکمت لاہور کے مالکان یا مولانا بشیر احمد لدھیانوی مرحوم یا دالبستگان ولی اللہ سوسائٹی میں سے کسی کے پاس ہوگا۔ ضرورت ہے وہ تمام تحقیقی مواد شائع کر دیا جائے۔

خاص طور پر آج جیسے حالات ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور حکمت پر تحقیق کرنے کی دعوت دی ہے علماء کرام کو اس کی طرف خاص توجہ کرنے اور اس علم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

درس قرآن

حضرت لاہوری کو درس قرآن کے سلسلہ میں جو شغف تھا اور جس قدر پابندی حضرت درس کے متعلق کرتے تھے وہ حیرت انگیز اور نصیحت آمیز ہے۔ حضرت اگر لاہور میں موجود نہ ہوتے تو درس کا ناغہ ہو جاتا ورنہ کسی وجہ سے آپ ہرگز درس کا ناغہ نہ فرماتے۔

ایک بار حضرت کی ایک بچی بیمار تھی۔ حضرت درس قرآن میں مصروف تھے۔ گھر سے پرچہ آیا کہ لڑکی کی طبیعت سخت علیل ہے۔ آپ نے پرچہ پڑھا اور درس جاری رکھا، دوسرا پرچہ آیا کہ کرب اور بے چینی بڑھ رہی ہے، عالم نزع طاری ہو گیا ہے۔ آپ نے پرچہ پڑھا اور درس جاری رکھا بالآخر تیسرا پرچہ آیا کہ لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ نے اناللہ و انا الیہ راجعون کہا۔ اور درس کو دستور کے مطابق ختم کیا اور درس کے بعد دعا کی اور فرمایا کہ بچی اللہ تعالیٰ کی امانت تھی، اس نے اپنی امانت واپس لے لی ہے، میں اسی ہی کا کلام اور فرمان آپ تک پہنچا رہا تھا۔ اس لیے درس کا درمیان سے بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

پنجاب میں دورۂ تفسیر یا دورۂ درس قرآن کا سلسلہ حضرت لاہوریؒ نے شروع فرمایا تھا آج یہ درس کا سلسلہ ملک کے طول و عرض میں جاری ہے اور سالانہ ہزاروں طلباء قرآن حکیم کے درس میں شریک ہو کر مستفیض ہو رہے ہیں۔

اہلیہ صاحبہ حضرت میاں مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسیر مالٹا

حضرت مولانا عزیر گل حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگرد ہیں اور آپ نے جہاد حریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت شیخ الہند کی معیت میں گرفتار ہوتے، جیل گئے مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ آپ نے ایک جرمن عورت کو مسلمان کر لیا تھا اور اس کو قرآن حکیم کی تفسیر خود پڑھاتے تھے، یہ عورت بڑی محبت والی عورت تھی، اس نے حضرت سے قرآن کریم کی تفسیر پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔

مولانا میاں تنویر الحق صاحب کاکا خیل فاضل دیوبند ایم اے پرنسپل گورنمنٹ کالج کرک اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ فیروز سنز لاہور نے لندن سے شائع کیا تھا، پاکستان میں یہ ترجمہ نایاب ہے۔ مکتوب ۱۰.۱.۷۷

جناب علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم

علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم دنیائے اسلام کے مشہور علمی انسان تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد روس میں آپ کی بہت عزت کی جاتی تھی لیکن اسٹالن کے دور میں آپ روس سے جلاوطن کیے گئے پھر ترکی اور ہندوپاک میں بھی رہے۔

علامہ دراصل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد خاص ہیں۔ بلکہ آپ نے علامہ سندھی سے ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء میں مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھوائی تھی یہ امالی تفسیر القرآن عربی زبان میں ہے، اس کا نام الہام الرحمان ہے۔

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب قاسمی فاضل دیوبند نے اس تفسیر کو از سر نو مرتب کیا ہے اور ان امالی کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ مولانا ابو العلا محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم نے کیا ہے، علامہ جار اللہ کی تصانیف فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں ہیں اور ان کی تالیفات کو اسلامی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور اعلیٰ علمی حلقوں میں ان کا بلند مقام سمجھا جاتا ہے[۱] (بحوالہ مولانا سندھی کے امالی تفسیر القرآن الرحیم حیدر آباد نومبر ۶۴ء)

---

[۱] حضرت سندھیؒ کے بعض متوسلین کی تحریروں میں اہل حق کے مسلک کے خلاف ایسی چیزیں آگئی ہیں جن کو دارالعلوم دیوبند کی طرف نسبت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اکابر دارالعلوم دیوبند ان سے برأت کا اظہار کر چکے ہیں۔ الرشید۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری

دارالعلوم کراچی

حضرت مولانا بنوری مدظلہ، حضرت فخر المحدثین مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہٗ کے شاگرد خاص اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے مرکزی امیر ہیں،

آپ کی ایک کتاب یتیمۃ القرآن فی مشکلات القرآن دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

جناب مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی

آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر ۳۰ جلد میں تالیف کی ہے۔ مرتب سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر لکھتے ہیں، اس تفسیر کو حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی نے پڑھا ہے اور کئی جگہ مفید حواشی کا اضافہ فرمایا ہے، الکتب خانہ امدادیہ دیوبند سے مولوی محمد اسحٰق صاحب نے اس کو شائع کیا ہے۔

مولانا فضل ودود و مولانا گل رحیم اسماری فاضل دیوبند

مولانا فضل ودود نے ۱۵ پاروں کی تفسیر اور ترجمہ پشتو زبان میں کیا ہے اور ۱۵ پاروں کی تفسیر مولانا گل رحیم اسماری نے کی ہے، اس کی تفسیر میں خازن معالم التنزیل جمل روح البیان وغیرہ یہ ترجمہ دوسرے تراجم سے بہتر ہے اور مستند ہے اور اس تفسیر و ترجمہ کے دونوں مصنفین خود اعلیٰ درجہ کے خوش نویس دونوں حضرات عالم و فاضل ہونے کے ساتھ فن کتابت کو بطور پیشہ اختیار کیے ہوئے اسلاف میں تو ایسی مثالیں بہت ہیں لیکن اس دور میں یہ نوادرات سے ہے۔

جناب مولانا سید ممتاز علی دیوبندی بانی دارالاشاعت پنجاب لاہور

آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کے علوم کی فہرس تفصیل البیان فی علوم القرآن برسوں محنت و مشقت کر کے ترتیب دیا اور شائع کیا تھا، گیلانی پریس سے ۱۳۴۹ھ میں شائع ہوا ہے، ترجمہ ابھی نامکمل تھا کہ مؤلف کا انتقال ہو گیا، باقی مولانا نجم الدین صاحب سیوہاروی نے کیا ہے، یہ کتاب سہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور قرآنی انڈکس ہونے کے اعتبار سے بہت ہی کارآمد اور مفید ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس کتاب سے مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے علماء بھی استفادہ کرتے رہے ہیں۔

مؤلف نے حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے درخواست کی تھی کہ اس کتاب میں جو خامیاں اور نقائص نظر آئیں ان کی اصلاح فرمائیں تاکہ آئندہ طباعت میں ان کی اصلاح کی جائے، حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، غالباً مؤلف کی وفات کی وجہ سے نئے ایڈیشن کی طباعت اور اس کی اصلاح کا موقعہ نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ ایسی مفید اور جامع تالیف نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی جائے موصوف کے وارثوں میں سے یا کوئی پبلشر صاحب یا محکمہ اوقاف اس مفید کام کی طرف توجہ کرے تو اہل علم حضرات کو قرآنی حوالوں کی تلاش میں بہت سہولت ہو جائے گی۔

صاحبزادہ جناب مولانا سید محمد انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیوبند

مولانا انظر شاہ صاحب حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہٗ کے صاحبزادے ہیں، آپ نے مشہور تفسیر مدارک التنزیل از عبداللہ نسفی ۶۸۶ھ کا اردو ترجمہ کیا ہے جو مکتبہ خضر راہ دیوبند سے شائع ہوا ہے مترجم نے حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔

نیز معلوم ہوا ہے کہ فاضل مؤلف نے تفسیر حقانی پر بھی حاشیہ

لکھا ہے اور تفسیر مدارک التنزیل کا ترجمہ اور حواشی سے قبل مقدمۃ القرآن تالیف کی ہے، جس میں قرآن فہمی کے لیے بنیادی ضروریات کا بیان درج ہے، یہ مستقل کتاب کے طور پر علیحدہ شائع ہوا ہے۔

مترجم لکھتے ہیں کہ فٹ نوٹس میں ان تمام مقامات کی مکمل تشریح بھی کر دی، جن کی تفسیر میں اختصار سے کام لے کر صاحب مدارک نے مختصر کلام کیا تھا یا جہاں کوئی ضعیف قول پیش کیا گیا اور صحیح اور درست قول سامنے نہ آ سکیں، ان حواشی میں متعدد مشہور تفاسیر کے حوالے بھی ملیں گے صاحب تفسیر نے فقہی جزئیات پر زیادہ توجہ نہیں فرمائی تھی مترجم نے حواشی میں احکام القرآن للجصاص سے اور ابن عربی سے وقتاً بر موقع اس طرح کے احکام کی تعیین و نشاندہی کی ہے۔

اس سے قبل فاضل مترجم تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔

فاضل مترجم کا یہ علمی اور قرآنی کام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے، امید ہے کہ آپ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے والد ماجد حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ،

جناب مولنا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی فاضل دیوبند

سابق استاذ تفسیر جامعہ ملیہ دہلی

کے زیر نگرانی ان کے رفقاء اور معاونین میں جناب حافظ نذر احمد صاحب، حافظ مرغوب احمد صاحب، حاجی عبدالواحد صاحب شامل ہیں ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے تحت قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر شائع ہوئی ہے۔ جس کا نام درس قرآن مع ترجمہ ہے، ہر آیت کے دو ترجمے ہیں، ایک لفظی ترجمہ ہے دوسرا محاورے کے مطابق ہے، ہر آیت کی تفسیر نیچے تحریر کر دی گئی ہے، اکثر مساجد میں جو آج کل درس مروج ہے وہ اس ہی درس قرآن مع ترجمہ سے ماخوذ ہے۔

خواجہ صاحب نے تفسیر سورہ بقرہ خلافۃ الکبریٰ کے نام سے اور بیان تفسیر سورہ آل عمران الصراط المستقیم انفال و توبہ کی تفسیر عبرت سورہ یوسف کی تفسیر براہ، سورہ نور کی تفسیر سبیل الرشاد، سورہ حجرات کی تفسیر ذکریٰ، تفسیر پارہ عم سبل السلام تفسیر سورہ مجادلہ تا تحریم تالیف فرمائی ہیں۔ یہ تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کے متفرق حصص ہیں،

جناب پروفیسر مولنا حکیم عبدالصمد صارم صاحب ازہری فاضل دیوبند

آپ کثیر التالیف ہیں، انداز بیان محققانہ اور عالمانہ ہے تفسیر میں آپ نے الدر المکنون فی تفسیر الماعون تالیف فرمائی ہے۔

اور آپ کی ایک تصنیف تاریخ القرآن ہے، یہ کتاب قرآن حکیم کی تاریخ پر نہایت مستند اور معیاری تصنیف ہے، علماء مصر اور بلاد شام وغیرہ نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے، اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیئے ہیں، یورپ کے مصنفین نے بھی اس کے حوالے نقل کیے ہیں، مولانا نے قیام مصر کے زمانہ میں یہ کتاب تالیف کی ہے اور اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولنا نے ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے کہ زمانہ میں سر سید احمد خان کی تالیفات انکار معجزات وغیرہ کے مضامین پڑھنے کی وجہ سے میرے دل میں قرآن کی وہ عظمت باقی نہ رہی جو مسلمان کے دل میں ہونی چاہیئے اور مجھ سے ایک بہت بڑی گستاخی صادر ہوئی، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے اس گستاخی کرنے پر فوراً سزا نہ دی عتاب اور عذاب نازل نہ ہوا بلکہ میرے پیر میں تکلیف رہنے لگی جو کسی علاج اور پرہیز سے ٹھیک نہ ہوئی، بالآخر میرے خیالات درست ہوئے قرآن سے محبت اور اس کی عظمت دل میں لوٹ آئی اور میں نے سچے دل سے قرآن شریف کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کیا۔ اور میں اس ہی روز سے بالکل ہی تندرست ہو گیا۔

حضرت مولانا حکیم مولوی علاؤ الدین صدیقی پھلتی اعلی اللہ مقامہ

حضرت مولانا ممدوح، قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر جو حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا مولد اور حضرت مولانا حکیم شاہ اہل اللہؒ اور حضرت شاہ محمد عاشق خلیفہ اعظم و جانشین حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مولد و مرقد ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے جد مادری حضرت شاہ محمد اور بہت سے دوسرے اکابر کا مسکن و مدفن ہے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے لیے عملی کام کرنے کا مقام آغاز ہے، اس متبرک قصبہ میں ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت مولانا حکیم شاہ اہل اللہؒ اور حضرت شاہ محمد عاشقؒ کے جانشین کی حیثیت سے قصبہ پھلت میں نصف صدی سے زیادہ مدت تک قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ راقم الحروف ناچیز انیس احمد صدیقی حضرت سے قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر اور مشکوٰۃ شریف پڑھی، اس کے بعد دار العلوم دیوبند میں جا کر تکمیل کی اور میرے علاوہ بہت سے طلباء نے اسی طرح حضرت سے علم قرآن اور حدیث حاصل کیا۔

آپ نے قرآن حکیم کی روشنی میں کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں ان کتابوں میں حضرت نے قرآن حکیم کی آیات جمع فرمائی ہیں ترجمہ و تفسیر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی نقل فرمائی ہے اور بہت مختصر الفاظ میں اپنی طرف سے وضاحت فرمائی ہے۔

حضرت مولانا موصوف نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ سے منہاج سنت کے مطابق بیعت کی تھی، مروجہ طریقہ کے مطابق آپ مرید نہیں ہوتے۔ حالات اس کے گواہ ہیں آپ مراد تھے ۲۱ صفر المظفر ۱۳۹۰ھ بروز یک شنبہ لاہور (صدیقی نگر) میں وصال ہوا حضرت نے عالم سکرات میں نماز صبح ادا کی اور آخری لفظ آپ کی زبان مبارک پر نماز کا آیا، اشاروں سے نماز ادا کر کے واصل حق ہو گئے۔

لے کر تو در عالم سکرات کردی بندگی   کردی ثابت کہ بہر بندگی است زندگی

انیس

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ الجامعہ جامعہ اشرفیہ لاہور نے نماز جنازہ پڑھائی، آپ کی تالیفات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ آیات محکمات، حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق راسخین فی العلم کے لیے ضروری ہے کہ آیات محکمات پر پوری طرح عمل کریں، جن کو قرآن نے ام الکتاب فرمایا ہے۔

۲۔ صفات المومنین۔ فی القرآن ترجمہ اور تشریح میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا اتباع کیا ہے

۳۔ صفات المتقین۔ " " " "

۴۔ صفات الذاکرین۔ " " " "

۵۔ صفات المستغفرین والتوابین " " " "

۶۔ صفات المسبحین مع آیات تسبیح " " " "

۷۔ صفات الخاشعین " " " "

۸۔ صفات المقربین " " " "

۹۔ صفات المتصدقین " " " "

۱۰۔ صفات اہل جنت " " " "

۱۱۔ صفات المجاہدین " " " "

۱۲۔ صفات الضالین المغضوبین یا اہل دوزخ کی صفات " " " "

۱۳۔ صفات المنافقین " " " "

وغیرہ وغیرہ

آپ کی سوانح حیات صدیق امت کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

حافظ الحدیث والقرآن حضرت مولانا عبداللہ صاحب درخواستی

صدر جمعیۃ العلماء اسلام، مدرسہ مخزن العلوم خان پور

آپ کے یہاں ہر سال قرآن حکیم کا دورہ تفسیر پڑھایا جاتا ہے درحقیقت یہ ایک منفرد دورہ تفسیر ہے جو مدارس عربیہ کے فاضل اور مستند طلباء کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

اس دورہ تفسیر میں قرآن حکیم کے علوم و معارف پر خاص زور دیا جاتا ہے اور قرآن کریم سے جو علوم حاصل کیے جاتے ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے، اور قرآن فہمی کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ حضرت درخواستی نے اگرچہ قرآن حکیم کی تفسیر تحریر نہیں فرمائی ہے لیکن آپ کے درس میں قرآن حکیم کے مفسر پیدا کیے جاتے ہیں۔

حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

حضرت سید صاحب اگرچہ ندوہ کے اکابر میں سے تھے لیکن حضرت تھانوی سے بیعت و نسبت کے بعد حضرت سید صاحب کا شمار بھی سلسلہ اشرفیہ میں کیا جاتے گا۔ آپ نے مشہور کتاب سیرۃ النبی تصنیف فرمائی ہے۔ اور ایک کتاب ارض قرآن تالیف فرمائی ہے، یہ کتاب قرآن شریف میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے حالات سمجھنے کے لیے نہایت مستند تالیف ہے، اس میں تاریخی، جغرافیائی اور دیگر امور پر بحث کی گئی ہے اور مستشرقین کے جوابات محققانہ اور عالمانہ انداز میں دیئے ہیں۔

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم

مولانا احمد سعید صاحب مرحوم ہندوستان کے بہترین مقررین اور واعظین میں سے تھے، آپ کے بہت سے مضامین مقالے اور کتابیں جنت کی کنجی، دوزخ کا کھٹکا وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

آپ نے قرآن کریم کی تفسیر "کشف الرحمٰن" کے نام سے تالیف فرمائی ہے جو بیان کی سلاست اور مضامین کی نفاست کے اعتبار سے بہت مقبول ہوئی ہے۔ یہ تفسیر دلی میں شائع ہوئی تھی کچھ لکھنے لاہور میں بھی کسی تاجر نے منگائے تھے۔ بلا تحقیق نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ یہ تفسیر آپ کی ۳۰ سال مطالعہ کا خلاصہ ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مقدمہ القرآن دیوبند تفسیر کے ابتداء میں درج ہے۔

آپ کی ایک تالیف "تفسیر فاتحۃ الکتاب" بھی .... سنہ ۱۳۵۵ھ میں دلی سے شائع ہوئی تھی۔

قرآن حکیم میں سورہ فاتحہ کے الفاظ جس جس جگہ آئے ہیں ان کو جمع کیا ہے اور ان کی تشریح سے تفسیر کی ہے۔ مولانا کے مضامین مختلف موضوعات پر مقالات مولانا احمد سعید کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جنت اور دوزخ کے عنوان پر آپ کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا، چونکہ جنت اور دوزخ کے عنوان بھی قرآنی عنوان ہیں اس لیے ان کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

خصوصیات

۱۔ تیں۔ نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ فاعل اور مفعول کی تمام ضمیروں کا ترجمہ بجائے اس نے اور اس پر اور اس کو کرنے کے ضمیر کا اصل مرجع ظاہر کر دیا ہے۔

۲۔ ترجمہ کی ترکیب عربی کی لفظی ترتیب کی رعایت سے نہیں کی بلکہ اردو ترکیب کی رعایت رکھی ہے مثلاً عربی میں جزا مقدم اور شرط موخر ہو تو ترجمہ میں شرط کو مقدم اور جزاء کو موخر کیا ہے۔

۳۔ اگر اس تفصیل کے باوجود بھی کسی لفظ کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو اس کو واضح کر دیا ہے اور یہ طریقہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے ترجمہ میں اختیار فرمایا ہے جیسے کہ سورہ ہود

میں رحمت سے آگے نبوت کا لفظ بڑھادیا ہے۔

۴۔ یعنی کا لفظ آیت کے ختم پر استعمال کیا ہے کہیں مجبوراً درمیان آیت بھی استعمال کیا ہے۔

۵۔ دراصل یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اردو تراجم کو مروجہ اردو زبان تبدیل کیا ہے تاکہ زبان آسان اور سلیس ہو جائے اور قرآن کا سمجھنا آسان ہو جاتے۔

۶۔ اس ترجمہ کے الفاظ یا تحقیقات کا مرجع پانچ بزرگ ہیں دو بزرگوں کا نام تو اس سے قبل آچکا ہے۔ تیسرے بزرگ ان دونوں بزرگوں کے والد ماجد حضرت حکیم الامت مجدد ملت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ ہیں اور چوتھے بزرگ حضرت استاذی و مرشدی مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اور پانچویں بزرگ حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب لکھتے ہیں، میں اپنے ان اکابر کی اردو کو محض صاف سلیس اور شستہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ قرآن کے مطالب عام طور پر مسلمان آسانی سے سمجھ سکیں۔

۷۔ اختلاف مطالب میں بخاطر کے اختلاف میں عام طور پر حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کو ترجیح دی ہے، پھر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو پھر حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے قول کو اختیار کیا ہے اور ان کے بعد رئیس المحققین راس المتاخرین حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی تحقیق کو اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں کہ جن میں اکابر اربعہ کے بجائے حضرت تھانوی کی تحقیق کو اختیار کیا ہے۔

۸۔ مولانا احمد سعید صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ جو لفظی ترجمہ ہے، وہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کا اردو جامہ ہے، اس لیے دونوں کے مختارات ایک ہیں، حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ ترجمہ میں بعض دوسری تحقیقات کو اختیار کیا ہے۔ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحب کا اتباع فرمایا ہے اس لیے دونوں ترجموں کا رجحان اور بیان بھی ایک ہے۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے روح المعانی پر زیادہ اعتماد فرمایا ہے اس لیے بہت سے مقامات پر حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی رائے کو چھوڑ دیا ہے۔ اور کہیں کہیں حضرت تھانوی نے اپنے ذوق کو اختیار کیا ہے۔

۹۔ قرآن مجید کا یہ ترجمہ خواہ تحت اللفظ نہ ہو لیکن قرآنی ترکیب اور قرآنی بندش کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے، پڑھنے والا محسوس کرے کہ وہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ کوئی اردو کی مستقل ادبی کتاب زیر مطالعہ نہیں ہے۔

۱۰۔ جہاں تک ممکن ہوا ہے بریکٹ میں عبارت لکھنے سے اجتناب کیا ہے کیونکہ بریکٹ کی عبارت کو قاری سمجھتا ہے کہ قرآن سے خارج ہے۔ اور پھر بغیر بریکٹ کے عبارت کو پڑھ کر قرآن سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور مطلب و معانی میں الجھ جاتا ہے یعنی بریکٹ سے مفہوم اور مطلب سلجھنے کی بجائے اور الجھ جاتا ہے۔

۱۱۔ بین السطور ترجمہ کے علاوہ ایک اور ترجمہ بھی اس کے ساتھ حاشیہ پر لکھا ہے، یہ ترجمہ بین السطور کے ترجمہ کا حاصل ترجمہ ہے، اس کے ساتھ آیات کی تفسیر اور تشریح تحریر کی گئی ہے۔

حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی مدظلہٗ دارالارشاد کیمبل پور

قاضی صاحب کو علوم قرآنی سے خاص شغف ہے، آپ کئی سال سے قرآن حکیم کا درس دے رہے ہیں اور الحمد للہ آپ کے درس سے بے شمار آدمی فائدہ حاصل کر رہے ہیں، آپ نے حال میں ایک کتاب "معارف القرآن" کے نام سے تالیف کی ہے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے معارف القرآن کا مطالعہ بہت فائدہ مند ہے۔ میرے سامنے اس کا طبع سوم ۱۹۹۰ء کا نسخہ ہے ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چند ابواب یہ ہیں: نزول قرآن، سورت اور آیت کی تشریح، علم قرآن، مکی اور مدنی آیات اور سورتیں، مقاصد قرآن حکیم (توحید) نبوت اور رسالت، ختم نبوت، قیامت، معاد، مبہمات قرآن، محاورات قرآن، معارف قرآنی میں تدبر، محاورات قرآن، الفاظ قرآن باعتبار معنی و مراد تفسیر بالرائے پر تبصرہ کے عنوان سے جو مضمون تحریر ہے وہ بھی بہت مفید ہے سر سید احمد خاں بانی یونیورسٹی علی گڑھ کے متعلق سر سید احمد خاں کے احباب کی آراء قابل ملاحظہ ہیں۔

آپ قرآن کریم کا جو درس دیتے ہیں، اس کو قلم بند کر کے رسالہ الارشاد میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آپ تحریر و تقریر کے ذریعہ قرآن کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

آپ نے "تعلیم القرآن" کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے، سورہ بقرہ سورہ آل عمران اور سورہ نساء تک شائع ہو چکی ہے۔ باقی غیر مطبوعہ ہے اللہ تعالیٰ اشاعت کا موقعہ عطا فرمائے۔

لغات القرآن

یہ لغت قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے کلید ہے۔ اس کی جلد اول حرف ش تک ہے جو مطبوعہ موجود ہے

تذکرۃ المفسرین

اس کی جلد اول شائع ہو کر نایاب ہو چکی ہے۔ اب فاضل مولف نے مکمل کتاب پر نظر ثانی فرمائی ہے جس میں تقریباً سات سو مفسرین قرآن کا ذکر ہے۔ کتاب کی تصویر آخری مراحل میں ہے۔

درسِ قرآن

آپ قرآن حکیم کا درس واہ کینٹ آرڈیننس فیکٹری میں تقریباً گیارہ سال سے دے رہے ہیں۔ اس درس کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔ رسالہ خدام الدین میں بھی شائع ہوتا رہا ہے اور گاہ بگاہ رسالہ فاران لندن میں بھی شائع ہوا ہے اب خود ایک رسالہ ماہنامہ "الارشاد" کے نام سے شائع کرتے ہیں جس میں قرآن حکیم کا درس اور درس حدیث شائع کیا جاتا ہے۔

شیر پنجاب فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم

مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں سے تھے، اکابر دارالعلوم دیوبند سے محبت اور خلوص رکھتے تھے آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی سے مناظرے، مباحثے اور مقابلے کیے، اس لیے آپ کو شیر پنجاب کہا جاتا ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی نے آخری عمر میں اعلان کیا تھا کہ میں اگر سچا ہوں تو میری زندگی میں مولوی ثناء اللہ کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر مر جائیں گے اور اگر وہ سچے ہیں تو میں ان کی زندگی میں مر جاؤں گا۔ الحمد للہ حضرت مولانا ثناء اللہ کی زندگی میں مرزا غلام احمد ہیضہ جو ایک وبائی مرض ہے اس کا شکار ہو کر آنجہانی ہو گیا۔ اس لیے آپ کو فاتح قادیان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا رجحان طبع اہل حدیث مسلک کی طرف تھا۔

آپ نے قرآن حکیم کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام "تفسیر ثنائی" ہے اور اس میں فرق باطلہ کا رد اور ادیان کاذبہ بالخصوص نیچری، چکڑالوی، مرزائی اور بدعتی عقائد کی بڑی کامیابی سے تردید کی ہے اور ہندوؤں، عیسائیوں اور دیگر غیر مذاہب کے اعتراضات کا معقول طریقہ اور مدلل انداز سے جواب دیا ہے۔ فجزاہم..... اللہ تعالیٰ اعضاد من سائر المسلمین یہ تفسیر مطبع ثنائی سرگودھا سے شائع ہوئی ہے۔

آپ نے عربی میں ایک "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" بھی تالیف فرمائی ہے اور سورہ یوسف کی تفسیر بھی تالیف فرمائی ہے جو امرتسر سے شائع ہو

چکی ہے بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کی چار تفسیروں کا ذکر کیا ہے غالباً دوسری تفسیریں مکمل نہیں ہوئیں۔

حضرت مولانا مولوی احتشام الحق صاحب تھانوی مہتمم کراچی

حضرت مولانا احتشام الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت اور حسن بیان کا وہ ملکہ عطا فرمایا ہے جو بہت کم لوگوں کا حصہ ہے۔ حضرت علامہ عثمانی مرحوم نے ایک بار مولانا احتشام کی تقریر سن کر فرمایا تھا کہ اب مجھے مرنے کا کوئی فکر نہیں ہے میرے بعد میرا جانشین پیدا ہو گیا ہے۔

مولانا موصوف تحریر و تقریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ قرآن حکیم کی ایک تفسیر تالیف فرما رہے ہیں، جو پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ قرآنی آیات کے مطالب و تشریح اور اسرار و معارف کا بہترین مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ العالی

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی علماء و فضلاء دیوبند میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ پاکستان میں جن علماء کے علم پر اعتماد کیا جاتا ہے اور جن کو عوام و خواص میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان میں آپ بھی سرفہرست ہیں، آپ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کے منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے ہیں۔

"علوم القرآن" کے نام سے ایک جامع کتاب تالیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب پشاور یونیورسٹی میں ایم اے کے نصاب میں شامل کر لی گئی ہے۔

"عالمی مشکلات اور ان کا قرآنی حل" جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے شائع ہوئی ہے۔

"احکام القرآن" "مفردات القرآن"، "مشکلات القرآن"

غیر مطبوعہ ہیں

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب سابق استاذ دار العلوم دیوبند گوجرانوالہ

آپ دار العلوم دیوبند میں درس قرآن شریف دیتے تھے۔ آپ نے حضرت مولانا حسین علی مرحوم سے درس قرآن حاصل کیا تھا آپ کا انداز درس عجیب ہے۔ خلاصہ آیات، ربط پر خاص زور دیتے ہیں آپ نے پورے قرآن کی تفسیر تالیف فرمائی تھی، لیکن وہ کوئی صاحب مستعار لے گئے اور واپس نہ کی۔

تفسیر القرآن

پارہ الم کی تفسیر جلد اول شائع ہو چکی ہے، یہ تفسیر دوبارہ لکھی ہے۔ تسنیم کمپنی نے شائع کی ہے۔ تفسیر علمی مضامین کا خزانہ ہے زبان عالمانہ ہے۔

مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی شہید پاکستان

فاضل دیوبند ۱۹۲۹ء بانی اخبار سہ روزہ "الامان"، روزنامہ "وحدت" دہلی

آپ مسلم لیگ اور پاکستان کے بہت بڑے حامی پر جوش مقرر تھے آپ نے ہندوؤں کی شدھی کے خلاف تحریک تبلیغ اسلام میں بھی بہت زیادہ کام کیا تھا۔ مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کی وجہ سے آپ کو شہید کر دیا گیا تھا آپ نے ایک مختصر تفسیر "قول المتین" فی تفسیر سورۃ المتین تالیف فرمائی اس کے ساتھ شاہ عبد العزیز کی تفسیر اور مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر بھی شامل ہے۔

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب

مہتمم دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی۔

حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مشہور مفسر قرآن ہیں، آپ

حضرت مولانا حسین علی واں بھچراں والے کے خاص شاگردوں میں سے ہیں، قرآن حکیم سے خاص شغف ہے اور ترجمہ کے مسئلہ میں حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور بعض دیگر مسائل میں انفرادی رائے رکھتے ہیں، آپ برسوں سے قرآن حکیم کا درس دے رہے ہیں، تعلیم القرآن کے نام سے آپ نے ایک ماہنامہ جاری کیا ہے۔ جو برسوں سے علوم قرآنی کی اشاعت کر رہا ہے۔

آپ کا درس قرآن بہت زیادہ مقبول ہے، بہت سے طلباء دوسرے مدارس میں تفسیر و حدیث کی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کے درس قرآن میں شریک ہو کر مستفیض ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم پر آپ کو کافی عبور ہے اور آپ حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے جانشین اور راشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

جواہر القرآن

دراصل حضرت مولانا حسین علی (ضلع میانوالی) کے ملفوظات و ارشادات پر مشتمل ہے۔ قرآن فہمی کے لیے یہ ایک بے نظیر کتاب ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی "حضرت شیخ التفسیر نے قرآن پاک پر فہم و تدبر اور خاص طور سے مسئلہ توحید کی تفہیم میں جو دولت آپ کو نصیب ہوئی ہے وہ نہایت ہی عزیز الوجود ہے اور صوفیانہ اصلاح پر مسئلہ توحید سے آپ کو جو تعلق خاطر بلکہ انہماک و استغراق ہے، وہ آپ کے قوت ایمانی کی دلیل ہے" یہ جواہر القرآن مولانا کی تفسیر کا مقدمہ ہے۔

جواہر القرآن کے نام سے آپ کی ایک مکمل تفسیر اور ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس ترجمے کے متعلق ہم تفصیل سے کچھ لکھنے سے قاصر ہیں باوجود طلب و جستجو ہم کو اس کی خصوصیات کا علم نہ ہو سکا۔

پروفیسر جناب حکیم مولانا مولوی غلام مصطفےٰ صاحب قاسمی زاد اللہ مجدھم

موصوف متناقات ؟ کے رہنے والے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے زمانہ تعلیم میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سے ملاقات ہوئی علوم ولی اللّٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور علم دین کی تکمیل اور فن طب کی تحصیل کے بعد حضرت مولانا سندھی سے شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف حاصل کیے۔

۔ آپ نے سندھی زبان میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی ہے۔ موصوف کے خسر جناب مولانا محمد ولی جو حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد ہیں، انہوں نے بھی سندھی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر تالیف کی ہے۔

آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نایاب کتابوں کی تحقیق و تصحیح اور ترجمہ کیا ہے جو شاہ ولی اللہ اکاڈمی حیدرآباد سندھ نے شائع کی ہیں۔

۱۔ تاویل الاحادیث عربی۔ اس کا ترجمہ قصص الانبیاء کے رموز اور ان کی حکمتیں۔

۲۔ لمعات۔ فارسی

۳۔ لمحات (عربی) فلسفہ تصوف کی نایاب کتاب ہے، تصحیح تحشیہ اور مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔

۴۔ مختصر القدوری عربی کا مقدمہ اور بہترین عربی حاشیہ

اس کے علاوہ آپ نے بہت سی کتابیں تالیف فرمائی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض علمی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔

۵۔ الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن امالی مولانا عبیداللہ سندھی کی تدوین و تہذیب کی ہے۔

جناب علامہ ڈاکٹر رشید احمد صاحب جالندھری

(پی ایچ ڈی، کیمرج و جامعہ ازہر مصر)

ڈاکٹر صاحب نے دارالعلوم رائے پور ضلع جالندھر میں اپنی دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر خیر المدارس جالندھر داخل ہوئے، وہاں سے دیوبند گئے، اور اس کے بعد کیمرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا

آپ علماء اکاڈمی محکمہ اوقات میں ڈائریکٹر رہے ہیں۔ شیخ العرب و العجم حضرت امداد اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مختصر اور نہایت مفید رسالہ ہفت مسئلہ موصوف کے زمانہ میں کئی بار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا۔ اور علم دوست حضرات میں مفت تقسیم کیا گیا۔ علماء اہل سنت و الجماعت دیوبندی اور بریلوی مسلک کے لوگوں کے لیے اس رسالہ میں بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں۔ اور افتراق امت سے بچنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ آپ کو علوم قرآنی اور تصوف سے خاص شغف ہے۔

آپ نے ساماہی دین و دانش میں جو علماء اکاڈمی محکمہ اوقات کی طرف سے شائع ہوتا ہے، اس میں علم تفسیر اور مفسرین کے عنوان سے ایک نہایت مفید مقالہ تحریر کیا ہے یہ مقالہ $\frac{30 \times 20}{16}$ سائز ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے پر اس مقالہ کے حواشی و حوالہ جات ۴۰ لکھے ہیں، اس مقالہ میں صوفیا کی عجیب و غریب تفاسیر کی کچھ مثالیں لکھی ہیں مثلاً

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا گیا وضو اور نماز کے معنی کیا ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اول الذکر فصل اور دوسرا وصل ہے۔ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وہ دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے، یہ فصل ہے اور جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ تو وہ اللہ کے حضور میں حاضر ہوتا ہے اور یہ وصل ہے (ص ۴۲ د) جلد ۱ شمارہ ۱ ماہ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔

ڈاکٹر رشید صاحب کے خلاف جو غلط پروپیگنڈہ کرتے تھے ان میں سے بعض نے آپ کو معتزلی قرار دیا۔ حالانکہ موصوف اس مقالہ میں لکھتے ہیں۔

یہ نقطہ نظر کہ آدمی اللہ کو دیکھنے کی خواہش بھی رکھنا معتزلہ کے سخت اور خشک خیالات و آراء کا نتیجہ ہے۔ سچ پوچھو تو معتزلہ آدمی کو ایک مشین سمجھتے ہیں اور تفسیر کشاف کا شمار تفسیر بالرائے میں کیا جا سکتا ہے (ص ۴۳)

۲۰۶ ——

پروفیسر علامہ مولانا نور الحسن خان صاحب ایم اے زاد مجدہم

علامہ صاحب پنجاب یونیورسٹی شعبہ علوم شرقیہ میں پروفیسر ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، بمبئی کلاتھ ہاؤس کے پیچھے انارکلی میں ایک مسجد ہے اس میں علامہ صاحب برسوں سے درس قرآن دے رہے ہیں، آپ کا یہ درس بفضل اللہ تعالیٰ جاری ہے اور بے شمار لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں، درس قرآن کے ساتھ کبھی کبھار درس حدیث بھی ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ابنائے قدیم میں سے ایک فرزند ارجمند کا یہ تبلیغی کام اور درس بارہ سال سے مسلسل اس کو قائم رکھنا مولانا کے خلوص نیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت کی علامت ہے۔ علامہ صاحب کے درس میں ہر مسلک اور عقیدے کے لوگ آتے ہیں اور فیض یاب ہوتے ہیں، علامہ درس میں نہ کسی پر طنز کرتے ہیں اور نہ فرقہ بازی کو پسند کرتے ہیں، الحمد للہ صراط مستقیم پر اعتدال کے ساتھ گامزن ہیں، یونیورسٹی میں آپ کے تلامذہ آپ کے تقویٰ اور خلوص سے متاثر ہیں۔ علمائے اور فضلائے دارالعلوم دیوبند قرآن حکیم کا درس بے شمار جگہ دے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اعداد و شمار نہیں ہیں، ورنہ ہند و پاک بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے حضرت قاسم العلوم والخیرات کے اس خواب کی تعبیر ہمارے سامنے ہے جو حضرت نے دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر ہوں۔ اور میرے جسم سے پانی کے چشمے نکل کر بہہ رہے ہیں حضرت نانوتوی کی مساعی جمیلہ سے خدا جانے کہاں کہاں آب حیات کے یہ چشمے ابل رہے ہیں، نکل رہے ہیں اور کہاں سے کہاں تک جاری ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب وعندہٗ ام الکتاب

ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے عظیم تفسیری کارناموں میں سے چند حضرات کا ذکر اور ان کے تفسیری کام پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا ذکر نہیں کیا گیا وہ یقیناً مذکورین سے زیادہ ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ذرائع نہیں ہیں

جو ہم سب کا پورا بیان تحریر کر سکیں، دارالعلوم دیوبند کے ابناء قدیم نے ہر جگہ کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا اور تمام زندگی اسی مقصد کے لیے صرف کردی۔ جو حضرات تفسیر قرآن کے سلسلہ میں کسی قسم کا تحریری یا تقریری کام کر رہے ہوں، وہ ہم کو تفصیلات سے آگاہ فرمائیں تاکہ طبع ثانی یا ضمیمہ کی اشاعت میں شامل کی جائیں۔ ناچیز راقم آثم کو اس کا اعتراف ہے کہ یہ مختصر تحریر دارالعلوم دیوبند کی تفسیری خدمات کا ایک مختصر سرسری اور ابتدائی جائزہ ہے۔

حضرت مولانا محمد علی صدیقی صاحب کاندھلوی زید مجدہم

حضرت مولانا محمد علی صاحب حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے خواہرزادہ ہیں اور خود بھی اپنے خال مکرم کی طرح بہت زیادہ وسیع المطالعہ ہیں۔

آپ کی زیر نگرانی ماہنامہ "... شاد" سیالکوٹ سے شائع ہوتا ہے

آپ قرآن کریم کی ایک نہایت ضخیم اور عظیم تفسیر تالیف فرما رہے ہیں یہ تفسیر درحقیقت تمام مستند اور معتبر قدیم و جدید تفاسیر کا خلاصہ ہے، اس کی تیس جلدیں ہوں گی۔ جلد اول ضخامت ۶۴۰، جلد دوم ضخامت ...، شائع ہو چکی ہیں، اس تفسیر کا نام معالم تنزیل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرماتے۔

اس تفسیر کی زبان اور انداز بیان سلیس اور نفیس ہے۔

حضرت مولانا محمد طاہر صاحب مدظلہ پنج پیر مردان

آپ حضرت مولانا حسین علی شیخ المفسرین کے تلمیذ رشید ہیں

آپ کے یہاں قرآن حکیم کا دورہ تفسیر میں پڑھایا جاتا ہے۔

آپ کی تالیفات میں حسب ذیل قرآن حکیم سے متعلق ہیں۔

۱۔ مرشد الحیران الی فہم القرآن قرآن فہمی کے لیے رہنما ہے

۲۔ العرفان فی اصول القرآن ...۱۰۰ صفحات اصل اصول تفسیر ہے۔

۳۔ البرہان فی اصول القرآن ... یہ بھی اصول تفسیر کے موضوع پر ہے۔

۴۔ تبلیغ القرآن الکریم ... یہ بھی اصول تفسیر کے موضوع پر ہے۔ اور

۵۔ افغانی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب طوروی مدظلہ

آپ مظاہر العلوم سہارنپور کے فاضل ہیں

۱۔ پارہ اول مع ترجمہ و تفسیر بزبان پشتو مطبوعہ

۲۔ قرآن حکیم کے چند پارے تفسیر و ترجمہ غیر مطبوعہ

خطیب اسلام جناب مولانا محمد اجمل خان صاحب

قلعہ گوجر سنگھ لاہور

آپ مشہور مقرر اور مبلغ اسلام ہیں۔ انداز بیان بھی دلچسپ اور مؤثر ہے

۱۔ تدریس القرآن طبع اول ۶۴ صفحات پر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ طبع دوم ۱۹۶۷ء باضافات جدیدہ و مفیدہ ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ آداب القرآن کتبہ اشاعت اسلام اردو بازار نے شائع کیا ہے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ لغات القرآن کے موضوع پر مولانا نے مستند اور معتبر کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور قرآن کریم کے لغات کو حل کیا ہے درس قرآن اور تفسیر کے طلبا کے لیے یہ لغت بہت مفید ہے

۴۔ جامع رحمانیہ میں جمعہ کے روز تفسیر قرآن کا درس کئی سال سے دیتے ہیں اور ہزاروں لوگ مستفیض ہوتے ہیں

جناب مولانا حافظ عبدالواحد صاحب علوی ہزاروی

۱۔ تفسیر سورہ فیل منظوم
۲۔ تفسیر آیات قرآنی حافظ علوی کی زبانی
۳۔ سورہ مزمل کی تفسیر
آپ کی یہ تین تفاسیر ہمارے علم میں آئی ہیں۔

مولانا سید عبداللہ قطب شاہ عباسی مردانی

۱۔ "اسماء القرآن" مطبوعہ میرٹھ انڈیا
۲۔ "نجوم القرآن" فی "اطراف القرآن" کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

مولانا عزیز الرحمٰن المعروف صاحبزادہ محمد امیر خسرو ہزاروی

۱۔ تفسیر سورہ فاتحہ تالیف کی ہے

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم (اکوڑہ خٹک)

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق ممبر پاکستان دستور ساز اسمبلی بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے صاحبزادے ہیں ماہنامہ "الحق" آپ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ قرآن حکیم سے متعلق آپ کی تالیف
۱۔ قرآن اور تعمیر اخلاق بہترین کتاب ہے۔

جناب مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی صاحب

سید قطب شہید الاخوان المسلمون کے مشہور و معروف قائد تھے اور علوم قرآنی پر آپ کی خاص نظر تھی، سید قطب شہید کی مشہور تالیف فی ظلال القرآن

سید قطب شہید اکاڈمی احمد پور سیالکوٹ کے زیر انتظام اس کا اردو ترجمہ قرآن کے زیر سایہ لکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب ہزاروی دارالرشاد کوئٹہ

آپ کی تالیفات میں
۱۔ احکام القرآن اردو ترجمہ
۲۔ تفسیر سورہ بقرہ
۳۔ تفسیر قرآن فی ظلال القرآن سید قطب شہید کا اردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ ابھی نامکمل ہے۔

جناب مولانا عبدالقادر صاحب جامی ہزاروی فاضل دیوبند ۱۳۳۶ھ

قرآن حکیم کی تفسیری خدمات میں آپ کی حسب ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں۔
۱۔ تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے
۲۔ عمدۃ الفکر فی تفسیر سورۃ العصر

جناب حافظ حکیم مولانا قاری محمد عارف صاحب

ایم اے فارسی، عربی، اسلامیات (ایم او ایل)
آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے فاضل ہیں۔
۱۔ تفسیر سورۃ البقرہ ترجمہ و تشریح زیر طبع ہے۔
۲۔ تفسیر سورہ لقمان، ترجمہ و تفسیر یونیورسٹی کے طلباء کے لیے ہے

جناب حافظ مولانا قاری فیوض الرحمان صاحب

ایم اے عربی، اسلامیات، فارسی صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

باقی صفحہ ۶۰۷ پر

ڈاکٹر سید عبداللہ

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کہنے کو ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو چھتہ کی مسجد میں، انار کے ایک درخت کے نیچے "محمود" نامی ایک استاد مولانا محمود میرٹھی اور ایک شاگرد محمود جو بعد میں شیخ الہند محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے اکے ذریعے وجود میں آیا لیکن درحقیقت اس کی ضرورت کا احساس اس سے بہت عرصہ قبل، شمالی ہندوستان کی طرف انگریزوں کی پیش قدمی اور تدریجی طور پر تمام علاقوں پر قبضے کے اثرات سے پیدا ہوا۔ اسے آپ محمد شاہ کے فوراً بعد کا زمانہ کہہ سکتے ہیں جس میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان کے افراد نے ملت کے زوال اور غیر اسلامی غیر ملکی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے رسوخ کے اسباب پر غور کیا اور زوال کی اس لہر کو روکنے کی کوشش کی جو ہزار کوشش کے باوجود نہ رک سکی اور ۱۸۵۷ء کے حادثے پر ختم ہوئی۔

انگریزوں کے عروج کے اسباب دو طرح کے تھے (۱) داخلی اور (۲) خارجی۔ داخلی سے مراد باشندگانِ ہند خصوصاً مسلمانانِ ہند کی معاشرتی و اخلاقی کمزوریاں ہیں اور خارجی سے مراد مغربی اقوام کی اپنی استعداد، ان کا اپنا ساز و سامان اور ان کی اپنی بہتر تنظیم ہے۔

داخلی طور سے مسلمان اس بات سے غافل ہو چکے تھے کہ انہوں نے ایک غیر مسلم اکثریت پر سلطنت کی عمارت کھڑی کی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی نازک موقعہ پر حکمران مسلم اقلیت کا تختہ الٹ سکتی ہے! انہوں نے عالمِ غفلت میں اپنی قوت کو مجتمع نہ رکھا اور گروہوں اور فرقوں کی صورت میں آپس میں محاذ آرائی کی اور کمزور ہوتے گئے اس کے نتیجے میں ایک طرف وہ ہندوستان کے اندر کی غیر مسلم طاقتوں کے سامنے مغلوب ہوتے گئے اور دوسری طرف کبھی غیر ملکی طاقت کے آلۂ کار بنے اور کبھی اس کے سامنے مغلوب ہوتے گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی بصیرت سے اس زوال ملّت کے اسباب پر غور کر کے چند نتیجے نکالے جو کم و بیش یہ تھے۔

(الف) تعلیم میں قرآن و حدیث سے زیادہ دوسرے علوم معقولات، پر سب سے زور دینا۔

(ب) دینِ اسلام کے رکنِ عظیم جہاد کے بجائے اور جنگی ریاضتوں کے بجائے عرسوں اور میلوں اور تہواروں سے زیادہ دلچسپی، رزم کے مشاغل سے زیادہ بزم کے مشاغل (مشاعرہ، وغیرہ) میں وقت صرف کرنا۔

(ج) طریقت کو محض خانقاہی مشغلہ بنا کر اسے شریعت کے متوازی بلکہ شاید اس سے بھی بالا ایک عمل قرار دینا۔

(د) اس فرمانِ خداوندی کو فراموش کر دینا کہ یہود اور نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں بن سکتے۔

(ہ) فرقے کے اختلاف کو اتنی اہمیت دینا کہ کافر کو اختلاف رکھنے والے کلمہ گو پر ترجیح دینا اور کافر کی امداد کرنا

؎ دیوبند کے رہنے والے تھے میرٹھ میں مدرس تھے

(۵) اس امر کو فراموش کر دینا کہ خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو جب بھی تمکن فی الارض کی نعمت سے نوازا تو اس کا سبب قیام شریعت تھا اور قیام شریعت کامل ابھی ہندوستان میں مکمل نہ ہوا تھا مگر مسلمانوں نے ترک کر دیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے زمانے میں ان سب اسباب پر غور کر کے ہر بیماری کے علاج کی کوشش کی، قرآن و سنت کی ترویج پر زور دیا۔ اور زمانے کی معقولاتی فضا میں علم اسرار دین کی بنیاد رکھ کر دین کے اثبات کے لئے عقل اور تمدنی تجربوں سے بھی استشہاد کیا۔

فرقوں کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے الانصاف جیسے رسالے لکھے، شریعت و طریقت کے مابین فاصلوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاد بالسیف کے فریضے کی طرف متوجہ ہو کر کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کے لئے مسلمانوں کی بکھری ہوئی طاقتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جا رہی تھی کہ انگریزوں نے شاہ عالم ثانی اور شاہان اودھ کے ساتھ سمجھوتے کر کے دیوانی حقوق حاصل کر کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیا جس کا سب سے بڑا حملہ شعبۂ تعلیم پر ہوا چنانچہ ۱۸۵۷ء کے حادثے کے وقوع میں آنے تک انگریزوں نے ملک میں مغربی طریقے کے مدرسوں کے جال بچھا دیئے۔

ادھر اندر ہی اندر مناظروں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ نظام سب کو مگر فی الحقیقت مشنری پادریوں کو تشکیک پھیلانے کا موقع مل جائے، پھر اس کے ہمراہ انگریزی ڈگریوں کے بہلانے سے، تشکیک میں مبتلا عنصر کو اونچے عہدے دلوائے تاکہ وہ معاشرہ کے اس عنصر کو دبا سکیں جو کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کا ذرا بھی خیال رکھتا ہو۔ جب ملازمت کا معیار انگریزی سرٹیفکیٹ قرار پایا تو قدرتی طور سے ہندوؤں کو تعلیم کی زیادہ سہولتیں دیں تاکہ مسلمانوں کو بھی ترغیب ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ انگریزی مدرسوں میں داخل ہوں اس سے انہیں ایک یہ فائدہ مدنظر تھا کہ دین کے بارے میں تشکیک زیادہ سے زیادہ پھیلے اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملازمتوں کے مسئلے پر جھگڑے پیدا ہوں۔

انگریزوں کی طرف سے اس صدی میں مناظرے کی حوصلہ افزائی بے مقصد نہ تھی۔ اس کے ذریعے جہاں پادریوں اور آریہ سماجیوں کو دریدہ دہنی کی اجازت ملی وہاں ان فرقوں کی سرکاری سرپرستی (اگرچہ خفیہ) ہوئی جو جہاد پسند قوتوں کے مخالف تھے (یہ سب کو معلوم ہے کہ پچھلی صدی کے آغاز اور اس صدی کے ربع اول تک وہابی کا لفظ گالی بن چکا تھا۔)

غرض، ۱۸۵۷ء کے بعد صورتِ حال یہ ہو چکی تھی کہ دینی ولولے بالکل ضعیف اور سقیم ہو چکے تھے، نئی تعلیم ملازمتوں کی ترغیب کی وجہ سے پھیل پھیل کر لادینی، اور مغرب کی طرز معاشرت کی تقویت کا باعث ہو گئی تھی۔ انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر ختم کرنے کی ہر کوشش کر رہے تھے مگر اس سے زیادہ تعلیم کے ذریعے ضعفِ یقین پیدا کرنے کی طرف خاص طور سے متوجہ تھے قدیم علوم اسلامیہ کی سرپرستی کے بہانے سے انگریزوں نے علوم مشرقی کے نئے ادارے قائم کئے جن کے فارغ التحصیل حضرات کو ساری تعلیمی دسترس کے باوجود دوسرے درجے کا تعلیم یافتہ آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گویا ملت اسلامیہ ہند ایک طرف سلطنت و شوکت سے کاملاً محروم ہو چکی تھی تو دوسری طرف مسلمانوں کے شاندار ماضی اور اسلاف کے علمی کارناموں کی تذلیل و تحقیر کا بندوبست کر کے ان کی عزتِ نفس اور شعورِ خودی کو بالکل پامال کر دیا گیا۔

ان حالات میں چند دردمند اہلِ ایمان نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور یہ تدبیر سوچی کہ ان تمام پسپائیوں اور ناکامیوں کا علاج تعلیم ہی کے ذریعے کیا جائے چنانچہ مدرسہ دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس نے اشاعتِ دین سے لے کر استعماری طاقتوں کے جہاد تک ہر شعبے میں استحکام کی تحریک میں حصہ لیا۔ ایک حد تک یہ انہیں مساعی کا ثمرہ تھا کہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اور یہ انہیں کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ تحریک پاکستان کو دینی طاقتوں کی امداد حاصل ہوئی۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ اس معاملے میں دیوبند

کے علما دونوں طرف نظر آتے ہیں لیکن اگر بہ دوانتقاد نظر سے دیکھا جائے
اور نیتوں پر شک نہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ علمائے دیوبند کا ایک گروہ
آزادی ہندوستان کے بغیر پاکستان کو ممکن الوقوع نہ سمجھتا تھا لہٰذا آزادی پر
زیادہ زور دیتا رہا۔ راقم الحروف ہر گروہ کے علما کا خادم اور معتقد ہے لیکن
میری نظر میں جو جامعیت دیوبند کے اہل علم میں ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں
خطابت، تالیف و تصنیف، سرفروشی، خلق، ایک خاص نقش حریت
اور آزادی کی جو تڑپ علمائے دیوبند میں نظر آئی اس پر گذشتہ ایک سو
سال کی تاریخ شہادت دے رہی ہے۔

مجھے معلوم نہیں اس وقت دارالعلوم دیوبند کے کوائف وحالات
کیا ہیں لیکن مجھے دیوبند کے اساسی
اصولوں کی ایک شق نے ہمیشہ متاثر بلکہ گرویدہ کیا ہے اور وہ یہ ہے:

"اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل
یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط
توجہ الی اللہ چلے گا۔

اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت
یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ۔ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع
الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی بھی موقوف ہو جائے گی،
اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں
ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ
مضر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت
معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت
اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔"

یہ دارالعلوم دیوبند کے دستور اساسی کی شق نمبر ۸ ہے اس کے
مندرجات میں جو استغنا، توکل علی اللہ، رجوع الی اللہ، بے نیازی،
عزتِ نفس اور وقار پایا جاتا ہے اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی۔ یہ
اسی استغنا کا نتیجہ ہے کہ علمائے دیوبند مزاجاً حکام کی دہلیز پر جھکنے سے
مجتنب رہے۔ خصوصاً برطانوی دور میں استعماری طاقتوں کا حلیف بننے
سے گریزاں رہے۔

دیوبند کا مدرسہ دورانِ تربیت اپنے طلبا کے ذہن پر یہ نقش اچھی
طرح بٹھاتا رہا کہ انگریز ہی دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں،
انگریزوں نے ہی سلطنت مغلیہ کو ختم کیا اور یہ انگریز ہی ہیں جو ساری دنیا سے
دین اسلام کو مٹا دینا چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ نقش محکم تھا مگر اس کے ساتھ
ہی اسے یکطرفہ بھی سمجھ لیا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا کیونکہ بالآخر حقیقت یہی نکلی
ہے کہ الکفر ملۃ واحدۃ، بہرحال یہ ماضی کی باتیں ہیں اب ان پر گفتگو بے محل
بھی ہے اور بے سود بھی۔

اب دیوبند ہندوستان میں ہے اور اگرچہ میں ہندوستان کے
حالاتِ حاضرہ سے بے خبر ہوں تاہم میرا خیال ہے کہ یہ مدرسہ اب بھی اس
ملک میں ایک موثر قوت ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان مشکلات
کے باوجود جو ہندی مسلمانوں کو درپیش ہیں، یہ مدرسہ اسلام اور مسلمانوں کی
حقیقی خدمت انجام دے رہا ہے۔

آپ نے دورہ حدیث شریف جامعہ اشرفیہ میں پڑھا ہے۔
۱۔ تعارف قرآن ۔۔ صفحات کا مختصر لیکن جامع تعارف،
۲۔ سورہ حجرات ترجمہ وتفسیر
۳۔ سورہ لقمان ترجمہ وتشریح مولانا عارف برادر بزرگوار
کی معیت میں۔

دارالعلوم اور فتنۂ تکفیر

اکرام القادری، ایڈیٹر ترجمان اسلام لاہور

دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہت، ہمہ گیر اور ہمہ نوع خدمات ملی و قومی کا احصاء و احاطہ کیا جانا مجھ ایسے فرد مایۂ علم و عمل کے لئے بلا مبالغہ ناممکن ہے۔ دارالعلوم کی خدمات کو کسی رسالے کے ضخیم ترین نمبر اور کسی ضخیم ترین کتاب میں بیان کر دینے سے بھی اس بارگراں سے سبکدوش نہیں ہوا جا سکتا۔ یہ ایک ادنیٰ سی کوشش ہے جو ہر دور میں اصحاب علم و فضل کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ دارالعلوم دیوبند کی فقید المثال خدمات دینی و قومی پردہ اخفا سے منصۂ شہود پر لانے کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو جید علماء اور جدید تعلیم سے بہرہ ور افراد پر مشتمل ہو۔ اپنے یوم تاسیس سے تا دم تحریر دارالعلوم کے مایۂ ناز فرزندان ذی وقار نے جو عدیم النظیر خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے اندر اس قدر تابانیاں رکھتی ہیں کہ ان کا تذکرہ کئے بغیر برصغیر کی دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تاریخ لکھنے والا مورخ اپنی رقم کردہ تاریخ کے ہر باب کو نامکمل پائے گا۔ بالفاظ دیگر کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن خدمات کو فراموش اور نظر انداز کر کے لکھی جانے والی تاریخ، تاریخ نہیں ہوگی۔ بلکہ تاریخ کے منہ پر بدنما داغ ہوگی۔ بعض مردہ نام نہاد متعصب مورخین نے اس قسم کی سعی ناتمام کی ہے۔ ان مورخین کی اس مبنی بر کذب کاوش کی حیثیت اصحاب علم و فن اور غیر جانبدار و غیر متعصب مورخین کی نظر میں پرکاہ سے زیادہ نہیں۔ ان بزعم خویش مورخین نے حب علی کی بجائے بغض معاویہ سے کام لیتے ہوئے فرزندان دارالعلوم کی سیاسی خدمات پر پردہ ڈالنے کی جسارت کی ہے جس کا جواب اہل علم نے ہر دور میں دے کر ان کے مزعومات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد میاں صاحبؒ، مولانا غلام رسول مہرؒ اور مولانا حامد الانصاری کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا محمد میاںؒ صاحب نے "علماء ہند کا شاندار ماضی" "علماء حق کے کارنامے" اور اب آخر میں "تحریک شیخ الہند" ایسی اچھی کتابیں لکھ کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی سیرت سید احمد شہید اور سرگذشت مجاہدین میں بہت سے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے اور غیر ثقہ یا سہل انگار مورخین کی طرف سے پھیلائی ہوئی رطب و یابس روایات کے مدلل و مسکت جوابات دیئے ہیں۔ مولانا حامد الانصاری کے بعض کتابچے بھی اس سلسلہ کی کڑی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ابنائے دارالعلوم دیوبند ہی نے شکست خوردہ، ہزیمت زدہ اور ہراساں قوم کی عروق مردہ میں حریت فکر اور آزادی رائے کا خون دوڑایا۔ دارالعلوم دیوبند کے مؤسسین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہی

سے اس رخ سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ فی الحال بدلیشی ظالم حکمرانوں سے براہ راست نبرد آزما ہونے کی بجائے بالواسطہ جنگ کیلئے میدان تلاش کیا جائے مسلسل سوچ بچار اور اشارات غیبی کے بعد یہ میدان کارزار دارالعلوم دیوبند کی شکل میں نمودار ہوا۔

دنیا جانتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند علم و آگہی کا بحر بیکراں اور تعلیمات اسلامیہ کے خادم و ناشر کی حیثیت ہی سے نہیں ابھرا بلکہ اسے ملت اسلامیہ کی عظیم حیاؤنی کا منصب بلند بھی ملا۔ ایسا ہونا کوئی ایسا مستبعد بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے مؤسسین، سرپرست اور اساتذہ اشہب علم کے شہسوار اور شب زندہ دار ہی نہ تھے۔ وہ تیغ جوہر دار کے دھنی اور مجاہدین صف شکن بھی تھے۔

دارالعلوم کے قیام سے دس سال قبل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی قیادت میں اپنی جانبازی و جاں سپاری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ شاملی کا میدان انہی مردان کارزار کے جاں نثار ساتھیوں کے مقدس خون سے لالہ زار بنا تھا۔ یہی تھے وہ مردان حق آگاہ جو تحریک آزادی وطن کے "جرم" میں قید و بند اور روپوشی کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔

یہ امر... بدیہی ہے کہ ان جامع الصفات، کثیر المناقب اور مجموعۂ محامد اکابرین کے تربیت یافتگان میں ایسے نابغہ و عبقری اٹھتے جو ہر میدان کے مرد ہوں جو بیک وقت مسترشدین کے لیے مرشد مربی بھی ہوں اور مجاہدین کیلئے سپہ سالار و امیر لشکر بھی۔ ان اکابرین کے تلامذہ میں جہاں محدث، مفسر، متکلم، فقیہ، مفتی، مبلغ، مصنف اور مجاہد ہوئے ہیں وہیں ایسے فرید روزگار بھی ہوئے جو ہر فن کے گوہر یکدانہ ثابت ہوئے جن کی جامعیت کبریٰ کا ایک زمانے میں لوہا مانا گیا۔ جو سجادہ و دلق کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں میں بھی انارو تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے پروردگان "امام راشد

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے سر فروش رفقاء نے اتحاد عالم اسلام اور آزادی وطن کے سلسلے میں جو تاریخ ساز کردار ادا کیا اور جس طرح جلا وطنی، اسارت مالٹا اور مصائب و شدائد کے پہاڑ برداشت کئے وہ برصغیر کی صاف ستھری تاریخ کا حصہ ہیں۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے دیگر رفقاء کی قربانیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام حضرات سیاسیات ہند میں مختلف روشوں پر چلنے کے باوجود "در جاناں" پر آتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس بات پر فخر تھا کہ ان کا تعلق اس مادر علمی سے ہے جسے دنیا دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانتی ہے اور جس کی بنیاد ان اکابرین کا لہو کار فرما تھا جن کا تعلق براہ راست شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے جاں باز خانوادۂ حریت سے تھا وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی نسبی و نسبتی ذریت پر جان و دل سے نثار تھے انہیں بالاکوٹ کے شہیدوں سے معنوی نسبت تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ الہند اور ان کے فرید العصر اکابرین اس قافلۂ حریت کے مشن کی تکمیل کے لئے میدان کارزار میں در آئے تھے۔ جس نے امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی قیادت میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے قیام اور فرنگی سامراج کو ملک بدر کرنے کے لئے داد شجاعت دیتے ہوئے غریب الوطنی کے عالم میں بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں جان جان آفرین کے سپرد کی تھی۔

مقام افسوس ہے کہ آج بعض نام نہاد مفکرین سرزمین افرنگ میں بیٹھ کر اپنے آبا کی سنت کے مطابق تفریق بین المسلمین کی دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے کے درپے ہیں۔ ان دنوں اس گروہ ناپرساں کی قیادت کا شرف ہندوستان کے ایک "علامہ" کو حاصل ہے جو انگلینڈ کی "معطر" فضاؤں میں براجمان ہیں ساہنی کے اگلے ہوئے لقمے ان کے پاکستانی ایڈیشن چبا رہے ہیں۔ پوٹھوہار کے ملنگ میں ملفوف ان کی "تحقیق انیق"

اور عمل۔ کد و کاوش سے جو چند کتابچے سامنے آئے ہیں۔ ان میں دبی پرانے راگ نئے سُروں میں الاپے گئے ہیں جو آج سے تقریباً پون صدی قبل اس طائفہ کے مجدد و اعلیٰ حضرت الاپ چکے ہیں۔ ان مفتین کا مقصد وحید اس تمام ترنگ و رو سے یہ ہے کہ اس تکفیری نقشہ کو پھر سے ہوا دی جائے۔ جو ان کے امام فاضل بریلوی نے علماء حق اور سیل حریت کے پروانوں کے خلاف اپنی مزعومہ اغراض کے پیش نظر برپا کیا تھا اور جسے اہل علم نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا اور تکفیری نقشہ کے اس سرخیل کی شبانہ روز کوششوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشینوں پر الزام، اتہام اور دشنام کے باوجود اس "مجدد مائۃ حاضرہ" کو عام مسلمانوں میں پذیرائی نہ ہو سکی تھی۔ ہندوستانی علماء اور عوام میں تکفیری فتنے کی مکمل ناکامی کے بعد اس "مجدد و امام" نے حرمین شریفین کا رخ کیا اور وہاں علماء کے سامنے آزادیٔ ہند کے متوالوں اور شمع رسالت کے پروانوں کی اردو کتابوں سے عبارات لے کر اپنی منشاء کے مطابق عربی ترجمہ کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی مخادعت اور فن کاری سے کام لیا جس سے مصنف کی تحریر میں خود ساختہ معنی ڈالیں جا سکیں۔ اس مجدد و امام نے مختلف صفحات سے عبارات کے ٹکڑے لے کر یکجا کئے اور ایک عبارت بنا دی۔ ساتھ ہی مرزا غلام احمد قادیانی کی صریح کفریہ عبارات کو بھی ان اکابرین کی خود تراشیدہ عبارات کے ساتھ رکھا تاکہ علماء حرمین کو فریب دینے میں آسانی ہو۔

ان محتاط علماء نے اس قدر مخادعت کے باوجود احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور صریح طور پر مصنفین کی تکفیر سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر ان مصنفین کا یہ عقیدہ ہے تو یہ کافر ہیں ظاہر ہے اکابرین دیوبند؟ کا وہ عقیدہ تھا ہی نہیں جو اس "مجدد و امام" نے عربی عبارات کے ذریعہ علماء حرمین کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے باوجود علماء حرمین نے ازراہِ تحقیق و احتیاط علماء دیوبند کی طرف مراجعت کر کے جو لسنہ ان کے اصل عقائد معلوم کئے۔ جس کے جواب میں علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوری نے المہند کے نام سے اپنے اور اپنے اکابرین کے صحیح عقائد تحریر فرمائے۔ جس کی تصدیق علماء حرمین اور علماء ہندوستان نے کی۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ اگر اس "مجدد و امام" کی ہندوستان کے علماء میں پذیرائی ہوتی تو یہ حرمین شریفین میں تلوار نہ چلاتا۔ نہ ہی اسے حسام الحرمین لکھنے کی نوبت آتی۔ علماء حرمین سے اپنی خود ساختہ عبارات پر دستخط کرانے کے بعد اس "مجدد و امام" اور اس کے چند حواریوں نے غیر معروف سادہ لوح ہندوستانی علماء کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر چند فتوے حاصل کئے اور الصوارم الہندیہ کے نام سے چھپوایا۔ مقام غور ہے کہ یہ "مجدد" اور اس کے چند چیلے ان علماء اکابرین پر تلواریں چلاتے تھے جو براہ راست فرنگی سے برسرپیکار تھے۔ جن کی تلواریں انگریز کے خلاف چل رہی تھیں یہ انہی پر تلوار وں کی مشق کر رہے تھے مگر کون نہیں جانتا کہ ان کی یہ کاغذی تلواریں ہبا منثورا ہو کر رہ گئیں اور کیوں نہ ہوتیں جبکہ برطانیہ ایسی جابر و ظالم حکومت کی تلواریں، توپیں، گولیاں ان حق پرستوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ یہ طائفہ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو ولی اللہ اور بریلوی عقائد کا حامل بتاتا ہے۔ اس تکفیری گروہ کے غزالیٔ دوراں، رازیٔ زماں علامہ سعید احمد شاہ کاظمی اپنی کتاب الحق المبین کے ص۱۱ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "لیکن علماء اہلسنت برابر اس فتنے کے خلاف نبرد آزما رہے۔ ان علماء حق میں مذکورین صدر علماء کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حضرت مولانا عبدالسمیع رامپوری، حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری، حضرت مولانا احمد رضا صاحب بریلوی، حضرت مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی اور حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب اس دور کے تمام علماء کے سرخیل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اس عہد و امام کے دور میں بقید حیات تھے تو پھر اکابرین دیوبند کی مابہ النزاع عبارات کے سلسلے میں ان سے رجوع کیوں نہیں کیا گیا۔ جبکہ حاجی صاحب قبلہ علماء دیوبند کے مرشد و مربی بھی تھے اور حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی تو ان کے مرید و مجاز بھی تھے۔ سب سے عمدہ اور دیانت دارانہ صورت اس کی یہی تھی کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش ہو کر ان کے مریدوں اور خلفاء کے خلاف ان سے شکایت کی جاتی اور عبارات مذکورہ اگر واقعی کفریہ ہوتیں تو وہ خود ان پر کفر کا فتویٰ دیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا آخر کیوں! قارئین سوچ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی کم سواد یہ کہے کہ حاجی صاحب کی وفات کے بعد ان علماء نے یہ عبارات تحریر کیں جیسا کہ بعض جہلا ناواقفوں کے سامنے کہہ دیا کرتے ہیں تو گذارش یہ ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی کے وصال کے بعد حضرت حاجی صاحب ۲۰ سال تک زندہ رہے اور حضرت نانوتوی کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کے نام جو تعزیت نامہ لکھا اس کا ایک ایک لفظ حزن ملال اور غم و اندوہ کا مرقع ہے۔ دیکھئے بیس بڑے مسلمان ص۲۸۔

حضرت گنگوہی کی فتاویٰ رشیدیہ کی عبارت اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی براہین قاطعہ کی عبارت بھی حضرت حاجی صاحب کی زندگی میں ہی لکھی گئیں۔ یہ وہی عبارتیں ہیں جن کی بنیاد پر اس تکفیری گروہ کے "امام" ان علماء پر یہ اتہام لگاتے ہیں کہ مولانا گنگوہی اور مولانا سہارنپوری خدا کے جھوٹ بولنے کے قائل تھے۔ معاذ اللہ۔

نہ صرف یہ کہ ان دونوں عبارتوں کا علم حضرت حاجی صاحب کو تھا بلکہ ہندوستان کے مولوی نذیر احمد صاحب کے استفسار پر حاجی صاحب قبلہ نے ان عبارات کی حقیقت علماء و عوام کو سمجھائی

آپ نے قرآن و حدیث اور علماء متقدمین کی عبارات سے حضرت گنگوہی اور حضرت سہارنپوری کی فتاویٰ رشیدیہ اور براہین قاطعہ کی عدم قدرت والی عبارات کی تائید و تصویب کی ہے۔ طوالت کی خاطر ہم وہ عبارت نقل نہیں کرتے جو حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی اور حضرت سہارنپوری کی حمایت میں تحریر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو ہفت مسئلہ ص۱۸ مطبوعہ جامعہ ضیاء العلوم لاہور۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی وہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے ان عبارات کے سامنے آجانے کے بعد تحریر کی۔ جن عبارات علیہ کو یہ طائفہ اور ان کا امام کفریہ عبارات کہتے ہیں۔ حاجی صاحب قبلہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جو شخص اس فقیر سے محبت و عقیدت اور مریدی کا تعلق رکھتے ہیں وہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو جو کہ تمام علوم ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں بجائے مجھ راقم کے بلکہ مجھ سے بہت درجہ اوپر شمار کریں۔ اگرچہ ظاہر میں معاملہ اس کے الٹ ہو رہا ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہو گیا ہوں (یعنی وہ مرید اور میں پیر ہوں) اور ان کی صحبت کو غنیمت جانیں کہ اس زمانے میں ایسے لوگ نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیض حاصل کرنے والے ہوتے ہیں اور سلوک کا طریقہ جو اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھا گیا ہے ان کی نگرانی میں حاصل کریں۔ انشاء اللہ محروم نہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں کی عمر میں برکت دے اور تمام عرفانی نعمتوں اور اپنے قرب کے کمالات سے مشرف فرمائیں اور اونچے اونچے مرتبوں پر پہنچائیں اور ان کی ہدایت کے نور سے سارے عالم کو نورانی بنا دیں اور قیامت تک ان دونوں کا فیض جاری رکھیں بحرمت نبی پاکؐ و آل پاکؐ۔

حضرت حاجی صاحب کے حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کی

مدحت ہیں کلمات طیبات کو پڑھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر علامہ کاظمی شاہ صاحب کی عبارات ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن علماء اہلسنت برابر اس فتنہ کے خلاف نبرد آزما رہے ان علماء حق مذکورین صدر کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی"۔ الخ ص۔

اس کے بعد اس طائفہ کے امام کی عبارت پڑھ لیجئے اور داد دیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں
جیسے خلیل احمد انبیٹھوی اور اشرف علی وغیرہ ان
کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال،
بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح کسی
حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اس کے
کفر میں بھی شبہ نہیں"

کاظمی صاحب فرماتے ہیں حاجی صاحب "علماء حق اہلسنت" میں سے ہیں۔ "امام احمد رضا" کہتے ہیں رشید احمد، خلیل احمد اور اشرف علی کے کفر میں شک کرنا یا کسی طرح ان کے کفر میں تامل کرنا بھی کفر ہے۔ جبکہ حضرت حاجی صاحب حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کو اپنی جگہ خود اپنی جگہ کہتے ہیں ان کی صحبت کو بابرکت فرماتے ہیں۔ ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعاگو ہیں۔ ان کے ذریعہ تاقیام قیامت ہدایت پھیلنے کی تمنا کر رہے ہیں۔ ان کی عبارات کی تصویب و تائید کر رہے ہیں۔ خدا جانے علامہ کاظمی شاہ صاحب، حضرت حاجی صاحب کو اپنے امام کے فتوے کی زد سے کیسے بچائیں گے۔ اور اس صریح کفر کو ان سے کیسے مندفع کر کے انہیں علماء حق اہلسنت ہونے کا مرتبہ بلند بخشیں گے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

رہی حضرت تھانوی کی حفظ الایمان والی عبارت تو اس سے متعلق عرض یہ ہے کہ وہ یقیناً حاجی صاحب کی وفات کے دو سال بعد تحریر کی گئی۔ حاجی صاحب کا وصال ۱۸۹۹ء میں ہو گیا تھا جبکہ حفظ الایمان کی عبارت ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔ مگر اس کا کیا جواب کہ اس طائفہ کے عقائد میں بزرگوں کو آنے والے حالات کا قبل از وقت علم ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد پر تو حاجی صاحب قبلہ کو یہ علم ہونا چاہئے تھا کہ میری وفات کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی "کفریہ عبارت" تحریر کریں گے۔ لہذا انہیں قبل از وقت ان کے کفر سے آگاہ کردوں اور تائب نہ ہونے کی صورت میں بریلوی امام کی پیروی کرتے ہوئے ان کے کفر کا اعلان کردوں یا کم از کم اپنی مریدی سے خارج کردوں یہ بھی نہیں خلافت ہی منقطع کردوں" واہ رے مذہب حق اہلسنت،

شیشے کے گھر میں بیٹھ کے پتھر ہیں پھینکتے
دیوار آہنی پہ حماقت تو دیکھئے!

یہ ہیں چند نمونے اس تحقیق انیق کے اور اس "امام" کی خدمات دینیہ دلیہ کے جس کو پون صدی بعد اہل علم میں متعارف کرانے کی غرض سے چند محقق و مدقق پاپڑ بیل رہے ہیں۔ اب جبکہ پورے عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت پہلے سے سوگنا زیادہ ہو گئی ہے، تفریق بین المسلمین کا فریضہ انگلینڈ کی فضاؤں میں بیٹھ کر انجام دیا جا رہا ہے اور ایک ایسے شخص کو جنگ آزادی کا مجاہد بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کی تمام عمر استخلاص وطن اور ملت کی سرفرازی میں لڑنے والوں کو دشنام دینے میں گزری۔ جس کا سرمایۂ حیات مسلمانوں کو کافر بنانا رہا۔ جس نے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا فتویٰ اس وقت دیا جب بڑا ساست مسلمان انگریز کے مقابلے میں حق کی حمایت میں سرفروشی و جاں سپاری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہم بہانگ دہل کہتے ہیں کہ ان بے جوڑ بے ناہ اور پھسپھسی تحریروں سے بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تاریخ گواہ ہے اس

قسم کی کوششیں ہر دور میں ہوتی رہیں مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ آج بھی خدمت دین کے ہر محاذ پر فرزندان دارالعلوم سرگرم عمل ہیں اور کل بھی انشاء اللہ انہی کا چراغ جلتا رہے گا۔ نہ پہلے کسی کی دال ان کے سامنے گلی ہے نہ اب گلتی ہے اور نہ آئندہ گلنے کی امید ہے۔ دارالعلوم کے فیض یافتہ پاک و ہند ہی میں نہیں اکناف عالم کے گوشے گوشے میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ خدمت دین متین کر رہے ہیں۔

پاکستان ہی میں دیکھئے ملک کے کونے کونے میں مدارس دینیہ کا جال بچھا ہوا ہے۔ جن سے ہزاروں تشنگان علوم اسلامیہ سیراب ہو کر نکلے ہیں۔ کون سا ایسا ملک اور کونسا ایسا شہر ہے جہاں اس طوبیٰ کے درخت کی شاخیں نہیں پہنچیں۔ یہ سب ان اکابرین کی للّٰہیت و اخلاص کا اثر ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں علوم نبویہ کی نشر و اشاعت میں کھپا دیں۔

ختم نبوت کی حفاظت کا محاذ ہو یا صحابہ کرام کی عظمت و معیاریت کا دارالعلوم ہی کے فرزند سینہ تانے ہوئے نظر آئیں گے۔ انکار حدیث کا فتنہ ہو یا تجدد پسندی کا خدائے قدوس نے انہی ابنائے دارالعلوم کو شرف بخشا ہے کہ وہ ان فتنوں کا علمی و تحریری پوسٹ مارٹم کریں۔

سیاسیات کے خارزار میدان میں بغیر اغیار کے سہارے اور بیساکھیوں کے اگر کھڑے ہیں تو یہی کھڑے ہیں۔ یہی ہیں دیوبند کے بلند ناز سپوت جن کی للکار سے آمریت و فسطائیت کے پرستار لرزہ براندام ہیں۔ آخر میں ہم مولانا ظفر علی خان مرحوم کے شعر پر اپنی گذارشات ختم کرتے ہیں۔

شاد باد و شاد زی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

مسئلہ تکفیر اور اکابر دیوبند

حضرت العلامہ مولانا شمس الحق افغانی سابق وزیر معارف ریاست قلات و
سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ بہاولپور

کافر بنانا عام علماء اسلام کے متعلق جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں مشہور کیا گیا ہے کہ علماء کافر بناتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے کہ علماء کافر بناتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ علماء کافر بتاتے ہیں بنانا اور بات ہے اور بتانا اور۔

اگر ایک آدمی اپنی عادت بد کی وجہ سے چوری اختیار کرے تو وہ خود اپنے قصد و ارادہ سے چور بن گیا، یہ ہوا بنانا، لیکن اگر وہ چور مسلمانوں کی بھیڑ میں گھس جائے تا کہ چوری کرے اور کوئی اسے جانتا نہ ہو پھر ایک واقف حال شخص مسلمانوں کو کہے، کہ خبردار یہ چور ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور احتیاط رکھو تو یہ چور بتانا ہوا بنانا نہیں، چور بنانا تو برا ہے لیکن چور بتانا ہمدردی اور احسان ہے کہ تحفظ مال ہو، اسی طرح عادت بد یا صحبت بد سے اگر کوئی شخص پیشہ ور گمراہ تحریر و تقریر سے کسی کا اسلامی عقیدہ بگاڑ دے اور عقیدہ حقہ چرا کر اس کے بدلے میں کافرانہ عقیدہ اس کے دل میں مضبوط کرے جیسے کسی کی جیب سے اصلی نوٹوں کا بنڈل نکال کر جعلی نوٹ ڈال دے، جس کی وجہ سے وہ اپنے قصد و ارادے کے تحت کفر کو اسلام کے نام سے موسوم کر دے اور اسلام کو کفر کے نام سے ملقب کرے، تو یہ کافر بنانا نہیں، کافر تو تبدیلی عقیدہ کی وجہ سے وہ خود بن گیا، علماء نے صرف بغرض ہمدردی مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ اس سے بچیں

وسیع اسلام یہ درست ہے کہ اسلام ایک وسیع مذہب ہے، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ ناواقفیت کی وجہ سے اس وسعت کی رو میں ایسا بہہ گیا کہ چاہے کوئی کچھ عقیدہ رکھے، لیکن جب وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو تو اس کو مسلمان سمجھا جائے، کافر نہ کہا جائے، یہ رائے غلط ہے، اسلام وسیع ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو اپنی ضد تک وسیع کیا جائے کہ اس کی مقابل چیز بھی اس کے دائرے میں آجائے، سورج کی روشنی وسیع ہے لیکن پھر بھی اپنی ضد یا مقابل جو تاریکی ہے سے جدا اور ممتاز ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تاریکی بھی روشنی سے موسوم ہو کر روشنی کہلائے، بہرحال وسیع چیز بھی لامحدود نہیں ہوتی، جس کی حد بندی نہ ہو سکے اور اپنی ضد تک اس کا دائرہ وسیع ہو، یہی وجہ ہے کہ چونکہ ایمان و کفر کے ثمرات و نتائج اور حدود ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور انسانی زندگی کے لئے ان کا تعین انتہائی اہم ہے۔

ایمان کا امتیاز نعمت عظیمہ ہے

انسانی زندگی کا اہم ترین مقصد دائمی حیات و راحت اور تمام تکلیفات و آلام سے تحفظ ہے جس کا اصطلاحی نام جنت و سعادت ہے اور انسانی حیات کے لئے مضر ترین چیز دائمی آلام و مصائب اور راحت و لذت سے محرومی ہے جس کا اصطلاحی نام دوزخ ہے۔

اول الذکر کے حصول کا واحد یقینی ذریعہ ایمان ہے اور دوسرے کا واحد سبب کفر ہے۔ اس لئے نافع ترین چیز ایمان اور مضر ترین چیز یعنی کفر کی معرفت انسان کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے تاکہ انسان سرچشمہ انعامات الٰہی سے بہرہ مند ہو اور سرچشمہ آلام و مصائب سے محفوظ رہے، ان دونوں کی معرفت تک عقل و حواس کی رسائی آسان نہ تھی اس لئے ارحم الراحمین نے بعثت انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا اور کتب اللہ نازل فرمائیں، تاکہ دریافت حقیقت ایمان و کفر میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور آسانی کے ساتھ دونوں کے حدود متعین ہو سکیں، تاکہ ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان سمجھ کر انسان برباد و تباہ نہ ہو۔ کفر و ایمان کے حدود کا تعین انسان کی حقیقی ہمدردی ہے اور دونوں کو خلط ملط کرنا انسانیت پر ظلم عظیم ہے۔

اس موضوع پر کتاب و سنت اور اقوال فقہاء و متکلمین کی تحقیقات کا لب لباب دیکھو ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری امام العصرؒ کی کتاب اکفار الملحدین فی ضروریات الدین، میں درج ہے جو مولانا خلیل احمد مصنف "بذل المجہود شرح ابی داؤد" حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علماء ہند، مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند و مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب فتح الملہم کی تصدیق و تصویب کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

تمہید :- تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور جملہ کتب سماویہ کے نزول کا اصلی اور اہم مقصد، ایمان و کفر کی حد بندی اور امتیاز ہے، تاکہ خلط ملط اور افراط و تفریط سے دونوں کا مفہوم محفوظ رکھ کر دونوں کے مفہوم کی مکمل حد بندی کی جائے، تاکہ نہ اس شخص کو جو عقیدۃً تعلیمات نبوت و ہدایات کتب سماویہ کے بموجب مومن ہو، اسس کو کفر میں داخل کیا جائے اور اسی طرح وہ شخص جو عقیدۃً کافر ہو، اس کو ایمان اور ملت اسلامیہ میں داخل کیا جائے، مقدم الذکر غلط تنگی اور موخر الذکر نامعقول توسیع ہے اور دونوں جرم عظیم ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان کو کفر سمجھنا اور دوسری صورت میں کفر کو ایمان سمجھنے کا ارتکاب لازم آتا ہے جو بعثت انبیاء علیہم السلام اور انزال کتب سماویہ کے مقصد کو فنا کرنا ہے۔

اکفار الملحدین صفحہ ۲ پر امام ابوالمعالی سے نقل ہے

ادخال الکافر فی الملۃ واخراج عنھا عظیم فی الدین

کافر کو اسلام میں داخل کرنا اور مومن کو ملت سے نکالنا اسلام میں جرم ہے۔

دونوں کی حد بندی کیلئے ایمان و کفر کے مفہوم کی وضاحت ضروری ہے ایمان شرعی اقرار و تصدیق و تسلیم کا نام ہے اور کفر انکار کا۔ جو دونوں کے لغوی معنی کے مطابق ہے۔ ایمان — امن سے ماخوذ لفظ ہے اور جب کسی امر یا کسی ذات کی بات کی تصدیق و تسلیم کی جائے تو تصدیق کنندہ نے اس امر اور قائل کو انکار و تکذیب سے مامون و محفوظ سمجھا اور جو انکار کرے، اس نے امر حق اور قائل حق کو چھپایا

اب وہ کون سے امور ہیں جن کے ماننے کا نام ایمان ہے اور نہ ماننے کا نام کفر ہے۔ وہ بالاتفاق ضروریات دین ہیں، جن سب کو ماننے کا نام، ایمان اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کا نام کفر ہے ایمان کل ضروریات دین ماننے کا نام ہے اور کفر بعض یا ایک کے نہ ماننے کا یا انکار کا نام ہے۔

اوّل موجبہ کلیہ ہے جس کی نقیض سالبہ جزئیہ ہے۔ موجبہ کلیہ، کل ضروریات کی تسلیم و تصدیق اور ایمان ہے کہ اس میں حق لغتہ انکار و تکذیب سے مامون ہوتا ہے اور سالبہ جزئیہ بعض ضروریات دین کا انکار جو لغتہً کفر یعنی ستر الحق ہے اور حق کی تکذیب ہے۔

ضروریات دین کیا ہیں؟

ضروریات دین جن سب کے ماننے پر ایمان اور کسی کے انکار پر کفر کا دارو مدار ہے۔ وہ امور ہیں جن کا دین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے ہونا جلی۔ بدیہی اور واضح ہو اور علماء اور متدین عام مسلمانوں کو بھی ان کا دین اسلام میں سے ہونا سب کو معلوم ہو، اگرچہ دین سے بے خبر اور جاہل لوگوں میں سے بعض کو معلوم نہ ہو، مثلاً توحید باری تعالیٰ ذات، صفات، افعال باری، نبوت، ختم نبوت، حشر نشر، حساب کتاب جنت، دوزخ، ارکان اسلام، نماز روزہ حج زکوٰۃ، حرمت خنزیر و شراب و سود یا قربانی و مسواک وغیرہ کہ ہر واقف اسلام ان امور کو اسلامی امور سمجھتا ہے، ان میں سے کسی ایک کا انکار کہ یہ امور اسلام میں سے نہیں، حالانکہ یہ امور تو تواتر سے ثابت ہیں، اگرچہ بعض ان میں سے فرض ہیں بعض فرض نہیں، جیسے قربانی یا داڑھی رکھنا۔ لہٰذا ان کا انکار کہ یہ اسلام میں نہیں کفر ہے۔ اگر کوئی مانتا ہو لیکن عمل نہ کرتا ہو یہ کفر کی حد میں داخل نہیں ہوتا۔

سمی ضروریات الدین لان کل واحد یعلم ان هذا من دین النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولابد منه فکونها من الدین ضروری وتدخل فی الایمان المجید ون ان الاتیان بها بالجوارح لابد منه کما یتوهم فقد یکون استحباب شیئ او اباحته ضروریا یکفر جاحده ولا یجب الاتیان به (اکفار الملحدین ص ۲)

ضروریات دین کا نام اس بنا پر ہے کہ ہر مسلمان متدین جانتا ہے کہ یہ امور دین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ اس لئے ان کا ثبوت دین میں سے ہونا ضروری ہے اگرچہ عمل ضروری نہ ہو یہاں تک کہ مستحبات و مباحات دینیہ بھی ضروریات دین میں داخل ہیں جب ان کا ثبوت متواتر ہو اور ان کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اوّل مثلاً قربانی، داڑھی رکھنا، عورتوں کا پردہ اسلام میں بیاہ کا نکاح کی قربانی کی اباحت، ان میں سے کسی کا نہ کرنا کفر نہیں لیکن نہ ماننا کفر ہے کیونکہ یہ انکار شریعت اور تکذیب شارع ہے جو کلمہ طیبہ کے مفہوم کے خلاف ہے خلاصہ یہ ہے کہ جو مامورات یا منہیات سینہ کتاب اللہ، سنت متواترہ اور تعامل مستمرہ اہل دین سے ثابت ہو، کہ ان کے جاننے میں علماً اور عوام یعنی دیندار مسلمان سب شریک ہوں، تو ان کا ماننا ایمان ہے اور کسی ایک کا انکار کفر ہے۔

اوّل صورت میں ضروریات دین کی کلیۃً تصدیق و تسلیم ہے اور دوسری صورت میں بعض کی تکذیب اور انکار ہے، یہ کفر ہے کیونکہ کل ضروریات دین کے ماننے کا نام ایمان ہے، اگر بعض سے بھی کفر و انکار ہو، تو وہ ایمان نہیں بلکہ کفر ہے۔ قرآن میں ہے

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

کیا تم کتاب کے بعض حصے مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔

ایمان کے لئے تین امور کا ہونا ضروری ہے۔

۱. ضروریات دین میں اللہ اور رسول کے فیصلے کو حرف آخر جاننا

۲. ان پر اختیاری تصدیق، انشراح صدر کے ساتھ یقین کرنا

۳۔ التزام شرعیہ وتسلیم کہ عملاً ان کو ماننا
سورۂ نساء میں ارشاد ہے۔
فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم
تیرے پروردگار کی قسم کہ مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ کو (رسول کو) فیصل ما بین ان جھگڑوں میں جو انمیں اٹھیں۔
اس سے امر اوّل ثابت ہوا کہ نزاع میں رسول اللہ کو منصف نہ ماننا ایمان کے خلاف ہے۔
ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت
پھر نہ پاویں تنگی اپنے جی میں تیرے فیصلے سے
اس سے امر دوم ثابت ہوا کہ آپ کے حکم وفیصلہ کو انشراح صدر اور دل کی خوشی سے یقین کرے، یہ تصدیق اختیاری ہے۔
ویسلموا تسلیما اور قبول کرے دل کی خوشی سے یعنی اس پر عمل کرنا قبول کرے اس سے امر سوم ثابت ہوا۔
اس سے معلوم ہوا کہ اگر ضروریات دین کا علم ویقین ہو، لیکن ان پر اختیاری تصدیق ویقین کرنا مقصود ہو، جیسے بعض اہل کتاب کہ
یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم
پہچانتے ہیں وہ آپ کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو
بعض اہل کتاب اپنی کتاب کی خبر کیوجہ سے صداقت نبوت کا یقین رکھتے تھے۔ جیسے ہرقل، بعض ارکان وفد نجاری اور موجودہ دور کے بعض مستشرقین عیسائی، لیکن شرح صدر اور التزام شریعت وتعلیم عملی سے ان کے قلوب خالی تھے۔ اس سے بھی ایمان حاصل نہیں ہوتا

ان تین امور کی عقلی توضیح

اجب تک ضروریات یعنی احکام قطعی الوہیت ورسالت پر یقین نہ ہو بلکہ شک وتردد ہو تو یہ ایمان نہیں، کیونکہ تمام عدالتوں میں شکوک بیان قابل اعتبار نہیں، نہ اس سے دعوی ثابت ہو سکتا ہے

اس طرح بلا تصدیق ویقین کے اللہ پر اس شخص کو جو تصدیق ویقین سے خالی ہو، اللہ اور رسول کا مصدق نہیں کہا جا سکتا اور نہ مومن ہو سکتا ہے۔
۲۔ تصدیق کے دو درجے ہیں۔ ایک علمی واضطراری درجہ جو اہلِ مسلم کتب اور عقلی دلائل سے مجبور ہو کر ضروریات واحکام نبوت کو صحیح یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن انشراح قلب اور خوشی سے یقین نہیں کرتا، یہ تصدیق بھی وہ ایمان نہیں، جس پر جزاء نجات وسعادت اخروی مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ جزا کا تعلق افعال اختیاریہ کے ساتھ ہے جو قلب کے فعل اختیاری کا نام ہے۔ جس کے لوازمات میں یہ بھی ہے کہ ایمان خاتم الانبیاء علیہم السلام اور اس کی شریعت محبوب قلبی ہو اور پرانے دین سے قلب میں بیزاری ہو، قدیم وجدید زمانے میں بہت سے افراد صداقت نبوت کے اعلان کے باوجود نہ اسلام ان کے لئے محبوب بنتا ہے اور نہ اپنے سابق دین سے بیزاری کا اثر ان میں پایا جاتا ہے۔
مستشرقین یورپ مثلاً لیبان، سرولیم میور، ڈاکٹر مارلس، جان ڈیون، ملکہ مانگائی اور گاندھی تک نے ایسی تصدیق کا اعلان تحریر کیا جو میری کتاب علوم القرآن میں کسی قدر درج ہے، ان کے اپنے دین کے جو احکام خلاف اسلام ہیں، ان کو بھی مانتے رہے، خواہ مذہب جدید عیسائیت ہو یا ہندو دھرم یا الحاد و کمیونزم کیونکہ ان کو اختیاری تصدیق حاصل نہ تھی جو ایمان کے لئے ضروری ہے اور اس غیر اختیاری تصدیق کا اسلام میں اعتبار نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام کے بہت احکام عقائد واعمال دین مسیحیت وہندو مذہب کے خلاف اور نقیض ہیں، لہٰذا صحیح اختیاری تصدیق اس کا نام ہے کہ اسلام کی تصدیق کے ساتھ اس کے خلاف نقیض احکام کا بھی انکار کیا جائے لیکن ان مصدقین نے ایسا نہیں کیا، لہٰذا ایمان کے لئے

جو اختیاری تصدیق ہے جس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سابق دین جس کے وہ احکام جو خلاف اسلام ہیں، ان کا بھی انکار کیا جائے، دونوں نقیض حق نہیں ہو سکتے اور نہ دونوں متضاد و متناقض احکام کی تصدیق اختیاری بیک وقت ممکن ہے۔

سوال:۔ اگر کوئی ضروریات دین کا منکر نہیں، بلکہ ان میں تاویل کرتا ہو، تو وہ مومن کہلائے گا؟

جواب:۔ مومن نہیں کہلائے گا کیونکہ کتاب و سنت متواتر اور سلف و خلف امت سے جو ضروریات دین اور ان کے معانی و مقاصد بالتواتر ثابت ہیں۔ ان کے معانی و مقاصد کی تبدیلی درحقیقت تاویل کی آڑ میں ضروریات کا انکار ہے جو مانع تکفیر نہیں ورنہ دین حق کا تشخص ختم ہو جائے گا اور ایمان و کفر میں امتیاز ختم ہو کر مقصد ارسال انبیاء علیہم السلام و انزال کتب سماویہ ختم ہو جائے گا۔ بالخصوص کہ وہ ضروریات سب محکمات ہیں متشابہات نہیں۔ متشابہات کی دیگر نصوص کتاب و سنت سے خیر القرون میں اگر صحیح تاویل منقول ہو تو وہ درحقیقت مراد الٰہی کا تعین ہے اور خلاف تواتر بھی نہیں اور نہ وہ ضروریات دین میں تاویل ہے بلکہ غیر ضروریات دین ہے ایمان کے مسئلے میں ضروریات کے سلسلے میں غیر ضروریات کی بحث لانا بے فائدہ ہے۔ ضروریات دین کی بحث گزر چکی ہے۔

ایثار الحق علی الخلق للحافظ محمد بن ابراہیم الیمانی ص۱۴۲

لان الکفر جحد الضروریات او تاویلها

یعنی کفر ضروریات دین کا انکار یا انہیں تاویل کرنا ہے۔

اکفار الملحدین ص۶۲-۶۱ میں ہے۔

والتاویل فی ضروریات الدین لا یدفع الکفر

ضروریات دین کی تاویل کفر سے نہیں بچاتی۔

خیال رہا شیہ العلامہ سیالکوٹی فی الفتوحات المکیۃ باب ص۲۸۹ میں ہے

التاویل الفاسد کالکفر

ضروریات دین میں فاسد تاویل کفر ہے۔

اکفار الملحدین ص۶۲ پر ہے۔

اجماع الامۃ علی تکفیر من خالف الدین المعلوم بالضرورۃ

دین کی ضروریات کی مخالفت کے کفر ہونے پر اجماع امت ہے۔ ص۶۵ پر نقلا من ایثار الحق علی الخلق ص۴۱۱ و نقل فی اکفار الملحدین من ایثار الحق علی الخلق ص۴۱۵

لا خلاف فی کفر من جحد ذالک المعلوم بالضرورۃ للجمیع واستتر بالتاویل فیما لا یمکن بالتاویل کالملاحدۃ

جمیع امت کا اس میں اختلاف نہیں کہ جو معلوم بالضرورت ہو اس کا انکار کفر ہے، اگرچہ یہ انکار تاویل کے پردے میں جبکہ یہ تاویل ایسی کھلی چیزیں میں ناممکن ہے جیسے ملاحدہ کی تاویل۔ اکفار ص۶۵

سوال:۔ اگر اسلام کی کھلی چیزوں سے کوئی انکار کرے، اگرچہ تاویل کر کے ایسا کرے، لیکن اگر وہ شخص کفر کا التزام نہ کرے۔ بلکہ اپنے کو مسلمان کہے، اگرچہ قانون اسلام سے کفر لازم آتا ہو تو کیا التزام کفر نہ کرنے سے وہ شخص کفر سے بچ سکتا ہے۔

جواب:۔ کفر سے نہیں بچ سکتا کیونکہ جس عقیدہ سے بوجہ انکار ضروریات دین کفر لازم آتا ہو، خواہ وہ التزام کفر نہ کرے جب بھی وہ کافر ہے۔ کیونکہ لزوم کفر کافر ہونے کے لئے کافی ہے۔ التزام کی ضرورت نہیں، اگرچہ عناد کی وجہ سے التزام کفر نہ کرے۔

فی الکلیات ولزوم الکفر المعلوم کفر اذا کان بینا فهو فی حکم الالتزام لا اللزوم مع عدم العلم قلت لیس فی عبارۃ المواقف التقیید بان یعلم ان اللزوم کفر انما فیه ان یعلم اللزوم

کلیات ابی البقاء میں ہے کہ کفر کا لزوم جب معلوم ہو جبکہ وہ کھلا ہو

تو وہ التزام کفر کے حکم میں ہے نہ کفر نا۔ علامہ اللزوم مواقف میں یہ قید مذکور نہیں بلکہ جب کسی قاعدہ سے قانون شرح کے مطابق کفر لازم آتا ہو وہ کفر کا التزام ہے چاہے اس لازم کا کفر ہونا اس کو معلوم نہ ہو (اکفار الملحدین ص۱۳) میں کہتا ہوں

کہ لزوم کفر جو اسکو معلوم نہ ہو تو ایسے جاہل کو جب عالم تبلادے تو پھر یقیناً لزوم اور التزام میں فرق نہ رہے گا۔ یواقیت شعرانی کی عبارت سے مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے دیکھو اکفار الملحدین ص۶۲ یعنی التزام بایں معنی کہ اس منکر ضروریات دین کی زبان سے یہ اقرار کرایا جائے کہ میں اس عقیدہ کے لازم کو مانتا ہوں، ضروری نہیں۔ بلکہ نفس الامر میں اس کا کفر ہونا کافی ہے۔ ورنہ تو روئے زمین پر کوئی کافر اپنی زبان سے اپنے کو خود کافر ہونے یا اپنے عقیدہ کے کفر ہونے کا اصرار نہیں کرتا۔ تو کافر کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

سوال:- اہل سنت کا یہ قول کہ:

لا نکفر احداً من اھل القبلۃ سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ رخ نماز پڑھنے والا خواہ کوئی عقیدہ رکھے اس کو کافر نہیں سمجھا جائے گا۔ جو قطعاً باطل ہے۔

الجواب:- اہل قبلہ سے فن علم العقائد وعلم الکلام میں وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریات اسلام کے معتقد ہوں، منکر نہ ہوں ورنہ وہ اہل قبلہ سے خارج ہیں۔

نبراس ص۵۷۲ میں ہے۔

"متکلمین کی اصطلاح میں اہل قبلہ وہ ہیں جو ضروریات دین کی تصدیق کرے یعنی وہ امور جن کا شریعت میں ثبوت ہوا اور مشہور ہو یہ ہے کہ جس نے ضروریات دین یعنی حدوث عالم اور حشر اجساد اور علم باری تعالیٰ فی الجزئیات نماز، روزہ کی فرضیت وغیرہ کا انکار کرے

وہ اہل قبلہ نہیں ہے۔

اور عدم تکفیر کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب سے غیر مشہور امور خفیہ کے انکار سے کافر نہ ہوگا۔ یہی بات ہے جس کی محققین نے تحقیق کی ہے" (ترجمہ)

رد المختار جلد نمبر ۳ باب الردۃ ص۳۰۷ میں ہے:۔

لا خلاف فی کفر المخالف فی ضروریات الاسلام وان کان من اھل القبلۃ المواظب طول عمرہ علی الطاعات کما فی الشرح التحریر وفی جوھرۃ التوحید ومن لمعلوم ضروری جحد من دیننا یقتل کفرا لیس حد۔ (والتفصیل فی اکفار الملحدین ص۱۱ تا ص۱۲)

بہر حال مذکورہ حوالہ جات اور ایسے بے شمار حوالہ جات کا مقصد یہ ہے کہ اہل قبلہ سے مراد ضروریات اسلام کے ماننے والے ہیں کیونکہ ضروریات دین کا منکر اسلام سے اور اہل قبلہ سے خارج ہے۔

شرح تحریر اصول ج۳ ص۳۱۸ میں امام اعظمؒ کا لفظ یہ ہے

عن ابی حنیفۃ لا نکفر اھل القبلۃ مذھب فقیدھنیۃ۔

پس مراد یہ ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر گناہ کے سبب درست نہیں جیسے معتزلہ اور خوارج کا خیال ہے نہ یہ کہ منکر ضروریات اسلام ہونے پر تکفیر نہ ہوگی۔ کیونکہ تکفیر منکر ضروریات دین پر اجماع امت ہے نیز خود لا نکفر احداً من اھل القبلۃ کے لفظ میں بھی دلالت موجود ہے کہ اہل قبلہ سے مراد معتقد ضروریات دین ہے، کیونکہ لا نکفر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اہل قبلہ ہونا اور کافر ہونا دو مقابل چیزیں ہیں۔

کفر چونکہ ضروریات اسلام کے انکار کا نام ہے تو اہل قبلہ معتقد ضروریات دین کا نام ہوگا۔ ورنہ تقابل غلط رہے گا

باقی ۶۲۷ صفحہ پر

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلھم　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اکابر دارالعلوم تحقیق و تدقیق کے آئینے میں

مولانا حافظ مقبول احمد (برطانیہ)

اللہ کریم نے دین متین کی جس خدمت کے لئے خاندان ولی اللہی کو منتخب فرمایا تھا ٹھیک اس طرح اکابر دارالعلوم دیوبند ان کے وارث و جانشین ثابت ہوئے۔ اکابر دارالعلوم کی للہیت، علمی و عملی کمالات اور اسلامی خدمات کی ایک دنیا معترف ہے۔ بحمد اللہ اس خاندان کا ہر فرد پیکر خلوص و للہیت، مجسمۂ تقویٰ و طہارت اور آسمان علم و عمل کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکا۔ ظلم و جہالت اور ضلالت و گمراہی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو ان حضرات نے کتاب و سنت اور معارف نبوت کے انوار سے منور فرما کر ساحل مراد پہنچایا۔

کتاب و سنت کے احکامات ظاہریہ ہوں یا اسرار و رموز باطنیہ، سب ان کا حصہ تھے۔ اکابر دیوبند کا علمی و عملی مقام تو صاحب بصیرت حضرات ہی معلوم کر سکتے ہیں ایک طالب علم ان کے مقامات رفیعہ کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ اکابر کے علمی تحقیقی اور عرفانی کارناموں کی کچھ جھلکیاں ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہیں۔

۱۔ حضرت مولینا حکیم الاسلام قاری محمد طیب صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا عزیز الرحمٰن رح نے جنہیں گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس منصب افتاء پر متمکن فرمایا تھا۔ ایک رات سونے سے قبل یہ سوچنے لگے کہ قرآن کریم میں بالتصریح یہ آ رہا ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ کہ آدمی کو اپنا عمل اور اپنی محنت ہی کام آئے گا۔ اس کے برعکس احادیث و آثار صحابہ سے ایصال ثواب کا مؤثر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ یہ بظاہر ایک ایسا تعارض ہے جو رفع نہیں ہو پاتا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ بہت سوچتے رہے اور مختلف کتب کی طرف مراجعت فرماتے رہے۔ مگر تشفی نہ ہوئی۔ بستر پہ دراز ہوئے تو نیند نہیں آ رہی۔ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اگر اسی حالت میں موت واقع ہو گئی تو قرآن کریم کی ایک آیت میں متردد ہونے کی حالت میں مروں گا جو سراسر محرومی ہے۔ بستر سے اٹھے اور اس تردد و تشکک کو اور آیت و احادیث کے تعارض کو اپنے شیخ، مرشد اور شفیق استاذ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے حل کروانے کے لئے رات کی تاریکی میں دیوبند سے گنگوہ شریف کی طرف پیدل چل دیئے۔ رات بھر چل کر تہجد کے وقت گنگوہ پہنچے۔ حضرت گنگوہی رح تہجد کا وضو فرما رہے تھے کہ تاریکی میں ایک آنے والے مہمان کو محسوس فرما کر گویا ہوئے کون؟ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے عرض کیا حضرت عزیز الرحمٰن! فرمایا اس وقت کیوں اور کیسے؟ اس پر ماجرا کہہ سنایا کہ حضرت ابتدائے شب ہی سے لیس للانسان الا ما سعیٰ کی آیت اور ایصال ثواب کی روایات جن سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ایک کی نیکی اور اس کا

اجر دوسرے بھائی کو مل سکتا ہے اور قرآن میں اس کی نفی کہ ہر ایک کو اپنی محنت ہی کا اجر و ثمر ملے گا۔ اور اس کا تضاد بے چین کئے ہوئے تھا مطالعہ کتب اور مراجعت سے مسئلہ حل نہ ہوا تو شرفِ باریابی نے کھینچ کر حاضر خدمت کر دیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بلا تامل و توقف فرمایا کہ مولانا لیس للانسان الا ما سعیٰ میں سعی سے سعی ایمانی مراد ہے کہ ایمان تو ہر ایک کے اپنا ہی کام آئے گا اور روایات و احادیث صحیحہ جن سے ایصال ثواب ثابت ہو رہا ہے وہاں سعی ایمانی نہیں بلکہ سعی عملی ہے تو حاصل یہ ہوا کہ ایمان تو اپنا اپنا کام آئے گا جس کی تصریح مذکورہ آیت میں ہے۔ البتہ اعمال ایک کے دوسرے کو منتقل ہو سکتے ہیں۔ جس کا ذکر احادیث و روایات میں آ رہا ہے حضرت کا یہ جواب سن کر بے ساختہ زبان پر یہ شعر آ رہا ہے ؎

اے بقائے تو جواب ہر سوال
مشکل است حل شود بے قیل و قال

۲۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ جب ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا عہد سلطنت تھا۔ سلطان موصوف نہایت ہی دیندار، خدا ترس اور خدا پرست تھے۔ دینی امور میں ذاتی دلچسپی لیتے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ سعودی علماء میں یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درود شریف میں حضور علیہ السلام کے نام کے ساتھ سیدنا کا اضافہ بدعت ہے اور ناجائز ہے۔ چنانچہ زائرین کے مواجہہ شریفہ پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے وقت اس کی نگرانی رکھی جاتی کہ کوئی شخص درود و سلام کے صیغوں میں سیدنا کا استعمال نہ کر سکے۔ حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ کو اس بات کی سخت تکلیف تھی اور لفظ سیدنا کا استعمال حضرت کا اپنا معمول تھا۔ ایک دن آپ روضۂ مسجد نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن بلیہد کے پاس بیٹھے تھے اور سلطان عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے برابر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے موقع غنیمت پا کر قاضی صاحب مذکور سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت فرما کر جواب دیا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ ان حدیث میں آیا ہے۔ قاضی صاحب نے بہ تن گوش ہو کر حیرت کے ساتھ پوچھا کہاں آیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ انا سید ولد آدم ولا فخر۔ قاضی صاحب نے کہا ہاں اس طرح تو آیا ہے۔ مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو لفظ تعالیٰ لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا نہیں قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کیا کرو ایک جگہ حدیث میں آ گیا بس کافی ہے۔ سلطان اس مکالمہ کو بغور سن رہے تھے۔ اب انہوں قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں ممانعت بھی آئی ہے کہ سیدنا کو میرے نام کے ساتھ استعمال نہ کیا کرو۔ جواب دیا ممانعت کہیں نہیں آئی۔ سلطان نے فرمایا کہ جب ایک جگہ آ گیا تو ممانعت کہیں نہیں آئی تو پھر اس کے استعمال پر اتنا تشدد کیوں کیا جاتا ہے۔ جو شخص سیدنا حضور کے نام نامی کے ساتھ استعمال کرے۔ اسے شرک اور تبدع کے لقب سے یاد کیا جائے۔ یہ حضرت کی قاضی اور سلطان عبدالعزیز مرحوم سے پہلی ملاقات تھی جس میں حضرت نے اپنا حق ادا فرما دیا۔ اگلے دن نجدیوں میں حضرت کی گفتگو کا شور برپا رہا۔ پھر شرک و تبدع کی صدا کان میں نہ آئی۔ اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ قاضی مذکور اہم مسائل میں حضرت رحمۃ اللہ کی طرف رجوع کرنے لگے اور شدہ شدہ حضرت کے علم و فضل اور تقویٰ کا ایک مقام ان کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اکثر و بیشتر حضرت کے مکان پر حاضری دیتے اور دیر دیر تک مصروف مکالمہ رہتے۔

اس مضمون سے متعلق خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی تحقیق انیق تو اس سلسلہ میں حرف آخر معلوم ہوتی ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ سیدنا کا

لفظ بڑھا دینا مستحب ہے۔ چنانچہ درمختار میں لکھا ہے کہ "سیدنا" کا بڑھا دینا مستحب ہے۔ اس لئے کہ ایسی چیز کی زیادتی جو واقعہ میں موجود ہو عین ادب ہے جیسا کہ رملی شافعی رحمۃ اللہ وغیرہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ الخ۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سید ہونا ایک امر واقعی ہے۔ لہٰذا اس کے بڑھانے میں کوئی اشکال کی بات نہیں بلکہ ادب ہی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس سے منع کرتے ہیں۔ غالباً ان کو ابو داؤد شریف کی ایک حدیث سے اشتباہ ہو رہا ہے۔ ابو داؤد شریف میں ایک صحابی ابومطرف رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں ایک وفد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہم نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا "انت سیدنا" آپ ہمارے سردار ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "السید اللہ" کہ حقیقی سید تو اللہ ہی ہیں اور یہ ارشاد عالی بالکل صحیح ہے۔ یقیناً حقیقی سیادت اور کامل سیادت اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر "سیدنا" کا بڑھانا ناجائز ہے۔ بالخصوص جبکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں بروایت شیخین (بخاری مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے أنا سید الناس یوم القیامۃ الحدیث کہ میں قیامت کے دن لوگوں کا سردار ہونگا۔ اور دوسری حدیث میں مسلم کی روایت سے نقل ہے

سیدنا محمدؐ کہتے ہیں، اور اس میں بحث ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ نماز میں تو ظاہر ہے کہ نہ کہنا چاہیئے۔ نماز کے علاوہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر انکار کیا تھا جس نے آپ کو سیدنا سے خطاب کیا تھا۔ جیسا کہ حدیث مشہور میں ہے وہی حدیث ابوداؤد جو اوپر گذری ہے، لیکن حضورؐ کا انکار احتمال رکھتا ہے کہ تواضع ہو یا منہ پر تعریف کرنے کو پسند نہ کیا ہو یا اس وجہ سے کہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا یا اس وجہ سے کہ انہوں نے مبالغہ بہت کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ ہمارے سردار ہیں۔ آپ ہمارے باپ ہیں۔ آپ ہم سے فضیلت میں بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ ہم پر فضل کرنے میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور آپ جفنۃ الغراء ہیں۔ یہ بھی زمانہ جاہلیت کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ وہ اپنے اس سردار کو جو بڑا کہلانے والا ہو اور بڑے بڑے پیالوں میں لوگوں کو دنبوں کی چکتی اور گھی سے لبریز پیالوں میں کھلاتا ہو اور آپ ایسے ہیں اور آپ ایسے ہیں تو ان سب باتوں کے مجموعہ پر حضورؐ نے انکار فرمایا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ شیطان تم کو مبالغہ میں نہ ڈال دے۔ حالانکہ صحیح حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ثابت ہے أنا سید ولد آدم کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔ نیز حضورؐ کا قول ثابت ہے اپنے نواسہ حسن رضی اللہ عنہ کے لئے ابنی ہذا سید میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اسی طرح سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سعدؓ کے بارے میں ان کی قوم کو یہ کہنا قوموا الیٰ سیدکم کہ کھڑے ہو جاؤ اپنے سردار کے لئے اور امام نسائی کی کتاب "عمل الیوم واللیلۃ" میں حضرت سہل بن حنیفؓ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یا سیدی کے ساتھ خطاب کرنا وارد ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے درود میں اللّٰھم صل علی سید المرسلین کا لفظ وارد ہے۔ ان سب امور میں دلالت واضحہ ہے اور روشن دلائل ہیں۔ اس لفظ کے جواز میں اور جو اس کا انکار کرے وہ محتاج ہے اس بات کا کہ کوئی دلیل قائم کرے علاوہ اس حدیث کے جو اوپر گزری۔ اس لئے کہ اس میں احتمالات مذکورہ ہونے کی وجہ سے اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا الیٰ آخر ما ذکرہ۔ یہ تو ظاہر ہے۔ جیسا کہ اوپر بھی ذکر کیا گیا کہ کامل سیادت اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی وجہ سے اس کا اطلاق غیر اللہ پر ناجائز معلوم ہوتا ہو۔ قرآن پاک میں حضرت یحییٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں سیداً وحصوراً کا لفظ وارد ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا ارشاد منقول ہے وہ فرمایا کرتے تھے ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا یعنی بلالاً

ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار یعنی بلالؓ کو آزاد کیا۔ علامہ عینیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو حضرت سعدؓ کے بارے میں قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ یعنی اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ، کہا تو اس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس بات پر کہ اگر کوئی شخص سیدی اور مولائی کہے تو اس کو نہیں روکا جائے گا۔ اس لئے کہ سیادت کا مرجع اور مال اپنے ماتحتوں پر بڑائی ہے اور ان کے لئے حسن تدبیر اسی لئے خاوند کو سید کہا جاتا ہے۔ جب قرآن پاک میں وَاَلْفَیَا سَیِّدَہَا فرمایا حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ کیا کوئی شخص مدینہ منورہ میں اس کو مکروہ سمجھتا ہے کہ اپنے سردار کو یا سیدی کہے؟ انہوں نے فرمایا کوئی نہیں الخ۔ امام بخاریؒ نے اس کے جواز پر حضورؐ کے ارشاد من سیدکم سے بھی استدلال کیا ہے جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو خود امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں ذکر کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلمہ سے پوچھا من سیدکم کہ تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا جد بن قیس حضورؐ نے فرمایا بَلْ سَیِّدُکُمْ عَمْرُو بْنُ جَمُوْحٍ بلکہ تمہارا سردار عمرو بن جموح ہے۔ نیز اِذَا نَصَحَ الْعَبْدُ سَیِّدَہٗ مشہور حدیث ہے جو متعدد صحابہ کرامؓ سے حدیث کی اکثر کتابوں بخاری شریف وغیرہ میں مذکور ہے۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سے بخاری شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ کوئی شخص اطعم ربک وضی ربک نہ کہے یعنی اپنے آقا کو رب کے لفظ سے تعبیر نہ کرے۔ ولیقل سیدی ومولای بلکہ یوں کہے کہ میرا سید اور میرا مولیٰ کہنے کا حکم صاف ہے ۵

اسی کاروانِ شریعت و طریقت کے ایک قافلہ سالار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کی ذات گرامی حضرات صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کا نمونہ بن کر ہی دنیا میں آئی تھی۔ شانِ تفویض کی مجسم تصویر، بحرِ توحید کی غواص، تسلیم و رضا میں غرق اور توکل و اعتماد میں فنا، شریعت میں عالم متبحر تھے مگر طریقت کا آپ پر ایسا غلبہ تھا کہ دیکھنے والا آپ کو مولوی اور عالم نہ سمجھتا۔ یکسوئی اور وحدت نشینی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ آپ جس قدر دنیا سے بھاگتے، گھبراتے اور دامن چھڑاتے تھے اسی قدر دنیا آپ کا تعاقب کرتی۔ لپکتی اور دامن پکڑتی تھی۔ اللہ کریم نے آپ پر اپنے فیضانِ خاص سے وہ بارش برسائی ہے اور آپ پر وہ علوم کھولے ہیں جن کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

تذکرۃ الخلیل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے مناقشات و مشاجراتِ صحابہ کی ایک ایسی عمدہ توجیہ منقول ہے جو حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ایک مرتبہ بعد عصر آپ حسبِ معمول صحن باغ میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے اور چاروں طرف مونڈھوں پر خدام و حاضرین کا ایک کثیر مجمع چاند کا ہالہ بنا بیٹھا تھا کہ راؤ مراد علی خان صاحب نے حضراتِ صحابہ کی باہمی جنگ و رنجش کا تذکرہ شروع کر دیا اور اس پر رائے زنی ہونے لگی کہ فلاں نے غلطی کی اور فلاں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا یہاں تک نوبت پہنچی تو دفعۃً حضرت کو جوش آگیا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی اور جھرجھری لے کر حضرت سنبھلے اور فرمایا کہ راؤ صاحب! ایک مختصر سی بات میری سن لیجئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مخلوق کو قیامت تک پیش آنے والی تمامی ضروریاتِ دین و دنیا سے باخبر کرنے کے لئے تشریف لائے تھے اور ظاہر ہے کہ وقت اتنی بڑی تعلیم کے لئے آپ کو بہت ہی تھوڑا دیا گیا تھا۔ اس تعلیم کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے حوادث اور واقعات پیش آنے کی ضرورت تھی کہ ان پر حکم اور عمل مرتب ہو تو دنیا سیکھے کہ فلاں واقعہ میں یوں ہونا چاہیئے۔ پس اصول کے درجہ میں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں رہا۔ جو حضرت روحی فداہ کے زمانہ بابرکت میں حادث نہ ہو چکا ہو۔ اب واقعات تھے دو قسم کے ایک وہ جو منصب نبوت کے خلاف نہیں اور دوسرے وہ جو عظمت شان نبوت کے منافی ہیں۔ پس جو واقعات منصب نبوت کے خلاف نہ تھے وہ تو خود حضرت پر پیش آئے مثلاً تزویج اور اولاد کا پیدا ہونا ان کا مرنا، دفنانا،

کفنانا وغیرہ وغیرہ تمام خوشی و غمی کے واقعات حضرات کو پیش آگئے اور دنیا کو عملاً یہ سبق مل گیا کہ عزیز کے مرنے پر ہم کو فلاں فلاں کام کرنا مناسب ہے اور فلاں نامناسب، اور کسی کی ولادت و ختنہ و نکاح وغیرہ کی خوشی کے موقع پر یہ بات جائز ہے اور یہ خلافِ سنت۔

مگر وہ واقعات باقی ہیں جو رسول پہ پیش آویں تو عظمت رسالت کے خلاف ہو اور نہ پیش آویں تو تعلیم محمدی ناتمام رہے۔ مثلاً زنا و چوری وغیرہ ہو تو اس طرح حد و تعزیر ہونا چاہیئے اور باہم جنگ و قتال یا نفسانی اغراض پر دنیوی امور میں نزاع و رنجش ہو تو اس طرح اصلاح ہونا چاہیئے۔ یہ امور ذاتِ محمدی پہ پیش آنا کسی طرح مناسب نہ تھے اور ضرورت تھی پیش آنے کی۔

لہٰذا حضرات صحابہؓ نے اپنے نفوس کو پیش کیا کہ ہم خدام و غلام آخر کس مصرف کے ہیں جو امور حضرت کی شان کے خلاف ہیں وہ ہم پہ پیش آویں اور حکم و نتیجہ مرتب کیا جائے تاکہ دین کی تکمیل ہو جائے۔ چنانچہ حضرات صحابہ پہ وہ سب ہی کچھ پیش آگیا جو آئندہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے رشد و ہدایت بنا اور دنیا کے ہر بھلے برے کو معلوم ہو گیا کہ فلاں واقعہ میں یہ کرنا اور اس طرح مناسب ہے اور یہ کرنا اور اس طرح کرنا نامناسب۔ پس کوئی ہو ایسا باہمت جان نثار جو تکمیلِ دین محمدی کی خاطر ہر ذلت کو عزت اور عیب کو ہنر سمجھ کر نشانۂ ملامت بننے پر فخر کرے اور بزبانِ حال کہے کہ ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

شہرت و نیک نامی اور عزت و نام آوری سب چاہا کرتے ہیں مگر اس کا مزہ کسی عاشق سے پوچھو کہ جاں نثاری میں کیا لطف ہے۔ اور کوچۂ معشوق کی ننگ و عار کیا لذیذ بنتی ہے ؎

از ننگ چہ گوئی مرا نام ز ننگ است
از نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است

(شرم و عار کو کیا کہتے ہو مجھے تو اس عار سے ہی نام میسر ہے اور نام آوری کو کیا پوچھتے ہو مجھے تو نام آوری سے ہی عار آتی ہے) سچے عاشق تو اس طرح ہماری تمہاری اصلاح و تعلیم کی خاطر اپنی عزت آبرو نثار کریں اور ہم ان کے منصف و ڈپٹی بنکر تیرہ سو برس بعد ان کے مقدمات کا فیصلہ دینے کے لئے بیٹھیں اور نکتہ چینیاں کر کے اپنی عاقبت گندی کریں۔ اس سے کیا حاصل۔ اللہ اللہ فی اصحابی لاتتخذوھم من بعدی غرضًا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق کہ ان کو میرے بعد نشانۂ ملامت نہ بنائیو) دیر تک آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ دہن مبارک سے پھول جھڑتے اور سامعین کے مشام جان میں جگہ پکڑتے رہے۔

شریعت کے معارف و حقائق اکابر دارالعلوم کی جان تھے۔ یہی حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے۔ ضعف کی وجہ سے کروٹ بدلنا مشکل ہو گیا پھر مرض سے کچھ افاقہ ہو گیا۔ مگر ضعف کی وہی حالت رہی کہ دودھ پینے کے لئے چمچہ ہاتھ میں تھامتے تو ہاتھ کانپتا اور چمچہ پکڑا نہ جاتا۔ ایک مزاج شناس خادم نے طبیب کو رائے دی کہ ادویات مقویات اور مفرحات کا استعمال بے کار ہے کوئی کتاب جس میں معارف و حقائق ہوں سنانا شروع کر دیجئے۔ کہ روزانہ قوت بڑھتی رہے گی۔ چنانچہ غالبًا حجۃ اللہ البالغہ کا اشراق کے وقت سے سنانا حکیم صاحب نے معمول بنا لیا۔ حضرت بڑے شوق سے سنتے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے بعض دفعہ جوش میں اٹھ بیٹھتے۔

حق باطل کی معرفت کا معیار

اسی زمانہ میں ایک دن آپ کی مجلس میں بدعت و

سنت کے مسائل اختلافیہ کی بحث چل نکلی ۔ آپ دیر تک سنتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ میرے نزدیک دلائل علمیہ کے علاوہ حق و باطل کو پہچاننے کا ایک معیار اور بھی ہے ۔ وہ یہ کہ قدرت نے ہر چیز میں اس کے ہم جنس کی طرف کشش کا مادہ رکھا ہے کہ ؎

کبوتر با کبوتر باز با باز

اور قدرت کا یہ عطیہ جس کو فطرت کہنا چاہیئے ۔ اجسام ہوں یا اعراض سب ہی میں جاری و ساری ہے ۔ پس جس فعل سے متعلق یہ شبہ ہو کہ نہ معلوم حق ہے یا باطل اس میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی طرف میلان کن قلوب کا ہوا ۔ اور کشش کس قسم کے لوگوں کی ہے ؛ پس اگر دیکھو کہ بددین ، فساق و فجار کو ابتداءً اس کی طرف حرکت ہوئی اور وہی قلوب جوش و خروش کے ساتھ اس کی طرف لپکے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں ضرور ظلمت ہے ۔ اگرچہ ظاہری صورت نورانی معلوم ہوتی ہو کیونکہ اس میں اگر نور ہوتا تو ظلماتی قلوب کو جذب نہ کرتا ۔ بلکہ وہ اس سے بھاگتے اور اولیاء صلحاء کے نورانی قلوب اس کی جانب کھینچتے ۔ اور اگر کسی فعل کو دیکھو کہ دیندار اہل اللہ اس کی طرف جاتے اور عوام و بازاری لوگ اس سے بھاگتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں نورانیت ہے کہ اہل نور کے قلوب کو اس کی طرف کشش ہوئی اور ظلماتی قلوب نے اس سے وحشت کھائی ۔ پس عوام کا کسی اختلافی مسئلہ میں یہ کہنا کہ ہم تو بے پڑھے ہیں اور دونوں طرف مولوی ہیں ۔ پھر ہم کیونکر سمجھیں کہ کون حق پر خدا کے نزدیک معتبر اور قابل قبول نہ ہوگا ۔ بالخصوص جبکہ وہ دونوں طرف علماء ہونے کے قائل ہو کر بھی ایک طرف جھکے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شق کو ان کے نفوس نے ترجیح دے کر اختیار کیا اور اپنے اوپر سے الزام اتارنے کے لئے مولوی حضرات میں فیصلہ نہ کر سکنے کا عذر تراشا ہے ۔ اس طرح پر ذرا غور کر لینے پر ہر اَن پڑھ سے اَن پڑھ حق و باطل سمجھ سکتا ہے ۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ رسومات و بدعات رائجہ کی طرف یا وہ بازاری عوام جھکتے ہیں ۔ جن کو نماز روزہ تک سے وحشت اور بے تعلقی ہے یا وہ پڑھے لکھے قائل ہوتے ہیں جن کی نورانیت قلوب کو حب جاہ و مال نے دبا رکھا ہے ۔ اور اگر کوئی مخلص دھوکہ کھا کر ادھر چلا بھی گیا تو خود اپنے قلب کو ٹٹول لے کہ وہ کشش نہ ہوگی جو درود و نماز روزہ جیسی کھلی اور صاف عبادات کی طرف خود اسے محسوس ہوتی ہے اور اسی لئے امید ہے کہ انشاء اللہ کسی وقت خود اس کا قلب اس کی رہبری کرے گا اور وہ متنبہ ہو کر نور سنت کی طرف ضرور آ جائے گا ۔

حکیم امت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنی طبعی زندگی میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ رہتی دنیا تک ثبت رہیں گے لاکھوں بندگانِ خدا کی تعلیم و تربیت کے اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہزاروں کتب کی تصنیف و تالیف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندہ کرامت ہے کہ

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید کے بمصداق

آپ کی یہ تالیفی و تصنیفی خدمات اور تحقیقی کوششیں اور کاوشیں امتِ مسلمہ کے لئے تا قیامِ قیامت رہبر و رہنما ثابت ہوں گی ۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت ! اہلِ قبور سے اہل کشف ہی فیض حاصل کر سکتے ہیں یا عوام بھی ؟

حضرتِ موصوف نے جواباً فرمایا کہ فیض دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک تعلیم کا اور ایک تقویتِ نسبت کا پھر ایک ایک تو فیض ہے اور ایک اس کا ادراک یعنی معلوم کر لینا ہے ۔ پھر ادراک ایک فوری ہے اور ایک مسدریج ۔ یہ کئی صورتیں ہو گئیں ۔ پس فیضِ تعلیم تو اہل کشف کے ساتھ خاص ہے مگر وہ فیض تعلیم و تربیت ضروریہ کے لئے کافی نہیں اور فیض کی قسم ثانی یعنی تقویتِ نسبت کا فیض یہ اہل کشف کے ساتھ خاص نہیں ، یہ فیض غیر اہل کشف کو بھی ہو جاتا ہے ۔ اتنا فرق ہے کہ اہل کشف کو اس کا ادراک فوری طور پر ہو جاتا ہے اور غیر اہل کشف کو بتدریج ۔ لیکن بقاء اس فیض کو بھی نہیں ہوتا تاوقتیکہ اعمال سے اس کی بقاء کا اہتمام نہ کیا جائے ۔

پھر اس تمیر کے بیچ میں بھی تفاوت ہے۔ بعض کو فوراً یا زیادتِ اشغال سے اجتماع خواطر و قطع انکار حاصل ہو جاتا ہے جو مبتدی کی ادراک ہوتا ہے اور طریقہ اس کا سب کے لئے یہ ہے کہ قبر کے قریب بیٹھ کر اپنی اور میت کی روح کا تصور کرے اور دونوں میں اتصال کا خیال جمائے اور یہ سوچے کہ اتصال سے فلاں کیفیت مثلاً محبت یا خشیت وغیرہ میت کی روح سے میری روح پر فائض ہو رہی ہے اگر ابتداءً دل گھبرائے تو تنگ دل نہ ہو۔ انشاء اللہ تھوڑی اور جمعیت میسر ہوگی اور نفع حاصل ہوگا اور اس مراقبہ سے پہلے ایصال ثواب شرط نہیں لیکن اگر ایسا بھی کرے تو اس میں اس میت کا بھی نفع ہے جس سے یہ خود مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان مگر یہ تب ہی ہوگا جب وہ نسبت پہلے سے حاصل ہو اس مراقبہ سے نسبت کو تقویت حاصل ہوگی۔ باقی نفس نسبت یہ صرف اعمال و اشغال اور صحبتِ احیاء ہی سے حاصل ہوتی ہے ۔

یا تنگ نہ کر مجھے ناصح ناداں اتنا
یا لا کر تو دکھا دے مجھے کہ الیسی دہن ایسا

بقیہ از صفحہ ۶۲۰

خلاصہ کلام :- یہ ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے کہ دراصل وہ اللہ و رسول کی تکذیب ہے۔ جو منافی تصدیق ہو اور تاویل کے پردہ میں انکار وہ بھی کفر ہے۔ قبلہ کی طرف نماز پڑھنا اور ملازمت طاعت کے ساتھ جب کسی امر ضروریات دین سے انکار کرنے سے مانع تکفیر نہیں۔ بلکہ تکفیر لازم ہے اور وہ عقیدہ جو ضروریات دین ہے ہو اس کے انکار سے جب کفر لازم آتا ہو تو اگرچہ التزام کفر نہ ہو جب وہ منکر خارج از ایمان ہوگا۔ اور انکار ضروریات دین پر کفر لازم کے لئے التزام کرنے کی ضرورت نہیں خواہ التزام کفر کرے یا نہ کرے ۔

بریلوی اور دیوبندی نزاع

تصویر کا دوسرا رُخ

از شیخ نذیر حسین

مسلمانوں میں فقہی یا نظری اختلاف کوئی انوکھی چیز نہیں۔ خود صحابہ کرامؓ میں بعض فقہی مسائل کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں، امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ نے امام صاحب سے بعض مسائل کے بارے میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ابن الجوزیؒ کی معاصرانہ چشمک کتابوں میں مذکور ہے۔ امام سخاویؒ اور امام سیوطیؒ کے اختلافات اہل علم سے پوشیدہ نہ ہوں گے۔ ہندوستان میں مولانا عبدالحی فرنگی محل اور نواب سید صدیق حسن کے اختلافات ابھی کل کی بات ہے۔ اسی طرح بریلوی اور دیوبندی چپقلش علمی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں یہ صرف اختلاف ذوق و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس فکری اختلاف کا آغاز آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر مولانا سید اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے زمانے میں ہوا۔ مولانا خیرآبادی علوم عقلیہ کے امام، ادیب اور شعر و سخن کے ناقد تھے۔ مشہور شاعر غالب نے اپنا دیوان ان ہی کی اصلاح و مشورہ سے مرتب کیا تھا۔ مولانا شہید شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، علوم نقلیہ کے متبحر عالم اور ذہین و فطین نوجوان تھے۔ اس وقت مسلم معاشرے میں ہندوؤں کے زیر اثر بہت سی بدعات و رسوم رائج تھیں۔ جن کے خلاف مولانا اسمٰعیل شہید نے آواز اٹھائی۔ اور مسلمانوں کو اصلاح کی دعوت دی۔ مولانا شہید کے بعض خیالات سے مولانا خیرآبادی کو اختلاف تھا۔ یہ اختلافات محفل میلاد میں قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب اور امتناع نظیر خاتم النبیینؐ جیسے مسائل سے تھا۔ مولانا خیرآبادی دہلی میں ریذیڈنٹ دہلی کے سررشتہ دار تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مولانا اسمٰعیل کا وعظ جامع مسجد دہلی میں بند کرا دیا۔

اس زمانے میں پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی جس نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ انہیں اذان کہنے کی اجازت نہ تھی بلکہ بعض مقامات پر تو نماز باجماعت پر بھی قدغن تھی۔ مزید برآں مسلمانوں کی عزت و ناموس بھی محفوظ نہ تھی۔ شاہ شہیدؒ نے یہ حالات سن کر سکھوں سے جہاد کا عزم کیا۔ سید احمد شہیدؒ کی رفاقت میں سارے ہندوستان کا دورہ کر کے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا۔ جہاد کے لیے جماعت مجاہدین منظم کی اور صوبہ سرحد کے سکھوں سے نبرد آزما ہو گئے۔ بالآخر پٹھانوں کی غداری سے راہ حق میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اگر یہ تحریک اپنوں کی غداری اور اغیار کی ریشہ دوانیوں سے ناکامی کی موت نہ مر جاتی تو آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ہی پاکستان قائم ہو گیا ہوتا۔ مولانا خیرآبادی نے انگریزوں کی ملازمت چھوڑ کر ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت

کے الزام میں کالے پانی کی سزا پائی اور وہیں برس انڈیمان میں رہ کر اس دنیا سے عالم نور کو سدھارے، جہاں پہنچ کر سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔

شاہ اسمٰعیل کی شہادت اور مولانا شاہ محمد اسحٰق کی ہجرت کے بعد خانوادہ ولی اللّٰہی کے علوم و معارف کے وارث اور امین مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ہوئے، انہوں نے دیوبند اور سہارن پور میں مدارس عربیہ قائم کر کے علوم اسلامیہ کی بقاء کا سامان مہیا کر دیا۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم و مغفور کے زمانۂ صدر مدرسی میں نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلباء دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور انہوں نے رد بدعات اور غیر اسلامی رسوم و رواج کے استیصال میں قابلِ ستائش کام کیا، ان اکابر نے قومی تحریکات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اپنی علمی فضیلت، اخلاص اور بے لوثی سے عوام کے دل میں گھر کر لیا۔ شیخ الہند کا ترجمہ قرآن پاک اور اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی، مولانا تھانوی کی بیان القرآن، بہشتی زیور اور مواعظ گھر گھر پھیل گئے۔ مولانا خلیل احمدؒ سہارن پوری کی بذل المجہود، مولانا انور شاہ کی فیض الباری اور مولانا محمد زکریا کی اوجز المسالک شرح موطا امام مالک نے عالم عرب کے فضلا سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ مولانا احمد علی (انجمن خدام الدین) نے لاہور میں قرآن پاک کا حلقہ درس قائم کر کے مسلمانان پنجاب میں قرآن مجید کے افہام و تفہیم کا ذوق پیدا کیا اور انگریزی تعلیم یافتگان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کی، مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ساری عمر توحید و سنت کی ترویج اور فرق باطلہ کی تردید میں صرف کر دی۔ خاندان غزنویہ نے کتب حدیث کے تراجم شائع کیے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے رحمۃ اللعالمین لکھی۔ جو کتب سیرت میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان اور ان کے تلامذہ مہر و سالک کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اردو کو مسلمانان پنجاب کی قومی زبان بنا دیا، ورنہ یہاں بھی پنجابی اردو زبان کی مدمقابل ہوتی۔ یہ سب حضرات اکابر دیوبند کی محبت سے سرشار تھے۔

مولانا خیرآبادی کے افکار کے امین اور مبلغ مولانا فضل رسول بدایونی اور ان کے شاگرد مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی ہوئے ہیں، انہوں نے محافلِ میلاد میں صلوٰۃ و سلام کو اس زور شور سے جاری کیا کہ عوام نے اسلام اور ایمان کا دار و مدار اسی چیز کو سمجھ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے خدا جانے کن وجوہات کی بنا پر پوری صدی پیشتر کے نزاعی مسائل کو زندہ کر کے اکابر دیوبند کی تغلیط، تردید اور تنقیص میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کے خلف الصدق مولانا احمد رضا بریلوی نے ارباب ندوہ کو ایک عرصہ تک تفسیق اور تکفیر کا نشانہ بنائے رکھا، ان کے غیظ و غضب سے مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی مرحوم بھی نہ بچ سکے (دیکھیے سیرت مولانا محمد علی مونگیری از سید محمد الحسنی، مطبوعہ لکھنؤ) پنجاب میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان بھی تکفیر کا نشانہ بنے رہے (ملاحظہ ہو سرگزشت اقبال از عبد المجید سالک، مطبوعہ لاہور)

بہرحال انصاف سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ارباب دیوبند اپنے اکابر کے مختلف فیہ خیالات اور نظریات کی ترجیہ، تاویل اور مدافعت میں مصروف رہے اور انہوں نے اپنے دامن کو سب و شتم سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ملک میں مختلف سیاسی تحریکیں ابھرتی رہیں، کبھی کبھی سیاسی ہنگاموں کی گرم بازاری بھی ہو جاتی، لیکن بریلوی مکتب فکر (بجز ایک دو عالموں) قومی تحریکوں سے علیحدہ ہی رہا تا آنکہ ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی بعض پرجوش نوجوان شغل تکفیر کے نشے میں سرشار ہو کر اشتہار بازی سے دل تسکین حاصل کرتے رہے، آج سے پانچ چھ برس قبل تو اس لایعنی شغل نے خوفناک صورت اختیار کر لی تھی، جو بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔

اتحاد بین المسلمین کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا بہاء الحق قاسمی نے لاہور کے ایک معروف اخبار میں اہل السنت والجماعت کے

ان دونوں مکاتب فکر کو دعوت دی کہ وہ اپنے مسلک پر قائم رہ کر دوسرے مشرب کے علماء کا احترام کریں اور باہمی رواداری اور وسعت قلب و نظر سے کام لیتے ہوئے تکفیر اور تفسیق سے احتراز کریں، جیسا کہ طرفین کے بعض اکابر کا دستور رہا ہے، لیکن اس اخبار کے ایک کالم نویس کو ان کا یہ مضمون پسند نہیں آیا اور اس نے تفریق بین المسلمین کا سارا الزام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کی کتابوں پر ڈال دیا، اس نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں سے وہ عبارتیں نکال دی جائیں جن سے حضورؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔

مولانا تھانوی کی کتابیں ہم نے دیکھی ہیں، تفسیر بیان القرآن سے لے کر بہشتی زیور اور ان کے مواعظ تک — کیا نوائے وقت کے یہ مبصر ان مقالہ نویس مولانا تھانوی کی کسی کتاب کے قابل اعتراض فقروں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ رہی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان، تو یہ کتاب ہمیشہ سے ارباب بریلی و بدایوں کے لیے سرگرانی اور شائقین توحید و سنت کے لیے کحل البصر بنی رہی ہے۔ اس لیے اس کی اثر انگیزی کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی کا دلآویز تبصرہ ملاحظہ ہو۔

> "قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دی گئی، یہ پہلی کتاب ہے جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے، مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین اپنی جگہ قائم رہی۔"
>
> (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص ۸ تا ۹، مطبوعہ اعظم گڑھ)

مقالہ نویس اور اس کے ہم مسلک حضرات کو یہ کتابیں ناپسند ہیں، تو ہوا کریں۔ وہ اور ان کے ہم مشرب یہ کتابیں نہ پڑھیں۔ کہ ان کا پڑھنا فرض و فرمان نہیں ہے، لیکن وہ دوسروں کو ان اکابر کے علمی فیوض سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں، مجھے تو ڈر ہے، کہ کل کلاں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ حضرت علامہ اقبال چونکہ مولانا سید انور شاہ اور سید سلیمان ندوی کے علم و فضل کے مداح اور نیاز کیش تھے، لہٰذا ان (علامہ اقبال) کی کتابیں بھی نہ پڑھی جائیں۔

دوسری تجویز فاضل مقالہ نویس نے یہ پیش کی ہے کہ دیوبندی اور اہل حدیث فرض نمازوں کے بعد تین بار بلند آواز سے درود شریف پڑھنا شروع کر دیں۔ گزارش ہے کہ درود شریف کے فضائل کا کوئی بھی منکر نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ دیوبندی بیٹھ کر آہستہ سے درود شریف پڑھ لیتے ہیں، جب کہ بریلوی حضرات کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں، فاضل مقالہ نویس نے جس انداز اور زور و شور سے یہ تجویز پیش کی ہے کیا اس کی تائید میں کسی صحابی، کسی تابعی، کسی مجتہد، کسی مفسر یا کسی محدث یا کسی محقق عالم کا کوئی قول پیش کیا جا سکتا ہے، جس نے فرض نمازوں کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کو فرض عین قرار دیا ہو، ہندوستان میں نور اسلام کی مشعل مشائخ اہل چشت لائے ہیں، کیا ان میں سے کوئی شیخ طریقت فاضل مقالہ نگار کا ہم خیال اور مجوز رہا ہے، کیا اس بارے میں کسی تاریخ، کسی سوانح یا تذکرے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

فاضل معترض کو یہ شکایت ہے کہ بریلوی حضرات کو مشرک اور بدعتی کہا جاتا ہے۔ لیکن خود اس نے مضمون مذکورہ بالا میں اکابر دیوبند کو گستاخ اور بے ادب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور

تفریق بین المسلمین کا سارا الزام ان کی کتابوں پر ڈال دیا جاتا رہا ہے۔
کہ حضرات دیوبند نے عشق رسولؐ کا مظاہرہ زردے اور پلاؤ کی خوشبو
سے مہکی ہوئی محافل میلاد میں سلام و صلوٰۃ پڑھ کر نہیں کیا، بلکہ ان اکابر نے
بالاکوٹ کے میدانوں، لاہور، انبالہ، دہلی، پٹنہ کی جیلوں کی کال کوٹھڑیوں
اور جزائر انڈیمان اور مالٹا کے ویرانوں میں عملی طور پر پیش کیا ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ درود شریف پر مداومت اور کتب حدیث کی مزاولت سے
متابعت رسولؐ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کا اعلیٰ اخلاق، خدمت خلق،
عامۃ المسلمین کی صلاح و فلاح اور امت محمدیہ کی ہمدردی و خیر خواہی، غم خواری و
غم گساری اور راہ حق میں جان فروشی اور جاں سپاری کی صورت میں ظاہر ہوتے
ہیں۔ اگر یہ نہیں تو ذات پاک رسالت مآبؐ سے محبت اور عشق کا زبانی
دعویٰ قبول نہ ہوگا۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

حضرات دیوبند نے قیام پاکستان اور اس کے بعد ملک و ملت
کی جیسی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں تین چار
مثالیں عرض کرتا ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی اور
مفتی محمد شفیع (کراچی) نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم اور سلہٹ کے
استصواب رائے میں جو مساعی فرمائی ہیں اور مسلم لیگ کی جس اخلاص،
سرگرمی اور بے لوثی سے مدد کی ہے، تحریک پاکستان کا کوئی مورخ
ان کے مجاہدانہ کارناموں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ صوبہ سرحد میں خان برادران
کی مقبولیت کا طلسم ان کی کوششوں سے ٹوٹا، دستور ساز اسمبلی میں قرارداد
مقاصد ان کی سعی و کوشش اور اثر و رسوخ سے منظور ہوئی۔ مولانا محمد یوسف
بنوری، مولانا سید انور شاہ کے تلمیذ رشید اور دنیائے اسلام کے جلیل القدر
محدث اور ادیب ہیں، انہوں نے جس تدبر اور ہوشمندی سے تحریک ختم
نبوت جس میں تمام مکاتب فکر شامل تھے اس کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی سرپرستی میں تبلیغی جماعت کے لبستر
بردوش مبلغ اسلام کا پیغام گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں پہنچا رہے ہیں، مولانا
سید ابوالحسن علی ندوی کے علمی اور اصلاحی کارناموں سے اہل پاکستان بے خبر
نہ ہوں گے، انہوں نے بھارت کے مسلمانوں کے قومی تشخص کے تحفظ اور علوم
اسلامیہ کی بقا اور فروغ کے لیے خون اور پسینہ ایک کر دیا ہے"

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے متون احادیث
کی نشر و اشاعت کو مقصد حیات بنا رکھا ہے۔ انہوں نے مصنف
عبدالرزاق کو جس محنت و جانفشانی اور تصحیح و مراجعت کے بعد
ایڈٹ کیا ہے۔ اس کا اعتراف عرب ممالک کے فضلا کو بھی ہے۔

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

اب اہل علم حضرات یہ فیصلہ خود کر سکتے ہیں کہ کسی دوسرے
مسلک و مشرب کے اکابر کو بھی اسلام، اسلامی علوم و فنون اور امت محمدیہ
کی اس طرح خدمت کی توفیق ارزانی ہوئی ہے۔

آج سب سے بڑی قومی خدمت یہ ہے کہ نوجوانوں میں دینی
شعور پیدا کیا جائے، اسلام کی اہمیت کو ذہن نشین کرایا جائے، اسلام
کے معاشی و اقتصادی نظام کی اہمیت اور افادیت کو نئے ذوق
کے مطابق خوش سلیقگی سے پیش کیا جائے۔ فروعی اختلافات کا
زمانہ گزر چکا، اس پر بحث و مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ بے وقت
کی راگنی ہے۔

فوارہ مارکہ
اعلیٰ قسم کا
سوتی دھاگہ
سنگل اور فولڈڈ
۱۰ کاؤنٹ سے ۸۰ کاؤنٹ تک ہنکس کے علاوہ کونز پر
بھی دستیاب ہے

FOUNTAIN
تیارکنندگان:
ڈی۔ایم۔ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
کراچی
DOSTCOT
ORIENT

دیوبند اور علیگڑھ :۔

دو تحریکیں دو مکتب فکر

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور
امیر جمعیۃ علماء اسلام پنجاب

۱۸۵۷ء کا سال اقوام برصغیر بالخصوص مسلمانوں کے لئے اپنے جلو میں جو مصائب و آلام لے کر آیا اس کا دھندلا سا نقشہ بھی لرزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانان ہند نے مئی کے مہینہ میں دوسری اقوام کے اشتراک سے میرٹھ سے ایک تحریک کا آغاز کیا جو دیکھتے دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس تحریک کا مقصد غیر ملکی راج سے ملک کو آزاد کرانا اور اسلامی حکومت کے ابقاء و تحفظ کا اہتمام کرنا تھا لیکن ابھی مکمل کامیابی کا وقت شاید نہیں آیا تھا اس لئے نتائج مسلمانوں کے خلاف نکلے اور خاندان مغلیہ کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر رنگون کے قید خانہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اس خاندان کے شہزادوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا اور علماء و صلحاء کا نشان مٹانے کے لئے انتہائی شرمناک اور وحشت ناک رویہ اختیار کیا گیا۔ اس دور میں ظلم و ناانصافی کا کونسا طریق تھا جو اپنایا نہ گیا ہو اور تشدد و بربریت کا یہ کھیل محض اس لئے کھیلا گیا کہ انگریز بہادر کے اقتدار کو دوام و استحکام نصیب ہو جائے۔

اس تحریک سے چند سال پہلے ایک تحریک بالاکوٹ میں ناکامی پر منتج ہو چکی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد کمپنی کی حکومت کے اہلکار زیادہ ہی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ بقول امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

یہ واقعہ (واقعہ بالاکوٹ) ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا ایسٹ انڈیا کمپنی گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی مگر اب تک اس نے تجارتی لباس میں بدستور رہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس واقعہ سے دو سال بعد ۱۸۳۳ء میں یہ یک لخت تجارت کا لبادہ اتار کر حکومت کی مالک بن جاتی ہے فی ذٰلک لعبرۃ لاولی الالباب۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۰۵/۱۰۶

اپنی اغراض میں کسی درجہ کامیابی کے بعد کمپنی کے ارباب حل و عقد نے ذہنی انقلاب کی غرض سے اس تحریک کی ناکامی کے صرف چار برس بعد ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے یا فارسی سنسکرت میں! خوب لے دے ہوئی۔ ووٹنگ ہوئی تو ووٹ برابر تھے۔ کمیٹی کے سربراہ لارڈ میکالے نے کاسٹنگ ووٹ کے ذریعہ انگریزی کا حق تسلیم کروالیا۔ اس موقع پر یہ الفاظ تحریر کئے گئے

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریزی ہو"

(تاریخ التعلیم از میجر باسو ص ۸۵ بحوالہ روشن مستقبل)

گویا انگریز بہادر نے ذہنی طور پر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو مفلوج کرنے کی غرض سے اور انہیں اپنے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے قدیم نظام تعلیم کو ختم کر کے جدید نظام تعلیم کی بنا ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ ابھی دہلی کی مرکزیت اور اس کی علمی و تہذیبی بہاریں کسی نہ کسی درجہ میں قائم و باقی تھیں۔ فیلسوف اسلام حکیم الہند حضرت الامام الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کے والد گرامی مرتبت حضرت الشاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ رحیمیہ موجود تھا جس سے نہ صرف برصغیر بلکہ برصغیر سے باہر کی بھی دنیا مستفید ہوئی تھی۔ مولانا سندھیؒ نے شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک میں کسی سیاح عالم کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:۔

"میں نے برصغیر کا چپہ چپہ چھان مارا، کوئی عالم مجھے ایسا
نہ ملا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مدرسہ رحیمیہ سے فیض یاب نہ ہوا ہو"

اس کے علاوہ بھی ملک کے اطراف و اکناف میں مدارس و تعلیم گاہوں کی کمی نہ تھی۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھ کے متعلق کپتان ہملٹن کا قول ہے کہ:۔

"چار سو مختلف علوم و فنون کے کالج اس شہر میں موجود تھے اور
یہ زمانہ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کا تھا"

(سفرنامہ بحوالہ الفرقان ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ)

تعلیمی ہند نامی رسالہ میں مختلف چیزیں اس ضمن میں ذکر کی گئی ہیں۔

مثلاً:۔ انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں سے بھرا ہوا ہے ہر ۳۱ لڑکوں پر
ایک سکول ہے۔ (ص۲ بیان ریونٹ وارڈ ۱۸۲۱ء)

پروفیسر ماکس میلز کا بیان ہے:۔

برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار مدرسے تھے (ص۲)

مسٹر لڈلو نے اپنی کتاب تاریخ برطانوی ہند میں ہندوستان کے گاؤں گاؤں کے سکول، مدارس وغیرہ کی بڑی خوبی سے تعریف کی ہے (ص۲) اور جان میلکم نے اعتراف کیا تھا کہ جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا تو اس میں خوبی تعلیم کا سلسلہ بہت کافی طور پر موجود تھا (ص۱)

چنانچہ اس نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے ہی جدید نظام تعلیم کی تدوین و ترتیب کا سوچا گیا اور اس کی پشت پر چند در چند وجوہات تھیں۔ مثلاً یہ کہ انگریز نے امریکہ میں تعلیم کا سلسلہ جاری کر کے دیکھ لیا تھا کہ وہ ملک اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب یہ خطرہ برصغیر میں مول لینا مشکل تھا۔

اور دوسرے یہ کہ تعلیم اور غلامی کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں، تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ غلامی کا جوا اتار پھینکا جائے اور انگریز کو ملک سے نکال باہر کیا جائے جیسا کہ الکنس سمنڈسے نے اپنے بیان میں کہا تھا۔ دیکھیں تعلیمی ہند ص۱۷۸

گویا غلامی کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے اور اپنے جبر و تشدد کی رسی کو دراز کرنے کے لئے انگریز نے پرانا نظام تعلیم بدلا۔ مدارس و مساجد کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور اس کی جگہ تعلیم کے نام جو نظام نافذ کیا اس کے نفاذ و اجرا میں یہ بات مضمر تھی کہ غلامی کے جراثیم ذہنوں میں سما جائیں کیونکہ ؎

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

یہ ۱۸۳۵ء کی سوچ تھی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے پھر انگڑائی لی۔ اس وقت بھی بخت نے ان کا ساتھ نہ دیا تو انگریز کے وارے نیارے ہو گئے سچی بات یہ ہے کہ یہ دور اتنا وحشتناک تھا کہ الاماں۔

اقوام ہند بالخصوص مسلمان قوم کی جو حالت ہو چکی تھی اس کے بعد اس قوم کے دوبارہ پنپنے کا سوچنا بھی ایک مجنونانہ خواب تھا لیکن قافلہ حق و صداقت کے بچے کھچے افراد جو ۱۸۵۷ء تک باقاعدہ جنگی میدان میں انگریز کا مقابلہ کر چکے تھے، نے حالات کے پیش نظر رخ بدلا اور تباہ حال و خستہ حال قوم کی تعمیر نو کے لئے ایک نیا پروگرام بنایا۔

اس پروگرام کی بنیاد تعلیم پر رکھی گئی اور ایک باقاعدہ تعلیمی تحریک کا آغاز کیا گیا جس کی پہلی کڑی مادر علمی دارالعلوم دیوبند تھا۔ یہ دارالعلوم جس کا باقاعدہ افتتاح ۱۸۶۶ء میں دیوبند نامی ایک قصبہ میں ہوا۔ دراصل اس پرانے انداز فکر و عمل کی نئی صورت تھی جس کے بانی حضرت حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی قدس سرہ تھے بلکہ ان سے بھی پہلے جس کی بنیاد

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے رکھی تھی۔

حضرت حکیم الامت دہلوی مجدد سرہندی کے ساتھ اپنے تعلق کا کئی جگہ اظہار فرماتے ہیں اور ان کے کام کو اپنے کام کی بنیاد فرماتے ہیں اسی طرح فلسفہ ولی اللہی کے سب سے بڑے شارح امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمۃ شاہ صاحب دہلوی کو مجدد صاحب کے کام کی تکمیل کرنے والا فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے سراج الہند شاہ عبدالعزیزؒ جانشین ہے جنہوں نے اپنے آبا بزرگوار کے انقلابی پروگرام کی تکمیل کی خاطر بھرپور جدوجہد فرمائی۔ اس جدوجہد کا ایک حصہ سید احمد شہید اور حضرت الامام شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد حضرت الامام السید محمد اسحٰق (نواسہ شاہ عبدالعزیزؒ) نے تحریک کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ جب ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو استاد الکل مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ تعالیٰ ان کے نائب و جانشین قرار پائے۔

مولانا موصوف جس دور میں ولی اللہی میراث کو دنیا میں تقسیم کر رہے ہیں۔ وہ وقت سیاسی جبر و تشدد کا تھا لیکن اس زمانہ میں آپ کے حضور بعض ایسے شاگردوں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا جنہوں نے آئندہ چل کر تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ان شاگردوں میں قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند فقیہ العصر قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہی اور خود آپ کے صاحبزادہ گرامی مرتبت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح تھے۔ ان حضرات کی تربیت باطنی حضرت الامیر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے زیر سایہ ہوئی جو امام زمن میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہ کے خادم و خلیفہ اور جانشین برحق تھے حضرت میاں جی قدس سرہ شاہ عبدالرحیم ولایتی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے جو تحریک ولی اللہی کے قائد مکرم حضرت الامیر سید بریلوی کے اتباع خاص میں سے تھے۔ یہ تفصیل خود بتلاتی ہے کہ تحریک علمی یا بالفاظ دیگر تحریک دیوبند کے پس پردہ کیا عوامل کارفرما تھے! اور پھر یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ دیوبند کے لئے جو جگہ تجویز ہوئی۔ وہ وہی ہے جہاں سے حضرت الامیر سید بریلوی اور ان سے پہلے حضرت مجدد سرہندی کو بوئے علم آئی تھی۔

جناب سرسید احمد خان جو علی گڑھ کالج (بعد میں یونیورسٹی) کے بانی کی حیثیت سے متعارف ہوئے وہ بھی اتفاق سے مولانا مملوک علی قدس سرہ کے شاگرد تھے لیکن موصوف نے اپنے اسلاف کی متعین کردہ راہوں سے الگ ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ مولانا سندھی قدس سرہ انگریز سے تعاون کی راہ ارشاد فرماتے جبکہ دیوبند کو عدم تعاون کا علمبردار کہتے ہیں ایک استاد کے شاگردوں میں یہ اختلاف کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی اختلافات کا سلسلہ انسانی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اور اس تحریک ولی اللہی میں اس سے پہلے ایک اختلاف حادثہ بالاکوٹ کے بعد رونما ہو چکا تھا کیونکہ سید صاحب کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحب کے داماد مولانا نصیر الدین امیر منتخب ہوئے تو پارٹی میں امارت و قیادت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک دوسری وجہ سے اختلاف رونما ہوا۔ جس کی تفصیل یہ تھی کہ سید صاحب کی نعش مبارک نہ ملی تو ایک گروہ نے ان کی غیبوبت کا نظریہ قائم کر لیا جبکہ بیشتر حضرات شہادت کے قائل تھے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب کا طبقہ شہادت کا قائل تھا اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی یعنی صادق پوری جماعت غیبوبت کی قائل تھی۔

اسی طرح اب مولانا نانوتوی اور سرسید کے درمیان اختلاف ہوا۔ اور جماعت میں اس قسم کے اختلافات دوسرے مواقع پر بھی ظاہر ہوتے۔ مثلاً عمل جہاد کے بارے میں حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا شیخ محمد تھانوی کا اختلاف کہ اول الذکر اس کے علمبردار تھے اور انہوں نے ایسا کیا تو ثانی الذکر شرائط کے موجود نہ ہونے کے سبب (اپنے خیالوں کے مطابق) قائل نہ تھے (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۲۶) اور اسی نوعیت کا اختلاف حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے خدام میں رونما ہوا، جبکہ مولانا سندھی۔ مولانا مدنی۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا لاہوری، مولانا منصور انصاری قدس اللہ اسرارہم

جیسے حضرات نے انگریز سے عدم تعاون کی پالیسی اپنائی اور جنگ جاری رکھی تو مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ جیسے حضرات نے دلائل کے ساتھ اس موقف سے اختلاف کیا۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے حفاظت و احیاء اسلام کی خاطر قدیم نظام تعلیم کو اپنایا جوان کے بزرگوں سے انہیں ورثہ میں ملا تھا تو سرسید احمد خان نے اس روش پر سخت نکتہ چینی کی جیسا کہ تہذیب الاخلاق کی متعدد عبارتیں اس پر شاہد ہیں۔ مثلاً :-

"اس زمانہ میں پرانے طریق پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لئے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کئے ہیں۔ مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں۔"

(تہذیب الاخلاق ص۹۶ جلد دوم)

اس طرح کے اور بھی "ارشادات" ان کے قلم سے نکلے جنہیں بخوف طوالت نقل کرنا مشکل ہے۔ لیکن حضرات دیوبند قدس اللہ اسرارھم نے جوابا اس قسم کی کوئی ترش و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کبھی استعمال نہیں کی۔ انہوں نے دائرہ تہذیب و شرافت میں رہ کر وہ انداز اختیار کیا جس کا اختیار کرنا ان کے لئے ضروری تھا اور جس کی خدا اور اس کی مخلوق کی طرف سے ان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے دنیا اس پروپیگنڈے میں معروف ہے کہ علماء دیوبند انتہائی تنگ دل و تنگ ظرف تھے اور انہوں نے قوم کی تعمیر نو کے کام میں بجائے سرسید کا ہاتھ بٹانے الٹا ان کو مطعون کیا اور جدید علوم کی مخالفت کی۔ جہاں تک جدید علوم اور زبان انگریزی وغیرہ کی مخالفت کا تعلق ہے ایک بھی ٹھوس دلیل اس سلسلہ میں پیش کرنی مشکل ہے۔ الٹا ہمارے پاس ایسے دلائل ہیں کہ ان حضرات نے بڑی وسعت قلبی سے اس کی اجازت دی۔ مثلاً :-

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ جو گویا تحریک کے بنیادی دور کے اہم رہنما ہیں ان کی اجازت پر مشتمل فتوؤں کو خود سرسید صاحب نے اپنی معروف کتاب (اسباب بغاوت ہند کے ص۴۶) پر نقل کیا ہے۔ مزید فتاوی کیلئے مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتوی، فتاوی رشیدیہ میں مولانا سید الحی لکھنوی کا ارشاد مجموعہ فتاوی ص۱۱۱ ج ۱ پر اور مولانا اشرف علی تھانوی کا ارشاد فتاوی امدادیہ ص۱۹۰ ج ۴ پر موجود ہے۔ مزید نانوتوی قدس سرہ کی خواہش جو انگریزی زبان سیکھنے سے متعلق ہے۔ ایک معروف واقعہ ہے۔ گو کہ قدرت نے آپ کو مہلت نہ دی اور اس کے بعد ہمارے لاتعداد بزرگ ایسے تھے اور ہیں جنہوں نے نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری یورپین غیر یورپین زبانیں سیکھیں اور ان سے کام لیا۔ اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہود کا خط وغیرہ سیکھنے کا فرمایا تھا تو علماء جو ورثاء انبیاء ہیں کیسے مخالفانہ طرز عمل اختیار کر سکتے ہیں!

ایک مزید شہادت عرض کر دوں مسٹر غلام احمد پرویز جو آج منکرین حدیث کے قائد کی حیثیت سے معروف ہیں اور جو ایک مخصوص پروگرام کے پیش نظر ہوم ڈیپارٹمنٹ سے علیحدہ ہو کر دنیائے صحافت میں آئے اپنے ایک مضمون بعنوان "متاع کارواں" میں جو سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" ج ۱۱ عدد ۳ ص۲۲۱-۲۲۲ میں شائع ہوا اعتراف کیا ہے کہ مولویوں پر اس قسم کا الزام کہ انہوں نے جدید علوم کی مخالفت کی بالکل غلط ہے (الفرقان بابت ماہ صفر ۱۳۵۹ھ ص۵۸)

ان دلائل کے بعد یہ کہنا کہ صاحب مولوی تنگ نظر و متعصب تھے اور انہوں نے جدید علوم کی مخالفت کی بالکل غلط ہے۔ رہ جاتی ہے بات سرسید صاحب کے ارشادات و اقوال اور ان کے فکر و نظر کی، نیز کالج کے معاملہ میں ان کی سوچ کی تو اس سلسلہ میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خان عقل پرستی کا ایسے شکار ہوئے کہ انہوں نے بہت سارے مسائل دینی اور عقائد اسلامی کی نئی تعبیرات پیش کر کے ایک جدید علم کلام کی طرح ڈالی اور پھر جب انہیں اہل اسلام کی ترقی و تعمیر کا خیال آیا تو اس دھندہ میں اور تیزی آگئی

حتیٰ کہ وہ اسلام کی وکالت کے عنوان سے اسلام کو ذبح کرنے لگے
تفصیلات سے قطع نظر محض ایک حوالہ ملاحظہ فرمایئے ۔

آپ نے سرولیم کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب "خطبات احمدیہ" کے نام سے لکھا تو اس میں باب معراج کی احادیث وتفصیلات کی تطبیق نہ کر سکنے کی بنا پر اس واقعہ کو جسمانی ماننے سے انکار کر دیا اور ان تمام روایات احادیث کو موضوع ثابت کر دیا۔ (یہاں سے ص۹ دیکھیں)

اب اگر اس قسم کے واقع پر علما مداہنت سے کام لیتے تو وہ عند اللہ مجرم ہوتے۔ آگ کی لگام کے مستحق ہوتے اور خلق خدا ان کی خاموشی اور مداہنت سے گمراہ ہوتی اس لئے انہوں نے اصلاح احوال کی غرض سے اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیں لیکن پوری ملائمت اور سنجیدگی سے، اور یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے اختلافات میں بازاری پن اختیار کیا ہو۔ سرسید احمد خان اور مولانا نانوتوی کی مسائل پر خط وکتابت تصفیۃ العقائد کے نام سے چھپ چکی ہے اور اسے دیکھ کر ہمارے دعوے کی دلیل آسانی سے آپ کو مل جائے گی۔

اس کے بعد رہ جاتا ہے مسئلہ کالج اور اس میں دی جانے والی تعلیم کا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ علماء کو جدید علوم اور زبان وغیرہ سے اختلافات نہ تھا بلکہ سرسید احمد خان کے اس نقطہ نظر سے اختلاف تھا جس میں وہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اپنانے پر زور دیتے تھے۔ (دیکھیں تہذیب الاخلاق ص۱ ج ۲ بحوالہ روشن مستقبل ص۱۴۱) اور اس بات کا تذکرہ حضرت مولانا سندھیؒ نے بھی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ" کی سیاسی تحریک میں کیا ہے۔ (دیکھیں ص۱۲۱) اور جب سرسید نے ترکوں کو دیکھا کہ انہوں نے قدیم طور طریقوں سے بغاوت کر دی ہے اور انہوں نے ہر طرح جدت اختیار کر لی ہے تو وہ اچھل پڑے اور انہوں نے یہ خیال ذہن میں جما لیا کہ مسلمانوں کی فلاح کا راز اسی میں مضمر ہے۔ (دیکھیں تہذیب الاخلاق بحوالہ روشن مستقبل ص۱۸۶) بس یہی وہ موڑ ہے جہاں سے علماء کی اور ان کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔ علماء دیانت داری سے سمجھتے تھے اور آج بھی ان کی یہی رائے ہے کہ مسلمان کی فلاح کا راز صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات کو اپنانے میں مضمر ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اسلام کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو حوالے ملاحظہ فرمائیں مولوی کے نہیں غیر مولوی کے۔

پہلا حوالہ ڈاکٹر ہنٹر کا ہے جو انتہائی متعصب انگریز ہے اور جس نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نامی کتاب لکھی تھی۔ اپنی لاتعداد غلطیوں کے باوجود یہ کتاب تاریخ ہند وپاک کا بنیادی ماخذ ہے اس میں موصوف لکھتے ہیں

"ہمارے انگریزی سکولوں میں پڑھا ہوا کوئی
نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں
کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو"

(مسلمانان ہند ص۱۴۲)

دوسرا حوالہ اخبار "منشور" دہلی کا ہے۔ یہ اخبار مسلم لیگ کا ترجمان تھا وہی مسلم لیگ جو علی گڑھی فکر کا نتیجہ ہے۔ ۹ جون ۱۹۴۲ء کے منشور میں مقالہ افتتاحیہ میں مدیر محترم نے لکھا:۔

گذشتہ ۳۰ برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف
انگریزی سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
ہے کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں وہ اسلامی کلچر،
اخلاق اور اسلامی تصورات سے بالکل نابلد ہیں۔"

دیکھئے یہی بات علماء دیوبند اس زمانے میں کہتے ہیں جب یہ ابتدا ہو رہی تھی لیکن یہ بات بار لوگوں کو جب نظر آئی جب پانی سر سے گزر گیا تھا۔ علماء نے اس معاملے میں کبھی مصلحت کوشی اختیار نہیں کی۔ انہوں نے جب بھی متاع حیات کو لٹتے دیکھا تو اپنا فرض سرانجام دیا۔ حتیٰ کہ کانگریس سے وسیع تعلقات کے باوصف اس کی تعلیمی سکیم واردھا کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے۔ اس موقع پر آپ ہمارے دعوے کی دلیل کے طور پر سید محمود صاحب کی کتاب تاریخ التعلیم ص۱۵۱ کا وہ ریزولیشن بھی ملاحظہ فرما لیں جو ۱۸۷۳ء میں وائسرائے کے نام سے جاری کیا گیا تھا اور جس میں واضح کیا گیا تھا

کہ گورنمنٹ کی درس گاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے،
مسلمان اس کے نہیں بلکہ نظام کے خلاف ہیں

سرسید احمد خان ابتدا میں اسی انداز کا نقطہ نظر رکھتے تھے جس انداز کا نقطہ نظر دوسرے حضرات کا تھا۔ چنانچہ آپ ان کی کتاب اسباب بغاوت ہند دیکھیں یا ان کے ارشادات بہ سلسلہ مسئلہ قومیت آپ کو ایک خاص سرسید نظر آئیں گے۔ وہ اسباب بغاوت ہند میں انگریز کو تمام خرابیوں کا باعث قرار دیتے ہیں تو قومیت کے مسئلہ پر بعد میں بعض مسلم مفکرین کی رائے کے برعکس بالکل وہی رائے رکھتے ہیں جو اکابر علمائے حق کا مطمع نظر تھا۔ دیکھیں مسلمانوں کا روشن مستقبل (ص ۲۶۷ - ۲۶۹) اور غالباً اسی وجہ سے سرسید کے قدیم رفیق جناب شبلی نعمانی نے مسلم گزٹ لکھنؤ میں لکھا۔

"وہ پرزور دست و قلم جس نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تینوں آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جس پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں اور یہ صرف انہی کی بدولت ہے کہ علم و آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی۔ میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔ حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالٹکس سے روک دیا۔ یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا، کس چیز نے دفعۃً یہ انقلاب پیدا کر دیا۔ ان سوالات کا جواب آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ آج اجتہاد اور تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے۔"

(روشن مستقبل ص ۲۷۱)

ہمارے نزدیک اس انقلاب کی وجہ سرسید کا سفر یورپ ہے۔ وہ ۱۸۶۹ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ خوب آؤ بھگت ہوئی۔ حتیٰ کہ ملکہ نے شرف باریابی بخشا۔ شیشہ میں اتر گئے۔ وہاں سے آکر یورپین تہذیب کے حق میں مقالے لکھے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی ابتدا ہوئی، اس میں مسٹر مارلیسن، مسٹر بیک، مسٹر آرچبولڈ سے بالترتیب پرنسپل رہے۔ حالات پر ان کا کنٹرول تھا۔ انہی کی سیاست کار فرما تھی۔ آخر الذکر نے مشہور شملہ وفد کا اہتمام کیا جس نے والسرائے بہادر سے مل کر حقوق چھیننے کی خوددارانہ راہ کی بجائے "مانگنے" کی بزدلانہ روش کی ابتدا کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو یہ وفد شملہ میں ملا۔ اگلے ہی دن لندن کے اخبارات خوشی سے اچھل پڑے۔ انہوں نے تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور اسی کے چند دن بعد ۹۔ نومبر ۱۹۰۶ء کو مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اغراض و مقاصد اتنے افسوسناک تھے کہ معلوم ہوتا ہے سرکار کی کوئی ایجنسی ہے جو فرائض مخصوصہ سرانجام دینے کے لئے معرض وجود میں آئی ہے۔ اسی وجہ سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے شمولیت مسلم لیگ کی دعوت پر فرمایا تھا

ہر چیز منظور ہے مسلم لیگ میں شمولیت منظور نہیں۔

بہرحال شرعی حدود میں رہ کر علی گڑھ میں محض تعلیم کا سلسلہ ہوتا تو اختلاف نہ ہوتا لیکن انگریز پرنسپل حضرات کی کوشش سے جہاں عقائد و اعمال بگڑے، تہذیب کا جنازہ نکلا وہاں یہی چیز ایک مخصوص سیاسی جماعت کے جنم لینے کا باعث ہوئی جس نے لارڈ میکالے کی ۱۸۳۵ء کی سکیم کو عملاً کامیاب کرایا۔ فیاحسرتا۔

اس افسوسناک روش کے باوجود بعض علماء دیوبند کی کوشش رہی کہ

اس ادارہ کو ان مقاصد سے ہم آہنگ کیا جائے چنانچہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد مولانا نانوتوی اور حضرت گنگوہی کے حقیقی وارث اور مولانا سندھی کے الفاظ میں تحریکِ ولی اللہی کے چوتھے دور کے سربراہ و امام حضرت شیخ الہندؒ نے قرب و اتصال کی کوشش کی اور ۱۹۱۲ء میں دیوبند کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد کو بلایا اور طلبہ کے باہمی تبادلہ کی ایک تجویز منظور ہوئی۔ اس پر عمل بھی ہوا لیکن بدقسمتی سے علی گڑھ میں طلبہ مخصوص تربیت کے پیش نظر کار خاص کا فریضہ سر انجام دے کر حضرت شیخ الہندؒ کی مشہور عالم تحریک ریشمی رومال کی بربادی کا باعث بن گئے۔

تاہم خلافت اور اس کے بعد کے ادوار میں ایسا ہوا کہ علی گڑھ میں جو حریت پیشہ لوگ تھے۔ وہ شیخ الہند کی انقلابی پارٹی سے مل گئے جن میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ انہی حضرات کی کوششوں اور مولانا سندھی کے تعاون سے جامعہ ملیہ دہلی میں قائم کیا گیا یہ ادارہ نیشنل یونیورسٹی کے نام سے علی گڑھ میں قائم ہوا۔ شامیانوں کی چھتوں میں اس کی ابتدا ہوئی۔ مقصد حریت پسند طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ شدید بیماری کے باوصف پالکی میں افتتاح کے لئے تشریف لائے لیکن بعد میں علی گڑھ کی قدیم یونیورسٹی کو نقصان سے بچانے کے لئے اسے دہلی میں منتقل کر دیا گیا اور یہ حضرت شیخ الہند اور آپ کے خدام کی وسعت قلبی کی دلیل ہے۔ اس میں آپ کے مخصوص شاگردوں اور خدام کے ساتھ نواب وقار الملک ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خان وغیرہ برابر کے شریک تھے۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بعد کے ادوار میں کئی مواقع آئے جب حالات نے تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ بالخصوص تحریک پاکستان کے دنوں علی گڑھ کے عزیز طلبہ نے خاصی افسوس ناک روش اختیار کی۔ اس کے باوجود حضرات علماء کی کوشش رہی کہ تصادم کی بجائے تطابق و توافق کی صورتیں پیدا ہوں چنانچہ جب کبھی موقع ملا یہ حضرات وہاں گئے۔ حتیٰ کہ آل انڈیا ایجوکیشنل مسلم کانفرنس کے اجلاس پنجاہ سالہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ نے ایک اجلاس کی صدارت فرمائی۔ تحریری خطبہ ارشاد فرمایا جو شائع شدہ موجود ہے اور پھر اکابرین دیوبند گاہے گاہے وہاں جاتے رہے اور جوں جوں بادل چھٹے تو قرب ہوتا گیا اور اب بحمدہ تعالیٰ دیوبند کے کئی فضلاء وہاں اعلیٰ درجہ کے مدرس ہیں۔ کئی دیوبندی اکابر پر تحقیق و ریسرچ ہوئی اور طلباء کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ دیوبند کی سند کو وہاں اہمیت حاصل ہے اور یہ سب علماء کی پرخلوص اور مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ انہوں نے برائی سنی لیکن برائی کا جواب برائی سے نہ دیا۔ اگر سر سید احمد خان شروع میں وہ طرز عمل اختیار نہ کرتے جس کا اظہار کیا جا چکا ہے اور مولانا نانوتوی کی آراء تسلیم کر لیتے تو یہ دونوں ادارے مل کر مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ میں موثر کردار ادا کر سکتے تھے لیکن تقدیرات الٰہی کا لکھا ہوا کون ٹال سکتا ہے؟

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی مرکزی دینی درسگاہ

مدرسہ اسلامیہ عربیہ رجسٹرڈ

مرکزی جامع مسجد : ٹوبہ ٹیک سنگھ : ضلع لائلپور

۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء حضرت مولانا سید محمد اظہار الحق سہیل عباسی امروہوی مرحوم و مغفور کی مساعی سے اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت اس پورے علاقے میں کوئی مدرسہ تھا، نہ حفاظ تھے، نہ علماء۔ اب اس مدرسہ کی برکت سے یہ پورا علاقہ حفاظ و علماء سے معمور ہے۔ مدرسہ میں حسب ذیل شعبہ جات ہیں۔

۱. **شعبہ درس نظامی** ۔ اس شعبہ میں موقوف علیہ دورہ تک تعلیم کا انتظام ہے۔ سینکڑوں طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کرکے بڑے مدارس میں دورۂ حدیث سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس شعبے کے صدر مدرس مہتمم مدرسہ مولانا سید سلطان احمد عباسی امروہوی حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز شاگرد ہیں۔ تدریسی خدمات اور افتاء کا بیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ مولوی فاضل، بی اے، ایم اے اسلامیات کے طلبہ کو تیاری بھی کرانے ہیں

۲. **شعبہ حفظ و ناظرہ قرآن مجید** ۔ اس درجہ میں قرآن مجید، حفظ و ناظرہ تعلیم کے لیے ماہر اور جید حافظ و قاری حبیب اللہ صاحب لدھیانوی کے زیر نگرانی کام ہوتا ہے۔ تقریباً دو صد طلبہ اب تک حفظ سے فارغ ہوئے ہیں اور ناظرہ خواں طلبہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے۔

۳. **شعبۂ افتاء** ۔ مستقل دارالافتاء موجود ہے اور یہ خدمت مولانا سید سلطان احمد عباسی انجام دیتے ہیں۔ پورا علاقہ اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

۴. **کتب خانہ** ۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں پر مشتمل ایک قیمتی کتب خانہ ہے۔

۵. **مطبخ** طلبہ کو کھانا مدرسہ کے مطبخ سے دیا جاتا ہے۔ ایک با تنخواہ ماہر باورچی مقرر ہے۔

طلبہ کی رہائش، خوراک، لباس کا مدرسہ کفیل ہے، اور طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا ہے

مدرسہ کی کارکردگی کے متعلق اکابر علماء کی آراء

مدرسہ کے امتحانات کے لیے حضرات اکابر و علماء کرام وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے ہیں۔ کتاب الآراء میں ان حضرات کی رائے گرامی درج ہے۔ ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دربان حزین
حضرت مولانا عبد اللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ	حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب

المشتہر: چوہدری مختار احمد بھٹی ٭ ناظم انجمن مدرسہ اسلامیہ عربیہ رجسٹرڈ ٭ ٹوبہ ٹیک سنگھ

مولانا عبدالشکور دین پوری، صدر مجلس تحفظ حقوق اہل سنت

پورے ایشیا میں دارالعلوم دیوبند کی دینی، مذہبی، تالیفی، تصنیفی، تعلیمی، قومی، ملکی، ملی، اصلاحی اور فنی خدمات ہر شہر، ہر قصبہ، ہر دیہات میں دن رات مسلم ہے۔

جب ہندوستان میں کفر کا طوفان تھا، شرک برا جان تھا۔ بدعات رسومات، رواجات میں مبتلا انسان تھا۔ خرافات، ہزلیات، اغلوطات کا شکار مسلمان تھا، اسلام برائے نام تھا، مذہب بدنام تھا۔ ہر غلط کام تھا، عقیدہ خام تھا،

جہالت کا اندھیرا تھا، ظلم کا بسیرا تھا، گمراہی کا ڈیرا تھا۔ انگریز کی حکمرانی تھی، حکومت شیطانی تھی، ہر طرف حیرانی و پریشانی تھی، ہر سو ویرانی تھی جب علماء کو پھانسی پر لٹکایا گیا، دار و رسن پر چڑھایا گیا، دریا شور عبور کرایا گیا، حق گو لوگوں کا سر اڑایا گیا۔ الکفر ملۃ واحدۃ کا سماں تھا نقشہ الحفیظ والامان تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار، سرمایہ دار اور زمیندار حکومت کے وفادار تھے۔ ملک کے غدار تھے، مذہب سے بیزار تھے۔ اعلیٰ عہدوں کے طلب گار تھے۔ اکثر عیار، مکار اور بے کار تھے، مناصب کے نشے میں سرشار تھے، مسلمان ذلیل و خوار تھے۔ قرآن کے نسخے جلائے گئے اسلام کے نقشے مٹائے گئے، مجاہدوں پر مقدمے چلائے گئے۔ وہ درختوں پر لٹکائے گئے، کالجوں کی تعلیم تھی، مسلمانوں میں تنظیم تھی اور نہ اسلامی تعلیم تھی

حق پرستوں کا گروہ برسرپیکار تھا، ہندوستان میدان کار زار تھا۔ سب سے بڑا دشمن انگریز تھا، جو بڑا شر انگیز تھا، چالاک تھا تیز تھا، پھر بھی مقابلہ مقاتلہ کا معاملہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی دینی تنزلی دیکھ کر غیور جاگ اٹھے۔ بالآخر انگریز اس ملک سے بھاگ اٹھے

دارالعلوم نے ہزاروں مفسر، محدث، مفتی، متکلم، محقق، مدقق، مناظر، معلم مبلغ، مصنف، مولف، مورخ، مدبر، مفکر، سیاستدان، صحافی، شاعر

ماہر تیار کئے اور ہزاروں فقہاء، علماء فضلاء، فصحاء، بلغاء، ادباء، صلحاء
اتقیاء، اذکیاء، اصفیاء، اکابر کشیوخ پیدا کئے۔

ویسے تو دارالعلوم نے ہزارہا فرزند، ارجمند، سعادت مند سپوت پیدا کئے، مگر چند قدر بلند فاضل دیوبند، دل پسند اکابرین بہترین بزرگ ترین کا تذکرہ ضروری ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ ذوالمنن استاذ العلماء مفسر محدث سیاستدان تھے۔ محمود کی ہر صفت محمود تھی، جو ان میں موجود تھی۔ ان کا ہر شاگرد رشید تھا۔ قابل دید تھا، لائق تقلید تھا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی انقلابی، مدبر، مفکر، سیاستدان مرد میدان تھے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب محدث، فقیہ، مناظر، عالم باعمل کامل اکمل فاضل اجل تھے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مفسر، خطیب، ادیب، متین کامل انسان تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی متصوف، مصنف، فقیہ، مبلغ ولی اللہ، اہل اللہ تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد، محدث، سیاستدان، عامل قرآن اور عاشق رسول آخر الزمان تھے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند، فقیہ، مصنف مجاہد فی سبیل اللہ، خلیق، لئیق، شفیق آدمی تھے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی، فقیہ، لائق فائق تھے۔

دارالعلوم نے اڑھائی ہزار عربی مدارس ہند میں اور ایک ہزار مکاتب پاکستان میں سے قائم کئے جو تعلیمی، تبلیغی، تدریسی کام بر سر عام صبح و شام ہر قدم ہر گام کر رہے ہیں

خدمات دارالعلوم ایک نظر میں

دارالعلوم نے ۵۳٦ مشائخ ۵۸۸۸ مدرسین ٦٤ ۱۱ مصنفین ۱۸۴ مفتی ۱۵۴، مناظر ٦٨۴، صحافی ۴۲۸۸ خطیب مبلغ ۲۸۸ طبیب ۴۸، فضلا تیار کئے۔

عرب و عجم میں تبلیغ کا کام کیا، ہزاروں عیسائی ہندو اور مرزائی مسلمان کئے۔ فتنہ مرزائیت، فتنہ بہائیت، فتنہ عیسائیت، فتنہ چکڑالویت فتنہ سبائیت، فتنہ نیچریت، فتنہ اشتراکیت، فتنہ رضاخانیت، کا مقابلہ کیا انشاء اللہ

قیامت تک یہ سلسلہ فیوضات بابرکات دن رات جاری ساری رہے گا۔

ان کی شاخیں لاکھوں در لاکھوں ہیں، ماشاء اللہ لیل و نہار مصروف کار مشغول حسب معمول و مقبول ہیں

اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ

رباعی

از حضرۃ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ
صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

ماجرا آبلہ پائی کا مری اے مجنوں
خار سے پوچھو کہ سب نوک زباں ہے اسکو

ہم نے چاہا کہ اٹھیں دشت جنوں سے یعقوب
آبلے پاؤں پڑے، خار نے دامن پکڑا

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی
استاذ حضرۃ تھانوی و حضرۃ شیخ الہند

از مولانا سید عبدالمجید صاحب مدظلہم

دارُالعلوم دیوبند اور تحفظ ناموسِ صحابہؓ

★ ✷ ★

دارالعلوم دیوبند گو بظاہر ایک تعلیمی ادارہ کا نام ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک ایسی تحریک ہے جس نے باطل کو ہر محاذ پر للکارا اور سچائیوں کا پرچم بلند کیا۔ یہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کی آرزوؤں ...... اور تمناؤں کی زندہ تصویر ہے۔ اس ادارہ نے ایسے بے شمار افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیمی، تبلیغی، سیاسی خدمات اور تصنیف و تالیف سے احقاق حق و ابطال باطل کا فرض ادا کیا۔ باطل نے جس عنوان سے سر اٹھایا۔ اس کی سرکوبی کے لئے شاہ ولی اللہ مرحوم کے روحانی فرزند سربکف ہو کر میدان میں آئے۔ برصغیر میں جہاں صیہونی اور تثلیثی مشنریز کی یلغار کا نہایت جرأت و ہمت سے مقابلہ کر کے تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا گیا۔ وہاں برطانوی سیاست کے دجل و تلبیس کے تار و پود بکھیرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے جرنیلوں نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔ تحریک آزادی میں ولی اللّٰہی مکتب فکر کی بے پناہ قربانیاں ایک ایسا روشن باب ہیں۔ جن سے رہتی دنیا تک انسانیت درس حریت لیتی رہے گی۔

دشمن اسلام انگریز ظالم نے اپنے افتراق المسلمین کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے قادیان میں جس جھوٹی نبوت کا اجرا کرایا۔ اس کے تعاقب کے لئے بھی اکابرین دیوبند ہی کا لشکر جرار آگے بڑھا اور قادیانی دجال کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہی تو وجہ ہے کہ انگریز اور برطانیہ کے سیاسی گماشتے دیوبندی مکتب فکر کو اپنی آنکھ کا کانٹا سمجھتے ہیں۔

شجر نبوت کے برگ و بار صحابہؓ کرام کی ناموس کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے شرانگیز عزائم کو ناکام بنانے کی سعادت بھی اکابرین دیوبند ہی کے حصہ میں آئی جنہوں نے تحریر و تقریر سے یاران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی حفاظت کر کے ملت پر احسان عظیم فرمایا۔ حضور رحمتِ مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کردہ جماعت صحابہ کرامؓ کے خلاف یہودی سازش کے ایک تاریخی منصوبہ کے تحت زہر یلا پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جس استاد کے شاگرد ناکام ثابت ہو گئے۔ اس کی تعلیم از خود غیر معیاری کہلائے گی۔

اس فتنہ کے سدباب کے لئے متقدمین میں علامہ ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ فی ردّ اہل البدع ...... والاعتزال والشیعہ" لکھی جو چار جلد پر مشتمل نہایت علمی اور تحقیقی تصنیف ہے۔ اسی طرح قاضی ابوبکر مرحوم نے "العواصم" لکھ کر تاریخ پر احسان فرمایا۔

برصغیر میں سب سے پہلے حجۃ اللہ فی الارض حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" لکھیں۔ جن میں حقانیت مذہب اہلسنت والجماعت دلائل و براہین کی روشنی میں واضح کی گئی ہے اور دشمنان صحابہؓ پر ضرب کاری لگائی گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ نے "تحفہ اثنا عشریہ" لکھ کر شیعیت و سبائیت کے حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ تحفہ اثنا عشریہ کی اشاعت .... روافض کے لئے ایک ایسا چیلنج تھا جس کا ان کے پاس کوئی علمی جواب نہ بن سکا۔ حضرت شاہ صاحب پر روافض کے مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور اس راہ میں آپ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس مضمون پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے بطل حریت سید اسمٰعیل شہید رحمت اللہ علیہ نے "منصب امامت" فارسی میں لکھ کر تحریک تحفظ ناموس صحابہؓ کو آگے بڑھایا۔ خاندان ولی اللہ نے عظمت صحابہؓ کی جو شمع جلائی وہ تیز و تند آندھیوں کے باوجود روشن رہی۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں سے مولانا حیدر علیؒ نے "ازالۃ الغین" اور "منتہی الآمال" جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ انہی بلند پایہ اور معیاری تصانیف کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانان ہند کے علمی محسن نواب محسن الملک جیسے مدبر لوگ (جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔) شیعیت و سبائیت سے تائب ہو کر حلقہ گوش اہلسنت والجماعت ہوئے۔ نواب صاحب موصوف نے علی گڑھ میں بیٹھ کر "آیات بینات" لکھی جو تین جلدوں میں نہایت عمدہ اور لاجواب تصنیف ہے۔

یہ سب خاندان ولی اللہ ہی کی فیض رسانیاں تھیں کہ تحریک تحفظ ناموس صحابہؓ روز بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ جہاں تصنیفی محاذ پر اس عنوان کا حق ادا کیا جا رہا تھا۔ وہاں تبلیغی میدان میں بھی برصغیر کا گوشہ گوشہ ناموس صحابہؓ زندہ باد اور خلافت راشدہ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم نے "ہدیۃ الشیعہ" لکھی جس میں شیعی گروہ کے باطل عقائد و نظریات پر نہایت عالمانہ مگر عام فہم تبصرہ کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمت اللہ علیہ نے "ہدایت الشیعہ" لکھی جو مختصر مگر مفید تصنیف ہے۔ جس میں اس فرقہ کے نقصان دہ عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی "مطرقۃ الکرامعلی مرآۃ الامامۃ" اور "ہدایات الرشید الی افحام العنید" بھی اس مضمون پر بہترین کتابیں ہیں۔

پھر جب برصغیر میں تحریک مدح صحابہؓ چلی تو امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مرحوم کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی تحفظ ناموس صحابہؓ کے اس مقدس مشن میں پیش پیش رہے اور رفض و سبائیت کے عفریت کا علمی قوت سے مقابلہ کرنے کا جو بھی پروگرام بنا اس میں اکابرین دیوبند بالخصوص شیخ الاسلام حضرت سید مدنی کی سرپرستی حاصل رہی۔ تحریک مدح صحابہؓ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحبؒ بخاری مرحوم جیسے جلیل القدر مجاہد ہراول دستہ میں شامل رہے اور انہی بزرگوں کے والہانہ اخلاص کا نتیجہ تھا کہ مولانا مظہر علی اظہر جیسے شیعہ لیڈر بھی تحریک مدح صحابہؓ میں شامل ہوئے اور اسی تحریک میں لکھنؤ جانے والے زعماء اہلسنت پیش پیش بھی گئے اور اہلسنت والجماعت کے پلیٹ فارم پر صحابہؓ کرام کی مدح و منقبت بیان کی۔ امام الہند حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ اور ان کے خاندان کی مساعی مشکور کا نتیجہ تھا کہ سبائیت کا جو سیلاب اپنی ..... ہولناک بربریت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ پھیرنے کے لئے برصغیر میں علماء حق کا ایک لشکر جرار وجود میں آگیا۔ جنہوں نے عظمت صحابہؓ کا پرچم لہرا کر مسلمان اہلسنت والجماعت کے قلب و جگر کو حب صحابہ و اہلبیت کی آماجگاہ بنا دیا۔

انہی نفوس قدسیہ کے بے پناہ ایثار کی بدولت مخدوم القوم سردار احمد خاں صاحب پتافی مرحوم جیسے حساس اور درد مند اہل ثروت حضرات نے تحفظ ناموس صحابہؓ کا مشن اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ سردار صاحب مرحوم نے تنظیم اہلسنت والجماعت کی داغ بیل ڈالی اور اس پلیٹ فارم پر اکابرین دیوبند کو مدعو کر کے شیعیت و سبائیت کے خطرناک منصوبوں سے ملت کو آگاہ کیا۔ عظمت صحابہؓ کی اشاعت کے لئے سردار صاحب مرحوم نے

(بقیہ صفحہ ۶۷۸ پر)

علمائے دیوبند اور تحریک مدح صحابہؓ

از مولانا غلام مصطفیٰ ناظم اعلیٰ دارالسلام مدینہ بہاول پور

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو اگر تاریخ اسلام اور قرآن و حدیث کی روشنی سے صرف نظر کرتے ہوئے علیٰحدہ کیا جائے تو حضور سرور کائنات کی پونجی صرف چند گنتی کے افراد اور وہ بھی اپنے گھرانے کے رہ جاتے ہیں اس طرح درپردہ جہاں حضور کی شان رحمۃ اللعالمین سے دشمنی ہوگی وہاں آپؐ کی ختم رسالت پر بھی زبردست قدغن لگے گا۔ کیونکہ اس طرح پوری دنیا کی ہدایت کے لئے کسی اور نبی کی ضرورت ہوگی۔

اگر حضور پاکؐ سے متعلق تعلیم اسلام سے بالاتر ہو کر یہ تصور کر لیا جائے کہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق خلافت کی وصیت فرمائی تھی اور حضرت علی خلیفہ بلا فصل اور وصی رسولؐ ہیں تو ظاہر ہے کہ پوری دنیا جانتی ہے کہ معاملہ اس عقیدہ کے مطابق نہ ہوا اور خلافت بلا فصل حضرت صدیق اکبرؓ کے حصہ میں آئی تو لازماً درپردہ صداقتِ رسولؐ مطعون ہوگی کیونکہ آپؐ کے اعلان خلیفہ بلا فصل اور وصی کرنے کے باوجود حضرت علیؓ خلیفہ اول نہ بن سکے۔

اور پھر آنکھیں بند کر کے شیر خدا حضرت علی المرتضیٰؓ پر تقیہ کا طوفان برپا کر دیا جائے اور تقیہ کو جزا اسلام قرار دیا جائے تو لازماً منافقین کو اسلام کا ہیرو قرار دیا جائے گا حالانکہ قرآنی شہادت ان کے متعلق صاف ہے کہ منافق جہنم کے نچلے درجے میں ہوں گے۔ اور اگر باغ فدک کی آڑ میں صحابہ کرام کو ملعون کیا جائے تو لازماً یہ بھی درپردہ نبوت پر بہت بڑا بہتان ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر جائیداد بنانے کی بھی فکر میں تھے جبکہ آپ ایک بار نماز سے فارغ ہو کر فوراً اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے اور واپس آنے پر استفسار کیا گیا کہ آپ نے آج جلدی کیوں فرمائی جواب یہ تھا کہ میرے گھر معمولی سا ٹکڑا سونے کا رکھا تھا اسے فی سبیل اللہ دے آیا ہوں کہیں ایسا نہ ہو میں اپنے رب سے اس حال میں جا ملوں کہ میرے گھر کچھ مال ہو!

اور اگر صحابہ کرام کی عداوت میں قرآن پاک کے دس پارے مکمل بکری کے حوالے کر دیئے جائیں اور قرآن پاک غار میں رکھ دیا جائے تو زمانے خلق خدا آسمانی ہدایت و روشنی سے کس طرح فیضیاب ہوگی اور حفاظت قرآن کا وعدہ خداوندی کا کیا حشر ہوگا! اور پھر آپ اس پر بھی غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے صاف فرمایا: اگر کفار مکہ آپؐ کی نبوت کے انکاری ہیں تو ہم نے آپ کی نبوت کی پاسبانی کے لئے ایک قوم کو متعین کر رکھا ہے اور ساتھ ہی "لیسوا بہا بکافرین" فرما کر اس شک و شبہ کو بھی دور کر دیا کہ قیامت تک وہ کافر نہیں ہوں گے۔ بھلا جو پاسبانِ نبوت ہوں اور باقتضاء ارشاد الٰہی وہ کافر کبھی نہ ہوں گے انہیں وفات نبیؐ کے بعد صفِ ارتداد میں کھڑا کر دینا کہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صداقت کو برباد کرنا تو مقصود نہیں ہے۔؟

ان دیں حالات رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے مصداق " فان امنوا

بس ما آمنتم بہ کے تحت اسلام کی کسوٹی اور "من احبہم فبحبی احبہم ومن ابغضہم فببغضی ابغضہم" کا سرٹیفکیٹ پانے والوں سے کون ہے بدبخت جو مسلمان ہو کر بھی ان سے عداوت رکھے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی عاقبت خراب کرے

لیکن ان تمام باتوں کے باوصف اسلام کی اس عظیم جماعت اور حضور اکرمؐ کی پوری زندگی اور محنت کی پونجی کے خلاف بھی اعداء اسلام اپنی ہرزہ سرائی سے باز نہ آئے چنانچہ ان لوگوں کی سلف صالحین نے خوب سرکوبی کی اور دندان شکن جوابات دیئے

علمائے دیوبند نے جہاں دیگر فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہاں اس کی بھی سرکوبی کی

سب سے پہلے شاہی اودھ جو کہ شیعہ تھے کا تذکرہ کرتا ہوں کیونکہ وہ ایک عرصہ لکھنؤ میں حکمران رہے ۱۹۰۵ء کے بعد مقبول احمد خاں شیعہ نے وہاں فتنہ کھڑا کیا اور سنی شیعہ کشیدگی پیدا ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ تحریک مدح صحابہ چل اٹھی تو دارالعلوم دیوبند کے صدر اور اسلام کی عظیم متاع شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مجلس احرار اسلام کے عظیم رہنما امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے احباب نے باقاعدہ اس تحریک میں حصہ لیا اور شان صحابہ کرامؓ کو اجاگر کر کے اپنے فرض منصبی سے عہدہ برا ہوئے یہی وجہ تھی کہ تحریک خلافت میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں مجوزہ حکومت کے ارکان تجویز کئے ہیں ان میں ایک بھی شیعہ نہیں ہے کیونکہ سیاسی طور پر یہ لوگ تقیہ کا شکار ہو کر انتہائی کمزور ہوتے ہیں۔

اس سے قبل دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور دارالعلوم کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ نامی کتابیں لکھ کر صحابہ کرامؓ کی عظمت اور اہل سنت کے موقف کو مضبوط کیا۔

حضرت نانوتویؒ نے تو ایک بار حد کر دی جبکہ آپ عشرہ محرم کے موقع پر قاضی پور تشریف لے گئے اور وہاں کے شیعہ حضرات نے اپنی مجلس میں شرکت کی حضرت کو دعوت دی۔ اس پر حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ اس شرط پر شرکت کروں گا جب آپ اپنی مجلس میں کچھ سن لیں تو ہم بھی کچھ کہیں گے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے اور وہیں کچھ مذہبی گفتگو شروع ہو گئی اسی دوران ان لوگوں نے کہا ہم اس شرط پر اہل سنت والجماعت میں داخل ہوں گے کہ آپ حضور پاکؐ کی زیارت بیداری میں ہمیں کرا دیں چنانچہ حضرت نے جوش میں آ کر فرمایا اگر تم پختہ رہو تو اس طرح بھی ہو سکتا ہے اور میں بیداری میں حضور پاکؐ کی زیارت کرانے کو تیار ہوں مگر یہ روافض کچھ کچے ہو گئے۔

ایک بار حضرت نانوتویؒ خوابہ تشریف فرما ہوئے اعظم خان شیعہ نے حضرت کو دعوت دی اور اجازت کے ساتھ ایک سوال کیا کہ حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ کس طرح ہو گئے جبکہ حضور پاکؐ نے انہیں خلیفہ نہیں بنایا اس پر حضرت نانوتویؒ کا جواب پڑھیئے اور سر دھنیئے۔

فرمایا ارکان اسلام کے چار ہیں نماز روزہ حج زکوٰۃ دو ان میں اصل ہیں اور دو ان کے تابع ہیں نماز اصل ہے اور زکوٰۃ اس کے تابع ہے کیونکہ نماز کا تعلق براہ راست حق تعالیٰ سے ہے اور اس کے دربار کی حاضری اور اس کی تعظیم اور اس سے عرض و معروض کا نام ہے اور زکوٰۃ کا تعلق بلا واسطہ محتاجوں اور فقراء سے ہے پس نماز کے مقابلہ میں زکوٰۃ ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اہل دربار کو اپنے دربار میں پانچ وقت حاضری کا حکم دے اور یہ بھی حکم دے کہ ہماری طرف سے جو انعامات و صلات تم کو وقتاً فوقتاً ملتے ہیں ان میں سے کچھ ہماری غریب رعایا کو بھی جو دربار کے راستہ میں خیرات کے موقع پر بیٹھ جاتے ہیں دیدیا کرو ظاہر ہے کہ حاضری دربار مقصود ہے اور صدقہ و خیرات اس کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے بعد ذکر فرمایا ہے۔

اسی طرح حج کا تعلق براہ راست حق تعالیٰ سے ہے کیونکہ اس میں محبوب کے در دولت پر حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کا اظہار ہے اور روزہ میں خواہشات نفسانی کا توڑ ہے جو مانع ہیں اس محبت و عشق سے اور نفس امارہ میں جو خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں روزہ ان کو دور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے تیس روزوں کے بعد حج کا وقت شروع ہوتا ہے اور کعبہ کو ہدف کر کے

آخری وقت تک یعنی اس زوال پر سے رمضان تک دس مہینے ہوتے ہیں پس ہر مہینہ کے لئے تین روزے بطور سبیل تجویز کئے گئے اور ان سب کو ایک مہینہ یعنی رمضان میں جمع کر دیا گیا تا کہ ان تیس روزوں کی برکت سے دس مہینہ کی خامیاں جو نفس میں پیدا ہو گئی تھیں وہ ختم ہو جائیں اور محبوب کے در دولت پہ حاضری کے لائق ہو جائے اور اپنی محبت کا اظہار کر سکے چنانچہ رمضان کے بعد محبت کے اظہار کی اجازت ہو گئی یعنی شوال مکرم سے حج کا وقت شروع ہو گیا غرضیکہ رمضان میں شرکت جشن کی تیاری کی گئی اور حج میں جشن روحانی میں شریک ہو گیا جو مقصود تھا۔ سو حج جو اصل رکن ہے اس کی امارت حضور پاکؐ نے تمام صحابہؓ کی موجودگی میں حضرت صدیق اکبرؓ کے سپرد کی تو ایک رکن اصلی میں آپ کا استخلاف ثابت ہوا اسی طرح مرض وفات میں بھی تمام صحابہؓ کی موجودگی میں نماز کی امامت بھی حضور پاکؐ نے صرف صدیق اکبرؓ کے سپرد کی اور سترہ نمازوں کی امامت صدیق اکبرؓ نے حضورؐ کی حیات میں فرمائی اس سے دوسرے رکن اصلی میں آپ کا استخلاف ثابت ہوا۔ اب کون سی وجہ ہے کہ صدیق اکبرؓ کو خلیفہ برحق نہ مانا جائے اور اس طرح کہا جائے کہ خلافت کی اہلیت ان میں نہ تھی اور حضرت علیؓ ہی میں تھی غرضیکہ اس طرح آپ نے پُر اثر تقریر فرمائی کہ صاحب دعوت اعظم خان شیعہ تائب ہو کر اہلسنت میں داخل ہوا۔ افسوس کہ مضمون کا تقاضا اختصار کا نہ ہوتا تو میں اس مقام پر حضرت نانوتویؒ کا وہ فارسی کا خط جس کا ترجمہ مولانا بدر عالم مرحوم نے ترجمان السنہ میں کر دیا ہے نقل کرتا اور آپ کو صحابہ کرام کی عظمت کا پتہ چلتا۔

مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے لکھنؤ میں بیٹھ کر مدرسہ قائم کیا اور شیعہ حضرات کے تمام اعتراضات کے جواب دیئے اور رسالہ النجم جاری کیا جس میں تمام مسلمانوں کو عظمت صحابہ سے روشناس کرایا اور پھر پاکستان میں اس موضوع پر مستقلاً تنظیم اہل سنت والجماعت کے نام پر ایک جماعت قائم ہوئی جس میں سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری، مولانا عبدالستار صاحب تونسوی اور علامہ دوست محمد قریشی مرحوم اور ان کے رفقاء کار نے قابل قدر کام کیا۔ جیسے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ، مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ، قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی اور ان کے رفقاء کار نے پورے ملک میں اپنی تقاریر کے ذریعہ مدح صحابہؓ کی اور چکوال ضلع جہلم میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب نے پوری تحریک چلا رکھی ہے غرضیکہ علماء دیوبند نے پاک و ہند میں تحریک مدح صحابہؓ میں زبردست کام کیا۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

بقیہ از صفحہ ۶۴۴

بقیہ از صفحہ ۶۴۴

ایسے علمائے کرام کی خدمات حاصل کیں۔ جن کی خطابت وعلمی صلاحیتوں نے اس محاذ پر خاصی گہما گہمی پیدا کی۔ حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر مرحوم (جو بعد میں تحفظ ختم نبوت میں شامل ہو گئے) شہید فی سبیل اللہ حضرت قاری لطف اللہ صاحب جالندھری مرحوم، مولانا علامہ دوست محمد قریشی مرحوم اور علامہ خالد محمود صاحب جیسے مشاہیر علمائے کرام کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

تاسف کہ سردار بیانی مرحوم کے ذوق وجذبہ کے مطابق کام پورا نہ ہو سکا اور سردار صاحب دل گرفتہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو چل بسے۔ تاہم تحفظ ناموس صحابہؓ کی یہ قندیل روشن رہی اور اس مشن پر تبلیغی لحاظ سے کئی ناموں سے جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ مگر اس پلیٹ فارم پر عملی اور تنظیمی طور پر کام کے جو تقاضے ہیں وہ تا ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ مجلس تحفظ حقوق اہلسنت والجماعت پاکستان انہیں تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک ٹھوس جدوجہد کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کا ساجذبۂ اخلاص اور حق وصداقت کی راہ میں استقامت سے نوازے۔ (آمین)

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا

دَارُالعلوم اور تجوید وقرأت

اظہار احمد تھانوی

علوم تجوید و قرأت، قرآن مجید کے لب و لہجہ اور طرز ادا کی حفاظت کرنے والے علوم ہیں، فتوحات اسلامی کا دائرہ وسیع ہوا اور عرب و عجم کا اختلاط ہوا تو عربیت کے خالص اور صاف ستھرے لب و لہجہ میں تنوع اور گوناگوں نقائص پیدا ہونے لگے، لغت عرب کے ماہرین مثلاً ابوالاسود دؤلی خلیل بن احمد فراہیدی، سیبویہ، اخفش، فراء اور جرمی وغیرہم نے محسوس کیا کہ صرف، نحو، لغت عربی حرفوں کے مخارج، صفات لازمہ، صفات عارضہ اور ادغام و اظہار وغیرہ پر ایسی مکمل اور جامع تشریح اور اصول و ضوابط کی بنیاد رکھی جائے کہ عجم کے اختلاط سے عرب کی فصاحت و طرز ادا کسی حالت میں بھی مجروح نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عنوانات پر مبسوط کتابیں تحریر ہوئیں اور انہیں مبارک مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج فن ادا متفق علیہا اصولوں سے عبارت ہے اور ادائے قرآن میں صحیح اور غلط لب و لہجہ کے امتیاز میں کوئی مشکل راہ حائل نہیں۔

تجوید تجود سے ہے یعنی عمدہ ادائیگی، متقدمین کے یہاں تجوید کے علم پر علیحدہ تصانیف کا رواج نہ تھا بلکہ تجوید علم الصرف کا ایک نہایت ضروری باب تھا جس کے بغیر علم الصرف ہرگز مکمل نہ تھا۔ متاخرین نے البتہ اس فن پر مستقل قدم اٹھائے اور مبسوط کتابیں لکھیں، چنانچہ الرعایۃ محمد بن المکی کی تالیف اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی

علم قرأت الفاظ وحی کے اُس اختلافی طرز ادا کو کہتے ہیں، جو کلمات قرآنیہ میں منجانب اللہ سات قرأتوں کی حد تک اختلاف طرز تکلم نازل فرمایا گیا۔

یہ ایک جداگانہ فن ہے، قرأت کے ائمہ مشہور ہیں اور اس فن پر ہر دور میں مبسوط و مختصر کتابوں کے انبار تصنیف ہوئے ہیں، اس فن کے محقق اور دور آخر کے مسلمہ منتہائے فن علامہ محمد بن محمد جزری (م ۸۳۳ھ) ہوئے۔

یہ ہے علم تجوید اور علم قرأت کی مختصر تاریخی حیثیت جس سے ان کو درسیات کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

دارالعلوم دیوبند تمام علوم اسلامی کی مرکزی درسگاہ کی حیثیت میں قائم ہوا، تجوید و قرأت کے پہلے استاد حضرت قاری عبدالوحید رحمہ اللہ ہوئے حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی کے چھوٹے بھائی مولانا قاری محمد طاہر مرحوم حضرت قاری صاحب ہی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

حضرت قاری عبدالوحید صاحبؒ تجوید و قرأت کے ممتاز ماہر شیخ القرأت تھے حسب دستور دارالعلوم کے طلبہ کو علماً اور عملاً ایک ماہر استاد فن کے رنگ میں باکمال بناتے تھے ان کی تصانیف میں ھدیۃ الوحید تجوید کے فن کی مبسوط مکمل اور جامع کتاب شمار کی جاتی ہے بعد کے مختلف رسائل تجوید جو برصغیر میں تصنیف ہوئے۔ کم و بیش سب میں مسائل کی صحت و ثوق کے لئے

مدظلہ عبدالوحید کا نام آتا ہے، برصغیر کے استاذ الکل حضرت حافظ قاری مقری عبدالرحمٰن صاحب مکی ثم الہ آبادی فن قرأت کے بڑے مستند شیوخ میں سے ہوئے ہیں جنکی تدریس وتعلیم میں بڑی برکت ہوئی ہند وپاکستان کے مشہور اساتذہ تقریباً سبھی ان کے تلامذہ ہوئے ہیں، حضرت قاری عبدالوحید صاحبؒ بھی ان ممتاز ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے قاری عبدالرحمٰن مرحوم سے استفادہ کیا، یہ درسگاہ الہ آباد میں تھی، حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ الہ آبادی مکہ سے واپس ہندوستان تشریف لائے اور مسند تدریس سنبھالی، الہ آباد میں احیاء العلوم کے نام سے یہ درسگاہ تھی، منجانب اللہ ہی کہا جائے تو بہتر ہے کہ اس شان کی دوسری کسی مسند کو تدریس وقرأت کے سلسلہ میں پورے ہندوستان میں حاصل نہ تھی جو احیاء العلوم کی اس مسند کو تھی، بڑے ماہر قراء اساتذہ کا سلسلہ حضرت قاری عبدالرحمٰن تک ہی پہنچتا ہے۔ بہرحال قاری عبدالوحید صاحب استاد شعبۂ تجوید وقرأت دارالعلوم دیوبند ان مایہ ناز فاضلین میں سے تھے جو احیاء العلوم الہ آباد کے اولین وسابقین میں ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کی عظیم درسگاہ کے لئے ایک ایسے ہی ماہر وجامع فن استاد کی ضرورت تھی، مہارت ادا کا یہ عالم تھا کہ قاری عبدالوحید صاحب کی تلاوت تمام علماء وشیوخ سن کر ایک چاشنی اور حلاوت محسوس کرتے، قاری صاحب مرحوم سے استفادہ کرنے والے سینکڑوں جیّد علماء وحفاظ ہوئے بس یوں سمجھ لیجئے کہ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے اکثر تلامذہ کو حضرت قاری صاحب سے استفادہ کا فخر حاصل ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کی تفصیل اسی نمبر میں ضرور آپ کو کسی مضمون میں ملے گی۔

دوسرے بزرگ استاد تجوید وقرأت جو حضرت قاری عبدالوحید صاحبؒ کے بعد دارالعلوم کے شعبۂ تجوید وقرأت کی مسند صدارت پر فائز ہوئے حضرت قاری حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تھے، راقم الحروف نے ان کی تلاوت خوب سنی ہے نہایت عمدہ پڑھتے تھے ادا بہت عمدہ تھی لہجوں پر خوب عبور تھا اور مزید عطیۂ قدرت آواز بہت پرکشش تھی، حضرت قاری حفظ الرحمٰن صاحب کافی لمبی مدت دارالعلوم سے وابستہ رہے اور ان سے ہزاروں تلامذہ نے مکمل یا جزوی طور پر استفادہ کیا تا آنکہ دارالعلوم سے وابستگی کے دور ہی میں انتقال فرمایا رحمہ اللہ، مرحوم بھی حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی کے مستفیدین میں سے تھے فن کی تحصیل وتکمیل الہ آباد ہی میں فرمائی، حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب شاہی مزاج کے آدمی تھے جب طبیعت حاضر ہوتی پڑھاتے جب نہ ہوتی گھر پر ہی گوشہ کش رہ کر اپنے مطالعہ میں مشغول رہتے ان کے یہاں استفادہ کرنے والے بڑے آہنی عزم واستقلال کے مالک ہونے ضروری تھے، جو برسوں ان کے در استفادہ سے وابستہ پڑے رہتے تھے، ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو۔ طالب علم حاقتی طالب علم ہوتے تھے، اسباق نہ ہونے پر کسی کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی تھی، صبر ورضا کے پیکر تھے مگر برسہا برس پڑے رہنے میں ان کی بڑی برکت ہوئی جو بھی مستفید ہو کر نکلا اپنے وقت کا شیخ ہوا۔

ہمارے شیخ حضرت قاری عبدالمالک صاحب قدس سرہٗ حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب کے بڑے بھائی حضرت قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکی کے روایت حفص میں شاگرد تھے آٹھ سال مدرسہ صولتیہ مکہ میں حضرت استاد کے پاس حاضر رہے، یہ اور ان کے برادر بزرگ حضرت قاری عبدالخالق صاحبؒ خطیب جامع مسجد سہارنپور نے ایسی اعلیٰ تکمیل حاصل کی کہ جید اور ماہر استاد بن کر نکلے، یہ دونوں بھائی روایت حفص آٹھ سال میں مکمل فرما کر مراجعت فرمائے ہندوستان ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ تقسیم اسناد تھا اور بڑے وسیع انتظامات کے تحت ہوا تھا دُور دُور سے علماء اور عامۃ المسلمین شریک ہوئے حتیٰ کہ تمام شہر دیوبند میں جگہ نہ رہی جلسہ میں تقاریر سے پہلے تلاوت کا پروگرام تھا، حضرت قاری عبدالمالک صاحب اور حضرت قاری عبدالخالق صاحب دونوں کو جلسہ میں تلاوت کے لئے مدعو کیا گیا تھا دونوں بھائی عربی جبہ وعقال میں وارد جلسہ ہوئے اور عربی لب ولہجہ میں ایسی نفاست سے تلاوت کی کہ تمام حاضرین جلسہ محو ہوگئے۔ تمام حاضر علماء کرام نے اٹھ اٹھ کر بہت ثنا کیا۔ بہرحال ان دونوں بھائیوں کا ارادہ ہوا کہ الہ آباد حاضر ہو کر سبعہ وعشرہ قرأت

کی تکمیل کی جائے، فن میں مناسبت تو پہلے ہی تھی مختصر مدت میں ہی الہ آباد میں تکمیل ہوگئی حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب نے حضرت قاری عبدالمالک صاحب کو فرمایا کہ میرے یہاں یہ جتنے طلبا موجود ہیں ان سب کو تم ہی مشق کراؤ اس وقت کے طلباء میں حضرت قاری حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ بہت سے اصحاب تھے۔

اس طرح یہ تمام حضرات حضرت قاری عبدالمالکؒ کے شاگرد ہوگئے اس تعلق سے حضرت قاری حفظ الرحمٰن صاحب حضرت قاری عبدالمالکؒ کا مثل استاد بے حد احترام فرماتے، لکھنؤ سے دیوبند کسی سفر میں راستہ میں پڑتا تو باصرار حضرت قاری صاحب کو اتار کر دارالعلوم لے جاتے، دارالحدیث میں رات کو مجلس قرأت ہوتی، سننے والے محظوظ ہوتے، حضرت قاری حفظ الرحمٰن بڑے متواضع اور مسکین بزرگ تھے اپنے شاگردوں کی موجودگی میں حضرت قاری صاحبؒ کے پاؤں دباتے اور مثل ادنیٰ شاگرد کے خدمت کرتے۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ سے بیعت ہوجانے کے بعد تو حضرت قاری حفظ الرحمٰن کی حالت استغنا ر باطنی کی طرف بہت بلند ہو چکی تھی تقسیم ہند کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے کسی موقع پر قاری صاحب کی پر حلاوت تلاوت سنی تو بیحد محظوظ ہوئے، مولانا ہندوستان کے مرکزی وزیر تعلیم تھے پیشکش کی کہ آل انڈیا ریڈیو سے تلاوت نشر ہوا کرے گی سات سو روپیہ ماہانہ حکومت کی طرف سے پیش خدمت ہوگا، قبول فرمایئے، قاری صاحب نے معذرت کر لی، میں طالب علم ہوں درسگاہ میں بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے ہی میں زندگی گزاری ہے یہاں سے نہیں اٹھ سکتا۔

تھانہ بھون میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مخلص خدام میں ایک بزرگ قاری شاہ محمد صاحب ہوا کرتے تھے، حضرت علیہ الرحمہ کے سر میں تیل کی مالش کی خدمت انہیں کے سپرد تھی، نیک، پارسا بزرگ تھے خانقاہ کی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتے تھے، آواز بڑی پرکشش تھی، راقم الحروف اتفاقیہ دیوبند حاضر ہوا، حضرت قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی تعارف کے بعد فرمایا کہ خانقاہ اشرفیہ میں قاری شاہ محمد صاحب کو سلام عرض کرنا، میں نے عرض کیا حضرت! یہ قاری شاہ محمد صاحب کہاں سے پڑھے ہوئے ہیں فرمایا ہمارے ساتھی ہیں، الہ آباد میں حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی سے پڑھا ہے، میں نے عرض کی حضرت یہ مکمل قاری ہیں، فرمایا مکمل قاری کسے کہتے ہیں؟ بھائی مکمل قاری وہی ہے جو قرآن شریف اول سے آخر تک عمدہ پڑھ سکے، یہ کمال انکو حاصل ہے اور کیوں نہ حاصل ہو، معلوم بھی ہے حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی کی درسگاہ بڑی پر برکات درسگاہ تھی، اس درسگاہ سے تعلق رکھنے والے سبھی قاری تھے حتیٰ کہ دھوبی نائی، ماشکی بھی قاری تھے، وہ بھی قرآن شریف پڑھنے کی مشق کرتے تھے، اس سے مجھے احساس ہوا کہ بابرکات ہستیاں کیسی ہوتی ہیں، آج ہم پڑھاتے ہیں مگر قاری نہیں بنا سکتے ایک وہ تھے کہ جو طالب علم نہیں تھے انہیں بھی قاری بنا چھوڑا تھا، ذلک فضل الله یوتیه من یشاء۔

متحدہ ہندوستان میں تجوید و قرأت کی ۳ درسگاہیں تھیں، ایک دارالعلوم دیوبند، دوسرے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ تیسرے پانی پت اول الذکر یعنی دارالعلوم دیوبند کو یہ امتیازی حیثیت حاصل رہی کہ وہاں تجوید و قرأت کے فنون سے علماء کو مزین کیا گیا، علوم عربیہ سے منسلک ہر قسم کے طلباء عربیہ کے لیے تجوید کے شعبہ میں استفادہ لازم رہا کیونکہ دارالعلوم میں ہمیشہ تجوید میں استفادہ لازم رہا ہے، چنانچہ حضرت قاری عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور ان کے ہم عصر چوٹی کے علمائے تجوید میں استفادہ کیا اور حضرت خانصاحب مرحوم کے بعد قاری حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ سے استفادہ کرنے والوں میں حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ، جناب قاری عبدالعزیز شوق انبالوی رحمہ اللہ اور قاری زاہر قاسمی و دیگر ہم عصروں کے نام آتے ہیں، حضرت قاری عبدالخالق صاحبؒ ممتحن ہوتے تھے۔

پانی پت میں تجوید و قرأت پر علمی و تصنیفی کام زبردست ہوا بڑی مایۂ ناز

گئے پر تصنیف بھی۔ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی فن قرأت کے امام تھے انہوں نے تجوید پر بھی بے نظیر رسائل لکھے قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی کی سبعہ قرأت پر کتاب بے نظیر ہے، کاش قراء پانی پت اس کو پاکستان میں شائع کر کے شائقین فن پر احسان فرمائیں، دور حاضرہ میں حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہم قراء پانی پت کے تاج فخر ہیں فن پر بہترین کتابوں کے مؤلف و شارح ہیں۔ ان کے شاگرد جناب قاری رحیم بخش مدظلہ استاذ خیر المدارس کا وجود بھی دنیا، تجوید و قرأت میں بسا غنیمت ہے موصوف نے بڑا زبردست علمی کام کیا ہے۔ اپنے استاد صاحب مدظلہم کی طرح اردو کے دامن کو علوم تجوید و قرأت سے خوب بھاری بھر کم کر دیا ہے۔ پانی پت میں اس تمام کام پر مستزاد وہاں حفظ کلام اللہ کا چرچا تھا، نہایت جید اور عمدہ حفاظ کی محلہ محلہ موج ظفر موج ہوتی تھی رمضان شریف میں ہر مسجد پانی پت میں پڑھنے والے حافظوں سے پررونق ہوتی خصوصاً اخیر عشرہ میں تو تمام راتیں تلاوتوں سے زندہ رہتی تھیں، حفظ قرآن مجید کا شغل جوانوں سے کر عورتوں میں بھی تھا، شرفاء کے گھرانوں میں بچیوں کو حفظ کرانے کا رواج بڑے زور شور سے تھا چار آبادیوں کی مستورات میں مسلم گھرانوں میں دینداری قابل رشک تھی، کاندھلہ، تھانہ بھون، دیوبند اور پانی پت، پانی پت میں حافظ عورتوں کی وجہ سے اس کا پلہ بھاری تھا، کاندھلہ میں دینیات اور عربی کی عالم زیادہ تھیں۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ تجوید و قرأت کا برصغیر میں بے مثال ادارہ تھا، اس ادارہ کو ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے عروج و ترقی سے مالا مال کیا تھا۔ اس ادارہ کے بانی حضرت مولانا معین القضاۃ صاحب مجددی قادری نقشبندی تھے جو اپنے وقت کے مرتاض قائم الیل، صائم النہار عابد و زاہد بزرگ تھے، اپنی ذات کے لئے حضرت مرحوم نے کبھی کچھ نہیں کیا غیر متاہل زندگی گزاری، موٹے گاڑھے کے کپڑے زیب تن فرماتے، اکثر اوقات تنہائی و عبادت میں گزرتے، بڑے بڑے رؤسا اور متمول لوگ گھنٹوں دروازے پر ملاقات کی اجازت کے منتظر رہتے، مدرسہ عالیہ فرقانیہ بہت بڑا ادارہ تھا سینکڑوں طلباء اور درجنوں اساتذہ تھے۔ اس تمام خرچ کے واحد کفیل حضرت مولانا معین القضاۃ ہی تھے، ادارہ کا نہ کوئی باقاعدہ چندہ تھا، نہ سفیر و اپیل، نہ کسی امیر کی داد و دہش پر نظر، یہ راز ہمیشہ راز ہی رہا کہ حضرت موصوف کے پاس اتنے بڑے ادارے کے اخراجات کہاں سے آ رہے ہیں۔

ادارہ میں دیگر علوم مروجہ کے علاوہ بڑا اور بنیادی کام تجوید و قرأت کی تعلیم تھی، چوٹی کے ماہر اساتذہ تدریس کا کام انجام دے رہے تھے حضرت قاری عبدالمالک صاحب رحمہ اللہ سالہا کم و بیش پچیس سال پڑھایا جو اپنے وقت کے امام تھے، فن ادا، فن قرأت کے ساتھ ان کو عربی لہجوں میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ موصوف کے علاوہ مولانا قاری نذر محمد صاحب، قاری محمد صدیق صاحب اور قاری عبدالمعبود صاحب، قاری ضیاء الدین صاحب سب کے سب یگانۂ روزگار تھے، یہ سب ہستیاں دار رحمت کی طرف منتقل ہو چکی ہیں، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

فرقانیہ لکھنؤ میں خوش گلو، مد و ترتیل میں بے تکان خوبصورت آوازوں میں پڑھنے والے جس کثرت سے پیدا ہوئے پورے متحدہ ہندوستان کے لئے تاریخ میں سرمایۂ فخر ہیں۔ نوجوان قاریوں کے ہجوم تھے، ایک سے ایک بڑھ کر عمدہ پڑھنے والا، پڑھتے تو بارش نور برستی، سننے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہر سال بہت بڑی تعداد فارغین و کاملین کی ہوتی۔ حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ممتحن ہوتے تھے۔

بہر حال دارالعلوم دیوبند اگر علوم دینیہ کی یونیورسٹی تھی تو فرقانیہ لکھنؤ اور مدارس پانی پت اس کے ساتھ ملحقہ کالج تھے۔ یہ سب علماء دیوبند ہی کی سرپرستیاں تھیں کہ جہاں عربی ادب فقہ حدیث اور تفسیر کی پورے برصغیر میں چہل پہل تھی، حفظ، تجوید اور قرأت کی بھی زبردست گرم بازاری ہوئی۔

استاذنا حضرت قاری عبدالمالک صاحب نور اللہ مرقدہ علماء و قراء کے مخدوم و محترم تھے، حضرت مولانا تھانوی کے تجوید میں استاد بھائی تھے یعنی دونوں نے مکہ میں حضرت استاد القراء قاری عبداللہ مہاجر مکی سے روایت حفص کی تکمیل کی۔ حضرت تھانوی کا رسالہ جمال القرآن منجانب اللہ مقبول خلائق ہوا

اس وقت پورے برصغیر کے مدارس تجوید میں یہ رسالہ شریفہ داخل نصاب ہے اسی طرح فوائد مکیہ تصنیف حضرت قاری عبد الرحمن صاحب کی جو نصاب تجوید میں داخل ہے کا حاشیہ تعلیقات مالکیہ از حضرت قاری عبد المالک صاحب رحمہ اللہ کو بے نظیر حاشیہ مانا گیا ہے۔ استاذنا حضرت قاری صاحب بزرگان دین کا ہمیشہ بے حد احترام فرماتے اور ان کی دعاؤں کو ملتزم جانتے۔ لاہور میں تشریف آوری ہوئی تو حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت قاری صاحب کا یہاں تشریف لانا مسلمانان پاکستان کے لئے عموماً اور مسلمانان لاہور کے لئے خصوصاً خداوند تعالیٰ کی خاص رحمت ہے، واقعی حضرت کا وجود رحمت ثابت ہوا آج پاکستان میں جو جا بجا پڑھنے پڑھانے کے مرکز نظر آ رہے ہیں انہیں حضرت کا ہی بالواسطہ یا بلا واسطہ فیض کام کر رہا ہے ورنہ قاری خال خال ہی ہوتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند سے منسلک ان قراء کرام کے حالات و کارناموں کے لئے ایک دفتر چاہیئے، تصنیفی میدان میں ان حضرات نے وہ کام کیا کہ شاید دنیا میں کسی ملک میں اتنا عظیم الشان کام نہ ہوا ہو، جمال القرآن، تجوید القرآن منظوم تنشیط الطبع فی اجراء السبع، لمولانا التھانویؒ، فوائد مکیہ، شرح عقیلہ رسم عثمانی میں از قاری عبد الرحمن صاحب کی، ہدیۃ الوحید از قاری عبد الوحید صاحب حاشیہ بر فوائد مکیہ، حاشیہ بر شاطبیہ از حضرت قاری عبد المالکؒ صاحب، حاشیہ بر جمال القرآن و حاشیہ بر فوائد مکیہ از حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب، حاشیہ بر فوائد مکیہ از قاری محب الدین الہ آبادی، حاشیہ بر فوائد مکیہ از حضرت قاری محمد سعید مفتی مظاہر علوم سہارنپور، حاشیہ بر فوائد مکیہ، شرح جزری، معلم التجوید، زینۃ القرآن رسالہ در تشریح حرف ضاد، از قاری محمد شریف صاحب مدظلہ، معارف التجوید از قاری حبیب اللہ صاحب کراچی، تیسیر التجوید از حضرت قاری عبد الخالق صاحب سہارنپوری تنزیل الطبع فی اجراء السبع از قاری تاج محمد صاحب عبد الحکیم ضلع ملتان، تسہیل البیان فی رسم القرآن، از قاری نذر محمد صاحب لکھنوی، ضوابط نبلاء التجوید از قاری عبد المعبود صاحب لکھنو، شرح شاطبیہ از قاری محمد سلیمان صاحب مظاہر علوم سہارنپور، شرح شاطبیہ و شرح جزریہ و حواشی برکتب از راقم الحروف شرح ضخیم
برکتب مختلف از راقم الحروف، شرح شاطبیہ ضخیم، شرح رائیہ، شرح جزریہ شرح ناظمۃ الزہر لمولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہم، شرح جزریہ ترجمہ تیسیر علامۃ الدانی، ترجمہ وجوہ المسفرہ، رسالہ ار رسم العثمانی مختلف کتب بر روایات و قرات از قاری رحیم بخش صاحب پانی پتی وغیرہ وغیرہ تصنیف کی دنیا پر یہ صرف ایک طائرانہ نظر ہے، تفصیلی تذکرہ کی اس محدود سے مضمون میں گنجائش نہیں، التماس ہے کہ ناظرین ان اکابر کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔

نظر پڑی جو کہیں بارگاہِ سلطانی
دماغ عقل نے کہا لا الٰہ الا اللہ

دارالعلوم دیوبند کا

پہلا طالب علم

مولانا سعید الرحمن علوی
مدیر ہفت روزہ خدام الدین لاہور

"محمود الحسن مولانا، حضرت مولانا بھی کہا جاتا ہے، ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس، پارسائی اور تقدس کے لیے مشہور ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستان بھر میں ہیں۔ عبیداللہ (مولانا سندھی) کے اثر میں آنے سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے۔ دیوبند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کے سازشیوں کا گڑھ تھا۔ اس شخص نے سیف الرحمن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائلیوں کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا۔ ایس ایس اکبر جہاز کے ذریعہ وہ خود بھی تیرہ منحرف اشخاص کے ساتھ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ہجرت کر کے عرب کو روانہ ہو گیا۔ عرب میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے پہلے درپے اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستان میں جہاد کے مقصد کے لیے حکومت ترکی کی ہمدردیاں حاصل کریں۔ انور پاشا، جمال پاشا اور غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اور فرمان حاصل کیے۔ جن میں سے ایک فرمان محمد میاں عرف مولوی منصور کے ذریعہ ہندوستان اور آزاد علاقہ کے سازشیوں کو دکھائے جانے کے بعد کابل پہنچایا گیا۔

ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا کی رہنمایانہ قائدانہ شخصیت بڑی سرکردہ ہے، جنود ربانیہ (حضرت شیخ الہندؒ کی فوج) کی فہرست میں وہ جنرل ہیں۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو شریف مکہ کے احکام سے ان کو گرفتار کر لیا گیا اور جدہ بھیج دیا گیا، جہاں سے انہیں ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا گیا۔"

تحریک شیخ الہند رحمہ اللہ صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۳

یہ اقتباس "تحریک شیخ الہندؒ" نامی کتاب کا ہے جو برصغیر کے نامور مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی قدس سرہ کی آخری کتاب ہے۔ اصل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خلف الرشید سید محمد اسعد زید مجدہم نے حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کی تحریک کے سلسلہ میں انگریزی سی۔ آئی۔ ڈی کے محفوظ ریکارڈ کو انڈیا آفس لندن سے حاصل کیا، جس کا ترجمہ الجمعیۃ دہلی کے ایڈیٹر صاحب نے کیا۔ بعد میں مولانا سید محمد میاںؒ نے اس ترجمہ کو مرتب فرمایا اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کا طویل مقدمہ جو تعارف پر مشتمل ہے ایزاد فرمایا اور انگریزی سی آئی ڈی کے شہزادوں نے جو شگوفے کھائی تھیں ان کی اصلاح فرمائی۔

ہم نے درج بالا اقتباس کو اپنے مضمون کا ابتدائیہ بنایا ہے، جس میں حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ کی زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ آ گیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ جو آج دنیا میں اس عجیب غریب نام سے متعارف ہیں، یو پی کے مردم خیز خطہ دوآبہ کی اس بستی کے فرزند ہیں جو آج بر ہند دارالعلوم کی نسبت سے پوری دنیا میں متعارف ہے۔

تاریخ نگار حضرات کی تحقیق کے مطابق اس قصبہ میں شیوخ بکثرت آباد

تھے۔ جن میں صدیقی، فاروقی اور عثمانی ہر قسم کے شیوخ شامل ہیں اور بقول مولانا قاری محمد طیب قاسمی یہاں کے شیوخ میں عموماً تفضیلیت کے اثرات رچے ہوئے تھے۔ گو وہ شیعہ نہ تھے مگر ناموں اور کاموں میں شیعیت کے آثار سے کافی متاثر تھے اور کم سے کم تفضیلیت کا اثر اکثر و بیشتر پڑھے لکھے طبقہ میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ (مسلک علمائے دیوبند)

حضرت الامام الامیر السید احمد بریلوی قدس سرہ نے جب تحریک جہاد کے سلسلہ میں دورہ فرمایا تو چند دن دیوبند میں بھی قیام فرمایا۔ یہ قیام بہت مختصر تھا اس لیے ایک محلہ دیوان جس کا سید ذی شان سے واسطہ پڑا براہ راست پڑ گیا اور وہ کمزوریاں رفع ہو گئیں جو پہلے عام تھیں۔ البتہ پوری طرح رفض و شیعیت کے اثرات۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی تحریک و تبلیغ سے ختم ہوگئے۔

ان شیوخ کی عثمانی شاخ میں ایک بزرگ گذرے ہیں جن کا نام نامی مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ ہے موصوف اس زمانے کے اکثر باکمال لوگوں کی طرح استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی قدس سرہ کے شاگرد ہیں۔ جو مرحوم دہلی میں امام ولی اللہ قدس سرہ کی علمی وراثت کے گویا آخری وارث تھے کہ اس کے بعد مرکز دیوبند منتقل ہو گیا۔

استاذ العلماء کا یہ ہونہار شاگرد ذہانت و فطانت اور علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھا فن ادب میں تو وہ امام سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید موصوف کی ان کتابوں سے ہو سکتی ہے جو آپ نے اس فن میں لکھیں جو بصورت شرح و حواشی موجود ہیں۔ اس عظیم المرتبت انسان کے گھر ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو آپ پیدا ہوئے گویا ۱۸۵۷ء کی مشہور عالم تحریک حریت سے ۶ سال قبل آپ اس دنیا میں تشریف لائے۔

قدرت نے اس بچے سے چونکہ مستقبل میں بہت کام لینا تھا اس لیے ابتدا میں ہی اس کی تعلیم و تربیت کا خوب سے خوب تر انتظام فرمایا اور دار العلوم دیوبند کی خشت اول اور دعاؤں کا مرجع بنایا۔

میاں جی منگلوری، میاں جی عبد اللطیف، مولانا مہتاب علی (حقیقی چچا) سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور جب دیوبند کا مدرسہ معرض وجود میں آیا تو آپ کو سب سے پہلے اس مدرسہ کے احاطہ میں کتاب کھولنے کی سعادت نصیب ہوئی (یاد رہے کہ ابتدا میں مسجد چھتہ ہی مدرسہ تھی) اور جس استاذ کے سامنے کتاب کھولی ان کا نام نامی بھی ملا محمود تھا جنہیں میرٹھ سے بطور خاص بلایا گیا تھا۔

ان حضرات کے علاوہ قاسم العلوم و الخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ آپ کے سب سے بڑھ کر شفیق و مہربان استاذ ہیں اور تعلیم کا زیادہ حصہ بشمول دورۂ حدیث حضرت نانوتوی کی خدمت میں رہ کر پڑھا لیکن اس پڑھنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ یعنی ایک جگہ رہ کر نہیں، بلکہ چل پھر کر۔ اس کی وجہ حضرت نانوتوی خود تھے کہ آپ منشی ممتاز علی صاحب کے پریس میں تصحیح کتب کا کام کرتے جو میرٹھ میں تھا بعد میں یہ پریس دہلی میں منتقل ہو گیا تو حضرت شاگرد سمیت دہلی آ گئے اور جب نانوتہ (اپنے گھر) یا دیوبند اپنے بہنوئی (شیخ نہال احمد صاحب) کے یہاں تشریف لے جاتے تو شاگرد عزیز ہمراہ ہوتا اور اس طرح تعلیمی مراحل طے ہوئے۔ ۱۲۸۹ھ تک تمام کتابیں مکمل ہو گئیں۔ تعلیم میں آپ کے والد بزرگوار اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا بھی حصہ ہے جن سے بعض علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں اور مدرسہ میں معین المدرس ہو گئے حتیٰ کہ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ (فراغت کے تقریباً سال بعد) مدرسہ کا جلسہ دستار بندی ہوا جو پہلا جلسہ تھا۔ اس میں حضرت شیخ الہند کی دستار بندی ہوئی اور سند فراغت ملی۔ جن رفقاء کو آپ کے ساتھ یہ سعادت نصیب ہوئی۔ ان میں مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا عبد الحق پوری وغیرہ شامل ہیں (یہ تفصیلات حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ کی کتاب حیات شیخ الہندؒ سے لی گئی ہیں)

حضرت شیخ الہندؒ نے یوں تو تمام اساتذہ کی خوب خدمت کی جس کے صدقہ قدرت نے آپ کو خوب خوب نوازا لیکن جو تعلق خاطر حضرت نانوتوی سے تھا اور جو خدمت ان کی کی اس کی مثال چشم فلک پیش کرنے سے قاصر ہے جس کی محض ایک مثال تذکرہ شیخ الہند سے پیش خدمت ہے۔ ۲۲ میل کا سفر حضرت استاذ کے ساتھ اس طرح کیا کہ استاذ مکرم بخار میں مبتلا تھے۔ انہیں گھوڑے پر بٹھایا۔ ایک ہاتھ سے کمر کو سہارا اور دوسرے سے رکاب تھامی اور پیدل چلے (ص ۔۔)

فراغت کے چند سال بعد استاذ مکرم اور فقیہ عصر حضرت گنگوہی وغیرہ

اکابر کے ساتھ زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے۔ ان ایام میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (اکابر کے استاد) اور سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب کی تجلیات تھے۔ یہ دونوں حضرات اکابر کے علمی اور روحانی مرجع تھے اور ہر آدمی ان سے بیعت بالخصوص حصول سعادت کے لیے سبق اور سند لیتا تھا لیکن شیخ الہندؒ نے مطلق توجہ نہ دی جس کا سبب ان کا غایت درجہ ادب و تواضع تھا۔ بالآخر حضرت استاد مکرم نے از خود حاجی صاحب سے بیعت کرائی اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے سند حدیث لے کر دی۔

حضرت نانوتویؒ کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس سے کریں کہ ان کے انتقال کے بعد مدرسہ آنا ختم ہو گیا اور غم سے نڈھال ہو گئے۔ حتیٰ کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ کے سمجھانے سے دوبارہ تدریس شروع کی۔

حضرت استاد مکرم کے بعد قطب العصر فقیہ گنگوہی سے رابطہ قائم کیا اور اس دربار سے فیوضات حاصل کیے۔

ان معمولی ارشادات کے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ جو ذات مستقبل میں پورے عالم اسلام بالخصوص برصغیر کی آنکھوں کا تارا بننے والی تھی قدرت نے اس کی تربیت و تعلیم کا کیا کیا انتظام کیا اور اسے کیسے کیسے مربی و ہادی نصیب فرمائے یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہی آپ کو علم کا کٹھلہ قرار دیتے۔

دیوبند سے تعلق کی بات تو واضح ہو گئی کہ آپ پہلے طالب علم تھے بعد ۱۲۹۰ھ میں فراغت ہوئی تو معین المدرس بن گئے۔ بعد ۱۲۹۱ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا سید احمد صاحب، ملا محمود صاحب اور شیخ الہند چار مدرس تھے اور یہی ترتیب تھی۔ یہ حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے، ایک آدھ بزرگ ضرورت کی خاطر دوسری جگہ تشریف لے گئے تو ۱۳۰۸ھ میں آپ مادر علمی کے صدر مدرس و شیخ الحدیث بنائے گئے اور ہمیشہ تادم واپسیں ان مناصب پر فائز رہے۔ اس طرح پوری نصف صدی آپ نے علم دین کی اشاعت فرمائی جس میں ایک طویل عرصہ صدر مدرس و شیخ الحدیث رہے اور اگر ۳، ۴ سال مالٹا کی اسارت کے نکال دیئے جائیں تو ۴۴ سال کے لگ بھگ آپ نے تدریس فرمائی۔ کیونکہ اس طویل نظر بندی کے علاوہ ناغہ نہیں ہوا اور ہوا تو بہت کم اور برائے نام۔

آپ کا دور تدریس طویل ہونے کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے جیسے عظیم المرتبت لوگوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ان کی مثال حضرت امام ابو حنیفہ قدس سرہ اور حضرت سراج الہند شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ چند شاگردوں کے نام اور مختصر نام پیش خدمت ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل ادارہ اور انجمن ہے اور ان کے حالات پر قلم اٹھانا ذخیرہ نے کے مترادف!

(۱) شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ
(۲) حکیم الامت مولانا تھانویؒ
(۳) امام انقلاب مولانا سندھیؒ
(۴) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ
(۵) ابو حنیفۂ ہند علامہ مفتی کفایت اللہؒ
(۶) بطل حریت مولانا منصور انصاریؒ
(۷) ادیب لبیب مولانا حبیب الرحمٰنؒ
(۸) مہاجر مدینہ مولانا سید احمد مدنیؒ مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ
(۹) شیخ الفقہ والادب مولانا اعزاز علیؒ
(۱۰) شیخ الحدیث علامہ سید فخر الدین احمدؒ
(۱۱) استاد کامل علامہ عبدالسمیعؒ
(۱۲) شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ
(۱۳) برادر مدنیؒ مولانا محمد صدیق مہاجر مدنیؒ
(۱۴) مجاہد کبیر مولانا محمد صادق کراچیؒ
(۱۵) یادگار اسلاف مولانا عزیر گل مدظلہ
(۱۶) علامہ عبدالوہاب دربھنگویؒ
(۱۷) مصنف بے بدل مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
(۱۸) مجاہد سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئیؒ
(۱۹) استاد کبیر مولانا حامد حسن گنگوہیؒ

(۲۰) فاضل اجل مولانا رحمت اللہ نہٹوری

(۲۱) شارح مسلم علامہ شبیر احمد عثمانی رح

(۲۲) مبلغ اعظم مولانا محمد الیاس کاندھلوی

(۲۳) رفیق تحریک مولانا احمد اللہ پانی پتی رح

(۲۴) سفیر شیخ الہند مولانا فضل ربی قندھاری رح

(۲۵) حضرت مولانا محمد اکبر پشاوری

(۲۶) امام المعقولیین علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ تعالیٰ

تذکرہ شیخ الہند ص۲۶۰ مطبوعہ بجنور یو۔پی

یہ فہرست اصل کا سواں حصہ بھی نہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک بزرگ کی یہ حیثیت ہے کہ ہزاروں حضرات نے ان سے پڑھا اور دیوبندی مسلک کے لئے سردھڑ کی بازی لگائی ہے۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

حضرت نے بعض کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ جن میں ادلہ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، جہد المقل، افادات، الابواب والتراجم، کلیات، حاشیہ مختصر المعانی، تصحیح ابی داؤد وغیرہ شامل ہیں جبکہ اس میدان میں آپ کا شاہکار ترجمہ قرآن مجید اور اس کا حاشیہ ہے جو عمر کے وفا نہ کرنے کے سبب نامکمل رہ گیا تو حضرت علامہ عثمانی نے فاضلانہ قلم سے تکمیل کی۔ سابقہ تفصیلات سے حضرت کی علمی حیثیت کا قدرے اندازہ ہو جاتا ہے۔ چند سطور آپ کی احسانی کیفیت کے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیں

احسان جس کو آج کل تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے وہ نعمت جس کے صدقہ انسان کو ذات حق جل وعلیٰ مجدہ کی عبادت اور اس دربار کی حاضری پر ایک مخصوص مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ — اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو کہ اسے تم دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم یہ سوچو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے

یہ سعادت و نعمت اپنے آپ حاصل نہیں ہوتی۔ علمی منازل طے کرنے کی طرح ——— یہاں بھی مربی حضرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ

یُعَلِّمُہُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ کے ساتھ یُزَکِّیْہِمْ بھی فرمایا گیا ہے جس کا واضح مقصد یہ ہے کہ تعلیم کتاب و حکمت کسی کی مرہون منت ہے تو تزکیہ بھی اپنے آپ نہیں ہو جاتا بلکہ یہاں بھی شیخ و مرشد کی ضرورت ہے۔

نبی امی علیہ السلام کی جامع شخصیت بیک وقت سارے کام کرتی، اب قدرت نے کام بانٹ دیا اور اس طرح مشعل اسلام فروزاں ہے۔ حضرات صوفیائے کرام اور اولیائے عظام اس کام میں مشغول ہیں۔

دارالعلوم دیوبند جو انسانی فکر و سوچ نہیں بلکہ الہام ربانی کا نتیجہ ہے۔ پر ایسا وقت گذرا کہ اس کے شیخ الحدیث سے لے کر چپراسی تک سب ارباب باطن و صاحب کمال ہوئے۔ ان کی موجودگی میں جو آتا صبغۃ اللہ میں رنگا جاتا۔

شیخ الہند کا گھریلو ماحول بھی انتہائی دیندارانہ تھا۔ بعد میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا وہ نادرۂ روزگار تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ آپ انسانی لباس میں فرشتے نظر آنے لگے۔

اس پوزیشن میں ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کا جو اہتمام تھا اس کا ایک زمانہ معترف ہے اور سب سے بڑی ریاضت تو تعلیمی مشغلہ تھا جو نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ علامہ نوویؒ جیسے باکمال فرزند اسلام تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ

"علم دین میں مصروف رہنا قرب خداوندی کا بہترین ذریعہ ہے سب سے بڑی طاعت سب سے بڑی نیکی اور سب سے مؤکد عبادت ہے۔ اور اس میں اوقات کا خرچ کرنا سب سے بڑھیا ہے اور علم میں بھی اہم ترین علم تحقیق احادیث ہے"

ان کمالات کا نتیجہ اس طرح سامنے آیا کہ استاذ مکرم کے ساتھ حج کو گئے تو انہوں نے سید الطائفہ حاجی صاحب سے بیعت کرا دیا۔ انہوں نے منجھا ہوا دیکھا تو سلاسل اربعہ میں خلافت عنایت فرما دی ——— ساتھ ہی حاجی صاحب کے نفس ناطقہ حضرت نانوتویؒ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ ان دونوں بزرگوں کے وصال کے بعد حضرت گنگوہی سے رشتہ جوڑا اور مدتوں معمول رہا ——— کہ جمعہ کی صبح دیوبند سے پیدل گنگوہ جانا اور بعد نماز جمعہ اسی طرح واپس۔ یہ سفر ۲۰ میل تھا (تذکرۃ الرشید ص۱۲)

یہ تعلق بھی رنگ لایا اور دربار رشیدی سے علم کا کشتہ کا خطاب ملا۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

حضرت گنگوہیؒ نے بھی سلاسل اربعہ میں مجاز قرار دیا ہے۔

اساتذہ و اکابر کے ان تمام تیرا سے آپ نے جس کو زاتا ہو، اس کی مقبولیت کا کیا ٹھکانا!

شیخ الہندؒ اکابر کی موجودگی میں بیعت سے گریز کرتے بعد میں عوام کا اصرار بڑھا تو مان گئے اور پھر تو مرجع ہو گیا۔ آپ کی قید و بند نے اس رجال رشید نے تربیت حاصل کی۔

حضرت کے شاگرد میاں سید اصغر حسین صاحب قدس سرہٗ جو مادرزاد ولی تھے، نے حیات شیخ الہندؒ میں حضرت کے اذکار، اشغال اور عبادات کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، مزید میرے استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان ہزاروی (خادم خاص حضرت مدنی قدس سرہٗ) نے اپنے استاذ محترم مولانا سید فخرالدین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے حوالے سے حضرت کی عبادت و ریاضت کے ایسے ایسے واقعات سنائے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مالٹا کی اسیری کے حالات دیکھنے ہوں اور یاد اللہ کی مشغولیت کا پتہ کرنا ہو تو شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کا "اسیر مالٹا" موجود ہے۔ ان سب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے اس مختصر سے وجود کے اندر جذب و عشق کے کتنے الاؤ روشن کرائے تھے۔ پر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ حوصلہ و تحمل کا یہ عالم ہے کہ سب کچھ تلخم پی لینے کے بعد ڈکار بھی نہیں لی۔

نثار سیدالکونین ﷺ پر مرے ماں باپ
سبق دیا بھی تو کیا لا الٰہ الا اللہ
میں اس چمن میں غریب اللہ ہوں شورش
مری دعا ہے رسا لا الٰہ الا اللہ

عادات مبارکہ اور اخلاق و کمالات کے موڑ پر اگر حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مرجع عام و خاص بنایا ہو، علم و فضل سے بہرہ وافر عطا فرمایا ہو، اس کی سادگی، عاجزی اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ باید و شاید؛ بقول شیخ مدنیؒ:

> غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا طبعاً پسند تھا
> .. طالب علموں سے بے حد انس تھا..... ریل میں
> تیسرے درجے میں سفر فرماتے..... صفائی بہت
> زیادہ پسند تھی (یاد رہے کہ صفائی سادگی کے منافی نہیں
> بلکہ مطلوب ہے)..... اپنے استاذ نانوتوی کی طرح
> ہر اس بات کی تلاش میں رہتے جس سے نفس مرتا ہے
> ..... دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی سے مکمل
> احتراز تھا..... بقول مولانا عبدالصمد مرحوم اس
> شخص (شیخ الہند) کے دل پر کبھی خطرہ بھی نہیں گزرتا
> کہ میں کوئی عالم ہوں..... الغرض تکلیف
> نام کو نہ تھا۔

یہ شاگرد عزیز اور سفر و حضر، آزادی و قید کے ساتھی کے تاثرات ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں بناوٹ ناممکن ہے کیونکہ طویل رفاقت میں بناوٹ مشکل ہے کبھی نہ کبھی آدمی مصلحتوں کے حجاب اتار کر سامنے آ ہی جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ نے جو لکھا صحیح لکھا، واقعی شیخ الہندؒ ایسے تھے۔ تنده اللہ بغفرانہ قاری محمد طیب صاحب قبلہ کی روایت صاحب تذکرہ نے نقل کی،

> کہ مسجد کے لئے کیسر دگھاس، لانا تھی تو شاگردوں
> کو لیکر چلے گئے تالاب پر جاکر اہتمام کیا چار گٹھڑیاں
> بنائیں، پانچویں خود اٹھا کر لائے اور مسجد میں بچھادی
> (صفحہ ۱۳۴)

محدث اکبر شیخ العلماء اور یہ کردار! یہ نصیب اللہ اکبر

لوٹنے کی جائے ہے طلباء کی ضروریات کا خود انتظام کرنا حتی کہ گھر سے چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر لانا اور انہیں دینا اور ان کی جائز خواہشات کا احترام جیسے انہیں تیرنا سکھلایا، آپ کی خصوصیات تھیں

بے نفسی کا یہ عالم کہ جامع العلوم کانپور کے مدرسہ میں تقریر فرما رہے ہیں ٹھاٹھیں مارتا ہوا مجمع اور مضمون کی روانی جوبن پر لیکن جونہی ایک صاحب پر نظر پڑی جو مسائل میں اختلاف کرتے تو وعظ ختم کر دیا، احباب نے کہا اب تو وقت تھا فرمایا اس لئے تو ختم کر دیا۔ (حیات شیخ الہند)

یہ داستان تو اتنی طویل ہے کہ ایک مفصل مقالہ اس پر لکھا جا سکتا ہے، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ،

انہیں دیکھ کر صحابہ کرام یاد آ جاتے

حضرت شیخ الہند کے جہاں باقی کمالات ہیں وہاں آپ کا عظیم کارنامہ انگریز راج کے خلاف منظم بھرپور جدوجہد ہے جسے تحریک ریشمی رومال سب سے زیادہ اہم واقعہ ہے۔

الرشید کے اس عظیم نمبر میں کئی مضامین یہ باتیں آ چکی ہوں گی اسلئے ہم تسلسل قائم رکھنے کے لئے اشارات کریں گے۔

یہ گزرا کہ آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں تحریک حریت نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا آپ کی عمر ۶ برس تھی ذی فہم اور ذی شعور بچے اتنی عمر میں حالات سے بے خبر نہیں ہوتے پھر آپ کا تعلق جن لوگوں سے علمی استفادہ تھا وہ اس تحریک کا ہراول دستہ تھے آپ نے ظلم و جبر کی داستانیں نہ صرف سنی بھی تھیں اور اساتذہ سے بھی سنی تھیں اس نے ذہن میں مستقل بیداری کر کے لمحہ چین سے نہ بیٹھنے۔

دارالعلوم دیوبند بظاہر ایک تعلیمی تحریک تھی لیکن درحقیقت اس کا مقصد صحیح ذہن سازی تھی تاکہ رجال کار تیار ہو سکیں اور ملک کو آزاد کرایا جائے شیخ الہند کے شیوخ اور اساتذہ مصائب و آلام کی دنیا سے گزر چکے تھے گذر رہے تھے انہی حالات نے آپ کے قلب حساس کو متاثر کیا اس کے ساتھ ہی برطانیہ کی وہ انسانیت سوز حرکات جن کا مظاہرہ بلقان وغیرہ میں ہو رہا تھا سے آپ بے خبر نہ تھے۔ یہ صورت حال خلافت عثمانیہ کیخلاف ایک خطرناک سازش تھی اور آپ اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ خلافت ترکوں کی نہیں پوری ملت کی میراث تھی اور اس کا ضیاع ملت کا عظیم نقصان تھا۔

۱۹۰۹ء میں پرانے خدام اور شاگردوں کو دیوبند میں جمع کر کے جمعیۃ الانصار کی بنا ڈالی، نام سے کام کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کے ذہن رسا نے اس مقصد کے لئے مولانا سندھی کو نامزد کیا اور انجمن ان کے سپرد کی۔

یہ انجمن محض طلباء قدیم (اولڈ بوائز) کی انجمن نہ تھی بلکہ اس کا ایک بہت بڑی تحریک سے تعلق تھا جس کا دائرہ اثر مختلف اسلامی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۱۱ء کے وسط میں اس جمیعۃ کا فقیدالمثال اجتماع ہوا یہاں اغراض و مقاصد کا اعلان ہوا۔

سرپرستان مدرسہ دیوبند کے دست و بازو بنکر کام کرنا۔

مدرسہ کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت۔

تقسیم کار کا ایک نظام قائم ہوا پانچ شعبے تکمیل التعلیم نظام التعلیم الارشاد، التالیف والاشاعت اور جلسہ علمیہ قرار پائے پہلے شعبہ میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور مولانا نانوتوی قدس سرہم کی کتابوں کی تعبیر پیش نظر تھی اور بعض دوسرے علوم بھی شامل تھے۔

دوسرے شعبہ میں دیوبند کے طرز کے مدارس دیوبند کی نگرانی میں، اگر یہ نظام کو بحیثیت مقصود تھا۔

باقی شعبوں کا تعلق بھی دین کی نشر و اشاعت سے تھا۔

اس اجلاس میں بعض تجاویز سامنے آئیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

- انگریزی مدارس میں مسلم طلبہ کی معقول مذہبی تعلیم کا اہتمام
- انگریزی مدارس کے طلبہ کے لئے دینیات کے وظائف کا اعلان۔
- غریب طلبہ کے لئے انتظامات
- مدرسہ دیوبند میں مخالفین کے اعتراضات کے جوابات کی تیاری۔
- تنظیم مساجد اور علماء کا اہتمام
- قرآن شریف اور کتابوں کی اشاعت بصورت تجارت۔
- ہلکا پھلکا لٹریچر وسیع پیمانے پر پھیلانا۔

برطانوی حکومت جو شکاری کتے کی طرح شکار کو سونگھنے کی عادی تھی، نے خطرات محسوس کئے اور فوراً صدر جلسہ مولانا احمد حسن محدث سے پوچھ گچھ کی گئی جبکہ مرد غیور شیخ الہند کی آمد پر ٹیکس لگا دیا۔

اس بوکھلاہٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور طبائع گھبرا گئے لیکن شیخ الہندؒ نے مدرسہ کے تحفظ کی خاطر مولانا سندھی کو دہلی بھیج دیا، وہاں نظارۃ المعارف کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ایک طرف قدیم و جدید کا آپس میں ملاپ تھا تو دوسری طرف مخصوص افراد کی تیاری۔

حضرت شیخ الہندؒ مسلمان قوم کی باہمی لڑائی سے سخت پریشان رہتے، ان کی خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ختم ہو، تجویز جو سوچی وہ یہ تھی کہ باہمی ملاپ علمی اور فکری بنیادوں پر ہو، اس کیلئے نظارۃ المعارف میں حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، نواب وقار الملک جیسے لوگ موجود تھے جو جدید دنیا کے نمائندہ تھے۔ بعد میں انصاری صاحب قبلہ نے ہی مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے مولانا سندھی کو ملایا۔

اس کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں دیوبند کا عظیم الشان جلسہ دستار بندی ہوا جس میں علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب بلائے گئے، طلبہ کے تبادلہ کی تجویز منظور ہوئی لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی کیونکہ سرسید احمد خان کی سوچ کے مطابق طلبہ مخصوص رنگ میں رنگے جا چکے تھے

اس کے بعد بھی مختلف مواقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کی ایک جماعت ٹوٹ کر شیخ الہندؒ کے ساتھ آملی جس میں مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ موجود تھے جو شیخ الہندؒ کے اتنے عاشق زار تھے کہ ان کی وفات پر رو رو کر فرماتے،

کہ مولانا کی وفات نے ہماری کمر توڑ دی

اور مالٹا سے واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ طلبہ علی گڑھ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی سرکار کے زیر اثر سے آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس مرحلہ پر مصلحت بین حضرات نے خواہش ظاہر کی کہ آپ بیمار ہیں نہ جائیں لیکن فرمایا،

اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہونگا۔ (رئیس جنت مسلمان)

پالکی میں علیگڑھ گئے، خواجہ عبدالمجید کی کوٹھی پر قیام کیا اگلے دن جلسہ میں شرکت فرمائی کمزوری اتنی تھی کہ چلنا مشکل، دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے خطبہ میں فرمایا،

"میں نے اپنی اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا"

مزید فرمایا،

اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے
اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھل جا رہی ہیں)
مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں کالجوں میں زیادہ
ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم
علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو
تاریخی مقاموں کا رشتہ جوڑا۔

آگے چل کر آپ نے اس الزام کی تردید کی کہ علماء جدید علوم کے مخالف ہیں البتہ جو اثرات واضح طور پر سامنے ہیں ان کی نشاندہی کی اور آزاد یونیورسٹی کے قیام کا اعلان فرمایا، شامیانوں کی چھت تلے افتتاح ہوا یہی یونیورسٹی بعد میں دہلی میں جامعہ ملیہ کے نام سے بنی اور اس طرح آپ نے علی گڑھ کو گرایا بچایا۔

درمیان میں اصل ذکر تحریک ریشمی رومال کا تھا جس کی ابتدا یوں ہوں کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے بیرونی محاذ پر کام شروع کیا اور مولانا سندھی کو کابل بھیج دیا اس وقت پروگرام نہیں بتایا لیکن مولانا خود فرماتے ہیں کہ کابل جانے پر معلوم ہوا کہ استاد مکرم اور ان کے شیر غ کی ۵۰ سالہ محنتوں کے اثرات سامنے ہیں اب ان کو سمیٹنا ہے، وہاں مولانا سندھی نے جو کام کیا اس کا کم از کم نتیجہ برطانوی چیرہ دستیوں سے افغانستان کا چھٹکارا تھا جس کا اظہار شاہ افغانستان ظاہر شاہ نے اس وقت کیا جب قاری محمد طیب صاحب وہاں تشریف لے گئے موصوف نے واضح کیا کہ ہماری آزادی آپ کے بزرگوں کی مرہون منت ہے۔

افغانستان کے استخلاص اور آزادی کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن بعض برخود غلط عناصر کے سبب اصل مسئلہ یعنی آزادی ہند حاصل نہ ہو سکا۔

اس داستان درد کو پڑھنا ہو تو شیخ مدنی کی نقش حیات اور ابنائے اللہ مولانا محمد میاں کی تازہ کتاب "تحریک شیخ الہندؒ" پڑھیں مختصر یہ کہ مولانا سندھی کا ایک خط جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا بارگوں کے ہتھے چڑھ گیا اسی کی وجہ سے تحریک کا نام "تحریک ریشمی رومال" پڑ گیا حضرت شیخ الہندؒ ترکی کے زعماء سے مل کر لمبا پروگرام بنا چکے تھے لیکن قدرت کو منظور نہ تھا اس لئے آپ اپنے رفقا سمیت مکہ معظمہ میں گرفتار ہو گئے اور اناجیل میں ڈال دیئے گئے جبکہ برصغیر میں لاتعداد افراد پکڑے گئے اور مختلف قسم کی سزائیں پائیں۔

تحریک شیخ الہندؒ کے اردو ایڈیشن کے مطابق متعلقہ لوگوں کی تعداد ۲۲۲ ہے۔ جن کا ریکارڈ انڈیا آفس لندن میں ہے ان میں خلیفہ ترکی، سلطان ایران اور امیر کابل مربی ہیں جبکہ انور پاشا، ولی عہد دولت عثمانیہ، وزیر اعظم دولت عثمانیہ عباس علی، شریف مکہ (ابتدا میں)، نائب سلطنت کابل، معین سلطنت کابل، نظام حیدر آباد، والئی بھوپال نواب رام پور اور نظام بہاولپور مرکزی شخصیتیں تھیں۔

فوجی لشکر جس کا نام جنود ربانیہ تھا کے سالار اعلیٰ حضرت شیخ جبکہ قائم مقام سالار مولانا سندھی، نائب سالاروں میں مولانا دین پوری حضرت امروٹیؒ، حضرت مدنی، حاجی صاحب ترنگ زئی، ڈاکٹر انصاری ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق، ملا بابرا، ملا کوہستانی، جان باجوڑ، مولانا منصور انصاری، مولانا آزاد مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان حضرات کو لیفٹیننٹ جنرل لکھا گیا ہے۔

معین سالار یعنی میجر جنرل ۱۵ حضرات ہیں ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، ابو الکلام +، مولانا محمد علی قصوری وغیرہ کے نام ہیں

کرنل حضرات کی فہرست میں ۴۴ کے قریب حضرات کے نام ہیں حضرت لاہوری، مولانا محمد صادق کراچی، مولانا عزیر گل خواجہ عبدالحیٔ فاروقی مولانا فضل ربی وغیرہ اس زمرہ میں شامل ہیں۔

ہے کہ تریب لیفٹیننٹ جنرل اسی طرح میجر اور کپتان وغیرہ علیحدہ فہرست ہے۔

ان میں سے ہر ایک کا حلقہ اثر ما تحت علماء مشاہرہ جات اور دورے اخراجات کی تفصیل تحریک شیخ الہند میں منقول ہے جسے طوالت کے خوف سے چھوڑ رہا ہوں من شاء فلیراجع۔

مولانا سندھی نے کابل میں حکومت موقتہ بھی قائم فرمائی جس کا تذکرہ رولٹ ایکٹ کمیٹی وغیرہ میں ہے اور خود مولانا کی ذاتی ڈائری کے علاوہ اس سلسلہ کی دوسری کتابوں میں تفصیل سے درج ہے۔ اس حکومت میں راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ بھوپالی وغیرہ شامل تھے گویا یہ آزاد حکومت تھی۔ لیکن بدقسمتی سے بعض حضرات آڑے آئے مولانا سندھی کی چٹھی کا راز آؤٹ ہو گیا بات گرفتاری تک پہنچی اور پھر حضرت شیخ الہندؒ طویل عرصہ کے بعد رہا ہوئے تو عمر عزیز بیت چکی تھی اور چل چلاؤ کا دور تھا تاہم آپ واپس آکر ۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانگی راستہ کی منزلیں طے کر کے جون ۱۹۲۰ء میں بمبئی اترے۔ چین سے نہیں بیٹھے یہ مختصر مدت (یعنی جون ۲۰ء تا نومبر ۲۰ء یوم وفات) بھی اس طرح گزاری کہ اسی میں علی گڑھ تشریف لے گئے جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ جہاں آباد، مراد آباد، امروہہ، کلکتہ اور بجنور جانا ہوا اور آخری پڑاؤ دہلی ڈاکٹر انصاری صاحب کا مکان تھا جہاں وفات ہوئی۔

مالٹا سے واپسی پر عظیم الشان استقبال ہوئے، گاندھی جواہر لال جیسے لوگ بمبئی موجود تھے مجلس خلافت نے شیخ الہند کا خطاب تجویز کیا جو نام کا جزو اعظم بن گیا۔

مالٹا سے واپسی پر دو اہم کام ہوئے نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ کا افتتاح جس کے جانشین کے طور پر جامعہ ملیہ دہلی آج بھی موجود ہے، اور دوسرا جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۸۔۹۔۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ بمقام دہلی کی صدارت۔

گزشتہ سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جمعیت کا پلیٹ فارم بن چکا تھا کیونکہ بدلے ہوئے حالات میں جنگ کا انداز بدلنا ضروری تھا۔ اب عدم تشدد اور عدم تعاون کا آغاز ہوا جس کو باقاعدہ شکل اس اجلاس میں دی گئی۔

ملک بھر کے پانصد جید علماء اس اجلاس میں موجود تھے مولانا آزاد، مولانا عبدالباری لکھنوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالکافی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حبیب الرحمن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا داؤد غزنوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

اس اجلاس کی دوسری تجویز سب سے زیادہ اہم ہے جو گویا آئندہ کے لئے لائحہ آف ایکشن کا درجہ رکھتی ہے اور جس کے مطابق آئندہ سارا کام ہوا اس تجویز میں۔

خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑنے۔

کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے نہ دینے۔

دشمنان دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانے۔

کالجوں سکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنے اور سرکاری یونیورسٹی سے تعلق قائم نہ رکھنے۔

دشمنوں کی فوج میں بھرتی نہ ہونے۔

اور عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانے

کا فیصلہ ہوا۔

ان تجاویز کے متعلق حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت اور آخر میں ایک مفصل بیان پڑھا گیا جو جمعیۃ کیا ہے؟ نامی کتابچہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس خطبہ اور بیان میں حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن و سنت اور اور فقہ اسلامی کے متعدد حوالجات سے ترک موالات اور عدم تعاون

پر روشنی ڈالی اور گویا مجاہدین آزادی کے لئے ایک شاہراہ عمل متعین فرما دی جس پر چل کر بلانوشان محبت نے مزید ۲۴ سال قربانیاں دیں تب ۴۷ء میں آزادی کا دور آیا۔

اس اجلاس کے چند دن بعد دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر بے چینی بڑھ گئی، حالت عجیب تھی، آنسو تھمتے نہ تھے پوچھنے پر فرمایا:

خواہش تھی میدان میں مرتا بند بند کاٹا جاتا مگر افسوس!

یہ تھا اس مرد حق آگاہ کی زندگی کا مختصر خاکہ اور اس کے کارناموں کی ایک جھلک جس نے مادر علمی کے پہلے مدرس کے سامنے سب سے پہلے کتاب کھولی لیکن اپنے سوز دروں، جذبات حریت اور تربیت باطنی سے نصف صدی میں ایک نیا جہان بسایا اور اس طرح ایک ایسی کھیپ تیار کی جو جب سے اب تک باطل و طاغوت کے خلاف سرگرم عمل ہے، جی چاہتا ہے چند رفقاء کا سرسری تذکرہ کر دوں جو اس وقت شریک بزم تھے۔

- حضرت مدنی بقول میاں اصغر حسین قدس سرہ مولانا مدنی کو حضرت شیخ الہند سے وہی نسبت ہے جو سیدنا صدیق اکبرؓ کو حضور نبی کریم علیہ السلام سے، حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مدینہ میں قیام فرمایا پھر مالٹا میں ساتھ رہے حتیٰ کہ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر حضرت کھڑا کر گئے تو وہیں جان قربان کر دی۔

- مولانا سندھی سکھ سے مسلمان ہوئے، حضرت بھرچونڈی، حضرت امروٹی اور حضرت دین پوری جیسے باخدا لوگوں کی تربیت تھی آخر میں دیوبند گئے شیخ الہندؒ کے معتمد بن گئے، آپ نے پہلے داخلی طور پر پھر خارجی سطح پر نمائندہ بنایا سات سال کابل رہ کر روس ترکیہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ گئے ۲۵ سال بعد جلا وطنی کے بعد ۳۹ میں تشریف لائے، قوم کو ایک پیغام دیا ۴۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

- حاجی ترنگ زئی صاحب مولانا سندھی اور مولانا عزیر گل کے ذریعے شیخ الہند نے انہیں یاغستان میں کام کرنے کا فرمایا انہوں نے جو جان کی بازی لگائی تو انگریز بوکھلا کر رہ گیا بقول ایک مورخ:

ہم نے اس شخص کا غلط اندازہ لگایا تھا۔

مزید یہ کہ "اس وادی کے چپے چپے پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں تھیں۔

ان کے رفقاء میں مولانا سیف الرحمن صاحب تھے حضرت گنگوہی کے شاگرد مدرسہ فتح پور کے استاد، شیخ الہندؒ کے حکم سے استعفیٰ دیکر میدان میں آ نکلے۔

اسی طرح مولانا فضل ربی اور مولانا محمد اکبر نے یاغستان میں خوب کام کیا اور مولانا فضل محمود نے شاندار کام کیا۔

- مولانا منصور انصاری حضرت نانوتوی کے نواسے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حج میں گئے "غالب نامہ (مشہور تحریر) لیکر ہند واپس آئے، تحریک کا افشاء ہو گیا تو بھیس بدل کر مولانا سندھی سے جا ملے۔ افغانستان کے وزیر مختار رہے۔
- مولانا عزیر گل حضرت شیخ الہندؒ کے جانثار، مالٹا کے رفیق ابھی بقید حیات ہیں، خدا سلامت رکھے۔
- مولانا احمد اللہ پانی پتی حضرت شیخ الہندؒ کے ڈاک کے نگران آپ کی عدم موجودگی میں تحریک کے متعلق تمام امور کے نگران و مختار، جبکہ اہم اور بڑے امور کے نگران حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری تھے۔ خلیفۂ خاص حضرت گنگوہی اور ہزاروں بندگان خدا کے مربی و رہنما۔
- مولانا ظہور احمد سہارنپوری فراہمی چندہ کے نگران۔
- شیخ عبدالرحیم سندھی، اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی اسلام

قبول کر لیا، مولانا سندھی کے گہرے دوست سندھ میں خوب تبلیغ کی، سرہند شریف میں انتقال ہوا۔

حضرت مولانا غلام محمد دین پوری، حضرت بھرچونڈی کے خلیفہ خاص، وقت کے قطب الاقطاب، مولانا سندھی کے مربی، بعد میں عزیز داری ہو گئی، انہی کے واسطے سے شیخ الہندؒ سے رابطہ ہوا، زبردست مجاہد اور انقلابی، انقلاب کا سامان خوب اکٹھا کیا۔

مولانا محمد صادق کھڈہ کراچی، جنگ کے دوران لس بیلا اور بلوچستان میں کامیاب بغاوت کے ہیرو، انگریز کے سترہ ہزار سپاہی مارے گئے۔

حضرت امروٹی، سید تاج محمد امروٹی یہ بھی حضرت بھرچونڈی کے خلیفہ ہیں، مولانا سندھی اور حضرت لاہوری کے مربی، زبردست مجاہد اور انقلابی، تحریک خلافت کے سندھ میں سب سے بڑے رہنما، بعد میں جمعیۃ علماء کے رہنما رہے۔ ۵۰ ہزار غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، جہاد کے شوقین، اس مقصد کے لئے گھوڑے پالے، انگریز کی دستبرد سے مسجد کو بچایا، حکومت نے خفیہ طریق سے زہر دیدیا

خان عبدالغفار خاں سرحد کا مظلوم رہنما، شیخ الہندؒ کے مرید اور معتمد ساتھی، طویل عرصہ جیلوں میں گزرا اب بھی نظر بند۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم شیخ الہندؒ کے محبوب ترین مرید، ملکی سطح پر قائم کی جانے والی انجمن اعانت نظر بنداں کے جنرل سیکرٹری، ہلال احمر کا وفد لیکر ترکی جانے والے اور قومی کارکنوں کے زبردست خادم۔

شاہ عبدالرحیم رائے پوری ضلع انبالہ کے مرد حق آگاہ حضرت گنگوہی اور شاہ عبدالرحیم سہارنپوری کے مخلص مرید اور بانیٔ مشق الٰہی کی پرورش میں اپنی مثال آپ، حضرت شیخ الہند کی عدم موجودگی میں اہم امور کے نگران

مولانا جلیل کیرانوی، بچپن سے خادم شیخ تھے آپ کی عدم موجودگی میں گھریلو نظم کے نگران

مولانا محمد مبین دیوبندی بیرونی مقامات از قسم نگون وغیرہ فراہمی چندہ کے نگران۔

مولانا محمد ابراہیم مانڈیر ضلع سورت کے نیز دوست خوب مالی امداد کی۔

حضرت لاہوری مولانا سندھی کے نائب اور معتمد خصوصی عام گرفتاریوں میں گرفتار ہو کر لاہور لائے گئے تو شیخ کے حکم کے لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے اور بے بہا قربانیاں دیں۔

یہ چند سطریں ہیں ان بلند نشان ہستیوں کے متعلق جنہوں نے تحریک شیخ الہندؒ میں نمایاں کام کیا ضرورت ہے کہ ان کا تذکرہ مفصل طریق سے سامنے آئے اور نسل نو کو پتہ چل سکے کہ آزادی کا مرحلہ کیونکر طے ہوا۔

آخر میں ایک بات عرض کر دوں تحریک شیخ الہندؒ کا اقتباس جو شروع میں دیا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ تحریک کے بانی مولانا سندھی تھے اور بعض دوسرے مقامات پر مولانا سندھی اور مولانا آزاد دو بزرگوں کا تذکرہ ہے اور شیخ الہندؒ کو ان کا تابع بتایا گیا ہے۔

یہ دراصل انگریزی سی آئی ڈی کی کم عقلی ہے حقیقت یہ ہے کہ مولانا سندھی اور مولانا آزاد دونوں ہی شیخ الہندؒ کے خوشہ چین تھے، شیخ الہندؒ کا ایک مقولہ "آزادی کے مجاہد" کے فاضل مرتب نے نقل کیا ہے کہ آپ دہلی آئے مولانا سندھی سے فرمایا:

"انگریزی حکومت کا اثر ہندوستان میں بڑھ رہا ہے تم جتنی دیر میں دس بیس آدمیوں کو مسلمان بناؤ گے (ڈیڑھ سال مراد ہے) اتنی مدت میں وہ ہزاروں مسلمانوں

کو گمراہ کر دیں گے۔ (صفحہ ۵)

اس پر مولانا سندھی نے عرض کیا تو حضرت نے انگریز حکومت مٹانے کا فرمایا اور اس کے لئے مجاہدین اسلحہ وغیرہ کا ذکر کیا۔ مرکز کی بات آئی شاگرد کے سوال پر مرکز کے متعلق فرمایا یاغستان کا علاقہ بہت مناسب ہے۔

چنانچہ اس کے لئے انہیں کابل بھیجا، مولانا سیف الرحمٰن وغیرہ کو حاجی ترنگ زئی کے پاس بھیجا خود ترکی حکومت سے بات کرنے حجاز گئے گو آپ فوری طور پر اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہوئے لیکن انگریز دشمنی کا جو بیج بو گئے اس نے مستقبل میں قوم کی راہنمائی اس انگریز دشمنی کا پتہ چلانا ہو تو سر جیمس گورنر یوپی سے پوچھیں جس نے کہا تھا:

اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی (آزادی کے مجاہد صفحہ ۵۵)

یہ عداوت نہ معلوم وہ کتنے مراکز کی طرف منتقل کر گیا جو بالآخر انگریزی ظلم و جبر کے خلاف استعمال ہوئے اور ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

دارالعلوم
اور
تحفظ ختمِ نبوّت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اللّٰھمّ لک الحمد حمدًا دائمًا مع دوامک، ولک الحمد حمدًا خالدًا مع خلودک، ولک الحمد حمدًا لا یرید قائلہ الا رضاک، ولک الحمد عند طرفۃ عین وتنفس کل نفس۔ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، واشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ لا نبی بعدہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا دائمًا ابدًا۔ امّا بعد:
تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات پر کچھ لکھنے سے پہلے تقریب فہم کے طور پر دارالعلوم دیوبند اور تحفظ ختم نبوت پر الگ الگ کچھ عرض کردینا ضروری ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اسلام، حق تعالیٰ شانہٗ کا نازل کردہ آخری دین، آخری قانون سعادت اور آخری پیغامِ ہدایت ہے جو اس کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری امت۔ امتِ محمدیہ کو عطا کیا گیا۔ اسلام کو یہ شرف وفضیلت حاصل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ

اور امتِ مرحومہ کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ جارحۂ خداوندی کی حیثیت سے دینِ متین کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیں اور جب کوئی فتنہ سر اٹھائے فورًا اس کی گوشمالی وسرکوبی کریں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔

یحمل ھٰذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔

ہر آئندہ نسل میں اس علم دین کے حامل ایسے عادل اور ثقہ لوگ ہوں گے جو اسے غالیوں کی تحریف باطل پرستوں کے غلط

دعوؤں اور جاہلوں کی تاویل سے پاک صاف کریں گے۔

گویا حق تعالیٰ نے صرف دین کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا بلکہ اس کے ضمن حافظانِ دین وملت کی حفاظت کا بھی قطعی اور یقینی وعدہ کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر صدی میں اس جنودِ ربانیہ (خدائی فوج) کا کوئی نہ کوئی دستہ حفاظت دین کے محاذ پر اعداء اللہ سے مصروف پیکار اور دشمنانِ دین کی تحریف و تاویل کے راستہ میں آہنی دیوار نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان مجاہدین اسلام کی پوری تاریخ وعدۂ الٰہی إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کی عملی تفسیر ہے۔

گیارہویں سے چودھویں صدی تک زمانہ ہندوستان کا ہے۔ اس موقع پر ایک بات اہل نظر کو صاف نظر آئے گی کہ دینی قطبیت کا مرکز دوسرے اسلامی ملکوں سے ہندوستان کو منتقل ہوگیا، چنانچہ دینی و مذہبی خدمت، علوم فنون کی خدمت، حدیث و تفسیر کی خدمت اور ہدایت خلق اور احیائے سنن و رد بدعات کے لحاظ سے ہندوستان تمام دوسرے اسلامی ملکوں پر سبقت لے گیا۔ کیوں کہ ان صدیوں میں ہندوستان میں جو ہستیاں نمایاں ہوئیں ان کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ مثلاً گیارہویں صدی کے آغاز میں حضرت شیخ احمد سرہندی المتوفی سنہ ۱۰۳۴ھ اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی المتوفی سنہ ۱۱۷۶ھ اور تیرھویں صدی کے وسط میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی اور مولانا سید احمد بریلوی شہید۔ (شہادت سنہ ۱۲۴۶ھ) "مقدمہ تجدید دین کامل از مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی"

حضرات شہیدین کے بعد ان کے متوسلین میں ایک ایسی شخصیت نمایاں ہوئی جو عشق و معرفت، زہد و تقویٰ، اخلاص و ایمان، فہم و فراست علم و عمل اور حال و قال میں اپنے اسلاف کی صحیح جانشین تھی اور جسے قدرت نے اس دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت کا مرکز و محور بنایا تھا۔ یہ قطب العالم شیخ العرب والعجم مولانا شاہ امداد اللہ مہاجر مکی، المتوفی سنہ ۱۳۱۷ھ کی ذات گرامی تھی۔ جو اکابر دیوبند کے مرشد و مربی اور ہندوستان میں تحریک دعوت و عزیمت اور تحفظ دین کے موسس و بانی تھے۔ "دارالعلوم دیوبند" حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے سوز دروں کا مظہر اور ان کی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جاچکی تھی، کسی شخص نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کیلئے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:-

سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر! یہ مدرسہ انہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے"

(علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے ص۱۰، سوانح قاسمی ص۲۶۱ منقول از بیس بڑے مسلمان ص۲۱۲ طبع سوم)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست و ناکامی کے بعد اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل نظر بظاہر تاریک تھا۔ انگریز کے منحوس قدم ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور انگریز ہر طرف سے یہ اعلان کر رہا تھا۔

"جس طرح کل ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی (تمام لوگ) ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے"....
(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۲۱)

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگین ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام

ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیے۔" (حکومت خود اختیاری صد ۱۲۶

اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے صد ۲۰۲)

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی آخری حصہ ص ۳۰۲)

"میں اس عقیدے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے، اس لیے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے ہیں۔"....

(ان بیمپ انڈیا ص ۲۹۹)

مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی اور سفید طاغوت کی ان تعلیوں کے پیش نظر سطحی نظر کے لوگوں نے اگر یہ رائے قائم کی کہ:

"اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔"

(ص ۱۸۱ موج کوثر شیخ محمد اکرم[1])

تو بلاشبہ وہ معذور تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہی رائے لوگوں نے اس وقت بھی قائم کی تھی جب وصالِ نبوی کے بعد پورا خطۂ عرب فتنۂ ارتداد کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور پھر گیارہویں صدی میں یہی رائے اس وقت بھی (کم از کم ہندوستان کی حد تک) قائم کی گئی جب ہندوستان کا مطلق العنان طاغوت اکبر جل جلالہ کا نعرہ لگاتے ہوئے دینِ الٰہی تصنیف کر رہا تھا ان تمام موقعوں پر حق تعالیٰ شانہ کا وعدہ "حفاظتِ دین" کبھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور کبھی اس نے امام ربانی مجدد الف ثانی کو کھڑا کیا۔ آج وہی وعدہ "دارالعلوم دیوبند" کی شکل میں پورا کیا جا رہا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو اسلام فتنۂ ارتداد کی نذر ہو گیا ہوتا۔ اہلِ نظر آج یہ کہتے ہیں کہ انگریز کے دورِ آمد میں دارالعلوم دیوبند کا لطیفۂ غیبی ظہور پذیر نہ ہوتا.... جو حضرت حاجی صاحب کے بقول اوقات سحرگاہی میں پیشانیاں رگڑ رگڑ کر گڑگڑانے سے ظہور پذیر ہوا.... تو شاید انگریز کی مراد بر آتی، اور اسلام ہندوستان سے رخصت ہو گیا ہوتا۔

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کو کیا دیا؟ اس پر بہت سے حضرات بہت کچھ کہیں گے۔ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ تجدید و احیاءِ دین کی جو تحریک گیارہویں صدی سے ہندوستان کو منتقل ہوئی تھی، اور جسے اپنے دور میں مجدد الف ثانیؒ، محدث دہلویؒ اور شہید بالاکوٹؒ جس امانت کے حامل تھے دارالعلوم اس وراثت امانت کا حامل تھا، لوگ "مدرسہ عربی دیوبند" کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں، کوئی اسے علوم اسلامیہ کی یونیورسٹی سمجھتا ہے، کوئی مجاہدینِ حریت کے مجاہدین کی تربیت گاہ قرار دیتا ہے۔ کوئی اسے دعوت و عزیمت اور سلوک و تصوف کا مرکز سمجھتا ہے، لیکن میں حضرت حاجی صاحب کے لفظوں میں اسے "بقائے اسلام اور تحفظ دین کا ذریعہ" سمجھتا ہوں۔

دوسرے لفظوں میں آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں مجددینِ امت کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا دارالعلوم دیوبند ـــــ اپنے دور کے لیے مجددینِ امت کی تربیت گاہ تھی، یہیں سے مجددِ اسلام حکیم الامت تھانویؒ اٹھے، اسی سے دعوت و تبلیغ کی تجدیدی تحریک ابھری، جس کی شاخیں چار دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، یہیں سے تحریکِ حریت کے داعی تیار ہوئے جن سے فرقِ باطلہ کا توڑ کیا گیا، یہیں سے محدثین، مفسرین، فقہا اور متکلمین کی کھیپ تیار ہوئی۔ مختصر یہ کہ دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف یہ کہ نابغہ شخصیتیں تیار کیں، بلکہ اسلام کی ہر پہلو تجدید و احیاء کے لیے عظیم الشان ادارہ کو جنم دیا ـــــ اس لیے دارالعلوم کو اگر تجدید و احیاءِ دین کی یونیورسٹی کا نام دیا جائے تو شاید یہ اس کی خدمات کا صحیح عنوان ہو گا۔ صفحات میں

---

[1] یہ "تمام اقتباسات" ہیں بڑے مسلمان ص ۱۱۱ طبع سوم سے ماخوذ ہیں۔

صرف ایک پہلو یعنی عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ میں دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ ہو گا تاکہ والے

نے دعویٰ نبوت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتوں کا نظریہ ایجاد کیا جس کا خلاصہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار تو چھٹی صدی عیسوی میں مکہ میں مبعوث ہوئے تھے اور دوسری مرتبہ (نعوذ باللہ) مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں قادیان کی ملعون بستی میں۔ مکی بعثت کا دور تیرھویں صدی ہجری پر ختم ہوگیا اور اب چودھویں صدی سے قیامت تک قادیانی بعثت و نبوت کا دور ہوگا۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو تیرھویں صدی کے بعد کالعدم قرار دے کر خاتم النبیین کا منصب خود سنبھال لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات مخصوصہ کو اپنی جانب منسوب کرنے کے لئے قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں بے دریغ تحریف کر ڈالی۔ اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا۔ انبیاء علیہم السلام کو فحش گالیاں دیں، تمام امت مسلمہ کو گمراہ اور کافر و مشرک قرار دیا۔ قصر اسلام کو منہدم کرکے "جدید عیسائیت" کی بنیاد رکھی۔ انگریز کی ابدی غلامی کو مسلمانوں کے لئے فرض و واجب قرار دیا، مسئلہ جہاد کو حرام اور منسوخ ٹھہرایا اور مجاہدین اسلام کو منکرِ خدا قرار دیا۔ جن لوگوں کو قادیانیت کی گہرائی کا علم نہیں اور وہ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں انہیں اس فتنہ کی شدت کا احساس نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ صدر اول سے لے کر آج تک جتنے فتنے پیدا ہوئے ان سب کی مجموعی فتنہ پردازی بھی فتنہ قادیانیت کے سامنے شرمندہ ہے۔ اگر ملاحدہ و زنادقہ اور مدعیانِ نبوت و مہدویت کی تحریفات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں قادیانی کی تحریفات کو جگہ دی جائے تو یقین ہے کہ قادیانی تحریفات کا پلڑا بھاری رہے گا۔

حکومتِ برطانیہ نے اپنے خود کاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی سے نبوت کا دعویٰ ایسے دور میں کرایا جب کہ مسلمانوں کی تلوار ٹوٹ چکی تھی، جب ان کا تاج لٹ چکا تھا، جب ان کے لئے آزادی کا نام جرم تھا، جب جہاد اور وہابیت ہم معنیٰ ہو گئے تھے، جب غلامانِ ہند بلکہ اسلامیانِ عالم کا فیصلہ سفید آقاؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر مرزا صاحب نے حریم نبوت میں قدم رکھنے کی جرأت دورِ صدیقی نہیں بلکہ عثمانی دَورِ خلافت ترکیہ، میں بھی کی ہوتی تو ان کا انجام اسود کذاب اور مسیلمہ کذاب سے مختلف نہ ہوتا، خود مرزا صاحب کو بھی اس اسلامی غیرت کا جو مدعیانِ کذاب کے معاملہ میں مسلمانوں میں یکایک ابھر آتی ہے پورا پورا احساس تھا، چنانچہ اپنی جماعت کو گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت کرنے کا جو ان کی زندگی کا مشن اور ان کے دعویٰ نبوت کی اصل غرض تھی، اور جس کے لئے انہیں بطورِ خاص مامور کیا گیا تھا) حکم دیتے ہوئے انہیں گورنمنٹ برطانیہ کی اصل قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہیں:

> "خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت ہے کہ اُس نے اس گورنمنٹ کو اس بات کے لئے چن لیا کہ یہ فرقہ احمدیہ اس کے زیر سایہ ظالموں کے خونخوار حملوں سے اپنے تئیں بچاوے، اور ترقی کرے، کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ تم سلطان روم (خلافت ترکیہ) کی عملداری میں رہ کر یا مکہ مدینہ ہی میں اپنا گھر بنا کر شریر لوگوں (مسلمانوں) کے حملوں سے بچ سکتے ہو؟ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ ایک ہفتہ ہی میں تم تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاؤ گے۔ تم سُن چکے ہو کہ کس طرح صاحبزادہ عبداللطیف ۔۔۔۔ جب میری جماعت میں داخل ہوئے تو محض اس قصور سے کہ میری تعلیم کے موافق جہاد کے مخالف ہو گئے تھے، امیر حبیب اللہ خان نے نہایت بے رحمی سے ان کو سنگسار کر دیا، پس کیا تمہیں توقع ہے کہ تمہیں اسلامی سلطنتوں کے ماتحت کوئی عزت مل سکے گی؟ بلکہ تم تمام اسلامی مخالف علماء کے فتوؤں کی رو سے واجب القتل ٹھہر چکے ہو۔" (تبلیغ رسالت ص۱۲۲، جلد ۱۰)

۵۔ سیاسی نبوت

ختم نبوت کے صریح اعلان اور امت اسلامیہ کے متواتر اجماعی عقیدہ

کے بعد یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص (جو دماغی طور پر صحتمند ہو) سنجیدگی کے ساتھ دعویٰ نبوت بھی کر سکتا ہے، اس لئے اسود کذاب سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی تک مدعیانِ نبوت کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرو تو ہر مدعی نبوت کے دعویٰ کا کوئی نہ کوئی سیاسی یا معاشی سراغ ضرور ملے گا۔ (الا یہ کہ کوئی شخص مراقی بخارات اور خشکیٔ دماغ سے مجبور ہو کر یہ دعویٰ کرے تو بے چارہ معذور ہے) مرزا صاحب کی نبوت کے محرکات شاید پس منظر میں رہ جاتے لیکن بعض وجوہ و اسباب ایسے پیش آئے کہ مرزا صاحب کو (اشاروں کنایوں میں) ان محرکات کی نشاندہی کرنا پڑی، ان محرکات میں سب سے قوی محرک آسمانِ مغرب کی وحی تھی جس نے مرزا صاحب کو دعویٰ نبوت کے لئے آمادہ کیا تھا، اور یہی وحی خفی" ان کے بہت سے ابتدائی معجزات کی تشکیل کرتی تھی۔ پیارا انگریز نے قادیانی نبوت کا تخم سرزمین ہند (پنجاب) میں کیوں کاشت کیا؟ یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے، مختصراً اس کے مقاصد حسب ذیل تھے:

الف: ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ انگریز کا پنجۂ استبداد ہندوستان پر پوری طرح گڑ چکا تھا، اور نخچیرانِ ہند کے لئے پھڑپھڑانے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہنے دی گئی تھی، لیکن انگریز اس خطرے سے بے نیاز نہیں تھا کہ یہ بے بال و پر اسیرانِ قفس کسی موقع پر اپنی اسیری کے خلاف پھر بغاوت کر ڈالیں۔ ان کے "ذہنی مشغلہ" اور "روحانی ترقی" کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف مذاہب عالم کو (جن کا مرکز بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان تھا) آپس میں ٹکرا دیا جائے بلکہ یہ بھی قرینِ آئینِ جہانداری تھا کہ ہر مذہب میں نئے نئے فرقے پیدا کئے جائیں اور پھر ہر فرقے میں نئی نئی قلمیں لگا لگا کر ہندوستان کو مذاہب و افکار کا نگارخانہ بنا دیا جائے۔ تاکہ آوازۂ حریت بلند کرنے کی اوّل تو کسی کو فرصت ہی نہ ملے، اور اگر کسی گوشے سے ایسی آواز اٹھے بھی تو اس افتراقی غلغلہ کے شور میں دب کر رہ جائے، اور پرستارانِ مذاہب کی نظر میں وہ آواز صدائے بے ہنگام قرار دی جائے: "سفید آقا" کے مہاتمانہ فلسفہ نے "آزادی مذاہب" کا تمغہ دے کر غلامانِ ہند کو عطا کیا تھا — اس دور میں جو مذہبی کشتیاں لڑی گئیں — یا صحیح تر لفظوں میں یوں کہیے کہ غلامانِ ہند کو اس پر مجبور کیا گیا — اس کی مثال کسی قوم کے دورِ زوال میں ہی مل سکتی ہے، عروج و اقبال کا دور ان سے مبرا ہوتا ہے۔ اس دور میں کون کون سے فرقے وجود میں آئے، اور انہوں نے کیا کردار ادا کیا؟ اور ان سے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کو کیا کیا نقصان پہنچا؟ ان سوالات سے پردہ اٹھانا اگرچہ ایک تلخ فریضہ ہے، لیکن ہم آنے والے مؤرخ کے قلم کو اس سے نہیں روک سکتے۔ یہاں صرف قادیانی نبوت کو لیجئے جو انگریز کے سایہ عاطفت میں پھل پھول رہی تھی، علمائے حق کی جتنی قوت اس ایک فتنہ کے استیصال میں خرچ ہوئی اگر یہ انگریز کا خودکاشتہ پودا ہندستان میں نہ ہوتا تو غور کیجئے کہ ہندستان کی تاریخ کا نقشہ کیا ہوتا اور ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہم سے مکمل غصب کر لیا گیا تھا اس کی بازیابی میں کتنی آسانی ہو جاتی؟

ب: ایشیا اور بالخصوص برصغیر پر انگریزی تسلط کا مقصد صرف جسموں پر حکمرانی اور یہاں کے مادی، اقتصادی فوائد کا استحصال نہیں تھا بلکہ وہ اس سے بڑھ کر عالم اسلام کو ذہنی ارتداد کے عمیق گڑھے میں دھکیلنا چاہتا تھا، اگرچہ لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم (کہ ہندوستانیوں کو اس نہج پر تعلیم دی جائے کہ اگر وہ عیسائی نہ بنیں تو کم از کم مسلمان بھی نہ رہیں) اپنی جگہ کافی کامیاب تھی، بہت سے مسلم مفکرین اسلامی عقائد و اعمال میں تشکیک پیدا کرنے کے لئے نئے نئے فلسفے اور نظریے پیش کر رہے تھے۔ اور ان کو نمایاں کرنے کے لئے مستشرقین مغرب کی ایک پوری فوج شب و روز محنت کر رہی تھی، لیکن یہ تمام تر کوششیں ایک محدود حلقے پر اثر انداز تھیں، عوام پر ان کا اثر بالواسطہ در بالواسطہ تھا، اور پھر جو لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے

اسلام کی بنیاد کلمہ طیبہ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے دو حرفی عہد پر رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مدعیٔ الوہیت کا وجود ناقابل برداشت ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعی نبوت کے بساطِ نبوت پر قدم رکھنے کی گستاخی بھی لائق تحمل نہیں۔ یہی عقیدہ ختم نبوت کا عقیدہ کہلاتا ہے جس پر صدر اوّل سے آج تک امت مسلمہ قائم رہی ہے۔

جو لوگ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے ایمان و اقرار سے سرشار ہو کر اسلامی برادری میں شامل ہوں ان پر یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ وہ باغیان رسول اللہ کے خلاف بھی سینہ سپر ہو جائیں اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے طلسم سامری کو بھی پاش پاش کر ڈالیں۔ اسی فریضہ کا نام "تحفظ ختم نبوت" ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ امت مسلمہ نے کسی دور میں بھی اس فریضہ سے تغافل نہیں کیا۔

ختم نبوت کا سب سے پہلا باغی یمن میں عبہلہ نامی ایک شخص ہوا۔ جس کے سر میں دعوائے نبوت کا سودا سمایا اور اس نے چند دنوں میں یمن کے بیشتر علاقہ پر حکومت قائم کر لی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو اس سے قتال و جہاد کا تحریری حکم صادر فرمایا۔ بالآخر حضرت فیروزؓ کے خنجر نے اس کی جھوٹی نبوت کا آخری فیصلہ سنا دیا۔ تاریخ کے ریکارڈ میں اس کا افسانہ "اسود کذاب" کے نام سے محفوظ ہے۔

ختم نبوت کا دوسرا غدار مسیلمہ کذاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس نے نبوت محمدیہ میں شرکت کا دعویٰ کیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے "اللہ کی تلوار" (خالد بن ولیدؓ) کو اس کی سرزنش کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ کذاب اپنے بیس ہزار امتیوں کو لے کر حدیقۃ الموت[1] کے راستے سفر جہنم پر روانہ ہوا صرف اس ایک معرکہ میں مسلمانوں کو "تحفظ ختم نبوت" کے لیے اتنی بڑی قربانی دینا پڑی کہ گیارہ سو سے چودہ سو تک اشراف صحابہ شہید ہوئے[2]۔ ان میں سات سو سے زیادہ وہ اصحاب تھے جو قرا کہلاتے تھے، یعنی قرآن کریم کے حافظ قاری اور متخصص عالم۔ — حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادہ عبداللہؓ، حضرت عمرؓ کے برادر اکبر زید بن خطاب، خطیب الانصار ثابت بن قیس شماس، مدرسہ نبوت کے سب سے بڑے قاری سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ان کے مولیٰ حضرت ابوحذیفہ وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین — آفتاب نبوت کے ان درخشندہ ستاروں کے نام سے حدیث و تاریخ کا کون طالب علم ناواقف ہے! ان میں سے ایک ایک کا وجود پوری امت پر بھاری تھا، یا صحیح لفظوں میں بجائے خود امت تھا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مقتل یمامہ میں شمع نبوت کے ان پروانوں نے ختم نبوت پر کٹ مرنے کا کیا حسین مگر دلگداز منظر پیش کیا! گویا حافظ شیرازی نے انہی کی زبان سے کہا تھا۔

> ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
> ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ختم نبوت کا تیسرا باغی طلیحہ اسدی تھا جس کے مقابلہ کے لیے وہی اللہ کی تلوار چمکی، لیکن بہت سے حامیوں کو مروا کے اسے جلد ہی راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت محسوس ہوئی، ملک شام پہنچ کر سانس لی اور ہمیشہ کے لیے دعوی نبوت سے توبہ کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ کم از کم ان تین مدعیان نبوت کا انجام ہمارے سامنے ہے جنہوں نے دور نبوی میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور صحابہ کرامؓ نے سیف و سنان سے ان کی تواضع کی۔ گویا صدر اول ہی سے امت مسلمہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ مدعیان نبوت کا فیصلہ بادشاہ مناظرہ کی بزم آرائیوں سے نہیں ہوتا بلکہ تلوار کی نوک اور نیزے کی انی اس کا فیصلہ چکاتی ہے۔

چودہویں صدی ہجری میں اسلام کو جن فتنوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سب سے بدتر اور منحوس فتنہ وہ تھا جسے دنیا فتنۂ "قادیانیت" کے نام سے جانتی ہے۔ اس فتنہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ)

---

[1] "حدیقۃ الموت" اس باغ کا نام ہے جہاں مسیلمہ کذاب قتل ہوا۔

[2] عمدۃ القاری ص ۱۸۵ ج ۱۹   [3] عمدۃ القاری ص ۱۶ ج ۱۰

ان کے متعلق کسی پر نیچریت کی اور کسی پر دہریت کی چھاپ تھی، مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت سے انگریز کو اس ذہنی ارتداد کے لئے دو اہم ترین فائدے تھے۔ اول یہ کہ یہ تحریک صرف خواص اور پڑھے لکھے روشن خیال افراد تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ اس کا دائرہ کار عوام کی سطح تک پھیل جائے گا، دوم یہ کہ جو نظریات ملحدانِ یورپ اور ان کے شاگرد اپنی عزیز نیچریت یا دہریت کی تہمت کی بنا پر مسلمانوں سے قبول کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہی نظریات "وحی والہام" کی سند سے قادیانی نبوت پیش کرے گی، اور مسلمان اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔

مشرق و مغرب کے تمام ملاحدہ کے سارے افکار اور ان کی تمام جدوجہد کا خلاصہ اگر نکالا جائے تو یہ ہے کہ اسلام اپنی موجودہ شکل میں ـــــ جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے ہے۔ (نعوذ باللہ) لائقِ اعتبار اور قابلِ عمل نہیں۔ ـ اور جن لوگوں نے قادیانی اور اس کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ٹھیک یہی خلاصہ قادیانی تحریک کے عقائد و افکار کا ہے کسی قادیانی کے سامنے مرزا صاحب کے الہام کے خلاف کوئی آیت پڑھیے کوئی حدیث پیش کیجیے، کسی صحابی کی سند لائیے، کسی امام و مجدد کسی ولی و قطب کی تحریر پیش کیجیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کا ذہن ان میں سے کسی چیز پر بھی ایمان لانے یا اعتماد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ـــــ ظاہر ہے کہ ذہنی ارتداد اور مزاجی تشکیک کی یہ کیفیت انگریز اگر صرف مستشرقین کے حملوں اور لارڈ میکالے کے نظریۂ تعلیم کی یورش کے ذریعہ پیدا کرنا چاہتا تو اسے کامیابی نہ ہوتی ـــــ یہی فلسفہ ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ افراد جو دہریت اور نیچریت کا شکار رہتے، انہیں اپنے افکار و نظریات کے لئے جب الہامی سند مہیا ہوئی تو فوراً اس کی پناہ میں آگئے، حکیم نورالدین مولوی عبدالکریم سیالکوٹی، محمد احسن امروہوی اور مسٹر محمد علی لاہوری، جو قادیانیت کا ہراول دستہ ہے، جو پہلے نیچری تھا پھر مرزائی ہوا۔

ج: ہندوستان کے سیاسی حالات کے پس منظر میں انگریز کو جس چیز نے سب سے زیادہ بے چین کر رکھا تھا وہ اسلام کا "جذبۂ جہاد" تھا، جہاد کی تلوار انگریزی جارحیت کے سر پر ہر وقت لٹک رہی تھی۔ اور انگریز اس تلوار کو ہمیشہ کے لئے توڑ دینا چاہتا تھا یورپ کے مستشرقین نے اسلامی جہاد کے مسئلہ کو نہایت گھناؤنی شکل میں پیش کرنے کے لئے اگرچہ بہت سے صفحات سیاہ کئے، جناب سرسید صاحب اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے بھی اس کی تعبیرات اس انداز سے کیں کہ جہاد کا دبدبہ اور اس کی سنگینی انگریز کے ذہن سے ختم ہو جائے۔ لیکن انگریز بدستور خائف رہا، اور جہاد کے عملی تجربوں نے جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی طرف سے دہرائے جاتے تھے، اسے بے چین کئے رکھا تاآنکہ مرزا غلام احمد صاحب نے وحی آسمانی کے ذریعہ اس کے آئندہ منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا، ظاہر ہے مستشرقین کے طومار اور سرسید کے افکار کا وہ وزن نہیں تھا جو مرزا صاحب کے "الہام" کا ہو سکتا تھا۔ مرزا صاحب کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن، ان کے وجود کا سب سے بڑا مقصد، ان کی نبوت و مسیحیت کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کے الہامی نیزہ کا سب سے اہم نشانہ یہی مسئلہ جہاد ہے۔ باقی سب تمہید ہے ـــــ اور یہی انگریز کی اس دور میں سب سے بڑی ضرورت تھی۔

انگریز کے پاس اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے سی۔ آئی۔ ڈی کا ہیبت ناک جال موجود تھا، اور پھر مخبری کے لئے "کالے فرنگیوں" کی ایک نوع کی فوج بھی خفیہ خدمات پر مامور تھی۔ جن میں ہر طبقہ اور ہر سطح کے لوگ تھے، ان میں "امیر" بھی تھے اور "غریب" بھی

"شریف" بھی اور "شاہ" بھی، نواب بھی تھے اور خان بہادر بھی۔ صوفی بھی تھے اور زاہد دین فروش بھی۔ علماء بھی تھے اور مشائخ بھی، طالب علم بھی تھے اور مریدانِ صفا کیش بھی۔ الغرض رضاکارانِ ہند میں ہر سطح کے لوگ جو دفتے ہو "خدماتِ خاص" بجا لاتے اور سفید آقا کے دربار میں خلعت وخطابات سے نوازے جاتے۔

اس نازک دَور میں سرکار کو بروقت اطلاع دے دینا کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت حضورِ گورنمنٹ کے خلاف باغیانہ "خیالات" رکھتا ہے، معمولی خدمت تھی وادودہش کے دہانے کھل جاتے انعام واکرام کی بارش ہوتی، عزت ووجاہت کو چار چاند لگ جاتے، جائدادیں تقسیم کی جاتیں، ریشمی رومال پکڑ کر انگریز افسر کے حوالے کر دینے پر "خان بہادر" کا لقب اور کئی مربعے جائداد مل جاتی ——— تاہم اب تک ایک "نبی" کی نشست خالی تھی، اس کے لئے جناب مرزا غلام احمد قادیانی (جو آقایانِ فرنگ کے پُشتینی وفادار اور یار غار تھے) سے بہتر اور کسی شخصیت کا انتخاب موزوں ہو سکتا تھا؟ مرزا صاحب ایک نبی کی حیثیت سے اپنی امت سمیت "مردانِ احرار" کی خفیہ رپورٹ کی خدمات انجام دینے کے لئے مامور ہوئے یا مرزا صاحب کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ انہیں اس کارِ خیر کی "وحی" والہام ہوا۔ یہ کہانی خود مرزا صاحب کی زبان سے بھی معلوم ہوگی، وہ لکھتے ہیں:

"چونکہ قرینِ مصلحت ہے کہ سرکارِ انگریزی کی خیر خواہی کے لئے ایسے نافہم مسلمانوں کے نام بھی نقشہ جات میں درج کئے جائیں جو درپردہ اپنے دلوں میں[1] برٹش انڈیا کو دارالحرب قرار دیتے ہیں.... لہٰذا یہ نقشہ اسی غرض کے لئے تجویز کیا گیا ہے تاکہ اس میں ان ناحق شناس لوگوں کے نام محفوظ رہیں جو ایسی باغیانہ سرشت کے آدمی ہیں اگرچہ گورنمنٹ کی خوش قسمتی سے برٹش انڈیا میں مسلمانوں میں ایسے لوگ معلوم ہوسکتے ہیں جن کے نہایت مخفی ارادے گورنمنٹ کے خلاف ہیں[1]، اس لئے ہم نے اپنی محسن گورنمنٹ کی پولٹیکل خیر خواہی کی نیت سے اس مبارک تقریب پر یہ چاہا کہ جہاں تک ممکن ہو ان شریر لوگوں کے نام ضبط کئے جائیں جو اپنے عقیدے سے اپنی مفسدانہ حالتیں ثابت کرتے ہیں.... لیکن ہم گورنمنٹ میں بادب اطلاع کرتے ہیں کہ ایسے نقشے ایک پولٹیکل راز کی طرح اس وقت تک ہمارے پاس محفوظ رہیں گے جب تک گورنمنٹ ہم سے طلب کرے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ حکیم مزاج بھی ان نقشوں کو ایک ملکی راز کی طرح اپنے کسی دفتر میں محفوظ رکھے گی[2]۔ ایسے لوگوں کے نام مع پتہ نشان کے یہ ہیں۔"

(تبلیغ رسالت ص ۱۱/۵)

چونکہ مرزا صاحب کا "کارِ خیر" بقول ان کے نافہم، ناحق شناس، شریر اور منکر مسلمانوں کے خلاف، اپنی محسن گورنمنٹ کی پولٹیکل خیر خواہی

---

[1] ظاہر ہے کہ دلوں کی بات تو مرزا صاحب کو "وحی" کے ذریعہ ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

[1] گورنمنٹ کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک نبی جبرئیل سے پوچھ پوچھ کر لوگوں کے نہایت مخفی ارادوں کی گورنمنٹ کو اطلاع دینے کے لئے میسر ہو۔

[2] کیوں نہیں، ایک نبی کی اطلاع اور وہ بھی لوگوں کے عقیدوں کے بارے میں، گورنمنٹ کو اس سے بہتر خفیہ مواد اور کہاں سے مل سکتا تھا۔

کی نیت سے انجام دیتے تھے، اس لئے یہ ان کی "سیاسی نبوت" کا سب سے اونچا فریضہ سمجھتا ہے۔ اور یہ مسلمان ہیں کہ مرزا صاحب ناہم "غیر خطابات" سے نوازتے ہیں، اور جو کہ مخبری کو قرینِ مصلحت کہہ کر آقا یانِ نعمت کا حق ادا کر رہے ہیں، یہ چور اور ڈاکو نہیں ہیں۔ ان کا بس ایک جرم ہے کہ ان کا دماغ فرنگی کافروں سے گلو خلاصی کی تدبیر کیوں سوچنے لگتا ہے، اور ان کے دل آزادیٔ وطن کے لئے کیوں بیتاب ہیں۔

اور مسلمانوں کی مخبری صرف برٹش انڈیا ہی میں انجام نہیں دی جاتی تھی، بلکہ ملاء اعلیٰ کا حکم تھا کہ قادیانی تبلیغ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل جائیں، اور انگریزوں کی خدمات بجا لائیں، مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے عربی اور فارسی میں بعض رسائل تصنیف کر کے بلاد شام و روم اور مصر اور بخارا وغیرہ کی طرف روانہ کئے، اور ان میں اس گورنمنٹ کے تمام اوصاف حمیدہ درج کئے، اور بخوبی ظاہر کر دیا کہ اس محسن گورنمنٹ کے ساتھ جہاد قطعاً حرام ہے۔ اور ہزارہا روپیہ خرچ کر کے وہ کتابیں مفت تقسیم کیں، اور بعض شریف عربوں کو وہ کتابیں دیکر بلاد شام و روم کی طرف روانہ کیا، اور بعض کو مکہ اور مدینہ کی طرف بھیجا اور بعض بلادِ فارس کی طرف بھیجے گئے، اور اسی طرح مصر میں بھی کتابیں بھیجیں، اور یہ ہزارہا روپیہ کا خرچ تھا جو محض نیک نیتی سے کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر نیک نیتی کا ثبوت کیا ہوگا کہ جس کا ذکر ہر آدمی مامور ہو لے بعد شوق و رغبت بجا لائے۔" (ملخص) (تبلیغ رسالت ص ۱۹۶)

قادیان کی سیاسی نبوت نے "تبلیغ اسلام" کے پردے میں عالم اسلام میں سازشوں کے کیا کیا جال پھیلائے، مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لئے کیا کچھ کیا، اور کیا کیا خفیہ و جلی خدمات انجام دی گئیں، یہ تفصیل اس مقالہ کے احاطے سے باہر ہے۔

(۱) سب سے پہلا انکشاف

یوں تو ردِ قادیانیت اور تحفظِ ناموسِ رسالت کا کام کم و بیش قریباً تمام اسلامی فرقوں نے کیا، اور سبھی کو کرنا بھی چاہئے تھا۔ مگر دارالعلوم دیوبند جو حضرت حاجی صاحبؒ کے بقول ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ دین کی خاطر وجود میں لایا گیا تھا، اسے اس سلسلہ میں چند ایسے امتیازات کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ سب سے پہلی بات تو یہی کہ قادیانی فتنہ کا جرثومہ ابھی رونما نہیں ہوا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مرشد و مربی حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ، نے بطور کشف اس کے ظہور کی پیشگوئی فرمائی اور علمائے امت کو اس کی جانب متوجہ فرمایا۔ "تاریخ مشائخ چشت" میں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہٗ کے "ملفوظات طیبہ" سے نقل کیا ہے کہ حضرت پیر صاحبؒ حج پر تشریف لے گئے، اور حجاز میں قیام کا ارادہ فرمایا، مگر حضرت قطب عالم حاجی صاحبؒ نے انہیں باصرار و تاکید ہندوستان کی واپسی کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا:

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور	ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار
کند، شما ضرور در ملک خود واپس	ہوگا، آپ وطن واپس جائیے
بروید، واگر بالفرض شما در ہند	بالفرض آپ وہاں خاموش بھی
خاموش نشستہ باشید تاہم	بیٹھے رہیں تب بھی وہ فتنہ ترقی
آن فتنہ ترقی نہ کند و در ملک	نہیں کر سکے گا، اور ملک میں سکون

آرام ظاہر شود. ہو جائے گا۔

(بحوالہ بیس بڑے مسلمان" صفحہ ۹۸ طبع سوم)

اسی نوعیت کا واقعہ اس ناکارہ نے اپنے اکابر سے حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم رائپوری رحمہ اللہ کے بارے میں بھی سنا تھا کہ قادیانیت کے نفس ناطقہ حکیم نورالدین صاحب (قادیانی دام میں پھنسنے سے پہلے) کسی ضرورت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حکیم جی کو بطور نصیحت فرمایا کہ قادیان سے ایک مدعی نبوت اٹھے گا، اس سے بحث و مناظرہ کی غرض سے بھی اس کے پاس نہ جائیو الخ)

۲۔ حضرت نانوتویؒ کا فتویٰ

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قدس سرہ نے کسی جگہ ایک عجیب مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ ذہن میں اسقدر محفوظ ہے کہ زمانہ نبوت میں تو حق تعالیٰ شانہ اپنی منشاء کا اظہار بذریعہ وحی فرماتے تھے مگر وحی کا سلسلہ آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ بند ہو چکا ہے اس لئے زمانہ وحی کے بعد اگر کوئی معاملہ کسی پر مشتبہ ہو جائے اور اسے یہ معلوم کرنا ہو کہ اس معاملہ میں منشاء خداوندی کیا ہے تو اسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اولیاء اللہ اور عارفین کے قلوب کس جانب مائل ہیں ؟ جس جانب ان اکابر کا رجحان ہو اسی کو منشائے الٰہی کے مطابق سمجھنا چاہیئے۔

یہ حق تعالیٰ شانہ کی حکمت بالغہ تھی کہ قادیانی فتنہ کے ظہور سے قبل ہی اکابر اولیاء اللہ کے قلوب کو اس کے ردّ و تعاقب کی طرف متوجہ فرمایا قادیانی نبوت کا فتنہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے وصال کے بعد رونما ہوا، مگر حق تعالیٰ نے ایک تقریب ایسی پیدا کر دی کہ حضرت نانوتویؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کبریٰ پر ایک رسالہ "تحذیر الناس" تحریر فرمایا جس میں مسئلہ ختم نبوت کو اس قدر مدلل فرمایا کہ قادیانی تاویلات کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ ختم نبوت پر ایک انوکھا استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"بالجملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف نبوت میں موصوف بالذات ہیں اور سوا آپؐ کے اور انبیاء موصوف بالعرض ——— اس صورت میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (تمام انبیائے کرامؑ کے آخر میں نہیں بلکہ ان کے) اول یا اوسط میں رکھتے تو انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف دین محمدیؐ ہوتا تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم آتا، حالانکہ خود فرماتے ہیں: مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا . . . اور انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا تو یہ بات ضرور ہے کہ انبیاء متاخرین پر وحی آتی اور افاضہ علوم کیا جاتا، ورنہ نبوت کے پھر کیا معنیٰ ؟ سو اس صورت میں اگر وہی علوم محمدی ہوتے تو بعد وعدۂ محکم إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کی کیا ضرورت تھی، اور اگر علوم انبیاء متاخرین علوم محمدی کے علاوہ ہوتے تو اس کتاب کا تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہونا غلط ہو جاتا۔"

(تحذیر الناس ص۳)

حضرت نانوتوی قدس سرہ آنحضرتؐ کی خاتمیت کبریٰ کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں، زمانی، مکانی، مرتبی۔ ان کے نزدیک آیت کریمہ خاتم النبیین خاتمیت کی تینوں اقسام پر حاوی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار شرف و منزلت کے بھی خاتم النبیین ہیں، باعتبار زمانہ کے بھی،

اور باعتبار مکان کے بھی۔

"سو اگر (آیت میں خاتمیت کے تینوں اقسام کا) اطلاق اور عموم (مراد) ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے، (ورنہ (اگر ان تینوں اقسام میں سے صرف ایک قسم مراد ہے تو وہ خاتمیت مرتبی ہو سکتی ہے "اندریں صورت) تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبوی مثل: انت منی بمنزلة ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ او کما قال۔ جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس باب میں کافی — کیونکہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہے، پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا، گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں، سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ، باوجودیکہ الفاظ حدیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں۔ جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا (یعنی ختم نبوت زمانی کا) منکر بھی کافر ہوگا۔"

(تحذیر الناس صفحہ ۱۰)

اور "جوابات محذورات عشرہ" میں فرماتے ہیں کہ تحذیر الناس کے

"صفحہ نہم کی سطر دہم سے لے کر صفحہ یازدہم کی سطر ہفتم تک (آیت خاتم النبیین کی) وہ تقریر لکھی ہے جس سے خاتمیت زمانی اور خاتمیت مکانی اور خاتمیت مرتبی تینوں بدلالت مطابقی ثابت ہو جائیں۔ اور اسی تقریر کو اپنا مختار قرار دیا ہے، چنانچہ شروع تقریر سے واضح ہے، سو پہلی صورت میں تو (جب کہ آیت کا مدلول مطابقی خاتمیت مرتبی کو قرار دیا جائے) تاخر زمانی بدلالت التزامی ثابت ہوتا ہے —— اور دلالت التزامی اگر در بارۂ توجہ الی المطلوب مطابقی سے کم ہو، مگر دلالت ثبوت اور دلنشینی میں مدلول التزامی، مدلول مطابقی سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کہ کسی چیز کی خبر تحقیق اس کے برابر نہیں ہو سکتی کہ اس کی وجہ اور علت بھی بیان کی جائے، اگر کسی شخص کو کسی عہدہ پر ممتاز فرمائیں تو اور امیدوار قبل ظہور وجہ ترجیح بے شک خلل جائیں گے۔ اور بعد وضوح وجہ و علت پھر مجال دم زدن نہیں رہی۔" (صفحہ ۵۰)

"الغرض معنی مختار احقر سے کوئی عقیدہ باطل نہ ہو گیا، بلکہ وہ رخنہ جو در صورت اختیار تأخر زمانی و انکار و منع خاتمیت مرتبی پڑتا نظر آتا تھا، بند ہو گیا، پھر تسیر خاتمیت زمانی بھی مدلول "خاتم النبیین" رہی، البتہ دو شقوں میں سے ایک شق پر تو مدلول التزامی، اور دوسری شق پر.... مدلول مطابقی۔"

(صفحہ ۵۱)

حضرت نانوتوی قدس سرہ کی اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین معنی "آخری نبی" ہونا قرآن کریم، احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کا منکر اسی طرح کافر ہے جس طرح تعداد

رکعات کا منکر کافر ہے اور یہ کہ آپؐ کی خاتمیت مرتبی، خاتمیت زمانی کو مستلزم ہے، اگر آپؐ مراتب نبوت کے خاتم ہیں تو بلاشبہ زمانی نبوت کے بھی خاتم ہیں ـــ اس تقریر سے قادیانی نقشہ پردازوں کی ساری منطق غلط ہو جاتی ہے اور "خاتم النبیین" میں ان کی ساری تحریفات پادر ہوا ثابت ہوتی ہیں ۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پہلے شخص تھے جنہوں نے قادیانی تحریفات کا رد کیا اور قادیانی ملاحدہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کے قائل ہیں ان کو متواترات دین کا منکر قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا۔

۲۔ فتویٰ تکفیر قادیانی :۔

اکابر دیوبند کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعاقب سب سے پہلے شروع کیا اور ۱۳۰۱ھ میں جب مرزا قادیانی نے مجددیت کے پردے میں اپنے الہامات کو "وحی الٰہی" کی حیثیت سے براہین احمدیہ میں شائع کیا تو لدھیانہ کے علماء (مولانا محمد، مولانا عبداللہ، مولانا اسمٰعیل رحمہم اللہ) نے جو حضرات دیوبند کے منتسبین میں سے تھے، فتویٰ صادر فرمایا کہ یہ شخص مسلمان نہیں بلکہ اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے زندیق اور خارج از اسلام ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ دجالِ قادیان کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ اس لئے بعض لوگوں نے جو مرزا قادیانی سے حسن ظن رکھتے تھے علمائے لدھیانہ کی مخالفت میں حضرت گنگوہی سے فتویٰ منگوا لیا۔ ۱۲، جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ کو علمائے لدھیانہ دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ سالانہ پر تشریف لے گئے اور قادیانی مسئلہ میں حضرت گنگوہی اور دیگر اکابر سے بالمشافہ گفتگو فرمائی۔ رفع نزاع کے لئے دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو جو صاحب کشف تھے حکم تسلیم کیا گیا اور انہوں نے مندرجہ ذیل تحریری فیصلہ دیا :۔

"یہ شخص (مرزا غلام احمد قادیانی) لامذہب (دہریہ) معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص نے اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر فیض باطنی حاصل نہیں کیا معلوم نہیں اس کو کس کی روح سے اویسیت ہے (عزازیل کی روح سے ہو سکتی ہے) ناقل) مگر اس کے الہامات اولیاء اللہ کے الہامات سے کچھ مناسبت اور علاقہ نہیں رکھتے"

اس تنقیح و تشریح کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے بھی مرزا قادیانی اور اس کے پیرووں کو زندیق اور خارج از اسلام قرار دیا۔ حضرت گنگوہیؒ تمام اکابر دیوبند کے مقتدیٰ تھے۔ ان کا فتویٰ گویا پوری جماعت کا متفقہ فتویٰ تھا۔ یہی وجہ ہے مرزا غلام احمد قادیانی اس فتوے کی ٹیس کو آخری زندگی تک محسوس کرتا رہا۔

مکتوب عربی میں مرزا قادیانی نے ان اکابر امت کو مندرجہ ذیل الفاظ سے نوازا ہے۔

اخرھم شیطان الاعمیٰ والغول الاغوی یقال لہ رشید احمد الجنجوھی وھو شقی کالامروھی ومن الملعونین۔ (ص ۲۵۲)

ان میں سے آخری شخص وہ اندھا شیطان اور بہت گمراہ دیو ہے جس کو رشید احمد گنگوہی کہتے ہیں، اور وہ (مولانا احمد حسن) امروہی کی طرح شقی اور ملعونوں میں سے ہے۔

(یہ تمام تفصیلات "رئیس قادیان" جلد دوم میں مولانا ابو القاسم رفیق دلاوری میں ملاحظہ کی جائیں)

دوسرا فتویٰ:

صفر ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے قادیانی کے خلاف ایک اور فتویٰ جاری ہوا۔ جس پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ رئیس المدرسین دیوبند، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر تمام اکابر دیوبند کے علاوہ بیشتر مشاہیر علمائے ہند کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ مولانا محمد سہول صاحبؒ کے قلم سے ہے جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے افکار و نظریات اس کی کتابوں سے نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا:۔

"جس شخص کے ایسے عقائد و اقوال ہوں اس کے خارج از احاطۂ اہل سنت والجماعت اور احاطۂ اسلام سے خارج ہونے میں کسی مسلمان کو خواہ جاہل ہو یا عالم، تردد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مرزا غلام احمد اور اس کے جملہ متبعین درجہ درجہ مرتد، زندیق، ملحد، کافر اور فرقۂ ضالہ میں یقیناً داخل ہیں۔ ۔ الخ"

یہ طویل فتویٰ "القول الصحیح فی مکائد المسیح" کے نام سے شائع ہوا۔

تیسرا فتویٰ

۱۲ رجب ۱۳۳۶ھ کو ایک اور مبسوط فتویٰ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے صادر ہوا۔ اس پر بھی تمام مشاہیر علمائے ہند کے دستخط ہیں اور یہ "فتویٰ تکفیر قادیان" کے نام سے طبع ہوا۔

علمائے حرمین کا فتویٰ:۔

مکہ و مدینہ (زادہما اللہ شرفاً و عظمۃً) اسلام کا مرکز و منبع ہیں۔ اور وہاں کے علمائے کرام کے فتاویٰ کو ہر دور میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اکابر دیوبند میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی قدس سرہٗ نے قادیانی کے خلاف کفر و ارتداد کا فتویٰ صادر فرمایا جس پر دیگر علمائے حرمین کے دستخط ہیں (رئیس قادیان ص ۲)

۴۔ مسئلہ تکفیر اور علمائے دیوبند کا امتیاز

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف جو فتوے صادر کئے گئے ان میں علمائے دیوبند کا ایک اور خصوصی امتیاز بھی نمایاں ہوا۔ اور وہ تھا ان کا مسلک اعتدال۔ مسئلہ تکفیر بہت ہی نازک مسئلہ تھا۔ ایک مسلمان کو کافر کہنا بہت ہی سنگین جرم ہے اور دوسری طرف کسی کھلے کافر کو مسلمان کہنے پر اصرار کرنا بھی معمولی بات نہیں۔ بدقسمتی سے جس دور میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کافرانہ دعوے کئے، عام طور سے لوگ اس مسئلہ میں افراط و تفریط کا شکار تھے۔ ایک گروہ مرزا غلام احمد قادیانی کے صریح کفریات پر اسے کافر کہنے کو خلاف مصلحت سمجھتا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جس نے گیہوں کے ساتھ گھن پیسنے کا مشغلہ شروع کر رکھا تھا۔

پہلے گروہ کی تفریط قادیانی تحریک کو انگیز کر رہی تھی۔ اور قادیانی ملاحدہ بڑے طمطراق سے ایسے لوگوں کو پیش کر دیتے تھے جو انہیں کافر نہیں سمجھتے اور دوسرے گروہ کے افراط نے خود مسئلہ تکفیر کی مٹی پلید کر دی تھی۔ اور قادیانی ملاحدہ ان کے تکفیری فتووں کے طومار کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے یہ کہہ دیتے تھے کہ مولویوں کے پاس کفر بڑا سستا ہے۔ یہ ہر شخص کو جو ان کے خیالات کے خلاف کوئی بات کہہ دے، فوراً کفر کا تحفہ پیش کر دیا کرتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں کا طرز عمل نہ صرف افسوسناک تھا بلکہ اس سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ خدانخواستہ ان لوگوں کی بے احتیاطی

اور افراط و تفریط سے کفر و اسلام کی حدود ہی مٹ کر نہ رہ جائیں حق تعالیٰ شانہ، علمائے دیوبند کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلام اور کفر کے حدود کو ممیز کیا اور لوگوں کو بتایا کہ اسلام اور کفر کے درمیان خط فاصل کیا ہے اور وہ کون سی حد ہے جس کو عبور کر لینے کے بعد آدمی صریح اسلام سے خارج ہو کر کفر کے خارزار میں جا نکلتا ہے۔ اس موضوع پر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے "اکفار الملحدین فی شئ من ضروریات الدین" میں تحقیق و تفتیش کا حق ادا فرمایا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ صاحب نے اردو میں "وصول الافکار الی اصول الاکفار" نامی رسالہ تحریر فرمایا اور دیگر اکابر دیوبند نے بھی اس موضوع پر رسائل تحریر فرمائے۔ اس مسئلہ کو خوب منقح کر دیا۔ اصول تکفیر پر مفصل لکھنے کی ان سطور میں گنجائش نہیں خلاصہ یہ ہے کہ وہ امور جن کا دین محمدی میں داخل ہونا تواتر یا شہرت سے ثابت ہے وہ "ضروریات دین" کہلاتے ہیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے تسلیم کرنا اسلام ہے اور ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دینا یا تاویل کے ذریعہ ان میں سے کسی ایک کے مفہوم کو بدل ڈالنے کا نام کفر ہے۔ علمائے دیوبند نے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرووں کی تحریفات پیش کر کے واضح کیا کہ یہ لوگ "ضروریات دین" کے منکر ہیں۔ اس لئے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

بعض لوگوں نے اسلام اور کفر کے فیصلہ کے لئے ایک آسان سا اصول تلاش کر لیا ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو بس وہ مسلمان ہے۔ ورنہ کافر۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول صریحاً غلط ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کلمہ پڑھتا ہے، نماز روزے کا قائل اور بہت سی عبادت و ریاضت بھی کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن کی فلاں آیت ثابت نہیں؟ کیا ایسے شخص کو مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا ہمیں کس ذریعہ سے معلوم ہوا؟ ہر شخص اس کا جواب یہی دے گا کہ قرآن کا قرآن ہونا امت کے تواتر سے ثابت ہے۔ چودہ سو سال سے یہی قرآن مسلمانوں کے پاس تواتر سے چلا آتا ہے۔ یہی قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اس لئے اس کے کسی ایک حرف میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ بس جس طرح قرآن کریم کے ہمارے تک پہنچنے کا ذریعہ امت اسلامیہ کا تواتر ہے اور اس تواتر کا منکر کافر ہے۔ اسی طرح دین محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں سے جو چیزیں ہمیشہ سے مسلّم چلی آتی رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ اور پھر صرف الفاظ کے تواتر کو تسلیم کر لینا کافی نہیں بلکہ قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی متواتر عقیدہ کا جو مفہوم و معنی امت میں ہمیشہ سے مسلّم رہا ہے اس کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اس کا انکار کر کے قرآن کریم یا احادیث متواترہ کو نئے معنی پہنانا کفر ہی کی ایک قسم ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام مسلمان یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم جن کے آخری زمانہ میں نازل ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ ان سے مراد وہی اسرائیلی پیغمبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے برعکس مرزا غلام احمد اور مرزائی امت کا یہ دعویٰ ہے کہ عیسیٰ بن مریم سے مراد غلام احمد ہے۔ دمشق سے مراد قادیان ہے۔ مسجد اقصیٰ سے مراد قادیان کی مسجد ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مضحکہ خیز تاویلوں کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کسی نے عیسیٰ بن مریم کا مطلب نہیں سمجھا اور نعوذ باللہ پوری کی پوری ملت اسلامیہ گمراہ اور کافر و مشرک رہی۔ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تکذیب اور امت کے کروڑوں اکابر کی تحمیق و تجہیل نہیں؟ اگر اس کے بعد بھی ایک شخص کو دائرہ اسلام میں پناہ مل سکتی ہے تو کہنا چاہیئے کہ اسلام کا کوئی متعین مفہوم ہی سرے سے موجود نہیں۔

حاصل یہ کہ اسلام کے کسی ایک قطعی مسئلہ کا قطعی معنوی انکار دراصل پورے دین کا انکار ہے۔

۵۔ علمائے دیوبند تحقیق کے میدان:

مرزا غلام احمد قادیانی نے جن نظریات و افکار کا اظہار کیا اور جس طرح اسلام کے مسلمات میں قطع و برید کی، واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص دیانت و امانت کے ساتھ ان کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کی توقع صرف اس شخص سے کی جا سکتی ہے جو خشکی دماغ کے عارضہ میں مبتلا ہو، یا دین و ایمان کو غارت کر کے اس نے اپنے اغراض مشئومہ کی تکمیل کی ٹھان لی ہو اس لئے غلام احمد قادیانی اور اس کے مخصوص حواریوں کے بارے میں علمائے دیوبند کی قطعی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ اس حد کو عبور کر چکے ہیں، جس سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ یہ ظلی بروزی نبوت کا ڈرامہ اور مسیحیت و مہدویت کے دعوے ایک سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ ہیں اور اس کے پردہ میں مخصوص اغراض و مقاصد کار فرما ہیں۔ البتہ عام لوگ جو کسی غلط فہمی سے قادیانیت کے دام فریب کا شکار ہیں ان کی اصلاح ضروری ہے۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور دیگر مرزائی لیڈروں نے جو غلط فہمیاں امت میں پھیلا دی ہیں ان کا ازالہ بھی لازم ہے۔ اس مقصد کے لئے علمائے دیوبند نے رد قادیانیت پر قلم اٹھایا اور قادیانی فتنہ پردازوں کے تمام شبہات کا جواب لکھا۔ اس موضوع پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں ہیں غالباً کسی ملحدانہ تحریک پر اتنا لٹریچر تیار نہیں ہوا ہو گا۔

اس سلسلہ میں امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (المتوفی) کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ ان حضرات نے اور ان کے احباب و تلامذہ نے قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر گرانقدر کتابیں تالیف فرمائیں۔ اور امت اسلامیہ کو قادیانی دجل و فریب سے آگاہ کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ یہاں اکابر دیوبند اور ان کے متوسلین کی تالیف کردہ کتابوں کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

نمبر	کتاب	مصنف
۱	الشہاب	مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۲	القادیانی والقادیانیہ	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
۳	ایمان وکفر	مفتی محمد شفیع دیوبندی
۴	آئینہ قادیانی	محمد عبدالرحمن مونگیر
۵	آئینہ کمالات مرزا	
۶	المتنبی القادیانی	مولانا مفتی محمود
۷	التصریح بما تواتر فی نزول المسیح	مولانا انور شاہ کشمیریؒ
۸	اکفار الملحدین	" " "
۹	الاسس السیاسیہ للحرکۃ القادیانیۃ	سید عباسی
۱۰	الانکلیز والقادیانیۃ	محمد عمر
۱۱	الہامات مرزا	مولانا ثناء اللہ امرتسری
۱۲	القول المحکم	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۳	اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف	" " "
۱۴	اطلاع رحمانی	مولانا محمد اسحاق رحمانی
۱۵	اغلاط ماجدیہ	مولانا عبداللطیف رحمانی
۱۶	اکھنڈ بھارت	مولانا محمد شریف جالندھری
۱۷	اسلامی تبلیغی انسائیکلو پیڈیا	مولانا مفتی محمد شفیع
۱۸	الکاویہ علی الغاویہ	مولانا محمد عالم آسی
۱۹	ائمہ تلبیس	مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری
۲۰	ایمان کے ڈاکو	" " "
۲۱	اردو ترجمہ اکفار الملحدین	مولانا محمد ادریس میرٹھی
۲۲	اسلام اور مرزائیت	مولانا عتیق الرحمن
۲۳	انگریزی نبی	مولانا منظور احمد چنیوٹی
۲۴	مرزائیوں کا عبرتناک انجام	" " "
۲۵	امین الملک جے سنگھ	
۲۶	الہامی گرگٹ	
۲۷	غدار کی تلاش	
۲۸	اسلام اور معاشی اصلاحات	مرتضیٰ خاں میکش
۲۹	اشد العذاب	مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
۳۰	اول السبعین	" " "
۳۱	صیفۃ الحق	
۳۲	ثانی السبعین	" "
۳۳	قادیان میں زلزلہ	" " "
۳۴	پاکستان میں مرزائیت	مرتضیٰ خاں میکش
۳۵	پاکستان کا غدار	مولانا عبداللطیف
۳۶	ترک مرزائیت	مولانا لال حسین اختر
۳۷	تفسیر رحمانی	ابواحمد رحمانی
۳۸	تنبیہ رحمانی	" " "
۳۹	تحیۃ الاسلام	مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ
۴۰	تازیانہ عبرت	مولانا کرم الدین جہلمی
۴۱	تحقیق لاثانی	محمد ایوب سنوری
۴۲	تکمیل دین اور ختم نبوت	چوہدری افضل حق
۴۳	چودھویں صدی کے مدعیان نبوت	مولانا محمد عالم آسی
۴۴	حقیقت مرزائیت	مولانا علم الدین
۴۵	حقیقت مرزائیت	مولانا عبدالکریم
۴۶	مسیح علیہ السلام مرزا قادیانی کی نظر میں	مولانا لال حسین اختر
۴۷	پانچ سوالوں کا جواب	فرزند توحید
۴۸	حقیقت مرزا	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۴۹	تحقیق ناقد	عبدالکریم ناقد
۵۰	حیات و نزول مسیح	ڈاکٹر عبداللہ حجوئی

نمبر	کتاب	مصنف
۱۰۱	قادیانی دجل کا جواب	قاضی مظہر حسین چکوال
۱۰۲	قادیانی ریشہ دوانیاں	مولانا لال حسین اختر
۱۰۳	کشف الستار عن القادیانیۃ قطیۃ الاستعمار	مولوی محمد عمر ملتانی
۱۰۴	کشف تلبیس	حافظ محمد اسحاق
۱۰۵	مرزائیوں کی سیاسی کرامات (مولانا محمد علی جالندھری کی تقریر)	مرتب محمد سعید الرحمن علوی
۱۰۶	کفر و اسلام کی حدود اور قادیانیت	مولانا محمد منظور نعمانی
۱۰۷	کذبات مرزا	ابو عبیدہ نظام الدین کوہاٹی
۱۰۸	لطائف الحکم فی اسرار نزول عیسیٰ ابن مریم	مولانا محمد ادریس صاحب
۱۰۹	مرزا غلام احمد کی تصویر کے دو رُخ	جانباز مرزا
۱۱۰	مرزائیت کا سیاسی محاسبہ	" "
۱۱۱	مرزائیت سے اسلام تک	اللہ وسایا ڈیروی
۱۱۲	مسلمان کون ہے اور کافر کون	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۳	معیار صداقت	سید ابو احمد رحمانی
۱۱۴	مسلک الختام فی ختم نبوت خیر الانام	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۵	مسئلہ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں	مولانا محمد اسحاق سندیلوی
۱۱۶	منکوحۂ آسمانی	ابو عبیدہ
۱۱۷	مولانا نانوتوی پر مرزائیوں کا بہتان	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۸	مرزائیوں کے خطرناک ارادے	مرتبہ مولانا عبدالرحیم صاحب
۱۱۹	مرزائیت عدالت کے کٹہرے میں	جانباز مرزا
۱۲۰	مسلمانوں کو مرزائیت سے نفرت کے اسباب اور مرزا کے متضاد اقوال	حضرت مولانا احمد علی لاہوری
۱۲۱	میں نے مرزائیت کیوں چھوڑی	مرتبہ قاضی خلیل احمد
۱۲۲	مرزا غلام احمد کی آسان پہچان	مولانا عبدالرحیم اشعر
۱۲۳	مرزا قادیانی اور غیر محرم عورتیں	مجلس تحفظ ختم نبوت کوئٹہ
۱۲۴	مسلمانوں کی نسبت مرزائیوں کا عقیدہ مع تبصرہ	مولانا لال حسین اختر
۱۲۵	مرزا بشیر الدین (خلیفہ قادیانی جواب دیں)	مولانا محمد علی جالندھری
۱۲۶	نزول عیسیٰ	مولانا بدر عالم صاحب
۱۲۷	نبوت قادیانی	انجمن تائید اسلام
۱۲۸	نصرت اسلام (مناظرہ مابین خالد محمود اور قاضی نذیر)	
۱۲۹	وزیر خارجہ	جانباز مرزا
۱۳۰	ہدایۃ المقتدی عن غواۃ المفتری	مولانا محمد عبدالغنی خان
۱۳۱	مرزائی نامہ	مولانا مرتضیٰ احمد میکش

یہ معلوم کتابوں کی فہرست ہے ورنہ تلاش و جستجو کی جائے تو بہت سی کتابیں اور بھی ہوں گی، بجاب نایاب ہو چکی ہیں۔

میدان مباحثہ

مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری بھگ دوڑ کاغذی پتنگ بازی تک محدود تھی، انہوں نے علمائے امت کو للکارنے اور پھر قادیان کے "بیت الفکر" کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہو جانے کا فن بطور خاص ایجاد کیا تھا۔ مرزا صاحب کی اس حکمت عملی سے مباحثہ کی اول تو نوبت ہی نہ آتی، اگر مرزا صاحب کی بدقسمتی سے اس کا موقع آ ہی جاتا تو ان کی شکست و ناکامی ہی "فتح مبین" کا بہروپ اختیار کر لیتی تھی۔ یہاں بطور مثال چند واقعات کا مختصر تذکرہ کافی ہوگا۔

۳ رمئی ۱۸۹۱ء کو مرزا صاحب نے علمائے لدھیانہ کو مناظرہ کا چیلنج کیا کہ حیات مسیح پر مجھ سے مناظرہ کر لیں۔ علماء لدھیانہ نے جواب دیا کہ ہم آج سے آٹھ سال پہلے آنجناب کے کفر اور خروج از اسلام کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ اس لئے کوئی جگہ تجویز کر کے ہمیں مطلع کریں ہم بلا تاخیر وہاں پہنچ جائیں گے۔ آنجناب پہلے اپنا اسلام ثابت کر کے دکھائیں۔ اس کے بعد حیات مسیح اور دیگر مسائل پر بھی گفتگو ہو جائے گی۔ لیکن مرزا صاحب نے اس کے جواب میں "خموشی معنیٔ دارد کہ درگفتن نمی آید" پر عمل کیا۔ اور علماء لدھیانہ کا چیلنج آج تک قائم ہے کوئی قادیانی اس کا جواب نہیں دے سکا۔ نہ انشاء اللہ قیامت تک دے سکتا ہے (اس مباحثہ طلبی کی روئداد رئیس قادیان جلد دوم ص۲۵

(مؤلفہ مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری میں ملاحظہ فرمائیے)

۲۔ مرزا صاحب کے منجھلے صاحبزادے مرزا بشیر احمد ایم اے نے سیرۃ المہدی صفحہ ۲۲۰ جلد اول میں مرزا صاحب کے پانچ مباحثوں کا ذکر کیا ہے ایک آریہ سے ہوا، ایک عیسائی، اور تین مسلمانوں سے بدقسمتی یہ کہ ان میں سے چار کی روئیداد پڑھ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب میدان چھوڑ کر بھاگے۔ اور بعد میں ان کی یہ شکست "فتح مبین" قرار پائی ——— اور پانچویں مباحثہ میں تو مولانا عبدالحکیم کلانوری نے مرزا صاحب سے دعویٰ نبوت سے توبہ کرائی، اور ان سے یہ تحریر لی کہ وہ آئندہ نبوت کا لفظ استعمال نہیں کیا کریں گے۔ یہ ان کی پہلی فتح مبین تھی۔ لیکن بعد میں مرزا صاحب نے توبہ توڑ ڈالی، اور اس تحریری توبہ نامہ سے انحراف کیا یہ ان کی دوسری فتح مبین تھی۔ (اس کی تفصیل مرزا صاحب کے اشتہارات میں موجود ہے)

۳۔ مرزا صاحب نے جب دیکھا کہ مباحثات کی وادی پرخار میں اُن کے پاؤں شل ہو چکے ہیں اور مباحثوں میں ان کی ذلت نما "فتح" دن بدن نمایاں ہو رہی ہے تو انہوں نے یہ الہامی اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ علماء سے مباحثہ نہیں کیا کریں گے (انجام آتھم ص۲۸۲) یہ مرزا صاحب کی "فتح" کا آخری اعلان تھا۔

۴۔ مرزا صاحب کے اس بہادرانہ اعلان کے بعد لازم تھا کہ قادیانی صاحبان کبھی مناظرہ و مباحثہ کا نام نہ لیتے، لیکن انہیں شاید یہ احساس تھا کہ وہ علم و فضل اور فہم و دانائی میں مرزا صاحب سے فائق ہیں، اس لئے اگر مرزا صاحب نے مناظروں اور مباحثوں سے "توبہ" کر لی ہے تو یہ حکم صرف انہی کی ذاتی لیاقت سے متعلق ہے۔ ان کی امت پر اس کی تعمیل واجب نہیں۔ چنانچہ قادیانی صاحبان مرزا صاحب کے اس اعلان کے بعد بھی مناظرے کے چیلنج کرتے رہے (خود مرزا صاحب کی زندگی میں بھی، اور ان کے انتقال پر ملال کے بعد بھی) مناظروں کی نوبت اکثر پیش آئی نتیجہ وہی "فتح" بصورت شکست۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ جو دارالعلوم دیوبند کے رئیس المناظرین تھے اور جنہیں قادیانی خانوادہ سے گفتگو اور مباحثہ کے بہت سے مواقع پیش آئے تھے، قادیانی مباحثوں پر بلیغ تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علماء اسلام نے مرزا صاحب کی خرافات باطلہ کا پورا ردّ اور خود ان کا کذاب و مفتری ہونا ایسا ثابت کر دیا کہ منصف کے لئے تو کافی ہی ہے، مرزائی ہٹ دھرموں کے بھی منہ بند کر دئے، اور قلم توڑ دئے، اور ان کو جواب کی تاب نہ رہی، لہٰذا اب نہ مناظرہ کی ضرورت، نہ مباہلہ کی، فقط جاہل مریدوں کو جہنم تک پہنچانے کے لئے یہ راہ اختیار کی جاتی ہے کہ کہیں مناظرہ کا اشتہار، کہیں مباہلہ کا چیلنج۔ ورنہ وہ نہ مناظرہ کر سکیں، نہ مباہلہ

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

ہمیں عام مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ علماء اسلام اپنا فرض ادا فرما چکے، اور نہ ماننا اور نہ تسلیم کرنا یہ محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے ہے، ورنہ مناظرے بھی ہو چکے، اور جس کو فتح دینی تھی اور جس کو ذلیل کرنا تھا وہ بھی ہو چکا ———

سرور شاہ (قادیانی) امیر وفد مونگیر سے دریافت کر لو حافظ روشن علی صاحب، مختار احمد صاحب شاہجہانپوری غلام رسول پنجابی (قادیانی مناظر) ان میں سے جو زندہ ہوں ان سے دریافت کر لو ——— موضع مونگیر و بھاگلپور کے رہنے والوں سے دریافت کر لو ——— مونگیر کے مناظرہ

باتحت سے کہہ اپنی مگر دستکاران دونوں صاحبوں کے بننے لازم ہیں
قادیانی امت کے فرمارا اس رسالہ کے جواب میں جب سے اب تک
خاموش ہیں۔

مباحثہ مونگیر کا تذکرہ مولانا مرتضیٰ حسنؒ کی عبارت میں اسی اوپر گذر چکا ہے جس میں قادیانیوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور مرزائیوں کے امیر وفد سرور شاہ کو بھی ذلت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اسی نوعیت کا ایک مباحثہ فیروزپور میں ہوا جس میں قادیانیوں نے من مانی شرائط پر مناظرہ کیا لیکن علمائے دیوبند کے ہاتھوں ایسی شکست اٹھائی کہ انہیں مدت تک نہ بھولی۔

اس مباحثہ کا مختصر سا تذکرہ "بیس بڑے مسلمان" میں بالفاظ ذیل کیا گیا ہے:

"فیروزپور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ طے پایا، اور عام مسلمانوں نے جو فن مناظرہ سے ناواقف تھے مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط پر مناظرہ طے کریں، جو مسلمان مناظرین کے لئے خاصی پریشان کن ہو سکتی تھیں، دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت (مولانا محمد انورؒ) شاہ صاحب (کشمیری) کے مشورے سے مناظرے کے لئے حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ تجویز ہوئے۔ یہ حضرات جب فیروزپور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم ہوا کہ انہوں نے کس دجل سے من مانی شرائط سے مسلمانوں کو جکڑ لیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ان شرائط پر مناظرہ کیا جائے یا پھر انکار کر دیا جائے، پہلی صورت مضر تھی، دوسری صورت مسلمانان فیروزپور کے لئے سبکی کا باعث ہو سکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر بھاگ گئے۔ انجام کار انہی شرائط پر مناظرہ طے کر لیا گیا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کو تار دیا گیا۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا اور عین اسی وقت دیکھا گیا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں، انہوں نے آتے ہی اعلان فرما دیا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرائط مسلمانوں سے منوالی ہیں اتنی شرائط اور من مانی لگوالو، ہماری طرف سے کوئی شرائط نہیں، مناظرہ کرو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، چنانچہ اسی بات کا اعلان کر دیا گیا، اور مفتی صاحب مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا سید بدر عالم صاحب نے مناظرہ کیا، اس میں مرزائیوں کی جو درگت بنی اس کی گواہی آج بھی فیروزپور کے در و دیوار دے سکتے ہیں، مناظرے کے بعد شہر میں جلسہ عام ہوا، جس میں شاہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریریں کیں، یہ تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں، بہت سے لوگ جو قادیانی دجل کا شکار ہو چکے تھے، اس مناظرہ اور جلسہ کے بعد اسلام میں واپس لوٹ آئے"۔
(صفحہ ۲۹۴ طبع سوم)

خلاصہ یہ کہ مرزائیوں کے ساتھ علمائے دیوبند کے سینکڑوں تحریری

وتحریری مباحثے ہوئے اور بحمداللہ ہر موقعہ پر قادیانیوں کو میدان ہارنا پڑا۔ اسی سلسلہ میں علمائے دیوبند کی جانب سے متواتر ایک سال تک اشتہارات بھی نکلتے رہے مگر قادیانیوں نے جواب دہی سے توبہ کر لی۔

۷۔ عدالت کے کٹہرے میں

مرزا غلام احمد قادیانی ایک زمانہ میں سیالکوٹ کچہری میں محرری کے فرائض انجام دیتے تھے، نیز اسی زمانہ میں منصفی کے امتحان کی بھی تیاری کی تھی جس میں ناکامی ہوئی۔ اس لئے مرزا غلام احمد اور اس کی ذریت کو "مقدمہ بازی" کا خوب شوق تھا لیکن قسمت کا پھیر کچھ ایسا تھا کہ انہیں ہمیشہ ناکامی ہی ہوئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے زمانہ میں جو مقدمہ بازی ہوئی اس کا تذکرہ قادیانی لٹریچر میں بھی موجود ہے، کچھ مقدموں کی روئداد محترم مرزا جانباز کی کتاب "مرزائیت عدالت کے کٹہرے میں" نیز مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری کی "رئیس قادیان" میں" ملاحظہ کی جا سکتی ہے —— یہاں صرف دو مقدموں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی طبعی جبلت کے مطابق حضرت مولانا کرم الدین صاحب ساکنہ موضع بھیں جہلم (حضرت مولانا قاضی مظہر حسین چکوال کے والد ماجد) کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال کئے تھے، مولانا نوجوان تھے انہوں نے مرزا قادیانی کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا، اور جہلم میں ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا قادیانی گروہ نے یہ مقدمہ جہلم سے گورداسپور منتقل کرا لیا۔ بہرحال یہ مقدمہ ایک طویل مدت تک مرزا قادیانی اور ان کی ذریت کے لئے تماشا عبرت بنا رہا۔ بالآخر عدالت نے مرزا قادیانی کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس پر جرمانہ عائد کیا۔ جو عدالت بالا میں قادیانی اپیل پر معاف کیا گیا —— اس مقدمہ کی دلچسپ روئداد اس زمانہ میں سراج الاخبار جہلم اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتی رہی بعد ازاں "تازیانہ عبرت" کے نام سے دوبارہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی، جو غالباً مولانا قاضی مظہر حسین صاحب سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا "مقدمہ بہاولپور" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کی تقریب یہ ہوئی کہ ایک مسلمان لڑکی مسماۃ غلام عائشہ بنت مولوی الٰہی بخش کا شوہر مسمّی عبدالرزاق ولد جان محمد اسلام سے مرتد ہو کر مرزائی بن گیا تھا، زوجہ کی طرف سے ۲۴ جولائی ۱۹۲۶ء کو احمد پور شرقیہ کی عدالت میں دعویٰ کیا گیا کہ:

> "مدعیہ اب تک نابالغ رہی ہے۔ لب عرصہ دو سال سے بالغ ہوئی ہے مدعا علیہ ناکح مدعیہ نے مذہب اہلسنت والجماعت ترک کر کے قادیانی مذہب اختیار کر لیا ہے اور اس وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے، اس کے مرتد ہو جانے کے باعث مدعیہ اب اس کی منکوحہ نہیں رہی کیونکہ وہ شرعاً کافر ہو گیا ہے، اور بموجب احکام شرع شریف بوجہ ارتداد مدعا علیہ، مدعیہ مستحق انفراقِ زوجیت ہے اس لئے ڈگری تنسیخ نکاح بحق مدعیہ صادر کی جاوے،
>
> اور یہ قرار دیا جاوے کہ مدعیہ بوجہ مرزائی ہو جانے مدعا علیہ کے اس کی منکوحہ جائز نہیں رہی اور نکاح بوجہ ارتداد مدعا علیہ قائم نہیں رہا!"
>
> (فیصلہ مقدمہ بہاولپور مرتبہ طبع اوّل)

یہ مقدمہ ابتدائی عدالت سے دربارِ معلّٰی تک پہنچا اور وہاں سے بایں حکم ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں واپس کر دیا گیا کہ مستند مشاہیر علمائے ہند کی شہادت لے کر بروئے احکام شرع شریف فیصلہ کیا جاوے"۔

اگرچہ یہ مقدمہ سات سال سے چل رہا تھا اور مدعا علیہ قادیانی تھے
فخر سے اعلانیہ کہتا تھا کہ قادیان کا خزانہ اور منظم جماعت اس کی پشت پر ہے
مگر مسلمانوں نے اسے ایک شخص کا مقدمہ سمجھا، اور مدعیہ کی مالی امداد کی طرف
بھی توجہ نہ کی لیکن ڈسٹرکٹ عدالت نے جو اس مقدمہ کی سماعت کے لئے
ریاست کے سربراہ نے بطور کمیشن مقرر کی تھی، فریقین کو اپنے اپنے مسلک
کے مستند اور مشاہیر علماء کو بغرض شہادت پیش کرنے کا حکم دیا تو مسلمانان
بہاولپور کا احساس بیدار ہوا کہ کہیں مدعیہ کی کسمپرسی و ناداری اسے شہادت
شرعی پیش کرنے سے قاصر نہ رکھے۔ چنانچہ انجمن مؤید الاسلام بہاولپور
نے مدعیہ کی جانب سے اس مقدمہ کی پیروی شروع کر دی۔ بالآخر دو سال کی
کامل تحقیق و تنقیح کے بعد، ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو عالی جناب محمد اکبر ڈسٹرکٹ
جج بہاولپور نے اس مقدمہ کا تاریخی فیصلہ مدعیہ کے حق میں صادر کرتے ہوئے
قرار دیا کہ،

"مدعیہ کی جانب سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب
کاذب مدعیٔ نبوت ہیں، اس لئے مدعا علیہ (عبدالرزاق
قادیانی) بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد
قرار دیا جائے گا.... لہٰذا ڈگری بدیں مضمون بحق مدعیہ
جاری کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے
اُس کی زوجہ نہیں رہی، مدعیہ خرچۂ مقدمہ بھی از ان
مدعا علیہ لینے کی حقدار ہوگی۔"

(فیصلہ مقدمہ بہاولپور صفحہ ۱۴۹)

یہ ایک مسلمان ریاست کے مسلمان جج کا تاریخی فیصلہ تھا جو اسلام
اور مرزائیت کی پوری تحقیق کے بعد صادر کیا گیا۔ اور پھر ایک ایسی عدالت کی
جانب سے تھا جس کی حیثیت عدالت خاص کی تھی اس لئے یہ فیصلہ آئندہ کے
لئے نشانِ راہ ثابت ہوا، اور بحمد اللہ آئندہ اس قسم کے تمام فیصلے اسی
کے مطابق ہوئے۔ حضرات اکابر دیوبند نے اس مقدمہ میں جو کارنامہ انجام
دیا اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا ابوالعباس محمد صادق نعمانی جن کی
وساطت سے یہ فیصلہ شائع ہوا، تحریر فرماتے ہیں:

"مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لئے شیخ الاسلام
حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ)
حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاندپوری، حضرت
مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور
اور مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند
پیش ہوئے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی
تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے
جذب مقناطیسی کا کام کیا، اسلامی ہند میں اس مقدمہ
کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی، حضرات علمائے کرام
نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دئیے
اور فرقہ ضالہ مرزائیہ کا کفر و ارتداد روزِ روشن
کی طرح ظاہر کر دیا، اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت
مسکت جواب دئے۔

خصوصاً حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی
شہادت میں ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم
نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی،
کشف، الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد
بیان کئے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علی وجہ البصیرت
بطلانِ مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے۔

پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروی
اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و تزویر
کو آشکارا کرنے کے لئے شہرۂ آفاق مناظر حضرت
مولانا ابوالوفا صاحب نعمانی شاہجہان پوری تشریف

لائے، مولانا موصوف مختار مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروی فرماتے رہے، فریق ثانی کی شہادت پر بالکل تکون جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تار و پود کو پارہ پارہ کر کے ذرّیت مرزائیہ ضالہ کا ارتداد آشکارا کر دیا۔ فریقین کی شہادت کے ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔

(مقدمہ فیصلہ بہاولپور ص۲۶)

جہاد مسلسل

تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں اکابر دیوبند کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے قادیانی فتنہ کے آغاز سے لے کر آج تک ان کا تعاقب جاری رکھا، مسند احمد (ص۲/۲۴۷) میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

ما سالمناهن منذ حاربناهن يعني الحيات — ہم نے ان سانپوں سے جب سے جنگ شروع کی ہے تب سے کبھی ان کے ساتھ صلح نہیں کی۔

قادیانی ٹولہ اسلام کے لئے مار آستین کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے ارشادِ نبویؐ کے مطابق اکابر دیوبند جب سے مرزائی ٹولے کے خلاف نبرد آزما ہوئے آج تک نہ صلح کی جانب مائل ہوئے اور نہ ہتھیار اتارے۔ بلکہ وہ پہلے دن سے لے کر آج تک بدستور محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور جب تک یہ قزاقانِ ناموسِ رسالت اپنے کیفرِ کردار کو نہیں پہنچ جاتے انشاء اللہ محاذ آرائی جاری رہے گی۔

خوش قسمتی سے اکابر دیوبند میں کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت موجود رہی جو اپنے دور میں مرجع خلائق تھی، جس کے دل کی دھڑکنیں امت مسلمہ کے جذبۂ جہاد کو بیدار رکھتی تھیں، جسے علماء و مشائخ میں قطبیتِ کبریٰ کا مقام حاصل تھا، جس کا سینہ عشقِ رسالت کے نور سے منور تھا، اور جس کے انفاسِ قدسیہ زندیقانِ قادیان کے کفر و ارتداد کے لئے آتش سوزاں کا حکم رکھتے تھے۔

گذشتہ سطور میں قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ اور ان کے خلیفۂ ارشد حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کے بعد یہ قیادت و سیادت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے حصہ میں آئی، جن کا وجود ہی انگریز اور انگریزی حکومت سے بغاوت کا نام تھا، یوپی کے انگریز گورنر جیمس مسٹن کے بقول:

"اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تب بھی وہ اس کوچے سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز رہتا ہو"

"اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی"

(بحوالہ "بیس بڑے مسلمان" صفحہ ۱۲ طبع سوم)

اور "ریشمی خطوط سازش کیس" کے مرتبین کے الفاظ میں:

(حضرت شیخ الہندؒ کو) "حضرت مولانا" بھی کہا جاتا ہے، ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ۔ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس، پارسائی اور تقدس کے لئے مشہور ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستان بھر میں ہیں ..... ہندوستان میں "اتحاد اسلامی کی سازش" میں مولانا کی رہنمایانہ و قائدانہ شخصیت

پڑھ سکتے ہیں:

(تحریک شیخ الہندؒ انگریزی سرکار کی زبان میں ص۳۴۲
شائع کردہ مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ ۱۶ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ اگرچہ انگریز کی ذریت (قادیانی ٹولہ) سے نہیں بلکہ براہِ راست قادیانی نبوت کے خالق (انگریز بہادر) سے ٹکرا رہے تھے۔ لیکن انہوں نے ذریت برطانیہ کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ "القول الصحیح فی مکائد المسیح" نامی فتویٰ کا تذکرہ اوپر کر چکا ہوں، جس میں کذاب قادیان کی عبارتیں درج کر کے اس کے کفر و ارتداد کا فتویٰ علماء دیوبند کی جانب سے مرتب کیا گیا ہے، حضرت شیخ الہندؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

(کل جوابات صحیح ہیں)

"مرزا — علیہ ما یستحقہ — کے عقائد و اقوال کا کفریہ ہونا ایسا بدیہی مضمون ہے کہ جس کا انکار کوئی منصف فہیم نہیں کر سکتا۔ جن کی تفصیل جواب میں موجود ہے

(مہر)

(بندہ محمود عفی عنہ دیوبندی (صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)

حضرت شیخ الہندؒ کے بعد آپ کے تلامذہ نے، جو آسمان علم و فضل اور تقدس و تقویٰ کے مہر و ماہ تھے۔ قادیانی نبوت کا تعاقب کیا، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ اور دیگر اکابر نے اس تحریک کا علم بلند کیا۔

اس دور کے امام و مقتدا حضرات العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ تھے، فتنہ قادیانیت کی شدت نے حضرت کشمیریؒ کو ماہیٔ بے آب کی طرح بے چین اور مضطرب کر دیا تھا، حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ الانورؒ میں حضرت کشمیریؒ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

"جب یہ تاریک فتنہ پھیلا تو مصیبت عظمیٰ سے غم اور اضطراب کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کسی کروٹ چین نہ آتا تھا، راتوں کی نیند حرام ہو گئی، مجھے قلق تھا کہ قادیانی نبوت سے دین میں ایسا رخنہ واقع ہو جائے گا جس کو بند کرنا دشوار ہو گا، اسی قلق و اضطراب اور بے چینی میں چھ مہینے گذر گئے۔" تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں القاء کیا کہ عنقریب اس فتنہ کا شور و شغب انشاء اللہ جاتا رہے گا، اور اس کی قوت و شوکت ٹوٹ جائے گی، چنانچہ ایک طویل مدت کے بعد میرا اضطراب رفع ہوا اور سکون قلب نصیب ہوا۔"

(ص۳۴ طبع جدید)

حضرت کشمیریؒ نے اس اضطراب و بے چینی کا اظہار اپنے بعض قصائد میں بھی کیا ہے، ایک طویل عربی قصیدہ میں جو "اکفار الملحدین" میں طبع ہوا ہے، آپ نے قادیانی فتنہ کی شدت و گہرائی کی طرف امت اسلامیہ کو متوجہ فرمایا ہے۔ اس قصیدہ کا زور بیان، قلق و اضطراب آج بھی امت اسلامیہ کا خون گرما دینے کی صلاحیت رکھتا ہے:

أَلَا يَا عِبَادَ اللّٰهِ قُومُوا وَقَوِّمُوا
خُطُوبًا أَلَمَّتْ مَا لَهُنَّ يَدَانِ

اے اللہ کے بندو! اٹھو اور ان فتنوں کے کس بل نکال دو، جو ہر جگہ چھا رہے ہیں اور جن کے برداشت کرنے کی تب و تاب نہیں رہی۔

وَقَدْ كَادَ يَنْقَضُّ الْهُدٰى وَمَنَارُهٗ
وَزُحْزِحَ خَيْرٌ مَا لِذَاكَ تَدَانِ

ان فتنوں کی شدت سے ہدایت کے نشانات مٹا چاہتے ہیں، خیر و صلاح مٹ رہی ہے اور پھر اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں بن پڑے گی۔

يُسَبُّ رَسُولٌ مِّنْ أُولِي الْعَزْمِ فِيكُمْ
تَكَادُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ تَنْفَطِرَانِ

ایک اولوالعزم رسول (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کو تمہارے سامنے گالیاں دی جارہی ہیں قریب ہے کہ قہر الٰہی سے زمین و آسمان پھٹ پڑیں۔

وَحَارَبَ قَوْمٌ رَبَّهُمْ وَنَبِيَّهُ
فَقُومُوا لِنَصْرِ اللّٰهِ إِذْ هُوَ دَانٍ

ایک ناہنجار قوم (مرزائیوں) نے اپنے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی چھیڑ رکھی ہے پس اللہ کی مدد کے بھروسے اٹھو کہ وہ بہت ہی قریب ہے

وَقَدْ حِيلَ صَبْرِي فِي انْتِهَاكِ حُدُودِهِ
فَهَلْ ثَمَّ دَاعٍ أَوْ مُجِيبٌ أَذَانِي

حدود اللہ کو ٹوٹتے دیکھ کر صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے پس کیا اس بھری دنیا میں کوئی حدود الٰہی کے تحفظ کیلئے پکارنے والا یا میری دعوت پر لبیک کہنے والا ہے؟

وَإِذْ عَزَّ خَطْبٌ جِئْتُ مُسْتَنْصِرًا لَكُمْ
فَهَلْ ثَمَّ غَوْثٌ يَا لَقَوْمِ يَدَانِي

اور جب مصیبت حد برداشت سے نکل گئی تب میں نے مدد کیلئے تمہارے دروازے پر دستک دی اے قوم! کیا کوئی فریادرس ہے جو آگے بڑھ کر میرے دکھ درد میں شریک ہوجائے؟

لَعَمْرِي لَقَدْ نَبَّهْتُ مَنْ كَانَ نَائِمًا
وَأَسْمَعْتُ مَنْ كَانَتْ لَهُ أُذُنَانِ

بخدا! میں ان لوگوں کو جو خواب غفلت میں مست تھے۔ بیدار کرچکا ہوں۔ اور ہر ایسے شخص کو جسے قدرت نے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، سنا چکا ہوں۔

وَنَادَيْتُ قَوْمًا فِي فَرِيضَةِ رَبِّهِمْ
فَهَلْ مِنْ نَصِيرٍ لِي مِنْ أَهْلِ زَمَانِ

اور میں قوم مسلم کو ان کے رب کی جانب سے عائد شدہ فریضہ کے سلسلہ میں پکار چکا ہوں، پس کیا اہل زمانہ میں کوئی شخص میری مدد کو اٹھے گا۔؟

دَعُوا كُلَّ أَمْرٍ وَاسْتَقِيمُوا لِمَا دَهَى
وَقَدْ عَادَ فَرْضَ الْعَيْنِ مِنْذُ عَيَانِ

سب کچھ چھوڑ کر اس فتنۂ عظمیٰ کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جاؤ! اس لئے کہ اس فتنہ کا مشاہدہ ہو جانے کے بعد اس کا استیصال ہر شخص پر فرض عین ہوگیا ہے۔

أَلَا فَاسْتَقِيمُوا وَاسْتَهِيمُوا لِدِينِكُمْ
فَمَوْتٌ عَلَيْهِ أَكْبَرُ الْحَيَوَانِ

ہاں اٹھو! اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے دیوانہ وار جان کی بازی لگا دو۔ بخدا! دین کی خاطر جان دے دینا ہی سب سے اعلیٰ و اشرف زندگی ہے۔

وَعِنْدَ دُعَاءِ الرَّبِّ قُومُوا وَشَمِّرُوا
حَنَانًا عَلَيْكُمْ فِيهِ إِثْرَ حَنَانِ

اور جب تمہیں دین کیلئے رب تعالیٰ کی طرف سے پکارا جارہا ہے تو دیر کیوں کرتے ہو؟ اٹھو اور کمر ہمت چست باندھ لو اس راستے میں تم پر رحمتوں پہ رحمتیں نازل ہوں گی۔

حضرت کشمیریؒ کے قلب صافی پر اس فتنہ کی شدت کا جو اثر تھا وہ ان اشعار سے نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے مامور من اللہ تھے، اور ان کی تمام صلاحیتیں اس پہ لگی ہوئی تھیں کہ وہ قادیانیت کے قصر الحاد کو پھونک ڈالیں۔ حضرت امام العصرؒ نے قادیانی الحاد پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ اور ان کے کفر و ارتداد کو عالم آشکارا کرنے کیلئے قلم اٹھایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قادیانی قذاقوں کے سب سے بڑے حریف تھے۔ مرزا اور مرزائی امت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جس دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ایک باغیرت و حمیت مسلمان کا خون کھول جاتا ہے، اور جو شخص اس کے بعد بھی قادیانیوں کے بارے میں کسی نرمی یا مصالحت کا رویہ رکھتا ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو دین و ایمان سے محروم ہے یا پھر اس کی غیرت و حمیت کو مصلحت کی دیمک چاٹ گئی ہے۔ امام العصر فرماتے ہیں:

نشانی شان الانبیاء مکفر
ومن شك قبل هذا الاول ثان

یعنی انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی کرنے والا قطعاً کافر ہے، اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے تو صاف کہہ دو کہ یہ بھی پہلے کا دوسرا ہے۔

حضرت امام العصرؒ نے قادیانیت کے تعاقب میں جو کارنامے انجام دئے اس کی تفصیل کے لئے مقالہ کافی نہیں، مختصر یہ کہ:

الف: حضرتؒ نے خود بھی ان تمام مسائل پر قلم اٹھایا جو اسلام اور قادیانیت کے درمیان زیر بحث تھے، مثلاً حیات عیسیٰ علیہ السلام پر تین کتابیں تالیف فرمائیں "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" "عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام" "تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" یہ تینوں کتابیں اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

ختم نبوت کے موضوع پر فارسی میں رسالہ "خاتم النبیین" تالیف فرمایا، جو آیت ختم نبوت کی تفسیر تھا دقیق معارف کا ذخیرہ ہے۔ ان تمام رسائل میں قادیانی دجل وفریب سے نقاب کشائی فرمائی اور قادیانیوں کے کفر وارتداد کو ثابت کرنے کے لئے "اکفار الملحدین" تالیف فرمائی۔

ب۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا محمد یوسف بنوری مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ اور دیگر بہت سی ایسی نابغہ شخصیتیں موجود تھیں، جن کو حضرت شاہ صاحبؒ نے رد قادیانیت پر مامور فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تلامذہ سے عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور رد قادیانیت کے لئے کام کرنے کا عہد لیتے تھے، اور ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن شفاعت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے وہ قادیانی درندوں سے ناموس رسالت کو بچائے۔ ان حضرات نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وصیت کے مطابق فتنۂ قادیانیت کے تعاقب کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔

ج۔ قادیانی امت کا مذہبی و دینی سطح پر محاسبہ تو علمائے امت شروع سے کرتے آرہے تھے۔ لیکن جدید طبقہ میں قادیانیوں سے رواداری کا مرض سرایت کئے ہوئے تھا، وہ سمجھتے تھے کہ قادیانیوں کے خلاف جو کچھ مذہبی اسٹیج سے کہا جارہا ہے وہ صرف ملاؤں کی انتہا پسندی کا نتیجہ ہے۔ حضرت امام العصرؒ نے قادیانیت کے خلاف جدید طبقہ تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر "زمیندار" اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبال مرحوم کو آمادہ کیا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں:

"باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں قادیانی فتنہ کی شرانگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحومؒ کے اس لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے، اور ساتھ ہی اس مقالے کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ ہی تھے۔"

(نقش دوام "ص ۲۰۹")

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات ومقالات اور گفتگوئے مجالس میں قادیانیت کا فلسفی اور نفسیاتی رنگ میں تجزیہ کیا، جس سے جدید طبقہ کو یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ قادیانیت کا پس منظر کیا ہے، اور امت مسلمہ کے حق میں اس کے نتائج کس قدر بھیانک ہوں گے؟ ڈاکٹر صاحب کے ان مقالات

کا اردو ترجمہ حرف اقبال، اقبال اور قادیانی، ارمغان اقبال، اور دیگر کتب و رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا ظفر علی خان مرحوم علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، مگر اکابر دیوبند سے تعلق و وابستگی نے انہیں واقعی "مولانا" بنا دیا تھا۔ موصوف نے ۱۹۱۰ء سے "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور نازک ترین دور میں قادیانیت کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اور جب تک جسم میں توانائی رہی وہ اس محاذ پر لڑتے رہے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم نے "تحریک ختم نبوت" کے صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۹ تک مولانا ظفر علی کی اس داستان وفا کی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے کہ:

"عدالت نے وہ نوٹس پڑھ کر سنایا، جو اس مقدمہ کی بنیاد تھا کہ

"تمہارے اور احمدی جماعت کے درمیان اختلاف ہے تم نے اس کے عقائد اور اس کے مذہبی پیشوا پر حملے کئے ہیں، جس سے نقض امن کا اندیشہ ہو گیا ہے۔ وجہ بیان کرو کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے"۔

مولانا نے عدالت کو جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مرزائیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ لیکن جہاں تک مرزا غلام احمد کا تعلق ہے ہم اس کو ایک بار نہیں ہزار بار دجال کہیں گے، اس نے حضورؐ کی ختم المرسلینی میں اپنی نبوت کا ناپاک پیوند جوڑ کر ناموس رسالت پر کھلم کھلا حملہ کیا ہے۔ اپنے اس عقیدے سے میں ایک منٹ کے کروڑویں حصے کے لئے بھی دستکش ہونے کو تیار نہیں، اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مرزا غلام احمد دجال تھا، دجال تھا، میں اس سلسلہ میں قانون انگریزی کا پابند نہیں، میں قانون محمدی کا پابند ہوں"۔

(تحریک ختم نبوت مؤلفہ آغا شورش مرحوم ص۷۶)

۵۔ حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے تحریک ختم نبوت کو باقاعدہ منظم کرنے کے لئے خطیب الامت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو "امیر شریعت" مقرر کیا، اور انجمن خدام الدین کے ایک عظیم الشان اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۰ء میں ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہندوستان کے ممتاز ترین پانچ سو علماء کی بیعت ان کے ہاتھ میں کرائی، ظاہر بین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں دارالعلوم دیوبند کا صدر المدرسین حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ امیر شریعت" کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا، لیکن خود امیر شریعت" کا تاثر یہ تھا کہ:

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت (مولانا سید محمد انور شاہؒ) نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمایا ہے"۔ یہ کہہ کر شاہ جیؒ زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا"۔

(حیات امیر شریعت مؤلفہ محترم مرزا جانباز ص۱۵۵)

بہر حال یہ بحث تو اپنی جگہ ہے کہ حضرت امام العصرؒ کشمیری حضرت امیر شریعتؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے! اور نہ فتنہ قادیانیت کے استیصال کا عہد لے رہے تھے؟ مگر اس میں کیا شک ہے؟ کہ حضرت امیر شریعتؒ اور ان کی جماعت نے قادیانیت کے محاذ پر جو کام کیا وہ حضرت امام العصرؒ کی باطنی توجہ اور دعائے سحری کا ثمر تھا۔

حضرت امام العصرؒ کے وصال کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت تھانویؒ نے نہایت شفقت سے حالات سنے اور تشریف آوری کی غرض دریافت فرمائی، شاہ جیؒ نے بے تکلفی

سے عرض کیا کہ حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ہمارے روحانی پیشوا تھے انہوں نے ہمیں ردِّ قادیانیت کے کام پر لگا دیا، چنانچہ مجلس احرار اسلام کا شعبۂ تبلیغ اس کے لئے وقف ہے، حضرت کشمیریؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد آپ سے دعائیں لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں ——— حضرت حکیم الامت نے دریافت کیا کہ آپ کی جماعت کا رکن بننے کے لئے کیا کوئی شرط بھی ہے؟ عرض کیا کہ ایک روپیہ سالانہ رکنیت کی فیس ادا کر کے ہر مسلمان جماعت کا رکن بن سکتا ہے، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو معلوم نہیں کہ زندگی کے کتنے دن باقی ہیں، تاہم مجھے پچیس سال کے لئے اپنی جماعت کا رکن بنا لیجئے اور اگر اس سے زیادہ جیتا رہا تو پھر رکنیت کی تجدید کر لوں گا، یہ کہہ کر پچیس روپے عطا فرمائے اور پچیس سال کے لئے رکنیت قبول فرمائی۔

(روایت مولانا محمد علی جالندھریؒ)

بظاہر یہ ایک معمولی نوعیت کا واقعہ ہے، لیکن اس سے مسئلۂ ختم نبوت کے ساتھ علمائے دیوبند کے غیر معمولی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت امام العصرؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مجلس احرار اسلام کا رخ فتنۂ قادیانیت کی طرف موڑنے کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" کے منصب پر کھڑا کرتے ہیں۔ اور خود بنفس نفیس ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان پر کامل اعتماد کا اظہار فرماتے ہیں، ادھر حضرت حکیم الامت تھانویؒ، مجلس احرار اسلام کے شعبۂ تبلیغ کی رکنیت قبول فرما کر گویا امیر شریعتؒ کی اس جہاد میں قیادت کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ جب تک حیات رہے ان کی توجہ اور دعا اور ہر قسم کی اعانت مجاہدین ختم نبوت کے شامل حال رہی، ان کے وصال کے بعد قطب العالم حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ اس قافلہ کے سالار بن گئے، "احرار اسلام" کے اکابر حضرت رائے پوریؒ کے حلقۂ ارادت میں منسلک اور حضرتؒ کی عنایات و توجہات سے مستفید تھے، جن لوگوں کو حضرت رائے پوریؒ کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا انہیں علم ہے کہ حضرتؒ قادیانی فتنہ کے بارے میں کس قدر گہرا احساس رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نسبت حضرت رائے پوریؒ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ حضرتؒ مجاہدین ختم نبوت کی سرپرستی فرماتے، ان کی مالی خدمت کرتے، انہیں مفید مشورے دیتے۔ ان سے کارگزاری کی باقاعدہ رپورٹ سنتے، اور ان حضرات کی بے حد قدردانی اور حوصلہ افزائی فرماتے۔

حضرت رائے پوریؒ کے حکم سے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "القادیانی والقادیانیۃ" عربی میں تالیف فرمائی، اور پھر حضرت کے حکم سے اس کا اردو ایڈیشن "قادیانیت" کے نام سے مرتب فرمایا۔ دونوں کتابوں کا ایک ایک حرف حضرتؒ نے سنا، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی کتاب "شہادۃ القرآن" کو بھی حرفاً حرفاً سن کر اس کی اشاعت کا حکم فرمایا۔ اس سلسلہ میں حضرت رائے پوریؒ کے عجیب و غریب واقعات ایسے ہیں جن کو یہاں ذکر کرنا افشائے راز کے زمرہ میں آئے گا۔

۹۔ تنظیم ملت اور علمائے دیوبند

علمائے امت قادیانی فتنہ کا مقابلہ انفرادی طور پر اپنے اپنے رنگ میں شروع ہی سے کر رہے تھے، مگر علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ "تحفظ ختم نبوت" کے لئے مسلمانوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک ایسی مضبوط جماعت ہونی چاہیئے جو ناموس رسالت کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرے، اور وہ فتنۂ قادیانیت کے استیصال کو اپنا مشن بنا لے۔ اس کے لئے حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نظر انتخاب "مجلس احرار اسلام" پر پڑی، اور فتنۂ قادیانیت کا منظم مقابلہ کرنے کے لئے "احرار اسلام" کے صدر حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" مقرر فرمایا۔

"احرار اسلام" کے سرفروش فرنگی اقتدار سے نبرد آزما تھے، ادھر

قادیانی نبوت فرنگی اقتدار کی سیاسی شطرنج کا مذہبی مہرہ تھے۔ اس لئے "احرار اسلام" کو جس قدر نفرت انگریز اور انگریزی اقتدار سے تھی اس سے کئی سوگنا زیادہ قادیانی کی سیاسی نبوت سے تھی، جس نے اسلام کی تحریف و تکذیب اور برطانیہ کی خوشامد و چاپلوسی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ "احرار اسلام" نے قادیانی نبوت کے مقابلہ میں جو کچھ کیا اس کا تذکرہ "تاریخ احرار، حیات امیر شریعت" اور "تحریک ختم نبوت" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، مختصراً چند امور کی جانب یہاں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔

تحریک کشمیر

۱۹۳۱ء میں کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کے خلاف مسلمانانِ کشمیر نے عَلَم حریت بلند کیا، قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کی تشکیل کی، جس کا صدر خود مرزا قادیانی تھا، اور سیکرٹری بھی قادیانیوں کے ہاتھ میں تھی، ہندوستان کے بڑے نام آور لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد مسلمانانِ کشمیر کی امداد ہی ظاہر کیا گیا، لیکن اندرونی مقاصد کچھ اور تھے، ان میں سب سے بڑا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر مرزا محمود کی قیادت میں متحد ہیں، اور وہ انہیں اپنا قائد اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں، یہ گویا ان مذہبی فتووں کا جواب تھا جو علمائے امت کی جانب سے قادیانیوں کے خلاف صادر ہو رہے تھے۔ "احرار اسلام" نے اس قادیانی سازش کا بروقت نوٹس لیا، اور قادیانی عزائم کو طشت از بام کیا، نتیجۃً "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" اپنی موت آپ مر گئی، اور علامہ محمد اقبال مرحوم نے اپنے بیانات میں قادیانی ذہنیت کو، جو اس کمیٹی کے قیام میں کارفرما تھی، عالم آشکارا کر دیا۔

قادیان میں داخلہ

قادیانی خلیفہ (میرزا محمود) قادیان کی آبائی ریاست میں کوس "لمن الملك اليوم" بجا رہا تھا، قادیان میں مرزائی جماعت کے علاوہ نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ عزت و آبرو کا لحاظ تھا، دن دہاڑے قتل ہو جاتے اور کوئی باز پرس نہ کر سکتا، غریب مظلوموں کا بائیکاٹ کر دیا جاتا۔ دکانداروں سے عہد لیا جاتا کہ وہ خلیفہ صاحب کے خلاف نشا کسی کے پاس خورد و نوش کی کوئی چیز فروخت نہیں کریں گے۔ "احرار اسلام" نے قادیان کے حسن بن صباحی طلسم کو توڑنے کے لئے ۱۹۳۴ء میں قادیان میں اپنا دفتر قائم کر دیا، اور مظلومانِ قادیان کی دادرسی کے لئے ایک ڈیفنس کمیٹی بنا دی گئی، "احرار اسلام" کی اس جرأت نے خلیفہ قادیان کو سیخ پا کر دیا، اور ظلم و ستم میں اضافہ ہونے لگا، لیکن تابکے؟ بالآخر وہ وقت آیا کہ خلیفہ قادیان کے "خفیہ اسرار" کی شہادت دینے کے لئے پردہ نشینانِ قادیان عدالت میں پہنچ گئیں۔ قادیان میں کیا کچھ ہوتا تھا؟ اور "احرار اسلام" کے جانفروشوں نے قادیانی مظالم کا کس جرأت و مردانگی سے مقابلہ کیا؟ یہ ایک طویل داستان ہے، جو دردناک بھی ہے اور عبرت آموز بھی ——— مگر افسوس ہے کہ یہ فرصت اس کے لئے موزوں نہیں۔

احرار تبلیغ کانفرنس

قادیان کی سنگینی توڑنے کے لئے "احرار اسلام" نے ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی تاریخوں میں "قادیان تبلیغ کانفرنس" منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا اعلان ہونا تھا کہ قادیان میں صف ماتم بچھ گئی، آقایان فرنگ کے دربِ دولت پر دستک دی گئی کہ "احرار" ہمارے مقدس شہر پر چڑھائی کر رہے ہیں، خلیفہ محمود نے ہر وقت صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک محکمہ قائم کر دیا، ادھر میرزا محمود نے لمبے طویل طویل خطبوں میں اپنی مظلومیت و بے بسی اور خوف و ہراس کا صور پھونکنا شروع کیا، حکومت برطانیہ کب برداشت کر سکتی تھی کہ اس کے چہیتے خاندان اور ان کی سیاسی نبوت کو کوئی آنچ آئے، نتیجۃً قادیان کے حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

مرزا! احرار کو "تبلیغ کانفرنس" قادیان کے حدود کے باہر موضع رجادہ میں منعقد کرنا پڑی۔ کانفرنس کی صدارت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فرمائی۔ ہندوستان کے اطراف و اکناف سے مسلمانانِ ہند "تبلیغ کانفرنس" میں شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ شاہ جیؒ نے اس موقع پر صدارتی تقریر فرمائی جو عشاء کے بعد سے شروع ہو کر اذانِ فجر تک جاری رہی، اس میں قادیانیت کا اپنے مخصوص انداز میں ایسا تجزیہ کیا کہ قادیان میں کھلبلی مچ گئی، مرزائی گورنمنٹ کے دروازے پر فریاد لے کر پہنچے، اور گورنمنٹ نے شاہ جیؒ پر ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ بنا دیا۔ مقدمہ کی سماعت دیوان سکھا آنند سپیشل مجسٹریٹ گورداسپور نے کی۔ شاہ جیؒ نے شہادت کے لئے مرزائیوں کے بڑے بڑے لوگوں کے علاوہ مرزا محمود کو عدالت میں طلب کرنے کی درخواست کی، چنانچہ مرزا محمود کی شہادت تین دن تک جاری رہی۔ بالآخر عدالت نے شاہ جیؒ کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی، اس فیصلے کے خلاف مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور میں اپیل کی گئی۔ مسٹر کھوسلہ نے ملزم کے جرم کو محض اصطلاحی قرار دیتے ہوئے تابرخاست عدالت سزا دی، اور ایک تاریخ ساز فیصلہ لکھا۔

مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ

مرزائیوں نے "احرار" کی گوشمالی کے لئے شاہ جیؒ پر مقدمہ بنوایا تھا، لیکن خدا کی قدرت انہیں لینے کے دینے پڑ گئے، شاہ جیؒ کی "تبلیغ کانفرنس" کی تقریر سے مرزائیت کی ہوا کیا اکھڑی تھی جو اس مقدمے سے اکھڑی۔ مسٹر کھوسلہ کا یہ تاریخی فیصلہ جو قادیانیت کے لئے پیغام موت کی حیثیت رکھتا ہے طبع ہو چکا ہے، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"مرافعہ گذار کے خلاف جو الزام عائد کیا گیا ہے، اس پر غور و خوض کرنے سے قبل چند ایسے حقائق و واقعات بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق امور زیر بحث سے ہے۔ آج سے تقریباً پچاس سال قبل قادیان کے ایک باشندے مسمّٰی غلام احمد نے دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا کہ میں مسیح موعود ہوں، اس کے اعلان کے ساتھ ہی اس نے "لاٹ پادری" کی حیثیت بھی اختیار کر لی، اور ایک نئے فرقے کی بنا ڈالی، جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی تھے، لیکن ان کے بعض عقائد و اصول عام عقائدِ اسلامی سے بالکل متباین تھے، اس فرقہ میں شامل ہونے والے لوگ قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتے ہیں، اور ان کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ یہ لوگ فرقہ مرزائیہ کے بانی (مرزا غلام احمد) کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں"۔

"مسلمانوں کی اکثریت نے مرزائیوں کو بنظرِ ناپسندیدگی دیکھا، خصوصاً اس کے دینی تفوق کے دعوؤں پر بہت ناک منہ چڑھایا اور مرزا نے ان پر کفر کا الزام لگایا، اس کے جواب میں ان لوگوں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا، مگر قادیانی حصار میں رہنے والے اس سے کچھ بھی متاثر نہ ہوئے"۔

"قادیانی مقابلتاً محفوظ تھے، اس حالت نے ان میں متمردانہ غرور پیدا کر دیا، انہوں نے اپنے دلائل دوسرے سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کے لئے ایسے حربوں کا استعمال شروع کر دیا جنہیں ناپسندیدہ کہا جائے گا، جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا انہیں بائیکاٹ، قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی مکروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی، بلکہ بسا اوقات انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی

جماعت کے استحکام کی کوشش کی قادیان میں رضاکاروں کا ایک دستہ مرتب ہوا، اور اس کی ترتیب کا مقصد یہ تھا کہ قادیان میں "لمن الملک الیوم" کا نعرہ بلند کرنے کے لئے طاقت پیدا کی جائے۔"

"انہوں نے عدالتی اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے، دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کی، دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کیں، اور ان کی تعمیل کرائی گئی، کئی اشخاص کو قادیان سے نکالا گیا، یہ قصہ یہیں نہیں ختم ہوتا، بلکہ قادیانیوں کے خلاف کھلے طور پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا، اور قتل کے مرتکب ہوئے۔"

"کم از کم دو اشخاص کو قادیان سے اخراج کی سزا دی گئی اس لئے کہ ان کے عقائد مرزا کے عقائد سے متفاوت تھے: یہ اشخاص حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر ۲ اور مستری اسماعیل ہیں۔" "کئی اور گواہوں نے قادیانیوں کے تشدد و ظلم کی عجیب و غریب داستانیں بیان کی ہیں۔" جگت سنگھ گواہ صفائی نے بیان کیا کہ قادیانیوں نے اس پر حملہ کیا، ایک شخص مسمی غریب شاہ کو قادیانیوں نے زد و کوب کیا، لیکن جب اس نے عدالت میں استغاثہ کرنا چاہا تو کوئی اس کی شہادت دینے کے لئے سامنے نہ آیا۔"

سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم ایڈیٹر "مباہلہ" کا ہے، جس کی داستان، داستانِ درد ہے۔ یہ شخص مرزا کے مقلدین میں شامل ہوا اور قادیان میں جاکر مقیم ہو گیا وہاں اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور وہ مرزائیت سے تائب ہو گیا۔[1] اس کے بعد اس پر ظلم و ستم ہوا، اس نے قادیانی معتقدات پر تبصرہ کرنے کے لئے "مباہلہ" نامی اخبار جاری کیا، مرزا بشیر الدین نے ایک تقریر میں "مباہلہ" والوں کی موت کی پیشگوئی کی، اس تقریر میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مذہب کے لئے ارتکابِ قتل پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس تقریر کے بعد جلد ہی عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، مگر وہ بچ گیا، لیکن اس کا ساتھی قتل کر دیا گیا۔"

"محمد امین ایک مرزائی تھا اور جماعت مرزائیہ کا مبلغ تھا، اس کو تبلیغ کے لئے بخارا بھیجا گیا، لیکن کسی وجہ سے بعد میں اسے اس خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا، اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چودھری فتح محمد گواہ صفائی نمبر ۲ نے لگائی۔۔۔۔ محمد امین پر مرزا کا عتاب نازل ہو چکا تھا۔۔۔۔ محمد امین تشدد کا شکار ہوا اور کلہاڑی کی ضرب سے قتل کیا گیا۔ پولیس میں وقوعہ کی اطلاع پہنچی لیکن کوئی کاروائی عمل میں نہ آئی۔ چوہدری فتح محمد کا عدالت ہذا میں باقرار صالح یہ بیان کرنا تعجب انگیز ہے کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا مگر پولیس اس معاملہ میں کچھ نہ کر سکی، جس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مرزائیوں کی طاقت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ گواہ سامنے آکر سچ

---

[1] مولانا عبدالکریم کو مرزا محمود کے کیرکٹر پر اعتراض تھا، وہ مرزا محمود سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ پر عائد کردہ الزامات غلط ہیں تو آئیے "مباہلہ" کر لیجئے۔ اخبار "مباہلہ" میں انہوں نے مرزا محمود کو بار بار مباہلہ کا چیلنج دیا، اس کے جواب میں مرزائی جماعت کی جانب سے انہیں وہ سزا دی گئی جس کا تذکرہ فاضل جج نے کیا ہے۔

بولنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا!"

"ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا واقعہ بھی ہے کہ عبدالکریم کو قادیان سے خارج کرنے کے بعد اس کا مکان نذر آتش کردیا گیا اور قادیان کی کمال ماؤن کمیٹی سے حکم حاصل کرکے نیم قانونی طریقے پر اسے گرانے کی کوشش کی گئی۔"

"یہ افسوسناک واقعات اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں کہ قادیان میں قانون کا احترام بالکل اٹھ گیا تھا، آتش زنی اور قتل کے واقعات ہوئے تھے، مرزا نے کروڑوں مسلمانوں کو، جو اس کے ہم عقیدہ نہ تھے شدید دشنام طرازی کا نشانہ بنایا، اس کی تصانیف ایک لاٹ پادری کے اخلاق کا انوکھا مظاہرہ ہیں، جو صرف نبوت کا مدعی نہ تھا، بلکہ خدا کا برگزیدہ انسان اور مسیح ثانی ہونے کا مدعی بھی تھا!"

"معلوم ہوتا ہے کہ حکام غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ دینی و دنیاوی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز بلند نہیں ہوئی، مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایت پیش ہوئی لیکن وہ اس کے انسداد سے قاصر رہے، مسل پر کچھ اور شکایات بھی ہیں لیکن یہاں ان کے مضمون کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے، اس مقدمہ کے سلسلہ میں صرف یہ بیان کردینا کافی ہے کہ قادیان میں جور و ستم رانی کا دور دورہ ہونے کے متعلق نہایت واضح الزامات عائد کئے گئے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ (حکومت کی طرف سے اس صورت حال کے انسداد کے لئے) کوئی توجہ نہ ہوئی۔ ان کارروائیوں کے سدباب کے لئے اور مسلمانوں میں زندگی کی روح پیدا کرنے کے لئے تبلیغ کانفرنس منعقد کی گئی۔"

اس کے بعد فاضل جج نے تفصیل سے مقدمہ پر بحث کی ہے، ان اقتباسات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قادیان کے غیر مرزائی افراد کس قسم کی حالت سے دوچار تھے، اور "احرار اسلام" نے کتنی سنگلاخ زمین پر اپنا کام شروع کیا تھا۔

مباہلہ کا چیلنج

مرزا غلام احمد قادیانی کے زمانہ سے مرزائی امت کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ بلند بانگ دعووں کے ذریعہ لوگوں پر رعب جمایا جائے، اور جب امتحان کا وقت آئے تو کوئی نہ کوئی حیلہ کرکے بلائے ناگہانی کو ٹلانے کی کوشش کی جائے۔ ۳۵ء میں "احرار" کی یورش سے تنگ آکر میرزا محمود نے "احرار" کو مباہلہ کی دعوت دی، اپنی طرف سے شرائط مقرر کرکے اعلان کردیا کہ "احرار" ہمارے ساتھ مباہلہ کی شرائط طے کرلیں، "احرار" تو میرزا محمود کے رخ زیبا کے عاشق تھے، انہوں نے فی الفور اعلان کردیا کہ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں، ہم فلاں تاریخ کو قادیان حاضر ہوجائیں گے۔ یہ خبر اخبار "مجاہد" میں چھپی تو مرزا محمود کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے، فوراً واویلا کیا کہ "احرار" شرائط مباہلہ طے کئے بغیر قادیان پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں ان کو روکا جائے ـــــ احرار کا موقف یہ تھا کہ مباہلہ کی دعوت آپ نے دی ہے، شرائط آپ نے پیش کی ہیں، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں عائد کی گئی، بس ذرا آنے کی اجازت ہوجائے۔ مگر میرزا محمود صاحب تو محض اعلان کی حد تک مباہلہ کا رعب ڈالنا چاہتے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ "احرار" سچ مچ قادیان میں آدھمکیں گے۔ چنانچہ پھر حکومت عالیہ کے دربار میں درخواست کی گئی کہ "احرار" قادیان میں فلاں تاریخ کو آنے کا اعلان کرچکے ہیں، انہیں حکماً روکا جائے، حکومت نے ۱۴۴ نافذ کردی، اور

مرزا صاحب کی جان میں جان آئی۔

مباہلہ کا نتیجہ

یہاں اس امر کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف تو حکومت کو "احرار" کے قادیان آنے سے روکنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، اور دوسری طرف شیخ عبدالرحمن مصری کو (جو اس زمانہ میں مرزا محمود کے بہت بڑے معتمد تھے) احرار کو شرائط کے جال میں الجھانے کے لئے لاہور روانہ کر دیا گیا، ہدایت یہ تھی کہ جب تک حکومت کا حکم "احرار" کو روکنے کے لئے جاری نہیں ہو جاتا، اس وقت تک شرائط کا عقدہ حل نہ ہونے دیا جائے، چنانچہ جوں ہی حکومت نے "احرار" کے داخلہ قادیان پر پابندی عائد کی، فوراً شیخ عبدالرحمان مصری کو تار اور خط کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ اب احرار سے شرائط طے کرنے کی ضرورت نہیں، فوراً واپس چلے آؤ، اس خط اور تار کی مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود ہے۔

لیکن اس مباہلہ کا اثر یہ ہوا کہ یہی شیخ عبدالرحمن مصری جو کو نومبر ۱۹۳۵ء میں احرار سے شرائط طے کرنے کے لئے بھیجا گیا، ۱۹۳۷ء میں خود ہی مباہلہ کے میدان میں مرزا محمود کو چیلنج کرنے لگا، اور جب مرزا صاحب اپنی صفائی پیش کرنے سے کنی کترا گئے تو اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، عدالت میں شیخ مصری نے جو حلفیہ بیان مرزا محمود کے بارے میں دیا، وہ یہ تھا:

> "موجودہ خلیفہ (مرزا محمود) سخت بدچلن ہے، یہ تقدس کے پردے میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے، اس کام کے لئے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو بطور ایجنٹ رکھا ہوا ہے، ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو کرتا ہے، اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے، جس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔"
>
> (فتح حق ملخصاً شائع کردہ: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور)

شیخ مصری کا یہ بیان، مذہبی تاریخ میں انوکھی مثال ہے، کہ ایک مرید اپنے واجب الاطاعت خلیفہ کے بارے میں حلفیہ طور پر اپنی رائے کا اظہار عدالت میں اتنے سنگین الفاظ میں کرے — اگر شیخ مصری کے اس بیان کو احرار سے مباہلہ کا نتیجہ کہا جائے تو کیا بے جا ہوگا؟

احرار کی تبلیغی مہم

"احرار کے نزدیک قادیانی، ناموس رسالت کے قزاق اور انگریز کے وفادار پالتو تھے، قادیانی نبوت، سراسر مکاری و عیاری اور دجل و تلبیس کا دام فریب تھا، قادیانیوں کی حکومت کے لئے جاسوسی اور خوشامد اسلام اور مسلمانوں سے غداری کے مترادف تھی، اس لئے احرار کے کسی گوشۂ دل میں مرزائیت اور مرزائیوں کی عزت و احترام کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، وہ قادیانیت کو کسی سنجیدہ بحث و تجزیہ کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، ان کے خیال میں مرزائیت، اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک مذاق کی حیثیت رکھتی تھی اور مرزائی جماعت ایک مسخروں کا ٹولہ تھا، اس لئے احرار نے علمی بحثوں سے ہٹ کر مسلمانوں کو قادیانیوں سے نفرت دلانے پر توجہ کی، اور اسے اپنے مذہبی فرائض میں شامل کر لیا۔

احرار کی تبلیغی مہم کے کئی پہلو تھے، ان میں سب سے اہم تر پہلو یہ تھا کہ مرزا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے اخلاق و کردار کو ان کی کتابوں سے پیش کیا جاتا، اور مسلمانوں کو توجہ دلائی جاتی کہ جن لوگوں کی یہ حالت ہو کیا وہ نبی، مجدد، مسیح موعود یا مذہبی پیشوا ہو سکتے ہیں، احرار جگہ جگہ جلسے کرتے اور مرزائی لٹریچر سے وہ مواد پیش کرتے جس سے مرزائیت ایک اضحوکہ بن کر رہ جائے، مرزائیوں کو شکایت ہوتی کہ "احرار" ان کے "مسیح موعود" کو گالیاں نکالتے ہیں، ان کے "خلیفہ صاحب" کی بے ادبی کرتے ہیں، لیکن یہ شکایت بے جا تھی، احرار کا جرم اگر تھا تو یہ تھا کہ وہ مرزائی لٹریچر کے آئینے میں مرزائیت کا بھیانک چہرہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً سیرۃ المہدی میں صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب قادیانی نے بہت سے واقعات درج کئے کہ مرزا غلام احمد نامحرم عورتوں سے

اختلاط رکھتے تھے، نامحرم جوان لڑکیاں شب تنہائی میں ان کی خدمت کیا کرتی تھیں ان کے کمرۂ خاص میں ان کے سامنے غیر عورتیں بلا تکلف برہنہ غسل فرمایا کرتی تھیں، اس قسم کے بے شمار واقعات اخبار بیان کرتے تو لوگ سن کر کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتے اور مرزائیوں کی طرف سے واویلا کیا جاتا کہ اخبار بیہودہ گالیاں نکالتے ہیں، یہاں بطور مثال ایک "مرزائی فتویٰ" درج کیا جاتا ہے جس سے قادیانی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ مرزا صاحب کے خاص اخبار "الحکم قادیان" شمارہ ۱۳ جلد ۱۱ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء میں "استفسار اور ان کے جواب" کے زیر عنوان کسی محمد حسین نامی مرزائی کے چند سوالات کا جواب شائع ہوا، ان میں چھٹا سوال یہ تھا "سوال ششم: حضرت اقدس (مرزا غلام احمد) غیر عورتوں سے ہاتھ پاؤں کیوں دبواتے ہیں" اس کے جواب میں مرزائیوں کے مفتی صاحبان نے علم و فقاہت کے پرزے اڑاتے ہوئے جو دلچسپ جواب دیا وہ یہ تھا:

"جواب: وہ نبی معصوم ہیں، ان سے مس کرنا اور اختلاط منع نہیں، بلکہ موجب رحمت و برکات ہے۔ اور یہ لوگ احکام حجاب سے مستثنیٰ ہیں۔ دیکھو سوالات دوم تا پنجم کے جوابات۔

(۲) امت اپنے نبی کی روحانی اولاد ہوتی ہے اس لئے وہاں زنا اور تہمت زنا کا احتمال نہیں!"

ساتواں سوال مرزا صاحب کے صاحبزادوں سے متعلق تھا کہ وہ بھی نامحرم عورتوں سے اختلاط رکھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے:

"سوال ہفتم: حضرت کے صاحبزادے غیر عورتوں میں بلا تکلف اندر کیوں جاتے ہیں۔ کیا ان سے پردہ درست نہیں۔؟

جواب: آپ نے اس سوال کے وقت جلدی سے کام لیا اور غور نہیں کیا کہ پردہ کرنے کو جو احکام ہیں، یا عورتوں کے پردہ کرانے کے جو پابند مرد ہی ہیں بعض مردوں کو حکم ہے۔ یغضوا من ابصارھم یعنی مرد اپنی آنکھیں نیچے رکھیں، اگر آپ یہ اعتراض کرتے کہ صاحبزادے غیر عورتوں کی طرف دیکھتے ہیں اور غض بصر نہیں کرتے اور اس کا کوئی ثبوت بھی آپ پیش کرتے تو اس کے جواب کی ضرورت بھی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: لست علیھم بمصیطر یعنی تو ان پر داروغہ نہیں کہ ان سے عمل در آمد کرا دے اور سزا دے، جب ہم مرد کسی کا داروغہ نہیں تو کیا صاحبزادے عورتوں سے پردہ کرانے کے ذمہ دار ہیں ... استثنیات کے ذکر میں اور قانون کے وجوہ اور منشا بیان کرتے ہوئے میں نے کہہ دیا ہے کہ ضرورت حجاب صرف احتمال زنا کے لئے ہے، جہاں اس کے وقوع کا احتمال کم ہو ان کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ کر دیا ہے، اس واسطے انبیاء اور اتقیاء لوگ مستثنیٰ بلکہ بطریق اولیٰ مستثنیٰ ہیں۔ پس حضرت کے صاحبزادے اللہ تعالیٰ کے فضل سے متقی ہیں، ان سے اگر حجاب نہ کریں تو اعتراض کی بات نہیں۔"

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

اس سوال اور جواب کو بار بار پڑھیے، قادیانی مفتی یہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت صاحب نامحرم عورتوں سے ہاتھ پاؤں دبوانے کی خدمت لیا کرتے تھے۔ اور ان کے صاحبزادگان گرامی قدر بھی "بلا تکلف" نامحرم عورتوں کے مجمع میں تشریف لے جانے کے خوگر تھے مگر مرزائی مفتی کی منطق یہ ہے کہ وہ چونکہ نبی اور نبی زادے تھے اس لئے پردہ کا

حکم الٰہی ان پر لاگو نہیں ہوتا، حکم الحکام یہ تو اُمتیوں کے لئے ہیں۔ قادیان کا خانوادۂ نبوت تو اتنا مقدس ہے کہ غیر محرم عورتیں اس سے جس قدر مس و اختلاط زیادہ کریں گی اتنی ہی رحمتیں اور برکتیں ان پر نازل ہونگی لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

اب غور فرمایئے کیا یہ نقرہ لے اور یہ منطق سنجیدہ بحث و نظر کی مستحق ہے؟ یہ صرف ایک مثال عرض کی گئی ہے، ورنہ قادیانی لٹریچر اس قسم کے ہزلیات و ہفوات کے تعفن سے بھرا ہوا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب تک مرزائی حلقوں تک محدود رہے تب تک وہ "اسرار و معارف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جب اسے پبلک اسٹیج پر پیش کیا جائے تو یک لخت وہ گالی بن جاتا ہے۔ چنانچہ احرار جب اپنی تقریر میں ان قادیانی "اسرار و معارف" کو پیش کرتے تو مرزائی چلا اٹھتے کہ ہمیں گندی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ کاش! ان بھلے لوگوں سے کوئی کہتا کہ اگر تمہارے لٹریچر کا مواد پیش کر دینا ہی "گندی گالی" ہے تو اس میں مجرم "احرار" ہیں یا تمہارے حضرت صاحب؟ ماحصل یہ کہ احرار نے مرزائیوں کے خلاف اس قدر نفرت پھیلائی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے یہ لطیفے قصے گلی گلی پہنچ گئے، اور "مرزائی" کا لفظ خود مرزائیوں کے نزدیک بھی واقعۃً گالی بن کر رہ گیا ــــ قادیانیوں سے یہ عمومی نفرت نہ سنجیدہ مقالات سے پیدا ہو سکتی تھی، نہ عالمانہ بحثوں سے، نہ دارالافتاء کے فتووں سے ــــ

احرار کے تبلیغی کارنامہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ مرزائیوں کی انگریز پرستی اور اسلام دشمنی کو اس انداز سے بیان کرتے کہ انگریز اور قادیانی بیک وقت دونوں تلملا اٹھتے۔ مرزائیوں کی تاریخ کا سب سے بدترین باب یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تمام عالم اسلام کو کافر گردانا، اور دوسری طرف ہر ایسے موقعہ پر جہاں اسلام اور انگریز کے مفاد کے درمیان ٹکراؤ ہوا وہاں اسلام کے بجائے "کافر انگریز" سے وفاداری کا مظاہرہ کیا ــــ ترکی خلافت کو تاخت و تاراج کیا جا رہا تھا، پورا عالم اسلام خون کے آنسو رو رہا تھا، لیکن مرزائی ٹولہ بڑی ڈھٹائی سے انگریز کی مدح و ستائش اور مسلمانوں کی مذمت میں مشغول تھا۔ جسٹس منیر نے اپنی مرزائیت نوازی کے باوجود یہ تسلیم کیا ہے کہ:

"غیر احمدیوں کو تحریک احمدیہ کے بانی اور اس کے لیڈروں کے خلاف بڑی بڑی شکایات تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے "ذلیل خوشامدی" ہیں۔"

"جب انہوں نے (مرزا غلام احمد نے) عقیدۂ جہاد کی تاویل میں "مہربان انگریزی گورنمنٹ" اور اس کی مذہبی رواداری کی تعریف نہایت خوشامدانہ لہجے میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہونے لگے۔ پھر جب مرزا صاحب نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کی فراخ دلانہ مذہبی پالیسی کا موازنہ و مقابلہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ و غضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ احمدی جانتے تھے کہ ان کے عقائد دوسرے مسلم ممالک میں اشاعت ارتداد پر محمول کئے جائیں گے، اور ان کا یہ خیال اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا جب افغانستان میں عبداللطیف (احمدی) کو سنگسار کیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں (جس میں ترکوں کو شکست ہوگئی تھی) بغداد پر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور قادیان میں اس "فتح" پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں برہمی پیدا ہوئی اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے۔"

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت ۲۰۸)

احرار جنگ آزادی کے مجاہد تھے، وہ اپنے دین و مذہب اور قوم و وطن کی آزادی کے لئے انگریزی حکومت کی آہنی دیوار سے ٹکرا

رہے تھے، احمدی مرزائیت سے نفرت کرنا اور نفرت دلانا احرار کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھا، احرار کا کوئی جلسہ اور ان کی کوئی تقریر اس سے خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ احرار نے انگریز کی خوشامد پر اس شدت سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا کہ خود قادیانیوں کو اپنی روش سے نفرت ہونے لگی، کسی زمانہ میں وہ بڑے فخر سے انگریز پرستی کو اپنا زریں کارنامہ قرار دیتے تھے، مرزا غلام احمد قادیانی انگریز کی خوشامد اور وفاداری کو اپنا خاندانی پیشہ ظاہر کیا کرتا تھا، لیکن احرار کی یلغار کے بعد انہیں انگریز پرست کا لفظ گالی نظر آنے لگا۔ مرزائیوں کے بس میں ہوتا تو مرزا غلام احمد کی وہ تمام کتابیں دفن کر دیتے جن میں انگریز کی گھٹیا خوشامد درج ہے۔ اور جن میں ملکہ برطانیہ کو "خدا کا نور" قرار دیا گیا ہے۔

اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

قادیانی اپنے عقائد و نظریات کے لحاظ سے کسی وقت بھی مسلمانوں کی صف میں شمار نہیں کئے گئے، لیکن انگریزی سیاست انہیں مسلمانوں میں شامل رکھنے پر بضد تھی، مسلمانوں کی جانب سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے علامہ اقبال مرحوم نے اٹھایا، اس کے بعد احرار نے اس کو مستقل مشن بنا لیا۔ مرزا غلام احمد اور مرزائی جماعت کی کفریات کو پیش کر کے انہیں مسلمانوں سے جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تقریباً ہر بڑے جلسے میں کیا جاتا، اگرچہ تقسیم سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد بھی (۱۹۷۴ء تک) ارباب اقتدار نے احرار کے اس مطالبہ کو درخور اعتناء نہ سمجھا لیکن اس مطالبہ کو بار بار دہرانے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ مطالبہ راسخ ہوتا چلا گیا، اور عملی طور پر عام مسلمانوں نے قادیانیوں کو کبھی اپنی صف میں جگہ نہیں دی۔

مرزائیوں کے خلاف احرار کی مہم کا ایک پہلو یہ تھا کہ الیکشن میں کسی مرزائی کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ مرزائی مسلمانوں کی سیٹ پر مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے کھڑے ہوتے اور ارباب اقتدار کے ساتھ اپنے غیر معمولی اثر و رسوخ اور زر و دولت کے بل بوتے پر کامیاب ہونے کی کوشش کرتے لیکن احرار کو جہاں پتہ چل جاتا کہ فلاں سیٹ پر کوئی احمدی امیدوار مسلمانوں کے ووٹ سے آگے جانے کی تیاری کر رہا ہے، یہ فوراً وہاں پہنچ جاتے اور پوری قوت سے مرزائیوں کی مزاحمت کرتے۔ اکثر و بیشتر مرزائیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا — واقعہ یہ ہے کہ اس محاذ پر صرف احرار نے کام کیا — میں اس عنوان کو مسٹر جسٹس منیر کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں، موصوف لکھتے ہیں:

> "احرار کی بڑی بڑی سرگرمیوں میں ایک یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں احمدیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احرار کی پیدائش ہی احمدیوں کی نفرت سے ہوئی ہے، ابھی مجلس احرار کی تاسیس پر دو ہی سال گزرے تھے کہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی جس کا منشا یہ تھا کہ کوئی قادیانی کسی مجلس عاملہ کا ممبر منتخب نہ کیا جائے، قادیان تقسیم سے پہلے تقریباً خالص احمدی قصبہ تھا، ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا، لیکن جب اس جلسے کو ممنوع قرار دیا گیا تو انہوں نے اسی سال ۲۱ راکتوبر کو قادیان سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں رجادہ کے دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کانفرنس منعقد کر لی جس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں تک تھی، اس کانفرنس میں احرار کے مقبول عام خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے احمدیوں کے خلاف پانچ گھنٹے کی ایک نفرت آمیز تقریر کی جس میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے صرف

یہ مقصود تھا کہ سننے والوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف نفرت
کی آگ بھڑک اٹھے، انہوں نے اپنی تقریر میں امن و امان
کے دعاوی کے ساتھ نہایت پست قسم کی دشنام طرازی
اور سخرگی سے کام لیا۔[1] اس تقریر کی بناء پر بخاریؒ کے
خلاف مقدمہ چلایا گیا جس کی سماعت کے دوران اتنی
سنسنی پیدا ہوئی اور احمدیوں کے خلاف جذبات اتنے
برانگیختہ ہوئے کہ خود تقریر سے بھی نہ ہوئے ہونگے[2]
اس مقدمے میں بخاریؒ کو سزا دی گئی، وہ دن اور یہ
رات۔ ہر قابل ذکر احراری مقرر، احمدیوں، ان کے
راہ نماؤں اور ان کے عقیدوں کے خلاف ہر قسم کی
باتیں کہتا رہا ہے۔ (تحقیقاتی رپورٹ صفحہ ۱۱)

جسٹس منیر صاحب نے اور بھی بیسیوں جگہ قادیانیت کی مخالفت
پر "احرار اسلام" کو "خراجِ تحسین" پیش کیا ہے، اور احرار رہنماؤں
میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ ریمارکس دئیے ہیں، قاضی احسان احمد
شجاع آبادیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم کی توجہ قادیانی
تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کرائی وہ قاضی احسان احمد
شجاع آبادی تھا، قادیانیت کی مخالفت اس شخص
کی زندگی کا واحد مقصد معلوم ہوتا ہے، اور وہ جہاں
کہیں جاتا ہے اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق
لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر
بھرا ہوا ہوتا ہے —— زیادہ اہم سیاسی واقعات
کا ذکر تو درکنار، پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت
پیش آجائے، کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہو جائے،
قائد ملت قتل کر دئیے جائیں، یا ہوائی جہاز گر پڑیں قاضی
احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں
کی سازش ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

(تحقیقاتی رپورٹ صفحہ ۱۲۰)

ہم اس پر صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تصور صرف قاضی صاحب
مرحوم کا نہیں تھا، بلکہ تمام احرار کا تھا، اور اب پاکستان اور عالم اسلام کے
تمام مسلمانوں کا ہے۔

تاریخ تحریک ختم نبوت

پیام حق نبوت ختم شد

۱۹۵۳ء

ختم نبوت

حق کامیاب شد

۱۹۷۴ء

---

[1] جسٹس صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے، قادیانی کتابوں کے حوالوں کو وہ "پست قسم کی دشنام طرازی اور سخرگی" سے تعبیر فرما رہے ہیں جو شخص ناموس رسالت کے ساتھ مسخرہ پن کا مظاہرہ کرے وہ مسلمانوں کے نزدیک تو اسی کا مستحق ہے۔

[2] گویا شاعر کی زبان میں: ؎ نہ تم صدمے ہمیں دیتے، نہ ہم فریادیوں کرتے ؏ نہ کھلتے رازِ سربستہ، نہ یوں رسوائیاں ہوتیں۔ آخر اس میں غریب بخاریؒ کا یا

قادیاں سے ربوہ تک

مختصر یہ کہ ان اکابر کی قیادت میں امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور "مجلس احرار اسلام" کے سرفروشوں نے اپنی شعلہ بار خطابت کے ذریعے انگریز اور انگریز کی ساختہ پرداختہ قادیانی نبوت کے خرمن امن کو پھونک ڈالا۔ تاآنکہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار رخت سفر باندھ کر رخصت ہوا تو برصغیر کی تقسیم ہوئی، اور پاکستان منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں قادیانی نبوت کا منبع خشک ہوگیا اور قادیان کی منحوس بستی دارالکفر، دارالحرب ہندوستان کے حصہ میں آئی۔

قادیانی خلیفہ اپنی "ارض حرم" اور "مکۃ المسیح" (قادیان) سے برقع پہن کر فرار ہوا۔ اور پاکستان میں ربوہ کے نام سے نیا دارالکفر تعمیر کرنے کے بعد شاہوار نبوت کی ترکتازیاں دکھانے اور پورے ملک کو مرتد کرنے کا اعلان کرنے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد

قادیانیوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستان کے ارباب اقتدار پر ان کا تسلط ہے، ملک کے کلیدی مناصب ان کے قبضے میں ہیں، پاکستان کا وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں خلیفہ قادیان (حال ربوہ) کا ادنیٰ مرید ہے اس لئے پاکستان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا جعلی سکہ رائج کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، ان کی امید افزائی کا خاص پہلو یہ بھی تھا کہ "احرار اسلام" کا قافلہ تقسیم ملک کی وجہ سے لٹ چکا تھا، تنظیم اور تنظیمی وسائل کا فقدان تھا، اور رہبر "احرار اسلام" ناخدایان پاکستان کے دربار میں معتوب تھے، اس لئے قادیانیوں کو غرہ تھا کہ اب حریم نبوت کی پاسبانی کے فرائض انجام دینے کی کسی کو ہمت نہیں ہوگی

لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ حفاظت دین اور تحفظ ختم نبوت" کا کام انسان نہیں کرتے خدا کرتا ہے، اور وہ اس کام کے لئے خود ہی رجالِ کار بھی پیدا فرما دیتا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاء قادیانیوں کے عزائم سے بے خبر نہیں تھے، چنانچہ جدید حالات میں قادیانیت کے خلاف کام کرنے کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے ملتان کی ایک چھوٹی سی مسجد "مسجد سراجاں" میں ایک مجلس مشاورت ہوئی جس میں امیر شریعتؒ کے علاوہ مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا عبدالرحمن میانوی، مولانا تاج محمود لائل پوریؒ اور مولانا محمد شریف جالندھریؒ شریک ہوئے۔ غور و فکر کے بعد ایک سیاسی تبلیغی تنظیم "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی بنیاد رکھی گئی اور اس کا ابتدائی میزانیہ ایک روپیہ یومیہ تجویز کیا گیا۔ چنانچہ صدر المبلغین کی حیثیت سے فاتح قادیاں حضرت مولانا محمد حیات صاحب اطال اللہ حیاتہ، کو جو قادیان میں شعبۂ تبلیغ احرار اسلام" کے صدر تھے ملتان طلب کیا گیا۔ ان دنوں مسجد سراجاں ملتان کا چھوٹا سا حجرہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا مرکزی دفتر تھا۔ وہی دارالمبلغین تھا، وہی دارالاقامہ تھا وہی مشاورت گاہ تھی اور یہی چھوٹی سی مسجد اس عالمی تحریک "مجلس تحفظ ختم نبوت"، کا ابتدائی کنٹرول آفس تھا۔ شہید اسلام حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بقول ؎

وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع

حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس نحیف وضعیف تحریک میں ایسی برکت ڈالی کہ آج اس کی شاخیں اقطار عالم میں پھیل

چکی ہیں اور اس کا مجموعی میزانیہ لاکھوں سے متجاوز ہے۔

قیادت باسعادت

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کو یہ سعادت ہمیشہ حاصل رہی ہے کہ اکابر اولیاء اللہ کی قیادت و سرپرستی اور دعائیں اسے حاصل رہی ہیں حضرت اقدس رائے پوری آخری دم تک اس تحریک کے قائد و سرپرست رہے۔ ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ، حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہ اور حضرت مولانا خان محمد صاحب خانقاہ سراجیہ کندیاں اس کے سرپرست رہے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے بانی اور امیر اول امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ امیر شریعت کی وفات ۱۹۶۱ء میں ہوئی اور خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی ان کے جانشین مقرر ہوئے ان کے وصال کے بعد حضرت مجاہد ملت مولانا محمد علی صاحب جالندھری کو امارت سپرد کی گئی، ان کے وصال کے بعد مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر امیر مجلس ہوئے۔ مولانا لال حسین اختر کے بعد عارضی طور پر فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیات صاحب مدظلہ کو مسند امارت تفویض ہوئی مگر اپنے ضعف و عوارض کی بنا پر انہوں نے اس گراں باری سے معذرت کا اظہار فرمایا، یہ ایک ایسا بحران تھا کہ جس سے اس عظیم الشان تحریک کی پیش قدمی رک جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، لیکن حق تعالیٰ شانہ کا وعدہ حفاظت دین یکایک ایک ایسی ہستی کو اس منصب عالی کے لئے کھینچ لایا جو اپنے اسلاف کے علوم و روایات کی امین ہے، اور جس پر ملت اسلامیہ کو بجا طور پر فخر حاصل ہے، میری مراد شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری، دامت برکاتہم سے ہے۔

تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت، امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی وراثت و امانت تھی اور اس کا اہل علوم انوری کے وارث حضرت شیخ بنوری سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ حضرت امیر شریعت قدس سرہ کی امارت، خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ کی خطابت، مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری نور اللہ مرقدہ، کی ذہانت، مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کی بلندی عزم نے نہ صرف مجلس تحفظ ختم نبوت کی عزت و شہرت کو چار چاند لگائے بلکہ ان حضرات کی قیادت نے قصر قادیانیت پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ قادیانی تحریک کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت پر کذب و افترا کی آئینی مہر لگ گئی۔

غیر سیاسی جماعت

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کا مقصد تاسیس، عقیدہ ختم نبوت کی حفاظت اور امت مسلمہ کو قادیانی الحاد سے بچانا تھا، اس کے لئے ضرورت تھی کہ جماعت خارزار سیاست میں الجھ کر نہ رہ جائے چنانچہ جماعت کے دستور میں تصریح کر دی گئی کہ جماعت کے ذمہ دار ارکان سیاسی معرکوں میں حصہ نہیں لیں گے، کیوں کہ سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے دوسرے حضرات موجود ہیں۔ اس لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا دائرہ عمل دعوت و ارشاد، اصلاح و تبلیغ اور رد قادیانیت تک محدود رہے گا، اس فیصلے سے دو فائدے متصور تھے، ایک یہ کہ "جماعت تحفظ ختم نبوت" کا پلیٹ فارم تمام مسلمانوں کا اجتماعی پلیٹ فارم رہے گا، اور عقیدہ ختم نبوت کا جذبہ اہل اسلام کے اتحاد و اتفاق اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا بہترین ذریعہ ثابت ہو گا۔ دوم یہ کہ "مجلس تحفظ ختم نبوت"، کا ارباب اقتدار سے یا کسی اور سیاسی جماعت سے تصادم نہیں ہو گا۔ اور امت مسلمہ کا اجتماعی عقیدہ ختم نبوت اطفال سیاست کا کھلونا بننے سے محفوظ رہے گا۔

مشکلات و موانع

حق تعالیٰ نے اس کمزور ترین جماعت کو جن دینی خدمات سے سرفراز فرمایا ان کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان مشکلات کا بھی ایک نظر مطالعہ کیا جائے جو اس کے راستہ میں کوہِ گراں کی طرح حائل رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس نوزائیدہ مملکت میں قادیانی مرتدین کا اثر و رسوخ خوفناک حد تک بڑھ گیا تھا، سر ظفر اللہ خاں قادیانی پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ اور ملکی پالیسی کے خالق تھے۔ مسٹر ایم ایم احمد سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے، فوج، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ اور فارن سروس کے اہم اور نازک ترین کلیدی مناصب پر چن چن کر قادیانی افراد کو مقرر کیا گیا، یہ تمام لوگ جن کے ہاتھوں میں ملک کے نظم و نسق کی کلید تھی خلیفہ ربوہ کے مرید و مطیع تھے ان کا ہر اقدام خلیفہ کے اشارہ چشم و ابرو کا رہین منت تھا۔ گویا قادیانی خلیفہ صرف اپنی "مرتد جماعت" کا ہی امیر المومنین نہیں تھا بلکہ اپنے مریدوں کی وساطت سے نظم مملکت میں براہِ راست دخیل تھا۔ اور مسلمانوں پر خلافتِ حکمرانی کر رہا تھا اور ملک کی قسمت کے فیصلے "ربوہ" کے "دارالندوہ" میں کئے جاتے تھے۔

ان حالات میں خلیفہ قادیانی کے باپ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کے خلاف لب کشائی کی اجازت کیوں کر ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے کارکنوں کی زبان بندی، نظر بندی اور پابندی روز کا معمول بن چکی تھی۔ ان جرم ناآشناؤں کا "جرم بے گناہی" یہ تھا کہ کذاب قادیان مرزا غلام احمد کی نبوت کو غلط اور اس جھوٹی نبوت کے پرستاروں کو "کافر" کہنے کی "غلطی" کیوں کی جاتی ہے۔ ختم نبوت کے مجاہدین کہیں قادیان کی ہزلیاتی نبوت پر لب کشائی کرتے قانون فوراً وہاں ہتھکڑی لے کر پہنچ جاتا، گرفتاری، مقدمہ، پیشی، سزا اور بالآخر جیل مجاہدین ختم نبوت کا تحفہ تھا جو انہیں قادیانی گماشتوں کی جانب سے عطا کیا جاتا۔ بلا مبالغہ ایک ایک کارکن پر بیس بیس مقدموں کا تانتا بندھا رہتا اور پھر یہ غیر مختتم سلسلہ کہیں تھمنے کا نام نہ لیتا۔ اس جبر و تشدد اور ان ستم رانیوں کے باوجود مجاہدین ختم نبوت نے ہمت نہ ہاری بلکہ ان کے کیف و سرمستی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور جور و ستم کے طوفان، قید و سلاسل کا خوف اور دار و رسن کے اندیشے ان کا راستہ نہ روک سکے۔ بلکہ اس سنگلاخ زمین میں بھی "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے آہنی عزم جوانمردوں نے سفر جاری رکھا۔ اس کسمپرسی و بے بضاعتی کے عالم میں مجلس تحفظ ختم نبوت نے جن شعبوں میں کام کیا ان کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

شعبہ تبلیغ

"مجلس تحفظ ختم نبوت" نے ملک میں ایسا مخصوص "تبلیغی نظام" رائج کیا جو اپنی نوعیت کا منفرد "تبلیغی نظام" ہے، مجلس نے تدریجاً ایسے مبلغین کی مضبوط جماعت تیار کی جو ہر علاقہ میں بلا معاوضہ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیں اور "مجلس تحفظ ختم نبوت" ان کے مصارف کا کفیل ہو۔

ملک کے کسی حصے میں دعوت و تبلیغ اور رد قادیانیت کی ضرورت ہو مجلس کے مرکزی دفتر کو ایک کارڈ لکھ کر وقت طے کر لیجئے۔ مجلس کا مبلغ ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جائے گا۔ ہاں اگر کچھ خدمت کرے تو وہ مجلس کے بیت المال میں جمع کر دیا جائیگا۔

اس نظام تبلیغ کا یہ فائدہ ہوا کہ لاہور سے کوئٹہ اور کراچی سے پشاور تک ہر طرف سے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو جلسوں کی دعوت آنے لگیں، مبلغین ختم نبوت اور رد قادیانیت پر اظہار خیال کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا۔ اور انہوں نے ملک کے چپے چپے اور قریہ قریہ میں ختم نبوت کی تبلیغ کی۔

مجلس کے تبلیغی اثرات کا اندازہ صرف ایک معمولی سے واقعہ سے

کیا جاسکتا ہے کہ ربوہ کی گرمی سے گھبرا کر قادیانی خلیفہ نے اپنے گرمائی ہیڈ کوارٹر کے لئے ضلع سرگودھا کے ایک سرد مقام وادی سون کو منتخب کیا اور "النخلہ" کے نام سے وہاں ایک قادیانی مرکز تعمیر کیا گیا، پانی کے لئے ٹیوب ویل اور بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک اعلیٰ درجے کا جنریٹر لگایا گیا، قادیانی خلیفہ اور اس کے حواریوں کے لئے نفیس ترین بنگلے تعمیر کئے گئے۔ ختم نبوت کے کارکنوں نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکز کو اطلاع کی، مرکز نے "النخلہ" کے متصل موضع "جابہ" میں ایک "ختم نبوت کانفرنس" منعقد کرانے کا اعلان کرایا۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے اس علاقہ کے مسلمانوں کو فتنۂ قادیانیت کے خدوخال سے آگاہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ قادیانی مرتدین کو "النخلہ" جانے کی ہمت نہ ہوئی، آج "النخلہ" کی ویرانی کأنهم اعجاز نخل خاویة کی شکل میں اپنے بانیوں کا ماتم کر رہی ہے۔

ختم نبوت چنیوٹ کانفرنس اور جابہ کانفرنس

"مجلس تحفظ ختم نبوت" نے اپنے تبلیغی نظام کو مزید وسعت دینے کے لئے ایک خاص انتظام یہ کیا کہ جن علاقوں میں قادیانیوں کا زور تھا وہاں خود اپنے مصارف سے جلسے اور کانفرنسیں منعقد کرنے کا اہتمام کیا اور قادیانیوں کو خود ان کے علاقوں میں لاکارا، اس قسم کی بے شمار کانفرنسیں منعقد کی گئی ان میں "چنیوٹ ختم نبوت کانفرنس" اور "جابہ ختم نبوت کانفرنس" کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ مسیحیت کا مدعی اور جدید عیسائیت کا بانی تھا، اس لئے عیسائیوں کے تہوار کے دنوں یعنی ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر کو ان کی جماعت کا ظلی مرکز ارتداد ربوہ کے نام سے تقسیم سے قبل مرکز کفر قادیاں میں ہوتا تھا، اور تقسیم کے بعد نئے مرکز ارتداد ربوہ میں ہونے لگا، اس لئے قادیانیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے ختم نبوت کانفرنس ان ہی تاریخوں میں پہلے قادیان میں ہوتی تھی اور اب ربوہ کے متصل چنیوٹ میں ہوتی ہے، اس عظیم الشان کانفرنس کا انتظام "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی طرف سے کیا جاتا ہے جس میں تمام اسلامی مکتب فکر کے نمائندے شریک ہو کر قادیانی کفر وارتداد کی تردید کرتے ہیں۔ اسی طرح "النخلہ" کے قریب موضع "جابہ" میں بھی ہر سال باقاعدگی سے ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور وہاں جماعت کا دفتر اور مدرسہ بھی کام کر رہا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے ذیلی مراکز

تحریک ختم نبوت کی دعوت کو مزید وسعت دینے کے لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی جانب سے ایک خاص اہتمام کیا گیا کہ ہر بڑے شہر میں جماعت کا دفتر قائم کر کے وہاں دیگر عملہ کے علاوہ ایک ایسے عالم کو مبلغ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا جو قادیانیت کے اسرار و رموز پر ماہرانہ دسترس رکھتا ہو تاکہ مسلمانوں کا رابطہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے ساتھ قوی اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو اور قادیانیوں کی مرتدانہ سرگرمیوں پر ہر لحظہ کڑی نگاہ رکھی جا سکے، یہ کام خاصا مشکل تھا لیکن بحمد اللہ جماعت کو اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اب خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجلس تحفظ ختم نبوت کی ذیلی شاخیں چھوٹے چھوٹے قصبات میں بھی موجود ہیں اور جماعت کے ضلعی دفاتر ان کا نظم و نسق چلا رہے ہیں، یہی انتظام بیرونی ممالک میں بھی کیا جا رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ ان تمام ممالک میں جہاں قادیانی ارتداد کا فتنہ موجود ہے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے مراکز عنقریب قائم کر دیئے جائیں گے، اب تک تقریباً ایک درجن ممالک میں جماعت کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

مرکزی دارالمبلغین

جماعت "تحفظ ختم نبوت" کے پیش نظر ایک اہم ترین فریضہ یہ

تھا کہ دینی علوم کے ماہر نوجوانوں کو قادیانیت کی تعلیم دی جائے تاکہ انہیں قادیانیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملے تو وہ پوری طرح بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ قادیانیوں سے بحث و گفتگو کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے مرکزی دفتر میں ایک دارالمبلغین قائم کیا گیا اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دو صورتیں تجویز کی گئیں اول یہ کہ جو نوجوان اس کے لئے کافی وقت نہیں دے سکتے انہیں تعطیلات کے زمانے میں دارالمبلغین میں رکھا جائے اور ان کی رہائش و دیگر ضروریات کا انتظام جماعت کی جانب سے کیا جائے۔ دوم یہ کہ جو حضرات اس کے لئے معتدبہ وقت دے سکیں انہیں مجلس تحفظ ختم نبوت کے رفیق کی حیثیت سے باقاعدہ وظیفہ دیا جائے اور قادیانیت کے مقابلہ میں انہیں علمی اسلحہ سے پوری طرح مسلح کیا جائے۔

اس کے علاوہ ایک خصوصی انتظام یہ کیا گیا کہ ملک کے بڑے بڑے دینی مدارس میں دارالمبلغین کے نمائندے کچھ مدت قیام کریں اور فارغ التحصیل یا منتہی طلبہ کو ردِ قادیانیت کی تربیت دی جائے۔ بحمداللہ دارالمبلغین کے اس تربیتی نظام کے تحت ہر سال مبلغین کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جاتی ہے جو اپنی اپنی جگہ تبلیغ ختم نبوت اور ردِ قادیانیت کے فرائض انجام دیتی ہے اب تک ہزاروں کی تعداد میں ایسے مبلغین تیار ہو چکے ہیں جن میں سے بعض حضرات بیرونی ممالک میں بھی کام کر رہے ہیں۔ حال ہی میں مرکزی جماعت کے رہنما مولانا عبدالرحیم اشعر اور ان کے رفیق مولانا اللہ وسایا المجلس الاعلیٰ للشؤن الاسلامیہ کے صدر الشیخ حسین الحبشی کی دعوت پر انڈونیشیا تشریف لے گئے اور المعہد الاسلامی اور دیگر اداروں کے طلبا کو قادیانیت پر تیاری مکمل کرائی۔

مناظرے اور مباحثے

قادیانی مرتدین مناظروں اور مباحثوں کے مریض ہیں۔ ایک زمانے میں وہ ہند و پاک میں ہر جگہ بھولے بھالے مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے حیات و وفات مسیح" اور" اجرائے نبوت" کے موضوع پر بحث چھیڑ دیا کرتے تھے۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو قادیانی مرتدین کی اس جارحیت کا نوٹس لینا ضروری تھا، چنانچہ ختم نبوت کے مبلغین کو سینکڑوں مرتبہ قادیانیوں سے گفتگو اور مناظرہ و مباحثہ کی نوبت آئی، خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر جگہ مرتدین کو ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور قادیانی ٹولہ مجلس کے مبلغین سے اس قدر زچ ہوا کہ قادیانی خلیفہ کو باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے کسی مبلغ سے مناظرہ نہ کیا جائے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ نبوت کے مرکزی دفتر کو اطلاع ہوئی کہ فلاں جگہ مرتدین مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں، جماعت کا فاضل مبلغ کتابوں کا صندوق لے کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچا تو قادیانی مرتدین نے وہاں راہِ فرار اختیار کرنے کو سب سے بڑی فتح سمجھا۔ پورے ملک کے لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا اعلان تھا اور اب یہ اعلان پوری دنیا کے لئے ہے کہ کسی جگہ بھی قادیانی مرتدین مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہوں تو مجلس کے مرکزی دفتر کو (مجلس تحفظ ختم نبوت، تغلق روڈ ملتان کے پتہ پر) ایک اطلاع نامہ لکھ دیجئے۔ ختم نبوت کے مجاہدین انشاء اللہ فوراً اس محاذ پر بھیج دیئے جائیں گے۔ اور قادیانی مرتدین سے نمٹ لیں گے انشاء اللہ

مجاہد ملت حضرت محمد علی جالندھری صاحبؒ یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ کسی سفر میں وہ اسٹیشن پر ایسے وقت پر پہنچے کہ ریل کے آنے میں کچھ وقت تھا، غور کیا کہ اس مختصر سے فارغ وقت کو کیسے کام میں لایا جائے، چائے کے اسٹال پر گئے چائے نوش کی، پیسے ادا کئے اور چائے والے سے کہا: میرا نام محمد علی جالندھری ہے میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا نمائندہ ہوں میرا پتہ یہ ہے، اگر خدا نہ کردہ کسی وقت کوئی مرزائی تمہارے علاقے میں شرارت کرے تو مجھے خط لکھ دینا، مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ سات برس بعد اس شخص کا خط آیا کہ ہمارے قصبے میں مرزائی مبلغین قادیانیت کی تبلیغ کر

بیٹے ہیں اور انہوں نے ایک خاندان کو مرتد کر لیا ہے یہ خط ملتے ہی ہم اس
پہنچے، قادیانیوں کو چیلنج کیا تو قادیانی بھاگ گئے اور نو مرتد گھرانے کو قادیانیت
کی حقیقت سمجھائی تو وہ دوبارہ مشرف باسلام ہوا۔ اس کے بعد قادیانیوں
کو اس قصبے کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ سینکڑوں واقعات میں سے
ایک معمولی سا واقعہ ہے جو مجاہدین ختم نبوت کے ذوق و شغف، محنت،
خلوص اور فہم و تدبر کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتا ہے۔

مسلم قادیانی مقدمات

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کو قادیانیت کے خلاف ہمہ گیر مسائل سے
واسطہ تھا اور اس کے رہنماؤں کو "قادیانی مسئلہ" کے ہر پہلو پر مسلمانوں کی اعانت
اور رہنمائی کی ضرورت لاحق رہتی تھی چنانچہ مجلس نے ایک اہم خدمت
اپنے ذمہ یہ لے رکھی تھی (اور ابھی تک اس کے ذمہ ہے) کہ اسلام اور
قادیانیت کے تقابل کے سلسلہ میں جس قدر مقدمات عدالتوں میں جائیں
ان میں نہ صرف مسلمانوں کی اخلاقی و قانونی مدد کی جائے بلکہ حسب ضرورت
مقدمہ کے مصارف کا تکفل بھی کیا جائے اس قسم کے مقدمات کو تین قسموں
میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم ان مقدمات کی ہے جو انتظامیہ کی جانب سے مجاہدین
ختم نبوت اور دیگر علماء امت پر محض اس "جرم" میں دائر کئے گئے کہ
انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت کے خلاف لب کشائی
کی گستاخی کیوں کی؟ اس قسم کے مقدمات روزمرہ کا معمول تھے اور ان کے
مصارف کا بہت سا بارگراں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو برداشت کرنا ہوتا
تھا، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۴ء تک کے دوران بہت سے
ایسے حضرات بھی تھے جن کے نان و نفقہ کی جانب بھی مجلس تحفظ ختم نبوت
کو توجہ کرنا پڑی۔

دوسری قسم ان فوجداری مقدمات کی تھی جو مسلم قادیانی نزاع کی
صورت میں رونما ہوتے رہے۔ قادیانیوں کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے جس جگہ
انہیں اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے مواقع میسر آئیں اور حکام بالا سے اثر و رسوخ
ہو وہاں وہ مسلمانوں کی اذیت اور دنگا فساد کی کوئی نہ کوئی شکل پیدا کر لیتے ہیں۔
اور بعض اوقات کمزور مسلمانوں کو مار پیٹ کر تھانے میں اپنی مظلومیت کی داستان
سرائی بھی کیا کرتے ہیں کہ آج فلاں مجرم نے مسلمانوں پر "مسلح حملہ" کر ڈالا۔
"مجلس تحفظ ختم نبوت" کے رہنماؤں کو جہاں کہیں ایسے فساد کی اطلاع ہوئی
فوراً وہاں پہنچے اور اگر معلوم ہوا کہ قادیانیوں کی زیادتی ہے تو مسلمانوں کی طرف
سے مقدمہ کی سرپرستی کی، اور مسلمانوں کو ہر طرح قانونی، اخلاقی اور مالی مدد
بہم پہنچائی۔

تیسری قسم ان دیوانی مقدمات کی تھی جو مسلم، قادیانی قضیہ کے سلسلہ میں
عدالت میں دائر ہوتے تھے اور جن میں بنیادی طور پر تصفیہ طلب یہ نکتہ ہوتا
تھا کہ آیا قادیانی مسلمان ہیں، یا خارج از اسلام؟ مثلاً کسی قادیانی نے دھوکہ
دے کر کسی مسلمان خاتون سے شادی کر لی۔ یا شادی کے بعد معاذ اللہ اسلام سے
مرتد ہو کر قادیانی بن گیا۔ اس صورت میں کبھی قادیانیوں کی جانب سے
خانہ آبادی کا دعوے ہو جاتا اور کبھی مسلمانوں کی جانب سے اس نکاح کو
کالعدم قرار دینے کا۔ اس نوعیت کے مقدمات کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری
رہتا تھا۔ مجلس ختم نبوت کو ملک کے کسی حصہ میں اس قسم کے مقدمہ کی
اطلاع ہوئی تو مجلس نے نہایت فراخدلی سے ان مقدمات کی سرپرستی
کی اور مجلس کے مبلغین نے قادیانیوں کی کتابوں سے ان کا کفر و ارتداد ثابت
کر کے عدالت کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دی۔ چنانچہ اس نوعیت کے
تمام مقدمات کی مختلف عدالتوں نے قادیانیوں کے کفر و ارتداد کا فیصلہ
کرتے ہوئے مسلم قادیانی نکاح کو کالعدم قرار دیا، اسی طرح کبھی کسی مسجد
کی تولیت کے معاملے میں قادیانیوں کے کفر اور اسلام کا نکتہ عدالتوں
میں زیر بحث آیا۔ اور کبھی کسی وراثت کے مقدمہ میں، ایسے مقدمات
میں بھی "مجلس تحفظ ختم نبوت" نے مسلمانوں کی وکالت کے فرائض انجام

دینے اور عدالتوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور مدارس عربیہ!

مجلس تحفظ ختم نبوت کا اصل موضوع تو قادیانی ارتداد کا استیصال تھا۔ لیکن اس تنظیم کے اکابر نے دینی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، کیوں کہ دینی مدارس ہی دین کے قلعے اور علم دین کے سرچشمے ہیں اور یہیں سے اسلام کے سپاہی تیار ہو کر کفر و ارتداد کو للکارتے ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر دینی مدارس کے جلسوں میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے خطیب اور مبلغ قوم سے خطاب کرتے اور مسلمانوں کو دینی مدارس کے قیام و استحکام کی ترغیب دیتے، بالخصوص امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری اور خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی تو دینی مدارس کے نقیب تھے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ "اپنے گاؤں میں دینی مدرسہ قائم کرلو۔ اور پھر مجھے کارڈ لکھ دو۔ میں اس کے جلسہ میں تقریر کرنے چلا آؤں گا" چنانچہ ان حضرات کی دعوت و ترغیب سے سینکڑوں مکاتب وجود میں آئے اور بعض جگہ خود مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام بھی دینی مدارس جاری کئے گئے، خصوصاً ایسے علاقے جہاں قادیانیوں کا اثر تھا، وہاں مجلس نے خود دینی مدارس جاری کئے چنانچہ ملتان، بہاولپور، سکھر، جابہ، سیالکوٹ، پرمٹ، ضلع مظفرگڑھ، اکنری، ضلع تھرپارکر، میں مجلس کے زیر اہتمام دینی مدارس چل رہے ہیں، جن کے جملہ مصارف مرکزی مجلس تحفظ ختم نبوت ادا کرتی ہے۔ قادیانیوں کے گڑھ ربوہ میں انشاء اللہ عنقریب دینی مدرسہ جاری کیا جا رہا ہے۔

شعبہ نشر و اشاعت

مجلس نے تبلیغ اسلام اور ردِ قادیانیت کے لئے نشر و اشاعت کے شعبہ پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور مجلس کے شعبہ نشر و اشاعت نے عربی، اردو، انگریزی، سندھی، پشتو اور بنگلہ میں بھی بہت سی کتابیں پمفلٹ اور اشتہارات لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے ہیں۔ مجلس کے اشاعتی کارنامہ سے تعارف کے لئے مندرجہ ذیل مختصر سی فہرست پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہوگا

- حیات مسیح، فیصلہ کمشنر بہاولپور و نزول مسیح
- التصریح فی ماتواتر فی نزول المسیح
- القادیانی و القادیانیہ
- قادیانیت، مرزائیوں کے عقیدے و ارادے
- فیصلہ مقدمہ بہاولپور و فیصلہ مقدمہ راولپنڈی
- فیصلہ مقدمہ جیمس آباد و فیصلہ مقدمہ کھوسلہ
- فیصلہ مقدمہ رحیم یار خاں
- ترک مرزائیت لنڈنی نبی
- ابوظہبی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی عظیم کامیابی
- قادیانی مذہب و سیاست
- عالم اسلام کے مسلمان مرزا کی نظر میں
- محمد قادیانی ـ دعاوی مرزا۔
- موجودہ بحران کا ذمہ دار کون؟
- غداروں کی نشان دہی و اربعین ختم نبوت
- شرائط نبوت، ربوہ ثانی جو نہ بن سکا،
- خواجہ غلام فریدؒ اور مرزا قادیانی
- ملت اسلامیہ کا موقف
- موقف الامۃ من القادیانیہ (عربی)
- مرزائیت کا اصلی چہرہ
- حکومت کے پانچ سوالوں کا جواب

- مرزا کی عبرت ناک موت
- حضرت مسیح مرزا قادیانی کی نظر میں
- قادیانیوں کی پچاس الایوں سے دو خط
- قادیانیت علامہ اقبال کی نظر میں
- فتنہ قادیانیت اور پیام اقبال
- ربوہ سے تل ابیب تک
- بیٹا جس نے باپ کا جنازہ نہ پڑھا
- قادیانیوں سے ستر سوالات
- محضر نامہ بخدمت خواجہ ناظم الدین
- 〃 〃 ایوب خاں
- 〃 〃 یحییٰ خاں
- 〃 〃 مسٹر ذوالفقار علی بھٹو
- 〃 〃 ارکان اسمبلی
- 〃 〃 ارکان صوبائی اسمبلی
- عرضداشت برائے وزیر قانون پاکستان
- مرزائیوں کی خوفناک چالیں
- قادیانی ملک اور ملت کے غدار ہیں
- نوادرات امیر شریعتؒ
- فتویٰ تکفیر قادیاں
- انگلستان میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی کامیابی
- دعاوی مرزا قادیانی
- قادیانیت نے عالم اسلام کو کیا دیا ؟
- شہادت القرآن ۔ انگریزی نبی
- ترک مرزائیت ۔ سوچنے کی بات
- حیات عیسیٰ علیہ السلام
- قادیانی دین ، کفر خالص — التبنی القادیانی
- اعدآ المسلمین فی العالم
- مرزائی یہودی فوج ہیں
- القادیانیہ ما ہی
- الہامی گرگٹ ، ایک مذہبی غدار
- آئینہ مرزائیت : حجت شرعیہ
- غیر ممالک میں قادیانیوں کی تبلیغ کی حقیقت
- قادیانیوں کی سیاسی چالیں
- مرزا جی کی ایک پیش گوئی
- تقاریر مجاہد ملت
- فتنہ قادیانیت ، قادیانی ازم
- تحریک کشمیر اور قادیانی
- مسئلہ ختم نبوت اور ہمارے اکابر
- مرزا جی کی آسان پہچان
- قادیانیت ایک خطرناک تحریک
- مرزائیوں کے خطرناک عزائم
- خدارا پاکستان کو بچائیے

اور ان کے علاوہ سینکڑوں مختلف اشتہارات جو مختلف ملکوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے ۔

مختصر یہ کہ مجلس تحفظ ختم نبوت دنیا کی مختلف زبانوں میں مسلمانوں کو فتنہ قادیانیت سے آگاہ کرنے کے لئے لاکھوں روپے کا لٹریچر چھاپ کر تقسیم کر چکی ہے اور ان کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا ترجمان ہفت روزہ " لولاک " لائلپور قادیانیت کے مد و جزر سے قوم کو آگاہ رکھتا ، اس کے مصارف کا بیشتر حصہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر دفتر ادا کرتا ہے ۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور تنظیم ملت

اہل اسلام قادیانی فتنے سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ لیکن قادیانیت کے خلاف بیشتر کام غیر منظم شکل میں ہوا۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے قیام میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ قادیانیت کے خلاف امت مسلمہ کو رشتہ تنظیم عطا کیا جائے۔ اور پوری امت کو قادیانیوں کے خلاف "بنیان مرصوص" بنا دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مجلس نے دو عظیم تر کارنامے انجام دیئے۔

اول یہ کہ ملک کے ہر شہر، ہر محلہ، ہر قصبہ اور ہر قریہ میں مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کی تنظیم میں شامل ہو کر ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کریں اور قادیانیوں کی دست برد سے ناموس رسالت کو بچانے کے لئے رشتۂ وحدت میں منسلک ہو جائیں۔ بحمد اللہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی یہ پرخلوص دعوت رائیگاں نہیں گئی۔ بلکہ مسلمانوں نے فراخ دلی سے اس پر لبیک کہی اور ملک میں مجلس کی ہزاروں شاخیں قائم ہوئیں۔

علاوہ ازیں جو حضرات اپنے مخصوص اعذار کی بنا پر مجلس تحفظ ختم نبوت کے باقاعدہ رکن نہیں بن سکتے تھے۔ انہوں نے مجلس کی دعوت سے ہمدردی و خیر خواہی اور بڑی حد تک سرپرستی کا التزام فرمایا اور مسئلہ ختم نبوت کے بیان میں کسی خوف ملامت کی پرواہ نہیں، بالخصوص آئمہ مساجد اور خطیب حضرات نے اس سلسلہ میں بہت ہی اہم خدمت انجام دی حق تعالیٰ شانہ، ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہر مسجد، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو۔ قادیانیت کے خلاف ایک "اسلامک سنٹر" ہے۔ اس طرح مجلس تحفظ ختم نبوت کی تنظیم ہر مسلمان کو جس کے دل میں قادیانیت کے خلاف ذرا بھی نفرت ہے۔ تحفظ ختم نبوت کا سپاہی سمجھتی ہے اور اس کا فخر ہے کہ ہم اولیائی، من کانوا، وا ینما کانوا۔

تمام امت مسلمہ ایک اسٹیج پر

مجلس تحفظ ختم نبوت نے دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ امت مسلمہ کے مختلف فرقوں کو ختم نبوت کے اسٹیج پر جمع کیا۔ انگریز نے اپنے دور اقتدار میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی حکمت عملی کے ماتحت، مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان شدید تلخیوں کا زہر کچھ ایسا گھول دیا تھا کہ ان کا آپس میں کسی مسئلہ پر مل بیٹھنا قادیانیوں کے نزدیک ناممکن تھا۔ مرتدین اور زنادقہ نے اس افتراق و تصادم سے خوب فائدہ اٹھایا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ صورت حال نہ صرف قائم رہی۔ بلکہ قادیانی سازشوں نے اس میں مزید اضافہ کر دیا اور مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے پاکستان پر یا کم از کم بلوچستان کے صوبے پر غلبہ و تسلط جمانے کے منصوبے کا اعلان کر دیا اور قادیانیوں کے سرکاری آرگن "الفضل" نے مسلمانوں کو یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ:۔

"ہم فتحیاب ہوں گے۔ ضرور تم مجرموں کی طرح ہمارے سامنے پیش ہو گے۔ اس وقت تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو فتح مکہ کے دن ابوجہل اور اس کی پارٹی کا ہوا۔"

("الفضل ۳ جنوری ۱۹۵۲ء")

مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں نے، جو ہمیشہ قادیانیت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے خوگر تھے۔ بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ اگر اس نازک موقع پر امت اسلامیہ کو قادیانیوں کے مکروہ عزائم اور ان کی لن ترانیوں سے آگاہ کر کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع نہ کیا گیا۔ تو چند دن بعد زمین مسلمانوں کے پاؤں تلے سے نکل چکی ہو گی اور مسلمانوں کو انگریز کے بعد قادیانی مرتدین کی غلامی کا روز بد دیکھنا نصیب ہو گا۔ اس احساس نے رہنمایان مجلس تحفظ ختم نبوت کو بے چین اور مضطرب کر ڈالا۔ اور وہ ماہی بے آب کا منظر پیش کرنے لگے۔ انہوں

نے ایک طرف تو ملک کا طوفانی دورہ کر کے جگہ جگہ جلسے منعقد کئے قادیانی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ ان کے عزائم سے متنبہ کیا اور پورے ملک کو قادیانیوں کے خلاف آتش بنا کر رکھ دیا۔

دوسری طرف انہوں نے اسلامی فرقوں کے ممتاز راہنماؤں کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا اور اتحادِ ملت کا صور پھونکا۔ اس سلسلہ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے عظیم رہنما مجاہد ملت مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ موصوف نے اپنی ذہانت و خطابت کا سارا زور امت مسلمہ کے فرقوں کو متحد کرنے پر صرف کر دیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ اپنے دل کی بے چینی کا اظہار کیا۔ ناموس رسالت کا واسطہ دیا اور مسلمانوں کو اس آفت کبریٰ سے بچانے کا لائحہ عمل ان کے سامنے رکھا۔ بات دل سے نکلی تھی، دلوں تک پہنچی۔ تمام اسلامی فرقے "تحفظ ختم نبوت کے اسٹیج پر متحد" ہو گئے اور مسلمانوں کی متفقہ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت وجود میں آئی۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت

مجلس عمل کی قیادت میں۔ جس کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادری اور سیکرٹری جناب سید مظفر علی شمسی حضرت امیر شریعت کی تجویز اور مولانا جالندھری کی تائید سے مقرر کئے گئے تھے۔ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت چلی۔ قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ارباب اقتدار کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ لیکن اس وقت اقتدار قادیانیوں کے شکنجہ میں تھا۔ اس اپاہج اقتدار نے اسلامی مطالبات کا جواب گولی سے دیا، مجلس عمل کے معزز راہنما جیلوں کی زینت بنے۔ ہزاروں مسلمانوں کو جھونک ڈالا گیا اور لاکھوں پس دیوار زنداں بھیج دیئے گئے۔ جو مہینوں نہیں سالوں تک "جرم بے گناہی" کی سزائیں کاٹتے رہے۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت بظاہر ناکامی سے ہمکنار اور تشدد کا شکار ہوئی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنے مقدس مقاصد میں پورے طور پر کامیاب رہی۔ تفصیل کی گنجائش نہیں البتہ چند اہم امور کی جانب اشارہ ضروری ہے۔

اوّل ــــ تحریک کا سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ قادیانی وزیر خارجہ مسٹر ظفر اللہ خاں کو برطرف کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک کا سیلاب نہ صرف مسٹر ظفر اللہ خاں کی وزارت خارجہ کو بہا کر لے گیا۔ بلکہ اس کے تمام محافظ بھی "خدا کی بے آواز لاٹھی" کا نشانہ بن گئے۔ خواجہ ناظم الدین سے جنرل اعظم تک کا جو حشر ہوا وہ کس کو معلوم نہیں۔؟

دوم ــــ تحریک ختم نبوت کا دوسرا اہم مطالبہ یہ تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت تسلیم کیا جائے۔ بلاشبہ یہ مطالبہ اقتدار کی عدالت میں سماعت نہ ہوا۔ لیکن تحریک کے بعد عوام کی عدالت نے قادیانیوں سے وہی سلوک کیا۔ جو ایک سازشی کا فرٹولے سے کیا جانا چاہیئے۔

سوم ــــ تحریک کا اہم مقصد پاکستان کو قادیانی سازش سے محفوظ کرنا تھا۔ بحمد اللہ یہ مقصد بھی پوری طرح حاصل ہوا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیوں کی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ وہ سازشی خلیفہ جو بڑے طنطنہ سے بلوچستان کو مرتد کرنے کا اعلان کر رہا تھا ــــ

ــــ سب نے دیکھا کہ وہ تحریک کے بعد تحقیقاتی عدالت کے کٹہرے میں اپنے بیانات کا حساب چکا رہا ہے۔

چہارم ــــ قادیانیوں کے نزدیک مسلمانوں کا اتحاد ناممکن تھا۔ لیکن ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت نے اس کو نہ صرف "ممکن" بلکہ ایک امر واقعی بنا کر رکھا یا اور قادیانیوں کو اپنے لغت "ناممکن" کا یہ لفظ حذف کر دینا پڑا بحمد اللہ جب سے اب تک مسلمان قادیانیوں کے خلاف متحد ہیں اور اس "اسلامی اتحاد" کا مظاہرہ ہر سال "ختم نبوت چنیوٹ کانفرنس" میں ہوتا ہے۔

پنجم ــــ ۵۳ء کی تحریک نے مسلمانوں کو دائمی بیداری تنظیم اور مقصد کے لئے ایک مسلسل تب و تاب عطا کر دی ہے تا آنکہ

۷ ستمبر ۷۴ء کو وہ مقصد عظیم حاصل ہوا اور قادیانیت کا کانٹا اسلام کے جسم سے نکال پھینکا گیا۔

۲۹ مئی ۷۴ء سے سات ستمبر تک

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بعد ایک سرکاری افسر نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ سے طنزاً کہا "شاہ جی! وہ آپ کی تحریک کا کیا ہوا؟" فرمایا "میں نے اس تحریک کے ذریعہ ایک "ٹائم بم" مسلمانوں کے دلوں کی زمین میں چھپا دیا ہے۔ جب وہ اپنے وقت پر پھٹے گا۔ تو قادیانیوں کو اقتدار کی کوئی طاقت تباہی و بربادی سے نہیں بچا سکے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۹ مئی ۷۴ء کو یہ "ٹائم بم" خود قادیانیوں کے ہاتھوں ربوہ ریلوے اسٹیشن پر پھٹا۔ جس سے قادیانیت کو زلزلہ آیا۔ قادیانیوں کے قصر خلافت ربوہ پر مایوسیوں کے بادل منڈلاتے رہے اور سات ستمبر ۱۹۷۴ء کو جب مطلع صاف ہوا تو پوری دنیا نے دیکھا کہ قادیانیت کا مصنوعی سورج اسلامی افق سے غروب ہو چکا ہے اور آئین پاکستان میں قادیانیوں کا نام غیر مسلم اقلیتوں کی فہرست میں سکھوں ہندوؤں اور اچھوتوں کے ساتھ درج ہے اور دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ نہ تو امریکہ سے برطانیہ تک اقتدار کی کوئی طاقت قادیانیوں کو اس انجام بد سے بچا سکی نہ یہودیوں کا سرمایہ ان کی ذلت و رسوائی کے داغ مٹا سکا۔ سچ ہے کہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔" ۵۳ء کی طرح ۷۴ء کی تحریک میں بھی مسلمانوں نے "مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بے مثال اتحاد و تنظیم کا مظاہرہ کیا۔ اور ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ "مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے صدر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نے اپنے امراض و اشغال اور ضعف و کبرسنی کے باوجود جوانمردی و اولوالعزمی سے مسلمانوں کی قیادت کی معزز ارکان اسمبلی نے قومی اسمبلی میں اہل اسلام کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور ملت اسلامیہ کے تمام اکابر و اصاغر نے اپنی ہمت و بساط سے بڑھ چڑھ کر ناموس رسالت پر جانثاری کا نمونہ پیش کیا۔ اس گئے گذرے زمانے میں یہ اتحاد، یہ تنظیم یہ اولوالعزمی اور یہ پرخلوص قربانیاں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا ہی معجزہ تھا۔ اس موقع پر مجلس تحفظ ختم نبوت نے دیگر خدمات کے علاوہ مجلس عمل کے مصارف کا بار برداشت کیا اور قومی اسمبلی پر قادیانیت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے "ملت اسلامیہ کا موقف" نامی کتاب شائع کی۔ خلاصہ یہ کہ ۷۴ء کی تحریک کی کامیابی دراصل ۵۳ء کی تحریک کا ثمرہ تھی۔ جب سے اب تک "مجلس تحفظ ختم نبوت" نے مسلمانوں کو ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر متحد رکھنے کے لئے نہایت جانفشانی اور خلوص سے کام کیا۔

ختم نبوت کا پیام ایک عالمی پیام

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کے وسائل نہایت محدود تھے۔ اس کا ضعف و ناتوانی اندرون ملک بھی کام پر قابو پانے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن مجلس کے راہنماؤں کو اولوالعزمی اسباب و وسائل سے زیادہ مسبب الاسباب پر نظر رکھ کر چلنے کی خوگر تھی۔ وہ ختم نبوت کی دعوت دنیا کے ہر اس خطے میں پھیلانا چاہتے تھے۔ جس میں کوئی انسانی آبادی موجود ہو" "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے امیر مخلص مولانا محمد علی جالندھری کی تقریروں کا یہ فقرہ بہت سے لوگوں کے حافظہ میں محفوظ ہوگا کہ:

"آج کل امریکہ چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کسی وقت چاند پر انسان آباد ہوا۔ اور اگر زمین سے کوئی انسانی قافلہ چاند پر منتقل ہوا تو جو سیارہ انسانی آبادی کے سب سے پہلے قافلہ کو لے کر جائے گا۔ اس میں انشاء اللہ مجلس تحفظ ختم نبوت" کا نمائندہ بھی ہوگا۔"

اس لئے مجلس نے قلت وسائل کے باوجود فتنہ قادیانیت کے

تعاقب کو اندرون ملک تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ عالم اسلام کو بھی مسلسل اس فتنہ سے آگاہ رکھا۔ مثلاً

الف :۔ باہر سے آنے والے اسلامی ممالک کے وفود سے ملاقاتیں کی گئیں اور فتنہ قادیانیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ چنانچہ جشن قرآن کریم راولپنڈی اور سربراہی کانفرنس لاہور کے موقعہ پر مجلس تحفظ ختم نبوت نے عالم اسلام کے ان معزز مہمانوں سے رابطہ قائم کیا انہیں قادیانیوں کی سازشوں سے باخبر کیا گیا اور اس سلسلہ میں ضروری لٹریچر فراہم کیا گیا۔

ب :۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوری نے جن کا عالم اسلام کی ممتاز علمی شخصیتوں سے دیرینہ تعارف اور دوستانہ تعلقات تھے۔ عالم اسلام کے چیدہ افراد کو اس فتنہ کے استیصال کی طرف متوجہ کیا۔

ج :۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ رابطہ عالم اسلامی (سعودی عرب) المجلس الاعلیٰ للشؤن الاسلامیہ (مصر) اور دیگر اسلامی اداروں کو توجہ دلائی اور ان سے قراردادیں منظور کروائیں۔

متعدد موقعوں پر عالم اسلام کے قائد شاہ فیصل شہید اور دیگر سربراہوں سے ملاقات کی اور انہیں اس فتنہ کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔

ہر سال جماعت کے نمائندے حج پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور دنیا بھر کے حجاج کرام سے رابطہ قائم کر کے ان کو قادیانیوں کی تحریک ارتداد سے متنبہ کرتے ہیں۔

یورپ کے مسلمانوں کی دعوت پر مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر مرحوم نے انگلینڈ، جرمنی، آسٹریلیا، امریکہ اور جزائر فجی آئرلینڈ کا دورہ کیا۔ جس سے لاکھوں مسلمان قادیانیوں کے ارتداد سے محفوظ ہو گئے۔ مولانا مرحوم کا قیام ان ممالک میں تقریباً تین سال رہا

قادیانیوں کے خلاف وہاں خوب کام ہوا۔ انگلینڈ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ خریدی گئی اور اس میں مجلس کا مرکز قائم ہوا " ووکنگ مسجد" جو قادیانیوں کا مشہور اڈا تھا۔ ان سے واگذار کر کر مسلمانوں کی تحویل میں دی گئی جزائر فجی میں تعلیم قرآن کا مدرسہ جاری ہوا۔ جو "فجی مسلم لیگ" کے زیر اہتمام بحسن و خوبی چل رہا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے ممتاز رہنما مولانا سید منظور احمد شاہ حجازی نے دو مرتبہ متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا۔ وہاں کی عدالت عالیہ اور دیگر ممتاز شخصیتوں کو قادیانی لٹریچر سے ان کی کفریہ عبارتیں پڑھ کر سنائیں۔ اور ان کے عقائد و نظریات کی تفصیل پیش کی۔ جس کے نتیجہ میں وہاں کی عدالت عالیہ نے ان کو خارج از اسلام اور سازشی گروہ قرار دیا۔

مولانا سید منظور احمد شاہ حجازی نے بحرین کا دورہ کیا اور وہاں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی شاخ قائم کی گئی۔ بحمد اللہ تمام عرب امارتوں میں قادیانی دجل و فریب کھل چکا ہے اور قادیانیوں کے خلاف مؤثر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

۷ ستمبر ۷۴ء کے فوراً بعد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نے انگلینڈ کا دورہ کیا اور وہاں قادیانیت کے خلاف کام کو مزید مؤثر و منظم کیا گیا۔

حال ہی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ نے مولانا عبد الرزاق اسکندر کی معیت میں مشرقی افریقہ کے متعدد ممالک کا دورہ کیا۔ ان تمام ممالک میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی شاخیں قائم کی گئیں اور مسلمانوں کو قادیانیوں کے خلاف منظم کیا گیا۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے عظیم رہنما مولانا عبد الرحیم اشعر، مولانا اللہ وسایا کی معیت میں "المجلس الاعلیٰ" کے صدر جناب الشیخ

حسین الحبشی کی دعوت پر انڈونیشیا تشریف لے گئے۔ وہاں مجلس تحفظ ختم نبوت" کا مرکز قائم ہو چکا ہے۔ وہاں بھی انشاء اللہ عنقریب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے گا۔

نائیجیریا اور دیگر مغربی افریقی ممالک میں بھی مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نمائندے پہنچ چکے ہیں۔ اور الحمد للہ وہ قادیانیت کے خلاف خوب کام کر رہے ہیں۔

آثار و نتائج

اکابر دیوبند کی مساعی اور "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے مقاصد و خدمات کا مختصر سا خاکہ آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ اب ایک نظر ان آثار و نتائج پر بھی ڈال لینا چاہیئے۔ جو جماعت کی جہد مسلسل اور امت اسلامیہ کے اتفاق و تعاون کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

اوّل:۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ علاوہ ازیں تقریباً تیس اسلامی ممالک قادیانیوں کو کافر، مرتد، دائرہ اسلام سے خارج اور خلاف قانون قرار دے چکے ہیں۔

دوم:۔ ختم نبوت کی تحریک پاکستان میں کامیاب ہوئی۔ تو پوری دنیا پر قادیانیوں کا کفر و نفاق واضح ہو گیا۔ اور دنیا کے بعید ترین ممالک کے مسلمان بھی قادیانیوں کے بدترین کفر سے واقف ہو گئے۔

سوم:۔ بہاولپور سے ماریشس تک بہت سی عدالتوں نے قادیانیوں کی غیر مسلم حیثیت کی بنا پر فیصلے دیئے۔

چہارم:۔ مجلس تحفظ ختم نبوت" کی تحریک نے نہ صرف پاکستان کو بلکہ دیگر اسلامی ممالک کو قادیانیوں کے غلبہ تسلط سے محفوظ کر دیا اور تمام دنیا کے مسلمان قادیانیوں کو ایک سازشی اور　ٹولہ سمجھ کر ان سے محتاط اور چوکنا رہنے لگے۔

پنجم:۔ بے شمار لوگ جو قادیانیوں کے دام ہمرنگ زمین کا شکار ہو کر مرتد ہو گئے تھے۔ جب ان پر قادیانیت کا کفر کھل گیا تو وہ قادیانیت کو چھوڑ کر دوبارہ دامن اسلام سے وابستہ ہو گئے۔

ششم:۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا ملازم پیشہ نوجوان طبقہ قادیانیوں سے بے حد مرعوب تھا چونکہ قادیانی پاکستان میں اعلیٰ مناصب پر قابض تھے۔ اس لئے وہ ایک طرف اپنے ماتحت عملے میں قادیانیت کی تبلیغ کرتے اور دوسری طرف اچھے مناصب کے لئے صرف قادیانیوں کو انتخاب کرتے۔ اس سے مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کی صریح حق تلفی ہوتی تھی اور بہت سے نوجوان اچھی ملازمت کے لالچ میں قادیانی مذہب کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ اب بھی اگرچہ کلیدی آسامیوں پر بہت سے قادیانی فائز ہیں اور ملازمتوں میں ان کا حصہ مسلمانوں کی نسبت اب بھی زیادہ ہے۔ مگر اب قادیانیوں کے سامنے مسلمان نوجوانوں کا احساس کمتری ختم ہو رہا ہے اور نوجوانوں کی طرف سے مطالبے ہو رہے ہیں کہ قادیانیوں کو ان کی حصہ رسدی سے زیادہ کسی ادارے میں نشستیں نہ دی جائیں۔

ہفتم:۔ قیام پاکستان سے ۱۹۷۴ء تک "ربوہ" مسلمانوں کے لئے ایک ممنوعہ قصبہ تھا۔ وہاں مسلمانوں کے داخلہ کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ ریلوے اور ڈاک خانہ کے سرکاری ملازموں کے لئے قادیانی ہونے کی شرط تھی۔ لیکن اب "ربوہ" کی سنگینی ٹوٹ چکی ہے۔ وہاں اکثر سرکاری ملازم مسلمان ہیں۔ ایک سال سے مسلمانوں کی نماز باجماعت بھی ہوتی ہے اور مجلس تحفظ ختم　کا مبلغ نماز جمعہ پڑھا رہا ہے۔

ہشتم:۔ قادیانی اپنے　ردوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے پر اصرار کیا کرتے تھے۔ لیکن اب مسلمانوں کے قبرستان میں ان کا دفن کیا جانا ممنوع ہے۔

نہم:۔ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور فوجی ملازمتوں کے فارموں میں قادیانیوں کو اپنے مذہب کی تصریح کرنا پڑتی ہے۔

دہم :- پاکستان میں ختم نبوت کے خلاف کہنا یا لکھنا قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جا چکا ہے۔

یازدہم :- سعودی عرب، لیبیا اور بعض دیگر اسلامی ممالک میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اور انہیں "اسلام کے جاسوس" قرار دیا جا چکا ہے۔

دوازدہم:- مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے خلاف لب کشائی کی پاکستان میں اجازت نہیں تھی۔ مگر اب صورتحال تبدیل ہو چکی ہے۔

سیزدہم :- قادیانی جو بیرونی ممالک میں یہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ کہ پاکستان میں قادیانیوں کی حکومت ہے اور دارالخلافہ "ربوہ" ہے وہ اس جھوٹ پر نہ صرف پوری دنیا میں ذلیل ہو چکے ہیں، بلکہ خدا کی زمین اپنی فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہو رہی ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور بیت المال

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کے وسیع ترین تبلیغی نظام کا ایک مختصر خاکہ آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جماعت کے لاکھوں روپے کے مصارف کا انتظام کیسے ہوتا ہے۔ جماعت کے بیت المال کے لئے کوئی مستقل ذریعہ حاصل نہیں، اس نے محض حق تعالیٰ شانہ، کے خزانہ عامرہ پر توکل کرتے ہوئے ایک روپیہ یومیہ کے میزانیہ سے اپنا کام شروع کیا اور جوں جوں جماعت کا ٹھوس کام سامنے آتا گیا، حق تعالیٰ شانہ نے عام مسلمانوں کی خدمت و تعاون کی طرف متوجہ فرمایا اور وہ تمام حضرات جن کو مسئلہ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت سے دلچسپی تھی انہوں نے اپنے صدقات جماعت کے بیت المال میں جمع کرانے شروع کئے، گویا جماعت کا کل سرمایہ توکل علی اللہ اور مسلمانوں کا دست تعاون ہے۔

جماعت نے بیت المال کے نظام میں جن امور کو ملحوظ رکھا ان کا خلاصہ یہ ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت میں جس قدر کارکن کام کرتے ہیں ان کے قوت لایموت کا انتظام جماعت کرتی ہے اور ان پر یہ پابندی عائد ہے کہ کسی مسلمان کی جانب سے ایک پیسہ بھی انہیں دیا جائے، وہ جماعت کے بیت المال کی رسیدیں اور وہ پیسہ بیت المال میں جمع کرائیں، جماعت کے مبلغین اور کارکنوں نے اس سلسلہ میں جس بے مثال قربانی اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ اس کی نظیر موجودہ دور میں مشکل سے ملے گی۔

اہل اسلام کی جانب سے زکوٰۃ، صدقات، صدقہ فطر، چرم قربانی اور دیگر عطیات کی شکل میں جو امداد جس مد میں دی جاتی ہے بیت المال کی جانب سے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ احتیاط کے ساتھ اس مد میں خرچ کی جائے۔

چنانچہ اسی بیت المال سے مبلغین کے مشاہرات، دفاتر کے اخراجات، مدارس اور طلبہ کی ضروریات، اندرون و بیرون ملک کا تبلیغی نظام، دنیا کی مختلف زبانوں میں تحریر کردہ اور شائع کردہ لٹریچر کی اشاعت اور بیرون ملک جانے والے وفود کے لوازمات پورے کئے جاتے ہیں۔ گویا جس نے جماعت کو ایک روپیہ بھی دیا وہ ان تمام شعبوں میں حصہ دار ہے۔

جماعت کی جانب سے ہر سال ایک روئیداد شائع ہوتی ہے جس میں گذشتہ سال کی کارکردگی اور آئندہ لائحہ عمل کے ساتھ ساتھ تمام عطیہ دہندگان کے نام اور ان کی رقوم کی تصریح کی جاتی ہے نیز مصارف کی تفصیل بھی پیش کی جاتی ہے۔ تاکہ ہر مسلمان یہ اطمینان کر سکے کہ آیا اس کی بھیجی ہوئی رقوم بیت المال میں جمع ہوئی یا نہیں؟

آمد و صرف کے حسابات باقاعدہ رجسٹرڈ کئے جاتے ہیں اور ہر سال سرکاری آڈیٹر سے حسابات کی پڑتال کرائی جاتی ہے۔

ہر مسلمان کو اس امر کی اجازت ہے کہ جب چاہے جماعت کے حسابات کا معائنہ کر سکتا ہے۔

گورنمنٹ پاکستان نے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو ایک تبلیغی و فلاحی اور فلاحی ادارہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے بیت المال میں داخل کئے جانے والے جملہ عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

لاکھوں روپے کا میزانیہ ہونے کے باوجود جماعت کے کارکنوں کو اپنے فقر و افلاس پر ناز ہے۔ ہم اپنے اسلاف کی اس دولت فقر کی نمائش کو گناہ سمجھتے ہیں۔

آئندہ عزائم اور جماعت کا لائحہ عمل

بہت سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا لہٰذا ختم نبوت کا مشن اب ختم ہو چکا" لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ جماعت ختم نبوت کا مشن ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے دائرہ کار اور اس کی ذمہ داریوں میں کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب تک جماعت کی بیشتر توجہ اندرون ملک قادیانیوں کے رد و تعاقب کی طرف تھی۔ مگر ستمبر ۱۹۷۴ء کے بعد پوری دنیا جماعت ختم نبوت کی دعوت و تبلیغ کا میدان بن چکا ہے۔ جہاں جہاں قادیانی پہنچے ہیں۔ وہاں وہاں سے جماعت کے امیر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو تقاضوں پر تقاضے آ رہے ہیں۔ کہ یہاں ختم نبوت کے کام کی ضرورت ہے۔ اس لئے ۷۴ء سے پہلے اگر جماعت کو بیسیوں کارکنوں کی ضرورت تھی تو اب سینکڑوں کی نہیں ہزاروں کی ضرورت ہے۔ پہلے اگر اس کا کام ہزاروں میں چل سکتا تھا۔ تو اب لاکھوں نہیں کروڑوں کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ بہر حال پہلے بھی خدا کے بھروسے یہ جماعت چل رہی تھی اور آئندہ بھی اس کا یہی سہارا ہے تاہم مسلمانوں کے سامنے جماعت کے نئے مسائل اور نئے تقاضوں کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ ختم نبوت کی تحریک پوری دنیا میں پھیل چکی ہے اور کم و بیش ہر جگہ قادیانیوں سے وہی معرکہ گرم ہے جو یہاں ہمارے ملک میں تھا۔ اس لئے فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری دنیا کے ممالک میں۔ اور بالخصوص ان ممالک میں جہاں قادیانیوں کا زیادہ تسلط ہے ختم نبوت کے مضبوط مرکز قائم کئے جائیں اور چونکہ باہر کی دنیا قادیانیوں کی کتابوں سے واقف نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ یہاں سے کثیر تعداد میں مبلغ بھیجے جائیں اور ان کے ساتھ ضروری لٹریچر بھی دیا جائے۔

۲۔ اسی طرح یہ امر بھی فوری طور پر توجہ طلب ہے کہ اردو، عربی، انگریزی فارسی، فرانسیسی اور افریقی و ایشیائی ممالک کی معروف زبانوں میں۔ خصوصاً ان ممالک کی زبانوں میں جہاں قادیانی ہیں۔ رد قادیانیت پر لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے۔ یہ لاکھوں روپے کا منصوبہ ہے۔ مگر جماعت کو توکلاً علی اللہ یہ امید ہے کہ وہ ۷۶ء میں تقریباً ستر ہزار روپے کا اشاعتی لٹریچر تیار کر کے بیرونی ممالک میں بھیج سکے گی۔

۳۔ ایک اہم ترین ضروری بات یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے ذہین فطین نوجوانوں کو پاکستان لایا جائے اور انہیں قادیانیت کی تعلیم دے کر ان کے ممالک میں تبلیغ ختم نبوت کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ملتان ایک عالمی مرکز تبلیغ زیر تعمیر ہے۔ جس میں انشاء اللہ ان تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

۴۔ پاکستان میں قادیانیوں کی سازشی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ اور زیادہ گہری ہوئی ہیں۔ اس لئے جماعت کی مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ لاہور اسلام آباد اور بالخصوص ربوہ میں ختم نبوت کے مراکز تعمیر کئے جائیں۔ جن میں جامع مسجد ختم نبوت لائبریری، اور ختم نبوت درس گاہ کا انتظام کیا جائے۔ یہ انتظام اس لئے ضروری ہے کہ قادیانیوں کی سرگرمیوں پر قریبی رابطہ کے ذریعہ کڑی نظر رکھی جا سکے۔

۵۔ ختم نبوت کے کارکنوں کے درمیان عالمی سطح پر مواصلاتی روابط تعلقات کو مزید منظم کرنے کی بھی فوری ضرورت ہے۔ تاکہ کسی ملک اور کسی خطے میں قادیانیوں کی ارتدادی و سازشی سرگرمیوں کا سراغ ملے تو اس کا ریکارڈ مرتب کیا جا سکے۔

ملّتِ اسلامیہ کی فتح

اسلام آباد، ستمبر (اب پ) قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ صادر کیا ہے اس کی روشنی میں آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات کی ترمیم کے بعد یہ صورت ہو گی ــــــ آرٹیکل نمبر ۲۶۰ جو شخص خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی ختم نبوت پر مکمل ایمان نہیں لاتا یا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انداز میں نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا کسی ایسے مدعی نبوت یا مذہبی مصلح پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ از روئے آئین و قانون مسلمان نہیں ہے۔ آرٹیکل نمبر ۱۰۶ کلاز نمبر ۳۔ اس میں ملبوں کے لفظ کے بعد قادیانی یا لاہوری گروپ کے جو اشخاص "احمدی" کہلاتے ہیں کے جملے کا اضافہ کر دیا گیا۔ اضافے کے بعد کلاز نمبر ۳ کی یہ صورت ہو گی صوبائی اسمبلیوں میں بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کی کلاز نمبر ۱ میں دی گئی نشستوں کے علاوہ ان اسمبلیوں میں عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں، بدھوں، پارسیوں اور قادیانیوں یا شیڈول کاسٹس کے لیے اضافی نشستیں ہوں گی۔ آئین میں دوسری ترمیم کے بل کا متن: قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے۔ لہٰذا بذریعہ ہٰذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے مختصر عنوان اور آغاز نفاذ ایکٹ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔ ۲۔ فی الفور نافذ العمل ہو گا۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا۔ دفعہ ۱۰۶ کی شق ۳ میں لفظ اشخاص کے بعد الفاظ اور قوسین اور قادیانی یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) درج کیے جائیں گے۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق نمبر ۲ کے حسب ذیل نئی شقیں درج کی جائیں گی۔ نمبر ۳ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو آخری نبی ہیں کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو حضرت محمدؐ کے بعد کسی بھی مفہوم یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تصور کرتا ہے وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔ بیان اغراض: جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے کہ اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر شخص جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا حضرت محمد صلعم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

(عبد الحفیظ پیرزادہ وزیر انچارج)

ادارہ مرکزیہ - دعوت و ارشاد - چنیوٹ پاکستان

زیرِ سرپرستی : شیخ الاسلام حضرۃ مولانا محمّد یوسف بنوری دامت برکاتہم

مندرجہ ذیل شعبوں کی تکمیل و ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

شعبۂ دار المبلغین: جس کے تحت علماء کرام کو قادیانیت اور دیگر فرقِ باطلہ کے بارے میں تربیت دی جائے گی اور بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لیے بھی علماء کو تیار کیا جائے گا۔

شعبۂ نشر و اشاعت: جس کے تحت قادیانیت اور دیگر فرقِ باطلہ کے عقائد و نظریات اور گمراہ کن پراپیگنڈہ کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اس شعبہ کی تعمیر تکمیلی مراحل میں ہے اور اس کے تحت "مطبع ارشاد" کے نام سے جدید ترین پریس کا منصوبہ طے ہو چکا ہے۔

شعبۂ تصنیف و تالیف: جس کے تحت اردو، عربی، انگلش اور دیگر زبانوں میں لٹریچر مہیا کیا جائے گا اور وسیع تر بنیادوں پر بہت بڑی لائبریری قائم کی جائے گی۔

ربوہ کے پڑوس میں تحفظ عقیدۂ ختمِ نبوّۃ کا یہ عظیم ادارہ

تکمیل و ترقی کی راہ میں قدم قدم پر آپ کے تعاون و سرپرستی کا محتاج ہے۔

منجانب

خادمِ نبوّت منظور احمد چنیوٹی ناظم ادارہ مرکزیہ دعوت و ارشاد چنیوٹ پاکستان

قطب العالم مُرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ چشتی مُہاجر مکی قدس سرّہٗ (م ۱۳۱۰ھ)

اور

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرّہٗ (م ۱۳۲۳ھ)

حضرۃ سید نفیس الحسینی

"شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرّہٗ (م ۱۳۱۰ھ) نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو بیعت ہونے کے آٹھ ہی روز بعد بشارت غیبی کی بنا پر فرمایا: "میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی ہے، وہ آپ کو دے دی، آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے:

حضرت قطب ارشاد گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اُس وقت بہت ہی متعجب ہُوا کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ وہ کون سی چیز ہے، جو اعلیٰ حضرت کو حق تعالیٰ نے دی تھی اور مجھے عطا ہوئی۔ آخر پندرہ برس کے بعد معلوم ہُوا کہ کیا تھا۔" (امداد المشتاق صـ۲۱)

"جنگ شاملی کے بعد انگریزی حکومت نے شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرّہٗ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلے کا اعلان بھی کر دیا۔ اعلیٰحضرت نے ایک رُوحانی اشارے کی بنا پر وطن کو خیرباد کہی اور بہ نیت حرمین شریفین گھر سے باہر نکلے۔ چونکہ حضرت اقدس گنگوہیؒ سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔ اسلیے الوداعی ملاقات کے لیے گنگوہ تشریف لے گئے۔" (امداد المشتاق صـ۲۷)

"سب سے زیادہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو اپنے رُوحانی باپ اعلیٰحضرت حاجی صاحبؒ کی مفارقت اور ہندوستان میں یتیم رہ جانے کا غم تھا جو آپ کو کبھی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ راتوں آپ کو اس رنج میں نیند نہ آتی اور دنوں آپ اس دُھن میں رہتے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت کی ایک دفعہ اور زیارت کر لوں، مگر جائیں تو جائیں کہاں اور ملیں تو کس طرح ملیں نہ اعلیٰحضرت کی کوئی جائے قیام معیّن نہ بحالت روپوشی کسی جگہ کا تعیّن۔ آخر شدہ شدہ آپ کو پنجلاسہ (پنجاب) کا پتہ چلا اور آپ بسم اللہ کہہ کر گنگوہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ راتوں چلتے دنوں چھپتے، خاردار جنگل پیدل قطع کرتے پنجلاسہ پہنچے۔ اعلیٰحضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ہر چند اصرار کیا کہ بندہ کو ہمرکاب لے چلیں مگر اعلیٰحضرت نے نہ مانا اور یہ فرمایا کہ اسی طرح خدا کا حکم ہے۔ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ آپ کو وہاں سے

رخصت فرمایا۔ حضرت مولانا بادل ناخواستہ الفراق الفراق کہتے ہوئے نکلے اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اعلیٰحضرت نے تسلی و تشفی دی اور فرمایا "میاں رشید احمد! تم سے تو حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں، گھبراؤ مت۔ ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور مراتب میں ترقی دے۔ اس کے بعد دیر تک چھاتی سے لگائے رکھا اور آخر کار چند ناصحانہ شفقت اور مربیانہ محبت کے انداز پر خود بھی چشم نم ہوئے اور مولانا کو بھی رلایا۔" (تذکرۃ الرشید ص ۹۵ ج ۱)

"جرم بغاوت کی پاداش میں گرفتاری سے رہائی پائے کامل تین سال گزر چکے تھے۔ اپنے شیخ و مرشد اعلیٰ حضرت مخدوم الکل حاجی امداد اللہ شاہ صاحبؒ سے چوتھا سال تھا۔ آپ کی محبت شیخ جو قدرت نے آپ کے دل میں ودیعت رکھ دی تھی دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ گو آپ تعلیم و تعلم کے دینی شغل سے اپنے دل کو بہلاتے اور پاک خدا کی یاد میں رات دن گزارتے تھے مگر مرشد العرب والعجم کی زیارت و پابوسی کا شوق اور حاضری حرم محترم کا غلبہ اشتیاق آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ یہ زمانہ آپ پر عسرت کا تھا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ فقر کے امتحان میں مبتلا کیے گئے تھے۔" (تذکرۃ الرشید ص ۲۰ ج ۱)

۱۲۸۰ھ کو ایک چیدہ و برگزیدہ قافلے کے ساتھ بصد اشتیاق سفر حرمین شریفین اختیار فرمایا۔ بلدۃ الحرام میں حج و عمرہ کے علاوہ اپنے شیخ برحق مرشد العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے فیض صحبت کی جو جو نعمتیں آپ نے حاصل فرمائیں، ان کا کسی کو علم ہی کیا ہے جو بیان کی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ جب تک آپ مکہ معظمہ میں مقیم رہے، فرط محبت کے باعث آپ کو اعلیٰحضرت نے اپنے ہی پاس رکھا۔ حج کے لیے عرفات جاتے وقت آپ کا اونٹ اعلیٰحضرت نے اپنے اونٹ سے متصل کیا اور منیٰ و مزدلفہ میں آپ کو اپنے ساتھ ہی لگائے رکھا۔ آپ نے مکہ معظمہ میں خواب دیکھا کہ ابدال جیسے اہل خدمت اولیا کا ایک گروہ جا رہا ہے اور آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے لاحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں جا ملا۔ صبح کو یہ خواب اعلیٰ حضرت سے ذکر کیا تو مسکرا کر فرمانے لگے: "پھر اب کیا چاہتے ہو، لاحق ہو گئے۔" بلدۃ الحرام ہی میں آپ نے یہ خواب دیکھا کہ آپ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں سے خون جاری ہے۔ دو سے بکثرت اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ کم۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے یہ خواب حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے بیان کی تو یہ تعبیر دی کہ تمہاری چاروں نسبتیں جاری ہوں گی دو کا جریان بہت زیادہ ہوگا۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۰۶ ج ۱)

پہلے سفر حج میں آپ کا قیام حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں دو سال رہا۔ دوسرا سفر حجاز ۱۲۹۴ھ میں کیا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی شریک سفر تھے: "یہ منتخب روزگار قافلہ شب کے وقت مکہ معظمہ پہنچا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کو اپنے لاڈلے اور چاہیتے پیارے ہندی قافلے کے جدہ سے روانہ ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ باوجود ضعف و نقاہت کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر سے باہر چلنے کی خواہش پوری کیے بغیر نہ رہ سکے۔ خدا جانے کس وقت کے منتظر کھڑے اور راستہ کی جانب آنے والے قافلہ کا انتظار فرما رہے تھے جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت پٹکے سے کمر باندھے ہوئے فصیل کے پاس کھڑے تھے۔ شیخ کے شیدا اور مرشد کے جانثار خدام اسی وقت سواری سے نیچے اتر پڑے اور بغلگیر ہو کر خوب دل کھول کر ملے۔ شب اعلیٰ حضرت کے مکان پر قیام ہوا۔ صبح کو سارے مجمع کی دعوت بھی انہی کے دسترخوان پر ہوئی۔ ہر چند حضرت گنگوہیؒ نے عرض کیا کہ آدمی بہت ہیں مگر اعلیٰ حضرت نے یہ فرما کر کہ میری خوشی اسی میں ہے کہ

سب احباب میرے یہاں کھاویں" مجبور فرمادیا۔ (تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۲۲۸)

اس سفر مقدس سے واپسی ۱۲۹۵ھ میں ہوئی۔ ۱۲۹۹ھ میں شورشِ شوق و محبت نے پھر سفر پر مجبور کیا اور تیسری مرتبہ مرشد العرب والعجم شیخ الکل اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی زیارت و شرفِ ملازمت سے مشرف و کامیاب ہوئے۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۴۴ ج ۱)

یہ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ کا آخری سفر مبارک تھا۔ اس کے بعد خط و کتابت ہی سے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے سلسلۂ راہ و رسم محبت و عقیدت قائم رہا۔

مکاتیب رشیدیہ کے ابتدائی صفحات میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے بارہ گرامی نامے حضرت گنگوہیؒ کے نام ہیں۔ تلخیص پیشِ خدمت ہے۔ القابات اور دعائیں ملاحظہ ہوں۔

مکتوب ۱ بخدمت فیض درجت سراپا خیر و برکت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب عمت فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمد للہ فقیر بفضلہ تعالیٰ مع الخیر ہوں اور آپ کی صلاح فلاح دارین کی دعا کرتا ہوں ...... اللہ تعالیٰ فقیر کا اور آپ کا خاتمہ بالخیر فرماکر اپنے صدیقین و مقربین کے زمرے میں داخل فرماوے ..... ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی ہے اور میں اپنے سب احباب کی محبت کو اپنے لیے وسیلۂ نجات جانتا ہوں اور یقین جانو کہ مجھ کو دنیا میں کسی سے ملال و کدورت نہیں ہے تو پھر اپنے عزیزوں سے جو اس گنہگار کے متبعین کے حامی ہیں کیونکر کدورت رکھوں گا۔ اول تو کسی کو مقدور نہیں کہ نیچ کے سامنے آپ کے خلاف زبان ہلاوے۔ کیونکہ اس بارہ میں اس کو سوائے میرے ملال و رنج کے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرے جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے تو اس کے خلاف کبھی کوئی تحریر آپ کے پاس جائے تو اس کو باور نہ کرنا۔ عزیزم دل محلِ ایمان و معرفت و محبت ہے نہ محل کینہ و کدورت۔ آپ کی دعا میرے حق میں مقبول ہے دعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ اب اس اخیر زمانہ میں میرے دل کو نورِ محبت و ایمان و معرفت سے نور علیٰ نور فرماوے۔

(مکاتیب رشیدیہ مطبوعہ میرٹھ طبع اول بحوالہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۲)

مکتوب ۲ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت جامع علوم شریعت و طریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ مورخہ یازدہم ذیقعدہ بذریعہ رجسٹری ڈاک ورود مسرور لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر قرب مراتب و درجات عالیات عطا فرماوے اور آپ کی ذات بابرکات کو ذریعہ ہدایت خلق فرماوے۔ آمین۔ اگرچہ بظاہر آپ کی علالت سے بہت بڑا نقصان معلوم ہوا اور خصوصاً حدیث شریف کے درس موقوف ہوجانے کا بہت افسوس ہے مگر باطنی و حقیقت میں اس کے نتائج و برکات بہت بڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دارین میں اس کا نعم البدل عطا کرے .... الحمد للہ آپ کی کیفیات باطنی و حالات مقدسہ سن کر کروڑ کروڑ شکر اللہ تعالیٰ کا بجا لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات اور قرب کو ترقی بالائے ترقی بخشے اور ہم بے ہنروں کی نجات کا وسیلہ بناوے .... آپ تکلیف فرماکر اپنی خیر و عافیت سے مسرور فرماتے رہیں کہ خاطر کو تعلق رہتا ہے .... والسلام۔ از مکہ معظمہ محلہ حارۃ الباب ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ بعد لکھنے اس خط کے مسرت نامہ مورخہ دوم شوال ملا۔ کل کیفیت معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فیض ظاہر و باطن سے ہمیشہ خلق کو مستفیض فرماوے۔ آمین۔ عزیزم امیر شاہ خان صاحب آپ کے نہایت معتقد اور نہایت ارادت و محبت رکھتے ہیں۔ کچھ وجہ ایسی

ہو گئی کہ چلتے وقت آپ کی زیارت سے مستفیض نہ ہو سکے۔ آپ ستہ یقین کی وجہ سے مجھ سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ اس پر کچھ شبہ نہیں کہ تم عزیزوں کے کمالات کی وجہ سے فقیر کے نقصان و عیوب چھپ گئے ہیں۔ تمھاری محبت نے اکسیر کا کام کیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ قیامت میں بھی ایسی ہی شاری کی اُمید ہے۔ تمھاری محبت کا بڑا وسیلہ ہے۔ زیادہ والسلام

ص ۳۰۲، ۴۰ (مورخہ بست و ششم ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ)

مکتوب ۳ | از فقیر امداد اللہ عفی عنہ، بخدمت فیضدرجت سراپا خیر و برکت سراسر محبت عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ: السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ آپ کے دو قطعہ خط بدست عزیزم امیر شاہ خانصاحب وصول ہوئے۔ کیفیت مندرجہ معلوم ہونے سے بجائے خوشی قلب پر صدمہ شدید پہنچا۔ اعنی عزیزم برخوردار محمد محمود احمد صاحب کے انتقال پر ملال کا حال دیکھ کر بہت ہی رنج ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہر چند صبر کام میں لایا تاہم آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ آخر بجز صبر چارہ نہ دیکھا۔ لاچار صبر کیا۔ فقیر خوب جانتا ہے کہ ایسے ہونہار نونہال کے انتقال کا صدمہ جو آپ کو ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔ کیوں نہ ہو برخوردار موصوف بصفات حمیدہ ایسا ہی تھا جس نے سنا وہی غمگین اور نالاں ہوا۔ کیونکہ یہ دارِ فانی ہے یہاں ہر روز چل چلاؤ ہے۔ کوئی آج کوئی کل چلا جا رہا ہے۔ آپ اس بات کا خیال کرکے صبر فرماویں، سب کو وہاں جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عنایت فرما کر اس رنج کو خوشی سے مبدل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ برخوردار عزیز مسعود احمد صاحب کو بھی توفیق خیر عنایت فرمائے کہ آپ کی یادگار و جانشین رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا تمہارا خاتمہ بالخیر کرے۔ فقط از مکہ معظمہ (۲۴ رجب ۱۳۱۰ھ) (مہر)

مکتوب ۴ | از فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ بخدمت فیضدرجت سراپا خیر و برکت سراسر خلوص و محبت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ: السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے۔ آپ کے واسطے دعا بخیر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے عشق و محبت و رضا و تسلیم میں رکھ کر آپ کا فیض جاری کرکے حسن خاتمہ نصیب فرماوے ...... ص ۵۱ (از مکہ مکرمہ ۲۲ رمضان ۱۳۱۰ھ) (مہر)

مکتوب ۵ | از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیضدرجت سراپا خیر و برکت عارف باللہ عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد زید عرفانہٗ: السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی صحت و سلامتی خدا تعالیٰ کی جناب سے مطلوب ....

عزیزم مولوی قاری حافظ احمد صاحب مکی آپ کی خدمت میں حاضر ہونگے آپ اپنی جماعت سے خیال کرکے دُعا فرماویں۔ یہ قاری صاحب آپ سے طالب دُعا ہیں، آپ دُعا فرماویں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا آپ کا حُسن خاتمہ فرماوے۔ آمین۔ ص ۵ (مہر) (از مکہ مکرمہ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ)

مکتوب ۶ | جامع فضل و کمال جناب محبی مخلصی عزیزی مولوی رشید احمد صاحب زاد اللہ عرفانکم۔ پس از دُعا ترقی درجات واضح رائے محبت پیرائے باد کہ آپ کا راحت و محبت نامہ عین حالت انتظاری میں وصول ہو کر باعث اطمینان خاطر ہوا۔ ایک مدت سے تعلق قلبی اس طرف متعلق تھا جویائے احوال آں مخلص تھا۔ خدا نے کیا راحت نامہ محبت شامہ کاشف حالات ہوا۔ عزیزم بے شک آپ کا عُذر عدم ارسال نامجات نہایت ہی قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو زائل فرما کر صحت کلی عطا فرماوے۔ آمین۔ میری بھی یہی حالت ہے کہ مضامین دل میں جوش مارتے ہیں مگر بوجہ ضعف و نقاہت بدنی و بصری کے لکھنے پڑھنے سے معذوری ہے اور غیر سے اپنا اظہار مطلب کرانا اور زیادہ دشواری ہے۔ چونکہ ہر مضمون اس قابل نہیں ہوتا کہ ہر ایک سے کہا جائے۔ بدیں وجہ ساکت ہو کر

بیٹھ جاتا ہوں اور ارسال خطوط سے معذور رہتا ہوں مگر تعلق قلبی محبت باطنی ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ آپ کے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔ خدا قبول فرماوے۔ من کل الوجوہ صحت مرحمت فرماوے اور فیضان آنعزیز سے خلق اللہ کو فیضیاب فرماوے۔ آمین۔ ص ۱۰۵

مکتوب ۷ از طرف فقیر امداد اللہ عفی عنہ۔ بخدمت بابرکت فیضدرجت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب سلمہ۔ بعد سلام مسنون کے واضح رائے ہو کہ عزیز مولوی مسعود علی صاحب کا خط ۲۹ جمادی الاوّل کا ارسال ہُوا۔ کل ۲۲ جمادی الثانیہ کو پہنچا۔ اُس سے حال پُر ملال انتقال اہلیہ آں عزیز معلوم ہُوا۔ کمال صدمہ ہُوا۔ افسوس صد افسوس کہ آپ پر صدمات متواترہ کے ہجوم نے یکداغ نیک باشد و داغ دگر نہندؔ ۔ تعی امتحان اسی کا نام ہے اور ایسے مواقع میں ثابت قدم رہنا آپ ہی جیسے بزرگواروں کا کام ہے۔ آپ کو صبر و شکر کی تعلیم کی حاجت نہیں کیونکہ آپ مجسّمہ صبر و سراپا شکر ہیں۔ ہاں یہ دُعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو کمال اجر عطا فرماوے اور آپ کو تا دیر اپنے بچوں کے سر پر زندہ رکھے اور آپ کے فیوض سے اہلِ اسلام کو مستفیض کرے۔ ایں دُعا از ما و از روح الامین آمین باد۔ مرحومہ کے لیے دُعا مغفرت اور چند طواف کر دیے گئے۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرماوے .... ص ۱۰۶

(المرقوم ۲۳ جمادی الثانی)

مکتوب ۸ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیضدرجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی ادام اللہ فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ...
...... اللہ تعالیٰ آپ کی ذات بابرکات کو باعث استقامت خلق و وسیلۂ ہدایت کرے .... آپ کی صحت خلق اللہ کے واسطے بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بعافیت تمام وصحیح و سلامت رکھے .... فقیر نے پہلے بھی تکلیف دی ہے کہ اپنی خیریت مزاج سے جلد جلد مسرور و ممتاز فرماتے رہیں کہ دریافت خیریت کے واسطے ہمیشہ دل کو تعلق رہتا ہے .... اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلاوے اور مارے اور فقیر کا بھی وقت قریب ہے۔ دُعا حسن خاتمہ سے مدد فرماویں .... ص ۱۰۷ (مُہر)

(از مکہ معظمہ پنجم شوال ۱۳۰۹ھ)

مکتوب ۹ مُحبّی و مُخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ بعد سلام سنّت الاسلام ...... فقیر کو ضعف و نقاہت بہت ہے ...... غرض پا برکاب ہے۔ سب وجہ سے دُعا کا محتاج ہے کہ خدا تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین" ص ۸

(العبد الضعیف فقیر امداد اللہ عفی عنہٗ) (مُہر)

مکتوب ۱۰ "مُحبّی و مُخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ بعد سلام مسنون المرام۔ آنکہ خط پہنچا۔ الحمد للہ کہ آپ کو صحت یابی حاصل ہوئی۔ آپ کی صحت سے ایک عالم کو فائدہ ہے ......: دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے" ص ۸

(از عبد ضعیف امداد اللہ عفی عنہٗ) (مُہر)

مکتوب ۱۱ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ۔ بخدمت بابرکت فیضدرجت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔

سلامٌ علیکم چو در خاطری　　گر از چشم دوری بدل حاضری

دُعائے ترقی درجات عالیات دوجہانی مشہور ضمیر منیر باد ...
..... برائے ہمیں عزیزان و مُحبّان دُعا خیر میکنم شما ہم دُعا فرمایند کہ

خاتمہ ما وشما بخیر شود آمین۔ ص۱

مکتوب ۱۲ عشق بر مرده نباشد پائدار عشق بر حی و بر قیوم دار

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ .... مطلب ضروری یہ ہے کہ فقیر کی وہ مثنوی شریف جو ایک زمانہ سے فقیر کے مطالعہ و درس میں تھی اور اپنے خیال کے موافق اس پر کچھ مطالب و فوائد درج کیے تھے۔ اس دفعہ اس مثنوی کو مولوی عبداللہ انبیٹھوی بوسیلہ عزیزم مولوی ابواحمد صاحب بمبئی کے طبع کرانے کی غرض سے فقیر سے لے گئے ....

.... فقیر نے سیٹھ صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ مثنوی کا طبع ہونا قطعاً موقوف کر کے وہ دونوں مثنوی آپ کی خدمت میں مقام گنگوہ پہنچا دیں ......

آپ بذریعہ حافظ قمر الدین یا کسی اور معتبر شخص کے ذریعہ سے فقیر کی مثنوی کو سہارنپور سے اپنے پاس منگا کر رکھ لیں۔ اس بارہ میں توقف نہ فرمادیں۔

ص۱ (از مکۃ معظمہ دہم رمضان شریف روز دوشنبہ ۱۳۱۰ھ)

(مہر)

ذیل میں مرشد العرب والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک عریضہ حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کا بھی ملاحظہ ہو۔

۱۴۔ حضور نے جو بندۂ نالائق کے حالات سے استفسار فرمایا ہے۔ میرے ماوائے وارین، اس ناکس کے کیا حالات اور کس درجہ کی کوئی خوبی ہے جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں۔ بجد اسخت شرمندہ ہوں، کچھ نہیں ہوں مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں، بناچاری کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ حضرت مرشدی! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور رہے، غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے اس سال تک وہ سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انھوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہیں اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جائے اور حضرت کے اقدام نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ جذبہ قلب میں غیر حق تعالیٰ سے نفع و ضرر کا التفات نہیں واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی کے مدح و ذم کی پرواہ نہیں رہی اور ذام و مادح کو دونوں برابر جانتا ہوں اور معصیت کی طبعاً نفرت اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت یادداشت بزرگ کا ہے جو شکرانہ از حضرت سے پہنچا ہے پس زیادہ عرض کرنا گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ یا اللہ! معاف فرما کہ حضرت کے ارشاد سے تحریر ہوا ہے۔ جھوٹا ہوں، کچھ نہیں ہوں۔ تیرا ہی ظل ہے۔ تیرا ہی وجود ہے۔ میں کیا ہوں۔ کچھ نہیں ہوں اور وہ جو میں ہے وہ تو ہے اور میں اور تو خود شرک در شرک ہے استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اب عرض ہے معذور فرما کر قبول فرمادیں۔ والسلام ۱۳۰۶ھ

(مکاتیب رشیدیہ مطبوعہ میرٹھ ص۱)

قطب العالم شیخ العرب والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ اپنی شہرۂ آفاق تالیف ضیاء القلوب کے آخر میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہما (المتوفیٰ ۱۲۹۷ھ) کو خلافت عظمیٰ سے سرفراز کر کے اپنا جانشین نامزد فرماتے ہیں۔ یہ الہامی تحریر قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں:

ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من و من بمقام اوشان شدم و صحبت اوشان را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیض یاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ (ضیاء القلوب) نوشتہ شد در نظر شان تحصیل نمایند۔ انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نخواہند ماند۔ اللہ تعالیٰ در عمر شاں برکت دہد و از تمامی نعماء عرفانی و کمالات قربیت خود مشرف گرداناد و بمراتب عالیات رساناد و از نور ہدایت شاں عالم را منور گرداناد و تا قیامت فیض اوشان جاری داراد و بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔

جو صاحب اس فقیر سے محبت عقیدت ارادت رکھیں مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہیں، میری جگہ بلکہ مدارج میں مجھ سے فوق سمجھیں۔ اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہے کہ میں اُن کی جگہ پر اور وہ میری جگہ پر ہیں اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھیں کہ ان کے ایسے لوگ اس زمانے میں نایاب ہیں اور ان کی خدمت بابرکت سے فیضیاب ہوتے رہیں اور سلوک کے طریقے جو اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھے گئے ہیں، ان کے حضور حاصل کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں برکت دے اور معرفت کی تمام نعمتوں اور اپنی قربت کے کمالات سے مشرف فرمائے اور بلند رتبوں تک پہنچائے اور ان کے نورِ ہدایت سے دُنیا کو روشن کرے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں قیامت تک اُن کا فیض جاری رکھے۔

(ضیاء القلوب صفحہ ۶۰ مطبع مجتبائی دہلی)

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ بعض معترضین کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں :

" مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی احمد حسن صاحب وغیرہم از عزیزان این فقیر اند و تعلق با فقیر میدارند ہیچگاہ خلاف اعتقادات فقیر و خلاف مشرب مشائخ طریق خود مسلکے نخواہند پذیرفت "

(رسالہ در بیان وحدۃ الوجود صفحہ ۳ مطبوعہ راشد کمپنی دیوبند۔

از اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ

" فیصلہ ہفت مسئلہ کے آخر میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ المسلمین اور خصوصاً اپنے متوسلین کو ارشاد فرماتے ہیں :

" اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں، خصوصاً عزیزی جناب مولوی رشید احمد صاحب کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت کبریٰ و نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض برکات حاصل کریں کہ مولوی صاحب موصوف جامع کمالات ظاہری و باطنی کے ہیں اور ان کی تحقیقات محض للہیت کی راہ سے ہیں ہرگز اس میں شائبہ نفسانیت نہیں "

(فیصلہ ہفت مسئلہ صفحہ ۱۳ مطبوعہ راشد کمپنی دیوبند)

آخر میں شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کا ایک مکتوب مبارک درج کیا جاتا ہے جو قطب الارشاد حضرت گنگوہی کے علو مرتبت پر شاہد صادق اور اُن کے معترضین کے لیے جواب شافی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

از فقیر امداد اللہ چشتی بخدمت محبان عموماً۔ ان دنوں بعض خطوط ہندوستان سے اس فقیر کے پاس آئے، اس میں تحریر تھا کہ مولوی رشید احمد صاحب کے ساتھ بعض لوگ سوءِ ظن رکھتے ہیں کہ ہم مولوی صاحب کو کیسا سمجھیں۔ لہٰذا فقیر کی جانب سے مشتہر کرادو اور طبع کرادو کہ مولوی رشید احمد صاحب عالم ربانی، فاضل حقانی ہیں، سلف صالحین کا نمونہ ہیں، جامع بین الشریعۃ والطریقۃ ہیں، شب و روز خدا اور اُس کے رسولؐ کی رضامندی میں مشغول رہتے ہیں، حدیث پڑھانے کا شغل رکھتے ہیں۔ مولانا مولوی محمد اسحٰق صاحب کے بعد اس قسم کا فیض علم دین کا مولوی صاحب سے جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں مولوی صاحب ایک فردِ واحد ہیں۔ مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی مولوی صاحب سے ہوتی ہے۔ ہر سال میں پچاس آدمی کے قریب علم حدیث پڑھ کر اُن سے سند لیتے ہیں۔ اتباعِ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں محو ہیں۔ محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق خداوندی میں مستغرق ہیں، حق گو ہیں، لا یخافون لومة لائم کے مصداق ہیں۔ خدا کے اوپر پورے طور سے توکل رکھتے ہیں۔ بدعات سے پورے طور سے مجتنب ہیں، اشاعتِ سنت اُن کا پیشہ ہے۔ بدعقیدوں کو خوش عقیدہ بنانا اُن کا حرفہ ہے۔ ان کی صحبت اہل اسلام کے واسطے کیمیا اور اکسیر اعظم ہے، اُن کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آتا ہے۔ یہی اللہ والوں کی علامت ہے، متقی اور تارک الدنیا ہیں۔ راغب الی الآخرۃ ہیں۔ تصوف اور سلوک میں کامل ہیں۔ امیر و غریب اُن کے نزدیک یکساں ہیں، سب کی توجہ برابر ہے، لالچ نہیں۔ فقیر نے جو کچھ ان کی ثنا میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے وہ حق ہے اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے اُن کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر اُن کو اپنے واسطے ذریعہ نجات کا سمجھتا ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو بُرا کہتا ہے وہ میرا دل دُکھاتا ہے۔ میرے دو بازو ہیں، ایک مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم، دوسرے مولوی رشید احمد صاحب۔ ایک جو باقی ہے اس کو بھی نظر لگانے میں میرا اور مولوی صاحب کا عقیدہ ایک ہے۔ میں بھی بدعات کو بُرا کہتا ہوں، جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے، وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسولؐ کا مخالف ہے۔ اور بعض جہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض ان کی کم فہمی ہے۔ طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلود ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے واسطے اتباعِ سنت کسوٹی ہے جو متبعِ سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے۔ خرقِ عادات تو دجال سے بھی بہت ہوں گی۔ خدا فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو نہ ہووے اور مروّج بدعات ہووے وہ خدا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس فقیر سے جو اہل علم محبت رکھتے ہیں، یہ امر باعث اتباع سنت کے ہے۔ کسی کی مخالفت سے مولوی صاحب کا نقصان نہیں ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مولوی صاحب وہ شخص ہیں کہ خواص کو چاہیے کہ اُن کی صحبت سے مستفید ہوں اور ان کی صحبت کو خیر کثیر سمجھیں اور میں چاہتا ہوں، کہ

مولوی صاحب کی نسبت مجھے کوئی کلمہ بے ادبی کا نہ سنا دے اور نہ تحریر کرے، مجھ کو ان امور سے سخت ایذا ہوتی ہے، عجب بات ہے کہ میرے لخت جگر کو ایذا پہنچاویں اور اپنے آپ کو میرا دوست سمجھیں، ہرگز نہیں، مولوی صاحب پکے حنفی المذہب صوفی المشرب ہیں، باخدا ولی کامل ہیں، اُن کی زیارت کو غنیمت سمجھیں، والسلام

مُہر حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ

منقول از الشہاب الثاقب مؤلفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

صفحہ ۱۲۹، مطبوعہ میرٹھ۔

امداد اللہ فاروقی

اسلامی قوانین کا نفاذ

ہمارے تمام مسائل کا واحد حل ہے

— اور —

پوری قوم اس بات پر متفق ہے کہ پاکستان میں قرآن و سنّت کے مکمل نظام کا نفاذ ہماری اصل منزل ہے

— اس لیے —

میں قوم کے ذمہ دار حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی صلاحیتیں اور وسائل ملک میں اسلام کے عادلانہ نظام کے لیے وقف کر دیں

عبد العزیز

فیصل آباد — گوجرانوالہ

ارضِ دیوبند[1]

مولانا سید حامد میاں صاحب
مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

شادباش و شادزی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند　　(ظفر علی خاں مرحوم)

جن حضرات نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے وہ خصوصاً ان معلومات سے محظوظ ہوں گے محل وقوع۔ شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقے عرض البلد اور ۷۷ درجے ۳۵ دقیقے طول البلد پر ضلع سہارنپور کے متعلقات میں ایک قصبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا قیام طوفان نوح کے بعد ہوا۔

محل وقوع کوہ ہمالیہ کے قریب سہارنپور[3] واقع ہے اس کے مشرق میں بجنور مغرب میں ضلع کرنال اور جنوب میں مظفر نگر ہے۔

یہ ضلع علاقہ دوآبہ میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے گنگا اور مغرب میں دریائے جمنا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو شہر ہیں وہ علاقہ دوآبہ میں واقع کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم کی روداد ۱۳۱۱ھ میں تحریر ہے " یہ قصبہ ہمیشہ سے اپنے گردو نواح کے جملہ مقامات اور دیہات میں آب و ہوا کی عمدگی اور خوبی میں مشہور ہے۔ البتہ نہر کے جاری ہونے کے بعد سے آب و ہوا میں سابقہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کا نام " دیبی " تھا بعد میں دیوبند کہلانے لگے جیسے کہ آگے شیخ علاء الدین چشتی م ۹۵۶ھ کے ملفوظات سے معلوم ہوگا ملا عبد القادر بدایونی نے بھی شیخ دانیال عثمانی م (جو ساتویں ہجری میں گزرے ہیں) کے لئے اپنے عقیدتمندانہ سلام میں " دیبن " کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ۔

شیخ عثمانی کہ بود در پارسائی بے عدیل　　نازل دیبن منورہ اصل دین را سلام　　(ماخوذ از تاریخ دیوبند)

میں نے اپنے رشتہ داروں سے " دیوی بن " نام بھی سنا ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اس کا صحیح و متفق نام یہ ہے " دیوی بن برلب دریائے گنگ " ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جہاں آبادی ہوگی اس کے قریب سے دریائے گنگا تک کوئی بن ہو۔ وہ حضرات یہ بھی فرماتے تھے کہ پہلے دریا قریب بہتا تھا پھر دور ہٹ گیا اور راستہ بدل لیا۔　　واللہ اعلم　　(حامد میاں غفرلہ)

[2] بحوالہ " شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ " از اقبال حسن خاں پی۔ ایچ۔ ڈی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (اقبال خاں نے شیخ الہند پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے) (تاریخ دیوبند مصنفہ سید محبوب رضوی طبع دوم مطبوعہ آزاد پریس دیوبند شائع کردہ علمی مرکز دیوبند۔

[3] $\frac{۷۲۶ھ}{۱۳۲۶ء}$ میں بعہد غیاث الدین تغلق ایک بزرگ شاہ ہارون چشتیؒ کے نام سے سہارنپور کی آبادی کا آغاز ہوا۔ ابتداءً شاہ ہارون پور کے نام سے موسوم رہا۔ پھر کثرت استعمال سے سہارنپور ہوگیا۔ اس کا تاریخی نام " شہر پُر زیب " ہے۔ بحوالہ جغرافیہ سہارنپور از تاریخ دیوبند

اعتدال باقی نہیں رہا۔ دیوبند سہارنپور اور دہلی کے درمیان دہلی سے جانب شمال تقریباً نوے میل (۱۴۴ کیلومیٹر) اور سہارنپور سے بیس میل جانب جنوب واقع ہے۔

صاحب تاریخ دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ "زمانہ قدیم میں کورو اور پانڈو کی وہ عظیم جنگ جو مہابھارت کے نام سے موسوم ہے جس میدان میں لڑی گئی اس کی طویل و عریض حدود میں دیوبند کی سرزمین بھی شامل ہے" ص۲۸

اس جنگ کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح کا بتاتے ہیں۔

(حاشیہ تاریخ دیوبند ص۲۸)

تاریخ میں دیوبند کا ذکر مارکنڈے پران میں ملتا ہے جس سے دیوبند کی قدامت ثابت ہے۔ نیز یہ بھی مشہور ہے کہ کورو پانڈو کے عہد حکومت میں دیوبند آباد تھا۱؎ (تاریخ دیوبند)

دیوبند بلدة قديمة

وقصبة عظيمة ومدينة

كريمة وبلدة فخيمة

كانها اول عمران عمّر

بعد الطوفان ذات

المعاهد الوسيعة والمساجد

الرفيعة والمعالم المشهورة ۔

امپیریل گزیٹر میں لکھا ہے۔

"بادشاہ نے ملک بدر ہونے کی پہلی مدت یہیں گزاری تھی بیان کیا جاتا ہے کہ سالار مسعود غازی۲؎ کے اولین مفتوحہ قلعوں میں سے تھا"

(تاریخ دیوبند)

دیوبند کا محلہ قلعہ غالباً اسی حصہ پر آباد ہے۔ وہیں اب تحصیل کے دفاتر اور پولیس اسٹیشن ہے۔

اس کی قدامت کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اَلْهَدِيَّةُ السَّنِيَّةُ میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سے اس کی آبادی ارشاد فرماتے ہیں، اس رسالہ میں آپ نے نہایت ہی بلند ادیبانہ انداز میں دیوبند کے حالات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ قصبہ کے حالات کے بعد ایک قصیدہ مدحیہ پر رسالہ ختم فرمایا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں

دیوبند ایک قدیم اور بڑا قصبہ ہے۔ شرفا کی بستی اور عظیم الشان شہر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کی ابتدائی بستیوں میں سے ہے۔ اس کی عمارات و مساجد نہایت وسیع اور بلند واقع ہوئی ہیں۔

(یہاں) آثار قدیمہ اور مزارات اولیاء اللہ ہیں اس کے آثار محمودہ اور حالات مبارکہ مشہور ہیں۔ اس میں

۱؎ ۔ ہندو سنسکرتی کا ایک کیندر ص ۲۔ شائع کردہ نرائن نشد رسرتی (از تاریخ دیوبند ص۳۳)

۲؎ ۔ سالار مسعود غازی اوائل پانچویں صدی ہجری کے ایک اولوالعزم مجاہد اور سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے۔ ان کے والد سالار ساہو کو سلطان محمود نے اجمیر کی مہم میں فوج کا سالار مقرر کیا تھا۔ سالار مسعود غازی ۴۰۵ھ، ۱۰۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں دہلی میرٹھ قنوج اور بہرائچ وغیرہ مقامات کی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں آخر میں بہرائچ میں مقیم تھے کہ گرد و نواح کی ریاستوں نے ان پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں سالار مسعود غازی نے ۱۴ رجب ۴۲۴ھ، ۱۰۳۲ء کو جام شہادت نوش کیا۔ بہرائچ ہی میں آپ کا مزار ہے۔ تاریخ دیوبند ص۳۳، ص۳۴

والآثار المحمودة والاخبار
المسعودة وابنية مرصوصة
وامكنة مخصوصة
واثمار وثمار منتزهات وانهار
وحياض ورياض وآجام وغياض
منيعة المدور ونيعة القصور قريبة
الى الخير بعيدة من الشرور
بلدة طيبة ورب غفور
وقد تشرفت بالمدرسة ودفن فيها
مولانا محمد قاسم رحمة الله تعالىٰ صارت نوراً على نور
الطيب البلاد هواً واحسنها لطافة وصفاءً
واجملها صباحاً ومساءً واكثرها انسا
وضياء تقوى الاجسام والارواح وتربي
النفوس والاشباح ارضها موسومة معشبة
وممطورة مخصبة طينها اللازب احكم من
الجص وحمارها المسنون اثبت من الرصاص
في الرص وبهذا يستدل على قوة
امزجة سكانها وتصلب طبائع قطانها

پختہ اور مستحکم عمارتیں ہیں، اور اس کے درختوں میں پھلوں
تفریح گاہوں، نہروں، حوض اور باغات، جنگلات
کے ساتھ، خوش منظر جھاڑیاں ہیں۔ محفوظ مکانات
بلند محلات ہیں۔ یہ شہر خیر سے قریب اور شر سے دور
ہے، جیسے ارشاد ربانی ہے۔

بلدة طيبة ورب غفور[1]

مدرسہ سے اسے شرف حاصل ہوا اور اسی میں
مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ مدفون[2] ہوئے تو نور علیٰ نور
ہو گیا۔

ہوا میں عمدہ لطافت اور صفائی کے لحاظ سے
نہایت خوبصورت ہے اور صبح و شام کی لطافت کے لحاظ
سے پسندیدہ و دلکش ہے (فضا) منور اور روشن ہے
کہ روح و جسم کے لئے قوت بخش ہے۔ اور روح و
جسم کو انسراح بخشی ہے۔

اس کی زمین کنوانی اور چارہ پیدا کرنے والی
ہے اور بارش کو قبول کرنے والی سرسبز اور شاداب ہے
یہاں چکنی مٹی[3] چونہ سے زیادہ مضبوط اور گہگل سیسہ
کی مانند مضبوط ہے۔ اس سے یہاں کے باشندوں
کی قوت مزاجی طبائع کی پختگی پر استدلال کیا جا سکتا ہے

---

[1] ۔ بخاری طلبہ جو تحصیل علم کے لئے مدینہ منورہ سے آتے تھے۔ وہاں کے سکون کو دیکھکر کہتے تھے کہ یہاں مدینہ منورہ کی خوشبو آتی ہے۔

[2] ۔ مجھے جناب حامد حسن صاحب عثمانی دیوبندی مرحوم و مغفور نے جو پٹواری کہلاتے تھے بیان کیا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی جب قبر مبارک کھودی گئی تو میں وہاں تھا۔ قبر کے اندر کی مٹی سے خوشبو آرہی تھی۔ جہاں آپ کا جسم خاکی رکھا جانا تھا۔ رحمۃ اللہ۔ جناب حامد حسن صاحب اگرچہ بعض بدعات کی رسوم بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان کو حضرت کی اس کرامت کی وجہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کافی عقیدت تھی۔ جناب حامد حسن صاحب مرحوم نے دراز عمر پائی

[3] ۔ مٹی بہت عمدہ ہے۔ اس لئے وہاں لحد کا رواج ہے۔ شق کا نہیں۔ نیز اس سرزمین میں سبزہ خودرو ہے یہی حال پورے دوآبہ کا ہے

فلله در ها من ثمر تدل اسمها على انها من

الثمار أشبه د بفواكه

الجنان اشبه ذات الوان رائعة

وروائح طيبة فائحة واذوق

لذيذة متنوعة للنفوس مطبيه.

اما الالوان فمنها حمر كالجلنار

فكانها علقت بالشجر الاخضر نار

وصفراء فاقع لونها تسر الناظرين

وتعجب برؤاها الوسيما لمشتاقين

وخضرا تزهو بخضرتها على ما

تحت الخضرا وسودا

هي لاصناف الثمار كالسويدا

واما رياها فاللارواح

الطيبة رايا ها تفوق

المسك الاذفر وتزدرى

بالعود والعنبر واما

انواعها فحلاوتها احلى

من الشهد وحموضتها اشهى

من تعلّس الخرّوب

(الهدية السنية صلا مطبوعہ ۱۳۰۷ھ)

نیز ان چیزوں میں سے کہ جن سے اس شہر کی فضیلت اور کمال
کر سامنے آتی ہے۔ آموں کی کثرت اور ان کی لطافت و

عمدگی ہے۔ کیا ہی عمدہ پھل ہے جن کا نام "انبہ" خود ہی

بتلا رہا ہے کہ پھلوں میں نباہت والا اور ارفع ہے۔ اور

جنت کے میووں سے بہت مشابہ ہے۔ دل فریب رنگوں

والے اور عمدہ مہکتی خوشبو والے قسم قسم کے لذیذ ذائقوں

والے۔ ان کے رنگ بعض کے تو ایسے سرخ ہوتے ہیں جیسے

شگوفہ انار ایسا لگتا ہے کہ سبز درخت پر آگ کی چنگاریاں

لٹکا دی گئی ہیں۔ بعض گہرے زرد رنگ ہیں دیکھنے والے کی

نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اپنی بلند خوش منظری سے

مشتاق لوگوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

اور بعض سبز رنگ ہیں اپنی سبزی میں آسمان تلے

سبزیوں سے فوقیت لے جاتے تھے اور بعض سیاہ رنگ

ہیں وہ تو پھلوں کی تمام قسموں کے دل کا بھی اندرونی

حصہ جیسے ہیں اور رہی ان کی خوشبو تو کہاں عمدہ

خوشبوئیں اور کہاں یہ۔

یہ مشک سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور عود عنبر

کو (اپنے مقابلے میں) گھٹا دیتی ہے۔

رہے ذائقے تو ان کی شیرینی شہد سے زیادہ ہے اور اس

کی (عجیب طرح کی) ترشی بہ نسبت خرّوبؓ کے پھلوں کے

(جو سیب کی طرح مگر بے ذائقہ ہوتے ہیں۔ خیار شنبر سے چپٹے

ہوتے ہیں اور دوران میں رس ہوتا ہے) زیادہ مرغوب ہوتی ہے

الهدية السنية مطبوعہ مجتبائی دہلی صلا مطبوعہ ۱۳۰۷ھ

اس کے بعد صلا پر دیوبند کے تعریفی قصیدہ پر آپ نے

رسالہ ختم فرمایا ہے

جو حضرات دیوبند میں تعلیم پا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ

وہاں آم ٹوکریوں کے حساب سے بہت سستے فروخت ہوا

کرتے تھے اور اہل دیوبند دوپہر کو کھانے کے ساتھ اور بعض دفعہ

کھانے کے بجائے آم ہی کھایا کرتے تھے۔
حضرت نے یہاں دیوبند کے بیروں کا ذکر نہیں فرمایا۔

یہاں کے بیر خوش رنگ گول نہایت لذیذ بڑے اور سیب

کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر خوشبو دار ہوتے ہیں

مائها بارد سائغ عذب فرات
يربو في حسن الصفات على ماء الحياة
مباءة التجار ومتجر بضاعات الامصار
ومحط نزاع الآفاق
ومناخ النزاح والرفاق لاسيما
منذ تمهد فيها سكة الحديد فصارت
مغدى للقريب ومراحا للبعيد وكانت
قديما بجودة صنع السيوف الصقيلة
معروفة وبحسن نسج الاثواب
القطنية الرصينة موصوفة
واما قصب السكر والقند فقلما يوجدان
في البلاد مثل ديوبند. في الذوق كالعسل
وفي الريح كالزند فابن منها سمرقند
واهلها اخشاهم للرحمن وارضاهم للسلطان
واسمعهم للعلماء واطوعهم للفقراء والاشراف
اكثرهم من ولد السعيد الشهيد الصابر
الشاكر السخي الاريحي واسع الخلق اندا هم يدا
واقربهم الى رسول الله صلى الله عليه وسلم نسبا
وصهرا واصلا ومحتدا مجهز جيش العسرة
ثالث الخلفاء والعشرة المبشرة
من هاجر هجرتين وفاز بالخطبتين العظمتين
سيدنا ابي عمرو عثمان ذي النورين رضي الله
تعالى عنه وعن جميع الصحابة والتابعين آمين
يارب العلمين. ومما يتغ به مزية هذه البلدة و
نباهتها كثرة ثمرة الاشبة الجيلة فيها وانا نتها ولطانتها

اس قصبہ کا پانی ٹھنڈا پینے میں لذیذ شیریں اور عمدہ ہے۔ لہذا اپنے حسن وصفات کے لحاظ سے آب حیات سے بڑھا ہوا ہے۔

یہاں تاجروں اور شہروں کے سامان تجارت کی منڈی ہے آفاق سے آنے والے پردیسیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے دور دراز کے مسافروں اور ان کے رفقا کے لئے بہترین فرودگاہ ہے خصوصاً جب سے ریل جاری ہوئی ہے اس وقت سے تو قریب کے مسافروں کے لئے کھانے کے انتظام اور دور کے لوگوں کے لئے شام کے قیام وطعام کی جگہ بن گیا ہے۔ پرانے زمانے میں یہاں کی اعلیٰ درجہ کی صیقل کی بنی ہوئی تلواریں مشہور تھیں، اسی طرح عمدہ قسم کے سوتی کپڑے میں دیوبند مشہور تھا۔ گنا اور شکر تو دیوبند جیسی شاید ہی کہیں ہوتی ہو ذائقہ میں شہد اور خوشبو میں زند کی مانند ہے اس کی خصوصیات سے سمرقند کو کیا نسبت یہاں کے باشندے خداترس بادشاہ کے مطیع علما کے فرمانبردار فقرا کی بات ماننے والے ہیں اور دیوبند کے اشراف کی اکثریت حضرت سعید شہید صابر شاکر جو سخی اور وسیع الاخلاق نہایت کھلے ہاتھ کے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل اور نسل اور نسب میں بہت قریب تھے جنہوں نے جیش عسرت تیار کرایا تھا۔ خلفاء راشدین اور عشرہ مبشرہ میں تیسرے جنہوں نے دو ہجرتیں کیں اور دو عظیم خصوصیات حاصل کیں۔ سیدنا ابوعمرو حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ رضی اللہ عنہ وعن جمیع الصحابۃ التابعین آمین یارب العالمین

کر چندوانوں سے کمرہ مہک اٹھتا ہے۔ ایسے پیڑ کہیں دیکھے نہیں۔
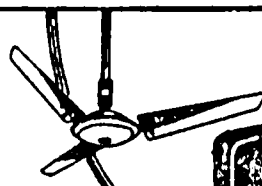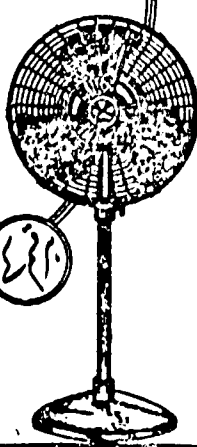
فردوسی کے شاہنامہ میں ہے کہ جب سکندر نے ۳۲۱ھ قبل مسیح ایران پر حملہ کیا تو اس موقع پر اس نے ہندوستان سے تلواریں منگائی تھیں۔ عرب کے لوگ سیف مہند کی زمانہ جاہلیت سے تعریف کرتے آئے ہیں۔ اہل ہند کو فولاد سازی میں مہارت حاصل تھی۔ اب یہ صنعت دیوبند میں باقی نہیں رہی تلوار چلانے کا فن قریبی زمانہ تک باقی تھا۔ تلوار کے ہاتھ کی اتنی زیادہ اور صفائی سے مشق کرتے تھے کہ کیلے کے تنہ میں سے تلوار گزار دیتے تھے اور اس کے کٹ جانے کے باوجود درخت کھڑا رہتا تھا۔ حالانکہ تلوار بیچ سے گزر چکی ہوتی تھی اور ہلانے سے اوپر کا تنہ الگ گر جاتا تھا۔

اسی طرح بنوٹ اور لاٹھی چلانے کی عمدہ مشق کرتے تھے کہ ایک کٹولے کے نیچے کبوتر یا کوئی پرندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس پر کھڑے ہو کر لکڑی کو ہاتھ اتنی پھرتی سے چلاتے تھے کہ پرندہ کو اپنی ہر چہار جانب لکڑی گھومتی نظر آتی تھی اور وہ اس کے نیچے سے نہ اڑ سکتا تھا۔ استادان فن اپنا فنی مظاہرہ اسی طرح کیا کرتے تھے۔

نیز شب برات کی لڑائی جو آتش بازی کی ہوتی تھی لیکن درحقیقت اس میں فریقین ایک دوسرے پر آتش بازی کرتے تھے۔ اس میں زخمی ہونا تو معمولی بات تھی۔ بعض اوقات لوگ مر بھی جاتے تھے۔ لیکن ان کا خون معاف ہوتا تھا یہ اس علاقہ کے باشندوں کی بے جگری کا ثبوت ہے اسے حکومت ہند نے سنہ ۴۷ء سے ممنوع قرار دے دیا (اس کی تفصیل تاریخ دیوبند میں ہے)

مولانا سید حامد میاں صاحب

دیوبند میں مسلمانوں کی آبادکاری اور فروغ

یہاں مسلمانوں کی آبادکاری کا سلسلہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوا

حضرت خواجہ عثمان ہارونی (وفات ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء) کی بیعت و خلافت سے سرفراز ہوکر دو بزرگوں نے ہندوستان کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں پہنچ کر ایک بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور سے اجمیر تشریف لے گئے اور دوسرے بزرگ قاضی دانیال قطری نے اپنی دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لئے دیوبند کی سرزمین کو منتخب فرمایا۔ سلطان قطب الدین ایبک[له] (۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء، ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء) کی جانب سے جس زمانہ میں شمس الدین التمش بدایوں کا گورنر تھا، اہل فضل و کمال کو ڈھونڈ کر بلانا اور ان کی حتی الامکان قدر افزائی کرتا تھا۔ اس نے قاضی دانیال کے علم و فضل کی شہرت سنی تو ان کو بدایوں آنے کی دعوت دی۔ یہ شیخ جب بدایوں پہنچے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور وہیں ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ چلا جو ابھی تک موجود ہے۔ ان کا دیوبند میں اتنے عرصہ قیام رہا کہ ان سے علمی سلسلہ پھیلا جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔ قاضی دانیال قطری کو التمش نے بدایوں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔

شیخ علاء الدین سہروردی

یہ بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات ۶۳۰ھ ۱۲۳۲ء) کے خلیفہ ہیں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (وفات ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء یا ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) اور شیخ سعدی شیرازی رحمہما اللہ ان کے ہم درس اور پیر بھائی تھے۔ مقامی روایت یہ بھی چلی آرہی ہے کہ یہ ابن جوزی کے شاگرد تھے۔

آپ کی وفات ۱۰ شعبان ۷۴۳ھ/۱۳۴۱ء میں ہوئی دیوبند ہی میں مزار ہے۔ سب سے قدیم مزار آپ ہی کا ہے آپ کے مزار کی شہرت "شاہ جنگل باش" کے نام سے ہے۔ دیوی کنڈ کی جانب مغرب سہارنپور، مظفر نگر روڈ کے متصل ہے ایک روایت یہ مشہور ہے کہ شیخ سعدی شیرازی (جن کا اسم مبارک شرف الدین ہے) سیاحت ہند کے دوران اپنے ان ہی بزرگ ساتھی سے ملاقات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

بہند آمدم بعد ازاں رستخیز ۔ وزانجا براہ یمن تا حجیز

له قطب الدین ایبک نے ۵۹۱ھ ۱۱۹۴ء میں فتح کیا تھا اور ۶۰۰ھ ۱۲۰۳ء میں التمش کو بدایوں کا گورنر مقرر کیا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کا اطلاق زیادہ تر نواح دہلی پر ہوتا تھا۔

شیخ معزالاسلام دیوبند کے شیوخ صدیقی کے مورث اعلیٰ ہیں آپ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں دیوبند تشریف لائے آپ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے شرف صحبت سے مستفیض تھے۔ مزار بڑے بھائیاں میں آدینی مسجد کے قریب بتلایا جاتا ہے۔

شاہ ولایتؒ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء ; ۷۸۹ھ/۱۳۸۸ء) کے عہد حکومت میں شیخ شہاب الدین بخاری مشہور بشاہ ولایت دیوبند تشریف لائے۔ شاہ ولایت کو شیخ جلال الدین کبیرالاولیاء (۶۳۵ھ ۷۶۵ھ) سے شرف بیعت حاصل تھا۔ مولد و مسکن بخارا تھا وفات ۶، ربیع الاول ۸۰۷ھ/۱۳۷۸ء، آپ کا مزار دارالعلوم کے جنوب مغرب میں ہے۔

ایک اور بزرگ: ایک بزرگ قالو قلندر (وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) کا مزار مبارک بھی تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے آپ سے بھی اپنے زمانہ میں اہل دیوبند مستفیض ہوئے

شیخ جیا صاحب خانقاہ جلال الدین اکبر کے ابتدائی عہد سلطنت میں یہ بزرگ دیوبند تشریف لاتے ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اجمیر سے دہلی آئے اور چند روز وہاں قیام فرمایا۔ اکبر کو ان سے عقیدت ہوگئی اس نے حکم دیا شیخ جہاں قیام کرنا پسند کریں وہاں ان کی حسب منشا انتظام کر دیا جائے۔ شیخ جیا نے دیوبند کے قیام کو پسند کیا۔ اکبر کے حکم کے مطابق مرزا بیگ ابن خواجہ محب علی بخشی نے شیخ کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ مسجد کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں مسجد تعمیر ہوئی ہے۔

اسی محلہ خانقاہ میں حضرت اقدس مولانا انورشاہ الکشمیری قدس سرہٗ مدفون ہیں۔

شیخ ابوالوفاء عثمانی آپ اوائل نویں صدی ہجری میں دیوبند آئے خاندان عثمانی اہل دیوبند کے مورث اعلیٰ ہیں۔ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کی اولاد میں ہیں، دونوں بزرگوں میں پانچ پشت کا فاصلہ ہے۔

شیخ کا نسب یہ ہے۔

ابوالوفاء بن عبداللہ بن حسین بن عبدالرزاق بن عبدالحکیم بن حسن بن عبداللہ عرف ضیاالدین بن یعقوب بن عیسٰی بن اسمٰعیل بن محمد بن ابوبکر بن علی بن عثمان بن عبداللہ حربانی بن عبدالرحمٰن گازرونی بن عبدالعزیز ثالث بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز ثانی بن عبدالعزیز بن عبدالکبیر بن عمرو ابن امیرالمؤمنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ۔

شیخ عبدالرحمٰن گازرونی محمود غزنوی کے قاضی لشکر تھے ان کے ہمراہ ہندوستان آئے اور پانی پت کی فتح کے بعد وہاں مقیم ہوگئے دیوبند کے تمام شیوخ عثمانی ابوالوفاء عثمانی رحمۃ اللہ کی اولاد میں ہیں

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا سلسلہ نسب بھی یہی ہے اور ہرسہ برادران ذی القدر مفتی عزیزالرحمٰن قدس سرہٗ، مولانا حبیب الرحمٰن اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ کا بھی یہی ہے۔

ان ہی کی اولاد میں دیوان لطف اللہ گزرے ہیں۔ یہ شاہجہاں کے عہد میں دیوان کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے دیوان خانہ کی جگہ اب دارالعلوم کا مہمان خانہ ہے۔

قاضی فضل اللہ شیر بھی اسی خاندان میں گذرے ہیں۔

قاضی مسجد انہی کی تعمیری یادگار ہے۔ دیوان لطف اللہ[1] کی اولاد میں شیخ کرامت حسین اور ان کے فرزند شیخ نہال احمد (وفات ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) سربرآوردہ لوگوں میں رہے ہیں۔ شیخ نہال احمد دارالعلوم کی پہلی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) جب اپنی تحریک جہاد کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے دیوبند تشریف لائے تو اس خاندان کے متعدد حضرات سید صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ ابوالبرکات گزرے ہیں جہاں ان کا گھرانہ آباد ہے وہ محلہ ان ہی کے نام سے ابوالبرکات کہلاتا ہے شیخ کی یادگار ایک مسجد بھی ہے جو سید کبیر کہلاتی ہے۔ اسی خاندان کے افراد میں مولانا فرید الدینؒ ہیں۔ جو جید عالم تھے اور ساری عمر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی بلند بخت تھے جو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جہاد میں شریک رہے

شاہ جلال الدین قادری وفات ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء دیوبند کی آبادی کے جنوب مشرق میں ان کا مزار ہے یہ جگہ محلہ شاہ جلال کے نام سے موسوم ہے۔

بندگی محمد عمر وفات ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی المتوفی ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء اور حضرت شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی المتوفی ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء سے مستفیض تھے آبادی کے جنوب مغرب میں سہارنپور روڈ پر ریلوے لائن کے شمال میں آپ کا مزار ہے

شاہ ماہ رو: المتوفی ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء محلہ شاہ ماہ رو میں مزار واقع ہے مزار کے متصل مسجد ہے۔

سید حسام الدین۔ جامع مسجد قلعہ کے جنوبی گوشے میں مزار ہے۔ جامع مسجد قلعہ کی امامت و خطابت کے لئے حضرت سید محمد ابراہیم المتوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء نے ان کو جلال آباد لوہاری سے طلب کرکے مقرر کیا تھا۔ عرصہ تک ان کی اولاد میں مسجد کی امامت کا منصب باقی رہا۔

شاہ محمد فرید نقش بندی سلسلہ کے بزرگ ہیں ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۰ء میں وفات پائی۔

میاں جی نور علی قطب الوقت وفات ۱۳۰۴ھ

ملا شہاب الدین کابلی ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۴ء محلہ شاہ جلال میں مدفون ہیں

سید محمد ابراہیم

گیارہویں صدی کے اوائل میں خاندان سادات کے ایک بزرگ سید محمد ابراہیمؒ نے بعض اہل اللہ کے مشورہ سے اسلام کی دعوت اور تبلیغ و ارشاد کے لئے دیوبند کا انتخاب فرمایا۔ تذکرۃ العابدین میں لکھا ہے:

"آپ اولیا کبار میں سے تھے، کرامتیں ان کی دیوبند میں مشہور و معروف ہیں، آپ کا سلسلہ قادریہ تھا۔"

دیوبند میں سید صاحبؒ کے قیام کے لئے دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے مسجد اور ایک وسیع خانقاہ تعمیر کرائی گئی جس میں افادۂ باطنی اور طریقت و تصوف کے حلقہ کے ساتھ ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم و تعلم کی مسند بھی بچھی ہوئی تھی۔

سید صاحبؒ کے اخلاف کے نام مغل بادشاہوں، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگزیب عالمگیرؒ کے عہد میں مدد معاش کے لئے جو زمینیں دی گئی ہیں، شاہی فرامین میں ان کی وجہ عطایائے علم و طریقت کے مصارف بتلائے گئے ہیں۔

سید محمد ابراہیمؒ کا سلسلہ نسب یہ ہے

سید محمد ابراہیم بن سید سعد اللہ

---

[1] مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی مرحوم و مغفور بھی دیوان لطف اللہ کی اولاد میں ہیں۔ اگرچہ تھانوی مشہور ہوگئے۔

بن سید محمود قلندر، بن سید احمد کبیر بن سید فرزند علی بن وجیہ الدین، بن
علاء الدین بن سید احمد کبیر بن شہاب الدین بن حسین علی بن عبد الباسط
بن ابوالعباس بن اسحاق عبد لبیب المکی ابن قاری حسین علی بن لطف اللہ
بن تاج الدین بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین
بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الاعرج ابن ابی عبداللہ احمد بن موسیٰ
المبرقع ابن امام محمد تقی ابن امام موسیٰ علی رضا، ابن امام موسیٰ کاظم ابن امام
جعفر صادق ابن امام محمد باقر ابن امام زین العابدین ابن امام ابی عبداللہ الحسینؓ
ابن سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بنت سرور کائنات محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم، سید محمد ابراہیمؒ کے دادا سید محمود قلندرؒ شہنشاہ
ظہیر الدین بابر (۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء - ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) کے زمانہ میں اوش[1] سے لکھنؤ تشریف
لائے یہ ایک مرتاض درویش تھے۔ آپ حمص سے جیلان تشریف لے گئے
وہاں سید محی الدین علی جیلانی سے بیعت ہوئے اور مجاز ہو کر ان کی ہدایت کے مطابق
ہندوستان تشریف لائے اور گھومتے ہوئے لکھنؤ پہنچے، وہاں شہر سے
باہر قیام فرمایا، بحر ذخار میں حجۃ العارفین کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ
پر استغراق کی ایسی کیفیت رہتی تھی کہ ایک دن سخت آندھی اور بارش
آئی اور شیخ کو اس تیز ہوا اور بارش کے زور کا کوئی پتہ نہ چلا۔ عشا کی اقامت
کے وقت کچھ لوگوں نے بتلایا تو اطلاع ہوئی پھر حجۃ العارفین میں ان
کے خوارق عادات کا ہر ساعت اور ہر آن مثل فوارہ کے ظہور کا تذکرہ کیا
گیا ہے۔ آپ نے طویل عمر پائی ۹۸۶ھ ۱۲ شعبان کو لکھنؤ میں وفات ہوئی
"بلدہ خالی شدہ" سن وفات ہے۔ سید محمد ابراہیمؒ کے دو بھائی اور تھے،
سب سے بڑے بھائی جامع مسجد لکھنؤ میں امامت وخطابت کے منصب
پر فائز تھے۔ دوسرے بھائی حیدر آباد دکن چلے گئے۔

اور سید محمد ابراہیم نے جو زہد وتقویٰ اور فقر وتوکل میں اپنے دادا کے جانشین
تھے، مسند رشد وہدایت کو رونق بخشی آپ کو اس کا مشورہ شیخ علاء الدین
چشتی (م ۹۹۶ھ) نے دیا تھا، فرمایا

"لیکن قصبہ دیبئی کہ دیوبند گویند دریں زمانہ از غلغلہ
اشخاص متعادم نمایاں شدہ است مناسب آں ست
کہ دراں قصبہ وطن گیرند ونکاح کنند تا مردم آنجا استفادہ
کنند پس شیخ مذکور ہمچناں کرد"

آپ کا فیض دیوبند اور اطراف دیوبند میں پھیلا۔ دیوبند کے مشہور
طبیب حکیم عبداللطیف جو راجہ مالوہ کے طبیب خاص رہے۔ فرمایا
کرتے تھے۔ حضرت سید محمد ابراہیمؒ کی نظر کیمیا اثر
اور فیض صحبت سے ان کا خاندان بھی مسلمان ہوا۔ دیوبند کے گوجر بھی آپ
ہی کے فیض صحبت سے داخل اسلام ہوئے آپ کی وفات ۵ شوال
۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء کو ہوئی مسجد کی جانب شمال آپ کا مزار ہے۔
یہ جگہ اب سرائے پیرزادگان کہلاتی ہے، آپ ہی کا خاندان سادات
دیوبند کا سب سے بڑا خاندان ہے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے

---

۱ ؎ اوش فرغانہ کے علاقہ میں واقع ہے، بابر کا وطن
مالوف تھا، بابر نے تزک بابری میں تفصیل کے ساتھ اوش
کے حالات لکھے ہیں، خاندانی شجروں میں اوش سے قبل ۲

۲ حمص لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ خاندان حجاز سے پہلے حمص میں
منتقل ہوا اور وہاں سے چل کر اوش میں اقامت گزیں
ہوا، آپ کے حالات بحر ذخار میں آٹھ صفحات میں
مبسوط تحریر ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۰۳ھ کی تصنیف ہے
اس کا قلمی نسخہ فرنگی محل لکھنؤ میں ہے۔ اس میں دو ہزار
اولیاء کرام کے حالات جمع کئے گئے ہیں اس کے مصنف
سید وجیہ الدین اشرف ہیں۔ اس کتاب کے صفحات
کی تعداد ۲۸۰۲ ہے۔ یہ کتاب نزہۃ الخواطر کا
سب سے بڑا ماخذ ہے یہی اس کے مستند ہونے کی کافی دلیل ہے

سید محمد اسمٰعیل بندگیؒ جانشین ہوئے اور تمام عمر درس و تدریس اور تربیت باطنی میں مشغول رہے آپ نے ۲۹ محرم ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء میں وفات پائی، اور اپنے والد کے پہلو میں بائیں جانب دفن ہوئے۔

بندگی محمد اسمٰعیل اور ان کے فرزند سید محمد عارف اور ان کے فرزند سید وجیہ الدین کی نسبت عہد عالمگیری کے پروانہ میں بہت بلند کلمات استعمال کئے گئے ہیں۔

"دریں ولایت شیخ وجیہ الدین پسر غفران پناہ معارف آگاہ شیخ محمد عارف ولد مغفرت پناہ بندگی شیخ محمد اسمٰعیل کہ بصلاح و تقویٰ آراستہ لیاقت تمام دارد بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس و تذکیر با جماعت طالب علماں و فقراء و صوفیہ مشغول است"

یہ فرمان ۹ شوال ۴۴ جلوس عالمگیری میں غضنفر خاں صوبہ دار دوآبہ کے دستخط سے جاری ہوا ہے۔ اسی طرح کا دوسرا فرمان جلوس عالمگیری کے ۳۴ھ کا سید محمد صاحب کے نام محمد یعرب کے دستخط سے جاری ہوا ہے۔

ان سب حضرات کی قبریں اپنے جد بزرگوار کے مزار کے احاطہ میں ہیں۔ سید محمد عارف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۱۰۵ھ میں بعہد محمد شاہ ہوئی۔ دیوبند میں یہ خانقاہ دینی علوم کی اولین شعاع تھی جس کو حق تعالیٰ نے گیارہویں صدی کے اوائل میں سید محمد ابراہیم قدس سرہٗ کے مقدس ہاتھوں سے روشن کیا تھا۔

سید محمد عارفؒ کے صاحبزادے سید وجیہ الدینؒ کے بارے میں بھی فرمان میں ایسے الفاظ موجود ہیں "شیخ وجیہ الدینؒ پسر شیخ مرحوم بصلاح و تقویٰ آراستہ لیاقت تمام دارد بجائے پدر خود خانقاہ بتذکیر و تدریس با جماعت طالب علماں و فقراء و صوفیاء مشغول است و خرچ خانقاہ فی سبیل اللہ مصروف است"۔ فرامین شاہی اور پروانہ جات میں جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے ان حضرات کی نسبت یہ الفاظ لکھے گئے ہیں "غفران پناہ" "مشیخت پناہ" "حقائق و معارف آگاہ" ان الفاظ سے ان حضرات کے علم و فضل، زہد و تقویٰ شرف و منزلت اور ان کی علمی و دینی خدمات کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے، جد اعلیٰ کے زمانہ سے لے کر ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء کی آتش زدگی تک جو سکھوں نے کی تھی، خانقاہ میں اباً عن جدٍ درس و تدریس اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا، ایک فتوے سید وجیہ الدینؒ کے دستخط کا موجود ہے جس پر ۱۲۵۱ھ کی مہر ثبت ہے۔

محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء – ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۷ء) کے عہد میں سید ابرار اللہ بن فضل اللہ کو دیوبند اور اس کے اطراف و جوانب کا قاضی مقرر کیا گیا خاندان کے ایک بزرگ سید نور الحق کا وظیفہ نواب نجیب الدولہ (وفات ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء) کی سرکار سے جاری تھا۔

غرض دیوبند میں اس بلند پیمانہ پر درس و تدریس و تصوف کا سلسلہ بدستور چلا آرہا تھا، اور درسگاہ مدتوں سے قائم چلی آرہی تھی شاید اسی لئے بعد میں قیام دارالعلوم بھی دیوبند میں ہوا ہو لیکن اہل دیوبند اور اس خاندانی درسگاہ کو ایک عظیم سانحہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں سکھوں کے ایک بڑے گروہ نے دیوبند پر قزاقانہ حملہ کیا۔ اس وقت جنہوں نے مزاحمت کی ان کے گھروں کو آگ لگا دی۔ اس حادثہ میں دیوبند کے کئی محلے جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

ایک یادداشت میں مرقوم ہے کہ

شیخ علاؤ الدین برناوہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے جو میرٹھ سے تقریباً ۱۹ میل جنوب میں واقع ہے، وہاں بہت سے مشائخ کرام گذرے ہیں جو اسی خاندان کے تھے، اس خاندان کے جد امجد شیخ بدر الدین م ۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء تھے ان کو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

۹ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو سکھوں کے ایک لاکھ سوار و پیادوں نے دیوبند پر حملہ کیا۔ ہماری آبادی (خانقاہ) کا محاصرہ کر کے ہمارے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگادی۔ انہوں نے ہمارے گھروں میں نقد زیور اور برتن وغیرہ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ یہ لوگ ۸ دن تک یہاں ٹھہرے اور نہایت اطمینان کے ساتھ انہوں نے ہمارے گھروں کو لوٹا اور پھر نذر آتش کر دیا۔ ان غارتگروں کے چلے جانے کے بعد ہم اپنے سوختہ گھروں میں داخل ہوئے۔ اپنے متنوں کی تجہیز و تکفین کی شاہی فرامین اور دستاویزات میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی، سب جل کر راکھ بن گئی تھیں۔

دیوبند کی تاریخ میں یہ وہ قیامت خیز سانحہ ہے کہ جس نے ڈیڑھ سو سال کی شمع علم کو ایسا بجھایا کہ آج اس کے آثار و نقوش ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ خانقاہ اس طرح برباد ہوئی کہ بعد میں پھر اس کی تلافی نہ ہو سکی، دوسری عمارتوں کی طرح مسجد بھی جو عہد جہانگیری کی تعمیر تھی منہدم ہوگئی۔ بعد میں اس خاندان کے مشہور بزرگ سید محمد انور صاحب نے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں قدیم بنیادوں پر از سر نو مسجد تعمیر کرائی۔

کچھ اور بزرگ

مولانا فضل اللہ صدیقی ترکی خطیب عیدین دسویں صدی کے اوائل میں وارد ہوئے، اکبر کا دور تھا اس نے آپ کو خطیب مقرر کیا۔ اس خاندان کے سارے افراد شروع سے آج تک دارالعلوم کے معاون چلے آ رہے ہیں۔

شیخ احمد دیبتی

حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ آپ آخر میں بنگال تشریف لے گئے، وہیں قیام اختیار فرما لیا۔ اور وہیں وفات پائی۔

شاہ رمز الدین

دیوبند کی سرزمین میں سلسلہ قادریہ کے ایک بزرگ شاہ رمز الدین بغدادی (وفات ۱۲۲۲ھ) آسودہ خواب ہیں۔ آپ کو شہنشاہ اورنگزیب ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء)

۱۱۰۸ھ) اور حضرت شاہ محب اللہ اللہ آبادی کا خلیفہ بتلایا گیا ہے، آپ کے زمانے کی مسجد موجود ہے۔ مسجد کے شرقی گوشہ میں آپ کا مزار ہے۔ یہ محلہ شاہ رمز الدین کے نام سے موسوم ہے۔

سید غلام رسول

تیرہویں صدی کے اوائل میں بغداد سے تشریف لائے، یہیں ازدواجی زندگی گذاری۔ آپ کی اولاد صالح ترین حضرات ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ (آپ ہی حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب قدس سرہ کے جد امجد ہیں)

دیوبند ـ زوال سلطنت مغلیہ کے وقت

اٹھارہویں صدی کے وسط سے مغلیہ سلطنت کا زوال اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ شمال مغرب میں سکھوں، شمال مشرق میں روہیلوں، جنوب میں مرہٹوں اور مشرق میں انگریزوں نے ہندستان کی حکومت پر چھانے کی کوششیں شروع کیں، شمال مغرب میں سکھوں کا زور تھا۔ انہوں نے مسلح جتھے بنا کر غارتگری کا سلسلہ شروع کر دیا

شاہ عالم بہادر شاہ اول کے زمانہ میں سکھوں نے سرہند پر یورش کے بعد سہارنپور پر حملہ کیا وہاں جنگ و جدال کے بعد قبضہ کر کے خوب لوٹ مار کی، اس کے بعد قلعہ جلال آباد (مظفرنگر) پر حملہ کیا، وہاں کے پٹھانوں نے شدید مقابلہ کیا بالآخر سکھ حملہ آور بیس روز کے محاصرہ کے بعد ناکام لوٹ گئے۔

اسی صدی کے آخر میں سکھوں کا یہ معمول ہو گیا کہ برسات ختم ہو جانے پر دوآبہ کے علاقہ میں ان کی لوٹ مار کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ سکھوں کی یہ مسلح جماعت ان کی اصطلاح میں دَل کہلاتی تھی۔

۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں سردار غریب سنگھ نے ضلع سہارنپور اور مظفرنگر کے متمول قصبات و دیہات میں لوٹ مار کی۔ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں تھانہ بھون اور ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں مظفرنگر کو لوٹا۔ ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں تارا سنگھ گھیب سنگھ مادھو سنگھ جیت سنگھ، صاحب سنگھ اور کھنڈا نے دیوبند پر حملہ کیا۔ یہاں ضابطہ خان

کی طرف سے جو حاکم مقرر تھا وہ سکھوں سے ڈرتا ہوا بھاگ گیا۔ سکھوں نے خوب لوٹ مار کی۔ یہاں سے مظفر نگر کے دیہات کی طرف بڑھے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے مراد آباد کی جانب چلے گئے اور چند دنوں کو جاٹ ان پیہم یورشوں سے دو آبہ کا علاقہ ویران و بے چراغ ہو گیا۔ نومبر ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء رائے سنگھ اور شیر سنگھ نے سہارنپور میں قلعہ احمد آباد کا محاصرہ کیا مگر ناکام ہوئے۔

مارچ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں سکھوں نے کاندھلہ، جھنجھانہ اور تھانہ بھون میں جو ضلع مظفر نگر کے متمول قصبات ہیں لوٹ مار کی مگر وہاں مقابلہ میں انگریزوں کی فوج آ گئی اور سکھوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد سکھوں نے حملے موقوف کر دیئے۔ (تاریخ دیوبند)

اس کے بعد سکھوں کے ان گروہوں کی تعداد جنہیں "مثل[1]" کہا جاتا تھا، بارہ تک پہنچ گئی تھی، ان پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مضبوط طاقت بھی عرصہ دراز کے بعد قابو پا سکی (شاندار ماضی)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہ کابل "زمان شاہ" نے صوبہ پنجاب کی حکومت عطا کی یا مسلمانان لاہور نے مدد دے کر اسے بلایا تھا۔

قلعہ لاہور میں تخت سلطنت پر اس کے جلوس کی تاریخ ۱۳ صفر ۱۲۱۴ھ، ۷ جولائی ۱۷۹۹ء ہے۔

رنجیت سنگھ انگریزوں کی چالبازیوں کو نہ سمجھ سکا، اسے چاہیئے تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نائبین حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ اور حضرت سید احمد شہید قدس سرہما کی طرح اپنے اور ملک کی صحیح دشمن طاقت کو سمجھ جاتا کہ وہ انگریز ہیں۔ اور سید صاحب کو ان سرحدی علاقوں سے جو مسلم ممالک سے ترکی تک باہم متصل چلے جا رہے ہیں، پشت پہ لے کر انگریز کی طاقت سے مقابلہ کے لئے راستہ دے دیتا۔ جبکہ اس کے مرکزی اعلیٰ ترین معتمد علیہم اور گورنر بھی بہت سے مسلمان تھے، اور سید صاحب کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ہندو فائز تھے بلکہ آخری معرکہ میں تو توپخانہ کا انچارج ہندو تھا۔ (شاندار ماضی)

لیکن رنجیت سنگھ انگریزوں کی دسیسہ کاریوں کی وجہ سے سید صاحب کے نقطۂ جہاد کو نہ پہچان سکا کہ وہ کس سے مقابلہ چاہتے ہیں۔ ان کے مکاتیب ان کے نظریہ کے لئے کافی تفسیری مواد ہیں اگرچہ قلمی تحقیقی مکاتیب اور سلسلے طبع ہو کر آنے والے ہیں۔ ان شاء اللہ۔ لیکن وہ دھوکہ میں آ کر خود ہی ان سے الجھ گیا، اس طرح انگریز کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کامیاب ہو گئی، پھر انگریز نے رنجیت سنگھ کی حکومت کو بھی پارہ پارہ کر دیا ۱۲۶۰ھ / ۱۸۹۲ء میں پنجاب سے سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، لارڈ ڈلہوزی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقبوضات کو کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا۔

(تاریخ دیوبند)

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جہاد حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کے رفقاء دیوبند

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، مشرقی یو پی میں رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ علم اللہ قدس سرہ تھے جو اودھ کے بڑے نامور بزرگ تھے اور سو سال سے وہاں ان کا فیض چل رہا تھا اسی جگہ "دو تکیہ شاہ علم اللہ" کے نام سے معروف تھی، صفر ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء کو سید صاحب پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا آپ تلاش روزگار میں اودھ کے دار السلطنت لکھنؤ پہنچے وہاں دلچسپی نہ ہوئی۔ تو دہلی کا سفر اختیار کیا اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ (وفات ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) سے بیعت کر کے کمالات روحانی حاصل کیے۔

---

[1] ان کی تفصیل شاندار ماضی ج ۲ ص ۲۷۸ پر　　حاشیہ میں ہے اور کچھ حالات تاریخ دیوبند میں ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء) سے کچھ کتابیں پڑھیں پھر نواب امیر خان والی ٹونک کے یہاں تشریف لے گئے یہ ہندوستان کی فوجی اعتبار سے مضبوط ترین ریاست ہوتی تھی۔ اس کی فوج چالیس ہزار تک ہو جاتی تھی جو بڑی جانباز تھی[1]۔ اس کے پاس سید صاحب یہ نصب العین بنا کر گئے تھے کہ اس کی عظیم الشان قوت سے وطن کی آزادی اور احیاءِ اسلام کا کام لیا جائے۔ اور ہندوستان کو انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے بچایا جائے۔ مگر جب ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور نواب امیر خان نے سید صاحب کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کر لیا تو سید صاحب نواب امیر خان سے علیحدہ ہو کر دہلی چلے گئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے اپنے تمام شاگردوں اعزاء اور اقارب کو ہدایت کر دی تھی کہ سید صاحب سے باقاعدہ بیعت کر کے کمالات روحانی سے استفادہ کریں۔ آپ کا یہ ارشاد جہاں سید صاحب کے کمال کا اظہار کرتا ہے وہاں یہ بھی بتلاتا ہے کہ آپ کو ان کی سیاسی رائے گرامی سے اتفاق تھا اسی لئے خاندان ولی اللہ کے وہ افراد جو چشم و چراغ تھے سید صاحب کے ہمیشہ ساتھ رہے۔

آپ ٹونک سے واپسی پر دہلی اور پھر وہاں سے ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء میں دوآبہ کے اصلاح کے دورہ پر روانہ ہوئے اس دورہ میں آپ نے روحانی اصلاح کے ساتھ اخلاقی اصلاح بھی فرمائی۔ اور شہادت و ایثار اور جذبۂ جہاد کی روح رگوں میں تازہ کی۔

آپ کے ساتھ بہت اعلیٰ خاندانی اور مالی حیثیت رکھنے والے اور اولیاء اللہ کل کثرت سے ہو گئے۔ آپ کا یہ قافلہ بے نظیر علماء کی جماعت پر مشتمل ہو گیا جو ہر اعتبار سے اعلیٰ اور جامع صفات تھی (حالانکہ ۱۸۱۸ء میں یہ علاقہ (دوآبہ) بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر آنا شروع ہو گیا تھا) ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء میں آپ نے سفرِ حج کیا۔ آپ کی معیت میں قافلہ کے سات سو حضرات نے یہ سعادت حاصل کی ۱۲۳۹ھ میں۔ سفر سے واپسی ہوئی پھر آپ ہمہ تن جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس[2] وقت ہندوستان

---

[1] انگریزوں نے اس سے مقابلہ کے بجائے چال بازیوں سے کام لیا اس کے ساتھیوں کو توڑنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ تنہا رہ گیا۔ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں مجبوراً اسے انگریزوں سے معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے صرف ریاست ٹونک کا اقتدار امیر خان کے پاس باقی رہ گیا۔

[2] محمد ایوب خان جنہوں نے ۱۹۵۸ء کے بعد خود کو فیلڈ مارشل بھی بنا لیا تھا اور صدر پاکستان ہوتے ہی بے تکی باتیں کرنے لگے تھے چنانچہ سید صاحب کے نقشۂ جنگ کے بارے میں کچھ نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ کہ پہاڑوں میں وہ کیا لینے آئے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ ورنہ وجہ بھی معلوم ہو جاتی۔ اب بعض اور لوگ بھی یہ اشکال پیش کرتے ہیں اگرچہ حقیقتاً یہ ان کی اپنی ناسمجھی ہے۔ سید صاحب کو بہ رغبت ہو یا بجبوری اور اسی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما کو بھی تحریک کیلئے یہی علاقہ منتخب کرنا پڑا۔ ان حضرات کی نظر پورے ہندوستان کے ہر علاقہ اور وہاں کے خواص و عوام پر ایوب خاں سے بہت زیادہ تھی اور وہ زیادہ جانتے تھے اور جانتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ حامد میاں غفرلہٗ

میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جسے انگریزوں کے خلاف مرکز بنا کر جہاد کیا جاتا اس لئے آپ نے افغانستان کے قریبی حصہ صوبہ سرحد کو منتخب فرمایا۔ وہاں افغانستان اور بخارا و ترکی وغیرہ سے امداد کی توقع تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں قافلہ کے ساتھ وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ اور آزاد قبائل کا ارادہ فرمایا۔ پنجاب سے گزرنا مشکل تھا اس لیے راجستھان کا طویل راستہ[۵] اختیار فرمایا۔ نیز اس راستہ میں دو ریاستیں پڑتی تھیں جن کے دلوں میں حریت موجزن تھی۔ جب قافلہ گوالیار پہنچا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا نے اور ان کے سالے وزیر راجہ ہندو راؤ نے بڑے اہتمام کے ساتھ قافلہ کو ٹھہرایا ان دنوں مہاراجہ سندھیا استسقاء کے مرض میں مبتلا تھے اور سارا کام راجہ ہندو راؤ کرتے تھے۔ مہارانی نے اصرار کیا کہ سید صاحب اتنی مدت گوالیار میں قیام کریں کہ لشکر کے لئے پورا ساز و سامان فراہم کیا جا سکے۔ مگر سید صاحب نے معذرت کی۔ گوالیار کے قیام میں سید صاحب نے ہمراہیوں کو باقاعدہ فوجی طریقہ پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر جماعت کا ایک مستقل سرعسکر بنا دیا۔ قافلہ گوالیار سے روانہ ہو کر سندھ ہوتا ہوا قندھار اور کابل کے راستہ سے صوبہ سرحد میں داخل ہوا۔ آزاد قبائل کے خوانین اور عوام کثرت سے سید صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے صوبہ سرحد پہنچنے پر ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء کو بالاتفاق سید صاحب کے ہاتھ پر امامت و خلافت کی بیعت کی گئی۔

سید صاحب نے وہاں مرکز قائم کر کے باقاعدہ حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور والی کابل سلطان ہرات شاہ بخارا، رئیس قلات اور آزاد قبائل کے دیگر سرداروں کو امداد کے لئے خطوط لکھے۔ ان خطوط میں جہاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا گیا تھا۔ کہ جہاد کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے۔

سید صاحب نے جب دوآبہ کا دورہ فرمایا تھا تو اسی وقت سے دیوبند[۶] کے بڑے بڑے خاندانی حضرات آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے نزدیک جانب مشرق قاضی مسجد

---

۵ شاندار ماضی ص ۱۲۴ ج ۲ - (تاریخ دیوبند مفصلاً نیز تذکرۃ العابدین میں مالیر کوٹلہ۔ محدوت۔ بہاولپور۔ حیدرآباد سندھ۔ شکارپور جاگن نام گنبد درۂ دہار، درہ بولان پشین کے مقامات سے گزرنا بھی لکھا ہے ص ۱۳۳ ج ۱ -

۶ دیوبند کا علاقہ قدیم زمانہ میں "مدھ دیش" کہلاتا تھا۔ شمالی ہند کی راجگان کی راج دھانی جب تک "ہستناپور" (ضلع میرٹھ) رہی یہ علاقہ اس کے ماتحت رہا پھر مہابھارت کی جنگ میں کوروں کی شکست کے بعد اندرپرست (دہلی) کے مہاراجگان کی مملکت میں شامل ہو گیا قدیم اہمیت کی بنا پر بھی شاید میرٹھ کو ہمیشہ چھاؤنی رکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں دیوبند وغیرہ کے علاقوں میں اعلیٰ ترین خاندانوں نے جو صاحب روحانیت و علم و فضل تھے آبادی اختیار کی۔ اشرف السوانح میں ہے "جیسے اس گرد و نواح میں مسلمان شرفاء کے بڑے بڑے قصبے ہیں مثلاً دیوبند۔ گنگوہ۔ کیرانہ۔ جھنجھانہ، کاندھلہ اور پانی پت وغیرہ ویسے ہندوستان میں کہیں اور نہیں پائے جاتے اور جتنی دین داری اور جتنا علم کا چرچا ان اطراف میں ہے۔ اتنا اور کہیں نہیں دیکھا گیا اور جس کثرت سے بڑے بڑے علماء و فضلاء و مشائخ اس حصہ ملک میں گزرے ہیں اور موجود ہیں اتنے اور کہیں نہیں،" اشرف السوانح جلد اول ص ۱۵۔ طبع اوّل

واقع ہے اسی مسجد میں حضرت سید صاحب فروکش ہوئے تھے۔
یہاں دس روز تک قیام فرمایا۔

"سید احمد شہید" میں لکھا ہے۔

سید صاحب پھلت (جو حضرت شاہ ولی اللہ کا ننھیالی وطن ہے) سے مظفر نگر ہوتے ہوئے دیوبند پہنچے دیوبند سے انبٹھا (جو دیوبند سے تین میل کے فاصلہ پر جانب جنوب واقع ہے) گئے۔ ان مقامات میں قاضی نجم الدین پندرہ آدمیوں کے ساتھ سید مقبول مولوی شمس الدین، قاضی علیم اللہ شیخ رجب علی۔ ان کے فرزند منور علی حافظ عبداللہ ان کے بھائی نظام الدین اور کریم الدین نیز ان کے والد امام بخش، کرامت حسین، محمد ماہ شیخ چاند، مولوی فرید الدین، مولوی بشیر اللہ سید محمد حسین وغیرہ اصحاب نے بیعت کی۔" ان حضرات میں سے جو حضرات سید صاحب کی خدمت میں پیش پیش رہے ان کے اسماء گرامی تو ملتے ہیں لیکن مفصل حالات نہیں ملتے جن حضرات کے حالات معلوم ہو سکے وہ درج کئے جاتے ہیں

۱۔ سید مقبول۔ ان کا پورا نام سید مقبول عالم[ؒ1] ہے۔ دیوبند کے خاندان سادات سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ بندگی سید محمد ابراہیم ہیں جن کا ذکر مفصل گزر چکا ہے۔

۲۔ مولوی شمس الدین۔ ابتداءً آپ بدعات کی طرف مائل تھے دیوبند میں سید صاحب کے ورود کی خبر سن کر مخالفت کے جوش میں ایک ہجو لکھی جو اسی وقت بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گئی۔

ایک مرتبہ سید صاحب کے دوران قیام ہجو پڑھنے کے لئے قاضی مسجد میں آئے کہ آخر سید صاحب کی طرف لوگوں کا اس قدر رجوع کیوں ہے؟[2] مسجد عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی۔ مولوی صاحب مجمع میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فوراً ان کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا "آپ ہی نے ہماری ہجو میں اشعار لکھے ہیں۔"

سید صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں فرمائے کہ مولوی صاحب تڑپ گئے اور معذرت کے بعد عرض کیا کہ اس گستاخی پر شرمندہ ہوں خدا کے لئے معاف کر دیجئے اور حلقۂ بیعت میں داخل فرمائیے۔ سید صاحب نے بیعت کر لیا۔ اور مرید ہو کر بالکل سید صاحب کے رنگ میں ڈوب گئے۔

بعد کے دور میں ان کے صاحبزادے مولانا عبدالخالق صاحب نے دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر میں بہت کام کیا۔ جامع مسجد دیوبند کی امامت و خطابت ان ہی کی اولاد میں چلی آرہی ہے۔

۳:۔ شیخ رجب علیؒ بن خورمند دیوان لطف اللہ عثمانی کی اولاد میں ہیں جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

۴:۔ مولوی بشیر احمد ابن شیخ عزیب اللہ۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ کی اولاد میں ہیں۔ ان کے گھرانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت تک منصفی کا عہدہ قائم رہا۔

۵:۔ مولوی فرید الدین ابن شیخ محمود بخش۔ دیوان لطف اللہ کی

---

[1] حافظ سید مقبول عالم ابن سید محمد عالم ابن سید محمد جمیل ابن سید محمد اسماعیل ابن سید محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہم۔

[2] اس آخری دور میں حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی قدس سرہٗ سے بیک وقت بیعت ہونیوالوں کی تعداد آٹھ ہزار تک شمار کی گئی ہے لاؤڈ اسپیکر پر بیعت فرماتے تھے۔ لیکن حضرت سید صاحب کے دست مبارک پر ان کے ان دوروں میں ان سے بیک وقت بیعت ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک بتلائی گئی ہے۔ ان دونوں مشائخ کے درمیانی دور میں اس کی نظیر نہیں ملتی سچ فرمایا گیا "یوضع لہ القبول فی الارض" اور یہ حضرات اسی کی روشن مثال تھے
حامد میاں غفرلہٗ

اولاد میں تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ سے تحصیل علوم کی تھی مزار مبارک دارالعلوم کے شمالی دروازہ کے سامنے میدان میں ہے۔ دارالعلوم کے دوسرے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحبؒ آپکے صاحبزادے تھے۔

۱۶ :- شیخ بلند بخت مولوی فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ شیخ بلند بختؒ کے دو چھوٹے بھائی مقصود علی اور سید احمد بھی سید صاحب کے ساتھ شریک جہاد تھے سید صاحب اہم معرکوں کو سر کرنے کے لئے ان کو مامور فرماتے تھے چنانچہ کوہ کنبر ڈی کی جنگ میں لڑائی کا نقشہ کچھ بگڑ گیا تھا مگر شیخ بلند بخت نے اپنی عسکری مہارت اور جرأت وہمت سے جنگ جیت لی۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے اپنی جگہ ان کو جانشین بنایا تھا۔ ان ہی اوصاف عالیہ اور حسن تدبر کی بناپر یہ سید صاحب کی مجلس مشاورت کے رکن بھی تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "ڈر موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں بس ہمیں کیا ڈر ہے۔" ان کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"بفضل خدا گشت بختم بلند"

صوبہ سرحد میں چھترپائی کی گڑھی پر حملے میں شیخ بلند بخت کے بھائی مقصود علی نے دوسرے چند غازیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا جب ان کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو نہایت صبر وضبط سے فرمایا "الحمد للہ! میرا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے" چنانچہ معرکۂ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ گولی کھا کر شہادت سے سرفراز ہوئے[1]۔

سید صاحب کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مقصود علی پشتو بے تکلف بول لیتے تھے ایک موقع پر ان کی پشتو دانی کی وجہ سے مجاہدین کو بڑی کامیابی ہوئی۔

۱۷ :- سید احمد برادر شیخ بلند بخت کے بارے میں بھی خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ انہوں نے بھی بالاکوٹ میں شہادت پائی ہے "تاریخ دیوبند" تحریر فرماتے ہیں "مولوی جعفر علی بستوی نے شہدا بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں شیخ بلند بخت اور ستو خان۔ ستو خاں اصل میں سید احمد ہیں بچپن کا نام ستو ہے بعد میں اُن کی جرأت مردانگی اور تہور کی بناء پر ستو خاں زبان زد ہو گیا یہ شیخ بلند بخت کے سب سے چھوٹے بھائی تھے راقم سطور کا یہ ننھیالی خاندان ہے۔" ص۲۲ تاریخ دیوبند[2]

(شاندار ماضی جلد دوم ص۲۲ پر ان حضرات کی کرامات جو دیوبند میں مشہور ہیں ذکر فرمائی گئی ہیں۔)

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ بالاکوٹ کے معرکہ میں ایک پل تڑوانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر سکے سید صاحب نے شیخ نصر اللہ خورجوی اور ستو خاں کو بھیجا انہوں نے پل توڑ دیا معرکہ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے اس خاص دستے میں شامل

---

[1] سید صاحب کے تذکرہ نگاروں نے یہ نام علی محمد لکھا ہے۔ لیکن ان کے خاندانی شجرہ کے مطابق صحیح نام مقصود علی ہے۔ علی محمد شیخ بلند بخت کے کوئی بھائی نہیں تھے تاریخ دیوبند مجاہدین کے شوق جہاد کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اکوڑہ میں سب سے پہلی جنگ کے موقع پر ایک مجاہد عبدالمجید خاں جہاں آبادی بیمار تھے۔ سید صاحب نے لشکر ترتیب دیتے وقت ان کا نام خارج کر دیا۔ انہیں معلوم ہوا تو خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ "آپ نے میرا نام کیوں نکال دیا"؟ سید صاحب نے فرمایا۔ "تم بیمار ہو" بولے کہ آج پہلا موقع ہے جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے آپ مجھ ضرور شامل رکھیں ان کے اصرار پر سید صاحب نے اجازت دیدی۔ (سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۰۱)

[2] ان کی کرامتیں میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا بھی سنایا کرتی تھیں میں نے بھی ان سے سنی ہیں (حامد میاں غفرلہٗ)

تھے جس نے نہایت جرأت اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے سید صاحب کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا اور شہید ہوا۔ ان میں شیخ بلند بخت کے سوا ان کے باقی بھائی غیر شادی شدہ تھے ان کی شہادت کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اس دستے کے سب ہی لوگوں نے شہادت حاصل کی۔ حالات بتانے والا کوئی زندہ نہیں بچا (بروز جمعہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو تاریخ حریت کا یہ المناک واقعہ پیش آیا[1]

۸۔ مجاہدین کے سب سے پہلے معرکہ میں جو اکوڑہ (صوبہ سرحد) میں پیش آیا جس میں ۳۰ مجاہدین شہادت سے سرفراز ہوئے ان میں دیوبند کے ایک صاحب، عبدالرزاق بھی شامل تھے۔ اس معرکہ میں ۳۵ مجاہدین زخمی ہوئے سات سو سکھ فوجی قتل ہوئے۔

۹۔ شہداء بالاکوٹ میں دیوبند کے ایک اور بزرگ عبدالعزیز کا اسم گرامی بھی ملتا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

۱۰۔ غازی حفیظ اللہ دیوبند کے ایک بزرگ۔

شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر محلہ ابوالبرکات موسوم ہے) کی اولاد میں سے تھے۔ سید صاحب کی معیت میں شریک جہاد رہے۔ یہ سید صاحب کے خلیفہ بھی تھے اور ان کے ہاتھوں پر ان کے والد ماجد نے بیعت کرلی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پاکیزگی سیرت کی عجیب حالت تھی۔ غلام رسول مہر صاحب نے لکھا ہے حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس نالہ میں (جو وہاں پہاڑی بارانی نالہ ہے) پہنچ گئے۔ وہاں ان کی بائیں آنکھ کے نیچے تیر لگا۔ اور اسکا پیکان پار ہوگیا۔ میاں جی چشتی نے انہیں پن چکیوں کے پاس سایہ دار درختوں میں بھیج دیا راستہ میں انہیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند غازی ملے جو سید صاحب کے پاس جا رہے تھے۔ حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے لگے دوسرے غازیوں نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ زخم کی وجہ سے معذور ہیں۔ وہ پھر پن چکیوں کے پاس پہنچے اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے رہے بعد میں سید صاحب کا فیل بان ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا[2] بعد میں ان پر سید صاحب سے عشق و تعلق کی بناء پر وارفتگی کا عالم طاری رہا۔ اہل دیوبند کے اصرار پر دیوبند آگئے تھے اور غازی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

تغمدهم الله جميعا برحمته ورضوانه واسكنهم الفردوس الاعلى من جنانه آمين

---

[1] تاریخ دیوبند بحوالہ سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۸۱ و ۴۱۳

[2] تاریخ دیوبند۔ بحوالہ سید احمد شہید ص ۴۱۴ بحوالہ وقائع۔ جلد سوم ص ۲۱۰ و ۲۱۱۔

مولانا سید حامد میاں صاحب

خونیں انقلاب ۱۸۵۷ء اور اہل دیوبند

سنہ ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں دوآبہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی ذیل کا رِحکومت ہوگئی تھی، اس نے اپنے مراکز بنانے شروع کر دیئے تھے سہارنپور میں مرکز قائم کر لیا تھا لیکن پوری طرح پورے علاقوں پر تسلط سقوطِ دہلی کے بعد ہوا۔ استخلاصِ وطن میں جو علاقے مسلسل کوشاں رہے اور جہاد کرتے رہے انگریزوں نے پوری طرح تسلط جمانے کے بعد ان سے بری طرح بدلہ لیا۔ اس پورے علاقے کی انگریز دشمنی کی حالت کیا تھی، وہ تو سب کے سامنے ہے کہ اسے وطن سے نکال کر ہی دم لیا! او رخلفاً عن سلف مسلسل تحریک جاری رکھی گئی، یہ نظریات حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے ان فکری اور روحانی وارثین میں جو بتوسط سید صاحب شہید قدس سرہٗ وابستہ ہیں چلتے ہی رہے ہے۔ سید صاحب کے افکار و نظریات کا یہ علاقہ کتنا بڑا مرکز تھا اس کا اندازہ مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہم کے والد ماجد مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ کے تبصرہ سے لگایئے۔ انہوں نے اس علاقے کا دورہ تقریباً سو سال بعد ۱۳۱۲ھ میں کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت سہارنپور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا ہے، جو ہے ان کی محبت میں چور ہے، میں نے اپنی عمر میں سید صاحب کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا"

شاندار ماضی جلد چہارم صہ ۲۰۲

اہل دیوبند نے اپنی بساط کے مطابق اسی روش پر چلتے ہوئے جہاد ۵۷ء میں حصہ لیا اور جب اس مسلح جنگ آزادی میں ناکامی ہوئی تو ہر وہ شخص جس نے آزادی وطن کی جنگ میں کوئی حصہ لیا تھا، برطانوی حکومت کا باغی اور مجرم قرار پایا۔ انگریزوں نے دوبارہ تسلط حاصل کرنے کے بعد جس غیظ و غضب کے ساتھ اس کا انتقام لیا وہ کیفیت شاندار ماضی[1] وغیرہ میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ صاحب تاریخ دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ صرف دیوبند میں ۴۴ اشخاص کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ آم کے جس درخت پر لوگوں کو پھانسی دی گئی، اس کو راقم سطور نے بھی دیکھا ہے، آم کا یہ درخت "سولی والا" کہلاتا تھا۔

۱۶ آدمیوں کو دس دس سال قید کی سزا دی گئی۔

۲۰ آدمیوں کو تین تین سال قید کی سزا دی گئی۔

۲۴ اشخاص پر جرمانہ عائد کیا گیا۔

---

[1] "شاندار ماضی" ان شاء اللہ جلد ہی طبع ہونے والی ہے۔ حامد میاں غفرلہٗ

۴۴ اشخاص سے آئندہ پرامن رہنے کی ضمانت لی گئی۔

۷ آدمی ایسے خوش قسمت تھے کہ ان کو کوڑے مار کر چھوڑ دیا گیا۔

مضافات کے تین گاؤں نذر آتش کر دیئے گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند، تھانہ بھون، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پھلت، کھتولی، جلالآباد، جھنجھانہ، بڈھانہ، نانوتہ، گنگوہ، منگلور، رڑکی، انبیٹھہ، رائے پور، ملم پور، منہیاران، وغیرہ اس علاقے کے مشہور قصبات ہیں ان کے خواص و عوام ہم خیال تھے، اس لئے بہت بڑے بڑے حضرات باوجود مسلح مقابلوں کے بچ گئے۔ انگریز مخبری کا جال اس علاقہ میں کامیاب نہیں رہا۔ شروع سے ہی ان حضرات نے پوری بیدار مغزی سے کام لیا جب کہ «جلد چہارم صہ ۲۰۵ پر، شاندار ماضی ہیں" ۱۸۵۷ء کے دہلوی مورخ شمس العلماء ذکاء اللہ خان کی ایک دلچسپ تحریر" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا گیا ہے، وہ لکھتے ہیں "سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانوی لڑہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے، وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحبِ تصنیف تھے، وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا، دراصل مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی، جو جنت المعلیٰ میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے ساتھ مدفون ہیں، خود ایک جلیل القدر شخصیت اور عظیم جماعت مجاہدین کے نمائندہ تھے۔ مولانا رحمت اللہ اور حضرت حاجی صاحب رحمت اللہ علیہما دونوں ہی انگریز کے پنجۂ استبداد سے بچ نکلنے میں بفضل الٰہی کامیاب ہو گئے، مکہ مکرمہ سے ہندوستان میں امور سیاسیہ کی قیادت فرماتے رہے۔ مولانا رحمت اللہ نے تو قسطنطنیہ پہنچ کر سلطان ترکی کے یہاں اعتماد بھی حاصل کر لیا تھا۔ ان حضرات نے اگرچہ انگریز سے جہاد بالسیف کیا لیکن پھر بھی بحمد اللہ یہ محفوظ رہے اور ان کے ساتھی اور قائم مقام اکابر بھی، بظاہر اس کی وجہ ان حضرات کا تدبر، حسن سیاست و کارکردگی اور عام علاقے کے عوام و خواص کا مجموعی سمجھدار اور صاحب فراست ہونا تھا۔

شمس العلماء ان اکابر کے ساتھ پڑھے ہوئے تھے مگر اپنی کتب میں انداز بیان اجنبیانہ اختیار کیا۔ دیوبند کے رقبے کا بڑا حصہ سیورہنال کے طور پر تھا۔ آئین اکبری میں دیوبند کے دسویں حصہ کو سیورہنال بتلایا گیا ہے اس کے بعد بھی اس میں مغل بادشاہوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا، ۱۸۵۷ء کے بعد قید و بند اور پھانسی کی سنگین سزاؤں کے علاوہ ان سب لوگوں کی معافی و دوام زمینوں کو بھی سرکار ضبط کر لیا گیا۔ (تاریخ دیوبند صہ ۱۸۶)

تجارت پیشہ لوگوں کے علاوہ زمینداروں طبقہ کی مرفہ الحالی کا اندازہ ان عالیشان حویلیوں سے کیا جا سکتا ہے جو اس دور میں تعمیر ہوئیں، تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے کہ دیوبند کی بیشتر اراضی معافی دوام تھی، جو مسلمان بادشاہوں، روہیلوں اور مرہٹوں کے عہد حکومت میں دی جا رہی تھی برطانوی حکومت کے زمانہ میں ضبط ہو کر "محالِ منضبط" قرار دی گئی۔

تاریخ دیوبند صہ ۲۴۷

بنز بحوالہ تاریخ سہارنپور صہ ۱۶۱

سیورہنال کی ان زمینوں کے ضبط ہو جانے سے شیوخ (عثمانی و صدیقی) کے بہت سے مرفہ اور مرفہ الحال خاندان نانِ جویں تک کے محتاج ہو گئے۔ اس وقت انگریز حکام کے غیض و غضب کا یہ عالم تھا کہ

ع جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے "

(تاریخ دیوبند صہ ۱۸۶)

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا جس میں اہل اللہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، یہ علمی اور سیاسی مرکز بنا۔ یہیں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا قدس سرہ کا وجود مسعود ۱۸۵۷ء کے دور کے بعد سب سے عظیم تر انقلابی تھا جس میں ان کی روحانیت کو بڑا دخل تھا ہم نے ۱۹۶۲ء میں امیر جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب سے سنا

کو مسلمانوں کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ جس طرح سب حضرت شیخ الہند
رحمۃ اللہ کے زمانہ میں جمع ہو گئے تھے، یہ تو محال ہے البتہ اپنی سی کوشش
کی جا سکتی ہے" اس کے بعد ان کا خطاب تین گھنٹے جاری رہا جس کے بعد
ظہر کی نماز کا وقت قریب آگیا تھا۔ انہوں نے یہ خطاب مدرسہ صولتیہ میں
نچلی منزل کے بڑے کمرے میں فرمایا تھا، اس میں ہند و پاکستان کے چیدہ چیدہ
علما کو بلایا گیا تھا جن کی تعداد بیس بائیس کے قریب تھی، بیٹھ کر ہی خطاب
فرمایا تھا، مجھے بھی از راہ شفقت مدعو فرما لیا تھا، مجھے حضرت شیخ الہند
قدس سرہ کی عظمت شان کا اتنا علم نہ تھا جتنا حضرت مولانا محمد یوسف
صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اس دن سنا اور سن کر محو حیرت ہو گیا۔

اس مجلس میں مولاناؒ کے قریب فرانس کے مبلغ بھی بیٹھے تھے مولانا نے
اس روز پورے عالمی حالات پر ہر اعتبار سے جامع خطاب فرمایا تھا،
جو حضرات اس مجلس میں شریک ہوئے ان میں جوان اور عمر رسیدہ علما
سب ہی تھے۔ ان حضرات کو شاید اور بھی باتیں مجھ سے زیادہ یاد ہوں کاش
وہ خطاب ٹیپ کر لیا گیا ہوتا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پورے اور مکمل حالات اس
لئے جمع ہی نہیں ہو سکے کہ انگریز کی دسترس سے کوئی جگہ محفوظ نہ تھی اس
کی سلطنت پر سورج ہی غروب نہ ہوتا تھا۔

اسی سفر میں مدینہ منورہ میں ایک معمر بزرگ مولانا محمد القرشی
رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ سندھ کے رہنے والے
تھے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ القرشی بڑے قانون دان اور انگریزی
زبان سے بھی واقف ہیں۔ گھڑیوں کی دکان ہے، مولانا محمد القرشیؒ خود
تحریک شیخ الہند کے ایک کارکن تھے۔ اسی بنا پر ترک وطن کر کے سندھ سے
مدینہ منورہ جا بسے۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک
آزادی ہند پر ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی تھی، لیکن جب وہاں بھی
انگریزی تسلط ہوا تو ایسے لوگوں کی خانہ تلاشی لی جانے لگی اور سامان ضبط کر لیتے
برطانیہ کے حوالے کیا جانے لگا تو اسی اندیشے سے انہوں نے اپنی اس ضخیم کتاب
کو تلف کر دیا کیونکہ ان کے بارے میں بھی مخبری کر دی گئی تھی۔ میں نے ان
سے گذارش کی کہ دوبارہ اب مرتب فرما دیں لیکن وہ اتنی بڑی اور مفصل
تحریر تھی کہ اسے دوبارہ مرتب کرنا بے حد مشکل تھا، ممکن ہے انہوں نے
کچھ مواد مرتب فرمایا ہو مگر مجھے اس کا پتہ نہیں۔

نہ معلوم اس طرح کتنے اکابر تھے جن کی معلومات ان کے ساتھ ہی
رخصت ہو گئیں، انگریز کے آخری دور میں یہی حال رہا ہے۔ والد ماجد
قدس سرہٗ نے "الجمعیت" کے مجاہد ملت نمبر میں تحریر فرمایا ہے کہ آخری دور
تک تمام معلومات راز میں رکھی جایا کرتی تھیں، کسی کا رہنمائی کا کوئی ریکارڈ
نہیں رکھا جاتا تھا۔

مجاہد ملت نمبر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی
وفات پر شائع ہوا تھا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ
۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو وفات پائی۔ آپ کو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر جب
غسل کے لئے لٹایا گیا تو پیٹھ بالکل سیاہ ہو رہی تھی اور اس پر نشانات تھے
لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر ہوئے۔ آپ کے ان رفقاء نے جو اسارتِ مالٹا
میں ساتھ تھے بتلایا کہ یہ نشانات ان دروں کے ہیں جو اسارت مالٹا میں
آپ پر پڑتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ شیخ الہندؒ نے ہمیں ہدایت کی تھی
کہ میرے سامنے ان مصائب کا جو مجھ پر ٹوٹ رہے ہیں کبھی ذکر نہ کرنا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن

مصنفہ ڈاکٹر اقبال حسن خان پی ایچ ڈی صہ ۱۵۳

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے اخفا کا یہ حال تھا کہ کتمان حسنات
طبیعت ثانیہ تھا تو ایسی صورت میں ان کے کارنامے اور بھی مستور رہے
نیز جب وہ اسارت سے رہا ہوئے تو وہ ہی انگریزی دور تھا، اور
تحریک جاری تھی اور حضرت کے جوش جہاد کا وفات تک یہی حال تھا،

کہ اسی دن جس شام کو وفات ہوئی ذرا گفتگو کی قدرت ہوئی تو ارشاد فرمایا: "ترے کا آگے افسوس نہیں تمنا آرزو تھی کہ میں میدانِ جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے"

(ایضاً صفحہ ۱۵۲)

کوئی ایسی فضا ان کشتگانِ تسلیم و رضا کو میسر نہیں آسکی جہاں سب مل بیٹھتے، مراکز جو خفیہ تھے خفیہ ہی رہے اور ان حضرات کی یہ نیکیاں جزا یوم قیام میں محض رضا رب انام کے لئے محجوب رہیں۔

ان کے کارناموں کا سراغ تو لگ سکتا ہے مگر تفاصیل جمع ہونی مشکل ہیں۔ باہم ایک دوسرے سے کیسے رابطہ رہا، بجز خدائے تعالیٰ کے کون کیا جانے۔

شکر اللہ مساعیہم وتغمدہم برحمتہ ورضوانہ واسکنہم الفردوس الاعلی من جنانہ (آمین)

بہرحال یہ علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کس طرح قائم ہوا جس میں ایسے بزرگ پیدا ہوتے اس کا کچھ خاکہ اگلے مضمون میں پیش کیا جائے گا۔ اس سے قبل مناسب ہے کہ یہاں دیوبند کے اس دور کے ان معروف علماء بزرگ حضرات کا تذکرہ بھی مختصراً کر دیا جائے کہ جن کی پیدائش یا عمر کا معتدبہ حصہ تیرھویں صدی میں گذرا ہے کیونکہ یہاں تک دیوبند کے بارھویں صدی کے بزرگوں کا اجمالاً کچھ ذکر آچکا ہے۔

حضرت مولانا رفیع الدینؒ وفات ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء،

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ (۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء) کے مشہور خلفاء میں تھے گو علمی حیثیت بہت معمولی تھی مگر اپنے زمانہ کے اولیائے کاملین میں ان کا شمار ہوتا تھا، اسی کے ساتھ انتظامی امور کا زبردست ملکہ حاصل تھا عرصہ تک دارالعلوم کے مہتمم رہے (تقریباً ۱۹ سال) آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے بڑی ترقی کی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن آپ سے بیعت تھے۔ مدینہ منورہ میں وفات ہوئی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے آپ ہی کا واقعہ ہے کہ جب ۱۳۹۲ھ میں نو ملکے کی عمارت کی جو موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے، بنیاد کھدائی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے" مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر عمیر شروع کروائی گئی (تاریخ دیوبند صہ ۶۷، وصہ ۲۸۲) اور شیخ بلند بخت شہید بالاکوٹ آپ ہی کے چچا تھے۔ رحمہم اللہ۔

ملا محمودؒ (وفات ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) علوم حدیث و فقہ کے فاضل استاد تھے، میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں ملازم تھے۔ چھتہ کی مسجد میں جب اولاً دارالعلوم قائم ہوا تو اس کی مدرسی کے لئے حضرت نانوتویؒ کی نظر انتخاب جن پر پڑی وہ یہی ملا محمود تھے یہ دارالعلوم کے سب سے پہلے مدرس تھے۔

حضرت شیخ الہند نے چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے ان ہی سے پہلا سبق پڑھا تھا۔ حضرت نانوتویؒ کے مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے۔

در حدیث و فقہ و تفسیر و اصول شہرتِ کامل بدار و در فحول،
ز لیعی و لوذعی و دریائے علم منبع خلق و تواضع کانِ حلم
بر زبانش ہست مضمون کتاب،
ہست تقریرش چو بارندہ سحاب

مولانا فصیح الدین، دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے تحصیل علم حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ (۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء) سے شرف بیعت حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے، محکمہ تعلیم کی فرمائش پر (۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۶ء) میں ضلع سہارنپور کا جغرافیہ لکھا، جو اس ضلع کا غالباً سب سے پہلا جغرافیہ ہے کہ "اٹھارہ سو چھیاسٹھ سن" کے اعداد سے اس کی ہجری تاریخ بھی نکلتی ہے۔

مولانا فصیح الدین دارالعلوم کے معاون رہے، مدرسہ کو کتابیں

بھی دیتے رہے۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں وفات پائی۔

حافظ لطافت علی: مجذوب صفت بزرگ تھے، آپ کی سوانح حیات تذکرہ حافظ کے نام سے الگ لکھی گئی ہے۔

سہارنپور کے قریب شیخپورہ میں مدفون ہیں (۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء)

المولوی عظمت علی: (وفات ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) حافظ لطافت علی سے خلافت حاصل تھی، یہ بھی مجذوب صفت تھے، دارالعلوم سے متصل جانب شمال ان کا مزار ہے۔

مولانا ذوالفقار علیؒ: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ کے والد ماجد تھے، ۱۲۳۷ھ میں پیدا ہوئے، دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ (وفات ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) سے پڑھا فراغت کے بعد بریلی کے کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، چند سال کے بعد محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر ہوگئے۔ عربی زبان وادب پر بڑی دسترس تھی۔ دیوان حماسہ، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، اور قصیدہ بانت سعاد اور قصیدہ بردہ کی شروح تحریر فرمائی ہیں، معانی وبیان میں تذکرۃ البلاغۃ اور ریاضی میں تسہیل الحساب ان کی یادگار ہیں

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں عربی زبان میں ایک مختصر رسالہ الھدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیۃ کے نام سے لکھا ہے جس میں بزرگان دارالعلوم کے اوصاف وکمالات اور سرزمین دیوبند کی خصوصیات بڑے لطیف اور ادیبانہ انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ پنشن پانے کے بعد آنریری مجسٹریٹ رہے دارالعلوم دیوبند کے اولین بانیوں میں سے تھے، چالیس سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۰ سال وفات پائی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پہلو میں جانب مشرق ان کی قبر مبارک ہے، ان کی بائیں جانب مولانا محمد احسنؒ نانوتوی مدفون ہیں۔

اسی پر حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ عثمانی نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہاں بجنب آسودہ تر　مابین دو یاران خویش
قاسم بزم مودت　احسن شائستہ خو

جناب حاجی سید محمد انورؒ رحمۃ اللہ علیہ

ؒ ان کی شہرت ومقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ان کی وفات پر تاریخ وفات نظم کرنے والے ہندوستان بھر کے مختلف مقامات کے بڑے بڑے حضرات ہیں۔ ایک سو پچیس شعراء وعلماء اکابر نے بلکہ غیر مسلموں نے بھی کلام منظوم میں تاریخ وفات لکھی ہے جن میں مولانا عبدالعلیم صاحب مبارکپوری مولانا عبدالجبار صاحب پروفیسر عربیک کالج جبلپور، مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند، محدث عصر حضرت مولانا ظہیر احسن صاحب، شوق نیموی عظیم آبادی　شاہزادہ مرزا زیبندہ بخت بہادر تیمور گورگانی ابن السلطان المعظم سراج الدین محمد بہادر شاہ، بادشاہ نور اللہ مرقدہ، مولانا مولوی اصغر علی صاحب روحی ایم او ایل پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، لقا غازی پوری، بمولانا ابوالمیز مظہر عالم وجہ السلام محمد صفی الدین، قصبہ مونگیر ضلع دربھنگہ، ملک الشعراء امیر مینائی لکھنویؒ، محمد افضل علیخان صاحب بہادر افضل شوکت جنگ لکھنوی۔ نواب کنور اعتماد خان صاحب بہادر سعد آباد، دہاراجہ سری جیت پرتاب بہادر والیٔ ریاست تنکوہی۔ راجہ محمد امیر حسن صاحب والیٔ ریاست محمود آباد داخل ہیں۔ ان کے علاوہ بکثرت حضرات بمبئی کلکتہ امرتسر وغیرہ سب اطراف کے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اثرات ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، ملاحظہ فرمائیں ملفوظات انوری مصنفہ اکرم علی صاحب مطبوعہ ۱۳۱۵ھ مطبع مجتبائی دہلی

حاجی محمد عابد مہتمم اول دارالعلوم دیوبند کے رشتہ دار اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ سال پیدائش ۱۲۵۰ھ ہے۔ ۲۰ جمادی الاول ۱۳۳۱ھ ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء میں آپ نے وفات پائی۔ سرائے پیرزادگان میں آپ کا مزار ہے۔

آپ کے بارے میں حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں

حضرت حاجی انور صاحب دیوبندی خلیفہ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ دیوبندی بھی بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے بلکہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے شیخ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ حج سے واپس آنے کے بعد ان کے اوپر ایسی حالت طاری ہوئی جس سے لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ جنون ہو گیا ہے، اپنی چیزیں لوگوں کو مفت دے ڈالتے۔ کھانے بکثرت پکوا کر تقسیم عام کراتے اور ہر وقت ایک سکر کی سی کیفیت غالب رہتی اس زمانہ میں حضرت والا اتفاق سے دیوبند تشریف لائے تو عیادت کے لئے پہنچے۔ حاجی صاحب نے حضرت والا سے خلوت میں فرمایا کہ آپ سے ایک بات کہتا ہوں جو میں نے اب تک کسی سے ظاہر نہیں کی لیکن اب آپ اس کو میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کریں۔ وہ یہ بات ہے کہ میں نے حرم شریف میں بعض انبیا علیہم السلام کی بیداری میں زیارت کی ہے جو میری حالت ہے یہ انہیں حضرات کی نظر کا اثر ہے۔

حضرت والا سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تنہائی میں کوئی خاص بات فرمائی ہے۔ حضرت والا نے یہی بات فرمادی کہ ہاں ایک خاص بات تو ہے لیکن مجھے ممانعت فرمادی ہے کہ میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کرنا، اس لئے میں اس کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ حضرت والا نے حسب وصیت حاجی صاحب کی زندگی میں کسی پر وہ بات ظاہر نہ فرمائی البتہ بعد وفات اظہار کا اہتمام نہیں فرمایا، اس واقعہ سے بخوبی ظاہر ہے کہ حاجی صاحبؒ نے اپنے اس خاص راز باطنی کا اہل حضرت والا کو سمجھا اور کسی پر اس کا اظہار نہ فرمایا بلکہ حضرت والا کو بھی اس کے اظہار سے ممانعت فرمادی۔

اشرف السوانح صہ ۱۴۹ تا صہ ۱۵۱

باب دوازدہم مطبوعہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی

سید محمد حسن نبیرہ سید غلام رسول بغدادی رحمۃ اللہ علیہما

سید محمد حسن ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے، آپ سید غلام رسول صاحب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہوتے ہیں اور دیوبند کے مشہور بزرگ سید محمد عبداللہ صاحب عرف میاں جی منے شاہ صاحب آپ کے ماموں ہوتے ہیں۔

میاں جی منے شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات اور شجرہ نسب کا پتہ نہیں چل سکا یہ بزرگ اولیا کاملین میں سے تھے۔ ان کے زمانے کے تمام بزرگ ان کی درویشی اور بزرگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد جن حضرات سے رکھوایا ان میں میاں جی بھی شامل تھے، فارسی کے نہایت باکمال استاد تھے، قلعہ کی مسجد میں ان کا مکتب جاری تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعلیم میں بڑی برکت دی تھی، شاگردوں میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ میاں جی منے شاہؒ نے ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء میں وفات پائی، بندگی شاہ محمد عمر کے قبرستان میں مزار ہے۔

مولانا فضل الرحمان عثمانی (وفات ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء)

ؔ ایک بار دوران درس حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے میاں جی منے شاہ صاحب کا واقعہ نقل فرمایا کہ لکھنؤ کی طرف سے ایک معروف عالم دیوبند تشریف لائے تو میاں جی صاحب ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آئے۔ نیت باندھی اور تھوڑی دیر بعد نیت توڑ کر چلے گئے کہ امام صاحب تو اینٹوں کے بھٹے میں گئے ہوئے ہیں، دریافت کرنے پر ان عالم نے بتلایا کہ میں گھر اینٹوں کے عمارت کے واسطے کہہ آیا تھا، مجھے نماز میں ان کا خیال آیا تھا، میاں جی منے شاہ صاحب کے ایسے واقعات بہت مشہور ہیں اور حضرت میاں اصغر حسین

(باقی صفحہ ۷۶۵ پر)

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے مجلس شوریٰ کے آخر عمر تک رکن رہے۔ دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی، فارسی اور اردو کے بلندپایہ شاعر تھے۔

خانقاہ و مدرسہ سرائے پیرزادگان کا ذکر پہلے گذر چکا ہے طلبہ اور روحانی مستفیضین کی تعداد کی کثرت کی بنا پر اس کے نام اوقاف تھے لیکن ایک حادثۂ عظیم کے بعد اس کا احیاء نہ ہوسکا تھا اس کے بعد آخری زمانہ میں دیوبند میں قدیم طرز کے صرف تین مدرسوں کا پتہ چلتا ہے۔
ایک مدرسہ مولوی مہتاب علی[۲] کا تھا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی عربی تعلیم کا آغاز اس مکتب سے ہوا تھا۔
دوسرا مدرسہ میاں جی امام علی کا تھا جو امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے اور تیسرے مدرسہ میں جو جال سنگھ مصر رئیس دیوبند کے مکان پر جاری تھا، دیوبند کے مشہور بزرگ میاں جی منے شاہ پڑھاتے تھے، ان مدرسوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھا کرتے تھے۔

فَقَط هٰهُنَا تَمَّ مِنَّا الكَلَام
عَلیٰ مُصطَفٰنَا اَلُوفُ السَّلَام

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بقیہ صفحہ ۷۵۲) صاحب کے بھی اسی طرح کشف و کرامات کے واقعات، جنات کے واقعات اور ان کے موثر تعویذات بہت مشہور ہیں۔ جن حضرات نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے اور حضرت میاں صاحب کا شرف تلمذ حاصل ہوا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں حضرت اقدس مولانا السید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرف میاں صاحب (ابن جناب سید محمد حسن صاحبؒ) پیدائش ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء وفات ۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء، نے حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث و تفسیر پڑھی، دارالعلوم میں حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے، اردو زبان میں پینتیس کتابیں تصنیف فرمائیں۔ یہ کتابیں عوام و خواص میں بہت مقبول ہیں، گجرات کے علاقہ راندیر میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً
(از تاریخ دیوبند)

حضرت مولانا اختر حسین صاحب مدرس علیا دارالعلوم دیوبند ہیں اور ان کے دوسرے بھائی حضرت حاجی بلال صاحب تعویذات میں وہی ملکہ و قوت رکھتے ہیں۔ کثر اللہ امثالہم (حامد میاں غفرلہٗ)

[۱] اب سید ابراہیم رحمۃ اللہ کی اولاد سرائے سے شہر میں آباد ہو چکی ہے، صرف دو ایک گھر باقی رہ گئے ہیں، وہ بھی خستہ حال اور روایات سلف سے عاری۔

[۲] مولانا مہتاب علی صاحب (وفات ۱۲۹۳ھ) مولانا ذوالفقار علی کے بڑے بھائی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے تایا جان تھے۔
تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانہ میں جو مدرسہ قائم تھا اس میں عربی پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم قائم کرنے کے لئے پہلا چندہ حاجی محمد عابد صاحب کا تھا، اور دوسرا چندہ ان ہی مولانا مہتاب علی صاحب نے دیا قیام دارالعلوم کے بعد اس کی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے۔

مرکزی دارالحکومت میں

علوم اسلامیہ کی معیاری درسگاہ

دارالعلوم حنفیہ عثمانیہ (رجسٹرڈ)

محلہ ورکشاپی ——— راولپنڈی

——— بانی ———

مجاہدِ ملت حضرت مولانا الحاج عبدالحنان ہزاروی (فاضل دیوبند خطیب صدر راولپنڈی)

یہ دارالعلوم بانی مرحوم نے محلہ ورکشاپی کی جامع مسجد میں قائم فرمایا اور طلبہ کی ضروریات کے لیے مسجد کے ساتھ ہی کمروں اور برآمدوں کا انتظام کیا۔ یہ عمارت ۸ کمروں اور ۲ طویل برآمدوں پر مشتمل ہے۔

مرحوم بانی نے مرکز علمی دارالعلوم دیوبند کی طرح ایک باقاعدہ مجلس منتظمہ تشکیل دی، جو ادارہ کے تمام نظام کی نگران و ذمہ دار ہے اور باقاعدہ رجسٹرڈ ہے۔ مدرسہ میں ابتدا سے دورۂ حدیث تک مکمل درس نظامی کا معقول انتظام ہے۔ جگہ کی تنگی کے پیش نظر ریلوے ورکشاپ روڈ پر دس کنال زمین مدرسہ کے لیے خرید لی گئی ہے۔ جس میں جامع مسجد، دارالحدیث، درسگاہیں، اقامتی کمرے اور مکانات اور کتب خانہ وغیرہ تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ ۱۸ کمروں کی بنیادیں بھر دی گئی ہیں جبکہ چار کی تعمیر شروع ہے۔

مدرسہ ملک کی سب سے بڑی تنظیم مدارس وفاق المدارس العربیۃ سے ملحق ہے۔

اہل خیر اور اصحاب ثروت کی خصوصی توجہ سے یہ مرکز علمی بہت جلد پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے

(قاری) محمد امین مہتمم دارالعلوم حنفیہ عثمانیہ (رجسٹرڈ) محلہ ورکشاپی راولپنڈی

محمد فاروق قریشی

اگر دارالعلوم نہ ہوتا؟

دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جو انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں وہ محتاج تعارف نہیں۔ برصغیر کی تاریخ سے معمولی دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ابنائے دارالعلوم فکر و عمل کے ہر میدان میں قیادت و راہنمائی کے منصب بلند پر فائز رہے ہیں۔ فکر و عمل کا کوئی گوشہ ایسا ہو گا جو فضلائے دارالعلوم کی حیرت انگیز جد و جہد کا رہین منت نہیں یا پھر یہ کہ برصغیر ہی نہیں بلکہ اکناف عالم میں فرزندانِ دارالعلوم نے جانگداز مصائب برداشت کر کے دینی ملی اور قومی خدمات کے پھریرے نصب کیے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے فضلاء دارالعلوم کی ہمہ جہت خدمات عظیمہ کو احاطہ تحریر میں لایا جانا ممکن ہی نہیں بالاختصار عرض کیا جا سکتا ہے کہ اگر دارالعلوم دیوبند نہ ہوتا تو:۔

★ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بظاہر ناکام ہو جانے والی شکستہ دل مسلمان قوم کی دینی و قومی روایات کا تحفظ نہ ہوتا۔

★ تعلیماتِ ولی اللّٰہی کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کا اہتمام نہ ہوتا اور تحریک سید احمد شہید کو برگ و بار میسر نہ آتے۔

★ دیانند سرسوتی، سوامی شردھانند، پادری فنڈر اور اس قبیل کے دیگر اسلام دشمن افراد کی چلائی ہوئی تحریک فتنۂ ارتداد کی سرکوبی و بیخ کنی نہ ہوتی۔

★ پاک و ہند اور دیگر براعظموں میں مدارس و مساجد کے ذریعہ قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں نہ گونجتیں۔ برصغیر کے چپہ چپہ پر مدارس اور مساجد کے جال بچھائے جانا فرزندانِ دارالعلوم ہی کی کوششوں اور کاوشوں کا رہین منت ہے۔

★ دین و دنیا کو الگ الگ کرنے کی رسوائے زمانہ فرنگی سازش کامیاب ہو جاتی اور اسلام ایسا ہمہ گیر دین محض "پرسنل عقیدہ" ہو کر رہ جاتا۔ تحریک آزادی کی مسلمانوں کے مقدس خون سے آبیاری نہ ہوتی اور فرنگی سامراج کے ظالمانہ اقتدار کی رسی مزید دراز ہو جاتی جس کے بعد وہ مسلمانوں کو رنگ و نسل کے اعتبار سے مسلمان اور فکر و نظر کے اعتبار سے عیسائی بنانے میں مکمل طور پر کامیاب ہو جاتا حتیٰ کہ مسلم قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی علیحدہ مملکت وجود میں نہ آتی۔ ★ اتحاد عالم اسلامی کی منظم تحریک، تحریک ریشمی رومال کے نام سے وجود میں نہ آتی۔ اس تحریک نے بدیشی قوم کے دل و دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور اس تحریک کی قیادت و راہنمائی کا شرف بھی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالبعلم، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو حاصل ہوا جس کی پاداش میں اس بطل جلیل اور اس کے جانثار ساتھیوں کو وطن سے دور جزیرہ مالٹا میں طویل مدت کے لیے پس دیوارِ زنداں ہونا پڑا۔ ★ اسلام کے خلاف مستشرقین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات اور اسلام و پیغمبر اسلام ﷺ پر کیے گئے جارحانہ حملوں کا شافی و کافی جواب نہ دیا جاتا اور جس کا جی چاہتا "لائف آف محمد" اور "رنگیلا رسول" ایسی شرمناک کتابیں تصنیف کرتا۔ ★ علم حدیث اور علم تفسیر کی لاتعداد علمی کتابیں وجود میں نہ آتیں اور ایسی عام فہم اور بین الاقوامی زبان میں اسلامی لٹریچر منتقل نہ ہوتا۔ ★ عظمتِ صحابہؓ اور عزتِ اسلاف کا تحفظ نہ ہوتا۔ ★ سارقین ختم نبوت کا علمی و عملی تعاقب نہ کیا جاتا۔ ★ بدعات کے اندھیاروں میں سنت کی مشعلیں روشن نہ ہوتیں اور الحاد و زندقہ، تجدد و نیچریت کے خد و خال نہ دھندلاتے۔ ★ علم و عمل کی اس فقید المثال چھاؤنی سے عالم، فاضل، مفسر، محدث، متکلم، فقیہہ، مفتی، مقرر، خطیب، مناظر، مدرس، سیاس، قراء اور حفاظ تیار نہ ہوتے۔

القصہ یہ دارالعلوم ہی کا فیضان ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں خدا کے آخری دین کے چراغ روشن ہوئے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

محمد شریف شبوہ

تُونے بکھرے موتیوں کو آج یکجا کر دیا	سچ تو یہ ہے بند اِک کوزے میں دریا کر دیا
ناز جتنا بھی کریں تجھ پر، وہ کم ہے "الرشید"	تُونے ذرّوں کو ستاروں سے شناسا کر دیا
سینکڑوں اہلِ صحافت کر نہ پائے تھے جسے	مرحبا وہ کام تُونے آج تنہا کر دیا
تیرے مضمونوں کے عنواں آفتاب و ماہتاب	منزلِ تاریخ کا پُرنور رستا کر دیا
بھُولی بسری داستاں تھی، بکھرے بکھرے واقعات	تُونے کڑیاں جوڑ کر اِک ربط پیدا کر دیا
چھیڑ کر مردانِ حق کی داستانِ قید و بند	ہر دلِ حسّاس میں اِک حشر برپا کر دیا
تیرا یہ نمبر سنہری باب ہے تاریخ کا	زندۂ جاوید تُونے نام اپنا کر دیا
تُونے ہر دل میں سجایا نقشہ دارالعلوم	ہر نظر میں تُونے اس کا نقش پیدا کر دیا

کاش! میں بھی دیکھ سکتا، ان کو شبوہ اِک نظر

وہ کہ جن لوگوں نے اس ملت کو زندہ کر دیا

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان ——— ملک میں

سامراجی اثرات کے خاتمہ

اسلامی نظام کے نفاذ

اور

جمہوری اقتدار کی بحالی

کے لیے شب و روز جدوجہد میں مصروف ہے اور جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام اسلامیان پاکستان کے تنازعات کے اسلامی تصفیہ کیلیے

— ملک بھر میں —

شرعی عدالتوں کا نظام

عملی جدوجہد کا آغاز کر رہا ہے

اسلامیان پاکستان سے اپیل ہے کہ اس مقدس جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ ولے، قدمے، سخنے تعاون فرمائیں

منجانب

مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

حکایتِ مہر و وفا

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(از حضرۃ سید نفیس الحسینی)

جس زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی تجدیدی شان جلوہ گر ہوئی تو ایک جہانِ بسیط نے سعادت و ہدایت کی روشنی پائی۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ ان کے مرتبہ و مقام کی پہچان سے قاصر رہا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی ذاتِ والا صفات کے خلاف فتویٰ بازی میں مشغول ہو گیا۔ بڑی بڑی کتابیں ان کے رد میں لکھیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس حضرت مجدد قدس سرہٗ کا آفتاب عالمتاب آج بھی پوری آن بان اور شان سے نور افشاں ہے۔ یہی صورت حال حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ اور مجدد مائۃ سیزدہم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے زمانے میں پیش آئی۔ ان کا پھریرا بھی بحمد اللہ پورے وقار سے لہرا رہا ہے۔

بزرگانِ دیوبند کی تجدیدی تحریک بھی حضرت مجدد الف ثانی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ تعجب نہیں اگر انھیں بھی اپنے پیش روؤں کی طرح باطل سے ٹکرانا پڑا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ہر زمانے میں ایسے بندگانِ خدا بھی ہوتے ہیں کہ سعادتِ ازلی کے نور سے وہ حق و باطل میں فوراً تمیز کر لیتے ہیں۔

ذیل میں دارالعلوم دیوبند اور اکابر علماء دیوبند کے بارے میں چند معاصر علماء و مشائخ اور کچھ دیگر بزرگوں کے تاثرات پیش کیے جاتے ہیں

حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۰۳ھ)

آپ قطبِ ربانی، رئیس المجاہدین، غازیٔ اسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات قدس سرہٗ (م ۱۲۹۵ھ) کے خلیفۂ اعظم تھے۔ مزار مبارک سہارنپور میں ہے۔ آپ اکابر علمائے دیوبند کے معاصر تھے۔ مولانا عبداللہ شاہ صاحب کرنالیؒ "تعلیماتِ رحیمی" میں تحریر فرماتے ہیں اکہ حضرت پیرو مرشد (حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوریؒ) بدرجۂ غایت متبع سنت اور محترز از بدعت تھے۔ کبھی عرس اور محفل رقص و سرود و شعر خوانی میں شریک نہیں ہوتے تھے اور اپنے خادمان کو اتباع شرع کا تقید فرماتے تھے اور بدعات سے منع فرماتے تھے۔ (تعلیمات رحیمی۔ ص ۵۲، ۵۳)

آپ کا فیضان باران رحمت کی صورت تھا، آپ کے خلفاء کرام کے نام اس ترتیب سے لکھے ہیں۔ ص ۱۰۰، ۱۰۹

۱۔ حضرت مولانا محمد امیر باز خاں صاحب قدس سرہٗ
۲۔ حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب جلال آبادی ثم الکرنالی قدس سرہٗ
۳۔ حضرت مولانا شاہ ابوالحسن سہارنپوری قدس سرہٗ
۴۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نوراللہ مرقدہٗ جو کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مجاز تھے۔
۵۔ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ساکن نہتم ضلع رہتک نفعنا اللہ مضجعہ
۶۔ حضرت مولانا قاری عبدالکریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تخت ہزاروی
۷۔ حضرت مولانا نور محمد صاحب لدھیانوی نوراللہ مضجعہ

حضرت مولانا محمد امیر باز خاں صاحب جانشین اور حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحبؒ دونوں مدرسہ دیوبند ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ باقی تمام خلفاء پر بھی اکابر علماء دیوبند کا مسلکِ اعتدال ہی غالب تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب سے ایک صاحبؒ نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی نسبت دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ حضرت مولانا کی نسبت بہت قوی اور غیر متناہی ہے" (رہنمائے طریقت مطبوعہ کراچی ۱۳۸۴ھ)

حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب قدس سرہٗ کے سلسلے میں اس وقت حضرت مولانا طفیل احمد صاحب قادری (حال مقیم خانقاہ قادریہ

محمد (کراچی) صاحب ارشاد ہیں جو بزرگان دیوبند کے شیدائی ہیں۔

قطب عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء) کا سلسلہ آفتاب کی طرح روشن ہے۔ آپ نے ترویج اشاعت سُنّت نبویؐ میں کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ آپ کے خلیفۂ اعظم و جانشین برحق قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری (م ۱۳۸۲ھ) قدس سرہٗ نے عرب و عجم میں اس سلسلے کو پھیلا دیا ہے۔

• حضرت قاری عبدالکریم صاحب تخت ہزاروی کے سلسلے میں اس وقت جناب صوفی برکت علی صاحب لدھیانوی دارالاحسان سالار والا ہیں جن کے حلقے میں جدید طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض بڑے افسر بھی شامل ہیں۔

جناب صوفی صاحب مدظلہٗ اکابر علماء دیوبند حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ وغیرہم کو مقبول بارگاہ خداوندی سمجھتے اور ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کو تو وہ حضرت علاءالدین علی احمد صابر کلیریؒ ہی کا مدرسہ کہتے ہیں۔ اس بناء پر کہ بزرگان دیوبند سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کے چشم و چراغ ہیں۔

حضرت صوفی نور محمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرّاقم المدارس کے بانی اور نورانی قاعدہ کے مصنف ہیں۔ وہ مسلک علماء دیوبند کے حامل تھے۔ اُن کی اولاد حضرت مرشدنا و مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہٗ کے حلقۂ بگوش ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

حضرت سائیں توکّل شاہ صاحب انبالوی قدس سرہٗ

حضرت مولانا مشتاق احمد چشتی انبٹھوی مؤلف "انوار العاشقین" فرماتے ہیں:

" حضرت عارف باللہ شیخی توکل شاہ صاحب چشتیؒ نے عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں۔ مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) تو جہاں پائے مبارک حضورؐ کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں اور میں بے اختیار بھاگتا ہوں کہ حضورؐ کے پاس پہنچوں چنانچہ میں آگے ہو گیا" (انوار العاشقین ص۳)

حضرت سائیں صاحب کے بعض الہامی جملے حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کی شان میں بھی مشہور ہیں۔

سر سیّد احمد خاں مرحوم (م ۱۳۱۵ھ)

" مولوی محمد قاسم اس دُنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ کے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں اُن سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰقؒ سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے"

(علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص ۴۶۸)

حضرت خواجہ غلام فرید قدس سرہٗ (م ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

حضرت خواجہ غلام فرید پنجاب میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے۔ فرمانروایان ریاست بہاولپور کے پیرِ مرشد تھے۔ اُن کے ملفوظات کا ایک مجموعہ مقابیس المجالس کے نام سے ہے۔ عرب کے سلاسل طریقت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سلسلۂ چشتیہ میں اس وقت صرف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہیں جو چشتی صابری ہیں، آگے فرماتے ہیں:

حاجی امداد اللہ صاحب کہ بزرگے ست کامل زندہ است۔ بعد ازاں فرمودند کہ اکثر علمائے جدید از دیوبند و دہلی وسہارنپور وگنگوہ از مریدان حاجی صاحب ہستند و مولوی رشید احمد گنگوہی نیز مرید و خلیفۂ اکبر مولوی موصوف است و دیگر علمائے وے ہم بسیار اند چنانچہ مولوی محمد قاسم صاحب و محمد یعقوب صاحب"

مقابیس المجالس۔ جلد ۲ صفحہ ۴۴

(مقدمہ دیوان فرید ص۵۴ مطبوعہ عزیز المطابع بہاولپور ۱۹۴۴ء)

حضرت شاہ ابو الخیر مجددی دہلوی (م ۱۳۴۱ھ)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کی اولاد میں ہیں۔ ہندوستان اکابر علماء دیوبند کے معاصر اور ہندوستان کے نامور مشائخ میں سے تھے۔ آپ اور بزرگان دیوبند کے درمیان نہایت خوشگوار روابط تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا ابو الحسن زید مدظلہٗ کی خدمت میں راقم سطور دہلی میں دو بار حاضر ہوا ہے۔ دوسری مرتبہ حاضری پر اپنی تالیف "مقامات خیر" عطا فرمائی جو حضرت شاہ ابو الخیر کے حالات میں لکھی ہے۔ ان دنوں آپ ہی دہلی کی شاہی عیدگاہ کے امام ہیں — قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے حسن عقیدت رکھتے ہیں۔ حدیث میں حضرت مولانا عبد العلی (تلمیذ حضرت نانوتوی) اور حضرت مولانا محمد شفیع (داماد حضرت شیخ الہند) کے شاگرد ہیں۔ اپنی تالیف "مقامات خیر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ (حضرت شاہ ابو الخیر مجددی) نے ۱۳۲۹ھ میں ہم تینوں بھائیوں کو مدرسہ مولوی عبد الرب دہلی میں داخل کیا۔ ۱۳۴۴ھ میں یہ عاجز کامل طور پر دو سال کے لیے مدرسہ سے وابستہ ہو گیا۔ اس مدرسہ میں جناب مولانا عبد الوہاب، جناب مولانا حکیم جی محمد مظہر اللہ، جناب مولانا محبوب الٰہی صاحبان سے علوم متفرقہ کی کتابیں پڑھیں اور حدیث شریف کا دورہ حضرت مولانا عبد العلی و حضرت مولانا محمد شفیع کے حلقہ میں کیا۔ صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ حرفاً حرفاً از اول تا آخر مولانا عبد العلی سے اور جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد و نسائی مولانا محمد شفیع سے پڑھیں"۔ (طبع اول ص۳۹، مطبوعہ دہلی ۱۳۹۲ھ)

حضرت مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آپ نے "مقامات خیر" میں حضرت شاہ ابو الخیر صاحب کے مخلصین میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"یہ عاجز اب چند دیگر حضرات کا ذکر کرتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے دل آپ (حضرت شاہ ابو الخیر صاحب) کی طرف کس طرح مائل تھے اور وہ آپ کا احترام کس طرح کرتے تھے"۔ ص۲۶۱

اس کے بعد سب سے پہلے حضرت مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ کا ذکر مبارک کیا ہے۔ اس عنوان کے ساتھ "حضرت استاذی مولانا عبد العلی"

"اس عاجز نے آپ سے پڑھا ہے۔ آپ عاشق صادق بارگاہ نبوی اور دلدادۂ کامل حضرت محمد قاسم نانوتوی تھے۔ جمعہ کے دن مدرسہ عبد الرب میں صدہا افراد کے سامنے آپ (حضرت شاہ ابو الخیر صاحب) کے انگرکھے کے دامن کو اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے، مجھ کو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خوشبو آتی ہے اور آپ نے ایک مرتبہ ایک خواب لکھ کر حضرت سیدی الوالد کو ارسال کیا۔ خواب یہ ہے:

"مدرسہ میں آپ ٹہل رہے ہیں اور ٹہلتے ٹہلتے اچانک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔"

یہ عبارت آپ ہی کی ہے۔ آپ نے ۱۹ شعبان ۱۳۴۶ھ میں اس عاجز کو سند عنایت فرمائی۔ دو دن پہلے جب کاتب سے اس عاجز کا نام لکھوا رہے تھے تو یہ الفاظ لکھوائے: "اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اَخَانَا فی الدین المولوی اَبَا الْحَسَنِ زَیْدَ بْنَ العالم الربانی الجامع بین الشریعۃ و الطریقۃ مولانا عبداللہ شاہ ابی الخیر نور اللہ مرقدہٗ ..... الخ

آپ نے جس وقت حضرت سیدی الوالد کا اسم گرامی لیا، زار و قطار رونے لگے۔ اس عاجز نے آپ کی یہ کیفیت دو حضرات کے ساتھ ہمیشہ دیکھی، ایک سیدی الوالد اور دوسرے مولانا نانوتوی قدس اللہ اسرارہم . . . حضرت سیدی الوالد کے پاس اگر کبھی کوئی عمدہ میوہ یا شیرینی آتی تھی یا حضرت برادر کلاں ہرن شکار کر کے لاتے تھے تو حضرت مولانا کو بھی ارسال فرماتے تھے۔" (ص ۴۶۲)

"حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہٗ جمعہ کی نماز مدرسہ عبدالرب میں پڑھا کرتے تھے اور نماز کے بعد حضرت مولانا عبدالعلی سے کافی دیر تک صحبت رہتی تھی۔"

(ص ۴۷۸)

"جس دن عاجز، مولانا ابوالحسن زید، نے صحیح امام بخاری ختم کی، حضرت مولانا عبدالعلی کے شانے پر ایک تہ بند رومال پڑا تھا۔ آپ نے دائیں ہاتھ سے رومال کے کونے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: صاحبزادہ یہ گرہ کھولو۔ عاجز نے گرہ کھولی تو ایک اشرفی برآمد ہوئی۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: صاحبزادہ یہ قبول کرو۔ اس وقت آپ کو حضرت سیدی الوالد قدس سرہٗ یاد آ گئے اور ان کے واسطے دعا فرمائی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ نے بخاری، مسلم اور ابن ماجہ پڑھانے کے بعد عاجز سے فرمایا: صاحبزادہ کچھ اور شروع کرو۔ پھر فرمایا: قصیدہ بردہ پڑھو۔ چنانچہ میں نے چھیں ان اس مبارک قصیدہ کا سبق ہوا اور آپ کے عشق نبوی کا کچھ اندازہ اس وقت ہوا۔ یہ عاجز قصیدہ کا مبارک شعر پڑھتا تھا، اور آپ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو جاتا تھا۔ آپ اتنا روتے تھے کہ تکلم نہیں فرما سکتے تھے۔ آپ کی لحیہ مبارک سے آنسو کے قطرے ٹپکتے تھے۔ آپ کو اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت سیدی الوالد قدس اللہ اسرارہما سے بھی کامل قلبی تعلق تھا۔ جب بھی ان دو حضرات کا ذکر فرماتے تھے، آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔" (مقامات خیر ص ۴۷۱)

"آپ (حضرت مولانا عبدالعلیؒ) نے فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں یہ خواب دیکھا کہ سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں، آپ اونٹ پر سوار ہیں اور اونٹ کی نکیل

مولانا کے مونڈھے پر پڑی ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کیفیت میں ہیں جس کا بیان محدثین نے کیا ہے۔ البتہ آپ کی لحیہ مبارک حلق شدہ ہے اور میں آپ کی اونٹنی کے پیچھے چل رہا ہوں۔ اس خواب کو میں نے حضرت مولانا سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مبارکہ کی ہے اور آپ کا اظہار حلق لحیہ کی صورت میں یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اب آپ کی یہ مبارک سنت ترک کر دی جائیگی مولانا کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی ہے۔ ان دنوں داڑھی منڈانے کا روز افزوں رواج مولانا کے خواب کی صحیح تعبیر بن کر سامنے آرہا ہے۔ (ص۴۲)

حضرت مولانا (عبدالعلی) رحمۃ اللہ کی شفقت اور مہربانی کا بیان یہ عاجز کیا کرتے" (ص۴۲)

"پروردگار جل شانہٗ ان حضرت کی قبر کو انوار سے معمور فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ مدرسہ عبدالرب کے پانچ اساتذہ کرام اس عاجز کے مربی و معلم تھے۔ ان میں سے جناب مولانا مولوی عبدالوہاب صاحب تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے گئے۔ جانے سے پہلے عاجز کے پاس تشریف لائے۔ وہی آخری ملاقات تھی پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کہاں قیام فرمایا۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ۔ باقی چار حضرات کی وفات کی تاریخیں درج ذیل ہیں۔

مولانا عبدالعلی میرٹھی کی وفات یکشنبہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۸ء دلّی میں مدرسہ مولوی عبدالرب میں ہوئی اور حضرت محدثین پاک و شہداء کے جوار میں مہندیوں کے قبرستان میں "نم کنوم العروس" استراحت فرمارہے ہیں۔

۲۔ جناب مولانا محمد شفیع داماد حضرت مولانا محمود الحسن کی وفات ۹۲ سال کی عمر میں دوشنبہ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۰ھ مطابق ۷ نومبر ۱۹۶۰ء کو دیوبند میں ہوئی اور وہاں استراحت فرمارہے ہیں۔

۳۔ جناب مولانا حکیم حاجی محمد مظہر اللہ کی وفات شنبہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء دلّی میں ہوئی اور کوٹلہ فیروز شاہ کے پاس قبرستان میں آرام فرمارہے ہیں۔

۴۔ جناب مولانا محبوب الٰہی فرزند علامہ عبدالرحمن کی وفات جمعہ ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۹۷۱ء دیوبند میں ہوئی۔ اور وہاں استراحت فرمارہے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَسَاتِذَتِیْ قَدْ اَحْسَنُوْا اِلَیَّ فَاَحْسِنْ اِلَیْھِمْ وَ اِلٰی کُلِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیَّ وَ ھَدَانِیْ وَ عَلَّمَنِیْ وَ رَبَّانِیْ۔ اللّٰھم اجزھم عنی خیر الجزاء وارض عنہم وارحمھم یا ارحم الراحمین"۔ (مقامات خیر ص۴۳)

حضرت مولانا ابوالحسن زید مدظلہ نے بعض علماء دیوبند کی حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہ سے ملاقاتوں کا تذکرہ بھی "مقامات خیر" میں کیا ہے ــــ لکھتے ہیں:

"ایک دن جناب مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی آپ سے ملنے تشریف لائے۔ آپ ان سے نہایت محبت سے ملے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ دونوں حضرات کی نہایت پُرلطف ملاقات رہی .... مولوی صاحب آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور آپ نے ان کی محبت و احترام مرخص کیا۔ (مقامات خیر ص۴۴)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا حافظ احمد (فرزند حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) کی آمد سے حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہٗ مطلع ہوئے؛

" آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ ہاں ان کو بلاؤ، ہم ان سے ملیں گے چنانچہ دونوں صاحبان تشریف لائے۔ آپ نے مخلصین سے فرمایا، ہم کو سہارا دو۔ چنانچہ سہارا لے کر آپ کھڑے ہوئے اور دونوں سے بمحبت ملے۔ حافظ صاحب کی وجہ سے ان کے پدر بزرگوار کا ذکر آیا۔ آپ نے فرمایا: مولوی قاسم صاحب اور مولوی رشید احمد صاحب نے خانقاہ شریف میں حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث پڑھی ہے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے استاد کا اور ان کی جائے قیام کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خانقاہ شریف کے دروازے کے باہر جوتی اتار دیا کرتے تھے اور خانقاہ شریف میں برہنہ پا داخل ہوتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ کہ مکرہ میں ہمارے حضرت والد ماجد علیل تھے۔ مولوی قاسم صاحب ملنے آئے۔ حضرت والد بوجہ علالت و ناتوانی لیٹے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر آپ نے بیٹھنا چاہا، لیکن مولوی صاحب نے بہت اصرار سے روکا اور پھر بڑی محبت سے آپ کو دابنے لگے اور آخر میں آپ سے کہا: "حضرت ہندوستان میں دو دجّال پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اُن کے شر سے محفوظ رکھے" اس واقعہ کو بیان کر کے حضرت سیّدی الوالد قدس سرہٗ نے مولانا قاسم صاحب کی خدمت اسلام کا ذکر کیا۔ (صد ۲۴۱)

جناب مفتی عزیز الرحمٰن میرٹھ میں تفسیر مظہری کی تصحیح فرماتے تھے۔ مولوی حافظ کفایت اللہ آپ کو تفسیر سنایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب جناب مولانا محمود الحسن کے شاگرد اور جناب مفتی صاحب کے مرید تھے، مفتی صاحب شاہ رفیع الدین دیوبندی کے اور وہ شاہ عبدالغنی مجددی کے خلیفہ تھے۔ ایک دن حافظ صاحب کے ساتھ جناب مفتی صاحب نسبت شریفہ مجددیہ لے کر حضرت سیدی الوالد سے ملنے تشریف لائے۔ حافظ صاحب کا بیان ہے کہ حضرت سیدی الوالد کھڑے ہو کر مفتی صاحب سے ملے اور دونوں حضرات کی آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری ہوئے۔ قدس اللہ اسرارہم۔ حافظ کفایت اللہ نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کے علاوہ ایک دن جناب مفتی صاحب اور جناب مولانا محمود الحسن صاحب آپ سے ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ آپ ان دونوں صاحبان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور یہ دونوں صاحبان بھی آپ کی محبت لے کر رخصت ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب تیرہ سو اکتیس یا بتیس میں مکی آکر بھی آپ سے ملے تھے۔ رحمہ اللہ (صد ۲۵۶)

" مولانا رشید احمد گنگوہی کے فرزند مولانا حکیم محمد مسعود صاحب مع چند رفقاء کے آپ سے ملنے آئے۔ آپ بڑی محبت سے ملے۔ سب کی خاطر شیر چائے سے کی۔ آپ کی محبت بھری باتیں سن کر حکیم جی اور ان کے رفقاء متاثر ہوئے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر میں آپ نے فرمایا: مولوی صاحب ہمارے

دوست تھے اور ہم اُن کے دوست تھے۔ رحمہم اللہ
(مقامات خیر ص۱۹۷)

مولانا مفتی پیر غلام رسول صاحب قاسمی (م ۱۹۰۲ء)

"اُسوۂ اکابر" میں ہے:

"حضرت مولانا مفتی پیر غلام رسول صاحب قاسمی امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۰۲ء) سابق پنجاب کے جلیل القدر فاضل اجل اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کو تمام علوم کی سند فراغ حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی قدس سرہٗ سے حاصل تھی اور طریقت میں آپ عارف باللہ حضرت خواجہ ملا دین محمد صاحب تیراہی نقشبندی مجددی (چورہ شریف ضلع کیمبلپور) رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ ایک دفعہ امرتسر میں ایک واعظ کی انگیخت پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف عوام میں سب وشتم کا طوفان اُٹھا تو حضرت مفتی صاحب قاسمی نے جلسۂ عام میں عوام کو سرزنش کی اور مولانا گنگوہی کی توہین و تکفیر سے عوام کو روکا۔" (ص۱۶)

حضرۃ خواجہ ضیاء الملۃ والدین زیب سجادہ سیال شریف قدس سرہٗ

آپ حضرت قطب ربانی حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۰۰ھ) کے پوتے اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تحریک آزادیٔ ہند سے بالکل متفق اور انگریزی اقتدار کے سخت مخالف تھے۔ جس زمانہ میں حضرت مولانا محمد ذاکر صاحب بانی جامعہ محمدی شریف دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے تھے، آپ کا سفر ہندوستان ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کو معلوم ہوا تو اثنائے سفر میں آپ کو تشریف آوری کی درخواست پیش کی جو آپ نے بخوشی قبول فرمائی۔ دیوبند ریلوے اسٹیشن پر دارالعلوم کے اساتذہ و طلباء اور عوام کے ایک جم غفیر نے آپ کا استقبال کیا۔ دارالعلوم میں مکمل چھٹی کر دی گئی اور ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے خطاب میں دارالعلوم کی علمی و دینی و سیاسی خدمات کی تعریف و تائید فرمائی۔ بعد ازاں آپ نے دارالعلوم کو ۲۰۰ روپے کا عطیہ بھی مرحمت کیا۔

مؤلف تحریک جامعہ محمدی نے آپ کو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا مجاہد اعظم لکھا ہے (ص۱)

حضرۃ قاضی سلطان محمودؒ اعوان شریف ضلع گجرات (م ۱۳۳۸ھ)

قطب سوات حضرت اخوند عبدالغفور مدفون سیدو شریف (م ۱۲۹۵ھ) کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ سلسلۂ عالیہ قادریہ کے نامور شیخ تھے۔

"حضرت صاحبزادہ محبوب عالم صاحب مدظلہٗ حضرت قاضی (سلطان محمود) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ حضرت صاحبؒ نے آپ کو خود بھی پڑھایا اور آپ کی تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ بھی رکھے۔ مثلاً مولوی عبدالرحمٰن صاحب فاضل دیوبندی۔ (ص۳۰۷)

(مقامات محمود۔ مؤلفہ معشوق یار جنگ، مطبوعہ استقلال پریس لاہور ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء)

مقامات محمود کے ص۳۱۴ پر مولوی عبدالرحمٰن صاحبؒ کا تعارف مختصراً ان الفاظ میں ہے:

"مولوی عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پنڈی سریال ضلع کیمبلپور (اٹک) حضرت قاضی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے اجازت یافتہ خلیفہ تھے۔ آپ دیوبند کے فارغ التحصیل بہت بلند پایہ عالم اور شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہم درس تھے۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں اسی برس سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔

حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۷ھ)

آپ خانقاہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ مکان شریف ضلع گوجرانوالہ سے فیض یاب تھے، پنجاب میں اولیائے سلف کا نمونہ تھے۔

مولانا مولوی انور علی شاہ، مولانا محمد انور شاہ کشمیری ، صدر مدرس دیوبند ہمراہ مولوی احمد علی صاحب مہاجر لاہوری شرقپور شریف حاضر ہوئے اور حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کو بڑی ارادت سے ملے آپ ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور شاہ صاحب خاموش رہے۔ پھر آپ نے مولانا انور شاہ صاحب کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔ موٹر کے اڈے تک حضرت میاں صاحبؒ خود سوار کرانے کے لیے ساتھ تشریف لاتے۔ شاہ صاحب نے میاں صاحب علیہ الرحمۃ سے کہا "آپ میری کمر پر ہاتھ پھیر دیں" آپ نے ایسا ہی کیا اور رخصت کرکے واپس مکان پر تشریف لائے۔ بعدازاں آپ نے بندہ سے فرمایا شاہ صاحب بڑے عالم ہوکر اور میرے جیسے خاکسار سے فرماتے تھے کہ میری کمر پر ہاتھ پھیر دیں اور میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ دیوبند میں چار نوری وجود ہیں، ان میں ایک شاہ صاحب ہیں۔

خزینۂ معرفت (حالات وکمالات حضرت میاں صاحب شرقپوریؒ) مؤلفہ حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری
صہ ۲۸۴ باراول ۱۳۵۰ھ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ پریس لاہور

اب حضرت میاں صاحبؒ کا ارشاد شاہ صاحبؒ اور چند دیگر اکابر دیوبند کے متعلق پڑھیے۔ حضرت میاں صاحبؒ نے فرمایا۔

"دیوبند میں چار نوری وجود ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا انور شاہ صاحب ہیں"۔

حضرت میاں صاحب کا یہ ارشاد کتاب "خزینۂ معرفت" طبع اول میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے جو حضرت میاں صاحبؒ کے خلیفہ حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری مرحوم کی تصنیف ہے۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب جو اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے اس میں سے حضرت میاں صاحب کا یہ ارشاد حذف کرا دیا گیا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناشر کتاب نے آخر اپنے پیر و مرشد اور ان کے خلیفہ کی ایک "سنگین غلطی" کا ازالہ کر ہی ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(منقول از اسوۂ اکابر مولانا بہاؤالحق قاسمی)

رسالہ "اسوہ اکابر" مولانا بہاء الحق صاحب قاسمی مدظلہ نے ۱۳۸۲ھ میں تحریر فرمایا تھا مقصد یہ تھا مختلف فرقوں کی باہمی آویزش کو کسی طرح کم کیا جائے ... ۵ ہزار کی تعداد میں طبع کراکے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری اور پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی کے ذریعے مفت تقسیم کرایا

حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے حضرت سید محمد اسمٰعیل شاہ صاحب کرموں والے حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب مؤلف خزینۂ معرفت اور حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب (بیربل شریف) نے خاص طور پر میاں صاحبؒ کی روش کو قائم رکھا۔

مؤلف "اسوہ اکابر" کا بیان ہے۔

"مولانا عبدالحنان ہزاروی موصوف (تلمیذ رشید حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری) نے بتایا کہ میں جب تک آسٹریلیا مسجد لاہور میں مقیم رہا۔ حضرت میاں صاحب شرقپوریؒ کے خلیفہ سید محمد اسمٰعیل شاہ صاحب کرموں والے لاہور آنے پر میرے ہاں اکثر قیام فرماتے۔ صہ ۳۰

حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہما اللہ کے شاگرد تھے اپنی تالیف "انقلاب الحقیقت" میں خود تحریر فرماتے ہیں

کالج کی ملازمت میں ہی مجھے ٹریننگ کالج میں

عربی زبان کی تعلیم کے لیے جانا پڑا خوش قسمتی سے کالج
کے پروفیسر قاضی ضیاء الدین صاحب ایم اے مرحوم
جو نہایت شریف النفس اور صوفی آدمی تھے۔ حضرت
میروی علیہ رحمۃ (حضرت خواجہ احمد صاحب خلیفہ
حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ اور خاندان
تھی علیہ الرحمۃ (حضرت خواجہ غلام نبی للّٰہی) سے باطنی
تعلقات رکھتے تھے اور دینیات کی سند دیوبند کی
رکھتے تھے گویا وہ ظاہری عالموں اور باطنی صوفیوں کی
درمیانی کڑی تھے۔ ان کے ایماء سے ترجمۃ القرآن الحمید
کے لیے مولانا حاجی احمد علی صاحب (شیرانوالہ دروازہ
لاہور) کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور چھ ماہ کے
عرصہ میں مجھے اتنی مہارت ہوگئی کہ بلا تردد مطالب
قرآنی ذہن میں آنے لگے۔

للہ الحمد حمداً کثیراً صت

نیز فرماتے ہیں۔
مجھے اپنے زمانے کے بڑے بڑے علمائے کرام کی شاگردی
اور تلمذ کا فخر حاصل ہے اور بہت سے بزرگان علم سے
نیاز خاص رکھتا ہوں۔ میرے اساتذہ میں سے مولانا
عبداللہ ٹونکی مرحوم اور مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم
جیسے منطقی اور ادیب اور فخر العلماء جناب مولانا
کفایت اللہ جیسے محدث بھی ہیں" صر د
آپ کے خلیفہ جناب حاجی فضل احمد صاحب مدیر "سلسبیل" لاہور
اپنے پیر و مرشد کی روش پر قائم ہیں۔
مولانا بہاء الحق صاحب قاسمی کے رسالہ "اسوہ اکابر" سے یہی
واقعہ ذرا تفصیل سے ملتا ہے، ملاحظہ ہو۔
"مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی خطیب صدر
راولپنڈی نے مجھ (قاسمی) سے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ
حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ دیوبند
سے کشمیر جاتے ہوئے رونق افروز لاہور ہوئے (مولانا
عبدالحنان صاحب اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے
ہمراہ تھے) تو حضرت میاں صاحب شرقپوری کے
متوسلین میں سے ایک صاحب نے حضرت شاہ صاحب
کی خدمت میں حضرت میاں صاحبؒ کے شوق
ملاقات کا تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے سفر کشمیر سے
واپسی پر شرقپور تشریف لے جانے کا وعدہ فرمایا اور
جب آپ کشمیر سے واپس ہوکر لاہور تشریف لائے
تو انہی صاحب نے وعدہ کی یاد دہانی کرائی چنانچہ آپ
شرقپور تشریف لے گئے۔ اس سفر میں مولانا عبدالحنان
صاحب کو حضرت شاہ صاحبؒ کی ہمراہی کا شرف
حاصل رہا۔ حضرت میاں صاحب نے حضرت شاہ
صاحب کے ساتھ انتہائی اکرام واحترام کا معاملہ فرمایا
بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کو چند روپے اور چند
کپڑے بھی بطور ہدیہ پیش کیے اور رخصت کے وقت
سواری پر سوار کرانے کے لیے باہر تک ساتھ
تشریف لائے"
مولانا مولوی عبدالحنان صاحب موصوف نے میرے مضمون کی
تائید کرتے ہوئے اس واقعہ کی مزید تفصیل بایں الفاظ فرمائی ہے۔
حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ
کی خدمت میں حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

کی ہر کابل میں حاضری ہوئی تو اس وقت میاں صاحب
مکان کی بالائی منزل پر تشریف فرما تھے۔ حضرت کے
خدام نے حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت
میاں صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اوپر سے تشریف
لاتے ہیں تو بیٹھے ہوئے مہمان ان کے استقبال و اکرام
کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔ آپ خود ان کے پاس
آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا
ویسا ہی کریں گے۔ جیسا میاں صاحب کا طریقہ ہے چنانچہ
حضرت میاں صاحبؒ اطلاع ہونے پر تشریف لائے
اور حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے
حضرت شاہ صاحب سے مصافحہ کیا پھر چار پانچ منٹ
تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا۔

"میں خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کروں جس نے
ایک مدت کی تمنا کو آج پورا کر دیا۔"

اس کے بعد حضرت میاں صاحبؒ نے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"ان حضرات کو اب کہاں ڈھونڈیں"۔

آپ نے حضرت شیخ الہند کے ایک خط کا بھی ذکر کیا اور فرمایا

"میرے پاس موجود و محفوظ ہے"۔

"حضرت میاں صاحبؒ نے دو کپڑے (کرتہ، تہبند، شاید
پگڑی بھی، لیکن پورا یاد نہیں) اور پانچ روپے کرتے کی جیب میں ڈال کر
حضرت شاہ صاحب کو ہدیۃً پیش کیے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر
حضرت شاہ صاحب کو رخصت کرنے کے لیے بنفس نفیس موٹروں کے
اڈہ تک تشریف لائے"۔ (دارالعلوم ماہ جون ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۸)

یہ تو عمل برتاؤ تھا جو حضرت میاں صاحبؒ نے حضرت شاہ
صاحب کے ساتھ فرمایا۔

حضرت مولانا مشتاق احمد چشتی انبیٹھوی

خلیفہ حضرت حافظ محمد صابر علی رامپوریؒ سلسلہ عالیہ چشتیہ
صابریہ کے شیخ طریقت "تذکرہ خواجگان چشتیہ صابریہ المعروف بہ انوار العاشقین"
شیخ الاسلام حضرت مولانا انوار اللہ خان صاحب چشتی حیدرآبادی (استاذ
نظام عثمان علی خان دکن) کے ارشاد پر تصنیف کیا۔ جو ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء)
میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔

مؤلف "انوار العاشقین" نے حضرت قطب الاقطاب مرشد العرب
والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کا زمانہ بھی پایا ہے۔
حضرت حاجی صاحب اور ان کے مسترشدین سے انہیں بہت تعلق خاطر
تھا۔ قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور
دیگر بزرگان دیوبند سے انہیں والہانہ عقیدت و محبت تھی ذیل کا اقتباس
انہی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

"حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء بیشمار
ہر دیار و امصار میں ہیں متاخرین چشتیہ صابریہ میں (باوجود
قیام مکہ معظمہ کے کہ وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا
نادر ہے) حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں سے
کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی بجملہ آپ کے خلفاء
کے حضرت بقیۃ السلف حجۃ الخلف مولانا رشید احمد
صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ
مسلّم علماء اور صلحاء گذرے ہیں۔
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے

خلفاء ہیں آجکل بزرگ اور عالم باعمل مانے جاتے ہیں جیسے
حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عالیہ
دیوبند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی صدر
مدرسہ عالیہ دیوبند، حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری
حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت
مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا
حکیم مسعود احمد صاحب خاص گنگوہ میں مولانا کے
جانشین اور اوقات کے پابند ہیں۔ راقم الحروف ان سے
مل کر خوش ہوتا ہے اور جس طرح حضرت مولانا رشید احمد
صاحب عاجز کے ساتھ نوازش و کرم سے پیش آتے
تھے اسی طرح حکیم صاحب کمال شفقت و محبت سے پیش آتے
ہیں یہ حضرات تو مولانا کے خلفاء ہیں۔ مگر جناب مولوی
شاہ ظہور احمد انبہٹوی کو جو نسبت خاص روح مقدس
حضرت مولانا سے یہ عاجز راقم الحروف پاتا ہے وہ فنا فی الشیخ
کے درجہ سے کم نہیں۔ لہٰذا یہ بدرجہ اولیٰ خلافت کے
لائق ہیں بارک اللہ فی عمرہم و صلاحہم، حاجی وارث حسن
صاحب بھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے
عمدہ خلفاء میں ہیں اور مشائخانہ طریقہ اور لباس صوفیانہ
رکھتے ہیں حضرت مکرمی مولانا اشرف علی صاحب
تھانوی سے عالم و جاہل دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔
روایات صحیحہ اور مضامین عالیہ نہایت آسان عبارت
میں بیان فرماتے ہیں بڑے قادر الکلام ہیں، زبردست
مصنف ہیں صدہا کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔
حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی تمام عمر میں جہاں
تک ہمیں معلوم ہے بوجہ کسر نفسی اور کمال تواضع کے
کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ بیعت بھی حضرت
قبلہ عالم حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے نیابۃً
کرتے تھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عشق
اور محبت میں فنا تھے کمالات امدادیہ میں نقل کیا ہے کہ
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
اپنے بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے چنانچہ شمس تبریز کے
واسطے مولانا رومی کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم
لسان عطا ہوتے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے مولوی
صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ میں بعض اصطلاحات
نہ جاننے کی وجہ سے اس کو بیان نہیں کر سکتا عاجز راقم الحروف
عرض کرتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں یہ عاجز ایک دفعہ
حضرت مخدوم العالمین خواجہ سید مخدوم علاؤ الدین علی احمد
صابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت سے خواب میں مشرف
ہوا تو اس وقت حضور مخدومؒ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی
صورت میں نظر آئے اور حضرت عارف باللہ شیخ
ترکی شاہ صاحب مجددی زنبالوی، رحمۃ اللہ علیہ نے
عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا
کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا
رہے ہیں مولانا محمد قاسمؒ تو جہاں پائے مبارک
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں
رکھتے ہیں اور میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضورؐ کے
پاس پہنچوں۔ چنانچہ میں آگے ہو گیا!"

انوار العاشقین صـ ۸۲ تا ۸۸ شائع کردہ مجلس اشاعت العلوم
حیدرآباد دکن بار اول مطبوعہ اعظم پریس حیدرآباد، دکن

جناب پیر کرم شاہ صاحب سجادہ نشین بھیرہ (ازہری) مدیر ماہنامہ "ضیائے حرم"

خانقاہ عالیہ چشتیہ سیال شریف سے

مستفیض ہیں۔ عالم و فاضل ہیں

مکتوب بنام مولانا کمال الدین رتوالوی بکاس سعودی اس تحریر سے چند

اقتباس ملاحظہ ہوں :

" حضرت قاسم العلومؒ کی تصنیف لطیف مسمیٰ بہ تحذیر الناس

کو متعدد بار غور و تامل سے پڑھا اور ہر بار نیا لطف و سرور

حاصل ہوا۔"

" جہاں تک فکر انسانی کا تعلق ہے حضرت مولانا قدس سرہٗ

کی یہ نادر تحقیق کئی شپرہ چشموں کے لیے سرمۂ بصیرت کا کام

دے سکتی ہے۔ یہ ذلیفتگان سامانِ مصطفویؐ اور اُن کے

لیے بے قرار دلوں اور بے تاب نگاہوں کی وارفتگیوں میں

اضافہ کا ہزار سامان اس (تحذیر الناس) میں موجود ہے"

" مولاناؒ خاتم النبیین کی آیت کی تحقیق فرماتے ہوئے رقمطراز

ہیں کہ ختم نبوت کے دو مفہوم ہیں، ایک وہ ہے جہاں تک

عوام کی عقل و خرد کی رسائی ہے اور دوسرا وہ ہے جسے

خواص ہی خداداد نورِ فراست سے سمجھ سکتے ہیں۔"

" ختم نبوت کا یہ ہمہ گیر مفہوم جو سبدأً و مآل اور ابتداء اور انتہاءً

کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر اُمتِ مرزائیہ وغیرہ کی

سطح سے بلند تر ہو تو اس میں کس کا کیا قصور۔" ——

محمد کرم شاہ از بھیرہ ضلع سرگودھا "ڈھول کی آواز" ص ۱۲۹ تا ۱۳۰

حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفۂ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہٗ و سابق شیخ الجامعہ

عباسیہ بہاولپور، مولف "چراغِ سنت" نے آپ کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

" مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد صاحب

گنگوہیؒ کا زمانہ میں نے نہیں پایا۔ مولانا خلیل احمد صاحب

سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی

زیارت ایک دفعہ کی ہے۔ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی ایک دفعہ زیارت کی

ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سُنا ہے۔ اس سے زیادہ

ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر

میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات

عُلماء ربانیین اور اولیاء اُمتِ محمدیہ سے تھے۔ احقر کو بعض

مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے۔ مگر میرا اعتقاد یہی

ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی

تصنیفات کا مطالعہ اور استفادہ اور قبولِ عام ہے۔ بالخصوص

مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم کی خدماتِ طریقت

پر نظر کرکے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔"

فقط

۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۳۵ھ

"چراغِ سنت" مولفہ مولانا سید فردوس علی شاہ صاحب ص ۱۰۲

حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی (م ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء)

مفتی و امام مسجد فتحپوری دہلی ۔

آپ حضرت مولانا مفتی محمد مسعودؒ خلیفہ ارشد قطب ربانی حضرت سید امام علی شاہ صاحب مکان شریفی قدس سرہ (م ۱۲۸۲ھ) کے پوتے تھے ۔ مولانا محمد مسعودؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ کے تلامذہ حضرت نواب قطب الدینؒ (م ۱۲۸۹ھ) اور حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (م ۱۳۲۰ھ) سے کتب حدیث شریف پڑھی تھیں ۔

مؤلف "تذکرہ مظہر مسعود" رقمطراز ہے ۔

"تعلیم و تدریس میں اعلیٰ حضرت (مولانا محمد مسعودؒ) کا مسلک، مسلک ولی اللّٰہی تھا کیوں کہ اسی خاندان سے فیض پایا تھا"

آگے چل کر مؤلف کی رائے یہ ہے کہ "شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک معتدل کی جن علماء نے پیروی کی ہے ، وہ ہمیشہ اختلافات سے بالا تر رہے ہیں ۔" صـ۴۵

حضرت مولانا مفتی مظہر اللہ صاحبؒ کو بھی یہی روش پسند تھی "تذکرہ مظہر مسعود" آپ کے صاحبزادے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے آپ کے حالات میں لکھا ہے ۔ ان کا بیان ہے ۔

"اہل سنت والجماعت میں مختلف جماعتیں موجود ہیں مگر حضرت نے خود کو کبھی کسی جماعت سے وابستہ نہیں فرمایا ۔ حضرت کا مسلک "تائید حق تھا" ، خواہ وہ کسی جماعت میں ہو ، یہی وہ معتدل راستہ تھا جس کی وجہ سے ہر مسلک کے لوگ ، کیا خواص کیا عوام ، حضرت کی بے انتہا قدر و منزلت کرتے تھے ۔" صـ۲۲

"جس کسی سے حضرت اختلاف رائے رکھتے ، وہ اخلاص کی بنیاد پر ہوتا ۔ اس لیے ہمیشہ ذاتیات سے بالاتر ہوتا ۔ یگانگت و محبت کو ہر حالت میں قائم رکھتے ۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا جو خود حضرت نے سنایا تھا ۔ دہلی کے مشہور عالم و فقیہ مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم اور حضرت قبلہ قدس سرہ کے درمیان بعض مسائل پر اختلاف رائے رہا ہے ، مگر یہ اختلاف کبھی بنائے مخاصمت نہیں بنا ، جن کو اللہ وسعت علم سے نوازتا ہے ، ان کو وسعت قلبی بھی عطا فرماتا ہے ـــــ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتے تھے ۔ آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتیں ۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت قبلہؒ مفتی صاحب مرحوم کے ہاں تشریف لے گئے ۔ دستک دی ، خادم آیا ، اندر اطلاع ہوئی مگر مفتی صاحب ذرا دیر سے تشریف لائے ۔

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

حضرت قبلہ سے مصافحہ ہوا ۔ اندر تشریف لے گئے ۔ حضرت نے دیکھا کہ کچھ بان کے ٹکڑے صحن میں بکھرے پڑے ہیں ۔ سمجھ گئے کہ مفتی صاحبؒ چارپائی بُن رہے تھے ۔ چنانچہ حضرت نے دریافت فرمایا : "کیا کر رہے تھے" : مفتی صاحب نے فرمایا کہ "کچھ نہیں" ـــــ پھر دوبارہ حضرت نے دریافت فرمایا تو مفتی صاحب نے حقیقت حال بیان فرمائی کہ وہ چارپائی بُن رہے تھے ۔ حضرت نے فرمایا : "یہ تو میں بھی بن لیتا ہوں ، لائیے ہم دونوں بُنتے ہیں ۔" چنانچہ چارپائی نکالی گئی اور ان دونوں جلیل القدر علماء (رحمہما اللہ تعالیٰ) نے چارپائی بُنی ۔ چارپائی کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے ۔" تذکرہ مظہر مسعود صـ۲۲۶

"معتبر ذرائع سے یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ جب مفتی صاحبؒ کا وصال ہوا تو انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ نماز جنازہ حضرت امام صاحب ، (حضرت قبلہ) پڑھائیں ۔ اس سے کمال عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ محبتیں ان حضرات کے لیے سبق آموز ہیں جو خواہ مخواہ دل میں رنجشوں کو پرورش دے کر دل کو ویران کرتے ہیں ۔" صـ۲۲۹

"آپ نے میانہ روی کی روش کو اپنایا ، جس کی بنا پر آپ کو صلاحے

تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یگانگت کی راہ روشن ہوئی۔ لوگوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ حضرت مفتی محمد کفایت اللہؒ نے عصر کی نماز آپ کے پیچھے پڑھی اور جب آپ نے نماز سے فارغ ہو کر انہیں دیکھا تو اُن کی طرف بڑھے اور وہ آپ کی طرف اور معانقہ فرمایا۔

تذکرہ مظہر مسعود، ص۲۴۱ بحوالہ ماہنامہ عقیدت نئی دہلی جولائی

اگست ۱۹۶۳ء ص۱۶ مفتی اعظم مضمون علامہ نصف احمد بڑی

" مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کا شمار ہندوستان کے مشہور علماء و فقہا میں ہوتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے تلامذہ پاک و ہند میں پھیلے ہوئے ہیں ـــ فارغ التحصیل طلبہ بھی آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ اس سے مفتی صاحب کی تبحر علمی اور تدریسی صلاحیت کا علم ہوتا ہے ـــــ مسجد فتحپوری میں رمضان المبارک اور عیدین کے سلسلے میں حضرت کی صدارت میں رویت ہلال کمیٹی کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ مفتی صاحب اس میں برابر شرکت فرماتے تھے۔" ص۲۶۲

" مولانا محمد الیاس مرحوم کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ آپ ہندوستان کی مشہور تبلیغی جماعت کے بانی مبانی ہیں۔ اس جماعت کا مرکز بستی نظام الدین (نئی دہلی) میں تھا اور اب بھی وہیں ہے۔ مولانا الیاس صاحبؒ وہیں اقامت گزیں تھے۔ مولانا حضرت قبلہ کا بڑا احترام فرماتے تھے ـــ حضرت قبلہ بھی جب کبھی بستی نظام الدین تشریف لے جاتے تو گاہے گاہے مولانا کے ہاں بھی تشریف لے جاتے، خصوصاً علالت کے زمانے میں عیادت کے لیے ضرور تشریف لے جاتے۔" ص۲۶۳

" حضرت مفتی محمد مظہر اللہ صاحبؒ نے اپنے صاحبزادوں کو مدرسہ فتحپوری ہی میں دیوبندی اساتذہ سے تعلیم دلائی۔ آپ کے ایک پوتے علامہ قاری رضوان اللہ صاحب نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔" ص۲۶۱

" اتمام المقال فی رویۃ الہلال" (مطبوعہ جید برقی پریس دہلی سنہ $\frac{۱۳۷۰ھ}{۱۹۵۱ء}$) ـــ میں حضرت مفتی مظہر اللہ صاحب اپنے موقف کی تائید میں حضرت گنگوہی سے استدلال کیا ہے، فرماتے ہیں:

" اور مولانا گنگوہی نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو معتبر رکھا ہے۔" ص۵۰۳

" فتویٰ رویت ہلال" (مطبوعہ جید برقی پریس دہلی $\frac{۱۳۷۸ھ}{۱۹۵۹ء}$) میں اپنے موقف کی تائید میں حضرت مفتی مظہر اللہ صاحب نے جن علماء کے ناموں کی فہرست تحریر کی ہے اُن میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بھی شامل ہیں۔" ص۵۰۵

اس رسالے کے آخر میں حضرت مرحوم نے مسلمانوں کو بڑی دلسوزی کے ساتھ وصیت فرمائی ہے کہ وہ ان لوگوں کی پیروی کریں جن کی روش مجتہدانہ نہیں سلف کے راستے پر گامزن ہیں۔ فرماتے ہیں:

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ تو تشریف لے جاچکے اب فقیر بھی اپنی عمر پوری کر چکا ہے۔ آج نہیں کل اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو جائے گا۔ اس لیے تمہیں وصیت کرتا ہے کہ تم ایسے امور میں ان علماء کی پیروی کرنا جو مجتہدانہ روش نہیں چلتے بلکہ سلف صالحین کے پیرو ہیں۔" ص۵۰۶

حضرت مفتی محمد مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے $\frac{۱۳۸۶ھ}{۱۹۶۶ء}$ میں وصال فرمایا۔ اخبار الجمعیۃ نے حضرت کے سانحہ ارتحال کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ نمازِ جنازہ میں ایک بڑا ہجوم تھا۔ جمعیۃ علماء ہند، اخبار الجمعیۃ اور دیگر اداروں کے

نمائندگان اور شہر کے معززین و عوام نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ انتقال کملال کی خبر ملتے ہی شام کو بغرض تعزیت ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند حضرت مولانا اسعد مدنی حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا وحید الدین قاسمی صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اور جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ دہلی مرحوم کے دولتکدہ پر تشریف لے گئے اور دوپہر تک پس ماندگان کے پاس بیٹھے رہے۔ تذکرہ مظہر مسعود ص ۳۲۵

حضرت مفتی مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی بیعت حضرت سید صادق علی شاہ صاحب فرزند و جانشین قطب ربانی مکان شریفی قدس سرہ سے تھی لیکن خلافت حضرت مولانا رکن الدین صاحب الوری رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔

حضرت مولانا محمد ذاکر صاحب ظلہ بانی جامعہ محمدی شریف

مؤلف تحریک جامعہ محمدی رقمطراز ہیں:

"مولانا محمد ذاکر صاحب نے ابتدائی تعلیم تراہائی تیسے میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں سے آپ نے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم کو مکمل کیا۔ آپ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے مجاہد اعظم شمس ضیاء العارفین حضرت خواجہ محمد ضیاء الملت والدین سیالوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔آپ نے اپنے شیخ طریقت کے ساتھ تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا۔ فرنگی اقتدار کی مکمل کر مخالفت کی جس کے نتیجے میں مولانا موصوف کو بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔"

"تحریک جامعہ محمدی" ص ۹۔ شائع کردہ شعبہ تالیف و تصنیف جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ

"جامعہ محمدی شریف کے بانیوں نے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بتلائے ہوئے اسی فلسفہ ثانی یعنی الجمع بین المختلفات کو اصل الاصول قرار دیا ہے اور اس اصل الاصول کو تحریک کے تین اساسی عناصر

(ا) جدید و قدیم علوم کا امتزاج

(ب) مسلک اعتدال اور

(ج) اتحاد عالم اسلام میں پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔"

تحریک جامعہ محمدی ص ۵

حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (م ۱۳۱۳ھ)

آپ حضرت شاہ محمد آفاق مجددی دہلویؒ کے خلیفہ اجل اور ہندوستان کے اولیائے کبار میں سے تھے۔

حضرت گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ اپنی تالیف "کمالات رحمانی" میں اپنی بیعت رقمطراز ہیں:

"اب بیعت کا جو عزم ہوا کہ مجھ کو (مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ کو) عقیدت اور غلامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ سے تھی۔ آپ کو (حضرت گنج مرادآبادیؒ کو) کشف سے معلوم ہوا۔ آپ نے حضرت مولانا کی تعریف کی کہ اس کم سنی میں ان کو ولایت ہوگئی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی بھی تعریف کی کہ ان کے قلب میں ایک نور الٰہی ہے جس کو ولایت کہتے ہیں۔ حضرت مولانا (محمد علی) مونگیری نے بھی اس روایت کی تصدیق کی ہے۔"

(طبع سوم ص۱۰۵ مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ شائع کردہ خانقاہ رحمانی مونگیر)

حضرت خواجہ سید غلام محی الدین صاحب گولڑویؒ

آپ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہما کے نور نظر تھے۔ مولانا کامل الدین اپنی تالیف "ڈھول کی آواز" میں رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ تحذیر الناس کی عبارت پر بعض معترضین سے بحث ہوئی تو انھوں نے کہا کہ سیال شریف اور گولڑہ شریف سے فتوٰی لاؤ تو ہم مان جائیں گے۔ مولانا کامل الدین پہلے سیال شریف اور پھر گولڑہ شریف حاضر ہوئے ہر دو مقامات سے سنہری تحریریں پائیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"احقر گولڑہ شریف پہنچا۔ صوفی غلام نبی کی وساطت سے حضرت مولانا غلام محی الدین صاحب سجادہ نشین سے ملاقات ہوئی۔ سب واقعہ بیان کیا گیا۔ انھوں نے مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور خلیفہ خاص حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو (جو اتفاقیہ وہاں آئے ہوئے تھے) حکم دیا کہ آپ میری طرف سے ان کو لکھ دیں۔ انھوں نے الفاظ ذیل لکھے جو سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں:

قال "میرا مذہب یہ ہے کہ علماء دیوبند مسلمان ہیں اور دین کا کام کر رہے ہیں۔ جو شخص ان کے حق میں کچھ برا کہتا ہے اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ میرے قبلہ حضرت بڑے پیر صاحب (حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ) کا بھی یہی مذہب تھا۔" ختم۔

(ڈھول کی آواز ص۱۹۔ مرتبہ مولانا کامل الدین اتوکاری مطبوعہ مشتاق پریس سرگودھا)

حضرت خواجہ قمر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف مدظلہ

قطب العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کے پڑپوتے اور حضرت خواجہ ضیاء الملۃ والدین کے فرزند و جانشین ہیں۔ حضرت سیالوی مدظلہ کی ایک سنہری تحریر جو انھوں نے مولانا کامل الدین اتوکاری کو عنایت فرمائی، ملاحظہ ہو:

"میں نے تحذیر الناس کو دیکھا۔ میں مولانا محمد قاسم صاحب کو اعلیٰ درجہ کا مسلمان سمجھتا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میری حدیث کی سند میں ان کا نام موجود ہے۔ خاتم النبیین کے معنی بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا کا دماغ پہنچا ہے وہاں تک معترضین کی سمجھ نہیں گئی۔ قضیۂ فرضیہ کو قضیۂ

واقعہ حقیقیہ سمجھ لیا گیا ہے۔ (فقیر قمر الدین سیال شریف)
(ڈھول کی آواز، مؤلفہ مولانا کامل الدین رتوکالوی ص ۱۱۶ مطبوعہ عثمانی پریس سرگودھا)

حضرت مولانا خواجہ سدید الدین صاحب مدظلہٗ چشتی نظامی سجادہ نشین مردشریف ضلع سرگودھا

آپ کے دادا بزرگوار حضرت خواجہ محمد معظم الدین رحمۃ اللہ علیہ شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ اجل تھے۔ آپ نے قصبہ پپلاں ضلع میانوالی کے دیوبندی اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ عالم وفاضل ہیں اور مسلکِ اعتدال کے حامل۔ آپ کے استاذ محترم خاتم المحدثین حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ کے ہمدرس اور شیخ العالم حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی رحمۃ اللہ کے باکمال شاگرد تھے۔ راقم سطور نے ذاتی طور پر آپ کو وسیع المشرب پایا ہے۔ لاہور میں بارہا آپ کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ کے صاحبزادہ جناب غلام نظام الدین صاحب سے میرے گہرے روابط ہیں۔ وہ جب لاہور آتے ہیں، میرے ہاں بھی تشریف لاتے ہیں۔ فقیر بھی دو مرتبہ مرولہ شریف میں ایک دو شب ان کی مہمانی کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ چند سال پیشتر ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ (ستمبر ۱۹۶۸ء) کو جب حاضری ہوئی تو حضرت خواجہ قمر الدین صاحب سیالوی مدظلہٗ بھی ایک خاص جماعت کے ساتھ وہاں تشریف لائے ہوئے تھے جن میں علماء بھی تھے۔ صبح ناشتہ کے بعد جو مجلس تھی اس کی یاد اب تک تازہ ہے اس میں اکابر علماء دیوبند کا تذکرہ بھی ہوا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی تحذیر الناس کی عبارت کے بارے میں علماء میں سے کسی نے سوال کیا۔ حضرت خواجہ قمر الدین صاحب نے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی تائید کے ساتھ فرمایا کہ معترضین ان کی عبارت کو سمجھے نہیں۔ نیز علماء دیوبند کی تکفیر سے بری ہوں۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ "نور الایضاح" کا پورا واقعہ بیان فرمایا کہ کس طرح حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ مصر تشریف لے گئے اور ایک کتب خانے میں "نور الایضاح" کا قلمی نسخہ دیکھا اور پھر یہاں ہندوستان آ کر اپنے حافظے سے اس کو من وعن نقل کر کے شائع کرا دیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا:

"مولانا انور شاہ صاحب کا حافظہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا:"

ایک معمر عالم مجلس میں آئے، خواجہ صاحب نے ان سے پوچھا آپ نے حدیث کس سے پڑھی تھی۔ انھوں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کا نام لیا۔ آپ نے دریافت فرمایا "مولانا محمود حسن صاحب کو بھی دیکھا تھا؟" پھر خود ہی فرمایا: "مولانا بہت بڑے محدث تھے۔" حضرت خواجہ قمر الدین صاحب مدظلہٗ نے اپنے استاذ گرامی حضرت علامہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی نہایت والہانہ انداز میں کیا۔ ترک موالات کے حق میں ان کے ایک رسالے کا بھی ذکر کیا (حضرت علامہ اجمیریؒ کے اکابر دیوبند سے گہرے روابط تھے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہے) اپنے استاذ محترم کی علمی شان بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا: "مولانا احمد رضا خاں صاحب کا عشقِ رسولؐ بجا مگر میں بلحاظ علم وفضل انھیں اپنے استاذ علامہ معین الدین اجمیریؒ کے برابر نہیں سمجھتا:"

اس مجلس میں اور بھی باتیں ہوئیں، کیونکہ ہمارا عنوان "حکایت بزرگان" ہے اس لیے انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت پیر احمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چورہ شریف

"اسوۂ اکابر" میں ہے:

"متحدہ ہندوستان کے اور کئی ایسے مشائخ طریقت ماضی قریب میں گزرے ہیں جن کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ دیوبند کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کے ساتھ حسن ظن رکھتے تھے۔ ان میں سے

بعض نے خود اکابر دیوبند کی شاگردی اختیار فرمائی مثلاً حضرت پیر امیر شاہ صاحب (اچوڑ شریف ضلع کیمبلپور) کہ وہ اپنے جدِ امجد حضرت خواجہ نظام الدین محمد صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے اور عمر بھر اکابر علماء دیوبند کے علم و تقویٰ کی مدح فرماتے تھے بلکہ ہم نے خود بھی سنا کہ حضرت پیر صاحب کی زبانی کئی دفعہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی شان میں تعریفی الفاظ سنے ہیں۔ (مصنف)

در مدح شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن دیوبندی

زمینِ فقر بوسم دیو اینجا در کمند آمد — نگاہِ حضرتِ محمود اینک دیوبند آمد

قیامت را بقامت نسبتے دادم غلط کردم — قیامتہا بلا گردانِ آں بالا بلند آمد

ادب نا آشنا قدرِ سخنہائش چہ میداند — کہ در درگاہِ حضرت ہر کہ آمد ارجمند آمد

چہ خوانم از تمنائش چہ گویم از تماشائش — تمنا خود فروش آمد تماشا خود پسند آمد

بہ پیشِ روئے لیلیٰ مہر و مہ را برنمی سنجد — نگاہِ حضرتِ مجنوں چہ مشکل پسند آمد

ز انفاسِ گرامی خاکِ پنجاب آبرو دارد
گرامی از مریدانش عظامی[1] سربلند آمد

---

[1] مولوی عزیز الدین احمد عظامی تلمیذ خاص حضرت مصنف۔

مولانا دیدار علی شاہ صاحب الوری مرحوم (م ۱۳۵۴ھ)

مسجد وزیر خان لاہور کے خطیب (مفتی مولانا ابو الحسنات محمد احمد قادری اور مولانا ابو البرکات سید احمد قادری لاہوری کے والد تھے۔

مولانا دیدار علی شاہ صاحب کے ایک رسالہ تحقیق المسائل" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

" اور مولانا واستاذنا رئیس المحدثین استاذ مولانا محمد قاسم صاحب مغفور حضرت مولانا احمد علی صاحب مرحوم مغفور محدث سہارنپوری کے فتوی اجوبہ سوالات خمسہ کی نقل، زمانِ طالب علمی میں کی ہوئی احقر کے پاس موجود ہے۔"

رسالہ تحقیق المسائل" صفحہ۳ سطر ۳، ۴، ۵۔

مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لاہور طبع ثانی ۱۳۴۵ھ

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی

پنجاب میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے سربر آوردہ پیر تھے۔ قطب زمانہ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کے خلیفہ اکمل تھے

" اسوۂ اکابر" کے مؤلف کا بیان ہے:

" حضرت مولانا محمد سعید صاحب کوہ مری والے فرماتے ہیں کہ میں حضرت پیر صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا: آپ مولوی قاسم صاحب کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ حضرت پیر صاحب نے جواباً فرمایا:

" تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟۔ سائل نے عرض کیا: جی ہاں انہی کے متعلق حضرت پیر صاحب نے فرمایا:

" وہ حضرت حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔"

اسوۂ اکابر مؤلفہ مولانا محمد بہار الحق قاسمی خطیب ماڈل ٹاؤن لاہور۔ مطبوعہ آفتاب عالم پریس لاہور ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء

حضرت پیر صاحب گولڑوی نے ایک فتوی متعلقہ "فرار از طاعون" کی تصدیق و تائید میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا ایک فتوی اپنی کتاب "فتوحات صمدیہ" (مطبوعہ ملتان بار سوم ص۱۶) میں درج کیا اور اس پر جلی قلم سے یہ عنوان تحریر فرمایا:

" نقل فتوی جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی عم فیضہ"

حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد جب یہ فتوی خدام خانقاہ گولڑہ شریف کی طرف سے شائع کیا گیا تو حضرت کا نام یوں درج کیا:

" حضرت مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی"

(اسوۂ اکابر ص۲)

جناب حضرۃ خواجہ شہید اللہ صاحب فریدی مدظلہ

آپ نومسلم انگریز ہیں۔ حضرت سید ذوقی شاہ صاحب رحمۃ اللہ (خلیفہ حضرت مولانا وارث حسن صاحب لکھنوی) کے خلیفہ ہیں۔ آپ نے "تربیۃ العشاق" کے نام سے اپنے پیر و مرشد کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ ص۱۱۱ پر ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں۔ عنوان یہ ہے:

• حضرت اقدس کو حضرت حاجی صاحب اور مولانا گنگوہی سے خلافت" ملفوظ ملاحظہ ہو۔

• حسب ذیل خواب حضرت اقدس نے دسمبر ۱۹۴۰ء (مطابق ذوالقعدہ ۱۳۵۹ھ) میں بیان فرمایا۔

ایک دفعہ حضرت اقدسؒ نے اپنے مجاہدات کے زمانے کا خواب سنایا، جس میں آپ کو حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے خلافت ملی۔ آپ نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ سے خلافت پانے کا واقعہ بھی بیان فرمایا۔

ارشاد فرمایا کہ مجاہدات کے زمانے میں جب میں اجمیر شریف میں رہتا تھا، ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک بہت صاف ستھرے صحن میں ہوں جو سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ وہاں علما کا ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ میرے ایک دوست مولوی اشرف حسین (یا شاید حضرت نے عابد حسین فرمایا) نے میرا تعارف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے کرایا۔ اس وقت آپ کی صورت ایک نوجوان کی سی تھی اور سر پر سنہری تاج پہنے ہوئے تھے اور نہایت عظیم الشان ہستی معلوم ہوتے تھے۔ آپ مجھے بہت خوشی سے ملے اور میرا امتحان لینے لگے۔ ساتھ ہی آپ نے یہ فرمایا:

"شاید پہلی نظر سے سوالات مشکل نظر آئیں، لیکن ان کا جواب آسان ہوگا۔"

میں نے سارے سوالوں کا ٹھیک جواب دیا۔ شروع سے میں اپنے شیخ مولانا وارث حسن صاحبؒ کو تلاش کر رہا تھا، تاکہ مجھے کچھ سہارا مل جائے۔ امتحان کے بعد مولانا رشید صاحب گنگوہیؒ نے فرمایا:

"اچھا اب تم لوگوں کو تعلیم دینا شروع کر سکتے ہو۔"

جب میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے رخصت ہوا تو پھر مولانا صاحبؒ کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ میں نے ایک سیڑھی دیکھی، میں اس پر چڑھنے لگا اوپر جا کر مولانا صاحبؒ کو مریدین کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مولانا صاحبؒ نے دیکھتے ہی فرمایا:

"تم کہاں تھے، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا"

میں نے ان کو سارا ماجرا سنایا اور آپ بہت مسرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ پھر خواب ختم ہوگیا اور میں تین دن تک حال میں پلنگ ہی پر پڑا رہا۔ اس کے بعد میں لکھنؤ گیا اور مولانا صاحبؒ سے ملا۔ اس وقت میں نے آپ کو اسی حالت میں پایا جیسے خواب میں دیکھا تھا۔ مولانا صاحبؒ نے دیکھتے ہی اسی محبت سے دریافت فرمایا:

"تم کہاں تھے، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

یہ سن کر میں ہنسنے لگا۔ جب مولانا صاحبؒ نے ہنسنے کا سبب دریافت فرمایا تو میں نے وہ خواب بیان کیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد مجھے خلافت بھی مل گئی۔ تربیۃ العشاق صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰

شائع کردہ محفل ذوقیہ کراچی طبع دوم ۱۹۳۴/۱۹۰۴ء

حضرت سید جماعت علی شاہ صاحب ثانی علی پوریؒ

۱۲۵۰ھ / ۱۹۲۹ء

حضرت مولانا سید نعمۃ اسلم صاحب خطیب مسجد قادری لاہور نے خود راقم سطور سے بیان فرمایا کہ میں نے علی پور شریف میں اپنے استاد محترم حضرت صاحبزادہ محمد حسین شاہ صاحبؒ (خلف الرشید حضرت پیر حافظ سید جماعت علی شاہ صاحب علیپوریؒ م ۱۹۵۱ء) سے دورہ حدیث سے پہلے کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ایک روز میرے والد صاحب حضرت مولانا سید عبدالغنی شاہ صاحب (م ۱۹۴۰ء) خلیفۂ اعظم زبدۃ العارفین حضرت سید جماعت علی شاہ صاحب ثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: "میرا خیال ہے تم اپنی تعلیم مکمل کرو، دورہ حدیث شریف کے لیے دو جگہیں ہیں دارالعلوم دیوبند اور منظر اسلام بریلی۔ جہاں تمہارا جی چاہے وہاں چلے جاؤ اور تکمیل کرو۔" میں نے عرض کیا کہ میں اپنے استاد حضرت صاحبزادہ محمد حسین شاہ صاحبؒ کے مشورے سے کوئی فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ میں علی پور گیا، حضرت استاد کی خدمت میں والد بزرگوار کا منشاء مبارک ظاہر کیا، حضرت صاحبزادہ صاحب نے

دارالعلوم دیوبند کا مشورہ دیا. واپس آکر میں نے حضرت والد صاحب حضرت الاستاذ کا فیصلہ عرض کر دیا. چنانچہ دیوبند کے لیے تیاری شروع ہوگئی اس زمانہ میں مرشدی و مولائی حضرت اقدس ثانی صاحب علی پوریؒ ابھی حیات تھے. اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعا کی درخواست کی. انہوں نے دارالعلوم دیوبند جانے پر بشاشت ظاہر فرمائی اور دعوات صالحہ سے مجھے رخصت کیا چنانچہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں ڈیڑھ دو سال رہ کر دورۂ حدیث شریف کی سعادت حاصل کی.

مولانا سید محمد اسلم فرماتے ہیں کہ میرے پیر و مرشد حضرت ثانی صاحب علی پوریؒ بزرگان دیوبند کو کلمات خیر سے یاد کیا کرتے تھے اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تو وہ بہت تعریف فرماتے تھے.

مولانا محمد اسلم حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں. اس وقت اسّی سال کی عمر میں ہیں. آپ کے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ علمائے دیوبند حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک اور تعلیمات پر عامل ہیں. عارف کامل حضرت سید جماعت علی شاہ صاحب ثانی علی پوری قدس سرہ قطب ربانی بابا فقیر محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے. آپ کی روش صوفیہ سلف کا نمونہ تھی. حضرت مولانا حافظ محمد شفیع صاحب سنکھتروی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کے خلفاء میں سے تھے جو بزرگان دیوبند سے نہایت درجہ عقیدت رکھتے تھے.

حضرت صاحبزادہ سید محمد حسین شاہ صاحب علی پوریؒ

محب الرشید حضرت پیر حافظ سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوریؒ (م ۱۹۵۱ء) والد ماجد نے آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا آپ وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے. فرمایا کرتے تھے کہ ہم فارغین کی دستار بندی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ کے دست مبارک سے ہوئی تھی. آپنے علی پور میں مدرسہ قائم

کیا ہوا تھا طالب علموں کو خود بھی کتابیں پڑھاتے تھے دورۂ حدیث شریف کے لیے طالب علموں کو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور جانے کی تلقین فرماتے تھے.

قطب عالم حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری قدس سرہ (م ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء)

ابتداء میں قطب العارفین حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری قدس سرہ خلیفہ اعظم رئیس المجاہدین غازی اسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات نور اللہ مرقدہ (م ۱۲۹۵ھ) سے مرید تھے. ایک زمانہ ان کی خدمت میں رہنے کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے. حضرت پیر و مرشد کے ارشاد پر رائپور میں جو حضرت رائے پوری کا ننھیال گاؤں تھا. آپنے اقامت اختیار کی. قصبہ رائے پور سے باہر ذرا فاصلے پر چمن شرقی کے دوسرے کنارے خانقاہ کی بنا ڈالی. جو بعد میں خانقاہ گلزار رحیمی کے نام سے موسوم ہوئی ہے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو آپکے شیخ عالیمقام نے وفات پائی. رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ بزرگوار کی وفات کے بعد آپ کبھی کبھی کلیر شریف بھی جایا کرتے تھے اکثر تنہا سفر فرماتے کسی کو ساتھ نہ رکھتے بعض اوقات کچھ شب و روز وہاں قیام بھی فرماتے ایک مرتبہ وہاں حاضر ہوئے تو عجیب واقعہ پیش آیا. جس نے آپ کی زندگی میں ایک خاص انقلاب پیدا کیا جسے مرشدنا مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری (م ۱۳۸۲ھ) قدس سرہ بارہا اپنی مجالس میں بیان فرماتے تھے. واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ ایک شب کو تاج الاولیاء حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری قدس سرہ کے مزار مبارک کے قریب ہی مسجد سے ملحق صحن میں محو خواب تھے. نصف شب کو آپنے بارش محسوس کی. آپ فوراً اندر سایہ میں چلے گئے پھر غور کیا تو معلوم ہوا کہ بارش نہ تھی دوبارہ آپ باہر آکر آرام فرما ہوئے. کچھ دیر کے بعد پھر یہی کیفیت ہوئی. اب آپ کو یقین ہو گیا کہ بارش انوار ہے. آپ اٹھے وضو کیا اور نوافل میں مشغول ہو گئے اچانک آپنے آواز سنی. "عبدالرحیم..... عبدالرحیم" آپ نے خیال کیا کہ صحن میں ان متعدد

سعادت دارین کی کوئی ہوا چلتی کوئی بلا رہا ہے تو آپ کے قلب کو کشش ہوئی سلام پھیر کر مزار مبارک کی طرف متوجہ ہوئے۔ آواز آئی "میں تمہیں بھی بلا رہا ہوں"۔ یہ ارشاد ہوا "ہمارے سلسلے کی نعمت اس وقت گنگوہ میں ہے۔ مولانا رشید احمد صاحب کے پاس آپ وہاں جاؤ۔

آپ کلیر شریف سے عجیب خیالات جذبات کے ساتھ لوٹے۔ یہ سفر کا زمانہ تھا۔ آپ گنگوہ شریف حاضری سے پہلے ہی سفر مبارک پر روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں قطب الاقطاب شیخ العرب والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے چشمۂ فیوض و برکات سے ایک عالم سیراب ہو رہا تھا۔ آپ کو منظر میں ان کی خدمت مبارک میں باقاعدہ حاضر ہوتے رہتے۔

حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے والد بزرگوار بھی اعلیٰحضرت حاجی صاحب کے مرید تھے ان کی بیعت کا واقعہ تذکرۃ الرشید اور امداد المشتاق میں موجود ہے۔

اعلیٰحضرت حاجی صاحب کی شفقت حضرت رائپوری کے حال پر بے پایاں رہی۔ ایک روز آپ مجلس مبارک میں موجود تھے کہ حاجی صاحب نے ایک عام ارشاد فرمایا "میں آج مجلس کے بعد اپنا قرآن پاک جو میرے زیر تلاوت رہتا ہے اس شخص کو دوں گا جو قرآن پاک سے کمال شفقت کے باعث مجھ سے آگے نکل گیا"۔ اس نعمت کا اشتیاق بہت سے حاضرین کو ہوا۔ مگر یہ نعمت جس ذات کے مقدر میں تھی۔ اسی کو ملی۔ اعلیٰحضرت حاجی صاحب نے اختتام مجلس کے بعد وہ کلام پاک حضرت اقدس رائپوریؒ کو عنایت فرمایا۔ جس پر بڑے بڑوں کو رشک ہوا۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اعلیٰحضرت حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "مولانا! آپ سے میرا رشتہ روحانی ہے۔ ہندوستان واپسی کے وقت مجھے مل کر جائیے گا"۔

اگرچہ حضرت اقدس رائپوری نے کلیر شریف کا واقعہ کسی سے بھی بیان نہیں فرمایا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ پر وہ تمام کمال منکشف ہو گیا۔

حضرت اقدس رائپوریؒ جب آخری ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو اعلیٰحضرت حاجی صاحبؒ نے ایک مکتوب گرامی قطب الارشاد گنگوہیؒ کے نام دیا جس میں ان کی اصلاح کے بارے میں تحریر فرمایا تھا۔ حضرت اقدس رائپوریؒ واپس آ کر گنگوہ شریف پہنچے۔ حضرت والا کی خدمت میں اعلیٰحضرت حاجی صاحب کا مکتوب مبارک پیش کیا تین شب و روز آپ وہاں خانقاہ رشیدیہ میں قیام پذیر رہے رخصت کے وقت حضرت اقدس گنگوہیؒ نے آپ کو بیعت سے مشرف فرمایا اور چاروں سلاسل طیبہ کی اجازت کے ساتھ اپنی دستار خلافت مرحمت فرمائی۔

حضرت خواجہ سراج الدین صاحب قدس سرہٗ خانقاہ موسیٰ زئی شریف

خلیفہ ارشد حضرت خواجہ محمد عثمان دامانی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حدیث میں حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں) (تلمیذ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ) کے شاگرد تھے۔ آپ کے صاحبزادوں نے بھی دیوبندی اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

حضرۃ مولانا ابو السعد احمد خان قدس سرہٗ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف

خلیفہ اعظم حضرت خواجہ سراج الدین صاحب قدس سرہٗ موسیٰ زئی شریف۔ آپ کے زمانے میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کندیاں تشریف لے گئے۔ آپ بے حد اکرام و احترام سے پیش آئے۔ آپ کے خلیفہ و جانشین حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب قدس سرہٗ ہوئے جو فاضل دیوبند تھے سجادہ نشین حال حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہٗ بھی علماء دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نقشبندی خانقاہ کے سلسلۂ رشد و ہدایت سے لاکھوں افراد وابستہ ہیں۔

حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوری قدس سرہٗ

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے مربیوں میں سے تھے۔
آپ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی تحریک آزادی کے ممتاز مجاہدین میں سے تھے۔
آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالہادی صاحب کو اجازت وخلافت شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے ہے۔

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی قدس سرہٗ

آپ حضرت خواجہ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی شریف کے خلفائے عظام میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک آزادی کے سرگرم مجاہد تھے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پیر بھائی اور مربی تھے۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہٗ آپ ہی کے خلیفۂ اعظم تھے۔
آپ کے صاحبزادے سید محمود شاہ صاحب آج کل جمعیۃ علماء اسلام سندھ کے امیر ہیں۔

حضرت حاجی فضل واحد صاحب ترنگزئی قدس سرہٗ

بیک واسطہ غازی اسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب، سوات قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔
حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے سرگرم مجاہد تھے، انگریز کے خلاف برسرپیکار رہے۔

- "دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصول تشنگانہ الہامی ہیں" (محمد علی جوہرؒ)
- "ہے دل روشن مثال دیوبند" (اکبر الٰہ آبادی)
- "گنجینۂ فقر را کلید ست رشید" (گرامی)
- "محمود رسید در مقام محمود" (گرامی)
- "محمل رائے تجلی ست روئے انور شاہؒ" (اقبالؒ)
- "میں مثنوی مولانا روم کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مقلد ہوں" (اقبالؒ)
- "میں یقین دلاتا ہوں کہ مولانا (سید حسین احمد مدنیؒ) کی محبت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں" (اقبالؒ)
- "مقدمہ کراچی میں سر عدالت مولانا محمد علی جوہرؒ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے قدم چوم لیے تھے"
- "شیخ اکمل آں بخاری مرو راہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ" (گرامی)
- "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ انور شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" (اقبالؒ)
- "خدا کی قسم میں نے انور شاہؒ جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا" (علامہ رشید رضا مصری)
- اس میں قاسم ہوں کہ انور شاہ کہ محمود الحسنؒ
  سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند
  (ظفر علی خانؒ)

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

فاضل رشیدی
مدیر البلاغ

اکابر دارالعلوم دیوبند اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال

ذرا پوچھ ان خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان کو ○ ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

○ دارالعلوم دیوبند کے بعد سب سے قدیم مدرسہ رشیدیہ رائے پور تحصیل نکودر ضلع جالندھر پنجاب ہے۔ جو دیوبند کی ہی طرز پر قائم کیا گیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا الحاج الحافظ محمد صالح رائے پوری تھے، جامعہ کے بانی مرحوم کا ذکر رسالہ "تذکرۃ الرشید" میں موجود ہے — ○ مدرسہ رشیدیہ کے مہتمم اول حضرت مولانا فضل احمد رائے پوری بھی حضرت گنگوہی سے بیعت حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری سے فیضیاب اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مجاز تھے۔ آپ رائے پور تشریف لانے سے قبل لاہور کے مدرسہ میں تعلیم و تدریس پر مامور تھے، جہاں حضرت مولانا سید فخرالدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند آپ سے تعلیم حاصل کرتے رہے ○ مدرسہ رشیدیہ رائے پور کے واعظ حضرت مولانا احمد دین رائے پوری، حضرت مولانا عبدالقادر کے خلیفہ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے پہلو میں مدفون ہیں۔

جامعہ رشیدیہ کے صدر مدرس اور مفتی اعظم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ فقیر اللہ جالندھری (والد ماجد عبداللہ، حبیب اللہ اور قاری لطف اللہ خادمان جامعہ رشیدیہ) دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد رہے، مرحوم علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہم درس تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سے فن افتاء میں تربیت حاصل کی۔ آپ نے رائے پور سے ساہیوال تک اکابر دارالعلوم و حضرات تھانہ بھون سے رابطہ قائم رکھا۔ آپ کا تفقہ فی الدین، تصلب، تقویٰ زبان زد خاص و عام ہے۔ آپ کی وفات کے ۲۳/۲۴ ماہ بعد آپ کی قبر کی مٹی سے خوشبو کے عینی گواہ موجود ہیں ○ آپ کے خصوصی تلامذہ میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا محمد نور جالندھری، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالجبار ابوہری، مولانا محمد ابراہیم میرپوری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا رشید احمد سلفی (جامعہ سلفیہ) جیسے مشہور و معروف حضرات ہیں — ○ استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی مدرسہ خیر المدارس جالندھر و ملتان، جامعہ رشیدیہ کے سرپرست اور ہمارے خصوصی شفیق مربی اور محسن استاذ تھے، آپ حضرت تھانوی قدس سرہ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مدرسہ رشیدیہ رائے پور کے سرپرست حضرت مولانا منشی رحمت علی بڑی شان و شوکت کے رئیس، حضرت گنگوہی کے فیض یافتہ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے خلیفہ مجاز اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے رفیق خاص تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رکین رہے۔ ○ جامعہ رشیدیہ کی نشاۃ ثانیہ (ساہیوال) کے مؤسس اور مبلغ اعظم مولانا حافظ قاری لطف اللہ رشیدی فی سبیل اللہ، حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ سید محمد یوسف بنوری کے خصوصی شاگردوں میں تھے۔ علامہ عثمانی نے قاری صاحب اور راقم کو جمعیۃ علماء اسلام پنجاب کا رکن بنانے کا حکم دیا تھا جس کی تعمیل میں راقم ناظم نادم تحریر خادم جمعیۃ علماء اسلام ہے۔ بفضلہ تعالیٰ المرحوم خلاصۃ کلام دارالعلوم اور جامعہ رشیدیہ کا تعلق قدیم اور بطریق دونوں جانب سے ہے اور ان شاء اللہ یہ تعلق قائم و دائم رہے گا۔ اسی تعلق کی بنا پر الرشید کا خصوصی شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خصوصی اشاعت کا مقصد جذبۂ محبت ہے جو دارالعلوم کا مقصد ہے۔ تقبل اللہ منا و منہم

خواهم که همیشه در وفای تو زیم
خاکی شوم و زیر پای تو زیم
مقصود من خسته ز کونین توئی
از بهر تو میرم از برای تو زیم

اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِی

مدرسہ عربیہ اسلامیہ (رجسٹرڈ) بوریوالا ضلع ملتان کے مختصر کوائف

یہ مدرسہ [illegible] میں قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کے فرمان اور ترغیب دینے پر قائم ہوا۔ پھر [illegible] میں آپ نے اور آپ کے مرید حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی۔ یہ شاندار عمارت اب دو منزل اور ایک مسجد پر مشتمل ہے۔

مدرسہ ہذا کے مندرجہ ذیل شعبوں میں تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے:-

درسِ نظامی، درجہ عربی زنانہ، درجہ حفظ مردانہ، درجہ حفظ زنانہ، درجہ تجوید۔

۱۔ **درسِ نظامی:** کا نصاب وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مطابق ہے جو چودہ علوم اور مضامین پر مشتمل ہے۔

۲۔ **درجہ تجوید:** عربی طلبہ کے لیے روایت حفظ تک تجوید حاصل کرنا ضروری ہے۔

۳۔ **درجہ عربی زنانہ:** میں سہ سالہ نصاب رائج ہے جو صرف، نحو، فقہ، حدیث، ترجمہ قرآن پاک و تفسیر پر مشتمل ہے۔

۴۔ **درجہ حفظ مردانہ و زنانہ:** میں اردو نوشت و خواند فقہ کی کتابوں کے ذریعے لازمی ہے۔

۵۔ **دار الافتاء:** بھی عوام کی دینی رہنمائی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

۶۔ **کتب خانہ:** مدرسہ کے کتب خانہ میں دس ہزار سے اوپر عربی، فارسی، اردو، انگریزی کی کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔

۷۔ **دار المطالعہ:** طلباء مدرسہ اور عوام کے لیے دار المطالعہ کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

۸۔ **دار الاقامہ:** میں ڈیڑھ صد سے اوپر مسافر طلباء جو قرآن پاک اور درسِ نظامی کی تعلیم کے لیے مختلف علاقوں سے آئے ہیں کے قیام و طعام، پوشاک، ادویات وغیرہ جملہ ضروریات مدرسہ ہی فراہم کرتا ہے۔

۹۔ مستند اور تجربہ کار معلمین و معلمات یکجا اکٹھے کر دیئے ہیں جو انضباط اوقات کے ساتھ تعلیمی فرائض میں مشغول ہیں۔

۱۰۔ ان تمام انتظامات پر ایک لاکھ سے اوپر کے اخراجات کا بجٹ مستقل ہے مگر آمدنی مستقل نہیں اور نہ ہی کوئی سفیر ہے جو باہر سے چندہ فراہم کرنے پر مامور ہو۔ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے بھروسہ پر خوش اسلوبی سے تمام کام انجام پاتے ہیں۔ مدرسہ رجسٹرڈ ہے حساب باضابطہ آڈٹ ہوتا ہے۔ مدرسہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

حکیم الاسلام حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند مدرسہ ھذا کے بارے میں فرماتے ہیں: "مدرسہ بحمداللہ اپنے تعلیمی کام میں مشغول و منہمک ہے اور مستفیدوں اور طلباء کے علم پہنچا رہا ہے۔ کارکن مخلص اور اسلامی سادگی کا نمونہ ہیں۔"

عبدالرحیم نعمانی مہتمم مدرسہ عربیہ اسلامیہ بوریوالا ضلع ملتان

ایم۔ اے۔ اسلامیات

پرچہ نمبر ۱ القرآن برائے امتحان ۱۹۷۶ء و ۱۹۷۷ء

۱۔ سورۃ نساء مع ترجمہ وتفسیر، ہدیہ ۸/- روپے (۲) سورۃ مائدہ مع ترجمہ وتفسیر، ہدیہ ۶/- روپے

۲۔ تاریخ ادب تفسیر و اصول تفسیر، ہدیہ ۲/- روپے۔ نوٹ: مندرجہ بالا تفاسیر مولانا منظور احمد صاحب ایم اے اسلامیات و عربی (گولڈ میڈلسٹ) فاضل دیوبند، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی تالیف ہیں۔ ان میں تفسیر المنار (علامہ رشید رضا) تفسیر فی ظلال القرآن (سید قطب) تفسیر حقانی و تفسیر ابن کثیر و تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی کے خصوصی اقتباسات شامل کر دیئے ہیں۔ اس لیے یہ تفاسیر نہایت جامع ہیں۔ اور الگ الگ تفاسیر کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پرچہ I القرآن مندرجہ بالا تینوں کتابوں سے مکمل ہو جاتا ہے۔

پرچہ نمبر ۲ الحدیث (از پروفیسر مولانا منظور احمد ایم اے (عربی و اسلامیات) گولڈ میڈلسٹ فاضل دیوبند)

(۱) کتاب الصلوٰۃ از مشکوٰۃ المصابیح (ہر فصل کی پہلی حدیث صرف) مع ترجمہ و تشریح (نیا ایڈیشن زیر طبع)

(۲) کتاب الزکوٰۃ و کتاب الصوم از مشکوٰۃ المصابیح (ہر فصل کی پہلی حدیث صرف) مع ترجمہ و تشریح، ہدیہ ۷/- روپے

(۳) تاریخ و اصول حدیث، ہدیہ ۲/- روپے

پرچہ نمبر ۳ الفقہ:

(الف) تاریخ فقہ مع عائلی قوانین و علم الفرائض۔ از پروفیسر مولانا منظور احمد، ہدیہ ۲/۷۵ روپے

(ب) رہنمائے فقہ و اصول فقہ: اس میں ہدایہ اور اصول الشاشی کا ملخص آسان زبان میں دیا گیا ہے۔ ہدیہ ۵/۵۰ روپے

پرچہ نمبر ۴:

تاریخ مسلمانان عالم: (قدیم و جدید) موجودہ عالم اسلام سمیت ملک کے فاضل تاریخ دان پروفیسر محمد رضا خان ایم اے، ڈپلومہ پی۔ ای۔ ایس I (ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج ڈیرہ اسمٰعیل خان) کی مرتب کردہ ہے۔ اس میں سلیبس میں دیئے گئے تمام عنوانات شامل ہیں۔ بہترین کتاب۔ عمل اسلام اور اسلامی نظریات کی زندہ تصویر

نوٹ: تمام ادوار کا بہترین تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ صفحات بڑے سائز کے ایک ہزار، قیمت ۲۰/- روپے

پرچہ نمبر ۵:

مطالعہ تقابل ادیان (نیا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۷۶ء) از پروفیسر غلام رسول ایم اے جامع کتاب ہے۔ ہدیہ ۲۰/- (زیر طبع)

پرچہ نمبر ۶:

اسلام اور معاشرتی، معاشی و سیاسی افکار: از پروفیسر چودھری غلام رسول ایم اے

(۱) اسلام کا معاشرتی نظام قیمت ۱۵/- روپے (۲) اسلام کا سیاسی نظام قیمت ۱۲/- روپے (۳) اسلام کا معاشی نظام قیمت ۶/- روپے

پرچہ نمبر ۷: اسلام، سائنس اور فلسفہ

(۱) اسلام اور سائنس، از پروفیسر طارق ایم اے قیمت ۱۲/- روپے (اسلام اور فلسفہ، از پروفیسر خان محمد ایم اے، قیمت ۹/- روپے (نیا ایڈیشن زیر طبع)

پرچہ نمبر ۸: آپشن I تھیسس مع زبانی امتحان (۱۰۰ نمبر) آپشن II جواب مضمون ۵۰ زبانی امتحان ۵۰ نمبر

(۱)۔ مقالات علوم اسلامیہ: از پروفیسر مولانا منظور احمد صاحب (گولڈ میڈلسٹ) یونیورسٹی کے پرچوں سے منتخب مضامین پر مقالات لکھے گئے ہیں۔ بلند پایہ کتاب ہے۔ نیا ایڈیشن اضافہ شدہ (زیر طبع)

مدرس عربی: از پروفیسر میاں منظور احمد ایم اے گولڈ میڈلسٹ (عربی و اسلامیات) فاضل دیوبند، عربی صرف و نحو، ترجمہ، کمپوزیشن پر مکمل کتاب، زبان آسان، مثالیں جدید عربی سے لی گئی ہیں یا قرآن و حدیث سے، ترکیب نحوی، مضمون نویسی، کہانی لکھنا، مکالمات وغیرہ سب شامل ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے حصہ اول کافی ہے۔ حصہ دوم ایف اے، بی اے، ایم اے اور ادیب عربی، عالم عربی اور فاضل عربی کے لیے مکمل رہنما ہے۔ قیمت: حصہ اول زیر طبع ۴/- روپے، حصہ دوم ۱۰/- روپے

تفسیر بیضاوی: مع اردو ترجمہ (برائے ایم اے عربی) ہدیہ ۶/- روپے

علمی کتاب خانہ: کبیر سٹریٹ، اردو بازار لاہور

بلند پایہ اسلامی کتابیں
قاسم العلوم
فارسی مکتوبات حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ
مع اردو ترجمہ از پروفیسر محمد انوار الحسن ایم اے فاضل دیوبند شیر کوٹی
حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے گیارہ
علمی خطوط جن کی دھوم تمام ہندوستان میں مچ گئی تھی اور جو علوم و فنون
کا بیش بہا خزانہ ہیں، جن کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت یاد آتی ہے مع
سلیس اردو ترجمہ، خلاصہ مکتوب، تشریح اصطلاحات، سفید کاغذ،
خوبصورت جلد، صفحات ۵۶۰، سائز ۸/۲۰×۳۰، ہدیہ تیس روپے چھپ
گئے ہیں۔ مکتوبات کے چند عنوانات درج ذیل ہیں۔
۱۔ باغ فدک کی تحقیق، ۲، شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ شیعوں کے
نکتہ نگاہ سے (۳) کیا امام خطا اور سہو سے معصوم ہوتا ہے؟ (۴)
دارالحرب میں سود کی حرمت و حلت (۵)، معجزہ دلیل نبوت کس طرح
ہے؟ (۶) تحقیق حدیث ابو زرین کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرنے سے
پہلے کہاں تھا؟ (۷) مکاتب غلام اس وقت تک غلام ہے جب تک
ایک درہم بھی اس کے ذمہ ہے (۸) اختلاف امت رحمت ہے، کی
تحقیق (۹) تحقیق حدیث کہ جس نے اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانا تو وہ
جاہلیت کی موت مرا وغیرہ وغیرہ۔
مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب کی رائے :۔
"قاسم العلوم مع آپ کے ترجمہ اور حواشی کے نظر نواز ہوا۔ دل سے دعا نکلی
اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑے اچھے کاموں کیلئے موفق فرمایا اب یہ گمشدہ ذخیرہ علوم آپکے
ذریعہ نہ صرف محفوظ ہو گیا بلکہ افادیت میں چند در چند ہو گیا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔"
۱۔ بہشتی زیور مدلل و مکمل :۔ از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
بہترین لکھائی، چھپائی، کاغذ، ہدیہ ———— ۳۰ روپے
۲۔ تبلیغی نصاب :۔ از حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری۔ عمدہ لکھائی،
چھپائی، کاغذ۔ احادیث پر اعراب لگے ہوئے ہیں۔ ہدیہ ۲۱ روپے
۳۔ فضائل صدقات :۔ از حضرت مولانا محمد یوسف۔ لکھائی چھپائی
کاغذ عمدہ۔ ہدیہ ———— ۲۱ روپے
۴۔ نسخہ کیمیا :۔ از حضرت امام غزالی۔
اردو ترجمہ کیمیائے سعادت۔ ہدیہ ———— ۲۶ روپے
۵۔ تعلیم الاسلام :۔ از حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ۔ اعلیٰ لکھائی
چھپائی کاغذ۔ چار حصے۔ ہدیہ ———— ۶ روپے
۶۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا :۔ از حضرت مولانا عاشق الٰہی۔
لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ ہدیہ ———— ۷-۵۰ روپے
۷۔ سوانح عمری :۔ حضرت مولانا محمد یوسف۔
ہدیہ ———— ۹ روپے
۸۔ حیاۃ الصحابہ :۔ از حضرت مولانا محمد یوسف۔
اردو ترجمہ از حضرت مولانا محمد عثمان فیض آبادی۔ جلد اول ہدیہ ۱۵ روپے
جلد دوم ۱۵ روپے
جلد سوم ۱۵ روپے
۹۔ اکابر امت محمدیہ :۔ از حضرت مولانا اشتیاق احمد دیوبندی
قادری، نقشبندی، مجددی۔ ہدیہ ———— ۴ روپے
۱۰۔ تعارف اسلام :۔ از حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی
۱۱۔ حضرت کی تقریریں :۔ ارشادات حضرت مولانا محمد یوسف
۱۲ نصاب و نظام دینی مدارس :۔ از حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی
ناشران قرآن - ۳۸ - اردو بازار، لاہور

تبلیغ اسلام اور تعلیم و اشاعت قرآن کا بے مثل تاریخی ادارہ

انجمن خدام الدین پاکستان

لاہور، کراچی

موسس و بانی قطب الاقطاب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہ

جب برِ صغیر میں برطانوی تسلط و استبداد اپنی انتہا کو پہنچ گیا، تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ناکام ہو گئی تو حصولِ مقاصد کے لیے علمائے حق نے تحریک دارالعلوم دیوبند کا آغاز کیا جس نے آگے چل کر تحریک علی گڑھ اور تحریک دیوبند کو قرآن حکیم کی اساس پر دہلی میں "نظارت المعارف القرآنیہ" کی شکل میں جمع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے جنگِ عظیم اول شروع ہو گئی اس سے تحریک ہجرت و ریشمی رومال" معرضِ وجود میں آئی جس میں شرکت کی پاداش میں برٹش سامراج نے حضرت شیخ التفسیر کو لاہور میں نظر بند کر دیا تو گویا نظارت المعارف دہلی سے خدام الدین اور قاسم العلوم کے نام سے لاہور منتقل ہو گئے۔

انجمن کے شعبہ جات — مدرسہ قاسم العلوم

جس کی مستقل عمارت اور عظیم الشان لائبریری موجود ہے، جو مادیت و الحاد کے اس دورِ پُرفتن میں گذشتہ نصف صدی سے اسلامی علوم و فنون کی سرمدی تعلیمات کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہے۔ اس شعبہ کی زیرِ نگرانی درسِ نظامی، درسِ قرآن عمومی و خصوصی درجہ اور قرأت و تجوید کا معقول انتظام ہے۔ سالانہ دورۂ تفسیر قرآن [illegible] حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت لاہوریؒ کے دستخطوں سے مزین سند دی جاتی [illegible]

انجمن نے لاہور اور کراچی میں مسلمان بچیوں کی قرآن و سنت [illegible] معقول بندوبست کیا ہے۔

مدرسۃ البنات

شعبہ نشر و اشاعت

حضرت شیخ التفسیرؒ کے مختلف موضوعات پر ۴۲ رسائل ۱۳ لاکھ کی تعداد میں چھپ کر دنیا کے کونے کونے میں [illegible] جلد [illegible] رسائل کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں سورہ علق، سورہ عصر، سورہ قریش، سورہ کوثر اور تفسیر معوذتین بڑی [illegible] میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور علامۃ المشکوٰۃ، گلدستۂ صد احادیث اکثر مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ نیز حضرت بانی مرحوم [illegible] قرآن عزیز عکسی طباعت سے مزین مع فہرست مضامین قرآنیہ کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ بانی مرحوم نے حضرت امروٹیؒ [illegible] ترجمہ بزبان سندھی دس بار چھپوایا جس سے سندھ میں بہت استفادہ کیا گیا۔

ہفت روزہ خدام الدین لاہور

۱۹۵۰ء میں حضرت بانی ادارہ نے رفقاء کی خواہش پر "خدام الدین" کے اجراء کی اجازت دی جو دینی و روحانی دنیا کا ایک کثیر الا[شاعت] اور مقبولِ عام پرچہ ہے اور جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے لاتعداد گم کردہ راہ لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائی۔ انجمن نے آج تک سفیر وغیرہ نہیں رکھا نہ ہی چندہ کی اپیل کی، اللہ رب العزت اپنے خصوصی فضل سے تمام ضروریات پوری فرما دیتے ہیں۔

احقر عبیداللہ انور — امیر انجمن خدام الدین رجسٹرڈ لاہور۔